مومن انصاری برادری
کی
تہذیبی تاریخ

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

اور ہم نے تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے
الحجرات ۱۳

وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے
۱۳

ڈاکٹر مومن محی الدین
ایم اے پی ایچ ڈی (ایڈنبرا انگلستان)

بادیٔ النظر میں یہ مومن برادری کی تاریخ ہے لیکن حقیقت میں اس کے اوراق اپنے اندر پوری انسانی برادری کی علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ سمیٹے ہوئے ہیں۔

یہ تصنیف معلومات کی وسعت، استدلال کی قوت اور زبان و اسلوب کی دلکشی و تاثیر کے لحاظ سے بھی گرانقدر ہے۔ مصنف نے اپنی بالغ نظری، دیدہ وری، وقت کی اور شگفتگی تحریر سے کتاب کو عہد ساز بنا دیا ہے۔ علم و تحقیق کی دنیا میں کسی تخلیق کو حرف آخر کہنا مشکل ہے لیکن مومن انصاری برادری کی تاریخ پر اب تک جو کام ہوئے ہیں انکے درمیان یہ کتاب منفرد ہے۔ مصنف نے اپنی فکری کاوش اور جگر کاوی سے موجودہ و آئندہ نسلوں کے لئے ایسی دستاویز پیش کر دی ہے جس میں برادری کی متنوع خدمات کا اعتراف بھی ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتوں اور فکری توانائیوں کیلئے پیغام بیداری بھی۔ مصنف کا یہ شاہکار قدر شناسوں کے لیے ایسا تحفہ ہے جو ہمیشہ ان سے خراج تحسین حاصل کرتا رہے گا۔ قوی امید ہے کہ اہل علم و تحقیق اور خصوصاً برادری کے باشعور افراد اس تحقیقی شاہکار، علمی خدمت اور صنعتی تذکرہ کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

اقتباس از مقدمہ

حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

(وکیل الجامعۃ)

الجامعۃ السلفیۃ، مرکزی دار العلوم بنارس

مالیگاؤں اپنی علمی، ثقافتی، اقتصادی سرگرمیوں کیلئے جن اداروں، شخصیات اور ارباب کمال کا احسان مند ہے انکو دل نشیں اور ہمہ گیر انداز سے محترمی ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب نے مرتب کر کے بڑا تجدیدی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے کوشش بسیار سے کام لیکر مومن انصاری برادری کی علمی، تہذیبی، معاشرتی، قومی اور تاریخی خدوخال سے پردہ اٹھایا ہے بلکہ ایک نہایت اہم اور نامکمل موضوع کو زیور تکمیل سے آراستہ کر کے برصغیر میں آباد مومن انصار برادری کے تاریخی کردار کو پیش کر کے تعارف کی قابل ستائش سمت مقرر کی ہے۔ انکا یہ کوئی معمولی کمال نہیں ہے بلکہ غیر معمولی کاوش کے ذریعے مختلف علاقوں اور شہروں کے پارچہ باف بزرگوں کی آفاقی خدمات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ علمی اور تہذیبی و ادبی ذوق کو کوئی بھی پیشہ اور صنعت فروغ پانے سے روک نہیں سکتا۔ یہ کتاب زبان و بیان اور گوناگوں معلومات کا عظیم شاہکار ہے۔ مصنف موصوف اپنی اس منفرد تصنیف پر علمی حلقوں اور ارباب کمال کی طرف سے بجا طور پر تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

محمد حنیف ملی

معہد ملت، مالیگاؤں

۲۲ / ۱۲ / ۹۳ء

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

مومن انصاری برادری

کی

تہذیبی تاریخ

ڈاکٹر مومن محی الدین

مومن دارالثقافہ۔ (اندھیری، بمبئی)

خطاطی: مقصود

نام کتاب: مومن - انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ

مصنف: ڈاکٹر مومن محی الدین ایم - اے - پی - ایچ - ڈی (ڈاڈبرا - انگلستان)

اشاعت: مارچ ۱۹۹۴

طباعت: بھارت پرائیوٹ لیمیٹیڈ، ۲۴۲ بلاسس روڈ، بمبئی ۸

کتابت: عثمان علی، ۶۱/اے محلہ عبیر گر ٹولہ جونپور (یوپی) ۲۲۲۰۰۱

سرورق: احمد حنیف (مالیگاؤں)

عنوان: مقصود احمد انصاری (بھیونڈی)

اسکرین پرنٹنگ: ۲۷ ایوار لین مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳

تعداد: دو ہزار

صفحات: ۱۱۷۰

قیمت:

ناشرین

نوشابہ مومن اور رخشندہ صادق

مومن دار الثقافہ

۵۰۲ سی کریسٹ ۲ - سات بنگلہ، ورسوا روڈ

اندھیری، بمبئی - ۴۰۰۰۶۱

انتساب

محمد حسن محمد خلیل مومن (لالہ سیٹھ) کے نام

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

(بیشک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اللہ جسے محبوب رکھے تو بھلا اس کے شکر گذار بندے ایسے محبوب کو کیوں نہ محبوب رکھیں

تقسیم کار زیر اہتمام

مومن ویلفیئر سوسائٹی

مومن جماعت خانہ ۳۶۳، صمد نگر کنیری بھیونڈی (ضلع تھانہ)

ملنے کے پتے

مومن ویلفیئر سوسائٹی

مومن جماعت خانہ۔ ۳۶۳ صمد نگر، کنیری۔ بھیونڈی (ضلع تھانہ) ۴۲۱۳۰۲

ٹیلیفون: ۲۲۶۶۳، ۲۱۴۶۲

۱۔ بمبئی: شرف الدین الکتبی و اولادہ (شرف الدین اینڈ سنز)

۲۹، محمد علی روڈ، بمبئی ۳۔۰۰۰۴۰۰ ٹیلیفون ۳۷۱۹۳۴۴

۲۔ کرلا (بمبئی): اسحاق ابراہیم فیت والا (ایم اے)۔ ۱۵۷ فیت والا بلڈنگ پائپ روڈ کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰

۳۔ مالیگاؤں: ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی۔ ایس۔ ایچ ایم ایس بی نمبر ۳۷، عبداللہ نگر، نیا پورہ پہلی گلی۔ مالیگاؤں

۴۔ جونپور: عثمان علی ۹۱/اے، محلہ بیر گر ٹولہ، جونپور (یوپی) ۲۲۲۰۰۱

۵۔ الہ آباد: احمد علی (چندا)، ۱۷۷ منہاج پور۔ الہ آباد (یوپی)

۶۔ مئوناتھ بھنجن: مقصود اختر انصاری، ازہر لائبریری۔ ڈومن پورہ۔ جبہ۔ مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱

۷۔ برہانپور: محمد حشمت اللہ انصاری (بی ایس سی)۔ انصاری اردو پریس، مومن پورہ، برہانپور (ایم پی) ۴۵۰۳۳۱

اور براہ راست ناشرین سے

نوشابہ مومن اور درخشندہ صادق

۵۰۳، سی کریسنٹ ہاؤس

سات بنگلہ ورسوا روڈ

اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۶۱

ٹیلیفون: ۶۲۳۴۰۱۱

یہ کتاب بھیونڈی کی مومن۔ انصاری برادری کی مالی اعانت سے
شائع ہوئی ہے

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا

اور جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن وفات پائینگے اور جس دن زندہ کرکے اٹھائے جائینگے

ان پر سلام و رحمت رہے)   (مریم: ۱۵)

ڈاکٹر مومن محی الدین کی تحقیقی و علمی کتاب

"مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ"

سرپرست صاحبان

حاجی عبدالشکور سیٹھ   محمد ایوب پنجابی   شبیر احمد آہی   عبدالرؤف پنجابی

مجلس عاملہ

محمد حسن خلیل — چیرمین

عبدالحکیم انصاری — وائس چیرمین

محمد حسن بھوپالی — خازن

یوسف حسن مومن — سیکریٹری

شریف حسن مومن — رُکن

ابراہیم انصاری — رُکن

ڈاکٹر عبدالمنان انصاری — رُکن

بلال احمد مومن — جوائنٹ سیکریٹری

مومن اقبال [illegible] — جوائنٹ سیکریٹری

رابطہ و پروپیگنڈہ کمیٹی برائے نشر و اشاعت

بلال احمد مومن

عبدالملک مومن

محمد رفیع انصاری

ڈاکٹر ریحان انصاری

مقصود آرٹسٹ

عبدالجلیل انصاری (مدیر "صبح و شام")

سیماب انور

شمیم انصاری

اراکین استقبالیہ و اجسرار کمیٹی:

الحاج عبدالغنی اطلس والے	نظام الدین انصاری
ابوبکر اکبر علی	عثمان حاجی ولی اللہ
محمد عمر شفق	مشتاق احمد موسیٰ رضا
ڈاکٹر عبدالرؤف مومن	نثار عمر عبدالستار
عبدالحفیظ حافظ محمد حسین	مشتاق احمد محمد یٰسین پیٹی والے — مشتاق احمد مرشد
ایڈوکیٹ عبدالرشید طاہر	نصیر احمد پچو سیٹھ
یٰسین مبین ماسٹر	ایڈوکیٹ نیاز احمد مومن (نوری)
ڈاکٹر ابرار مومن	ڈاکٹر غیاث الدین
ڈاکٹر حسام الدین	ایڈوکیٹ یٰسین مومن
بدرالدین انصاری	ڈاکٹر عبدالسلام
ڈاکٹر جاوید شاہجہاں	ڈاکٹر راحیل احمد انصاری
ایڈوکیٹ انیس مومن	زبیر احمد انصاری
سعید احمد محمد یوسف (مومن اتحاد)	زاہد جابر
محمد ایوب حیدر علی انصاری	ایڈوکیٹ مومن مختار محمد حنیف
کامریڈ اسرار احمد	عتیق احمد محمد طیب
انصار احمد انصاری	اقبال احمد محمد یٰسین (بلڈر)
ریاض احمد بابو گھڑی والے	نصیر احمد حاجی غلام رسول
عبدالمجید انصاری (مچھلی والے)	ڈاکٹر محمد امین بھارتی
محمد یٰسین سردار سکندر انصاری	محمد یوسف دین محمد
اقبال احمد جسیم سردار	ریاض احمد محمد طاہر
شفیق عبدالرشید مومن	وقار احمد مومن
محمد اقبال محمد نذیر (اورنگ آباد)	ضیاء احمد عبدالشکور
عرفان محمد ایوب پنجابی	اقبال عبدالرؤف پنجابی

عبدالمجید محمد یوسف پنجابی

اجراء کمیٹی مالیگاؤں
برائے مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ

مصنف ڈاکٹر مومن محی الدین ایم اے، پی ایچ ڈی۔ اڈنبرا

صدر :- محمد امین صدیقی　　　نائب صدر :- احمد عفیف

سکریٹری :- شبیر احمد ہاشمی　　　جوائنٹ سکریٹری :- ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی (بمبئی)

محمد یسین درگاہی (بمبئی)

ممبران :-

ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب	غلام مصطفٰے اثر صدیقی صاحب	ڈاکٹر سعید احمد فیضی صاحب
ڈاکٹر منظور ایوبی صاحب	ڈاکٹر آصف سلیم صاحب	ڈاکٹر عبدالحمید کلر صاحب
ڈاکٹر احمد ریاض صاحب (شامنامہ)	حاجی عبید الرحمٰن (یونیورسل)	حاجی عزیز الرحمٰن (رحمانی گروپ)
سیٹھ شفیق احمد مہاراجہ صاحب	انصاری نہال احمد (ایڈوکیٹ)	جمیل احمد کراتی صاحب
فاروقی عبدالرحیم صاحب	عبدالخالق فارقلیط صاحب	احسان الرحیم صاحب
انصاری شفیق ماسٹر صاحب	انصاری محمد رضا صاحب	ماسٹر اقبال احمد انصاری صاحب
یوسف جمال صاحب	صدیقی اقبال احمد (نورانی پریس)	

(اراکین برانچ آف بمبئی سوسائٹی مالیگاؤں)　　　پروفیسر شیخ صغیر احمد صاحب

انصاری محمد صابر صاحب　　　انصاری انیس احمد　　　ڈاکٹر جاوید اختر رحمانی صاحب

(اراکین بیبئے سوسائٹی مالیگاؤں)

صدیقی خورشید احمد (نیو راج ہنس)　　　صدیقی خالد احمد (راج ہنس)

انصاری خلیل احمد کلر　　　جمیل احمد (ڈبلیو برٹی)　　　انجم عارف صاحب

صدیقی غلام محمد صاحب (نیو راج ہنس)　　　صدیقی محمد اسحاق صاحب

صالح ابن تابش　　　انصاری عبداللطیف صاحب

سرپرست نگراں کمیٹی :

نگراں حضرات :

مولانا محمد حنیف ملی صاحب	پروفیسر عبدالحفیظ انصاری صاحب	شبیر حکیم صاحب
پروفیسر نذیر احمد انصاری صاحب	ڈاکٹر عبدالعزیز انصاری صاحب	عتیق احمد عتیق صاحب (دوازن)
محمد الیاس صدیقی صاحب	محمد اسحاق خضر صاحب	محمد حسن فاروقی صاحب
سعید اظفر فاروقی صاحب	عبدالمجید سرور صاحب	لطیف جعفری صاحب
محمد ہارون بی اے صاحب	اظہر لجنری صاحب	ڈاکٹر غلام حیدر صدیقی صاحب
رمضان بھائی قریشی صاحب	پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب	مولانا جاوید احمد ندوی صاحب
جمال انصاری صاحب	کلیم دانش (عوامی آواز)	عثمان غنی (ایکس)

سرپرست حضرات :-

سیٹھ عبدالاحد صاحب (اسمٰعیل بیڑی فرم)	سیٹھ محمد اسحاق زری والے
محمد حنیف شوال صاحب	خواجہ عمر صدیقی صاحب
ڈاکٹر سہیل احمد صدیقی	سیٹھ عبدالرحیم چمڑے والے
سیٹھ عبدالمجید چمڑے والے	سیٹھ ریاض احمد ملا صاحب
سیٹھ چراغ احمد صاحب (۵۵ نمبر بیڑی)	سیٹھ محمد اقبال (نوبہار)
سیٹھ محمد فاروق مقادم	سیٹھ مبین حسن صاحب
سیٹھ رئیس احمد صاحب (سنٹرل مینا)	سیٹھ شمس الضحیٰ (حفیظ سائزنگ)
مولانا نذیر احمد اظہری	حافظ عبدالقدوس صاحب
انصاری فضل الرحمٰن انجینیر صاحب	ماسٹر محمد فاروقی صاحب

کنوینر:- ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی

فہرست

تعارف

تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ میں روزگار کی تلاش میں پہلی بار بمبئی آیا تھا، کسی کو جانتا نہ تھا مگر سید نجیب اشرف ندوی کا نام سن کر ان کے پاس پہنچ گیا انھوں نے کچھ دنوں بعد انجمن اسلام بمبئی کے جنرل سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی سے کہہ کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایک چھوٹی سی ملازمت میں لگا دیا۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ایک پوسٹ گریجویٹ ادارہ تھا اور بمبئی یونیورسٹی سے ملحق تھا، جو طلبہ اردو میں ایم۔ اے یا پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے خواہش مند ہوتے، وہاں داخلہ لیتے اور کامیاب ہو کر جاتے تھے۔ صبح کے وقت وہاں کوئی خاص ہما ہمی نہیں رہتی تھی۔ کچھ لائبریری کے ممبر اور کچھ مطالعہ کے خواہش مند وہاں آجاتے تھے، البتہ جو نہی دوپہر ہوتی اور دو بجتے اچانک ایک چہل پہل سی مچ جاتی، ایم۔ اے کے لیکچر شروع ہو جاتے، طلبہ آنے لگتے اور انسٹی ٹیوٹ کے آنریری ڈائرکٹر سید نجیب اشرف ندوی کی آمد کے ساتھ ساتھ [illegible] تازگی [illegible] شروع ہو جاتی۔ ایک اچھی [illegible] سی چہل پہل رہتی اور میں ایک اجنبی کی طرح لائبریری کے ایک کونے میں بیٹھا [illegible] تماشا دیکھتا رہتا۔

ایک دن تین بجے کے قریب ایک خوبصورت سے نوجوان لائبریری میں آئے، دبلے پتلے، [illegible] شرمیلے شرمیلے سے [illegible] اور [illegible] لگ بھگ رہے تھے۔ ان کی شخصیت [illegible] کشش تھی [illegible] لائبریری کی سیڑھیوں پر قدم رکھا تھا، وہاں موجود طلبہ [illegible] ان کے اطراف حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور ان سے باتیں کرنے لگے، ایسا لگتا تھا سب ان سے [illegible] ہیں اور انھیں بہت چاہتے ہیں، ان لوگوں میں کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ صاحب چلے گئے۔

میں نیا تھا، سب سے اجنبی تھا، نہ ان کے قریب گیا نہ ان سے بات چیت کی، بس دور ہی دور سے انھیں تحسین آمیز نظروں سے دیکھتا رہا اور ان کی ہر دلعزیزی پر رشک کرتا رہا۔ جب وہ چلے گئے تو میں نے اپنے دوستوں سے پوچھا کہ وہ کون صاحب تھے تو معلوم ہوا کہ ان کا نام مومن محی الدین ہے، [illegible] یوسف کالج کے طالب علم ہیں، فارسی میں ایم۔ اے کر رہے اور [illegible] پر [illegible] تعلیم [illegible] میں مولوی [illegible] اور [illegible] انھیں [illegible] مجھے [illegible] مگر ساتھ ہی ان کی [illegible] شخصیت نے میرے دل پر خوش گوار اثر چھوڑا اس سے میں [illegible] [illegible] گئی تھی۔

مومن صاحب کی کالج کی زندگی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا صرف اتنا معلوم ہے کہ [illegible] یوسف کالج کے طالب علم تھے، ان دنوں بمبئی اور بیرون بمبئی میں وہی کالج زیادہ مشہور تھے۔ [illegible] یوسف کالج [illegible] سینٹ زیویرس [illegible] اسمٰعیل یوسف کالج مسلمانوں میں زیادہ مشہور تھا اور وہاں مسلم طلبہ کو خاص مراعات حاصل تھیں، اس کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر [illegible] ایک اچھے انسان، اچھے مسلمان اور اچھے منتظم تھے اور پڑھے لکھے طبقہ میں کافی ہر دلعزیز تھے۔ انھوں نے کالج میں ہر مضمون کے لیے اطراف ہند سے ایسے اساتذہ کو جمع کر لیا تھا جو اپنے اپنے مضمون کے ماہر تھے، عربی میں ڈاکٹر داؤد پوتہ، فارسی میں پروفیسر محمد ابراہیم ڈار اور ڈاکٹر [illegible] ایم [illegible] اور اردو میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور نہ معلوم [illegible] کتنے

لگا۔ کوئی ادبی نشست اور کوئی مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر کامیاب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بھیونڈی کے نوجوان انھیں اپنے لئے ایک مثالی شخصیت سمجھتے تھے۔

مومن صاحب نے اپنی اس کتاب میں ایک جگہ ان اعزازی جلسوں، سپاسناموں اور اپنی صدارتی تقریروں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا بھی حوالہ دیا ہے جس سے اُن کی شخصیت کے متعلق دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں، ایک تو یہ کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" بچپن ہی سے ان میں وہ ساری علمی، ادبی اور فنی صلاحیتیں موجود تھیں جو بعد میں پھل پھول کر جوان ہوئیں اور سب کو اپنا گرویدہ بنایا اور دوسرا یہ کہ بھیونڈی کے سربرآوردہ اور بااثر لوگ ان کی ان صلاحیتوں سے پہلے ہی سے واقف تھے اور انھیں پروان چڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

"راقم کی یادوں کے قدیم سرمایے میں بچپن کی ایک یاد سب سے زیادہ تابناک ہے اور سنسنی خیز بھی، جب ہم لگ بھگ گیارہ سال کے تھے کہ ۱۹۴۱ء میں ایک مشاعرے میں جس کا انعقاد نور محمد حکیم کے مکان، درگاہ روڈ سے ملحق ایک چبوترے پر کیا گیا تھا، ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ہمیں مصوری کا بڑا شوق تھا، جس طرح رب العطایا نے ہمیں بہت ساری نعمتوں سے نواز کر مکلف بنایا ہے کہ ہم اپنی زبان ہر لمحہ 'شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو' کے ورد سے تر رکھیں، تو ہمیں نقاشی کی خداداد صلاحیت بھی بخشی تھی۔ ہماری بنائی ہوئی تصویروں کو روی مسلم پبلک لائبریری نظام پورہ میں اپنے عہد کے پہلے ترقی پسند اور روشن فکر شاعر نشیط نظامپوری نے دیکھا تو بے حد تعریف کی۔ اس مشاعرہ میں انھوں نے حاضرین مشاعرہ کے سامنے ان تصویروں کی نمائش کی، ہمیں 'ننھا مصور' کا خطاب دیا اور چاندی کا تمغہ سے نوازا۔ یہ ہمارے بچپن کا سب سے ہیجان انگیز واقعہ تھا اور غالباً سب سے پہلا موقع کہ ہم عوام کے سامنے پیش کئے گئے۔ یہ اعزاز ہماری زندگی میں ملنے والے اعزازات کی بسم اللہ تھی۔"

اُن دنوں انگلینڈ اور امریکہ میں تعلیم پاکر ہندوستان لوٹنے والوں کی عام لوگ تو قدر کرتے ہی تھے، سرکاری سطح پر بھی ایسے لوگوں کو دوسرے ہندوستانیوں پر فوقیت دی جاتی تھی اور ان پر روزی کے دروازے بڑی آسانی سے کھل جاتے تھے۔ چنانچہ مومن صاحب بھی جب ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو انھیں فیلوشپ اور سرکاری عہدوں کی صورت میں ایک سے ایک اچھی ملازمتیں ملیں، پہلے وہ دکن کالج پونہ میں یو جی سی کے فیلو رہے اور پونا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ کے۔ پوتدار کے ساتھ تین سال مراٹھا اور مہاراشٹر کی تاریخ سے متعلق فارسی دستاویزات پر کام کیا، پھر حکومت ہند کے محکمۂ تعلیمات کے افسر کی حیثیت سے بھوپال میں ملازمت کی، پھر علی گڑھ چلے گئے اور وہاں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ علوم اسلامیہ سے منسلک ہوگئے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم مصنف لغات القرآن اس شعبے کے صدر تھے، انھوں نے وہاں ڈاکٹر مقبول احمد، منیب الرحمٰن، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو، مولانا غلام مصطفےٰ، اقبال انصاری، انصاری، فضل الرحمٰن ندوی، ڈاکٹر مغل محفوظ الحق اور اکمل ایوبی جیسے قابل لوگوں کو جمع کر لیا تھا۔ مومن صاحب وہاں خوش تھے مگر وہاں بھی وہ ایک سال سے زیادہ ٹک نہ سکے، پاؤں میں چکر تھا۔ اپنوں کی کشش انھیں دوبارہ بمبئی لے آئی اور بمبئی یونیورسٹی نے یو۔ جی۔ سی کی مدد سے فارسی، عربی، فرنچ، جرمن اور روسی زبانوں کی تعلیم کے لئے "فارن لینگویجز ڈپارٹمنٹ" کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کیا تو مومن صاحب اس میں فارسی زبان کے پہلے استاد

مقرر ہوگئے، ۱۹۶۵ء تا ۱۹۸۹ء وہ اسی سے منسلک رہے اور چوبیس سال بعد فارسی کے ریڈر اور ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مومن صاحب کی شخصیت بڑی فعال اور جاندار ہے، جب وہ کسی کام کو ہاتھ میں لیتے ہیں تو اس کو ادھورا نہیں چھوڑتے، انجام تک ضرور پہنچاتے ہیں، وہ آدمی کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتے، اور ایک بار جب وہ کسی کے متعلق کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس میں ذہنی طور پر اتار چڑھاؤ تو آتا ہے مگر اُن کی اصل رائے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اور جب کسی کے متعلق وہ ایک بار اچھی رائے قائم کر لیتے ہیں تو پھر اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں کس نیک گھڑی میں انھوں نے میرے متعلق اچھی رائے قائم کر لی تھی، اُن کا سلوک میرے ساتھ ہمیشہ اچھا بلکہ ہمدردانہ رہا، بمبئی یونیورسٹی میں استاذ کی حیثیت سے میرا داخلہ، فارن لینگویجیز ڈپارٹمنٹ میں عربی کے لیکچرر کی حیثیت سے میرا تقرر، اور پھر اسی ڈپارٹمنٹ میں میرا ریڈر کے عہدہ تک پہنچنا، سب انھیں کی کوششوں کا رہین منت ہے۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں، میں پورے دس سال لائبریرین رہا، اور تقریباً اتنا ہی زمانہ میرا مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں بھی ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے گذرا، دونوں جگہ میری ملازمت میرے مزاج کے مطابق تھی، پھر بھی میرے [illegible] کے کسی نامعلوم گوشہ میں یہ خواہش بھی دبی دبی سی رہی کہ مجھے بھی میرے [illegible] اور دوستوں کی طرح یونیورسٹی میں طلبہ [illegible] نے کا موقع ملے تو بہت اچھا ہو، میرے بعض اچھے دوستوں سے جو میرے ساتھ سفر شروع کر کے آگے بڑھ چکے، اور تعلیمی دنیا میں اچھے عہدوں پر فائز تھے میں نے دو ایک بار اپنی اس خواہش کا [illegible] بھی کیا، مگر انھوں نے میری بات سنی ان سنی کردی۔ ایک دن انصاری صاحب کو مومن صاحب [illegible] بات میری اور حمید انصاری کی بہت پرانی پہچان تھی، میرے انھیں کے [illegible] کا [illegible] ذوق فراق کے شعبہ بھی دونوں میں بڑی یکسانیت تھی، ہم دونوں [illegible] کیا کرتے تھے، [illegible] ہوگیا، ان دنوں فارن لینگویجز ڈپارٹمنٹ چرچ گیٹ اسٹیشن کے قریب یونیورسٹی کے طلبہ ہاؤس میں تھا۔ عربی فارسی کے پوسٹ گریجویٹ لیکچرز کا شعبہ بھی اسی ڈپارٹمنٹ [illegible] ہم وہاں [illegible] بجے کے قریب یونیورسٹی طلبہ ہاؤس پہنچے تو مومن صاحب اپنے کیبن میں موجود تھے، ہم دونوں کے آنے سے وہ بہت خوش ہوئے، پھر باتوں ہی باتوں میں میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے "آپ عربی کے سرٹیفکیٹ کورس کے لیکچر لیں گے" وہ تو میری پرانی تمنا تھی، کیسے انکار کرتا، [illegible] کلاسیں شام میں چھ بجے شروع ہوتی تھیں، چونکہ ڈپارٹمنٹ میں عربی کا [illegible] لیکچرر [illegible] اس کا انتظام مومن صاحب کے سپرد تھا، چنانچہ مومن صاحب نے میری [illegible] دوسرے ہی دن میرے نام، عربی کے لئے مہمان لیکچرر (۱۹۷۰–۱۹۷۱) کا [illegible] ایم۔ جی۔ ایم سے چھوٹ کر طلبہ ہاؤس جاتا اور سرٹیفکیٹ کے لیکچر لیتا، طلبہ کافی تھے [illegible] کے آفسوں میں کام کرنے والے تھے، میرے طرز تدریس، دوستانہ رویہ اور [illegible] سب کے سب بہت جلد مجھ سے مانوس ہوگئے اور پڑھائی کا کام ایک خوش گوار ماحول میں چلتا رہا۔ دوسرے سال خوش ہو کر مومن صاحب نے مجھے ڈپلوما کے لیکچرز بھی دیدیئے اور تیسرے سال ایم۔ اے کے، اس طرح ۷۲ سے ۸۰ تک آٹھ سالوں میں مجھے پوسٹ گریجویٹ لیکچرز کا اچھا خاصا تجربہ ہوگیا۔

اس دوران میں ایم۔ جی۔ ایم میں حالات بڑی تیزی سے بدلنے لگے۔ اور وہاں کی زمین مجھ پر تنگ ہونے لگی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ اگر میں نے جلد ہی اپنے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ڈھونڈی

تو مجھے "رہ گذر پہ بیٹھنا" پڑے گا۔ اتفاق سے انھیں دنوں بمبئی یونیورسٹی کے عربی کے لیکچرر کی پوسٹ کا اشتہار نکلا، مومن صاحب تھوڑا بہت ایم۔جی۔ایم کے ان بدلے ہوئے حالات سے واقف تھے، میں ان سے ملا، اور اپنی بپتا سنائی۔ انھیں بہت افسوس ہوا، کہنے لگے آپ اس پوسٹ کے لئے درخواست دیدیجئے، مگر میں پہلے سے آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرے ذہن میں اس پوسٹ کے لئے پہلے ہی سے عرفان نقیہ کا نام ہے اگر وہ درخواست دیتے ہیں تو پھر میں آپ کے لئے کوشش نہیں کروں گا۔ ہاں اگر وہ درخواست نہیں دیتے تو پھر نمبر آپ کا ہی ہے۔ شاید میری قسمت اچھی تھی، نقیہ صاحب نے اس پوسٹ میں دلچسپی نہیں دکھائی اور مومن صاحب نے وعدے کے مطابق اپنا سارا اثر و رسوخ میرے حق میں استعمال کیا اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک اس پوسٹ پر میرا تقرر نہ ہو گیا۔

کچھ برسوں بعد یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی جگہ بھی نکل آئی، اس وقت تک عربی میں میں اکیلا ہی تھا، بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے میرے ریڈر بننے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، مگر بات اتنی آسان نہ تھی کیونکہ آج زندگی کی ہر دوڑ میں مقابلہ اس قدر سخت ہو گیا ہے کہ معمولی سے معمولی کام بھی بغیر سفارش کے نہیں بنتے، وقت آنے پر آدمی کی ساری صلاحیتیں اور ایمانداریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، سفارش لانے والا بازی مار لے جاتا ہے، میں اپنی ذمہ داریاں پوری دیانت داری اور محنت سے ادا کرتا تھا، طلبہ، اساتذہ سبھی میری عزت کرتے تھے، مگر میں ایک خاموش طبیعت کا آدمی تھا، نہایت کم گو اور کم آمیز، بھلا میں اپنی سفارش کے لئے کس کے پاس جاتا، مگر یہاں بھی مومن صاحب کسی درخواست کے بغیر ہی میری مدد کے لئے آگے بڑھے اور اپنی ساری طاقت مجھے ریڈر بنانے میں لگا دی، مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب ریڈر کی پوسٹ کے لئے میرا انٹرویو ہوا تھا، اس دن آخر وقت تک مومن صاحب میرے ساتھ تھے، میں جب انٹرویو دے کر وائس چانسلر کے چیمبر سے نکلا تو مومن صاحب سامنے کی [illegible] میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے، میرا انٹرویو غیر معمولی طور پر ذرا لمبا ہو گیا تھا، ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ ملتے ہی انٹرویو کا حال پوچھا، میں نے تفصیل بتائی تو انھیں تھوڑا سا اطمینان ہوا، پھر بھی نتیجہ معلوم کئے بغیر وہ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے، یہاں تک کہ ایک بجے کے قریب بمبئی یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر اور اس وقت کے ڈین ڈاکٹر [illegible] چیمبر سے باہر نکلے و مومن صاحب کو بتایا کہ آپ کے امیدوار کا انتخاب ہو گیا ہے تو خوشی اور جذبۂ احسان خداوندی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، کھڑے ہو کر [illegible] پڑھی اور مجھے مبارک باد دی۔

[illegible] انصاری کے ساتھ [illegible] کے حسن سلوک کی داستان بھی میری داستان سے بہت کچھ ملتی [illegible] بعد میں مومن صاحب کے [illegible] انصاری صاحب پہلے ہی سے ان کے [illegible] وہ ان [illegible] نہیں بیٹھتے تھے انھیں چین نہیں آتا تھا [illegible] انصاری صاحب بتایا کرتے تھے کہ مومن صاحب [illegible] ان کی بڑی مدد کی ہے وہ بڑے اچھے استاد تھے۔

[illegible] ایم۔اے [illegible] فارسی کے لیکچرر ہو گئے تھے اپنے مزاج اور [illegible] کی وجہ سے وہ بہت [illegible] مقبول بھی ہو گئے، مگر وہاں ترقی کے مواقع کم تھے اس لئے [illegible] کالج سے مہاراشٹرا کالج میں چلے آئے۔ مہاراشٹرا کالج مسلمانوں کا کالج تھا [illegible] کرتے ہیں [illegible] میں گرفتار ہو گئے، ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ان کی [illegible] معلوم تھا اسی لئے جب یونیورسٹی میں فارسی [illegible] تو وہ [illegible] مہاراشٹرا کالج سے نکال کر یونیورسٹی میں لے آئے [illegible]

کر اپنے احباب میں کسی کو نہیں پایا۔

مومن صاحب میں نفاست پسندی بھی بے انتہا ہے۔ وہ خود بھی صاف ستھرے رہتے ہیں اور اپنے دوستوں کو بھی صاف ستھرا دیکھنا پسند کرتے ہیں، دفتر ہو کہ گھر، پوشاک ہو کہ پیرہن، ہر چیز میں اُن کی یہ نفاست پسندی نمایاں ہوتی ہے، جب تک وہ یونیورسٹی میں رہے، اپنے دفتر کو بھی انھوں نے صاف ستھرا رکھا، اُن کی میز پر نہ کبھی مٹی دھول دیکھی گئی، نہ غیر ضروری کاغذات، صرف مطالعہ کی کتابیں میز کے بک اسٹینڈ پر قرینے سے لگی رہتیں اور وہ بھی آئینہ کی طرح گرد و غبار سے پاک، اُن کی نفاست پسندی کا ایک سرا حسن و خوبصورتی سے بھی ملتا ہے، وہ اچھی صورتیں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اُن کا یہ ذوقِ جمال اُن کے گھر کی سجاوٹ سے بھی ظاہر ہوتا ہے، یوں تو گھر دو کمروں کا، کچن اور باتھ روم کے ساتھ، مگر اس کو جس قدر سلیقہ سے رکھا ہے وہ کم ہی دوسروں کے ہاں دیکھنے میں آیا ہے، خاص طور پر اُن کا ڈرائنگ روم تو نہ صرف دیکھنے بلکہ محسوس کرنے کی چیز ہے، فرش پر قالین بچھے ہوئے، دیواروں پر قرآنی آیات کے مخملیں طغرے آویزاں، خالی جگہوں میں خوبصورت پھول پتوں کے گملے، ایک طرف چھوٹی سی لائبریری اور وہ بھی دینی اور تاریخی کتابوں سے سجی ہوئی، کتابیں بھی مجلد اور خوبصورت، دوسری طرف کھانے کی میز اور خوبصورت کرسیاں، تیسری طرف مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے نہایت آرام دہ صوفے، اور چوتھی طرف خود ان کے اپنے بیٹھنے کا دیوان، نرم نرم گدوں سے سجا ہوا، ہر چیز صاف و شفاف، اس کمرے کی پاکی صفائی اور آراستگی سے جو مجموعی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ٹھنڈک بن کر دل میں اتر جاتی ہے۔ گھر کی آراستگی کا یہ عمل یقیناً ایک مشترک عمل ہے جس میں اُن کی بیوی اور بچی کا حسنِ ذوق بھی شامل ہے۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ اپنا گھر اتنا صاف ستھرا اور آراستہ کیسے رکھ لیتے ہیں، کہنے لگے "جب دینی طریقے پر جینے کا صحیح سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے تو مکان سے لے کر زبان تک پاکیزہ بن جاتی ہے۔"

گھر میں کمانے والے اکیلے مومن صاحب ہیں مگر ہمیشہ انہوں نے اچھی زندگی گذاری ہے، روپے پیسے کے معاملے میں ان کے عزیز رشتہ دار ان کے روادار ہوں تو ہوں مگر وہ خود کسی کی ایک پائی کے روادار نہیں۔ ہاں اپنے ایک رشتہ دار بھتیجے کے احسانوں کا ہمیشہ ذکر کرتے ہیں اور سب کے حق میں دعا کرتے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ کماتے ہیں سلیقہ سے خرچ کرتے ہیں اور بیوی بچوں کو بھی سلیقے سے رکھی ہے، انھیں فضول خرچی کرتے کبھی نہیں دیکھا، دفتر میں کوئی دوست ان سے ملنے آجائے تو چائے سے اس کی خاطر داری کرتے ہیں، وہ ہوٹلوں میں کبھی نہیں جاتے، لیکن گھر میں اپنے دوستوں کو خوب کھلاتے پلاتے ہیں، خاص طور پر ایسے دوستوں کو جنھیں وہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ [illegible] دوست ہیں، پروفیسر احمد انصاری، پروفیسر غلام حسین تمدنی اور پروفیسر سید [illegible] بخت ہے، جب بھی مومن صاحب کے گھر جانا ہوتا، ہم چاروں یا چاروں ساتھ ہی جاتے تھے، ہمارے پہنچنے سے انھیں بے حد خوشی ہوتی اور وہ ہمیں خوب کھلاتے پلاتے، گھنٹوں ہمارے ان کی علمی اور دینی موضوعات پر بحث ہوتی، مغرب کا وقت ہو جاتا تو ساتھ ہی نماز پڑھتے، اس طرح کافی دیر بعد جب ہم مل ملا کر اُن کے گھر سے نکلتے تو ہمارا دل روحانی اور طمانیت سے معمور ہوتا۔

مومن صاحب کی علمی و تحقیقی خدمتیں بھی بے پناہ ہیں، وہ اُن لوگوں میں نہیں ہیں جو محض ڈگری کی خاطر ریسرچ کرتے ہیں اور ڈگری مل جانے کے بعد اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، بلکہ

نے تحقیقی کاموں کو اپنا مزاج بنایا ہے اور ہمیشہ کسی نہ کسی موضوع پر مواد جمع کرنے اور اس کو کتابی روپ دینے میں لگے رہتے ہیں۔ ملازمت کے زمانہ میں ان کے تحقیقی کاموں کی رفتار ذرا دھیمی رہی، مگر ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد جس یکسوئی اور تیز رفتاری سے انھوں نے اپنے مختلف ادھورے پروجیکٹوں کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ان آخری دو سالوں میں کم از کم دو اہم تحقیقی کام پورے کیے، ایک : (Medieval Konkan : A Study of Muslim Community) جس میں عہدِ وسطیٰ کے کوکن کے مسلم فرقوں کی ثقافتی اور سماجی تاریخ پر پوری تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، یہ کام انھوں نے دی انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی کی مدد سے کیا ہے اور انگریزی میں ہے، اور دوسرا "مومن — انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ" کی تدوین، اُن کے یہ دونوں کام موضوع کے اعتبار سے انتہا اہم اور مواد کے اعتبار سے انتہا حیرت انگیز ہیں۔

اس کے علاوہ دو اور پروجیکٹ ان کے ہاتھ میں ہیں جن پر انھوں نے کافی کام کر لیا ہے۔ پہلا ہے وہابی تحریک : مغربی ہند اور بمبئی میں (انگریزی) جس کو وہ "دی انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی" کی مدد سے انجام دے رہے ہیں اور دوسرے "المعجم المفہرس مصطلحات الفقہ الاسلامی (انگریزی)" جس پر انھوں نے کافی مواد اکٹھا کر لیا ہے۔ ان کے علاوہ مومن صاحب نے اب تک جو علمی اور تحقیقی کام انجام دیے ہیں ان کی مختصر سی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ "The Chancellary and Persian Epistolography Under The Mughals" (دانش اور دار الانشاء عہد مغلیہ میں)۔ یہ دراصل اُن کے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے اور اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ ہے اور فارسی کی قدیم انشاء نگاری کی تاریخ اور اس کی تفصیلات پر مشتمل ہے، اس میں ایسی قدیم اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے جن کو سمجھے بغیر کوئی ہماری قدیم فارسی تاریخوں کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا، ان کا یہ مقالہ پہلے قسط وار "Indo-Iranica" نامی کلکتہ کے ایک جرنل میں چھپا اور پھر اسی ادارہ کی طرف سے کتابی صورت میں سنہ ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔

۲۔ تذکرہ حضرت دیوان شاہ بھیونڈی : بھیونڈی میں حضرت دیوان شاہ کے نام سے ایک بزرگ مدفون ہیں، ان کا ایک شاندار مقبرہ بھی ہے، جہاں ہر سال بڑے اہتمام سے عرس ہوتا ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی سے لوگ واقف نہیں تھے۔ مومن صاحب نے بڑی محنت سے ان کے یہ حالات جمع کیے ہیں اور دیوان شاہ کی مذہبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۔ تاریخ کوکن : اردو میں کوکن کی یہ پہلی سماجی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ ہے۔ جس کو ڈاکٹر عبدالکریم نائیک نے نقش کوکن کی طرف سے شائع کیا ہے۔ اس میں سرزمین کوکن کا جغرافیہ، تاریخ اور کوکنی مسلمانوں کی علمی، ادبی سرگرمیوں کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے متعدد مقالات بھی 'بلیٹن آف دی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ'، انڈو ایرانیکا کلکتہ اور پاکستان ہسٹاریکل جرنل کراچی' میں شائع ہو چکے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا جو کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) مرتب کر رہی ہے اس میں آپ کے دو مضامین شامل ہیں۔ عہد شاہجہاں میں جو فارسی تواریخ تصنیف ہوئی ہیں ان کے ترجمے کے ایک عظیم پراجیکٹ جو ایک یونیورسٹی (امریکہ) نے بنایا ہے اس کی مجلس ادارت کے آپ اعزازی مشیر مدیر Consultant Editor ہیں۔

مومن صاحب کی شخصیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان کے فکری رجحانات کو سمجھنا بھی زیادہ

ہوتے ہیں، اُن میں سچائی اور دینداری زیادہ ہے اور وہ کسی بھی حق بات کے لیے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے سیاسی اور مادی مفادات کے تحفظ کی خاطر یہاں کے عوام پر جو جو مظالم ڈھائے، جن جن کا استحصال کیا، ان میں سرفہرست مومن و انصاری برادری کے ہی لوگ تھے، ان کی روزی چھینی، ان کے ہاتھ کاٹے اور ان کی صنعت پر قبضہ کرکے انہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ ایک ایسا گہرا زخم تھا جو کبھی مندمل نہ ہو سکا اور اُن کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف انتقام کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہی، نتیجہ یہ ہوا کہ وقتاً فوقتاً جو بھی دینی یا سیاسی تحریک انگریزوں کے خلاف اٹھی وہ اس کے ساتھ ہو گئے، اور پوری شدت کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

انگریز ایک مغرور اور مکار قوم ہے، اس کے پاس اپنے دشمن کو ذلیل کرنے اور اُسے نیچا دکھانے کے بیسیوں حربے ہیں، مادی بھی اور نفسیاتی بھی، چنانچہ ہندوستان کے جن حکمرانوں نے بھی انھیں للکارا، ان کے اقتدار کو چیلنج کیا، ان کے خلاف انھوں نے ان دونوں حربوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر، نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کے خلاف آج ہندوستان میں عام طور پر جو نفرت و حقارت کی فضا پائی جاتی ہے وہ انھیں کی پیدا کردہ ہے، تقریباً یہی بات مسلمانوں پر بھی عموماً، اور مومن و انصاری برادری پر خصوصاً صادق آتی ہے، انگریزوں نے اپنے حواریوں کی مدد سے یہ بات مشہور کردی کہ مومن و انصاری برادری کے لوگ سرکش و بدذات ہوتے ہیں، ان کو جولاہا کہہ کر ذلیل کرو۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ لغت تک میں جولاہا کے ایک معنی 'بے وقوف' دیے ہیں، یک مثل بھی ہے 'جولاہے کی مسخری ماں بہن کے ساتھ'، یعنی دینی بزرگوں ہی کے ساتھ مسخراپن کرنا ہے۔

اب انگریز یہاں سے جا چکے ہیں، زمانہ بھی کافی بدل گیا اور دوسروں کی طرح اس برادری کے لوگ بھی پڑھ لکھ کر زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں، اب انگریزوں کی چھوڑی ہوئی ان مذموم روایات پر عمل کرکے انھیں جولاہا کہنا اپنے آپ کو ذلیل کرنے کے برابر ہوگا۔ ہماری ثقافت میں اس تحقیر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ لکھ کر انھوں نے ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں دستاویز مرتب کی ہے۔ برادری ایسی کتاب پر اور ان پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔

حامد اللہ ندوی

ریٹائرڈ ریڈر ان عربک
یونیورسٹی آف بمبئی۔ بمبئی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

روئے زمین پر انسان کا سفر طویل صدیوں کو محیط ہے، قرآن کریم کی تعلیم و توضیح کے مطابق پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ان سے اور ان کی بیوی علیہما السلام سے نسلِ انسانی وجود میں آئی" اور جنت سے دنیا میں آنے کے بعد ان دونوں کی اولاد نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس معمورۂ ہستی کو بھی جنت نظیر بنا دیا، خالقِ کائنات نے انسانی مخلوق کو مکرم و محترم بنا کر جن گوناگوں محاسن و کمالات سے نوازا ان کی جھلک ہم ان کارناموں میں دیکھ سکتے ہیں جو انسان کے ذریعہ وجود پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں، یہی کارنامے زمین پر انسانی تہذیب کا تانا بانا ہیں، انھیں سے تمدن کی ردائے دلکش و نظر زیب تیار ہوئی ہے، اور انھیں سے تعمیر و ترقی کی پرشکوہ عمارت قائم ہے۔

انسان کی سربلندی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اس نے روئے زمین پر اپنی جدوجہد اور خدمت و کمالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور اس طرح اپنی تاریخ کے بڑے حصہ کو محفوظ کر لیا ہے جس سے بعد کی نسلوں کو روشنی اور حوصلہ ملتا ہے۔ اہلِ نگارش کے اس قافلہ میں ایک قابلِ فخر نام **ڈاکٹر مومن محی الدین** صاحب کا بھی ہے جنھوں نے "مومن۔ انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ" مرتب فرما کر پارچہ بافی کی صنعت اور اس سے وابستہ اربابِ علم و فن اور اصحابِ فضل و کمال کی شخصیت، حیثیات اور خدمات کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی ہے اور تہذیب و تمدن کے سفر میں ان اصحاب کی حصہ داری کو نمایاں کیا ہے، معاشرہ میں اقدار و نظریات کے وجود اور ان کی تاثیر سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ مادی پہلو کے ساتھ ساتھ معنوی پہلو کس طرح ارتقا پذیر ہوتا ہے، بادی النظر میں یہ مومن برادری کی تاریخ ہے لیکن حقیقت میں اس کے اوراق اپنے اندر پوری انسانی برادری کی علمی، ادبی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ سمیٹے ہوئے ہیں جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر انسان کے سفر میں کہاں کہاں نشیب و فراز ہیں اور اس کے عوامل و اسباب کیا ہیں۔

پارچہ بافی کی صنعت سے متعلق اب تک جو کتابیں میری نظر سے گذری ہیں ان میں مصنفین نے اس صنعت کا مختصر تعارف کرانے کے بعد اس کی فضیلت بیان کی ہے اور پھر مشہور پارچہ بافوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ڈاکٹر مومن صاحب کی کتاب میں استیعاب و شمول ہے، انھوں نے پارچہ بافی کو ایک صنعت کی حیثیت سے گذر کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ روئے زمین پر انسانی زندگی سے اس کا رشتہ جوڑا ہے اور انسانی معاشرہ کی ایک ضرورت کے طور پر اس کا تعارف کرایا ہے، معروضی انداز میں ان اہلِ فضل و کمال کے حالات پیش کئے ہیں جو اس صنعت سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ رہے ہیں، موصوف کی نظر میں پارچہ بافی کوئی محدود قسم کا پیشہ نہیں بلکہ انسانی معاشرہ کی ایک ایسی ضرورت ہے جس کا احساس ہر دور میں کیا گیا ہے اور جس کی جلوہ فرمائی سے زندگی کا ہر گوشہ منور ہے، اسی لئے کتاب کو تہذیبی تاریخ کے عنوان سے معنون کرنے میں مصنف بالکل حق بجانب ہیں۔

کتاب کے مشتملات و محاسن پر کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ گذارش مناسب ہے کہ کسی طبقہ یا

برادری کی دینی و علمی خدمات کے تعارف کا محرک ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے کہ اسلام کے بنیادی اصول سے اس کا تصادم نہ ہو یعنی اس طرح کے تذکرہ کا مقصد کسی طبقہ یا برادری کی بہتری یا کمتری کو نمایاں کرنا نہ ہو بلکہ واقعاتی طور پر اس کی صحیح تاریخ پیش کرنے کا جذبہ ہو۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ انصاف و مساوات اسلام کا ایک ایسا امتیاز ہے جس پر ہر مسلمان کو فخر ہے' اس دین میں نسل و رنگ اور زبان و علاقہ کا کوئی وزن نہیں، بلکہ برتری و کمتری کے فیصلہ کے لئے تنہا بنیاد عمل ہے' کسی مخصوص نسل یا پیشہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انسان نہ تو برتر ہو سکتا ہے نہ کمتر ؎

تمیز بندہ و آقا فساد آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس کتاب کے محاسن متنوع اور گوناگوں ہیں' لیکن اگر اس مفید اور دلکش تذکرہ کی سب سے نمایاں خصوصیت کی بابت سوال کیا جائے تو میرے نزدیک اس کا جواب ہوگا کتاب کی جامعیت و شمولیت۔ مصنف نے زمانی لحاظ سے بھی ایشیا کے مختلف ممالک میں پارچہ بافی کی صنعت کے فروغ کا جامع نقشہ پیش کیا ہے' درج ذیل عناوین اس کا ثبوت ہیں۔

یمن سے یثرب تک' انصار مدینہ' انصار مدینہ سے انصاریوں تک' پنجاب' سندھ اور راجپوتانہ کے انصاریوں کے حالات' بہار و اڑیسہ اور آسام کے محب وطن' بنگال کے تانتی بنکر' اتر پردیش (شمالی ہند) کی انصاری برادری' پورب دیس کے زرباف' وسطی ہند (جبلپور' اندور و اجین)' ناگپور کامٹی کی انصاری برادری' برہانپور کی انصاری برادری' جنوبی ہند' دکن و رخاندیش کی مومن۔ انصاری برادری' مالیگاؤں کی انصاری برادری' جزائر ممبئی کی مہاراشٹری مومن برادری اور خوردان کے وطن اسلام آباد۔ بھیونڈی کی مومن برادری۔

اس طرح موضوعات و عناوین کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب میں مذہب' اسلامی علوم و فنون' اقتصاد' سیاست' سماجیات' تہذیب و تمدن' شعر و ادب' تاریخ و سوانح' صنعت و حرفت' تعلیم و تربیت' تحریکات و تنظیمات' تصوف و کرامات' سماجی روایات' رسوم' تہوار' ریاضت اور کھیل کود وغیرہ موضوعات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

مومن صاحب کی چالیس ابواب پر مشتمل کتاب مسمی بہ "مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ" پارچہ بافی کی صنعت اور اس سے وابستہ افراد کا ایک مفصل و معروضی مطالعہ ہے۔ تحریر' تصنیف و تحقیق کے میدان میں موصوف کا تجربہ طویل اور مختلف زبانوں سے ان کی واقفیت عمیق ہے' لہٰذا انہوں نے تقریباً تمام دستیاب ماخذ سے ممکن استفادہ کیا ہے اور مختلف علاقوں کی تاریخ و تہذیبی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے' اس لئے ان کی کتاب میں انصاری برادری کی علمی' سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں کا بہت بڑا حصہ منضبط ہو گیا ہے۔ انصاریوں کے مدارس' ان کے ادارے' شعراء اور دوسرے اہل فن پر ایک پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

موصوف نے اس تذکرہ میں واقعات کو اس طرح فنی انداز میں مرتب کیا ہے کہ ماضی کا رشتہ حال سے جڑ گیا ہے اور تہذیبی سفر کا تسلسل نمایاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔ اس تذکرہ کے بعض محاسن و امتیازات پر اظہار خیال باعث طوالت ہوگا' لہٰذا صرف بعض اہم کی جانب اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

ایک باب میں مصنف نے ان حالات کی تصویر پیش کی ہے جنہیں ان کی کتاب کا محرک اور اس کے تصور کا پس منظر کہہ سکتے ہیں' اس باب کا عنوان شاعرانہ ہے "ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے" اس باب میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں مسلم معاشرہ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مذہبی حالات دگرگوں ہو گئے تھے، قرآن و سنت کی راہوں پر باطل عقائد اور ذات پات کی لعنتوں کا گرد و غبار چھا رہا تھا، علی الخصوص تعلیم یافتہ طبقہ جس پر مغربی تہذیب کی قلعی چڑھتی جا رہی تھی، لیکن مذہب سے بے بہرہ ہونے کے سبب ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا تھا۔"

ذات اور پیشے کی بنیاد پر برتری و کمتری کا تصور مسلمانوں میں اس قدر عام اور گہرا ہو چکا تھا کہ دارالعلوم دیوبند جیسا تعلیمی ادارہ اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد شفیع دیوبندی اور مولانا رضا خان بریلوی جیسے نامور علما اس ذہنی کجروی کے شکار تھے اور انصاری برادری کے بارے میں بجد غیر اسلامی تصور رکھتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا نے جہاں اپنی مشہور مذہبی کتاب "بہشتی زیور" کو برائے ترغیب و ترہیب موضوع احادیث سے سنوارا ہے وہیں انہوں نے بعض لایعنی قصوں کو مشتہر کر کے قوم منصار کے سر سے عزت و ناموس کا سہرا بھی اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے فرد دینے مدد درجہ اذیت رساں ہیں جب وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تین روز جولاہے نے نماز کیا پڑھ لی کہ اپنے آپ کو برگزیدہ ہستی سمجھنے لگا۔"

مفتی محمد شفیع کی کتاب پر خود دیوبند میں جو دلچسپ ردِ عمل ہوا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مومن صاحب لکھتے ہیں:

"لیکن ان کے درمیان ایسے جیالے طالب علم بھی تھے جنہوں نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے مولوی محمد شفیع دیوبندی کی مبتذل اور تحقیر انگیز رائے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ مالیگاؤں کے مشہور شہر سے مولانا محمد عثمان نے اپنے اساتذہ کے روبرو استدلال، جامع اور پُر اثر مضمون تحریر کیا کہ دارالعلوم دیوبند میں ہنگامہ مچ گیا۔"

مولانا ابوالعابد عبدالسلام مبارک پوری کی ایمان افروز، عہد آفرین اور مومن برادری کی تاریخ ساز کتاب "مدیح المنوال" کو ابتدا پر اسی باب میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس رسالہ میں صنعت و حرفت کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زراعت، نسبتی، تجارتی [illegible] پیشے جن پر [illegible] صحابہ کرام اور اولیاء اللہ نے اختیار کر رکھا تھا [illegible] [illegible] اور پیشہ ور طبقہ کو دین کی بات وہ دراصل ان بزرگانِ دین کی [illegible] اور ہر حرفہ کو مطعون کرتا ہے۔ جو گیر ور معاشی نظام کی جڑیں مغربی تہذیب [illegible] بڑی ہوئی جا رہی تھیں۔ اسلامی اخوت و اخوت کی جو [illegible] کی [illegible] بیگانگی تھی۔ طرفی شرفا اور [illegible] افراد سے مسلک باعتوں سے وہ رہی [illegible] [illegible] میں [illegible] وجہ سے کم شعوری [illegible] [illegible]"

[illegible] میں قرآن کریم، حدیث نبوی، سیرت طیبہ اور حیات صحابہ [illegible] مختلف پیشوں اور کپڑوں کا ذکر ہے، صحابہ میں متعدد [illegible] کو [illegible] کرتے تھے، ایک صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی [illegible] اللہ کو پارچہ بافی میں خاص امتیاز تھا۔ مصنف نے [illegible] حالات پر روشنی ڈالی ہے جس سے ان کے تذکرہ میں جامعیت اور

استناد کا وصف پیدا ہو گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ ذات اور پیشے کی بنیاد پر بیجا فخر و تکبر کرنے والے لوگ کس طرح اسلامی اصولوں کی خلاف ورزی اور اپنی تاریخ سے ناواقفیت کے مرض میں مبتلا ہیں۔

مسلمانوں میں فقہی مذاہب کب پیدا ہوئے، ان کی تقلید کا رواج کیسے ہوا، اس کی وجہ سے امت میں تشتت و افتراق اور بغض و عداوت کی لہر کس طرح دوڑی، ہندوستان میں یہ فرقہ بندی کب شروع ہوئی، مختلف علاقوں میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے، مومن برادری کا اس سلسلہ میں کیا موقف رہا، تحریک شہیدین سے تقلیدی جمود کس طرح ٹوٹا، اس تحریک کو مومن برادری سے کیسا تعاون ملا، جدل و مناظرہ کا بازار کس طرح گرم ہوا، اختلافی مسائل پر طرفین سے کون کون سے رسالے اور کتابیں لکھی گئیں، یہ اور اس طرح کے دوسرے بہت سے سوالات پر مصنف نے ایک مستقل باب میں روشنی ڈالی ہے جس کا عنوان ہے: "مذہب، مسلک اور مکتب فکر و خیال"۔

پارچہ بافی کی صنعت اور اس سے متعلق افراد میں مختلف صلاحیتوں اور مختلف کمالات کے حضرات تھے اور ان کی محنت و کوشش سے ملک میں مختلف تنظیمیں اور ادارے قائم ہوئے اور پروان چڑھے، مصنف نے اپنے تذکرہ میں ان تمام شخصیات، تنظیموں اور اداروں پر بھی تبصرہ کیا ہے جس نے کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کیا ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت کا تذکرہ بھی مصنف نے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ اس صنعت کی پوری تاریخ مختلف علاقوں میں اس کے عروج و ترقی کا مرقع تیار ہو گیا ہے۔

مومن جماعتی تنظیم اور اکابر سیاست کے باب میں مومن کانفرنس کی سرگرمیوں اور اس تنظیم سے وابستہ شخصیات کی ملی و سماجی خدمات کا خوبصورت ادبی انداز میں تعارف بھی موجود ہے۔ تنظیم سے متعلق اہل قلم نے انصاریوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کی ملی و سماجی خدمت کے لئے صحافت کے میدان میں بھی اہم کارنامے انجام دیا اور مختلف اوقات میں مختلف مقامات سے اخبارات و رسائل جاری کئے، مصنف نے برادری کی صحافتی خدمات کو بھی دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

مومن کانفرنس کے تذکرہ میں مصنف نے اس کی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی میں اس کی خدمات کا مفصل ذکر کیا ہے اور مختلف واقعات کا تذکرہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس تنظیم سے وابستہ افراد نے ہر طرح کی قربانیاں پیش کر کے تحریک آزادی کو تقویت بخشی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد زوال میں تحریک شہیدین مجاہدین کے ایمان و یقین اور عزم و حوصلہ کے کمال کا نمونہ تھی، اس تحریک کا دائرہ پورے برصغیر کو محیط تھا، ہر علاقہ اور طبقہ کے لوگ اسکی تحریک میں شریک تھے، مومن صاحب نے اس تحریک میں بھی انصاری برادری کا سراغ لیا ہے،

> "جلاہوں کا نام وہابی تحریک اور جہاد کے ساتھ ایسا جڑ گیا تھا کہ کسی بھی شورش کی چنگاری بھڑکتی جس کی نوعیت مذہبی ہوتی اور نہ جہاد کی، لیکن جلاہوں کو ضرور ملوث کر دیا جاتا۔ برطانوی سامراج کو ہندوستان میں اگر کسی سے خطرہ تھا تو صرف مسلمانوں سے۔ اور مسلمانوں میں وہ سب سے زیادہ خطرناک جلاہوں کو سمجھتے تھے۔ خاص طور سے دیار پورب کے اضلاع اعظم گڈھ اور بلیا پر ان کی کڑی نظر رہتی تھی، ادھر قریب برسوں سے جب سے سید احمد بریلوی کی وہابی تحریک پھیلی ہے یہ جلاہے کچھ اور زیادہ ہی شورہ پشت ہو گئے ہیں۔"

صوبۂ اترپردیش کے مختلف علاقوں اور وہاں کی مومن برادری اور ان کے احوال کا ذکر کسی

کے اکثر مقامات پر آیا ہے، اور اس صوبہ کے لیے مصنف نے بعض مستقل باب بھی قائم کیے ہیں، ایک باب کا عنوان ہے "اتر پردیش کی انصاری برادری" اس باب کا آغاز بڑے ادیبانہ اور مؤثر انداز میں کیا ہے، ذیل کی عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

"ہندوستان کا دل اگر عالم میں انتخاب اور فلک رکاب و ملائک جناب قنوج کا شہر تھا، اور پنجاب قوت بازو بنا، تو اتر پردیش کو یہ شرف حاصل کہ وہ اس کا دماغ تھا، یہاں کی مردم شماری کیجیے تو افراد بے شمار اور مردم شناسی کیجیے تو ہزاروں کردار، حکومت و امارت کا باب عالی کھولے تو مسند نشینوں کی قطار اور تاریخ کے صفحات الٹیے تو مجاہدین کی سرفروشیوں کے درخشاں عنوانات اور شہیدوں کے خون کی سرخیاں جگمگا اٹھیں گی، شعر و سخن کا دفتر کھولیے تو ہزاروں دبستان کھل جائیں گے، مدرسے ان کے علم و عرفان کے چراغوں سے روشن تھے اور ہزاروں دل و دماغ کے دریچے ان کے افاضات، برکات اور درس و تدریس کی دستکوں سے وا ہو گئے تھے۔"

اسی باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ صوبہ کے مختلف حصوں میں بسنے والے انصاری برادری کے افراد پارچہ بافی کے علاوہ دوسرے پیشوں سے بھی وابستہ ہوئے اور آج تک اسی سے متعلق ہیں، مثلاً علی گڑھ میں قفل سازی، مراد آباد و سنبھل میں نقش ظروف سازی، آگرہ میں کفش سازی، الٰہ آباد میں رنگ کے ڈھنگ اس سلسلہ میں ان کی اس عبارت کی دل کشی ملاحظہ فرمائیں:

"اس کی بنائی ہوئی تیتلیاں خیر طرح کے ہاتھوں میں بے زبان بن کر چلتی تھیں، فیروز آباد میں کانچ کی چوڑیاں انھیں کے ہاتھوں سے بن کر کلائیوں میں کھنکتی ہیں اور ان کی کارگہ شیشہ گری نے دھانی ہاتھوں کا بانکپن اور سہاگ قائم رکھا تھا، بھدوہی اور مرزاپور میں قالین باف مشہور رہے، سہارنپور میں لکڑی کی کھدائی اور نقش و نگار کے فنکار یہی تھے، مئو اور مبارک پور کا سنگی غلطہ، ٹانڈہ اور اکبر پور کے نفیس ململ انھیں کے ہاتھوں کے نوازش کرتے تھے۔"

ڈاکٹر مومن صاحب نے متعدد مقامات پر انصاری برادری کی مذہبی وابستگی اور علم و علماء کی ان کے ذریعہ سرپرستی کا تذکرہ کیا ہے، اس تذکرہ میں موصوف نے جس طرح تاریخی تسلسل قائم فرمایا ہے اس سے ان کی فنی مہارت اور استیعاب پسند طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مومن برادری کی جماعتی روایات کے زیر عنوان ایک باب میں مصنف نے برادری کے پنچایتی نظام اور اس نظام کے مختلف عہدوں کا ذکر کیا ہے، یہ تذکرہ بھی مختلف علاقوں اور شہروں کے پنچایتی نظام کو محیط ہے، اور اس ضمن میں متعدد شخصیات اور ان کے کارناموں کا خوبصورت تعارف کرایا گیا ہے۔ اس نظام کا رشتہ مصنف نے قرون وسطیٰ میں اسلامی ممالک کے اس نوعیت کی تنظیموں سے جوڑا ہے، اس پنچایتی نظام کا پس منظر واضح کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ زمیندار طبقہ، مغربی تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر انگریزی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز ہو جاتا تھا، جبکہ برادری کے لوگ مذہبی تعلیم اور دینی تہذیب سے وابستگی کی کوشش کرتے تھے۔" اس وجہ سے پست طبقہ اور اونچے طبقات کے مابین خلیج وسیع ہوتی جا رہی تھی، اور برادری میں خودداری، خود شناسی اور عزم و ہمت کے ملکات پیدا کر دیے تھے معاشرہ میں برادری کے لوگوں کے ساتھ گوناگوں ناانصافیوں کی وجہ سے ان کے اندر ایک طبقاتی شعور پیدا ہوا تو انھوں نے اتحاد و یگانگت کی بنیاد پر برادری کی عظیم عمارت" کھڑی کر دی۔ ان کی پنچایت "حصن حصین" بن گئی اور پنچایت کے سردار سالار لشکر بن گئے، عزم و ہمت سے زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے اور برادری میں علماء

کبار، شیوخ عظام اور اہل قلم و اہل سیاست کی ایک فوج کھڑی ہو گئی۔" دیار پورب کے بعض سرداروں کی عظیم خدمات اور کارناموں کی داستانیں ہم تک پہنچی ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ برادری کی یہ ممتاز ہستیاں نہ صرف برادری کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے لئے کتنا اہم اور مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔"

مصنف نے تہذیبی تاریخ کا احاطہ بڑی وسیع النظری سے کیا ہے، مومن برادری کی مختلف حیثیتوں کا جائزہ لے کر ہر طرح کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا ہے، اس ضمن میں انکی نظر اصلاحی پہلو کی طرف بھی گئی ہے۔ مسلم معاشرہ میں جو خرابیاں تھیں ان کی نشاندہی بھی کی ہے، سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۳ مع ترجمہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> "لیکن اسکو کیا کیجئے کہ ہندوستان میں ذات برادری کی لعنت نے مسلم معاشرہ میں بھی درجہ بندی کر دی تھی۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ حاسد علماء سو نے جو "اسفل اطبقہ الحدیث" کے بڑے "ایجاد بندہ" زمرہ میں نمایاں ہیں موضوع حدیثیں گھڑ لی تھیں۔ مومن انصاری برادری کی پچھلی دو صدیوں کی تاریخ دیکھئے، ان کی جہالت نے انھیں مورد تضحیک، تحقیر بنا دیا تھا، نرغۂ شرفاء، جاگیرداروں، زمینداروں اور بالا دست حکام نے انھیں ہر میدان میں پیچھے رہنے دیا۔"

مصنف کا اصلاحی جذبہ اور بدعات و خرافات کے سلسلہ میں ان کی بصیرت و حکمت اس باب میں نمایاں ہے جس کا عنوان ہے "برادری کے رسوم و رواج اور تہوار"۔ مصنف نے اس باب میں ان تمام بدعات و رسوم کا ذکر بلا جھجک کیا ہے جو برادری کی زندگی کے مختلف حصوں میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس طرح برادری کی دینی، سماجی اور تعلیمی حالت کی واقعی تصویر سامنے آگئی ہے۔ اس باب میں گیارہویں، محرم، عرس اور ان سے متعلق بدعات کا بھی ذکر ہے اور ان کی تردید کے لئے جا بجا قرآن و حدیث کے حوالے سے صحیح تعلیم پیش کی ہے جس سے ان کی اعتقادی غیرت کا پتہ چلتا ہے۔

مصنف نے تہذیبی تاریخ کو جامع و ہمہ گیر بنانے کے لئے، برادری میں تصوف کے رجحانات و اعمال کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن اس تذکرہ میں تنقید و تجزیہ کا پہلو کم آیا ہے۔ جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ تصوف کے نام پر ایسے نظریات و اعمال امت میں فروغ پا چکے ہیں جو اسلام کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، مومن برادری میں تصوف و طریقت کا رجحان اگر کہیں سے آیا اور اشاعت پذیر ہوا تو اس کا ذکر ضروری ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ توضیح بھی ضروری ہے کہ اس مکتب فکر کی صحیح اسلام سے کیا نسبت ہے؟ مصنف نے برادری کے رسم و رواج کے ضمن میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس پر غور کرنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوگی۔

مصنف نے "بنارہ مومن کے روحانی سلسلے" کے عنوان سے معنون باب میں تصوف کے ان تمام طرق و سلاسل کا ذکر کیا ہے جو مومن برادری میں جا بجا مروج تھے۔ اس ضمن میں برادری کی اعتقادی و عملی حالت کی تصویر کشی بھی کی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا یہ حصہ "امر واقعہ کے اظہار و بیان" کی حیثیت رکھتا ہے ورنہ اسلام میں اس طرح کی بہت سی عادات و روایات کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مذکورہ باب کے اختتام پر خود مصنف نے تصوف کی راہ سے اسلام میں داخل ہونے والی خرابیوں کی جانب اشارہ کیا ہے لکھتے ہیں:

> "انحطاط تصوف کے دور میں اس کے جوہر بیک پر خود ساختہ اوراد، کلمات اوراد و وظائف کی تعلیم چڑھا دی گئی اور انھیں "دلائل الخیرات" اور "حزب اعظم" بنا دیا گیا، تصور الٰہی کی جگہ "تصور شیخ" نے لی اور یہیں سے شخصیت پرستی شروع ہو گئی۔"

تصوف کی ایک علم کی حیثیت سے تعریف کرنے کے بعد مصنف ان خرابیوں کی جانب

اشارہ کرتے ہیں جو اس میں راہ پا گئی ہیں:

"تصوف کے اس ماورائی نظریے اور سلوک و طریقت کے صبر آزما اور بیتاب تقاضوں سے بھرپور "کٹھے کوس" کے سفر پر چلنے والے بھلا ہی لوگ تھے۔ باقی "چور دروازہ" ڈھونڈھ کر صاحب منزل کی بجائے بھٹکے ہوئے راہی بن گئے، یہ تند رو لوگ تھے اور درویش فقیر، بلکہ تشرع صرفی تھے اور زیادہ تر بے شرع"

مذکورہ باب کے اختتام پر مصنف نے تصوف سے متعلق "کلمۂ حق" یوں رقم کیا ہے:

"پھر وقت کے دھارے میں اور بدعات و مشرکانہ رسوم کے گرد و غبار میں تصوف کا جوہر پاک مکدر ہو گیا، جہل و بدعت کی آمیزش نے روحانی اقدار کے صیقل کو زنگ زدہ کر دیا، پھر حقانیت کی جگہ حکایت نے لے لی، اس دھند لکے میں شریعت کا راستہ گم ہو گیا، ہاں طریقت پر بڑی چہل پہل نظر آنے لگی، خانقاہوں اور سلسلوں کی بکھری ہوئی زنجیروں میں ارباب عمائم کی دستاریں الجھنے لگیں، اور مریدین و معتقدین کے ذہنوں کو پیشہ ور پیران طریقت اور مفاد پرست سجادہ نشینوں کے جہالت آمیز عقیدے الجھانے لگے، نو مسلم پیشہ ور اور سماجی طور پر نچلے درجے کے لوگ ابھی تک اپنے آبائی عقیدہ و رسوم کے گرد و غبار کو جھٹک کر دامن دین کو مطہر نہیں بنا سکے تھے، وہی ان عقیدوں کے عنکبوتی جالوں میں پھنس کر رہ گئے۔"

"بندۂ مومن کی کرامات" کے زیر عنوان ایک باب میں مصنف نے بعض صحابہ، صحابیات اور بعد کے دور کے صلحاء و اولیاء کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق بارجہ بانی سے تھا، اس میں مختلف علاقوں کی شخصیات کا ذکر ہے۔ اس باب میں مصنف نے جن کرامتوں کا ذکر کیا ہے وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیں تو انہیں تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ میدان بجد حزم و احتیاط کا متقاضی ہے، اسی باب میں ایک مقام پر مصنف نے پیشہ کی بنیاد پر برتری و کمتری کے تصور کے سلسلے میں بڑا صائب تبصرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بعض تذکرہ نویس اس حقیقت سے صرف نظر کر لیتے ہیں کہ ایسے درویش شاہی کی طرح کے ، کتنے ہی ولی صفت، صاحب کشف و کرامات، نیکوکار اہل اللہ ہمارے درمیان سے اٹھے ہیں اور ہمارے بیچ آج بھی موجود ہیں جنکی صحیح شناخت سے تذکرہ قاصر ہے اور نظر بے بصر ہے، یہ ذہنی کجروی کا سبب ہے، اللہ تعالیٰ نے عزت و مکرمت کا انتخابی درجہ تقویٰ کو قرار دیا ہے، انسانوں کے بیچ فضیلت اور برتری کی بنیاد اخلاق فضیلت اور نیکوکاری ہے، اس مختصر سی قرآنی آیت کے کوزے میں حقیقت بیانی کے سمندر کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے مذکور کیا ہے وہ قابل غور ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات:۱۳)"

زبان و ادب مصنف کا اصل موضوع ہے، مختلف زبانوں پر ان کو دسترس حاصل ہے انھوں نے فارسی ادب پر ڈاکٹر اے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا ہے اور طویل عرصے سے تدریس و تصنیف کے میدان میں سرگرم عمل ہی نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی سرگرمی کا باعث اور رہنمائی کا سبب ہیں۔ زبان و ادب سے ان کی واقفیت اور تعبیر و تصویر پر قدرت کا ایک مظہر یہ ہے کہ تہذیبی تاریخ میں انھوں نے ایک باب میں پوربی بولی اور اس کے محاورے، ضرب الامثال اور اصطلاحات پر ماہرانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ پوربی بولی کے زیر عنوان زبان کے ارتقاء اور زبان و بولی کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ "زبان عموماً شہروں میں زبان کھولتی ہے اور

بولی دیہی ماحول میں ہو تا سیکھتی ہے۔"

پوربی لوک گیتوں پر یہ ادیبانہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے :

"پوربی لوک گیتوں میں دیہی عوام کی مسرتوں اور خوشیوں کی چاشنی اور غم و اندوہ کا تیزاب گھلا ہوا ہے، ان میں انسانی رشتوں کی سچائی کی آواز سنائی دیتی ہے اور انسانی جذبات کی دھڑکنیں گونجتی رہتی ہیں، ان میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے اور آدھے ادھورے گاؤں کے ماحول کی ٹوٹی پھوٹی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔"

تمدن کی ترقی سے زندگی کا جو نقشہ بدلا اور پرانی روایات کی جگہ جس طرح نئے انداز و اطوار آئے اس کا خوبصورت تذکرہ یوں کیا ہے :

"پوربی کے لوک گیتوں کے سُر جو خوشیوں کے سرگم سے پھوٹ کر ابھرتے تھے اب آدھے ادھورے گاؤں کی چیزوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں، ہندوستان پہلے دیہاتوں میں بستا تھا، اب شہروں میں اجڑ رہا ہے جہاں پوربی فلمی گیتوں کے ساتھ بندوقیں چلنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اگر ملک کی ایسی خرابی ہوتی رہی تو شاعری کا دم گھٹ جائے گا، پوربی کویتا کی سانس اکھڑ جائے گی اور شاید صرف مرثیہ اور نوحہ لکھنے والے رہ جائیں گے۔"

مومن برادری کی تہذیبی تاریخ بلاشبہ دنیا کی عام تمدنی تاریخ کا ایک حصہ ہے، مصنف نے اس تاریخ کو اپنے مخصوص ادبی رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ تاریخ پر ان کی گرفت اور زبان و بیان پر قدرت دونوں خوبیاں نمایاں ہو گئی ہیں۔ احوال مذکورہ سے مصنف کی واقفیت چوتھے باب میں نمایاں ہے جو ہندوستان کی پارچہ بافی کے لئے مخصوص ہے۔ اس میں موریہ عہد سے مغلیہ عہد تک اس صنعت کے ہندوستان میں وجود کی نشاندہی کی ہے۔ پارچہ بافی کی صنعت یمن سے مدینہ اور وہاں سے ہندوستان کیسے پہنچی؟ اس پر بھی مصنف نے روشنی ڈالی ہے اور اس تذکرہ میں بعض تاریخی غلطیوں کی اصلاح کرتے ہوئے مختلف صوبوں میں انصاری برادری کی تعلیمی و اقتصادی حالت پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اور اس برادری کے نامور افراد نے جنگ آزادی میں جس طرح حصہ لیا اس کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

دلکش ادبی تعبیر بھی کتاب میں مختلف مقامات پر نمایاں ہے۔ عباسی دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"عہد عباسیہ کے دورِ عروج میں تہذیب و ثقافت اسلامیہ نے تنعم و تعیش کے ایسے اسباب و لوازمات مہیا کر دیئے تھے کہ اس وسیع سلطنت کا ہر نظارہ "فردوس نظر" اور "جنت نگاہ" بن گیا تھا۔ امراء کی ہر محفل ساقی کے جلوہ اور مطرب کے نغمہ زن سے فردوس گوش بن گئی تھی۔ وقت کے شبستان حرم میں تاریخ کی شہرزاد الف لیلوی شہروں کی ہوشربا داستانیں سنا رہی تھی۔ اور حسین شہزادیاں اور شب زادیاں زرق برق ملبوسات میں بڑا طمطراق دکھلاتی تھیں۔"

ادبی تعبیر کے درج ذیل نمونے ملاحظہ فرمائیے تاکہ زبان و بیان پر مصنف کی قدرت کا اندازہ ہو سکے :

"نوربافی عارف نہیں شاعر تو ضرور ہوتا ہے جو ریشم کی ملائمت میں اور حریر و پرنیاں کی نفاست میں اپنی نفاست طبع کی تسکین کی خاطر اس شاعری کی تلاش کرتا ہے جس کا سر رشتہ خدا سے ملا ہوا ہے، اس کی زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ تانے بانے کے ٹوٹ جانے تک خدا سے اس کا رشتہ قائم رہے اور وہ کھا چبا کر صلۂ رحمی کرتا رہے۔"

مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے تسلط کا بڑا سبب یہ تھا کہ امت مسلمہ توحید و

سنت کے اصولوں سے منحرف ہو کر مختلف قسم کی اعتقادی و عملی گمراہی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ مصنف نے اس حقیقت کی طرف ادبی انداز میں اشارہ کیا ہے۔

"دل ... نے رقص و سرود کی محفلوں اور حریم ناز و نیاز کی بزم آرائیوں میں پناہ گاہیں ڈھونڈھ لیں اور ذوق نظر کی تسکین کے سامان پیدا کر دئے۔ مسجدیں مرثیہ خواں بن گئیں اور مدرسے بے چراغ ہو گئے، جہاد کی جگہ مجروں نے اور حقائق کی جگہ حکایت نے لے لی، ملک و ملت کے مفاد سے زیادہ مصلحت اور سیاست عزیز تھی، جب شکستہ حال رسمی خانقاہوں سے "یا حق" کے نعروں کی بجائے "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کی آوازیں اور درگاہوں سے "امدد حضرت شاہ ....." کی پکاریں آنے لگیں اور اذان کی آواز دبا دی جائیں اور جب امام بے حضور بن جائے اور نماز بے سرور اور دل سوز سے خالی اور فضا ساز و مطرب کے نغموں سے بوجھل بن جائے تو اسلام کی روح تڑپنے لگتی ہے۔ یہ دنیا سے محبت اور موت سے خوف کا زمانہ ہوتا ہے اور ایسے زمانے میں صدیوں تک سنّاٹا چھا جاتا ہے۔"

دلکش ادبی تعبیر کا یہ نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ بھیڑی کے ایک سردار کی زندگی کا حاصل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عبدالرحمٰن سردار نے برادری کی تاریخ کے کئی دور دیکھے تھے۔ ان کی کتاب حیات میں جنگ اور فسادات کی سرخیاں بھی تھیں، ہجرت کے دور ابتلا کی جاں سوز حکایتیں بھی ثبت ہیں۔ برادری کے اور بار و نکیت کا دھندلا دھندلا نقشہ، دیو رہی محفوظ ہے اور پھر آخر عمر میں انھوں نے برادری کے عروج کا وہ زمانہ دیکھا جب وسعت قلب اور رواداری کے تلنے بنے ٹوٹنے لگے تھے، باہمی محبت، قرابت داری و رشتہ داری کے تعلقات پر ذاتی مفاد اور رٹ کھسوٹ اور حق تلفی کی تیغیاں چلنے لگی تھیں اور گرگے کا کاروبار و رسم کے چلنے آہنی ترازو (دساوں) کی سطح پر دوڑتے دوڑتے کبھی کبھار کسی حقدار کے سینے میں گھس جاتا تھا، کپڑوں پر چھاپا پڑنے کے ساتھ ساتھ دوں پر بھی حسد، رقابت اور عداوت کی چھاپ پڑنے لگی تھی۔"

"عبدالرحمٰن سردار ناخواندہ تھے لیکن ان کی تحریریں اور مستقبل کے رخ پر لکھی ہوئی دھندلی عبارتیں پڑھ لیتے تھے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہو چکا تھا کہ برادری کی خوشحالی اس بے دینی نعمتوں کا تعاقب کرا رہی ہے ورنہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی قوم آخرت کو پیچھے چھوڑتی جا رہی ہے۔ کرنسی نوٹوں کی رنگین پتنگیں لوٹنے والوں کے ہاتھوں سے آخرت کی ڈور چھوٹتی جا رہی ہے ـــــ"

تصنیف معلومات کی وسعت، استدلال کی قوت اور زبان و اسلوب کی دلکشی و تاثیر کے اعتبار سے بھی گراں قدر ہے۔

مصنف نے اپنی بالغ نظری، دیدہ وری، وقت رسی اور شگفتگی تحریر سے کتاب کو عہد ساز بنا دیا ہے۔ علم و تحقیق کی دنیا میں کسی تخلیق کو "حرف آخر" کہنا مشکل ہے۔ لیکن انصاری برادری کی تاریخ پر اب تک جو کام ہوئے ہیں ان کے درمیان یہ کتاب بے نظیر ہے۔ مصنف نے اپنی فکری کاوش اور جگر کاوی سے موجودہ و آئندہ نسلوں کے لئے ایسی دستاویز پیش کر دی ہے جس میں برادری کی متنوع خدمات کا اعتراف بھی ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں اور فکری توانائیوں کے لئے پیغام

بیداری بھی۔ مصنف کا یہ شاہکار قدر شناسوں کے لئے ایسا تحفہ ہے جو ان سے خراج تحسین حاصل کرتا رہے گا۔

قوی امید ہے کہ اہل علم و تحقیق اور خصوصاً برادری کے باشعور افراد اس تحقیقی شاہکار، علمی خدمت اور منفرد تذکرہ کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

حافظ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

وکیل الجامعہ (ریکٹر)
الجامعۃ السلفیہ
(مرکزی دارالعلوم)
بنارس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترے نام سے ابتدا کر رہا ہوں!

پینتیس سال پرانی بات ہے، میں مالیگاؤں ہائی اسکول کے سالانہ جلسہ (منعقدہ ۲ر جنوری ۱۹۵۹ء) میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک تھا۔ شہر کے اربابِ علم اور اہلِ علم و نظر کی ایک درخشاں کہکشاں جلسہ گاہ کو زینت بخش رہی تھی، اس کے واسطۂ عقدِ نجوم، بانیِ معہد ملت مولانا عبد الحمید نعمانی صاحب تھے، تعارف ـــ غائبانہ تھا، استغفر محبت بجید شفقانہ، میں بڑا متاثر اور مرعوب ہوا، دوسرے دن بھیونڈی کے مہمانوں کے اعزاز میں معہد ملت میں مولانا مرحوم نے انجمن ترقی اردو، جس کے وہ اس وقت صدر تھے، کے زیرِ اہتمام ایک عصرانہ دیا، انہوں نے مختصر سی تعارفی تقریر میں صنعت پارچہ بافی کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اسی سے متعلق مومن۔ انصاری بُنکر برادری کے معاشی مسائل اور معاشرتی زندگی کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کیا اور برادری کی تاریخ کی تصنیف کا ذکر کیا جو وقت کی ایک اہم ضرورت تھی ـــ یارانِ نکتہ داں کے لیے یہ صلائے عام تھی۔

میں تازہ واردِ انگلستان تھا اور حاضرینِ جلسہ میں سے کچھ ادب نواز دوستوں کے لیے "نو بہارِ ناز" ـــ اور نگاہیں تکنے لگیں تو اس بزم میں حیا کے بغیر کوئی بات نہیں بنی اور حق بیٹھ بہ گرچہ اشارے ہوا کیے، اتنا اثر ضرور ہوا کہ میرے تخیل کی چرخیاں تاریخ کے منصوبے کا تانا بانا بننے لگیں۔ مگر بیکسی، بے تمن کا اس دورِ جاہلیہ میں نہ میرے پاس دنیاوی سرمایہ تھا ورنہ دین کی پھوٹی کوڑی، جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ دریا برد ـــ رُودبارِ انگلستان کر آیا تھا۔

ملازمت تو فوراً مل گئی، سکونت بھی مل گئی مگر قلبی سکینت نہ ملی جھیلوں کے شہر بھوپال میں تاج جہاں سفینۂ روزگار پہلے ہیں لنگر انداز ہوا ایک سال گزار دیا عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا لیکن بار بزمی لطف نے ٹھہرنے نہ دیا اور نہ حالات کی زہرناکی نے جینے دیا، بلکہ سہ

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

چالاک تو خیر ہوئے ہیں ہلاک ہوتے ہوتے بچ گئے ـــ علم و دانش کی آماجگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی راس نہ آئی، جہاں ادارۂ علوم اسلامیہ میں مجھ سفر نصیب کو چند

جسے پناہ ملی، اس علمی ادارے کا ظاہری رنگ و روپ اسلامی تھا مگر اس زمانے میں اس
کے قالب پر اشتراکیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور میں تو برسوں سے اس قالب میں ڈھل چکا تھا، مگر
یہاں کی علمی فضا اور ادبی ماحول میں میری تحقیقی خداداد صلاحیتوں کے نونہال میں کچھ انکھوے
پھوٹے، میں ہمیشہ سے تخیل پرست ہوں، مجھے بچپن سے یادوں کے ٹوٹے ہوئے کھلونوں
کو جوڑنے کا شوق رہا ہے اور ماضی کے ویرانے میں بھٹکنے کا جنون سا رہا ہے، تاریخ کے
سناٹے میں عجیب عجیب آوازیں سنتا ہوں تو میری نوکِ قلم کی سوئی انہیں لفظوں میں ٹانکنے
لگتی ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کا نادر کتب خانہ میرے لیے ماضی کا شاندار خزانہ تھا میں نے منگولوں
کے مورخ عطا ملک جوینی کی بیش بہا تصنیف [illegible] کا نادر و نایاب نسخہ ڈھونڈھا،
اُسے ایڈٹ کیا اور تقریظ لکھی، انگریزی اور اردو میں کئی تحقیقی مقالے شائع کیے۔ لیکن گو
قلم کا سفر جاری رہا، میں خود ہی اپنی مجرد زندگی سے تھک گیا تھا، کسی کی زلف کے سائے میں کب
تک یہ مجرد زندگی گزارتا۔ ایک شام گھر آ گئی اور گھر بسایا تاکہ اپنے زاویے میں رہ کر یکسوئی سے
کچھ کام کر سکوں۔

اسی دوران میں یو جی سی کی فیلوشپ ملی تو پٹنہ یونیورسٹی سے میرا تعلق ہو گیا۔ فارسی دستاویزات اور
تاریخی اسناد کی مرموز عبارتوں کا مطالعہ میرا محبوب مشغلہ تھا، پیشوا دفتر میں پڑے ردی کے ڈھیر
سارے کاغذات نظر سے گزرے میں نے انہیں نظر انداز نہیں کیا بلکہ ان کی نقلیں محفوظ رکھیں
ایک مرتبہ اور غالباً پہلی مرتبہ پھر میرے شعور کی کارگاہ میں برادری کی تاریخ کی تصنیف کا [illegible]
اپنا تانا بانا پھیلانے لگا، میں نے مالیگاؤں مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب کو اس بارے میں لکھا
انہوں نے ازراہِ نوازش جو جواب دیا اس خط کا عکس تبرکاً شاملِ فہرست ہے۔ خط مورخہ ۹ جون ۱۹۶۶ء
میں اس وقت بمبئی یونیورسٹی کے نئے شعبۂ فارسی کا پہلا استاد مقرر ہو چکا تھا درس و تدریس
کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور میری علمی اور تحقیقی مصروفیات نے بھی میری تھوڑی بہت [illegible]
استعداد کو زندہ رکھا اور میرے قلم کو روشنائی کا تازہ خون ملتا رہا اور میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہا۔

فارسی دستاویزات اور تاریخی اسناد کی روشنی میں جنجیرہ کی ماضی کے ٹوٹے ہوئے نگینوں
کو جوڑ کر اپنے وطن کی تاریخ مرتب کی، تاریخ کوکن تصنیف کر کے کوکن کے پہلے مورخ ہونے
کا شرف حاصل کیا، اردو، فارسی اور انگریزی میں مقالات شائع ہوئے، کولمبیا یونیورسٹی کے
انسائیکلوپیڈیا ایرانیکا، کراچی کے انگریزی رسالے دانش گاہ تہران کے فارسی جرنل، دہلی،

لکھنؤ وغیرہ کے اردو جرائد میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہا، افسانہ بھی لکھا اور شاعری بھی کی —— ایران سوسائٹی کلکتہ نے ۱۹۷۱ء میں میری انگریزی کتاب جس کا موضوع فارسی انشاء اور عہدِ مغلیہ میں دار الانشاء ہے بڑے شاندار طریقے پر شائع کیا — انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈی شملہ میں ہمالیہ کی برف پوش وادی میں دو سال رہکر وسطی ایشیاء کے تیموری عہد کی تاریخ کو کھنگالتا رہا — بس یونہی زندگی کی اکائیاں اور دہائیاں گذرتی رہیں —— !!!

عمر کی جو مدت واہب العطایا نے انسان کو دی ہے وہ برف کی طرح تیزی سے گھلتی جاری ہے۔ میں نے جب اپنے سرمایۂ حیات اور زادِ راہ عمل کا حساب کتاب کیا تو اندازہ ہوا میں سراسر خسران میں ہوں گھڑی کی سوئی سینے میں چبھنے لگی، وقت جو سرمایۂ حیات ہے اس کی اہمیت کا علم مجھے سورۃ العصر کی تفسیر سے ہوا۔ ایک روز جو گذر گیا وہ عمر کا بقایا تھا آنے والا دن نعمت اور عطیہ ہے۔ جب میں نے اپنا محاسبہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ پچھلی پانچ دہائیوں کی مدت میں میرا آئندۂ عمر دنیا کے تعاقب میں آخرت سے کالے کوسوں دور جا پڑا ہے — خشیتِ الٰہی سے میری روح پر کپکپی طاری ہو گئی اور مجھے اُسی دن یہ حدیثِ نبوی یاد آگئی:

"اِرْتَحَلَتِ الدُّنْیَا مُدْبِرَۃً وَّارْتَحَلَتِ الْاٰخِرَۃُ مُقْبِلَۃً وَّ لِکُلٍّ
مِّنْھُمَا بَنُوْنَ فَکُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدَّارِ الْمُقْبِلَۃِ وَلَا تَکُوْنُوْا
مِنْ اَبْنَاءِ الدَّارِ الْمُدْبِرَۃِ فَاِنَّ الْیَوْمَ عَمَلٌ وَّلَا حِسَابَ وَ
غَدًا حِسَابٌ وَّلَا عَمَلَ"

دنیا پیچھے کو جا رہی ہے اور آخرت آگے بڑھ رہی ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے طلبگار ہیں۔ تو تم آخرت والی زندگی کے طلبگار اور اس کے پرستار بنو۔ جو دنیا پیچھے کو جا رہی ہے اس کے پرستار نہ بنو۔ آج عمل کا موقع ہے حساب نہیں ہو رہا ہے۔ کل حساب ہوگا اور عمل کا موقع نہ ہوگا۔"

مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ، اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے دین کا تفقہ عطا کرتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ میرا رب میری بھلائی کا خواہشمند ہے کہ میرا شرح صدر ہوا اور میں صبح کا بھولا شام گھر لوٹ آیا اور اب شام سر پر آن کھڑی ہے اور قضا کا نقیب کسی وقت بھی پکار اُٹھیگا۔ جرس فریاد می دارد کہ بر بندید محملہا — اٹھو محمل بڑھاؤ — سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ!

۱۰ مارچ ۱۹۸۹ء کو یونیورسٹی کی ملازمت سے عزت و توقیر کے ساتھ سبکدوش ہوا اور فوراً ہی انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی کی سینیئر فیلوشپ مل گئی، ۴ ستمبر ۱۹۹۲ء کو "عہد وسطیٰ کے کوکن کا مسلم معاشرہ (انگریزی) کتاب مکمل کی اسی دوران ۱۵ اگست ۱۹۹۱ء کو صدر جمہوریہ ہند کی توصیفی سند اور انعام سے نوازا گیا، اسی کے تعلق سے بیسویں نیورس ایجوکیشن سوسائٹی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۹۱ء کو ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا تھا جس میں میں نے اعلان کیا کہ میں مومن انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں — اور اس ارادے کو استحکام پہنچا میرے عزیز ترین — رشتے کے بھانجے محمد حسن مومن لالہ سیٹھ سے جنہوں نے برسوں پہلے یہ تجویز رکھی تھی۔ اس کتاب کی تصنیف کے اصلی محرک لالہ سیٹھ ہیں۔ میرے محترم دوست ڈاکٹر عبدالمنان انصاری میری حقیر تصنیف "تاریخ کوکن" پڑھ کر مسلسل اصرار کرتے رہے کہ میں برادری کی تاریخ اسی نہج پر مرتب کروں۔ ان کے مزید عزیزی حسن بھی مصر تھے۔ چنانچہ میں نے ۵ ستمبر کو جب مرے خامہ بسم اللہ کہہ کر قلم اٹھایا، اپنی علمی کم مائیگی اور تحقیقی بے بضاعتی کا احساس ضرور ہے اور جب میں نے تاریخ کا خاکہ بنایا تو سب سے بڑی تحقیق میں صرف چند رسالے تھے پھر غیب سے مضامین خیال میں آنے لگے اور غیب سے ہونے ہونے سے کتابیں آنے لگیں پھر ہر روز نئے سرچشمے بن گیا، رشتہ داروں کی کتابیں ملنے لگیں اور میں تاریخ کے صحرائی سناٹے میں عجیب عجیب گوشوں سے گزرتے گزرتے تخیل کے خم پر سوار ہو کر گم ہو گیا ایک سال دو مہینے اور بیس دنوں تک گم رہا۔

کسی بھی قوم کا شاندار تہذیبی و ثقافتی سرمایہ اس کی تاریخ ہوتی ہے اور تاریخ اس قوم کا لبادہ بن جاتی ہے اور اسے اس کے ماضی سے جوڑتی ہے اور آشنا کرتی ہے۔ اس کے مخصوص کردار کے تشخص کو واضح کرتی ہے اور اس کے مستقبل کے ارتقا کے خطوط بناتا۔ اگر دوسری قوموں کے درمیان شناخت و تعین کرنی قوم مٹ جاتی ہے دنیا سے ختم ہو جاتی ہے مگر اس کے آثار صفحۂ ہستی پر یادگار بن کر اس قوم کی عظمت کا تذکرہ رہتی ہے اس قوم کی لکھی ہوئی تاریخ ہے کہ اوراق در صفحوں میں محفوظ رہتی ہے اس قوم کی عظمت و مقام رہتی ہے، ایسی قوم زندہ اور تقلیدوں پر تا دیر زندہ رہتی ہے، وہ کیسی بدنصیب اور بد مذاق قوم ہے جسے اپنی صحیح شناخت بھی نہیں کرا سکتی اور نہ اسلاف کے کارناموں کو جاننا چاہتی ہے۔ جس قوم کے پاس اپنی کوئی تاریخ نہیں، وہ کوئی بے روح قوم کی سرگزشت ہوگی۔

قلمکاروں میں سب سے زیادہ مشکل اور محتاط مورخ ہوتا ہے، دیانتداری اور صداقت کے قلم سے، واقعات کی روشنی میں اور حقائق کی روشنائی سے وہ غیر جانبدارانہ رویّہ —

اور اسلوب سے تاریخ لکھتا ہے، اس حق کی ادائیگی میں وہ دیدہ و دانستہ خیانت کی نہ قینچی چلاتا ہے، نہ خوشامد کا رنگ و روغن چڑھاتا ہے اور نہ عصبیت اور حسد کے غبار سے اپنے قلم کو آلودہ کرتا ہے، اسے چاہیے کہ نہ غرور بالعلم والعقل سے نیچے لوگوں کو دیکھے اور نہ سر اٹھا کر تفاخر بالقلم سے لکھے اور اگر وہ زعم میں آکر "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا نعرہ لگائے تو سمجھ لیجیے وہ زعم باطل کا ناآموزہ مریض ہے۔ وہ آواز بھی کوئی آواز ہے جو تنہا گونجے۔

علم تو ایک بحر بیکراں ہے نہ اس کی وسعت معلوم اور نہ گہرائی کا اندازہ ہے، کسی نے اس بحر ناپیدا کنار پہ آکر ایک قطرہ پیا اور کسی کے کام و دہن کو ایک چھوٹے سے لذت ملی، کوئی ایک گھونٹ سے فیضیاب ہوا اور کسی کو ایک جرعہ نصیب ہوا، جس نے تشنگی کی شکایت کی وہ اصلی طالب علم ہے اور جس نے سیراب ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ صحیح معنوں میں کم ظرف ہے، سچا عالم وہ ہے جو اپنے علم پر فخر نہ کرے بلکہ دوسروں کے علم کی قدر کرے اور عالم کی تعظیم و تکریم کرے، ہمارے اکابر علم اور ارباب قلم نے تنقید و تبصرہ کے کچھ قاعدے مرتب و مقرر کئے ہیں اور کچھ آداب بتلائے ہیں، سیکھنے کا بھی ایک ڈھنگ ہوتا ہے اور بات کہنے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی محبت اور تعظیم میں بن سنت ہونے کی سب سے بڑی اور پہلی پہچان ہے۔"

— میں یہ ڈھنگ اور یہ طریقہ جانتا ہوں یا نہیں؟ اتنا ضرور ہے کہ میں نے اس حق کی ادائیگی میں پاس ادب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے، کسی کے خلاف دیدہ و دانستہ ایک ٹوٹا ہوا جملہ بھی نہیں لکھا، نہ تو کسی کے عقائد سے بحث کی ہے، رسوم و بدعات کے بارے میں امر واقعہ بیان کر دیا، اپنا نقطہ نظر پیش کر دیا اور اپنے عقیدت کا اظہار کر دیا۔ مگر مقصود یا نہیں۔ میری دیانتداری، خلوص و محنت کو دیکھتے ہوئے اگر مجھ سے تقصیر، تسامح اور سہو و غلطی ہو گئی بھی ہو تو امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے اور کسی قسم کے نقد و تنقیص سے میری دل آزاری نہ کریں گے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ میری غلطیاں عمل بتا دیں تو وہ زیادہ مہذب طریقہ ہوگا، تو مجھے بھول گیا ہو تو بتلا دوں۔

کرنا ہے جسے دست ہو دل سازی میں — شیشہ ٹوٹے تو کرے لاکھ ہنر سے پیوند

مومن کی یہ شان ہے کہ عیب جوئی کی بجائے دلجوئی کرے۔

— یہ میری حقیر تصنیف حرف آخر نہ سہی حرف اول ضرور ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے اسلاف کی تاریخ ہے بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک دور کی تاریخ ہے، جنگ آزادی، ہندو مسلم یکجہتی اور قربانی و ایثار کی تاریخی دستاویز ہے، یہ کتاب مومن۔ انصاری برادری کی شاندار

تہذیبی میراث کی نشاندہی کرتی ہے اور حال کو ماضی سے جوڑتی ہے اور برادری کے مستقبل اور آنے والی نسلوں کے ارتقاء کے خطوط کی طرف رہنمائی کرتی ہے اسی لیے اس کتاب کی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے کہ یہ تاریخ بھی ہے اور تذکرہ بھی، اس میں اسلام کی علمی و فکری اور عملی ثقافتوں کو بیان کیا گیا ہے میں اس کتاب کے فقط چند لفظوں کا مصنف ہوں باقی لفظوں کا مورخ نے نوکِ قلم سے واقعات کو گزرے عہد سے ماضی کو پرو دیے اور حال کو تابناک کیا ہے۔ میری اس کاوش اور جگر کاری میں، میرا ساتھ دینے والے اور ہاتھ بٹانے والے بہت سارے دوسرے ماہر دستکار بھی ہیں، جن کی مدد اور اعانت سے برادری کا یہ عہد نفیست اور پیراہن حیات تیار ہوا ہے یہ وہ رنگ ہیں جنہوں نے مجھے کتابیں مہیا کیں اپنے شہر اور اپنے لوگوں کے بارے میں معلومات مہیا کیں، ملاقاتیں کیں، اور صراحت سے مجھے مستفید کیا۔

میں سب سے پہلے الہ آباد کے مشہور خاندان قمر الدین بدر الدین یونس کے بزرگ صمدت الدین نوجوان کیمیکل ورکس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے رشتے کے بہنوئی، میرے ماموں محمد یسین انصاری کے داماد وسیم انصاری کی نوازش پر چند مفید کتابیں ارسال کیں، میری تصنیف کے بنیادی مصادر یہی کتابیں ہیں۔

مئو کے میرے دوست محمد ایوب انصاری، پرانڈیا کیمرن کیشن سروس نے ڈھیر ساری کتابیں مہیا کیں، نوٹس تیار کیے، ملاقاتیں کیں اور ناگپور کانٹی کی برادری کے بارے میں بڑی مفید معلومات مہیا کر کے مجھے مستفید فرمایا، میں ان کا شکر گزار ہوں۔

انہیں کے ہم نام میرے عزیز محمد ایوب محمد حنیف انصاری، بابو بھائی برادرت دمحیوی نے برہانپور کے بارے میں ایک پورا باب لکھنے میں میری مدد کی ان کے عزیز دوست شفیق انصاری صاحب بھی نوٹس تیار کرنے میں محمد ایوب انصاری کے ساتھ تعاون کیا محمد ایوب نے بڑی دوڑ دھوپ کی، کتابیں لا کر دیں، متعلق بنیادی معلومات فراہم کیں۔
میرے عزیز دوست اور سابق رفیق کار پروفیسر احمد انصاری نے دھولیہ اور اپنے وطن شہادہ کی برادری اور شرف کرم کے بارے میں تحقیق کر کے میری معلومات میں اضافہ کیا، میں ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں۔

میرے عزیز دوست اور دیرینہ ہمدم اور ہمدرد ساتھی محبوب خان صاحب پچھلے دس برسوں سے میرا سایہ بن گئے ہیں، میرے سارے ذاتی کام اور دفتری امور انہیں کی مدد اور وسیلے سے انجام پاتے ہیں، اس کتاب کی تصنیف کے دوران اور اس کی تکمیل طباعت تک خانصاحب برابر میرے کام آتے رہے اور بڑے خلوص و محبت سے کام لیتے رہے۔

جزاکم اللہ خیراً احسن الجزاء۔ ان کی بیگم میری اسٹوڈنٹ ڈاکٹر مہر النساء خان کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مختلف لائبریریوں سے کتابیں لا کر دیں۔

بمبئی کے دردمندانِ قوم میں سے الحاج عبدالغنی اطلس والا صاحب کا ذکر خاص طور پر کر رہا ہوں جنہوں نے ایک عرصہ تک اپنی دو اہم اور نادر مملوکہ کتابیں مستعار دے رکھی تھیں میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں، بمبئی کے شعرائے کرام کے بارے میں محترم انجم انصاری صاحب نے بڑی مفید معلومات فراہم کی ہیں ان کا میں شکرگذار ہوں۔

مالیگاؤں کے احباب، اربابِ ذوق، متمول اور مخیر حضرات نے اپنے تعاون، مالی اعانت مفید مشوروں اور معلومات سے مجھ کو مستفید کر کے مجھے زیرِ بارِ احسان کر دیا ہے، ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی اور یٰسین درگاہی صاحبان ابتدا ہی سے اس کتاب میں عملاً دلچسپی لے رہے ہیں، ہماری ملاقاتیں بھی بے حد مفید ثابت ہوئیں، ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی صاحب اس وقت مالیگاؤں کی ادبی و علمی سرگرمیوں کے محور ہیں اور تمام سلسلوں کے قطب، کچھ رشتہ داری کے سبب تعلق خاطر ہے اور کچھ فطری مناسبت اور جذبۂ خدمت ہے کہ انہوں نے بڑی اعلیٰ سطح پر آ کر اس کتاب کی طباعت و نشر و اشاعت میں تعاون کیا ہے وہ ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی صاحب کا بے نظیر کارنامہ ہے۔ ان کے دوست شبیر احمد ہاشمی صاحب نے جس خلوص و محبت کا ثبوت دیا ہے میرا شعور تشکر و امتنان نعم البدل اور اجر نہیں ہو سکتا۔ مشہور شاعر امین صدیقی اور مشہور خطاط اور تزئین کار احمد حنیف صاحبان نے جو سعادت مندی دکھلائی ہے وہ میری عقیدت مندی [illegible]۔ ان صاحبان کے علاوہ محمد اسحاق خضر پرنسپل تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں، ماسٹر عبدالرحیم اور دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں کے تمام مخیر تجار، اربابِ علم اور خداوندانِ کتب و مدارس کا شکرگذار ہوں جنہوں نے ہر ایک مرحلۂ عمل میں جو کہ میرے ساتھ تعاون کیا اور میری مدد کی۔ اور مجھے ایسا محسوس کرایا کہ منزل قریب ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں۔ اللہ میاں بھی فرماتا ہے۔ اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (رعد: ۴۱)

(... ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں)

جب مجھے اپنے وطن بھیونڈی کے بزرگوں، دوستوں اور احباب کی نوازشات اور احسانات کا خیال آتا ہے تو میرا سر "زیرِ بارِ منت" سے بوجھل اور عقیدت و محبت میں سرنگوں ہو جاتا

ہے۔ کس کس کا اور کس کس بات کا شکریہ ادا کروں، میرے شکریے کی مستحق تو ساری مومن برادری ہے جس کی مالی اعانت سے یہ تاریخی دستاویز۔ تاریخ ساز بن گئی ہے، فنڈ کی فراہمی میں میرے کرم فرما محمد ابراہیم صاحب انصاری (بی کام) نے جو پہل کی اور جانفشانی دکھلائی وہ ان کا حصہ ہے، میری کتاب کی تصنیف سے وہ برابر دلچسپی لیتے رہے ہیں مگر محمد ابراہیم انصاری صاحب کا خلوص جس شرعت سے دوڑتا ہے ان کے مخلص ساتھی بھی ان کا ساتھ نہیں دے سکتے اور وہ اکیلے رہ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مگر ان کا جذبہ ضرور رہتا ہے، فنڈ کی فراہمی میں اجرا کمیٹی کے چیئرمین عزیزی محمد حسن مومن لالہ سیٹھ، میرے عزیز دوست یوسف حسن مومن (سکریٹری)، ڈاکٹر عبدالمنان انصاری اور عزیزان مکرم الحاج محمد حسن بشیر بھوپال اور الحاج شریف حسن رمضان کی مساعی جمیلہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ میں ان تمام حضرات کا ممنون و مشکور ہوں۔

اس کتاب سے دلچسپی لینے اور ہمت افزائی کرنے والوں میں استاذِ گرامی حاجی شبیر احمد انصاری راہی صاحب کا ذکر خاص ہے انہوں نے حق استادی ادا کیا، ایڈوکیٹ یٰسین مومن محمد رفیع انصاری، عبدالجلیل انصاری (دیسج وتسم)، ڈاکٹر محمد ریحان انصاری (تزئین کار) اور مقصود احمد انصاری (آرٹسٹ) نے اس کی کتابت، طباعت، تزئین اور اشاعت میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اور حتی القدور میرے ساتھ تعاون کیا، میں ان لوگوں کا بیحد مشکور ہوں، یوسف حسن مومن چیئرمین ویلفیئر سوسائٹی اور نبس عامہ نے شروع ہی سے اس کتاب کی تصنیف میں بڑا عملی حصہ لیا ہے اور میری قدردانی کا ثبوت بھی دیا اور جن پُرخلوص الفاظ میں اس حقیر تصنیف کا تعارف پیش کیا ہے اور عکاسی کی ہے وہ ان کے احساسات کی آئینہ دار ہے۔

> "یہ کتاب فن پارچہ بافی اور ملک کے ایک بہت بڑے طبقے مومن انصاری برادری کی تہذیبی
> تاریخ کی آئینہ دار ہوگی۔ اس نوعیت کی تاریخی اور تہذیبی کتاب برصغیر میں آج تک منظرِ عام
> پر نہیں آئی۔ ڈاکٹر صاحب ہم سب میں ہیں اور ہماری ہی برادری کے ہیں۔ اب
> ان کے ذریعہ کیا کہوں، بہ ترتیب اور تکمیل سے لگا۔۔۔ فخر ہے۔"

اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں یہ پُرخلوص جذبہ ہمیشہ اُن کے دلوں میں موجود رہے (آمین)

اس اظہار تشکر کے مقطع میں برعکس گسترانہ بات آ گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس کبھی جنت غزل کا مطلع بھی ہے۔ بھیونڈی کے تعلق سے اس کتاب میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے، اس میں

خودنوشت سوانحعمری کی جھلکیاں بھی عبارتوں کے جھروکے سے نظر آجاتی ہیں، اس کا پہلا حصہ
جو بھیونڈی۔ اسلام آباد کے اسلاف کے تذکرے پر مبنی ہے۔ میری تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔
اور دوسرا حصہ جو حال کا تذکرہ ہے اس کے لئے میں اپنے دو جدید مخلص اور پیارے عزیزان
گرامی بلال احمد مومن (ہیڈ ماسٹر صمدیہ ہائی اسکول بھیونڈی) اور ان کے دوست اور رفیق کار
عبدالملک مومن کا ممنون ہوں۔ بھیونڈی کی شخصیات کے خاکے ان کے بنائے ہوئے ہیں
خطوط کی وضاحت، تزئین اور رنگ آمیزی میرے قلم کی رہین منت ہیں۔ ان دونوں کی سعادت
مندی، محبت اور تعاون میرے لئے یادگار تجربات ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں قرانِ السعدین
کو ہمیشہ تابندہ اور کامیابیوں سے ہمکنار رکھے۔ (آمین)

ڈاکٹر حامد اشرف ندوی صاحب میرے دیرینہ دوست، مشفق اور رفیق کار کے احسانات
کا شمار نہیں جنہوں نے مسودے کا ایک معتد بہ حصہ پڑھا، تصحیح فرمائی، اور تعارف بھی لکھا
ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (وکیل الجامعہ) الجامعۃ السلفیہ بنارس کا بھی میں شکرگذار ہوں جنہوں
نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔

ممکن ہے کہ مؤلف کے بعض خیالات و آراء سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اہل علم وبصیرت
کو کتاب میں بہت کچھ خامیاں بھی نظر آسکتی ہیں لیکن اولاً تو بوجوہ بشری تقصیر و لغزش سے
کسی کتاب کو مبرا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، ثانیاً یہ کہ نہ مؤلف کے جذبۂ خیر اور
خلوص نیت اور کتاب کی اہمیت اور افادیت سے انکار ممکن ہے۔ ہاں میرا اظہار اعتذار
ممکن ہے اور آپ کا عفو و درگذر کرنا ممکن ہے۔

آخر میں بزرگوں سے التماس ہے کہ میرے حق میں دعائے خیر و مغفرت کریں اور یہ کہ
میری یہ حقیر تصنیف میری آخرت کے لئے وسیلۂ نجات اور صدقۂ جاریہ بن جائے (آمین)

واللہ تعالیٰ الموافق

۲۴ نومبر ۱۹۹۳ء
سات بنگلہ ورسوا۔ اندھیری بمبئی ۴۰۰۰۶۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حامداً و مصلیاً

پہلا باب

تمہید

نکلنا خُلد سے آدم کا ....

"اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا کہ تم دونوں (آدم و حوا) یہاں (بہشت بریں) سے اُتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمہیں ایک خاص مدت تک زمین میں ٹھہرنا اور وہیں گذر بسر کرنا ہے"[1]

ھُبوطِ آدمؑ — ابوالبشر آدم کا زمین پر اُترنا عہدِ انسانی کا نقطۂ آغاز ہے اور تاریخِ بشری کا پہلا باب ہے جو زوالِ بشریت سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ وجودِ بشر کا پہلا شرف سجدۂ ملائکہ سے عبارت ہے، آدم و حوا کو شیطان نے اپنے اغوا کا پہلا شکار بنایا "شجرِ ممنوعہ" سے کام و دہن کو لذت نصیب تو ہوئی لیکن ہاتھ سے جنت بھی گئی اور "خلدِ بہشتی" جسموں سے اتر گیا تو "جنت کے پتوں سے ستر پوشی کی"[2]

جب دونوں نے اس بہشتِ ارضی میں ساری کائنات کے روبرو اپنے آپ کو بے پیرہن پایا تو برہنگی کے شدید احساس نے فطری حیا و شرم کی چادر اوڑھا دی۔ اللہ سے رجوع کیا اور سروں کو شرم سے جھکا دیا اور اعترافِ گناہ کیا:

"اے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں نہیں بخشیگا اور ہم پر رحم نہیں کریگا تو ہم تباہ ہو جائینگے۔"[3]

---

(۱) البقرہ: ۳۶ (۲) الاعراف: ۲۲

(۳) رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (الاعراف: ۲۳)

یہ پہلی دعا ہے جو شرمسار بندے نے اپنے معبودِ حقیقی سے سیکھی، اور پھر جب کائنات پر نظر ڈالی تو فرطِ حیا میں ڈوبے بندوں کو اپنی برہنگی اور ''عُریاں'' نظر آنے لگی، آفاق کا ہر ذرہ اسرار و حکمت کے پردوں میں پوشیدہ نظر آیا۔ زمین سرسبز و شاداب تھی اور سبزوں کے مخملیں فرش سے مُزیّن تھی[1] گھنے درختوں کے سائے دھوپ کی پردہ داری کر رہے تھے، سر پر آسمان کا نیلگوں سائبان سایہ کئے ہوئے تھا اور اس کے در پردہ وہ گم شدہ جنت تھی جس کو دوبارہ دیکھنے کی تمنا تھی۔ ہر شئے بظاہر آشکارا تھی لیکن پُراسرار اور مستور تھی اور یہ دونوں بندے ساری کائنات کے سامنے ننگے محجوب کھڑے تھے، بیحد نادم اور پشیمان تھے۔ اور ندامت کی یہ ادا استارالعیوب کو پسند آئی، عرقِ انفعال کے قطرے موتی بن گئے جنہیں شانِ کریمی نے چُن لیے اور شانِ رحیمی نے اپنی بیش بہا نعمتوں سے نوازا:

> ''اے اولادِ آدم ہم نے تم پر لباس نازل کیا کہ تمہارا ستر ڈھانپے اور تمہارے بدن کو زینت بخشے، اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے''[2]

ستر پوشی کے لئے لباس ہاتھوں سے بُنا جاتا ہے مگر تقویٰ کا لباس اعمالِ صالحہ کے تانے بانے سے تیار کیا جاتا ہے دونوں کے لئے محنت و ریاضت کی ضرورت ہے، یہ نیکی کا پہلا سبق تھا۔ خالقِ کائنات نے آدم کو زراعت کا ہنر سکھایا، ہل ہاتھ میں آیا تو پیٹ کا مسئلہ حل ہو گیا، پھر جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا وہ جنت سے ایک صندوق لے کر آئے جس میں بُنائی کے کُل ستّرہ اوزار تھے:

(۱) نال:	(۲) پائی رفتار: پاوڑی
(۳) پشتہ چوب میخ: لکڑی کی پانچ کھونٹیاں	(۴) سہ رشتہ: تین ڈوریاں
(۵) ن وو چوب: بتیس لکڑیاں	(۶) سوتی
(۷) کوبیا	(۸) بیلن
(۹) دو تختہ:	(۱۰) لپیٹن

---

(۱) چونکہ آدمؑ کا پہلا لباس سبز تھا اسی لیے ''سبزہ'' کو قدمِ آدم کہتے ہیں

(۲) الاعراف: ۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ

(۱۱) کرسنچا: کر- ڈور- سنچا فارسی کے سنجیدن (تولنا) کا سنچ ہے وزن برابر رکھنے کے لئے

(۱۲) ماکو: نال (دو عدد)

(۱۳) ہتھا:

(۱۴) سیل:

(۱۵) کنگھی: بھینی

(۱۶) کالبوٹ: کالبد

(۱۷) ڈنڈیہ:

مفید المؤمنین یعنی
ارشاد المؤمنین

یہ ساری تفصیلات اور دعائیں جو آگے آرہی ہیں 'مفید المؤمنین' نامی کتاب سے نقل کی جارہی ہیں' کسی نامعلوم مصنف نے جو خود نورباف تھا اور تصوف سے گہرا شغف رکھتا تھا اواخر عہد مغول میں فارسی میں مختلف تذکروں' تفاسیر اور ادعیہ کی کتابوں سے کچھ مفروضات اور موضوعات کی پیوندکاری سے ارشاد المؤمنین کے نام سے انصار' نوربافوں کے لئے لکھی تھی' اس کا اردو ترجمہ مدرسہ موسے تحصیل رام سنی گھاٹ ضلع بارہ بنکی کے دو مدرس حضرات نے اسی عہد کی اردو زبان میں کیا اسے بھی سو برس کے لگ بھگ ہوگیا ہوگا جیسا کہ متن کی زبان سے پتہ چلتا ہے' مگر چونکہ مومن کی عرفیت اتنی قدیم نہیں اور 'مومنین' کا اشارہ مومن برادری کی ہی طرف ہے اسی لئے' وقت تصنیف کا تعین انیسویں صدی کے اواخر تک کیا جا سکتا ہے'

بہار اور یوپی کے قدیم مومن۔ انصار گھرانوں میں یہ "صحیفہ' مومن" آج بھی دستیاب ہے۔

جبرئیل علیہ السلام اور حضرت آدم کے درمیان طویل مکالمات ہوئے' جن میں پارچہ بافی کے ہنر پر روشنی ڈالی گئی ہے' بنائی کا ہر طریقہ' عمل جس کے ساتھ ایک دعا پڑھی جانی چاہئے بتایا گیا ہے اور اس کے بعد ہر اوزار کی ایک صوفیانہ تلمیح اور تشریح کی گئی ہے' ان تلمیحات اور تمثیلات میں مذہبی طرز زندگی کا ایک بھرپور تصور ملتا ہے' فقر و درویشی کا سبق ملتا ہے' توحید' خداشناسی اور حق پرستی کا درس ملتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی' مختصر سی دعاؤں میں جن میں عبارات کی پیوندکاری نمایاں ہے اللہ سے لو لگانے اور اسے ہر لمحہ' ہر قدم اور ہر عمل میں یاد رکھنے کی موعظت' پند اور نصیحت ملتی ہے' اور ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایک سادہ دل مومن کی بڑے خشوع و خضوع کی عبادت ہے۔

مکالمات جبرئیل علیہ السلام اور آدم علیہ السلام

"جبرئیلؑ سے آدم نے پوچھا "کیونکر ہوں؟""

جبرئیل نے کہا: "اے آدم پیشۂ بافندگی میں مجموعہ ستر چیزیں ہیں اور ہر چیز (عمل) پر ایک ایک دعا لکھی ہے اگر کوئی پڑھے گویا ہزار قرآن شریف ختم کئے[1] دو ہزار بھوکوں کو کھانا کھلایا اور ہزار اونٹ خدا کی راہ میں آزاد (قربان) کئے۔ اگر پڑھا نہ ہو اپنے پاس (یہ مفید المومنین) رکھے اس کو تمام آفات و بلیاتِ زمانہ سے بچاوے اور کچھ سحر و جادو اس پر اثر نہ کرے۔ اگر کوئی اولاد میں یہ دعائیں نہ پڑھے یا اپنے پاس نہ رکھے اور ہنسے اور بافندگی کا پیشہ کرکے روزی کمائے اور کہے کہ میں مومن ہوں تو وہ جھوٹا ہے۔ نعوذ باللہ منہا! اور قیامت کے دن۔ ان کی جماعت میں داخل کیا جائیگا جو کوئی اس پر عمل کرے اور وقت بُننے کے ہر روز پڑھے اس پر روزی حلال ہو اور قیامت کے دن (مومنوں) کی جماعت میں داخل کیا جائیگا اور داخل ہو جنت میں بے حساب اور بے عذاب جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وعدہ کیا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝

[التوبہ : ۷۲]

{خدا نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بہشت کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (وہ) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور بہشت ہائے جاودانی میں نفیس مکانات کا (وعدہ کیا ہے) اور خدا کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے یہی بڑی کامیابی ہے}

"آدمؑ نے کہا اے جبرئیل علیہ السلام یہ کب مجھکو سکھ... جبرئیلؑ نے کہا "اے آدم اول اپنی

---

[1] حضرت آدم علیہ السلام اور نزول قرآن کے بیچ ہزاروں سال کا بُعد ہے۔

کمر مضبوط باندھو۔ اور پیشہ بُننے کا شروع کرو! آدم علیہ السلام نے کہا کہ اے جبرئیل[۳] مجھکو بہشت کی آرزو ہے کہ پھر دیکھوں اور میری اولاد بھی دیکھے' اول دعائیں تعلیم کرو جو موجب خوشنودی بہشت کے ہیں۔ جس وقت اولاد کو سکھاؤں یہ دعائیں بھی بتاؤں تاکہ میں اور میری اولاد بہشت میں داخل ہوں"

سوال از جانب آدم علیہ السلام: "کمر باندھتے وقت کون سی دعا پڑھتے ہیں؟"

جواب منجانب جبرئیل علیہ السلام: "اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ"[۱]

آدم علیہ السلام: "داہنے ہاتھ سے نال پھینکتے وقت کون سی دعا پڑھنی چاہئے؟"

جبرئیل علیہ السلام: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ"

آدم علیہ السلام: "بائیں ہاتھ سے نال چلاتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"

آدم علیہ السلام: "پاسے رفتار کے وقت کی دعا بتاؤ؟"

جبرئیل علیہ السلام: "یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِکَ اَسْتَغِیْثُ"[۲]

آدم علیہ السلام: "تیغ زکیلے تاگا کسنے کی دعا کیا ہے؟"

جبرئیل علیہ السلام: "یَا حَنَّانُ یَا مَنَّانُ یَا دَیَّانُ یَا سُبْحَانُ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ"[۳]

آدم علیہ السلام: "سررشتہ (تینوں ڈوریں یا رسیاں) بٹتے وقت کیا پڑھیں"

جبرئیل علیہ السلام: "یَا هُوَ یَا مَنْ هُوَ یَا مَنْ لَیْسَ لَهُ اِلَّا هُوَ اَسْأَلُکَ تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْ وَاَنْتَ خَیْرُ الْوَارِثِیْنَ"[۴]

---

(۱) عیدین کی نمازوں کی تکبیرات چند اضافوں کے ساتھ

(۲) "اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اور سبھوں کی نگرانی کرنے والے تیری رحمت کی دہائی ہے" (ترمذی) یہ غم و فکر دور کرنے کی دعا ہے

(۳) اللہ کے صفات۔ آخری حصہ قرآنی آیت (الاعراف: ۱۵۱) کا کچھ حصہ ہے

(۴) ندائے صوفیانہ۔ پھر دعائے استغفار۔ آخری حصہ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ "اے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب سے بہتر وارث ہے۔" (الانبیاء: ۸۹) حضرت زکریا کی دعا ہے۔

آدم علیہ السلام: "بتیس لکڑیاں آراستہ کرنے کے وقت کون سی دعا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○" [1]

آدم علیہ السلام: "سوتلی ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "يَا مَعْبُوْدُ يَا مَقْصُوْدُ" [2]

آدم علیہ السلام: "کوچ ہاتھ میں اٹھاتے وقت کیا پڑھنا چاہیے؟"

جبریل علیہ السلام: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ [3]

آدم علیہ السلام: "دوبلین ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ" [4]

آدم علیہ السلام: "دوتختہ ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "اٰهِيًّا اَسْرَاهِيَا بِحَقِّ كٓهٰيٰعٓصٓ" [5]

آدم علیہ السلام: "پیٹن ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ" [6]

آدم علیہ السلام: "دوماکو ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبریل علیہ السلام: "فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○" [7]

---

[1] سورہ الصف: ۱۳ "نصر اللہ" سے قریب تک۔ سورہ یوسف: ۶۴ کی آیت کا ٹکڑا ہے۔ "سو خدا بہترین نگہبان ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔" بتیس ۳۲ ٹکڑیں۔ کشتی کے اہم حصے تھے: دیکھو شیث نبی کے ہنر: بتیس لکڑی لگا کر

[2] اللہ کو پکارنے کا عام طریقہ۔ [3] سورہ المؤمنون میں "الحق المبین" (۲۹) آیت میں آیا ہے، پہلا حصہ کلمۂ طیبہ کا جز ہے [4] "میں معافی چاہتا ہوں اپنے رب سے تمام گناہوں کی اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں" یہ دعائے استغفار ہے، اسی سے ملتی جلتی دعا ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے۔

[5] اول حصہ سمجھ میں نہیں آیا، کٓهٰيٰعٓصٓ سورہ مریم کے آغاز کے حروف مقطعات ہیں۔

[6] اصل قرآنی آیت یہ ہے "لا الٰہ ... الخ اور "رب العرش العظیم" ہے۔
(سورۃ توبہ: ۱۲۹)

[7] بقرہ: ۱۳۷ "اور ان کے مقابلے میں تمہیں خدا کافی ہے اور وہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔"

آدم علیہ السلام: "کرسنجا ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھنا چاہیئے"

جبرئیل علیہ السلام: "یَا غِیَاثُ الْمُسْتَغِیْثِیْنَ اَغِثْنِیْ [1]"

آدم علیہ السلام: "مبھہ ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "یَا اَللّٰہُ الْمَعْبُوْدُ فِیْ کُلِّ فَعَالِہٖ یَا اَللّٰہُ [2]"

آدم علیہ السلام: "سیل ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "اَللّٰھُمَّ یَا مُفَتِّحَ الْاَبْوَابِ وَیَا مُسَبِّبَ الْاَسْبَابِ اَغِثْنِیْ اَغِثْنِیْ اَغِثْنِیْ [3]"

آدم علیہ السلام: "کنگھی ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ [4]"

آدم علیہ السلام: "قالبوت ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ [5]"

آدم علیہ السلام: "ڈنڈی ہاتھ میں لیتے وقت کیا پڑھیں؟"

جبرئیل علیہ السلام: "اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ [6]"

"ای درویش مومن جان تو کہ جب آدم علیہ السلام نے یہ سترہ [انیس؟] دعائیں سیکھیں تب پھر پوچھا کہ اے جبرئیل علیہ السلام پہننے کے کسب میں ان [دعاؤں] سے جو چیز کہ افضل ہو مجھے سکھاؤ کہ جس کے سبب سے خدا کی خوشنودی ہو۔؟ جبرئیلؑ نے کہا اے آدمؑ جان تو کہ پیشہ بافندگی میں سب سترہ چیز [یں] مع سترہ تصور کے بھی ہیں۔ ان کو کرنے خوشنودی پروردگار کی حاصل ہو آدمؑ نے کہا کہ اے جبرئیل وہ کون تصور ہیں اے [کذا؟] جس وقت کہ اپنی اولاد کو سکھاؤں وہ تصور بھی بتاؤں تاکہ مجھکو اور میری اولاد کو رضامندی خدا کی ہو جبرئیلؑ نے کہا۔ اچھا۔

---

[1] مدد کے لئے اللہ کو پکارنا

[2] موضوع عبارت ہے اللہ کو پکارنا مقصود ہے۔

[3] کسی وظیفہ کی عبارت ہے، ذکر الٰہی ہے

[4] اور [5] تشریح کی ضرورت نہیں، اللہ کی وحدانیت اور ذات وصفات سے عبارت ہے۔

[6] ایک دعا کا آخری حصہ ہے جو حضرت ابو درداؓ نے حضورؐ سے نقل کیا ہے۔

[7] کذا یعنی اس طرح کی اور مثالیں جن میں تحریری اور دیگر غلطیاں ہیں۔

سوال از جانب آدم علیہ السلام: "نال کا تصور کیا ہے؟"

جبرئیلؑ: نال تین [حروف] ن سے اپنی نفی اور الف سے خدا کا اثبات (تصدیق) اور "ل" سے لطف یعنی ہر آل [کا] پاکی سے پاک ہونا (ہر گندگی سے پاک ہونا)

آدمؑ: تصور پاؤڑی [پای رفتار] کا بتاؤ؟

جبرئیلؑ: پاؤڑی میں پانچ [حروف ہیں] پ سے بعید یعنی دور رہنا ہے کہ حرام ہے (حرام سے گریز کرنا) اور الف سے اللہ کو دل و جان سے تصور کرو کہ موجود ہے اور "واؤ" سے وحدت کو خیال میں رکھنا، اور [ر] سے اپنی روح کو "ہویت" [صوفیوں کی اصطلاح میں ذات باری تعالیٰ] کے دریا میں مستغرق کرنا اور ی سے یاری کرنا ساتھ خلق اللہ کے۔

آدمؑ: میخوں (کیلوں یا کھونٹیوں) کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ: میخ میں تین [حروف] - میم سے مرد مانگنا خدا سے عبادت اور بندگی میں۔ اور ی سے یاد کرنا حق تعالیٰ کو ہر دم کہ بغیر یاد کے کوئی دم نہ گذرے (ذکر خدا) اور خ سے خبردار ہونا خدا کریم سے ہر حال میں۔

آدمؑ: رشتہ کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ: رشتہ میں چار [حروف ہیں] ر سے ریاضت کرنا خدا کی راہ میں اور ش سے شکر خدا کرنا ہر حال میں اور ت سے توبہ کرنا (انابت الی اللہ) اور ہ سے اپنی روح کو زندہ رکھنا خدا کی یاد میں [الخ][1]

آدمؑ: سی و دو چوب[2] کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ: چوب میں تین [حروف] ہیں چ سے چار کتاب کو برحق جاننا کہ توریت حضرت موسیٰ پر اور انجیل حضرت عیسیٰؑ پر اور زبور حضرت داؤدؑ پر اور قرآن مجید حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحابہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور واؤ سے واحد جاننا جو کچھ نظر میں آیا اور ب سے اپنے باطن کو صاف رکھنا[2]

---

[1] الخ ...... ان کی آگے آنے والی مثالیں

[2] چار کتب پر ایمان رکھنا، توحید اور تزکیۂ نفس کی طرف اشارہ ہے۔

آدمؑ : ستولی کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ : ستولی میں پانچ [حروف ہیں] "س" سے ستم یعنی ظلم کرنا اپنے نفس پر اور "و" سے واجب کرنا اپنے اوپر جو کچھ کے واجبات ہیں اور "ت" تکبر کو اپنے آپ سے دور کرنا اور "ل" سے لطف یعنی رحم خلق اللہ پر اور "ی" سے یاری کرنا دین کے کام میں۔

آدمؑ : کورچ کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ : کورچ میں [تین حروف] ہیں "کاف" سے کِذب یعنی جھوٹ [نہ] کہنا کیونکہ زبان میں کلام مجید میں آیا ہے لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ[1] اور "واؤ" سے یعنی اپنے مالک کو نگاہ رکھنا کہ بصیر ہے (؟) اور "جیم" سے جام پینا شراب محبت الٰہی کا

آدمؑ : دو بیلن کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ : بیلن میں چار [حروف ہیں] "ب" سے باری تعالیٰ کو جان اور دل سے یاد کرنا اور "ی" یوم یعنی دن کو روزہ رکھنا ماسوی اللہ سے اور "ل" سے لیل یعنی رات کو جاگنا خدا کی یاد میں اور "نون" سے اپنے نفس کو فانی جاننا بموجب حدیث شریف مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ بِالْفَنَاءِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ بِالْبَقَاءِ

آدمؑ : دو تختہ کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ : تختہ میں چار [حروف ہیں] "ت" سے ترتیب شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت کی مرشد کامل سے سیکھنا اور "خ" سے خطرۂ غیر کو اپنے دل میں نہ آنے دے اور "ت" سے تارک ہونا دنیا و مافیہا کا حدیث پاک تَرْكُ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ عِبَادَةٍ یعنی چھوڑنا دنیا کا سر ہے عبادتوں کا اور "ہ" سے ہاری کرنا غریبوں کے ساتھ نسبت ذات میں۔

آدمؑ : لپیٹن کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ : لپیٹن میں پانچ [حروف ہیں] "ل" سے لازم رکھنا اپنے پر خدا کے ذکر کو کلام مجید میں آیت يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا[2] اور "پ" سے عبادت الٰہی میں مشغول رہنا اور "ی" سے اپنے یقین کو شریعت پر مضبوط رکھنا اور

---

[1] غالباً سورۃ النور: اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ کی آیت کی طرف اشارہ ہے "اگر جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت" [2] سورۃ الاحزاب : ۴۱ "اے اہل ایمان خدا کا بہت ذکر کیا کرو"

ش سے ترتیب ذکر و فکر و شغل و مراقبہ و مکاشفہ اور معاملہ کی۔ مرشد کامل سے سیکھنا اور نون سے نیت ہونا اپنی زندگی میں بموجب حدیث مُوْتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوا یعنی مرد تم پیشتر اس سے کہ مرد تم۔

آدمؑ : کرسنچا کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ : کرسنچا میں چھ [۶] حروف ہیں [ ] ک سے کم کھانا اور کم پینا اور کم خلق کے ساتھ رہنا اور ر سے رضا اور تسلیم اختیار کرنا اور س سے سجدہ بجز خدا کے دوسرے کا نہ کرنا اور ن سے ناحق کر جان اور دل سے لینا اور ج سے اپنے نفس سے جنگ وجدل یعنی لڑائی کرنا اور الف سے اللہ کو ہر شئی پر محیط سمجھنا۔

آدمؑ : دو[۲] ماکو کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ : ماکو میں چار [۴] حروف ہیں [ ] میم سے ماں باپ کی خدمت کرنا بموجب حدیث شریف رضاءُ الوالِدَیْنِ فِی رَضَاءِ اللّٰہِ تعالیٰ۔ یعنی ماں باپ کی رضا اللہ کی رضا میں ہے اور الف سے آب و آتش و خاک و باد کا مراقبہ کرنا (؟) اور ک سے کبر و غرور کو اپنے سے دور رکھنا اور واؤ سے اسم ذات کا وِرد کرنا۔

آدمؑ : سیل[۱] کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ : سیل میں تین [۳] حروف ہیں [ ] س سے سِرّ [ ] الٰہی [ ] یعنی خدا کا بھید کسی سے نہ کہنا مگر اپنے مرشد سے۔ ی سے یادِ حق سِر [ ] ی [ ] و روح خفی و جلی[۲] و قلب صنوبری و قلب مداری و عرش اعظم سے کرنا اور لام سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہر دم کہنا۔

آدمؑ : مبتھ کا تصور بتاؤ!

جبرئیلؑ : مبتھ میں حرف ہ سے ہدایت مانگنا خدا سے کارِ خیر میں اور ت سے تائب رہنا سارے گناہوں سے اور ی سے یاد رکھنا اپنے فعلِ بد کو اور بخشش مانگنا خداوند تبارک تعالیٰ سے

آدمؑ : کنگھی کا تصور کیا ہے؟

---

[۱] سیل

[۲] صوفیہ۔ اصطلاحات ہیں۔ "اِفشائے سِرّ الربوبیت کفر" یعنی کہ اسرار عام لوگوں کے سامنے کھولنا کفر کے برابر ہے۔ یہ امام غزالی کا ارشاد ہے (احیاء العلوم)۔ روح اور نفس تصوف میں ایک دوسری کی ضد ہیں۔

جبرئیلؑ: کنگھی میں پانچ (حروف ہیں) کافؔ سے کینہ کو اپنے سینہ سے دور کرنا اور گاف سے
حرص یعنی حرص کو نکالنا دل سے اور نؔ سے نصیحت دین کی بزرگوں سے سیکھنا اور گاف
سے کفر کو اپنے دل سے مٹانا اور یؔ سے یاری کرنا دنیوی کاموں میں کہ (دنیا) چند
روزہ ہے۔

آدمؑ: تابوت کا تصور (کیا) ہے؟

جبرئیلؑ: تابوت میں چھ (حروف ہیں) تاف سے قیل و قال غیر از شرع کے نہ کرنا اور الف
سے آرزو کرنا سوائے خدا کے اور لام سے لطیفہ (انوکھی اور عجیب چیزوں کا مشاہدہ)
کرنا اور سیر کرنا ناسوت اور ملکوت اور جبروت اور لاہوت اور ہاہوت اور ماہوت (ذاتِ)
اور ذاتِ محیط میں بیدار رہنا اور ان ساتوں مقاموں (تصوف کے مدارج) کی سیر کرنا
بؔ سے بجان و دل خدا کے احکام بجالانا اور واؤ سے واجب الوجود یعنی خدا کو نہ بھولنا
اور تؔ سے تابوت (جنازہ) جاننا اپنے جسم کو

آدمؑ: دنڈیہ کا تصور کیا ہے؟

جبرئیلؑ: دنڈیہ میں چار (حروف ہیں) دالؔ سے دل کو صاف رکھنا حرام سے اور نؔ سے نوم
یعنی نیند کو دوست نہ رکھنا اور یؔ سے یاری کرنا سب مسلمانوں کے ساتھ۔

روحانی عمل

جبرئیل علیہ السلام نے آدمؑ کو فن بافندگی کا ہر عمل سکھلایا اور ہر عمل کے لیے ایک مخصوص
دعا کی تعلیم دی۔ یہ ساری تفصیلات چند تناسیرے اخذ کر کے ایک نامعلوم 'مومن عارف' شخص نے
ایک کتاب لکھی تھی غالباً عہد مغلیہ میں جو فارسی میں تھی، جس کا اردو ترجمہ انیسویں صدی کے
آخر میں مفید المؤمنین کے نام سے کیا گیا تھا، اصل فارسی تصنیف ارشاد المؤمنین میں موضوعات
اور مفروضات الجھے ہوئے ہیں۔ عرصۂ دراز تک مفید المؤمنین کا صحیفہ مومن برادری اور اس کے

---

۱ فلسفۂ تصوف میں آفاق و کائنات کے مختلف عالم (دنیا) ہیں: ناسوت[۱] ۔ انسانوں کی دنیا۔ ملکوت[۲] ۔ سوائے بادہ مجھ میں تمدن [۳]
دنیا۔ عالم جبروت[۴]: طاقت کی دنیا عالم لاہوت[۵]: الوہیت ہاہوت[۶] اور ماہوت[۷] کن ہی دنیا کی باتیں ہیں واللہ اعلم۔ ذاتِ محیط
خدا کی بیکراں ذات جو سارے آسمانوں کو گھیرے ہوئے ہے۔

پیشۂ و ہنرِ بافندگی کا رہنما اور ہدایت نامہ تسلیم کیا جاتا رہا اور ہمارے لیے بھی یہ آج ہمارے ماضی
کا شاندار سرمایہ ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات اسی مفید المؤمنین سے لیے گئے ہیں۔[۵]

نوربافی کے کمالات، اکلِ حلال کے مسائل اور کسبِ حلال کے فضائل آدمؑ اور جبرئیلؑ کے
مکالمات کے بنیادی موضوع ہیں جن کا سررشتہ لباسِ دنیوی اور لباسِ تقویٰ سے بندھا ہے
گویہ سارا بیان سورۃ الاعراف کی چھبیسویں آیت کی تفسیر ہے اور نوربافی کا پہلا ازلی سبق ہے،
فنِ بافندگی کو وقت کے ہاتھوں نے تہذیب و تمدن کی دستگاہ میں ایک باقاعدہ ہنر اور
صنعت میں ڈھال دیا جو کئی پیغمبروں کا پیشہ اور محدثین کرام اصحابِ کبار اور ائمۂ عظام کا وسیلۂ
معاش بنا رہا اور امتِ مسلمہ میں سے ایک خاص جفاکش طبقہ کا موروثی پیشہ بن گیا جو پہلے
انصاری کہلائے — اور انیسویں صدی کے بعد مومن بنے۔ صوفی سلسلوں سے منسلک
ہونے کے سبب کبھی مداری اور محمدی کے القاب سے معروف ہوئے، عربوں نے حیاکت
(فنِ بافندگی) سے حائک بنا دیا اور نساج کو نساجی (بُننے تننے) سے نسبت دے دی۔ یمن
مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں ریشم باف قزاز کے اعزاز سے معزز بنے، کتانی اور سوتی کپڑوں کے
مصری زرباف قطن سے قطنی کہلائے، کچھ خامی بن کر اس ہنر میں مختص بنے اور کچھ ابریشم باف اور
سفید باف حریری بن کر معروف ہوئے اور حرار بن کر مشہور ہوئے، ہندوستان میں اہل الہندی
مومنوں اور صدرِ انصاریوں کو عہدِ سلاطین کے مسند نشینوں نے جُلاہا کہہ کر
تضحیک کی لیکن یہ اپنے آپ کو نورباف کہتے رہے اس لیے کہ ان کا پیشہ ابوالبشر آدمؑ کی وراثت
ہے۔ فنِ بافندگی نورانی دعاؤں کے ساتھ جبرئیلؑ نے جب آدمؑ کو سکھایا تو وہ دنیا کے سب
سے اول حائک — بافندے بن گئے۔

مفید المؤمنین نہ صرف نوربافی کا ہدایت نامہ ہے بلکہ ملفوظات بھی ہے جس میں صوفیانہ ادوں
سے گُندھا ہوا ایک ایسا درویشانہ پیام اور تحفہ پیش کیا گیا ہے جو ایک مدت تک مومن عارف کا بجا
طور پر فخریہ ورثہ تھا اس میں مومن۔ انصاری برادری کی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی آثار نظر
آتے ہیں اور ذہنی و فکری سمتوں کی طرف بلیغ اشارے ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ

---

۵ یہ پوری کتاب 'تحریکِ دستکاری' مرتبہ محمد ایوب نصری (؟) الہ آباد ۱۹۷۶ء از صفحہ ۳۶
تا ۹۲ میں منقول ہے ہم نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

پارچہ بافی کا ہر عمل گویا ایک 'روحانی عمل' ہے جس میں ہر تلگے پر دم کیا جاتا ہے اور دعاؤں کے انفاس
بابرکات سے رُقیہ کیا جاتا ہے' ہر تار - گویا تسبیح کا وہ دھاگا ہے جس میں 'تسبیحات' کے
نورانی موتی پروئے جاتے ہیں' ہر تال (کرگہ یا کھڈی) کا ہر زہ ایک صوفیانہ علامت ہے'
وحدانیت کی تفسیر اور اُلوہیت کی تاویل ہے۔ نوربافی کا فن اس نورانی فضا میں زندگی
گزارنے کا دینی اور درویشانہ فن بھی سکھاتا ہے' نوربافی کے ہر عمل پر ایک موزوں یا غیر
موزوں مسنونہ یا معروفہ اور موضوع دعا' دینی اٹھتی ہے' اس میں قرآنی آیات اور احادیث
کے تاثیری کلمات گونجتے ہیں - اس فنی اور روحانی عمل میں 'دستکارانِ اہلِ شرف' کے
عقاید کے وہ تار و پود بکھرے ہوئے ہیں جن سے وہ کمال صاحبات کے ساپنے پر تقویٰ
کا لباس تیار کرتے ہیں'

صوفیانہ استعارات میں معرفتِ خداوندی کے رازہای سربستہ کی گرہیں کھلی ہیں۔ انہیں
'مومن عارف' اپنے تدبیر کے ناخنوں سے کھولتا ہے' پنے کرگھے کی کنگھی سے زندگی کے الجھے ہوئے
معاشی مسائل کو سلجھاتا ہے اور طور (جامے) سے رت ہی کا جلوہ دیکھتا ہے' ان تمام
مبالغہ آرائیوں کے باوجود مفید المومنین ایک حیثیت انصاری برادری کا صحیفہ تسلیم کیا جاتا
رہا جس میں ان کے مذہبی عقاید' صوفیانہ افکار مجاہدانہ ریاضت اور موحدانہ تصورات کی
بھرپور نقاشی کی گئی ہے' اور عرصہ تک ان کی فنی اور صنعتی زندگی کا ہدایت نامہ بنا رہا'

جب بھی مومن انصاری گھرانے کا کوئی نوجوان نوربافی کا فن سیکھنے کے لئے کسی
بزرگ کا شاگرد بنتا تو ایک رسم ادا کی جاتی جس طرح صوفی سلسلہ میں مرید کو 'محرم راز' بنانے کے
اور اسے ابتدائی سبق دینے کے لئے ایک تقریب عمل میں آتی تھی بالکل اسی طرح نوربافی کی
صاف ستھری دستگاہ میں شاگرد کو پہلا عملی سبق دیا جاتا تھا۔ مفید المومنین پڑھی
جاتی اور شاگرد کے 'ہر عمل' پر دعاؤں کا عمل جاری رہتا' ساری فضا میں نورانی دعاؤں سے

کلمات گونجنے لگتے اور ان کے انفاسِ بابرکات سے کرگہ سانس لینے لگتا، ماں چرخہ کاتتی اور ماں جایاں پھرکیاں بھرتیں، ان کے چہرے بشاشت سے کھل اٹھتے، تصور میں امیدوں اور آرزوؤں کے تانے بانے بکھر جاتے کیونکہ آج ان کے خاندان کا ایک نیا شہسوار مصائبِ زندگی میں جدوجہدِ معاش کے لیے، کرگہ کی پائکھری میں اترا ہے، کمر باندھ کر منوال پر زین کس کر بیٹھا ہے، پائی رفتار دیا ڈُنڈی کے رکاب میں پیر ڈالے، سہ رشتوں کی باگ تھامے اُلٹے ہاتھ سے ہتھے کی جہمیز سے ایڑ لگا رہا ہے، آج ان کے لاڈلے نے عملی زندگی کے سفر میں پہلا قدم رکھا ہے تاکہ محنت کے ہاتھوں سے رزقِ حلال کے دروازے پر دستک دے سکے نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے اور نہ دستِ سوال دراز کرے اور نہ دامن پھیلائے بلکہ اوروں کے لیے دامن کا کپڑا بُننے چاہے خود تہی دامن رہ جائے، اور اسی طرح ایک نیا فنکار جنم لیتا ہے،

'مومن عارف' کا مقصدِ حیات یہی تھا، لباسِ دنیوی بنا دوسروں کے لیے اور اپنے لیے لباسِ تقویٰ تیار کرنا، کسبِ حلال اور اکلِ حلال کے ساتھ دعا کے لیے بھی ہاتھ اٹھتے تھے یہی اس کا لائحہ عمل تھا۔ جب آخری دن شاگرد کی تربیت ختم ہو جاتی، کتاب بند کر دی جاتی اور دعاؤں کی زبانیں کھل جاتیں تب بزرگ، استاذ ـــ اور مرشد ایک نصیحت کرتا جو مومن عارف کے عزائم کو اور پختہ بنا دیتی ـــ

"بیٹے! اب صحیح معنوں میں تم نورباف بن گئے ہو۔ اب سب سے پہلے اپنا کفن بُنو!

ـــ اور کارگاہ میں رزق کے فرشتے کے پروں کی سرسراہٹیں کرگھے کے شور میں سنائی دینے لگتیں،

تم گٹھری باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دُھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑوں کا یاں تانا بانا بُنتی ہے

(نظیر اکبرآبادی)

دوسرا باب

کسبِ حلال، اکلِ حلال: حلال کمائی حلال روٹی

"کسی آدمی نے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے زیادہ لذیذ کھانا نہ کھایا ہوگا"
(حدیث۔ بخاری)

ابلیس جب ملعون اور مطعون ہوا تو آدمؑ کے تعاقب اور گھات میں لگ گیا۔ شجرِ ممنوعہ نے حُلّۂ بہشتی، بدن سے اتروا دیا۔ عریانیت اور قابلِ شرم اعضائے جنسی کا دوسروں کے سامنے کھلنا باعث ذلت و رسوائی ہے اور بے حیائی کی نشانی علامت۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان کا پہلا حملہ اسی راہ سے ہوا جس راہ سے بے راہ روی راہ پکڑتی ہے۔ ستر پوشی فواحش کی ڈھال ہے اس لئے لباس، انسانی فطرت کا اہم مطلوب شرعی ہے اس سے شرم و حیا، عصمت و عفت کے ملکوتی صفات پیدا ہوتے ہیں، اس سے جسم کی زینت ہوتی ہے اور عیوبِ بدنی کی پردہ پوشی اور تہذیب و شائستگی کا اظہار ہوتا ہے اور موسمی اثرات سے حفاظت ہوتی ہے۔

غذا کے بعد لباس انسان کی دوسری اہم ضرورت ہے اور روزِ اول ہی سے انسان ان احتیاجات کے لئے اپنے ستار اور رزاق کا رہینِ منت رہا ہے۔ ابوالبشر آدمؑ کی دونوں بنیادی ضرورتیں اس نے اپنے فیض و کرم سے الہامی طور پر پوری کر دی تھیں۔ بھوک نے غذا کا مسئلہ حل کر دیا، اور گیہوں کا ہتھا ہاتھ میں تھما دیا تو ننگے بدن کو پیرہن مل گیا اور فنِ بافندگی کا راز۔ آدمؑ روئے زمین پر پہلے انسان ہیں جنہوں نے کپڑا بُنا اور یہی پہلے بُنکر تھے، شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر فتح العزیز میں حضرت انسؓ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں: اَوَّلُ مَنْ حَاکَ آدم، ور ابن کثیر (م۷۷۴ھ) البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ:

"آدم و حوا کا پہلا لباس دُنبے کے بالوں کا تھا اس کے بالوں کو کات بُن کر کے آدم نے اپنے لئے جُبّہ اور حوا کے لئے ایک زرہ (بدن ڈھانپنے)

کے لیے' اور ایک چادر (خمار) کا کپڑا بُنا " [1]

آدمؑ نے یہ فن اپنے بیٹے شیثؑ کو سکھایا جو چار سو چوالیس[444] برس زندگی کے تانے بانے میں اُلجھے رہے، فنِ نساجی کا چرخہ وقت کے ہاتھوں گردش کرتا رہا اور اس کے تار و پود سے انسانی تہذیب و تمدن کا جامہ تیار ہو گیا، قرآن پاک میں جابجا صنعتِ پارچہ بافی کی طرف اشارے ملتے ہیں، روئی (کتان) اور اُون کاتنے کا عمل چرخے کے اردگرد گھومتا نظر آتا ہے:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (النحل: ۹۲)

"اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے تو سُوت کاتا پھر اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔"

رنگین اون کا استعمال بھی رائج تھا اس آیت سے اس کا رنگ جھلکتا ہے:

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ

(القارعة: ۴)

(وہ قیامت ہے) جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دُھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اُون"

یعنی نداّفی بھی باقاعدہ فن بن چکا تھا۔ کلام پاک نے اعلیٰ قسم کے پارچوں کے نام گنوائے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملبوسات تہذیب و شائستگی کے مظاہر بن گئے تھے فن بافندگی ایک پیشہ اور کسبِ معاش کا ذریعہ بن گیا تھا اور اقتصادی معیشت کا جزو لازمی جس پر معاشرے کی خوشحالی کا دار و مدار تھا، مختلف صنعتوں کے بارے میں قرآن میں واضح اشارے ملتے ہیں صناعی و دستکاری کی طرف لطیف اشارے کئے گئے ہیں ان پیغمبروں کا بھی ذکر ملتا ہے جو کسبِ معاش کے لئے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ جہازوں کا ذکر چھبیس[26] آیات میں ملتا ہے ۲۲ جگہ فُلک، ۲ جگہ جوارِ، ایک آیت میں سفینۃ اور ایک میں ذات الواح و دُسُر کی تلمیح کے ساتھ، ایک آیت میں جاریۃ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے یہ دیو پیکر جہاز سمندروں کی موجوں پر ہواؤں کے سہارے جب صحیح و سلامت رواں دواں

---

[1] ... ... قبلها من شعر الضان جزاه و غزلاه فنسج له دَرَجْبَة والجوادر و خمارا'

نظر آتے تو خدا کی قدرت نظر آتی تھی[1]" ان جہازوں کے بادبان بھی پہاڑوں کی طرح اونچے ہوتے تھے[2]۔ دبیز کپڑوں کے بادبان بُننے اور مستولوں پر کسی ہوئی موٹی موٹی رسیوں کے بُننے کا ہنر بھی صنّاع جانتے تھے۔

انبیا علیہم السلام کے پیشوں کی تفصیل قرآن و احادیث سے معلوم ہوتی ہے، حضرت آدمؑ پہلے کاشتکار اور پہلے بُنکر تھے، حضرت نوحؑ نے نجّاری (بڑھئی) کا پیشہ اختیار کیا، یہی حضرت زکریاؑ کا بھی ذریعہ معاش تھا، حضرت ادریسؑ درزی (خیاطی) کا ہنر جانتے تھے، حضرت ابراہیمؑ زراعت پیشہ تھے، حضرت لقمانؑ نجار بھی تھے اور خیاط بھی، اسی طرح حضرت لوطؑ بھی ملبوسات سیتے تھے، حضرت داؤدؑ حدّادی (لوہے کا ہنر) جانتے تھے، یہ زرہ ساز بھی تھے، حضرت سلیمانؑ نہ صرف ایک پیغمبر تھے بلکہ جلیل القدر بادشاہ بھی تاج وتخت کے مالک تھے لیکن فرش کے لئے چٹائیاں بُنتے تھے، حضرت موسیٰؑ بکریاں چرانے والے گڈریے تھے اور حضرت عیسیٰؑ رنگریز بھی تھے اور اپنی والدہ حضرت مریمؑ بنت عمران کے کاتے ہوئے سُوت بازار میں بیچ کر روزی حاصل کرتے تھے۔ گلہ بانی بھی ایک پیشہ تھا اور کئی پیغمبروں کا ذریعۂ معاش۔ صحیحین میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "کوئی نبی نہیں گذرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں" پوچھا گیا "اور آپ نے یا رسول اللہ؟" ارشاد ہوا "ہاں میں بھی چند قیراط پر اہل مکہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا" (بخاری)

نبی کریمؐ سے پوچھا گیا "کہ کسب معاش کا کون سا ذریعہ بہتر ہے؟"
فرمایا "دستکاری[3]" اور ایک جگہ فرمایا: "اپنے ہاتھوں کی کمائی سے پاکیزہ تر کوئی کمائی نہیں ہے"[4]

آپ نے کمائی کرنے والے اور محنت کرنے والے (کاسب) کو اللہ کا دوست بتایا ہے[5]

---

[1] سورہ الشوریٰ: ۳۲ "وَمِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ"

[2] وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (رحمان: ۲۴)

[3] قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای کسب الرجل اطیب؟ قال عمل الرجل بیدہ (بخاری)

[4] ما کسب الرجل کسباً اطیب من عمل یدہٗ (ابن ماجہ)

[5] الکاسب حبیب اللہ

وہ اپنا کام خود کرتے تھے نہ جھاڑو دینے میں عار تھا اور نہ جوتیاں گانٹھنے میں شرم کا گذر تھا اور نہ عذر، کپڑوں میں دستِ مبارک سے پیوند لگا لیتے، اسی طرح انہوں نے اپنے ہر فعل اور عمل سے کام کرنے کی فضیلت کو سراہا ہے، دستکاری اور پیشوں کی عظمت کو تہذیب کا سربلند ستون بنا دیا جو ہاتھ دعا کیلئے اٹھتے تھے اُسے کمائی کے لئے جھکانا بھی سکھایا، دستکاری ایسا ہنر ہے جس کی قدر و منزلت قرآن نے بھی کی ہے اور رسول کریمؐ نے اور ان کی اتباع میں صحابہ و خلفاء راشدین نے بھی لسے سراہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی مدح میں فرمایا:

"وعلمناہ صنعتہ لبوس لکم" (الانبیاء: ۸۰) یعنی منجملہ اور احسان کے ایک احسان حضرت داؤدؑ پر یہ کیا گیا کہ ان کو تمہارے لباس (زرہ) کا بنانا سکھا دیا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا "خیر الکسب من اعمال الید" اچھی کمائی وہ ہے جو ہاتھ کی محنت سے ہو" آپؐ اپنی ازواج مطہرات اور دیگر عورتوں کو یہی ہدایت دیتے تھے کہ" اپنے رب سے اس کا فضل طلب کرتے رہو" (النساء: ۳۲) اُمّ المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش (متوفی: ۲۰ ھجری) چمڑے کی دباغت اور رنگنے کا کام کرتی تھیں اور جوتے گانٹھتی تھیں جو کچھ دست و بازو کی محنت سے کماتیں راہِ حق میں خیرات دیا کرتی تھیں، اُمّ المومنین حضرت اُم سلمہؓ چرخہ کاتتی تھیں۔

اسلام سے پہلے ایام الجاہلیہ میں پیشے کو حقیر تصور کیا جاتا تھا، اس ذہنیت نے سماجی فرق و امتیاز کی تقسیمی لکیر کھینچ دی تھی۔ عربی شاعری میں پیشوں کی تضحیک اور ہجو کرنا خود ہجو نگاروں کا پیشہ بن گیا تھا، اسلام نے آتے ہی امت مسلمہ کو ایک دائرہ میں جمع کر کے اخوت و مساوات کو سماجی محور بنا دیا اور تقویٰ کو قطب۔ سارے امتیازات دُوئی کی یکجائی میں بدل گئے۔ ہر کسبِ حلال جو اکل حلال کا ذریعہ تھا اس کی فضیلت بڑھ گئی، انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی اسی سنت متوارثہ کا خوشگوار نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ میں محدثین کرام، ائمہ عظام، حفاظ، فقہا، خطباء، علماء و فضلاء اور شعراء کی ایک طویل فہرست ملتی ہے جنہوں نے ہر وہ پیشہ اختیار کیا جو اکل حلال کا ذریعہ تھا، اسی پیشے کی مناسبت سے ان کی عرفیت یا نسبت بھی معروف ہوئی، تہذیب و شائستگی کی روایات اور آداب و اخلاق کی پابندیوں نے پاسِ خاطر کا خیال رکھا، نہ نسبت نہ قومیت سے کسی دور نے ان اذہانیات کے خلاف نہ ایک کلمہ تحقیر استعمال کیا اور نہ خود انہوں نے کسی قسم کی ذلت کی گرانباری

محسوس کی اور نہ کمتری کی سبکی سہی بلکہ اپنی صناعیوں میں سبکدست رہے، فن میں ماہر اور علم میں شہیر تھے، کتب اسماء الرجال، کتاب الانساب، طبقات اور تاریخوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تقریباً ۴۱۰ (چار سو دس) پیشوں اور صنعتوں کے بارے میں معلومات مہیا ہوئی ہیں[1] جو کسی نہ کسی عالم دین یا صوفی نے اختیار کیا تھا اور اسی مناسبت سے معروف ہوئے۔ اسلامی ممالک میں جہاں قبائلی زندگی۔ تمدن و معاشرت اور شناخت کی شہ رگ تھی وہاں آبا و اجداد، خاندان، نسل، قوم اور قبیلہ کی طرف منسوب ہونے سے زیادہ ترجیح اور فوقیت ان القاب کو دی گئی جن سے پیشہ، صناعی یا فن کی نمائندگی ہوتی ہے چند بزرگان دین اسلام کے بارے میں یہ تفصیل تمثیل کا کام دیگی۔

اکابرین اسلام کے پیشے

اسم	پیشہ یا صنعت	اسم	پیشہ یا صنعت
حضرت ابو ایوب انصاریؓ (صحابی)	بافندگی (حیاکت یا ساجی)	حضرت اشعث بن قیس بن معدیکرب کندیؓ (صحابی)	حیاکت
حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ (صحابی) (م ۴۲ / ۶۶۲)	حیاکت		
حضرت ابو طلحہ انصاریؓ (صحابی)	بافندگی	محدث ابو صالح	گلوتی
امام ابوبکر اسکاف	خراز (موچی)	اسماعیل بن احمد خورس	زنبیل باف
امام ابوحنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ)	بزاز (بساطی)	ابوبکر خباز	نانبائی
امام جوزی (محدث)	ٹھٹھیرے	قصار صوفی	دھوبی
ابراہیم بن ثابت	دھوبی	ابو حفص صوفی (حداد)	لوہار آہنگر
سعید بن مرزبان مروی	سبزی فروش (کنجڑا)	ابو الحسن نجار	بڑھئی
حسین بن منصور حلاج	دھنیا، نداف	ابو الخیر تیناتی صوفی	زنبیل باف

[1] مسلمانوں میں علم رجال کو جو ترقی ہوئی دنیا میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں، تراجم، طبقات، قرون، وفیات، اعیان، سنین وغیرہ کے نام سے جدا جدا عنوان قائم ہوئے۔

اسم	پیشہ یا صنعت	اسم	پیشہ یا صنعت
حمزہ بن حبیب	عصار (تیلی)	ذکوان بن ابو صالح (م ۱۰۱ھ/۷۲۰ء)	عصار (تیل کے سوداگر)
فضیل بن عیاض (محدث صوفی)	بہشتی	شریح بن النعمان (م ۲۱۷ھ/۸۳۲ء)	جوہری
محمد بن محمد شاذیکان	جواہر فروش	داؤد بن نصیر الکوفی (م ۱۶۰ھ/۷۷۷ء)	موچی، خراز
قاضی ابراہیم بن زید الرعینی	پھانسی کا پھندا بننے والے	حکم بن سنان ابو عون (م ۱۹۰ھ/۸۰۶ء)	چرم سازی
عمر بن احمد صفار (محدث) (م ۳۵۰ھ/۹۶۱ء)	ظروف فروش، مسگر	ظالم بن مکتوم (حداد)	لوہار
معرفی عمر بن سمیہ [illegible]	لوہار	یونس بن احمد بن ایوب	جواہر فروش
ابو حفص نیشاپوری			

مختلف کتب سے ظاہر ہے کہ پیشے اور صنعتیں مختلف انواع کے تھے مثلاً بزازی (بساطی)، نقال، زجاج (شیشہ گر)، جصاص (چونہ فروش)، قطان (روئی فروش)، خواص (روئی کے پتے بیچنے والے)، صبان (صابن ساز) جیسی حرفت اور نسبت سے ہم روشناس ہوتے ہیں۔ اکابرین اسلام کا تعلیم یافتہ طبقہ ملازمت کی طرف زیادہ رغبت رکھتا تھا جو سرکاری محکمہ جات میں ملازم تھے معاشی طور سے کمزور لوگوں میں سے کچھ خادم تھے اور کچھ خدمات ناظری (چوکیداری) کرتے تھے اور حمال بن کر بوجھ ڈھوتے تھے، شتربانی کرتے تھے (جمال تھے)، کچھ خچران (بغال) تھے، پارچہ بافی کے کارخانوں میں تیار ہوا کپڑا دھونے والے بھی عام تھے۔ مسلمانوں میں ستر پوشی کا رواج تھا، اصلاح ساز یا نائی (مزین) اور حجام کی بھی دینی حیثیت تھی۔ جانوروں کے حکیم (بیطار) رکھتے تھے۔[1]

[1] کتب التمدن، تاریخ المتوالی وغیرہ سے یہ تفصیلات مع دیگر کتب رجال لکھی گئی ہیں۔ اول الذکر کتاب کے اس مصنف حضرت مولانا [illegible] نے اسلام [illegible] کی تالیف [illegible] مرحوم مولانا حبیب الرحمٰن مبارکپوری شیخ الحدیث کی طرف اس کی تصنیف منسوب کر دی

[illegible] شارح مشکوٰۃ المصابیح مسمی بہ مرعاۃ المفاتیح ہیں۔ متاخرین مصنفین کے بارے میں کتب رجال اور کتب [illegible] علامہ شیخ علی متقی (۱۵۶۷ء-۹۸۰ھ) نے کنز العمال میں تفصیلات دی ہیں۔ یہ ابو نعیم، ابن عساکر [illegible] (۵-۱۵ ھ، ۱۲۲م) کی مرتبہ الآثار تصنیف کی بہ نسبت اس سے زیادہ منظم طریقہ پر احادیث کی کتاب ہے۔ ان تمام مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے اور جہاں تک جو حوالے دستیاب ہو سکے درج کئے گئے ہیں۔

آنحضرتؐ کو بذاتِ خود صناعی اور دیگر فنون سے بیحد شغف تھا، مکۂ معظمہ کے بازار سے گذرتے ہوئے آپ اکثر ایک آہنگر کو جو تلوار سازی کرتا تھا کام کرتے دیکھ کر رُک جاتے اور اس کی صناعی کا مشاہدہ کرتے تھے۔

اسلام نے انسانی معاشرہ کو یک مکمل نظامِ حیات پیش کیا ہے جو انسانیت اور معاشرہ کی بقاء و تحفظ کا ضامن ہے، شریعت جس کے بنیادی مآخذ اور اصول قرآن و سنت پر مبنی ہیں فردِ واحد سے لے کر تمام مخلوق کے افعال و اشغال، معاملات، آداب، معاشیات و اقتصادیات، اخلاق و معاشرت کے بارے میں بسط و شرح کے ساتھ نشاندھی کرتی ہے، اعمالِ صالحہ کی ترغیب و ترہیب دے کر نیکیوں کا راستہ دکھلاتی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کو نصب العین بنایا گیا ہے، اسلامی معاشرہ کی شاندار عمارت انسانیت اور روحانیت کے اعلیٰ اقدار کے ستون پر قائم و دائم ہے۔ اپنے اقتصادی نظام میں اسلام نے شرافتِ کسب اور کسبِ حلال کو اکلِ حلال کا واحد ذریعہ بتایا ہے جس سے بدن کی بالیدگی ہوتی ہے اور روح میں پاکیزگی پیدا ہوتی ہے۔

نبی صلعم نے فرمایا ہے — "سب سے پاکیزہ غذا وہ ہے جو تمہاری اپنی کمائی کی ہو"

تقدیرِ الٰہی اور مشیتِ ایزدی کو حرفِ آخر سمجھ کر توکل کی میں کھی ہے کہ قناعت کے گوشۂ عافیت میں عزلت گزینی رہبانیت ہے اور اللہ لی تصوف کی فرگاہیں ہیں یہ نہ تو سچے مومن کا ایمان ہے اور نہ عمل، مومن تو وہ ہے جو تقدیر کو تدبیر سے بدل دیتا ہے — دونوں ہی تو مشیتِ ایزدی ہیں۔ سچا مومن معرکۂ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کرتا ہے اپنے ہاتھوں کو مفلسی اور ناداری سے تحفظ کی ڈھال بنالیتا ہے اور انگلیوں کو برچھیاں جب ہی تو رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

ـلہ شارع علیہ السلام نے مہر البغی یعنی زنا کے معاوضے کو خبیث اور شر المکاسب (ناپاک اور بدترین آمدنی) قرار دیا ہے۔

(ابوداؤد، ترمذی، نسائی، بخاری، مسلم) لونڈی سے کوئی آمدنی وصول کرنا ممنوع قرار دیا جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کس ذریعہ سے ہے۔

(ابوداؤد) رافع بن رفاعہ انصاری کی روایت میں اس سے زیادہ واضح حکم ہے" اللہ کے نبی نے ہم کو لونڈی کی کمائی سے منع کیا بجز اس کے جو وہ ہاتھ کی محنت سے حاصل کرے اور آپ نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ یوں جیسے روٹی پکانا، سوت کاتنا اور روئی دھنکنا (مسند احمد، ابوداؤد کتاب الاجارہ) ناپاک کمائی کو کسب الاماء (لونڈیوں کی کمائی) اور مہر البغی (زنا کی آمدنی) کہتے ہیں۔

جُعِلَ رِزقی تحت ظلّ رُمحی

"رزاق کریم نے میرے رزق کو میرے نیزے کے نیچے چھپا رکھا ہے" (مسند احمد)

ہر بندہ اللہ کا فقیر ہے[1] "لوگو تم (سب) خدا کے محتاج ہو اور خدا بے نیاز اور سزاوارِ حمد و ثنا ہے" اس لیے وہ بندہ اللہ کے نزدیک زیادہ فضیلت رکھتا ہے جو "تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کام کرتے کرتے شام کر دیتا ہے اور اسی فکر میں پڑ کر اور تھک کر سو رہتا ہے[2] تو خدا اس کو معاف کر دیتا ہے" (طبرانی) یہی نہیں کوئی احسن عمل ضائع نہیں ہوتا اس کا اجر مقدر ہے اور ملتا ضرور ہے دیر یا سویر۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے "گدازِ قلب صرف اکلِ حلال سے پیدا ہو سکتا ہے"

"مشہور صوفی اور بزرگ شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ[3] نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ کاریگروں اور دستکاروں کو عابد شب زندہ دار اور عبادت گذار پر فوقیت حاصل ہے[4]، عابد کی عبادت خود اسے نفع دیتی ہے لیکن ایک صناع اور کاریگر سے خلائق عامہ کو فائدہ پہنچتا ہے عابد شب زندہ دار مصلّے پر قرار پکڑے صبح کر دیتا ہے لیکن دستکار ہاتھوں میں اوزار پکڑے صبح و شام کر دیتا ہے فرش پر بیٹھا یا زمین پر کھڑا محنت کرتا رہتا ہے، ریاضت اور مجاہدہ کی نفسی عبادت سے زیادہ فضیلت ہے اور سب سے افضل طریقہ تو یہ ہے کہ حصولِ معاش کے لیے سرگرداں رہے اور ذکرِ الٰہی سے مشغول رہے، کاش درزی اپنی سوئی کی نوک کو اور بڑھئی آری کے دندانوں کو تسبیح کا دانہ قرار دے اور کارگھروں کے شور میں ذکرِ الٰہی کی آواز بھی شامل ہو جائے — تو یہ عبادت بدنی خدمت روح و جسم کا باعث بن جاتی ہے اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ بھی۔ دستکاری ایک فن ہے نفاست و نزاکت چابک دست انگلیاں جب ترتیب اور صناعی کی رگِ جاں بن جاتی ہیں تو ایک شاہکار وجود میں آتا ہے یہی اس کی صناعی کا معجزہ بن جاتا ہے — محنت بھی عبادت ہے [illegible] کی عبادات میں فرقِ مراتب یہی ہے۔

---

[1] يا أيها الناس أنتم الفقراء إلى الله والله هو الغني الحميد (الفاطر: ١٥)

[2] من بات كالا من طلب الحلال بات مغفورا له "جو شخص رزقِ حلال کے لئے سرگرداں رہے اور تھک کر سو رہے خدا اسے معاف کر دیگا"

[3] [illegible] ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی کتاب: مشكلة الفقر وكيف عالجها الاسلام" اردو ترجمہ نعیم احمد ملی مترجم دار السلفیہ، بمبئی ص ٦٢

تیسرا باب

انوارِ نُورِ ربانی

عرب ہمیشہ سے سفر میں رہے، صحرا کا شہسوار کبھی بھی شاہراہوں کا محتاج نہیں رہا، کچھ بادیہ پیمائی کا شوق تھا اور کچھ تجارت کا تقاضہ جس نے اُنہیں ہمیشہ پابہ رکاب رکھا، غیر ممالک سے عربوں کے تجارتی تعلقات تاریخ کی یاد سے پہلے بھی تھے شام و یمن تک تجارتی قافلوں کا سفر عربوں کی اقتصادی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنی قریش تاجر پیشہ تھے ان کے تجارتی قافلے جاڑوں اور گرمیوں میں شام و یمن تک منزلیں مارتے تھے، یمن پارچہ بافی کا ایک عظیم الشان مرکز تھا اور مکہ معظمہ تجارتی گذرگاہوں کا چوراہا اور مال کی نکاسی کی سب سے بڑی منڈی رہی تھی۔

نبی کریمؐ کے پردادا بنی ہاشم کو سب سے پہلے بادشاہ روم و مصر کے درمیان ہونے والی بین الاقوامی تجارت میں حصہ لینے کا خیال پیدا ہوا انہوں نے اپنے تینوں بھائیوں کو اس تجارت میں شریک کر لیا۔ اس کاروبار کی وجہ سے اہل قریش کے تعلقات شام و مصر، عراق، ایران، حبش اور یمن کے ممالک سے اُستوار ہو گئے، ان ممالک کی تہذیب، وہاں کے تمدن سے براہ راست سابقہ پڑنے لگا، مختلف صناعیوں، ایجادات اور صنعتی پیداوار سے عرب بھی روشناس ہونے لگے، اہل قریش کے تعیش و تمول کا یہی سبب تھا، یہ وہ دور تھا جب ایران کی ساسانی شہنشاہیت نے بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلط قائم کر رکھا تھا یہ تجارت شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی، جزیرۂ روم کے ساحلی علاقوں سے بھی تجارت کا رابطہ قائم تھا یہ سارا علاقہ پارچہ بافی کی صنعت کا بڑا مرکز تھا،

دوسرے عربی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے قبائل انہیں بیت اللہ کے خُدام ہونے کے سبب احترام کرتے تھے، حج بیت اللہ کی سربراہی نے انہیں سماجی برتری دے دی تھی، مکہ معظمہ کی دینی مرتبت کے علاوہ اسے ان تجارتی گذرگاہوں پر مرکزی حیثیت بھی حاصل تھی اس "وادِ غیر ذی زرع" میں جہاں خانۂ خدا کے بانی حضرت ابراہیمؑ نے

اپنی ذرّیت کی سکونت اور اپنے قلب کی سکینت کے لئے دعائیں مانگی تھیں' اور بعد حرم کے مہینوں میں حجاج زائرین اور معتوطنین کے اژدہام سے بڑی رونق رہتی تھی اور یہاں خاص قسم کے روایتی قدیم میلے بھی لگتے تھے اور جہاں کے ہاٹ بازاروں میں اندرونِ ملک کے تجار خریداری کے لئے آتے تھے' اہلِ عرب کی ضروریات کا سارا سامان یہاں ملتا تھا جن میں یمنی پارچے ہسپانیہ کے زربفتی نفیس کپڑے اور خود ہندستان کی صنعتوں میں سے پارچہ بافی اور شمشیر سازی کے نمونے وارد کئے جاتے تھے[1]

چھٹی صدی عیسوی تاریخ عالم کا اہم ترین باب ہے جب ظہور اسلام سے ضلالت و گمرہی کے ظلمات میں اجالا پیدا ہوا اور زندگی بسر کرنے کا سیدھا سچا راستہ منوّر ہوا' انسانیت کو ایک نیا موڑ ملا اور تہذیب کو ایک نیا راستہ ——— اسی عہد میں قسطنطنیہ کے بازنطینی ایشیائے کوچک کی سرحدوں کو طاقت کے بل پر آگے بڑھاتے جا رہے تھے ان کی سرپرستی میں شام تک بنو غسان فرات کے کناروں تک تسلط کے خیمے گاڑ چکے تھے ان کی پُرشکوہ بارگاہوں سے عرب کے مشہور شاعر النابغۃ الذبیانی (م ۶۰۴ء) اور مشہور صحابی شاعر حضرت حسان بن ثابت رض کے پُرزور قصیدوں کی گونج بلند ہو رہی تھی' ان کے حریف والیانِ حیرہ دوسرے کنارے پر تلواروں کی باڑھ باندھ رہے تھے یہ ایران کی ساسانی سلطنت کے سائے تلے عربوں اور ایرانیوں کے مابین واسطہ بنے ہوئے تھے' انہیں کے واسطے سے بلادِ عرب پر ایرانی تہذیب و تمدن کی پرچھائیاں پڑنے لگی تھیں۔

عہد نبوی تک عرب کی تہذیب اور معاشرت درجۂ کمال تک پہنچ چکی تھی اس وقت تین بڑی سلطنتیں عرب کے اردگرد طاقت اور تسلط کی منصوبوں میں کھنچی گھات میں تھیں' رومی' ساسانی اور حبشی مہذب ریاستوں کے مقابلے میں عرب بادیہ نشینوں کی صحرائی تہذیب اور ثقافت کی معاشرت کی زیادہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی' دورِ جاہلیہ میں رہنے والے عرب بادیہ نشینوں کو قرآن جب اعلیٰ سطح پر پھیلی ہوئی تہذیب سے روشناس کراتا ہے تو جنت النعیم کے پس منظر میں سب سے زیادہ ارفع اور اعلیٰ حیاتِ سرمدی' طرزِ زندگی اور انعام و اکرام کا ذکر کرتا ہے مکی سورتوں میں جہاں جہاں جنت کی نعمتوں کے وصف میں مشروبات' ملبوسات

۱؎ کتاب المحبر صفحہ ۲۶۶ ۲؎ کتاب المیزان مولانا عبدالسلام مبارک پوری

اور عیش و تنعم کے لوازمات اور اسباب آسائش و آرائش کے نام گنوائے گئے ہیں وہاں یہ سارے
نام ہمسایہ تہذیبوں کی نشاندہی کرتے ہیں چنانچہ ہم ایرانی پارچہ جات کے ذکر میں سُندُس اور استبرق
کی ریشمی سرسراہٹیں سنتے ہیں (الکہف، الدخان)، تصور میں نفیس فرش (زرابی) بچھے
ہوئے دیکھتے ہیں (الغاشیہ)۔ سرادق (قناتوں) سے پردہ ہٹایا جاتا ہے (الکہف) اور ہم
دیکھتے ہیں کہ جنتی لوگ ایسی فرشوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں جن کے استر ابریشم کے ہوں گے (الرحمٰن)؛
اہل جنت کے ذکر میں باریک ریشم اور اطلس و دیبا کے کپڑوں، ریشم کے سبز لباس کے رنگین بیانات
ہمارے لیے جنت نگاہ اور فردوس نظر بنے ہوئے ہیں — عرب کے متمول تاجر اور سوداگر
ان لوازمات سے نابلد نہ تھے، ان تمام تزئین و آرائش کا سراسر تعلق ترقی یافتہ صنعت پارچہ
بافی سے تھا۔

عرب میں مختلف شعبوں میں صناعوں اور کاریگروں کی کمی نہ تھی، یہاں کئی صنعتی کارگاہیں کام
کر رہی تھیں چنانچہ طائف میں جب بنی ثقیف غالب تھے چرم سازی اور دباغت کے کئی کارخانے
تھے اسی لیے اسے 'بلدۃ الدباغ' کہتے تھے، عرب کی معاشیات میں آہنگری کی صنعت اپنا وجود
منوا چکی تھی مکہ معظمہ کی 'نادیہ زرق' میں تمام پیداوار کے علاوہ کسی دیگر صنعت کو فروغ
حاصل نہ تھا صرف اونٹ کے کھروں کی دباغت اور تیر کی صناعی کو رواج تھا۔ یثرب (مدینہ منورہ)
میں جہاں تما تھا، کرم بعد ہونے کئی صنعتوں نے فروغ پایا۔ بنو قینقاع جو عبداللہ بن سلامؓ
کی برادری کے لوگ تھے زرگری کرتے تھے یہ مضافات مدینہ میں آباد تھے۔ ظروف سازی میں بھی
ماہر تھے، معاشی حیثیت سے مدینہ اور اطراف میں بسنے والے یہودیوں کی حالت عرب قبائل کی
بہ نسبت زیادہ مضبوط تھی ان کے اجداد شام کے متمدن علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں بود و باش اختیار
کر چکے تھے یہ بہت سارے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے، یہودی تاجروں کے
تجارتی تعلقات دیگر قریشی سوداگروں کی طرح بیرون عرب سے استوار تھے اس وجہ سے یثرب اور
بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کا خاص پیشہ تھا پارچہ بافی کی
صنعت انہیں کے سبب بام عروج پر تھی یہ خود چابک دست صناع تھے۔ انصار مدینہ نے یہودیوں
کی تربیت میں رنگتی (رنگریزی) اور زنگ سازی کے ہنر سیکھے تھے، زراعتی آلات کی تعمیر و ساخت
میں بھی انہوں نے میدان مار لیا تھا۔

عربوں کی نساجی

بافندگی کا پیشہ عموماً خاص قبیلوں کا آبائی شغل تھا مدینۂ منورہ میں بنو نجار کا قبیلہ اس فن میں ممتاز تھا یہ رسول اکرمؐ کے ننہیالی قرابت دار تھے۔ صدیوں پہلے غالباً یمن کے بادشاہ تبع کے عہد میں ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے یمن عہد قدیم سے صنعت نساجی میں نظیر نہیں رکھتا تھا یہودیوں کی کئی صنعت گاہیں مدینہ میں قائم تھیں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی کارگاہ مقامِ سنح میں تھی غالباً یہ پارچہ بافی کی تھی اس لئے کہ آپ بزازی بھی کرتے تھے اور خود طلائے بیچنے جاتے اور بازار سے سودا سلف لانے کا بھی آپ کا شغل تھا صحابیات بھی حیاکت میں بڑی حیثیت رکھتی تھیں یہاں تک ماہر اور لائق دستکار تھیں کہ رسول اکرمؐ کے شایانِ شان بُردہ بُن لیتی تھیں۔ ایک صحابی حضرت سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ ایک مدنی خاتون ایک بُردہ لائی" حضرت سہل نے پوچھا: "تم جانتے ہو بُردہ کیا چیز ہے؟" ان کو جواب دیا گیا "بُردہ اس چادر کو کہتے ہیں جس کا حاشیہ (کناری) بُنا ہوا ہو۔ اور اُس نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ میں نے یہ چادر اپنے ہاتھوں سے بُنی ہے میں یہ آپ کو اُڑھاؤں گی" چنانچہ آپ نے لے لیا۔ اُس وقت آپ کو ضرورت بھی تھی پھر اس کا تہبند باندھ کر ہمارے پاس تشریف لائے، عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو وہاں حاضر تھے کہا "یا رسول اللہؐ یہ چادر مجھے عنایت فرما دیجئے! آپؐ نے فرمایا اچھا۔ پھر نبی کریمؐ مجلس میں بیٹھ گئے اس کے بعد جب اُٹھ کر گئے تو اس کو لپیٹ کر ان کے پاس بھیج دیا لوگوں نے ملامت کی کہ کیوں اس چادر کو مانگا جو آپ کی مرغوب خاطر تھی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو ایک جلیل القدر صحابی گذرے ہیں یہ چادر اس لئے مانگی تھی کہ مرنے کے بعد یہ اُن کا کفن بنے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ اس میں کفنائے گئے" [1]

قبیلۂ طفاوہ کی ایک خاتون بھی کرگہ پر کپڑا بُنتی تھی اس کے پاس بافندگی کے اوزار بھی تھے، عورتیں سوت بھی کاتتی تھیں اور کتر بیونت کر کے کپڑے بھی منوال پر بُن لیتی تھیں اصحاب رسولؐ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ خود ایک خاندانی بافندے تھے ان سے یہ آبائی پیشہ ان کے صاحبزادے شیخ عبداللہ انصاری بن ابو ایوب الخالد الانصاری کو وراثت میں ملا، اشعث بن قیس بن معد

---

[1] صحیح بخاری تیسیر مکمل اردو ترجمہ مرزا حیرت دہلوی ج ۱ ص ۲۶۶۔ کراچی ۱۳۲۴/۱۹۰۶ (مملوکۂ مصنف)

یکرب الکندی کا گھرانہ حیاکت میں اتنا قدیم تھا کہ حضرت علیؓ انہیں ابن الحائکؓ کہہ کر خطاب کرتے تھے اسی طرح ابوموسیٰ اشعریؓ مشہور صحابی، خوش الحان قاری اور فقیہ بھی ابن الحائک کہلاتے تھے، عشرہ مبشرہ کے معروف صحابی حضرت ابوطلحہ انصاریؓ بھی پارچہ بافوں کے خاندان میں شمار ہوتے تھے، بافندگی بالخصوص بنی نجار کا موروثی پیشہ تھا وہ اس صنعت میں ایک شاندار روایت کے حامل تھے یہ قبیلہ بنو خزرج کی شاخ تھی، رسول کریمؐ نے انصار مدینہ میں سے اس گھرانے کو بڑی فضیلت دی تھی جیسا کہ صحیحین اور سُنن سے ثابت ہوتا ہے اور انصار تو آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھے آپ اپنے کپڑے بنی نجار کے یہاں بُننے کو دیتے تھے اور بار بار کچھ قرابت داری اور ننھیالی عزیز ہونے کی خاطر اور کچھ دستکاری سے شغف کے سبب ان کپڑوں کو دیکھنے جاتے اور فرماتے تھے کہ جلدی تیار کرکے دے دیں تاکہ انہیں پہن کر اور نفیس بن کر لوگوں سے ملاقات کرتے رہیں[1]

مدینۂ منورہ کی صنعت گاہوں میں اونی کپڑے بھی تیار کئے جاتے تھے، بنو ساعدہ جو بنی نجار کی طرح یمنی تھے اور خزرج قبیلے کی ہی شاخ تھے وہ بھی بافندگی کے خاکے کے مالک تھے، حضرت سہل بن سعدؓ سے ملبوسات اور پارچوں کے بارے میں جو متعدد احادیث مروی ہیں اُن سے یہ قرینہ ملتا ہے کہ آپ بھی حیاکت کی صنعت سے وابستہ تھے، نساجین کی مدینہ میں کئی کارگاہیں تھیں۔

عرب میں بُنائی کے کاریگر کو عام طور سے حائک کہتے تھے، نسّاج بھی ہم معنی تھا پارچوں کے مختلف اقسام کے سبب بافندوں کی شُہرت مختلف تھی، مثلاً قز سے ریشم بافی کو قزاز کا اعزاز ملا گیا، حریری بھی ریشم بافی تھے اور خامی یا سفید باف کچا (خام) مال تیار کرتے تھے، اونی، ریشمی یا ابریشمی، زربفت، اطلس، دیبا (دیباج) حریر، سُندس، استبرق، قطنی (کتانی) وغیرہ دیگر مختلف انواع پارچوں کی کارگاہیں اور دستگاہیں تمام ممالک اسلامیہ میں اس عہد میں عروج پر تھیں، سرکاری کارخانے (طراز) قائم تھے جو اہلِ حکومت کے لیے مکلف ملبوسات تیار کرتے تھے۔

عہد عباسیہ ($\frac{١٣٢-٦٥٦}{٧٤٩-١٢٥٨}$) کے دورِ عروج میں تہذیب و ثقافت اسلامیہ نے تنعم و تعیش

---

[1] دستکار اہلِ شرف مصادل تذکرۂ نسّاجین، محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن عظمی، اعظم گڑھ $\frac{١٤٠٦}{١٩٨٥}$، ص ٢٧

کے ایسے اسباب اور لوازمات مہیا کر دیے تھے کہ اس وسیع سلطنت کا ہر نظارہ 'فردوس نظر'
اور جنت نگاہ' بن گیا تھا، امرا کی ہر محفل 'ساقی بجلوہ' او مطرب نغمہ زن' سے 'فردوس گوش'
بن گئی تھی، وقت کے شبستانِ حرم میں تاریخ کی شہرزاد الف لیلوی شہروں کی ہوشربا داستان
سنا رہی تھی اور حسین شہزادیاں اور شب زادیاں زرق و برق ملبوسات میں بڑا طمطراق دکھلاتی
تھیں ــــ لیکن ان تمام ہوشربا طلسماتی نظاروں کے ساتھ علم و ادب، اور حدیث و فقہ کی
سحر آفرینیاں بھی اپنی تاثیر اور توقیر دکھلا رہی تھیں، مطربائیں رہزنِ تمکین و ہوش بن کر
بیت القیان (موسیقی گھر) میں جلوہ نمائیاں کرتی تھیں تو دوسری طرف بیت الحکمہ میں 'قال اللہ
اور قال الرسول' سے ایمان میں تازگی پیدا ہوتی تھی، کوفہ میں اہل الرائے اور اہل القیاس کا
ہنگامہ تھا تو دوسری طرف بغداد اور بصرہ میں ابو عبداللہ احمد بن حنبلؒ جیسے صالح۔ بے باک
فقیہ اور کتاب و سنت کے علمبردار بھی موجود تھے، یہ حنبلی مذہب کے بانی اور امام تھے۔

مدینۃ النبیؐ سے دوری کے سبب 'اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول' کی گرفت بھی کسی حد تک ڈھیلی
پڑ گئی تھی، مجموعی طور پر اسلام حجازی اقتدار اور عراقی عجمی اقتدار میں بٹ چکا تھا اور فقہ میں اہل الرائے
اور اہل حدیث کے مختلف مکاتب خیال قائم ہو چکے تھے، بغداد حریم خلافت کا مرکز تھا، نومسلموں اور
مہاجرین کے قافلے در قافلے آتے رہے اور بغداد، کوفہ اور بصرہ میں بستے رہے ان میں مختلف
علوم و فنون کے ماہرین تھے اور ایرانی مہاجرین جو اپنے ساتھ عجمی روایات کی میراث لائے تھے، بغداد
تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، کوفہ علمی و فقہی مذاکرات کا اکھاڑا، ان تمام شہروں میں نو دولتیوں
کی بارگاہیں رونق پذیر تھیں اور صناعوں اور دستکاروں کی کارگاہیں کھنک چکی تھیں، اسلامی تہذیب
کا عروج، ثقافت کی ترقی، معیشت کی فراوانی مال و دولت کی فراوانی جاہ و حشم کے دلآویز نظارے،
درباروں میں استبرق کی مسندیں، زربفت کے استر خوابگاہوں کی خواب آور مسہریاں اور ان پر بچھی
ہوئی اطلسی پوشش، بارگاہوں کے زریں اور ریشمی مشجر پردے، تکیے، موتے غرضکہ زیب و
زینت کی ہر پیرہن کا ہر ایک تار اور تاگا پارچہ بافی کی صنعت سے بندھا ہوا اور منسلک تھا۔

بل ترقہ میں بل یباکت کی فضیلت مسلّم ہے۔

کوفہ ــــ عباسی خلافت کا دوسرا علمی دینی اور فنی مرکز تھا یہاں پارچہ بافی کے مختلف اقسام
کی کارگاہیں قائم تھیں، ریشمی رومال جسے مندیل کہتے تھے یہاں کی خاص مصنوعات میں
شمار ہوتا تھا کوفہ کی مناسبت سے اسے 'کوفیہ' کہتے تھے عورتیں انہیں سر پر باندھتی

نفیس ریشمی پارچوں اور ریشمی ملبوسات (حُلّہ) جنہیں 'الکوفی' کہتے تھے یہاں کی خاص صنعت تھی[1]
کوفہ میں سوزن کاری کا کام بھی ہوتا تھا اِسے دَشتی کہتے تھے یہ ترکستان کے دشت قصبے میں بُنا، کاڑھا
اور رنگا جاتا تھا، دَشتی ایک خاص قسم کا سُرخ ریشمی اور اطلسی رومال تھا جو باہر کوفہ میں درد کیا جاتا
تھا یا اُس کی نقل اسی نام سے فروخت ہوتی تھی بخار شکوری میں سینکڑوں علما بزاز، خزاز، حریری اور خامی کے کام سے پیدا ہوئے

نساجی کا پیشہ اور بزازی کا شغل امام ابو حنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ) کے عجمی النسل خاندان میں موروثی
حیثیت کا حامل تھا، امام صاحب نے خز (ریشمی پارچوں) کی صنعتگاہیں کوفہ میں قائم کر رکھی تھیں
اور کوفہ کے محلہ کے 'بزازی (کپڑے کی خردہ فروشی) کے لئے اٹھار رکھے تھے'، اعلیٰ دکان تھی اور اعلا
درجے کے تاجروں سے معاملہ رہتا تھا خود بھی اپنے معاملات میں اعلیٰ درجے کی دیانتداری برتتے
تھے گماشتے مقرر تھے جو ان کے کارخانے کے مال تھے اندرونِ ملک میں وارد کرتے تھے لاکھوں کا
لین دین تھا۔[2]

اونچے معیار کی صنعت اور اعلیٰ قسم کے مصنوعات کو اہلِ دولت و اہلِ حکومت کی سرپرستی حاصل
ہو جائے تو تجارت میں ساکھ قائم ہو جاتی ہے اور مال کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ بارھویں صدی
عیسوی میں ایک اُموی شہزادہ عتّاب، نفیس ملبوسات کا شوقین تھا اور اعلیٰ قسم کے پارچوں کے
استعمال کا ذوق رکھتا تھا، اس محلے کا جہاں یہ رہتا تھا اور جہاں پارچہ بافی کے کارخانے تھے "عتّابیہ"
نام پڑ گیا اور کپڑا بھی عتّابی کے نام سے چل نکلا اور اندلس کے بازاروں میں جا پہنچا، اندلسی
عرب دستکاروں نے اصل کی نقل میں ایسا کمال دکھایا کہ فرانس اور اطالیہ سے اس کی تجارت
کر کے مالا مال ہو گئے یہی عتّابی 'تبی' کے نام سے ان کی زبانوں پر چڑھ گیا، مغربی اندلس میں
"شنترین" نام کے شہر میں دستکارانِ اہلِ شرف، نساجی میں جو یدِ طولیٰ رکھتے تھے اُسے کرامات
سے تعبیر کرتے تھے ان کے ہاتھوں کے بُنے ہوئے زربفت کے نفیس پارچے عوام الناس میں
"کراماتی" کپڑے کے نام سے ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے لیکن اندلس کی حکومت نے اس کی فروخت اور پاس
پر قدغن لگا دی یہ زرنگار رنگ کپڑا گراں تھا اور ایک ہزار اشرفی سے زیادہ (ایک طاقہ تھان) کی قیمت تھی[3]

---

[1] مسالک الممالک۔ اصطخری ص ۵۳
[2] سیرۃ نعمان مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی (دہلی)
(۱۳۷۶/۱۹۵۶) ص ۵۱-۵۸
[3] ابن حوقل، کتاب المسالک و الممالک، لیڈن، ص ۱۲۱
[4] کتاب التمدن۔ ج ۱۔ ص ۳۸

ایران کے منقش غالیچے، نفیس قالینیں اور فرش — بیرونی تاجروں کے لیے زرِ شش راہ بنے رہتے تھے، سارے ملک میں فنی دستگاہیں تھیں اور پارچہ بافی کی کارگاہوں کے تار و پود پھیلے ہوئے تھے، خوزستان میں تستر اور سوس میں ریشم کاتنے، تاگہ بُننے، تننے بونے اور کاتنے کے کاریگروں کی کمی نہ تھی، کلتے ہوئے ریشم (خز) سے نقش و نگار بنائے ہوئے پردے امرا کی عیش کوش زندگی کی پردہ داری کرتے تھے، اسے 'سوسی سازی' کہتے تھے جس میں یہاں کے ماہر دستکار بڑی شعبدہ بازی دکھلاتے تھے، ریشم کے حُلّے اور ملبوسات سوس اور تستر کے خاص مصنوعات تھے ریشمی (خز) پردوں پر بیل بوٹے کا کام طلائی تاگوں سے کیا جاتا تھا اسے دمسک بھی کہتے تھے جو غالباً دمشق کا بگڑا ہوا نام ہے اور اسی سے مشتق ہے فارس صوبہ میں توّاج اور فسا شہروں میں قالین بافی، سوزن کاری، کارچوبی، زربفتی کے کارخانے پھیلے ہوئے تھے یہاں جُبّہ، ردا، عبا اور خلعت کی صناعی کا شہرہ تھا اور یہ سارے امیرانہ زندگی اور دربارداری کے لوازمات تھے، طراز یعنی نقش و نگاری کی صنعت کو امرا اور نودولتیے طبقہ کی سرپرستی حاصل تھی، شیراز میں اونی اور ریشمی دھاری دار عبائیں ہراتی تھیں، اور کمخواب کے بیدقیمتی ملبوسات اپنی شان دکھلاتے تھے، عہدِ وسطیٰ میں یورپ کے بازاروں میں ایران کے نفیس پارچہ کی بڑی مانگ تھی، بیگمات کے ملبوسات افسے تیار کیے جاتے تھے، خراسان اور آرمینیا کے صنعتی مراکز میں سنہرے کمخواب اور مشجر غلاف، منقش پردے، تکیوں کے استر اور صوف کے کپڑے اور پلنگ پوش چادریں امرا کے محلات۔ اور ایوانوں اور بارگاہوں کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ وسطی ایشیا میں بخارا کی دینی فضا میں مصلّیٰ (جانماز) کے کاریگر بڑا پاکیزہ کام کرتے تھے،

مصری مصنوعات اپنے شہروں کی مناسبت سے معروف تھیں، مختلف پارچوں کے نام یہ تھے جو عالمگیر شہرت رکھتے تھے:

دمیطی (دمیاط سے)، دبیقی (دبیق سے)، تنیسی (تنیس سے)، جن کو دساور بھیجے جاتے تھے، ایران میں ان کی نقلیں کی جاتی تھیں[1] آنحضرتؐ کے عہد میں مصر کے قس میں بنا ہوا قسّی

کپڑا رائج تھا لیکن آپؐ نے اس کا پہننا ممنوع قرار دیا تھا[1] اس لیے کہ یہ ریشم سے بُنا جاتا تھا
تمام ملکوں سے زیادہ یمن کی صنعتِ پارچہ بافی کی شہرت تھی اور یہ سب سے قدیم بھی تھی اور
سب سے زیادہ عروج پر اُس وقت تھی جو قومِ سبا کا زمانۂ عروج تھا حضرت داؤد اور سلیمان
علیہم السلام کے عہد تک جنوبی عرب کی اس ثروتمند قوم کا شہرۂ آفاق گیر بن چکا تھا ایک عرصہ تک
یہ آفتاب پرست رہے اور کواکب انہیں دیوتا اور دیویاں نظر آتی رہیں، قومِ سبا کا عروج اور
تموّل دو بنیادوں پر مبنی تھا، زراعت میں، مآرب کا بندِ آب پاشی کا مخزن بن گیا اور سارے علاقے کو
باغستان بنا دیا، تجارت کے لیے اس قوم کو خداوند تعالیٰ نے بہترین جغرافیائی مقام عطا فرمایا
تھا ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہ قوم بلادِ مشرق و مغرب کے مابین تجارتی سرگرمیوں
کا واسطہ بنی رہی، اس کے ساحلی شہروں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے،
ہندوستان کے سوتی پارچے، شمشیریں اور دیگر مصنوعات کی برآمد نے تجارت کا بازار گرم کر
رکھا تھا۔ خود یمن کی مصنوعات خصوصاً قسم قسم کے پارچہ جات، رنگا رنگ ملبوسات بحیرۂ قلزم
کے بحری راستے سے اُردن اور مصر کی بندرگاہوں تک بھیجے جاتے تھے۔

یمن میں قدیم عرب قبیلے قبل از اسلام سے نساجی اور رنگائی میں اپنی مہارت اور لیاقت
دکھا رہے تھے، کندہ اور اشعر کے یمنی قبیلوں میں بُننے بُننے کا پیشہ عہدِ قدیم سے جاری تھا دوسرے
قبیلے، شاخیں اور خاندان اسی بافندگی کے تاروں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ رُہام، تدمُر اور معافر،
ہمدان اور حمیر کی شاخیں تھیں اور نساجی کے فن میں بے نظیر رکھتی تھیں جن سے متعلق گھرانوں
کی تعداد کثیر بے شمار ہے لیکن ہر گھرانہ بافندگی میں طاق و یگانہ تھا۔ مدینہ منورہ کے انصار
جن کا آبائی پیشہ نساجی تھا یمنی الاصل تھے ان کے اجداد تلاشِ معاش کے پیچھے دھاگے میں بندھے
یمن سے یثرب آئے اور بافندگی کا موروثی پیشہ ساتھ لائے، ان میں بنو نجار اور بنو ساعدہ اور اشعری
گھرانے خاص طور سے معروف تھا۔

قبیلہ معافر جو ہمدان اور حمیر کی شاخ تھی صناعی میں تجدیدِ رنگ و بو رکھتا تھا معافر کا نام
کافور کی طرح پھیلا ہوا تھا اور تانے بانوں کی مانند بکھرا۔ جہاں بود و باش اختیار کی اُس محلے نے
وہی نام اختیار کیا، جو کپڑا وہ بناتے معافری کہلایا، جہاں اکٹھے رہے معافر کہلائے اور جب بٹ گئے

---

[1] صحیح مسلم۔ کتاب اللباس والزینۃ

تو بنو قرافہ اور بنو ناشرہ بکھر گئے"۔ اسکندریہ میں نساجی کی نشوونما کی تو قرافہ قبیلے کے نام پر محلہ قرافہ آباد ہوا مصر کے ملوں میں جا بسے تو قرافۂ کبریٰ اور قرافۂ صغریٰ کے محلے انہیں باقندوں کی طرف منسوب ہو گئے۔

سابقون میں اصحاب کرام یعنی طبقہ اولیٰ کے بعد جو طبقۂ ثانیہ اور طبقۂ ثالثہ (تیسرا) میں فقہا، تابعین اور تبع تابعین اور طبقۂ رابعہ (چوتھا) میں جو محدثین کے اسمائے گرامی ملتے ہیں ان میں سے ایک کثیر تعداد یمنی قبیلہ معافر سے متعلق تھی۔ رسول کریمؐ نے معافری پارچہ باقندوں سے کئی مواقع پر اپنے تعلق خاطر کا اظہار فرمایا۔ یمن کے مصنوعات پارچہ بافی کے کثیر اقسام تھیں اور مخصوص نام جو یا تو قبیلہ سے منسوب تھے یا جغرافیائی نسبت سے معروف تھے جیسے معافریہ، قدمیہ (قدم قبیلہ)، سدیریہ، سعیدی، ثیٔ، معافریہ وغیرہم۔ سحول شہر میں اعلیٰ قسم کا کپڑا "سحولیہ" بنایا جاتا تھا جبر میں مخطط (خطوط والے یعنی دھاری دار) پارچہ اسی نام سے معروف تھے۔ کارگاہ دار یعنی (مخطط) بُردہ الیمن ۔۔ یمن کی چادر رسول اکرمؐ کی پسندِ خاطر تھی حُلّۂ یمانی، دُر حلّہ نجرانیہ جس میں گل دوزی اور بیل بوٹے کی نقاشی ہوتی تھی سب سے زیادہ مشہور اور کثیر الاستعمال کپڑا ۔۔ اور ملبوس تھا۔

بافندوں کے محلے:

عہد وسطیٰ میں اسلامی ممالک کے بڑے بڑے شہروں اور صنعتی مرکزوں کا ایک خاص کردار تھا اور معاشرتی ہیئت اور حیثیت تھی، ہر پیشے کے الگ الگ محلے آباد تھے آبادی کے مرکز میں جامع مسجد ہوتی تھی جس کے ارد گرد بازار (بزازی) ہوتے تھے۔ عطاری اور وراقی کی دکانیں ہوتی تھیں۔ قیصریہ کا مرکزی بازار صرف پارچہ جات کے لئے مخصوص تھا جہاں تھوک فروشی ہوتی تھی۔ ہر خاص پیشہ وروں کی طرف منسوب تھا چنانچہ مصر میں قرافہ کبریٰ اور قرافہ صغریٰ فاطمیوں کے عہد میں اسی قبیلے کے بافندوں کے لئے مخصوص تھا۔ بغداد میں سوتی کپڑوں کے

بُنکروں کا محلہ کتان، قطن کی مناسبت سے دارالقطن کہلاتا تھا، امام دارقطنی مشہور محدث کی بود و باش اسی محلے میں تھی، دارالقز میں ریشم باف رہتے تھے اور ان کی بافندگی کے کارخانے بھی یہیں تھے، اسکندریہ میں بافندوں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ان کا محلہ قرافہ محترم تصور کیا جاتا تھا۔ ہر محلے کی اپنی ایک انفرادیت تھی اور علاحدہ حیثیت لیکن اسلام کے نام پر تہواروں پر اور خاص حالات میں حصاریں ٹوٹ جاتیں، آہنی دروازے جن سے ہر محلے کی حفاظت مقصود تھی کھل جاتے۔ یہ اور بات کہ مذہب یعنی حنفیت اور شافعیت کے نام پر برسوں نیشاپور کی طرح اور شہروں میں بھی نویں صدی سے مناقشے اور مناظرے عام ہوگئے تھے۔ تنظیم ہی اور جماعتی استحکام نے گروہ بندی اور بڑی حد تک عصبیت کی داغ بیل ڈال دی تھی لیکن اس طرح امدادِ باہمی کی نشو و نما ہوئی اور جماعتی بہبود و فلاح کی بنیاد پڑی جس نے انجمن کی شکل میں پیشہ وروں، اربابِ ہنر اور اہلِ فن کے مختلف اصناف (صنف) کی تنظیم کی، بُنکروں اور [illegible] کی الگ ایک صنف تھی۔ یہ ایک قسم کا تربیتی ادارہ بھی تھا۔

تیسری ہجری مطابق نویں صدی عیسوی میں اکتسابِ رزق، تجارت، صنعت و حرفت پر کئی اہم تصانیف منظرِ عام پر آئیں، الشیبانی (متوفی ۱۸۹/۸۰۵) کی کتاب الکسب کا ایک خاص مقام ہے ابن سماعہ (م ۲۳۳/۸۴۷) اس کے شاگرد نے اس کی تلخیص الاکتساب فی الرزق المستطاب کے نام سے کی تھی۔ الجاحظ (متوفی ۲۵۵/۸۶۹) نے معاشیات پر کئی تصانیف چھوڑی ہیں، ان میں التبصر فی التجارۃ بہت معروف ہے اس میں ایک طرح سے مسلم تاجروں کے تجارتی تجربات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

تہذیبی اور ثقافتی عروج کی داستان میں ہر حرفہ و صنعت کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کی زندگی کے تمام تکلفات، آرائش و زیبائش کے لوازمات کے پس منظر میں بُنکر اور دستکار کے فنی منصب اور محنت کے نقوش اُبھر گئے تھے، عوام سے لے کر خواص تک اُن کی خدمت گزار تھے۔ حریم ناز سے لے کر حرم تک، بارگاہ سے لے کر درگاہ تک، شہری کے ملبوس سے لے کر مزار کے غلاف تک درویش کے تار تار پیرہن سے لے کر مردے کے کفن تک — ہر ایک کا ایک ایک تار دستکار کے فن سے جڑا اور بندھا ہوا تھا یہی فنکار تھے جو ریشم، اطلس، دیباج، زربفت

(کم خواب) کے کپڑوں سے زرق برق خواب بنتے تھے جو صرف امیر دیکھ سکتے تھے جو محلوں میں رہتے تھے۔ اور یہ محلوں میں بستے تھے، لیکن ان خاکساران جہاں میں علم و ادب کے میدان کے ایسے شہسوار بھی تھے جو اہلِ قلم بھی تھے، ابن سعد (متوفی ۲۳۰ھ/۸۴۵ء) نے "طبقات الکبیر" میں ایسے نام گنوائے ہیں جو بافندگی سے منسلک تھے یا پارچہ فروشی سے مربوط، شیخ احمد بعلی دمشقی حنبلی الآجہ ایک قسم کا پارچہ بُن کر گذارہ کرتے تھے آپ فقہ کے جید عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔

محدث میمون بن مہران (متوفی ۱۱۷ھ/۷۳۵ء) جو دیوان الخراج میں معتمد تھے ایک بافندہ خاندان کے فرد تھے۔ محمد بن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ/۷۲۹ء) جو ایک جید فقیہ اور خوش الحان مقری تھے کوفہ کے ثروتمند بزازوں میں شمار ہوتے تھے۔ صحیح مسلم کے مرتب و مؤلف ابو الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیشاپوری (۲۰۶-۲۶۱/ ۸۲۱-۸۷۵) بھی بزاز تھے، امام ابو حنیفہ پارچہ کے تھوک فروش اور بساطی تھے۔ خز (ریشم) کوفہ سے صادر کرتے اور اپنے شرکت دار حفص بن عبد الرحمٰن کو بغداد میں گماشتہ مقرر کر کے ریشمی طاقے کا بیوپار کرتے تھے۔ محدث یونس بن عبید بصری (متوفی ۱۳۹ھ/۷۵۶ء) ریشمی پارچہ (خز) درآمد کر کے بیچتے تھے اس کے بدلے میں یہ ریشم (خز) سوس بھیجتے تھے اس کاروبار سے انہوں نے ڈھیر ساری دولت کمائی تھی۔

ریشم (خز) کی صنعت اور تجارت میں یہودیوں کا عمل دخل بڑھا ہوا تھا، ان کی خاص صنعت لٹھا اور پارچۂ کتانی تھا۔ یہ چمکیلے پارچے بنانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے رنگریزی اور رنگ سازی میں بھی یہ بڑی رنگینیاں دکھلاتے تھے، ان کا طریقۂ عمل خاص ان کی ایجاد تھی اور جُز ترکیبی خاص ان کی دریافت تھی، رنگ سازی میں یہ ایک خاص جُز یا جوہر استعمال کرتے جو گھُل کر قوس قزح رنگوں کی طرح کھل اٹھتا اور رنگ برنگی بن جاتا، اور افشاں کی طرح چمکنے لگتا۔ بحیرۂ روم کی ساحلی تجارت پر بھی یہودیوں کا قبضہ تھا۔ ہندوستان سے سوتی پارچے برآمد کرتے تھے، مصر میں پارچے کے تاجر یہودی ہی تھے، مصری عیسائی قوم نے بھی دستکاری کو ذریعۂ معاش بنا لیا تھا۔ بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں میں جہاں کثرت سے پارچہ بافی کی صنعتیں تھیں اور شکر آباد تھے ایک جماعتی تنظیم "صنف"[1] کی بنیاد ڈالی گئی تھی نویں صدی عیسوی سے صنعت و حرفت

---

[1] انگریزی میں GUILD کہتے ہیں

کے فروغ کے ساتھ اس قسم کی انجمنوں کا انعقاد تقویٰ باہمی اور تعاون باہمی کی مقصدیت کے پیش نظر کیا جاتا تھا، تاکہ صنعت کی حفاظت ہو سکے کساد بازاری میں کمزور دستکاروں کو سنبھالا دیا جائے اور سیار بافندگی ہمیشہ اعلیٰ سطح پر قائم رہے، صنف کے قوانین وضوابط مرتب کئے جاتے شاگردوں کو فنی تربیت دی جاتی اور فارغ ہونے کے بعد انہیں صنف میں شامل کر لیا جاتا، صنف کی دینی اور مذہبی حیثیت کا بے حد خیال رکھا جاتا اور شریعت کے حدود میں رہ کر سارے امور انجام دئے جاتے، سربراہ کو شیخ کہتے تھے اسلامی نظام حکومت میں محتسب ہوا ایک خاص عہدہ دار ہوتا تھا بازاروں کارخانوں اور دوکانوں کا نگراں رہتا تھا۔ اوامر ونواہی کے جاری کرنے اور ممنوع وغیر شرعی کاموں کو روکنے کا ذمہ دار رہتا تھا، بیع فاسدہ، خراب مال، جھنگا مال اور جملہ خرابیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا، "صنف" کی تنظیم پر صوفیوں کے اثرات غالب تھے فتوت (جو جمہ گیر اوصاف کا حامل لفظ ہے) اور مردانگی کے تصورات نے بھی صنف پر گہرا اثر ڈالا تھا" موروثی پیشہ کا سلسلہ خاندان میں برقرار رکھنا احسن سمجھا جاتا تھا،

ملبوسات:

پارچوں کے ساتھ ملبوسات کا دامن بندھا ہوا ہے ان دونوں کے استعمال پر شریعت کی بھی بندشیں اور پابندیاں ہیں جیسے مردوں پر زینت کی دو چیزیں حرام کر دی ہیں جبکہ عورتوں کے لئے حلال قرار دی ہیں یعنی سونے کے زیورات اور خالص ریشم پہننا حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے ریشم کو اپنے دائیں ہاتھ اور سونے کو بائیں ہاتھ میں رکھ کر ارشاد فرمایا: "یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں[2]"

— اور آج بھی ازدواجی زندگی میں جب نیا بیاہتا جوڑا قدم رکھتا ہے تو دولہے میاں کو سونے کی انگوٹھی یا گھڑی پہنا کر حرام عمل اور ممنوع چیزوں سے ان کا آغاز کرتے ہیں۔ آپؐ نے خصوصاً ریشم کے استعمال پر سخت وعید فرمائی ہے اور اس بارے میں کئی حدیثیں وارد ہیں کیونکہ یہ اُن (مردوں) کا لباس ہے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں[3] "قسی"، "استبرق"، "دیباج"، اور "حریر"

---

[1] اسلام میں حلال اور حرام، علامہ یوسف القرضاوی اردو ترجمہ شمس پیرزادہ، ادارہ سلفیہ بمبئی ص ۱۱
[2] صحیح مسلم کتاب اللباس والزینة

ریشمی کپڑوں کو مردوں کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے مگر جس میں ریشم اور سوت ملا ہوا ور ریشم کا حصہ زیادہ نہ ہو اسکی اجازت ہے، اسی طرح آپؐ نے چند رنگوں کے استعمال پر پابندیاں لگائی ہیں مثلاً زرد رنگ کے کپڑے، کُسُم میں رنگے ہوئے لباس مردوں کے لئے مُباح نہیں۔ ایسا کپڑا جس پر ریشمی نقش بنا ہوا رجوان (سُرخ رنگ) کا زین پوش اور سُرخ دھاگا، دیبا کی قبا (جُبہ) شارع علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق حرام ہیں، آپؐ کو سبز رنگ پسند تھا اور پوشاک عموماً سفید ہوتی تھی کیونکہ سفید رنگ اللہ تعالیٰ کو مرغوب ہے، یمنی چادریں بجد پسند تھیں جو دھاری دار (مخطّط) ہوتی تھیں[۱]۔ آپؐ کا لباس سادہ مگر نظیف و پُروقار ہوتا تھا درویشانہ زندگی تھی لیکن قلوبِ عالم پر سلطانی کرتے تھے، نام لباس میں تہمد، چادر اور کُرتا تھا، جُبہ زیب دتیا تھا اور کمبل (نمدہ) جس میں پیوند لگے ہوتے تھے آپؐ کو باری تعالیٰ نے "مُدثر" اور ـ کالا زقہ یا سرف نے "مزمّل" کا خطاب دیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اولیاء کرام کے نزدیک سورہ مزمل کو "سورۃ الخرقہ" بھی کہتے ہیں[۲]

صنعت نساجی کی مصنوعات اور ملبوسات کی وجہ سے امیرانہ زندگی میں تکلفات داخل ہو گئے۔ ملبوسات میں نئی نئی قطع، بناوٹ اور زینت کی ایجادات نے وہ کرشمے دکھلائے کہ اُن کے سامنے یورپ کی تہذیب ننگی نظر آتی تھی، مادی ترقیوں نے تہذیبی اور ثقافتی فتوحات کے دروازے کھول دئے تھے، شہری تصورات کو فروغ حاصل ہوا، نئی تجارتی منڈیاں قائم ہوئیں، عباسی خلفاء کے دورِ حکومت میں اور مسلم اندلس میں اموی امیروں کی سطوت نے (۹۶۱-۷۵۶) تک تمول کی فراوانی رہی اور تعیش کی فزونی، یورپ کے کئی ملکوں کے مقابلے میں اندلس کی آبادی بڑھی ہوئی تھی قرطبہ میں جو بقول اقبال دیدۂ مسلم کا نور تھا، ۱۳ ہزار بنکر بستے تھے اور صنعت پارچہ بافی کو جدید فروغ حاصل تھا۔ مسلمانوں نے علوم و فنون میں جو سرمایہ عظیم ورثہ کے طور چھوڑا ہے اس کی یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ وہ دستکار اور اہلِ ہنر جنہوں نے ہاتھوں سے کسبِ حلال کمایا اور اکلِ حلال سے روح کی بالیدگی اور تربیتِ ایمانی حاصل کی آگے چلے گئے ہیں۔ اور اپنا ہنر چھوڑ گئے ہیں۔ نیک مردوں کا عمل نیاحہ (سلائی) اور نیک عورتوں کا عمل چرخہ کاتنا تھا، شیطان ان سے دور رہے اور وسواسِ نفسانی قریب نہ آئے[۳]

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود (اقبال)

---

[۱] صحیح مسلم کتاب اللباس والزینۃ [۲] تفسیر عزیزی [۳] کتاب التمدن، حصہ دوم صفحہ ۱۰۸

چوتھا باب

ہندستان کی پارچہ بافی

پارچہ بافی ہر ملک کی تہذیب کا اولین مظہر ہے۔ ہندستان میں بھی یہ صنعت قدامت کی حامل تھی اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے امتیازات اور روایات میں ایک خاص مقام رکھتی تھی نفیس مصنوعات کی مانگ مصر و یونان و روم کی منڈیوں میں تھی اور یہ عالم تھا کہ نیرو کے عہد میں یہاں کا ململ اعلیٰ طبقہ میں سب سے زیادہ کثیر الاستعمال تھا۔ پیغمبران اسرائیل کے زمانے میں بابل اور اشور کے پارچہ بازاروں میں ہندستان اور خصوصاً ڈھاکہ کے ململ و [illegible] سجائی دیتی تھیں، قیصر روم کے مکلف ایوانوں اور شبستانوں میں حریری مشجر پردے زینت بڑھاتے تھے اور مصر کی ممیوں کو جن بہترین کپڑوں میں کفنایا جاتا تھا وہ ہندستانی تھے۔ بقول [illegible] شہر اسکندریہ میں ہندستانی پارچوں کی سب سے بڑی منڈی تھی معمولی درجے کے علاوہ اور ہندستانی دستکار معمولی رنگ پر ایسے نفیس اور مہین کپڑے تیار کرتے تھے کہ یونانی اسے بوجہ کمال صناعی "سنڈنی" یعنی "[illegible] رنگا" میں دھلا ہوا پاکیزہ کپڑا کہتے تھے۔[1]

قدیم ہندستان میں موریہ عہد (۳۱۲ ق م) سے سماجی و معاشی حالت میں نمایاں تبدیلیاں ہونے لگی تھیں، دولت کی فراوانی نے مشترکہ طرز زندگی اور روایتی جماعت کے تصورات کو بکھیر دیا تھا۔ زمین اور جائداد کی تقسیم کی دھار سماج کو کھنگ پر اور تیز ہو گئی، طبقاتی کشمکش کی ایک وجہ دستکاری کا فروغ تھا جس نے بیرونی تجارت کے لئے سمندری راہیں کھول دی تھیں۔ کوکن کی قدیم تجارتی بندرگاہیں تھانہ (شری استھانک)، سوپارہ (شرپارکا)، چول، دیرمہ (جسے عرب صیمور کہتے تھے) اور کلیانہ (کلیانا) کی تجارتی سرگرمیاں مصر و روم و یونان کے سوداگروں کے دروازے پر دستکیں دینے لگیں۔ خود سوپارہ میں بہت سے کرگھوں پر تانے بانے سجانے والے جولاہوں کا ہاتھ بٹانا مشکل تھا۔ یہاں میں ایک خاص قسم کے طریقہ پر سوت کی انٹیاں بنائی جاتی تھیں اور اس سے جو کپڑا بنا جاتا تھا

---

[1] مقدمہ تاریخ ہند قدیم۔ اکبر شاہ خان نجیب آبادی ص ۱۰۷، بارہ کیتی کی حکومت ص ۱۳۵

اُسے تھانہ کی نسبت سے 'تنا سی' کہتے تھے، کیا عجب کہ تھان بھی تھانہ سے مشتق ہو[1]۔ ان ساری بندرگاہوں کی بین الاقوامی حیثیت چھٹی صدی عیسوی تک قائم ہو چکی تھی، سوپارہ اور تھانہ دکن اور خاندیش کے بُنے ہوئے سوتی کپڑے دساور بھیجے جاتے تھے اسی تجارت کے سلسلے میں بنی اسرائیلی قبیلے بحیرۂ روم کے علاقے سے ہجرت کر کے کوکن کے ساحلی علاقوں میں آباد ہونے لگے تھے اور قیاس غالب ہے کہ یمن کے مہاجرین 'سیل العرم' کے دردناک واقعہ کے بعد (۵۲-۵۱ء عیسوی) سے پارچہ بافی کی صنعتوں کے کمالات کا ورثہ لے کر انہیں ساحلوں پر لنگر انداز ہوئے اہل یمن کا تجارتی کاروبار ہندستان سے نہایت قدیم تھا انہیں صابئین کہتے تھے، اور ظہورِ اسلام سے قبل یہ ہندستان کے ساحلی علاقوں میں آباد ہو چکے تھے۔[2]

جب عرب جغرافیہ نویسوں نے ممالک و مسالکِ عالم کی سیاحت اور تجارت پر اپنے تجربات اور معلومات کو قلمبند کرنا شروع کیا تو ہندستان کی نعمتوں اور صنعتوں کی داستانیں چمنستانِ عالم میں ہر طرف بکھر گئیں، کچھ ورق سلیمان تاجر سیرافی کے سفرنامہ سلسلۃ التواریخ (۸۵۰/۱۳۲ھ) نے اڑائے جن میں لکھا ہے کہ کالیکٹ میں ایک ایسا نفیس اور اعلیٰ قسم کا کپڑا بنا جاتا تھا کہ عجوبۂ روزگار تھا اور بے نظیر، اسے خود اُس نے دیکھا تھا جو ایسا نفیس اور مہین و لطیف تھا کہ درمیانی انگلی کی انگوٹھی کے حلقے سے پار ہو جاتا تھا[3]۔ اسی طرح ابوالفدا نے تقویم البلدان میں (ص ۳۰۹)، مسعودی نے مروج الذہب (ص ۲۰۲) اور بشاری نے احسن التقاسیم (ص ۴۸۲) میں صنعت بافندگی کے بارے میں نئی نئی باتیں لکھی ہیں، عربی زبان کا لغت بھی کپڑوں کے ناموں کی پیٹ میں آ چکا تھا اور بہت سارے عربی اور فارسی کے ساتھ نو، ناموں اور تراکیب نے ہندستانی پارچوں کی "بہروزی جامہ پوشی" کی ہے۔

سلاطینِ ہند۔ خیر الامم کے تاجدار

سپہ سالار مسعود غازی کی جنگی مہمات کا تعلق دہلی کی فتح اور جے پال راجہ کی شکست سے تھا یا یہ محض سے پہلے کا واقعہ ہے یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے، لیکن یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ یوپی

---

[1] تاریخ کوکن، مومن محی الدین ۱۵-۱۶-۱۹، ۲۱۰-۲۱۱

[2] سید سلیمان ندوی۔ عرب و ہند کے تعلقات (الہ آباد ۱۹۳۰) ص ۶۴

بہار اور دہلی کے گرد و نواح میں اسلام کی اشاعت میں اسی مجاہد کی تبلیغی جد و جہد اور دعوت و عزیمت کا بڑا حصہ ہے۔ انصاری خاندانوں کی بیگمات ایک سرحد پار کرنے لگی تھیں تو مسلم بنکر — نورباف بن گئے جنہوں نے بافندگی کے چرخے کی گردش کو تیز تر کردیا۔

دہلی میں غیاث الدین بلبن (متوفی ۱۲۸۶ء) کے عہد میں محلہ 'انصاریان' سے کارگاہوں کی کھٹ کھٹاک کا شور حضرت نظام الدین اولیاء (۱۲۳۹-۱۳۲۵) کی نئی خانقاہ کی "یا حق" کی آواز میں ڈوبنے لگا جہاں ان کی والدہ، بہن اور رشتہ دار [illegible] چل کر چرخے پر سوت کاتتی تھیں اور اپنا گذارہ کرتی تھیں۔[1] علاء الدین خلجی کے دورِ اقتدار میں سترہ ہزار کے قریب شاہی اور عام دستکاروں میں بافندگان کی تعداد غالب تھی، مختلف پارچہ جات میں سوتی (کرپاس) کپڑا سب سے زیادہ سستا تھا، دہلی اور علی گڑھ کا [illegible]، اور گرد و نواح اور [illegible] کا بنا ہوا مشروع اور صلاحیہ اور شیرین نام کے کپڑے عام و معروف تھے۔[2]

محمد بن تغلق نے جو (۱۳۲۵ء) میں تخت پر بیٹھا، دہلی میں سوتی کپڑوں کا ایک ایسا عظیم کارخانہ قائم کیا تھا جس میں چار ہزار بنکر کام کرتے تھے۔ مسلم بافندگان کی کثرت کا اندازہ بادشاہ کی مسلم نوازی اور سرپرستی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی عہد سے مسلم بافندگوں کی جدت طرازی اور صناعی کا شہرہ دور دور تک پہنچنے لگا تھا، جب بادشاہ نے دہلی کو چھوڑ کر دولت آباد کو پایۂ تخت بنایا تو صنعت کے تانے بانے ٹوٹ گئے لیکن دکن میں دستکاری کے ہاتھ مضبوط ہو گئے، پھر بھی جب تک دلی دور تھی دو سو اقسام کے پارچے اس عہد میں رائج اور مقبول رہے تھے ان مصنوعات میں وہ ملبوسات بھی تھے اور وہ صنعتیں بھی تھیں جن سے ریاست نواز بادشاہ امرا اور درباریوں کو نوازتا تھا، مشہور مراکشی سیاح ابن بطوطہ نے اس عہد میں [illegible] کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں نہایت عمدہ قسم کے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔[3]

چودھویں صدی کے پہلے نصف میں دلی سلطنت کا شیرازہ بکھرا تو دکن میں بہمنی حکومت کی داغ بیل (۱۳۴۷ء) میں پڑی۔ کوکن کی قدیم بندرگاہ جو [illegible] کو ذریعہ بڑھ گیا، نیل، کپڑے

---

[1] خواجہ حسن نظامی، نظامی بنسری، دہلی ص ۵

[2] ضیاء الدین برنی — تاریخ فیروز شاہی (کلکتہ ۱۸۶۲) عہد علائی کا تذکرہ

[3] 'رحلہ' ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۵ طبع مصر

لچھے، ریشم، سوت اور ان تمام اشیاء کی تجارت کو جن سے صنعت پارچہ بافی کا تانا بانا
جڑا ہوا تھا فروغ حاصل ہوا۔ کالیکٹ کی چھینٹ، مسولی پٹم کے چھپے ہوئے کپڑے،
دیوگیری (دولت آباد) کا ریشمی پارچہ، کلیان اور اسلام آباد۔ بھیمڑی میں بُنے ہوئے نفیس سوتی
تھان، تھانہ کا تناتی اور بریمبہ راجہ پور اور مضافاتی صنعتی مراکز میں بُنے ہوئے ململ کے تھان،
دکن کے علاقے میں سنہری گوٹے ٹپوں والے اعلیٰ قسم کے خوشنما کپڑے، دریچوں کی کارگاہوں میں
تیار کیے گئے ریشمی پارچے اور لچھے۔ یہ سارے کپڑے انہیں بندرگاہوں سے ایران اور بحیرۂ احمر کے تجارتی مراکز
میں برآمد کیے جانے لگے تھے، یمن سے ہندستان کی تجارت قدیم تھی۔ یمنی تاجر اسرائیلی جنکو وہ صابئین
مہرہ ساحلی علاقہ کے باشندوں کے لیے نئے نہ تھے۔ یہ یہیں آباد ہو گئے تھے[1]

بہمنیوں کے دور حکومت میں ایران، خراسان اور وسطی ایشیا سے ہجرت کرکے آنے والوں کو
آفاقی، غریب یا پردیسی پکارتے تھے، ان کی قسمت آزمائی دکن کے سیاسی اکھاڑے میں قوت آزمائی
بن گئی۔ یہ علمی اور معاشرتی اعتبار سے عام دکنیوں اور سیدیوں سے اونچا درجہ رکھتے تھے اسی
سے بہمنیوں نے انہیں سربلندیاں عطا کی تھیں، سیاسی رسہ کشی میں سلطنت بہمنی کا شیرازہ
بکھر گیا۔ پھر تو گھر گھر تو یہ گھروندوں میں بٹ گیا، دکھنی ثقافت اور معاشرت کا ایک
[illegible] ہو گیا [illegible] بن گئی، پارچہ بافی کی صنعت گولکنڈہ کے قطب شاہیوں کی
[illegible] امراء اور اہل دولت کے خلعات کے زیر سایہ بس گئے،
[illegible] اور مغل بادشاہوں کے نمائندوں نے انہیں خرید کر انہیں آباد کیا، جو مال تیار ہوتا تھا
وہ [illegible] جس [illegible] بادشاہوں کا حصہ تھا، کارومنڈل اور گولکنڈہ کے کارخانوں کا مال
جن میں [illegible] اور چھینٹ کی بڑی مانگ تھی بیرون ملک عادل شاہی بندرگاہوں سے بھیجے جاتے تھے[2]

جنوبی [illegible] میں پارچہ بافی کی صنعت کے تار و پود مانی کی جڑوں سے ملے ہوئے تھے، کلیان
اور اسلام آباد۔ بھیمڑی کی دستگاہیں بھی قدیم تھیں، ان [illegible] میں [illegible] کی صنعت بافندگی کا
شہرہ [illegible] چھپا ہوا تھا جہاں کے [illegible] بھی [illegible] کے دستکاروں کی ہاتھ نہیں پکڑ سکتے تھے،
[illegible] یہیں سے درآمد کیا جاتا تھا، عورتوں کے دوپٹوں کے لیے نفیس ململ بھی یہیں کے پارچہ
[illegible] تیار کرتے تھے۔ [illegible] میں رنگین [illegible] بھی تیار کیا جاتا تھا جنہیں رقاصائیں اور رنگیاں ناچتے

---

[1] [illegible] محی الدین۔ تاریخ دکن ص ۲۱۱

وقت ہاتھوں میں پکڑے لہرا لہرا کر دیکھنے والوں کے دلوں میں نفسانی خواہشات کی لہریں اٹھاتی تھیں، خاندیس میں ململ کی طرح ایک مہین کپڑا بنا جاتا تھا اسے 'آب بافتہ' کہتے تھے، بریسے کپڑا جس کا ذکر ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے تھانہ میں بنا جاتا تھا، واجول (مصطفیٰ آباد) میں سولہویں صدی میں ایک قسم کا کپڑا تیار کیا جاتا تھا جسے 'براتی' کہتے تھے جو بریسے کے مماثل تھا، ان کپڑوں کی ملابار میں بڑی مانگ تھی، یہیں کلابتون یا زرتیطون (لیس جسے عام لوگ گوٹا کناری کہتے تھے) گھریلو دستکاری تھی۔

چول سے ہندوستان کے شہروں اور غیر ممالک میں جیسے جزائر مشرق الہند، مشرقی افریقہ، پرتگال اور خلیج فارس کے شہروں کو سوتی تھان، رنگین چھپے ہوئے پارچے اور ریشمی کپڑے برآمد کئے جاتے تھے، ریشم بافی کی کارگاہوں میں مسلم بنکر تھے جن کا ایک معتدبہ حصہ دائجہ یا واجہ (گجراتی نومسلم) پر منحصر تھا، ان کی آبادیاں بھیونڈی، (پائی پڑی) تھانہ، بھیونڈی، باندرہ، تھانہ اور جیول (ریوڈنڈا کے پاس) عرصے سے قائم تھیں۔[1]

مغلوں کا زریں دور

"تاریخ سولہویں اور سترہویں صدی کا سفر طے کرتی ہوئی ایک ایسی منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں سے ہندوستانی تہذیب اور ثقافت نے ایک نیا موڑ لیا تھا اور ایک نئی سمت کی طرف رواں دواں تھی، یہ مغل شہنشاہیت کا زریں دور تھا، ثقافت نے اقدار و روایات کے زیر اثر نکہت و جمالیات کے حریم ناز میں عروج پا لیا تھا، مغل شبستان محبت میں حسینہ زیبایوں کی طرح لطیف جذبات کا اظہار کرتے اور جنگی مہمات میں ان کی خونریزی شمشیریں خوف انسانی مرتی تھیں، بریسے پنڈی کی بہروں سے سینے میں چھپ چھپ کر وہ تصویریں بنا رکھی تھیں جن میں احمد نگر کی نظام شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی مملکتوں سے آئے ہوئے خطوط نظر آرہے تھے، اقتصادی استحکام، مقبوضات کی تفصیلات، مادی ترقیوں اور معاشرتی معیارات نے ہندوستانی معاشرے کو تمدنی اور تہذیبی حیثیت سے دنیا کے ترقی یافتہ اور متمدن ملکوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا تھا، یہاں تک کہ انگریزی، پرتگالی، فرانسیسی اور فرنگی تاجروں کو اپنا قدم ہندوستان کے تعاقب میں جمانے لگا تھا۔

---

[1] مومن محی الدین۔ تاریخ کوکن صفحہ ۲۶ اور صفحہ ۲۹۱

و مغل — نو وارد اور اجنبی تھے مگر جلد ہی معاشرے کے تمدنی سانچے میں اپنے آپ کو ڈھال کر ہندستانی بن گئے، ثقافتی قدروں اور روایتوں کے اشتراک اور اختلاط سے ایک نیا تہذیبی ڈھانچہ تیار ہوا یہ لوگ تیموری شاہزادوں کے زریں عہد کے وسطی ایشیا کی مہذب و متمدن زندگی کے اعلیٰ نمایندے تھے اور حکمراں طبقے کے بے حد ذہین اور باشعور افراد تھے جو زندگی کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی جستجو میں زرافشاں کی وادیوں اور آمو دریا کے کناروں کو چھوڑ کر گنگا و جمنا کی گود میں چلے آئے تھے اور پھر اسی کے تہذیبی گہوارے میں ایک گنگا جمنی معاشرت کی نشوونما ہونے لگی جس کا خمیر ہندوستانی تھا مگر جس کے رنگ اور روپ پر سمرقند و بخارا کے تہذیبی جمال کی پرچھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

یہ ہندستانی مغل، ایک نئی ذہنی، فکری اور تہذیبی دنیا کی تخلیق کر کے عوام کے دلوں پر حکمرانی کرتے رہے، ذہن و فکر کی شاہراہیں علم و دانش کے چراغوں سے منور ہو رہی تھیں، متحدہ قومیت اور مشترکہ تہذیب کے تصورات حقیقت کے حسین سانچوں میں ڈھل چکے تھے۔ لیکن مذہب کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا، جمالیاتی ذوق نے انگڑائیاں لیں تو "مائلِ پرواز حسن" نے مرمریں سلوں میں اپنا مرکز ڈھونڈھ لیا، فن معماری میں تڑپ پیدا ہوئی تو محلوں، مسجدوں، قلعوں اور مقبروں میں ابدی سکون ملا۔ مدنیت کے بیکراں تصورات کو فتحپور سیکری، اورنگ آباد اور شاہجہاں آباد جیسے کئی نئے شہروں اور آبادیوں میں پناہیں ملیں، حسن خود بیں میں جلوہ نمائی کا جذبہ ابھرا تو فنون لطیفہ کی حسین تخلیقات میں جلوہ گر ہوا۔ جامہ پوشی نے دامن پھیلایا تو پارچہ بافی کی صنعت کا چھید و کشمیر کی شال بافی سے لے کر سورت اور ڈھاکہ کی ململ بافی کو سمیٹ لیا، ذوق مشتری اور زیب تن سے تزیب، ململ، مشروع، لیٹے، کم خواب اور مخمل کے مختلف النوع پارچوں کو حسین اور [illegible] نام دئے، گلبدن، شبنم، نور، آب رواں، غلط، چندر کلا وغیرہ سنہری اور روپہلی کلابتون کو بٹ کر سینکڑوں قسم کے زربفت پارچے تیار کئے جاتے تھے۔

دکن کی صنعت پارچہ بافی کی اختراعات اور ہنرکاروں کے کمالات کو سیاحوں نے بے حد سراہا ہے[1]۔ مغل بادشاہ اکبر کے دربار کا مشہور شاعر ابوالفیض فیضی جو ابوالفضل کا بھائی تھا جب احمد نگر اور خاندیس کی سفارت پر دکن گیا اور وہاں سے اپنی عرضداشت میں جو اکبر بادشاہ کی خدمت میں روانہ

---

[1] سرون محی الدین — تاریخ دکن صفحہ ۳۲۰ - ۳۲۱

کیا امر نے پارچہ بافان بی بل" کی دل کھول کر تعریفیں کی ہیں یہ مینٹین اور دیوگیری کے بنکروں کے بارے میں ہوگا ، پیٹھن میں پتامبر ساڑی دو رنگی ریشم سے بُنی جاتی تھی' ابو الفضل کی آئینِ اکبری میں صنعت پارچہ بافی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں اور اکبر کی ایجاد پسند طبیعت کا عکس نظر آتا ہے کہ کس طرح " بادشاہ گیتی پناہ " کی جدت طرازی نے شاہانہ تکلفات اور اختراعات میں پناہ ڈھونڈ نکلی تھی ، یہاں تک کہ درندہ جانوروں کو بھی مہذب بنانے کا سلیقہ دے رکھا تھا ' اکبر بادشاہ نے اپنے پالتو چیتے ' شیر اور دیگر چوپایوں کو مخملیں ملبوسات پہنا کر ان کی درندگی پر پردہ ڈال دیا تھا ' یہ پالتو جانور کمخواب کی پوششوں میں بھی اپنی جبلت اور فطرت کو نہ چھپا سکے ہوں گے۔

بادشاہ کی ایجاد پسندی اور ذوقِ پیراہنی نے نئی نئی قسم کے پارچہ جات اور ملبوسات اختراع کیے ' یہ سارے نئے ناموں کی خلعتیں پہن کر اور قبولیت کا فرمان لے کر دربارِ عام و خاص میں مشہور ہو گئے ، نیا پارچہ ' نور' شاہی استعمال کے لیے ' ایجاد کیا گیا تھا اس میں زری لگائی جاتی تھی اور اس کی دو قسمیں تھیں میم نور اور کپور نور ' نور باف اور سفید باف بنکروں کی دو جماعتیں انہیں ناموں کی طرف منسوب ہو گئیں [1] سفید باف خاص ململ بُنتے تھے۔ اکبر بادشاہ فن اور علم و دانش کا قدردان تھا ، وہ روزگار اور شہیر دستکاروں کو شاہی اکرام و الطاف سے نوازتا تھا انہیں سلک بندگی میں باندھ کر بافندگی کے فن کو نئی زندگی دیتا تھا امراء کے لیے زربفتی خلعتیں اور دو نشوروں کے لیے ادنیٰ دو شالے کارخانۂ خاص میں تیار کرائے ، نہیں نو زتاق شعر بافی —— یعنی بالوں سے کپڑا بُننے کی شائستگی اس کے عہد میں رائج ہوئی جس نے گیسوئے بافندگی کو سنوارا ' شال بافی کی صنعت لاہور سے کر تا بجاک کا تغرائی کی سرپرستی میں بے مثال بن گئی تھی اس میں تانا بانا ابریشم اور پشمینے کا ہوتا تھا' اس شال کو " ریزن " کہتے تھے [2] دیبا ' مخمل ' اطلس ' کمخواب زربفت کے نام وسطی ایشیا کے شہروں کے نام پر ختائی ' شرد انی وغیرہ تھے۔ جہانگیر نے بھی شال بافی کی صنعت کو فروغ دیا '

شاہ جہاں کے عہد کی تمام تواریخ (ان میں تین کے نام یکساں ہیں) بادشاہ نامہ (۱۰۵۸) مؤلف

---

[1] مولوی شیخ عبد الرؤف — خطبۂ صدارت۔ ماہنامہ المومن ، کلکتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء۔

[2] علامی فہامی ابو الفضل ، آئینِ اکبری۔ مرتبہ ایچ بلوخمن کلکتہ ۱۸۷۷ء (تین حصے)

عبدالحمید لاہوری، محمد قزوینی اور تیسری میرزا محمد جلال الدین طباطبائی یزدی کی تصنیف) اور دیگر شاہجہاں نامہ (۱۰۵۰ھ) وغیرہ میں جتنے واقعات میں نفیس اشیاء کے ہدایا اور پیشکشوں کا ذکر ملتا ہے وہ اعلیٰ درجہ کے پارچہ جات پر مشتمل تھے جو ایک شہنشاہ معیار کا نذرانہ تھا۔ عہد شاہجہان میں مؤ مبارک پور کا مشروع جس کا نام گلبدن تھا شاعروں کا استعارہ بن گیا تھا، یہ دولت آباد میں بھی بنا جاتا تھا اس میں سوت اور ریشم کے تانے بانے کا استعمال کیا جاتا تھا مشروع کا نام ہمرو بھی تھا، ہمرو چادریں اورنگ آباد میں کثرت سے بنائی جاتی تھیں، اسی بادشاہ کے زمانے میں مغربی سیاح ٹوے ورنیئے (۱۶۴۱ء اور ۱۶۵۶ء) میں برہان پور آیا، برہانپور، دارالسرور جسے نصیر خان فاروقی نے ۸۰۲ھ مطابق ۱۳۹۹ء میں آباد کیا تھا پارچہ بافی کی صناعی میں یورپ تک مشہور تھا یہاں سے آبِ رواں ململ اور اطلس وسطی ایشیا برآمد کیا جاتا تھا، رنگین اور گلدار طلس بیرونی ممالک میں نقاب، پلنگ پوش اور پردہ بنانے کے کام آتا تھا، ریشمی کپڑے اور زربفت کے مسلمان بنکر جو دہلی سے آکر آباد ہو گئے تھے ایک الگ محلہ میں رہتے تھے ریشمی اور زربفتی اوڑھنیاں ایران اور ترکی کی خواتین "گردیری" کے طور پر استعمال کرتی تھیں شاہجہاں، جہاں آرا اور اورنگ زیب کے شاہی کارخانے یہیں قائم تھے۔ انگریزوں کا بھی ایک کارخانہ تھا شہر میں سورت کے ملک التجار "ویرجی بوہرہ" کی آڑھت کی دکان تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسرے تجارتی ادارے سیٹھ جی کے مقروض تھے۔[1]

اورنگ زیب عالمگیر کی پارسائی نے اس کی انگلیوں میں سوئی تھمادی تھی وہ ٹوپی سی کر گذارہ کرتا تھا، اس درویشی کے باوجود اس کی سلطانی مرتبت اور سرپرستی کی روایت نے ان تمام کارخانوں کو اکھڑنے نہ دیا جن سے ہزاروں دستکاروں کو روزی ملتی تھی، اور جو ریشمی زربفت، نفیس ململ اور کمخواب بننے میں مشغول رہتے تھے، فرانسیسی سیاح برنیئے لکھتا ہے کہ "بہت دستکار شاہی کارخانہ جات میں سوزن کاری، زردوزی اور کشیدہ کاری جو روپہلی اور سنہری کلابتوں سے کی جاتی تھی اپنی صناعی کا مظاہرہ کرتے اور کمال دکھلاتے تھے۔

عہد مغلیہ میں صنعتی مرکز بنگال سے گجرات، کشمیر اور جنوبی ہند تک قائم ہو چکے تھے، گجرات میں

۱۔ و۔ م۔ برنئے۔ مغل سلطنت میں سفر (انگریزی)

۲۔ ... حبیب الدین، ماہنامہ پیام تعلیم، شمارہ اگست ۱۹۶۵ء، ص ۴۴-۴۶

احمد آباد، سورت، کھمبایت، بڑودہ، بھڑوچ، بہروس، کیرا، باگا، دھالز، بلسار، پارڈی، پٹن
پور وغیرہ قصبات اور دیہاتوں میں زربفت، کمخواب، مشروع، مخمل، موٹے سوتی پارچے، چھینٹ، کلا
ریشمی، تافتہ اور اعلیٰ قسم کے ململ کے تھان تیار کر کے فروخت کیے جاتے تھے۔ گجرات کے
مظفر شاہی سلاطین اور فتح گجرات کے بعد سلاطینِ مغل یہاں کی مصنوعات کے شائق تھے اور صناعوں
کی کاریگری کے معترف۔ جہانگیر نے یہاں زربفت اور مخمل کے کارخانے قائم کیے تھے۔ عہدِ شاہجہانی
میں ایوانوں اور بارگاہوں کے لیے اور شامیانوں کے لیے زربفت کی قناتیں اور مشجر پردے یہیں
تیار کیے جاتے تھے۔ احمد آباد سب سے اہم اور عظیم صنعتی مرکز تھا۔ اس کی تاریخ۔ گو کوئی اتنی
قدیم نہیں لیکن اس کی صنعتی ترقیاں قیاس کی سرحدوں سے بھی دور ہیں۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس
شہر کی تاریخ تین تاروں یا تاگوں سے متعلق ہے، ریشم کا تاگا، سونے کا تار اور سوتی دھاگا۔
سورت کے ململ کی بناوٹ پر ڈھاکہ اور مرشد آباد کی کاریگری کا دھوکا ہوتا تھا سنہری اور روپہلی
کلابتوں کو بٹ کر یہاں بروٹے کی کاریگری زربفت پر خوب بہار دکھلاتی تھی، اسے صرف امرا خریدتے
تھے۔ سورت کا رنگین پارچہ "سورتی کپڑے" کے نام سے فروخت ہوتا تھا۔ بھڑوچ، بروس کی
مصنوعات ایران و عرب تک مشہور تھیں، یہاں کا بافتہ، ڈوریا، چارخانی اور بستہ کپڑے،
نگرکھاب وہ، ازار اور قمیص کے لیے بُنے جاتے تھے اور انگریزوں کی پتلونوں کے لیے موٹے
تاروں سے بنا ہوا کپڑا خوب بکتا تھا (شش...) دولتمند لوگ "جامہ" کے لیے نفیس دھاگوں
سے بنا ہوا "اساوی" نام کا خاص کپڑا بنواتے تھے ان کے علاوہ ساڑی، رومال، پگڑی کے
لیے چھینٹ، دوپٹہ کا مہین پارچہ، توسے اور کمبل بھی تیار کیے جاتے تھے۔ کھمبایت میں یہ
جوتے پہنتے تھے جو صرف بغداد کے شہزادوں کی قدمبوسی کرتے تھے، نیز قالین
دریاں اور منقش شطرنجیاں بھی بساط بھر تیار کی جاتی تھیں یہاں احمد آباد اور سورت کی طرح
نفیس پارچوں کے کارخانے تھے۔ احمد آباد کے زربفت، ریشم، مشروع، کمخواب وغیرہ
کا یہاں بھی چلن تھا۔

سنبھلپور اور بھاگلپور میں ٹسر کی ساڑیاں بُنی جاتی تھیں، انہیں بافتہ بھی کہتے تھے، ان
علاقوں میں ترسیہ اور ریشم کا بھی مال تیار کیا جاتا تھا۔ فرخ آباد کے پردے، لکھنؤ کا تنزیب

اور چکن، ٹانڈہ (اجودھیا) اور اکبر پور کا دھاریدار ململ، ڈوریا یا چارخانہ اور سنہری ریشمی پارچے زربفت تنبیہ، انصار کی مصنوعات تھیں، اعظم گڑھ کا مردم خیز علاقہ 'سنگی' نام کے سوتی ریشمی مخلوط کپڑے کے لئے مشہور تھا، نواحی قصبات میں یہی کپڑا زیادہ بنتا تھا۔

سونا تھ بھنجن کے قدیم تاریخی شہر کا ہر گوشہ کرگھوں سے آباد تھا، یہاں تہمد، ریشمی ڈوریا، عمامہ کا کپڑا، رومال اور سنگی کپڑے بنے جاتے تھے، بنارس میں کہ بقول علی حزیں "یہاں کا ہر ہندو، پسر لچھمن و رام است اینجا" اور ہر عورت سیتا تھی جو یہاں کی ریشمی زرتار ساڑھی میں ملبوس رہتی تھی جس پر گلکاری سے ایسی بہار آجاتی کہ وہ سدا بہار بن جاتی اور یہ صنعت آج بھی سدا بہار ہے۔ سلطان محمود الشرقی کی یادگار میں کچھ نوع کے ریشمی ملبوسات اسی کے نام سے منسوب ہیں، 'گلبدن' جس کا پہلا نام راجہ بی بی تھا محمود شرقی کی ملکہ تھی "پارچہ گلبدن" سے ابھی تک انہی گلبدن کی مہک آتی ہے [1]

مبارک پور (اعظم گڑھ) محدثین اور علماء و فضلا کا مسکن تھا، کتاب 'منوال و اہلہ' کے مصنف عبدالسلام مبارک پوری اپنے وطن مالوف کا ذکر بڑی ہی محبت سے کرتے ہیں، یہاں کا ملطا، سنگی، مشروع اور گلبدن سے خوبصورت پیراہن بنائے جاتے تھے، کوپا گنج، اوری، گھوسی، بہادر گنج، شیخ معروف پور، مہاراج گنج، جہانا گنج اور کریم الدین پور میں انصاری برادری کا غلبہ تھا۔ ٹانڈہ میں مشہور جامدانی ململ اور فیض آباد کا دھاریدار تہمد اس تاریخی شہر اور نوابی کی یادگار تھے۔

شرقی بادشاہوں کے شہر جونپور، اس کے اطراف خیرآباد اور گھوسی میں سوتی کپڑوں کے کرگھے چلتے تھے، ملک محمد جائسی کے جائس قصبہ میں جہاں کے انصاری شجرۂ نسب بھی رکھتے تھے اور اسی رائے بریلی کے ضلع میں شیرآباد ململ کی بہترین نفاست کے لئے مشہور تھا، غازی میاں کے بہرائچ، گورکھپور اور اس کے نواح میں بنکروں کی بڑی تعداد آبائی پیشہ میں معاش کی تلاش کرتی تھی، آگرہ اور فتحپور سیکری کی دریاں فرش راہ بنی رہتیں، ونیز قصبہ ورنداوت میں نگینہ میں موٹا سوتی کپڑا چلتا تھا۔

یوپی میں غازی پور، دھام پور، بدایوں، سہارنپور، بلند شہر کے علاوہ جگادھری، غازی آباد

---

[1] آثار بنارس

شاہجہانپور، گڑگانوں، بستی، بارہ بنکی، علی گڑھ، دھام پور، فتحپور، سلطان پور، کانپور، مرزاپور، مرادآباد، فرخ آباد، الہ آباد، اٹاوہ، قنوج، پرتاب گڑھ اور اس کے نواح میں مانک پور، لال گوپال گنج، چوراچوری، کنڈہ، سکندرا گنج۔ غرض کہ چھوٹے چھوٹے قصبے اور دیہات میں مومن جنکر خود اپنی ضرورت اور ساریوں کے لیے کپڑا بن لیتے تھے، تقریباً ہر گھر میں کرگھا اور چرخہ ضرور ہوتا تھا۔

چھدوری اور مرزاپور میں مومن۔ انصاری بین بانی میں اپنی علاحدہ خصوصیت رکھتے تھے، فرخ آباد میں پردے کے کپڑے نفیس قسم کے بُنے جاتے تھے۔ اب ان کا تہمد پہلوانوں کے کام آتا، دیہات میں سوتی کپڑا اور چادر تیار ہوتا تھا۔ ریشم بانی کے لئے بنارس، آگرہ فتحپور سیکری، لاہور اور کشمیر شہرت رکھتے تھے۔

بنگال اور بہار میں ململ کے طلسم خانے تھے۔ جامدانی، تنزیب اور ڈوریہ۔ سورت، جہانگیر، مرشدآباد اور ڈھاکہ کی خاص اور اعلیٰ مصنوعات میں شمار ہوتے تھے۔ بنگال کے قدیم بنارسی ریشم کے پارچے معیاری تسلیم کئے جاتے تھے۔ اطراف کے شہروں میں جیسور کا ڈوریہ جو چوخانی نقشوں میں بنا جاتا تھا پسند اور عجیب تھا۔ بہار، اڑیسہ اور بنگال وآسام کی شہرت طویل ہے جن کے ہر ایک قصبہ میں تانے بانے چھیڑے جاتے تھے۔ چند قصبوں کے نام یہ ہیں:

بردوان، بشن پور، برجورہ، بربیور، بیربھوم، بانکورہ، آسنسول، احمد بنگر، اسلام پور، پھلواری شریف، بلاری گنج، پرندھر پور، جگناتھ پوری، جیر نیزہ پانڈہ، بہار شریف، دربھنگہ، برگرہ، رامپور لوریہ، دھپی، راج شاہی، رام گرام، رانی گنج، رامپور ستکھیا، ور بتیلی، کلکتہ، کرشن بار، سنک، ستا مڑھی، گرڑیہ، سنتی پور، عمر پور، رنگ پور، متھرا، بھوجم، میمن سنگھ، گمتیہ، لکھی گنج، ہزاری باغ وغیرہ۔

وسطی ہند میں جبلپور، نرسنگھ پور، برہانپور، جاش پور اور بھڑوچ، ناگپور میں بھی سوتی اور ریشم کے بننے تننے میں الجھا ہوا تھا۔ آکولہ میں سوتی کپڑے، بالاپور میں پگڑیاں، مالیگاؤں میں رنگین ساڑی، بھیمڑی میں مقری رومال اور تاج ساڑیاں، تھانہ میں بیر سیہ اور رتناگیری، درجگاؤں، دھولیہ، شاھدرہ، جسدول، ناسک اور ایرلہ پارچوں کی کئی قسموں کے لئے معروف تھے۔

مملکت خداداد میسور میں سلطان حیدر علی اور شہید ٹیپو سلطان نے سترہ کوٹھیاں اور تیس کارگاہیں قائم کر رکھی تھیں جن میں ہزارہا بنکر مزدور تھے، سولی پٹنم، سرنگاپٹم اور گنجم میں

بزار ہا بنکر آباد تھے؛ خاص مصنوعات میں ریشمی پارچے، منقش اور مشجر چھینٹ (گلدار) اور
ململ خاص قسم کے بُنے جاتے تھے، مسولی پٹنم کا مہین اور نفیس پارچہ عجوبۂ روزگار تھا،
اورنگ آباد کا ململیں پارچہ امرا کے شبستانِ حرم کی زینت بڑھاتا تھا اور پردہ بن کر ان
کی تعیش کوشی کی پردہ داری کرتا تھا۔ سندھ میں عرب نژاد انصاری زرباف ایسا بافتہ
تیار کرتے تھے جس پر انگلستان اور یورپ کی مہذب خواتین دل باختہ تھیں۔ مرورِ زمانہ کے
ہاتھوں سیاسی حالات کے تحت یہ سارے اقسام آہستہ آہستہ تار تار ہو گئے؛ نہ صنعت رہی
اور نہ سرپرست رہے۔ یورپ کے مخلوط کیمیائی سوت نے ہاتھوں کے کاتے ہوئے تانے بانوں کو
اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ ڈھاکہ اور مرشد آباد کے ململ کا شباب ڈھل گیا، بنارس، احمد آباد اور
اورنگ آباد کی کم خواب مصنوعات — خواب کی باتیں بن کر یادوں میں رہ گئیں۔

"ہم نے ان کے اور ان کی بستیوں کے درمیان جن کو ہم نے برکت عطا کی
تھی نمایاں بستیاں بسادی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں بنادی تھیں جس کی وجہ
سے وہ رات دن امن و اطمینان کے ساتھ سفر کرتے تھے لیکن انہوں نے اس نعمت
کی بھی قدر نہ کی بلکہ دعا کی کہ الٰہی ہمارے سفر کی منزلوں میں دوری پیدا کر دے
کیونکہ سفر کا لطف بھوک اور پیاس ہی سے حاصل ہوتا ہے، ایسی خواہشیں کر کے
انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہم نے اس ناشکری کی سزا میں ان کو ایسا تباہ کیا
اور یہ یادگار افسانہ بنا کر رکھ دیا اور وہ تتر بتر ہو کر رہ گئے"

۴۵۰-۴۵۱ء میں مارب بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید کی آیات
میں کیا گیا ہے۔

"سیل العرم" کا یہ زبردست واقعہ اللہ کی ناراضگی کا نادر نمونہ تھا جس نے مارب کا بند توڑ کر سارے
علاقے کو ویران بنا دیا اور پھر جب انہوں نے کہا کہ "اے رب ہمارے سفر کی مسافتیں طویل
کر دے" تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کر لی اور انہیں دور دراز شام و فلسطین اور حجاز و
عرب کی ان برکت والی بستیوں میں بسا دیا۔

قوم سبا کے اعلیٰ تمدن، تمول اور تعیش کی داستانیں مصر و شام اور یونان و روم تک
پھیلی ہوئی تھیں، یہ دنیا کی سب سے مالدار قوم تھی اور یمن سب سے زیادہ متمدن ملک
تھا۔ دو ملکوں کی دولت بین الاقوامی تجارت کے راستے یہاں بہتی آ رہی تھی، اس تمول
نے ان کی معیشت کو مستحکم بنا دیا تھا، یہ لوگ سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتے تھے،
ان کی چھتوں اور دروازوں پر ہاتھی دانت سے زیبائش کی جاتی تھی اور سونے چاندی اور
جواہرات سے مرصع کاری اور مینا کاری کی جاتی تھی، جلانے کے لیے ایندھن میں دار چینی، صندل
اور خوشبودار لکڑیاں استعمال کرتے تھے، ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے
تجارتی جہازوں تک خوشبوؤں کی لپٹیں پہنچتی تھیں۔ ان کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان،
عود، عنبر، مشک، مُر، قرفہ، قصب الذریرہ، سلیخہ اور دوسری خوشبودار اشیاء کی بڑی پیداوار ہوتی
تھی جنہیں مصر و شام کے تاجر ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، یمن کے خوبصورت اور دلربا شہروں میں
عالیشان قصور و محلات موجود تھے، صنعا ملک یمن کا بہت خوش منظر شہر تھا، قصر غمدان یمن
کے فن عمارت کا بے مثال نمونہ تعمیر تھا اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فیٹ بلند

تھی، سب سے اوپر کی منزل مرمر اور مصفا آئینوں سے مسقف کی گئی تھی اس قصر میں سو کمرے تھے، اس کے علاوہ بہت سارے عالیشان قصر محلات اور قلعے تھے جن کی عظمت و شوکت کے افسانے ان کی شاندار زندگی کے آئینہ دار تھے، سارے ملک میں سرسبزی اور شادابی کا زمردیں فرش بچھا ہوا تھا، ہری بھری کھیتیاں تھیں، ریوڑ، لگے تھے، خوشحالی کا دور دورہ تھا لیکن دولت کے نشہ نے خدا کو بھلا دیا تھا، کفرانِ نعمت میں حد سے زیادہ بڑھ گئے، بعض روایات میں ہے کہ ان کی اصلاح اور ہدایت کے لئے تیرہ پیغمبر بھیجے گئے لیکن یہ ضلالت اور گمراہی میں پڑے رہے، پھر جب اللہ کی نعمت سے پھر گئی تو اس کا غضب نازل ہوا، پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ان کا یہ نازِ شہرۂ آفاق آہنی بند، سد مارب' ٹوٹ گیا، حمیر چوہوں نے اندر گھس کر بند کو کھودنا شروع کر دیا تھا اور تین میل طویل وہ تین سو چوڑی بڑی بڑی چٹانوں کو سیسے پلا کر جو آہنی سد بنائی گئی تھی اور جس میں ستر سے نہروں کا پانی اکٹھا کیا جاتا تھا — وہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا، اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پہ بند توڑتا چلا گیا یہاں تک سارے ملک کا نظام آب پاشی تباہ ہو گیا، سد کا غضب 'سیل العرم' کی شکل میں نازل ہوا رب قدیر نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر ذلت اور تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہ اٹھا سکی، ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی — اور قحطان کی وہ نسل جو عمران بن عامر اور مرب ماء السماء جیسی ہستیوں سے مسلسل رکھتی ہے — باقیاتِ صالحات میں سے رہ گئی۔ انصار مدینہ انہیں کی یادگار ہیں۔[1]

مورخین لکھتے ہیں کہ سیلِ عرم کے بعد بنی قحطان کے بہت سارے قبیلے یمن چھوڑ کر دور و دراز ممالک جیسے شام اور عراق میں فرات کے کناروں پر بس گئے۔ عمران بن عامر جو انصار کے جدِ امجد تھے وہ مع اقارب کے سیل عرم کے واقعہ سے قبل یمن چھوڑ کر چلے گئے تھے ثعلبۃ العنقاء بن عمرو بن عامر ماء السماء جو عمران کا بھتیجا تھا وہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوا یہاں عمالقہ کی آبادی میں شام کے یہود بس گئے تھے ثعلبہ کی اولاد یہاں پروان چڑھنے لگی اور جب انہیں قوت اور شوکت حاصل ہو گئی تو یہودیوں کو نکال پھینکا یہاں انہوں نے

---

[1] تفہیم القرآن، ج چہارم ۱۹۲-۱۹۳، ۱۹۰، اس کے علاوہ طبری، اخبار الرسل والملوک (لیدن ۱۸۷۹-۱۹۰۱) اور دیکھیے اسی مصنف کی تفسیر، جامع البیان فی تفسیر القرآن (تفسیر طبری) سورۂ سبا۔

گڑھیاں تعمیر کیں، کھجور کے باغات لگائے اور مدینہ (یثرب) نخلستان بن گیا اور یہ بستی ثعلبہ کے قبیلے کی میراث بن گئی، ثعلبہ کے بیٹے حارثہ تھے اس کے دو بیٹے اوس اور خزرج تھے۔ خزرج کے پانچ بیٹے تھے اور اوس کے صرف ایک بیٹا مالک بن اوس تھا' اہل عرب میں قوت وشوکت کا مدار اولاد کی کثرت پر تھا۔ جب ان دونوں حقیقی بھائیوں کی اولاد پھیلی تو انہوں نے علاحدہ علاحدہ بستیاں قائم کرلیں اور قوت وشوکت کا مظاہرہ کرنے لگے یہاں تک کہ آپس میں خانہ جنگیاں ہونے لگیں' دونوں قبیلوں میں ریاست ونخوت کا مادہ بھرا ہوا تھا دونوں میں کم وبیش ایک صدی تک معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں 'آخری یوم بعاث'۔ ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ برس پہلے اور عقبہ اولیٰ سے تین سال قبل ہوا۔ اور نہایت سخت معرکہ ہوا۔ فتح اوس کو ہوئی لیکن فریقین کے اشراف وسرداران کام آئے مشیت الٰہی یہی تھی کہ قوت وشوکت کا زعم اور ریاست ونخوت کا شجر قبول حق سے باز رکھتا اُسے پہلے ہی فنا کردیا گیا ورنہ شاید اوس اور خزرج کو نبی آخر الزماں کی بعثت ورسالت کا جو علم خاندانی روایات سے ورثہ میں ملا تھا یا جو علم ویقین اس بشارت کے متعلق تورات کے یہودی علماء سے حاصل ہوا تھا وہ اکارت جاتا اور یہود مدینہ کی طرح یا قریش مکہ کے جیسے رسول اکرم صلعم کی آخری دم تک مخالفت پر تلے رہتے مگر مشیت الٰہی کو اوس اور خزرج کی بہبودی اور بہتری مقصود تھی۔ 'یوم بعاث' فیصلہ کن ثابت ہوا' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

کان یوم بعاث قدمه الله لرسوله فی دخولهم الاسلام[1]

"انصار کے لیے یوم بعاث کو قبول اسلام کا مقدمہ اور سبب بنا دیا تھا"

سارے عرب میں انصار سے زیادہ کوئی نبی آخر الزماں کے حال وشان سے واقف نہ

---

[1] ایام العرب، "بنی اوس بنی خزرج جنگوں کا نام تھا" 'یوم بعاث' اوس اور خزرج حقیقی بھائیوں کی اولاد کے بیچ لڑی جانے والی جنگ کو کہتے ہیں' مختلف انگریزی' اردو اور فارسی سیرۃ کی کتابوں میں اوس اور خزرج اور ایام الجاہلیہ وایام العرب کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں' ہم نے ان کے علاوہ ایک نایاب کتاب تاریخ غزوات انصار مصنفہ ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اشرف ارشاد دانا پوری ثم ندوی (مطبع دہلی) تاریخ جمع نادرہ سے استفادہ کیا ہے' حصہ اول ص ۱۸، ۲۰-۲۴، ۴۸، ۵۰

تھا، جلال الدین سیوطی (۸۴۹ - ۹۱۱ھ) نے اپنی تفسیر الدر المنثور فی التفسیر الماثور میں بروایت ابن اسحاق و ابن جریر و ابن المنذر و ابو نعیم و بیہقی، عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری سے نقل کیا ہے وہ اپنے بعض بڑے بوڑھوں سے نقل کرتے ہیں:

"سارے ملک عرب میں ہم (انصار) سے زیادہ کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور اس بشارت کی صداقت کے بارے میں جاننا نہ تھا، یہود ہمارے پڑوسی تھے وہ اہل کتاب تھے اور ہم بت پرست (مشرک)، جب ہماری طرف سے کوئی رنجیدہ بات یہود کو پہنچتی تو وہ کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کا زمانہ بہت قریب آگیا ہے ہم ان کے ساتھ ہو کر تم بت پرستوں کو عاد و ارم کی طرح قتل کر ڈالینگے"

غرض دونوں قومیں یہود اور اولاد حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو بن عامر (اوس اور خزرج) اس نبی کے ظہور کے منتظر تھے اور نصرت پر کمربستہ مستعد اور آمادہ تھے مگر قسام ازل نے یہ سعادت صرف اوس اور خزرج کے قبائل یعنی بنی عامر کے حصہ میں لکھی تھی، نہ کہ بنی اسرائیل کے جیسا کہ یہودیوں کا خیال تھا۔ قرآن کریم میں آیا ہے:

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی جو لائی گئی باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا" [1]

یہود باوجود اہل کتاب ہونے کے رسول کے منکر اور معاند و مخالف بن گئے اور اوس و خزرج ایمان لاکر مددگار بن گئے اور انصار کے معزز خطاب سے سرفراز ہو کر اسلام کے لیے فتح و نصرت لائے اور انہیں کی استدعا اور التجا پر رسول اللہ صلعم نے اپنے وطن مکۂ معظمہ کو چھوڑا، یثرب کو مدینۃ النبی بنایا اور وطن مالوف اور رسول اللہ کی زبان مبارک سے جب یہ نکلا کہ "انصار ہم سے ہیں اور ہم انصار سے ہیں" تو ان کی عظمت و تکریم فضائل اور مناقب کی شان دوبالا ہو گئی۔

---

[1] وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ (البقرہ: ۸۹)

انصار میں اسلام ایسا پھیلا کہ تیرہ سال کی جدوجہد کے باوجود مکہ میں نہیں پھیلا تھا، اسلام کی ترقی دین کی اشاعت، امت مسلمہ کی شوکت اور قوت کا اصل زمانہ ہجرت کے بعد کا ہے، انصار مدینہ نے اپنا جان و مال رسول اللہ صلعم پر فدا کر دیا، مہاجرین سے رشتۂ مواخات قائم کر کے اپنے گھروں میں ٹھہرایا اپنی جائداد، اپنے گھر بار اور اپنی عائلی زندگی میں ان کو حصہ دیا اور اسلام کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیں، یہی انصار تھے جن کی اولاد ہندستان میں پروان چڑھی جو مومن - انصاری کہلائے اور اپنے نیک طبع، قدسی نفس اور پاکیزہ خصلت آباء و اجداد کے اوصاف سے حصہ پایا۔ ان کے پیشۂ بافندگی کو اپنایا اور یمن کے صناعوں کی طرح جن کی نسل سے یہ ہیں فنی منصب کے اعلیٰ درجہ تک پہنچے۔

"آج ہندستان میں جتنے مومن انصاری ہیں اسی اوس کے برادر خزرج کے پوتے"

ابوایوب انصاری کے پوتے یوسف کی اولاد میں یا یعقوب کی اولاد میں جن کا ذکر انشاء اللہ آگے آئیگا" [1]

---

[1] تاریخ مومن انصار حصہ اول ص۲۳ دوسرا مولانا عبدالسلام مبارکپوری، کتاب سوال وجواب جلد دوم ص۱۳۱-۴۲

انصارِ مدینہ

يَا لِلْاَنْصَارِ كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ كَمَا اٰبَآءُكُمْ

"اے انصاریو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد میں ہمیشہ رہا کرو جیسے تمہارے آباء و اجداد رہا کئے"

دعوت اسلام کی بنیاد بعثت سے پڑی۔ اللہ کے رسولؐ نے تبلیغ دین کا آغاز گھر سے کیا۔ سب سے پہلے اہلِ بیت کو دعوتِ حق پہنچائی پھر قوم کو پکارا۔ تب ہی کافروں اور مشرکوں نے انہیں للکارا۔ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں تشریف لے جاتے، اعلائے کلمۃ حق فرماتے "اے لوگو! کہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فلاح پاؤ گے" لیکن لوگ پتھر برساتے اور اللہ کے نبی ہدایت فرماتے۔

آپ کا دستور تھا کہ ہر موسم حج میں قبائل کے پاس فرداً فرداً جاتے اور اسلام کی دعوت دیتے۔ ایک حج کے موقع پر آپؐ مدینہ کے انصاریوں کے پڑاؤ پر تشریف لے گئے۔ وہ چھ حاجی تھے جن کا تعلق مدینہ کے قبیلۂ خزرج سے تھا۔ عقبہ منیٰ کے پاس وہ سر منڈا رہے تھے (حلق)۔ سرورِ عالمؐ بھی قریب تشریف فرما ہوئے۔ دعوتِ حق پہنچائی، قرآن سنایا۔ مقلب القلوب نے اسلام کے لئے ان کے سینوں کو کھول دیا۔ شرح صدر ہوا اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ فوزِ ابدی پائی اور دولتِ دین سے مالامال ہو کر مدینہ لوٹے اور اسلام کی تعلیمات اپنے دلوں میں چھپانے لگے۔ اسلام اپنی تعلیمات دلوں پر لکھتا ہے، لوحِ قلب پر لکھے ہوئے حروف اَنمٹ ہوتے ہیں، انصاریوں کے دلوں پر دین کا قلم سکہ لکھ رہا تھا۔ کوئی گھر کوئی مجلس کوئی محفل نہ تھی جو آپ کے ذکر سے خالی اور دینی تعلیمات سے عاری ہو۔ انصار آپ کے پاس آتے رہے، ایمان لاتے، قرآن سیکھتے، واپس جاتے اور اپنے قبیلے کے لوگوں کو پیغامِ اسلام دیتے۔ اوس اور خزرج کے قبیلے جو صدیوں سے کشت و خون میں رنگے ہوئے تھے اللہ کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگ گئے۔ آپ کی زبانِ مبارک سے اسلام کے احکام اور محاسن سن کر اس فریفتگی کے ساتھ انصار مسلمان ہونے لگے کہ قبل از ہجرت گویا عملاً تمام مدینہ مسلمان ہو چکا تھا۔ پھر

انہوں نے سوچا ہمارے نبیؐ کب تک مکہ کی وادیِ غیر ذی زرع میں در بدر رہیں گے حج کے موقعہ
پر آئے بیعت عقبہ کی اور پھر یہ لوگ مدینہ لوٹ گئے آنحضرت صلعم نے ان کے ساتھ حضرت ابن
ام مکتومؓ اور مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا جو مدینہ جا کر لوگوں کو قرآن سکھاتے تھے اور اسلام کی دعوت
پھیلاتے، ان دونوں اصحاب کے ہاتھوں پر بہت سارے لوگ مسلمان ہوئے، بنو عبد الاشہل
کا سارا گھرانہ مشرف بہ اسلام ہو گیا، پھر بیعت عقبہ ہوئی اور اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی ہجرت کی اجازت دے دی، لوگ تیزی سے ہجرت کرنے لگے، دینِ
حق کی اس قدر جب ترقی ہوئی اور اہلِ مکہ کی سختیاں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو بحکمِ
الٰہی آپ نے بھی ہجرت کا ارادہ فرمایا،

انصارِ مدینہ کو جب یہ مژدۂ جانفزا ملا کہ ان کے پیارے نبیؐ مکہ سے مدینہ کی راہ چل
پڑے ہیں تو وہ نہایت اشتیاق سے آپ کی تشریف آوری کے دن گننے لگے، ان کی
بیقراریاں بڑھ گئیں، لوگ روزانہ حرہ تک آ کر دھوپ میں آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے
کا انتظار کرتے اور جب تپش تیز ہو جاتی تو دلوں کا اضطراب بڑھ جاتا۔ ۱۲ ربیع الاول دو شنبہ
کا دن تھا۔ انصار صبح سے منتظر تھے، آنکھیں چشم براہ تھیں، ایک یہودی اپنے کسی کام سے
ایک ٹیلے پر چڑھا۔ رسول اکرمؐ اور ان کے ہمراہی دھندلکے میں چمکتے نظر آئے، اور سراب ان
سے چھٹ رہا تھا اس نے بلند آواز سے پکارا "اے بنو قیلہ! یہ ہیں تمہارے بزرگ اور سردار
جن کے تم چشم براہ ہو۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اہلِ مدینہ کو
کبھی کسی چیز سے اتنا خوش ہوتے نہیں دیکھا جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف
آوری سے خوش ہوتے دیکھا، سنن ابی داؤد میں انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ جس
روز رسول اللہ صلعم مدینے میں داخل ہوئے اس کی ہر چیز روشن ہو گئی[2] عورتیں نوجوان
اور بچے جمالِ مبارک کے دیدار کے لئے چھتوں پر چڑھ گئے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس روز
رسول اللہ مدینہ منورہ میں تشریف لائے عورتیں اور بچے یہ استقبالیہ اشعار پڑھ رہے تھے:

---

[1] بنی قیلہ: حضرت قیلہ انصار کے جدِ اکبر کی بیوی، اوس اور خزرج کی دادی کا نام ہے، اوس
و خزرج ایک ہی نسل در حقیقت اعلیٰ سے تھے، سیرۃ المصطفیٰ، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، دیوبند ۱۹۸۰ء، ج ۱، ص ۳۹۹
[2] ترمذی فی المناقب، ابن ماجہ فی الجنائز

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

بدر (چودھویں رات کے چاند) نے ثنیات وداع کی طرف سے ہم پر طلوع کیا

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَىٰ لِلّٰهِ دَاعٍ

ہم پر شکر (خدا) واجب ہے جب تک اللہ کو کوئی پکارنے والا باقی ہے

أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِينَا جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

اے ہم میں بھیجے گئے نبیؐ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے امر کو لیکر آئے ہو جسکی اطاعت واجب ہے۔ [1]

مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر آپ قبا پہنچے، مرحبا اور اللہ اکبر کی آوازیں بنو عمرو بن عوف کے محلے سے بلند ہونے لگیں، یہ قبا کا ممتاز گھرانہ تھا۔ انصار کے چند قبیلے بھی آباد تھے۔ آپ کی آمد سے خوش ہو کر مسلمان تکبیر کہہ رہے تھے آپ کے استقبال کے لیے بڑھے، ہجرت کا سلام پیش کیا اور نورِ خدا کو ہالے میں لے لیا، مدینہ میں ان لوگوں کا بیتاب عالم جنہوں نے بیعت عقبہ کے موقعوں پر آپ کے جمالِ مبارک کا دیدار کیا تھا صبر کا عالم نہ تھا لیکن جنہیں آپ کی خدمت میں رہنے کا نہ موقع ملا تھا اور نہ فیضِ صحبت سے کسبِ برکت کرنے کا وقت، وہ نہ جانے کس تیز اور کس جذبے سے فریفتہ تھے، غائبانہ کسی کے منہ سے تو چھوٹی لگتی بات سُنی وہ دل میں اُتر گئی تھی، ایسے رنگے کہ سارا مدینہ اللہ کے رنگ میں ڈوب گیا۔ مدینہ کے ہر گھر سے حمد و ثنا اور کلمۂ شہادت کی آوازیں گونج رہی تھیں، اور اب تکبیروں سے ساری فضا پر ہیبت طاری ہو گئی تھی۔

چودہ شب آپ کا قیام قبا میں رہا، اس دوران آپؐ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی، ہجرت کے بعد تعمیر ہونے والی یہ پہلی مسجد تھی، جمعہ کے روز مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔ نماز کا وقت بنی سالم میں ہو گیا، بطنِ وادی میں آپ نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور پہلا خطبہ جسے خطبۃ التقویٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے دیا جو فصاحت و بلاغت سے معمور، نصیحتوں اور اعمال صالحہ کی ترغیب و ترہیب سے بھرپور تھا۔ [2]

---

[1] سیرۃ المصطفیٰ ص ۲۰۶

[2] زاد المعاد، امام ابن قیم الجوزیہ ترجمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری بمبئی ۱۹۷۸ ص ۲۰۶ — ۲۰۷

اللہ تعالیٰ کے آخری نبیؐ، مسلمانوں کے محبوب اور انصارِ مدینہ کے مہمانِ عزیز ناقہ پر سوار تھے، پیچھے یارِ غار حضرت ابوبکرؓ بیٹھے تھے مدینہ کا رُخ تھا اور انصار کا جمِ غفیر ہتھیار لگائے شمعِ نبوت کو پروانہ وار گھیرے میں لیے چل رہا تھا، جاں نثاروں نے ناقہ کی مہار چھوڑ دی تھی اور ہر دل میں یہی تمنا عناں گیر تھی کہ دیکھیں ناقۂ نبی کہاں ٹھہر جاتی ہے، اس امید پر کہ شاید یہ چاند ان کے بام پر اُترے لوگوں نے امید کی شمعیں جلائے اپنے گھروں کو آراستہ اور منور کر رکھا تھا، ہر طرف سے والہانہ اور بیتابانہ درخواستِ نیاز بلند ہو رہی تھی "یا رسول اللہؐ غریب خانہ حاضر ہے" آپ صرف دعائے خیر دیتے اور فرماتے "اس کا راستہ چھوڑ دو! یہ ناقہ منجانب اللہ مامور ہے"[1] اور اللہ کی جانب سے مامور ناقہ چلتے چلتے وہاں پہنچا جہاں مشیت الٰہی تھی، یہ بنو نجار کا محلہ تھا، یہ آپ کے ننھیالی عزیز تھے، ایک کھلی جگہ جہاں بکریوں کے ریوڑ کا اڈا تھا بنو نجار کے دو یتیم لڑکے سہل اور سہیل کی ملکیت تھی وہاں اونٹنی ٹھہری یعنی آگے چلیں گے دم لے کر۔ پھر لوٹی اور اسی جگہ بیٹھ گئی (جہاں اب مسجد نبویؐ ہے) سامنے حضرت خالد کنیت ابو ایوب انصاریؓ کا یک منزلہ مکان تھا۔ یہ بنو نجار کے فرد تھے، نبی کریمؐ کے عزیزی رشتہ دار لیکن ایک غریب مسکین طبع بافندے تھے۔ بنو نجار آپ کے دادا عبدالمطلب کے ماموں تھے، رسول اکرمؐ کا طبعی میلان بھی اسی طرف تھا کہ آپ اپنے والوں کے مہمان بنیں اور معجزانہ طور پر یہ خواہش بھی پوری ہوئی، بنو نجار کے ایک گھر کو شرفِ میہمانی حاصل ہوا حضرت ابوایوب انصاری بڑھے سواری کا کجاوہ گھر میں داخل کر لیا، مہمانِ گرامی نے فرمایا "آدمی اپنی سواری کے ساتھ رہتا ہے"[2]

---

[1] اس اونٹنی کا نام دو شترہ ہے قصویٰ اور ابن اسحاق نے سیرۃ میں جدعاء لکھا ہے۔

[2] معارج النبوۃ مولانا حسین کاشفی، ابن اسحاق نے کتاب المبتدا میں ذکر کیا ہے کہ اسعد ابن کلیکرب نے ایک تحریر جناب رسولؐ پر ایمان لانے اور اپنے مسلمان ہونے کی لکھ کر مُہر بند کر کے سب سے بڑے یہودی عالم کے سپرد کر دی تھی، ایک دوسری روایت تبع کے بارے میں بتاتی ہے جو چار سو علماء تورات کے ساتھ صدیوں برس پہلے یثرب (مدینہ) سے گزرا تو علماء نے جنہیں نبی آخر الزماںؐ کی بعثت کی پیشگوئی کا علم تھا اسی نخلستانی شہر میں بسنے کا ارادہ ظاہر کیا جو دار الہجرۃ بننے کا شرف حاصل کرنے والا تھا، یہودیوں نے حوالے دے کر خاتم النبیین کی بعثت کی بشارت دی تو بادشاہ نے اجازت دے دی، ہر عالم کے لئے ایک مکان بنوایا اور مقامی عورتوں سے شادیاں کر دیں تا کہ نسل بڑھے اور ایک خاص مکان نبی آخر الزماںؐ کے لئے تعمیر کروایا اور اپنے اقرارِ اسلام کا مُہر بند خط (تبع عالم) کو دیا کہ اگر اس کی اولاد اس نبی کا زمانہ پائے تو یہ تحریر پہنچا دے۔ یہ گھر مختلف لوگوں کے قبضے میں رہا پھر ابو ایوب انصاری کا گھرانہ اس میں آباد ہوا اور اس طرح کہ آپ اسی عالم کی اولاد میں سے تھے، نبی آخر الزماںؐ حسبِ مشیتِ الٰہی اور بشارت کے بموجب اُسی مکان میں نزول فرمایا جو ان کے لئے خاص طور سے بنوایا گیا تھا۔ دیکھئے مقدمہ ملک تبع" اور در منثور (بیہقی)

جن کو سلوک و طریقت اور معرفت کے رازہای سربستہ کا علم دیا گیا تھا، آنحضرت ؐ نے "مومن عارف"
کو دعائیں دیں کہ "اے مومن خوش باش!

جو لوگ تیری اولاد میں راہ راستی پر رہیں گے وہ کبھی محتاج نہ ہوں گے اور روز بروز ان
کا درجہ ان کے خدا کے پاس بڑھے گا، دوسرے یہ کہ نیچے (درجہ) میں ہوں گے اور
اوپر تیرا خدا دونوں کے درمیان محمد کو رکھا اس سے بہتر کیا چاہتے ہو"؟ ؎۱

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار سب سے زیادہ محبوب تھے اور ان میں سے بنی
نجار کو سب سے زیادہ فضیلت دیتے تھے، ابو الاسید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ
نے فرمایا کہ انصار کے سب گھروں میں بنو نجار کا گھر بہتر ہے جو آپ کے ننھیالی عزیز تھے حضرت
ابو ایوب انصاریؓ کے مکان پر آپ کی شانِ نزول سارے قبیلہ نجار کے لئے فخر و
مباہات کا باعث بنا، بنو نجار کے بعد بنی عبد الاشہل کو پھر بنو حارث میں خزرج کو پھر
بنو ساعدہ کے فضائل کا بالترتیب ذکر فرماتے اور پھر کہتے کہ انصار کے ہر گھر میں بہتری ہے ؎۲

مناقب حضرت ایوب انصاریؓ

آپ کا نام خالد، کنیت ابو ایوب، پیشہ حیاکت، نسلاً خزرجی اور یمنی الاصل تھے، قبیلہ بنو
نجار کے فرد تھے بیعت عقبہ کے بعد جن انصاری گھرانوں نے اسلام قبول فرمایا آپ ان میں
سے تھے، بافندگی کا پیشہ موروثی تھا آباؤ اجداد یمن سے لائے تھے یہی یمن و برکت کا
باعث بن گیا کیونکہ نبی کریم صلعم بنو نجار ہی سے اپنے کپڑے بنواتے تھے اور آپ بار بار ان کپڑوں کو
دیکھتے جاتے، بنی نجار کے لوگوں کو بھی حضورؐ کی ذات مبارک سے والہانہ محبت تھی، ایک بار بنو
نجار کے محلے سے گذر رہے تھے تو کمسن بچیاں دف بجا کر یہی شعر پڑھ رہی تھیں جب ان کا
مدینۂ منورہ میں استقبال ہوا تھا۔

نحن جوارٍ من بنی النجار — یا حبذا محمد من جار

ہم لڑکیاں ہیں بنی نجار کی۔ — محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہی اچھے پڑوسی ہیں

قرین قیاس ہے کہ جب بھی آپ بنی نجار کے محلّے میں تشریف لے جاتے ہوں گے مذہبی قدردانی

؎۱ نجابت و شرافت" تذکرہ سفیر المومنین صفحہ ۵۰۔۱۵ ؎۲ صحیح مسلم کتاب الفضائل"

احساسِ رفاقت اور فرطِ محبت سے یہ شعر زبانوں پر آجاتا ہوگا، آنحضرتؐ نے سن کر فرمایا: اَللّٰھُمَّ بارِكْ فِیهِنَّ "اے اللہ تو ان میں برکت دے!"

بنو نجار کی فضیلت و نجابت کا اس سے اعلیٰ درجہ کا معیار کیا ہو سکتا تھا کہ سرکارِ دو عالم سے رشتہ تھا، قریش کے عبد المطلب کے واسطے سے کفو اور رشتہ ازدواج کے لئے ان کے ہمسر تھے زبانِ مبارک سے بھی اس فضیلت کا ادّعا کئی بار ہوا۔

خیر دیار الانصار دور بنی النجار

انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ جب نبی کریم قبا تشریف لائے تو بنی نجار کے سردار کو طلب فرمایا وہ گلے میں تلوار ڈال کر آئے اور جب حضورؐ حضرت ابو ایوب انصاری کے صحن میں اترے تو بنی نجار کے سربرآوردہ افراد پیچھے پیچھے تھے، یہاں وہ نماز اس جگہ پڑھتے تھے جہاں بکریوں اور بھیڑوں کا ریوڑ تھا، یہ ایک خالی زمین کا حصہ تھا جو دو یتیم بھائیوں کی ملکیت تھی اور جن کی پرورش حضرت اسعد بن زرارۃ کے ذمہ تھی۔ آپ نے اس جگہ کے لئے تعمیر مسجد کے بارے میں بنی نجار کے سرداروں سے بات چیت کی، انہوں نے کہا ہم ہبہ کر دینگے آپ نے منظور نہ فرمایا اور دس دینار قیمت دے کر زمین حاصل کر لی۔

اس جگہ درختوں کا گھنا سایہ تھا جن کے بیچ مشرکوں کی قبریں تھیں، آپ کے حکم سے قبریں مسمار کر کے زمین ہموار کر دی گئی اور غرقد اور کھجور کے درخت کاٹ کر قبلہ کی جانب ڈال دیئے گئے، اس وقت تک قبلہ بیت المقدس کی جانب تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اسعد بن زرارۃ نماز اور جمعہ پڑھاتے تھے۔ مسجد کی تعمیر شروع ہوئی اور آپ بھی اینٹ اور پتھر اٹھا کر لے جاتے ہوئے زبان مبارک سے یہ شعر پڑھتے:

اللھم لاعیش الاعیش الآخرۃ　　فاغفر الانصار والمھاجرۃ

اے اللہ زندگی صرف آخرت کی زندگی ہے　　تو مہاجرین کو اور انصار کو بخش دے

پھر جب مسجد کی تعمیر سے فراغت ملی تو ازواج مطہرات کے حجرے بھی اینٹوں سے تعمیر کرائے، پھر آپ نے مہاجرین و انصار کے مابین اخوت کا رشتہ قائم کر دیا یہ کل نوّے آدمی تھے، حضرت ابو ایوب انصاری کے گھر سے اٹھ کر آپ پھر اپنے حجرہ نبی میں تشریف لے گئے، مگر حضرت ابو ایوب انصاری نے آنحضرتؐ کی معیت اور رفاقت کو دائم اور قائم رکھا، وہ ان کی صحبت میں بدر کی جنگ سے حاضر رہے ان کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے اور حجۃ الوداع میں ساتھ رہے

حضرت ابو ایوب انصاریؓ ایک غریب بافندے تھے مگر دل کے غنی اور تلوار کے دھنی تھے،
اشاعتِ اسلام کے لیے آنحضرتؐ کے ساتھ آپ تمام غزوات میں شریک رہے اور فوج کی علم
برداری کے شرف سے بھی سرفرازی نصیب ہوئی، ہمیشہ سرکارِ دو عالمؐ کے حضور اور خدمت
کے لیے کمربستہ رہتے تھے حجۃ الوداع میں بھی ساتھ تھے، غزوۂ تبوک اور فتح خیبر کے ایک واقعہ
سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں اپنے نبیؐ کے لیے کتنا جذبۂ قربانی اور کتنی محبت تھی، جب
فتح خیبر کے بعد مالِ غنیمت میں ام المومنین صفیہؓ بنت اخطب قید ہو کر آئیں تو سرکارِ دو عالمؐ
نے ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لے لیا اور یہی آزادی مہر قرار پایا، خیبر سے ایک منزل آگے
پہنچ کر رسولؐ نے شب گزاری اور صبح کو دیکھا کہ خیمے کے باہر حضرت ابو ایوب انصاریؓ ننگی تلوار لے کر
نگرانی کر رہے ہیں، حضرتؐ نے استفسار فرمایا، جواب دیا اور اپنے ان تردّدات اور اندیشوں
کا اظہار کیا کہ شاید نو مسلم منکوحہ کو اپنے شوہر سے جدائی، باپ کے قتل و خاندان کی تباہی اپنی پوری قوم کی
جدائی یعنی اتنی شاق گذری ہو کہ منتقمانہ کارروائی کر بیٹھیں، [1]

آپ نے طویل عمر پائی تھی اور جب رسول خداؐ کی خدمت اور صحبت سے محروم ہو گئے تو بافندگی
کے شغل سے اٹھ گئے اور گھوڑے پر بیٹھ گئے عمرو بن العاصؓ کی سرکردگی میں مصر کی جنگ میں حضرت
علیؓ کے ساتھ کئی جہادوں میں دادِ شجاعت دی، انہوں نے فوج کی سپہ سالاری سپرد کی اور مدینہ
منورہ کی گورنری، پھر حضرت امیر معاویہ کے دورِ حکومت میں قسطنطنیہ پر حملے کی مہم میں شریک
ہوئے، قسطنطنیہ پر تین دفعہ حملے ہوئے پہلا حملہ ۴۹ھ میں یزید کے ساتھ آپ کی شرکت ہوئی
تھی، محاصرہ کے دوران قسطنطنیہ میں وبا پھوٹ پڑی ہزاروں جانوں میں سب سے
قیمتی جان آپ کی تھی وہ بھی نذر ہو گئی، نمازِ جنازہ میدانِ جنگ میں پڑھی گئی یعنی شہسوار
نے میدان نہیں چھوڑا اور آج تک وہیں آپ کا مزار ہے، [2]

"حضرت ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا [illegible] ان مسلمانوں سے اسلام کا دل ہے یہ شہر"

---

1. Muhammad Husayn Haykal, "The Life of Muhammad", Qum-Iran, 1976, PP. 373 [illegible]
2. حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے امام ترمذی، امام احمد، طبرانی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان وغیرہم نے کثرت سے حدیثیں روایت کی ہیں

۵۲ھ ہجری میں حضرت ابوایوب انصاری رضؓ کے سال وصال سے لے کر صدیوں تک ان کا مزار یونانی اور بازنطینی عیسائیوں کے لیے آستانۂ عقیدت بنا رہا یہاں وہ قحط اور سوکھے کی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے واسطے دعائے استسقار کرنے آتے تھے، جب بازنطینیوں اور ایشیائے کوچک کے درمیان معرکہ آرائیوں کا اٹوٹ سلسلہ قائم ہوا تو دونوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں، قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے جہاں مزار تھا باسفورس کی لہروں نے آبی غلاف چڑھا دیا اور تربتِ ایوبؓ سے آنے والی صدا رک گئی پھر جب ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا تو لہروں کی آبی حصاریں ٹوٹ گئیں اور ایک روز آفتاب کی کرنوں میں چمکتا ہوا مزار معجزانہ طور پر نظروں کو منور کر دیا، اعتقاد اور پختہ ہو گیا اور بدعت سنگین، نذر و نیاز اور منتوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے جیسا کہ راقم سطور نے پایا اور دیکھا جب ۱۹۶۵ء میں دولتِ ترکیہ کی دعوت پر استنبول (قسطنطنیہ) اور انقرہ کی سیاحت کا موقع ملا تھا۔

حضرت ابوایوب انصاری رضؓ سے جہنم، تربیہ، اذکار، طہارت، قصر و در مزدلفہ میں جمع بین الصلوٰتین اور جہاد کے بارے میں حدیثیں مروی ہیں ان کی مرویات کی تعداد ۱۵۵ تک پہنچتی ہے اور بالخصوص وہ ذکر جو کئی اور رواۃ سے ہم تک پہنچی ہیں وہ یہ ہے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

چھٹا باب

انصارِ مدینہ سے انصاریوں تک

اسلام نے تمام عالمِ انسانیت کو ایک نیا مذہب دیا، اسلام دینِ فطرت ہے اور یہی اولین انسان ابوالبشر کا بھی دین تھا، اسلام کی جلو میں ایک نئی تہذیب کا سفر شروع ہوا، ثقافت اور معاشرت کے نئے اقدار ہم رکاب تھے اور ہجرتِ نبوی نے تاریخ اسلام کو ایک نیا موڑ دیا، امت مسلمہ کی پہلی ریاست کی بنیاد شہرِ نبی میں ڈالی گئی۔ موشنہ زندگی کے سفر کے لئے شریعت نے نئی راہیں متعین کیں، ورنئی سمتوں کی نشاندہی کی اور آخرت کو آخری منزل قرار دیا، اسلام پھیلا اور خلافتِ راشدہ کے دورِ زریں سے کر بنو امیہ کی تاسیس اور استحکام تک سارا وسطی ایشیا اور بلادِ عرب اسلامی سلطنت کی وسعتوں میں گم ہو گئے، فتوحات کی لہروں کے ساتھ صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین موتی مرجان کی مانند پھیل گئے۔

ہندستان میں مغربی ہند کے ساحلی علاقے کوکن سے کیرالہ تک عرب اور ایرانی تاجروں اور مہاجروں کی نئی آبادیں ظہورِ اسلام سے قبل آباد تھیں (بمبئی سے قریب) تھانہ (تانہ) سوپارہ چیول[1] (جسے عرب صیمور کہتے تھے) اور سندان (سنجان) کی بندرگاہوں سے تجارتی تعلقات عہدِ قدیم سے اس سرزمین سے مستحکم ہو چکے تھے بابل اور نینوا کی قدیم سامی تہذیبوں کے گہوارے تھے اور جہاں اللہ کے کئی پیغمبر پیدا ہوئے تھے جنہوں نے کفر و شرک کے ظلمت کدوں میں توحید کی شمعیں روشن کی تھیں، ظہورِ اسلام کے بعد عرب تاجر داعیانِ اسلام بھی بن گئے، تجارتی مال کے ساتھ اب وہ دین و ایمان کے جواہر پارے بھی لانے لگے،

آنحضرت صلعم نے فرمایا "مجھے ہندستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے"[2] وہ روایتیں تاریخی

---

[1] چیول جو عرب صیمور کہتے تھے، یہ بمبئی سے قریب تھانہ کی کھاڑی الباس ندی سے پرے موجودہ نئی بمبئی میں (چمبور) کا علاقہ تھا۔

[2] سید سلیمان ندوی، عرب و ہند کے تعلقات (الہ آباد ۱۹۳۰)، غلام علی آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان فی آثار ہندستان۔ مطبوعہ ۱۳۰۳۔

شہر تھا اور پارچہ بافی کی صنعت کے لیے مشہور تھا ان حملوں کا نشانہ بنا رہا، کوکن کی زرخیزی اور
زراعتی پیداوار کی شہرت حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں وجہ رشک بن گئی تھی[۱] انہیں کے
زمانے سے ایک بحری دستہ ان بندرگاہوں کی باقاعدہ نگرانی کرنے لگا تھا، حضرت امیر معاویہؓ
نے سب سے پہلے بحری طاقت کی اہمیت کا اندازہ کیا اور انہوں نے اپنی حکومت میں رئیس البحر
کے ایک نئے عہدے کا نفاذ کیا اور مستقل قرار دیا، حضرت محمدؐ کے ایک صحابی (یا غالباً تابعی
صحابی) وہب بن ابی صفرہ انصاریؓ کا جو پارچہ باف تھے اس عہدہ پر تقرر کیا، المہلب
سیستان (سجستان) کی اس مہم میں بھی شریک تھے جس کی سپہ سالاری عبدالرحمٰن بن سمرہؓ
کر رہے تھے۔

جب حجاج بن یوسف ثقفی (م ۴۱-۹۵/۶۶۱-۷۱۴ء) عراق عرب کا والی مقرر ہوا تو انصار
مدینہ اور مکہ کے صحابہ کرام کی جمعیت کی باقیات صالحات کے لیے دورِ ابتلا کا آغاز ہوا، حجاج
طائف کا ایک مدرس تھا جس کے زیر تربیت طلبا کی نسلیں پروان چڑھتی رہیں اور جب بنو امیہ
نے چھری پکڑا کر ہاتھ میں دے دی تو سروں کی فصلیں کاٹنے لگا، خلافتِ امیہ کی بنیادوں
کو محسنوں کے خون سے مستحکم کیا گیا اور اس میں عبداللہ بن زبیر کی شہادت کا خون سب سے
زیادہ گہرا نظر آتا ہے، عبداللہ بن زبیرؓ کی نوسالہ عراقی خلافت ختم ہوگئی (۶۹۲ء) اور وہ
خود مصلوب کر دیے گئے۔ انصاریوں کی طاقت ٹوٹ گئی اور جمعیت پراگندہ ہوگئی، حجاز و عراق
کی زمین ان کے لیے تنگ اور زندگی بھی تنگ ہوگئی تو تنگ آمد بجنگ آمد حرمین شریفین
سے ہجرت کر کے شمالی افریقہ اور اسپین کے جنگی محاذوں پر چلے گئے، ایک قافلے نے اس
طرف کا رخ کیا، میسر سب کو کچھ ٹھنڈی ہوا جہاں سے، مہاجرین کا یہ قافلہ جزائر بمبئی کے
ارد گرد سوپارہ، تھانہ اور چیول (صیمور) کی بندرگاہوں پر اترا، جب حجاج مشرقی مقبوضات
جس کی حکومت میں مکران، سیستان، بلوچستان اور خراسان شامل تھے تو بہت سارے مہاجر

---

[۱] Rizvi, S.A.A. Shah Abdal-Aziz: Puritanism, Sectarian Polemicsand Jihad, Cambridge, 1970. PP. 28, 40, 73

انصاری خاندان ان علاقوں میں آ کر بس گئے اور فوج میں شامل ہو گئے، مہمات کا سلسلہ ماوراء النہر (ترکستان) تک پھیلا ہوا تھا، مہلب بن ابی صفرہ انصاری نے ۴۵ھ میں مرو (ایران) کی طرف سے آ کر ایک لشکرِ جرار کے ساتھ جس میں دو سو انصاری تھے ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک نئے درے سے جو بعد میں درۂ خیبر کہلایا گھس کر مغربی پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ یہ کشور کشائی کا داخلہ تھا بعد دینِ رحمت کا داخلہ تھا۔ کابل کی مہم سر ہو چکی تھی، قتیبہ ابن مسلم ترکستان میں زرفشاں کی وادی تک پہنچ چکا تھا لیکن سرداروں کی قبائلی خانہ جنگیوں نے اس کے لشکر میں انتشار پھیلا دیا تھا، باہمی عداوتیں عام بغاوتیں بن گئیں[1]۔ المہلب کا انصاری دستہ بھی دستبرد[illegible] سے ذہبی، بن انصاری خاندان کا حجاج بن یوسف خیر خواہ تھا لیکن بنو امیہ خود دشمن بن چکے تھے، المہلب معتوب ہوئے، فرار میں فائدہ تھا، بسلسلے کے راستے مکران پہنچے، قندھار (قندوین) کے حکمران نے بد عہدی کی، خاندان کے افراد اور انصاریان تہ تیغ کر دئے گئے۔ جو بچ گئے پنجاب میں بس گئے۔

دیارِ ہند میں اصحاب کرامؓ اور تابعین عظامؒ:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

— ایسے ہی تھے وہ قدسی نفس اور بابرکت ہستیاں، وہ اصحابؓ و تابعین کرام اور تبع تابعین جو شوقِ جہاد اور ذوقِ شہادت سے سرشار ہو کر دین کی عزیمت و دعوت کے لئے دیارِ ہند میں آئے، کچھ یہیں پیوندِ خاک ہوئے اور کچھ آگے بڑھ گئے، دم ہے کہ سرزمینِ ہند میں کیا کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں، تجارتی تعلقات، عسکری مہمات و سیاسی انقلابات کے نتیجے کے تحت شمالی ہند، سندھ اور مغربی ساحل پر کوکن سے ملیبار تک مسلم عربوں کی آمد و رفت نے اسلام کی برکتوں کو پھیلا دیا تھا، اولین مبلغینِ دین میں وہ ہستیاں بھی تھیں جنہوں نے

---

[1] M.A. Shaban. The 'Abbasid Revolution? Cambridge, 1970, PP. 28, 40, 73

پیغمبر اسلام کا شاندار زمانہ دیکھا تھا اور خیر القرون کی وہ شخصیتیں بھی موجود تھیں جو بنو امیہ کے دورِ خلافت میں یہاں آکر بس گئی تھیں اور یہیں ان کی اولاد پروان چڑھی، ثقہ روایات کے مطابق جن اصحابِ کرام اور تابعین عظام کا ہندستان سے تعلق رہا اُن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

عثمان بن ابی العاصی ثقفی کے دو بھائی، الحکم اور المغیرہ، عاصم بن عدی الانصاری، عبداللہ بن عتبان، عبدالرحمٰن بن سمو بن حبیب بن عبد الشمس بن عبد مناف۔ یہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے۔ حضرت عثمان رضی کے زمانہ میں سجستان اور کابل کی مہم میں شریک ہوئے، امیر معاویہ نے سجستان کی دوبارہ مہم پر جو لشکر جرار بھیجا تھا اس کے سپہ سالار یہی تھے، قریشی النسب تھے، بصرہ میں ۵۱ ھ میں وفات پائی۔ عبیداللہ بن معمر التیمی (یہ رسولِ اکرمؐ کے وصال کے وقت لڑکے تھے)، ان کے فرزند عمر بن عبیداللہ بن معمر التیمی جو عبدالرحمٰن بن سمرہ کے لشکر میں تھے کابل کی مہم میں شہید ہوئے۔

محمد بن قاسم ثقفی انصاری فاتح سندھ (۱۲-۷۱۱ عیسوی) کے لشکر میں انصاریوں کی کثیر تعداد تھی، مسلم مقبوضات اور جنگی مہمات نے اسلامی سلطنت کو سیاسی اور اقتصادی استحکام بخشا تھا، مالِ غنیمت کی فراوانی، عرب نو آبادیوں کی تأسیس اور نئی مقبوضات نے عربوں کو خراسان، سیستان اور ہندستان تک پھیلا دیا تھا، عرب فوجیوں کو وظائف بھی دئے جاتے تھے، جہاد میں دنیوی اور اخروی مفاد بھی تھا اور جذبۂ اسلامی نے ان کے دلوں اور جسموں میں نئی روح پھونک دی تھی۔ محمد بن قاسم نے اپنی چار سالہ حکمرانی میں عدل و انصاف کے ترازو کو سنبھالے رکھا، رعیت خوشحال ہوئی، مسلمان مرفہ الحال ہوئے، اسلام کی تعلیمات کی تاثیر اور مسلمانوں کے مومنانہ کردار سے کلمہ گویان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا، عرب ممالک سے لوگ آتے رہے، کچھ قبائل بسلسلۂ تجارت ترکِ وطن کر کے آئے، اور کچھ جو وطن میں بے سہارا رہ گئے تھے اپنے والوں کی محبت اور حفاظت کی خاطر ان کے ساتھ آکر بس گئے تھے،

جن صحابیوں کی اولاد نے ہندستان میں نشو و نما پائی ان میں زبیر بن العوامؓ کی اولاد پنجاب میں بھیلی، اناوہ اور بریلی والے زبیری لکھتے ہیں، کنبوہ کہلانے والے اپنے آپ کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کوکن کے ساحلی علاقوں میں جہاں عربوں کی قدیم آبادیاں سوپارہ، تھانہ، چول (چیمور) اور سنجان میں قائم تھیں وہاں حجاج بن یوسف کے ظلم اور بربریت سے بچنے

کے لئے جن لوگوں نے کوفہ، مکہ اور حجاز سے ہجرت کی ان کے اولین پناہ گزینوں نے آل طلحہ رضؓ
عباس رضؓ و زبیر رضؓ سے سلسلۂ انتساب باندھا۔ مہدیلی، اٹاوہ اور پنجاب کے کمبوہ حضرت زبیر بن العوام رضؓ
سے سلسلۂ نسب جوڑ کر زبیری بن گئے تو جنوبی ہند اور گجرات میں یہ
(نائطہ، نایت، نوایت) کہلائے۔ عرب نژاد مخلوط النسل نوائط جو کوکن میں بس گئے کوکنی مسلمان
بن گئے، جو ملیبار میں مقیم ہوئے موپلا کے لقب سے مشہور ہوئے جو آگے بڑھ گئے مدراس وغیرہ میں
وہ لبے بن گئے۔ سوپارہ اور تھانہ میں پارچہ بافی کی صنعت اور تجارت کو اس عہد میں بے حد فروغ حاصل
تھا، یہ صنعت تھانہ میں عہد برطانیہ تک قائم رہی۔[1] یہاں ایک خاص قسم کا کپڑا جسے تنسی کہتے
تھے بُنا جاتا تھا اس کا ذکر عرب جغرافیہ نویس ابوالفدا (چوتھی صدی ہجری) نے کیا ہے۔ وہ یہ
(تھانہ) کے بُنے ہوئے کپڑے "تنسی" کی تکنیک کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح یہاں
کے بُنکر نقلی ریشم سے اسے بنتے تھے اور یہ مصنوعی ریشم بانس کے ریشوں سے کشید کی ہوئی
طباشیر (ایک قسم کی شکر) اور شکر (گنے) کے گودے سے کیمیاوی طریقہ پر تیار کیا جاتا تھا۔[2]
تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ یمنی پارچہ باف کوکن اور بحیرۂ عرب کے جزائر، لدیپ وغیرہ
میں بس گئے تھے بحرِ ہند میں ایک ہزار نو سو جزائر تھے عرب مبلغین دین اور تاجروں کی
کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے اور وحشت و بربریت کا سیاہ دور ختم ہوا۔ یہاں [illegible]
ریاستیں قائم ہوئیں اور خصوصیت کے ساتھ حضرموت کے عرب نو آبادکاروں کی ایک
بڑی تعداد یہاں آباد ہو گئی اسی لئے اسے 'حضرمہ' کہتے تھے، یمن حضرموت کا حصہ ہے۔

حضرت معاذ بن جبل انصاری رضؓ

بنو امیہ کے دور خلافت میں محمد بن قاسم کی معیت میں متعدد انصاری خاندان ترک وطن کر کے
شمالی ہند آئے۔ ان میں سید الانصار حضرت معاذ بن جبل رضؓ جو یمنی الاصل تھے ان کی اولاد کو [illegible]
تھا، حضرت معاذ بن جبل انصاری کا خاندانی پیشہ بافندگی تھا جو یمن کے یمن و برکت کا سبب تھا،
کشادہ دل تھے اور جود و سخاوت میں ہاتھ کھلا تھا، آمدنی زیادہ تھی لیکن کریم النفسی نے قرض سے

---

[1] مومن محی الدین، تاریخ کوکن، بمبئی ۱۹۲۹ء، ص ۹۸، چوتھا باب کوکن سے دین کی دہلیز پر،
[2] تاریخ کوکن ص ۹۵

مٹھی بند کر دی، اور اس قدر قرضدار ہو گئے کہ تمام اموال منقولہ و غیر منقولہ قرض کا بار بھی نہ سنبھال سکے، تہی دست ہو گئے، تو رسول اکرمؐ نے آپ کا تمام مال فروخت کر کے قرض ادا کر دیا، فتح مکہ کے سال حضورؐ نے آپ کو ملک یمن کا والی مقرر فرمایا۔ یہاں جب یہ امیر یمن بنے تو تجارت کے تانے بانے بھی سلجھے اور دولت بھی کمائی۔

وفات نبیؐ کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق اکبرؓ کی خلافت کا زمانہ تھا، حضرت عمر فاروقؓ نے آپ سے کہا کہ اپنا سارا مال حضرت معاذ سے لے کر بیت المال میں جمع کرا دیں، صدیق اکبرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ جناب رسول صلعم نے ان کو یمن اسی لئے بھیجا تھا کہ نقصان کی تلافی ہو جائے۔ ایسی حالت میں میں ان سے خود نہ لونگا ہاں وہ خود داخل کر دیں تو اور بات ہے، حضرت عمرؓ نے جب خود یہ مطالبہ حضرت معاذؓ سے کیا تو انہوں نے وہی تلافی وفات کا حوالہ دیا، حضرت عمرؓ یہ سن کر خاموش ہو گئے لیکن کچھ دن ہی گزرے تھے کہ حضرت معاذؓ حضرت عمرؓ سے ملے اور کہا بھائی میں آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں پانی کے گرداب میں غوطے کھا رہا ہوں، ڈوبنے کے قریب ہوں کہ آپ نے مجھے بچا لیا اور نجات دلائی۔ پھر حضرت معاذؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی خدمت میں سارا ماجرا عرض کیا اور جو کچھ یمن سے کما کر لائے تھے بلا تکلف سامنے رکھ دیا، ایک حبہ بھی اپنی ملکیت میں نہیں چھوڑا، خلیفہ اول نے تلطف کے ساتھ فرمایا کہ میں اس میں سے کچھ نہ لونگا، میں اپنی طرف سے تم کو ہبہ کرتا ہوں، حضرت عمرؓ جو اس وقت موجود تھے فرمایا کہ اب اس کے رکھنے میں کچھ حرج نہیں، یہ تھا ان صحابیوں کا عمل، اتباع سنت اور اطاعت احکام الٰہی، حضرت معاذؓ نہایت جلیل القدر اصحاب رسولؐ میں سے ہیں آپ کی فضیلت اور منقبت کا اندازہ جناب رسول صلعم کے اس ارشاد سے ہوتا ہے کہ معاذ بن جبل انصاریؓ قیامت کے روز علماء کے سردار ہونگے، یمن کے عہدہ قضات پر آپ کے تقرر کے وقت جو مکالمے آپ کے اور رسول اکرمؐ کے درمیان ہوئے وہ اصول فقہ کے مبادیات میں سے ہیں۔

حضرت مہلب بن ابی صفرہ انصاریؓ

حضرت مہلب بن ابی صفرہ انصاری خراسان کے گورنر رہ چکے تھے ان کے صاحبزادے یزید بن مہلب انصاری ان کے جانشین بنے بنوامیہ کے عہد حکومت میں معتوب ہوئے عہد عباسیہ میں

صورتِ خورشید ڈوب کر نکلے، اور ان کی اولاد جو موروثی صفات اور کمال کی حامل تھی عروج کو پہنچی، کبھی کوئی یمن کا والی بنا تو کوئی آذربائیجان کا گورنر، ہمیشہ سے عرب میں شجاعت اور دلیری کے لیے، یہ پائندہ خاندان مشہور رہا۔[1]

دوسرا انصاری خاندان، حیاکت جن کا آبائی پیشہ تھا حضرت ابو ایوب انصاری کا یعنی اوس اور خزرجی خاندان تھا بنو نجار قبیلے سے نسبت تھی اور آنحضرت[2] کے دادا عبدالمطلب کے ماموں تھے، اس خاندان میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے کثیر العیالی کی برکت عطا کی اور معیشت میں تفریت شامل حال رہا۔

عرب خاندانوں میں یہ دستور عہدِ قدیم سے چلا آ رہا تھا کہ آباء و اجداد کی یادوں کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے، یا تو ان کی یادگاریں بنا دیتے تھے یا شاعری کا سہارا لے کر ان کے کارناموں کی داستانیں سنا کر زبان زدِ خاص و عام کر دیتے تھے، ہر سال جب حج کے سارے ارکان پورے کر چکتے تو منیٰ میں جلسے کرتے، باپ دادا کے کارناموں پر قصیدہ فخر کے ساتھ بیان کرتے اور بڑائی کی ڈینگیں مارتے، ایک طریقہ تسمیہ تھا یعنی آباء و اجداد کے جن افراد کا نام لیتے بعد دیگرے اپنی اولاد کو دیتے تاکہ سلسلہ چلتا رہے اور شجرۂ نسب برقرار رہے۔

حضرت عبداللہ بن ایوب انصاری

حضرت خالد بن زید بن کلیب نام تھا اور کنیت ابو ایوب تھی اور ایک صاحبزادے کا نام عبداللہ تھا، اور اس نام کی تکرار سے بہت سارے اشتباہات پیدا ہو گئے تھے جنہیں تذکرہ نویسوں نے بہت سارے تاریخی واقعات کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ عبداللہ انصاری حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں جب کہ ابھی ان کے والد بقیدِ حیات تھے اور جن کی وفات ۵۲ ہجری میں ہوئی قیس بن احنف کے ساتھ ۳۲ھ میں خراسان چلے گئے قیس ہرات کے گورنر مقرر ہوئے تھے یہ ہرات میں بس گئے اور ان کی اولاد پشت[3] پر پشت ان پڑھی، انہیں کے نسب سے مشہور صوفی؛

---

[1] شبلی نعمانی، المامون

[2] تاریخ ہرات، انصار حصہ ص ۶۹، ۱۔ مصنفین اور تذکرہ نویسوں سے تسامح ہو گیا ہے اور دونوں مبادیوں کو خلط ملط کر دیا گیا، دیکھیے الزمن کلکتہ ۱۹۲۵ مضمون عبدالرحیم جامی

یعقوب انصاری اور یوسف انصاری

یہ دونوں حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے پوتے یعنی عبداللہ انصاری کے صاحبزادے تھے، ان دونوں کی اولادیں تمام ہندستان میں شہر در شہر پھیلیں اور فی الحقیقت ہندستان کے انصاریوں کے یہی دونوں جدِ امجد ہیں۔ یوسف انصاری کے نسب سے ان کی اولاد کی دو شاخیں بٹ گئیں، وہ اولاد جو سندھ میں آباد تھی بنو امیہ کے زوال کے بعد اور اسماعیلیوں کے احتساب اور قید و بند کے بند توڑ کر راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ میں ہجرت کر گئی، یہ جیسلمیر کا علاقہ تھا، یوسف انصاری ۵۶ھ میں اولادِ کثیر چھوڑ کر وفات پا گئے۔[1]

محمد بن قاسم ثقفی کی توسیع پسندی میں یوسف انصاری کی بہادری کی تعبیریں شامل تھیں، محمد بن قاسم انہیں یاد کر کے روتا رہتا تھا اور جب وہ خود سیاسی سازشوں میں پھنس کر معتوب ہوا اور معزول ہوا پھر مقید ہو کر زندان میں مرا تو سارا سندھ رو دیا اور اس کا بت بنا کر ماتم کیا، دختر یوسف نے [illegible] تو خاندان "یوسف بے کارواں" بن کر راجپوتانہ، سندھ، دریائے اٹک کے کنارے [illegible]، غزنی میں مل جائے ——— اور یوسف انصاری کے پردادے (پرپوتے) عبدالرحمن و مسعود غازی مل گئے۔

دونوں بھائیوں کی اولاد نے سلاطین غزنویہ (۹۶۲ - ۱۱۸۶ء) کے دورِ حکومت میں بہت عروج حاصل کیا، امیر ناصر الدین سبکتگین (۹۷۶ - ۹۹۷) کی بہت سے جنگی خدمات انجام دیں، ان کے سبب افغانستان اور پنجاب کے مقبوضات سلطنت کا حصہ بن گئے، عبدالرحمن انصاری بن [illegible] بن ابوالحسن انصاری ——— یوسف انصاری کے پردادے (پوتے کا بیٹا) تھے یہ نہایت جری سپاہی تھے اور غزنوی سلطنت کو استحکام اور استقامت اسی شہید پہلوان کی بیداری سے ملی۔
اسی طرح قاسم انصاری اور یونس انصاری بن محمد صالح انصاری وغیرہ بھی یوسف انصاری کے پردادے (پرپوتے) تھے، یہ تمام گھرانہ مردانگی اور شجاعت میں ہم [illegible] میں اور ممتاز تھا محمد بن صالح انصاری کثیر العیال اور بزرگ تھے ان کی اولاد میں ایسی برکت خلاق دوعالم نے دی تھی کہ یہ عالمگیر بن گئی۔ آٹھ بیٹے اور تیس پوتے تھے اور پرپوتوں کی تعداد ان کی زندگی میں

۱۔ البلاذری۔ فتوح البلدان

بے شمار تھی۔ گھرانے جب گھیرے توڑ ڈالتے ہیں تو گھروندوں کی طرح بکھر جاتے ہیں، راجپوتانہ اور
سندھ میں کچھ خاندان آباد ہوئے، کچھ صحرا کے ریگ زار کی طرح بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گئے۔
جے پور، جودھ پور، جیسلمیر، بیکانیر اور خیر پور کے ریگستانی شہروں اور قصبوں میں یہ زندگی کے
دھوپ چھاؤں میں پھیلتے چلے گئے۔

یعقوب انصاری کی اولاد میں یحییٰ بن زکریا اور منصور انصاری کے علاوہ کئی اور نامور ہستیاں
پیدا ہوئیں جو محمود غزنوی کے چھٹے حملے (۳۹۹ھ) میں شریک تھے، پنجاب کی فتح کے بعد یہیں
بس گئے اور ملتان ان کا مرکز بنا یہیں سے یہ سارے اضلاع پنجاب میں پھیل گئے۔ ان میں یہ
اہم شہر تھے: راولپنڈی، سیالکوٹ، لدھیانہ، گوجرانوالہ، منٹگمری، جھنگ، وزیر آباد، قصور،
لاہور، جہلم، فیروز پور، جالندھر، پٹیالہ، امرتسر، لائلپور، گرداسپور۔

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری، پیر ہرات، پیر ہروی

حضرت یعقوب انصاری ابن عبداللہ انصاری ابن ابی ایوب انصاریؓ کا ہرات خراسان میں
مستقل سکونت پذیر ہونا ایک مصدقہ تاریخی واقعہ ہے، یہیں انہیں کی اولاد سے مشہور صوفی بزرگ
دین شعور و نغز نگار شیخ عبداللہ انصاری گذرے ہیں جو عرف عام میں پیر ہرات یا پیر ہروی کے
لقب سے معروف ہیں، ان کا پورا نام ابو اسمٰعیل عبداللہ محمد انصاری تھا (۳۹۶-۴۸۱ھ، ۱۰۰۵-۱۰۸۸ء)
ارسلان سلجوقی اور مشہور وزیر خواجہ نظام الملک طوسی کا زمانہ پایا تھا، علوم ادبیات فارسی و عربی
میں کامل دستگاہ حاصل تھی، حدیث و فقہ و تفسیر پر عبور کامل تھا، تصوف میں مرشد کامل کا درجہ
رکھتے تھے۔ شیخ ابو الحسن خرقانی سے عرفان و تصوف کا سبق لیا تھا اور مشہور رباعی گو شاعر
ابو سعید ابی الخیر ([illegible]) جیسے "پیر صحبت" سے فیض روحانی اکتساب کیا تھا حضرت
پیر انصاری سلوک و طریقت میں اپنے مرشد شیخ ابو الحسن خرقانی سے بھی آگے بڑھ گئے تھے اور
ان کا قول ہے کہ "آج اگر وہ ہوتے تو میرے مرید ہوتے"

"من مرید خرقانی ام درین وقت می بود با وجود پیریش مریدی میکرد"

عربی و فارسی میں پیر ہرات کی متعدد تصانیف ہیں، فارسی میں رسالہ مناجات عبداللہ
انصاری، زاد العارفین، الٰہی نامہ، کنز السالکین، رسالہ دل و جان، قلندر نامہ وغیرہ ان کی
علمی فضیلت اور صوفیانہ علو مرتبت کی نشاندہی کرتے ہیں، پیر ہرات کی اولاد نے اس شہر کو
اپنے وجود قدسیہ سے بوستان بنا دیا تھا، مؤرخین اور تذکرہ نویسان لکھتے ہیں "مشائخ ہرات

باغیچۂ انصاریان اندؒ انصاری خاندان سے علم و عرفان کے چمنستان روحانیت میں جو بہار آئی تھی اس کی رنگینیاں ہندستان تک کو دمغز ابنا چکی تھی، انصاری خاندان جو ہندستان میں علم و ادب کے افق پر شہاب و آفتاب بن کر چمکے انہیں کے پرتو سے کسبِ نور کیا تھا، ملک محمود شاہ ایجوآق خواجہ جو عہد غزنویہ میں فارس و کرمان و عجم کا حکمراں بنا پیر انصاری کا رشتہ دار تھا، انہیں سے خواجہ محمد علی انصاری کا جو عہد عین میں ہندستان آکر پانی پت میں مقیم ہوئے سلسلۂ نسب دس واسطے سے پہنچتا ہے، پانی پت کے اسی مشہور کنبہ کے گل سرسبد مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی تھے ان کی والدہ انصاری تھیں، مولانا محمود الحسن شیخ الہند کی ریشمی رومال کی تحریک میں جنہوں نے سب سے عظیم کارنامہ سرانجام دیا وہ مولانا محمد میاں تھے جو بعد میں منصور الانصاری کے نام سے مشہور ہوئے انہیں کے صاحبزادے مولانا حامد الانصاری (متوفی ۱۶ر اکتوبر ۱۹۹۲ء) تھے جو بمبئی کے قدیم روزنامہ 'جمہوریت' کے مدیر، عالم دین اور جنگ آزادی کے مردِ مجاہد تھے، لکھنؤ کے فرنگی محل دینی درسگاہ کے بانی ملا نظام الدین ابن ملا قطب الدین سہالوی شہید بھی حضرت ایوب انصاری کی پشت سے تھے 'ایں خانہ ہمہ آفتاب' جب سے فسوں شاں ہے، قطبِ ارشاد مولانا رشید احمد بن ہدایت احمد گنگوہی بھی انصاری خاندان سے تھے۔

شیخ الاسلام کے بہت سارے اقوال علم و معرفت اور حقانیت سے بھرپور ہیں، فرماتے ہیں:

اگر یکبار بگوید بندۂ من! از عرش بگذرد خندۂ من"

پہلے اتنا کہہ دے اے میرے بندے — تو میری مسرتیں آسمان کو چھولیں" ان کے حکیمانہ کلمات ان کی نثر کے جواہر پارے ہیں۔

تذکرہ نویسوں سے جو عام تاریخی غلطی ہوئی ہے وہ عبداللہ انصاری نام کی تکرار ہے، اس اشتباہ نے کئی صدیوں کو سمیٹ کر حضرت عبداللہ انصاری ابن محمد ایوب انصاری کو جو ۲۲ھ میں خراسان منتقل ہو چکے تھے۔ انہیں کی پشت سے پیدا ہونے والے ہم نام شیخ عبداللہ انصاری پیرِ ہرات کو جو پانچویں صدی مطابق گیارھویں صدی میں جلوہ گر تھے خلط ملط کر دیا ہے اس طرح پہلی صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری میں جست کر گئے۔

شجرۂ آل انصار

بحوالہ تاریخ مومن۔ انصار

پنجاب

صوبۂ دھلی

اودھ

آگرہ

احاطۂ بنگال

کلکتہ

گجرات

حیدرآباد

احاطۂ مدراس

اولاد یونس انصاری

اولاد زکریا انصاری

ساتواں باب

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

یمن سے یثرب (مدینہ منورہ) اور دیارِ ہند تک، زمانۂ خلافت سے لے کر عہد سلاطین دہلی و دکن تک قافلۂ انصار سے کاروانِ انصاریین تک صدیوں کے کڑے کوس کا سفر تھا، یہ لوگ مجاہدین بن کر آئے، شہید بن کر شہر خموشاں کے سناٹوں میں سو گئے، مسلمانوں کا تسلط قائم ہوا تو غازیوں اور مُردوں کو چھوڑ کر واپس کیا جاتے، نہ واپسی کا ارادہ تھا اور نہ بس جانے کے سوا کوئی چارہ تھا پھر پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا، کا نعرہ لگاتے اور پرکھوں کے دیس میں جا بسے اسلامی مقبوضات کی سرحدیں بیکراں وسعتوں میں گم ہوتی جا رہی تھیں اور عرب میں سارا ان گم ہوتا نظر آ رہا تھا، ہندستان کے ہر شہر میں ان کے لینے والے زندہ تھے اور اپنے والے بس گئے تھے، پشتینی پیشہ ورچہ بانی کے رشتے زمین میں پیوست ہو چکے تھے، جہاں جہاں تنے ہوئے کا سایہ دیکھا اور امن کی گھنی چھاؤں ملی وہیں چھاؤنی ڈال دی، خاندان کے خاندان بس گئے، نسلوں کی فصلیں کھڑی ہو گئیں، باہمی اختلاط اور قرابت داری کی جڑیں مضبوط ہو گئیں، ایک دوسرے کے ہمسر کفو بن کر رشتۂ ازدواج میں جکڑ گئے، ہندی بانے اور عربی بانے نسب انصاری سادات میں شیخ کی تعظیمی صفت لگائی، نور بف خود کو کہتے تھے اور بیسویں صدی سے مومن عرفیت لکھواتے تھے۔ غبارِ جلاہا، کہہ کر بلاتے تھے غرض کہ ساری کڑیوں کی ایک وحدت بن گئی ملتان سے لے کر مرشد آباد تک اور بہار و یوپی سے لے کر جیسٹی بمبئی تک، ان کے آبائی روایات میں یکجائی تھی اخلاقی کردار اور اقدار کا وہی معیار تھا، سادہ لوحی، منکسر فروتنی، پاکیزگیٔ نفس کی وہی نشاست اور وہی پابندیٔ عبادت، لیکن وہیں تو اس میں رہنے والوں کی وہی جہالت جس کے سبب یہ جولاہا، جُلاہا کہلائے۔

انصاریوں کا قومی، دینی اور تہذیبی کردار کم از کم ماضی میں یہی تھا۔ کیا حال کے پردے پر اس کی پرچھائیاں پڑ رہی ہیں یا یہ سارے قصۂ پارینہ اور حدیثِ دیگراں بن گئے ہیں، ان تمام قبیلوں کا جہاں جہاں ان کی بستیاں آباد تھیں ایک سرسری جائزہ ضروری ہے تاکہ اس حقیقت

کا اندازہ ہو جائے اور شاید مجبور ہو کر یہیں کہنا پڑے

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے (اقبالؒ)

مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی کتاب المنوال والمنہ سے استفادہ کُلّی کرتے ہوئے دیگر تذکرہ نویسوں نے ہندستان کے شیخ انصاری زر بافوں کی مختلف بستیوں اور شخصیات کا ایک سرسری جائزہ لیا ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے یہ حقیقت کم و بیش مصدوق نظر آتی ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضؓ حضرت معاذ بن جبلؓ انصاری، حضرت مُہلّب بن ابی صفرہ انصاریؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ کی نسلیں سندھ، شمالی پنجاب یوپی اور بہار میں پروان چڑھتی رہیں [۱]

یہ سارے نام انہیں بستیوں کے ہیں:

الٰہ آباد۔ اعظم گڑھ، اجودھیا، آرہ، آسنسول، بنارس، بلہوری، بہرائچ، بلیا بھاگل پور، بردوان، بمبئی، ترہت، پٹنہ، پشاور، ٹانڈہ، جونپور، جبل پور، جموں، چھپرہ، جگر دھر، حیدرآباد، دانا پور، دہلی، ڈمراؤں، ڈھاکہ، رائے بریلی، رانی گنج، سیوان، سگڑی، شاہ بورہ، سہارنپور، شیخوپورہ، سیالکوٹ، غازی پور، کلکتہ، کھگول کشمیر، فیض آباد، گجرات، گرانڈ، مدراس، مرشدآباد، مکانوان، مظفرنگر، میرٹھ، مالک ستو سدا، مبارک پور، مئوناتھ بھنجن [۲]۔

سندھ اور راجپوتانہ کے انصاریوں کے حالات

یوسف انصاری کی جو محمد بن قاسم ثقفی کے لشکر کے ساتھ سندھ میں آئے ایک شاخ راجپوتانہ کے صحرانشینوں میں برگ و بار بن کر بہار لائی، لیکن اس بہار کی آبیاری کے لئے برسوں ان جاں باز مجاہدین کو خون بہانا پڑا، دشمنوں کے دستے صحرائی بگولے بن کر انہیں ریت کے ذرّات کی طرح بکھیر دینا چاہتے تھے لیکن یہ نخلستان بن کر سایۂ عاطفت بن گئے جیسلمیر کے ریگستانی علاقے

---

[۱] کتاب منوال و منہ، حصہ دوم ۷۴۔۷۷؛ تاریخ مومن، انصار جلد دوم تمام

[۲] کتاب المنوال والمنہ حصہ دوم ۷۴۔۷۷

میں ایک دامنِ کوہ میں بہ دریائے اٹک کے کنارے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بس گئے۔
امیر ناصر الدین سبکتگین (متوفی ۹۹۷ء) کے لشکر نے جب دہلی کے راجہ جے پال کو ۹۷۹ء میں شکست دی تو انہیں خاندانوں کے بہادر سپاہیوں نے دادِ شجاعت دی تھی ان میں عبدالرحمٰن انصاری (جو یوسف انصاری کے پرپوتے تھے) ابن جلال الدین انصاری بن ابوالحسن انصاری اور دوسرے پرپوتے قاسم انصاری اور یونس انصاری ابن محمد صالح انصاری کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں، سلطان محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰ء) کی مختلف مہمات میں انصاری حضرات شریک رہے جو تمام راجپوتانہ اور سندھ کے شہروں اور قصبوں میں آباد ہو چکے تھے،

راجپوتانہ میں جودھپور، جے پور، جیسلمیر، بیکانیر، خیرپور اور سندھ حیدرآباد میں شیخ انصار کے قبیلے موجود تھے، ان میں کچھ گھرانے بافندگی کا پیشہ اختیار کر چکے تھے درباقی زراعت اور کھیتی باڑی کرتے تھے، ایمانداری اور دینداری شعار تھا، طبیعت کے سادہ لوح تھے ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۰ء تک ملک میں تحریک خلافت نے بڑا زور پکڑا۔ خلافت امت مسلمہ کے لئے ایک نام نہاد علامت بن کر رہ گئی تھی لیکن اس اپاہج کو بیساکھی کے سہارے چلانے سے مسلمانوں میں کچھ تو جذبۂ قوم پیدا ہو چلا تھا اور وہ سیاسی میدان میں قدم آگے بڑھانے لگے تھے، بڑے بڑے جلسے ہوتے تھے اور ان جلسے جلوسوں میں لوگوں کا اژدہام ہوتا تھا ور بچہ بچہ کی زبان پر یہی شعر تھا

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

سندھ اور راجپوتانہ سے کچھ خاندان جان دینے کے لئے کابل پہنچ گئے جب کہ "ایں راہ کہ میروی بہ ترکستان است" یہ خانماں برباد بھی کابل ہی میں رہ پڑے جو واپس آئے۔ مشکل سے بسر کرپائے ان میں تنظیم کا فقدان تھا اور پنچایت کا دستور کالعدم۔ ایک راجستھانی مولوی احترام الدین شاغل عثمانی لکھتے ہیں[1]

"قصبہ سوائی مادھوپور میں ہنگروں کا ایک محلہ آباد ہے اور مختلف شہر و قصبات میں دور دور پھیلے ہوئے ہیں"

"دینداری ان کا شعار ہے اپنے کو لشکریان شاہی کی اولاد کہتے ہیں، فی زمانہ اپنے

---

[1] نجات دستاویزات صفحہ ۲

نام کے ساتھ اکثر صاحبان "خان" بھی استعمال کرتے ہیں اور اپنے کو پٹھان بتاتے ہیں"

لیکن جے پور میں محلہ گھاٹ دروازہ میں مومن برادری نے جو بکثرت آباد ہیں اپنی عرفیت تبدیل نہیں کی بلکہ پیشہ بدل دیا یہ پارچہ بافی کے بجائے جواہر فروشی کرتے ہیں یہ لوگ بھی اپنے نام کے ساتھ "خان" کا لقب استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی نسل پٹھان نہیں بلکہ "مومن انصار" بتاتے ہیں اور ہر جگہ اسی برادری میں ان کی قرابت داریاں قائم ہیں" [1]

پنجاب کے انصاریان

یہاں کے انصاریوں کا سلسلۂ نسب براہ راست حضرت ابوایوب انصاری رضؓ سے ملتا ہے، لعقوب انصاری کی اولاد میں یحییٰ ابن زکریا اور منصور انصاری بجد ممتاز تھے جو محمود غزنوی کی چھٹی مہم (۳۹۹ھ) میں شامل ہو کر ملتان آئے اور یہیں ان کی اولاد، اعزا اور اقارب بس گئے اور وقت کی لہروں نے انہیں سارے پنجاب میں پھیلا دیا، مغل بادشاہ اکبر کے عہد حکومت تک ملتان کی شاخ سے گھرانوں کی جو کونپلیں پھوٹیں انہوں نے راولپنڈی، سیالکوٹ، لدھیانہ، گوجرانوالہ، منٹگمری، جھنگ، وزیرآباد، قصور، جہلم، فیروزپور، جالندھر، پٹیالہ، لاہور، امرتسر، ہوشیارپور، گورداسپور، کیمبلپور، میں پھیلادیں ان تمام شہروں میں ملتان ہی کے انصاریان جا جا کر مستقل رہنے [illegible] کے نسب سے [illegible] منصور انصاری کے اولاد [illegible]

پنجاب بھر میں ان کی تعداد تقریب ایک کروڑ رہی ہے ان میں جن کا آبائی پیشہ پارچہ بافی تھا کچھ اور طرف بھی مائل تھے۔

ملتان میں قالین، لنگیاں، رومال، موزے، کمبل، ریشمی لنگیاں، گھمبن، پردے اور کپڑے بڑی بڑی منڈیوں میں بیچے جاتے تھے، شہر ملتان، امرتسر اور لاہور کے بجز ان اکثر بڑے بڑے [illegible] تجارتی اشیاء کی دکانیں لگاتے تھے، برادری میں بہت سے ثروت مند تھے، انگریزی کی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر کچھ "بابو" بن گئے، کھیتی باڑی کا بھی شوق تھا اور فن کشتی میں مشاق تھے، مذہبی تعلیم عام تھی اور حفاظ کی تعداد بھی کم نہ تھی، دینی جذبہ

---

[1] نجابت و شرافت صفحہ ۲۲

[2] تاریخ مومن انصار۔ صفحہ ۹ ــ ۱۹

سے سرشار تھے صاحب ہمت، خلیق اور دلدار تھے، طرز معاشرت کا معیار بھی بلند تھا اور دولتمند
بھی تھے، نہایت صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی قوم کا درد بھی رکھتے تھے۔

تقسیم ہند سے پہلے: راولپنڈی کے انصار یعقوب انصاری کی ملتانی شاخ کی یادگار
تھے، محلے ان کے بھرے پڑے تھے آپس میں باہمی اخوت اور قرابتداری ایسی تھی جیسے ریشم
کا لچھا، اور اسی ہنر میں یکتا تھے، مسجدیں آباد تھیں اور کوئی مسجد بھی مرثیہ خواں نہ تھی، حفظ
قرآن کا شوق اتنا کہ قرآن کو سینوں سے لگا رکھا تھا عالم دین بھی تھے اور دین کی سرفروشی کی
تمنا بھی تھی، حوصلے بلند تھے، اخلاق بھی بلند، مخلص بھی تھے اور خلیق بھی، خوشحال لوگ تھے
اور بیرون شہر بصیغہ کاروبار "سفر نصیب" تھے، پہلوانی کے فن نے انہیں زندگی کے ہر میدان میں
مشکلات کو پچھاڑنا سکھا دیا تھا، طرز معاشرت پاکیزہ تھا، پارچہ بافی سے زیادہ تجارت کی طرف
مائل تھے، جناب مسٹر غلام احمد صاحب مالک "شنایت ٹیلرنگ ہاؤس" انصار برادری میں ممتاز تھے
اور ہمدرد قوم تسلیم کیے جاتے تھے۔

سیالکوٹ: میں بھی وہی ملتانی یعقوبی، انصاریوں کا نسبی سلسلہ چلا، سو پشت سے پیشہ
آبائی وہی بافندگی تھا لیکن بزازی بھی کرتے تھے خصوصاً ازاربندوں اور دریوں کے کاروبار
میں اپنے آپ کو منسلک رکھا تھا، پابند صوم و صلوٰۃ تھے، ان میں حافظ اور عالم بھی تھے اور طبیب بھی
قوم کے باعث فخر بھی تھے مساجد آباد تھیں اور علم حدیث کی تحصیل کے لئے الرحلة في طلب الحديث
کے قائل تھے اور دیوبند، سہارنپور اور دہلی کے محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے لیکن
جب سے مولوی محمد ابراہیم نے دارالحدیث کی بنیاد ڈالی سیالکوٹ خود دینی علوم کا مرکز بن گیا۔
شہر کے ممتاز اور سربرآوردہ شخصیتوں میں منشی رحیم بخش مدرس، منشی خورشید مدرس،
مولوی صدر الدین "ہاکی ساز"، منشی علی محمد مدرس، مسٹر رحمت اللہ اور شہاب الدین لکڑ والا
ورکشاپ کے نام مشہور تھے۔

لودھیانہ: کے شیخ انصار بھی ملتان سے آکر یہیں آباد ہوئے تھے، یہاں کا موزہ
کمبل، رومال، غالیچہ، قالین اور لنگیاں مشہور تھیں اور یہی آبائی پیشہ تھا اور اپنی مصنوعات
کے خود ہی تاجر بھی تھے اور شہر بہ شہر گھوم کر اور دور دور جا کر اسی کی تجارت کرتے تھے، کوئی بڑا میلہ یا
تماشہ ایسا نہ تھا کہ ان کی دوکان نہ چمکی ہو، اس لیے خوشحال اور مرفہ الحال تھے، مذہبی
تعلیم کا خاص خیال رکھا جاتا تھا چنانچہ حافظ القرآن کثرت سے تھے، طبیب اور حکیم ہر

قصبہ میں موجود تھے علوم مغربی کی طرف بھی راغب تھے اور گریجویٹ اور وکیل وغیرہ بھی انصار برادری کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے شاہد تھے، مسلمانوں کا درد دلوں میں موجزن تھا، خود بھی دینداری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ عام انصاریوں کی طرح طبعی طور پر حلیم، خوش اخلاق اور دیندار تھے، یہی مومن۔ انصار برادری کا قومی کردار تھا، کشتی کا فن، شاید برادری کی روایت بن گئی تھی۔

گوجرانوالہ کے اطراف اور مضافات میں انصاریوں کی خاصی تعداد آباد تھی، آبائی پیشہ بافندگی کے تانے بانے ٹوٹے نہ تھے مگر تجارت کو فروغ زیادہ حاصل تھا۔ گوجرانوالہ کے انصاریوں کی معاشرت، اخلاق، اشغال اور دینی و مذہبی کردار ان کے عام بھائیوں کی طرح تھے جن کا ذکر گذر چکا ہے، مولوی احمد الدین سوداگر سیکریٹری ٹانگہ کمیٹی، میاں نور محمد سوداگر، فضل دین کلاتھ مرچنٹ، نورالدین دکاندار چلے، ممتاز شخصیتیں تھیں۔

منٹگمری کے انصار حضرات پنجاب کے ان شہروں کی برادریوں ہی جیسے تھے کردار بھی وہی، شغل بھی وہی اور اوصاف بھی وہی، یہی حال جھنگ کے انصاریوں کا تھا۔

وزیر آباد کے انصار حضرات میں حافظ عبدالمنان کا علمی رتبہ نہایت بلند تھا، بڑے پایہ کے محدث تھے، ان کے وقت میں دینی مدرسہ میں تعلیم قرآن و حدیث کا نہایت معقول انتظام تھا، اسی سبب پنجاب کو مولینا سے بڑا فیض پہنچا، چنانچہ یہاں کے اصحاب انصار میں نہ حفاظ کی کمی تھی اور نہ علماء دین کی۔ یہاں کے لوگ مہمان نواز تھے، خلیق اور دیندار لوگوں کی اس طبقہ میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔

قصور میں بھی انصاریوں کی کثیر تعداد آباد تھی، بنکر بھی تھے اور تاجر پیشہ بھی، شہر قصور کی میتھی مشہور ہے، اکثر زراعت پیشہ میتھی کا کاروبار دوسرے شہروں میں بھی کر رہے تھے؛ ان سب کے دینی و مذہبی اوصاف اور کردار ان کے دوسرے شہروں کے بھائیوں ہی کی طرح تھے۔

جہلم میں بھی انہیں شہروں کا جلوہ نظر آتا تھا۔

فیروزپور، لاہور اور اس کے مضافات سرگودھا میں انصاریوں کی تعداد کافی تھی، حفاظ قرآن اور علماء دین کی کمی نہ تھی، بافندگی پیشہ کرنے والے بھی تھے اور کاشتکار تاجر بھی تھے جو کپڑے کی تجارت کرتے تھے، مسجدیں آباد تھیں، خوش خلقی عام تھی، باہمی اخوت کا رشتہ بہت مضبوط تھا دینی اوصاف کے حامل تھے جیسے انصاریوں کی پوری قوم تھی۔

جالندھر میں پانڈگی کی صنعت عروج پر تھی انصاری دستکاروں کے بٹے ہوئے اور کاتے ہوئے سوتی تلنگے سارے ہند میں مشہور تھے۔ یہی ان کا آبائی پیشہ تھا۔ تاگے کی تجارت کی ڈور میں تقریباً ہر شہر بندھا ہوا تھا جہاں جہاں پارچہ بافی ہوتی تھی۔ دولت تھی کہ کچے دھاگے میں بندھی آ رہی تھی اس کی جلو میں خوشحالی بھی ہمرکاب تھی۔ اکثر دولت مند تھے اور رئیس التجار کہلاتے تھے۔ باقی اوصاف میں شیخ انصاریوں سے مماثلت رکھتے تھے اور ہر جگہ کے اپنے دوسروں کی طرح نیک، بااخلاق اور دیندار تھے۔"

پٹیالہ۔ سکھوں کے راج میں انصاریوں کا بڑی کام کاج تھا جن کے اجداد کا تاجر ملتان سے یہاں تجارت کے سلسلہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ پٹیالہ ریاست کے مضافات نارنول میں بھی پانڈگی کرنے والے انصاری بکثرت آباد تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ان پر کیا بیتی خدا جانے!

لاہور۔ پنجاب کا دارالخلافہ، غزنوی سلطنت کا دوسرا مرکزی شہر۔ ہندوستان کے پہلے ہندی اور فارسی شاعر مسعود سعد سلمان نے اسی کے زندان میں حبسیات لکھی تھیں انصاری بھی اسی عہد سے آباد تھے اور کچھ خاندان ملتان سے یہاں میں آ بسے تھے اور اکبر بادشاہ کے عہد میں شیخ نور بافوں کی بہت بڑی جمعیت بس گئی تھی اور مضافاتی قصبات میں پھیل گئی تھی۔ بڑا شہر تھا اور بڑے بڑے کاروبار تھے۔ انصاری برادری میں رئیس، تجار بھی تھے اور پڑھے لکھے بھی۔ سرکاری محکموں میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ زمیندار بھی تھے لیکن پانڈگی کے تار ٹوٹ چکے تھے۔ بزازی کرتے تھے۔ لدھیانہ، امرتسر کی مصنوعات شال، دوشالہ، کھیس خانی، الوان، دلوئی، ریشمی گلبدن، دریاں، کمبل، لنگیاں وغیرہ لے کر بڑے بڑے میلوں میں سارے ہندوستان میں تجارت کرتے پھرتے تھے۔ تجارت سے فرصت بہت کم ملتی تھی اور شوق کشتی نے بڑے بڑے پہلوانوں کو پروان چڑھایا تھا۔ زندہ دل اور عالی حوصلہ سمجھے جاتے در حقیقت موتی تھے۔ سر آوردہ شخصیتوں میں حاجی مستری ضیاء اللہ صاحب رتنجیت، ابو الحسن صاحب بام مرشد، ماسٹر تاج دین، بابو محمد حسین ہیڈ کلرک کے نام تھے جو نیک نام تھے۔ اردو ادب میں بھی انصاری حضرات کا دخل تھا اور بہت سارے صاحب تصنیف بھی تھے لیکن زمانے کے گم شدہ اوراق میں انہیں ڈھونڈے کہاں کہاں؟

امرتسر کے قالین، الوان، شال، دوشالہ، کمبل خاص مصنوعات تھیں جو شیخ انصاری صناعیوں کے نادر نمونے تھے اور جن کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۳۰ء میں مضافات اور

قصبات میں بھی بُنکر آباد تھے اور پارچہ بافی ہی خاص صنعت تھی انصار عورتیں بھی کمبل وغیرہ بُن لیتی تھیں اہلِ علم میں حافظ القرآن، عالم اور محدث نمایاں تھے، تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہ تھی مولوی شیخ محمد خورشید ایڈیٹر "الانصار" نے برادری کے لیے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کیا، منشی صاحب نے "مومن انصار" کی تاریخ پر یک معرکۃ الآرا تصنیف "تذکرۃ الانصار" ۲ جلدوں میں یادگار چھوڑی ہیں مولوی موصوف کی جدوجہد سے پنجاب کے انصاریوں کے علاوہ یوپی کے انصاریوں میں خود شناسی کی بصیرت پیدا ہوئی، امرتسر کے پہلوان شہرت کے میدان میں بازی لے گئے تھے۔

لائلپور اور گورداسپور میں شیخ نور خاں نے اُجالا پھیلا رکھا تھا، گورداسپور اور اس کے توابع بٹالہ اور قصبہ قادیان میں بیس ہزار کے قریب یہ لوگ جلوہ نمائی کر رہے تھے اور قادیان کے مزعومہ باطل دعویدار نبوت کا مقابلہ کرنے والے بھی نورانی لوگ تھے چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا واقعہ مشہور ہے، انہوں نے ہمیشہ مرزائیت کے مقابلہ میں تقویتِ ایمانی کا ثبوت دیا۔ ع

"خدا کی رحمتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر"

بہرائچ (یوپی) کے غازی میاں اور انصاری نورباف

مومن۔انصار برادری کی تہذیبی روایات میں تصوف کا بڑا حصہ اور اثر ہے، صوفیائے کرام سے براہِ راست نسبی نسبت نہ سہی کچھ نہیں ہے تو محبت ہی سہی ایک تعلق خاطر ضرور ہے۔ ہندی الاصل انصاری یا نورباف طبقہ کے بارے میں یہ مصدقہ اور مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ ان کا ایک معتدبہ حصہ سید سالار مسعود غازی اور ان کے بعد ہندوستان آنے والے صوفیائے کرام کے ہاتھوں پر اسلام لایا تھا، اور وقت کی رفتار اور تاریخ کے دھاروں کے ساتھ عربی نژاد انصار کا جزو لاینفک بن گیا،

ان مبلغینِ دین میں یہ کرامت سید سالار مسعود غازی شہید (۱۰۳۳ء) کا نام زیادہ سُرخی سے جڑا ہوا ہے، ان کے بہت سارے پیار کے نام ہیں، سالار، بالا پیر، غازی میاں، بالے میاں، وغیرہ انہیں سلطان الشہداء کا لقب بھی حاصل ہے اور چونکہ وہ ہندوستان کے سب سے پہلے شہید ہیں سے تھے اور خاص امتیاز کے حامل تھے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جب ہندوستان میں کوئی شہید ہوتا ہے تو وہ ان کے تابعین میں گنا جاتا ہے، آپ بعض تاریخی شواہد کی روشنی میں سلطان محمود غزنوی (م ۱۰۳۰ء) کے خواہر زادے تھے کئی مہمات کے بعد جن میں آپ کا اور آپ

کے والد کو بڑی کامیابی نصیب ہوئیں۔ آپ ہندو سرداروں سے لڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہید ہوئے۔[1] ان مہمات میں آپ کے ساتھ شمالی ہند اور افغانستان و سندھ کے وہ انصاریان بھی شامل تھے جن کا نسب قرونِ اول کے انصار مدینہ سے ملتا ہے۔ کچھ پیشہ کی مناسبت سے کچھ سلسلۂ سوانحات کے سبب مقامی بُنکر مسلمان ہونے لگے ان میں بڑی تعداد یو پی کے جلاہوں کی تھی۔ یہ نورباف اسی لئے غازی میاں کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ "بالے بادشاہ" یا "غازی میاں دولہے" کی برات یا میدنی لے کر مع جہیز بہرائچ جاتے۔ ہر دور میں غازی میاں کی برات ان کے مزار پر چڑھتی، جہاں آپ کا عُرس بڑی دھوم دھام سے ہوتا ہے اور اس کے علاوہ لاہور، میرٹھ، الٰہ آباد، دہلی اور دیگر شہروں میں بھی آپ کے نام پر عَلَم نکالے جاتے ہیں۔ آپ کے مزار سے بڑی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ یہاں منتیں مانی جاتی ہیں اور چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ ان کی قبر کو عقیدت مندوں نے مزار بنا دیا۔ پھر کرامتوں کی روایات نے مرقد اور مرقد سے مشہد بنا کر درگاہ شریف کا مرتبہ دے دیا۔ آج بھی مئی۔ جون میں میلے کے موقع پر قوالی کی آواز سارے یو۔پی میں الٰہ آباد سے میرٹھ، بارہ بنکی، اعظم گڑھ اور مئو تک گونجتی سنائی دیتی ہے

چلے غازی کی نگریا
اپنی زندگی بنانے، سوئی قسمت جگانے
سارے گناہ بخشوانے، جی کی بپتا سنانے
چلے غازی کی نگریا۔[2]

"اس طرح بت شکن سالار مسعود غازی، بالے میاں کے روپ میں کرشن دیش کے باسیوں کے لئے ایک اور دیوتا بن چکے تھے۔ ان کے مزار پر گھی کے چراغ جلائے جاتے، ان کے جھنڈے اٹھائے جاتے۔ ہر سال دھوم دھام سے ان کی برات نکلتی۔"
"عورتوں کی ٹولیاں بیاہ کی تھالیاں سجائے مزار پر چڑھاوا چڑھانے کے لئے جاتی تھیں۔ یہ ہندو عورتیں ہوتیں۔"[3]

---

[1] شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر: اسلامی ہند و پاکستان کی مذہبی اور علمی تاریخ عہدِ مغلیہ سے پہلے۔ دہلی ۱۹۹۰ء، ص ۵۶، ۶۳، ۶۵
[2] مشہور شاعر میر تقی میر (م ۱۸۱۰ء) نے بھی برات یا میدنی کی تشبیہ اس شعر میں دی ہے:
یوں چلی آنکھوں سے اشکِ خوں فشاں کی میدنی — جیسے بہرائچ چلے غازی میاں کی میدنی
[3] قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، اردو کتاب گھر دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۲

غازی میاں کی عظیم شخصیت روایات اور فرضی داستانوں کے تانے بانوں میں ایسی اُلجھی
ہے کہ تاریخ کا سررشتہ ملتا ہے[1] تو اس کا پہلا سرا نہیں ملتا، عام روایتیں انہیں سلطان محمود
غزنوی کا خواہرزادہ (بھانجا) بتلاتی ہیں اور تاریخ کے کچھ اندرونی شواہد انہیں محمود غزنوی کے عہد
وسطی ایشیا کا ایک نیک نفس اور متقی جوان دیندار کی حیثیت سے روشناس کراتے ہیں[2]، خلقِ
خدا کی خدمت کا جذبہ تھا، حقانیت کا غلبہ اور وحدانیت کا دبدبہ جس نے انہیں مجاہد اور غازی
بنا دیا، عقیدتمندوں کا انبوہِ کثیر اور ہجومِ غفیر غازی میاں کے عَلَم تلے جمع ہو گیا، دریائے اٹک
کے کنارے پڑاؤ ڈالا، حضرات انصار جو سبکتگین اور اس کے بیٹے محمود غزنوی کی مہمات
میں برابر شریک رہے، غازی میاں کے بڑے معتبر اور وفادار لشکری رہے، دلی فتح ہوئی،
تسخیرِ قلوب اس سے زیادہ اہم ثابت ہوئی مظلوم و محروم اہلِ حرفہ کو مسیحا مل گیا اور
اسلام کی دعوتِ عزیمت دردمندی مساوات و اخوت میں برابری کا درجہ مل گیا۔ سید صاحب
بہرائچ چلے گئے، اور جنگل میں ایک مہوہ کے درخت کے نیچے بیٹھ کر علم و عرفان کا چراغ جلایا اور
توحید کی شمع روشن کی جن کے اجالوں میں دور دور تک غازی میاں کی روحانی سلطنت
قائم ہو گئی۔

دلی جو ایک شہر قدیم میں تخت ہے مسلمان فاتحین کا شمالی ہند میں پہلا انتخاب تھا روایت
جس کی فتح اور راجہ جے پال کی شکست سالار مسعود غازی سے منسوب کرتی ہے، ہمارا مقصد
اس وقت صرف ان حضرات انصار کی شناخت ہے جنہوں نے غازی میاں کے ساتھ دادِ شجاعت
دی اور نعمتِ شہادت پائی۔

یوسف انصاری بن سید سعد انصاری ابن ابو ایوب انصاری کی اولاد میں سے عبد الرحمن
انصاری رضی اللہ عنہ کا پوتا ... بن جلال الدین بن ابو الحسن انصاری نہایت جری اور بہادر سپاہی
تھے۔ یہ سالار غازی اپنے اقرباء اور اہلِ وطن کے ساتھ دریائے اٹک کے کنارے ایک موضع میں
سکونت پذیر تھے۔ جب سالار مسعود غازی دعوت و عزیمت کا علم ہند کے عقیدتمندوں در پیش دل

۱۔ شیخ عبد الرحمن چشتی۔ مرأتِ مسعودی، اردو ترجمہ ... حسین ...

۲۔ Christian, W. Toll, ed Muslim Shrines in India, Delhi, 1989, PP. 44-47 (art. Iqtidar Husain Siddiqi)

کالشکر جرار سے کران نک کے پڑاؤ پر آئے تو عبدالرحمٰن انصاری جو ایک بے مثل پہلوان تھے غازی میاں کے ساتھ ہو گئے، راستے میں قلعہ اودیا نگر (جس کا نام بعد میں بعہد شہاب الدین غوری "چونسی" رکھا گیا)[1] شرک و کفر کا گڑھ بنارات ردو کے کنارا تھا، سالار مسعود غازی میاں نے عبدالرحمٰن انصاری کو ایک فوجی سردار میر عماد الدین خلجی کی سرکردگی میں محاصرہ کے لئے مقرر کیا، دونوں شہید ہوئے مگر فتح و نصرت مسلمانوں کو نصیب ہوئی، یہ پہلوان شہید جہاں گرے وہیں دفن ہوئے۔ مشہد سے پرے ان کی اولاد اور باقیات صالحات نے محلہ انصاری کی بنیاد ڈالی جو ان کا یادگار محلہ بن گیا، بفضلہ تعالیٰ حضرت عبدالرحمٰن انصاری کی اولاد میں ایسی برکت ہوئی کہ رفتہ رفتہ بارہ محلوں میں پھیل گئی۔

غیاث الدین بلبن جو ۱۲۶۶ء میں تخت نشین ہو تو اس کے عہد میں ستے انصاری خاندان موجود تھے کہ دار السلطنت دہلی کے مشہور پندرہ محلوں میں سے ایک محلہ خاص انصاریوں کا تھا دہلی سے قریب شاہدرہ میں جو باب اندانہ تھا ان کی پُر رونق آبادی تھی پھر یہ تدریج و اور اپنے پیشہ پارچہ بافی سے منسلک رہنے کے لئے اطراف و مضافات کے شہروں میں ہجرت کر گئے اور آباد ہوتے گئے، میرٹھ، رڑکی، سہارنپور اور ضلع کرنال کے قصبہ پانی پت میں یہ معاشی زندگی میں جد و جہد کرنے کے لئے اتر پڑے۔ بلبن ہی کے عہد میں اس کے شہزادہ محمد کی علم دوستی اور سرپرستی کا شہرہ سن کر شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ ترین خواجہ محمد علی ہرات سے آئے اور پانی پت میں بس گئے سلطان بلبن عالموں کا قدردان تھا، منصب صدارت اور احتساب کے عہدے پر فائز کیا اور بطور مدد معاش کچھ پرگنے ملحقات پانی پت سے، اراضیات سواد قصبہ سے در تولیت مزارات ائمہ کی جو پانی پت میں تھیں عطا کیں، پانی پت میں انصاریوں کا محلہ خواجہ محمد علی کی اولاد سے تقسیم ہند سے پہلے آباد تھا، یہیں اردو کے مشہور شاعر خواجہ الطاف حسین حالی (ولادت ۱۲۵۳ھ) ایک انصاری خاندان میں پیدا ہوئے،

یوسف انصاری کی نسل سے ابوالحسن انصاری تھے جو کئی انصاری خاندانوں کے جد امجد ہیں انہیں کے پوتے عبدالرحمٰن شہید پہلوان تھے اور پر پوتے مومن۔ عارف مومن عارف سے انصاریوں

---

[1] شیخ عبدالرحمٰن چشتی۔ مرآت مسعودی، اردو ترجمہ عنایت حسین بنگری

کے لاتعداد خاندان آباد ہوئے قصبہ منیر جو بہار کا مشہور تاریخی مقام ہے انہیں کی اولاد سے
بھرا پڑا تھا اور یہیں سے مومن عارف کی اولاد بہار، اڑیسہ، بنگال اور ڈھاکہ تک پھیل گئی،
مومن عارف کے ایک صاحبزادے پہلوان شہید بھی تھے[1] یہ بھی غازی میاں کہلانے لگے اور
غازی میاں کی شادی کا میلہ، بہرائچ کی طرح قصبہ منیر میں بھی ہر سال منایا جانے لگا۔

مومن عارف مبلغ دین تھے منیر میں آباد ہو گئے اور یہیں ان کا مزار مرجع خلائق بن گیا،
اس قصبہ کی شہرت سب سے زیادہ مشہور صوفی مصنف شاہ شرف الدین یحییٰ منیری کے سبب
ہے جن کے مکتوبات میں علم و عرفان کا ایک خزانہ بند ہے، مومن عارف بھی مرد کامل اور صاحب
کرامت تھے ان کے فوجی اور تبلیغی دستے میں زیادہ تر ترک، سیّد اور میر تھے مومن عارف نے
۵۷۶ھ میں منیر کو فتح کیا تھا۔[2]

نوربافی کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے چلا، اور آج تک "مومن بنکر" جو یوپی اور بہار کے قریہ
اور قصبات میں پشت در پشت بستے چلے آئے ہیں اور یہی پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں
چنانچہ سلسلۂ نسب بھی ہے تہیں، ان دستکاران اہل شرف کا تقویٰ اور تصوف سے جو تعلق
خاطر رہا ہے وہ مفید المومنین کے تذکرے کے اس خلاصے سے ظاہر ہے:

"نوربافی آدم سے چلا، موجب حکم خدا شیث پیغمبر کو بُنّا سکھایا جو چار سو چوبیس برس
بافندگی میں مشغول رہے۔"

[یہ ہنر اہل علم نے بھی سیکھا اور اہل معرفت نے بھی چنانچہ مفید المومنین نے جو نام گنوائے ہیں ان سے
معلوم ہوتا ہے کہ کسی سلسلہ خواجگان کا نوربافی سے رشتہ تھا]۔

"نوربافی ورنگ" جو "نوربافی" کرتے تھے (نور کے زن زن) کی چشم بینا سے نور حق کا
مشاہدہ کرتے تھے، زادے، مرشد، ہر دم و خیال کردن سے دور رکھتے تھے بدر
معرفت سے [اور راہ سے] راز و نیاز الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔" خواجہ
[illegible] "چادر کرنا" سکھایا۔ خواجہ عبداللہ [انصاری، پیر ہرات] نے
"[illegible]" سیکھا [سکھایا] یہ بافندہ کاری کے موجد تھے۔ خواجہ یمانی [یمنی]
[illegible] رقم یمانی [یمنی] اور خواجہ بوستانی اسی فن نوربافی کے ماہر بنے۔ جو

---

[1] بابت [illegible] عبد الرحیم جاؔئی کا مضمون [2] تاریخ مومن انصار حصہ ۲ ص ۱۲۳

> بوستانی، خواجہ عبدالصمد، خواجہ سراج الدین، خواجہ حمید الدین، خواجہ شمس الدین، خواجہ تعلیم الحق اور ان سب کے بعد خواجہ مومن۔ عارف کر معرفت ہمہ جا کت ملی پھر ان سے ہافندگی کا تانابانا خواجہ محمود تک پہنچا، علیٰ ہٰذا القیاس اب تک یہ پیشہ مومن۔ انصاری برادری میں، انہیں بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام سے پہنچا اور یہ سارے انہیں مذکورہ بالا خوبیگان کی نسل سے ہیں جن کا سلسلہ مومن عارف کے واسطے سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک پہنچا ہے" [1]

مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے "کتاب المنوال والید" میں عبدالحلیم شررؔ اور دوسرے مورخوں کے حوالے سے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے پوتے حضرت یوسفؒ اور مومن عارفؒ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے یہ بزرگان سلف براہ راست عرب اور مشرق وسطیٰ سے تشریف لائے تھے۔[2]

گجرات میں انصاریوں کی تعداد احمد آباد اور بڑودہ میں کثیر تھی۔ بڑودہ کے بنکر اپنے آپ کو عرب نژاد بتلاتے تھے اور ان کی روایت کے مطابق ان کے آبا و اجداد محمد بن قاسم ثقفی کے لشکر کے ساتھ دیارِ ہند آئے اور سندھ سے گجرات میں ہجرت کر گئے۔ تذکرہ نویس بھی اس کی تصدیق اور توثیق کرتے ہیں لیکن جس کے نسب سے یہ انصاریت میں اس کا سلسلہ جوڑنے میں تاریخی غلطی ہو جاتی ہے، اور یہ اشتباہ[3] حضرت ابوایوب انصاری کے صاحبزادے عبداللہ انصاری کا زمانۂ حیات تعین کرنے میں ہو جاتا ہے اور انہیں کے نسب سے مشہور صوفی پیر اور عالم شیخ الاسلام عبداللہ انصاری پیر ہرات کی شناخت میں غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ "گجرات کے انصاریوں کے حالات" کے ضمن میں ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ رحمانی ندوی ثم الدہلوی اپنی "تاریخ مومن انصار" (حصہ دوم صفحہ ۹) میں لکھتے ہیں:

> "محمد بن عبداللہ انصاری، پیر ہرات (بن ایوب انصاریؓ) و محمد انصاریؓ جو رئیس المحدثین محمد بن اسمٰعیلؒ (امام بخاری) کے استاد تھے گجرات تشریف لائے ہندوستان میں دینی تعلیم آپ کی بدولت لوگوں نے بہت حاصل کیں۔ لکھا ہے۔ علاقۂ گجرات میں جو انصاری خاندان بسے ہوئے ہیں وہ لوگ آپ ہی کی اولاد محمد بن عبداللہ انصاری کی ہیں۔"[3]

---

[1] نجابت و شرافت ص ۲۷ از سعید امرہینی [2] کتاب المنوال والید حصہ دوم ص ۳۲ صفحہ ۹۳
[3] غالباً اس اشتباہ کا مصدر کتاب المنوال والید (جلد دوم) ہے۔

محمد بن عبداللہ انصاری جیسا کہ قرین قیاس ہے اپنے والد شیخ الاسلام پیر ہرات کے زمانے میں یعنی پانچویں صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی میں حیات تھے وہ بھلا کیسے امام بخاری کے استاد ہو سکتے ہیں جن کا زمانہ ۸۱۰-۸۷۰ء عیسوی کا تھا۔ ان دو باتوں میں سے اگر یہ صحیح ہے کہ وہ محمد بن عبداللہ انصاری واقعی امام بخاری کے استاد تھے تو وہ پیر ہرات سے پہلے کوئی اور محمد انصاری ہونگے جن کے والد کا نام بھی عبداللہ تھا اور جو خراسان ہی کے اسی خاندان یعنی محمد یعقوب انصاری کی اولاد میں سے تھے، یوں رشتہ تو اس طرح پیر ہرات سے ملتا ضرور ہے، بہرحال بڑودہ کے انصاریوں کے عربی نژاد اور انصاری ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ گجرات کے انصاری بُنکر کفو کے قائل تھے اور شریعت کے سخت پابند، میمن قوم کی طرح یہ بھی ہر سال حج ضرور کرتے اور خاندان کا ہر فرد حاجی تھا ان میں حفاظ کی تعداد بھی کثیر تھی ورنہ یہ کہ حاجی اور حافظ ان میں سب سے زیادہ ہیں یہ ان کے لئے باعث فخر تھا، یہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور کوئی جماعتی تنظیم نہ تھی۔ لیکن برادری کا ایک "پنچ" کئی افراد پر مشتمل ضرور تھا جو عموماً کاروبار سے متعلق اور شادی بیاہ کے امور کے فیصلوں کا ذمہ دار تھا[1] گجرات میں بُنکروں کا ایک اور طبقہ تھا جو "جلاہا" کہلاتا تھا لیکن یہ اپنے آپ کو "شیخ" کہلواتے تھے۔ ان میں شریعت کی پابندی کا فقدان تھا۔ شادی بیاہ میں باجے تاشے کا رواج تھا اور وہ تمام غیر مسلم رسومات ادا کیے جاتے تھے جو مقامی اثرات کا نتیجہ تھے[2] یہاں ہر شہر میں ان کے اپنے محلے آباد تھے عثمان پورہ، احمد آباد میں دس ہزار بُنکر بستے تھے[3]

گجرات میں سنی بوہرے جو جعفری کہلاتے تھے محمود بیگڑا کے زمانے (۱۴۵۶-۱۵۱۲) اور سلطان مظفر شاہ (۱۵۱۲-۱۵۲۶) میں بار چہ بافی کرتے تھے یہ اسی عہد میں شیعہ بوہروں سے الگ ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ گجرات کے جنوبی علاقے کمبایت، دھالو اور پارڈی میں تائی پارچہ باف آباد تھے یہ قزاز (ریشم باف) تھے ان کی روایت جو آباء و اجداد سے چلی آرہی ہے ان کا سلسلہ نسب قبیلۂ طی جو شمالی عرب میں ظہور اسلام سے قبل آباد تھا اور پھر سنۃ الوفود ۶۳۰-۶۳۱ء کے زمانہ میں مسلمان ہوا ملتی ہے، ایک دوسری روایت عرب اور ترکستان کے بیچ کسی غیر معروف

---

[1] مسرا، Misra- C.M. Muslim Communities in Gujrat, PP 80-81

[2] مسرا- ایضاً ص ۱۱۴ [3] مرآت احمدی

علاقہ "تانی" یا طائی کو ان کا مسکن بتاتی ہے، ان کی روایت یہ ہے کہ بافندگی اور خیاطی انہیں
براہِ راست حضرت ادریس علیہ السلام سے وراثت میں ملی ہے یعنی یہ انہیں کی نسل سے ہیں
ان کے خدوخال اور وضع وقطع سے عربیت تو نہیں جھلکتی لیکن "ادریسی" لقب ان کی نسبت کو
دلاسا فرو دیتی ہے، نومسلموں کو اپنی نئی شناخت کے لئے ہمیشہ عرفیت کی تلاش رہی ہے تاکہ
دین سے وابستگی کا اعلان ہو جائے اور امتِ مسلمہ سے رابطہ کا اظہار، لہٰذا ان میں محمدی،
مداری، ادریسی اور مومن عرفیت عام تھی، ان کی ایک جماعت نیار کہلاتی تھی یہ چوڑیاں بیچتے تھے[1]

انیسویں صدی کے اواخر تک بلسار، سنجان، دھانو اور دیگر علاقوں کے طائی اسلامی معاشرہ
اور طرزِ زندگی سے نابلد تھے، جہالت عام تھی تھوڑی بہت دینداری حنفیت نے قائم کر رکھی تھی
اسی عہد میں ایک کشمیری وہابی مولوی بغرضِ تبلیغ اس علاقے میں آئے ان کی جدوجہد سے پوری
جماعت میں روحِ اسلام تازہ ہو گئی اور انہوں نے تمام ہندوانہ رسوم و عقائد کو ترک کر دیا اور
بدعات کی قبر کھود ڈالی، سیدھے سادے سچے مسلمان بن گئے اور یہ جماعت اہلحدیث
کے مسلک پر چلنے لگی[2]

طائی قزاز کی طرح ایک اور بنکر جماعت واجہ یا واجہ مسلمانوں کی ہے جن کی اہمیت
تاریخ کے ملبے میں گم ہو گئی ہے، سلاطینِ گجرات کے زمانے میں یہ جزیرہ بمبئی، تھانہ، ماہم،
کلیان، بھیونڈی، بسین (بہ پڑی)، ماہم، بندرہ اور کوکن کے ساحلی علاقے میں چیول تک
آباد تھے[2] صنعتِ پارچہ بافی کے بڑے ماہر اور بڑی تعداد میں کرگھوں کے مالک تھے، تھانہ میں
رابوڑی محلہ میں ان کی کثرت تھی یہاں عرصۂ قدیم سے بیرمیہ، تاسی اور آبار یا گوندگا جو
(کلف شدہ) جسے انگریزی میں بکرم (Buckram) کہتے ہیں کپڑوں کی قسمیں تیار کی جاتی
تھیں، ایسٹ انڈیا کمپنی نے نائب گورنر گوڈیر (Goodier) (۱۶۶۱ـ۸ء)
کو مشورہ دیا کہ تھانہ اور چیول سے بنکروں کو زیادہ اجرت کی لالچ دے کر جزائر میں بسا دیا جائے"
اس زمانے میں چیول جہاں نظام شاہی عہدِ حکومت میں ریشم کی پارچہ بافی اور کلابتون کی

---

[1] Gagetteer of Bombay Presidency, Thana, XIII, Pt. 1, 1894, P. 242; XIV – P. 46

[2] گزیٹیر- ایف

دستکاری عروج پر تھی، تھانہ اور بھیونڈی اس صنعت کے خاص اور اہم مراکز تھے[1]
بمبئی گزیٹیر کی رو سے انیسویں صدی کے آخر میں واجہ بُنکروں کی آبادی باندرہ میں ۲۵۰
گھرانوں پر مشتمل تھی تھانہ اور اس کے توابع قصبات سوپارہ، بولنج، پاپڑی اور ماہم میں
دو سو کے قریب کنبے بود و باش رکھتے تھے، اسی گزیٹیر کے بیان سے ان کی عمرانی تاریخ کی
کچھ گرہیں کھلتی ہیں ان کا آبائی مسکن گجرات تھا، طرزِ معاشرت میں نوائط کی تقلید کے
سبب اور رنگت کی یکرنگی نے انہیں کوکنی مسلمانوں کے رنگ میں ڈھال دیا اسی لئے عام
طور پر انہیں کوکنی مسلمانوں سے کمتر درجہ کے "کوکنی" سمجھنے لگے، بہرحال حتمی طور پر کوئی
رائے وثوق سے قائم نہیں کی جا سکتی لیکن جیسا کہ ہمارے بزرگ علماء لکھ گئے
ہیں کہ انگریز قوم کو داد دینی پڑتی ہے اس کے اہلِ علم جس موضوع پر لکھتے ہیں نہایت
باریک بینی اور تحقیق سے کام لیتے ہیں"[2] گزیٹیر کے بیان پر اکتفا کرنا ہی پڑتا ہے۔

واجہ یا واجۂ جس کی وجہِ تسمیہ بھی ابھی تک پردۂ ظہور سے عیاں نہیں ہوئی ہے
زیادہ تر حنفی مسلک کے تھے، یہ تہمد کے لئے چارخانی کپڑا جسے مقامی لوگ 'مقری' کہتے
تھے، تو یہ اور رومال بناتے تھے، بھڑوچ میں بھی یہ چند قسمیں رائج تھیں، غدر کے بعد جب
پارچہ بافی کی صنعت کے شیرازے بکھر گئے اور معاشی نظام بحران سے دوچار ہوا تو یوپی کے
انصاری مومن جنہیں عام طور سے ہندستانی کہتے تھے بھیونڈی آئے تو یہاں کے واجہ
بُنکروں کی کارگاہوں میں مزدوری کرنے لگے اور بعد میں اپنے کرگھے قائم کر کے ان سے
سوت وغیرہ لیکر مزدوری پر بُنت کر دیتے تھے۔[3]

احمدآباد میں انصاری برادری کے خاندان بکھرے ہوئے ہیں۔ عُرفیت کے استعمال کا فقدان بھی
مانعِ شناخت ہے۔ انصاری اور مومن القاب کے حامل زیادہ نہیں۔ این ایم مومن احمدآباد کے مشہور
آرکی ٹیکٹ اور انجینیئر ہیں۔ سورت میں بھی بُنکروں کی بہت بڑی تعداد آباد ہے۔

---

[1] David. 'History of Bombay', 371-372
[2] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرۂ علمائے مبارکپور (مبارکپور ضلع
اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء) ص۵۹
[3]

آٹھواں باب

بہار، اڑیسہ اور آسام کے انصاری محبان وطن

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مذہب ایک کلمہ گو کی زندگی کی رگِ جاں ہے جس میں ایمان کا تازہ خون دوڑتا رہتا ہے، وطن کو غلامی سے آزاد کرانے کی جد و جہد اور جنگیں جہاد بن جاتی ہیں نصب العین یہی رہتا ہے کہ آزاد مسلمان بن کر اسلامی زندگی بسر کر سکیں اور انسانیت کی خدمت و بہبود میں دوسروں کو بھی شریک کر سکیں اور خود شرک نہ کریں بلکہ توحید کا علم ہمیشہ سربلند رکھیں۔ ایسے بہت سارے مجاہدینِ آزادی اور وطن دوستوں نے اپنے خون سے لالہ زارِ آزادی کو سینچا ہے۔

منیر (پٹنہ کے مرکزی شہر کے تابع) ایک تاریخی مقام ہے جو دانا پور کی چھاؤنی میں ہے، بہار کی انصاری برادری کے جد امجد حضرت مومن عارف ابن عبد رحمٰن انصاری ابن جلال الدین انصاری ابن ابوالحسن انصاری بعہد شہاب الدین غوری مجاہد بن کر آئے اور قصبہ منیر میں مستقل طور سکونت اختیار کی، عبدالرحمٰن انصاری شہید کا میلہ بھی 'غازی میاں' کا میلہ کہلاتا ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی تہائی میں صوبۂ بہار میں ۲۷ لاکھ انصاری آباد تھے، جہانت اور سادہ لوحی میں 'بہاری' نشانہ تضحیک بنا رہا۔ پٹنہ (عظیم آباد) میں عالم گنج شاہ گنج، مرزا پور گھرہ دھوبیوہ جولاہوں کے محلے تھے۔

پٹنہ (عظیم آباد) کے انصاری بھی منیر کے مومن عارف کے نسب سے تھے، کچھ لکھنؤ اور دہلی سے ہجرت کر کے آباد ہوئے اور آبائی پیشۂ بافندگی کے مقابلہ میں خیاطی، زردوزی، زرکوبی کفش سازی (جوتا سازی) اور کلاہ سازی کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ شہر کے کئی محلوں میں ان کی دکانیں اور کارخانے تھے اور محلہ باقر گنج، بکسر، مردپور، منصور پور، کیوان شکوہ اور معروف گنج میں کثرت سے آباد تھے محمد شاہ گنج تو حضرات انصار ہی سے آباد تھا اور اسی محلہ میں اکثر حضرات کے پاس شجرۂ نسب بھی موجود تھا جو مومن عارف انصاری تک پہنچتا ہے، کئی ممتاز ہستیاں تھیں جیسے حافظ شمس الدین (وکیل) ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی جو سائنس کالج میں

پروفیسر تھے، حکیم غریب اللہ اور منیر الدین نائب ناظم 'انجمن انصاریہ'، محمد سعید ایم۔ اے پروفیسر بی۔ این۔ کالج، مولوی ابوالحسن، مولوی اصغر حسین مدرس، عبدالمجید ایم۔ اے پروفیسر پٹنہ کالج، خان بہادر عبدالکریم انسپکٹر مدارس وغیرہ۔ ان کی دکانیں اور بساط خانے ان کی خوشحالی اور دولت مندی کی ضامن تھیں، چونکہ تعلیم یافتہ افراد میں پروفیسر، ڈاکٹر، عالم، حافظ اور حکیم کی کمی نہ تھی اسی لیے جماعتی خودشناسی، تنظیم اور معاشی تحفظ نے انہیں فعال بنا دیا تھا، پنچایت بھی تھی اور برادری کی تنظیم کے لیے 'انجمن انصاریہ' کی بنیاد ڈالی گئی تھی، اس کا جلسہ ہر سال ہوتا تھا اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے آپس میں مشورے ہوتے تھے اور تجاویز مرتب کی جاتی تھیں۔ مومن کانفرنس کے مارچ ۱۹۲۵ء کا جلسہ جو کلکتہ میں ہوا تھا اس کی صدارت پٹنہ کے پروفیسر حافظ شمس الدین وکیل نے کی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کی جدوجہد کے طویل سفر کے بے منظم طریقہ پر تقدمے قدم اٹھایا تھا، مسلم قیادت کئی تحریکوں میں بٹ کر اور نصب العین سے ہٹ کر اپنا الگ کارواں بنا رہی تھی، مسلمانوں کا سواد اعظم اپنی بنیادی کمزوریوں اور راستے کی رکاوٹوں سے بے خبر جذباتی سیاست کا شکار ہو رہا تھا۔

"اس سیاسی و سماجی پس منظر میں [مسبب الاسباب] نے مولوی علی حسین عاصم بہاری کو غریب اور پسماندہ مسلمانوں کا مسیحا بنا کر اٹھایا ..... محلہ خانقاہ گنج بہار شریف ضلع نالندہ (پٹنہ) میں ۱۸۹۰ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں ایک دیندار مگر غریب اور پسماندہ گھر خاندان میں پیدا ہوئے اور اپنی پسماندہ برادری کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جدوجہد کی جس نے مومن برادری کو مومن کانفرنس میں تبدیل کر دیا۔ قرآن و سنت کی روشنی میں دین کے حقیقی تصور کا فروغ اور قوت اسلامی کے لیے جدوجہد تعلیم اور صنعت و حرفت کی ترقی اور رسم شرقی اصلاح نصب العین تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی جمعیۃ المومنین (۲۶ دسمبر ۱۹۲۱ء) بہار شریف کی تنظیم تھی اور ایک ماہ کے بعد جمعیۃ انجمن انصاریہ پٹنہ کا قیام عمل میں آیا۔"[1]

دانا پور کیمپ (چھاؤنی) میں قدیم زمانے سے انصاریوں کی آبادی موجود تھی، باقندگی مکمل طور

---

[1] ڈاکٹر محمد سجاد ایم۔ اے۔ ڈی لٹ، پروفیسر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی، رانچی بہار، تحریک آل انڈیا مومن کانفرنس تاریخ کے آئینے میں ۱۹۸۴ ص ۵-۲۳

ترک کرکے برادری نے دوسرے معاشی وسائل پیدا کرلئے تھے خصوصاً چرم کی تجارت نے انہیں بید
دولت مند بنا دیا تھا، چرسہ (چمڑے) کا کاروبار کلکتہ میں بھی قائم کر لیا تھا۔ معاشی تبدیلی کا سبب وہ صنعتی
بحران تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پارچہ بافی کے تار و پود کو بکھیر دیا تھا، جب چرسہ کی
تجارت عروج پر تھی تو حضرات انصار نے برادری کی فلاح و بہبود کے لئے کئی تعلیمی ادارے قائم کئے
تھے، مدرسہ محمدیہ ایک دینی مدرسہ تھا اور اس میں اردو، فارسی، عربی، منطق، ادب، فلسفہ، ریاضی،
جغرافیہ، تواریخ وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، چمڑے کے مومن انصار تاجروں نے طلبار کے لئے رہائش
اور خوراک کے ساتھ ایک خوابگاہ کی بنیاد ڈالی تھی، اس مدرسے سے بہت سارے فارغ التحصیل
ہو کر علمار کی صفوں میں شامل ہو گئے، انجمن ہدایت الاسلام تبلیغ دین کا ایک ادارہ تھا یہاں
پند و موعظت کے جلسے منعقد ہوتے تھے اور واعظین۔ روح انگیز اور ایمان افروز وعظ کیا کرتے
تھے، اس کے سیکریٹری قصبے کے مشہور سوداگر چرسہ (چمڑے کے سوداگر) شیخ کریم بخش تھے،
ان کے لائق صاحبزادے ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ رمان تھے جو بڑی خوبیوں کے مالک تھے شاعر
بھی تھے اور مصنف بھی۔ قوم کے ہمدرد تھے اور "تاریخ مومن انصار" میں انہوں نے ہندوستان بھر کے
انصاریوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ ریاست گوالیار، بھوپال اور کشمیر میں ملازمت کے
سلسلے میں رہ چکے تھے، انہوں نے "وجہ تصنیف" میں اپنے قومی اور ملی جذبات کا ان لفظوں
میں اظہار کیا ہے:

"یا الذین کونوا انصار اللہ و رسولہ کما آبائکم
اے انصاریو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد میں ہمیشہ رہا کرو جیسے
تمہارے آباء و اجداد رہا کئے۔ تم اپنے اسلاف کے نقش قدم پر رہو اور دینی خدمت
اسلام دینی، اشاعت دین تمہارا نصب العین رہے۔"[1]

عجب خیر و برکت کا زمانہ تھا مگر ناسازگار حالات کی مار نے چمڑے کے تاجروں کے کاروبار کی کھال
ادھیڑ لی۔ یہاں برادری کے سارے معاملات پنچایت سرانجام دیتی تھی۔

کھگول کا قصبہ پھلواری شریف کے قریب ہے چرسہ اور سب ہی کی دکانداری اور تجارت انصاریوں
کے ہاتھوں میں تھی، کھگول، پھلواری شریف، سگوڑی، باہوری اور دیگر مواضعات جو دانا پور

---

[1] تاریخ مومن۔ انصار۔ دہلی (۱۹۳۰)۔ ص۳

دانشوروں میں پیش پیش تھے مرد آہن ثابت ہوئے اسی لئے حکومت نے ملکی اور سیاسی خدمات کے صلے میں تانبے کے پتر (تام پتر) سے انہیں نوازا تھا۔

دربھنگہ میں انصار بن پٹنہ، دانا پور اور چھپرہ سے آکر بس گئے تھے اور مضافات کے دیہاتوں اور قصبوں میں مثلاً سمستی پور، کٹھیار، ترکی، بھگاہی، رانگھو پور، محمد پور، کوآری، سوپول، دیگجات وغیرہ میں ماجلاکران کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی، چرسہ کے بھی سوداگر تھے سن کا کاروبار بھی کرتے تھے لیکن بافندگی کا پیشہ عام تھا، پنچایت کا نظام اچھا تھا، دینی مدرسے بھی ان کے مذہبی رجحان کی ترجمانی کرتے تھے حافظ اور عالم موجود تھے، عبدالجلیل بی۔اے وکیل اس علاقے کی معروف شخصیت تھی۔

علی گنج سیوان چھپرہ کے قریب کے قصبے میں نصر تاجروں کی شورے اور چمڑے کی تجارت زوروں پر تھی، شیخ گلزار حسین نے چمڑے کے بیوپار میں اتنی وسعت پیدا کی کہ کلکتہ کانپور، گورکھپور، نیپال و چوراچوری تک چرسہ کا بیوپار پھیل گیا تھا، شیخ صاحب ایک دیانتدار تاجر، وضعدار مسلمان اور متقی مومن تھے، اخلاق محمدیؐ کے مجسم نمونے تھے، انصار قوم کے ہمدرد اور جدوجہد کے شریک رفیق تھے، ان کا خاندان نہایت ممتاز تھا۔

آرہ (ضلع شاہ آباد) سہسرام اور ڈومراؤں میں مومن۔ انصاری چمڑے کے تاجر تھے، انگریز مؤرخین جلاہوں کو ہمیشہ متعصب جلاہے کہا کرتے تھے، اور انہیں شورہ پشت اور فسادی قرار دیتے تھے، ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد سے تو وہ "ان بدذات جلاہوں" سے اور بھی زیادہ خائف رہنے لگے تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات تو اس ملک کا مقدر بن چکے ہیں اور یہ بھی انگریزوں ہی کی دین ہے۔ شاہ آباد میں بقرعید کے موقع پر فرقہ وارانہ فساد باقاعدہ ایک سازش کا نتیجہ تھا جس میں دیہاتوں پر حملے کرکے اہل ہنود نے خون کی ہولی کھیلی اور سنت ابراہیمی پر عمل کرنے والے قربان ہو گئے، مومنہ عورتوں نے جس جرأت کا ثبوت دیا وہ "شاہ آباد مقدمہ[1]" میں خون کی سرخی بن گئی۔ اسی شاہ آباد ضلع (بعد میں روہتاس ضلع) کی مومن برادری کے فخر قوم عبدالقیوم انصاری تھے" مولانا فرخند علی مدرس کھرپا سہسرام ممتاز لوگوں میں سے تھے، سہسرام کے اہل شرف نشین میں حاجی حکیم مولوی حسن علی عالم فاضل صفات ظاہری و باطنی سے آراستہ تھے، ان کے صاحبزادے مولانا حاجی محمد

---

[1] The Shahabad Riot Case

قادر بخش بھی عالم گزرے ہیں، (۱۲۷۳ء)۔ مولانا محمد یحییٰ سہسرامی اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے بڑے فاضل اور مناظر تھے، سہارنپور کے بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں نائب صدر رہے تھے[1]

بہار میں بکسر، جگدیش پور، سارا، ڈمراؤں، تربت، سکلاون اور حاجی پور میں نورباف کثرت سے آباد تھے۔ ان میں پنچایت کا رواج تھا جماعت بندی کے لئے جلاہے مشہور ہیں۔

صوبۂ بہار کا مونگیر تعلیم، تجارت اور صنعت کے اعتبار سے پُر بہار شہر تھا، انصاریوں کی ایک بڑی تعداد مہاجرین کی تھی جو پٹنہ اور دیگر شہروں سے آکر بس گئے تھے اور انتقال مکانی کی برکت سے مال و متاع کی فراوانی حاصل ہو گئی، ان میں ان مجاہدین کی اولاد بھی تھی جو فتح شہر مونگیر کے موقع پر دہلی سے مہم میں شریک ہوئے تھے۔ سترہ ہزار کے قریب مونگیر میں اور دیگر قصبات و مواضعات میں آباد تھے پارچہ بافی ان ہی اطراف میں زیادہ تھی لیکن زیادہ تر لوگ لوہے اور فولاد کی مصنوعات اور تجارت میں زور دکھا رہے تھے، عہد سلاطین میں تلواریں، چھریاں اور چاقو کی فولادی صنعت کا پلہ بھاری تھا، انگریزوں کے عہد میں بندوق بنانے کا کام عام ہو گیا، زردوزی اور تارکشی بھی ان میں موجود تھے، چاندی کے ورقوں کا کام (زرکوبی) کرنے والوں کی تعداد کثیر تھی۔ تعلیم دین کا شوق تھا مدرسے تھے اور تعلیم یافتہ فرد کی کمی نہ تھی کچہریوں اور سرکاری دفاتر میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے، خطاب یافتہ ہستیاں بھی تھیں، چمڑے کی تجارت کا تعلق کلکتہ سے رکھتے تھے ورس کی بھی تجارت کرتے تھے، ضلع ترہت کے ذائقہ دار چاولوں کی تجارت پر بھی انصار حضرات کی روزی کا دار و مدار تھا لوگ دولت مند تھے اور امیرانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے، علمی شغف بھی تھا۔ وارثی مرزا زیب بھی تصنیف و تالیف کا شغل کرتے تھے، مطابع و پرنٹنگ پریس نے ان کی تخلیقی طباعی کو تیز کر دیا تھا، دیہاتوں میں بنکر انصار زمیندار اور مفلس تھے اور بلا شرکت دولت ان کی عسرت سے بے نیاز تھے، قومی تنظیم موجود تھی اور نہ ہمدرد قوم تھے۔ مقرر ہستیوں میں محمد ابراہیم نیپل مرحوم، حبیب اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر، ڈاکٹر علی حسین مولوی فخر الدین غنیمت تھے۔

نکٹ میں برادری کے صناع چاندی کے زیورات نہایت عمدہ اور نفیس بناتے تھے، پیتل کے ظروف کے بھی ماہر یہی لوگ تھے، ہر قسم کے پیشہ، دکانداری اور کاروبار میں مشغول تھے

---

[1] دستکاران شرف صہ ۵۳، ۹۰ اور ۱۱۲

بذریعہ تجارت چرم (چمڑے) زیورات اور ظروف۔ کلکتہ، پٹنہ اور بمبئی میں آمد و رفت رکھتے تھے، دیہاتوں میں کچھ حضرات زرباف آبائی پیشہ میں مشغول تھے، یہ لوگ شاید اسی لئے غریب تھے، عام شہروں کے انصاریوں کی طرح عالم، حافظ، ڈاکٹر، مدرس، وکیل، طبیب اڑیسہ کے دوسرے شہروں میں بھی موجود تھے۔

جگناتھ پوری میں انصاریوں کی تعداد اور شہروں کی بہ نسبت کم تھی لیکن دینی تعلیم نہ ہونے کے سبب نہ دینداری کا چرچا تھا اور نہ صوم و صلوٰۃ کی پابندی تھی مکتبوں میں قرآن لڑکوں کو تبرکاً پڑھوا دیتے تھے۔ اسلام کا غلبہ شاید اس لئے کم تھا کہ سمندر کے کنارے واقع جگناتھ پوری ہندوؤں کا متبرک مقام اور بڑا تیرتھ تھا، لاکھوں یاتریوں کے اختلاط سے جن سے یہ ہر قسم کے کاروباری اور دکانداری کا واسطہ رکھتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ ان اشیاء کی بھی تجارت کرتے ہونگے جن کی اسلام میں ممانعت ہے یعنی وہ تبرکات، اشیاء، خوشبوئیں، رنگ وغیرہ جو رسومات ہنود میں کام آتی ہیں اور مشرکانہ عقاید کی علامتیں ہیں۔

["مسلمانوں کو غیر مسلموں کی تقریبات میں شرکت سے جو روکا گیا ہے وہ بلا وجہ نہیں ہے، ضرورت نہیں، اس میں کئی مصالح اور مضرت ہیں، ایک مسلمان کو ایسی تقریبات اور تیوہاروں میں جانے سے سب سے پہلی چیز جو روکتی ہے وہ ان تیوہاروں کا مذہبی، مشرکانہ اور مخالف اسلام ہونا ہے یعنی ان میں شرکت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ توحید کے علمبردار کفر و شرک کے تماشوں اور نمائشوں میں دلچسپی لیں...... علامہ ابن تیمیہ کی رائے ہے کہ غیر اسلامی تقریبات میں شرکت کسی طرح جائز نہیں"] [1]

دینی تعلیمات کے فقدان نے جگناتھ پوری کے مسلمانوں کو امت مسلمہ سے بہت دور کر دیا تھا، طرز معاشرت بدتر، باہمی تعلقات ابتر، آپسی تنازعات بیشتر، یہ تھا آج سے ساٹھ سال پیشتر کا جگناتھ پوری شہر۔

شیخ پورہ کی انصار برادری میں ڈاکٹر محمد جعفر سول سرجن کا ذکر کافی ہے، باقی حالات بدستور وہی تھے جو دیگر شہروں میں انصار برادری کے تھے۔

---

[1] شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔ اسلام اور غیر اسلامی تہذیب: رواداری، مدارات اور تقارب باہم کے اصول و حدود کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں۔ تلخیص و ترجمہ مولوی شمس تبریز خان۔ لکھنؤ ۱۳۹۸/۱۹۷۸۔ صفحات ۶۳، ۸۱

نگمیتہ (ضلع گیا) کی انصار برادری کی اسلامی تعلیم کی آخری حد قرآن شریف کی تجوید تک تھی باقی دین کا ماتم رہ گیا تھا جو تعزیہ داری کے شوق نے پورا کر دیا تھا بدعات اور رسوم قبیحہ نے، پارچہ بافوں کا لباس تقویٰ تک اتار لیا تھا، حالانکہ ان میں محمد اسلام سردار (بی۔ اے آنریری مجسٹریٹ اور رئیس) صدر آل انڈیا مومن کانفرنس جیسی شخصیت موجود تھی، لطیف الرحمٰن بھی مومن کانفرنس کے ایک عظیم الشان جلسہ کی صدارت کر چکے تھے لیکن:

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہوگا
مسائلِ نظری میں الجھ گیا ہے خطیب (اقبال)

ہزاری باغ شہر گیا کی طرح باغ و بہار جیسے مومن انصاریوں کا شہر تھا، اسکولوں اور کالجوں کی نہ کمی تھی نہ فارغ التحصیل انصاریوں کی کمی تھی۔

دھنباد (آسنسول میں بسلسلۂ ملازمت کچھ مومن خاندان آباد تھے، دین سے بے بہرہ اور تعلیم سے نابلد تھے اس سے بدتر حالت جھریا کی تھی، جہاں حضرات شیخ انصار (پٹنہ، گیا، بھاگلپور، دربھنگہ اور چھپرہ) سے آکر کوئلہ کی تجارت یا کانوں میں ملازمت کرتے تھے، نرے جاہل رہ گئے تھے، دین سے کوسوں دور اور گمنامی کے کانوں میں پڑے ہوئے تھے، اس کے برعکس سیتا مڑھی کے مومن انصاریوں کی مالی اور دینی حالت بہتر تھی، ان تمام شہروں میں مثلاً کٹک، جگن ناتھ پوری، رانچی، دھنباد میں عام طور سے سگریٹ، پان، تمباکو، زردہ، بیڑی وغیرہ کی دکانداری اور بڑھئی کا دھندا پسماندہ برادری کے غیر تعلیم یافتہ افراد کے ہاتھوں میں تھا۔ مین سنگھ میں عموماً یہی چھوٹا موٹا کاروبار ان کا ذریعۂ معاش تھا، دکانداری خاص پیشہ تھا کچھ لوگ پارچہ بافی کرتے تھے اور جہاں بھی دینی تعلیم کا شوق کثر طالبانِ علم کو بہار پور تک کشاں کشاں لے گیا، پھر جاہلانہ رسوم اور بدعات نے مومن انصار برادری کو پیرانِ تسمہ پا کا مرید بنا دیا تھا، بالکل یہی حال جمشید پور کے انصاریوں کا تھا، یہاں کپڑے کے تاجر تھے وہی لوگ خوشحال تھے دوسرے ملازم پیشہ، دست پیشہ تھے اور مالی حالت کمزور تھی دینی حالت مشرکانہ رسوم کے سبب بعید بدتر تھی حرمت و تربیت کا عالم کچھ اور تھا، اخلاق سے کوسوں دور نہ پنچایت نہ دستور، نام کے مسلمان تھے، رمضان کے مہینے میں دین کی جھولی جشنی بھر آجاتی تو پٹنہ اور دہلی کے حفاظ تراویح پڑھانے آجاتے اور دامن روپوں سے بھر کر لے جاتے، یہی کارِ ثواب تھا اور سب بیکار۔

جمشید پور کی طرح ہر جگہ میں بھی اصلاح معاشرت و تبلیغ دین کی شدید ضرورت محسوس کی جا

رہی تھی، یہاں کے انصاریوں کا ذریعۂ معاش وہی تھا جو عام طور پر اڑیسہ اور بہار کے شہروں کا تھا، تجارت، پارچہ بافی، بساطی، بزازی، خیاطی اور دکانداری۔ کچھ لوگ سن اور روئی کی تجارت کرتے تھے دینی تعلیم میں قرآن مجید کا تبرکاً پڑھنا اور سیکھنا باعث برکت تھا اور باقی عید بقرعید پر نئے کپڑے پہننا کبھی کبھی پردہ داری کر لیتے اور تراویح کی نماز تو سالانہ عبادت تھی ورنہ مسجدیں مرثیہ خواں تھیں کہ نمازی نہ رہے، دیہاتی اور قصباتی لوگ تو اور بھی ضلالت اور گمراہی کے پاتال میں پڑے ہوئے تھے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں (اقبالؔ)

آسنسول، مقام اور گرڈیہہ میں جماعت انصار زیادہ تر دانا پور، پٹنہ اور دربھنگہ سے آکر بس گئی تھی، دین سے اتنے بے بہرہ نہیں تھے لیکن جہالت نے دلوں پر پہرہ بٹھا دیا تھا بس نام کے مسلمان تھے مولوی عبدالستار مدرس مدرسۂ اہلحدیث آسنسول، محمد حنیف انصار ٹھیکیدار مقام گھاٹ کی ممتاز ہستیوں میں سے تھے۔

موتی ہاری اور ضلع پورنیہ کے علاوہ کشن گنج، ارریا اور ضلع مظفرپور میں مومن برادری تعداد کثیر میں آباد تھے، تعلیم کی کمی، مالی پست حالی اور جہالت عام تھی، ایک بیرسٹر سید یوسف شریف حسین جو غنیمت تھے، لیکن جہاں تک جنگ آزادی کا تعلق ہے یہاں کی مومن برادری نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا۔ مظفرپور ہی کی ایک مومنہ خاتون بی بی رسول جہاں زوجہ مرعلی ایک جلوس میں انگریزوں کی بندوق کی گولی کا نشانہ بن گئی تھی۔

جنگ آزادی میں ضلع ویشالی (مظفرپور) کانگریس کے ساتھ شامل رہا جب ترک موالات، خلافت تحریک اور شہری نافرمانی کے نعرے لگے تو پورے ضلع کی مومن برادری نے بھی اپنی آواز ملائی۔ مقصود علی پسر نور علی (۱۸۷۹ء) میں مہنار تھانہ کے سلطان پور گاؤں میں پیدا ہوئے اچھے کھلاڑی کشتی باز، صاف گو اور طاقت ور جواں مرد تھے برادری کے لوگوں کو ستم زمیندار طبقہ کے استحصال سے آزاد کرانے میں انہوں نے سخت جدوجہد کی اور بیگار کی محنت سے نجات دلائی بے انصافی، ظلم اور جہالت کے خلاف لڑتے ہوئے اور جنگ آزادی کے لیے آخری دم (۱۹۳۰ء) تک جدوجہد کرتے رہے، ان کے بعد ان کے لڑکے عین الحق شریک جنگ آزادی ہوئے۔

مہنار تھانہ کے عبدالمجید انصاری ابن حیدل انصاری (۱۹۲۲ء) جو فتحپور بکالی کے تھے

طالب علمی ہی کے زمانے سے انقلابی ثابت ہوگئے ۱۸ اگست ۱۹۴۲ء کو مہنار تھانہ پر اپنے ساتھیوں
کے ساتھ قبضہ کر لیا، عبدالحمید انصاری نے پندرہ دنوں تک آزاد سرکار چلائی اس دوران گاؤں گاؤں
میں "رکھشا دل" اور پنچایتی راج قائم کیا اور کہیں کسی طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، ۲ ستمبر ۱۹۴۲ء
کو انگریزی فوج پہنچی یہ سارے روپوش ہو گئے۔ فوج نے عبدالحمید انصاری کے مکان کو پٹرول چھڑک
کر آگ لگا دی، عام گرفتاریاں ہونے لگیں اور لوگوں پر ظلم و ستم ہونے لگا "باغی نوجوان دستہ"
پٹنہ شہر بھاگ گیا، بہرحال پکڑے گئے، مقدمے ہوئے کئی سزائیں یکے بعد دیگرے ہوئیں اور عبدالحمید
انصاری چار سال کے قریب پابند سلاسل و مقید زندان رہے،

عین الحق جو مقصود علی کے نقش قدم پر چلے یہ بھی عبدالحمید کے ساتھیوں میں سے تھے ان کے
خلاف جب کارروائی شروع ہوئی تو فرار ہو کر محی الدین نگر ضلع دربھنگہ چلے گئے، اور وہیں چھپ
کر مزدوری کرنے لگے، رشتہ دار بھی گھر میں رہنے کے لئے اجازت نہیں دیتے تھے، یہ دور دراز
کے گاؤں میں چھپے جاتے اور رات جب بازار بند ہو جاتا تو یہ کسی دکان کے آگے کسی تختہ پر سو جاتے،
رات بھر بلوچی فوج گشت کرتی رہتی تھی، عبدالرؤف وکیل اسی علاقے کے مومن کانفرنس کے
فعال رکن تھے۔

مظفر پور کے وطن پرستوں کی فہرست میں اور کئی نام آتے ہیں جنہوں نے جنگ آزادی میں کانگریس
کے پرچم تلے کارہائے نمایاں سرانجام دئے۔ جہوا تھانے کے غلام ربانی، مرزا نگر ڈڈگرہ کے عبدالوہاب
شمسی شاہ پور، عبدالحفیظ حسن پور بھدواسی، جنڈھا علی اکبر، حامی پور کے عبدالستار، صاحب جان
انصاری، عبدالرؤف انصاری، لال گنج کے محمد سلیمان شاہپوری وغیرہ[1]

ضلع روہتاس (جو پہلے شاہ آباد ضلع تھا) میں ڈیہری قریہ میں عبدالقیوم انصاری (متوفی ۱۹۷۳ء
۱۹۰۵ء) میں پیدا ہوئے، کئی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہے اور بعد میں کانگریس میں شامل ہو کر آزادی کی
لڑائی لڑتے رہے، اور مومن برادری کی فلاح و بہبود کے لئے وزارت کے منصب تک پہنچنے کے بعد
جدوجہد کرتے رہے۔ بہار میں تشکیل وزارت کے وقت مومن کانفرنس کو کانگریس میں انضمام کی
حد تک قریب کر دیا گیا اور یہیں سے مومن کانفرنس کی علاحدہ شناخت اور جداگانہ سیاسی تشخص ختم ہونا
شروع ہو گیا۔ اس تحریک کی مزاج اور قلب ماہیت کی ذمہ داری عبدالقیوم انصاری پر تھوپی گئی۔

---

[1] کانگریس صد سالہ جشن: جنگ آزادی اور دیشالی ضلع کی مومن برادری، محمد منان ایڈووکیٹ ص ۶۴-۶۵

بھاگلپور اور اس کے نواحی قصبات میں مومن انصار بنکروں کی آبادیوں میں کرگھوں کا شور سب سے زیادہ بلند تھا، یہاں مشہور ٹسر مال تیار ہوتا تھا چمپا نگر ٹسر بافتہ کی صنعت میں خاص مقام رکھتا تھا، آزادی سے پہلے برادری نہایت عسرت اور تنگدستی کی زندگی بسر کر رہی تھی کیونکہ فرنگیوں نے ہاتھ باندھ رکھا تھا اور انگریز اس صنعت کو تباہ کرنے کے لئے دست تظلم بڑھا رہے تھے، ان میں تعلیم کا فقدان تھا اور طرز معاشرت غیر معیاری تھا جذبۂ اسلامی سے سرشار بھی تھے اور وطن پرستی کے ولولوں سے انگریزوں کے خلاف آمادہ پیکار بھی تھے چنانچہ ۱۹۴۲ء کی "کرانتی" "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک جو کانگریس نے چلائی تھی اس نے بھاگلپور کو انگریزوں کے ظلم و تشدد کا نشانہ مشق ستم بنا دیا، ملک بھر میں لگ بھگ پچیس ہزار (۲۵۰۰۰) وطن پرست مارے گئے، گاؤں کے گاؤں جلا کر خاکستر کر دئے گئے، عورتوں کو اغوا کیا گیا اور آبروریزی کی گئی، ملک کی آزادی کے لئے جو مومن نوجوان اور بوڑھے قربان ہو گئے ان میں بھاگلپور کے جراہی میاں ولد نبی میاں نغاری ساکن چمپا نگر کا نام بہت سرخی سے ہوتے ہے۔ یہ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء کو آزادی کی تحریک میں مارے گئے زخمی ہونے والے مومن نوجوانوں میں یہ لوگ تھے (۱) شمس الدین مولا بخش (ساکن چمپا نگر) بھاگلپور جیل میں قید رہے (۲) جمال الدین زین العابدین (چمپا نگر) قید اور زخمی ہوئے اور جیل ہی میں وفات پائی۔ (۳) عبدالرشید مولانا یعقوب (چمپا نگر) مجروح ہوئے اور آٹھ مہینوں تک قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں (۴) مولانا غلام حسین تاج الدین (چمپا نگر) یہ اسی سال ۱۹۴۲ء میں مراد آباد کے مدرسہ شاہی کے طالب علم تھے، جلوس میں پکڑے گئے، اور جیل بھیج دیے گئے۔ اس وقت مراد آباد ڈسٹرکٹ جیل میں بھاگلپور کے مولانا منصور علی عبدالسلام بھی تھے، انہیں کی رہبری میں ۲۴ ستمبر ۱۹۴۲ء کو شہر مراد آباد میں عظیم الشان جلوس نکالا گیا تھا، وقتاً جیل میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی صدر جمعیۃ علمائے ہند، مولانا محمد حفظ الرحمن جنرل سیکریٹری جمعیۃ علمائے ہند، مؤرخ اسلام مولانا محمد میاں اور مولانا اسمٰعیل سنبھلی جیسے بڑے مجاہدین آزادی اور بے لوث رہنما شامل تھے۔ علی احمد بلند اختر (مونگیر) جمعیۃ المومنین کلکتہ کے بانیوں میں سے تھے۔

بہار کے مومن مجاہدین آزادی میں ایک خاتون مومنہ بی بی رسول جہاں زوجہ نذر علی کا نام بھی ملتا ہے یہ ضلع مظفر پور کی رہنے والی تھیں۔ اسی علاقہ کے محمد سرفیں اور رمضان انصاری بھی تھے ضلع دھوبی کے بشیر احمد عبدالغفور اور نذیر احمد عبدالغفور دو بھائی جنگ آزادی کے مجاہدین میں سے تھے، فہرست ان وطن پرستوں کی بیحد طویل ہے لیکن ان کے کارناموں اور سرفروشیوں کی

داستانیں کسی بھی تاریخ جنگ آزادی میں جگہ نہ پاسکیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ نچلے درجہ کے بُنکر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے یا پھر احاطۂ تحریر محدود ہو کر رہ گیا لیکن کانگریس کی جب کوئی تاریخ اس کی بنائی (۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۸۸۵ء) کے عہد سے مرتب کی جائیگی تو اُن، مومن کرجو گلدستۂ طاقِ نسیاں بن کر مرجھا گئے ہیں، دوبارہ یادوں میں اور تحریروں میں تازہ کئے جائیں گے اور ہم ان میں پھر رانچی کے ان مجاہدین اور وطن پرستوں کے نام فرد پائیں گے: (۱) امانت علی انصاری (۲) نعمت علی انصاری (۳) عنایت علی انصاری (۴) محمد منصور محمد طاہر انصاری (۵) محمد شریف انصاری (۶) اسلام الدین انصاری (۷) جمال انصاری (۸) حاجی ملا ستار (۹) عبدالحمید عبدل میاں۔

رانچی بہار سے متصل ایک خطۂ خوشگوار ہے چھوٹا ناگپور کا دارالخلافہ اور برطانوی عہد میں ان کا صحت افزا مقام رہ چکا ہے، فضا انصاریوں کے لئے بھی سازگار تھی، کاروبار کو فروغ حاصل تھا اور دیگر صنعتوں کو عروج، طالبانِ علم پٹنہ کے مدرسۂ اصلاح المسلمین اور دیگر دینی جامعات میں تحصیلِ علم کے لئے جاتے تھے، قومی پنچایت کا رواج تھا، کئی مخلص رہنما جو کانگریس اور مومن کانفرنس تحریک کے تاحیات سرگرم رکن رہے اسی شہر اور ضلع میں پیدا ہوئے اس علاقہ کے مومن مجاہدین کی ایک علاحدہ تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے جس کا پہلا باب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی سے شروع ہوتا ہے۔

شیخ امام الدین ایڈووکیٹ جو ۱۹۱۱ء میں اٹکی (ضلع رانچی) میں پیدا ہوئے مومن تحریک کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں انھوں نے اپنے مضمون 'مومن تحریک: ایک تاریخی پس منظر' میں جنوبی بہار کے پہاڑی علاقہ چھوٹا ناگپور کو ہندوستان کے نقشے میں وہ اہم محاذِ جنگ قرار دیا ہے جہاں پہلی جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) میں کچھ جانبازوں نے اپنی جانیں برطانوی استعماریت کے خلاف لڑتے ہوئے قربان کی تھیں۔ ان کا سپہ سالار شیخ بھکاری مومن برادری کا فرد تھا۔ چھوٹا ناگپور کے کوہستانی علاقہ کی حسین وادی میں جہاں گھنے جنگلوں کا سناٹا چھایا رہتا تھا وہاں سینکڑوں بستیوں سے کرگھوں کا شور اٹھتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہاں نہ قدیم باشندے آدی باسی ہیں جن کے ساتھ مومن گھل مل کر رہتے ہیں، دونوں اپنے رسم و رواج، رہن سہن میں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں انگریزی حکومت کے برسرِ اقتدار آتے ہی چھوٹا ناگپور میں عیسائی مشنریوں کا جال بچھ گیا۔ مشنریوں میں مومنوں کے بُنے ہوئے کپڑے متروک کر دیے گئے، چونکہ آدی باسیوں کی کثیر تعداد عیسائی مشنریوں

سے حلقہ میں آگئی تھی مومنوں کی معاش کو ایک بڑا دھکا لگا۔ انگریزی حکومت سے
نفرت کا جذبہ تو پہلے ہی سے موجود تھا، عیسائی مشنریوں کے اس فیصلہ نے آگ پر تیل کا
کام کیا۔ چنانچہ دشوار گذار راستوں گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کے حائل ہونے کے باوجود
پورے چھوٹا ناگپور کے مومنوں نے آپس میں رابطہ قائم کیا اور ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی
جس کا مقصد تھا انگریزی حکومت کا خاتمہ۔ اس تنظیم کے سربراہ شیخ بھکاری ہوئے جو
بڑکا گڈھ کے راجہ ٹھاکر وشوناتھ شاہ دیو کے دیوان تھے، چاچا کے سلامت علی اور
شیخ ہرو دونوں سگے بھائیوں نے اس تنظیم کو مستحکم بنانے میں اپنی جان کی بازی لگادی[۱]
بڑکا گڈھ کے راجہ ٹھاکر نے اپنے دیوان کے حوصلوں اور امنگوں کو بڑھانے کے لیے تلوار اٹھالی
اور چھوٹا ناگپور کے مومن نوجوان سرفروشی کی تمنائیں دلوں میں لئے بازوئے قاتل کا زور آزمانے کے لئے
شیخ بھکاری کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ سلامت علی اور شیخ ہرو بھائیوں نے اپنے مومن دستہ کے
ساتھ سنتھال پرگنہ کے دمکا میں انگریز چھاؤنی پر دھاوا بول دیا، چھوٹا ناگپور گوروں سے خالی
ہوگیا، تازہ کمک نے گوروں کے سیاہ دلوں کو انتقام کی آگ سے اور جھلس دیا، شیخ بھکاری اور
اس کے ساتھیوں نے جنرل میکڈونلڈ کی چٹوپالو گھاٹ پر چڑھ کر سخت مزاحمت کی گھمسان کا رن
پڑا ۶ جنوری ۱۸۵۸ء کو شیخ بھکاری گرفتار کر لئے گئے پھر ایک نام نہاد فوجی عدالت نے شیخ
بھکاری کو پھانسی کا فیصلہ سنایا جس میں جنرل میکڈونلڈ نے یہ الفاظ قلمبند کئے "ہندستانی باغیوں
میں سب سے خطرناک شیخ بھکاری ہے" فیصلہ کی تعمیل میں اتنی عجلت دکھائی گئی کہ دو روز
کے بعد چٹوپالو گھاٹ ہی کے ایک درخت پر ۸ جنوری ۱۸۵۸ء کو "مومنوں کا عظیم رہنما" شیخ
بھکاری پھانسی پر چڑھ کر اپنے وطن پر قربان ہو گیا۔ شیخ سلامت اور شیخ ہرو بھی گرفتار کرلئے
گئے اور انہیں کالے پانی کی سزا دی گئی۔

ضلع رانچی کے مومن مجاہدین میں حاجی عبداللہ سردار عرف بیگا میں کے خاندان کا تعلق اعلیٰ مومن
برادری سے تھا ان کا خاندان اس زمانے میں امراء کے خاندانوں میں گنا جاتا تھا[۲] ایک دفعہ جب
مہاراجہ چھوٹا ناگپور کو روپوں کی ضرورت پڑی تو ان کے جد امجد نے راجہ صاحب کو گن کر نہیں بلکہ پیمانے

---

۱ شیخ امام الدین (ایڈوکیٹ)، انجمن - رانچی - بہار - مطبوعہ کانگریس صدسالہ جشن ۱۹۸۵ صفحہ ۵۲-۵۳
۲ کانگریس صدسالہ جشن۔ صفحہ ۵۵

(دھان چاول ناپنے کا بڑا کٹورہ) میں ناپ کر قرض دیا تھا اسی پر خوش ہو کر مہاراجہ نے انہیں "تام بھر"
دیا تھا، بیگاسیاں ان پڑھ تھے لیکن ایمانداری، دیانتداری اور انصاف پسندی کا سبق مکتب درس
سے ورثے میں ملا تھا۔ رانچی ضلع میں آج بھی دور دراز علاقوں تک ان کے اوصاف حمیدہ کے گن گائے
جاتے ہیں انہیں مومن برادری کی فلاح و بہبود کا ہمہ وقت خیال رہتا تھا ان کی خدمت کے صلے
میں ۱۹۲۲ء میں جب مومن برادری کے معاشرتی اور معاشی سدھار کے لئے "مرکز" میں مومن
کانفرنس کا انعقاد ہوا تو ان کو بارہ گاؤں کی سرداری کی پگڑی باندھی گئی، ان کا حلقۂ اثر
بڑھتا گیا حاجی امام علی سردار، مولوی فرزند علی، سخاوت حسین اور صدیق عہدیدار اور دیگر ساتھیوں
کے ساتھ مل کر سماجی سدھار میں زندگی بتادی، حاجی صاحب کانگریس کے پرچم تلے اور مومن
کانفرنس کے علم کے نیچے رہ کر مومنوں کی قیادت کرتے رہے اور جنگِ آزادی کے ہر محاذ پر
لڑتے رہے، آزادی کے بعد انہوں نے جو تعلیمی خدمات کی تھیں ان کی یادگاریں وہ مدرسے
اور ہائی اسکولیں ہیں جو ثواب جاریہ بن کر ان کے لئے توشۂ آخرت بنے ہوئے ہیں، سیسئی
ہائی اسکول، مدرسہ فیض الرشید سیسئی (ضلع رانچی) انہیں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

جنت حسین انصاری (وفات ۱۹۸۲ء) کستھار (ضلع گریڈیہہ۔ بہار) پولس کی نوکری سے استعفیٰ
دے کر خود پولس کی گرفتاری سے بچنے کے لئے مجاہدین آزادی کے ساتھ جنگل میں روپوش رہے۔
مومن کانفرنس کے روحِ رواں مولانا عاصم بہاری، عبدالقیوم انصاری اور دیگر مومن رہنماؤں
کی معیت میں آزادیٔ ملک کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔[1]

جنوبی بہار میں رانچی کے مردم خیز علاقے سے نجابت حسین انصاری (وفات ۱۹۷۱ء) جیسے
مومن رہنما پیدا ہوئے جن سے مومن تحریک کی نشو و نما ہوئی اور کانگریس پارٹی کو تقویت ملی،
مومن کانفرنس اور کانگریس کے سرگرم رکن رہے عدم تعاون اور ملک گیر پیمانے پر جاری تحریک
آزادی میں فخرِ قوم عبدالقیوم انصاری کے زیر قیادت حاجی امام علی (۱۸۹۶ء ـ ۱۹۶۲ء)
جنوبی بہار میں مومن کانفرنس کے بانی تھے، حاجی عبداللہ اور فرزند علی کے ساتھ جدوجہد میں شریک
رہے۔ پنچایت کے ۲۰ سال تک مکھیا، مقامی مومن کانفرنس اور کانگریس کمیٹی کے صدر رہے، ان
کے ذاتی کردار نے انہیں "اوتالی گاندھی" بنا کر ان کا سیاسی مرتبہ بڑھا دیا اور دنیا بنا دی۔

---

[1] کانگریس صد سالہ جشن۔ ص ۹۰

ہزاری باغ کے محمد یٰسین انصاری (سنہ ۱۹۱۸ء۔ سنہ ۱۹۷۵ء) بھی آزادی کے متوالوں میں سے تھے جنہوں نے چھوٹا ناگپور کے گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کی وادیوں میں بسے ہوئے گاؤں میں جا کر آزادی کے لئے لوگوں کو بیدار کیا، جنگل میں روپوش رہے، قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں، کانگریس اور مومن کانفرنس کی قیادت اور خدمت کی اور "آج بھی اپنی سادگی، ایمانداری، جفاکشی اور سیکولر ذہنیت کے لئے عوام الناس میں مشہور ہیں اور لوگ انہیں ایک مثالی شخصیت مانتے ہیں"۔ [1]

مومن کانفرنس اور کانگریس پارٹی کے امانت علی انصاری (پیدائش ۱۹۳۰) ضلع رانچی (بہار) کی مشہور شخصیت آزادی کی تاریخ میں اپنا خاص مقام رکھتی ہے، طلبہ و مزدوروں کے قائد بنے، دستی مصنوعات کے فروغ کے لئے کوشاں رہے، عبدالقیوم انصاری اور عبدالواحد انصاری کے بعد امانت علی انصاری کو بہار صوبائی مومن کانفرنس کا صدر بنایا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۵ کی آل انڈیا مومن کانفرنس کے زیر اہتمام (دہلی) کانگریس صد سالہ جشن کا انعقاد آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

چمپارن کے وطن دوست مومن۔ انصار

چمپارن صوبۂ بہار کا وہ شہر ہے جہاں کی خاک سے بڑے اولوالعزم مجاہدینِ آزادی اُٹھے ہیں، یہ سارے مومن کانفرنس کی قیادت کرتے رہے، اور کانگریس کی تحریکِ آزادی میں برابر کے شریک رہے، آزادیٔ ہند کے بعد ان میں سے محمد سعید انصاری (سنہ ۱۹۰۲ء۔ سنہ ۱۹۷۵ء) ایک آزاد خیال سیاسی کارکن تھے کانگریس سے والہانہ محبت تھی چمپارن ضلع مومن کانفرنس کے ستون بنے رہے، امارت شرعیہ شاخ بتیا کے برسوں تک صدر رہے، قومی یکجہتی اور قومی ایکتا کے بہت بڑے علمبردار تھے، حسین میاں انصاری ظہور میاں "انگریز بھگاؤ اور ہندوستان کی آزادی پاؤ" کا نعرہ لگاتے رہے اور کانگریس سے اٹوٹ محبت کا دم بھرتے رہے۔ عبدالغنی انصاری (سنہ ۱۹۱ء۔ سنہ ۱۹۷۴ء) بتیا ضلع چمپارن کے کانگریس کے سرگرم رکن تھے سنہ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ میں شامل ہو کر جیل گئے۔ ایسے ہی ستیہ گرہ کرنے والوں میں علاقت میاں انصاری ولد شمسی میاں موضع رمنہ (تھانہ یوگا پٹی) کے مجاہد آزادی بھی شامل تھے، ولی محمد انصاری (موضع امواچھار تھانہ مجھولیا، چمپارن) بڑے دیش

---

[1] کانگریس صد سالہ جشن صفحہ ۴۴۔۴۵

بھگت تھے، محمد حسین ولد عبدالجلیل انصاری (سنہ ۱۹۰۵ء۔ سنہ ۱۹۰۱ء) (محلہ درگاہ بتیا ٹاؤن وارڈ
نمبر ۴ ضلع پچھمی چمپارن) نے ایک خاص کانگریسی خادم کی حیثیت سے زندگی گذار دی، قدوس
نبی میاں انصاری (بہادروا تھانہ مجھولیا ضلع پچھمی چمپارن) کانگریسی اصولوں کے پابند خادم قوم
تھے، حکیم میاں ولد کھیدو میاں (موضع میناٹانڑ تھانہ میناٹانڑ ضلع پچھمی چمپارن) کو مجاہد آزادی
کی حیثیت سے وظیفہ ملتا رہا۔ —— یہ سارے غریب گھرانے کے افراد تھے، جذبۂ حریت سے
سرشار ہو کر سرفروشانہ جدوجہد کرتے رہے۔ ملک آزاد ہو گیا کچھ قید حیات سے آزاد ہو گئے چند
ایک رہ گئے جو وظیفہ خوار بنے ماضی کی یادوں میں زندہ رہ گئے ہیں ان کا ذکر تاریخ کے اوراق
میں ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا۔

پیر محمد مونس ولد ٹھنگن میاں انصاری (سنہ ۱۸۹۳ء۔ سنہ ۱۹۴۷ء) ایک متوسط گھرانے کے
انقلاب پسند فرد تھے، ہندی زبان کے اچھے لیکھک تھے اور 'نیا زمانہ'، 'نوجیون'، 'سودیش'،
'پاٹلی پتر'، جیسے موقر جریدوں میں ان کی لیکھیاں چھپتی تھیں، برطانوی استعماریت کے
خلاف ان کی انگریز دشمن کتاب 'چمپارن کی پرجا پر اتیاچار' غریبوں کی خونچکاں داستان
تھی جس میں برطانوی حکومت کے کالے کرتوتوں کو ننگا کر دیا گیا تھا لہٰذا بحق سرکار ضبط ہو گئی
—— ساتھ میں ساری جائداد بھی ضبط کر لی گئی، سنہ ۱۹۳۸ء سے کانگریس کے تاحیات سرگرم
خادم رہے جب آزادی ملی تو ان کے "درد کا شجر" بے برگ و بار ہی رہا، نیتاؤں کی بے دردی
کا زخم بھرنے نہ پایا آزادیٔ ہند کے دو سال بعد بے یار و مددگار دنیائے دنی سے رہائی پا گئے۔

حافظ زین محمد انصاری (سنہ ۱۸۹۱ء۔ سنہ ۱۹۶۱ء) پیر محمد مونس انصاری کے ساتھیوں میں
سے تھے، امیر گھرانے کے فرد تھے اور چمپارن ضلع مومن کانفرنس کے تاحیات صدر رہے اور
کانگریس کے قیام کے بعد اسی سیاسی راہ پر گامزن رہے۔

حافظ تبارک حسین انصاری (سنہ ۱۸۹۰ء۔ سنہ ۱۹۸۶ء) نے طویل عمر پائی، انقلابات وطن
کے کئی رخ دیکھے کئی تحریکوں کی آبرو بنے رہے قومی، ملی اور مذہبی اداروں سے وابستہ
رہے، حافظ قرآن تھے اور فقہ و حدیث کے عالم تسلیم کئے جاتے تھے، ایک اچھے ادیب اور شعلہ
بیان مقرر تھے، چمپارن کی معزز ہستیوں میں آپ کا شمار تھا، حافظ تبارک حسین انصاری نے
سنہ ۱۹۰ء میں پہلے انگریزوں کے خلاف علم بلند کیا اور کانگریس کے موقف کے ساتھ اپنے کو منسلک
رکھ کے نیتاؤں کے شریک کار بنے رہے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اخیر عمر حاجی شرف الدین احمد قادری انصاری (پیدائش ۱۹۱۴ء) جو خود مومن کانفرنس کے جانے پہچانے سرگرم رکن تھے اور حافظ تبارک حسین انصاری اور مولوی محمد سعید انصاری کی قیادت میں کام کرتے رہے۔ ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی تک بتیا ہی میں مقیم رہے، حافظ دین محمد انصاری کی وفات کے بعد صدر رہے۔ حافظ جی ابتدا ہی سے بہار اسٹیٹ ہینڈلوم ویورس یونین کے ڈائرکٹر رہے۔ ان کی انتھک کوششوں سے مدرسہ فیض العلوم اور مدرسہ احیاء العلوم قائم ہوئے۔

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مومن کاشتکار اور بنکر سے لے کر خود انگریزوں کے محکموں میں ملازم پیشہ اور فوج میں کام کرنے والے خادم اور سپاہی بھی شامل تھے، لیکن یہ گمنامی کے پردوں میں رہ گئے، لیکن موتی ہاری چمپارن (بہار) کے بطخ میاں ولد محمد علی انصاری (وفات ۱۹۵۷ء) کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، یہ انگریزوں کے کسی دستہ میں خانساماں تھے، ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے جب گاندھی جی موتی ہاری کے کسانوں کی اجڑی ہوئی حالت کا جائزہ لینے کے لئے چمپارن گئے، انگریز عہدہ داروں میں کھلبلی مچ گئی، ان کی اس آمد سے ان کے حواس جاتے رہے اس لئے کہ ان گوروں کے کالے کرتوتوں پر سے پردہ اٹھنے والا تھا، ظالموں کی نیند اڑ گئی تو دلوں میں انتقام کا جذبہ بیدار ہو گیا، اور یہ طے پایا کہ گاندھی جی کو موت کی نیند سلا دیا جائے، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں کی دعوت پر دورے سے لوٹنے کے بعد آنے والے تھے۔

بطخ میاں خانساماں کو سازش میں شریک کیا گیا، زمین و انعامات کا وعدہ کیا گیا، عہدے کا لالچ دیا گیا اور بصورت انکار انتقام کی دھمکیاں دے کر آخر کار انہیں راضی کر لیا گیا کہ جب وہ کھانے پر بیٹھیں تو پہلے سوپ پیش کیا جائے مگر گاندھی جی کو سوپ کے بدلے زہر کا پیالہ دیا جائے، خانساماں زہر کا پیالہ لے کر آگے بڑھا کہ انگریزی دستور طعام کے مطابق جیسے بقیہ بر سوپ کا پیالہ ان کی خدمت میں پیش کیا جائے، ایک طرف مال و دولت، ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور عز و اکرام سر پہ چڑھ کر بول رہے تھے اور دوسری طرف زنجیر و سلاسل کے کھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ گاندھی جی کے سامنے بطخ میاں کھڑے ہو گئے۔ راجندر پرشاد جی بیٹھے ہوئے تھے، پھر شاید حب الوطنی کے جذبہ نے طاقت گویائی عطا کی اور حق گوئی سے کام لیا اور شاید بطخ میاں کے کانوں میں خدا کا یہ فرمان گونجنے لگا:

"اور ہم نے تمہیں ایک دوسرے کے لئے آزمائش بنایا کہ تم صبر کرو گے اور تمہارا پروردگار تو دیکھنے والا ہے" (الفرقان : ۲۰)

بطخ میاں نے آہستہ سے کہا "اس میں زہر ہے مت پیجئے!"

گاندھی جی نے زہر کا پیالہ پھینک دیا —— اور بتیس سال زندہ رہے لیکن بطخ میاں خانساماں کی ساری زندگی میں مرتے دم تک زہر گھلتا رہا، زہر ہلاہل کو قند نہ کہنے والا، خود زندگی کی تلخیوں کو زہر گھونٹ کرتا رہا، اور اپنے آقاؤں کے عتاب کا نشانہ بنا رہا، جائداد جو تھوڑی بہت تھی وہ ضبط ہو گئی، بچا کھچا سرمایہ لٹ گیا۔

یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

تینتیس سال کے بعد ۱۹۵۰ء میں جب ڈاکٹر راجندر پرشاد جی آزاد ہندوستان کے پہلے صدر کی حیثیت سے چمپارن آئے اور موتی ہاری کے اسٹیشن پر ٹھہرے تو اس بھیڑ میں ایک ادھ ننگے ضعیف انسان کو دیکھا، ڈاکٹر صاحب کی قدر شناس آنکھوں اور طبیعت نے بطخ میاں انصاری خانساماں کو پہچان لیا آگے بڑھ کر سینے سے لگا لیا اور اسی وقت ضلع کلکٹر کو حکم دیا کہ ان کے لئے جلد سے جلد پچاس ایکڑ زمین کا بندوبست کر دیا جائے۔ راجندر پرشاد چلے گئے، رات گئی بات گئی، لیکن ان کا حکم بطخ میاں کی زندگی تک سرکاری فائلوں میں بند رہا اور جب قضا نے ان کی کتاب حیات بند کر دی تو کچھ ایکڑ زمین کا بندوبست ہوا لیکن بطخ میاں کو تو صرف دو گز زمین کی ضرورت تھی۔ بطخ میاں کیا کسی عظیم مجاہد آزادی سے صلت اور حق گوئی میں کم تھے؟

پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

(اقبال)

سلہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں مومن مجاہدین چمپارن کا حصہ — جناب اشرف الدین احمد قادری اشرف ایڈوکیٹ۔
کانگریس صد سالہ جشن صــ ۳۱-۳۷

مولانا علی حسین عاصم بہاری کا خاندان

"باباۓ قوم" مولانا علی حسین عاصم بہاری ایک عالم اور مجاہد خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا مولانا عبدالحکیم نے انگریزی استعماریت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں عملی حصہ لیا، جس کی سزا میں انہیں برسوں نیپال میں جلاوطنی کی زندگی گذارنی پڑی۔ ان کے بھائی مولانا عبدالرحیم بہار شریف میں اپنے وقت کے جید عالم تھے جنکے شاگردوں میں سلسلۂ فردوسی کے حضرت شاہ امین احمد فردوسی (۱۲۴۸-۱۳۲۱ھ) بھی تھے۔ عاصم بہاری انہیں بزرگوں کے زیر تربیت پروان چڑھے۔

مولانا عاصم تلاش معاش کے سلسلے میں ۱۹۱۶ء میں کلکتہ پہنچے، یہاں کی علمی، سیاسی اور صحافتی فضا میں ان کی فکری و نظری صلاحیتوں کی نشوونما ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر علماء کی شخصیتوں کی صحبت نے دیدہ وری پیدا کی۔ اسی دوران میں ایک اہم تصنیف "تاریخ المنوال وابناء فی تاریخ التمدن) کے مطالعہ نے موصوف کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ مصنف مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے انصاریوں یعنی بنکر برادری کی مکمل تاریخ پیش کرنے کے بعد "قومی اپیل بہدایت قوم" کے زیر عنوان انہیں اپنی پسماندہ برادری کی ترقی کے لئے اصلاحی کاموں کی طرف مائل کیا، قرآن، حدیث و فقہ پر عمل کی ہدایت فرمائی اور ایک کانفرنس قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔[1]

مولانا عاصم بہاری کی شادی کٹہل ٹولہ، مولا سرائے بہار شریف (نالندہ) کے بنکر خاندان میں ہوئی تھی، ان کی بیگم بی بی رسولن کے والد منیرالدین مستری ایک کامیاب اور ماہر کاریگر تھے، ان کے کارخانے کی بنائی ہوئی "کوریا لنگی" بڑی مشہور تھی۔ مولانا کی اولاد میں دو صاحبزادے ہارون اور ہمایوں اور ایک صاحبزادی بارکہ بقید حیات ہیں۔

بہار کے انصاری دانشوران

مولانا علی حسین عاصم بہاری کی قومی و ملی خدمات کو مومن برادری کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ سیاست کی بالادستی اور مفاد پرستوں کی غفلت اور کوتاہ نظری نے گو انہیں گمشدہ طاق نسیاں بنا دیا تھا لیکن

---

[1] تعبیہ۔ سید علی حسین عاصم بہاری۔ بموقع کل ہند بزم عاصم بہاری، منعقدہ ۳ مئی ۱۹۸۲ء۔ مرتب شاہد ... عاصم بہاری اکادمی۔ بہار شریف نالندہ۔ ڈاکٹر احمد سجاد۔ مولانا علی حسین بہاری کا اسلامی نظام تربیت۔ ص ۱۲-۲۳

ان کی مومن کانفرنس کی تنظیم کی نشاۃ ثانیہ کرنے والے نئی نسل میں موجود ہیں۔ پرانے نام لیوا میں ڈاکٹر احمد سجاد پروفیسر شعبۂ اردو، رانچی یونیورسٹی ان کے افکار و خیالات کے مخلص ترجمان ہیں، ان کا رسالہ تحریک آل انڈیا مومن کانفرنس: تاریخ کے آئینے میں گرانقدر تصنیف ہے۔ مولانا کی حیات اور کارنامے پر "بندۂ مومن کا ہاتھ" کے نام سے ایک سوانحی تدوین کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں عاصم بہاری اکادمی، بہار شریف (نالندہ) عاصم بہاری نگر، سوہ سرائے کے اراکین ڈاکٹر احمد سجاد، محمد نسیم اختر، ڈاکٹر ابوالفرح کاظمی اور شاہد نظامی نے اعلان کیا ہے کہ مولانا عاصم بہاری کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے تمام چھپے گوشوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائیگی۔ معاونین میں منشی محمد احسان، بدر الزماں، منشی عبدالغفور، محمد رفیع احمد انصاری، سلام الحق وغیرہ بھی شامل ہیں۔

پروفیسر محمد صدیق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ جنہیں فارسی زبان کی خدمات کے سلسلے میں صدر جمہوریۂ ہند کا اعزاز "جائزہ" ملا ہے برادری کے ممتاز دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں، آپ شاعر بھی ہیں اور مولانا عاصم بہاری کی یاد کر آپ نے جو قطعۂ عقیدت پیش کیا ہے اس کے ہر شعر میں آپ کے خلوص کی نکہت اور محبت کی خوشبو بسی ہوئی ہے:

ایماں کی حرارت ترے کردار نے بخشی — چشموں کی روانی ترے گفتار نے بخشی

بجلی کی تڑپ شوخیٔ اظہار نے بخشی — عرفاں کی حلاوت ترے ایثار نے بخشی

بیگم رفعت نشاط (محلہ عمار پور، بہار شریف، نالندہ) برادری کی تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ ان کے ایک مضمون "در پہ قوم سے ایک ملاقات"[1] سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار کی مومن برادری اپنے رہنماؤں کی کتنی قدرداں ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان رہنماؤں کی خدمات کے اعتراف میں کئی یادگار جلسے اور ادارے قائم ہوئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۸۲ء کو بہار شریف میں عاصم بہاری اکادمی کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کے تحت "یوم عاصم بہاری" کے منائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ شہید عبدالقیوم انصاری اکادمی پٹنہ اور شہید پروفیسر عبدالباری میموریل کمیٹی پٹنہ نے بالترتیب ان شخصیتوں کی برسی منا کر ان رہنماؤں کو خراج تحسین پیش کیا۔ بیگم رفعت نشاط لکھتی ہیں:

> "بلا شبہ مذکورہ بالا تینوں رہنما اپنے اپنے طور پر خلوص اور قربانی کے پیکر رہے۔ ان کی قربانیاں ایسی ہیں جن پر مصلحت وقت کے تحت پردہ ڈالا جاسکتا ہے لیکن انہیں مٹایا نہیں جاسکتا۔ ان کے نقوش، نمٹ بھی اور وہ تاریخ کے باب "اصلاح اور تنظیم" میں اپنا ایک منفرد مقام

---

[1] مجلہ۔ بیاد مولانا عاصم بہاری ص ۱۵۔ مسز رفعت نشاط۔ در پہ قوم سے ایک ملاقات۔

بنا کر رہینگے۔"

ڈاکٹر حسن نشاط انصاری۔ جن پنا (پٹنہ) میں گدھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں لیکچرار ہیں۔ بڑے قابل استاد اور ادیب ہیں۔ مولانا عاصم بہاری کے پوتے نعیم الدین۔ ایم۔ اے بھی لکھتے رہتے ہیں ڈاکٹر سجاد کے صاحبزادے خالد سجاد اور انجینیر طارق سجاد والد کی سنت پر عمل پرا ہیں اور مومن برادری کی تعلیمی ترقی کے امور میں دلچسپی لیتے ہیں۔ شاہد نظامی (عماد پور، بہار شریف، نالندہ) ادیب اور صحافی ہیں۔ آپ ظہیر الدین احسن انصاری نظامی کے چھوٹے لڑکے ہیں۔

بابائے قوم، بانی مومن کانفرنس، جنگ آزادی کے مجاہد علی حسین عاصم بہاری سے موسوم ادارے

- مولانا عاصم بہاری میموریل سوسائٹی اتر پردیش مراد آباد
- عاصم بہاری پبلیکیشنز بورڈ مراد آباد
- عاصم بہاری گرلز جونیر ہائی اسکول، عاصم بہاری بورڈ مراد آباد
- عاصم بہاری لائبریری مراد آباد
- عاصم بہاری گرلز ہائی اسکول امروہہ (یوپی)
- تاج الانصار عاصم بہاری اسکول علی گڑھ
- عاصم بہاری پری پرائمری اسکول، محلہ خاص گنج، بہار شریف، نالندہ
- عاصم بہاری اکادمی۔ بہار شریف۔ نالندہ
- عاصم بہاری نگر۔ سوہ سرائے۔ نالندہ

نواں باب

بنگال کے تانتی بُنکر: مومن - انصاری

عہدِ مغلیہ سے بنگال کی صنعت پارچہ بافی کا جادو فرنگیوں کے سر چڑھ کر بول رہا تھا، انگریزوں کی سیاسی بازیگری نے (۱۱۷۵ھ ۱۷۶۱ء) میں فرانسیسیوں کے تسلط کا طلسم توڑ ڈالا، یونانی، آرمینیائی اور ولندیزی تاجروں کو جب بساطِ سیاست پر مات ہو گئی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مہرے آگے بڑھانے شروع کر دیے، عہدِ مغلیہ کا آفتابِ تسلط دبار و زوال کے اُفق پر ڈوب رہا تھا، اس چھٹ پٹے سے فائدہ اٹھا کر صوبہ دار خودمختاری کی مشعلیں جلا کر اپنے اپنے صوبوں میں جم کر بیٹھ گئے اودھ اور بنگال میں نوابوں کے ٹھاٹھ شروع ہو گئے۔ اٹھارویں صدی کے پُر آشوب زمانے میں وسطی ہند سے کر مرشد آباد تک مرہٹہ برگیوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے مہاجنوں اور صرافوں کے دل دہلنے لگے ۱۷۴۲ء میں مرشد آباد کے جگت سیٹھ کی کوٹھی سے برگیوں نے ۲ کروڑ روپے لوٹ لیے، ادھر ۱۷۴۸ء سے نواب میر علی وردی کے تقاضوں کا دستِ دراز مہاجن اور پونجی پتیوں کی طرف بڑھنے لگا تو وہ لوگ پٹنہ میں اپنی پونجی منتقل کرنے لگے، روپیہ کی گردش ختم ہو گئی تو چرخوں اور چرخوں کی گردش بھی رُکنے لگ گئی۔ بنگال کی صنعت پارچہ بافی کا سارا دارو مدار ایسٹ انڈیا کمپنی کی لگائی ہوئی رقم پر تھا جو ۱۷۵۰ء سے ۱۸۱۳ء تک بڑھتی رہی، نفیس اور اعلیٰ درجے کے پارچوں کی لاگت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے منافع میں کمی ہونے لگی۔ ڈائریکٹروں نے اپنے عہدہ داروں کو حکم دیا کہ سستے داموں کپڑے خریدیں کیونکہ مدراس کے مقابلے میں بنگال کے بُنے ہوئے پارچے درآمد کرنے پر انہیں زیادہ منافع ملتا تھا۔ گورنر جنرل کو ۱۷۵۰ء میں ہدایت دی گئی کہ سوتی پارچوں کی مصنوعات میں رقم زیادہ لگائیں۔ ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمان نے ہندوستان کے کپڑوں کی درآمد پر پابندیاں لگا دی تھیں کمپنی بہادر نے اس پر تشدد سے عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

فرنگیوں نے ہندوستانی بنکروں کی غربت، جہالت اور مالی کمزوریوں کا ہر ممکن طریقے سے فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے استحصال اور استیصال کا نشانہ بنایا تھا، بڑے بڑے شہروں میں مثلاً کلکتہ، مدراس،

سورت اور بمبئی میں کوٹھیاں قائم ہو گئی تھیں اور ان کی نوآبادیاں پانڈیچیری، گوآ، چندر نگر اور دیگر علاقوں میں "ولایتی بستیاں" بن گئی تھیں۔ انہوں نے زمینیں خرید کر اپنے کارخانے قائم کر لیے۔ کمپنی بہادر کو برطانوی حکومت نے تجارت کی اجارہ داری دے دی اور ۱۷۶۵ء میں جب بنگال کی "دیوانی" کی مراعات حاصل ہوئیں تو ان کے سروں میں غلبہ اور اقتدار کا ایسا سودا سمایا کہ دیوانے بن کر بنگال کو لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا اور ظلم و ستم کی ایک طویل خونچکاں داستان شروع ہو گئی۔ بنگال پر خصوصاً ان کی مشق ستم زیادہ ہی رہی۔

کمپنی نے بنگال کے کارخانوں (آڑنگوں) پر قبضہ جما لیا، کارخانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور ۱۷۵۴ء سے کمپنی نے بنکروں کے ساتھ نئی شرائط رکھ کر معاہدہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک بڑی سی عمارت میں "آڑنگوں" سے متعلق، بہترین بافندگی مزدوروں کا انتخاب کرتے، کام کی نوعیت بتانے کے ساتھ ان سوت کی انٹیاں، تانی، آنٹے، ان کے حوالے کر دیے جاتے۔ مقیم (متعادم) دن بھر رکھوالی کرتا اور داروغہ کارخانے کی نگرانی کرتا تھا۔ وقت پر کام ختم نہ کرنے پر انہیں جرمانے اور سزائیں دی جاتی تھیں۔ وہ خود اپنے گھریلو کرگھے پر باقی اوقات میں کچھ بن کر "ہاٹ" میں بیچ بھی نہیں سکتے تھے جیسا کہ ان کا پہلا دستور تھا۔ اس اجارہ داری سے پہلے بھی انگریز، ولندیزی اور فرانسیسیوں کے مسلم تاجر (بنیے) اور ہندو گماشتے جولاہوں کو پیشگی رقم جسے بنگال میں "دادنی" کہتے تھے دے کر ان پر قرض کا بوجھ لاد دیتے اور ہاتھ باندھ دیتے۔ دلال بیعانہ دلانے کا انتظام کرتے اور بنکروں سے کمیشن کے طور پر رقم کاٹ لیتے۔ مگر ۱۷۵۳ء کے بعد کمپنی نے دلالوں کی جگہ گماشتے مقرر کرنا شروع کر دیے۔ بنکروں پر اور بھی پابندیاں تھیں۔[1]

معاہدہ کی پابندیوں نے غریب بنکروں کو جکڑ رکھا تھا۔ انہیں ایک جگہ جمع کر کے سخت پہرہ لگا دیتے اور زبردستی اپنے حسب دلخواہ معاہدے پر دستخط کرواتے۔ اس معاہدے کے پابند بافندوں کی تعداد صرف ایک کارخانے میں پندرہ سو تھی۔[2] چرخہ چلانے والی کتنیوں، ندفوں (دھنیوں)، رنگریزوں،

---

[1] Hameeda Hussain, The Company Weavers of Bengal, Oxford Univ. Press, Delhi, 1988.

ڈاکٹر حمیدہ حسین نے مختلف ابواب میں بنگال کی صنعت اور فیکٹری کے استحصال کے بارے میں پوری کتاب لکھی ہے۔

[2] ۱۸۱۲ء تا ۱۸۱۳ء میں صرف بیجاپور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے پچیس ہزار بنکر ملازم رکھ چھوڑے تھے۔

بوٹے داروں، کشیدہ کاروں وغیرہ مرد عورتوں کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔ ۱۷ مارچ ۱۷۶۵ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے عام ہدایات اپنے عہدہ داروں کو دی تھیں وہ تمام تر اذیت رسانی کے بارے میں تھیں، معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والے جولاہے کو ٹکٹکی سے باندھ کر کوڑے مارے جاتے، ان کی انگلیوں کو نت نئی ایذا دیتے، انگوٹھے کاٹ ڈالتے، ہر قسم کا بہیمانہ سلوک ان کے ساتھ روا رکھا گیا، ایک سے زیادہ کرگھا کوئی جولاہا نہیں رکھ سکتا تھا اگر پتہ چل جاتا تو تاوان دینا پڑتا، جو بُنکر کمپنی بہادر کے لئے یا کسی دوسری فرنگی تجارتی کارخانے کے لئے گھر کی کھڈی پر کام کرتا تو کمپنی کا ایک ملازم لاٹھی لے کر شام تک بیٹھا نگرانی کرتا رہتا تھا، شام کو بُنکر دستکار کو اس ملازم کو "طلبانہ" کے طور پر کچھ رقم دینا پڑتی تھی جس دن "طلبانہ" کی ایک کوڑی بھی نہ ملتی اس دن انہیں ملازم کے کوڑے ملتے، غیر ملکی دستکار یہاں کے کاریگروں سے یہ فن سیکھ کر اس صنعت کو اور ٹھیس پہنچانے لگے تھے۔[1] ایسے تمام بنکروں پر جو کمپنی کے معاہدے کی خلاف ورزی میں کوئی "جرم" کرتے ان پر صدر عدالت دیوانی پر مقدمہ چلتا اور سزائیں ہوتیں اور جرمانے عائد کیے جاتے، فوجی دستے بھیج کر ظالم کمپنی ان کے کرگھوں کو جلا کر خاکستر کروا دیتی، گھر جھلس دیے جاتے اور ان کی ملی اور معاشی تار و پود کو نوچ نوچ کر پھینک دیا جاتا۔ اور خلیج بنگال میں غرق کروا دیا جاتا۔ ۱۷۷۵ء میں کمپنی نے ہر کارخانے میں ایک نائب مقرر کر دیا تھا جو جھگڑے مٹانے کا کام کرتا، کیونکہ قانونی طور پر کوئی عدالت کسی بُنکر کا استغاثہ نہیں سن سکتی تھی، کمپنی کے عہدہ داران ۱۷۸۲ء کے ضابطے کی رو سے ان کے گھروں میں داخل ہو کر جو چاہے وہ سزا دے سکتے تھے ان تمام غیر انسانی کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بُنکر طبقہ ظلم و استبداد کے شکنجوں میں کسا ہوا رہ گیا اور ان کے رگوں سے ما رستے، رشتۂ نفس ٹوٹ گئے۔ اس نے سانس لینا بند کر دیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی سامراجیوں کا یہ سوچا سمجھا منصوبہ تھا، دستکار اور ہنرمند طبقہ جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی ملک کی اقتصادی خوشحالی کا ضامن تھا، انگریز کمپنی کا مقصد تجارت ہی نہیں معاشی استحصال اور بنکروں کا استیصال تھا کیونکہ انہیں خود اپنی ملوں میں تیار شدہ کپڑوں کی کھپت کے لئے بازار کی تلاش تھی اور ہندوستان سے بڑی منڈی اور کہیں ان کے زیر حکومت نہ تھی جہاں خود کمپنی کی حکومت تھی اور روسن بُنکر سب سے زیادہ مظلوم اور محکوم تھے، ۱۷۹۴ء میں ۱۵۶

---

[1] محمد رشید عمدی "ہندوستان میں کپڑا بننے کی صنعت"، کانگریس صد سالہ جشن ۱۸۸۵ء ــــ ص ۴۶ - ۴۹

پونڈ کی مالیت کا کپڑا ولایت سے ہندوستان کو بر آمد کیا گیا اور دو دہائیوں کے بعد ۱۸۱۳ء کے لگ بھگ ۲۷۸۵۶ (ستائیس ہزار آٹھ سو چھپن) پونڈ مالیت کا کپڑا انگلستان سے ہندوستان میں آیا یعنی انگلستان جو پہلے ہندوستان کے چیتھڑے بھی خرید کر اپنا ستر ڈھانپتا تھا اب ان کے چیتھڑے اڑا کر ننگا کر رہا تھا اور خود بربریت کا ننگا ناچ دکھا رہا تھا۔

سوتی پارچے جو کمپنی کے لیے بنائے جاتے تھے ان کی قسمیں سَو کے قریب تھیں، ان کے آرنگوں (کارخانوں) میں جو نفیس اعلیٰ قسم کا میرانہ اور شاہانہ ململ تیار کیا جاتا تھا اس میں تار کی تعداد اور سوت کا "کاؤنٹ" نو سَو سے دو ہزار ایک سَو تک استعمال ہوتا تھا، ڈھاکہ میں بوٹا دار ململ جس پر گل بل کاڑھے جاتے تھے اور جسے وسطی ایشیا میں مشجر اور منقش کہتے تھے اس کے تانے بانے میں ریشم اور ٹسر کا مرکب تاگا استعمال کیا جاتا تھا چکن پر بھی گلداری کی جاتی تھی، کشیدہ کاری کرنے والی مسلم عورتیں تھیں انہیں مالدہ اور سنار گاؤں میں 'بوٹا دار' کہا جاتا تھا دیناج پور میں بوٹا دار عورتیں معاہدے کے تحت کارِ صنعت کا کام کرتی تھیں۔ [۱]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے آرنگ (جنہیں کلکتہ اور اطراف میں "پٹنی گھریا" "جمگلہ" کہتے تھے خاص طور سے سنار گاؤں، ڈھاکہ اور مرشد آباد کی نوابی ریاستوں میں اور ڈھیمری، چاندپور، تیا بٹن، جنگل بڑی، باجت پور اور سری رامپور میں قائم تھے ان میں تیار کیے گئے پارچوں کے مختلف نام تھے چکن، ڈوریا، جامدانی اور تنزیب خاص قسم کے پارچے تھے جن کی بڑی شہرت تھی دیگر نام کے پارچے یہ تھے: ریگ، السّد بگی، بافتہ، سربند، رومالی، بدن خاص، ڈوریہ شیدہ، شربتی، جامدانی شبنم، آبِ رواں وغیرہ، ڈوریہ کی ایک نفیس نوع کو "ڈوریا کاغذی" کہا جاتا تھا جس میں "پیکرِ تصویر" بھی "کاغذی پیرہن" پہن کر عریاں نظر آتا تھا: شاید یہی پارچہ تھا جسے سات تہہ کر کے زیبِ تن کرنے کے بعد بھی اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی جو شاعرہ تھی اور مخفی تخلص کیا کرتی تھی یعنی زیب النساء مخفی — وہ بھی مخفی نہ رہ سکی، امراء کی بیگمات کے لیے خود کے آرنگوں میں "ملبوس خاص تیار کیا جاتا تھا" [۲]

نورباقوں کو بنگال اور آسام میں 'تانتی' کہتے تھے، مسلم نبکر جو سوتی پارچہ بُنتے تھے اسی لقب

---

[۱] حمیدہ حسین۔ ص ۴۷۔ ۴۸

[۲] ایضاً۔ ۴۹

سے پکارے جاتے تھے لیکن جامدانی بُننے والے کو 'جامدانی تانتی' کے لقب سے مختص کیا گیا تھا، غالباً یہی وہ جماعت تھی جو ابوایوب انصاری کے نسب سے یونس انصاری اور زکریا انصاری اولین مہاجرین کی اولاد میں سے تھی، اکبر بادشاہ کے عہد میں دہلی، آگرہ اور پنجاب سے انہیں سے نسبت رکھنے والے انصاری مہاجرین صنعت کے دورِ عروج میں بنگال بھر میں پھیل گئے تھے، حسین شاہی دور (۱۴۹۳ء تا ۱۵۳۸ء) میں بنگال میں مبلغینِ اسلام کی کوششوں سے نچلی ذات کے پسماندہ اور مظلوم جُلاہے، جنہیں جُگی کہتے تھے مسلمان ہو گئے تھے انہیں عام طور پر تہ باہی کہا جاتا تھا۔[1] بُنکر طبقہ پر نہ صرف انگریزوں کے ظلم و استبداد کے کوڑے اور تلواریں چلتی تھیں بلکہ مقامی جوت داروں (زمینداروں) کے استیصال کا ہل بھی چلتا تھا۔ انصار جو عموماً عرب نژاد تھے مقامی نسلی و سماجی اختلاط کے سبب آہستہ آہستہ اپنی شناخت بھول گئے، صرف ۔۔زروں کے دھندلکوں میں بستے تھے، اسی لیے 'انصاری کی عزت بھی" جلاہا" کے تضحیک آمیز اور تحقیر انگیز خطاب میں معدوم ہو گئی۔

اپنی شناخت اور نسب کے انصاری بنگال میں بسلسلۂ معاش آئے تھے ان علاقوں کی وسعتوں میں آسام اور برما تک گم گئے، مقامی زبانوں نے انہیں مقامی عرفیت دے دی "تانتی" جو جامدانی تانتی ہے اور جلاہا خاص طور سے نومسلم تانتی کے لیے وقف ہو گیا۔

جامدانی تانتی بُنکروں کی عورتیں بھی کشیدہ کاری اور زردوزی کے فن میں بڑی ماہر تھیں، چکن اور ململ کے پارچے ان کی چابکدست انگلیوں سے کاڑھی ہوئی گلکاری اور بیل بوٹے کی رنگینی سے "انگشتِ نگاہ" بن جاتے تھے، انہیں استانی کہتے تھے اور ان کے مرد استاگر (استاد) کہلاتے تھے ۔۔ مگر یہ خاص رفوگری کے ماہرین کے لیے مقبول تھا، ڈھاکہ کے استاد رفوگر اپنے فن رفوگری میں وہ کمال دکھا گئے ہیں کہ عرفی شیرازی اگر دیکھ پاتا تو یہ شعر انہیں کی شان میں کہتا کہ کس حد تک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑتے ہیں، اتنی مہارت سے جوڑے جاتے ہیں کہ تو خود نہیں پہچان سکتا کہ تیرا دل کہاں سے ٹوٹا تھا:

دل شکستہ دراں کوی می کنند درست
چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

---

[1] Arnold, T. W., 'The Preaching of Islam' London 1913 P 288

یہ رفوگر اپنے فن کا ایسا "تقیہ" کرتے تھے کہ راز ہائے سربستہ اپنی بیٹیوں کو بھی بتانے سے
حذر کرتے مبادا کہ ان کی اولاد نہ سیکھ جائے یہ خاندانی ورثہ کے تحفظ کی خاطر تھا۔

ڈھاکہ، مرشد آباد، جمال پور، کلکتہ اور آسام کے شہروں میں انصاریوں کی بڑی تعداد آباد تھی
لیکن ان کی "عرفیت عام" جولاہا" تھی اسی لیے تاریخ کے دھندلکوں میں سے ان کی شناخت
اور نسلی خدوخال کو اجاگر کرنا مشکل ہے۔ جمعیۃ المومنین، جمعیۃ الانصار اور بعد میں مومن کانفرنس
کی بنیادوں نے ان کی "اصل" اور "جڑ" پر سے ملبہ ہٹایا، قرآن میں خود شناسی کے انکھوے پھوٹے۔
ڈھاکہ میں جو شیعہ نواب کی ریاست تھی، انصاریوں کا جاہل طبقہ ان کے زیر اثر رہ کر تعزیہ داری
اور بدعتی رسومات میں ملوث تھا، شہر ڈھاکہ اور اس کے مضافات میں انصاری خاندان پارچہ
بافی کے آبائی پیشے پر قائم تھے، ان میں دیندار بھی تھے اور عالم دین بھی، انیسویں صدی کے دوسرے
نصف سے یہاں اور شہروں کی طرح عام مسلمانوں کی جو انجمنیں قائم ہوئی تھیں، ان کے زیر اہتمام
دینی مدرسے چلنے لگے تھے جو فیض عام تھا، مولوی امیر حسن مدرسہ حمادیہ قوم کے بڑے ہمدرد تھے،
جمال پور، اس کے مضافات، قصبات اور دیہاتوں میں مومن - انصار "تانتی" تانا بانا توڑ کر محکمہ
جات ریلوے اور تار ٹیلیگراف سے رشتہ ناتہ جوڑ لیا تاکہ کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا کہ "جولاہے" کے
ذلت سے بچ کر "تار بابو" اور "ریلوائی بابو" کہنے لگے، کچھ ذی علم خاندان کے افراد دہلی، سہارنپور،
رامپور اور دیوبند کے دینی مراکز میں تحصیل علم کے لیے جانے لگے تھے، جب وہابی تحریک بنگال میں
پھیلی اور طریقہ محمدیہ نے جو سید احمد شہید (م ۱۸۳۱ء) کی "غیر تقلیدی جہاد" اور توحید پرستی
کی تبلیغی تحریک تھی تمام جولاہوں کو اس طریقہ پر ڈال دیا، لیکن وہابی تحریک نے تذبذب پیدا کر دیا ۱۸۹۰ء
کے بعد سے بحث، مواعظ اور مناظروں کی بھر مار نے رفع الیدینی، فرائضی، تعینی اور اہل حدیث
متبعین کو چار خانوں میں بانٹ دیا تھا، فرائضی حاجی شریعت اللہ کے پیروکار تھے، تعینی، مولانا
کرامت علی جونپوری کے مرید تھے، رفع یدینی اور اہل حدیث اصل وہابی مسلک کے سالکین تھے،
جولاہے (تانتی) اور دوسرے نچلے درجہ کے مسلمان بنگالی جو عام طور پر عرفی شرفاء یا اشراف کی
نظروں میں (کلو (دیبی) عصار) تھے حاجی شریعت اللہ کے وفادار پیرو رہتے تھے اسی لیے حاجی صاحب
کی تذلیل کرنے کے لیے اغیار اور مخالفین انہیں "جولاہوں کا پیر" کہتے تھے [1] جمالپور ان مجموعوں

---

[1] Rafiuddin Ahmed 'The Bengal Muslims'
Delhi, 1988. P. 46

اور مناظروں کا سب سے 'حساس' علاقہ تھا۔[1]

مرشد آباد کی نوابی ریاست کو کبھی صوبۂ بنگال کا دار الخلافہ ہونے کا شرف حاصل تھا، یہاں کا نواب حکمراں شیعہ تھا، اسی کے زیر اثر بہت سارے انصاری آباء و اجداد کے مسلک اور سنت رسول کی اتباع سے منہ موڑ کر عزاداروں کے سینوں سے لگ گئے اور سینہ کوبی کرنے لگے، لیکن جب سید احمد شہید کے 'طریقۂ محمدی' نے سیدھا راستہ دکھایا تو ایک طبقہ انتہائی حنفیت سے ہٹ کر دوسرے انتہائی مسلک سے منسلک ہو گیا یعنی اہلحدیث بن گیا۔ قَالَ اللہ اور قَالَ رَسُول کی بلند آوازوں میں "یا حسین ہم نہ تھے" کا ہنگامی شور ڈوب گیا۔

انصاریان مرشد آباد، بردوان، ہگلی، مالدہ، راجشاہی اور بوگرا کے شہر و اضلاع میں کلکتہ اور ڈھاکہ سے ہجرت کر کے آباد ہوئے تھے ان علاقوں میں ائمہ کرام اور اشراف خاندانوں کو بطور "مدد معاش" سلاطین نے بڑی بڑی جاگیریں عطا کی تھیں، زراعت عام پیشہ تھا اور جو نچلے درجہ کے پیشہ ور یہاں آ کر آباد ہوئے ان میں اجڑے ہوئے بنکر بھی تھے، تاریخ بنگال کے مورخ ڈاکٹر فضل ربی نے ان تمام اضلاع کا جائزہ لینے کے بعد 'انتقال مکانی' کی وجہ یہی بتائی۔

انصاری بنکر مرشد آباد کے آڑنگوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے پارچہ بافی میں اپنی صناعیوں کے کمالات دکھا رہے تھے، مرشد آباد کا ریشم بھی بہت مشہور تھا اور تمام ریشم بافوں میں انصاری نوربافوں کا مرتبہ اور درجہ کافی اونچا تھا، ان میں پنچایت کا رواج تھا لیکن متعدد کوئی پہنچا ہوا فقیر سربراہی کرتا تھا اور اس کا اتنا اثر غالب تھا کہ تمام معاملات کی باگ ڈور اسی کے ہاتھوں میں تھی وہی شادی اور بیاہ کی رسومات ادا کرتا تھا، وہابی تحریک اور اس سے وابستہ رفع یدینی اور اہلحدیث کی تحریکوں نے 'جلاہوں' کو دینی جذبہ سے سرشار کر دیا تھا، انیسویں صدی کے اواخر (۱۸۷۹ء) سے 'بحث اور مناظرہ' کی جو روایت قائم ہوئی اس میں مرشد آباد کے حنفی اور اہلحدیث (رفع یدینی) کے تاریخی معرکے مرشد آباد میں ہی زیادہ ہوتے رہے۔ مداری پور اور دوسرے شہروں کے دیہاتوں میں یہ مناظرے اجتماعی تقریب کی صورت اختیار کر چکے تھے اور گویا ایک میلہ لگتا تھا جس میں طرفین کے دور دیہ

---

[1] رفیع الدین احمد (انگریزی) 'بنگال کے مسلمان' ۸

بازار لگتے تھے پکوان بنائے جاتے اور دکانیں چمکنے لگتیں، خیمے میں سُرمہ، عطر، گلاب اور پانی
کی گگریاں سجا کر رکھی جاتیں اور "مولوی حضرات" کی خوب آؤ بھگت ہوتی، مُلّا کی مرغی حلال بن
جاتی اور پھر بحث، زوردار بحث بن جاتی، پھر کٹ بحثی ہوتی جو ایک پارٹی کے لیے بے بسی اور
دوسری کے لیے ہنسی کا باعث بن جاتی اور ارباب حل و عقد کے لیے نقضِ امن کا خطرہ بن جاتا۔
جب ۱۸۸۱ء میں مردم شماری ہوئی تو مرشد آباد کے "مجاہدین" نے "سُنّی" لکھوا کر تہمتوں سے
دامن بچا لیا۔[1]

بنگلہ میں بھی تشیع کا زور تھا، اور بڑے دھوم سے عزا کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ انصار حضرات
اتنے کٹر سُنّی نہ تھے کہ تبع رسول کا پاس رکھتے مذہب سے بیگانہ تو پہلے ہی سے تھے اور معاشرتی
طور پر پسماندہ تھے چند لوگ تھے جن سے برادری کا بھرم رہتی تھا مثلاً الٰہی بخش سردار (جھیوا لنگان)،
ہدایت اللہ سردار اور اظہر حسین میونسپل کمشنر۔

بردوان اور ٹیٹا گڑھ میں ڈھاکہ اور کلکتہ سے ہجرت کر کے نوربافت بند ہو گئے تھے۔ ٹیٹا گڑھ کا
کاغذ بیحد مشہور تھا یہ لوگ زیادہ تر کاغذ کے کارخانوں میں کام کرتے تھے، جہالت عام تھی کاغذ بناتے
تھے لیکن کاغذ پر لکھی ہوئی مذہبی تحریریں نہیں پڑھ سکتے تھے بلکہ مذہب سے بیگانگی نے، ہندو مذہب
اور معاشرہ کا رسم و رواج میں جگہ لے لیا تھا، بافندگی کا پیشہ کچھ خاندانوں میں بطور روزگار قائم تھا۔ بردوان
میں ۱۸۸۵ء میں ایک انجمن کی طرف سے مدرسہ کھولا گیا اور طریقۂ محمدی کی بنیاد پڑنے پر لوگوں میں
خصوصاً مسلم بنکر طبقہ میں مذہب کے پرستار پیدا ہو گئے۔

چندن نگر کے انصاریوں میں دین کی لگن موجود تھی صاحب استطاعت تفصیل مدرسے بزرگ
مراکز علمی میں کچھ برس تک آتے تھے، پیشۂ آبائی کی کچھ یادگاریں رہ گئی تھیں وہ بھی نزدیکی علاقوں میں۔
جلپائی گوڑی اور سلی گوڑی کے انصاری حضرات چائے کے باغات میں کام کرتے تھے، دینی
تعلیم سے نابلد اور مذہب سے یکسر بیگانہ تھے، ملازم تھے اسی لئے ناداری اور مفلسی کی زندگی
بتاتے تھے، دیناج پور میں انصاری بنکر کثیر تعداد میں تھے اور یہ چوپائی کرتے تھے یہاں کرگھے وہ
اس کے اوزار لکڑیوں وغیرہ نہایت عمدہ لکڑی سے بنے ہوتے تھے۔

---

[1] رفیع الدین احمد، بنگال کے مسلمان۔ (انگریزی) ص ۷۹-۸۱
[2] ایضاً ص ۴۸

چٹاگانگ کے گرد و نواح میں دیہاتی جنکر بافندگی کرتے تھے، ان میں دین کا شغف تھا اور طالبان
علم دینی و علمی مراکز سے استفادہ کرتے تھے اور فیض علوم حاصل کرتے تھے، خوشحالی بھی تھی اور دینی
جوش نے مسجدوں کو آباد کر رکھا تھا اور شریعت محمدیؐ کو زندہ، لیکن دیہاتوں میں نوربافوں کی
حالت دگرگوں تھی، انجمن کا قیام ۱۸۹۰ء میں عمل میں آیا اور اسی کے تحت دینی تعلیم کے لئے
مدرسے قائم کئے گئے۔

گوہاٹی جسے کامروپ دیس کہتے تھے آسام کا مشہور شہر تھا، مضافات کے دیہاتوں میں مثلاً نجوبری
اور بستا میں اور ضلع نوگاؤں کے قصبات میں بیسویں صدی کے پہلے دہائی میں پچیس ۲۵ تا تیس ۳۰ ہزار شیخ
انصار بستے تھے، آسام کا اصلی ریشم (سِلک) شہرۂ آفاق تھا، یہ درختوں کے ریشم کے کیڑوں سے
بنایا جاتا تھا، ان کے نام تھے ایڑیا اور مونگا۔ ان ریشم کے کیڑوں کو ان درختوں سے حاصل
کر کے پرورش کرتے پھر ریشم حاصل کر کے کتائی اور بنائی کر کے اصلی ریشم کے پارچے بُنے جاتے
جیسے ریشمی چادریں، پلنگ پوش اور دیگر ملبوسات برطانوی
حکومت ان ریشمی کیڑوں اور ریشم کے لچھوں کو اعلیٰ پیمانے پر خرید کر انگلستان بھیجتی تھی تاکہ وہاں
کے کارخانوں میں وہ مصنوعات میں استعمال کریں۔ ریشم کی بافندگی گوہاٹی میں بڑے عروج پر
تھی، کچھ انصار تاجر اور صنعتکار خوشحال تھے اور کچھ رئیس التجار اور ہندوستان کے صنعتی مراکز
سے کاروبار کرتے تھے ضلع ناگاؤں کے قرب و جوار میں نورباف بڑی تعداد میں آباد تھے لیکن بہت
سارے انگریزوں کے چائے کے باغات میں ملازم تھے، دین سے بالکل بیگانہ مذہب سے نابلد
بس نام کے مسلمان تھے نہ کوئی لقب تھا نہ عرفیت۔

شیلانگ۔ آسام کا دارالخلافہ تھا یہاں بھی گوہاٹی کی طرح ایڑیا اور مونگا ریشم کے کیڑوں کے قدرتی
درخت تھے، شیخ انصار ڈھاکہ اور کلکتہ سے تلاش معاش میں جوق در جوق شہروں میں بس گئے
یہاں بھی اگر ریشم کے تاجر اور بافندے بن گئے، دنیاوی دولت بھی کمائی اور دین کی دولت سے
بھی دینداری پائی۔

جہاں پورنی نے نفری کوٹے اور ہٹی کے تیل کے کاروبار میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔

بنگال میں اشاعت دین کا سہرا صوفیائے کرام کے علاوہ شاہ ولی اللہ کی تحریکات کے بانیان اور
مبلغین کے سر ہے۔ فرائضی تحریک کا زور زراعت پیشہ دیہی عوام میں اور دستکار طبقہ میں تھا، سماجی
اور تعلیمی نصب العین نے فرائضیوں کو جاگیرداروں کے خلاف منظم کر دیا جب کہ طریقۂ محمدی کی تحریک

بھی مذہبی نصب العین تک پہنچنے کے لیے طبقاتی کشمکش اور جد و جہد سے نبرد آزما تھی۔ ان سے الگ تھلگ مگر بدعت کے خلاف، مشرکانہ رسوم اور پیری مریدی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ایک نئی تحریک کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں یہ 'برگ و بارِ شجر' پروان چڑھنے کے بعد مومن کانفرنس کی عہد آفریں بہار بن گیا۔

بنگال کا ململی طلسم

امیر خسرو دہلوی (سنہ ۶۵۱-۷۲۵ھ / سنہ ۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) نے اپنی مثنویوں یعنی قرانُ السعدین اور نُہ سپہر میں ہندستان کے اوصاف اور لوگوں کے کمالات اور جغرافیائی خصوصیات کے بیان میں پارچہ جات کے اقسام گنوایا ہے، اور ان کی بناوٹ، نفاست اور صفائی کی تعریفیں کرتا ہے۔ ہر دور کے غیر ملکی سیاحوں نے مثلاً سلیمان تاجر سیرافی، ابوالفدا، ابن بطوطہ اور فرنگی سیاح جیسے ٹریورنیئر، برنیئر، مارکوپولو، منوچی نے دستکاروں کی صفائی، ہنرمندی اور صنعتی کمالات کا ذکر حیرت کے قلم سے کیا ہے۔

ڈھاکہ کا ململ ایک کرشمہ بن گیا تھا اور اس کے ماہرینِ فن 'شبنم بافت' ململ کے بہترین صنّاعی کا کمال دکھا رہے تھے اور ہر نگاہ میں ایک طلسم کار فن تھا، کوئی اس کی نفاست اور پاکیزگی دیکھ کر اسے پریوں کے ہاتھوں کا بُنا ہوا طلسمی کپڑا کہتا تھا اور کوئی عجوبۂ روزگار۔ شہزادیاں، امرا کی بیگمات، رانیاں اور طبقۂ اعلیٰ کی خواتین اور توانگروں کی مستورات ڈھاکہ کی ململ پہن کر فسانوی کردار بن گئیں، نفاست کا یہ عالم اور لطافت کا یہ کمال تھا کہ سات تہہ کرکے پہننے کے بعد بھی شہزادی زیب النسا، مخفی ململ کی "تصویری پردے" سے بھی عریاں تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر جیسے دیندار کی سرزنش پر مخفی نے اختفائے راز کیا کہ 'بابا جان یہ سات تہوں کی بنی ہوئی انگرکھی ہے'

ململ کے تھان کا وزن اس کی لطافت کے سبب اتنا ہلکا ہوتا تھا کہ دس گز تھان کا وزن اس زمانے کے پانچ روپوں کے سکے کے برابر ہوتا تھا[1]۔ خاص قسم کے ململ کے ایک تھان کی لمبائی دس گز اور چوڑائی ایک گز ہوتی تھی، اور یہ انگوٹھی کے سوراخ سے بآسانی نکالا جا سکتا تھا جس کا وزن تین اونس یعنی چودہ گرام ہوتا تھا[2]۔ اس طرح کی ململ کے تانے میں تقریباً ۱۹۰۰ تار ہوتے تھے

[1] انصاری دنیا۔ مراد آباد – ۱۶ ار فروری ۱۹۶۰۔ ہفت روزہ 'مومن گزٹ' کانپور ۱۶ ار جنوری ۱۹۲۶ء۔ [2] ہندستان میں کپڑا بننے کی صنعت، عبد الرشید انصاری، "کانگریس صد سالہ جشن زیر اہتمام آل انڈیا مومن کانفرنس نئی دلی، ۲-۳ دسمبر ۱۹۸۵ء"

دوسری قسم کی ململ کی لطافت نے اُسے "آردیکھا" کا نام دے دیا تھا، 'شبنم' نام کی ململ کا یہ کرشمہ تھا کہ شبنم آلود گھاس پر بچھادی جاتی تو نظر غائر کے سوا سبزہ بھی برہنہ نظر آتا۔ شبنم اور ہوائی ململوں کے علاوہ مرشدآباد اور ڈھاکے کی ایک نفیس ململ 'آبِ رواں' کا نام زبانوں پر جاری تھا، اسے 'ہوا تھان' بھی کہتے تھے۔ ان دونوں شہروں کے کاریگروں کی صناعی اور کمال کی انتہا ململ اور تنزیب کی بناوٹ پر ختم تھی، جسے دیکھ کر لوگ انگشتِ بدنداں رہ جاتے، اور زبان سے نکل جاتا: 'طفلہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے'؟ گائے تو کاغذ کھا جاتی ہے 'گاؤ خوردی' سے ململ بھی نہ بچی' ایک تھان گھاس پر پھیلائی گئی تھی گائے سبزہ سمجھ کر چر گئی[1]

سورت میں نفیس چھینٹ بنائی جاتی تھی، وہاں کا ململ اتنا نفیس اور لطیف ہوتا تھا کہ ہاتھ سے چھو کر بھی محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا گویا قوتِ فن نے قوتِ لامسہ کو بے حس کر دیا تھا، تیس گز کا عمامہ سر پر ایسا سبک سر لگتا تھا کہ گویا سر کھلا ہے۔

ململ کے خاص تھان بُننے کے لیے، چار سے چھ بُنکر درکار تھے، تین بُنکر مل کر بُنتے تھے، بنگال کے کاریگر اس کی بناوٹ میں اسی خطے میں اُگنے والی کپاس استعمال کرتے تھے، سورج نکلنے سے پہلے پانی سے بھرے ہوئے ایک چوڑے طشت میں اسے پھیلا کر نمی پہنچائی جاتی تھی، اسے نم آلود رکھ کر جوڑنے اور سکھانے میں اٹھارہ دن لگتے تھے۔ دو بجر دس سے ۳۰ دنوں تک تانی بنتے تھے۔

ململ کے تھان کا ہدیہ بڑی امتیازی حیثیت کا حامل تھا۔ شاہ صفی صفوی والیٔ ایران کو جب اس کے سفیر نے ہندستان سے شتر مرغ کے بیضے کے برابر ایک ڈبیہ ہدیہ میں دی تو اس میں ایک ململ کا تھان ساٹھ ہاتھ لمبا بند تھا، اور اتنا مہین ململ تھا کہ ہاتھ پر رکھ کر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جہانگیر شاہ کو ایک گوطقی پیش کی گئی نگینہ کی جگہ ایک مکمل تھان "جڑا" ہوا تھا۔ چالیس قسم کے ململ اس زمانے میں بُنے جاتے تھے یوروپ اور چین تک اس کا شہرہ پھیلا ہوا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری اور تجارت و صنعت پر تسلط کے بعد نوابانِ بنگال کے کارخانوں سے ململ کے رنگتوں کا شور بند ہو گیا، کاریگروں کے ہاتھ قلم ہوئے اور تاریخ نے اس صنعت اور اس کے کمالات کے بارے میں تسلسل چھوڑنا بند کر دیا۔

---

[1] انصاری، نیا مراد آباد ۷ فروری ۱۹۷۰ء۔ ہفت روزہ 'مومن گزٹ' کانپور ۱۶ جنوری ۱۹۲۶ء

کلکتہ کے انصاریوں کے حالات

ڈھاکہ میں حضرات شیخ انصار مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے عہد میں آکر بسنے لگے تھے آگرہ اور دہلی کے خاندان اپنا نسبی سلسلہ یونس انصاری سے اور جو پنجاب سے آئے تھے وہ زکریا انصاری سے بتلاتے تھے۔ جو بزمرۂ مجاہدین بوقت فتح بنگال آکر آباد ہوئے تھے انہیں کی اولاد کلکتہ شہر کی ترقی کے زمانے میں جاکر بس گئی تھی، اسی زمانے سے تقریباً دو سو برس تک یہاں ہندوستان کے ہر گوشے سے مومن۔ انصاری خاندان آکر بسنے لگے تھے، بمبئی، مدراس، امرتسر، لاہور، ملتان، سیالکوٹ، لودھیانہ، آگرہ، دہلی، لکھنؤ، الہ آباد، کانپور، مرادآباد، رائے بریلی، اعظم گڈھ، بنارس، دانا پور، پٹنہ، بھاگلپور، چھپرہ، گیا، آرہ، دربھنگہ اور ڈھاکہ وغیرہ سے وقتاً فوقتاً بذریعہ تجارت یا بسلسلہ ملازمت ان کی آمد و رفت اور نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہا، کچھ انصاری عرب سے بھی آکر آباد ہو گئے تھے، کلکتہ میں آج ستر برس پہلے حضرات انصاری اس کثرت سے آباد تھے کہ شمار مشکل تھا، تعدادی حیثیت سے تمام بنگال میں برادری لگ بھگ ایک کروڑ کی تعداد میں تھی (سنہ ۹۲۰ء) کلکتہ کے مختلف محلوں اور سوادِ شہر میں خصوصاً شیب پور، ہوڑہ، عالم گنج وغیرہ کے تیلی گھروں یعنی چٹکلوں (کپڑے کے کارخانوں) میں مومن جنکر لاکھوں کی تعداد میں ملازم تھے، خضر پور، تانتی بگان، تانتی باغ، کڑاہا، بالی گنج وغیرہ تو انہی حضرات سے آباد تھا، کورڑ، چینا پاڑہ، برنبا ڑی لین اور بچھو بازار کے انصاری تجارت پیشہ تھے۔ الغرض کلکتہ کا کوئی محلہ، کوئی گلی اور کوئی کوچہ ان سے خالی نہیں تھا، ٹٹیا گڈھ، اکبر پور اور دیگر صنعتی شہروں کے انصاری تاجروں کی یہاں بڑی بڑی گدیاں قائم تھیں۔

یہاں کے تعلیم یافتہ انصاری معاشرتی اور تمدنی طور پر بڑے مہذب اور اس کے ساتھ ہی دیندار تھے، مسجدیں آباد تھیں اور انگریزی تعلیم کے مدارس اور کالجوں میں مومن طلب بڑی کثرت سے داخلہ لیتے تھے، مغربی تہذیب و تربیت کا ان پر بڑا غلبہ تھا، برادری کی تنظیم کی پہلی بنیاد اسی شہر میں پڑی تھی، حضرات انصار کے ہمدردان قوم نے تانتی بگان میں آل انڈیا مومن کانفرنس کی تنظیم کی تھی، یہیں سے "مومن" نام کا رسالہ مولانا محمد یحیٰی بہاری کے زیر ادارت نکلتا تھا، اس رسالے کے اجراء سے برادری میں بڑی بیداری پھیل گئی تھی، دشمنِ قوم اور عربی شرفاء کو جو برادری کو حقارت سے دیکھتے تھے دندان شکن جواب دیے گئے، مولانا علی حسین عاصم بہاری اس جماعتی تنظیم کے روحِ رواں تھے، انہوں نے بہار شریف اپنے وطن سے الاکرام نامی رسالہ

بھی جاری کیا تھا۔

ایم سلیمان (ایم ایل سی)، وزیر علی چودھری (صدر جمعیۃ المومنین) نورالدین احمد وکیل، مستری عبدالحق، علی بلند اختر، الحاج شمس الدین عبدالغفور، عبداللہ (سوپ نارکل ڈانگہ)، الحاج عبدالرحیم (سوپ کمپنی راجہ بازار)، حافظ عبدالحفیظ (بیل گچھیا کلکتہ)، پروفیسر ثناءاللہ، الحاج سیٹھ محمد یوسف (تانتی باغ)، ڈاکٹر زمان الدین احمد (ٹیواربگان کلکتہ) عبدالمتین (بیل گچھیا) وکیل محمد یحییٰ، مولوی ابوالحسن کاشف (ایم۔پی) مولوی ابوالحسن بسمل آروی بی۔اے وغیرہ مشاہیر شہر اور ہمدردان قوم تھے۔[1]

---

[1] تاریخ مومن۔ انصار ج ۲، ص ۷۵-۷۷

دسواں باب

اتر پردیش د شمالی ہند، کی انصاری برادری

ہندستان کا دل اگر ’عالم میں انتخاب‘ اور ’فلک رکاب وملائک جناب‘ دلی کا شہر تھا اور پنجاب قوتِ بازو بنا رہا تو اترپردیش کو یہ شرف حاصل رہا کہ وہ اس کا دماغ تھا، یہاں کی مردم شماری کیجیے تو افراد بے شمار اور مردم شناسی کیجیے تو ہزار ہا کردار، حکومت وامارت کا ب‌ر عالی کھولیے تو مسند نشینوں کی قطار اور خانقاہوں کے دروازے پر دستک دیجیے تو شیوخ و پیران طریقت کے ہزاروں پرستار سامنے نظر آئیں گے، مزاروں کا شمار کیجیے تو خاک نشینوں میں سینکڑوں غازیوں اور سالاروں کے الواحِ تربت ان کی تابناک زندگی اور تاریخ ساز کارناموں کی داستانیں سنائیں گے اور تاریخ کے صفحات الٹیے تو مجاہدین کی سرفروشیوں کے درخشاں عنوانات اور شہیدوں کے خون کی سرخیاں جگمگا اٹھیں گی، شعر و سخن کا دفتر کھولیے تو ہزاروں دبستان کھل جائیں گے، مدرسے اُن کے علم و عرفان کے چراغوں سے روشن تھے اور ہزاروں دل و دماغ کے دریچے ان کے انفاسِ پاکیزہ کا شمع اور بخورِ علم و تدریس کی دستکوں سے وا ہو گئے تھے۔

تاریخ کے گم شدہ اوراق میں کتنے ہی بے نام چہروں کی دھندلی پرچھائیاں نظر آتی ہیں ان میں مانوس لوگ بھی ہیں اور گمنام لوگ بھی اور یہی سادے ہمارے لوگ تھے جن کے نام حقیقہ داریت نے قلم زد کر دیے، ملک کی معیشت، سیاست و سیادت اور تعلیم و تدریس کے اسفار میں محنت کش طبقہ اور دستکار اہل شرف کے کارناموں کے سنگ میں کھڑے ہیں کہ بہ گنج، مئو، ٹانڈہ، بھیونڈی، بنارس، مبارک پور سے لے کر بجنور، بریلی، جائس اور شاہجہاں پور تک نوربافوں نے پارچہ بافی کے گیسوئے تابدار کو سنوارا ہے اور اسی طرح دیگر کئی اور صنعتوں کو فروغ دے کر ملکی معاشیات کو استحکام پہنچایا ہے، علی گڑھ میں قفل سازی کی کلیدی صنعت انھی لوگوں کے ہاتھوں میں تھی، مرادآباد اور سنبھل میں نقشیں ظروف سازی انہیں عالی ظرف دستکاروں کا کام تھا، آگرہ کی سنگ سازی میں یہ لوگ دوسرے ہنرمندوں کے ساتھ قدم ملا کر چلا کیے، اس کے بعد میں شنگے ٹرنک (صندوق) کے کارخانے انہیں کے دم قدم سے قائم تھے ان کی بنائی ہوئی

قینچیاں خیاطوں کے ہاتھوں میں بے زبان بن کر چلتی تھیں، فیروز آباد میں کانچ کی چوڑیاں انہیں کے ہاتھوں سے بن کر نازک کلائیوں میں کھنکتی تھیں اور ان کی کارگر شیشہ گری نے دھانی بنکوں کا بانکپن اور سہاگ قائم کر رکھا تھا، بھدوہی اور مرزا پور میں قالین باف انصاری تھے، سہارنپور میں لکڑی کی کھدائی اور نقش و نگار کے فنکار یہی تھے، مئو اور مبارک پور کا سنگی، غلط ٹانڈہ اور اکبر پور کے نفیس ململ انہیں نوربافوں کے نورانی کرشمے تھے۔

محمود غزنوی، سید سالار مسعود غازی اور محمد غوری کی مہمات سے نقل مکانی کی رفتار اور شرح میں اضافہ ہوتا رہا، غازی میاں یا بالے بادشاہ کی دعوت و عزیمت کی بارات جہاں بھی پہنچی وہیں برکت پھیل گئی دلی میں تو انصاریوں کو مرکزیت مل گئی تھی رفتہ رفتہ نواحی علاقوں میں ان کی وسعت گیر نسل کو سکونت اور سکینت نصیب ہو گئی، دلی سے قریب شاہدرہ میں اور کچھ دور میرٹھ چھاؤنی میں انصاری حضرات کو سایۂ عافیت مل گیا تھا، شاہدرہ میں سوتی مل تیار کیا جاتا تھا مگر میرٹھ میں قینچی بنانے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور کچھ ٹوپی بناتے اور زردوزی کا کام کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ میرٹھ میں ۲۵،۶۰۵ انصاری افراد تھے، حکیم ذاکر حسین میونسپل کمشنری کے عہدہ پر تھے، بابو بشیر احمد سائیکل مرچنٹ چھاؤنی وہاں کے باشندے مومن کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔

دہلی کے قریب گڑگانوں میں انصاری خاندان معاشی بحران اور ادبار کے ایام میں دہلی سے آکر آباد ہوئے تھے، بڑے دیندار لوگ تھے، حفظ کا جزو تو ہر شہر، قصبہ اور قریہ میں مومن برادری کی مذہبی زندگی کا سب سے تابناک پہلو ہے۔

شاہجہاں پور میں بیسویں صدی کے آغاز تک ۱۸،۱۰۲ انصاری حضرات بسے ہوئے تھے، یہاں کے لوگ زیادہ زمیندار تھے، دربار ریاستوں میں بسلسلہ ملازمت آباد ہو چکے تھے، تاجر پیشہ زیادہ خوشحال تھے، یہاں کی جمعیۃ المومنین کی شاخ کے سیکریٹری نظام الدین تھے، سنہ ۱۹۳۰ء میں مولوی مشتاق حسین ذیلی وہاں قدر نائب رہے تھے۔

غازی آباد دہلی اور شاہدرہ کے قریب ایک اہم بستی تھی یہاں انصار حضرات انہیں علاقوں سے آکر آباد ہو گئے تھے، پارچہ بافی کی طرف میلان کم تھا، یہاں کے عبداللطیف سوداگر پارچہ عطر و تیل مشہور تھے۔

پنجاب و دہلی کی مسلم فتوحات نے یہاں کے آبادکاروں کے لئے کئی تجارتی اور صنعتی شہروں

کے دروازے کھول دیئے تھے، ان میں ضلع سہارنپور اور ضلع مظفر نگر انصاریوں کے لیے بڑے بابرکت ثابت ہوئے، انیسویں صدی کے آخری موڑ پر سہارنپور میں چالیس ہزار اکہتر (۴۰۰۷۱) نفوسِ انصاریان سکونت پذیر تھے، دس بارہ سال بعد ۱۹۰۳ء میں حضرات شیخ انصار کی تعداد ۴۸،۲۴۴ ہوگئی تھی، تحصیل رڑکی اور قصبات میں نوربافی آبائی پیشہ پر گزارہ کرتے تھے، لیکن ایک معتد بہ حصہ دوسری دستکاریوں میں بھی مشغول تھا، سہارنپور میں لکڑی پر نقش و نگار کی کھدائی کی دستکاری یہاں کے معاشی نظام میں بڑی گہرائی اور گیرائی رکھتی تھی، شانہ سازی (کنگھی بنانے) کی صنعت نے ان کی معیشت کے گیسوؤں کو سنوار دیا تھا، آتش سازی آتش خیز صنعت تھی یہ انہیں کے ہاتھوں میں تھی، خیاطی تو عام پیشہ تھا اور ہر شہر و قصبہ میں یہ کسب حلال اس غریب طبقہ کی زندگی کا لبادہ تیار کرتا تھا مگر جس میں عسرت و افلاس کے پیوند لگے ہوتے تھے، مگر "یہ نیک مردوں کا حال تھا" سہارنپور، رڑکی اور مظفر نگر میں شیخ نورباف انصاری، کی اتنی بڑی تعداد ہوتے ہوئے بھی ان میں سے کوئی نہ عالم تھا اور نہ اہلِ قلم پیدا ہوئے، اگر نام ملیں گے بھی تو دو چار وہ بھی شناخت مشکل، مولوی محمد یوسف سہارنپوری کا دم غنیمت تھا ان کے علاوہ عبداللہ وکیل اور شیخ جمو صاحب جنگلوری قابلِ ذکر ہستیاں تھیں۔

اسی سہارنپور میں صدیوں برس قبل قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے دربار کرامت و کشف مرید شیخ بھولا سفید باف اور ان کے بھائی شیخ شدھی سپید باف گذرے تھے۔

ضلع مظفر نگر میں ۱۸۹۱ء میں ۲۲،۲۹۶ حضرات انصار فروکش تھے یہ تعداد بڑھ کر ۱۹۰۳ء میں انتیس ہزار (۲۹،۰۰۰) ہوگئی تھی، قصبہ جانسٹھ میں نو ہزار (۹،۰۰۰) نورباف تھے جو عمدہ کمبل تیار کرتے تھے، شیخ نور الٰہی، حافظ محمد ابراہیم، طفیل احمد اور رفیق احمد مومن برادری کے ممتاز افراد تھے۔

پانی پت تاریخ کے ہر سنگین موڑ پر انسانی خون میں لت پت رہا، ہندستان کے نقشے پر سب سے زیادہ سرخ نشان کا مقام ہے جو علامت ہے انسانیت کی قربان گاہ کی، جہاں کی خونیں خاک میں ہزاروں انسان بے کفن مدفون ہیں، تقسیم ہند کا سب سے خونچکاں حادثہ یہیں وقوع پذیر ہوا۔

یہاں عہد سلاطین سے بہت ممتاز اور شریف انصاری خاندان آباد تھے یہ سب کے سب خواجہ عبداللہ انصاری پیر ہرات کی نسل سے تھے، اسی نسل کے ایک بزرگ خواجہ محمد علی ہرات

سے ہجرت کر کے غیاث الدین بلبن کے دربار میں آئے اور ساتھ علم و فضل اور خاندانی شرافت
و وجاہت کا سرمایہ لائے بلبن نے انہیں عہدۂ جلیل پر فائز کر کے سرمایۂ سلطنت بنا لیا، خواجہ محمد علی
فقہ و دیگر علوم اسلامی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے انہیں محتسب کا عہدہ ملا جو اسلامی نظم
حکومت میں نیابت قضات کے مساوی ایک اہم دینی تقرر تھا، محتسب یا منصب احتساب کا
جلیل القدر عہدہ دار اوامر و نواہی کے نفاذ کا ذمہ دار ہوتا تھا، جا بیجا بازار، وزن و ترازو،
سماع و رقص، شراب نوشی اور فروشی، احکام شریعت کی پابندی، رمضان کی حرمت، غرضیکہ
'دینداری' کے ہر عمل پر سختی سے پابندی کرانا اور نواہی پر قدغن لگانا محتسب کے فرائض میں
شامل تھا، اس کے ساتھ خواجہ صاحب کو سوادِ پانی پت میں اولیائے کرام کے مزارات کی تولیت
اور ائمہ بزرگان کے باقیات صالحات کی نگہداری بھی سونپی گئی تھی حکومت نے ان تمام امور
دینیہ و نظم اسلامیہ کی انجام دہی کے عوض انہیں بطور مدد معاش اراضیات عطا کی
تھیں، قصبے کے اندر برائے سکونت بہت بڑی زمین دی گئی تھی۔ خواجہ محمد علی انصاری نے دور ہرات
کے باغیچۂ انصاریہ کو ترک کر کے یہاں ایک گلستان آباد کر دیا جس کے ہزاروں شجرہائے
مبارک نے ایسا شجرہ تیار کیا جس کے گل سرسبد، مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی (ولادت
۱۲۵۳ھ) تھے۔ ان کے دادا اسی سلسلے سے تھے اور والدہ سادات کے معزز خاندان 'سادات
شہید پور' کی بیٹی تھیں، مولانا حالی سوادِ اسلام کے بیسویں صدی کے جدید اہم سنگِ میل ہیں، سرسید
احمد خان کی سوانح عمری کا خاکہ انہیں کے زورِ قلم سے گلرنگ ہے انہیں کی ایما پر شہرۂ آفاق
مسدس مد و جزرِ اسلام تصنیف کر کے اردو شاعری کو نیا موڑ دیا یہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کا قصیدہ
اور ان کے حشر کا مرثیہ ہے جبکہ علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ، امت مسلمہ کا مقدمہ ہے
جو خدا کی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔

خواجہ محمد علی کی اولاد پروان چڑھتی رہی، پانی پت میں انصاریوں کا محلہ انہیں کی یاد دلاتا ہے،
نسلاً بعد نسل یہاں انصاریوں کے مہذب خاندانوں کے جدِ اعلیٰ یہی خواجہ صاحب تھے، پانی پت اس
عہد میں علما و فضلا کا مسکن تھا اور حفاظ کا مرجع، دیندار مسلمانوں کا بڑا پاکیزہ قصبہ تھا جہاں اخلاق
محمدی کے زندہ نمونے تھے درجنوں قرآن سینوں میں محفوظ تھا کیونکہ بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانا
یہاں کے مسلمان گھرانوں کا خاص دستور تھا۔

پیر ہرات اور بھی کئی انصاری خاندانوں کے مورث اعلیٰ تھے، مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری

شہید قطب الدین سہالوی اور حکیم عبدالرزاق انصاری اور ان کے بھائی مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری وغیرہ کا نسب حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہے، مولانا منصور الانصاری کا نام ریشمی رومال کی تحریک میں جس کے بانی شیخ الہند مولانا محمود احسن اسیر مالٹا تھے سب سے زیادہ ممتاز ہے، شہید قطب الدین سہالوی ملا نظام الدین بانی فرنگی محل کے والد تھے، حکیم صاحب قصبہ یوسف پور ضلع غازی پور کے مشہور انصاری خاندان سے تھے، یہ بھی شیخ الہند کے مرید خاص تھے۔

پیر ہرات کی اولاد میں سے محمد بن عبداللہ انصاری کسی زمانے میں گجرات میں مقیم ہو گئے، جہاں ان کی اولاد پروان چڑھی، بڑودہ کے کچھ خاندان انہیں کے نام لیوا تھے۔

انبالہ چھاؤنی دہلی اور پنجاب کے مہاجرین انصار کی پناہ گاہ تھی، یہاں پارچہ بافی برائے نام تھی، ملازم پیشہ زیادہ تھے اور تعلیم یافتہ افراد کی بھی کمی نہ تھی، عام رجحان اس عہد میں مسلمانوں کا یہی تھا کہ علیگڑھ کی یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری حاصل کر کے شہر کے ایڈوکیٹ بن جائیں چنانچہ جس طرح دیگر شہروں میں بھی مومنوں میں وکیلوں کی کمی نہ تھی یہاں بھی تقریباً یہی حال تھا، شہر کے دو ممتاز وکیل ظہیر الدین (علیگ) صدر بلدیہ اور محمد ظفر (علیگ) تھے، یہ دونوں برادری کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

ضلع انبالہ کے جگادھری قصبہ میں بھی تعلیم یافتہ شیخ انصاری بڑی تعداد میں بسے ہوئے تھے، یہاں کی قابل ذکر شخصیتیں تھیں ڈاکٹر عبدالعزیز (میشنل میڈیکل ہال) عبدالسلام ٹھیکیدار اور بشیر احمد۔

بدایوں بڑا مردم خیز شہر تھا اکبری عہد کے ملا عبدالقادر بدایونی مؤلف منتخب التواریخ کو تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے، اور حضرت خورم شاہ بدایونی سے تذکرہ نویسان اور علما سے نحوں بخوبی واقف ہیں، جو ایک باقندہ مجذوب تھے، ان کے تصرفات کی تعداد احاطۂ قلم سے باہر ہے، بدایوں میں حضرات انصار سہارنپور اور بریلی سے آکر آباد ہوئے تھے، غریب لوگ تھے پارچہ بافی کی صنعت میں کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ انصاریوں کی کمی نہ تھی ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ۱۹,۸۹۴ نور بافوں کا پتہ چلتا ہے زبان پر شمالی ہند کے باشندوں کا اثر تھا کرخنداری لہجہ تھا جیسا کہ عام طور پر سہارنپور، مرادآباد اور بجنور میں رائج تھا، تجارت کے لئے وسائل کا فقدان تھا اور ہمت مفقود تھی اسی لئے ہمیشہ پست ماندہ رہے دینداری عام تھی اور خاص لوگ چند

ہی تھے، عبدالقیوم بی۔ اے، جان صاحب جوتے کے سوداگر، بابو رضا علی جو محکمۂ اراضی میں ملازم تھے بس یہی کل کائنات تھی۔

بجنور اور اس کے مضافات نگینہ وغیرہ میں انصاری خاندان رائے بریلی اور دہلی سے تعلق رکھتے تھے یہاں حُفّاظ، علماء اور اطبّاء کی کمی نہ تھی غریب و نادار لوگ تھے سہل انگاری، حوصلوں کی پستی اور محدود وسائل معاش نے انہیں زندگی کے سفر میں اپنے بھائیوں سے بہت پیچھے کر دیا تھا، بد حالی عام تھی یہاں تک کہ گھر کی عورتیں بھی خود کفیل بننے کے لیے اونی شال اور موٹا کپڑا بُن لیتی تھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی کمی بے حد کھٹکتی تھی، یہاں سے اردو کا مشہور اخبار 'مدینہ' برسوں تک نکلتا رہا، جس نے مسلم قوم اور معاشرت کی اصلاح کے لیے ان گنت مضامین چھاپے اس کی برکات سے مدنی حالات ملک کے دیگر حصوں میں چاہے سُدھری ہوں لیکن بجنور میں چراغ تلے اندھیرا ہی رہا، حالانکہ ۱۸۹۱ء میں جب مردم شماری ہوئی تو سارے یوپی میں انصاریوں کی تعداد یہاں دوسرے شہروں کے مقابلہ میں دوسرے نمبر پر تھی یعنی گورکھپور میں نور بافوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی ۱۱۷۸۹۱ (ایک لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو اکیانوے) اور بجنور میں ۶۱،۵۲۲ انصاری تھے۔

بجنور کے قریب دھام پور قصبہ میں اس سے بد تر حالت تھی، جہالت کا جادو سر پر چڑھ کر بول رہا تھا اسی سے تعزیہ داری اور قبر پرستی سے مسحور تھے اور بدعتی رسوم میں ملوّث تھے۔

مروہہ[1] (ضلع مراد آباد) میں حضرات شیخ انصار کی جمعیت لگ بھگ اٹھارہ ہزار تھی، کوئی خاص صنعت نہ تھی سوائے ٹوپی (کلاہ دوزی) کے یہی ذریعۂ معاش تھا، شیخ مولا بخش ٹھیکیدار مشہور فرد تھے جن کا کاروبار دہلی تک پھیلا ہوا تھا، اپریل ۱۹۳۲ء کو لاہور میں منعقدہ مومن کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی مجلس صدارت کے آپ رکن تھے۔ ہمدردان قوم کی کمی نہ تھی حافظ فیض احمد ناظم جمعیۃ المومنین ممتاز لوگوں میں سے تھے، جو قوم کی اصلاح کے لیے کوشاں رہتے تھے، چودھری اسلام الدین عرف چھٹن وہ مجاہد تھے جو (۱۹۲۱ء) تحریک آزادی میں ۱۹۳۲ء سے شامل تھے[2]۔

---

[1] قصبہ مروہہ کے حالات میں درجن بھر سے زیادہ تاریخی کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، آخری کتاب تاریخ امروہہ جو ۴ جلدوں میں ہے محمود احمد عباسی مرحوم نے مرتب کی ہے۔

[2] کانگریس صد سالہ جشن ص ۶۳

بلند شہر کے انصاری سہارنپور، بریلی اور دہلی سے معاش کی تلاش میں یہاں آکر بس گئے تھے، انیسویں صدی کے اختتام پر ۱۴۷، ۱۳ انصاری تھے، ماسٹر عبد الرؤف (علیگ) مشہور وکیل تھے۔

مراد آباد میں ۴۰۱، ۳۲ انصاری افراد تھے، خوشحال تاجر، ظروف سازی کے کامیاب سوداگر، تعلیم یافتہ افراد کی بہتات اور مجاہدین آزادی کی کثرت تعداد نے اس شہر کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی، مدرسہ شاہی سے کئی ممتاز مجاہدین وطن سرفروشی کی تمنا لے کر اٹھے ان میں مولانا غلام حسین زمانۂ طالبعلمی ہی سے سیاست کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے پھر سرکاری اسیر بن کر ۱۹۴۲ء سے ایک سال تک زنداں میں رہے اور خواب آزادی کی تعبیر ڈھونڈتے رہے اور تعبیر کی صورت میں ماہانہ پنشن ملی جو جد وجہد آزادی کا صلہ تھا، سیاست اور علم و ادب میں ان کے استاد شیخ الاسلام مولانا محمد حسین مدنی تھے اور دیگر سیاسی رہبروں کے حلقے سے ان کے تعلقات حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے رہبروں سے تھے، خاندانی پیشہ پارچہ بافی تھا اور ان کے ایک صاحبزادے مولوی عبد المنان گھریلو صنعت یعنی بُنائی کر کے گزر بسر کرتے تھے۔[1]

قصبہ شریف نگر (ضلع مراد آباد) میں ایک شریف اور با عزت مومن خاندان میں حاجی ماسٹر عبد العزیز انصاری پیدا ہوئے، والد عبد الرزاق انصاری بُنکر تھے اور یہ مدرس (ماسٹر) عبد الرزاق انصاری بُنکر قوم اور مزدوروں کے رہبر تھے، ماسٹر صاحب حافظ عبد القدیر انصاری (محلہ کٹرہ شہر مراد آباد) کے ساتھ جنگ آزادی کے مجاہدین میں شامل ہو گئے، ماسٹر صاحب کی قومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا، صنعتی اداروں کے علاوہ دینی انداز پر چلائے جانے والے اداروں کے رکن تھے اور ممتاز عہدوں پر سرفراز رہے، دیر تعلیم اور صدر مدرس کی حیثیت سے اور ایک سرگرم کانگریس اور مومن کانفرنس کے رکن ہونے کے تعلق سے ضلع مراد آباد میں مشہور تھے، ضلع مراد آباد مومن کانفرنس کے جنرل سیکریٹری رہ چکے تھے۔[2]

چودھری اسلام الدین عرف چھٹن ولد عبد الغنی بھی اسی ضلع کے مجاہدین آزادی میں سے تھے، حافظ حاجی امیر حسن، بابو غلام رسول لکڑے کے بیوپاری تجارتی اور سماجی حلقوں میں معروف تھے، نقشیں ظروف سازی کی صنعت میں انصاری برادری کا بڑا حصہ تھا ۱۹۳۰ء تک شہر اور مضافات مراد آباد میں انصاریوں کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ عبد القیوم انصاری اور ان کے برادران عبد الجبار اور عبد الغفور انصاری کا شمار رؤسائے مراد آباد میں ہوتا ہے۔

---

[1] کانگریس صد سالہ جشن ص ۹۳ [2] ایضاً ص ۹۳-۹۴

سنبھل میں برادری نے کپڑے کی تجارت اور بافندگی میں بڑی ترقی کرلی تھی، قریوں اور قصبوں میں بافندگی کے کرگھے قائم تھے، الٰہ بخش جمعیۃ الانصار کے سیکریٹری اور حاجی عبدالغفور صدر تھے، ظروف سازی کی صنعت میں عبدالمجید چھائے ہوئے تھے۔

سنبھل صوفیائے کرام کی آماجگاہ تھا، حضرت شاہ حیدر سنبھلی اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے۔

علی گڑھ میں شیخ انصار عرصۂ قدیم سے آباد تھے، تعلیمی اور معاشرتی حالات میں نمایاں تبدیلیاں اسی زمانے سے ہونے لگیں جب یہاں سرسید احمد خاں نے ہندوستان میں مغربی تعلیم کی پہلی عظیم الشان درسگاہ کی داغ بیل ڈالی صاحب حیثیت خاندانوں میں ممتاز شیخ نوربافوں کے گھرانے بھی تھے جو اپنے بچوں کی تعلیم دلانے اور بسلسلۂ معاش یہاں آکر آباد ہوگئے، فکر و دانش اور علم و ادب کے اس سرچشمے سے ہزاروں "ڈاکٹر انصاری" "وکیل انصاری" اور "عالم و فاضل انصاری" سیراب ہوکر نکلے، سنہ ۱۹۳۰ء تک جو مشہور ہستیاں مغربی تعلیم و تہذیب کے اس مرکز سے امتیازی شان کے ساتھ نکلیں ان میں سے چند یہ تھے: ظہیر الدین ایڈوکیٹ صدر بلدیہ انبالہ اور صدر کل ہند جمیعۃ المومنین، عبدالروف وکیل بلند شہر، محمد ظفر ایڈوکیٹ انبالہ، نظام الدین ایڈوکیٹ الٰہ آباد جو آل انڈیا جمعیۃ المومنین کے سیکریٹری تھے۔

علی گڑھ میں شیخ انصاریوں کیلئے قفل سازی کی صنعت نے ترقی کے دروازے کھول دئے تھے، بیسویں صدی کے اول نصف تک برادری سماجی، معاشرتی اور معاشی طور سے ایک طاقتور جماعت بن چکی تھی اور شہر کے مختلف معاملات میں ان کی "آواز" اتنی اونچی ہوگئی تھی کہ عدالت تک پہنچ گئی جب شاہ جمال کی درگاہ کے اوقاف کے متولیان شمسی برادری کے افراد سے شہر کے مسلمان برگشتہ ہوگئے تھے، اس شہر کے باشندوں کو اس حقیقت کا احساس ہوا کہ یہ "انصاری - مومن" ایک متمول اور غالب طبقہ بن چکا ہے۔ [1]

ضلع بارہ بنکی اور فرخ آباد میں آگرہ، دہلی اور جابس کے انصاری خاندان آکر آباد ہوگئے تھے، بارہ بنکی میں شیخ نوربافوں انصاریوں کی تعداد ۱۹۲۱ء ۳۰ تھی، ابو حسین اور احمد علی سوداگران، بارہ بنکی کی برادری کے صاحب حیثیت افراد تھے، حافظ محمد نذیر بانی مدرسہ عربیہ امداد العلوم بارہ بنکی دینی خدمات میں نمایاں تھے، عبدالرشید اسسٹنٹ سکریٹری اور شفیق الاسلام فرخ آباد کی ممتاز

---

[1] رچرڈ ایٹین، بروس لارنس کی مرتبہ کتاب "ہندوستان کی مسلم درگاہیں" "شاہ جمال کی درگاہ کا قضیہ" ۔ صفحہ ۱۵۷

سربرآوردہ شخصیتیں تھیں، محمد شمس الدین ناظم ہدایت المومنین اور منشی محمد حسین ناظم جمعیۃ المومنین دونوں فرخ آباد کے ہمدردانِ قوم تھے، فرخ آباد میں پردے کے کپڑے نہایت عمدہ بنائے جاتے تھے۔ فرخ آباد میں ۱۸۹۱ء میں ۲۳۳۴ انصاری افراد تھے۔

آگرہ۔ اکبر کے فیض سے اکبرآباد بنا، جہانگیر کے 'بادۂ شبانہ' کی محفلیں یہیں سجتی رہیں اور شاہجہاں آباد کی شان و شوکت شاہجہاں کی پُرشکوہ سلطنت تک قائم رہی، اس سارے دور میں یہ علوم و فنون کا مرکز بنا رہا، اور غیر ممالک کے فنکاروں اور دستکاروں کا مسکن اور علماء و فضلا کا مرجع بنا رہا، عالمگیر نے جب شاہجہاں کو معزول کر کے اس کے سر سے تاج اتار لیا تو اس نے بیکسی کے عالم میں تاج محل بنوایا، لیکن ایران و خراسان کے چابکدست صناعوں کی بستی اُجڑ گئی اور صنعت پارچہ بافی کے دستکاروں کے ہاتھ تنگ ہو گئے جو اس شہر اور مضافات میں کثیر تعداد میں سکونت پذیر تھے، انیسویں صدی کے اختتامی دور میں یہاں صرف ۱۲۷۱ نوربافت رہ گئے تھے، باقی کفش سازی میں دوسرے پیشوں کے ساتھ قدم جما رہے تھے اور ہاتھ مضبوط کر رہے تھے، ۱۹۳۰ء کے قریب لگ بھگ بیس ہزار تا پچیس ہزار شیخ انصار تمام ضلع میں پھیلے ہوئے تھے، آگرہ بازار کی رونق مگر لوٹ کر نہیں آئی۔

آگرہ میں شعر و سخن کی محفلوں میں سناٹا چھانے لگا تو نظیر اکبرآبادی کا نام زندہ ہوگیا، یہ اُس عہد کا عوامی شاعر تھا جس نے اپنی شاعری میں 'پارچہ بافی' کی اصطلاحات کو تشبیہی انداز میں یوں سمویا ہے کہ لگتا ہے کہ وہ خود بافندے تھے؛ بہرحال شاعر چرخے کی آواز اور کرگھے کے کمال سے بخوبی واقف تھا، مولوی عاشق حسین سیماب عہد ساز استاذ شعر رہے تھے، بیکش اکبرآبادی اور دیگر شاعروں نے ماہنامہ "شاعر" اور "تاج" کے صفحات میں شعر و سخن کا "آگرہ بازار" سجا دیا تھا۔

فیروزآباد (ضلع آگرہ) کے انصاری شیشہ گر تھے، کانچ کی چوڑیاں، شمعیں، اور دیگر رنگ بلوری مصنوعات ان کے چابکدست ہاتھوں کے کرشمے تھے؛ یہیں ۲ دسمبر ۱۹۳۲ء کو اترپردیش صوبہ کی جمعیۃ المومنین کی تنظیم کا جلسہ ہوا تھا، یزد حسین اس کے جنرل سیکریٹری تھے اور شیخ محمد خورشید انصاری مدیر انصار، سہارنپور مدعو تھے، دیگر اراکین میں رائے بریلی کے عبدالحفیظ، جونس کے شیخ عبدالرحیم، بریلی سے حاجی کریم الدین ٹھیکیدار، حافظ نصیر الدین ڈ اوہ سے تشریف لائے تھے، اسی اٹاوہ کے محمد اکبر بھی تھے جو ناظم شعبہ الانصار تھے۔ عہدہ داران حضرات میں مندرجہ ذیل (مع سب) منشی منور حسین منور (ناظم) اور حافظ عبدالمجید تھے۔ مدیر 'انصار' نے اپنی پرجوش تقریر میں عرفی

شرفا پر کڑی تنقید کی مولوی علی حسن عاصم بہاری جو تحریک کے روح رواں تھے انہوں نے بھی برادری کی بیچارگی پر یاس و الم کے آنسو بہائے ہیں۔

تیں کی تجارت اور عطر سازی کی شہرت نے شہر قنوج کو سارے ملک میں چمکا دیا تھا۔ انصاری حضرات کی معاشی زندگی میں اس تجارت نے خوشحالی کی نکہتیں پھیلا دی تھیں، ان میں سے بہت سارے رئیس التجار بن گئے، اور بڑی بڑی زمینداریاں قائم کرلی تھیں عموماً یہ لوگ جائس، دہلی اور بریلی سے ہجرت کرکے آئے تھے، ان میں تعلیم یافتہ، عالم اور فاضل لوگ بھی تھے، دیہاتوں میں آباد مومن حضرات کی زندگی دبی پھیکی سوکھی رہی، آبائی پیشہ پر قائم تھے لیکن تین چوک تانا اور میں چوک بانا سے زیادہ بڑھے نہیں۔ جہالت دوسروں کے لئے بہانہ، حقارت بن گئی، کارخانے سے مسجد تک یہی عموماً ہر نوربافی کی زندگی کی مسافت تھی۔

اٹاوہ کے مجاہدین

اٹاوہ کا ذکر مجاہدین انصار کے تعلق سے اہم ہے جن کی خدمات جنگ آزادی اور قوم کی فلاح و بہبود میں ناقابل فراموش ہیں، مجاہد آزادی مشہور طبیب حکیم حاذق اٹاوی کم و بیش پچاس ساٹھ برسوں تک کانگریس کے سرگرم رکن رہے، آل انڈیا مومن کانفرنس (۱۹۲۹) الٰہ آباد کے اجلاس کے بعد سے وہ اس قومی تنظیم و تحریک میں شامل ہوگئے تھے، ۱۹۴۲ء کے ہنگامی دور میں زندانی بنا دیئے گئے، اٹاوہ کے ایک اور مشہور حکیم بشیر احمد بھی تھے، مولوی بشیر الدین صاحب قلم تھے ایک پرچہ البشیر نکالتے تھے اور ایک ہائی اسکول بھی انہیں کی کوششوں سے جاری ہوا اور ایک بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا، اٹاوہ میں نوربافوں کی تعداد ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں ۲۳۵۲ تھی، پارچہ بافی برائے نام تھی۔

اٹاوہ کے مجاہد آزادی حبیب الرحمٰن انصاری (۱۸۹۲ء - ۱۰ نومبر ۱۹۸۴ء)

اٹاوہ میں بھی اُس مردم شماری کے حساب سے تعداد بہت کم تھی یعنی فقط ۳،۲۲۱ انصاری افراد بستے تھے، لیکن یہاں کی برگزیدہ ہستی مجاہد آزادی حبیب الرحمٰن انصاری کے متعلق یہ لکھ دینا کافی ہے کہ وہ ایک ایسی جامع شخصیت کے حامل تھے جن کے مرنے کے بعد یہ شعر صادق آتا ہے ؎

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاران بیش

حبیب الرحمٰن بے ریا اور مخلص خادمِ قوم تھے، اور کبھی نہ ستائش کی تمنا کی اور نہ صلہ کی پروا کی، آزادی کے بعد اور اسمبلی میں منتخب ہونے کے بعد متعدد مواقع ایسے آئے جب انہیں عہدے پیش کئے گئے لیکن وہ انفرادی طور پر یہ محسوس کرتے تھے کہ حصولِ آزادی کے بعد جو بیش بہا کام تھا وہ پورا کر چکے ہیں اب جو نئی نسلیں ہیں وہ آگے بڑھیں تاکہ ہندستان کی نشأۃِ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی جائے اور اتحاد و اتفاق نیز یکجہتی کو محفوظ رکھتے ہوئے آزادی کی بقا کے لئے نئی طاقت بن جائیں وہ زندگی کی آخری سانس تک ہندستان کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔

"جناب حبیب الرحمٰن صاحب کی زندگی کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے شروع ہی سے دستکار اور بنکر طبقہ نیز دیگر پس ماندہ طبقات کے مسائل میں بہت زیادہ دلچسپی لی اور انہیں حل کرنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ زندگی کے آخری لمحہ تک کھادی ہی کی پوشاک پہنی اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہے۔"[1]

حبیب الرحمٰن انصاری غازی پور کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، آپ کے والد بزرگوار حافظ عبد الصمد انصاری ایک عالم و فاضل شخصیت اور دینی کردار کے حامل بزرگ تھے، حافظ صاحب غازی پور سے قنوج نقلِ وطن کر کے آئے تو یہیں حبیب الرحمٰن انصاری پیدا ہوئے، حافظ صاحب ایک سچے دیندار اور خلوص و محبت کے پیکر تھے، ان پر تصوف ہونے کے سبب گنج مراد آباد (ضلع اناؤ) کے ایک بزرگ فضل الرحمٰن سے بیعت کر کے ان کے حلقۂ ارادت و سلسلے میں شامل ہو گئے، انہیں کے فیض و برکت سے حافظ صاحب میں "جمالِ ہم نشین" کا عکس جھلک پڑا، تقویٰ اور دینداری کو تقویت الایمانی نے اور بھی جلا بخشی، ادھر آزادی کی تڑپ اور لگن بھی تھی یہی ان کے صاحبزادے حبیب الرحمٰن انصاری کے دل میں کسک اور کرب بن گئی، حبیب الرحمٰن انصاری کی عملی زندگی اور زرّیں کارناموں نے ان کے فرزند ضیاء الرحمٰن انصاری کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا، حبیب الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ تھے اور کانگریس کی عظیم رہنما مسز اندرا گاندھی کو وہ ہمیشہ بیٹی کہہ کر پکارتے تھے۔

ضیاء الرحمٰن انصاری[2] ۹ مارچ ۱۹۲۵ء کو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے ساری زندگی سیاست میں

---

[1] کانگریس صد سالہ جشن۔ مجاہد آزادی جناب حبیب الرحمٰن انصاری از انیس الرحمٰن انصاری، نئی دہلی ص ٦٦-٦٩

[2] ڈاکٹر احمد سجاد، [illegible] آل انڈیا مومن کانفرنس، تاریخ کے آئینے میں، ص ١٥

بسر کی اور ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو اسی سیاست نے انہیں مضمحل بنا کر ان کی موت کو جلدی بلا لیا۔ ضیاء الرحمٰن انصاری مرحوم بھی والد بزرگوار کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وکالت کی سند رکھتے تھے طالبعلمی ہی کے زمانے سے سیاسی سرگرمیوں نے ان میں قیادت اور سیادت کا ملکہ پیدا کر دیا تھا، کانگریس کے سرگرم رکن بن کر بنکروں اور غریبوں کے لیے کام کرنے لگے، کئی دفعہ پارلیمان کے رکن رہے اس دوران آپ نے پسماندہ طبقات اور بنکروں کی فلاح کے لیے نمایاں کام انجام دیے، بنکروں کی تنظیم اور باہمی انجمنوں کی تشکیل میں آپ نے سرگرم حصہ لیا، حکومت ہند نے بنکروں کے مسائل سلجھانے کے لیے آپ کی کارکردگی کے پیش نظر ۱۹۷۰ء میں آپ کو آل انڈیا ہینڈلوم کا رکن نامزد کیا، ۱۹۷۱ء میں پہلی بار اناؤ سے لوک سبھا کے لیے منتخب ہوئے آپ کی وسیع خدمات کا صلہ آپ کو مرکزی وزارت میں صنعتی ترقی کے نائب وزیر کے تقرر میں ملا۔ یہ پہلی شان تھی کہ مومن برادری کو مرکزی حکومت میں وزارت ملی ۱۹۷۳ء میں الحاج عبدالقیوم انصاری کی وفات کے بعد اتفاق رائے سے آپ کو آل انڈیا مومن کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا ۷ اور ۸ مئی ۱۹۷۶ء کو نئی دہلی میں آپ کی صدارت میں مومن کانفرنس کی تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس کا افتتاح شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں ہوا، ضیاء الرحمٰن انصاری صدر کانفرنس اور اجلاس نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو نکات پیش کیے اس نے اس تحریک کو ایک نیا سیاسی موڑ دے دیا اور جو خالص مومن کانفرنسی تھے اور انتہا پسندانہ رجحانات کے حامل تھے انہیں ان کے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے سیاسی تسلط کا شائبہ نظر آنے لگا لہٰذا وہ چیخ اٹھے جب انہوں نے سنا:

> "میں برادری واد کو پسند نہیں کرتا ہوں یہ اسلامی روح کے خلاف ہے، اسلام میں کوئی
> شرف و امتیاز کسی برادری و نسل سے تعلق کی وجہ سے نہ تھا محض شرافت اور بہترین نیکی کے
> قومیت کا استعمال ہوتا رہا۔ مومن برادری نے آزادی سے قبل جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ
> جنگ آزادی کی تاریخ کا ناقابل تسخیر [ناقابل] حصہ بن چکے ہیں۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمانوں
> کی برادری کا ایک بڑا حصہ اسی برادری پر مشتمل ہے، اس لیے میں برادری کو اوپر اٹھنے

۱؎ [illegible] مومن کانفرنس تاریخ کے آئینے میں ص ۶۱ عبدالقیوم انصاری کی وفات [illegible] ۱۹۷۳ء کے مطابق [illegible] نہیں اور متحرک شخصیت، نائب وزیر صنعت و شہری رسد [illegible] کے ساتھ [illegible] مومن کانفرنس کو نیا صدر منتخب کیا گیا [illegible] سب کا بہترین [illegible] سامنے ہے۔" ایضاً

کا مطلب پوری مسلم برادری کو اوپر اٹھانا ہے، مومن برادری صرف دستکاروں اور صناعوں پر ہی مشتمل نہیں ہے۔ آزادی کے بعد اس پچھڑی ہوئی برادری میں دوسری پچھڑی ہوئی برادریوں کی طرح تعلیم کا رواج بڑھا ہے۔ آج مومن برادری میں تعلیم یافتہ نوجوان، گریجویٹس، پروفیسر، ڈاکٹر، وکلا، صحافی، ماسٹر اور انجینیئروں کی کمی نہیں" ؎۱

ابتدائی بات تو انصاری صاحب کی گویا اس قرآنی آیت کی تفسیر ہے اور بہت معقول، موزوں اور صحیح ہے۔

یَآاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۝ (الحجرات : ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ہندوستان میں ذات برادری کی لعنت نے مسلم معاشرہ میں بھی درجہ بندی کردی تھی ان سب پر مستزاد یہ کہ عامہ علماء سوء نے جو "اسفار ہو الحدیث" کے بڑے "ایجاد بندہ" زمرہ میں نمایاں ہیں موضوع حدیثیں گھڑ لی تھیں ؎۲ مومن۔ انصاری برادری کی پچھلی دو صدیوں کی تاریخ دیکھیے، ان کی جہالت نے انہیں موردِ تضحیک وتحقیر بنا دیا تھا، عرفی شرفا، طاقتور زمینداروں اور بالادست حکاموں نے انہیں ہر میدان میں پیچھے رہنے دیا، ضیاء الرحمٰن صاحب نے ۱۹۷۶ء میں برادری کی تمام شعبہ جات زندگی میں ترقیوں کا جو ذکر کیا ہے وہ آج اور زیادہ نمایاں ہو چکی ہیں پھر بھی اگر "شناخت" کے خدوخال کو یونہی رہنے دیا جائے تو "تعارف" میں ان کو تاریخی تناظر سے بھی آگہی ہو جائیگی اور انصاف و رواداری کی بنیاد پر ان کی تعظیم واجب ہو جائے گی، ورنہ اب اس برادری کو مزید کسی تعارف کی ضرورت نہیں ہے کہ

کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن

ضیاء الرحمٰن صاحب مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی قدآور شخصیتوں سے خاص طور پر متاثر تھے، اردو اور فارسی کے سینکڑوں اشعار ازبر تھے گفتگو کے دوران برمحل اشعار سناتے تھے بڑے اعتماد کے ساتھ قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے دیتے تھے، آپ ایک دیندار مسلمان

؎۱ ماہنامہ مدرسہ رحمٰن ص۱
؎۲ عبدالسلام مبارک پوری، کتاب المنزال دہلی ج ۱۔ ص ۹۹

اور صادق وطن پرست تھے لیکن وطن والوں نے ان کی اخیر عمر میں ان کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں
رکھا الزام اور اتہام کا کیچڑ اچھال کر خود اپنا دامن آلودہ کر لیا، سیاست کی دلدل میں رہنے والوں
کی ذہنیت بھی گندی ہو جاتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ۔

بلیا میں انصاریوں کی بڑی کثیر تعداد آباد تھی سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے حساب سے یہاں
۳۰،۵۴۷ مومن افراد تھے، زیادہ تر گورکھپور اور بہرائچ کے مہاجر انصاری خاندان تھے، صنعت
پارچہ بافی کے عروج و زوال اور سیاسی اتھل پتھل سے آبادیوں کی نقل مکانی، ایک تاریخی عمل
ہے مگر بلیا کی برادری انگریزوں کے لیے دردِ سر تھی کیونکہ ان کی نظر میں یہ متشدد مذہبی اور جذباتی
جلد باز تھے، محمد وصی انصاری، مختار اور مولوی علی حسین برادری کے بااثر لوگ تھے (سنہ ۱۹۳۰ء)

غازی پور میں حضرات شیخ نوربافان کی جمعیت آج سے سو سال قبل ۲۸،۵۶۴ تھی، بڑا مردم
خیز علاقہ تھا، مومن تعلیم یافتہ افراد سرکاری محکموں میں بڑے عہدوں پر فائز تھے، اہل علم و دانش
کا مرجع تھا، دینی درسگاہوں اور شیوخ و علماء کی کمی نہ تھی، صاحب کمال اور اہل اللہ یہیں کی خاک
سے اٹھے اور یہیں پیوندِ خاک ہیں جو ماہ و آفتاب بن کر برسوں جگمگاتے رہے، شیخ ضیاء الدین
حائک صوفی مردِ کامل اور صاحب کرامات تھے ان کے عقیدتمند ہر جمعرات کو ان کی قبر پر جمع ہوتے
ہیں، حافظ عبداللہ بن عبدالرحیم مئو سے ہجرت کر کے یہیں بس گئے تھے اساتذہ اور علماء میں آپ کا
شمار ہوتا ہے ان کے تلامذہ میں مشہور بزرگوں کے نام ملتے ہیں نولی قریہ میں مولانا عبدالواحد کتابوں
کے بڑے شوقین تھے ایک عظیم کتب خانہ ان کی وسعت مطالعہ اور علم دوستی کی شہادت دیتا ہے۔
سنہ ۱۹۶۰ء کے معاشی بحران میں بنکروں کی ایک بڑی تعداد ماریشس چلی گئی۔

سلسلۂ بیان کی سہولت کے پیش نظر ہم اُن چند اضلاع کی مومن برادری کے بارے میں اس جاری
باب میں گفتگو کر رہے ہیں جن کا ذکر جغرافیائی تسلسل کے سبب اگلے باب میں ہونا چاہیے، سوائے ان کے
چند شہروں میں مثلاً کانپور، جہاں چوسی اور کانپور سے قریب فتحپور میں مومنوں کی قلیل تعداد تھی درست
برادری کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی، کانپور میں ملوں کے قائم ہونے سے پہلے صرف ۳۲۱۴ انصاری
افراد تھے (سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے) یہ رائے بریلی، پانی پت اور قصبہ پوش سے ہجرت کر کے
آئے تھے، محمد حفیظ اللہ وکیل، کریم بخش تاجر چرم، ماسٹر عبدالکریم اور حکیم رمضان علی ممتاز افراد تھے،
فتحپور میں شاہ گنج علی فتحپوری ایک نو مسلم مداری سلسلہ سے متعلق ہو کر صاحب ظاہر و باطن بن گئے تھے،
صاحب کرامت تھے اور نوربافوں کے مرشد تھے، فتحپور (ہسوہ) میں بس گئے تھے۔

سلطان پور میں ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے حساب سے ۱۰،۳۴۵ کے قریب انصاری تھے، عموماً ان اطراف میں موٹا سوتی کپڑا بُنا جاتا تھا۔

ضلع پرتاپ گڑھ میں ۹،۲۹۷ انصاری بُنکر تھے، مضافات میں مانکپور، سلطان پور، لال گوپال گنج، گنج گنڈہ اور سکندر گنج میں ان کی تعداد چند برسوں میں بارہ ہزار کے قریب پہنچ گئی تھی، اور جگہوں کی مانند یہاں بھی حفاظ، علماء، اطباء اور خاص طور سے شاعر حضرات معروف تھے، دینداری عام تھی اور تعلیم کا چرچا اُس سے زیادہ تھا پھر بھی ضلع کے ممتاز افراد برادری کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے مومن کانفرنس کے دوسرے جلسہ منعقدہ الٰہ آباد (مارچ ۱۹۲۹ء) میں یہاں کے مومنوں نے بڑی دلچسپی دکھائی تھی ان میں یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں: حکیم ابوسعید مانکپوری، امیر احمد گوتی مانکپوری، ریاض الحسن گوتی مانکپوری، حکیم حبیب احمد مانکپوری، منیر احمد مانکپوری، احمد علی سلطانپوری، حافظ عبدالشکور سلطانپوری، ظہیر الدین، منشی عبدالوہاب، منشی عبدالصمد گوتی پرتاب گڈھی، منشی رحمت اللہ گوتی پرتاب گڈھی، ان کے علاوہ لال گوپال گنج کے منشی عظیم اللہ، کنڈہ کے زمیندار عبدالکریم، سکندر گنج کے ایم فاروق عطار، عبدالسلام (ایلمد کلکٹری پرتاب گڈھ)، حافظ عبدالشکور مانکپوری، یہ تمام افراد قوم کی تنظیم کے سرگرم کارکن تھے، مانکپور کے حضرت شیخ تقی مانکپوری جو کہ اس علاقے میں ایک مشہور صاحب کرامت اہل اللہ میں سے تھے، کبیر داس انہیں کے مرید تھے، مانکپوری کے مشہور شاعر جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل تھے جو نظام حیدر آباد کے استاد تھے، ان کا ذکر اگلے باب "کارگہ علم و ادب و شعر و سخن" میں آرہا ہے۔

ضلع بستی (گورکھپور) کے قریب مومن افراد میں جہالت عام تھی، اسی سبب دوسرے دھرموں کے مبلغین اس علاقے میں بہت اثر رکھتے تھے، آریہ سماج کے پرچارکوں نے سادہ لوح جلاہوں کو شدھ کرنا شروع کر دیا تھا، قصبہ بستی میں تقریباً شیخ نور بافن نصری ہی تھے، ایک وکیل صاحب کے مساعیٔ جمیلہ سے آریہ سماجیوں اور مسلمان علماء کے درمیان ایک عظیم اور طویل مباحثہ ہوا، اس موقع پر ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے پنڈت مہاشے بستی پہنچ گئے، مسلمانوں کی درخواست پر ساڑھے تین سو کے قریب علماء حضرات مقابلہ کے لئے مناظرہ کے میدان میں اتر گئے، ان میں مولانا شبیر الحق صاحب تفسیر حقانی دہلوی اور "اہلحدیث" کے مدیر اور اسی مسلک کے عالم دین مولوی ثناء اللہ امرتسری پیش پیش تھے، سات دن تک مباحثہ ہوتا رہا اور آریوں کو منہ کی

کھانی پڑی اور ان کی زبان بند ہو گئی، اس کی روداد "مباحثہ، بستی ضلع گورکھپور" کے عنوان سے شائع ہو گئی تھی اس مباحثہ اور اس کتاب کی اشاعت و طباعت کے اخراجات کے لیے مومن برادری نے بڑی رقوم فراہم کی تھیں۔ یہ لوگ جاہل تھے لیکن جذبۂ دینی سے سرشار تھے۔

یہ لوگ موروثی پیشہ سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے تھے چمڑے کے بیوپار میں انہوں نے خاصی ترقی کی تھی۔ گورکھپور میں ۱۸۹۱ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ پورے یوپی میں سب سے زیادہ اسی شہر میں نوربافت تھے یعنی ایک لاکھ سترہ ہزار آٹھ سو اکیانوے میر شیخ مرتضیٰ حسن صاحب رئیس اعظم گورکھپوری نے ۳ اپریل ۱۹۲۸ء کو لاہور پنجاب میں مومن کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی یہ میونسپل کمشنر بھی رہ چکے تھے۔

الہ آباد کی انصاری برادری

گنگا اور جمنا کے سنگم پر بسا ہوا الہ آباد، اتر پردیش اور مغربی ہند کے بیچ پل بنا ہوا صدیوں سے بمبئی، بھیونڈی، مالیگاؤں، دھولیہ، بھساول، برہانپور وغیرہ کی مومن برادریوں کے دلوں کو ملائے ہوئے ہے، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ایک دہائی تک معاشی تحریکات، سیاسی عوامل اور مذہبی تحریکات نے مومن مہاجرین کو آمادۂ سفر بنا دیا، قبیلے در قبیلے قافلے در قافلے اُن تمام قصبوں اور شہروں میں جہاں جہاں پارچہ بافی کی طنابیں کھنچی ہوئی ملیں یہ وہیں خیمہ زن ہو گئے اور جب خیموں کی تعداد بڑھتی گئی تو انہوں نے مستقل چھاؤنیاں بنالیں اور جب وقت کی زلفیں صدیوں کے شانوں پر بکھر گئیں تو ان اہل نظر نے تازہ بستیاں آباد کر لیں، اتر پردیش صرف ہمالیہ کی ترائی اور شمالی و مشرقی ہند میں ہی نہیں بسا ہوا ہے، یہ سمندر کے ساحلوں تک لنگر انداز ہے۔

الہ آباد قدیم تاریخی شہر ہے، ایک مذہب کے لئے پوِتر، پریاگ ہے تو مغربی ہند کی مومن برادری کے لیے ان کے اسلاف کا مقدس وطن اور آبا و اجداد کا دیس جس کے بزرگنج، اور پورہ، میں ان کی موروثی یادگاروں کے گنجینے دفن ہیں۔ الہ آباد دیہاتوں میں بسا ہوا ضلع ہے تو فتی طیب کا مئو، مئو ایمہ، فتح پور، منسوا، پھولپور، بادشاہ پور، پھاپھامئو، جھونسی، سکنرا، اکبر گنج، دیوان گنج، کوڑہ، بھمنی، ان سارے دیہاتوں اور قصبوں کے نام ہمارے کانوں میں بچپن سے گونج رہے ہیں، بھیونڈی، بمبئی اور مالیگاؤں میں الہ آبادیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، یہ تمام قریے اور قصبے قرنوں سے آباد ہیں اور صدیوں پہلے سالار مسعود غازی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے اسی لیے غازی

میاں بابا بادشاہ کا میلہ، اور ان کی برات بالے میاں کے ہنگاموں پر موقوف اس علاقے کی سالانہ رونق ہے۔

سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے حساب سے الہ آباد کی مومن آبادی ۲۹,۹۴۴ تھی۔ بافندگی پیشہ کے علاوہ دیہاتوں میں کھیتی باڑی بھی ہوتی تھی، کچھ لوگوں کی زمینداریاں تھیں، شہر میں عمائدین اور رؤسا میں انصاری برادری کے صاحب حشمت و ثروت لوگ تھے بڑے دبدبے والے اور پر وقار شخصیتیں تھیں پیشے مختلف النوع تھے، رنگ کے کارخانے عام تھے، ملازم پیشہ "بابو" بہت سارے تھے، دین داری اور سیاست تو یوپی کے مسلمانوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، ہمدردِ قوم کا کال نہ تھا، مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں الہ آباد کے خسرو باغ میں مومن کانفرنس کا عظیم الشان اجلاس ہوا تھا جس کی صدارت انبالہ کے وکیل شیخ ظہیر الدین (علیگ) نے کی تھی، (سنہ ۱۹۳۰ء) میں شہر کے وکیل نظام الدین (علیگ) آل انڈیا جمعیۃ المومنین کے جنرل سیکریٹری رہ چکے تھے، ڈاکٹر بدر عالم سلامت اللہ (اسسٹنٹ انجینیر)، ایم عبد الرزاق اور مولوی جگہن برادری کے ممتاز افراد تھے قمر الدین بدر الدین عطر فروش کا نام تو بڑے بڑے شہروں میں عطر کی تجارت کی علامت بن چکا تھا، اس خانوادے نے مومن کانفرنس اور اس کے بانی مولوی علی حسین عاصم بہاری (سنہ ۱۸۹۰ء-سنہ ۱۹۵۳ء) کی بڑی خدمات کی تھیں، انہیں کے الہ والے مکان میں مولوی صاحب نے دائمی جل کو بیٹھ کہا تھا یہی وہ قائد ملت تھے جن کی دعوت پر ہزاروں مومن جوانوں نے بیٹھک کہا تھا، الحاج قمر الدین کے صاحبزادے صلاح الدین انصاری (دیہومون کیمیکل ورکس الہ آباد) کے مالک بھی ہمدرد ملت ہیں الہ آباد ویفیر ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے ہیں اسی الہ میں محمد ایوب انصاری ایک بے لوث خادم قوم ہیں جن کی تصنیف "نجابت و شرافت یا لباس تقویٰ" برادری کی صنعت پارچہ بافی کی دلچسپ داستان ہے اور اسی کتاب میں انصاری صاحب نے مومن برادری کا وہ صحیفہ جو 'مفید المومنین' کے نام سے ایک صدی قبل "ہر گھر میں پڑھا جاتا تھا من و عن نقل کر دیا ہے" مفید المومنین نادر و نایاب ہو چکی ہے، انصاری صاحب مرلینا عاصم بہاری میموریل سوسائٹی الہ الہ آباد کے صدر رہ چکے ہیں۔ حکیم ضیاء الدین مشہور طبیب حاذق ہیں رفیق الدین انصاری برادری کے بڑے بہی خواہ اور ہمدرد قوم تھے رفیع احمد صدر جمعیت الانصار نے کرپس مشن کی آمد پر ۸ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء میں پنڈت نہرو کی موجودگی میں آنند بھون میں ملاقات کر کے مومن کانفرنس کی نمائندگی کی تھی۔

ضلع الہ آباد کی تحصیل پھولپور میں کئی اہلحدیث خاندان آباد تھے جن سے راقم کی والدہ کی
رشتہ داری تھی، والدہ ماجدہ کی اسی قصبے کے محلے بھینیا ٹولہ میں ولادت ہوئی ان کے بھائی
حاجی محمد یٰسین انصاری بڑے دیندار اور صوفی منش بزرگ تھے ان کے صاحبزادوں میں مرحوم محمد
امین انصاری تبلیغ وارشاد کرتے تھے، محمد حنیف انصاری سیاسی اور سماجی ورکر ہیں اور ایک
صاحبزادے ڈاکٹر شریف انصاری کینیڈا کے مشہور اور دلکش شہر وینکوور میں بس گئے ہیں اور تبلیغ
اسلام میں مشغول ہیں، راقم کی ددھیال پھولپور کے گاؤں اکبر گنج میں تھی یہیں سے والد محترم
محمد ابراہیم مومن سب سے بڑے صاحبزادے ذاکر حسین (کلو سیٹھ) اور ہمشیرہ حلیمہ کو لے کر
بیسویں صدی کے اوائل میں بھیمڑی آئے اور یہیں بس گئے۔

اتر پردیش کی زرخیزی اور مردم خیزی مشہور ہے، مبارکپور، مئو، اعظم گڑھ اور جونپور علماء و فضلا
کی آماجگاہیں تھیں، علم دوست امراء اور سرپرستوں کی بارگاہیں اور شریعت و تصوف کی خانقاہیں
تھیں، مئو نام میں کون سی ایسی مزہ لینے والی بات ہے کہ یہ کئی قصبوں اور قریوں کی قسمتوں کا
قرعۂ فال بن گیا، مئو ناتھ بھنجن، سنگرامئو (جونپور)، مئو آئمہ اور پھاپھامئو (الٰہ آباد) گوپامئو
(ہردوئی) میں تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ "مئو" موجود ہے، الٰہ آباد ضلع کا مئو آئمہ شہر
الٰہ آباد سے بائیس ۲۲ میل کی مسافت پر واقع ہے، مسلمانوں کی اکثریت غالب ہے اور اس پر
مومن برادری کا عددی غلبہ نمایاں رہا ہے، صنعت پارچہ بافی پیشۂ آبا رہا اور تجارت تمول اور
ثروتمندی کا وسیلہ تھا، تعلیم، دینداری اور تقویٰ سے تعلق خاطر تھا اور روایت ان کے شرف
اسلام کا سلسلہ سید سالار مسعود غازی کی اشاعت و تبلیغ دین سے ملاتی ہے اسی لئے جاہل
طبقہ اور دیہاتی ان کا سالانہ علم اٹھاتے ہیں اور عرس مناتے ہیں۔

مئو آئمہ کا نام مسلک اہلحدیث کے تعلق سے انیسویں صدی سے اور زیادہ منور ہو گیا تھا
جب مولانا عبداللہ جہاد نے جو ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، دہلی جا کر شاہ اسحاق دہلوی
(متوفی سنہ ۱۲۶۲ھ) سے درس لیا اور مبارکپور کے قریب اٹلو کو مرکز بنا کر مسلک اہلحدیث کی
ترویج و اشاعت کرنے لگے، مئو ناتھ بھنجن ان کی مساعی جمیلہ سے اہلحدیث مسلک کا گڑھ
بن گیا، مئو آئمہ کے محلہ کوٹ میں کلی طور پر اہلحدیث آباد ہیں، ان کے علاوہ راسخ العقیدہ مسلمان
اور اعتدال پسند احناف کی بھی بڑی تعداد ہے اور دینی تعلیمات کے فروزاں مدارس و مکاتب
کی روشنی میں بدعات کا دھندلکا چھٹنے لگا ہے، مسلک نہ کبھی کفو کا مسئلہ بنا اور نہ رشتہ ازدواج

میں گرہیں ڈالیں۔ یہ مومن برادری میں فروعی مسئلہ رہا البتہ مناکحت اور طلاق کے معاملات میں مسلکوں
کا تصادم ضرور ہوتا رہا۔ برادری میں ممتاز شخصیتوں اور برگزیدہ ہستیوں نے ہمیشہ سماجی درجہ بندی
کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے چاہے وہ زمینداروں کا بالادست طبقہ ہو یا نومسلم، قمارے راجپوتوں کی
جماعت ہو۔ مئوائمہ کی تاریخ میں سلیمان درگاہ والے یا رنگ والے کا نام ہوشربا طلسمی نام بن گیا ہے
انصاف پسندی کی سطح پر اور مساوات کی اسلامی بنیاد پر انھوں نے ہر قسم کی بالادستی کا ہاتھ قلم
کرکے رکھ دیا تھا۔ جونپور اور مبارکپور اعظم گڑھ کے علاقے[1] میں مسلمان زمینداروں کی قدیم آبادیں
نومسلم رقہاروں پر مشتمل تھیں یہ نسبی راجپوت تھے۔ عرفی شرفا اور اشراف کے اونچے طبقہ کے
تے اجلاف تھے۔ جلاہے، سبزی فروش، قصاب، دھنیے (نداف) اور دیگر پیشہ ور جماعتیں
موردِ تحقیر و تضحیک بنی ہوئی تھیں بیک مومن۔ انصاری "جلاہے" وطن پرستی اور جنگِ آزادی کے
میدانوں میں اتنے جیالے ثابت ہو چکے تھے کہ تاریخ میں ان کے ناموں کی سرخیاں نظر آنے لگی ہیں
جمعیۃ العلماء، کانگریس اور مومن کانفرنس کے پرچموں تلے لڑنے والے مجاہدین میں سب سے ممتاز
نام عبدالحکیم ابن عبدالسمیع کا ہے جو ایک شریف بنکر خاندان کے واحد چشم و چراغ تھے، مئو میں
کانگریس کمیٹی کے تاحیات صدر اور الٰہ آباد ضلع کمیٹی کے برسوں تک رکن رہے، دستکاری کی پارچہ
بافی کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور حکومت سے اپنے بل بوتے پر بہت ساری سہولتیں بنکر
طبقہ کے لیے حاصل کیں، تعلیم نسواں کو بڑی اہمیت دیتے تھے، اسی خیال سے کہ سماجی بہتری
علمی ترقی اور بہبودی کا انحصار عورتوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے میں ہے حکیم جی پہن (وہ اسی
نام سے مشہور تھے) نے لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا۔ حکیم جی پہن صاحب ایک مخلص و بے لوث خادمِ قوم تھے جنھوں
نے نہ کبھی جاہ کی چاہ کی اور نہ صلے کی پروا۔ اسمبلی کی ممبری ہو یا پارلیمنٹ کی رکنیت کبھی کسی رہنما
کی چوکھٹ پر گئے اور نہ کسی وزیر کا دروازہ کھٹکھٹایا بلکہ باصلاحیت جوانوں اور برادری کے دیگر
انصاریوں کے حوصلوں کو بڑھاتے رہے اور ان کے سامنے آسمان نزدیک ہیں کی نصیحت کرکے
قوتِ پرواز بڑھاتے رہے، ایک مثال محمد امین انصاری کی ہے جن کا مئوائمہ کی شخصیتوں میں شمار
ہوتا ہے آپ اترپردیش اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر رہے۔ کانگریس کا صد سالہ جشن جو مومن
کانفرنس کے زیرِ اہتمام ۳ر اور ۴ر دسمبر ۸۵ء کو نئی دلی میں منایا گیا آپ اس کے خصوصی رکن

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۱۵۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ علمائے مبارکپور، ص ۲۳

نامزد کیے گئے تھے، امین انصاری وی۔پی۔ سنگھ کی جوائنگ وزارت میں وزیر صنعت تھے اور بعد میں راجیہ سبھا کے رکن بنے، مدینہ منورہ میں وفات پائی اور اسی مقدس سرزمین میں سپرد خاک ہوئے۔

انگریزی ادب میں ایک مشہور نظم ہے "We are Seven" "ہم سات ہیں" مئو ائمہ میں بھی ایک تاجر پیشہ انصاری کنبہ اپنی اخوت کے سبب "آٹھ بھیا" نام سے مشہور ہے، یہ حاجی امام الدین کے آٹھ بیٹے تھے اب قدرت نے ان اخوان الثمانیہ کو اقالیم ثلاثہ بنا دیا ہے حاجی عبدالصمد امام الدین، حاجی عبدالحمید امام الدین اور حاجی عبداللطیف امام الدین یادگار رہ گئے ہیں، حاجی عبدالصمد ایک دہائی سے زیادہ مدت تک ٹاؤن ایریا کے چیئرمین تھے پچھلی نصف صدی سے اپنا "مدرسہ چشمہ صمدیہ" اپنے ذاتی اخراجات ومصارف سے چلا رہے ہیں۔ یہ گھرانا کٹر اہلحدیث ہے اور کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا ہے۔

اسی خانوادے کے ایک فرد ڈاکٹر عبدالمنان انصاری (ایم۔بی۔بی۔ایس) ہیں جو بھیونڈی میں مستقل آباد ہو گئے ہیں، آپ حکیم چیئرمین کے داماد ہیں، ان کی علم دوستی اور ادب نوازی سے کئی محفلیں روشن ہیں باذوق اور بااخلاق اور وضعدار ہیں، کچھ برسوں تک موصل (عراق) سے "مواصلت" بسلسلہ ملازمت بھی، اس حقیر تصنیف کے جو تین حقیقی محرکات ہیں مثلاً میرے عزیز بھانجے محمد حسن خلیل بی۔ایس۔سی (لالہ سیٹھ) اور حسن بھوپال ان میں ڈاکٹر عبدالمنان انصاری پیش پیش ہیں۔ آپ کے داماد سعید احمد فرزند ڈاکٹر جمیل الدین امریکہ میں زیر تعلیم ہیں

مئو کا دوسرا اہلحدیث اور سب سے زیادہ تعلیم یافتہ گھرانہ حکیم قمرالدین کا ہے، یہ محلہ کوٹ میں آباد تھے، یہ بھی کثیرالعیال تھے، پانچ لڑکے تھے اور ہر ایک کی اولاد "ہونہار بروا" کی صفات رکھتی تھی، حکیم ضیاءالدین کے لڑکے شاہد اب آباد میں سکونت پذیر ہیں، ڈاکٹر عماد امریکہ میں مقیم ہیں، ڈاکٹر جمیل الدین بن حکیم قمرالدین بھی بابرکت و باکمال تھے۔ چار بیٹے چاروں تعلیم یافتہ ڈاکٹر فہیم مئو ائمہ میں پریکٹس کر رہے ہیں، ڈاکٹر سعید احمد مقیم امریکہ ہیں ان کے بھائی رشید احمد بھی ان کے ساتھ ہیں، سعید احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ "تشکیل و تنظیم تجارت" "Business Management" میں لیکچرر ہیں، حکیم ضیاءالدین کے تیسرے صاحبزادے جلال الدین محکمہ آثار قدیمہ (الہ آباد) میں ایک ممتاز عہدہ پر فائز ہیں، جلیل الدین کے علاوہ ڈاکٹر شفیع الزماں ہیں جو مدھیہ پردیش کے محکمہ صحت میں عہدہ دار ہیں۔

مئو میں ڈاکٹر جمیل الدین انصاری کے رفقاء کی جد وجہد سے ایک اسٹینڈرڈ ہائی اسکول

برادری میں مغربی تعلیم کو بیحد فروغ دے رہا ہے، اسی طرح ڈاکٹر احمد اللہ دایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈی۔ ایم۔ آر۔ ای، بھی قصبے کے مایۂ ناز فرزندوں میں سے ہیں۔ بابو محمد حسن ایک اچھے شاعر ہیں۔

اس قصبہ میں منشی اسحاق کا گھرانہ انصاریوں میں بیحد ممتاز ہے، ان کے بڑے صاحبزادے "چھوٹے لال" بڑے تاجر ہیں، مؤائمہ کے مہاجرین جو بھیونڈی میں اس دوسری نصف صدی میں تجارت و معاش کے سلسلہ میں آکر آباد ہوئے ہیں انہوں نے یہاں بھی اپنے وطن کی تعلیمی، تجارتی اور دینی روایات کو برقرار رکھا ہے، ان میں مؤائمہ کے بزرگ سراج الدین کے دو حوصلہ مند بیٹے حاجی ضیاء الدین اور حاجی نظام الدین ہیں، جنہوں نے صنعت پارچہ بافی میں بھیونڈی شہر کے پرانے تاجروں اور روساء کو پیچھے ڈال دیا لیکن فلاح و بہبود کے کاموں میں یہ دونوں بھائی سب سے آگے رہتے ہیں، حاجی نظام الدین انصاری بھیونڈی کانگریس کے صدر ہیں اور حاجی ضیاء الدین انصاری کے قابل صاحبزادے ڈاکٹر غیاث الدین نے ایک شاندار ذاتی ہسپتال "رازی" کی بنیاد رکھ کر شہر کے مریضوں کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔[1]

مؤائمہ کی ایک تیسری ممتاز ہستی عبدالحکیم سیٹھ کی ہے، انہوں نے بھی اپنے وطن سے تعلق خاطر کو برقرار رکھا ہے اور وطن سے دور رہتے ہوئے بھی وطن والوں کے دلوں کے قریب رہتے ہیں جہاں انھوں نے ایک انصار گرلز کالج قائم کیا ہے اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کی ایک دیرینہ آرزو کو اپنے جود و سخاوت سے پورا کر دیا ہے، بھیونڈی میں ناگاؤں علاقے میں انہوں نے ایک شاندار مسجد تعمیر کرا کے ثواب جاریہ کا کام کیا ہے، ایسے عمل صالح کرنے والوں کو حدیث نبوی سے یہ بشارت ملتی ہے:

"جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے ایک مسجد بنائے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ویسا ہی گھر بنا دے گا" [2]

مؤائمہ میں مساجد و مدارس کی کبھی کمی نہیں رہی، ایک قدیم ابتدائی مکتب انوار العلوم پچھلی نصف صدی سے قرآنی تعلیم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ صنعت پارچہ بافی کی تاریخ عہد بہ عہد ظہور پہلوان کا نام اس لئے نمایاں ہے کہ یہ مؤائمہ کے پہلے صنعت کار تھے جنہوں نے پاور لوم لگایا۔

---

[1] ان تمام حضرات کا اجمالی ذکر باب "بھیونڈی کی مومن برادری کے سیاسی، صنعتی، تعلیمی و سماجی شہ پارے" میں آرہا ہے۔

[2] صحیحین۔ بخاری (اردو ترجمہ) ج ۱، ۳۲۳، ۱۹۰۶/۱، حدیث نمبر ۴۲۹

الہ آباد کی تحصیل پھولپور میں جہاں کی ایک بڑی جماعت بھیمڑی میں غدر کے بعد ہجرت کر کے آباد ہو گئی تھی، بے شمار گاؤں اور "گنج" آباد ہیں ان میں برادری کی اقلیت ہے۔ مبارکپور، کپسہ، بہریا، سکندرہ (سکنڑہ)، کوراپور، بھرسی، بارہ پورہ، اکبر گنج، دیوان گنج کے پرانے خاندانوں کی یادگار نسلوں کی کئی فصلیں اس شہر میں لہلہا رہی ہیں، لال گوپال گنج کے خان جہان پورہ میں مومن گھرانے آباد تھے اور نواب گنج میں بھی انکی بڑی تعداد موجود ہے، اسی طرح تحصیل سرائے عاقل اور چائل میں انصاری بکثرت عرصہ دراز سے بسے ہوئے ہیں، مانڈہ گاؤں سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کا وطن ہے انصاری گھرانوں کی تعداد کم نہیں لیکن ان بستیوں کے شمار کے بعد بھی برادری پورے اطراف ضلع میں سوائے قصبہ مؤائمہ کے کہیں بھی اکثریتی تعداد میں موجود نہیں ہے

کے قریوں کے مومنوں کو کشش روزگار نے بڑے شہروں اور صنعتی مراکز کی طرف کھینچ لیا ہے، نصاریوں کا ایک طبقہ الہ آباد میں بیڑی سازی کی تجارت اور مزدوری کرتا ہے۔ معاشی محرکات اور اقتصادی عوامل نے یوپی کے باشندوں کو ہمیشہ سے حرکت پذیر بنا دیا ہے چنانچہ آج تک بھیمڑی مالیگاؤں اور بمبئی میں مزدوروں اور صنعتکاروں کی بڑی تعداد آمد و رفت رکھتی ہے، ہجرت کا سلسلہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف سے شروع ہوا اور وقفے وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا در آں تک ٹوٹا نہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب کرگھا صنعت کی تباہی تھی ۱۸۶۰ء میں الہ آباد ضلع میں دس ہزار کرگھے تھے تین سال بعد فقط چار ہزار کرگھوں پر کام ہو رہا تھا دوسری جگہوں میں بھی تخفیف اور تقلیل کا یہی عالم تھا [1]

لکھنؤ مشرقی تہذیب و ثقافت کا مرکز تھا اور رئوسا، نوابوں کی تعیش کوشی اور رنگین زندگیوں کی رنگا رنگ بزم آرائیاں تھیں حریم ناز اور شبستان محبت میں حریر و پرنیاں جیسی ہلکی پھلکی زندگی تھی وہ قفس تو محرم میں ورنہ ہمیشہ فضا میں گھنگھروؤں کی جھنکار اور دادرا اور ٹھمری کے الاپ گونجتے رہتے تھے، عبدالحلیم شرر نے اپنے مضامین بعنوان "ہندوستان میں مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ" جو نومبر ۱۹۱۳ء سے ریاست حیدرآباد سے نکلنے والے رسالہ دلگداز میں مسلسل شائع کرتے رہے اور رجب علی بیگ سرور (۱۷۸۶ – ۱۸۶۷ء) نے لکھنؤ کے تمدن کے بارے میں جو لکھا ہے اُن سے اُس رنگین عہد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں خصوصاً جب یہ کہا جاتا ہے "فردوس بر روئے زمین" لکھنؤ تھا جو فردوس گوش تھا اور جنت نظر

---

[1] گیانندر پانڈے (انگریزی) ص۶۶ — Gyanendra Pandey, 'The Construction of Communalism in Colonial North India', Oxford Univ. Press, Delhi 1990.

ایسے عہد میں عیش و تنعم کے لوازمات آرام طلب زندگی کی آسائشیں، تزئین و آرائشیں اور لہو
ولعب کے ساز و سامان کی جو بہتات ہوتی ہوگی اس کا اندازہ ان لکھنوی مصنفین، کی تحریروں سے
کیا جاسکتا ہے، ملبوسات ہی کو لیجیے، نوابوں اور امیروں کے محلات میں توشہ خانے بھرے رہتے
تھے، ویسے چابک دست صناع اور کاریگر بھی موجود تھے ململ پر کشیدہ کاری کا کام جس عمدگی سے لکھنؤ
کے دستکار کرتے تھے ان کا ہاتھ کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا، چکن کی دستکاری میں یہاں کے کاریگر
ید طولیٰ رکھتے تھے کھلے گلے کا جامہ نفیس ململ سے تیار کیا جاتا تھا اس پر عمدہ کشیدہ کاری ہوتی
تھی، انگرکھا، اچکن، چپکن اور شلوکا کے لئے خاص قسم کے پارچے بُنے جاتے تھے، لکھنؤ کے
نواح میں انصاری بنکر یہ مال تیار کرتے تھے زیادہ مال ٹانڈہ سے آتا تھا فیض آباد اور اکبر پور میں
بھی انصاری پارچہ باف موجود تھے، رائے بریلی، پانی پت اور جائس سے آکر بس گئے تھے اپنے کرگھوں
پر ململ بُنتے تھے، ٹوپیوں کی کئی قسمیں رائج تھیں، کم رخی، دو پری (دو پلی) مندیل، کلاہ، نئی
وضع کی ٹوپیاں تھیں، رنگیلے نوجوان، بانکے، فوجی قسم کے جوان، امیر، نواب، بیگمات سادہ
وضعداری برتتے تھے لیکن فیشن اور وضع و قطع میں "تغیر رنگ عالم" عجیب ذریعہ رہتا تھا۔

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ یہاں پچیس ہزار کے قریب برادری کے افراد تھے، ۱۸۹۱ء کی مردم
شماری صرف ۵,۹۶۶ مومن افراد کی گنتی بتاتی ہے اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ جب نوابی ختم ہوئی
"تو سارا ٹھاٹ پڑا رہ گیا" اور انگریز بیوپاری سب لاد کر انگلستان لے گئے جو ہندوستان میں پڑا ہوا
چکا تھا، دستکاروں کے معاش کا دروازہ بند ہو گیا اور انگلیاں ننگی ہو گئیں، ڈاکٹر حافظ محمد حبیب
اللہ ارمان تاریخ مومن۔ انصار دستکار ۱۹۳۰ء میں لکھتے ہیں (ص ۲۸-۲۹)

"اس کے اطراف کاکوری میں نہایت قلیل لوگ اپنے آبائی پیشہ پر قائم ہیں، یہیں کی
نہایت اور زر مشہور ہے اور طرز معاشرت بہت اچھی ہے، نہایت نفیس اور زرینہ
لوگ ہیں، جب سے یہاں ڈاکٹری کالج کھلا ہے بہت لڑکے انصاریوں کے اس میں
بھی تحصیل علم کر رہے ہیں گو شاہی اودھ کا زمانہ نہیں رہا لیکن پھر بھی سبحان اللہ
اب تک اسلامی سلطنت کا سماں نظر آتا ہے گذرے وقت میں بہت کچھ موجود ہے"

آگے چل کر فاضل مصنف جنہوں نے مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی کتاب "کتاب المنوال
رابطہ" کی طرح کچھ شہروں کی "مومن برادری" کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں لکھنؤ
کے ممتاز مومن افراد "جناب ظفر الحسن صاحب وکیل، قاری حافظ محبوب علی صاحب مدرسہ فرقانیہ

جنگ ٹا تھا' ان میں اسلوب احمد انصاری (انگریزی)' فرنگی محل خانوادے کے مہدی انصاری (عربی)' اقبال انصاری (عربی) وغیرہ راقم کے معاصرین اور رفقائے کار تھے جب خود راقم بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے "شہیدوں میں خون لگا کر" شامل تھا (۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۰ء) یہ ادارۂ علوم اسلامیہ کی بات ہے۔

لکھنؤ کی صنعت پارچہ بافی کے آخری دور کے بارے میں حرف آخر لکھنا ضروری ہے جب ایک انگریز مصنف ولیم ہوئے نے ۱۸۸۰ء میں لکھا۔

> "لکھنؤ کے جلاہے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر ملازمت کی تلاش میں شہر سے جا رہے ہیں' لکھنؤ کے مشرق میں ٹانڈہ اور ضلع فیض آباد کے دوسرے قصبوں میں بھی معاشی بحران اور دباؤ پھیل گیا ہے۔ اور جامدانی کی صنعت ٹھپ ہو گئی ہے۔" لے

اودھ: ٹانڈہ' فیض آباد' اجودھیا

اودھ کے نام سے اب اس 'شام اودھ' کا تصور نہیں آتا جو ایک پوری مشرقی تہذیب کی شاعرانہ علامت تھی جب 'شام' کے شانے پر نغمہ و سرود کی زلفیں پریشان ہونے لگتی تھیں؟ اور شبستان حرم میں بیلا چنبیلی کے گجروں کی مہکار پھیل جاتی تھی۔ اب تاریخ کے پردے پر یہ ساری پرچھائیاں خون میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ اب اجودھیا اور فیض آباد کے ذکر سے خیالات پراگندہ اور ذہن پریشان ہو جاتے ہیں اور قربان گاہوں سے خون کی مہک آتی ہے۔ اور نغمہ و سرود میں مجروح معصوموں کے گھائل دلوں سے نکلتی ہوئی فریادیں اور ان کی چیخیں سنائی دیتی ہیں ——— ہندستان کی تاریخ میں انسانوں کا آج تک اتنا خون بہایا گیا ہے کہ اب رود گنگا بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے' اجودھیا اور ہنومان گڑھی (۱۸۵۴ء/۱۲۷۱ھ) کے خونچکاں وقعت تاریخ کا بجھا بجھا نوشتۂ دیوار نہیں بلکہ ایک خونیں باب ہے' کربلا کا المیہ تاریخ ہر دور میں دہرتی ہے صرف جغرافیہ بدلتا رہتا ہے' حق و باطل کی جنگ اور آزادی کی جدوجہد میں ہندو مسلم دونوں کا ساتھ ساتھ خون بہا ہے اور دنیا کا کوئی ماہر نفسیات یہ نہیں بتا سکتا کہ اس دھارے میں

لے William Hoey: 'A Monograph on Trade and Manufactures in Northern India', Lucknow, 1880, P. 28

کونسا ہندو خون ہے اور کونسی خون کی لکیر مسلمان کی ہے، اس دھارے میں مشہد بالاکوٹ کے مجدد شہید سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے خون کا رنگ سب سے گہرا ہے۔

ان خونیں واقعات نے سارے ضلع کے جلاہوں کو سراسیمہ کر دیا اور بافندگی کے سارے تار ٹوٹ گئے۔ ٹانڈہ میں جہاں سب سے زیادہ جامدانی اور ململ کے کپڑے تیار کئے جاتے تھے نوربافوں کی ہجرت کے سبب کرگھے بند ہو گئے تھے۔ ۱۸۵۶ء تک جب انگریزوں نے اودھ کو اپنی عملداری میں لیا ٹانڈہ سے ایک لاکھ ۵ ہزار لاگت کا مال صرف نیپال کو بھیجا تھا اب یہ برآمد نصف سے کم ہو گیا۔ ۱۸۸۰ء تک اس میں اور تخفیف ہو گئی، ۱۸۶۲ء تک یہاں لگ بھگ ۱۱۲۵ کرگھے تھے بیس سال سے کم مدت میں ان کی تعداد ۸۷۵ ہو گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۱۸۹۰ء تک ٹانڈہ میں صرف ۲ نورباف خاندان باقی رہ گئے تھے جو جامدانی کا کام جانتے تھے۔[1]

فیض آباد اور اجودھیا کے قریب سنکھاڑا ایک بڑا تاجر تھا اسی کے متصل قریوں میں حضرات شیخ انصاریوں کی بستیاں تھیں یہ لوگ سالار مسعود غازی کے ہمراہ زمرۂ مجاہدین میں آکر ان مقامات میں بس گئے" مولوی غلام جیلانی ڈپٹی کلکٹر در عبدالشکور رئیس قوم مومن [illegible] (۱۹۳۰ء)

اجودھیا اور ہنومان گڑھی کے خونچکاں معرکوں (۱۸۵۲-۵۵ء) میں جو مجاہدین شہید ہوئے ان میں شیخ انگو نورباف (۱۸۲۷ء) اور شاہ عثمان شہید کے مزار آج بھی قریب موجود ہیں۔ فیض آباد اور ٹانڈہ سے جو خاندان ہجرت کرنے پر مجبور رہے ان میں منشی بیٹھو اور [illegible] کو مانکپور میں پناہ ملی، شیخ حمید اور منشی امان اللہ کاسی میں بس گئے، چودھری الٰہی بخش [illegible] کے ایک [illegible] جو جوہری تھے ٹانڈہ سے اپنے [illegible] رشتہ داروں کو [illegible] چھوڑ کر بمبئی چلے آئے ان کا خاندان [illegible] کے [illegible] سراج الدین انصاری، قمرالدین انصاری اور مصباح الدین انصاری [illegible] آج تک آبائی پیشہ بافندگی پر قائم ہیں۔ اسی خاندان کے ڈاکٹر [illegible] کے بھائی ڈاکٹر نثار احمد نے آنکھوں کے علاج کے لئے ٹانڈہ میں پہلا ہسپتال کھولا۔

---

[1] [illegible] ٹانڈہ۔ الف

گیارھواں باب

پورب دیس کے نورباف

ہندستان کے ظلمت کدے میں نورِ اسلام پھیلانے والا چراغ جو ایوانِ تاریخ کے طاقچے میں سب سے پہلے روشن ہوا اُسے سید سالار مسعود غازی کے ہاتھوں نے جلایا تھا اور جن کی دعوت و عزیمت کے عظیم عسکر کے ہر مجاہد کے ہاتھوں میں تبلیغ و اشاعتِ دین کی مشعل فروزاں تھی اور توحید کا عَلَم سربلند تھا، وقت کا تعین تیقن کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا لیکن اولیت کا سہرا انہیں 'غازی میاں دولھا' کے سر ہے البتہ یہ تاریخی اعتبار سے مسلم ہے کہ پانچویں صدی ہی کی ابتدا سے شمالی ہند اور دیارِ شرق سلطان محمود غزنوی کی مہمات اور فتوحات کے زمانے ہی سے مسلمانوں کی آمد سے اسلام سے روشناس ہو چکا تھا اور نعرۂ تکبیر کی گونج سے کئی صدیاں روشن ہو گئیں اور وسعتیں نکھر گئیں۔ سید سالار مسعود غازی جب تبلیغ و اشاعتِ دین کا لشکر لے کر وارد ہند ہوئے تو دریائے اٹک کے کنارے آباد عبدالرحمٰن انصاری بن جلال سدید انصاری بن ابوالحسن انصاری بھی مع اہل و عیال و قرابت داروں کے شاملِ لشکر ہو گئے۔" دہلی کی فتح نے مجاہدین اسلام کا دل بڑھا دیا، آگے بڑھتے تو ستر کھ (ضلع بارہ بنکی) کو مرکز بنا لیا اور یہیں سے تبلیغی دستوں کو مختلف "ٹکوں" کی سرکردگی میں اطراف و جوانب میں بھیجتے رہے۔ قنوج، کڑا، کیورہ بہرائچ اور بنارس تک مسعودی پرچم لہرانے لگے اور آفتابِ اسلام کی ضیاپاشیوں سے یہ سارے علاقے جگمگانے لگے، خاص طور سے بنارس کی فتح نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی۔ غازی میاں نے ملک افضل کو ان کے رفقا کے ساتھ بنارس اور اس کے نواحی علاقوں میں بھیجا، ان کا روضہ دوسرے شہداء کے ساتھ ان اطراف میں مشہور ہے[1] ہر قصبہ اور ہر شہر میں جہاں جہاں 'ملک حضرات' اور بہادروں کو متعین کیا وہیں ان بزرگوں کی قبریں زیارت گاہِ خلق بن گئیں۔ سالار مسعود غازی بہرائچ جاتے ہوئے چند دنوں تک اعظم گڑھ کے بھگت پور میں پڑاؤ ڈالے

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۴ بحوالہ مرآۃ الاسرار

پڑے رہے[1]۔ خلاصۃ تاریخ مسعودی میں ہے کہ آپ ۴۲۴ھ میں ستر کھ آئے، سارے اتر پردیش میں ہر شہر و دیار میں سالار مسعود غازی میاں کے لشکر کے کسی نہ کسی شہید کا مشہد ضرور ملیگا۔ گنج شہیداں کے سناٹوں میں نجانے کتنے گوہران آبدار دفن ہیں، رائے بریلی، جائس، سلطان پور، فیض آباد، پرتاب گڈھ، اعظم گڈھ، جونپور، غازی پور، بنارس اور سارے اودھ میں جہاں جہاں مقابر شہیداں موجود ہیں یہ تمام سالار مسعود غازی کے گرے ہوئے شہسواروں کے آثار ہیں، تاریخ المنوال والجلا میں قاضی اطہر مبارک پوری نے معتبر حوالوں سے بڑی صراحت کے ساتھ "دعوت و عزیمت" کی داستان لکھی ہے کہ کس طرح بزمانہ سید سالار مسعود غازی ان کے رفقاء "ملک افضل بغرض فتح بنارس مع ملک علوی نائب، ملک طاہر بمقام سو اور ملک مردان بمقام شادی آباد غازی پور اور ستر کھ سے ہی ملک ساجی بمقام ٹانڈہ متعین ہوئے تھے۔[2]

ضلع رائے بریلی میں قصبہ اودیا نگر کے محاصرے میں عبدالرحمن انصاری اور سید عماد الدین جیسی دونوں شہید ہوئے اور وہیں ان کے مقبرے ہیں، گئے اور ان کی اولاد و احفاد اسی جگہ بس گئی اور یہ انصاری محلہ کہلانے لگا، کثیر العیالی اور تکاثر نے خاندانوں کو سینکڑوں خانوں میں بانٹ دیا اور یہ بارہ محلوں میں سماگئے اور رفتہ رفتہ ضلع رائے بریلی کے مختلف قصبات و قریات پر قابو پالیا، جب محمد غوری نے ہندوستان فتح کیا تو اودیا نگر نے جائس کا نام پایا اور انصاری خاندانوں نے ان محلوں میں آکر بود و باش اختیار کرلی جو اسی مناسبت سے غوریانہ خورد اور غوریانہ کلاں کہلانے لگے۔

انگریزوں نے جب پارچہ بافی کی صنعت کے سلسلے کو بجز بجز ڈھیلا کردیا تو معاشی بحران سے بجروں کے قوی بھی مضمحل ہوگئے، ۱۸۶۰ء میں جائس قصبہ میں چھ سو (۶۰۰) انصاری خاندان میں ایک ہزار نفوس تھے اور گھٹ کر صرف چالیس رہ گئے تھے[3] تا لیف بانی کے آثار باقی نہ رہے اور نفیس ململ کی بافندگی ملیامیٹ ہوگئی اور صرف پچاس کاریگر برسر روزگار رہ گئے ان میں سے بھی صرف بیس بجروں کے پاس ان کے پیشے کر گھے تھے تھے ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے حساب سے

---

[1] نزہۃ الخواطر، اعظم گڈھ، ص ۹۰
[2] تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۹۵-۹۶
[3] Silberrad, Monograph on Cotton Fabrics P 47

ضلع رائے بریلی میں ۷۰۱ام نوربان تھے اور جائس میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی، دوسری مردم شماری کا اندازہ یہ بتاتا ہے کہ جائس میں یکہزار نوربات تھے اور بل برادری کے ڈھائی سو گھر رہ گئے تھے جو بارہ محلوں کے صرف دس محلوں میں بسے ہوئے تھے ور ان میں یہ محلے نمایاں تھے، شیخانہ، غوریانہ، قضیانہ، چودھرانہ، کچانہ، ان میں چھوٹے بڑے خلے خورد اور کلاں کے اوصاف سے ممیز تھے، یہیں کے انصاری گھرانے تہذیب و تعلیم دونوں میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے، تعلیم یافتہ افراد سرکاری عہدوں پر فائز تھے، بشیر الدین ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے صاحبزادے منظور احمد ایم۔ اے وکالت کرتے تھے وہ کل ہند مومن کانفرنس کے سرگرم رکن تھے، عبدالرحیم منشی جمعیۃ المومنین کے ناظم اور مسعود احمد سیکریٹری تھے۔ ضلع رائے بریلی میں انصاریوں کی تعداد چار ہزار سے پندرہ ہزار تک پہنچ گئی تھی [illegible] پوسٹ۔ سر قوم کے بڑے ہمدرد تھے، مولانا عبدالکریم منصب سجادگی کے سبب سے زیادہ قابل احترام ہستی تھے سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری رپورٹ بتاتی ہے کہ قصبہ جائس اور شاہ ولی، موضع نصیرآباد ور رائے بریلی میں مل کی بندش کے [illegible] زیادہ اثر پڑ چکے تھے[1]

سید سالار مسعود غازی کی مہمات کا منتہیٰ بہرائچ کا جنگل تھا، جہاں سے [illegible] ہوئے [illegible] تھی، میرٹھ، قنوج اور فتح آباد سے گذر کر سرجو ندی کے کنارے بہ مقام بہرائچ میں غازی میاں نے ڈیرہ ڈال دیا، مجملاً، سالار غازی اجمیر میں تولد ہوئے، اپنے ماموں سلطان محمود غزنوی کی مہم میں شریک رہے پھر سنجر ملک سے دل برداشتہ ہوکر سنجر شمال مغرب کی طرف مائل ہوگئے، جذبۂ دینی ایسا غالب آیا کہ تلوار اٹھالی تو کفر و شرک کو مٹانے کے لیے، اور بت شکنی کے لیے اور پھر بت پرستوں کو اپنی طاقت روحانی اور تعلیمات دینی سے مسخر کرنے لگے اور توحید کے نعرے بلند کرتے ہوئے کے ساتھیوں میں جگمگانے لگے اسلام لانے والوں میں سب سے بڑی تعداد یوپی کے جلاہوں کی تھی جو ایک زمانے تک "بالے بادشاہ" یا غازی میاں دولہے کی برات دیہاتی علم نشان اور جہیز کے (پلنگ پیڑھی) سامان کے ساتھ ہی جون کی شدید گرمی کے مہینوں میں بہرائچ جاتے رہے "غازی میاں مدد" "بالے بادشاہ مدد" کی پکار سے حکمران وقت بھی چونک پڑتے تھے، اکبر بادشاہ نے

---

[1] مردم شماری سنہ ۱۹۳۱ء صوبۂ متحدہ آگرہ اور اودھ (انگریزی) ج ۱۸۔ حصہ ۱ رپورٹ (الٰہ آباد ۱۹۳۳ء) ص ۴۲۶

بھیس بدل کر زائرین کے قافلے کو رخصت ہوتے دیکھا تھا۔

ان کے پیارے پیارے لقب تھے' سید الشہداء' آفتاب شہادت' شہید برحق' سالارِ اعظم اور مجاہدِ ہند جیسے بلند آہنگ القاب سے یاد کرنے کی وجہ ان کی جامع صفات ہستی تھی' ایک نوجوان مبلغ نے بہرائچ کے مہوؤں کے جنگل میں راجہ سہردیو کی سرکردگی میں اکیس راجوں کی فوج کا مقابلہ جس جواں مردی سے کیا اور شہادت (سنہ ۴۸۹ھ) پائی وہ اتنا جیالا تھا کہ اس کی شہادت سے ہزاروں خون کی سرخیاں جگمگانے لگیں سارے یوپی میں کوئی ایسا مقام اور قریہ نہیں ہوگا جہاں ایک نہ ایک ان کے لشکر اور دستوں کا مجاہد شہید نہ ہوا ہو۔

سید سالار غازی نے روحانیت اور علم و عرفان کا اجالا سارے ملک میں پھیلا دیا اور بالے بادشاہ کی روحانی بادشاہت ان کی شہادت کے بعد اور بھی وسیع ہوگئی دور دور سے ان کے پرستار' عقیدت مند' ہندو مسلم زائرین شاہ و گدا معتقدین ان کے مزار پر نذرانہ' عقیدت پیش کرنے کے لیے' پیش پیش رہتے تھے منتیں مانگی جاتی تھیں' چڑھاوے چڑھائے جاتے اور ان کی کرامات کے چرچے سارے ملک میں پھیلنے لگے' جس نے محمد بن تغلق کے دل میں تمنا پیدا کی کہ ان کے آستانے پر حاضری دے' فیروز شاہ تغلق فتح ٹھٹھ کے بعد منت اتارنے آیا اور چادر چڑھانے آیا۔ مراکش کا ابن بطوطہ جس نے شاید ایسا نظارہ اسلامی ملکوں میں کم ہی دیکھا ہوگا جیسا کہ یہاں ہندو مسلمان مزار کی پرستش کرتے تھے' محمد بن تغلق کے ہمراہ آیا۔

غازی میاں کی یاد میں بہرائچ جگہ جہاں سے ان کا لشکر گذرا تھا میلہ بھرتا تھا' میرٹھ میں نوچندی کے موقع پر ویسا ہی میلہ ٹھیلا ہر سال رونق لاتا تھا' لکھن پور (بدایوں) میں بہرائچ کے سالانہ عرس کی پرچھائیاں مقامی میلے میں دکھائی پڑتی تھیں' سنبھل میں نیزے کا میلہ ان کی شہادت کی یاد میں منایا جاتا تھا' یوپی کے ہر شہر' قصبہ اور قریہ میں مئو سے مبارک پور تک' میرٹھ سے الٰہ آباد تک میدانی کے جلوس آکر بہرائچ میں بارات چڑھاتے تھے' عقیدت مند سنکروں کو اتنا یاد تھا کہ ہمارے اجداد نے غازی میاں کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اسلام لائے تھے' اس کے عوض وہ ان کا علم اور نشان لے کر جاتے تھے' اور علم کا نشان تو بدعت اور جہالت نے کب کا ڈبا تھا سکندر لودی جیسے صحیح العقیدہ حکمران کو ان مشرکانہ رسوم اور بدعات سے سخت نفرت تھی اس نے پابندیاں لگائیں' لیکن وہ بھی اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا؟ سارا ملک پندرہویں صدی میں بھگتی مارگ اور انفرادی تصوف کے راستوں پر چل رہا تھا' ایسی نہ جانے کتنی باراتیں'

کتنی برسیاں اور کتنے میلے ٹھیلے ہر روز کہیں نہ کہیں "عید تقاضا" بن گئے تھے، عالمگیر نے مزار پرستی اور غیر اسلامی رسوم پر قدغن بٹھا دیا لیکن وہ بھی ناکام و نامراد رہا، جبکہ ہزاروں لوگوں کی مرادیں، بسنت اور جیٹھ کے مہینوں میں ملتان سے لے کر مرشد آباد تک بالے بادشاہ کے نام پر پوری ہو جاتی تھیں، وہ تو بھلا ہو دیوبندیوں کا جنہوں نے مئو اور مبارک پور کے باشعور نوربافوں کو تقویتِ ایمانی بخشی اور غازی میاں دولہے کے باراتیوں میں کمی آنے لگی۔

بہرائچ کے نوربافت تعلیم یافتہ افراد میں دینی تعلیم کا جذبہ بیسویں صدی کے اوائل سے زور پکڑ چکا تھا، مولوی غلام جیلانی ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تھے، رئیس قوم عبدالشکور برادری کے خیرخواہ اور غمگسار فرد تھے، سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری نے بہرائچ میں ۱۸،۲۸۵ نوربافوں کا شمار کیا تھا۔

بنارس : طرہ پیچ رخانِ بنارس ہنر رونگارنگ

غازی میاں کے سلسلۂ تاریخ سے بنارس بھی جڑا ہوا ہے، یہاں کے بنکروں میں علوی نمایاں تھے، بعض قراین سے یہ استناد ملتا ہے کہ یہاں کے مسلمان جُلّاہے 'نوربافؔ' کی عرفیت سے معروف تھے، ریشم، کلابتون اور اطلس کی دستکاری میں یہ لوگ ید طولیٰ رکھتے تھے، مئو کے کارخانہ داروں سے ریشمی ساڑھیاں اور دیگر پارچے لے کر بنارس کے تاجروں نے اپنی دکانیں چمکائی تھیں، انیسویں صدی کے اوائل میں بنارس کے بزاز اور پارچہ فروش اطراف کے دیہات بارہ گانوں اور شیوپور کی منڈیوں سے مال حاصل کرتے تھے، یہاں کے بنکر اپنا مال شہر کے پرچون فروش، تاجروں کے ہاتھوں بیچا کرتے تھے[1] معاشی بحران کے زمانے میں بنکروں کی تعداد میں تخفیف ہو گئی اور ہجرت میں اضافہ ہو گیا بنارس کے قریب دیہات سے جہاں ۵۲ انصاری خاندان آباد تھے بمبئی کی طرف چلے گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں یہاں ۳ ہزار دستکار تھے۔

عہدِ شاہجہانی میں بنارس میں سات ہزار نورباف آباد تھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری میں بنارس کے نوربافوں کی تعداد ۲۲،۴۹۶ تھی، مدنپورہ، کچی باغ، علی پورہ محلے انہیں سے آباد تھے قوم کا ایک رسالہ مسمیٰ بہ ترجمانِ مومن انصار زیرِ ادارت حافظ مولانا امام الدین رامنگری بنارس

---

[1] گیانندپانڈے۔ ایضاً۔ ص۲۱ ف۲ نوٹ

سے باقاعدگی کے ساتھ مدتوں نکلتا رہا، حافظ جی نہایت دیندار بزرگ اور سچے بہی خواہ، ہمدردِ
قوم اور رہبر تھے، ڈاکٹر حبیب اللہ میونسپل کمشنر رہ چکے تھے، سردار محمد ایوب اور سردار عمر
ممتاز شخصیتیں تھیں، مولانا احمد اللہ بنارسی (سنہ ۱۸۶۰-۱۹۴۲ء) اور ان کے بھائی مولانا
عبد الغفور بنارسی (متوفی سنہ ۱۳۲۲ھ) کا شمار اکابرینِ شہر میں ہوتا تھا، مولانا عبد الجبار
بنارسی (سنہ ۱۲۸۶-۱۳۲۲ھ) بن حاجی عبد العزیز بنارسی کا خاندان دینداری اور تمول میں مشہور
و معروف تھا، آپ مدنپورہ محلہ میں مقیم تھے اور محلہ کے بڑے تاجروں میں ان کا شمار ہوتا تھا
اپنی خوش معاملگی اور راست بازی کی بنا پر وہ "التاجر الصدوق" کے صحیح مصداق تھے،
مولانا عبد الحئی بنارسی (سنہ ۱۲۱۶-۱۳۶۲ء) انہیں مولانا عبد الجبار کے بڑے بھائی تھے اور
مدنپورہ کے مشہور خانوادہ حافظ عبد القادر کے فرد تھے، مولانا عبد الرحمن مئوی (متوفی
سنہ ۱۳۱۵ھ) سید نذیر حسین دہلوی، سالار المحدثین کے تلامذہ میں سے تھے، آپ نے تدریسی
و تعلیمی خدمات کے ساتھ کپڑے کی تجارت بھی شروع کر دی تھی اور اسے اس میں بے حد
فروغ دیا، ڈاکٹر مصطفیٰ شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے اور مولانا موصوف کے نواسوں میں مولانا
عبد السعید بنارسی اور مولانا عبد الحمید مکی بنارسی عالم و فاضل گزرے ہیں، مولانا عبد السبحان
بنارسی (۱۲۲۲ھ-۱۳۲۲) نسباً عباسی و انصاری تھے، مچھلی شہر میں بچپن گزرا، مولانا
عبد الغفور بنارسی (سنہ ۱۲-۱۳۲۲ھ) طبیب تھے، آپ نے مدنپورہ کے لوگوں میں دینی تعلیم کا
ذوق و شوق پیدا کیا جس کی وجہ سے عوام میں تعلیم حاصل کرنے کا عام رجحان پیدا ہوا، ان کے
علاوہ بہت سارے انصاری برادری سے تعلق رکھنے والے یا قرابت داری رکھنے والے
تاجروں کی بڑی تعداد بنارس میں موجود تھی ان میں سے بہت سارے اپنے وقت کے عالم،
فاضل اور صاحب تصنیف تھے اور کچھ دینی درسگاہوں میں درس و تدریس دیتے تھے، ان میں
مولانا محمد امین امام نگری بنارسی اور مولانا عبد المجید حریری بنارسی (سنہ ۱۲۱۲-۱۲۹۲ھ) اور دیگر
بنارسی علماء کا ذکر آگے باب چہارم 'ادب میں تقریظ کے نمونے' میں آرہا ہے۔

جماعت بندی، تنظیم، پنچایتی دستور، بھی لگاؤ اور ذاتی دلچسپیاں انصاری برادری کے نظام
معاشرت کی بنیادیں بن گئی تھیں، پنچایت جماعتی استحکام کا سب سے مؤثر ذریعۂ اظہار تھا،
جماعت کے سربراہ کو سردار یا مہتو کہتے تھے، یہی مبارکپور اور مئو میں مہتر کہلاتا تھا، بنارس میں
دیگر شہروں کی طرح ہر محلہ کا ایک سردار تھا جسے چودھری کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا

۱۸۰۹ء میں بنارس کی مومن پنچایت کے چودھری دوست محمد اور فتح محمد تھے جن کا برادری پر بڑا اثر تھا، یہ دونوں مہتر تھے، اسی زمانے میں مدنپورہ کی انصاری پنچایت کا دائرہ عمل بہت بڑھ گیا تھا، پوری قوم مومن کی کل پنچایت یا مرکزی پنچایت کو 'باونی' یا 'باونی' کا نام دیا گیا تھا اس لئے کہ یہ اطراف واکناف کے باون ۵۲ محلوں پر محیط تھی، ہاتھ کرگھے کے ہڑتال کا مسئلہ ہو یا مکان ٹیکس کا معاملہ — پنچایت ہی طے کرتی تھی۔

مرزاپور اور بھدوہی میں عموماً قالین بافی کی صنعت ہوتی تھی، اور انصاری برادری کے تاجروں نے اس کو اتنا فروغ دیا کہ ان شہروں کی قالینوں کی شہرت مشرقِ وسطیٰ اور یورپی ممالک تک پہنچ گئی، دیہاتوں کے بنکر مزدوری پر کام کرتے تھے اور تمام کچا مال بہم پہنچاتے تھے بڑا صبر آزما اور وقت طلب کام تھا۔ لیکن تاجروں کو قلیل عرصے میں متمول بنانے کا ذریعہ بھی تھا۔ ۱۸۹۱ء میں مرزاپور میں ۵۸۲ (۳) مومن قالین باف تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد ایک بڑی تعداد بھدوہی سے ہجرت کر کے بھیمڑی میں بس گئی تھی ان کی جماعت اسی لئے بھدوہی جماعت کے نام سے مشہور تھی۔ بھدوہی کے قالین باف تاجروں میں عبدالصمد انصاری، میسرز حبیب علی اینڈ سنز کے وارث علی انصاری، صغیر علی انصاری، شوکت علی انصاری اور اظہار انٹرنیشنل قالین کے بڑے ایکسپورٹرس قابلِ ذکر ہیں۔

جونپور — "شیراز ہند"

اترپردیش کے مشرقی اضلاع کا جگمگاتا علم وفضل کے نجوم وکواکب کا بنات النعش در جگمگاتا ہوا کہکشاں تھا، بزرگانِ دین کے حسنات، اربابِ علم وفضل اور اہلِ کمال کے افاضاتِ برکات نے اسے روحانی گلستاں اور دینی چمنستان بنا دیا تھا۔ ان بزرگوں کی عظمت وجلالت کا یہ عالم تھا کہ مورخ ان میں سے ایک ایک کو غزالی اور رازی کا ہمسر بتاتا ہے جن کی توثیق وسند سے سمرقند و بخارا، نیشاپور و خوارزم کے اماموں کی تصنیفات اعتبار اور مرتبہ پاتی تھیں۔ قافلۂ علم و دعوت و عزیمت بدایوں سے ہوتا ہوا خواجوں کی چوکھٹ دہلی کو چومتا ہوا، کڑہ مانکپور، خلجیوں کی قتل گاہ سے گذر کر جونپور اور اعظم گڈھ اور مبارک پور میں پڑاؤ ڈال دیا۔ آٹھویں صدی کے وسط سے زیدیہ

۱؎ حیاتِ شبلی۔ ص ۹

پورب کی اسلامی نوآبادیاں اودھ سے بڑھ کر مشرق میں بہار اور ترہت تک اور شمال میں بہرائچ تک پھیل گئی تھیں سنہ ۷۹۶ھ میں خواجہ جہاں نے تغلق سلطان دہلی کے دربار سے سلطان الشرق کا خطاب پا کر جونپور میں شرقی سلطنت کی بنیاد ڈالی، شاہانِ شرقیہ علم دوست اور علماء نواز تھے، ارباب علم و فضل اور اصحاب دانش و ادب نے جو شمعیں روشن کیں ان سے سارا علاقہ جگمگانے لگا، اور سیاسی و مذہبی حوادث کے بگولوں میں بھی یہ چراغ عہد مغلیہ تک روشن رہے، جونپور مدرسوں کا شہر بن گیا ملک العلماء شہاب الدین دولت آبادی سے لے کر اخیر زمانہ تک یہاں کی درسگاہیں 'سرچشمۂ رحمت' بنی رہیں اور ان کے فیوض و برکات سے ہزاروں نفوسِ قدسیہ مستفیض ہوئے اور انہوں نے خود تشنگانِ علم کو سیراب کیا، علماء و فضلاء کا جمگھٹا دیکھ کر شاہجہاں نے بڑے فخر سے کہا" مملکتِ پورب شیراز ماست[1]" جونپور کی مشہور دینی درسگاہوں سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے رہے ان میں مدرسہ حنفیہ کی بڑی اہمیت تھی۔

'شیراز ہند' جونپور علم و فضل کا گہوارہ تھا مگر صنعت و حرفت اور تعمیرات کا مرکز بھی تھا، یہاں حضرات انصاری بزمرۂ مجاہدین ایران سے اور تغلق عہد میں شرقی حکومت کے استحکام کے بعد دہلی سے ہجرت کر کے آباد ہو گئے فرشتہ اپنی تاریخ میں اس نقل مکانی کا تذکرہ کرتا ہے، شرقی حکومت کی بڑھتی ہوئی عظمت کو دیکھ کر لودھیوں کی نظر لگ گئی اور سنہ ۸۹۳ھ میں دیار پورب سے اس شیراز ہند کا شیرازہ بکھر گیا اور اس کے ساتھ ہی بافندگی کی صنعت کے تانے بانے بھی بکھر گئے کمپنی بہادر کے استحصال نے معاشی پراگندگی پھیلا دی اور سنہ ۱۸۶۰ء کے مسلسل قحط نے اور قیامت ڈھادی ۳۰۱۲ کرگھوں میں سے ۱۹۸۶ کرگھے چل رہے تھے، بے روزگار جلاہے مزدوری کرنے لگے، جونپور کے مضافات میں جلال پور کی بستی میں برادری میں کئی تاجر تھے جو دہلی کی منڈیوں سے تجارت کرتے تھے، شہر جونپور کے ممتاز افراد میں عبدالحمید رئیس، محمد اسماعیل انصاری، حافظ محمد امین ایم اے، فدا حسین نائب تحصیلدار اور حکیم عبدالشکور کے نام ملتے ہیں (سنہ ۱۹۳۰ء) سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں ۲۲۳۰۷ نور باف تھے۔

---

[1] حیات شبلی۔ ص۱

عہدِ سلاطین میں کڑا مانکپور مشرقی علاقہ کا مرکزی مقام تھا اور اس سارے دور میں یہ علمی اور دینی و روحانی حیثیت کے ساتھ ساتھ صنعتی اور تجارتی حیثیت سے بھی مرکزیت حاصل کر گیا، مراکشی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار میں لکھا ہے کہ "ان علاقوں میں نہایت عمدہ قسم کے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں اور یہاں سے اٹھارہ دن کی مسافت پر دہلی بھیجے جاتے ہیں" [۱]

اعظم گڈھ، مبارک پور، مئو اور کوپا گنج

اس خطۂ اعظم گڈھ پہ مگر فیضانِ تجلّی ہے یکسر
جو ذرہ یہاں سے اٹھتا ہے وہ نیّرِ اعظم ہوتا ہے (سہیل اعظم آبادی)

اعظم گڈھ کی بنیاد کا سہرا دو اعظموں کے سر ہے، ایک روایت مغل شاہزادہ اعظم خان، اورنگ زیب کے چھوٹے بھائی کو اس کا بانی بتلاتی ہے[۲] اس کے نام سے ایک قلعہ بھی منسوب تھا۔ مزید یہ کہ اسی شہزادے کی سرپرستی میں کچھ انصار خاندان یہاں آکر بس گئے، دوسری روایت جس کا اعادہ کئی تاریخوں میں کیا گیا ہے اسے میہ نگر کے سورج بنسی خاندان کے راجپوت راجہ بکرماجیت کے بڑے لڑکے شاہزادہ اعظم خان نے جو ایک نو مسلم تھا سنہ ۱۶۶۵ء کو اس کا بانی بتلایا ہے اس خاندان کا ہر جانشین راجہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ عہدِ مغلیہ میں جب سرکاروں کی تقسیم ہوئی تو سرکار جونپور میں مشرقی اضلاع، فیض آباد کی سرحد سے لے کر موجودہ غازی پور کی حدود تک شامل کر دیے گئے، ان پرگنوں اور قصبوں کے نام آئینِ اکبری میں درج ہیں اور اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ کو جہانگیر نے جو بائیس پرگنوں کی ریاست عطا کی اس کے نام بھی شاہی فرمان میں ملتے ہیں، یہ ۲۲ پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڈھ میں واقع تھے[۳]۔ اس زمانے میں پورا اعظم گڈھ، ضلع بلیا، پرگنہ سکندر پور جسے سکندر لودی نے آباد کیا، غازی پور کے پرگنے شادی آباد اور بھتری، فیض آباد کے پرگنے چاندی پور، بڑہر، ۔۔۔ اور سرہرپور یہ سب

---

[۱] رحلہ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۵ طبع مصر بحوالہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۱۱
[۲] حیات شبلی ص ۵۲۔ فرمان کی نقل میں "بست و دو پرگنہ" لکھا ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ تزک جہانگیری کے مطابق ۲۲ پرگنے ہوں، ص ۵۲

سرکار جونپور کے ماتحت اور تابع تھے۔[1]

سلاطین شرقیہ کے زمانے سے لے کر برطانوی عہد تک یہاں لوگ دور دور سے آکر آباد ہوتے رہے، اعظم گڈھ کے مردم خیز قصبات اور قریات میں انصاری برادری اس کثیر تعداد سے آباد ہو گئی تھی کہ تمام ضلع گویا 'انصاری آباد' بن گیا۔ مبارک پور، سونا تھ بھنجن، ٹانڈہ، خیرآباد، ادری، گھوسی، کریم الدین پور، بہادر گنج، پورہ شیخ معروف میں شیخ زبانانِ انصار کی گنجان آبادیاں تھیں۔

شرقی دورِ حکومت میں (۸۰۲ھ تا ۸۸۳ھ) اس دیار میں متعدد علمی و دینی خاندان ہجرت کر آئے اور بس گئے، چنانچہ شیخ فتح اللہ انصاری دہلوی اودھی نے پرگنہ بیل کو اپنا مسکن بنایا اور اس خاندان میں اتنی برکت و سطوت پیدا ہوئی کہ اپنے صاحبزادے بہاء الدین کے نام پر بہاء الدین پور دو ایک دیہات کو نیا آباد کیا، ان کی اولاد میں مولانا گلشن علی بن عطاء اللہ انصاری باہلی اور مولانا حسن علی انصاری باہلی مشہور عالم اور بزرگ دین گذرے ہیں۔[2] باہل کے پرانے اشراف گھرانوں کے علاوہ سرائے میر سے متصل بندول نام ایک گاؤں میں ایک معروف انصار گھرانہ آباد تھا، یہی گاؤں مولانا شبلی کا ننہال تھا، مولانا کے والد شیخ حبیب اللہ کی شادی انصاری شیوخ کے گھرانے میں ہوئی، شیخ صاحب کے خسر اور مولانا کے نانا کا نام حاجی قربان قنبر انصاری تھا۔[3]

ضلع گڈھ اور پرتاپ گڈھ کے قدیم قصبے بیچ مئو ناتھ بھنجن واقع ہے جس کا حوالہ اعظم گڈھ کے ریونیو کے فرامین میں ملتا ہے۔ پرگنہ مئو ناتھ بھنجن شاہجہاں کی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم کی جاگیر میں تھا اسی مناسبت سے اس کا نام جہاں آباد رکھ گیا تھا، اعظم گڈھ کے سواد میں جہاں گنج بھی اسی مدبر و صوفیہ شہزادی کی طرف منسوب ہے۔ یہاں اس نے اپنی تربیت خانے کے لیے اور خاص پسندیدہ ملبوسات تیار کرانے کے لیے کارخانے قائم کئے، یہاں بڑے بڑے کاریگر جمع ہوگئے، شہزادی نے یہاں مسجد بھی تعمیر کرائی جس کے چاروں طرف طلبہ کے لئے حجرے تھے، یہاں شکر کے بھی کارخانے تھے۔ پارچے اور شکر کی طرح کئی اجناس دساور بھیجے جاتے تھے۔

---

[1] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی تذکرۂ اعظم گڈھ، ص۱۱

[2] ایضاً ص۱۲

[3] حیات شبلی ص۱۱، ۲۳۔ ۲۵

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں نوآبادکاروں کو بڑی سہولتیں حاصل تھیں جس کے سبب آبادی میں اضافہ ہوا، ان آبادکاروں میں جنکروں کی تعداد زیادہ تھی، کرگھوں کا شور بلند ہوا تو زندگی سے متعلق دوسرے حاملوں کے لوگ جمع ہونے لگے "کتوا" سوت کاتنے والے ہندو کاریگروں کے چرخوں کی گردشیں تیز ہوگئیں اور مئو صنعت پارچہ بانی کا پورے ضلع میں سب سے بڑا مرکز بن گیا، یہاں دیکھتے دیکھتے ۸۴ محلے آباد ہوگئے اور ۳۶۰ مسجدوں سے اذان کی آوازیں گونجنے لگیں۔ درآمد اور برآمد مال اور تجارتی اسباب پر محصول وصول کرنے کے لیے حکومت نے ایک محکمہ قائم کردیا جس سے تجارت کی گرم بازاری کا اندازہ ہوتا ہے اور "کٹرہ" نام کی بڑی منڈی میں ساہوکاروں، مہاجنوں اور بزازوں کا جمگھٹ رہنے لگا، اس قصبہ نے کپڑے کے کمال صنعت و حرفت کے ساتھ علم و فن کی خدمات بھی انجام دیں اور یہاں کثرت سے علماء پیدا ہوئے اور اب بھی ہیں۔

اعظم گڑھ اور اس کے نواح میں قصبات و قریات میں اتنی زیادہ دینی درسگاہیں قائم تھیں کہ یہ سارا خطہ علم و فن اور علماء و فضلاء اور اساتذہ و شیوخ کے وجود سے بقعۂ نور بن گیا تھا، یہاں کے مدارس اور مکاتب کی فہرست طویل ہے۔ مدرسۂ احیاء العلوم، مدرسہ اشاعت اسلام (پورہ معروف)، مدرسہ معروفیہ (معروف پورہ) (اعظم گڑھ) جامعہ مفتاح العلوم، مدرسہ اسلامیہ فیض عام، مدرسہ صدیقیہ، دارالعلوم مئو، دارالحدیث رحمانیہ (مئو) مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم، دارالتعلیم (مبارک پور)، دینیۃ العلوم، مصباح العلوم، جامع العلوم (کوپاگنج)، مدرسۃ الاصلاح، بیت العلوم (سرائے میر)، ناصر العلوم (گھوسی)۔

سلاطینِ دہلی اور سلاطینِ شرقیہ کے عہدِ زریں سے کر ۶۰۲ھ تا ۱۳۲۵ء تقریباً سو برس سو سال تک دیارِ پورب علم اور علماء کا شیراز، نیشاپور اور سمرقند و بخارا بنا رہا، مطلعِ علم پر درجنوں بے فضل و دانش پر ہر دور میں یہاں اہلِ قلم، اصحابِ کمال، اہل اللہ و اہلِ نظر کے تابندہ ستارے جگمگاتے نظر آتے رہے، شرقی سلاطین کی سرپرستی، علم دوستی اور علماء نوازی کے سبب بہت سے علمی و روحانی خانوادے یہاں آکر آباد ہوگئے اور ان کے فیوض و برکات کی تجلیوں کے صدقے سے اس خطے میں آج تک ایوان فضل و دانش کے طاقچوں میں پرانے چراغوں کی نئی روشنی پھیلی ہوئی ہے، وقت کے گرد اور سیاسی اتھل پتھل کی آندھیوں کے باوجود ہر ایک شمع دیلِ سحر بنی ہوئی ہے اور "سیر تپ ند" کی دعوت دیتی ہے، ان کے امین اعظم گڑھ اور مبارک پور کے مردم خیز قصبے ہیں۔ ان مردم خیز قصبات

لہ رپورٹ ضلع اعظم گڑھ (۱۸۷۷) ص ۱۲۶-۱۲۷

کی علمی و دینی زرخیزی سدا بہار ہے۔

اعظم گڈھ کی نئی بستی میں دہلی اور گرد و نواح کے انصاری خاندان بڑی تعداد میں آکر بس گئے تھے، ان کی بیشتر آبادی دلال محلہ یا سرپیٹو کا باغ میں جسے محلہ شیخان بھی کہتے تھے سنہ ۱۹۳۰ء تک آباد تھی[۱]۔ مہاراج گنج لٹنے کے بعد انصاری نوربافان اسی محلہ میں آن کر بس گئے۔ یہیں کے آباد خاندان ہی شہر کے معززا اور رئیس گنے جاتے تھے، ان خاندانوں میں ایسی برکت پیدا ہوئی اور ضلع بھر میں ان کی اولاد ریت کے ذروں کی طرح ایسی پھیلی کہ اعظم گڈھ انصاریوں کا نخلستان بن گیا، مئو کو پاگنج اور مبارک پور، "ہینچہ ہائے انصاریان" بن گئے۔ اور اطراف و اکناف کے قریے اور قصبے ٹانڈہ، خیرآباد، دری گھوسی، کریم الدین پور، بہادر گنج، پورہ شیخ معروف۔ اُن کے وجود مُود سے معروف ہو گئے۔

اعظم گڈھ پارچہ بافی کی صنعت کا مرکز تھا لیکن یہاں کے نوربافان تجارت، حارفت اور ٹھیکیداری بھی کرتے تھے انیسویں صدی کے اختتام (سنہ ۱۸۹۹ء) تک جبکہ اس ضلع میں ریل نہیں آئی تو جون پور اور غازی پور وغیرہ تک پہنچانے اور لانے کا ٹھیکہ انصاریوں کے پاس تھا جن کے شکرم اور شتر گاڑیاں اس کام میں آتی تھیں، سنہ ۱۹۳۰ء کے زمانے تک مومن برادری کے ممتاز افراد میں مولوی محمد میاں، حکیم محمود، مولوی اظہار الدین، حکیم خدا بخش، حاجی طیب سردار وغیرہ شامل تھے۔[۲]

شہر اعظم گڈھ اور سو دو محقت کے قصبات و قریت کے تعلیم یافتہ انصاری حضرات نے تحریک خلافت اور کانگریس پارٹی کے پرچم تلے جنگِ آزادی کے لیے جو جد و جہد کی ہے اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی، ترک موالات، سودیشی، بائیکاٹ، انسدادِ مے نوشی، انتخابات اور تعلک سازی کی تمام سرگرمیوں میں برادری کے نوجوان اور بزرگ پیش پیش تھے۔ تعلیمی اور علمی دائرہ عمل بھی بہت وسیع تھا، اعظم گڈھ کے قدیم مدرسۂ اسلامیہ سے دلچسپی لینے والوں میں حافظ عبد الحمید انصاری، شیخ عبد المجید انصاری، شیخ اسماعیل اور ان کے بھائی ابراہیم، حافظ یوسف انصاری جیسے بزرگوں کے علاوہ مہاجنی انصاری، بشیر انصاری، اعجاز انصاری، حافظ مختار انصاری جیسے مولوی انصاریان مدرسہ کی بقا کے لیے بڑی جد و جہد کرتے رہے۔

یہاں انصاریوں دواخانہ کی بڑی شہرت تھی یونس انصاری کے زیرِ نگرانی بڑی مفید دوائیاں تیار کر کے اطبا کو بھیجی جاتی تھیں اس دواخانے کے مالک مولوی اسلم انصاری کے والد مولوی خدا بخش

۱؎ تاریخ مومن انصار - ج ۲ - ص ۳۳ ۲؎ ایضاً ص ۳۵

عربی و فارسی کے عالم تھے، فارسی میں شعر کہتے تھے اور مڈل اسکول کے صدر مدرس رہ چکے تھے ان کے بیشمار شاگرد اعظم گڑھ اور قصبات میں پھیلے ہوئے تھے یہاں تک کہ لالاؤں اور ٹھاکروں کی اولاد بھی کائستھوں کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے تھی وہ بھی فارسی انہیں سے پڑھتے تھے، مولوی صاحب کو فارسی ادبیات سے بڑی دلچسپی تھی اور شعری ذوق اعلیٰ درجے کا تھا شرح ملا جامی اور منطق بھی پڑھا چکے تھے، مدرسہ امینیہ دہلی کے صدر مدرس مشہور مفتی مولانا کفایت اللہ سے دوستانہ تعلقات تھے۔

مولوی عبدالباری ابوعلی عربی و فارسی اور اردو کے عالم تھے اور تمام ادبی و علمی اور سیاسی رسائل کے لئے مضامین لکھتے تھے، دارالمصنفین کے پرانے کارکنوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر سعید انصاری کی حافظ عبدالمجید انصاری سے قرابت داری تھی ان کا حلقہ، احباب بہت وسیع تھا جب امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آئے تو مئو اور مبارک پور کے مسلمانوں نے ایک شاندار جلسہ کرکے انہیں بہت بڑا اعزاز بخشا، میووں اور زیوروں کا ہار پہنایا گیا، ایک بڑے تعلیم ہونے کے ناتے ہندو تعلیم یافتہ افراد بھی ان سے مشورہ لیتے تھے۔

حافظ عبدالمجید انصاری کا گھرانہ تعلیم سے آراستہ تھا، حافظ جی کے صاحبزادے ڈاکٹر شکیل انصاری کا ذکر آگے آرہا ہے، ڈاکٹر جمیل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ سائنس سے متعلق رہے اور ظہیر انصاری انڈین ایئر فورس میں اعلیٰ عہدے کی طرف گامزن تھے۔

عبدالمجید انصاری کے، جو آصف گنج کے تھے، صاحبزادوں میں سے عزیز انصاری تبلیغی جماعت کے سرگرم مبلغ تھے دوسرے بیٹے سراج انصاری اور بشیر احمد انصاری کاروباری لوگ تھے۔ ان کے ساتھ فاضل انصاری بھی سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے، حافظ یوسف انصاری کا گھر قرآن کا امین تھا ان کے صاحبزادے حافظ شعیب انصاری بھی حافظ قرآن تھے۔ انصاری خاندان کے مولوی مسلم انصاری کے ایک صاحبزادے انتخار انصاری ہمدرد کی شاندار ایجنسی لے کر ہمدرد دواخانہ کھول بیٹھے تھے اور اسلام انصاری اس کے مہتمم تھے، ان ہی کے قریبی لوگ تھے مہارت گنج کے دو بھائی رفیق انصاری اور شفیق انصاری۔ ان کے علاوہ سلطان انصاری اور سبحان انصاری بھی ممتاز افراد تھے آصف گنج کے قدیر انصاری محکمۂ صحت کے "بڑے بابو" تھے۔[1]

---

[1] ڈاکٹر شعیب اعظمی۔ پروانہ، چراغ مزار خود یم ما،

مبارک پور

یہ بابرکت اور سعادت پناہ قصبہ عہدِ سلاطینِ دہلی کے دوران قاسم آباد کے نام سے اپنی قسمت کے اقبال و ادبار کا ایک تاریخی دور پورا کر چکا تھا اور ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں پھر اس کی نشاۃِ ثانیہ کا دوسرا دور شروع ہوا کہ مانکپور کے خانوادہ حامدیہ چشتیہ کے چشم و چراغ حضرت راجہ سید مبارک شاہ نے ۹۲۶ھ میں اپنے بابرکت قدوم میمنت لزوم سے اس سرزمین کو نوازا اور مبارک پور نام دیا۔

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد شاہ کے ہمراہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کا خانوادہ بھی مانکپور سے آیا یہیں مستقل آباد ہو کر حکومتِ وقت کی طرف سے نیابتِ قضا کا عہدہ سنبھالتا رہا اور راجہ مبارک شاہ کے بعد اس قصبہ میں گویا ان کا نائب بن کر میزانِ عدل سنبھالے رکھا نوابینِ اودھ کے عہدِ تسلط میں یہاں شیعیت کو فروغ ہوا اور انہیں کی تکلفاتِ زندگی اور تعیش کوشی نے صنعت بافندگی کو نیا رنگ و روپ دیا، سنگی، غلط، مشروع پارچوں نے بڑا رواج پایا، مئو میں تسری، بیراگی اور دیگر اقسام پارچہ جات کو فروغ ملا۔

قصبہ مبارک پور عہدِ قدیم سے پارچہ بافی کا تاریخی مرکز تھا اور مانکپور جس کا ذکر ابن بطوطہ نے کیا ہے یہاں کی صنعت پر بھی اثر انداز ہوا جب وہاں کے جنکر راجہ مبارک کے ساتھ مبارک پور آئے[۱] اس فن کے یہاں بڑے ہنرمند اور صناع موجود تھے جو ایسی زرتار ردائیں بنتے تھے کہ سبک اندام حسینانِ ہند کے شانوں کو "بار حریری" کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہونے پاتا تھا، ہنرمندانِ مبارک پور کے چابکدست ہاتھوں کی بنی ہوئی بنارسی وضع کی ریشمی ساڑیوں کی بناوٹ، چمک دمک اور نفاست دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے کسی جنکر کے کھردرے ہاتھوں نے بنا ہے بلکہ اس پارچۂ دلفریب کو چھو کر کسی صف بلوری شہزادوں کے لطیف لمس کا احساس ہوتا تھا۔[۱]

نوابینِ اودھ کے زمانے میں یہ قصبہ مرفہ الحال تھا، آبادی بھی کم تھی دس ہزار سے بارہ ہزار تک لوگ بستے تھے جس میں ایک چوتھائی نوربافت تھے، ۱۸۱۳ء میں ۳ ہزار تعداد تھی اور پانچ سال بعد بڑھ کر ۹۰۶۶ ہوگئی صنعتی آبادی ہونے کے سبب دور و نزدیک کے مسلمان یہاں آکر مستقل سکونت اختیار کرنے لگے تھے، غدر کے ہنگامہ خیز دور میں تجارت کا سلسلہ ٹوٹنے لگ گیا تھا پھر بھی مبارک پور کے

---

[۱] "صد رنگ" خوش نذر کہ "عہد مبارک پور" ص ۵۹

تاجروں اور بزازوں نے کافی دولت جمع کر لی تھی، یہاں کے سنگی غلطہ کی تجارت میں حاجی حسن جو مجاہد آزادی تھے حیدرآباد کے آڑھتیوں سے بڑا سرمایہ اکٹھا کر لیا تھا، مئو کے صنعتکاروں میں بھی ظاہری خوش حالی تھی لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا، کبھی کبھی رہینِ ستم ہائے روزگار رہے، کبھی بلائے آسمانی نے برسوں رحمتِ باراں کے بادلوں کو زمین پر اترنے نہ دیا، کبھی وبائے طاعون (۱۸۹۶ء تا ۱۸۹۷ء) ہزاروں جانوں کو ہڑپ کر گئی، ۱۸۰۳ء سے ہر دس بیس سال بعد قحط اور بیماری کا آسیب نازل ہوتا رہا اور یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آخر تک چلتا رہا جب یہ دم توڑ رہی تھی ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۷ء میں سخت قحط پڑا، معیشت تباہ ہو گئی اور صنعتی زوال ادبار و عسرت ساتھ لایا، بنائے انسانی کریہہ منظر فسادات کا روپ دھار لیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے حکم سے قصبہ ارجمند آباد نے بیکلی کو لٹوایا اور برباد کر دیا تھا کیونکہ یہاں کے باشندوں نے جمہور کے باغی رجب علی کا ساتھ دیا تھا۔

فسادات مبارک پور

پہلا فساد ۱۸۹۰ء[1] میں شیعہ سنی فرقوں کے درمیان ہوا اس کے محرک اور ذمہ دار شیعہ علماء تھے، ۱۹۱۰ء میں پھر یہی ہوا اور ایک شخص بکر کی موت کا مرثیہ پڑھا گیا۔ ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۳ء کے خونچکاں فساد کا عنوان "رکھنی شاہی" دیا گیا ضلع کی تاریخ میں اس سے زیادہ بھیانک، ہولناک اور تباہ کن بلوہ کبھی نہیں ہوا، یہ ایک ہنگامہ ایسا تھا جس میں ۳۰-۳۵ مسلمان مارے گئے اور تقریباً تین سو طویل جانیں گئے اور آخر میں فوج درفورت مبارک پور کو رخ دے دی گئی قصبہ کے ۹۰۰ گھروں میں سے ۸۰۰ کھپریل پوش مکانات نذرِ آتش کر دیے گئے، جنون و دیوانگی نے انسانیت کے تمام بنیادی اصولوں کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں، بہیمیت اور بربریت کا عفریت آزادانہ لوگوں اور عورات اپنا آسیب پھیلاتا رہا، پچاس لاکھ سے اوپر کا مال و اسباب لٹ گیا، وجہِ فساد پندرہ گز کی گلی زمین تھی جو ایک چبوترہ جس پر محرم میں تعزیہ رکھا جاتا تھا اور ایک چھوٹے سے ٹکڑے دار کے بیچ میں تھی۔ محلہ کے ایک جگر یودھن نے اپنی منت پوری کرنے کے لئے یہاں ایک گئے کا ذبیحہ کر ڈالا، دیں اشرار نے شور کاٹ

---

[1] اعظم گڑھ گزیٹیئر ۱۹۱۱ء اور آگے کی تمام تفصیلات ملی حسن کی تصنیف "وقت و فسادات مبارک پور" مطبوعہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری دی گئی ہیں اس سے گیا تذکرہ پڑھے ہی انگریزی کتاب ہی بڑی حد تک استفادہ کیا ہے، بحوالہ ہوت پانڈے کی انگریزی کتاب کے ہیں۔

کر پھینک دیا، دو جانوروں کے خون کی وجہ سے انسانوں کا خون بہنے لگا، باہر کے دو دولتمند مہاجن
دلی دوبے اور رکھی ساہو جس کی زمینداری مبارکپور کے مضافات تک تھی، اپنے اثرات کو کام میں
لاتے ہوئے اپنے لوگوں کو اشتعال دلانے لگے، آخر معرکہ کا دن آگیا (۱۹ اپریل ۱۸۱۳ء)۔ سنکھ کی
آواز سن کر قصبے کے مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ لگا دیا، سرکاری اعداد کے مطابق بلوائیوں کی تعداد ۲۵
ہزار کے لگ بھگ تھی جو سارے مسلح تھے، علی حسن نے اپنی کتاب "واقعات وحادثات مبارک پور"
میں صرف چالیس ہزار ہندوؤں کی تعداد بتلائی ہے، باشندگانِ قصبہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے، ۲۴ر
اپریل ۱۸۱۳ء میں گورکھپور سے فوجی دستہ آیا تو امن بحال ہوا۔

پھر تفتیش کا دور چلا، درخواستیں بھیجی گئیں، لوٹے ہوئے اسباب کا تخمینہ لگایا گیا، اور ان افراد کی
نشاندہی کی گئی جو سراسر اس خونیں فساد کے ذمہ دار تھے، "عرضی بعدالت گورکھپور بسلسلہ جنگ مبارکپور
مورخہ سنیچر ۱۷ اپریل ۱۸۱۳ء" پر انصاری نوربافان شیخ شہاب الدین اور چار دیگر انصاری نوربافوں
کے دستخط تھے اسمیں آلو کے دوروں کا بڑا ہاتھ تھا۔[1] حسین آباد کی بستی کے مومن شیخ لال محمد ساکن
حسین گنج کو مبارک پور میں اپنی برادری کی تباہی وہلاکت کا شدید احساس تھا، انہوں نے بھی اس عرضی پر
اپنے دستخط کیے تھے۔

اس خونریز جنگ کے بعد مسلمان اور خصوصاً مومن برادری کے بقول انگریز "شورہ پشت" گروہی عصبیت
رکھنے والے اور جذباتی جلاہوں کے جیالے ہر موقع پر سینہ تان کر آن کھڑے ہوتے۔ فسادات کا ایک سلسلہ
مبارک پور کو برسوں جکڑے رہا، کبھی گئو کشی (مقامی زبان میں گئو کھیتی) نے ہندوؤں کو حفظ مقدم
کے طور پر مسلح کر دیا اور کبھی عبادت گاہ کی بے حرمتی نے کلمہ گویوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل بنا دیا، پہلوانی
اور کبڈی جیسے اسباب تفریح و کھیل کود میں تخالف اور تصادم تباہی کا باعث بن جاتے مگر ان سارے
فسادات کی نوعیت صرف مذہبی نہ تھی ان کے درپردہ معاشی اور اقتصادی عوامل تھے، لوٹ مار، ڈکیتی
(۱۹۵۰ ـ ۲۶۶۱) قرضوں کے بہی کھاتوں کو تلف کرنا، مہاجنوں اور ساہوکاروں کا خود ہندو
بنکاروں کو لوٹنے کا ارادہ کرنا، یہ سارے مالی طور پر پریشان زندگی، معیشت کی پراگندگی اور فرقہ وارانہ
ذہنیت کی گندگی کے نتائج تھے، چنانچہ ۱۸۴۲ء کے ہندو مسلم فساد میں قرضدار جلاہے موقع

---

[1] اس درخواست کی نقل مولوی حکیم عبدالمجید بھیری (مبارک پور) کے پاس تھی (گیانندر پانڈے انگریزی
مضمون ۱۲۵ ـ ۱۲۶) (دستخط ۔ حرف علامت کو ہوتے ہیں)

ملتے ہی مہاجنوں کے گھروں پر چڑھ بیٹھے اور حساب وکتاب کے رجسٹروں کو پھاڑ ڈالا اور اس طرح اپنا حساب بیباق کر دیا اور اعلان کر دیا "آنزا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک"

گر اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

ہندو مسلم فسادات کے پس پشت دونوں فرقوں کے زمینداروں کی پشت پناہی بھی تھی جن کی باہمی رقابت غریب مسلمانوں کو اور خاص طور سے 'جذباتی جلاہوں' کو برانگیختہ کر کے بلوہ کرا دیتی' قصبہ کے ایک پڑھے لکھے نورباف عبدالمجید نے بیسویں صدی کے اوائل سے اپنی ڈائری لکھنا شروع کی اور اس میں اس نے اپنی برادری کی جذباتی 'اداکاری' اور سادہ لوحی کی کردار نگاری کی ہے کہ کس طرح یہ ذرا سے اشتعال پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ "بڑے لوگ ورغلاتے ہیں اور چھوٹے لوگ نقصان اٹھاتے ہیں[1]" زمینداروں کا موروثی طبقہ جو راجپوت نو مسلم طبقہ کے رقیب دوسرے زمینداروں سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھتے تھے جیسا کہ گدا حسین اور بہور کے رجب علی کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے اور یہ کہ وہ بہت سارے حقوق و مراعات کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے' اس کی طرف علی حسن شیخ زمیندار کی تصنیف بھی واضح اشارے کرتی ہے' ذاتی مفاد اور باہمی عداوت نے کئی بار مسلمانوں کو آلۂ کار بنا کر فساد کروایا اور جب خون بہا تو مذہب کا رنگ دے کر خود یہ زمیندار سُرخرو بن گئے' چنانچہ ۱۳۲۲/ ۱۹۰۴ میں گوجہار اور مبارک پور پر جو تباہی آئی وہ ایک ہندو زمیندار اور ایک مسلمان زمیندار خدا بخش کی باہمی دشمنی کا بدترین مظاہرہ تھا' ان میں بقول انگریز حکام "مغرور نوربافوں" نے سب سے نمایاں حصہ لیا تھا۔[2]

شیعہ سُنی ٹکراؤ اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے' یک کربلا کے ملبہ سے ہر سال کئی کربلاؤں کا المناک حادثہ یادگار بن جاتا ہے اور پھر رسمِ ماتم اس کا ماتم کرتی ہے' نوابین اودھ کے عہد تسلط میں اس نوعیت کے فسادات کئی بار دہرائے گئے[86] چھیاسی سالہ زوالی دور میں شیعیت کے داعیوں نے ہاتھوں میں جہانگیر کا "پروانہ" دکھا کر سنیوں کو سینہ کوبی کرنے والوں کے ماتمی گروہ میں ملا لیا' جو چند بچے مٹی کے سنی تھے وہ جہانگیر کا عہد پا کر نعرۂ حیدری یا حسین' بلند کر کے سینہ پیٹنے

---

[1] یہ ڈائری مبارک پور میں عبدالمجید کے ورثا کی ملکیت ہے۔
[2] گیانندر پانڈے (انگریزی)، ص ۱۴۵ ۔ ۱۵۰

جماعتی اور قومی زندگی کے مظاہر انیسویں صدی کے مبارک پور قصبہ میں کم نہ تھے، بعض واقعات جو قصبہ کی حرمت، بانیٔ مبارک پور راجہ سید مبارک شاہ سے عقیدت اور انسانیت نواز روایات کے اعلیٰ اقدار کے حامل تھے اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن۔ انصاری برادری کا سارا وجود تصوف کے تصورات، مذہب کے اعلیٰ صفات اور پاکیزہ جذبات پر مبنی تھا، قوم، جماعت، وطن، اور عام انسانیت سے گہری وابستگی، عقیدت اور محبت تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں جب سواد قصبہ میں بھور جیب کی عام آبادی میں رو تارے زمیندار غالب تھے ان کا باغی رہبر رجب علی اپنے دو ہزار ساتھیوں کو لے کر قصبہ مبارک پور کے مہاجنوں کو لوٹنے اور قصبہ کو برباد کرنے کی نیت سے چڑھ آیا تو مسلمان جوانمردوں نے جوابی اقدام کیا، سارے لوٹ گئے، پھر قصبہ کے موروثی زمیندار شیخ گدا حسین اور انصاری برادری کے چودھری بخش نے خط میں لکھا کہ مہاجنوں کو لوٹنے کے بارے میں ایک کلمہ بھی منہ سے نکالا تو تمہاری بستی 'بھور' کی خیر نہیں، رجب علی نے پیغام بھیجا اور قدم شریف کی زیارت اور راجہ صاحب کے مزار پر نذر و نیاز چڑھانے کے لیے آنے کی اجازت مانگی تو شرط یہ رکھی گئی کہ صرف پانچ زائرین آسکتے ہیں اور دھوکے سے دو تین ہزار آگئے تو جان و مال کو ہم اپنی کمزوری شرافت نیاز کے تصور کرنا" [1]

اسی طرح منگھرا (ضلع فیض آباد) کے ٹھاکر جب مہاجنوں کو لوٹنے آئے تو مسلمان سینہ تان کر کھڑے ہو گئے، دونوں مذہبوں کے اتحاد کا محور، عمل وہ عقیدت تھی جو بانیٔ مبارک پور راجہ سید مبارک کی عظیم شخصیت سے وابستہ تھی جن کا ایک فرضی اور جعلی مزار راجہ صاحب کی مسجد کے شمال میں بنایا گیا تھا، مسلمان عقیدت مندوں کے لیے سارا قصبہ ان کے روحانی وجود سے مبارک اور بابرکت تھا اور ہندوؤں کے لیے پوتر۔ قدیم روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصبہ ۸۴ محلوں کا مجموعہ تھا جن میں ۴۳ محلے مبارک پور خاص میں تھے اور چودہ محلے سواد میں لیکن تمام تجارتی، علمی، دینی، مذہبی اور معاشرتی سلسلوں میں جڑ کر ایک اکائی بن گئے تھے، چند بڑے مشہور محلے یا بستی تھے: سکٹی، سرائے مبارک، مصطفیٰ آباد، حسین آباد، سریاں، رسول پور، تروہ، املو، اورو جیا، چکیا، اساوا، لہرا، گجہرا، فخر الدین پور، بھور۔

مہاجنوں کی جان و مال کی حفاظت کو قصبہ کے مسلمان حقوق العباد اور فرضِ کفایہ کا درجہ دیتے

---

[1] ایضاً (انگریزی) ص ۱۲۸ اور نقوش تراشے ۳ ص ۱۲۳

تھے مہاجنوں کو راجہ صاحب کے تبرکات سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار یہ مزار کی مرمت کر کے اور ہر
جمعرات کو چراغ جلا کر اور چڑھاوے چڑھا کر دیتے تھے ۱۸۶۶-۶۷ء سے مسلسل بیس برسوں تک مرمت
وغیرہ کا سارا خرچ یہی مہاجن دیتے رہے[1] باشندگانِ قصبہ راجہ صاحب کی یادگاروں اور تبرکات کا
بڑا پاس رکھتے تھے اس لیے کہ وہ اس قصبہ کے لئے مرنے کے بعد بھی فیوض و برکات کا منبع اور انوار
ہدایات تھے، ان کے فرمان کے خلاف کسی نے ان کے مزار سے بلند کوئی عمارت دو منزلہ نہیں بنائی
اور جس نے اس فرمان کے خلاف کیا چاہے وہ انگریز صاحب کا شوالہ ہو یا کوئی امام باڑہ زیادہ
دنوں تک قائم نہیں رہا۔[2]

مبارکپور کے باشندگان میں شیوخ زمیندار اور انصاریوں کے چودھری بڑے بااثر لوگ تھے ان کی وجہ
سے کئی بار فساد ٹل گئے اور ہنگامہ خیز ایام میں امن بحال رہا۔ یہ لوگ باشعور اور حقیقت پسند قصباتی
کردار تھے جیسے اگلی صدی کے مولوی شکر اللہ تھے اور دینی درسگاہوں کے اساتذہ اور شیوخ جن کی
ایک بڑی تعداد اسی عہد کی پیداوار تھی جو انسانی رشتوں کی سچائی اور اپنے معاشرے اور اپنے وطن
سے گہری وابستگی کا شعور رکھتے تھے، انصاری برادری کے سردار — شہاب مہتر نے ۱۸۱۳ء
کے زبردست بلوے میں امن و سکون بحال رکھنے کے لئے بڑی جدوجہد کی لکھنؤ تک نواب اودھ
کے دربار میں فریاد لے کر گئے اور ہندو مسلم کی خونریز جنگ کی خونیں داستان سنائی اور گورکھپور
کی عدالت میں یہ نکتہ پیش کیا کہ یہ صرف قصبہ کے مسلمانوں کا مسئلہ نہیں پورے ہندوستان کے
مسلمانوں کی بقاء کا سوال ہے پہلے دونوں قومیں مل جل کر رہتی تھیں جب سے ہندوؤں نے
عملداری سنبھالی ہے مسلمانوں کو سرِ عام قتل کیا جا رہا ہے[3] علی حسن جو خود طبقاتی شعور رکھتا تھا
اپنے سے نیچے درجے کے سردار شہاب مہتر کی عقلمندی، اصابت رائے اور استقامت کی تعریف
کرتا ہے اور جرأت کی تحسین جس نے ۱۸۱۰ء میں بھی شیعہ سنی فساد کے سلسلے میں پکڑے گئے
برادری کے بے گناہ بنکروں کو محمد آباد گہنہ کے تھانیدار کی حراست سے چھڑوایا تھا، غدر کے ایام میں
برادری کے بخش مہتر نے بھی آبائی سنت پر عمل کر کے جرأت مومنانہ کا کئی مرتبہ ثبوت دیا۔

---

[1] واقعات دشت مبارک پور بحوالہ گزیٹیر سندر پانڈے (انگریزی)، ص ۱۲۸-۱۲۹

[2] ایضاً ص ۱۳۳، ۱۳۴

[3] ایضاً ص ۱۳۴

مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کو اپنے آباء و اجداد کی بسائی ہوئی بستی سے جو محبت تھی اس کا پرتو ان کے قلم کی نورانی تحریر سے جھلکتا ہے، اپنی فاضلانہ تصنیف "شجرۂ مبارکہ" کو انہوں نے بڑی محنتوں کے بعد "شجر سایہ دار" بنایا ہے اور اسی کی چھاؤں تلے کتنے چہرے کتنے سائے "چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، چودھویں صدی کے اواخر کے مبارک پور کی علمی، دینی اور ادبی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مبارک پور کا سو سالہ دور علمی، دینی اور ادبی زندگی کے حق میں بڑا آفریں اور مردم خیز ثابت ہوا اس دور کی مبارک پور بستی کو علماء و فضلاء کے جھگھٹے کے سبب "نیشاپور ہند" کہا جا سکتا ہے، اس بنات النعش کے درخشندہ کواکب تھے:

مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارکپوری (متوفی ۱۳۵۳ھ)، مولانا حافظ عبد الرحیم مبارکپوری (متوفی ۱۳۲۰ھ)، مولانا عبد السلام مبارکپوری (م ۱۳۴۲ھ)، مولانا عبد العلیم رسولپوری (م ۱۳۲۲ھ)، محمد حسین رسول پوری (م ۱۳۵۹ھ)، مولانا الٰہی بخش کوپاگنجی (م ۱۳۱۸ھ)، مولانا حکیم الٰہی بخش مبارک پوری (م ۱۳۵۶ھ) اور بیسویں صدی کے مجاہد آزادی مولانا شکر اللہ مبارک پوری۔

علماء و فضلاء کے علاوہ اس مبارک قصبہ میں شعر و سخن کے اور شمع ادب کے پروانے بھی تھے جو دبستانِ شعر و ادب کے کئی ادوار بھی مقرر کئے گئے ہیں، ان میں منشی حبیب اللہ حبیب، حافظ نظام الدین رفعت، مولوی غلام عباس، قاضی اطہر مبارک پوری، تبسم مبارک پوری، محمد حنیف رہبر، محمد عثمان ساحر، فقیر اللہ اسور سیمابی اور ایوب مبارک پوری وغیرہ عروس سخن کی مشاطگی کرتے رہے ہیں۔ عربی شاعری میں مولانا احمد حسین رسول پوری اور مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے نام نمایاں ہیں۔[2]

عبد المجید نزہت کی ڈائری سے مبارکپور کی برادری کے معاشرتی اور معاشی حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ سوت کے بازار کا بھاؤ کپڑے کی تجارت کی گرم بازاری، ولادت اور اموات کے اندراج اور مذہبی سرگرمیوں کی تفصیلات ملتی ہیں ۱۰ اگست ۱۹۱۰ء کی تاریخ کے زیر تحت یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ: "بیوپار اچھا ہونے کے سبب مبارک پور خوشحال ہوگیا ہے اور باشندگان برادری کے ۲۴ افراد امسال حج کعبہ کے لئے تشریف لے گئے ہیں، لیکن حوادث وقت سے ایسا صنعتی

---

[1] واقعات و حادثات مبارک پور بیرو لڈگیانندو پانڈے (انگریزی) ص ۱۳۶

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ ایضاً ص ۵۵۔ ۵۷

زوال آیا کہ بستیاں اُجڑ گئیں اور اُجڑے ہوئے لوگ کامٹی، ناگپور، برہانپور، مالیگاؤں اور بمبئی میں جاکر بس گئے۔

مبارک پور اور اس کے سواد کے باشندوں کے لئے معیشت کے مختلف ذرائع اور وسائل مہیا تھے، ریشمی کپڑے کی صنعت بہت قدیم تھی، کمپنی بہادر کے زمانے میں یہاں کے ریشمی پارچے برما، چین اور عرب ممالک تک بھیجے جاتے تھے، سواد میں گذشتہ صدی تک نیل کی کاشت اور تجارت ہوتی تھی، شکر سازی کے کارخانے تھے، تجارت، صنعت اور علم وفضل کی برکات وفیوض نے مسلمانوں کو مرفہ الحال، ذی وجاہت واقتدار کا حامل بنا دیا تھا، مگر ان کے لئے انہوں نے قربانی وایثار سے کام لیا تھا، یہی وجہ تھی کہ قصبہ اور سواد کے عمائدین کے نام پر ان کی یادگاریں قائم ہوگئی تھیں اور علی نگر، پورہ خواجہ، پورہ صوفی بہادر، شاہ محمد پور، حسین آباد، پورہ خضر، پورہ دولہن، رسول پور اور فخر الدین پور کی بستیوں اور محلوں سے ان کی یادیں وابستہ ہیں۔ قدیم مبارک پور کو قدیم بستی کہتے تھے۔[1]

مبارک پور کے علمی اور درسی سلسلوں کے فیوض وبرکات سے اس قصبہ میں ایک صوفیانہ فضا پیدا ہوگئی تھی ان میں ولی اللہی سلسلہ خاص طور سے بہت مقبول ہوا، اسی کے ایک سلسلہ نے اتباع سنت اور اجتہاد کا راستہ اختیار کیا مگر دوسرا حلقہ وہ تھا جس نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہی تقلید اور تصوف کو باقی رکھا۔ مبارک پور میں اول سلسلہ کے متعدد علماء پیدا ہوئے مولانا عبدالرحمن محدث، مولانا عبدالسلام مبارک پوری، مولانا عبدالحق اعظمی، مولانا بخشش احمد، محمد احمد بہاری اور مولانا شاہ محمد سریلوی۔

علماء مبارک پور کے تصنیفی کارناموں کی گونج عرب ممالک میں بھی سنائی دینے لگی تھی مولانا عبدالرحمن محدث، مولانا عبیداللہ رحمانی، محمد حسن اعظمی مبارک پوری ازہری، مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی، مولانا عبدالسلام مبارک پوری اور عصر حاضر اور زمانہ قریب میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں:[2]

---

[1] عبد مجید کی ڈائری: مبارک پور کا واقعہ: پرانی بستی

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری ایضاً۔ ص ۲۲ ۵۵

مئوناتھ بھنجن

مئو کی بستی بڑی قدیم ہے، اس کی تاریخ کا پہلا باب سید سالار مسعود غازیؒ (متوفی ۴۲۴ھ مطابق ۱۰۳۰ء) کی تبلیغی مہم کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ مجاہدین کا ایک تبلیغی دستہ اعظم گڑھ ہوتا ہوا اس طرف آیا، اس دستے کے سالاروں میں شاہ ملک طاہرؒ اپنے بھائیوں کے اس قصبہ میں وارد ہوئے، سید سالار غازی کے لشکر میں "ملک" کا خطاب ہر اس دستے کے سالار تیر لشکر کا ہوتا تھا۔ یہ یہیں بس گئے اور اشاعت اسلام اور اعلاء کلمۃ الحق کے داعی بن گئے، اس زمانے میں یہ قصبہ ایک "نٹ" بھنجن کے قبضے میں تھا جو بڑا ظالم اور سرکش تھا، باشندگانِ قصبہ اس کے ظلم و جبر سے نالاں تھے، ملک طاہرؒ کی ملکوتی صفات اور دعوت و تبلیغ و ارشاد اور اسلام کی عالمگیر تعلیم، اخوت اور مساوات کے انسانی رویے نے قصبہ کے باشندوں کی قلب ماہیت کردی اور آہستہ آہستہ لوگوں کا سینہ اسلام کے لیے کھلنے لگا، نتیجہ یہ نکلا کہ نٹ بھنجن کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور شاہ ملک طاہر سے متصادم ہوا، مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا، بالآخر وہ ظالم سرکش اپنے حواریوں کے ساتھ سرنگوں ہوا اور قصبہ پر شاہ ملک طاہر کا عمل دخل ہو گیا، اور حاکم وقت نے یہ قصبہ ان کی جاگیر میں دے دیا اور بطور یادگار قرون شاہی میں مئو ناتھ بھنجن کے ساتھ یاد کیے گئے۔[1] بہت جلد یہ قصبہ مسلم اکثریت کی آبادی والا قصبہ بن گیا اور حکومت مغلیہ کے آخری حکمرانوں کے دور میں یہ کئی صنعتوں کا مرکز بن گیا تھا۔

قصبہ کے مشرقی حصے میں ملک طاہر بابا کا روضہ ہے، آپ ہی کے نام سے وہ محلہ ملک طاہر پورہ اور روضہ کے نام سے موسوم و معروف ہے۔ شاہ ملک طاہر کے ایک بھائی ملک قاسم کے نام سے قریب بعد متصل دوسرا بڑا محلہ قاسم پورہ موسوم ہے۔ قاسم پورہ چھوٹے بڑے سات پوروں پر مشتمل ہے۔ اسی واسطے اسے "قاسم پورہ ہفت پورہ" کہا جاتا ہے۔[2]

---

[1] تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب۔ محفوظ الرحمٰن فیضی۔ فیض عام اکیڈمی۔ ج ۲ مدرسہ فیض، مئو ناتھ بھنجن یوپی انڈیا ۱۴۰۹ھ/۱۹۸۹ء ص ۱۰

[2] ایضاً۔ مئو کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک توجیہ یہ بھی ہے جو خالصتاً تاریخی حیثیت سے ثابت ہے کہ نٹ بھنجن نے ملک طاہر سے شکست کے بعد اپنی جان سے درخواست کی کہ وہ اب مرا ہی چاہتا ہے (یعنی مرنے کے قریب) اس کی آخری خواہش ہے کہ اس قصبے سے اس کا نام اس طرح جوڑ دیا جائے کہ وہ امر ہو جائے۔ اسی مناسبت سے اس قصبہ کا نام پہلے مئوات بھنجن ہوا اور بگڑتے بگڑتے "مئو ناتھ بھنجن" ہوا۔ ایضاً ص ۱۵۔ نٹ بزنٹ۔

عالمگیر کی بیٹی شہزادی جہاں آرا کو مئو جاگیر میں ملا تو یہ جہاں آباد بن گیا اور کئی صنعتوں کا اہم مرکز صناع، کاریگر، پیشہ ور طبقوں کے اہل کمال اور اہل ہنر یہاں اکٹھا ہونے لگے جنہیں شہزادی کی سرپرستی کے آنچل کے سائے تلے اپنا کمال اور ہنر دکھانے کا موقع ملا۔ سب سے زیادہ یہاں شکر سازی کے کارخانے تھے لیکن سب سے زیادہ فروغ بافندگی کی صنعت کو ہوا۔ یہاں کے بنکر جو خاندانِ تیموریہ کے ہمرکاب آئے تھے یہیں کے ہو رہے اور گھا صنعت میں یہاں کے چابکدست کاریگروں نے نت نئی ایجادات سے اپنا کمال دکھایا۔ نت نئی ڈیزائنوں اور جاذب نظر رنگوں کے امتزاج سے سنگین غلطہ، اور ساڑیاں بُنی جاتی تھیں جن کی مانگ چہار دانگ عالم میں تھی۔

مئو کے بنکروں کی زندگی کے تار کمپنی بہادر کے زمانے سے ٹوٹنے لگے تھے لیکن تقسیمِ ہند سے پہلے تک پھولپور (اعظم گڈھ)، مینا نگر، کوپا گنج، محمد آباد، بلی اور سرائے میر میں صنعت و تجارت کی پرانی روایات قائم رہیں۔ مئو میں ہر سال لاکھوں کا مال آتا تھا، تحریک خلافت کے زمانے میں ترکِ موالات اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی وجہ سے مئو کی صنعت پارچہ بافی پر گہرا اثر پڑا۔ ترکِ موالات کے سلسلے میں جو مسلمان مجرم ٹھہرائے گئے تھے ان کے خلاف خود چند غدار مسلمانوں نے گواہیاں دی تھیں یہ مبارک پور کا واقعہ ہے جسے عبدالمجید نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے۔

مئو میں انیسویں صدی کے اختتام تک لگ بھگ پانچ ہزار کے قریب نوربافت تھے ۱۸۵۷ء میں مبارک پور کی برادری کا جو تجارتی مال لوٹا گیا تھا اس میں مئو کے نوربافوں کا تیار شدہ مال اور پارچے کے تھان رکھے تھے۔ لکھے بھی تھے، غدر کے ہنگاموں، فرقہ وارانہ فتنوں اور حکومت کی چیرہ دستیوں کے سبب یہاں بھی مبارک پور کی طرح صنعتی تباہ حالی نے اپنے پنجے گاڑ دیے تھے، معیشت اجڑی تو مہاجرین سے مالیگاؤں اور کامٹی کی بستیاں آباد ہو گئیں، سب سے پرانے خاندان ان شہروں میں یہیں سے جا کر آباد ہوئے تھے۔

مئو میں بھی فسادات کی وجہ فرقہ وارانہ منافرت ہی نہیں تھی بلکہ معاشی استحصال اور قرض خور مہاجنوں اور ساہوکاروں کی زیادتیاں تھیں جو بھاری سود اور اصل کا کشکول لے کر ہر ہفتے کے ہاٹ "گجری" میں کھڑے رہتے تھے، قرضدار مجبور ہو جاتا تو اپنا اثاثہ بیچ ڈالتا یا تھوڑی بہت زمین جو باپ دادا کی میراث تھی گروی رکھ دیتا، سیٹھ ساہوکار اونے پونے خرید کر جھٹ اس پر ایک نیا شوالہ بنا کر دائمی حق کا دعویدار بن جاتا، اصلی مالک نااہل اور تصرف کے ناقابل بن جاتا۔ اسی طرح شوالے کھڑے ہوتے رہے تو مسجدوں کی بنیادیں دھنسنے لگیں مگر

ان کی غیرت اُبھرتی گئی جس کے نتیجے میں جذباتی جلاہوں نے سرفروشی کی قسمیں لینے لگیں۔[1]
۱۸۶۰ء اور ۱۸۹۲ء میں یہاں اسی نوعیت کے فسادات ہوئے۔ سارے مشرقی اضلاع میں گئو کشی کے خلاف بلیا، غازی پور اور نواحی علاقوں کے ہندوؤں نے گوپا گنج، گھوسی، چریا کوٹ اور اعظم گڑھ کے دوسرے شہروں پر حملے کئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ "برادران وطن" نے باقاعدہ "گئو رکشا سبھا" قائم کر کے مضافات مئو میں اس کی شاخیں کھولی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بہت بڑی تعداد جمع ہو کر بقرعید (۲۵ رجب ۱۸۹۳ء مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھ) کو منظم طور پر چاند پورہ جو نوربافوں کی بستی ہے حملہ آور ہوئے مخالفین کا ہجوم آتشیں اسلحہ، بلم نیزے تیر اور لاٹھی سے مسلح ہو کر قصبہ پر چڑھ آیا تھا متعدد معرکے ہوئے مگر مومن بے تیغ بہادر سپاہی کی طرح لڑتا رہا، دونوں طرف سے بہت سی جانیں ناحق ضائع ہوئیں۔

"ہاکس صاحب بہادر نے جو اس ضلع کے کپتان تھے اس ہنگامہ کے وقت جائے حادثہ پر موجود تھے، نے اپنے بیان میں بلوائیوں کی تعداد پچیس ہزار بتلائی ہے جبکہ مسلمانوں کی تعداد اس کے مقابلے میں بہت کم تھی لیکن بنصرت غیبی کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللہ کے مصداق بلوائیوں کو ناکامی ہوئی اور وہ خائب و خاسر ہو کر نامراد واپس ہوئے"[2] اس ہنگامہ کی یاد میں متعدد اہل ذوق نے رجزیہ مثنویاں لکھیں۔ اس اہم تاریخی واقعہ کو "گئو لچھنی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وہابی تحریک سے مئو کی وابستگی مولانا سخاوت علی جونپوری (متوفی ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۰ء) کی ذات بابرکات کے وسیلے سے قائم ہوئی مولانا جونپوری کے مشاہیر تلامذہ میں ایک نمایاں نام مولانا فیض اللہ مئوی (متوفی ۱۳۱۶ھ) کا بھی ہے۔ مئو کی موجودہ دینی و تعلیمی تحریک کے اصل بانی انہیں کی ذات گرامی تھی۔ جب علامہ شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ اور شہر اعظم گڑھ کے اہل علم کے مشترکہ تعاون سے ۱۲۸۰ھ میں ایک مدرسہ بنام مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو مولانا فیض اللہ مئو سے اعظم گڑھ چلے آئے۔ لیکن مئو ناتھ بھنجن اور دیگر مضافات ضلع ہمیشہ آپ کے دعوتی و تحریکی سرگرمیوں کی جولانگاہ بنے رہے آپ ایک عرصہ تک صادقین صادق پور کی تنظیم

---

[1] گیانندر پانڈے۔ (انگریزی)، ص ۲۰۷
[2] محفوظ الرحمٰن فیضی ایضاً ص ۱۹۰۔ دیکھئے البقرة : ۲۴۹

تحریک سے منسلک رہے۔ اعظم گڑھ ضلع پر خصوصیت کے ساتھ مولانا فیض اللہ مئوی کا اثر رہا۔ مئو میں توحید کا بیج انہیں کے ہاتھوں بویا گیا، مولانا فیض اللہ مئوی کے فیضان علم سے بکثرت تشنگان علوم سیراب ہوئے۔

مئو میں، بافندگی کی صنعت کو فروغ یہاں کے ماہر بافندوں کی بدولت ملا، انہیں لباس تقویٰ کے بافندوں نے علم و دانش کی کارگاہوں کو بڑی رونق بخشی اور یہاں اتنی کثرت سے علماء و فضلاء، صاحب تصنیف اور اہل قلم پیدا ہوئے ہیں کہ دوسرے اضلاع میں اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے، سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ تاریخ مومن۔ انصار کے مصنف ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان دانا پوری لکھتے ہیں:

> "مئو ناتھ بھنجن کے انصاریوں کا کیا پوچھنا ہے ہر طرح کے اہل فضل و کمال موجود ہیں۔ دینی مدارس کثرت سے ہیں۔ دینی تعلیم کا بے حد شوق ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر گھر میں زنانہ مدرسے جاری ہیں جس میں عموماً دینی کتابیں اور کلام اللہ پڑھایا جاتا ہے۔ بعض لڑکیاں فارسی بھی پڑھ لیتی ہیں۔ بعض عربی صرف و نحو جلالین مشکوٰۃ بھی پڑھ لیتی ہیں۔ تجارت میں یہاں کے لوگ بہت فائق ہیں اسی وجہ سے نہایت دولت مند و معزز ہیں اور دوسری قومیں ان کی خدام اور دست نگر ہیں۔ علماء اور اطباء کی تعداد بہت ہے اور حفاظ تو بکثرت ہوتے ہیں۔ نہایت مہذب اور خلیق لوگ ہیں۔"[1]

یہ جائزہ بہت سرسری ہے۔ سچ یہ ہے کہ مئو کی دینی، علمی اور تعلیمی حالت اس سے کہیں زیادہ بلند رہی اور جاری تھی یہاں کے مشہور مدرسوں میں مدرسہ عالیہ اور جامعہ فیض عام کو قومی مقام حاصل ہے جو اسلامی علوم و فنون کی بیش بہا اور مخلص خدمات انجام دے رہا ہے، اس سرچشمہ علم و دانش سے اتنی بڑی تعداد میں طالبان علم سیراب اور فیضیاب ہوئے ہیں کہ ان سب کا حصر اور شمار ناممکن ہے ان میں ایک بڑی تعداد نے مسند درس و تدریس کو زینت دے رکھی ہے۔ اہل حدیث کے بیشتر اساتذہ و شیوخ یہیں پیدا ہوئے اور ان کے ایمان و آگہی اور علم

---

[1] ملحوظ رہے کہ مبارکپور اور مئو کو مرتبہ کہ ان کے گہوارۂ علم و دانش سے بڑی عظیم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جن میں محدث شہیر محمد عبد الرحمن مبارکپوری کی ہستی سب سے زیادہ تابناک ہے، مولانا محمد عبد السلام مبارکپوری اور ابو المآثر مولانا حبیب الرحمن اعظمی بڑی عظیم ہستیاں تھیں جو مئو ہی سے اٹھیں۔ دیکھئے: ... کے مومن دستوں سے۔

وفضل کا نتیجہ ہے کہ آج تک یہ چراغ روشن ہے اور جو نئی روشنی پھیل رہی ہے اسی چراغ کا فیض ہے، مولانا فیض اللہ مئوی نے جو پودا لگایا تھا، ملا حسام الدین مئوی (م ۲۱۰ھ) اور مولانا حکیم ابوالمکارم محمد علی (م ۱۳۵۲ھ) نے اپنے خون جگر سے سینچا اور مولانا محمد احمد ناظم نے جس کی نگرانی کی آج اسی شجرۂ مبارک کے روح پرور اور ایمان افروز سائے میں کئی نسلوں نے علم و عمل اور فضل و دانش کے نئے پودے لگا دئے ہیں۔ یہاں کی سرزمین سے اٹھے ہوئے ارباب علم اور تصنیف نے دینی و تبلیغی، تعلیمی و تدریسی اور تحقیقی و تصنیفی خدمات، درکارنمایاں کے ذریعے جریدۂ عالم پر ایسے گہرے اور نورانی نقوش ثبت کئے ہیں جو دیر تک قائم رہیں گے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل موجودہ علماء میں ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری (ولادت سنہ ۱۹۳۹ء) ریکٹر جامعۃ السلفیہ بنارس اور ڈاکٹر عبدالعلی عبدالحمید ازہری (ولادت ۱۹۴۳ء) قابل ذکر ہیں، یہ دونوں عربی دکتوریٹ، علوم اسلامی کے شاندار سرمایۂ علم و فضل کے وارث، امین اور محقق ہیں جن کی گرانقدر تصانیف عالم اسلام میں انہیں روشناس کرا چکی ہیں[1]

مئو میں سینکڑوں کی تعداد میں علماء، فضلاء اور شعراء پیدا ہو چکے ہیں اور آج موجود بھی ہیں۔ ملا حسام الدین مئوی کا خانوادہ آج بھی علمی روایات کا امین ہے۔ مدرسہ فیض عام کے ہزاروں فارغین "فیضی" ہر جگہ پھیل کر طالبان علم کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ ابوالمآثر محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کا شمار اکابر علماء میں ہوتا ہے۔

کوپا گنج

قصبہ کوپا گنج[2] ضلع اعظم گڑھ کا ایک قدیم صنعتی قصبہ ہے جو مئوناتھ بھنجن اور قصبہ گھوسی کے درمیان واقع ہے، تاریخی واقعات اور یادگاریں شہادت دیتی ہیں کہ یہ قصبہ بھی نواحی قصبات کی طرح قدیم ہے اور جس طرح ہر شہر و دیار میں سید سالار مسعود غازی کی تبلیغی مہمات کے دستے کا ایک نہ ایک ملک شہید گنج شہیداں میں دفن ہے یہاں بھی نور شہادت کی کرنیں پہنچی تھیں۔ اسی طرح کی قبریں رائے بریلی، سلطان پور، فیض آباد، پرتاب گڑھ، اعظم گڑھ، جونپور، بنارس

---

[1] دیکھئے باب: [illegible]

[2] قصبہ کوپا گنج کے بارے میں تمام معلومات تذکرہ مشاہیر کوپا گنج۔ تالیف محمد عثمان معروفی اعظمی۔ معاون یوسف جمیل ندوی (۱۹۸۵ء) سے لی گئی ہیں۔

اور غازی پور میں پائی جاتی ہیں۔ سید سالار غازی میاں کی یادگاریں کوپا گنج میں بھی جگہ جگہ ہر سال صحبت کے نام سے ایک میلہ لگتا ہے اور ان کا نشان گھمایا جاتا ہے۔ نہایت پابندی کے ساتھ یہ تقریب منائی جاتی ہے۔ یہاں ۱۹۱۲ء تک مسلم راجاؤں کا اقتدار مسلط رہا ان کے نام سے منسوب اور موسوم بہت سارے محلے آباد ہیں۔ بازید پورہ، حکیم پورہ، بدرست پورہ، ہرنس پورہ، جمن پورہ، فتح پورہ وغیرہ۔

کوپا گنج میں حنفی المسلک دیوبندی النسبت مسلمان زیادہ تھے، برادری میں کچھ اہلحدیث بھی ہیں، شیعہ باشندوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو بڑے اہتمام سے محرم میں مجلس عزا اور تعزیہ داری سے متعلق تمام رسومات ادا کرتے تھے، پہلے ان مختلف جماعتوں میں مخالفانہ ومناظرانہ صورتیں رونما ہوئیں مگر اب ناپید ہیں۔ مذہبی تعلیم کا رواج ہمیشہ ہی رہا اور مختلف مدارس و مکاتب جاری ہیں، جامعہ عربیہ مصباح العلوم قصبہ کا سب سے قدیم مدرسہ ہے جو ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا اس کے بانیوں میں حاجی محمد یعقوب عرف حاجی چمرو اور حاجی عبدالواحد صاحب دو بزرگوں کے نام قابل ذکر ہیں، سب سے پہلے مدرس قصبہ گھوسی کے ایک متدین اور ذی استعداد عالم دین مولانا حافظ قاری محمد یعقوب کا تقرر عمل میں آیا جن سے قصبہ کے طالبان علم نے کسب فیض کیا، اس کے علاوہ یہاں کئی اور مدارس ہیں مدرسہ جامع العلوم، وصیۃ العلوم، امداد العلوم وغیرہ۔ کئی لائبریریاں بھی ہیں اور علمی ادبی اور اصلاحی انجمنیں بھی قائم ہیں، قصبہ کی دیگر انجمنوں میں اصلاح اللسان، علم بساط، تنظیم المسلمین، ہدایت المسلمین، اصلاح المسلمین، و حیات المسلمین قابل ذکر ہیں۔ ان کے بانیوں میں مومن برادری کے افراد شامل ہیں۔ یہاں صاحب تصنیف اور اہل قلم کی تعداد نا خاصی ہے۔ بڑے معروف شعراء بھی پیدا ہوئے ان میں مولانا سراج الدین (متوفی ۱۳۴۷ھ)، مولانا محمد سلیم قاسمی (م ۱۳۹۲ھ)، مولانا عظیم اللہ (م ۱۳۹۰ھ)، مولانا عبدالقیوم اور محمد عثمان معروفی خلیفہ و مجاز مصلح الامت حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوری (م ۱۳۸۷ھ) کی روحانی حکمرانی تھی کوپا گنج کے بیشتر اہل علم واکابر ان کے حلقہ ارادت میں شامل تھے خانقاہ فتحپور مرجع خلائق عامہ تھا۔

قصبہ میں بزم شعر و سخن عرصہ سے قائم ہے اور قادر الکلام شعراء بھی پیدا ہوئے۔ ان میں یہ مومن ممتاز شعراء قابل ذکر ہیں: مولوی اختر حسن مضطر انصاری، قاضی عبدالشکور عاصی انصاری، اظہر حسن اظہر انصاری، منشی عبدالمجید صفیر وغیرہ کے علاوہ دیگر شعراء کی بڑی تعداد موجود رہی ہے، مثلاً مولانا اسد اللہ، مولوی عبدالوحید صاحب وحید، مولانا محمد سلیم صاحب سلیم، مولوی عبدالرشید صاحب رشید

رفیع اللہ ذوقؔ - فضل حق - ابوالکلام صاحب جوہرؔ - رہبر عزیزی - حکیم مولوی حفیظ اللہ، ڈاکٹر عباد صاحب افیقؔ - مولانا اسلام الحق - منشی محمد صدیق صاحب مشتاقؔ - مولوی ابوالحسنات فانیؔ - مولوی عبدالمنان امینؔ - اسیرؔ عزیز القدر صاحب نشترؔ - وحید الزماں صاحب سحرؔ کامرانی، نذیر احمد بیتابؔ عظیمی، مولوی معین الدین راہیؔ - مولوی غفران احمد تنویرؔ جمالی - مولوی ظہیر الجبار گوہرؔ سعیدی - کوپاگنج کے سب سے قادر الکلام اور برجستہ شعر کہنے والے بندہ علی تھے جو اس قصبہ میں اپنے ننہال میں حاجی جیکن شاہ کے یہاں آکر بس گئے تھے۔

کوپاگنج کے فسادات

مئو کی گئو لچھمی نے یہاں بھی اپنے منحوس لچھن دکھلائے تھے۔ ۲۵ر جون ۱۸۹۳ء مطابق ۱۰ر ذی الحجہ ۱۳۱۱ھ کو جب مئو میں ہندو مسلم جنگ ہوئی تو اس موقع پر چالیس جگہ فسادات ہوئے تھے اس سلسلہ میں کوپاگنج میں بھی سنگین بلوہ ہوا جس میں دس ہزار ہندو بلوائی شریک تھے اس کی خبر تین ماہ بعد بمبئی کے فارسی اخبار عام افروز میں ۲۰ ستمبر ۱۸۹۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی:

> "امسال روز عید متوبہ اطراف تقریباً دہ ہزار نفوس [ہنس] رپورٹ پریشن کردہ مانع قربانی گاؤ شدند مگر درین ہنگامہ نہ قربانی شد نہ تذبیحہ این واقعہ متعلق چریا کوٹ نبود بلکہ در مئو وکوپا و دیگر مقامات نیز پیش آمد"

جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب ایک قصائی سے جو ذبح کی طرف جا رہا تھا جانوروں کا جھنڈ چھین لیا گیا، یہ واقعہ جنوری ۱۸۹۲ء کا ہے ۱۹۳۶ء میں بھی یہاں ایک ہنگامہ ہو چکا تھا قتل و غارت گری کی فہرست میں حضرت مصطفیٰ شہید کا واقعہ بڑی شہرت لئے ہوئے ہے جنہیں یہاں کے اکثریتی فرقہ کے شرپسندوں نے سازش کر کے ۳ر جولائی ۱۹۵۵ء کو شہید کر دیا، ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو سڑک کے کنارے جین پورہ مسجد کے چبوترہ پر رکھی ہوئی پانچ سات ہزار اینٹوں کے انبار کو ہٹا کر ایک بڑے جلوس نے مورتیوں کا رتھ رکھنا چاہا اور ایک سازش کے تحت خشت باری شروع کر دی اور پھر جگہ جگہ فساد برپا کر دیا گیا، اسی طرح فساد برپا کرنے کے لیے " خوئے بد کو بہانہ بسیار " کی کمی نہ تھی ۱۹ر نومبر ۱۹۸۲ء کو دو فریق کے ایک معمولی جھگڑے کو آڑ بنا کر جامع مسجد پر سنگباری کی گئی، ادھر سے بھی اینٹوں کا جواب پتھر سے دیا گیا، مسلمانوں کی چند دکانیں لوٹ لی گئیں، اور بازار میں سبزی

فروشوں کا سارا مال لوٹ لیا گیا، یکم فروری ۱۹۸۳ء کی شب میں منشی نذیر احمد اور مولوی نورالہدیٰ
کی دوکان جلا کر خاکستر کر دی گئی۔ ۱۱ر فروری ۱۹۸۳ء کو حاجی اسلام اور ان کے پڑوسی ایک کٹنگ
کے درمیان معمولی تکرار پر شرپسندوں نے ایک جلسۂ عام کیا جس میں اشتعال انگیز تقریریں ہوئیں
پھر مشتعل مجمع نے جگہ جگہ پھیل کر پولیس کی پشت پناہی پر غارتگری اور آتش زنی شروع کر دی
تالا توڑ کر دکانیں لوٹی گئیں۔ مولوی احسان کی دوکان سے تقریباً بیس ہزار کا مال لوٹ لیا
گیا، ڈاکٹر قمر الہدیٰ کا دروازہ توڑ کر پولیس نے ڈاکٹر صاحب اور ان کے صاحبزادے کو لاٹھی
ڈنڈے سے زدوکوب کیا، درگا پان فروش جو ڈاکٹر صاحب کا پڑوسی تھا وہ بھی لٹ گیا۔ شرپسند
ہندوؤں کا یہ وطیرہ بن گیا تھا کہ سڑک اور اسٹیشن پر اکا دکا مسافروں کو زدوکوب کرکے ان کا سامان
چھین لیتے اور ایک ایک مسلمان کو چن چن کر مارتے پیٹتے تھے اس طرح قرب و جوار کی فضا مسموم
بن جاتی اور مسلمانوں کی آمد و رفت میں مشکلات پڑ جاتی تھیں۔ اس قصبہ میں ہی نہیں ہندوستان
کی ہر آبادی میں امن پسند مسلم اور غیر مسلم وطن دوستوں کی کمی نہیں جو اس قسم کے فسادات کی مذمت
کرتے ہیں۔[1] ایک زمانہ تک تو فرقہ وارانہ فسادات کا الزام انگریزوں کے سر تھوپا جاتا رہا اب کس
میں الزام اس کو دیا جاتا تھا قصور اپنا نکل آیا

پروفیسر ڈاکٹر گیانندر پانڈے نے جو اسی علاقے کے رہنے والے ہیں اپنی انگریزی کتاب میں جس
کا اس تصنیف میں جا بجا حوالہ دیا گیا ہے ان فسادات کی نوعیت، وجوہ اور نتائج کے بارے میں
غیر جانبدارانہ قلم سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ آپ ایک سیکولر ذہن کے ماہر سماجیات شمار ہیں۔

کوپاگنج میں صنعت پارچہ بافی اور برادری

صنعت بافندگی میں کوپاگنج مئو اور مبارک پور کی طرح ایک انفرادی حیثیت کا حامل تھا۔ برادری
کی اکثریت تھی اور کرگھوں کی بڑی تعداد تھی، یہاں پختہ رنگ کی ساڑی اور لنگی تیار کی جاتی تھی
جن کی منڈی بنگال اور آسام تھی مگر تقسیم نے ہاتھ کرگھا کا خاتمہ کر دیا تو ملک کے اندر کی منڈیاں بھی
بدل گئیں۔ بہرحال بنکروں کی اقتصادی حالت کا دارومدار بازار کے عروج و زوال پر ہے، بازار
میں تیزی ہے تو مزدور کاریگر کی حالت ٹھیک ہے تو مزدوروں کی عید ہے لیکن کساد بازاری

[1] تذکرہ مشاہیر کوپاگنج ص ۴۷-۴۸

کے عفریت کا آسیبی سایہ پھیلا تو فاقہ مستی ایک دن کی نہیں رہتی۔ بڑھتی جاتی ہے، مگر بُنکر طبقہ کے علاوہ جو "ماسٹر دیورس" ہیں، نہیں یہاں کی اصطلاح میں 'گرہست' کہتے ہیں ان پر زیادہ اثر نہیں پڑتا، نوربافوں سے مال تیار کرانے میں کمی ضرور ہو جاتی ہے، لیکن پھر بھی ہر گرہست اور کارخانہ دار کی خوشحالی برقرار رہتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی بدنصیبی کا آسیب ایسا پھیل جاتا ہے کہ سب ٹھاٹ پڑا رہ جاتا ہے جب بدنصیبی کا بنجارہ لاد کر لے جاتا ہے، سعد اللہ رحمت اللہ کی ثروت و دولت کا مقابلہ پورے ضلع میں شاید ہی کوئی کرسکتا تھا۔ پچاس برس پہلے ان کی فرم کا بڑا نام تھا اور آج عہ

سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

کوپاگنج میں اس وقت (۱۹۸۸ء) میں حاجی عبدالرب صاحب کا اقبال اوج پر ہے اور آپ جیسا امیر و رئیس قرب و جوار میں کوئی نہیں "آپ کے یہاں ہینڈلوم اور پاور لوم کے مختلف قسم کے مال تیار کرائے جاتے ہیں، بھیم بنانے کی سائزنگ بھی ہے اور تیار شدہ پاور لوم کے مال پر کیلنڈر بھی ہوتا ہے۔" [1]

حاجی عبدالرب کارخانہ دار بھی ہیں مگر ساتھ ہی بجد دیندار بھی۔ صدقہ جاریہ کے جذبۂ صادق نے آپ کو "اہل البر واحسان" کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔ چوک روڈ کی نہایت حسین و جمیل مسجد آپ کے جذبۂ ایمانی کا عکس جمیل ہے۔ مصلح الامت حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوری اور ان کے جانشین محمد مبین حاجی صاحب کے مہمان رہا کرتے تھے۔

حکیم مولانا نثار احمد بن حکیم محمد شفیع

آپ ایک زمانہ میں ہینڈلوم صنعت کے بہت بڑے صنعتکار اور گرہست تھے، بہت سے کاریگر ملازم تھے جو ہاتھ کرگھے پر عمدہ قسم کا مال تیار کراتے اور بنگال و آسام کی منڈیوں میں فروخت کراتے، آپ نے اپنے دولت کدہ کی بالائی منزل پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کرائی ہے، پابند صوم و صلوٰۃ اور بجد متقی تھے۔ بایں ہمہ بہبودیٔ خلق کا جذبہ ایسا جاگا کہ اپنا مطب پھر جاری رکھا کیونکہ اس کار خیر کی طرف جس سے جو خدمت خلق کا وسیلہ تھا شیخ و مرشد مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کا اشارہ تھا۔ آپ کی یونانی مفرد دوائیں نہایت

---

[1] تذکرہ مشاہیر کوپاگنج ص ۴۹۔ ۵۰ اور ۵۱

شفا بخش عقیل۔

مصباح العلوم، دار العلوم دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ ڈابھیل سے فراغت کے بعد مولانا شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اپنے پیر و مرشد سے عشق کے درجہ میں محبت کرتے تھے ان کے مجازین صحبت اور خلفاء کی فہرست معرفت حق (محرم، صفر ۱۳۸۹ھ) میں آپ کا نام شامل ہے۔ جمعہ و عیدین کے امام تھے گو خود گرہست اور رئیس شہر تھے لیکن سرمایہ دار دنیاداروں سے سخت نفرت کرتے تھے اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے منہ پر انھیں کھری کھری سنا دیتے۔ کبھی سیٹھوں کے وقار کو تسلیم نہیں کیا نہ اپنے سامنے انہیں پھٹکنے دیا اور نہ کبھی ان کی چالوں میں آئے۔ [1]

مسلم فنڈ کوپا گنج

برادری کی یہ بڑی عظیم روایت رہی ہے کہ وہ مالی اعتبار سے کمزور افراد اور بنکروں کی مدد کے لیے بڑی مفید اسکیمیں بناتی رہتی ہے بھیونڈی میں مومن بیری فنڈ، مئو میں کوڑی فنڈ اور، لیگاؤں میں امداد باہمی کے ادارے اسی نوعیت کے ہیں۔ کوپا گنج میں ۱۹۷۹ء میں اسی طرح کا ایک مسلم فنڈ قائم کیا گیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۸۰ء کو مسلم فنڈ کا باقاعدہ افتتاح حضرت مولانا اسعد صاحب مدنی کے مبارک ہاتھوں ہوا۔ شب میں مصباح العلوم کی چھت پر مسلم فنڈ کے اغراض و مقاصد پر بحث کے لیے اجلاس عام ہوا، مسلم فنڈ کی افادیت بتلائی گئی اور اسی کی مالی اعانت سے بہت سے غریب بنکر ہینڈ لوم سے پیڈل لوم اور پھر پاور لوم کے مالک ہو گئے اور اس میں رقم جمع کر کے سودی لین دین کی لعنت سے محفوظ ہیں۔ مسلم فنڈ کا آغاز چند سو روپے سے ہوا، اس کی رفتار ترقی ۱۹۸۴ء میں ذیل کے گوشوارہ سے ظاہر ہے: [2]

تعداد کل کھاتہ دار	۲۲۷۸
قرض لینے والوں کی کل تعداد	۶۵۱
کل رقم جو قرض دی گئی	۴,۳۵۱۶۳
کل امانت جو جمع ہوئی	۱۹,۵۹۲۴۹

---

[1] تذکرہ مشاہیر کوپا گنج ص ۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۲۸

یوپی کی انصاری برادری کے صنعتی، تجارتی اور فنی مشاہیر

نہ جانے کہاں کہاں کچھ بالیدگی میں نمایاں ہو گئیں، کیسے کیسے یادگار پر زمانہ لگ رہے تھے اور کیسے کیسے عجیب آزاد مرد جو انصاری برادری میں پیدا ہوئے، بڑے کام کئے اور نام اور کام یادگار چھوڑ کر چل بسے لیکن اے خاک تیرہ گوہر بار انگہدار۔

مراد آباد کے عبدالقیوم انصاری ظروف کے سب سے کامیاب سوداگر تھے آپ کے بھائی عبدالجبار انصاری اور عبدالغفور انصاری بھی اپنی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کے لئے اونچا نام رکھتے ہیں ان تینوں انصاری برادران کا برادری میں بڑا مقام ہے۔ عبدالقیوم انصاری مرحوم نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو کئی لاکھ کی خطیر رقم عطیہ دی تھی۔ یہ بھی خانوادہ ظروف سازی کے لئے مشہور ہے اور بیرون ممالک میں ان کے ماہر کاریگروں کے بنائے ہوئے نفیس اور منقش ظروف کی صداہت بلند ہے۔

نئی بستی محمد علی روڈ کے تاجر اور کارخانہ دار تیس سیٹھ بھی مراد آباد کی تاجر ہستیوں میں سے ایک ممتاز انصاری ہیں۔ دساور میں ظروف کی تجارت ہے۔ تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں روشن خیال اور درد مند انسان ہیں۔

محمد عبدالقیوم انصاری محلہ فیتھفل گنج کانپور کی مومن برادری کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جس نے غلامی کے تاریک دور میں حریت کی نورانی تحریر پڑھی تھی میٹرک کرنے والے نوجوانوں کی پہلی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی مومن کانفرنس کے سرگرم ممبر تھے اور ساتھ ہی کانگریس کے فعال ورکر بھی تھے۔ ۱۹۶۹ء کے فیصلہ کن انتخابات میں آپ مولانا حسرت موہانی کے خلاف امیدوار تھے۔ مگر گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں سے محاذ جنگ آزادی پر ڈٹے رہے اور برادری کے متحدہ نظریۂ قومیت سے وفاداری کا بشر طِ استواری کا بیّن ثبوت دیا۔ آزادی کے بعد کنٹونمنٹ بورڈ کے لئے مومن برادری کے پہلے ممبر کی حیثیت سے منتخب ہوئے۔ کئی سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہے اور باہمی امداد و تعاون کے زبردست حامی ہونے کے سبب ایسی ہی ایک کوآپریٹو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوا۔ فیتھفل گنج وہ علاقہ ہے جہاں انگریزوں نے چھاؤنی قائم کی تھی۔

سخاوت دین بھی کانپور کے ممتاز تاجروں میں شمار ہوتے ہیں۔ محلہ بابو پورہ گرانٹ ٹرنک روڈ

کے پہلو میں واقع مسلمانوں کی بستی کبھی ان کی جاگیر تھی متمول اور تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے
دولت و ثروت اور جود و سخاوت میراث میں ملی۔ کانگریس پارٹی کے ممبر رہے اور برادری کے
فلاحی اداروں سے وابستہ رہے۔ سیاسی طور پر ممتاز اور سماجی حیثیت سے بارسوخ شخصیت
کے مالک ہیں ان کے بڑے صاحبزادے بدرالزماں بھی کانپور کارپوریشن کے رکن ہیں۔ برادری
کی تین آبادی میں سخاوت دین اور ان کے جیسے چند ممتاز انصاری خاندانوں کا وجود کانپور
کے صنعتی شہر میں نعمت غیر مترقبہ ہے۔ چرم سازی یا چرے کا کاروبار برادری ہی میں ہوتا ہے۔
کوپاگنج کی صنعتی بستیوں میں حکیم عرف الحاج مولانا نثار احمد ایک منفرد مقام رکھتے
تھے، ہینڈلوم صنعت کے کامیاب تاجر اور علاقے کے گرہست تھے۔ سیٹھ حاجی عبدالرب
رئیس اعظم تھے، ان کے بھائی حاجی محمد ادریس اور چھوٹے بھائی چیئرمین محمد مصطفیٰ شہید
نے پارچہ بافی اور امداد باہمی و تعاون کے تعلق سے قصبہ اور قوم کی بڑی خدمات انجام دی تھیں
مئو ناتھ بھنجن کے ہینڈلوم اور پاور لوم کارخانہ داروں اور صنعتکاروں میں "گرہستوں"
کی [illegible] فہرست لمبی ہے۔ عبدالحنان گرہست، ابوبکر ولد محمد مصطفیٰ گرہست (مرزا
ہادی پورہ)، فخر الدین گرہست (مرزا ہادی پورہ) عبدالحکیم گرہست، عظیم حکیم گرہست،
محمد [illegible] (ڈومن پورہ)، مولوی نذیر احمد، صدرالدین انصاری، محمد علی سیٹھ، شکور سیٹھ، حکی
سیٹھ [illegible] حافظ مختار احمد وغیرہ نیشنل کیمیکل ورکس (تو چندی تیل) نورانی
تیل [illegible] کے ایجاد کنندگان کے گھرانوں میں مولوی احمد، مولانا عبدالاحد، مشتاق
احمد محمود احمد وغیرہ بڑے کامیاب تاجر گذرے ہیں۔ اسی قصبہ کے صنعتی و فنی
دستکاروں میں عبد غفور ماسٹر عبدالرحیم، عصمت اللہ، حبیب اللہ دار (کاڑی پورہ) وغیرہ
بڑی ممتاز ہستیاں تھیں، معزز شخصیتوں میں حاجی منشی عبدالعظیم سردار اور نثار اللہ سردار
پارچہ بافی کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے، دیگر فنی اور تکنیکی مناصب کے حامل یہ افراد تھے:
محمد مصطفیٰ [illegible] مدین اور قمر الدین، ایوب ولد بنی مداری۔

بنارس کے تاجر علماء

بنارس جس کا اسلامی نام محمد آباد تھا یہ دار بنارسی ساڑیوں میں شہرہ آفاق تھا، یہاں کے
ماہرین فن میں حسین میاں مئوی کو رام نگر کے راجہ کی سرپرستی حاصل تھی، قادر [illegible] بڑے

کارخانہ دار تھے، برکت جہتوان کی کارگاہ کے ماہر دستکار تھے، یہاں کے فنی مناصب کے حامل کچھ خاندان اپنی کاریگری اور فنِ نقاشی و گلکاری کا سلسلہ نقشبندی نمونوں کے پیشتانِ فن سے جوڑتے ہیں جو محمد بن تغلق کے جو سلاطین ہند میں سب سے تحقیق پرست تھا عہد حکومت میں ممالک اسلامی سے ہجرت کرکے آئے تھے۔[1]

یہاں کے شیخ انصاری نوربافان کالا تور ریشم کی کاریگری اور طاؤس بادلے کی دستکاری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ۱۲۱۵ھ میں شیخ رحمت بنارسی کو بمبئی کے نوروڈ ساسون کمپنی نے خاص طور سے ڈیزائن بننے کے لئے بلوایا تھا اور ملازم رکھا۔

مولانا حکیم عبدالغفار حاذق بنارسی (۱۳۰۰-۱۳۹۰) شاعری میں معنی آفرینی و حسنِ بیان کی بہار دکھاتے تھے اور بنارسی ساڑیوں کے بہترین ڈیزائنر کی حیثیت سے بھی ان کا دور دور پر نقش ہو چکا تھا، مصوری اور فوٹوگرافی میں بھی بڑی تکنیک پیدا کی تھیں۔ آپ کے ممتاز شاگرد مشہور آرٹسٹ ابراہیم بھارتی ہیں۔[2]

حاجی یار محمد قوم کے سردار تھے ان کے صاحبزادے جانشین بنے یہ بہت بڑے تاجر تھے۔ بنارس کے اکثر تاجروں نے علم و فضل کا بازار بھی گرم کر رکھا تھا یہ لوگ درس و تدریس کے بھی مسند نشین رہے۔

مولانا عبدالرحمن مئوی (بنارسی) جن کا ذکر "باب درس و تقویٰ کے ضمن بند ہے" میں موجود ہے بنارسی کپڑے کے بڑے تاجر تھے۔ اسی طرح مولانا محمد خلیل الرحمن بنارسی (۱۲۹۰-۱۳۵۳) بھی بنارسی پارچہ جات کی تجارت کرتے تھے۔ وہاب المعطی نے تجارت میں ایسی برکت دی تھی کہ رؤسائے شہر میں ممتاز مقام پیدا کیا۔

مولانا ولی اللہ بنارسی کے والد حاجی محمد حسین پٹنہ کے تھے بنارس میں محلہ مدنپورہ میں آباد ہو گئے اور پارچہ بافی کی صنعت میں ترقی کرکے شہر کے دولتمند حضرات میں شمار ہونے لگے۔

مولانا محمد نعیم بنارسی ساڑیوں کے کامیاب تاجر تھے، مولانا عبدالقیوم بنارسی (۱۳۴۶-۱۴۰۳) کے صاحبزادے بلال احمد کے کپڑوں کی دکان نئی سڑک پر واقع ہے۔

مولانا عبدالجبار بنارسی (۱۳۲۴-۱۳۸۶) کا خاندان دینداری اور تمول میں مشہور و معروف

---

[1] عبدالسلام بنارسی، تاریخ آثار بنارس ص

[2] وسیم احمد قاسمی، تذکرہ علمائے بنارس

تھا، حافظ عبدالقادر کے لڑکے عبدالعزیز جو مولانا عبدالجبار کے والد تھے بڑے متقی تھے۔

حاجی حافظ عبدالقادر محلہ مدنپورہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے اور آپ کی دیانتداری نے آپ کو "التاجر المصدوق" کہلانے کا صحیح معنوں میں مستحق بنا دیا تھا۔

حافظ قاری مولانا نیاز احمد بنارسی (۱۹۲۶ - ۱۹۸۴) کا آبائی پیشہ دستکاری تھا آپ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔

مولانا محمد نعیم الدین بنارسی (۱۳۷۰-۱۳۸۳) ایک عالم وفاضل تاجر تھے، آبائی پیشہ بنارسی ساڑیوں کی تجارت تھی۔

مولانا محمد اسحاق بنارسی (۱۳۲۸-۱۴۰۶) مفتی محمد ابراہیم بنارسی خطیب شاہی جامع مسجد (متوفی ۱۳۸۶) کے خلف اکبر اور علمی خانوادے کے درخشندہ ستارے تھے۔ آپ بنارسی ساڑیوں کے کامیاب تاجر تھے اسی سلسلے میں بمبئی آیا کرتے تھے صابو صدیق مسافر خانہ کے پاس الکریم ہوٹل میں مقیم رہتے اور عربوں کے ساتھ بنارسی پارچہ جات کا لین دین کرتے۔ آپ کے تعلقات مؤرخ اسلام اور عالم دنیائے اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے ساتھ بڑے دیرینہ اور مستحکم تھے۔ قاضی جی آپ کے بے تکلف دوستوں میں سے ہیں ایوالمآثر محدث العصر مولانا حبیب الرحمن جب بھی بمبئی تشریف لاتے اپنا زیادہ وقت ان دو علمائے بزرگ کے یہاں جنجیکر اسٹریٹ پر گذارتے۔

بھدوہی (مرزاپور) کے انصاری قالین تجار

مسلم سلاطین، نوابین اور راجگان ہند کا زمانہ لدگیا جب ان کی بارگاہوں اور محلوں میں قیمتی اور بیش بہا منقش قالین "تاابقدم" فرش راہ بنے رہتے تھے، بھدوہی کے قالین اس وقت ساری دنیا میں شہرت رکھتے ہیں، یہاں بھیڑ کے اصلی بالوں کا اون بنا کر قالین بنی کی جاتی ہے۔ بھدوہی میں اس وقت پانچسو کے لگ بھگ قالین درآمد بھیجنے والے تجار ہیں ان میں اسی فیصد مسلمان اور ان میں ساٹھ فیصد انصاری برادری کے کارخانہ دار ہیں، بھدوہی اور جوار د مضافات میں برادری کی بڑی گھنی بستیاں ہیں اُن میں بکر بھی بیاز جر تھی۔

قالین کے کارخانہ داروں اور تاجروں میں اگلے وقتوں میں عبدالصمد انصاری کا بڑا شہرہ تھا، انکا گھرانا متمول اور خیر تھا اور اب بھی باقیات صالحات پرانی روایات واقدار کے امین ہیں۔

ڈاکٹر طارق رجبی جو اس وقت لندن کے ایک تجربہ کار اور معروف ڈاکٹر ہیں اور راقم کی اہلیہ نوشابہ مومن کی منجھلی ہمشیرہ کے داماد ہیں اسی گھرانے سے ننہالی رشتہ رکھتے ہیں۔

مگر بھدوہی کے قالین تاجروں کے رئیس التجار اور سب سے بڑے سوداگر نوادہ گاؤں کے حاجی رجب علی انصاری تھے۔ آپ کے اوصافِ حمیدہ اور اعمالِ حسنہ کی تعریف و توصیف کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ آپ ایک رحمدل، غریب پرور، سخی دل اور خیر و خیرات کرنے والے نہایت دیندار بزرگ تھے۔ غریبوں کے داتا اور مزدوروں بنکروں کے ایک رحمدل آقا تھے۔ شوکت علی انصاری ان کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نے تجارتی روایات اور خاندانی اوصاف و اقدار کی اور بھی زیادہ شان و شوکت بڑھا دی ہے، تعلیمی سماجی اور دینی امور میں ان کے کارہائے نمایاں لائق تحسین و آفرین ہیں۔ ان کے بڑے صاحبزادے آصف انصاری ولسن کالج بمبئی کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس وقت وہی تجارت اور صنعت کے روحِ رواں بنے ہوئے ہیں۔ میسرس رجب علی اینڈ سنز فرم کا نام قالین بافی اور تجارت کی دنیا میں آفاق گیر بنا ہوا ہے یہ آصف انصاری کی شبانہ روز محنتوں کا ثمرہ ہے جو "پدر نتواند پسر تمام کند" کے مصداق قالین کی تجارت میں حرفِ آخر، اعتبار اور بھروسے کی ضمانت کی علامت بن گئے ہیں شوکت علی انصاری نے ۱۹۹۰ء میں ہندوستان سے سب سے زیادہ قالین برآمد کرنے والے تاجر کا ایوارڈ حاصل کیا۔ رجب علی اینڈ سنز کی مصنوعات جرمنی میں سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ رجب علی اینڈ سنز کے رشتہ داروں کا [illegible] فرم ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۲ء تک متواتر ایوارڈ حاصل کر رہا ہے، اسی طرح کئی اور ایوارڈس قالین بافی اور نکاسی کے بارے میں یو پی، مہاراشٹر، نیپال، بنکاک اور دیگر ملکوں سے حاصل کر چکا ہے۔

عبدالقادر انصاری کا ایسٹرن کارپٹ اس مسابقت میں شامل ہے لیکن اب وہ اپنی تجارت کو دھیرے دھیرے بمبئی منتقل کر رہے ہیں۔

اکائی ایکسپورٹرس بھی قالین کی بیرونی تجارت میں آہستہ آہستہ اپنی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بلیا کے کلیم احمد انصاری کارپیٹ کے کاروبار میں قدیم زمانے سے اپنی ساکھ قائم کر چکے ہیں ان کے نانا حافظ محمد شفیق انصاری اور والد حاجی شمشیر محمد انصاری تجارت اور جود و سخاوت میں بلیا اور پورے دیار پورب میں شہرت رکھتے ہیں، کلیم احمد انصاری ایک سماجی ورکر، قومی و ملی خادم اور برادری کے لیے دردمند دل رکھنے

والے دلدار ہیں اور صدقہ و خیرات میں بہت بڑا دل رکھتے ہیں۔ اس خاندان کا ذکر آگے آرہا ہے (دیکھئے باب: مومن برادری کی جماعتی تنظیم اور اکابرِ سیاست)۔

ماہر صناعوں کی قدر شناسی میں انگریز حکام دریغ نہیں کرتے تھے، یہ لوگ بڑے جوہر شناس تھے کہ "قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

الٰہ آباد کی نمائش میں مبارک پور اور بنارس کے حضرات شیخ نور بخش نے اپنے اپنے کارخانوں کے بُنے ہوئے کپڑوں کی صناعی اور مہارت کا مظاہرہ کیا تو انہیں تمغوں سے نوازا گیا، مبارکپور کے شیخ عبداللہ بن شیخ حاجی محمد نور بخش کی بڑی قدر افزائی ہوئی تھی۔ بنارس کے خلیل الرحمٰن بنارسی (ولادت ۱۲۵۰ھ ۱۸۳۴ء) نہ صرف جری تھے بلکہ فنی کمال اور صناعی میں ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ۱۹۰۵ء میں جب جارج پنجم عالم شہزادگی میں ہندستان آیا تو مولوی صاحب کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات کی تھی۔

ڈھاکہ اور سورت کے بنکروں کی صناعی کا ذکر گزر چکا ہے۔

آج بھی مالیگاؤں، بھیونڈی اور بنارس میں پارچہ بافی کے لیے ایسے دستکار اہلِ حرفہ موجود ہیں جن کی صناعی اور فنی کمال کا زمانہ لد گیا کیونکہ سائنسی کرشموں نے ان کے یدِ بیضا کی طلسم آفرینی کو ماند کر دی۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
(اقبالؒ)

اترپردیش میں ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کے حساب سے مومن۔انصاری افراد

۱	اٹاوہ	۲,۳۵۲	۲۴	رائے بریلی	۴,۱۱۷
۲	اعظم گڈھ	۵۳,۰۷۵	۲۵	سلطان پور	۱۰,۳۴۵
۳	آگرہ	۱,۲۷۱	۲۶	سہارن پور	۴۰,۰۷۱
۴	الٰہ آباد	۳۹,۹۴۴	۲۷	سیتاپور	۳۶,۶۵۲
۵	اناؤ	۳,۲۲۱	۲۸	علی گڑھ	۳,۰۵۱
۶	ایٹہ	۴,۲۰۳	۲۹	غازی پور	۲۸,۵۶۴
۷	بارہ بنکی	۳۰,۱۸۲	۳۰	فرخ آباد	۲,۳۳۴
۸	باندہ	۷۵	۳۱	فتحپور	۲,۶۳۶
۹	بجنور	۶۱,۵۲۳	۳۲	فیض آباد	۲۵,۴۷۳
۱۰	بدایوں	۱۹,۸۹۴	۳۳	کھیری	۲۰,۱۲۷
۱۱	بریلی	۴۲,۶۵۴	۳۴	گورکھپور	۱,۱۷,۸۹۱
۱۲	بستی	۳۰,۰۵۰	۳۵	لکھنؤ	۵,۹۶۶
۱۳	بلند شہر	۱۳,۱۴۷	۳۶	للت پور	۲
۱۴	بلیا	۳۰,۵۴۷	۳۷	مرزاپور	۱۳,۵۸۲
۱۵	بنارس	۲۲,۴۹۶	۳۸	میرٹھ	۲۵,۶۰۵
۱۶	بہرائچ	۱۸,۲۸۵	۳۹	مین پوری	۱,۲۲۶
۱۷	پرتاپ گڈھ	۹,۴۹۷	۴۰	مظفر نگر	۲۳,۲۹۴
۱۸	پیلی بھیت	۱۵,۴۶۱	۴۱	مرادآباد	۳۲,۴۰۱
۱۹	ترائی	۱۲,۶۶۵	۴۲	متھرا	۳۶
۲۰	جالاؤں	۳۷۷	۴۳	ہردوئی	۱۰,۵۵۳
۲۱	جونپور	۲۲,۳۰۷	۴۴	ہمیرپور	۸۸۹
۲۲	جھانسی	۵۱	۴۵	کانپور	۴,۳۴۷
۲۳	دہرہ دون	۱,۳۴۹		جمع	۷,۸۰۲۳۱

نوٹ: سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ یو پی میں حساب سے مومن۔انصاری کی تعداد ساڑھے ۷ لاکھ کے قریب تھی۔

بارہواں باب

شناخت: کرگھا، چرخہ اور جُلاہا:

پیسہ ہی رنگ و روپ ہے پیسہ ہی مال ہے
پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے (نظیر اکبرآبادی)

چرخے کی مال چرخہ کو گردش میں لاتی ہے" اور گردشِ روزگار کا مقابلہ بُنکر کا دل، تو اس اسی چرخے
اور کرگھے سے کرتا ہے جب تک اس کے ہاتھوں میں جنبش رہتی ہے، اور آنکھوں میں دم رہتا ہے
چرخے کی مال چلتی رہتی ہے، دل کہتا ہے تو "گذری" میں بیچ کر گزر بسر کر لیتا ہے جس سے جسم کا چرخہ
اور کرگھا چلتا رہتا ہے" — پچاس برس پہلے بُنکروں کی مالی حالت اور پیشہ کی نوعیت یہی تھی مگر
دنیا کی مانگ پوری کرنے والا نور باف — آخرت کے سفر کے لیے "زادِ راہ" بھی کسب کرتا تھا اور جسم کا چرخہ
اور کل یہ تن اپنی روح کی مال پر چلاتا تھا، اور کرگھے کے ہر تارِ نفس میں ذکرِ الٰہی کی گرہ لگاتا تھا،

ورنہ کی گیرد کلابۂ تن قرار
چون ضمیرت می کشد او را بہ کار

تن کا چرخہ جسد کب تھمے گا اور قرار پکڑے گا جب تک کہ تیرا من اسے کام میں جُتائے رکھیگا،
اور یہ تن وقت تک برابر چلتا رہے گا جب تک دل کی "مال" اسے گردش دیتی رہیگی — جب
تو اسے دل سے کاتا رہیگا آخرت کا مال تیار ہوتا رہیگا۔ یہ ذکرِ الٰہی ہے۔

پس کلابۂ تن کجا ساکن شود
چون سرِ رشتہ ضمیرش می کشد

مولانا جلال الدین رومی (متوفی ۱۲۷۳ء) نے جو صوفیائے کرام کے سلسلۂ مولویہ کے بانی ہیں
اپنی مثنوی معنوی میں پنبہ ریسی (سوت کاتنے) اور کرگھے کے اوزار اور صنعتِ بافندگی کی اصطلاحات
کو مشغولۂ استعارات اور تشبیہات کے سانچوں میں ڈھال کر علم و عرفان کے تانے بانے سے
"معرفتِ دین" کا ایک روحانی خرقہ تیار کیا ہے، بافندگی کا تصوف سے اور "خداشناسی" سے جو گہرا
ربط رشتہ ہے، اس نے اس نور باف طبقہ کے متقی اور پرہیزگار دینداروں کو مومن بنادیا اور جو آگے

بڑھے تو مومن عارف کے مقام پر پہنچ گئے'، یہ رنگ جو باریٔ حق ہے، صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ)
کا خرقہ پہن کر سلوک کے مقامات سے گزرتے رہے' ان کے لیے کرگھے پر بیٹھنا یادِ الٰہی کے لیے
مصلے پر بیٹھنا تھا، کنگھی کے ہتھے کا ہر جھٹکا۔ ایک "ضرب" ہوتا ہے ذکرِ الٰہی کا۔ اور وجد کا
عالم یہ رہتا ہے اور یادِ الٰہی میں دل کی یہ کیفیت رہتی ہے کہ جب تار اور تاگے سے ان کا تارِ نفس
بندھا رہتا ہے اور "یا حق" کا نعرہ بلند ہوتا ہے اور محبوب کی جستجو میں "ناکو" سوال کے سینے
کو چیرتا ہوا بیقراری میں کبھی ادھر جاتا ہے اور پھر مایوس ہو کر تلاشِ حق میں دوسری سمت دوڑتا
ہے اور پوچھتا ہے "ناکو؟" ہم کہاں جائیں؟ سانس لیتا ہوا کرگہ اس نے (بنسی) کی
طرح اپنے محبوب سے جدائی کی شکایت کرتا ہے جو مولانا روم کی مثنوی کا پہلا شعر ہے

بشنو از "نَی" چون حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند (مولانا روم)

نُور بافِ عارف نہیں شاعر تو ضرور ہوتا ہے، جو ریشم کی ملائمت میں حریر و پرنیاں کی نفاست
میں اپنی نفاستِ طبع کی تسکین کے خاطر اس شاعری کی تلاش کرتا ہے جس کا سررشتہ خدا سے ملا
ہوا ہے، اس کی زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ تانے بانے کے ٹوٹ جانے تک خدا سے اس کا
رشتہ قائم ہے اور کرگھا چلا کر "صلۂ رحمی" کرتا رہے۔ تلاشِ حق میں انسان کی ساری صلاحیتیں اس
کے اعضا و جوارح تک محدود نہیں رہتیں عبادتِ بدنی کے دور بھی رہتے ہیں — بچے کا کرتا
اور عورت کا چرخہ، چرخہ جب تک چلتا رہتا ہے۔ چرخہ چلانے والی مومنہ اس کی "ناکو" کی طرح حق کے
جستجو میں ایک روحانی دائرے میں گھومتی رہتی ہے نہ کہ وہ "نال" کے لیے گردش میں رہتی ہے
یہ اور بات کہ گردشِ روزگار سارے گھرانے کو گردش میں لے آتی ہے۔

کرامت اور ولایت اعزاز ہیں جن سے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے خاص مخلص اور مقرب متقی بندوں
کو نوازتا ہے، ایمان اور تقویٰ بندوں کی ولایت کی شان ہیں اس لیے جس درجہ کا ایمان ہوگا اس
رتبت کی ولایتِ رحمانی بھی ہوگی اور جن کو ولایتِ خاصہ ودیعت ہوتی ہے وہ "ولی کامل" بن جاتے
ہیں، "کرامتِ عامہ" خداداد صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے نیکیوں، اعمالِ صالحہ اور عبادتوں پر
اس کا دارومدار ہے حسنِ اخلاق، حسنِ عبادت اور پرکشش شخصیت بزرگوں کے لیے جب نظر

۱؎ ناکو = نال، جسے انگریزی میں Shuttle کہتے ہیں۔

اور جذبِ نگاہ ہو — یہ بھی کرامت ہے لیکن کرامتِ خاصّہ، جو اس کرامتِ عامہ سے افضل تر ہے وہ ہر ایک کے نصیب کی بات نہیں وہ جو ایمان کی پختگی رکھتے ہیں اور فنا فی اللہ ہو جاتے ہیں، اخلاص اور صداقت کے ساتھ پابندِ شریعت بھی ہوتے ہیں اوامر و نواہی اور احکامِ الٰہی کو زندگی کا نصب العین بنا لیتے ہیں ایسے خوش نصیب شہسوار عام مومنین کے قافلے سے آگے گھوڑا بڑھا کر سابقین اور مقربین کی صفوں میں جا پہنچتے ہیں۔

مقربین کا یہی وہ افضل طائفہ ہے جو ولایت اور کرامتِ خاصہ کے منصب پر فائز ہے، بظاہر مفلوک الحال لیکن ایمان کی دولت سے مالا مال رہتے ہیں، لیکن مستجاب الدعوات ہوتے ہیں کہ خدا سے استغاثہ کریں کہ زمین پھٹ جائے یا فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو مجیب الدعوات کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ محض اپنی شانِ کریمی سے اپنے مقرب بندوں کی دعائیں سن لیتا ہے کہ یہ وہ خاص الخاص بندے ہیں اور اللہ کے ولی۔ دوست۔ جن کے دستِ حق پر باری تعالیٰ خرقِ عادت واقعات کو ظاہر فرماتا ہے۔ اور ایسے اللہ کے مقبول بندے کارگاہوں میں ملتے ہیں نہ نام نہاد درگاہوں میں اور خانقاہوں میں نہیں ملینگے، جہاں کوئی 'پیر صاحب' یا 'شاہ صاحب' کاکلیں بڑھائے چہرے پر روحانیت کا غازہ ملے "معشوقہ" (جو تن شاہ صاحبوں کا چولا زیب تن کئے) بیٹھے — بلکہ گلے لگائے آنکھیں بند کئے تسبیح ہاتھ میں کچھ وظیفہ پڑھتے نظر آئینگے، تعویذ گنڈے کا بیوپار، قسمتوں کی سوداگری کرتے اور جھوٹی بشارتوں کی پھلجھڑی چھوڑتے دکھائی دینگے۔ [1]

حضرت شیخ ضیاء الدین غازی پوری ایک صوفی جلاہے (جولاہے) تھے (شیخ کا تعظیمی لقب عموماً انصاری اور جولاہے پیشہ لوگ نام کے آگے ضرور لگاتے تھے) یہ شیخ حضرت مردِ کامل اور صاحبِ کرامت ولی اللہ تھے۔ ان کی کرامت یہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ کے محلے کے کسی شخص نے آپ کی کارگاہ میں آ کر مچھلی کھانے کی فرمائش کی، شیخ صاحب نے کہا میں بُننے میں مصروف ہوں مچھلی کہاں سے لاؤں، لیکن اس شخص کا اصرار بڑھتا رہا تو آپ نے کرگھے کی پوکھری میں ہاتھ ڈالا اور ایک تازہ مچھلی نکال کر دے دی۔

---

[1] مولانا عبدالسلام باریابادی۔ کتاب تمدن۔ حصہ دوم ص۹

انہیں شیخ ضیاء الدین نمازی پوری کا ایک اور واقعہ بیان کیا گیا ہے[1] محلہ کے کچھ شریر لڑکے ایک بڑھیا کے زندہ بیٹے کا مصنوعی جنازہ تیار کر کے لائے اور آپ سے کہا کہ نمازِ جنازہ پڑھا دیجیے، آپ کرگھے پر بیٹھے بُننے میں مشغول تھے، لڑکوں نے جب بہت تنگ کیا تو بحالتِ مجبوری اٹھے اور نماز جنازہ پڑھا دی، شریر لڑکوں نے ٹھٹھول کرنا شروع کر دیا اور چادر ہٹا دی کہ دیکھو کیسا مذاق کیا، مگر دیکھا تو لڑکا مر چکا تھا — آپ نے میت کی ہی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

شیخ احمد نہروالی اکابر اولیائے ہند میں سے ہیں۔ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی، سلطان نظام الدین اولیاء اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (متوفی ۷۵۶ھ) جیسے مشائخ کبار آپ کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے، شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کا بیان ہے کہ شیخ احمد کو کبھی کبھی کارگاہ میں وجد آ جاتا تھا اور ذکر خدا کرتے کرتے اور بُنتے بُنتے ایک "حال" ہو جاتا تھا اور وہ بےخود ہو جاتے، ہاتھ کام سے رُک جاتے مگر کرگھا خود بخود چلتا رہتا تھا اور کپڑا خود بخود بُنتا رہتا۔[2]

بافندگی کرنے والے صوفیاء کرام اور اولیاء عظام کی کرامتوں کا ذکر اب تک عزت کے زیور خلوص کی طرح عقیدتمندوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔ لیکن وہ گمنام اور معمولی بنکر بھی صاحبِ کرامت تھا جو اپنے اندھیرے گاؤں کی بے چراغ مسجد میں اذان اور اپنی کارگاہ میں بیٹھ کر ٹھوکے سے ذکر کا ضرب لگاتا تھا اور آرزو و آمال — زر و مال سے بے غرض دل میں صرف اُس یعنی آخرت کا دھیان رکھتا تھا۔

"چرخے کی فضیلت یہ ہے کہ روز ازل سے ظہور میں آیا اور سب سے پہلے بی بی حوا کو کاتنا سکھایا گیا، نیک مردوں کا عمل خیاطت (سلائی) اور نیک عورتوں کا عمل چرخہ کاتنا ہے اور شیطان ان سے دور رہتا ہے اور وسواس نفسانی کی الجھی ہوئی پیچوں میں نہ پھنس جانے کے لئے بہترین مشغلہ ہے[3] صحابیاتِ کرام اور دوسری مستورات کا یہ مشغلہ، اشغال و اذکار کی طرح تھا، اشعث بن قیس کندی کی بہن قتیلہ بنت قیس حائک خاندان سے تھیں حضرت علی، اشعث بن

---

[1] یہ واقعہ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے دستکارانِ اہل شرف ... میں تذکرہ کتب بین میں ص۶۰ پر بیان کئے ہیں اور دیکھئے کتاب الغزال والنول ص۹
[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار ص۱۴۳، بحوالہ دستکاران اہل شرف ص۲۴-۲۵، نجابت و شرافت ص۹۱۔
[3] خیر اللہو المرأة المغزل، در علی الابرار عن النساء المغزل

قیس کو 'حائک بن مالک' کہا کرتے تھے، سوت کاتنے والی ان خاتون 'حائکہ' کو وہ فضیلت ملی کہ بنکر طبقہ کے لئے فخر و مباہات کی بات ہے وہ یہ کہ جب قتیلہ یمن میں تھیں تو ان کے بھائی اشعث بن قیس حائک نے ان کا نکاح ولی بن کر آنحضرتؐ سے مدینہ میں غائبانہ پڑھا دیا، یہ نکاح سنہ ۱۰ھ کے اواخر میں ہوا تھا، ور قتیلہ یمن سے رخصت ہو کر ابھی نہیں آئی تھیں کہ نصف صفر سنہ ۱۱ھ میں آنحضرتؐ بیمار پڑ گئے اور ابن عبد البرؒ کے بیان کے مطابق ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ میں آپ کی وفات سے انفرادی برکات و قدسی صفات کے سارے تار ٹوٹ گئے۔ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمن الاعظمی نے ان کے بارے میں تفصیل سے لکھنے کے بعد 'دستکار اہل شرف' کی فضیلت بتلائی ہے۔

"بنکر گھرانے میں سب سے علم و شرف کا یہ رشتہ ان دستکاروں کے لئے سب سے بڑا یہ انتخ رہے اور یہی اس بات کی نہایت مستحکم دلیل ہے کہ بننے والی کی بیٹی نہ صرف عربی بلکہ قریشی و ہاشمی بلکہ سب سے اشرف و اکرم ہاشمی کی کفو ہو سکتی ہے اور وہ اس کی بھی کفو ہو سکتی ہے جو یہ پیشہ نہیں کرتا، اس بحث میں فقہی کتابوں سے جو نقل کیا جاتا ہے وہ سب غلط فہمی پر مبنی ہے۔"[1]

صحابیات کرام شیخین کے زمانہ خلافت میں مسجدوں کے صحنوں میں اتر کر چرخے چلایا کرتی تھیں اور بعضوں کے لئے یہی وسیلہ معاش تھا۔

دور وسطیٰ کی مستورات میں بی بی فاطمہ سپید باف اور بی بی زلیخا جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کی والدہ محترمہ تھیں، سوت کاتنے کا کام کرتی تھیں۔ بی بی زلیخا خدا رسیدہ پارسا اور ولیہ کاملہ تھیں، جب ان کے ہونہار بیٹے شیخ نظام الدین اولیاءؒ تحصیل علم سے فارغ ہوئے تو ان کی 'دستار فضیلت' کے لئے خود انہوں نے اپنے ہاتھ سے سوت کاتا اور دستار تیار کیا تھا۔

چرخہ کاتنا غریب گھرانے کا وسیلہ معاش تھا، چونکہ ہر گھرانے میں سادگی برتی جاتی تھی ضرورت کی حد تک کپڑا بن لیا جاتا تھا، گھر کی بہو بیٹیاں تک اس کام میں جٹی رہتی تھیں، [illegible] مشرق کے ہ ہر تھا، متوسط گھرانوں کی بیبیاں چکن، کشیدہ اور سوزن کاری کا مشغلہ رکھتی

---

[1] دستکار اہل شرف ص ۱۱۲ - ۱۱۸

تھیں، یہی دستکاریاں ان کے سلیقہ شعاری میں شمار ہوتی تھیں، صوفی خانقاہوں کے زنانہ حجروں سے لے کر قصباتی اور دیہی عورتوں کے بے رونق گھروں تک ہر جگہ چرخہ چلنے کی آوازیں گونجتی تھیں، یہی ان کے گذر بسر کا ذریعہ تھا، ملک کی بے شمار بنکر عورتیں دن رات چرخہ چلا کر سال بھر میں لاکھوں کی لاگت کا مال تیار کر لیتی تھیں، صوبۂ بہار کے پٹنہ ضلع اور شاہ آباد میں چرخوں کی مال کی گردش سوت سے "گردشِ زر" کا تخمینہ پینتالیس لاکھ کیا جاتا تھا دیناج پور اور پورنیا ضلع کی غریب جولاہا عورتیں دس لاکھ روپوں تک کے مال کا سوت کات لیا کرتی تھیں، مہین، پشمینہ ریشمی، سوت کاتنے میں بھی بعض عورتوں کا کمال اور کرشمہ دیکھنے کے لائق تھا ایک عورت نے آدھ سیر روئی کات کر چھبیس میل لمبے سوت کی انٹی تیار کی تھی جو سوت آج کے "کاؤنٹ" کے حساب سے کم و بیش سات سو نمبر تک کا تھا اس کی مثال موجود ہے۔[1]

بنکر عورتیں گھروں کے صحن یا مسجد کے احاطے میں تانی تنتی تھیں، سوت کی نلیاں ہاتھوں میں لے کر زمین میں گڑی ہوئی لکڑیوں میں تینی دے کر چاروں طرف طواف کرتی تھیں، ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ گھر کی عورتوں کا چرخہ کاتنا ایک شریفانہ شغل سمجھا جاتا تھا، دیہاتی عورتیں گھنے درختوں کے سائے کے نیچے سوت کاتا کرتی تھیں۔[2]

سوت کی رنگائی اور چھپائی بھی مسلم بنکروں اور چھیپوں کا پیشہ تھا، [illegible] وقت انیسویں صدی کے عیسائی مبلغ ریجینلڈ ہیبر نے اپنی سیاحت کے دوران بھرت پور میں رنگنی کے کئی کارخانے دیکھے تھے جہاں موٹی ململ کی چھینٹ بنائی جاتی تھی اور رنگی جاتی تھی رنگوں کی مختلف قسمیں تھیں اور مختلف اجزا جو عموماً سبزہ و گیاہ سے نسبت رکھتے تھے، انہیں سے بنائے جاتے تھے، جیسے "نیل" "زعفران" اسی طرح خوشنما زرد رنگ ایک درخت سے کشید کیا جاتا تھا، ایسے رنگ اور اس قسم کا کپڑا "بہادروں" کے لئے مستعمل تھا جن میں شرفا و سپاہی زیادہ ہوتی تھیں۔[3] رنگائی کا کام احمد آباد، بمبئی، بھیونڈی، ارانی، ملک دربار پور میں انیسویں صدی

۱؎ نجابت و شرافت ص ۱۲۸

۲؎ عبدالحلیم شرر لکھنوی۔ لکھنؤ مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ

۳؎ R.V. Reginald Heber, Narrative of a journey Through the upper Provinces of India, from Calcutta to Bombay, Philadelphia 1828, PP.425-426, Vol. I

کے اواخر تک عروج پر تھا کم خواب یا دیبا، اور بنارس کی زربفت ساڑیوں کو رنگنے کیلئے خاص طریقہ استعمال کیا جاتا تھا، رنگریز بھی اپنے ناموں کے آگے "شیخ" لگاتے تھے، اپنی الگ برادری بنائے بیٹھے تھے[1]

مسلم پارچہ بافان اور انصاریوں کی شناخت

ترک سلاطین، ماوراء النہر (ترکستان) اور افغانستان کے علاقوں سے آئے تھے حکومت کے "ارباب حل و عقد" انہیں کے ہم وطن تھے جو اعلیٰ عہدوں اور مناصب پر فائز تھے اور یہ عہدے موروثی بن گئے۔ اہل حرفہ و صنعت مقامی ہندوستانی تھے لیکن نو مسلم طبقہ کے باصلاحیت اور دیانت دار افراد ہی حکومت کے کل پرزے بن گئے تھے گو یہ طبقہ سماجی درجہ بندی میں ذلیل اور پست طبقہ کہلاتا تھا۔ سلطان التتمش (۶۰۷–۶۳۳ھ، ۱۲۱۱–۱۲۳۶ء) کے دور حکومت میں دیوان البرید (پوسٹ) دیوان الاستیفاء (وزارت اقتصادیات) میں سلطان کے حکم سے نچلے طبقہ کے ملازمین کو برخاست کر دیا گیا شاید اس لئے کہ حکمراں تو خود بردہ فروشی کی منڈی کا زرخرید غلام تھا لیکن سلطان بننے کے بعد "یوسفی" بھول کر عزیز مصر کے اقتدار کا تاج پہن لیا۔ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سلطنت کا وزیر نظام الملک جنیدی کے ننھیالی رشتہ داروں میں ان کا جد امجد کسی زمانے میں جولاہا تھا[2] محمد بن تغلق باوجودیکہ خاندانی شرافت کا احساس رکھتا تھا وہ بلند پایہ شخصیت تھا لیکن کمتر خاندانوں کو کبھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا، اس نے ایک برادری کے ایک جولاہے شیخ بابو کو ہمنشینی کی عزت دی۔

مولانا عبد السلام نعمانی نے اپنی کتاب "تاریخ آثار بنارس" میں نور بافوں میں نہ صرف جلاہوں کی شناخت کی ہے بلکہ ان میں علویوں اور سادات سے بھی روشناس کرائی ہے جن کی ہجرتی تاریخ اور زمانہ کی نسبت سید سالار مسعود غازی کی تبلیغی جماعت سے ملتے ہوئے ہیں۔

حضرت سالار مسعود غازی کا ایک تبلیغی دستہ ملک فیصل یا بعض روایات کے مطابق

---

[1] The Peoples of INDIA, Vol. III, 1889 p. 83

[2] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ ۱۸۶۲ء، ص ۳۹–۳۹

ملک افضل علوی اور سید محمد باقر کی سرکردگی میں علوی امرا اور عہدہ داروں کے ساتھ بنارس آیا، مقامی راجہ نے مزاحمت کی معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان میں جو شہید ہوئے ان کے مشاہد آج بھی "علی پورہ" میں موجود ہیں، اسی علوی خاندان کی طرف نسبت پاکر یہ محلہ "علوی پورہ" کہلایا[1]

بنارس میں ریشم بافی کی صنعت نہایت قدیم تھی، علویوں اور سادات غازیوں نے گھوڑوں کی باگ ڈور چھوڑ دی اور تانا بانا ہاتھوں میں لے لیا، کسب حلال تھا، موروثی پیشہ بن گیا، زاہد اور متقی تھے، کردار کے غازی بن گئے اور مومن اور شیخ کی عرفیت کے ساتھ مشہور ہوگئے[2] بعد میں نورباف کہلانے لگے جس کا ثبوت وہ قدیم شاہی فرامین، محکمۂ قضات کے سجلات اور قبالہ جات ہیں جن میں 'نورباف' کا لقب جلی طور پر لکھا ہوا پایا گیا۔[3] علوی زربافوں کی نسلیں پروان چڑھیں اور یہ بڑی کثیر تعداد میں بنارس، جونپور، غازی پور، اعظم گڑھ کے علاقوں میں آباد ہوئیں

غازی میاں کے تبلیغی دستے جو مرکز بارہ بنکی سے جب مائل پرواز ہوئے تو ایک عام ہجرت میدان جنگ میں جو شہسوار گرے وہیں دفن ہوئے اور اس طرح سے بہرائچ، گونڈہ، جونپور، سلطان پور، فیض آباد، اعظم گڑھ، پرتاپ گڑھ، غازی پور، بنارس اور بہرائچ میں شہیدوں کا شہر خموشاں بس گیا اور غازیان اسلام انہیں خطوں میں آباد ہوتے گئے۔ مولانا محمد حیات سنبھلی شیخ الحدیث جامعہ حیات العلوم مرادآباد اپنی کتاب "بنارس میں صنعت و حرفت" میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں بھی عرب [عربوں] کی آمد اول فتح سندھ کے ذریعہ کو ملک کی تقسیم کی
> اور ملک پر تسلط و غلبہ کرکے بہت سے ان میں سے یہاں مقیم ہی ہو گئے جس طرح کہ آپ
> شیوخ صدیقی، فاروقی، عثمانی اور سادات کرام کو ہندوستان میں مدتوں آباد دیکھتے ہیں
> اسی طرح اگر ہندوستان میں اس پیشہ (پارچہ بافی) والے بعض حضرات بھی ہندوستان میں
> سلسلۂ جہاد اطراف ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہوں تو کیا بعید ہے...... کسی کا یہ
> دعویٰ کہ اس پیشہ (پارچہ بافی) کے آدمیوں میں کوئی بھی عربی نسل نہیں غلط ہے۔"[4]

---

[1] وسیم احمد قاسمی: تذکرۂ علمائے بنارس (مطبوعہ بنارس ۱۹۹۰ء) ص ۵ اور دیکھئے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری: شجرۂ مبارکہ مع تذکرۂ علمائے مبارکپور (مبارکپور ۱۹۷۶ء) ص ۶۲۔ [2] مولوی عبدالسلام نعمانی: تاریخ بنارس (مطبوعہ ندوۃ المعارف ۱۹۶۲ء) ص ۹۵-۹۶ [3] مولانا محمد حیات سنبھلی: بنارس صنعت و حرفت ص ۶۶ بحوالہ محمد ایوب انصاری: نوحۂ بنت وشر ص ۲۳

اس تاریخی حقیقت کو انگریز محققین اور مورخین بھی تسلیم کرتے ہیں[1] مولانا عبدالسلام نعمانی صاحب اپنی تصنیف 'آثار بنارس' میں ان مہاجرین اور مجاہدین کے بارے میں صراحت اور وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں جن کے دو بڑے قافلے سمرقندی اور عراقی مسلمانوں کے امیر تیمور صاحبقران کے ساتھ ہندوستان چودھویں صدی میں آئے:

"ان مسلمانوں سمرقندیوں کو پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی سے خاص عقیدت اور ارادت تھی اور یہ لوگ شریف دیندار اور باعزت لوگ تھے اور یہاں کے مسلمانوں میں کچھ نفاق تھا اس وجہ سے الگ ہو گئے"[2]

سلاطین دہلی کے ہر عہد میں اور ان کے بعد بھی۔ سلسلۂ 'تازہ وارداں بساطِ ہوائے دل' جاری رہا، جونپور کے سلطان ملک اشرف خواجہ جہاں کے عہد میں عراقی گروہ یہاں بس گیا، اور نوربافی کو پیشہ بنایا، جونپور کے علاوہ یہ لوگ اعظم گڑھ، غازی پور اور بنارس کے اضلاع تک پھیل گئے، گو انہوں نے دیگر نورباف خاندانوں سے قرابت داریاں قائم کر لیں لیکن برادری کا نام الگ رکھ کر یہ "رائنی" کہلاتے ہیں[2]۔ نوربافوں میں ایک جماعت مرداں کی بھی تھی۔

مسلم پارچہ باف جماعتوں اور برادریوں میں کئی قبیلوں اور قوموں کی اکائیاں ملتی ہیں تاریخ جن کا سلسلہ عرب، افغانستان اور ترکستان سے ملاتی ہے، باہمی اختلاط، غیر کفو میں رشتۂ زوجیت، سیاسی تغیرات اور معیشت کی وحدت نے "نوربافوں" کو ایک خاص طبقہ میں ڈھال دیا، اس میں ہندی الاصل بھی ہیں اور غیر ملکی نژاد کے افراد بھی۔ دیوان فضل ربی اپنی کتاب تاریخ بنگالہ میں لکھتے ہیں:

"شیخ نوربافوں کی صورت اور عادات و اطوار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس ملک کے اصلی باشندے نہیں ہیں۔ ان میں اکثر عرب، افغانستان و ترکستان کی نسلوں سے ہیں۔ جب اشخاص اور بزرگان دین کے ساتھ ان کے آباء و اجداد اس ملک میں آئے ہوں اور تمدن [illegible] کے سبب کھیتی کے بجائے پارچہ بافی اختیار کر لی ہو۔"[3]

---

[1] مولانا عبدالسلام نعمانی 'آثار بنارس' ص [illegible] [2] ایضاً

[3] دیوان فضل ربی تاریخ بنگالہ، [illegible] کتاب [illegible] دیکھئے [illegible] ص ۱۵۶۔ یہ حوالہ بھی کتاب مذکور ہی سے لیا گیا ہے۔

مولانا عبدالسلام مبارکپوری اپنی تاریخ ساز اور انقلاب انگیز معرکۃ الآرا تصنیف کتاب المنزال والملۂ میں تاریخ بنگالہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی مختلف جماعتیں جہاں آباد ہوئیں یا تو انہیں کی طرف منسوب ہو گئیں جیسے بہرائچہ (بہرائچ) فیض آبادی، چوریہ، پوریہ، سروریہ، شاہ آبادی وغیرہ اور بعض گروہ جو غالباً نومسلم تھے جیسے گجرات کے ہالی، مومنہ، داری اور محمدی وہ انہیں ناموں سے مشہور ہوئے لیکن پیشہ بافندگی ہی تھا، مومن، مغل، پٹھان، شیخ، صدیقی، سُنی الگ برادریاں تھیں لیکن بافندگی کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھیں، جولاہا کے لقب سے بُنکر طبقہ جُڑھتا ہے یہ اپنے آپ کو مومن دنوربافی کہتے ہیں قواعد سلام کے بڑے پابند ہیں۔[۱] پارچہ بافی کے پیشے کو بعض سادات کرام نے بھی اختیار کیا ہے جس کی صراحت خافی خان نے اپنی تاریخ منتخب اللباب میں کی ہے۔[۲]

کرگھا چلتا رہے

الکاسب حبیب اللہ — کمائی کرنے والا اللہ کا دوست ہے، نیز فرمایا رسول اکرم ﷺ نے:

"سب کاموں میں ستھرا کام آدمی کا اپنے ہاتھ سے کمانا ہے"

(شعب الایمان بیہقی)

انبیاء علیہم السلام، اصحاب کرام اور بزرگان دین نے کسی کام اور پیشہ کو عیب نہیں سمجھا جیسا کہ اوپر ذکر گزر چکا ہے اتنیہ مکرر کی طرح ایک بار پھر اعادہ کر لیا جائے کہ یہ بات فتخار بلاسبب کے ماننے والوں کو خصوصاً شیخ، سید، مغل پٹھان جن میں با تخصیص بیرزادے، مولویوں اور ذاکر جو عربی الاصل کہتے ہیں معلوم ہو جائے کہ حضرت آدمؑ پیشے سے کسان تھے، حضرت حوّا چرخہ پر سوت کاتتا، حضرت ادریسؑ کپڑا سیتے تھے اور حضرت نوحؑ بڑھئی کا کام کرتے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کھیتی کرتے تھے، حضرت صالحؑ اور حضرت ہودؑ تجارت کرتے تھے، حضرت داؤدؑ لوہاری کرتے، زرہ بناتے اور حضرت سلیمانؑ پنکھے چٹے اور بڑے ڈلیا بناتے اور حضرت شعیبؑ بکریاں چرا کر پلتے اس سے اپنی گذران کرتے، حضرت ابوبکر صدیقؓ بزازی کرتے یعنی کپڑا بیچتے اور حضرت عمر

۱؎ مولانا عبدالسلام مبارکپوری۔ کتاب المنزل (جلد) حصہ دوم ص۱

۲؎ خافی خان نظام الملکی۔ منتخب اللباب۔ ج اول ص۲۲۳ (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۹ء)

فاروقؓ خشت پزی یعنی (اینٹوں کے پزاوہ یا پجاوہ) میں اینٹیں بناتے۔ اسی طرح بڑے چھوٹے لوگ اپنی گزران کے واسطے کچھ نہ کچھ پیشہ کر لیتے تھے۔

اس کسبِ حلال کا تصور تھا کہ ہمارے بزرگانِ دین نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا "فضائل الکسب"، "آئینۂ شرافت"، "نجابت و شرافت یا باس تقویٰ"، "معیارِ شرافت"، "کسب النبی" وغیرہ میں زراعت، تجارت اور صنعت کی حلت و حرمت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ "کاشت کاری، بزازی اور پارچہ بافی وغیرہ ایسے پیشے ہیں جن کو اولیائے کرام نے بھی اختیار کیا تھا، قرآن و حدیث میں ان کی حلت کا ذکر موجود ہے، اس لئے جو ان کو برا کہتا ہے یا کرنے والوں کو حقیر سمجھتا ہے وہ دراصل انبیاء کی توہین کرتا ہے۔"[1]

اسلام نے مردِ مومن کو فقر اور غریبی کے ہر محاذ پر لڑنا سکھایا ہے تاکہ انفرادی، ازدواجی اور اجتماعی زندگی خوشحالی سے گذر سکے اولاد کی تربیت اور پرورش صحت مندانہ ماحول میں ہو سکے تاکہ وہ معاشرے کے صالح افراد بن جائیں۔ اسلام معاشرے کے ہر فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ محنت کرے اور کسبِ حلال اور اکلِ حلال کو مدِنظر رکھے۔ بیکار روٹیاں نہ توڑے اور نکھٹو بن کر خاندان پر بوجھ نہ بنے، کیا وہ دیکھتا نہیں کہ قدرت کا اتنا عظیم الشان کارخانہ چل رہا ہے اور وہ اپنے معاشرہ کے جسم کا عضوِ معطل بنا ہوا ہے؟

- محنت اور دیانت کا سبق ہمیں اپنے دین سے ملا ہے، بزرگانِ دین نے کیا اور ان ہی کے نقشِ قدم پر چل کر ہمارے بزرگوں نے جو مصائب بھری زندگی گذاری ہے یہ اسی کا صدقہ ہے کہ ہم آرام و آسائش کی زندگی گذار رہے ہیں۔ اور ہوش کی آنکھیں والی نسل جو اب تقریباً ختم ہو چکی ہے اور جو ترکِ وطن کے مہاجرین کی اولاد تھی اس حقیقت سے کما حقہ واقف تھی یہی لوگ بافندگی یا دستکاری کے امین تھے اور جو کچھ ہم نے سنا اور پڑھا اور کچھ باقی رکھا ہے انہیں کی دین ہے۔

"مہاجرین انصار" یعنی ہمارے آبا و اجداد نہ صرف اپنے وطن سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے بلکہ اپنے خاندان کے بزرگوں اور اپنی روایات کی بھی بڑی قدر اور تعظیم کرتے تھے۔ انہیں اپنے پیشے سے دلی محبت تھی وہ اپنے "بزاز" "کرگہا" پر خدا ترسی اور نیاز مندی کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ "دست کاری" یا ہاتھ سے کام کرنا یا "ہاتھ کا کام" کا معنوی اطلاق سب سے زیادہ صراحت اور عملی طور پر بافندگی پر ہوتا ہے

---

[1] دیکھئے مخطوطہ کسب النبی (رقم ۱۵) کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات: ڈاکٹر حامد اللہ ندوی صفحہ ۷۶

جس میں دونوں ہاتھ، دونوں پیر، غرضیکہ بافندہ کے سارے اعضا و جوارح متحرک اور مشغول
عمل رہتے ہیں، بُنکر کے دونوں پیر کھڈی (کرگھا) کی پوکھری (ہوسل) میں گڑے پائی رفت ر
(پاوڑی) کے قدمچوں پر رہتے ہیں ایک ہاتھ میں ہتھا اور دوسرے میں ستہ[3] رشتہ قائم رہتا
ہے، "آنکھیں" ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ بھلا دھوٹا (نال) پر رہتی ہیں ایک نظر چرخی
کے بانے پر کہ نال کی سوراخ سے نکل رہا ہے یا ٹوٹ گیا ہے، دوسری نظر گیبھا پر، پھر ایک نظر
تیل کی لکڑیوں کے اتار چڑھاؤ پر، اور تراوچی، جو تانی کا کوچہ جاناں تھا جس کی تلاش میں وہ سرگرداں
رہتا ہے وہ معشوق تو زرباف کے دل میں چھپا رہتا ہے۔ گھٹنوں پر دو تختے بندھے رہتے ہیں تا کہ
"نال" کو "چلاتا" ہوا کبھی جنون میں پوکھری میں کود نہ پڑے اور پیروں کو زخمی کر دے، کبھی بنکر
کا سیدھا ہاتھ ہتی (دینک) پر جاتا ہے جو بنے ہوئے کپڑے کو کھینچ کر "دامن کشی" کی دعوت
دکھلاتی ہے اور کبھی وہ اسی ہاتھ سے "پیٹن" کی گردانک دبوچ کر کپڑے کو پیٹ پیٹ کر
(کنگھی دیکھتی) پر نظر دوڑاتا رہتا ہے کہ تانے بانے کی شائستگی ہو رہی ہے یا نہیں ورنہ الجھن
کو سلجھانے کے لئے کوچ سے کام لیتا ہے، جولاہا جسے پوربی میں (... تشمیر و حقیر کے ساتھ
جلوا) کہتے ہیں اور تو اور یہی —— وہ ایک صوفیانہ تمثیل بن گیا تھا، پیٹن پر جھکا ہوا ٹوٹے
تار کی تلاش میں جلاہے کو دیکھ کر کسی نے پوچھا :

کا دیکھت باہو ؟

جولاہے نے جواب دیا "تور (طور) کا جلوہ دیکھت ہیں" —— مومن عارف کے تئے اکرتے ہو
"جالا فریم" کو اوپر نیچے کرتا ہے اور جسے "دَم" کہتے ہیں —— دم عیسیٰ سے کم نہ تھا جس پر وہ "ارشاد
المومنین" سے سیکھی دعائیں پڑھ کر دَم کرتا تھا، طور پر بیٹھ کر جلوۂ خدا دیکھتا تھا، بڑی رفتار سے اپنے
پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتا تھا اور بڑھاپے کی منزل تک شہسواری کرتے کرتے جب وہ تھک
جاتا تب بھی کرگھا کے زین سے نہیں اترتا مگر جب قویٰ مضمحل ہو جاتے اور عناصر میں اعتدال
باقی نہیں رہتا تو وہ اگر ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے کے کرگھا کو تصور میں
دیکھتا رہتا تھا، اور اب اس کا بیٹا شہسواری کر رہا تھا —— اور وہ دونوں رقت سے مغلوب

کی نماز کے بعد لاٹھی کا سہارا لے کر باہر بیٹھ جاتا اور بیٹے کا انتظار کرتا جو دن بھر کا بنا ہوا کپڑا بیچنے،
گڑھی بازار جاتا تھا، اگر اس کے ہاتھ میں سبزی ترکاری کی پوٹلی دیکھ لیتا تو باپ کی باچھیں کھل جاتیں
وہ خدا کا شکر بجا لاتا "الحمد للہ" آج بچّے بھوکے نہ سوئیں گے" ـــ یہ تصور نہیں ہے اور نہ افسانہ ساز
بلکہ ان تجربوں کی افسوں گری ہے جن سے میں اور میرے جیسے سینکڑوں میرے معاصرین
تنگدستی کے تنگنائے سے گذر چکے ہیں، آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہمارے پُرکھوں پر بھی ایسے
کٹھن دور گذر چکے ہیں، آج "سائزنگ" کی چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے کالے
بادلوں میں سینوں سے نکلی ہوئی آہوں کا دھواں کیسے دکھائی دیگا؟

گذر گئی ترے مستوں پہ ایسی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

بُنکر مومن کو اسی لئے اپنے پیشے سے بڑی محبت تھی اور محبت کا محور تھا کرگھا اور چرخہ۔
کرگھا معاشی اور دینی زندگی سے عبارت تھا دستگاہ سے عبادت گاہ تک یہی ہر مومن بُنکر
کا سفر تھا مگر ان چند قدموں کی مسافت میں وہ آخرت کا "زادِ راہ" اکٹھا کرتا رہتا، وہ کپڑا بُننے
کو بھی عبادت اور فرضِ کفایہ سمجھتا تھا خلقِ خدا کی خدمت کرنا اس کا نصب العین تھا بچپن سے
لے کر مرنے تک اسی کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا ستر پوشی کرتا، پیرہن بن جاتا اور آخر میں کفن۔

سیاسی بحران کا پُرآشوب زمانہ ہو یا معاشی بحران کا جاں گسل دور، خسارہ کا احتمال ہو یا خسران
ان کا کرگھا ہر حالت میں چلتا رہتا کیونکہ بُنکروں کی معاشی زندگی کا ماحصل یہی تھا اور یہی
خیال تھا کہ چولھا جلتا رہے اور کرگھا چلتا رہے" کرگھا چلے گا تو رزق کے دروازے کھلے رہیں
گے ورنہ بیٹھے گا تو [illegible] اور ذہن بھول جائے گی۔

۱۸۵۷ء میں جب پورے شمالی ہند اور بہار میں باغیگی کی سخت [illegible] کا باعث
بنی تو [illegible] خستہ ہو کر وطن چھوڑ، پردیس [illegible] رہنے لگے، غازی پور کے نوربافوں
خاندانوں کو ماریشس بھیجا نے کی [illegible] الہ آباد کے اجڑے ہوئے مومن۔ انصاری جن کے گاؤں
کے ڈھیر [illegible] مغربی ہند میں جا کر بس گئے تھے وہ سب سے زیادہ معاشی بحران کے بھنور میں
[illegible] تھے [illegible] ہنگاموں کے بعد انگریزوں نے سب سے زیادہ یہاں کے کرگھوں کو جلا

دیا تھا اور گھروں کو اُجاڑ دیا تھا، انہیں تحصیل چائل کے مولوی لیاقت علی سے انتقام لینا تھا جو جلاہوں کی مدد سے الہ آباد کے خسرو باغ میں "ایک دن کا سلطان" بن بیٹھے تھے، جو بالکل ہی ہمت ہار بیٹھے وہ مشک اٹھا کر بہشتی بن گئے اور خاندان کی آبرو رکھ لی، جو خودی ما لی بوجھ سے بوجھل تھے بار بردار بن گئے، "پھانسی کے جلاپے با لا بہبت کے جنگل میں زیر تعمیر "دودھی" بند میں مزدوری کرنے کے لیے نکل گئے اور راہ جنگل کی لی۔ بھوجپوری اضلاع کے مرد جلاہے کلکتہ اور آسام نوکری کرنے چلے گئے۔ عجب بے کسی کا عالم تھا "گاؤں ادھورے رہ گئے" اور زندگیاں بنیر بال بچوں کے بٹ گئیں۔ عورتوں کے ہجر و فراق کا یہ عالم تھا کہ دیار پورب کا ہر وہ شہر جہاں ان کے شوہر نوکری کے لئے نکل گئے تھے گویا ان کا "سوکن" بن گیا اور ان کے آنسو "بدیسیا" کے گیتوں میں ڈھل گئے:

"پورب کے دیشوا ان کیلی نوکریا
تے کری سنوان کے روجی گرجانیہ ہو" [1]

(پورب میں نوکری کرنے سے گھر سونے سے بھر جاتا ہے)

رلیا نہ بیری - جہجیا نہ بیری
نوکریا بیری نا ____ [2]

— نہ ریل نہ جہاز کوئی دشمن نہ تھا — دشمنی تو نوکری سے تھی جس نے گھر بار چھڑا دیا — اور رگھیے کو خاموش کر کے ہمیں رلا دیا۔

اس معاشی اور معاشرتی جنگ میں دیار پورب کے انصاریوں نے اپنے تصورات اور روایات کو ہمیشہ شکست خوردگی سے بچایا اور اپنی شناخت کی "بے چہرگی" نہ ہونے دی۔ مئو میں جب ایک ہندو سیٹھ نے کپڑے کا کارخانہ قائم کرنا چاہا اور انصاریوں کو دوگنی مزدوری دینے کا وعدہ کیا تب بھی انہوں نے بھوکوں جان دینا گوارہ کیا لیکن "ہر گاجے گرگھا نہ جائے" اپنا کرگھا نہیں چھوڑا اور انکار کر دیا۔ یہی صورتِ حال بنارس میں تھی جہاں ایک مہم جُو کو اسی طرح جولاہوں سے شکست کھانی پڑی۔

---

[1] پوری فلاکے بھوجپوری گیت اور دیکھئے۔ بی معصوم رضا کا ناول "دھاگا" (دہلی ۱۹۷۷ء)

[2] ایضاً ص ۱۰۱

تیرھواں باب

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟

انیسویں صدی دم توڑ رہی تھی۔ پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی شکست خوردگی سے یاسیت اور قنوطیت کا ایک دبیز کہرا مسلمانوں کے ذہنوں پر چھا گیا تھا۔ قومی تعمیر کا احساس[1] صرف دانشور طبقہ کو تھا مگر یہی طبقہ بے جا آزادئ طبع کے سبب سارے زمانے سے روٹھا رہتا ہے کیونکہ وہ اپنے ماضی کی حنوط شدہ لاش کو ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھتا ہے، حال کو شکستہ سمجھتا ہے اور مستقبل کا بھیانک خواب دیکھتا ہے۔ یہی طبقہ تھا جس میں حصول تعلیم اور تعمیر ملت کا احساس پیدا ہو رہا تھا لیکن اس کی نظریں ابھی تک مذہب کی شکستہ دیواروں کی طرف نہیں گئی تھیں۔ دین کے تنوں میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کی خودرو بیلیں چڑھتی اور لپٹتی جا رہی تھیں۔ مذہبی حالات دگرگوں تھے۔ قرآن و سنت کی راہوں پر باطل عقائد اور ذات پات کی لعنتوں کا گرد و غبار پھیلا ہوا تھا۔ علی الخصوص تعلیم یافتہ طبقہ جس پر مغربی تہذیب کی قلعی چڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن مذہب سے بے بہرہ ہونے کے سبب ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا تھا۔ دین سے بیگانگی کا یہ عالم تھا کہ قرآن شریف جزدان میں بند طاقِ نسیاں پر رکھا ہوا رہتا تھا۔ مکتبوں میں دینی تعلیم دینے والے مدرسین بقول ان کے نحو و صرف کی ترکیبوں کے سوا کچھ نہ جانتے تھے۔ فرنگی تہذیب و تعلیم کا تسلط بڑھتا جا رہا تھا۔ اسکول اور کالج کی مغربی تعلیم اور مذہبی زندگی دو مخالف سمتیں تھیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی پہنے نماز پڑھتا نظر آ جاتا یا قرآن شریف کی کوئی آیت اس کی زبان سے نکل جاتی تو لوگوں کو ایک شوشہ ہاتھ آ جاتا اور یہ ایک تعجب انگیز واقعہ بن جاتا اور اس طرح اسے بیان کرتے کہ فلاں شخص انگریزی تعلیم یافتہ ہونے پر بھی مذہبی پابندی کرتا ہے۔ اسلام سے وابستگی برائے نام قومی رشتہ تک رہ گیا تھا۔ جو مذہب سے تھوڑا بہت واسطہ رکھتے تھے وہ عزلت گزیں ہو کر درود و وظائف کا پھندا کھینچتے یہ صرف حصولِ جنت کے لئے تھا۔ خانقاہوں کے مشیخت پناہ پیری مرید

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ، مقدمہ

کا بازار گرم کئے بیٹھے تھے اور ترکِ معاملات میں ایسے ڈوبے رہتے کہ مذہب کی روح تلملا اٹھتی۔[1] قرآن کو جامع صفات و معانی تسلیم کرتے لیکن اس کے معارف اماموں اور ولیوں کے بس کی بات تھی اس پر غور کرنے اور عمل کرنے کی انہیں چنداں ضرورت نہ تھی، علماء و شیوخ کا ایک سہل انگار طبقہ اپنے بند حجروں کے دریچوں سے باہر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا کہ دین پر کیسا عجیب وقت آن پڑا ہے اور قومی زندگی کو کس طرح مٹایا جا رہا ہے اس کے نزدیک دین کا مطلب یہ تھا کہ نماز و روزہ کے فضائل بتلا دئے جائیں جنت کے حصول کا سہل طریقہ بتا دیا جائے تسبیحات کا شمار اور نفلوں کی گنتی بتا کر ثواب بٹورنے کا کشکول ہاتھ میں تھما دیا جائے یا کفر و الحاد کے فتووں پر مہریں ثبت کر دی جائیں اور شاگردوں کو پرانے نصاب کی چند کتابیں پڑھا دی جائیں یہی اندازِ مسلمانی تھا، رہ گیا مسلمانوں کی قومی زندگی کا اور ان کی بقا کا سوال تو یہ ساری سیاسی باتیں تھیں، علمائے دین اور مشائخِ طریقت کو ان سے کیا واسطہ؟ معتقدین کو تسکینِ خاطر کے لئے بشارت دیتے کہ قیامت قریب ہے اور حضرت امام مہدی ظہور ہونے والا ہے۔[2]

اربابِ صفا، حق اور اہلِ بصیرت نے ہمیشہ ہر دور میں اپنے اضحلال و پستی سے ابھر کر اور آگے والوں کے دور کے مقابلے میں آخرت سے قریب، اور یہ نکتہ بھی ان پر عیاں تھا۔ دنیا اپنی تمام مادی ترقیوں کے باوجود پیچھے جا رہی ہے اور آخرت آگے بڑھتی آ رہی ہے اسی لئے مردانِ حق آخرت کے پرستار تھے کیونکہ "آج عمل کا دن ہے اور حساب نہیں ہو رہا ہے اور کل جب حساب ہوگا تو عمل کا موقع نہیں رہیگا" بیسویں صدی کی تاریخ کا پہلا باب دیکھئے عمل کا ایک جگمگاتا عنوان نظر آئیگا۔

یہی زمانہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کی مذہبی، سماجی اور سیاسی تحریکات نے انقلاب کا بیج بونا شروع کر دیا تھا، فکری و ذہنی سمتوں سے معاشرتی اصلاحات اور آزادیٔ ملک کے لئے نعروں کی آوازیں آنے لگی تھیں، ادھر سیاسی شطرنج کی بساط بچھ چکی تھی کانگرس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو قائم ہو چکی تھی مسلم لیگ کی بنیاد بھی اس کے بعد پڑ چکی تھی اب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کو مات دینے کے لئے باہمی مسابقت میں آگے پیچھے دوڑنے لگیں لیکن مسلم قیادت اس راستے

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد: تذکرہ، مقدمہ ص۱۱ [2] ایضاً ص۱۱

کی کھوج میں تھی جن کی منزل الگ سمت تھی کانگریس کے ساتھ جو بھی مسلمان تھے وہ بھی ہندوؤں کی طرح طلب حقوق اور ملکی حالات کی تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اپنی جدوجہد کی معراج اور انتہا سمجھتے تھے، عوامی شرفاء کے سفید پوش سیاسی راہبرو پہچانا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں، کا بہانہ کرکے ہر ایک راہبر کے ساتھ تھوڑی دور تک چلتے، مسلمان جو کانگریس میں شامل ہوئے تھے ان کے سامنے بھی خود اپنی کوئی راہ نہ تھی قومی تعمیر کا احساس بہرحال ہر ایک کو ہو چکا تھا۔

مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کے کچھ ممتاز افراد ذاتی مفاد کی غرض سے اور جاہ طلبی کی بیتاب تمناؤں کے ساتھ انگریز صاحبوں کی مصاحبت میں سر جھکا کر کھڑے ہو گئے، جنگ آزادی کی شکست خوردگی سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اب انگریزوں کا سایہ ہٹنے والا نہیں اور جو وقتی روشنی وہابی تحریک سے پھیلی تھی وہ اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے، لیکن ـــ آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا، ـــ اور ایک نہیں سینکڑوں آفتاب رسالتماب پیدا ہو کر نورِ حریت اور نورِ اسلام پھیلانے لگے، علماء و فضلا اور شیوخ و اساتذہ کی ایک بڑی جماعت کانگریس کے ساتھ ہو گئی، اور سید احمد خان جیسے لوگ نہ صرف کانگریس کی مخالفت کرتے رہے بلکہ وہ اور ان کے "حواریین" جیسے مولوی مہدی علیخاں تھے اور دیگر اکابر نیچریہ کی تحریرات و تقریرات مذہب حقہ سنت کے حق میں مضرت رساں ثابت ہو رہی تھیں، فتوی علمائے اہل سنت حیدرآباد و بدایوں و سہسوان و مارہرہ شریف و احمد آباد و گجرات و الہ آباد و مرادآباد و دہلی و بمبئی "جو جلسہ[۱] "دوم" ندوۃ العلماء" منعقدہ لکھنؤ ۱۸۹۹ء میں صادر ہوا اس سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے علماء دین متین و مفتیان شرع مبین اب اسلام کی صحیح روش کو پا چکے تھے[۱]، لیکن ابھی وہ لوگ جو نسبتاً بے منظر عام پر نہیں آئے تھے وہ لوگ جو مذہب کے تسمہ پر رستے ہوئے ناسوروں کا علاج کرتے، ورنہ وہ ہنر و کاریگران وقت کی کارگاہ خرقہ میں نظر آ رہے تھے جو صنعت پارچہ بافی کے ذریعہ پیرہن کی رفوگری کرتے۔ اور نہ وہ مہدی آخرالزماں ظاہر ہوئے جو دنیا میں ظلم کو ختم کرکے عدل و انصاف کی بنیادوں پر ایک سلطنت قائم کرنے والے ہیں، امام منتظر و ...

---

[۱] مولانا مولوی میر عبدالرحمن، فتوی علمائے اہل سنت ... ۱۸۹۵ء اس پر بمبئی کے علماء اور مفتیان شریف عبداللطیف وغیرہ، شیخ محمد مرگے، مولانا محمد عبداللہ، قاضی اسماعیل چلپائی، قاضی محمد اسمٰعیل، الہ دین، ابو حنیفہ، محمد ... تعصب مسرت ... من اضلاع الہ آباد کی مہریں ثبت تھیں۔

نہیں ہوئے لیکن امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' فرودافقِ صحافت پر نمودار ہوا۔ ۱۹۱۲ء کا تاریخی سال تھا جب کلکتہ سے اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔

"الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ تاریخِ ہند میں یادگار رہیگا وہ یہ دماغی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اسی کی دعوتِ حق سے پیدا ہو گیا۔ لاکھوں کروڑوں مسلمان ہمیشہ قرآن شریف پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں مگر قرآن کی تعلیم کی اصل حقیقت سب سے پہلے اسی نے آشکار کی اور یکایک سب کے دل میں یہ بات اتر گئی کہ ہمارے دینی و دنیوی فلاح و ترقی کی صرف یہی راہ ہو سکتی ہے جو حق کی راہ میں نفی سے خالی ہو۔"[1]

الہلال کے نمودار ہونے کے بعد تعلیم یافتہ گروہ میں جو مذہب سے منہ موڑ چکا تھا ایسا انقلاب آیا کہ ہزاروں کے سر خدا کے حضور جھکنے لگے، علماء و مشائخ حجروں کو چھوڑ کر میدانِ عمل میں آگئے، پڑھے لکھے مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ جن میں اساتذہ و شیوخ، اطباء و وکلا بھی تھے، کانگریس کے جھنڈے تلے آ کر آزادی کی جدوجہد میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔ حب الوطنی، قومیت اور حریت کے تصورات نے ان لوگوں کی زبان پر انقلاب زندہ باد کے ساتھ تکبیر کا ورد پیدا کر کے بھی دے دیا۔ تحریکِ خلافت نے عام مسلمانوں میں بھی جذبۂ حریت پیدا کر کے وحدتِ اسلامی کا احساس بیدار کر دیا۔ بہار و اتر پردیش کے علماء اور تعلیم یافتہ افراد عموماً کانگریس میں شامل ہو گئے تھے ان میں ایک بڑی تعداد انصاریوں کی تھی ان کی ہمدردیاں مومن برادری کی تنظیم مومن کانفرنس اور جمعیۃ العلماء کے ساتھ تھی اور ایک کثیر تعداد بیک وقت دونوں کی رکنیت رکھتی تھی۔

شرفا، گور ڈراونی اور بیچ اندھیری رات
وہاں نہ کوئی پوچھے کہ کون تمہاری ذات

جس سال مولانا ابوالکلام آزاد کا انقلابی رسالہ الہلال افقِ صحافت پر جلوہ گر ہوا تھا، ٹھیک اسی سال مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارکپوری کی بیان افروز، عہد آفریں اور مومن برادری کی تاریخ ساز کتاب "المنوال والابد" شائع ہوئی۔ مولانا اہلِ حدیث مسلک کے زبردست عالم تھے۔ کتاب المنوال والابد قبیلۂ انصاریان کی مستند اور مبسوط تاریخ ہے اور اسی نے دنیا کو ایک ... انصار ... بات

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ ص ۱ [2] مرزوی قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرۂ علمائے مبارکپور ص ...

اور بوریا نشینوں میں سے اعاظم رجال، محدثین، مجاہدین، اہل قلم اور اہل سیف، اساتذہ اور شیوخ یہاں تک کہ اہل اللہ بھی اٹھے ہیں انہیں حقارت سے مت دیکھو کہ ان میں مردانِ ثابت بھی ہیں اور شہسوار بھی۔

خاکساران جہان را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ درین گرد سواری باشد

اس کتاب نے سب سے پہلے مومن برادری کو خود شناسی اور خودداری عطا کی، حریت و ذہنیت کے خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بنایا یہ کتاب مولانا موصوف کی جگر کاوی، ترتیب و تحقیق وسیع مطالعہ اور ان کی فضیلت پر دال ہے، جس برادری کے وہ فرد تھے، جس مسلک اہل حدیث کے وہ راہرو تھے اور جس دین کے وہ مبلغ مسلمان اور جید و متبحر عالم تھے ہر ایک ذمہ داری کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے قومی اور ملی احساس کے ساتھ نبھایا ہے۔ کتاب منوال و ابہ جیسی معرکۃ الآرا تصنیف نے علمی اور تمدنی حلقوں میں حرکت پیدا کر دی، اس میں بیباکی بھی ہے اور بیقراری بھی جو ملت مسلمہ کی زبوں حالی اور علی الخصوص پارچہ باف طبقہ یعنی خود اپنی برادری کی پسماندگی، جہالت اور احساس کمتری کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری تذکرۂ علمائے مبارکپور میں یوں رقمطراز ہیں[1]:

> "مولانا نے کتاب الحمرت کے نام سے ایک مستقل تصنیف و تالیف شروع کی تھی جس کے دو حصے تھے، دوسرا حصہ تاریخ منوال و ابہ کے نام سے چھپا، مگر اس پر مصنف کی حیثیت سے نام چھپنے کے بجائے عبید اللہ مبارکپوری کا رکھا"
>
> جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی وہ دور شرافت ہوئی مسلمانوں کے عرفی شرفاء میں پیشہ ور [illegible] خصوصاً پارچہ بافوں کے بارے میں نہایت حقارت آمیز نظریات پائے جاتے تھے [illegible] کی حالت بڑی قابل رحم تھی [illegible] تنزلی اور [illegible] ترقی کو دیکھ کر [illegible] کی وجہ سے اس طبقہ کے بعض [illegible] احساس کمتری میں مبتلا [illegible] حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے کمال جرأت سے کام لے کر [illegible] کی روشنی میں تحقیق کے بعد یہ کتاب لکھی اور اس کا ثبوت

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرۂ علمائے مبارکپور ص۱۳۸، [illegible] کتاب [illegible] مجھے [illegible] عبد الحمید [illegible] کی معرفت [illegible] سے دستیاب ہوئی [illegible] ۱۹۶۶ء)

یہاں تک کہ ہمارے زمانے میں چند برسوں پہلے تک ثقہ اور سنجیدہ اہل علم و فضل ذہنی کجروی کا ثبوت دے رہے تھے اس کی مشہور مثال مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کی کتاب "غایۃ النسب" ہے۔ اس میں پیشہ ور برادریوں کو رذیل بتایا گیا تھا جن میں جولاہے، قصائی، دھنیے اور کنجڑوں کو شامل بتایا گیا تھا، دار العلوم دیوبند کے ایک ایسے فاضل مفتی کے قلم سے "اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہ" کو جھٹلانے والے کا یہ مزعومہ باطل اس اعلیٰ دار فخر نصب العین کے بالکل عین ضد تھا جو بانیان دار العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا صحیح مقصد تھا، مفتی موصوف نے "کفو" کے مسئلہ کو بنیاد بناکر اسلامی اخوت اور مساوات کی دیوار میں رخنے ڈالنے کی مذموم کوشش کی، ان کی منطق یہ تھی کہ انصاری کی عزیت جو در اصل ایک جلیل القدر صحابی رسول حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت رکھتی ہے ایسے نچلے درجہ کے پیشہ ور پسماندہ طبقہ کو زیب نہیں دیتا اور یہ کہ ایسے کسی نسب کا مدعی بننے کے بارے میں تمت زیدانی ہے۔ اگر نسبت ادعائے نسب کی نہ بھی ہو تو محض پیشہ کے لحاظ سے [؟] وہ بھی ترک [؟] رذیل پیشے سے تعلق سے جیسا کہ یہ لوگ سمجھتے تھے اپنے کو نسبت کرنا مقصود ہو تو بھی یہ تلبیس اور مغالطہ سے خالی نہیں۔

اس کتاب کے خلاف [؟]۔ انصاری برادری میں غم و غصہ کی لہر پھیل گئی۔ لیکن ان کے درمیان ایسے باہمت بھی تھے جنہوں نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے مولوی مفتی محمد شفیع صاحب کی مبتذل اور حقیر انگیز رسالے کی دھجیاں بکھیر دیں، مالیگاؤں کے عظیم شہرے مولانا محمد عثمان نے اپنے اساتذہ کے روبرو ناقابل تردید دلائل اور پر اثر مضمون تحریر کیا کہ دار العلوم دیوبند میں ہنگامہ مچ گیا یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جب وہ وہیں زیر تعلیم تھے۔ مولانا محمد شفیع، مولانا عبد الله [؟] مرحوم مولانا عبد المجید [؟] وغیرہ۔ مالیگاؤں سرحت برادری کے طلبہ کو دار العلوم دیوبند سے خارج کرنے کی سازشیں ہونے لگیں۔[۱]

[؟] انصاری برادری کی تاریخ میں یہ واقعہ سنہری حروف میں لکھا جانا چاہئے کیونکہ اس طرح [؟] حق پرستی اور حق گوئی کے واقعات نے برادری میں خود رائی، خودداری اور خود شناسی کی

---

[۱] [؟] مجموعہ مقالات۔ ڈاکٹر مختار ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی، اسلام پورہ، مالیگاؤں ۱۹۹۲ء

مقالہ حضرت مولانا محمد عثمان کی خدمات الصالحات، عبد المجید سرور ۹۷ تا ۸۲

کے صفات میں کا لمہ پیدا کر دیے تھے، اس زبردست تاریخی ردعمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ دیوبند کی مومن برادری نے کھل کر مولانا عثمان کی حمایت کی، اور علامہ ابراہیم جیسی عظیم شخصیت ان طلبہ کے لیے سپر بن گئی، یہ خود بھی اسی برادری کے ممتاز فرزند تھے، اس کے علاوہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی حمایت بھی انہیں حاصل ہو گئی۔ بہار نجور سے نکلنے والے "انصار" اخبار کے مدیر خورشید عالم بھی دیوبند پہنچ گئے، ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ بحث چل نکلا اور مفتی محمد شفیع کے خیالات کے خلاف ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، مفتی اعظم ہند علامہ مفتی کفایت اللہ (متوفی ۳ دسمبر ۱۹۵۲ء) کے فتوے بھی صادر ہوئے جو کسب حلال کرنے والی انہی برادریوں کے تعلق سے تھے، ان تمام اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ غایۃ النسب ضبط کر لی گئی اور پھر تو یہ عالم ہوا کہ دیوبند میں مولانا عثمان، مومن برادری کے طلبہ کے علمبردار بن گئے اور اپنی خاص تقریبات میں "جمعیۃ الانصار زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔[1]

مفتی محمد شفیع دیوبندی جو شاید اس ہنگامے کے بعد پاکستان ہجرت کر گئے، ہندوستان کے مجدد مولانا اشرف علی تھانوی کے تلامذہ میں تھے، مولانا نے اپنی مشہور عورتوں کی کتاب بہشتی زیور کو جو پہلے ترغیب و ترہیب موضوع احادیث سے سنوارا ہے، وہاں انہوں نے بعض کاہیجی قوموں کو شہر کے قوم انصار کے سر سے عزت و ناموس کا سہرا بھی اتارنے کی کوشش کی ہے ان کے نادر لطیفے حد درجہ اذیت رساں ہیں جب وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تین روز جولاہے نے نماز کیا پڑھ لی تو اپنے آپ کو بڑی برگزیدہ ہستی سمجھنے لگا،[2] اور یہ کہ تین روز نماز پڑھنے تک جولاہا دقی بزاز اور عرب کا نظر ہو جاتا ہے — واللہ بہتر جانتا ہے کہ برسوں کی گنڈے دار نماز اور زندگی بھر کی ریاکاری کی عبادت کے مقابلے میں ایک عاجز، فروتن اور سادہ روح کی خشوع و خضوع کی تین روز کی نماز بارگاہِ الٰہی میں معراجِ استجابت کو پہنچ جائے، اس کے ایک سجدے سے جولاہے ہی کے دل میں ایمان و توحید کے کتنے چراغ روشن ہو جاتے ہونگے۔

ذات پات کو ہوا دینے والے رہبانیت زدہ عرفی شرفا اور علمائے سو تھے جو برادری کی سیاسی ترقی علمی مرتبت اور خود شناسی سے جل کر اور مرعوب ہو کر استہزا اور حوصلہ شکنی کی جانبداری کرنے لگے،

---

[1] دعاؤں کے سفیر

[2] مولانا اشرف علی تھانوی - الرفیق فی سواء الطریق، تھانہ بھون ۱۳۶۶ھ ص۵

فتاوے اور رسالے تو بہت ہی نہیں "جولاہا نامہ" جیسی شر انگیز مستقل تصنیف تک چھپوا ڈالی۔ دیوبندی اور بریلوی مفتیوں اور مولویوں نے کفو کے مسئلہ کو غبارے کی طرح الفاظ لہو الحدیث سے پھلا دیا "خاندان سادات کا کفو جولاہا نہیں ہو سکتا" اور مولانا احمد رضا صاحب نے فتاوی رضویہ میں اور ان کے صاحبزادے مصطفی رضا خاں نے بھی "بیچ" اس مسئلہ کے فرمایا کہ جولاہا عالم بھی ہو تو سیدہ کا ہمسر کفو نہیں ہو سکتا، لیکن پٹھان کفو ہیں اس لئے کہ سیدانیاں ان سے عار نہیں کرتیں۔ ذات پات کی برہمنیت زدہ ذہنیت نے ان سادہ لوح نوربافوں کو "کم عقل" اور "ناقص العقل" بنا دیا تھا۔ عرفی شرفاء اور ان کے درمیان امتیاز، فرق مراتب اور تفاوت کی بہت بڑی خلیج واقع تھی۔ خود ان کی زبان اور پسماندگی نے انہیں طعن، غبار اور تحقیر اہل اللہ کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ دیہاتی جولاہوں کو خواہ مخواہ حقارت سے اور مضحکہ خیز کردار بنا کر ڈھیر ساری کہاوتیں گھڑ لی گئی تھیں۔ بعض تو بہت مبتذل تھیں مثلاً: [1]

— جولاہے کی کھوپڑی مار بن کے ہاتھ
— اٹھو جلاہے تو حقہ پیں پر بھی کھلم کھلا
— جلاہا چرا وے تی، خدا پڑے اکٹے بری ذالکے ہی ہاری
— بیٹے نہ رو، کمت جلاہا
— جلاہے کی عقل گدی میں
— سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا
— کھیت کھائے گدھا، مارا جائے جلاہا
— ترک بچے تو جلاہے کے گھر، ان کے معنی یہ کہ اگر ان میں کوئی ذہین و فطین پیدا بھی ہوا تو وہ پھر بھی حق تعظیم نہیں۔

یہ سادہ لوح لوگ پشتینی زمینداروں کی رعیت اور باپ دادوں کے قرضدار تھے۔ نو مسلم اچھوت، بدرو، نزدیک رہے۔ وہ بھی ان سے عیاں رہتے تھے۔ یہ بیچارے عجز و انکسار کے پتلے بنے مرزا اور خان اور دیگر عرفی شرفاء کی مسندوں کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہتے تھے۔ چونکہ شرعی سلام ان کے تنازعہ بالنسب کی خود ساختہ شریعت میں ممنوع تھا اسی لئے یہ لوگ صرف "بندگی حضور" یا "سلام مالک"

---

[1] William Crook, 'The Tribe.' P. 70-71

کہہ کر سلامتی بھیجتے تھے تاکہ یہ خود ان کے استبداد اور استحصال سے سلامت رہ سکیں۔ ان کی
بیکسانہ زندگی کا یہ کتنا بڑا تضاد تھا جسے حالات کے المیہ نے پیدا کر دیا تھا۔ پھر بھی ان کی روایتی
دینداری اور تقویٰ نے انہیں صبر و تحمل کا سبق پڑھا دیا تھا۔ اگرچہ غاصب طبقہ کی عصبیت اور
طاغوتی طاقتوں نے انہیں پست ہمت اور پسماندہ بنا دیا تھا پھر بھی خدائے برتر کے آگے پانچوں
وقت سر بسجود رہتے اور طعنۂ اغیار کا شکوہ بھی نہ کرتے

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

وہ حقوق و مراعات جو ہر مسلمان کا گویا حق ہے وہ بھی ان سے چھین لیا گیا تھا۔ [illegible]
مسجد میں یہ اگلی صف میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے[1] اور نہ امامت کر سکتے تھے۔ ان کی مسجدیں
الگ تھیں، ان کے محلے الگ تھے۔ فسادات میں انہیں موت [illegible]
گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے۔ اکثر زمینداروں کی باہمی رقابت اور ذاتی مفاد انہیں بھی لپیٹ میں [illegible]
اور نقصان بھی سب سے زیادہ انہیں کا ہوتا تھا۔ بڑے لوگوں نے ہمیشہ ان چھوٹے لوگوں کو [illegible]
کیا اور اپنے مفاد کے لئے آلۂ کار بنا کر رکھا[2]

برادری کی تعلیمی پسماندگی کا بڑا سبب یہ ہے کہ تحصیل علم کی طرف انہوں نے دیگر طبقوں کی طرح توجہ
بہت کم دی۔ مغربی تعلیم تو [illegible]
مسلمان جو آسودہ حال تھے وہ علی گڑھ چلے گئے اور اعلیٰ طبقہ کے ذہین نوجوانوں کے لئے سہارنپور
میں دارالعلوم دیوبند تحصیل علم و فضیلت کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک علمی درسگاہ ہی نہیں ایک تہذیبی و
مذہبی تحریک بھی تھی۔ اسلامی روایات کی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل یہیں ڈالی گئی اور مغربی تعلیم و
تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند ایک مضبوط محاذ بن گیا۔ [illegible]
اس عظیم درسگاہ سے مستفیض نہ ہو سکے اس لئے کہ [illegible] پڑھ جاتی ہوں گی۔ جب
وہ بھی دست وظیفہ خوار بوریہ نشینوں کو علم و دانش کے اونچے میناروں کی طرف بڑھتے ہوئے

---

[1] گیان چند پانڈے۔ ایضاً ص ۱۳
[2] شیخ عبدالمجید ۱۸۶۴ء کی ڈائری، بحوالہ شیخ [illegible] مبارکپور۔
گیان چند پانڈے۔ ایضاً

دیکھتے ہوں گے، یہ راندۂ درگاہ ہر صورت کے کام آئے، اور اشراف کے نزدیک یہ صرف فاتحہ اور نیاز کی مجلسوں کے لائق تھے، لیکن ان میں اجلافوں کے سفیر بھی تھے اور ایمان اور تقویٰ کے علمبردار بھی۔

جدید رجحانات اور تحریکات نے مومن جماعت میں بڑی حد تک خودشناسی کی بصیرت پیدا کردی تھی وہ احساسِ کمتری کے مارے ہوئے ضرور تھے لیکن انہوں نے کبھی نسلی تفاخر یا نسبت کی فضیلت کا اظہار نہیں کیا، بلکہ برادری کا دانشور طبقہ اور بزرگانِ دین نے اپنی عزت کا بچا کھچا نوشتہ دیوار بھی پیش کردیا تھا۔ سیاسی حالات، اقتصادی عوامل اور معاشی تبدیلیوں نے عزت اور انتساب کی کئی فہرستیں مرتب کردی تھیں، عربی شرفاء کے پاس تو دو رستے تھے مگر جلاہوں کو نسبتاً تین نام دیے گئے: مومن انصاری اور شیخ۔ شیوخ میں پہلے تین خلفاء کے نام لیوا صدیقی، فاروقی اور عثمانی بن گئے۔ شیخ کی صفت تو اب اشراف کے لئے وقف ہو چکی تھی، علمائے کبار نے "شیخ انصاری" کی توضیحی ترکیب کو عام کیا، لیکن سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے حساب بنگال میں ۲،۳۵۴،۲۶ سے زیادہ آتش پرستوں کو حکومت نے "شیخ" لکھنے کی اجازت نہ دی بلکہ "مومن"، "نورباف" یا "کاریگر" کا لقب عطا کیا۔[۱] قریشی، ملکی اور قدوائی لکھنے والے اور کہلانے والوں کا تحفظ تھا اور سید بننے کا ہنر تو ہر ہوا ہوس، نسب پرست کا شعار بن گیا تھا، یوپی گزیٹیر نے ان شیخوں میں سے نومسلموں کو ڈھونڈ نکالا ہے،[۲] ان میں سے کچھ سلطان محمود غزنوی اور سلطان غوری کے حملہ آور لشکریوں کی اولاد سے تھے۔ نومسلم شیخ اور نومسلم راجپوت رانگڑ، سید زمینداروں کی طرح زراعت پیشہ تھے۔ بنگال میں جن زمینداروں کو شیخ ہی کہتے تھے، نومسلم خاندانوں میں سے جو زیادہ تونگر تھا، اسلام کی نعمت سے سرفراز ہو کر دو تین پیڑھیوں کے بعد وہ لوگ جو اپنے اصل و نسل میں بالکل خالص رہے ان میں قابل ذکر اعظم گڑھ کے راجپوت زمینداروں کے خاندان ہیں، دوسری قوم وہ ہے جو مغلوں، پٹھانوں، شیخوں اور دوسرے خاندانوں میں سرخرو ہوکر شادی بیاہ کرنے لگی ان کو عرف عام میں عام طور سے رتوارہ کہتے ہیں[۳] زمیندار طبقہ اس طور پر مالی حیثیت سے اعلیٰ تر طبقہ تھا دوسرا پیشہ ور طبقہ تھا ان میں نورباف سب سے زیادہ

۱۔ [illegible] بنگال کے مسلمان (انگریزی) ص ۱۰۲

۲۔ [illegible] گزیٹیر ج ۲، ۹، ص ۹۳-۹۴۔ عزت انصاری

[illegible] (انگریزی)، ص ۹۵-۹۹

۳۔ مرزا سید [illegible] حیات شبلی، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۱۰

نمایاں اور بعض حیثیتوں سے ممتاز تھے اس لئے کہ یہ جولاہے نہ صرف جذباتی اور کٹر مذہبی تھے یہی لوگ سیاسی اور مذہبی تحریکات میں پیش پیش تھے۔

مومن۔ انصاری برادری کے سارے قبیلے اور گھرانے نو عربی نژاد ہیں اور نہ ہی اس کا دعویٰ تمام کیا گیا، لیکن بعض خانوادوں کے بارے میں روایات اور اسناد کے شواہد موجود ہیں، لکھنو کا فرنگی محلی انصاری خاندان اصل میں سہالی میں آباد تھا یہ انصار کرام کا خاندان تھا جس کا ایک حصہ پانی پت میں رہ گیا تھا جس میں مولانا حالی اور دیگر نامور پیدا ہوئے اور جن کا سلسلۂ نسب ایران کے عہد کے خواجہ محمد علی جو پیر ہرات عبداللہ انصاری کی اولاد میں سے تھے پہنچتا ہے۔ ملا قطب الدین شہید سہالوی سی خاندان کے پہلے نامور علماء میں سے ہیں، بنارس کے قدیم نور بافوں کے توطن اور سکونت کی شہادت فرامین و اسناد سے ملتی ہے لیکن یہ لوگ "مومن" اور "شیخ" کے ناموں سے مشہور ہوئے کیونکہ یہ اصلاً ملک افضل علوی کے لشکر کی اولاد تھے جو سید سالار مسعود غازی کے تبلیغی مجاہدین تھے ان کی نسلیں بنارس ہی میں بڑھیں اور جب دوسرے اطراف منتقل ہوئیں تو ان کو "نور باف" کہا جانے لگا جو قدیم شاہی فرامین میں لکھا ہوا موجود ہے۔[1] ضلع رائے بریلی میں جائس قصبہ کے انصاری اپنا سلسلۂ نسب پیر ہروی شیخ الاسلام عبداللہ انصاری سے جوڑتے ہیں یہی حال گجرات کے کچھ شہروں میں مثلاً بڑودہ کے انصاری بھی حضرت پیر ہرات کے نام لیوا ہیں۔ بنارس میں کئی خانوادوں کے پاس شجرے تھے۔[2] اتر پردیش میں بھی مقامی طور پر انصاریوں کا بہت بڑا حصہ مسعود غازی اور دیگر صوفیائے کرام کی تبلیغی جدوجہد اور روحانیت و محبت کے نتیجے میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ چونکہ عہد سلاطین دہلی ہی سے مسلمانوں میں اہل حرفہ کی عددی اکثریت رہی اور ان میں بافندوں کی تعداد بڑھ چڑھ کر تھی[3] اسی لئے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ یہی لوگ مسلمان ہوئے اور صحیح معنوں میں مسلمان رہے۔

مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے اپنی عہد آفریں تصنیف "کتاب اصول و ابواب" میں دیگر مسلم برادریوں کی طرح انصاریوں میں بھی ہندوستانی نو مسلموں دکھا کر ان کی اصلی شناخت کی بات تجزیہ

---

[1] مولوی عبدالسلام نعمانی بنارسی "آثار بنارس"، بحوالہ ایوب انصاری، نجابت و شرافت ص ۲۲-۲۳
[2] غوث انصاری (انگریزی) ص ۳۷-۴۴
[3] ضلع گزیٹیر- ایضاً ص ۹۵-۹۹

اولاً نداف بودیم بعد ازاں گردیم شیخ
غلہ چوں ارزاں شود امسال سید میشویم

"پہلے دُھنیے تھے پھر شیخ بن گئے اور اس سال غلہ سستا ہو گیا تو سید بن جائیں گے"

مولانا عبدالسلام نے اپنی مرکۃ الآرا تصنیف میں اپنے زمانے کے نو شرفا کے بارے میں، جو خود سرائی کرتے تھے، لکھا ہے:

"یہ مثل مشہور ہے گھر میں بھونی بھانگ نہیں میاں چلے حج کو، نہ تن کو کپڑا ہے اور نہ پیٹ کو روٹی، میر صاحب، شیخ صاحب، خان صاحب کہلاتے ہیں اور کسی امیر کے دربار کی خدمتگاری کرتے ہیں، چلم بھرتے ہیں، ہاتھ دھلاتے ہیں، سب سے بھی زیادہ ذلیل کام کرتے ہیں" [١]

"ایک فاضل سہارنپوری نے ایک فاضل مناظر کا جواب لکھتے ہوئے ازراہ ظرافت میں حد سے باہر ہو کر غصے سے یہ جملہ لکھا تھا کہ آپ دو رکعت نماز پڑھتے ہوں گے تو وحی کا انتظار کرتے ہوں گے، اور حاشیہ پر یہ عربی جملہ لکھا تھا الحاصل اذا صلی رکعتین انتظر الوحی"

"لیکن سہارنپوری بزرگ نے یہ خیال نہ فرمایا کہ انھوں نے مذکورہ بالا بزرگوں کو کس قدر تکلیف دی کیونکہ بعض بزرگ ان میں ایسے ہیں جو دن کی نمازوں کے علاوہ راتوں میں ہزار رکعتیں پڑھتے [ہیں]"

"بعض لوگ مستشرف کی خوش گپیوں کو فخریہ بیان کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ خوش گپیاں کن پر پڑتی ہیں" [٢]

---

١ مولانا عبدالسلام: کتاب المنون دہلی ج ١، ص ١٩-٢٠ ٢ ایضاً ص ٨٨

چودھواں باب

بندۂ مومن کی کرامات

رندوں کو بھی معلوم ہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور نہیں ان کی کرامات (اقبالؔ)

ہمارے بزرگانِ دینؒ اور قوم کے چند جلیل القدر مصنفین و محققین نے ہمیں سینکڑوں جب ذوالاحترام[1] بزرگانِ سلف سے روشناس کرایا ہے جن کا پیشہ بافندگی تھا اور یہی کسبِ معاش کا ذریعہ تھا یا وہ بافندہ خاندان کے فرد تھے، انہیں میں سے اسلام کے اعاظم و اکابر، محدثین، ورجہ ہدین، بلند القدر اور اہل سیف، اہل علم اور اہلِ دولت، اہل اللہ اور اولیاء کرام اور صوفیاء عظام گزرے ہیں۔ ہم ان بزرگانِ دین کی معرکۃ الآرا تصانیف سے استفادہ کرتے ہوئے زمانۂ سلف کے نساجین کا مختصر تذکرہ لکھ رہے ہیں تاکہ عوام بندۂ مومن کا اندازہ کر سکیں اور اپنا موازنہ کر سکیں اور احتساب!

ہے آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

رسول اکرم صلعم کی ننہال بنو نجار میں بُنائی کا کام ہوتا تھا، انصار مدینہ کا بہترین گھرانہ پارچہ باف تھا، حضرت ابو ایوبؓ انصاری اور دیگر اصحاب کرام شلاً حضرت ابو موسیٰ اشعری، سید الانصار حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ وغیرہم کا ذکر گزر چکا ہے۔ حضرت زبیر بن العوام جو عشرہ مبشرہ کے اصحاب کرام میں سے ہیں نساجی کرتے تھے ان کی والدہ کا نام صفیہ تھا۔ آنحضرت صلعم کے دوسرے پھوپھی زاد بھائی حضرت عامر بن کریز تھے یہ ثانی نسب قریشی تھے اور امیر بصرہ عبد اللہ بن عامر کے والد تھے، حضرت عمرو بن عاص فاتح مصر اور وہاں کے گورنر تھے اور عہد نبویؐ میں ایک موقع پر سپہ سالار لشکر تھے یہ بھی خزاز تھے ـــــ حضرت عامر بن کریز کی والدہ کا نام بیضا تھا حضرت زبیر بن العوام سے ۳۸ حدیثیں مروی ہیں[1]

حضرت عبادہ بن الصامت انصاریؓ کی مرویات کی تعداد ۹۱ ہے ان کی اولاد میں محمد بن اسمٰعیل

---

[1] مندرجہ ذیل اہم مصادر و ماخذ جن کا ذکر بیشتر نام ہے مولانا عبد السلام مبارکپوری کتاب سیرۃ البخاری (۲) محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی دستکار اہل شرف۔ تذکرۂ نساجین (۳) مولانا قاضی اطہر مبارکپوری شجرۂ مبارکہ یعنی تذکرۂ علمائے مبارکپور اور دیار پورب میں علم اور علماء (۴) تذکرۂ علماء اعظم گڑھ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی اور (۵) وسیم احمد قاسمی تذکرۂ علماء بنارس۔

الانصاری (سنہ ۷۵۶-۶۶۷ھ) جو ایک جید محدث تھے بافندگی کا پیشہ کرتے تھے، امام ذہبی، عسقلانی، حسینی اور عراقی جیسے حفاظ حدیث ان کے شاگرد تھے، اپنے زمانے کے مسند الآفاق تھے۔ عراقی ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نہایت با امتیاز، امانت شعار اور مخلص مسلم تھے اپنے گھر میں کارگاہ پر بیٹھے صبح سے عصر تک بنتے رہتے اور ہم ان کے پاس پڑھا کرتے تھے۔

معاویہ بن خدیج کو محمد بن ابوبکر نے "یا ابنَ الیہودیۃ النساجۃ" اے یہودی بافندہ عورت کے بیٹے، کہہ کر خطاب کیا ہے اسلام سے پہلے ان کا خاندان یہودی تھا، مغرب کی جنگوں میں کئی مرتبہ امیر مقرر ہوئے سنہ ۴۷ھ میں مصر کے والی بنے سنہ ۵۲ھ میں وفات پائی، آپ کے صاحبزادے عبدالرحمن بن معاویہ بن خدیج (المتوفی سنہ ۹۵ھ) مصر کے قاضی اور شرطہ کے اعلیٰ حاکم تھے۔[1]

کندی قبیلے میں حیاکت آبائی پیشہ تھا۔ اشعث بن قیسؓ بن معدیکرب الکندی حضرت ابوبکرؓ کی بہن ام فروہ کے شوہر تھے، ایک دفعہ حضرت علیؓ سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں پہچانتا ہوں اور مجھکو تم سے سوت کی مہک آرہی ہے، ان کے والد چنے باقرے سنگیاں و چادریں بنتے تھے، وفات سنہ ۴۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔

ابوالقاسم محمد بن اشعث کندی حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بھانجے یعنی ان کی بہن ام فروہ کے بیٹے تھے ان کی بھی مرویات کثیر ہیں ان کے والد اشعث بن قیس کو حضرت علیؓ حائک بن حائک کہتے تھے، عبدالرحمن بن محمد بن اشعث کندی عالی حوصلہ اور نامور اکابر اسلام میں سے تھے جنہوں نے بنی امیہ کی حکومت سے تحریکیں چھیڑیں، عبدالرحمن کی وہ منزلت اور شان و شوکت تھی کہ شاہی خاندان کے افراد قریش یا ثقیف اور تمام عمائد ان کے سامنے پیش رہتے تھے۔

حضرت ابو طلحہ انصاریؓ بھی منجملہ دوسرے پیشوں کے بافندگی بھی کرتے تھے،

صحابہ کرام اور بعد کے مسلمانوں میں اکثر چرخہ کاتنے کے بارے میں مشہور محدث احمد بن حسین بیہقی (سنہ ۲۵۱-۲۰۶ھ) کی شعب الایمان کی شہادت کافی ہے۔ ایک صحابی اور ان کی والدہ نے حضرت ابوذر غفاریؓ مشہور صحابی رسولؐ کو جنگل میں اپنی ماں کے بنے ہوئے کپڑوں میں کفنایا تھا، انہوں نے فرمایا دو چادریں میری گٹھری میں ہیں جن کا سوت میری ماں نے کاتا ہے اور اسی سے

---

[1] [illegible]

[2] کتاب مذکور، ج ۲، ص ۹۵

ان کو بُننا ہے"

صنعت پارچہ بافی کا تصوف کے تصورات سے جو وابستگی ہے وہ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی سے ہویدا ہے، انکساری، استغنا اور فقر تصوف کی تعلیمات کے اسباق ہیں، تسلیم و توکل اور طبعی صبر و تحمل نے صوفیائے کرام کو خودی کا نگہبان بنا دیا تھا۔ یہی اوصاف صنعت حیاکت کے محترفین میں بھی ہمیشہ موجود تھے، پیرانِ طریقت اور مشائخین ریاضت و عبادات کے ساتھ کسبِ معاش بھی کرتے تھے اور ان کے ترِ انفاس پارچہ بافی کے تاروں سے بہت زیادہ ہم آہنگی محسوس کرتے تھے۔ خواجہ بہاء الدین نقشبندی کے والد کمخواب بُنتے تھے اور نقش بندی کے کارگر تھے، بعض روایت میں ہے کہ قالین بافی کرتے تھے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی والدہ محترمہ بی بی زلیخا نہ رسیدہ اور ولیہ کاملہ تھیں۔ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے سوت کات کر ایک دستار بُن کر اپنے ہونہار بیٹے کو پہنائی تھی یہی دستارِ فضیلت شیخ علی نے ان کے سر پر باندھی تھی۔[1]

ہندوستان کے اہل اللہ اور مشائخین طریقت میں بہت سارے ایسے شاعر تھے جو اہلِ حرفہ سے قریبی تعلق خاطر رکھتے تھے اور تصوف کے رموز و اسرار کو ان کے آلاتِ حرفت کو علامات اور استعارات بنا کر عوامی گیت لکھتے تھے چکی نامہ کے عنوان سے دکھنی اردو میں کئی تصنیفات موجود ہیں ان میں دکن کے مشہور صوفی بزرگ خواجہ محمد حسینی گیسو دراز کے چکی نامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے، چرخہ نامہ کے لوک گیت جو عورتیں سوت کاتتے وقت گاتی تھیں یہ عموماً دیہاتوں میں بہت مقبول تھے، یہ عورتیں صدیوں سے یہی کام کرتی آرہی تھیں ان لوک گیتوں کی مقبولیت کی کئی وجہیں تھیں سب سے پہلے یہ کہ ان گیتوں کی بحروں سے چرخے کی یا چکی کی گردش ہم آہنگ ہوتی تھی دوسرے یہ کہ ان کی تخیلات ان دیہاتی عورتوں کی گرفت میں تھیں اور تلمیحات اتنی سادہ زبان میں ہوتی تھیں کہ ان کے معانی سمجھ کر وہ ہم آواز ہو کر گاتی تھیں اور چکی یا چرخہ چلاتی تھیں۔[2]

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار (مطبع ہاشمی سنہ ۱۳۰۹ء ص ۸۳)۔ و راہ الفواد

[2] Richard Maxwell Eaton, "Sufis of Bijapur: 1300–1700 New Jersey p. 157 اور دیکھئے باب حمائق روایات، پارہ بی ہی

ہندستان کے عہد وسطیٰ میں جب چشتیہ طریقہ تصوف کی برکات سے اشاعت اسلام ہوئی اور جلیل القدر صوفیائے کرام خانقاہوں میں علم و عرفان کے چراغ روشن کر کے مریدان طریقت کو سلوک کا راستہ دکھلا رہے تھے، شیخ احمد نہروالی جولاہے کا پیشہ اپنے کرگھے پر بیٹھے پارچہ بُنتے اور یاد الٰہی میں مگن رہتے اور ان پر اکثر ایسا عالم طاری ہو جاتا کہ ہاتھ رک جاتے اور کپڑا خود بخود بُن جاتا تھا۔ آمدنی کا آدھا حصہ گزارہ کے لیے رکھ لیتے اور باقی نصف خدا کی راہ میں صدقہ کر دیتے تھے، ایک رات آپ کے گھر میں ایک چور گھس آیا تمام گھر چھان مارا آپ لیٹے ہوئے دیکھ رہے تھے جب وہ نامراد ہو کر خالی ہاتھ جانے لگا تو آپ نے اسے قسم دے کر ٹھہرایا، پھر کرگھا پر سے سات گز کپڑا جو آپ نے بُن رکھا تھا کاٹ کر اس کے حوالے کر دیا، چور بھاگ نکلا، دوسرے دن وہی چور اپنے ماں باپ کو لے کر شیخ صاحب کے حضور میں آیا اور چوری کرنے سے توبہ کی، مردان خدا کے ایثار نفس، عالی ظرفی اور نظر کرم سے دل مسخر ہو جاتے تھے اور قلب کی ماہیت بدل جاتی تھی، آپ کا مزار بدایوں میں ہے جہاں آپ نے ۶۹۱ھ میں وفات پائی۔

مومن عارف منیری جن کا ذکر گذر چکا ہے صاحب کرامت و کشف تھے، آپ نے منیر کے راجہ کے خلاف ۵۷۶ھ میں جہاد کیا، آپ حضرت ابو ایوب انصاری کے نسب سے تھے۔

قطب الوقت مولانا کریم رودولی میں ایک ناخواندہ جولاہے تھے لیکن علم و معرفت میں ایسا بلند مقام پایا کہ حضرت سید سلطان اشرف جہانگیر کچھوچھوی سمنانی (متوفی ۸۰۸ھ) بھی ان کا بڑائی سے ذکر کرتے تھے، صاحب کشف تھے، ایک مرتبہ سید سلطان اشرفی کے دو مرید حضرت شیخ سمار الدین اور حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے جد اعلیٰ شیخ صفی جو امام ابو حنیفہ نعمانی کے نسب سے تھے مولانا کریم سے ملنے ان کی جھونپڑی میں آئے آپ نے شیخ سمار الدین سے ان کا نام پوچھا، انہوں نے پورا نام بتلا دیا، سن کر فرمایا "اتنا بڑا نام کس سے لیا جائیگا؟" نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا نسبی سلسلہ منقطع ہو گیا کوئی نام لیوا باقی نہ رہا، پھر شیخ صفی کی طرف متوجہ ہوئے اور نام پوچھا، انہوں نے جواب دیا "صفی" کہنے لگے "تمہارا نام تا قیامت قائم رہیگا" ــــ یہ اب تک قائم ہے اور نعمانی، حضرت ابو حنیفہ کی اولاد ابھی تک موجود ہے، ہاں پور میں ان میں صاحب کمال لوگ پیدا ہوئے لیکن پارچہ بافی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔

شیخ عبد القدوس کے مرشد شیخ الاسلام شیخ بن حکیم اودھی کے زمانہ میں شیخ سُدھی جولاہے بڑے کامل ولی گذرے ہیں، مکتوبات قدوسی میں ان کے حال و استغراق کے بارے میں لکھا ہے

کہ ایک دفعہ حالت نماز میں ایسی محویت اور بیخودی طاری ہوئی کہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے یہاں تک کہ مصلیان نے نماز ختم کر کے جب "نہیں" گاہ کیا تو فرمانے لگے: میں اس فکر میں تھا کہ خدا کو دیکھوں اس کے سوا مجھ کو کچھ خبر نہیں۔[1]

قطب العالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے لودھیوں کا زمانہ پایا تھا اور اس عہد میں ایک عظیم روحانی سلطنت کے سلطان تھے ان کے دو جلاہے (سپید باف) مرید تھے شیخ جمو سفید باف دوسرے ان کے بھائی حبیب سفید باف، بڑے مخلص اور نیک خصلت مرید تھے۔ حبیب سفید باف کو شیخ مرشد اپنے مکتوبات (قدوسی) میں "برادرم" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اہل نظر کے نزدیک یہ اظہار محبت و شفقت بڑا سرمایہ افتخار تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ راجی یا راجے کے نام سے مشہور تھے۔ یہ سہارنپور کے تھے۔ شیخ ابراہیم سفید باف بھی انہیں کے مرید تھے ان کی نماز جنازہ خود قطب عالم نے پڑھائی تھی اور اس کے بعد سے ابراہیم کا نام بڑی تعظیم سے لیا کرتے تھے۔

سید شاہ کمال سنبھلی نے اپنے جلیل القدر صوفی شاہ شرف سنبھلی کے بارے میں اپنی تصنیف 'اسراریہ' میں تفصیل سے لکھا ہے۔ صاحب جز و فقر نے بھی لکھا ہے کہ یہ بافندے تھے ہمیشہ بننے میں مصروف رہتے۔ کہتے ہیں کہ وہ کلمہ پڑھتے جاتے تھے اور ان کے ہاتھ کا بنا کپڑا اتنا متبرک مانا جاتا تھا کہ ہر امیر اور غریب اپنے کفن کے لیے خریدتا تھا۔ ان کا روزانہ معمول تھا کہ نماز فجر سنبھل کی عیدگاہ میں پڑھتے اور اشراق و چاشت کی نماز تک وہیں رہتے اور اذکار بلند آواز سے پڑھتے، پھر گھر آ کر ظہر کے وقت تک کپڑا بنتے تھے پھر تلاوت کلام پاک کے بعد ہاٹ دگذری میں جاکر تھان بیچتے۔ روپے کی قیمت ایک جگہ جمع کر رکھا کرتے اور اسی میں سے ہر سال کو خیرات دیا کرتے تھے۔ ایک آدمی کو معلوم ہو گیا سارے روپے چرا لے گیا لیکن دیکھا تو سارے سکے کنکر بن گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی بہت ساری کرامتیں ہیں۔ سنبھل میں عیدگاہ کے متصل ان کی قبر ہے انتقال سنہ ۹۶۵ھ میں ہوا۔ نیم کے درخت نہیں کے نصب کئے ہوئے ہیں۔ آپ قادری سلسلہ سے بیعت تھے۔

---

[1] مکتوبات قدوسی ص ۲۲۰ - اللہ کی عبادت ایسی کرو جیسے کہ دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو تصور کرو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ کسی نے پوچھا حضرت نبی سے مَا الْاِحْسَانُ یعنی سب سے نفیس نیکی یعنی عبادت کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ

بعض تذکرہ نویس اس ڈر سے کہ ایسے صاحب کرامت کو پیشۂ باندگی یا جولاہگی سے متعلق کرنا جو باعث رذالت ہے سوءِ ادب ہوگا اور یہ لکھ دیتے ہے کہ شیخ شاہی اور ان کے بیٹے شاہ حیدر سنبھلی جولاہے تھے ان کی بزرگی کے تار ٹوٹ جائیں گے اور ولایت کی دھجیاں اڑ جائیں گی اس حقیقت سے صرفِ نظر کر دیتے ہیں ایسے کتنے ہی ولی صفت، صاحبِ کشف و کرامات، نیکوکار اہل اللہ ہمارے درمیان سے اٹھے ہیں اور ہمارے بیچ آج بھی موجود ہیں جن کی صحیح شناخت سے قدم قدم ہے اور نظر بے بصر ہے یہ ذہنی کجروی کا سبب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عزت و تکریم کا انتہائی درجہ تقویٰ کو قرار دیا ہے۔ انسانوں کے بیچ فضیلت اور برتری کی بنیاد صرف اخلاقی فضیلت اور نیکوکاری ہے۔ اس مختصر سی قرآنی آیت کے کوزے میں حقیقت ایمانی کے سمندر کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے بند کر دیا ہے وہ قابلِ غور ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)

"اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

حضرت نبی کریم صلعم نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں جو خطبہ دیا تھا وہ گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔ اللہ کی راہ میں نہ نسب کوئی چیز ہے نہ حسب۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزی نیست

حضرت شاہ سنبھلی کے صاحبزادے اور خلیفۂ برحق شاہ حیدر سنبھلی تھے جو ہمیشہ مشغول بخود رہتے تھے۔ بیماروں کے حق میں شاہ صاحب روحانی طبیب تھے جہاں حکیم علاج سے عاجز آ جاتے ان کی دعا اور توجہ سے شفایاب ہو جاتے لیکن ایسا رعب اور جلال طاری رہتا تھا کہ حاجت مند جو رو برو سامنے آنے سے گھبراتا ایک خادم کے ذریعے حال کہلوا دیتا حضرت جی کاغذ پر ایک لمبی لکیر کھینچ کر دے دیتے اسی سے حاجت بر آتی۔

قصبہ اُچہ و شیخ صفی الدین گازرونی (وفات [illegible]ھ) نے بسایا تھا۔

شیخ جمال جھنڈی اچہ (سندھ) کے حرفت جولاہی اور کارگاہ پر بیٹھنے والے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، صاحب کمال ولی تھے اور صاحب کرامات لوگ ان سے دعائیں لینے کے لیے آتے تھے کیونکہ ان کی دعائیں بشارت سے معمور اور برکات سے پُر نور ہوتی تھیں، حضرت مخدوم جہانیاں

جہان گشت کی ولادت کے بعد ان کے والد نے نومولود کو شیخ جمال اُچی کے قدموں میں ڈال دیا، شیخ جی نے بشارت دی کہ "یہ بچہ آفاقِ عالم میں ایسا ہوگا جیسی یہ رات سارے عالم میں بزرگ ہے" مخدوم کی ولادت شب برات کو ہوئی تھی۔[1] شیخ جمال اُچی کا ذکر ابوالقاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے اور انہیں حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کا مرید بتلایا ہے اور لکھا کہ یہ صاحب کرامات تھے[2] نواب صدیق حسن قنوجی (ثم بھوپالی) نے بھی "الوزع النامی" میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، مولانا عبدالحیٔ[3] نے عظیم شیخ الکبیر کہا ہے جو درس و افادہ میں برابر مشغول رہتے تھے اُن کی علمی فضیلت کا شہرہ مکہ اور مدینہ تک پہنچ چکا تھا حضرت مخدوم جہانیاں کو آپ سے بڑی عقیدت تھی۔ شیخ جمال اُچی کا انتقال سنہ ۷۷۶ھ میں ہوا۔

حضرت شیخ تقی مانکپوری (المتوفی سنہ ۱۹۲ھ) جن کا مزار الٰہ آباد کے قریب جھونسی میں ہے اس لیے زیادہ مشہور ہیں کہ آپ کبیر داس کے مرشد تھے صاحب کرامات تھے اور سانپ کے کاٹے کا علم اور پکڑنے کا فن جانتے تھے ان کی شہرت مقامی راجہ نوبک کو سانپ کی طرح ڈسنے لگی "افعی گزیدہ" کی طرح تڑپ رہا تھا جب کچھ بن نہ پڑا تو انتقام کا درپے ہو گیا اور جان کا دشمن ہو گیا۔ ایک دن دعوت پر بلایا اور سانپ کا گوشت کھانے میں پیش کیا آپ نے کشف باطن سے معلوم کر لیا اور سالن کے پیالے کو مخاطب کر کے کہا اُٹھ! ("برخیز") اور خدا کے حکم سے تکا بوٹی کیا ہوا سانپ پھنپھناتا ہوا نکل بھاگا، اس دن سے قرب وجوار میں شاہ تقی کا نام (رہے نام اللہ کا) جب بھی لیا جاتا ہے وہاں سے سانپ کا گذر نہیں ہوتا۔

شاہ تقی کے والد شاہ شعبان (یا بروایت دیگر) شاہ رمضان نے سہروردیہ سلسلہ سے خلافت پائی تھی وہ الہ باس (الہ آباد) کے صاحب ولایت تھے یہی جانشین شاہ تقی کو [illegible] شاہ فقیر اللہ جو شیخ تقی کی نسل سے تھے اپنے دادا کو انصاری بتاتے ہیں یہ شاہ فقیر اللہ بنور کے انصاری خاندان قاضی فخر الدین سے دامادی کی نسبت رکھتے تھے۔

کبیر داس کا ذکر اس ضمن میں دو وجہوں سے کیا جا رہا ہے اول یہ کہ وہ ذات کے جلاہے تھے

---

[1] لطائف اشرفی۔ ج ۱، ص ۲۹۲

[2] ابوالقاسم فرشتہ۔ تاریخ فرشتہ (اردو) ج ۲ ص ۶۲۳ ـ ۶۲۵

[3] نزہۃ الخواطر، جلد دوم

بنا کر میٹھے پر لادتے بنارس کی گلیوں میں جا کر پھیری لگاتے، جب سندھیا کی بیلا پھوٹتی تو ان کی کٹیا کے سامنے مولسری کے جھنڈ میں مجمع لگتا، چکارے سنبھالے جاتے، کھڑتالیں بجتیں، بھجن گائے جاتے یہ نقشہ برسوں سے قائم تھا، سارے میں میاں کبیر کی شہرت پھیلی تھی، ان کی بانیاں عوام الناس کی زبانوں پر تھیں۔[1]"

صوفیائے عظام میں وحدانیت کا یک مثبت انداز اور تصور ملتا ہے، شریعت کی پابندی سید محمد گیسو دراز میں ان کے معاصرین مشائخین طریقت سے زیادہ امتیازی حیثیت رکھتی ہے، ان کے ملفوظات میں اور ان کے شعری دوسرے صوفی شعرا میں شاعرانہ تلمیحات و استعارات میں غیر اسلامی تصور کا شائبہ تک نہیں ملتا، کوئی بات جو دائرۂ اسلام سے خارج ہو ان سے نکلتی نہ قلم سے لکھی جاتی؛ جہاں قومی وحدت اور یکجہتی کا تصور رواداری اور بقائے باہم کی بنیاد پر استوار کیا جائے وہاں شخصیت سازی اور کردار نگاری کے خمیر میں جدید رجحانات اور عناصر ترکیبی میں غیر اسلامی اجزا در داخل ہو جاتے ہیں۔[2] شاید یہی وجہ تھی کہ کاشی کے پنڈتوں کو [illegible] اور سلطان سکندر لودی کو جو بڑا اکٹر مسلمان تھا یہ خرافات پسند نہ تھی۔[3]

اسلام ہندستان آکر شرک اور رسوم و عقائد سے ملوث ہونے سے بچ نہیں سکا اور تصوف سے وہ تو بھگتی مارگ پر قدم سے قدم ملا کر ہندو بھگتوں کے ساتھ چلنے لگا۔ تیرہویں صدی کے خواجگان کو چھوڑ دیجیے، خرد آباد کے پیر خسرو [illegible] دہلی کے امیر خسرو، دہلی کے نظام الدین اولیا اور نہ جانے کتنے سادھو سنت، بھگت اور خرقہ پوشوں کے ہم آہنگ ہو کر [illegible] شعور شاعری میں قومی جذبات کو اور عوامی تصورات کو ڈھال رہے تھے، اسلام کی مساوات ہندو بھگتوں کو متاثر کر رہی تھی اسلام تو امن پسند صوفی اس دیس میں پھیلا رہے تھے یہاں [illegible] کا ذکر کہاں تک[4] میاں کبیر تو بس یہ کہہ کر چپ ہو جاتے۔

---

[1] قرۃ العین حیدر۔ آگ کا دریا، دہلی ۱۹۸۵ء۔ ص ۱۲۲

[2] مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ پیش لفظ، اسلام اور غیر اسلامی تہذیب۔ [illegible] مساوات اور بقائے باہم کے اصول و حدود کتاب و سنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، تالیف شیخ الاسلام ابن تیمیہ، تحقیق و ترجمہ مولوی شمس تبریز خان۔ لکھنؤ ۱۳۹۸ھ۔ ص ۵ - ۶

[3] آگ کا دریا ص ۱۲۲ [4] ایضاً

'جات جولاہا کیا کرے، ہردے بسے گوپال' یا 'تو بامہن میں کاشی کا جولاہا' بوجھو مور گیانا۔
اس کا گیان جولاہوں کی کبیر پنتھوں کو ملا۔

شیخ خدابخش منڈوی نمد باف اور حریر فروش تھے، کسب حلال اور اکل حلال کا بڑا اہتمام کرتے تھے، صدقہ و خیرات میں ہاتھ لمبا تھا، مہمانوں کی ضیافت میں بھی کوتاہ دستی کا کبھی ثبوت نہیں دیا، ثروت مندی کی زندگی چالیس برس تک گزارنے کے بعد ایک روحانی موڑ آگیا تجرد گزینی کا نشہ ایسا چڑھا کہ خدا کی راہ میں سارا اثاثہ لٹا دیا۔ درویشی کا خرقہ پہن کر معرفت الٰہی کی تحصیل کے لیے ہر صوفی کی خانقاہ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور اہل اللہ سے رجوع کرنے لگے فقر و بے نوائی کا یہ عالم تھا کہ آبادی سے دور ساگر تالاب کے کنارے ایک پشتہ پر ایک بے رونق اور کہنہ مسجد کے تنگ حجرے میں کشایش دل اور کشادگی صدر کے لیے یاد الٰہی میں دن رات مستغرق رہنے لگے اور ۲۲ سال تک اس حجرہ میں عزلت و تنہائی کی زندگی گزار دی، گرچہ آپ کا آستانہ مرجع خلائق بنا شاہ و گدا بھی ہدایت کے لیے آتے اور دعائے خیر کا تحفہ لے کر چلے جاتے دامن حاجت بھر جاتا اور کشکول گدائی پر ہو جاتا، نہ مرید بنانے کا شوق تھا اور نہ دوسرے پیران طریقت کی طرح محفل سماع و سرود گرم کرنے کی لگن تھی، عرس کی رونق نہ دل کو بھاتی اور نہ ہنگامہ پر موقوف ان کے حجرے کی خاموشی خلد تھی۔

شیخ نصیر الدین غازی پوری صوفی سالک، مرد کامل، صاحب کرامت ولی اللہ تھے، رسالہ حرز نبی رز ص ۲۶ پر مولوی نور محمد واعظ ساکن قصبہ بلیا ان کی ایک کرامت کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک پتھر کا سنگین ستون جو ابھی تک ان کی مسجد میں موجود ہے ان کی دعا کی برکت سے دوسرے ستونوں کے برابر ہو گیا جبکہ پہلے یہ بہت چھوٹا تھا، یہ اہل حرفہ میں سے تھے اور شیخ نور باف تھے ان کی پیری، شہرت و زر کمانے کا ذریعہ نہ تھا، اولیائے کرام کی تعلیمات کو تو دبیز غلاف میں دبا کر ان کے مریدین ظاہری نمائش میں ایسے مرشدان کامل کی اس حقیقت کو بھول بیٹھے ہیں۔

شیخ ابراہیم سفید باف اپنے وقت کے درویش تھے، قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی کے مرید تھے اور انہیں کی تربیت میں رہے، جب راہی ملک بقا ہوئے نماز جنازہ مرشد نے ہی پڑھائی اور فرمایا "درویش کا مرتبہ بلند و رفیع دکھائی دیتا ہے" اس کے بعد سے قطب العالم ہمیشہ اپنے مرید خاص ابراہیم کا نام بڑی تعظیم سے لیا کرتے تھے۔[1]

---

[1] لطائف قدوسی ص ۵۰-۵۸

نور باف یا سفید باف اہل اللہ جو موٹا کپڑا بُنا کرتے تھے خود اپنی کفالت اور تصرف کے لیے کرتے تھے لیکن بعضوں کے لیے یہ ذریعۂ معاش تھا۔ پٹن کے شیخ عبدالرزاق طاقی ایسے ہی نور باف تھے جن کی قلب ماہیت ہوئی اور بے خودی ایسی طاری ہوئی کہ پیراہن اتار کر کے درویش[1] بن گئے، طاقی گجرات کے مسلمان بنکروں کی عرفیت تھی۔

بدایوں میں حضرات انصار بڑی تعداد میں آباد تھے اور یہاں اہل علم اور اہل اللہ بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوئے۔ حضرت خورم شاہ بدایونی، شیخ عبدالرزاق طاقی کی طرح مجذوب فقیر تھے۔ ان سے منقول تصرفات اور کرامات احاطۂ قلم میں نہیں آسکتیں۔[2] نواب شمع الدولہ کے زمانے میں مانڈو کے رقص و سرود کے رنگین شہر میں نالین باف شیخ عمر کے ایک صاحبزادے شیخ زاہد بھی درویشی کا خرقہ زیب تن کر کے صاحبِ کشف باطن بن گئے۔ ان سے بھی بہت سارے کمالات منقول ہیں۔

لکھنؤ کے بافندہ خاندانوں میں بھی بڑے صاحب کرامات بزرگ گذرے ہیں، حضرت شاہ برخوردار لکھنوی، سید محمد ہاشم جو شاہ ارزاں عن جونپوری کی اولاد میں سے تھے، ان کے مرید تھے، اسی زمانے میں شاہ کے معاصر محمد قائم نگ بھی تھے جہاں سید صاحب رہتے تھے، شاہ برخوردار کے پاس بیمار روحانی علاج کے لیے آتے تھے اور خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا دی تھی۔ محمد قائم مالک نے اپنے گھر کے پیچھے ایک مسجد بنائی تھی اور شاید پیر محمد بھی کسی بافندے سے پیری تھی۔ شاہ خیراللہ لکھنوی، حضرت شاہ برخوردار کے داماد اور جانشین تھے یہ بھی سسر کی طرح بافندگی کرتے تھے۔[3]

شاہ معصوم بن شاہ بچو لکھنوی، شاہ غلام آفاق لکھنوی کے مرید و خلیفہ تھے۔[4] شاہ آفاق کے مریدین میں سید محمد ہاشم جیسے بلند مقام صوفی درویش لکھنؤ میں موجود تھے، شاہ قادر علی لکھنوی اپنے والد شاہ غلام آفاق کی طرح بُننے کا کام کرتے تھے لیکن جب خود شاہ معصوم کے مرید اور خلیفہ بنے تو سجادہ نشینی نے کر گئے کے شغل سے اٹھا دیا، تسلیم و رضا، توکل اور عجز کی زندگی بسر کرنے لگے۔

---

[1] محمد بن حسن غوثی مانڈوی اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۲۵۱ [2] بحر زخار ص ۴۲، ۲۸
[3] بحر زخار ص ۱۴۴۴ [4] ایضاً ص ۱۴۸۲

شاہ گنج علی فتحپوری ایک راجپوت نومسلم تھے فقر و درویشی میں بڑا مقام پایا اور اپنے عصر کے مشائخ سے کسب فیوض کیا اور ایسا مرتبہ حاصل کیا کہ امراء اور راجگان آستانہ پر حاضری دیتے تھے، بوریا بوں میں رہتے تھے اور ان سے بڑی رغبت تھی، اپنے ہاتھ سے چرخہ پر سوت بُن کر بیچتے اور گزارہ کرتے تھے شام میں قصبہ سے باہر نوربافوں کے ہمراہ جاتے، شاہ صاحب سے بڑی کرامتیں ظاہر ہوئیں، اکل حلال کا بڑا اہتمام کرتے تھے، نوربافی پیشہ ٹھہرا تو لوگ انہیں اصلاً اسی برادری کا فرد سمجھنے لگے تھے، چرخہ بھی خود ہی بناتے تھے کبھی کبھی دستار بنا کر بیچتے تھے، ان کے مرید اور خلیفہ فتحپور (ضلع بارہ بنکی) کے دوست محمد نورباف تھے جو کاروبار چھوڑ کر دن رات اپنے پیر کی خدمت میں رہنے لگے اور مجاہدات اور مرشد کے روحانی فیوض کسب کر کے درویش کامل بنے[1] یہ دونوں تیرہویں صدی ہجری کے اوائل زمانہ میں تھے۔

مئو (اعظم گڑھ، یوپی) کا تاریخی قصبہ ہے، اس جگہ سے بڑے مشہور اہل اللہ اور اہل دین اُٹھے ہیں، ایسے ہی تھے جمال شاہ مئوی، جن کی جوانی ساغر و مینا کی گردش میں گذری، پھر گردش روزگار نے نجانے کس مقام پر لا پھینکا کہ مئو والے بھول گئے، جب سے تو رنگ ہی بدلا تھا، کم گوئی اور کم آمیزی طبیعت ثانی بن گئی، فقیروں کا ایک "سدا سہاگ" فرقہ بھی بنارس، اودھ اور گرد کے اضلاع میں ملنگ بکثرت تھے، انہیں کے ایک پیر روشن علی شاہ کے مرید تھے کچھ اراضی زمین زمینداروں سے حاصل کی، جو ہزاری اور مئو میں امرود کا باغ لگا کر بس گئے لیکن جب حکم و ارشادِ پیر تھا کبھی کسی سے نذرانہ نہ لیا، پرسوا بن کر دستک دی اور نہ باغ کا پھل بیچا، توکل و قناعت کی زندگی بسر کر دی، ان سے ایک زندہ کرامت کے شاہدین خود مئو کے باشندے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں دھوبی پٹ کے برابر دو لکڑیوں کے کندے ندی کے کنارے رکھ دئے تھے، ٹونس ندی کے کنارے پر سیلاب آتے رہے، مضبوط پل بھی ٹوٹ گیا لیکن یہ لکڑے کبھی نہ بہے اور اپنی جگہ پڑے رہے، جمال شاہ کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے والے کئی ہندو عقیدتمندان کے روحانی فیوض سے مسلمان ہو گئے۔[2]

مرشدوں پر بیت اشاعت دین اور تبلیغ اہل اللہ کا مقصد تھا، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے مرشدوں کے ذریعہ خدمت پانے اور سجادہ نشینی کے سبب مشہور رہے، کچھ درگاہوں کے اعراس

---

[1] بحر زخار ۲۲۴۸ [2] دستکار اہل شرف ص ۳۶

کی وجہ سے مرجع خلائق بن جاتے اور خود پیر بن جاتے، لیکن ایسے خاموش قسم کے اللہ والے بھی تھے جنہوں نے خلق خدا کی خدمت کی اور خود تجرد کی زندگی تسلیم و توکل کی بیساکھیوں کے سہارے بسر کرتے رہے اور بافندگی کر کے گزارہ کرتے رہے ایسے ہی تھے مخدوم شیخ بھیکھ کے مرید اور خلیفہ جو جلاہے برادری کے تھے لیکن باطنی علوم میں بلند مقام رکھتے تھے، یہ موضع رام دیہ میں درگاہ سید اشرف جہانگیر (کچھوچھہ) سے ایک کوس کے فاصلے پر دفن ہیں۔

بحر زخار (سنہ ۱۶۹۹ء) میں بنگالہ کے ایک درویش عالی مقام میاں ہدایت اللہ کا تذکرہ ملتا ہے جو کپڑا بُن کر روزی حاصل کرتے تھے اور اس سے اپنے خاندان کی کفالت کرتے تھے۔ شیخ سمار الدین ردولوی جو کچھوچھہ کے سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید تھے وہ شیخ اعلم شیخ احمد ردولوی کی خانقاہ میں ایک بافندہ کو ہمیشہ ان کی خدمت میں پاتے، یہ آسو سوز کے تھے، ان کی توجہ اور تربیت سے آسو سُو کے بافندے ایسے صاحب کمال بن گئے کہ ایک رات آنحضرت صلعم کو خواب میں دیکھا، یہ شرف ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں۔

سندھ اور پنجاب میں فقیر و درویش کو سائیں کہتے تھے، ایک ایسے ہی جولاہے سائیں تھے قطب شاہ لاہوری جن کی طبیعت باطنی تھی، عبادت گذار اور بیدار شب زندہ دار تھے کم سن در کم گو تھے آشوب چشم کا روحانی علاج کرتے تھے، آنکھوں پر دست شفقت پھیرنے سے غلاظت دور ہو جاتی سنہ ۱۴۹۰ء میں فوت ہوئے، یہ سائیں فقیر قوت جلال کے لیے ' ہوا بھی ' کرتے تھے، بشارتیں ان کی زبان سے نکلتیں اور وہ قوت پذیر ہو جاتی تھیں،

یہ تمام احوال صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کے تذکروں میں ملتے ہیں ان میں اخبار الاخیار، سیر العارفین، سیر الاولیاء، حدیقۃ الاولیاء، مرآۃ الاسرار، مسالک السالکین، خزینۃ الاصفیاء، گلزار ابرار، تعریف العارفین، بحر زخار، تاریخ الاولیاء، برکات الاولیاء، تذکرۃ الاخیار فی اسرار الابرار اور اس نوع کی سینکڑوں تصانیف اردو، فارسی اور چند عربی مخطوطات اور مطبوعات کی شکل میں موجود ہیں۔

پندرھواں باب

مومن مجاہدین

عزازیل تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

حکومتِ مغلیہ کی بنیاد اور استحکامِ سلطنت کے سبب ہندوستان میں ایک نئی فکری ثقافتی اور تہذیبی فضا چھانے لگی۔ بانیٔ سلطنت کے فلسفۂ لذتیات "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" نے سہل نگار اور تعیش کوش طبقہ کو آخرت کے محور سے دور رہا پھینکا۔ ہمایوں بادشاہ کا ملک سے فرار اور پھر ایران سے واپسی اس کی سنت سے گریزپائی کا بہانہ بن گئی۔ شیعیت کی طرف میلان پیدا ہوا تو امراء اور درباریوں کا رجحان بھی اسی طرف ہوگیا۔ اکبر کی مذہبی جہالت پر علمائے سُو نے علمیت اور تملق کی قلعی چڑھا کر اسے دینِ الٰہی کا موجد بنادیا مگر یہ کھوٹا سکہ زیادہ دنوں تک نہ چل سکا۔ جہانگیر کی دین سے بے خبری نے اسے بادۂ گلفام کا مُدام تشنہ کام اور نورجہاں کے حسن وجمال کا بندۂ بے دام بنادیا۔ گیسوئے جاناں سنوارنے والا ذہن کی شائستگی کیا کرسکتا تھا۔ شاہجہاں نے اپنی محبت اور شہرت کو لافانی بنانے کے لیے مرمریں سلوں کا سہارا لے کر اور خزانۂ شاہی لٹا کر تاج محل بنایا مگر سیاست کے بے درد ہاتھوں نے اس کے سر سے تاج اتار لیا۔ اسے دین سے زیادہ اپنی تعریف اور تاریخ لکھوانے کا شوق تھا۔ عالمگیر کے دورِ حکومت کے بعد تو سنت کا آخری سد ساز دور ختم ہوگیا۔ شیعیت دربار اور عوام کے اندر قریب آگئی اور سنت دور ہوتی گئی۔ مخلوق سے دور ہونے والے اور فاصلہ پیدا کرنے والے حکمران اللہ سے کیسے قریب ہوسکتے تھے۔ علماء کی بھیڑ تتر بتر ہوگئی تو سازشی امراء اور شیعی بادشاہ گر مغل بادشاہوں کے قریب آتے گئے۔ [illegible] اسی زمانے سے شروع ہوگیا۔

ادھر ——— اجنبی طاقتیں دور سات سمندر پار سے بحرِ بیکراں بن کر ہندوستان کے ساحلوں سے ٹکرانے لگی تھیں۔ مسلمان حکمراں کنارے پر کھڑے اپنے تسلط اور اقتدار کے سفینوں کو بھنور میں پھنستے اور ڈوبتے دیکھ رہے تھے لیکن ان کے پاس سوائے بے بسی، بے کسی، بیچارگی اور درماندگی کے کچھ نہ تھا۔ ان کے ہاتھوں سے ہمت کے پتوار چھوٹ چکے تھے، واماندگیٔ شوق نے رقص وسرود کی محفلوں اور حریمِ ناز و نیاز کی بزم آرائیوں میں پناہ گاہیں ڈھونڈھ لیں، اور

ذوقِ نظر کی تسکین کے سامان پیدا کر لئے، مسجدیں مرثیہ خواں بن گئیں، اور مدرسے بے چراغ ہو گئے "جہاد کی جگہ جمود نے اور حقائق کی جگہ حکایت نے لے لی"[1] ملک و ملت کے مفاد سے زیادہ مصلحت اور سیاست عزیز تھی، جب شکستہ حال رسمی خانقاہوں سے "یا حق" کے نعروں کی بجائے "یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کی آوازیں اور درگاہوں سے "المدد حضرت شاہ......" کی پکاریں آنے لگیں اور اذان کی آوازیں دبتی جائیں اور جب امام بے حضور بن جائے اور نماز بے سرور اور دل سوز سے خالی اور فضا ساز و مطرب کے نغموں سے بوجھل بن جائے تو اسلام کی روح تڑپنے لگتی ہے یہ دنیا سے محبت اور موت سے خوف کا زمانہ ہوتا ہے اور ایسے زمانے میں صدیوں تک سناٹا چھایا رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بعض دفعہ کسی قوم کو یکلخت سزا نہیں دیتا بلکہ اسے راہِ راست پر آنے اور سنبھلنے کا موقع دیتا ہے، یہاں بھی قدرت نے احمد شاہ ابدالی کے وجود میں اپنی یزدانی سنت کو دہرایا۔ مفکرِ اسلام شاہ ولی اللہ نے اپنے خط میں[1] اس طرف اشارۂ بلیغ کیا تھا۔ پانی پت کی جنگ میں مرہٹے مر مٹ گئے، مسلمانوں کو سنبھلنے کا ایک موقع ملا۔ وہ کیا فائدہ اٹھاتے انگریزوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت اور تسلط کو اور مضبوط کر لیا۔ قدرت اب بھی مہربان تھی، مرزانِ ہمت میدانِ جہاد میں آگئے۔ بنگال سے سراج الدولہ نے جمود توڑا۔ جنوبی ہند سے سلطان حیدر علی اور اس کے شیر دل سپوت سلطان فتح علی ٹیپو نے انگریزوں کو للکارا، لیکن دین سے بے خبری، کتاب و سنت سے غفلت، احکام خداوندی کی نافرمانیوں نے کئی قسم کے بیج بو دئے تھے جو وقت کی مسموم فضا میں سازش، فریب اور دغا کے تناور درخت بن گئے تھے۔ "جعفر از بنگال صادق از دکن" انہیں کے سائے میں پرورش پا چکے تھے اور انہیں کی چھاؤں تلے اغیار دم لینے، تھکن اتارتے اور پھر موقع ملتے ہی حملہ آور ہوتے ۔۔۔ اسلام کی روح زخمی پرندے کی طرح تڑپتی رہ گئی اور ایک صدی سے زیادہ یونہی گذر گئی۔ تہذیب ایک نئے موڑ سے گذر رہی تھی، تاریخ کے بھرپور وار سے معاشرے کی قدیم شکستہ دیواریں ٹوٹ رہی تھیں اور تہذیبی روایات و اقدار کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ رہے تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک مسلمانوں کا سارا سوادِ اعظم ماضی کے المیہ کے کرب عظیم سے

---

[1] خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۶۹)۔ احمد شاہ ابدالی کے نام

تڑپ رہا تھا، مسلمانوں کا حال، سکدر تھا اور مستقبل ایک ڈراؤنا اور اندیشناک خواب بن گیا تھا، حکومتِ مغلیہ کے جہانگیری دور میں یہ کرب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے دل میں پیدا ہوا تھا، اسلام کی زبوں حالی، مذہبی روایات کی پامالی، تہذیبی اقدار کی شکستگی اور مسلم معاشرے کی پست حالی اکابرینِ اسلام کے دلوں میں برچھیاں بن کر چبھ رہی تھیں، اہلِ برات کی کمی نہ تھی جو اپنے وقتوں کے مُکمّل تھے اور علم و فضل کے بادشاہ، لیکن اپنی خانقاہوں کے حجروں سے باہر دیکھنے کا یارا نہ تھا، پاکیزہ تصوف کا مسلک جو دورِ عہدِ اکبری میں بھگتی کی آمیزش اور مشرکانہ رسوم کی کثافت سے یکسر مکدر ہو چکا تھا، وقت کے ساتھ عوام و خواص پر انفعالی تصوف کا قلندرانہ رنگ چڑھنے لگا تھا، اقلیمِ خانقاہی ساری کی ساری پیری مریدی اور سجادہ نشینی کے سلسلوں میں جکڑ بند تھی، اور اب یہاں بڑی بڑی کلاہیں بڑھائے پیرانِ تسمہ پا تعویذ کی سوداگری کرتے تھے اور گنڈوں پر پھونک مار کر کشتگانِ پیر کی قسمتوں پر گرہیں لگاتے رہتے، علمائے سُو لہو و لعب کا درس دیتے تھے، مشائخ دنیا پرست اور علمائے ظاہر پرست بڑی بڑی شرحیں اور حاشیے لکھ کر علمی ملغوبہ تیار کرتے جو حلق سے نیچے اترتا نہ تھا یا پھر کسی کی تذلیل و تکفیر کے فتوے پر مُہر لگا کر نذرانہ اور ہدیہ وصول کرتے، یہاں خرقہ پوشوں کی شہنشاہی تھی جب سد سین وقت خود بھی کشتگانِ پیر ہوں اور جس گروہ کے قبضے میں وقت کا بادشاہ ہو اور عوام کا قول ہو تو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

لیکن علماء حق پرست کی بھی کمی نہ تھی، ورنہ کسی دور میں ایسا رہا ہے، مجدد الف ثانی جہانگیر تک صاحبِ عزم تھے، اسی عہد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی موجود تھے اور آگے پیچھے اس زمرۂ عزیمت میں جو بھی تھے شیخ جلال تھانیسری، شیخ وجیہہ گجراتی، کنز العمال کے شیخ علی متقی، علامہ محمود جونپوری، ملا یعقوب کشمیری، مولانا الہداد جونپوری اور ابوایوب انصاریؓ کے نام لیوا قطب الدین انصاری سہالوی جو علمائے فرنگی محل کے انصاریوں کے جدِ اعلیٰ تھے۔ ایسے اکابرِ ملت دینی درسگاہوں اور خانقاہوں میں موجود تھے لیکن مقامِ دعوتِ عزیمت پر صرف شیخ احمد سرہندی ہی کیلئے ڈٹے رہے۔[۱]

۱؎ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، [illegible] ۱۹۸۰ ص ۲۶۴-۲۶۵

حجۃ الاسلام شیخ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دنیائے اسلام کے عظیم مفکر، دانشور اور مجددات تھے، انہوں نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال و انحطاط کا بنیادی سبب اقتصادی و معاشی بدحالی قرار دیا اور مذہبی محرکات اور عوامل کو اس کے تابع اور لازمی نتیجہ بتایا ہے۔ مسلم معاشرہ کے زوال پذیر ہونے کا اصلی سبب شعائر اسلامی سے روگردانی اور علومِ دینیہ سے غفلت بتایا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب مسلمان اپنے شاندار ماضی کو شکوک اور شبہات کا اور علوم دینیہ سے [illegible] کو خالی کر دیتا ہے تو مستقبل مذہبی پستی کی طرف تیزی سے دوڑنے لگتا ہے، اور پھر اسے کوئی نہیں روک سکتا، تاریخ کے ہر نازک موڑ پر دین کو مسلمانوں نے نہیں خود اسلام نے بچایا ہے۔

ان تمام خرابیوں اور برائیوں کی آبیاری عالم نما جاہلوں اور موروثی پیرزادوں اور بے ایمان اور مفاد پرست ارکانِ دولت اور عیش پسند بادشاہوں اور منافق خوشامدیوں کے ذریعے ہوئی ہے[1] صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں، انگریزوں کے ظلم و تشدد سے ہندوستان کی [illegible] کی حیثیت تباہ ہو رہی تھی صنعتکار اور دستکار ایک اجنبی معاشی نظام کی بدولت مفلوک ہو رہے تھے، ایسے میں قائد، درد مند مصلح اور مردِ حق آگاہ کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ نے تمام طبقوں کو خطاب کیا اور خصوصاً اہلِ صنعت و حرفت سے یوں مخاطب ہوئے:

> "ارباب پیشہ دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے، تم اپنے رب کی عبادت سے بالکل خالی الذہن ہو چکے ہو اور تم نے فرضی بنائے معبودوں پر قربانیاں چڑھانے پر تمہارا دارومدار کل بھی کرتے ہو، تم میں جن لوگوں نے [illegible] پیشہ اختیار کر رکھا ہے، یہی ان کی دولت ہے [illegible] لباس اور جامہ اختیار کرتے ہیں، خاص طور سے کھانا کھاتے ہیں اس میں ان کی آمدنی ختم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔[2]

حجۃ الاسلام جیسے عظیم مفکر کے دل میں یہی تڑپ پیدا ہوئی تھی اور یہی درد ان کے دل میں بس گیا تھا جب انہوں نے مسلم معاشرے کو اجڑتے دیکھا، ان کی دلی [illegible] تو تحریک کسی مرد میدان کی منتظر تھی، حالانکہ خود اس فاروقی نسب کے عالی خانوادے میں بڑے پائے کے عالم اکابر ور

۱؎ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ مرتبہ خلیق احمد نظامی ص ۴۲

۲؎ تفہیمات ص ۱۰۱

اساتذہ موجود تھے، خود ان کے صاحبزادے شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ولی اللہی خاندان کے سب سے ممتاز فرد اور خلف الرشید تھے، علمائے حق میں سے تھے، شاہ صاحب کے درس و تدریس کی بادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی، چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر مسجد اکبرآبادی کے ایک حجرے میں بسر کر دی، اسی لیے جب شاہ عبدالعزیز نے ہندستان کو دارالحرب قرار دینے کا فتویٰ دیا تو سید احمد شہید دہلوی کے ہاتھوں میں تھما دیا اور سید صاحب نے تلوار سنبھال لی اور گھوڑے کی باگ ڈور سنبھال لی اور مجاہدین کا لشکر لے کر بالاکوٹ کے محاذ پر پہنچ گئے، ان کے ساتھ ولی اللہ خانوادے کے چشم و چراغ مرد مجاہد اور شہید شاہ اسمٰعیل دہلوی اور ہزاروں علمائے حق پرست تھے۔

سید احمد بریلوی کے یک "نعرۂ محمدیؐ" سے ان کے طریقۂ محمدیؐ کی راہیں کھل گئیں اور کئی شمعیں روشن ہو گئیں، چونکہ اس کا نصب العین توحید پرستی اور شرک کی بیخ کنی تھا جو محمد بن عبدالوہاب نجدی کی "وہابی تحریک" کا بھی مطمح نظر تھا اسی لیے "طریقۂ محمدی" کا نام وہابی تحریک پڑ گیا یہی بعد میں مسلک اہلحدیث بن گیا اس کا پودا ولی اللہیت کی فکری زمین میں لگایا گیا تھا اور ــــ دور تک اس کی جڑیں پھیل گئیں، مقام دعوت عزیمت سید احمد جیسے مرد میدان کا منتظر تھا، مولانا ابوالکلام آزاد حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

> دعوت و اصلاح ... عزیمت و تجدید کے کھنڈروں اور گوشہ کے حجروں میں دفن کر دیئے گئے تھے، اب ... سلطان وقت و سکندر عزم کی بدولت شاہجہان آباد کے ... شاہی مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ برپا ہو گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں کہاں ... دور دور تک زمانے پھیل گئے، جن باتوں کے ... بند ... حجروں سے ... زبانی تک ... تھی، وہ اب سر بازار کی ... اور ... عزیمت و ہدایت سے ... دعوت کو نقوش دیوار بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے۔" [1]

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد: تذکرہ، مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۷۲

سید احمد شہید کی شخصیت کچھ ایسی پُرکشش تھی کہ جو دیکھتا پروانہ وار آن کر ان پر گرتا جو ان کی باتیں سنتا اس کا شرحِ صدر ہو جاتا جہاں جہاں وہ جاتے ایک خلقت ان کے نقشِ قدم پر چلتی، علماء، حکام، جاگیردار اور غریب پیشہ ور ننگے پاؤں ان کی پالکی کے ساتھ دوڑتے چلتے، پٹنہ ہوتے ہوئے جب وہ بغرضِ حج کلکتہ پہنچے تو ایسا زبردست ہجوم اکٹھا ہوا کہ انہوں نے اپنا عمامہ کھول کر پھیلا دیا جس نے جہاں بھی ہاتھ رکھا اس کی بیعت ہو گئی[1] بنگال کے تانتی بنکر جو ۱۸۱۰ء سے مشرقی بنگال میں فرید پور کے حاجی شریعت اللہ اور اُن کے جانشین دودو میاں کی فرائضی تحریک سے وابستہ تھے اب سید صاحب کے فدائی بن گئے، حاجی شریعت اللہ کو جولاہوں کا پیر کہتے تھے[2]

اکتوبر ۱۸۲۳ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر جب سید صاحب بمبئی میں کچھ دن ٹھہرے تو ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں کا ہجوم اکٹھا ہو جاتا تھا شہر کے ممتاز تاجر خاندان کے عالم محمد علی مُرگھے کو انہوں نے اپنا خلیفہ بنایا، بمبئی کی مخلوط آبادی میں جہاں مختلف خیال و عقیدہ کے مسلمان بستے تھے اور جہاں مغربی تہذیب سے مرعوب تر طبقہ کو اپنا کاروباری مفاد اور [illegible] عزیز تھی وہ ایک ایسی تحریک کی جس کا نصب العین صرف توحید پرستی ہی نہیں بلکہ انگریزوں کے خلاف جہاد تھا وہ بھلا کیسے حمایت کر سکتا تھا، سید صاحب کے سامنے [illegible] کچھ اور تھے۔

سید احمد بریلوی کی اور ان کے خلیفوں کی زبردست تبلیغ و ارشاد سے چاروں کھونٹ توحید کے علَم لہرانے لگے، ہزاروں بندگانِ خدا کو ارکانِ دین کی تعلیمات نے شرک و بدعت سے رہائی دلائی، فضول اور لغو رسموں سے متنفر کر دیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے تو جہاد کی نیت سے وہ میدانِ وغا میں بے خطر کود پڑے اور دادِ شجاعت دی، یہ بے نوا، بوریا نشین، یہ ذاتِ باری کے عاشق اپنے گھروں سے یہ آرزو لے کر نکلے کہ اللہ کے راستے میں قربان ہو جائیں، یہ لوگ جب پہرہ دیتے وقت اگر ایک دوسرے کو آواز دینا چاہتے تھے تو ایک کہتا "سبحان اللہ" دوسرا جواب میں کہتا "الحمد للہ" تیسرا سنتا تو اس کی زبان سے بے اختیار "سبحان اللہ" نکلتا اور چوتھا یہ سن کر بیقرار ہو جاتا اور اس کی زبان سے یہ صدا "یرحمکم اللہ" کی دعا نکل جاتی[3] قرآن و حدیث اور تاریخ

---

[1] W. W. HUNTER, THE INDIAN MUSULMANS, P. 13 (LONDON 1871) صادق حسین (اردو ترجمہ) ہمارے ہندوستانی مسلمان (لاہور ۱۹۴۴ء)

[2] RAFIUDDIN AHMED, THE BENGAL MUSLIMS (1871–1906), Oxford Un. PRESS DELHI, 1988, P. 46

[3] فیض عالم، اختلافِ امت کا المیہ، ص ۱۴۲، ملتان ۱۹۷۹ء

کی زبان میں یہ مجاہدین کے نام سے مشہور ہوئے ان میں بنگر افراد کی تعداد کم نہ تھی۔ بالاکوٹ
کے معرکے میں (۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶/۲۲ جنوری ۱۸۳۱) کو سید احمد بریلوی اور ان کے رفیق
مردِ مجاہد شاہ اسمٰعیل شہید ہوئے لیکن غازیانِ اسلام میں اتنی تقویت الایمانی پیدا ہو چکی تھی
کہ برطانوی استعماریت کی چولیں ڈھیلی پڑنی شروع ہو گئیں۔ تحریکِ جہاد کا یہ جذبہ اس کے بعد
تک جماعت ولی اللّٰہی میں زندہ رہا ۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی، شاملی کی جنگ اور پھر اس کے
شیخ الہند اسیرِ مالٹا کی تحریک، جس کے نتیجے میں برصغیر انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا اسی
تحریک کا نتیجہ اور اسی جذبہ کا ثمرہ تھا۔"[1]

وہابی تحریک اور بنگر طبقہ

سقوطِ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین اور غازیان کے جذبۂ جہاد میں اور جوش پیدا ہو گیا اور تبلیغ و
ارشاد کا جوش اتنا بڑھا کہ سارے ہندوستان میں گویا تسبیح کے دانوں کی طرح پھیل گئے لیکن
توحید کا یہ امتیں ہاتھ سے نہ چھوڑا ہر چند کہ ہاتھ قلم ہوئے لیکن قلم پھر بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ شاہ
اسمٰعیل شہید دہلوی کی شرک و بدعت کے خلاف ہنگامہ خیز تصنیف تقویۃ الایمان جب منظر
عام پر آئی اس کے خلاف تصنیفات کے ہزاروں قلم مدعیانِ سنت اور مبتدعین کے ہاتھوں میں
چلنے لگے اور دشنام و اتہام کی زبانیں کھل گئیں، وہابیہ معتزلہ، اسمٰعیلیہ، مرتدیہ، مترغین اور شیاطین
امجدیہ جیسے مبتذل اور رکیک القاب سے ان حق پرستوں کو نوازا گیا، ان مبلغین، مصلحین اور
مجاہدین میں بوریا نشین بھی تھے اور مسند نشین بھی، گدڑی پہ کام کرنے والے نواب بھی تھے اور
[illegible] زمینداروں اور جاگیروں کے مالک بھی تھے جو سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر قلندرانہ وار اس
تحریک جہاد و تبلیغ میں اللہ کھڑے ہوئے، کتاب و سنت سے تمسک کرنے والوں کو حق نے جس
مذہب [illegible] کا راستہ دکھا دیا۔ اسی پر "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کا شعار پا کر چل پڑے جس مسلک کو جزوں
سے حق سمجھا اس کے سہ غرض نہ ملنے دیا اس امر سے سروکار نہ رکھا کہ ان کے حق میں کسی نے
کلمۂ تحسین کہا یا نہ کہا، نہ طعنہ اغیار کا شکوہ نہ حکومت کے استبداد کی پروا۔
وہابی تحریک جنگل کی آگ کی طرح پھیلی اور بدعات و مشرکانہ رسوم کو جھلسانے لگی؛

---

[1] [illegible] تحریک [illegible] شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی اور فکری تحریک [illegible] صفحہ ۲۲-۲۳

حکومت اور اغیار کے سینوں میں حسد اور جلن کی آگ بھڑک اٹھی اور ہر جگہ ان کی مخالفت کے شعلے اٹھنے لگے، مشرقی بنگال میں پچھلے پچیس برس سے اسی کی مماثل فرائضی تحریک نے رد بدعات و شرک میں بڑی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں، جو لاہور کے پیر حاجی شریعت اللہ کے انتقال (۱۸۴۰ء) کے بعد پیرزادے دودو میاں نے تحریک کی باگ ڈور سنبھال لی، آپ نے مشرقی بنگال کے علاقے میں اسلامی طرز پر پنچایتیں قائم کیں اور آخر میں "الارض للہ" کا نعرہ بلند کیا، ان کی تحریک کو فرائضی تحریک بھی کہتے تھے۔ وہ فرائض کی بجا آوری پر بڑا زور دیتے تھے، مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی زبیری کا خاندان "این خانہ ہمہ آفتاب است" کے مصداق تھا، مولانا ولایت علی کو سید صاحب نے سرحد سے بغرض جہاد و تبلیغ دکن کی طرف بھیج دیا۔ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۳۰ء میں مولانا ولایت علی بمبئی آئے یہاں انہوں نے اپنے مواعظ میں مولود شریف کی مجلسوں کو شدید تنقید بنایا، اور نذر و نیاز کو بدعت ٹھہرایا جبکہ یہ سب یہاں کے مسلمانوں کی [illegible] کا خاصہ بن گئی تھیں، سید عبدالفتاح الحسینی القادری عرف سید اشرف علی گلشن آبادی [illegible] جو وہابیوں کے خلاف مجمع الاخبار (بمبئی) میں باقاعدہ مضامین لکھتے تھے اپنے مریدوں کی تعریف میں قلمطراز ہیں:

> "پوشیدہ نہ رہے کہ پچیس برس ہوئے کہ حضرت سید احمد بریلوی [illegible] کہتے تھے اور حضرت سید امان شاہ صاحب کے پوتے ہیں اور ایک قوم [illegible] حضرت شاہ [illegible] ڈھونڈھا ان کے ابا دیو سے ہیں حج ادا کر کے شہر معمورہ بمبئی میں ۱۲۴۳ھ میں تشریف لائے...... ان کی برکت سے بہت لوگوں نے ہدایت کی نعمت پائی اور یہاں بھی بہت لوگ ان کے سلسلے کے فیض سے [illegible] بعد اس کے ۱۲۴۵ھ ہجریہ مقدسہ میں مولوی ولایت علی خلیفہ آپ کے خلیفہ سید احمد کا یہاں آنا اور نئی بدعتیں برپا کیں [کذا] یہاں کے رئیس وغیرہ مسلمان لوگ بیٹھے مولود شریف کی مجلسیں کرتے ہیں خصوص [ف] ربیع الاول کے مہینے میں ہر ایک رئیس کے یہاں نیاز کے کھانے پکتے ہیں ہزار ہا آدمی نیاز پاتے ہیں بلکہ شادی وغیرہ میں بھی مولود شریف کی مجلس ہوتی ہے نعت کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال محبت سے جو ایمان کا شعبہ بلکہ عین ایمان ہے سلام کے وقت سب تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں اور دست بستہ ہو کر ادب سے درود و سلام پڑھتے ہیں اور مولانا شاہ عبدالعزیز مولود شریف کی مجلس بڑی دھوم سے کیا کرتے تھے یہ بات مشہور

تھی مگر مولوی ولایت علی مذکور نے ان کاموں کو برا کہنا شروع کیا آخر بلوائے عام
ہوا لکھنؤ تا حضرت مولوی عصام الدین صاحب اور حضرت مولوی روح اللہ صاحب
اور حضرت مولوی محمد صالح بنارسی رحمہم اللہ کی سعی و کوشش سے یہ فساد مٹ گیا اور
ولایت علی یہاں سے شب شب بھاگ گیا چنانچہ کسی رئیس نے "ویرد گریخت" (۱۲۴۵) اس لفظ میں اس
کی تاریخ نکالی ہے بعد ازاں کلکتے و بنارس سے ان لوگوں کے نائب یہاں آنے لگے[1]

مولانا ولایت علی حیدرآباد، برہانپور، سیونی، نرسنگھ پور اور جبلپور سے ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے۔ اس کے بعد بنگال، اڑیسہ اور الہ آباد میں دعوت و تبلیغ و ارشاد کا منظم سلسلہ جاری کیا۔ آپ کی تبلیغ کا انداز نرالا تھا، جولاہوں کی کھڈیوں پر پہنچے، کسانوں سے کھیتوں میں ملے اور دیہاتیوں کی دشنام طرازی سے بددل نہ ہوتے۔ بمبئی میں مولوی محمد قاسم تحریک کے مبلغ تھے اور بعد میں مولانا سلیمان نے جو بھیونڈی کی درسگاہ کے فارغ تھے تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔ مولانا ولایت علی غدر کے بعد گجرات میں وہابی تحریک کے داعی بنے۔ بعد میں کشمیر کے وہابی مولوی حضرات گجرات کے منکر طبقہ حاتی میں تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے، مولانا لیاقت علی نے جنہوں نے غدر کے زمانے میں بڑے کارنامے سرانجام دیئے تھے فرضی نام سے گجرات میں تبلیغ کرتے رہے اور بڑی کامیابی حاصل کی۔[2]

سانحہ بالاکوٹ کے المناک واقعہ کے بعد مبلغین کی جد و جہد سے تب دست سے تحریک کے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ بنگال میں بڑھ گئی۔ یوپی سے لے کر پنجاب تک قال اللہ قال الرسول کی صداؤں سے ساری فضا گونجنے لگی تھی۔ مئو ضلع اعظم گڑھ میں قصبہ مبارکپور کے نواح میں آلہ تہور قصبہ مجاہدین بالاکوٹ کا مرکز بن گیا تھا۔ شیخ امیر غازی احمدی، شیخ الٰہی بخش احمدی اور شیخ جہانگیر غازی احمدی تحریک جہاد کے سرگرم افراد، غازیوں اور مجاہدین

۱۔ [illegible] ۱۳۴۴ھ، ص ۱۳۰ – ۱۵۰، رجال المتداولہ

۲۔ [illegible]

Momin Mohiuddin, Muslim communities in Medieval Konkan, Indian Council of Historical Research
New Delhi (Uni Press) 1994

میں سے تھے، سید صاحب کی امارت، امامت اور قیادت میں حدود وافغانستان میں پانچ برسوں تک یہ مجاہدین سرگرم جہاد رہے جب بالاکوٹ میں ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں سید احمد اور مولوی شاہ اسمٰعیل دہلوی نے جام شہادت پی لیا، تو ان مجاہدوں کی بزم رزم اُجڑ گئی، ان میں سے کچھ اس علاقے میں رہ گئے اور کچھ لوگ وطن لوٹ آئے، شیخ محمد اکبر غازی الموی وطن سے ایسے نکلے کہ پھر لوٹ کر خبر نہ لی، مفقود الخبر غازی کی خبر چند سطروں سے زیادہ نہیں ہے۔ شیخ ابو الحق الموی نے اثنائے جہاد میں 'اَلتَّوَلِّی یَوْمَ الزَّحْف' کا ارتکاب کیا اور موناپس آگئے، نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ان کی امامت سے بچتے تھے یہ شیخ جہانگیر کے بیٹے مولانا عبد الحق الموی مشہور علماء میں سے تھے جو علامہ ابو محمد عبد الحق اعظم گڈھی کے نام سے مشہور ہوئے، یہ اپنے والد، اساتذہ اور شیوخ کے نقش قدم پر تحریک آزادی میں بڑی بیباکی اور جرأت سے حصہ لیتے رہے، ۱۳۳۸ھ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا قدس سرہٗ کا فتویٰ ترک موالات جب جمعیۃ العلماء ہند نے بعد میں متفقہ فتویٰ کی حیثیت سے پانسو علماء کے دستخط سے شائع کیا اس میں مولانا عبد الحق کا دستخط بھی ثبت تھا، پنجاب زندگی میں گرفتار رہے اور نفس بند زندگی میں رہے۔[۱] مبارکپور کے مولانا حافظ خدا بخش مہاجر مکی کے والد بابو حسن جو ایک نڈر اور جری تھے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا اپنے دروازے پر انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا اور اسی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، کمشنر مبارکپور کے قریب ۱۸۵۷ء میں لوگوں نے لوٹ مار مچادی تھی۔

مئوناتھ کے مولوی عبد اللہ جھاؤ نے املو کی بستی کو مرکز بنا کر اہل حدیث کو فروغ دیا۔ تراجم علمائے اہلحدیث میں مولانا عبد الستار کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بھی اعظم گڈھ تشریف لائے اور موضع املو میں مقیم رہے اور یہاں جماعت اہلحدیث کو مستحکم کیا پھر آسام و بنگال کا قصد کیا، اس مسلک کے متمسکین اور اساتذہ وشیوخ میں اس ضلع کے کئی ایسے علماء ہیں جو عالم اسلام میں شہرت کے آسمانوں پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے ان میں حضرت مولانا ابو العلی

---

[۱] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۲۶، ۲۷

[۲] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، تذکرہ علماء اعظم گڈھ، جامعہ اسلامیہ بنارس ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ، ص ۱۳۰-۱۳۱

عبدالرحمن محدث مبارکپوری، حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارکپوری، حافظ عبداللہ غازی پوری (بلیۓ ولادت مئو ۱۲۶۲ھ) اور کئی علماء و فضلاء شامل ہیں۔ ان کا ذکر محدث جلیل حضرت مولانا الحاج ابوالمآثر حبیب الرحمن اعظمی نے دستکاران شرف کے حصہ اول تذکرہ نساج صحیح میں کیا ہے۔ ان کے علاوہ مسلک اہلحدیث کے اساتذہ اور شیوخ میں مولانا احمد مئوی، مولانا عبیداللہ رحمانی (شارح مشکوٰۃ) اور عصر حاضر کے مشہور علماء و فضلاء کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مشرقی بنگال سے جولاہوں کی بڑی تعداد سب کچھ تج کر سید صاحب کی مہم بالاکوٹ میں شامل ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ وہابی تحریک کا زور یہیں تھا۔[1]

جذباتی جولاہا

جولاہوں کا نام وہابی تحریک اور جہاد کے ساتھ ایسا جُڑ گیا تھا کہ کہیں بھی شورش کی چنگاری بھی اٹھتی تھی جس کی نوعیت نہ بغاوت کی تھی نہ جہاد کی لیکن جولاہوں کو ضرور ملوث کر دیا جاتا بمصداق

جب کوئی فتنہ زمانے میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

برطانوی سامراج کو ہندستان میں اگر کسی سے خطرہ تھا تو صرف مسلمانوں سے اور مسلمانوں میں وہ سب سے زیادہ خطرناک جولاہوں کو سمجھتے تھے۔ خاص طور سے دیار پورب کے اضلاع اعظم گڑھ وغیرہ پر ان کی کڑی نظر رہتی تھی۔ تھوماسن نے ضلع اعظم گڑھ کے بندوبست اراضی کی رپورٹ ۱۸۳۷ء میں لکھی ہے کہ مبارکپور، مئو، کوپاگنج اور اطراف و جوانب کے جولاہے گو بظاہر دیکھنے میں صورت کے اور کمزور نظر آتے ہیں لیکن ان کے پاس آتشیں اسلحہ ہیں اور وہ اتنے جذباتی اور تند مزاج ہیں کہ ان کے مذہبی جذبات کو ذرا سی ٹھیس پہنچنے پر وہ بھڑک اٹھتے ہیں اور ادھر کچھ دنوں سے جب سے سید احمد بریلوی کی وہابی تحریک پھیلی ہے یہ جولاہے کچھ اور زیادہ ہی شورہ پشت ہو گئے ہیں۔[2] بعد کے انگریز مورخین جنہوں نے زراعتی نقطۂ نظر سے اس علاقے کی تاریخیں لکھی

[1] معین الدین احمد۔ بنگال کے مسلمان، (انگریزی)، صفحہ ۴۶۔۴۷

[2] Thomason, Report on the Settlement of Chuklah Azamgarh &c (Agra, 1837) P.130

میں یہی تاثرات پیش کرتے ہیں کہ ان میں تصنع ہے اور بزدلانہ صفت، شدت اور جتھ بندی کی عصبیت ہے۔[1] مبارکپور میں انیسویں صدی میں فرقہ وارانہ اور مذہبی فسادات کا جو ایک سلسلہ لامتناہی ۱۸۱۳ء، ۱۸۳۲ء، سنہ ۱۸۹۴ء اور سنہ ۱۹۰۴ء تک جاری رہا ان ناگوار حالات کے تناظر میں قصبہ مبارک پور کو فتنہ و فساد کا گڑھ تصور کیا جانے لگا، آس پاس کے غیر مسلم اس قصبہ کے باشندوں کو دشمن سمجھنے لگے اور ان کے بارے میں معاندانہ ذہنیت کام کرنے لگی۔[2] اعظم گڑھ گزیٹیر (صفحہ ۱۱، سنہ ۱۹۱۱ء) میں ہے کہ قصبہ کی آبادی زیادہ تر جذباتی جولاہوں پر مشتمل ہے اور مذہبی منافرت و عداوت کی آگ ان میں اور قصبہ کے اطراف و جوانب کے ہندوؤں میں ہمیشہ سلگتی رہتی ہے، اور ذرا سا تصادم ایک بڑے جنگ میں بدل جاتا ہے اور خطرناک فساد پھوٹ پڑتا ہے۔

اس جذباتیت کے پس پردہ تاریخی محرکات، معاشی عوامل، مذہبی جذبات اور سیاسی سازشیں تھیں، کچھ تو انگریزوں کے استبداد نے اس طبقہ کی غیرت اور حمیت کو دبا رکھا تھا، اس پر مزید یہ ستم کہ ان کی صنعت پارچہ بافی کو تباہی کا کفن پہنا دیا تھا، رہا سہا جو تانا بانا رہ گیا تھا اس میں مہاجنوں کے قرضوں اور دلالوں کے تقاضوں کی گرہیں لگی ہوئی تھیں، معاشی بحران اور سماجی ہیجان نے انگ بے جان کر رکھا تھا، لکھنؤ، بنارس، مئو اور مبارکپور کے بنکر اور کتائی تانی بننے والے معاشی مسائل سے دوچار تھے اور مفلوک الحالی کے سبب لاچار، بلیا اور غازی پور کے بنکر بھی انگریزوں کی نظروں میں شوریدہ پشت تھے۔

مذہبی فتنوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں شیعیت اور سنت میں تخالف اور تصادم محرم کی خصوصیت بن گیا تھا، سب سے پہلے یہاں نوابان اودھ کے زمانے میں تشیع کا درود ہوا، ایک صدی سے کچھ کم مبارک پور اور اعظم گڑھ پر ان کی حکومت رہی، ان کا دور لہو و لعب سے ہنگامہ خیز اور شیعیت کی تبلیغ و اشاعت سے اشتعال انگیز رہا، ہر شیعہ حکمراں

---

[1] William Crooke, The tribes and castes of the North Western India. Vol. III (Delhi 1875) P. 70

[2] گیا متدر پانڈے (انگریزی)۔ ایضاً

شیعیت کا علمبردار تھا اور پُرجوش داعی اور مبلغ، نواب آصف الدولہ (۱۱۸۷ھ تا ۱۲۱۲ھ) نے شیعیت کو سب سے زیادہ فروغ دیا، انہی کے نائب حسن رضا خاں کی کوششوں سے ہزاروں سنی خاندان سیاہ لباس پہن کر عزاداروں میں شامل ہو گئے اور سنت کا ماتم ہونے لگا، اہل سنت بھی اپنی شناخت بریلیت سے برقرار رکھتے رہے اور اختلافی امور میں جیسے تبرا اور تولا کا دستور تھا وہ اپنے موقف پر ڈٹ کر رہتے اور مقابلہ کرتے۔ نوربافوں کا مسلکی تنازعہ اور عام مسلمانوں کا شیعوں سے اختلاف اور ہندو مسلمان مذہبی اور فرقہ وارانہ فسادات یہی تمام محرکات تھے جنہوں نے نورباف طبقہ کو ذہنی انتشار سے دوچار کر رکھا تھا، [illegible] ان فسادات میں سب سے زیادہ انہیں مقتولوں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹتا اس لئے ان علاقوں میں اکثریت نوربافوں کی ہی تھی اور یہی عددی حساب سے سب سے زیادہ نقصان اٹھاتے تھے، انہیں کے گھر جلائے جاتے اور یہی مارے جاتے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں محمود آباد کی تحصیل (مئو اور مبارکپور) میں گو امن بحال رہا لیکن دوسری جگہوں کے جلاہوں کی شرکت جہاد سے انگریزوں کو انہیں نقصان پہنچانے کا موقع مل گیا یہاں تک کہ دس ہزار جلاہوں کا سارا تیار کیا ہوا مال جو بیچنے کے لیے "گندریوں" (گجریوں) اور منڈیوں میں بھیجا گیا تھا لوٹ لیا گیا، لیکن محمد تقی تعیند نے انہیں روک کے رکھا۔ اکثر اوقات ان فسادات میں یہ بھی ہوا کہ نورباف محصورین بن جاتے یہی سارے وجوہ تھے کہ ان کا معاشرہ تغلل پذیر بن چکا تھا، تعصب کے عام مسلمانوں میں تمام تلخ تجربات نے حفاظت خود اختیاری اور دفاع کا احساس دلا دیا تھا، اس جذبہ خود دفاعی مزید اور بہادری کا خوشگوار نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہر قسم کی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ رہتے تھے۔ ان کا ذہن لڑائی جھگڑے سے مانوس ہو گیا۔[2]

دوسرے علاقوں میں بھی نورباف کا طبقہ یعنی بافت بندی، تجارت گروہی حیثیت سے مشغول مذہبی اور تجارت کے لئے معروف تھا خصوصاً یادوں کے نام پر تو نوربافوں کا ایمان گرم خون بن کر ان کی رگ رگ میں دوڑنے لگتا تھا، یہی سب کچھ ایودھیا میں ہوا۔

مسجد جنم استھان گڑھی کا واقعہ واجد علی شاہ کے رنگین دور کی تاریخ کا خونچکاں باب ہے[1] اور

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری: تذکرہ علمائے مبارکپور، ص ۳۱-۳۲، اور گیانندر پانڈے (انگریزی)، ص ۱۱۷

[2] رئیس احمد جعفری: نواب واجد علی شاہ اور ان کا عہد

تاریخ کا قلم ابھی تک اس داستان کو لکھے جا رہا ہے، اس واقعہ کا تفصیلی ذکر "گم گشتہ حالات ایودھیا" (ص ۲۵ ۔ ۱۵۰) میں موجود ہے، یہ خونیں اوراق گم نہیں ہوئے اور ان شہیدوں کے خون کا رنگ پھیکا پڑا ہے جنہوں نے دین کے راستے پر اپنی جانیں قربان کیں، اس سارے سانحے میں حکمراں طبقہ کی بدعملی اور نااہل اہلکاروں کی سازش کا عمل دخل تھا، یہ غدر سے دس برس قبل کا واقعہ ہے، جب بھی دین کا معاملہ ٹھہرا "اشتعلا لله" کھڑا ہوا تب کر طبقہ کے نوربافوں نے ہی آگے بڑھ کے سینہ سپر ہو گئے، بابری مسجد کے پاس ہنومان بیٹھک کے ٹیلہ پر جو ویران اور بیکار پڑا تھا شہنشاہ عالمگیر نے ایک مسجد بنوا دی" ۔ نواب ملک کے زمانے میں بیراگیوں نے اس مسجد کو شہید کر دیا مگر عوام کی شورش پر حکومت نے ازسرنو مسجد کی تعمیر کرا دی اور اس کے نگراں قاضی محمد عاشق فیض آبادی مقرر کئے گئے، راجہ درشن سنگھ نے واجد علی شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی حکومت کی پروا کئے بغیر اس مسجد کو پھر گرا دیا اور بیراگیوں نے ہنومان گڑھی نئے سرے سے تعمیر کرائی، اور ایک قدم آگے یہ اور بڑھایا کہ مسجد بابری کے آگے جو سیتا جی کی رسوئی کہی جاتی تھی اس جگہ ایک صنم کدہ بنا دیا، ان واقعات نے اودھ میں عام خودسری پیدا کر دی اور نذر بیراگیوں کے عام گھاٹ کی مسجد کی بے حرمتی کر ڈالی۔[۱]

۱۱ ذی قعدہ ۱۲۶۱ھ میں اس واقعہ نے ایک خونیں موڑ لیا، شاہ غلام حسین اور مولوی محمد صالح فیض آبادی جو اس مسجد کو درست کرانے میں شریک رہ چکے تھے دو سو آدمیوں کے ساتھ نماز ادا کرنے گئے، تو راجہ درشن سنگھ کے اشارے پر متعینہ فوج ان پر ٹوٹ پڑی، شیعہ حکام مسلمانوں کا قتل دیکھتے رہے اور مجاہدین کے پرخچے اڑتے رہے اور یہ عرفی شیرازی کے اس شعر کے مصداق یہ دل لبھانے والا تماشا دیکھتے رہے:

> بجرم عشق تو مارا کشند غوغائیست
> تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

راہِ حق کے مجاہدوں نے دین کے لئے سر کٹا دیا تھا ۱۳۰ نفوس شہید ہوئے تھے ان میں غلام حسین اور فیض آباد کے نورباف تھے۔ شیخ انگو نورباف کا نام سب سے نمایاں ہے

---

[۱] دیکھیے ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات (ص ۲۳۹) مخطوطہ ۱۱۵ در بیان اطلاع نامہ امیر علی۔ ناقل مرتب نے اس مخطوطہ پر ایک سیر حاصل نوٹ لکھا ہے تاریخ اودھ وغیرہ میں بھی اسکی تفصیل ہے۔

اور شاہ عثمان شہید کی شہادت کا واقعہ آج بھی ان کے مزار پر جو محلہ کمال الدین ادیا رفیض
آباد میں غوثی نورباف کے مکان کے پاس ہے ۲۷ رجب کو عرس منا کر یاد کیا جاتا ہے۔

مولوی سید امیر علی شاہ نے ایک منظوم درخواست "اطلاع نامہ" کے عنوان سے لکھ
کر (۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء) کو شاہ اودھ کو حقائق سے مطلع کیا درخواست رد کر دی گئی"
پھر مولوی عبدالرزاق فرنگی محل (لکھنؤ) کے دستخط سے ایک فتوائے جہاد صادر ہوا اس
کے نتیجے میں شہر میں کھلبلی مچ گئی جہاد کو روکنے کے لیے واجد علی شاہ نے سیاست کا سہارا لیا
نواب احمد علی خان، مولوی غلام جیلانی، مولانا غلام امام شہید، مولانا فضل حق خیرآبادی
صدر الصدور لکھنؤ، پنچ مقرر ہوئے، واجد علی شاہ کے کاسہ لیس اور حاشیہ بردار راجاؤں
اور خطاب یافتہ امیروں نے تفتیش کر کے حق نمک ادا کر دیا اور ناحق یہ لکھ دیا کہ وہاں مسجد
کبھی بنی ہی نہ تھی اعلان عام ہو گیا ادھر مفتی سعد اللہ نے امیر علی شاہ کے خلاف قتل کا
فتویٰ دے دیا، دوسرے مفتی محمد یوسف نے اشاعت کرا دی کہ جو امیر علی کا ساتھ دیگا
وہ جہنمی بنے گا' جب یہ وعید بھی کام نہ آئی تو انعام و اکرام اور خلعت و بخشش سے کام
لیا گیا مگر جہاد کا نعرہ گونجتا رہا، پھر بڑی حقارت سے یہ کہا گیا کہ یہ گنتی کے فقیر جولاہے
خود اپنا گڑھا کھودنے نکلے ہیں الگوں کی طرح ان کی قبریں بھی یہیں بنیں گی' مگر الٹی
ہو گئیں سب تدبیریں، مگر ذات باری کے ان عاشقوں نے کوچہ معبود میں پہنچ کر اس کے
حضور سر جھکا دیا اور سر کٹا دیا انگریزی دستے کے سالار نے ان کو نشانہ مشق بنا لیا

"مجاہدین مسجد پہنچنے میں مصروف ہوئے ٹیکری پر سے بارود نے توپوں کے
دہانے کھول کر ان کو بھون کر رکھ دیا ۲۵۰ نفوس گھنٹہ بھر میں شہید ہو گئے، شاہ
صاحب بھی کام آئے ان کا سر اتار کر علی نقی کے پاس بھیج دیا گیا [1]
شہیدوں کی لاشیں قریب و جوار کے مسلمانوں نے دفن کیں'

ان قربانیوں کی صداقت نے بڑھ کر فیض آباد اور گونڈہ کے زرباف خاندانوں کو خوف اور دل
شکستہ بنا دیا تھا یہی لوگ تھے جنہوں نے غلام حسین اور سید شاہ امیر علی کا ساتھ دیا تھا ان کے
چند دار و گیر کا نشانہ بنے پھر وہ لوگ جو جہاد سے فرار اختیار کر کے روپوش ہو گئے تھے اپنے خاندانوں

---

[1] ڈاکٹر جمال احمد ندوی، کتب خانہ جامع مسجد کے مخطوطات ص ۲۲۳-۲۲۲۔ اطلاع نامہ امیر علی

اور رشتہ داروں کو لے کر نکل پڑے، انیسویں صدی کے پہلے نصف تک کلکتہ اور بمبئی دو ہی
شہر تھے جہاں معاش کے ذرائع اور وسائل کشادہ تھے، شمالی ہند کو مغربی ہند سے ملانے کے لئے
بمبئی آگرہ روڈ کی بنا ڈالی جا رہی تھی سفر حربوں اور صعوبتوں سے پُر تھا، لیکن وہاں میں امن کا
دور چل رہا تھا، اسلئے مجبور اور مفرور ہندوں کو یہیں پناہ مل سکتی تھی، اس طویل شاہراہ پر جبلپور
ناگپور، کامٹی ، برہانپور، بھساول، مالیگاؤں، بھیونڈی اور بمبئی صنعت پارچہ بافی کی پناہ گاہیں
تھیں، مہاجرت کا سلسلہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء سے شروع ہوا اور کئی برسوں کی مدت پر پھیل
گیا، اولین قافلے میں فیض آباد، ٹانڈہ اور اجودھیا کے وہ انصاری تھے جو اجودھیا کے جہاد اور
ہنومان گڑھی کے معرکے میں شامل تھے، کچھ بمبئی تک جا پہنچے یہاں بسنے والے ٹانڈہ کے دو خاندانوں
کے نام ملتے ہیں، سردار حافظ عبداللہ اور سیٹھ عبدالباری[1] مالیگاؤں کے انگنو سیٹھ اور ظہور جانی بھی
اثنائے جہاد میں میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے ، مالیگاؤں پہنچے تب سورۂ انفال کی یہ آیت:

"اے ایمان والو! جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلے
میں پیٹھ نہ پھیرو، جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری تو وہ اللہ کے غضب میں گھر
جائیگا" (الانفال: ۱۵)

— انگنو سیٹھ کو یاد آگئی تو انہوں نے اس کا کفارہ نیکیوں اور اعمال صالحہ سے ادا کرنے کی
کوششیں کیں، جو ثواب جاریہ کی صورت میں ہیں، انہوں نے اپنی زندگی میں تین مسجدیں
مالیگاؤں میں تعمیر کرائیں۔ موتی پورہ مسجد، سعری خان کے باڑے کی مسجد، نیا پورہ کی مسجد
جو انگنو سیٹھ کے محلہ میں تھی، اس کی پیشانی پر ۱۲۸۰ھ کی تاریخ بنیاد لکھی گئی ہے یہیں
انگنو سیٹھ کی قبر بھی ہے جو شاہ آبادی پتھروں کے چبوترے پر ہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں
بنوا رکھی تھی (وفات ۹ صفر ۱۳۲۸ھ مطابق ۲ مارچ ۱۹۱۰ء)[2] یہ اور مجاہد بھیونڈی آئے

---

[1] ذخیرۂ عاقبت یعنی تذکرۂ آخرت بمبئی ۱۳۲۲ھ، محب فرید بخش جناب محمد حسن سردار صاحب دمشقی
پیر محمد کل جماعت پھولپور ص۱۲۱، سیٹھ عبدالباری راقم کے خسر سراج الدین باری کے دادا تھے

[2] شبیر حکیم ، براۓ وطن مالیگاؤں ۱۹۸۸ء ص۱۲۴

[3] ابوالسعید مولوی محمد عبدالمجید صاحب وحید "تاریخ شہر مالیگاؤں معروف بہ فروغ مجید لکھنؤ
۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۶ء ص۹

شاہ عبداللطیف جو راجو دھیا کے تاریخی معرکے کے غازی تھے ان کا یہاں شاندار استقبال ہوا۔ اجودھیا کے جہاد کے اثنا میں ایک نواب کے سپاہی شہسوار نے سوناتھ بھنجن میں پناہ لی یہ خدا بخش ولد شاہ محمد تھے۔ ان کے صاحبزادے عبدالحمید سیٹھ غالباً غدر کے بعد مالیگاؤں آئے۔

واجد علی شاہ کی عیاشیوں اور رنگینیوں نے "شامِ اودھ" کو گناہوں کی تاریک رات بنادی تھی مظلوموں کی ہائے رنگ لائی، لارڈ ڈلہوزی نے اودھ کی ضبطی کا حکم دے دیا، نواب صاحب کو معزول کرکے کلکتہ بھیج دیا، نوابانِ بنگال ہوں کہ دیگر علاقوں اور ریاستوں کے حکمراں، نہ کسی کو دین کی پڑی تھی اور نہ ملک کے مفاد کا خیال تھا، اقتصادی بدحالی کا عالم یہ تھا کہ بنکروں نے کرگھا چھوڑ کھیتوں اور سڑکوں میں کدال اور پھاوڑے لے کر مزدوری کرنا شروع کردیا، کمپنی بہادر کے ظلم و استبداد نے پارچہ بافی کی صنعت کو پارہ پارہ کرکے رکھ دیا تھا کمپنی کے تجارتی داروں کے ہندستانی بنیوں، گماشتوں اور کارندوں نے "طلبانہ" طلب کرکے غریب تانتی بنکروں کو قرضے کے بار بوجھ سے دوہرا کر رہا تھا، جاگیردارانہ نظام کا سہل انگار طبقہ رعیت اور اہل حرفہ سے "منبع کن" کے نام سے ایک خاص ٹیکس وصول کرتا تھا، ظلم کا یہ دور دراز ہوتا جارہا تھا اور مظلوموں کا پیمانۂ صبر لبریز، سب سے زیادہ مفلوک الحال نوربافوں کا طبقہ تھا جو پسماندہ تو پہلے ہی تھا اب مزید پامال بن گیا، لیکن حریت کی آگ سینوں میں بھڑکنے لگی تھی اور وہ اس دن کی راہ دیکھ رہے تھے جب وہ گوروں کے سیاہ کرتوتوں کا بدلہ لے سکیں اور وہ دن ۱۰ مئی سنہ ۱۸۵۷ء کو آگیا۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تاریخ میں جہاں محبانِ وطن کے کارناموں کے جگمگاتے عنوان بنے ہیں وہیں گمنام مجاہدین کے کارناموں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس طبقے سے حریت کے اعلیٰ و ارفع قدروں و تصورات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ غدر کے ہنگاموں میں ان کا مجاہدانہ پاکیزہ جذبات حریت کا نتیجہ نہیں سمجھا گیا بلکہ ان پر غارتگری کا فرد جرم لگایا گیا، سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" میں

۱؎ [illegible]، ہندستان میں کمپنی کے بنکر، دہلی سنہ ۱۹۶۰ء

تقرب بالنسب کے قلم سے اور آقاؤں کے تملق دخوشامد کی روشنائی سے لکھا۔

— اور جولاہوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا جو بذات سب سے زیادہ اس ہنگامے میں گرم جوش تھے"

زرباف طبقہ کرفرنگیوں کے حاشیہ بردار اور کاسہ لیس مورخین ہمیشہ زبان و قلم سے مورد تضحیک و تحقیر بناتے رہے کبھی جذباتیت کا الزام لگا کر اُن کی حب الوطنی حُریت پسندی اور وطن دوستی کا منہ چڑایا گیا تو کبھی انہیں متعصب جلاہا، اور شورہ پشت قوم کہہ کر تعارف کرایا گیا، یہ حقیقت ہے کہ جولاہوں کا دیہاتی طبقہ گنوار اور جاہل تھا اوران کے عقاید پر مشرکانہ رسوم اور غیر اسلامی رواجوں کا خول چڑھا ہوا تھا لیکن بنیادی طور پر یہ لوگ مذہبی معاملات میں بڑے اعلیٰ و پاکیزہ خیالات رکھتے تھے اور شریعت کے بنیادی اصولوں پر سختی سے کاربند تھے، متعصب انگریزی مورخین بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے تھے[1] دین سے محبت کا سرچشمہ ان کے دلوں سے پھوٹتا تھا جس سے جذباتیت کے دھارے بہہ اٹھتے جب اس آبگینہ کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچ جاتی ان اللہ کے بندوں کو ذات باری کی بندگی عزیز ترین تھی، یہ اپنے وطن سے محبت کرتے تھے اور اپنی قوم سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کے مخالفین ان پر جماعت بندی اور قبائلی عصبیت کا الزام لگاتے تھے، فرنگی گزیدہ ہندوستانیوں کے لیے آقاؤں سے وفاداری پختہ و استواری اصل ایمان بن گئی تھی

اگر کسی نازک وقت پر وطن، قوم اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے یہ مومن طبقہ ایسی کئی آزمائشوں سے گذر چکا ہے اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے علما اور شیوخ عتاب و زنداں کی صعوبتیں جھیل چکے ہیں اور دار و رسن کی آزمائشوں سے گذر چکے ہیں لیکن ایمان و تقویٰ میں لچک پیدا نہیں ہونے دی ملکہ زمانے کو یہ بتا دیا کہ ایک خدا پرست انسان محب قوم اور محب الوطن رہ سکتا ہے لیکن قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا صرف اس لیے کہ خدا کی پرستش ہر شے سے عزیز تر اور افضل تر ہے جس پر دنیاوی جاہ و مرتبہ مفاد اور مصلحت کو بھی قربان کر دیتا ہے مگر ایمان، جس کا نرخ کبھی ارزاں نہیں ہوتا، سیاست کی کسی منڈی میں نہ بیچا

---

[1] کروک (انگریزی) صوبہ جات، صفحہ ۱۰۶۹ء

جاسکتا ہے اور نہ مفاد و منفعت کے بازاروں میں اس کی سوداگری ہوتی ہے۔ یہ ان لوگوں کا
عمل ہوتا ہے جن کے پاس تقویٰ اور استقامت کا ترازو ہے، دو رکعت کے امام اور بے سرو ساماں نمازو
کے مقتدی شانِ عبودیت کیا جانیں اور جہاد کی فضیلت کو کیا سمجھیں؟ کیونکہ انہیں موت سے خوف
آتا ہے اور زندگی سے ان کی محبت بڑھ جاتی ہے۔

انیسویں صدی کی تحریک آزادی کا دھارا وہابی تحریک سے پھوٹا جس کا سرچشمہ حضرت شاہ
ولی اللہ کے افکار و خیالات ہیں، پھر جب ولی اللہی فوج مرتب ہوئی تو حضرت سید احمد بریلوی اس میں
سالار اور ولیِ تہیدت، مقدمۃ الجیش میں شاہ اسمٰعیل شہید تھے، یہی لوگ وہ اہلِ بصیرت
تھے جنہوں نے غلامی کے پردۂ ظلمت پر حریت کی نورانی تحریریں پڑھی تھیں، وہابی مجاہدین
نے تلواروں کی نوک سے ملک کی آزادی کا نوشتۂ تقدیر برسوں پہلے اپنے خون سے لکھ دیا
تھا مگر علمائے سو تھے کہ ان کے خلاف فتویٰ کا قلم چلا رہے تھے، انگریزوں نے باغی قرار دیا،
کیونکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ مسلمانوں کو ذرا بھی سنبھلنے کا موقع ملا تو ہماری راتیں
بے سلیبیں کھڑی کر دیں گے، کیونکہ ان کا یہ جذبۂ ایمانی وہی شعلۂ فروزاں تھا جس سے صلیبی
جنگوں کی کئی صدیاں روشن ہو گئی تھیں، ہسپانیہ کے جبل الطارق و وادی الکبیر تابندہ
اور تابناک بن گئے تھے اور اب یہ شعلہ ان کی طاغوتی طاقتوں کی طرف بڑھ رہا تھا یہ سوچ کر
برطانوی سامراج نے تحریک ترغیب محمدیہ کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھایا لیکن پھونکوں
سے یہ چراغ بجھایا نہ جا سکا اسلئے کہ اس تحریک نے حقانیت اور وحدانیت کی تجلیوں سے کسبِ
نور کیا تھا۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ ہمارے پاس مجاہدین کے خلاف فتووں کا ایک انبار جمع ہو گیا تھا
جن میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ وہابی کافر ہیں اس طرح مسلمانوں کو بغاوت کے خطرناک ارادے
سے روکے رکھا گیا، سقوطِ بالاکوٹ کے بعد جدوجہد آزادی تیز تر ہو گئی اور ۱۸۵۷ء کا غدر اسی
سفرِ حریت کا ایک سنگِ میل تھا غدر کے بعد ہنٹر طبقۂ پر اور بھی قیامت ٹوٹی "کیونکہ یہی" بد ذات
جو بے تھے جو اس ہنگامہ میں گرم جوش تھے" اور الٰہ آباد ان کا مرکز تھا۔

جب جنگِ آزادی کا جذبہ سمندر کی طرح موجزن ہوا تو وہ جو صدیوں سے پامال تھے اور جبر و تشدد
کے مارے ہوئے تھے دشمنوں کو مارنے کے لیے مجاہدین کے دستوں میں شامل ہونے لگے، ان میں
"اجلاف" کا طبقہ نمایاں تھا جیسے کنجڑے، بھٹیارے اور دیگر پیشہ ور افراد، جلاہے دل جلے
بیٹھے تھے وہ بھی کرگھا چھوڑ بیٹھے، ان مجاہدین کی وردی کیا تھی؟ سر پر عمامہ اس کے بیچ سُرخ

کلاہ، سینہ پر سپر کی جگہ روئی کی صدری، پشت پر ڈھال، ہاتھ میں تلوار، کمر میں سبز پٹکا، انگلی میں انگوٹھی جس کے نگینے میں اللہ کا نام کندہ جگمگا رہا، لبوں پر نعرۂ تکبیر، قدم میں متقات اور سارا وجود جذبۂ جہاد سے پُرتاثیر — ایسا کہ انگریز بھی دیکھتا تو متاثر ہو جاتا۔

ایک ایسے ہی عوامی دستے کے سالار تحصیل چائل ضلع الٰہ آباد کے باشندے مولوی لیاقت علی تھے، اسکول میں مدرس تھے اور قصبے کے بڑے مؤثر مبلغ، ان کی للکار پر اطراف و اکناف کے قریوں سے بُنکر کرگھوں کو چھوڑ کر انگریز گرگوں در کرگسوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے سبز پرچم کے تلے اکٹھا ہو گئے اور الٰہ آباد کے قلعہ پر ہلہ بول دیا گیا، مولوی لیاقت علی نے خسرو باغ میں پڑاؤ ڈالا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا، اسی مستقر سے اعلانات اور اشتہارات شائع کر کے شہر کا انتظام سنبھال لیا، لوٹ مار بند ہو گئی اور جب انگریزی کمک پہنچی تو جنگ بند ہو گئی اور باغی مجاہدین کے پیر اُکھڑ گئے اور وہ تتر بتر ہو گئے، مولوی لیاقت علی کانپور میں مغربی فوج سے مل گئے، لکھنؤ اور اودھ ہوتے ہوئے گجرات پہنچے۔ یہاں بھی ان کے مواعظ نے لوگوں پر گہرا اثر ڈالا، مسائل و فضائل جہاد بیان کرتے تھے۔ لیکن یہاں وہ فرضی نام سے پورے گجرات میں تبلیغ کرتے پھرے، تا وقتیکہ یہ چتین میں بغاوت کرنے کے جرم میں پکڑے گئے اور مقدمہ دائر ہوا، اور انہیں حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہی جزائر انڈمان ہی میں ان کی وفات ہوئی۔[۱]

پیشہ ور طبقہ کے لوگ آزادی کے عظیم مقصد اور نصب العین کے لیے سر کٹاتے رہے لیکن اعلیٰ طبقہ کے شرفا کی نظروں میں انہیں کبھی سربلندی نصیب نہیں ہوئی جب بھی ذکر ہوا ان در شناخت ہوئی تو وہی جولاہے، دُھنیے، بھٹیارے، کنجڑے، دیسی تیرلی، نان قسائی، منت خورے، لٹیرے، بداطوار، بداخلاق جیسے مبتذل اور رکیک القاب سے نوازا گیا، اجلاف کا یہ طبقہ جنگ آزادی میں ہر فوج کے سپاہیوں میں نمایاں رہا، نانا صاحب، مہارانی جھانسی اور دیگر محبان وطن کے پرچم تلے لڑتا رہا، اور جب شورش اور ہنگامہ ختم ہوا تو دار و رسن کی آزمائش سے گذرنا پڑا۔ چھوٹا ناگپور کے مومن مجاہدین اور ان کے سالار شیخ بھکاری کی آزادیٔ وطن

---

[۱] مولانا لیاقت علی کا ذکر اسی باب کے ابتدائی حصے میں آچکا ہے۔

کے لیے، قربانیوں کا ذکر باب "بہار، آسام اور اڑیسہ کے محبانِ وطن" میں ہو چکا ہے۔
— اور دار و رسن کی آزمائش کی گھڑی آن پہنچی اور یہ گھڑی، ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک تحقیقات، مقدمات اور منتقمانہ کارروائیوں میں بیت گئی۔ بُنکر طبقہ کے لیے یہ تباہی اور پُر آشوب دور تھا، الٰہ آباد اور دوسرے اضلاع میں بے بس جلاہوں کی بستیاں اُجاڑ دی گئیں، درخت کی ہر ٹہنی سولی بن گئی اور ہر سینہ بندوق کی گولیوں کا نشانہ، ان کے کرگھوں کو جلایا گیا اور ان کی صنعت کے تار و پود کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا گیا، بنگال کے اور یوپی کی کارگاہیں، الٰہ آباد، مبارک پور، مئوناتھ بھنجن، بنارس، جونپور، ٹانڈہ، فیض آباد، اعظم گڈھ تمام اطراف و اکناف کے اضلاع اور قصبات و قریات کے کرگھے سارے تباہ و برباد ہو گئے۔ کرگھوں کے (پای رفتار اور پوسن) کے رکابوں سے شہسواروں کے پیر اُکھڑ چکے تھے، باگ ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی، بے زبان اکو (نال) جو ضرب کھا کر پوچھتا رہتا تھا کہ "ہم کہاں ہیں" اب پوچھ رہا تھا کہ "ہم کہاں جائیں؟"

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

— اور اس استفسار کا جواب نبی کریمؐ کی اس حدیث نے دے دیا جسے برادری نے اشارۂ ہجرت سمجھا اور قدم آگے بڑھا دیا۔

"یہ نسائی کی بنیادی حدیث ہے، جب کوئی مسلمان شخص روزی کی تلاش میں پردیس جاتا ہے اور وہاں اس کا آخری وقت آجاتا ہے تو خدا اس کے وطن سے اس کی جائے وفات تک کے فاصلے کے برابر جگہ اس کو جنت میں عطا فرماتا ہے۔" [1]

۱۸۵۷ء کے بعد

انیسویں صدی کا نصف آخر "دار و رسن، احتساب اور ماتم کے المیہ" کا دورِ ابتلا تھا، مجاہدینِ آزادی اور وہابیوں کی جماعت حقہ نے ایک پوری صدی تک برطانوی سامراج کا مقابلہ کیا، سولیوں پر لٹکے، کالا پانی بھیجے گئے، زندانوں میں پابجولاں رہے اور انسانیت سوز تشدد کا

---

[1] ڈاکٹر یوسف قرضاوی: اسلام میں غریبی کا علاج، ترجمہ نعیم تقی، ادارۃ السلفیہ بمبئی ۱۹۸۰ ص ۹۶

نشانہ بنے، ان کی صنعتیں تباہ ہوئیں، جائدادیں قرق ہوئیں، لیکن یہ لوگ سیلِ رواں کی مانند تھے، ایک لہر اٹھ کر جبر واستبداد کے پہاڑوں سے ٹکرا کر نابود ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی دوسری موج اٹھی ——— ایسی ہی ایک بیقرار موج نے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے سینے میں جذبۂ آزادی کا سمندر پھیلا دیا تھا جنکی تحریک ریشمی رومال کے نام سے لہرائی اور جس کو انگریزوں نے ریشمی خطوط کی سازش کا نام دیا، اس کے بانی شیخ الہند مولانا محمود الحسن وہ بزرگ تھے جن کو نہ اقتدار کی ہوس تھی نہ جاہ وعظمت کی چاہ تھی ان کی خدائی فوج میں اللہ والے تھے مردانِ حق وہمت جن کی جولانگاہ مدرسہ اور خانقاہ تھی یا مسجد کے شکستہ حال ملّا، بوریا نشین علماء اور مولوی حضرات تھے، اور ان کے ساتھ بے نوا اور بے سہارا تہی دست وظیفہ خوار طلبہ تھے، مولانا محمود حسن نہ کسی سیاسی داؤ پیچ سے واقف تھے اور نہ مفاد پرستی کے اسلحہ سے مسلح بلکہ "زہد وتقویٰ، پاکیزگی باطن، ترک دنیا، درویشانہ خصلتوں اور فقیرانہ عجز ونیاز نے آپ کو علمائے ہند کا سرتاج اور مشائخ طریقت کا مرشد اعظم اور قطب الاقطاب بنا دیا تھا" [1]

ان اہل اللہ اور خدائی فوج میں جہاں مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری جیسی عظیم شخصیت شامل تھی وہاں شیخ الہند کے مریدین اور معتقدین میں پیشہ ور افراد بھی پیش پیش تھے، بنکروں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے ریشمی رومال اور ان میں دیوبندی مسلک کے ذی فہم لوگوں کے عملی اقدام کی سرگرمیوں نے ریشمی رومال تحریک پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا۔

حضرت شیخ الہند اسلامی احیاء کی جدوجہد میں اپنے عہد کے مجدد تھے اور شیخ الہند کے تلامذہ کی نابغۂ روزگار جماعت شیخ صاحب کا تجدیدی کارنامہ ہے، ان کے شاگردوں نے اس صدی کی دینی اور سیاسی جدوجہد کے میدان میں ہر موقع اور ہر موڑ پر قیادت کی باگ ڈور سنبھالے رکھی، ان میں شیخ الہند کے جذبۂ حریت کے امین اگر مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عبید اللہ سندھی ہیں تو حدیث وفقہ کے علمی تبحر کا مظہر مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ ہیں [2]۔ یہاں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور آپ کے رفیق خاص مولانا رشید احمد گنگوہی کا ذکر ضروری

---

[1] مولانا سید میاں، مرتبہ، تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسن: انگریز سرکار کی زبان میں، ریشمی خطوط سازش کیس، دہلی ۱۹۷۵ء، ۱۹۶ - ۱۹۸

[2] اخلاق حسین قاسمی دہلوی۔ مجدد اسلام شاہ ولی اللہ۔ ص۲۹

ہے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی قیادت میں شاملی ضلع مظفر نگر کے جہاد اسلامی میں مجاہد کی حیثیت سے حصہ لیا، مولانا قاسم نے ۱۲۸۳ مطابق ۱۸۶۶ء میں دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی شاہ ولی اللہ کے جانشینوں کی حیثیت سے اسلامی علوم اور ملی تحفظ کی تحریک کی کامیاب قیادت انہی حضرات سے وابستہ ہو چکی تھی۔

کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

> "وہابی تحریک کی ہمہ گیر تیزی یہی تھی کہ وہ 'جہاد' جس کی آگ اسلام کی قبر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گذرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکا دیا گیا اور کتنے بچوں کو دریائے شور عبور کرا دئے گئے یا تنگ کوٹھریوں میں انہیں بند ہونا پڑا اور اب یہ کیسا صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی متوفی ۱۳۳۶ء کی زندگی تک اس تحریک کے علمبردار جماعت وقت کا مرکز رہی تھی۔ "وہ بس کہ قبیلۂ مجنون کی مانند" [1]

سفر جہاد بالاکوٹ (۱۲۴۶/۱۸۳۱ء) کے ساتھ تحریک کا ایک دور ختم اور دوسرا شروع ہوتا ہے اس کا آغاز صادقپور (عظیم آباد پٹنہ) کے مجاہدین کے لشکر سے ہوتا ہے ان قافلہ سالاران میں مولانا ولایت علی (م ۱۲۶۹/۱۸۵۲) مولانا عنایت علی (م ۱۲۷۴/۱۸۵۸) اور مولانا عبد اللہ بن عنایت علی (م ۱۳۲۰/۱۹۰۲) اور ان کے اخوان واخلاف اور اعوان وانصار پیش پیش نظر آتے ہیں جنہوں نے سرفروشانہ جدوجہد کے ساتھ تحریک کو مزید ایک صدی سے زیادہ باقی اور زندہ رکھا، انگریزی حکومت کے دور استبداد میں جب 'دوست کا بے راز دشمن پر کھلا' کا عالم تھا یہ مجاہدین نہایت خفیہ طریقے پر سرحد پار بقیۃ السیف غازیوں کو برابر ہر قسم کی امداد پہنچاتے رہے۔ [2]
اس دوسرے دور میں تحریک کا صدر مقام پٹنہ (عظیم آباد) تھا، اسی مرکز سے مجاہدین اور ان

---

[1] مقدمہ تراجم علمائے حدیث

[2] محفوظ الرحمٰن فیضی، تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب۔ فیض عام اکادمی، جامعہ فیض عام، مئو ناتھ بھنجن یوپی ۱۹۹۰ء۔ ص ۲۸-۲۹

کے لیے سامان جہاد اور مالی معاونت کی جمع و ترسیل کا بخوبی انتظام ہوتا تھا۔ یہیں سے ہر طرف دعاۃ اور مبلغین و محصلین روانہ کیے جاتے تھے۔ جو دعوتِ عزیمت کا علم لے کر عقائد و اعمال کی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ جہاد کی بھی تبلیغ کرتے اور شرکت کی ترغیب دیتے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ مردم خیز و زرخیز بہار اور بنگال کے اضلاع تھے۔ خفیہ امداد اور مجاہدین کی فراہمی ٹونک، بستی، روہیل کھنڈ، رام پور، وسط ہند، بمبئی اور یوپی کے اضلاع کے علاوہ مدراس تک سے ہو رہی تھی۔ یہ تحریک اپنے آخری عہد میں خراسانی تحریک سے موسوم و معروف تھی اس دوسرے دور میں سکھٹی، الہ آباد، مبارک پور کی طرح مئو کے مجاہدین بھی کمربستہ ہو کر راہ جہاد میں اٹھ کھڑے ہوئے، رئیس العلماء مولانا فیض اللہ مئوی (م ۱۳۰۶) صلاح الدین صادق پوری کی تعلیم و تحریک میں شامل ہو کر اطراف و اکناف کے تبلیغی دورے کرتے رہے اور ایک عرصہ تک اس نظام سے وابستہ رہے[1] رأس العلماء استاذ الاساتذہ حافظ عبداللہ غازی پوری کا جن کا وطن اصلی مئو ہی تھا تحریک جہاد سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ آپ موزوں نوجوانوں کو منتخب کر کے ان کے لیے عسکری فنون کی تعلیم کا بندوبست کرتے تھے[2] مئو سے خراسانی تحریک کے لیے اس وقت سالانہ پانچ سو روپے کی نذر پیش کی جاتی تھی مجاہدین کی امداد کرنے والوں میں حاجی ولی محمد اور ان کے بھائی حاجی محمد علی کی دینی غیرت و حمیت اور جود و سخا کی روایت کا سلسلہ حاجی ولی محمد کے خلف الرشید محمد گرہست (متوفی ۱۳۵۰/۱۹۳۰) جو مئو کی ایک بڑی تجارتی فرم کے مالک تھے، برقرار رکھا۔ حاجی احمد اور ڈومن پورہ کے مولانا محمد علی ابو المکارم کے یہاں سے بھی ایک معقول امداد اس تحریک کے لیے دی جاتی رہی۔ یہ امدادی رقم پہلے حافظ عبداللہ غازی پوری اور ان کے بعد بعض دوسرے معاونین کار حافظ عبداللہ نو مسلم مظفر پوری وغیرہ لے جاتے رہے۔[3] ولی اللہی مکتب فکر نے دینی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور جس بنیاد پر دار العلوم دیوبند کی یونیورسٹی جس پر ایک نئے انداز فکر کی عمارت کھڑی ہوئی۔ مگر اس کا رنگ رفتہ رفتہ اپنی اصلیت کھو کر دوسرا ہی رنگ پکڑنے لگا یہ خانقاہی زندگی کی رنگ آمیزی تھی جس کے سبب جہاد کی شمع بجھنے لگی، وہابی تحریک نے عقائد اور عبادات کے ظاہری اور باطنی اعمال سے ہی تعلق نہیں رکھا تھا اس کا اعلیٰ و ارفع لائحہ عمل سلفِ صالحین کے تمسک و تعامل کے حبل متین کو مضبوطی سے تھامے رکھنا تھا، ہندوستان میں اسلام کے مستقبل کا تحفظ بھی۔

---

[1] مقدمہ تراجم اہل حدیث ص۱ ۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ص۳۰ شمارہ نومبر ۱۹۰۶ء

[2] محفوظ الرحمٰن فیضی ص۲۱

سولھواں باب

مومن جماعتی تنظیم اور اکابر سیاست

مولانا عبدالسلام مبارکپوری نے معروف اعیان و اکابر اسلام کا جامع تذکرہ اپنی معرکۃ الآرا کتاب منوال میں قلمبند کیا ہے اور بزرگان سلف کے علمی و دینی کارناموں کو سراہا ہے۔ اس تناظر میں انہوں نے مومن۔ انصار برادری کے با بصیرت اور دانشور طبقہ کو اجتماعی تنظیم کا ایک دھندلا خواب دکھلایا ہے جس کی تعبیر جمعیۃ المومنین سنہ ۱۹۲۰ء، جمعیۃ الانصار سنہ ۱۹۲۲ء اور آل انڈیا مومن کانفرنس سنہ ۱۹۲۶ء کی وہ تنظیمیں تھیں جن کے نقوش دراصل مولانا علی حسین بہاری کے ذہن میں ابھر کر ہوئے کچھ مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر بزرگان دین کی صحبتوں کا فیض تھا اور کچھ کتاب امنوال وابد کے مطالعہ کا اثر کہ مولانا علی حسین بہاری نے مختلف قسم کی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہ اس وقت کلکتہ میں تھے جہاں وہ بہار شریف ضلع نالندہ سے تلاش معاش میں آئے تھے اور بود و باش اختیار کر لی تھی۔

کلکتہ و نوابی تہذیب و تعلیم اور مسلمانوں کے دینی، صحافتی اور سیاسی تحریکات کی مرکزیت حاصل ہو گئی تھی۔ اردو زبان کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج نے جو علمی کارنامے سرانجام دئے وہ اردو زبان و ادب کا سرمایہ بن چکے ہیں۔ مسلمان قوم کو کئی مسیحا مل چکے تھے دوران میں مومن برادری کے لئے مولانا عاصم بہاری جیسے مرد مومن پیدا ہو گئے تھے۔ کلکتہ میں کئی دینی، علمی، صحافتی و سیاسی تحریکات کی داغ بیل ڈالی گئی۔ سنہ ۱۹۱۲ء سے الہلال کا مجتہدانہ رسالہ شائع ہونا شروع ہوا۔ مغربی تعلیم سے آراستہ علی گڑھ کی ایک پوری نسل قوم کا بیدار طبقہ بن چکی تھی۔ ان تمام تحریکات نے مومن برادری کے احساس افسردگی و تعصب کو گرما دیا اور روح کو تڑپا دیا تھا اور ان میں قوم کی تنظیم و تعمیر کی زندہ تمنا پیدا ہو چکی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں بہار کے علی احمد جنید اختر اور پروفیسر حافظ شمس الدین شمس منیری وغیرہ نے کلکتہ میں مومن۔ انصار جماعت کی تشکیل کا کام شروع کیا۔ ابتداً اس کا ضابطہ

لے مولانا عبدالسلام مبارکپوری کتاب منوال واعظ ۔ ۱ ص ۱۹ ۔ ۲۰

جلسہ یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوا۔

مولانا عاصم بہاری[1] نے کلکتہ کے مسلم حلقوں میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے پہلے تو انجمنیں بنائیں اور اپنے لائحۂ عمل کے بنیادی منصوبوں کے ستون کھڑے کیے، قرآن و سنت کی روشنی میں دین کے حقیقی تصور کو فروغ دینا اور اخوت اسلامی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنا شروع کیا، تعلیم اور صنعت کی ترقی کے لیے جدوجہد شروع کی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، سنہ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں انہوں نے تربیت یافتہ نوجوانوں کے تعاون سے ایک باضابطہ تنظیم تانتی باغ کلکتہ میں جمعیۃ المومنین کے نام سے قائم کر لی جس کے زیر اہتمام ایک بڑے جلسے (۱۰ر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء) میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریر کی اور نوجوانانِ انصار کو مولوی علی حسین عاصم بہاری کی مساعی جمیلہ سے قائم شدہ تنظیم و تحریک میں شمولیت کی دعوت دی۔

تانتی باغ کے مزدور پیشہ مسلمانوں اور انصاری برادری کی ہدایت اور رہبری کے لئے پہلی سنہ ۱۹۲۱ء سے ایک دیواری اخبار "المومن" کا اجرا ہوا، یہ کچا پکا نوشتۂ دیوار مولانا یحییٰ کی ہمت سے "مومن برادری" کا نوشتۂ تقدیر بن گیا اور برسوں ماہانہ رسالہ کی شکل میں مومن تنظیم و تحریک کا نقیب و ترجمان بنا رہا، مولانا یحییٰ انصاری بھی تحریک کے اولین بانیوں میں تھے آپ حاجی الطاف حسین رئیس تانتی باغ کلکتہ کے فرزند تھے، تحریک کے ذریعے گرانقدر قومی و ملکی خدمات انجام دیتے رہے، ان کی زیرادارت نکلنے والا "المومن" مومن برادری کے دلوں پر قومی بیداری کے لئے دستکیں دیتا رہا، المومن کی اشاعت و ادارت میں ماسٹر حمایت حسین ہمیشہ آپ کے شریک رہے۔

مولانا عاصم بہاری کی مسلسل کاوشوں اور مساعی جمیلہ کا یہ موثر نتیجہ نکلا کہ یہ تحریک ہندوستان گیر بنتی گئی، اس کے پس منظر اور خاکے میں پسماندہ برادریوں کے عصری مسائل کے خطوط واضح ہوتے گئے، یہی وجہ ہے کہ یہ تنظیم و تحریک مقبول ہو گئی، اس کے ساتھ ہی صنعت پارچہ بافی کی تنظیم و ترقی کے لیے بہار ویورس ایسوسی ایشن کی تنظیم قائم کی، عام مسلمانوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ان میں نظم و اتحاد قائم کرنے کے لئے جمعیۃ اسلامیہ نام کی ایک تنظیم بہار شریف میں قائم کی، یوپی کے مغرب

---

[1] ڈاکٹر واحد سجاد کی کتاب "تحریک آل انڈیا مومن کانفرنس، تاریخ کے آئینے میں" (مطبوعہ ۱۹۸۲) مومن تنظیم کے بارے میں بخوبی معلومات ملتی ہیں ہم نے اس سے کافی استفادہ کیا ہے اس کے علاوہ دیگر مصادر میں کانگریس صد سالہ جشن زیر اہتمام آل انڈیا مومن کانفرنس ۱۹۸۵ء اور دیگر کتابیں شامل ہیں۔

انسلاع نیز دہلی و پنجاب کو مولانا نے منظم کیا اور جب تحریک کے تار و پود مضبوط ہو گئے تو مولانا نے
کلکتہ میں پہلے آل انڈیا مومن کانفرنس کا عظیم الشان تاریخی جلسہ[1] ۸۔۹ اپریل ۱۹۲۸ء کو منعقد
کیا، دوسرا اجلاس اسی کلکتہ میں مالیگاؤں کے مولوی عبدالرزاق خانوادے سے تعلق رکھنے
والے مولوی عبدالعزیز عبداللطیف صاحب (ایم۔ ایل۔ سی بمبئی) (بی۔ اے۔ ایل ایل بی) کی
صدارت میں ہوا[2]، یہ تمام اجلاس مومن کانفرنس کی تنظیم اور برادری کی معاشرتی اور معاشی تاریخ
میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، احساس کمتری آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا اور پسماندگی دور ہوتی گئی
تعلیم کو فروغ ہوا، درجے بلند ہوتے گئے اور مومن برادری میں سینکڑوں شاہین اور شہباز پیدا ہو گئے
اور مومن کانفرنس کی شاخیں برگ و بار اشجار بن کر برسوں ہری بھری رہیں، تنظیم کی شاخیں بمبئی
جمشید پور، مالیگاؤں، ناگپور، حیدرآباد، مدراس یہاں تک کہ لنکا اور برما میں بھی قائم ہو گئیں، کانپور
سے ہفتہ وار مومن گزٹ کا اجرا عمل میں آیا، اس سے پہلے مولانا نے بہار شریف سے ایک پندرہ روزہ
اخبار ترجمان کرام کے نام سے جاری کیا تھا، رام نگر (بنارس) سے جناب مولانا ابومحمد حافظ امام الدین
رام نگری نے اپنی ادارت میں ماہنامہ "ترجمان مومن۔ الفلاح" کا اجرا کیا، اس نے قوم کی شاندار علمی
و دینی خدمات انجام دیں، اور جناب منشی فتح محمد خورشید امرتسری نے سہارنپور سے ہفت روزہ "الانصار"
جاری کیا، لاہور سے جناب منشی اللہ دتہ صاحب عاشق نے "انصاری" نام کا ایک ماہنامہ جاری کیا
پھر پھلواری شریف، بہار سے مولوی محمد حفیظ اللہ نے ماہنامہ "مساوات" اور بدایوں سے ستمبر ۱۹۳۲ء
میں "تاریخ رحمت ربانی" کے نامور مرتب و مؤلف مولوی محمود الحسن بدایونی نے "ماہنامہ مومن"
جاری کیا، پہلے یہ بریلی سے نکلا پھر اکتوبر ۱۹۳۲ء میں دفتر منتقل ہو کر بدایوں آ گیا۔

[illegible] ۱۹۲۸ء [illegible] کلکتہ [illegible]

[illegible] ۱۹۱۹ء [illegible] ۱۹۳۵ء [illegible]

مولانا محمد یحییٰ بہاری کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ المومن (کلکتہ) کی طرح ترجمان الاکرام (بہار شریف) کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں میں مساوات کی اونچی نیچی سطح ہموار ہو جائے اور فرقہ بندیاں کے بند ٹوٹ جائیں۔ الاکرام کے پہلے مدیر خود اس کے بانی مولانا عاصم تھے اور مدیر معاون حافظ نعیم حسین ظفر انصاری تھے۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کا ہفتہ وار اخبار مومن گزٹ بھی ۱۹۳۶ء سے مولانا ہی کی نگرانی میں کانپور سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مدیر ابو عمر زکی بھاگلپوری تھے اس کے دو سال بعد حکیم بشیر احمد جہانگیر آبادی مقرر ہوئے ۱۹۴۵ء سے یہ حکیم و ڈاکٹر عبدالرزاق انصاری (الٰہ آباد) کے زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔

یہ سارے رسائل، جرائد اور اخبارات مومن برادری کے نقیب اور ترجمان تھے۔ ان کے ذریعے تحریک کی طاقت پھیل گئی، معاشرتی اصلاحات نے برادری کے معاشرہ میں تبدیلیاں پیدا کیں اور مومن کانفرنس کی آواز گنبد کی صدا ثابت ہوئی اور نہ صدا بصحرا بلکہ پوری ایک قوم کی آواز تھی۔ ان رسائل و جرائد کے اجراء نے اردو صحافت، ادب اور یہاں تک کہ شعر و سخن کے سرمائے میں ایک قابل قدر اضافہ کیا، کتنے ہی شاعر تھے جنہوں نے برادری کے مسائل کو موضوع سخن بنایا، مایہ گاؤں کے مولانا محمد یوسف عزیز جو جمعیۃ المومنین کے فعال رکن تھے جلسوں کے لئے ایسی نظمیں لکھتے رہتے۔ اسی تحریک نے برادری کے باصلاحیت افراد کو قلم چلانا سکھایا، سینکڑوں مقالہ نگار، مورخ اور صحافی پیدا ہوئے۔

۱۹۳۵-۳۶ء سے ملکی سیاست کی بساط پر شہ اور مات کا سلسلہ شروع ہوا تو کچھ ایسے مہرے بڑھے جن کی چالیں مومن کانفرنس کے اولین مقاصد کے خلاف ثابت ہوئیں۔ مولانا عاصم بہاری نے کانفرنس کی شناخت اور آزادانہ حیثیت کو ہر طریقے سے برقرار رکھنے کی کوششیں کیں لیکن بعض ارکان ایسے تھے جن کی وفاداریاں مشترکہ تھیں مسلم لیگ سے وفاداری کا دم بھرتے تھے اور کچھ تھے جو کانگریس کے حاشیہ بردار تھے اور ساتھ ساتھ مومن کانفرنس کی عنان اپنی پارٹیوں کی طرف موڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہ انتہا پسندانہ رجحانات رخنہ اندازی کا باعث بن گئے اور تنظیم کا توازن بگڑنے لگا، مومن کانفرنس کی باگ ڈور کچھ ایسے مفاد پرستوں اور غلط کار افراد کے ہاتھوں میں آ گئی جن کے سبب راہیں بکھر گئیں اور منزل گرد و غبار میں چھپ گئی لیکن قافلہ والوں میں اب اتنی بصیرت اور دور اندیشی پیدا ہو چکی تھی کہ وہ اپنا سفر جاری رکھے رہے، اور مومن برادری اب ایک ایسی شاہراہ پر رواں دواں ہے جہاں اب نہ پسماندگی کا طعنہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ جہالت پر آوازیں کسی سکتا ہے، اندھیرا کا سفر ختم ہو چکا ہے۔

مولانا عاصم بہاری کی شخصیت تاریخ ساز تھی، انہوں نے سب سے پہلے مومن برادری کی معاشرتی اصلاح کا درد محسوس کیا انتہائی خلوص اور ایثار سے کام لے کر اپنی تمام صلاحیتیں، سرمایہ اور قوت ملک و ملت کی تعمیر اور برادری کی تنظیم میں صرف کردیں، ایک ایسا خاک نشیں بے نشان جگر گھرانے کا فرد، دور بہار کے ایک پسماندہ علاقے میں پیدا ہونے والا اپنی علمی کم مائیگی، سماجی پسماندگی اور وسائل اور ذرائع کے فقدان کے باوجود ایک ایسی تحریک کا بانی اور داعی بنا جس کے نام لیوا آج بھی موجود ہیں، تقسیم ہند کے بعد نئے سیاسی و سماجی ماحول میں کچھ برسوں کے فترہ اور مایوسیت کا دور گذر جانے کے بعد مولانا نے انصاریوں کو عمل و اتحاد اور خدا پرستی کا روح پرور پیغام ایک بار پھر سنانا شروع کردیا، وہ مومن تحریک کو خدا پرستی کی بنیادوں پر استوار کرکے اسلامی تعلیمات اور مذہب سے قریب تر کرنا چاہتے تھے — لیکن ان کا آخری وقت قریب آچکا تھا، حاجی قمرالدین محلہ اللہ داد آباد کے مکان میں صاحب فراش رہے، ان کے عقیدتمندوں اور مخلص اور بے لوث قدردانوں نے موصوف کی بڑی خدمت کی، ۶ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو مومن برادری کا یہ "مسیحا" "آگے چلینگے دم لے کر" کہتا ہوا ملک حقیقی سے جاملا، اور ان کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

ہمارے مرنے پہ ایک عالم ہماری خوبی پہ جان دے گا
بچھے گی ماتم کی صف جہاں میں ہند و ملک سوگوار ہوگا

مومن کانفرنس کے مدبرین

کلکتہ کے مولانا محمد یحییٰ انصاری (ولادت ۱۸۹۵ء) کا آبائی وطن بہار شریف ضلع نالندہ (بہار) تھا، مولانا، مومن تحریک کے بانیات دلی کے خاص تھے، آپ تحریک کے نہایت سرگرم اور فعال بنیادی کارکنوں میں سے تھے۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے برسوں قوم کی قیادت کا فرض ملکی اور قومی سطح پر خوش اسلوبی سے انجام دیا، مومن ہائی اسکول کلکتہ کے بانیوں میں سے تھے مگر آپ کا عظیم کارنامہ رسالہ المومن کا اجرا ہے جو عظیم شہر کلکتہ کے اُفق صحافت سے ۱۹۲۳ء میں قوم مومن کے چیتے رہنما ستارے کی طرح نمودار ہوا اور ایک مدت تک آپ کی سرپرستی اور ادارت میں قوم انصار کا نقیب و ترجمان بن کر برادران ملت کے اندر قومی بیداری کی روح پھونکتا رہا اس رسالہ نے "آل انڈیا مومن کانفرنس" کے قیام کے ذریعے برادران انصار کو منظم کرنے کی کامیاب سعی کی، نوجوانوں کے علمی و ادبی ذوق کو جلا بخشی، آپ کی سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع

رہا۔ شہر کلکتہ کے بیشتر اصلاحی تنظیموں اور قومی اداروں مثلاً انجمن مفید الاسلام، اسلامیہ اسپتال، یتیم خانہ اسلامیہ، اسلامیہ ہائی اسکول اور مدرسہ وغیرہ سے منسلک رہے۔

مغربی بنگال کے مومن رہنماؤں میں علی احمد بلند اختر بھی ممتاز تھے۔ جمعیۃ المومنین کی ابتدائی نشستیں آپ کے دفتر (کلکتہ) میں ہوا کرتی تھیں۔

الحاج ابوالشمس عبدالغفور مومن تحریک کے بانیوں میں سے ہیں موصوف نے کلکتہ میں عبداللہ اور عبدالرحیم دو تاجر ساتھیوں کے ساتھ اور ان کے تعاون سے مومن ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی، حافظ عبدالحفیظ (بیل گچھیا کلکتہ) اور پروفیسر نذر راشد (ضلع نیا مغربی بنگال) مومن ہائی اسکول کے مؤسسین میں شمار ہوتے ہیں۔ پروفیسر نذر راشد کلکتہ پریسیڈنسی کالج کے پروفیسر تھے اور صوبائی جمعیۃ المومنین کے صدر رہے، مومن ہائی اسکول اور مومن ایجوکیشن بورڈ کلکتہ کے بھی صدر اول تھے۔

وکیل نورالدین (ہوڑہ ریگان) مومن تحریک کے صف اول کے مجاہدین میں سے تھے اور کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر تھے۔ ماسٹر شمس الدین (تانتی باغ) مومن تحریک کے اولین بانیوں میں سے تھے اور مومن ہائی اسکول کے قیام میں آپ کی سعی پیہم شامل ہے، ان کے ہمنام ع ج انجینئر شمس الدین نہ صرف مومن ہائی اسکول کی عمارت کے معمار تھے بلکہ معمار قوم بھی تھے؛ مومن ایجوکیشن بورڈ کے مجلس عاملہ کے ڈاکٹر قربان الدین احمد (ہوڑہ ریگان کلکتہ) سیکریٹری رہ چکے تھے۔ آپ مومن جمعیۃ کے ناظم بھی تھے، الحاج سیٹھ محمد یوسف (تانتی باغ) مومن تحریک کے نہ صرف رہنما تھے بلکہ مالی امداد میں پیش پیش رہتے تھے، کلکتہ (بیگچھیا) کے بانیان تحریک میں حافظ عبدالحفیظ اور ان کے صاحبزادے عبدالمتین کے کارنامے قابل ذکر ہیں، عبدالمتین صوبائی جمعیۃ کے سکریٹری رہ چکے تھے اور عبدالغفور صاحب کے دور صدارت میں آل انڈیا مومن کانفرنس کی مجلس عاملہ کے رکن تھے، مومن ہائی اسکول کے سیکریٹری اور بورڈ کے نائب سیکریٹری تھے موصوف کلکتہ کارپوریشن کے کونسلر بھی رہ چکے تھے، رفیع الرحمٰن انصاری کا نام کلکتہ کے مجاہدین آزادی کی فہرست میں ممتاز نظر آتا ہے۔ آپ ۱۹۸۵ء کے آل انڈیا مومن کانفرنس (نئی دہلی) کے رکن تھے۔

الحاج عبدالرحیم کلکتہ (مالک نواب سوپ) بڑی خوبیوں اور اوصاف کے حامل تھے، قوم کے لئے درد مند دل رکھتے تھے اپنی فیکٹری مارکلہ ڈانگہ کو مومن ہائی اسکول کی عمارت کے لئے معمولی قیمت پر دیدیا، مسجد کی تعمیر ہو یا مدرسہ کی بنیاد حاجی صاحب نے ہمیشہ صدقہ جاریہ کو مقدم رکھا۔

المومن کے اجراء کے بعد جب کلکتہ میں زیر صدارت علی احمد بلند اختر بھاگلپوری (علیگ) ایک شاندار تی جلسہ ہوا تو جمعیۃ المومنین کا قیام عمل میں آیا اور یہی جمعیۃ مومن کانفرنس کلکتہ اور آل انڈیا مومن کانفرنس کے انعقاد کا ذریعہ بنی، اس جمعیۃ کے داعیان میں مندرجہ ذیل حضرات تھے۔

(۱) مولانا محمد یحییٰ (شمس العلماء) صدر المدرس مدرسہ عالیہ عربی کالج (کلکتہ)

(۲) مولوی ابوالحسن بسمل آروی بی۔ اے

(۳) مولوی ابوالحسن کاشف۔ ایم۔ پی

(۴) وکیل محمد یحییٰ۔ ایم۔ اے شیخپوروی

(۵) علی احمد بلند اختر (علیگ)

(۶) مولانا محمد یحییٰ

مومن کانفرنس اور جمعیۃ المومنین کی سرگرمیوں کی روئیداد اور خبریں مومن گزٹ کانپور، المومن کلکتہ اور مساوات پھلواری شریف وغیرہ میں باقاعدہ شائع ہوتی تھیں، گو سارے اخبار و رسائل مالی مشکلات، سیاسی انتشار اور اختلافات کے سبب ایک ایک کرکے بند ہو گئے لیکن مولوی محمود الحسن کی ہمت مردانہ اور مستقل مزاجی نے المومن کو نذر اجل ہونے سے بچا لیا۔ تمام گزشتہ دفتروں پر سرسری نظر ڈالنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس تحریک کا دائرہ اثر و عمل تمام ہندوستان میں پھیل گیا تھا، برادری کا ہر متمول، مخیر، تعلیم یافتہ سیاسی مبصر، تاجر اور ... اس تنظیم کا رکن تھا اور اپنے آبائی پیشہ و صنعت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ معاشرتی و مذہبی اصلاحات کو قبول بھی کرتا جا رہا تھا، ہر سال دو سال بعد جمعیۃ المومنین کی سالانہ مومن کانفرنس ہوتی تھی، لاہور (پنجاب ۱۹۲۳) کے اجلاس کے ... منعقدہ ... خصوصی کے یہ اسمائے گرامی ہم تک پہنچے ہیں۔

شیخ ... حسن رئیس ... نے صدارت فرمائی، نائب صدر شیخ محمد ظہیر الدین وکیل ... پنجاب ... تھے، وکیل صاحب نے اس سے چند سال پہلے الہ آباد (خسرو باغ) میں منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۲۹ء کو شرف صدارت بخشا تھا، دیگر ممتاز افراد کے نام یہ ہیں: بابو محمد صدیق ... پروفیسر عبدالمجید (شاہ گنج پٹنہ)، پروفیسر محمد ثناء اللہ (ضلع بتیا مغربی بنگال)، یہ ... جمعیۃ المومنین کے صدر بھی تھے۔ شیخ مولا بخش (امروہہ) حکیم

محمد صدیق (پرتاپ گڑھ)، محمد ظفر ایڈوکیٹ (انبالہ) یہ سکریٹری تھے۔ مولوی محمد اسلم (لاہور)، بابو غلام رسول (اسالت پورہ، مراد آباد)، منشی عظیم اللہ (دہرہ دون)، منشی عبدالرحیم (سیتاپور)، محمد سلیمان (ایم۔ ایل۔ سی۔ کلکتہ)، ماسٹر عبدالستار (بستی یوپی)، ایم۔ جی۔ رسول (کلکتہ)، مولوی حفیظ اللہ (ایڈیٹر مساوات پھلواری شریف پٹنہ)، خانصاحب سردار محمد اسلام (نگینہ۔ گیا)، نظام الدین ایڈوکیٹ (الہ آباد)، عبدالستار فاروقی (کامٹی ناگپور)۔ صوبہ بمبئی سے تین ممتاز افراد محمد عمر رجب (مہورہ، بمبئی)، عبدالرحمٰن فیت والا (صدر بلدیہ کرلا) اور مالیگاؤں کے مشہور وکیل عبدالعزیز عبداللطیف (ایم۔ ایل۔ سی) نے شرکت کی۔ محمد عمر رجب برادری کے پہلے فرد تھے جنہوں نے جنیوا (آسٹریا) میں ہونے والی مزدوروں کی عالمی کانفرنس میں ہندستان کی نمائندگی کی، سیٹھ عبدالرحمٰن فیت والا بمبئی کے سماجی اور مذہبی معاملات میں بجد دلچسپی لیتے تھے، شیخ عبدالعزیز عبداللطیف (ایم ایل سی) (مالیگاؤں) برادری کے بجد بے لوث خادم تھے اور ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ آپ نے دو مرتبہ مومن کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی (دسمبر ۱۹۲۶ اور اکتوبر ۱۹۳۰)۔

مومن کانفرنس کے زیرِ اہتمام کانگرس کا صد سالہ جشن جو ۳۰-۲۹ دسمبر ۱۹۸۵ء کو دہلی میں منایا گیا اس کی روئیداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگرس اور جمعیۃ العلماء اس تحریک و تنظیم پر پوری طرح حاوی ہو چکی ہے اور انتہا پسندانہ رجحانات نے تنظیم کو محدود کر دیا ہے لیکن اس کی یہ روح مردہ ہوئی اور نہ نصب العین محور سے ہٹ گیا ہے بلکہ یک خودداری، خود شناسی اور عالی ہمتی کا احساس جاگ اٹھا ہے۔ مگر کہنہ سال و ناداران قوم کو سیاست کا یہ سفید لبادہ نہیں بھایا۔

تحریکِ خلافت اور سیاست

سلطنتِ عباسیہ کے دورِ انحطاط میں خلافت ایک مذہبی علامت بن کر رہ گئی تھی، سقوطِ بغداد (۱۲۵۸ء) کے بعد پانچسو برس کی پرانی روایت، فنی کے ملبے میں دب کر سسکنے لگی، عالمِ اسلام کے قلب و ذہن پر منگولوں نے ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ سوادِ اعظم صدمے سے تڑپنے لگا، تاریخ کا فتویٰ تھا کہ خلافت "سیاسی ایا بج" تھی جس کو مٹ جانا تھا۔ یک تاریخی عمل

تھا، دانشور طبقہ اس عمل کی کارفرمائی سے ناعلم نہیں تھا[1]، اسلام کے نظریات کی تازگی نے ہمیشہ تاریخ کے نازک مرحلوں اور دینی مسئلوں میں مسلمانوں کو بچایا ہے اور روح کو تازگی اور ایمان کو بالیدگی عطا کی ہے۔

پندرھویں صدی کے آخری چند برسوں تک مسلم اندلس جزیرۂ مسلمان کا امین تھا اور جس کی خاک میں ہزاروں سجدوں کے نشان جگمگاتے رہے عیسائیوں کی طاغوتی اور صلیبی طاقتوں کی تاب نہ لاسکا، اس کے بادِ سحر میں گونجتی اذانیں خاموش ہو چکی تھیں، دیدۂ مسلم کا نور، قرطبہ اپنی روشنی کرچکا تھا الزہرۃ کے بلند مینارے سرنگوں ہو کر اپنے وجود کا مرثیہ ماتم کر رہے تھے اور الحمراء کے دمکتے رخساروں کی سرخی — خوناب بن گئی تھی، قرطبہ کی سات سو مسجدوں کے 'الجوبِ رحمت' پر نصرانی تملے پڑ گئے اور وادیٔ تکبیر کے بہاؤ کا رخ بدل چکا تھا، ابوعبداللہ مسلم اندلس کا آخری فرمانروا پسپائیت کے شدید احساس کے باوجود بڑے تزک و احتشام سے اپنے حرم کو لے کر ملک بدر ہوا! اپنے وطن کی طرف دیدۂ حسرت سے دیکھا اور رو پڑا سلطانہ عالیہ (والدہ) نے طعنہ دیا:

"تمہیں عورتوں کی طرح رونا ہی چاہیے جبکہ مردوں کی طرح تم اپنے ملک کو بچا نہ سکے"[2]

مسلم ہسپانیہ کے آخری مسلمان کی یہ آخری "آہ" تھی — اس کے بعد سے تو آج تک آنسوؤں کا سیلاب جاری رہا۔

لیکن مسلمانوں میں ابھی دم خم باقی تھا، خلافت کا تابوت قسطنطنیہ پہنچ گیا، جہاں اسے دوسری زندگی ملی، پرانی روایات نئے اقدار کی حامل بن گئیں — اب پھر پانچسو سال بعد عثمانی خلافت یہاں گسل لمحات سے گذر رہی تھی، دولتِ ترکیہ کی عظیم الشان سلطنت کی سرحدیں سمٹتی جا رہی تھیں ۱۸۷۷ء میں روس سے جنگ چھڑ گئی، ساری اسلامی دنیا نے ترکوں کا ساتھ دیا لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے عملی طور پر اپنے بھائیوں کی اعانت اور استمدادکی، چندے جمع کیے، علماء اور دانشوروں نے بھرپور تعاون کیا، لیکن وقت یہ تھا جب امت پہ عجب وقت آن پڑا تو سارے سواد میں جہاد کی جگہ جمود نے

---

[1] دیکھیے راقم کا مقالہ "علماء ادب مطالعہ ملک جرمنی"، مجلہ علوم اسلامیہ علیگڑھ (جون ۱۹۶۱ء)

[2] فلپ ہتی: تاریخ عرب (انگریزی) (لندن ۱۹۴۰) ص ۵۵۵

لی تھی بے عمل مسلمان "حب الدنیا وکراھیۃ الموت" کی حدیث بھول گیا تھا، بمبئی کے علماء نے اس "نازلے" کی دفع کے لیے دعائے قنوت کا پڑھنا ضروری سمجھا جبکہ ان دنوں میں حضرت امیرالمومنین و امام المسلمین سلطان عبدالحمید خان غازی کے اور روسیوں کے درمیان جنگِ عظیم جاری ہے"۔ [1]

قیاس غالب تھا کہ سارا برطانیہ ترکوں کی مخالفت میں کہیں روس سے ساز باز نہ کر لے انجمن اسلام نے مسلمانانِ بمبئی کی طرف سے ایک جلسہ جامع مسجد میں بلوایا۔ انجمن کے عہدہ داران ناخدا محمد علی روگھے اور آنریری سکریٹری بدرالدین طیب جی پیش پیش تھے، ایک یادداشت پیش کی گئی، اس کارروائی کا تمام "اسلامیانِ ہند" نے تتبع کیا۔ [2] مسلمانانِ بمبئی اور خصوصاً علمائے کرام کو خلیفۂ ترکی سے جو والہانہ محبت اور شیفتگی تھی اس کا اظہار "سلطان غازی عبدالحمید خان دوم" کی سلور جوبلی (۳۱ راگست سنہ ۱۹۰۰ء) کے موقع پر ایک عظیم الشان جشن کی صورت میں کیا گیا، میلاد کی محفلیں منعقد کی گئیں، شہر کی ۸۹ مسجدوں میں چراغاں کیا گیا اور اس تقریب سعید کے موقع پر "خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ" کے دوام کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ اور ان کی یہ مانگ بھی تھی کہ ایک عالم فاضل مفتی ہندستانی مسلموں کے مذہبی مسائل پر فتویٰ دینے کے لیے مقرر کیا جائے اور شیخ الاسلام قسطنطنیہ، ان کے استفتاء اپنے فتاوے صادر فرمایا کریں۔ [3]

سنہ ۱۹۱۱ء میں طرابلس العرب پر اٹلی نے حملہ کر دیا، دوسرے سال یورپ کی سلطنتوں کی شہ پا کر بلقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف محاذِ جنگ کھول دیا، مسلمانوں کے دینی جذبات میں سیلاب آگیا، خود ان کا بیقرار اور گھائل دل آزادیٔ وطن کے لیے تڑپنے لگا، اس پُرآشوب وقت میں مولانا شبلی نعمانی نے ایک دردانگیز نظم "شہر آشوبِ اسلام" لکھی:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک — چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

---

[1] رسالہ ناخدا فی بیان مسئلہ قنوت نازلہ (مطبوعہ اردو) بمبئی ۱۸۷۷ء [illegible]

[2] انجمن اسلام بمبئی، ترجمہ خط انگریزی مرسلہ عالیجناب ناخدا محمد علی صاحب روگھے و مرحوم جب بدرالدین طیب جی ٹائمز آف انڈیا ۶ نومبر ۱۸۸۶ء بمبئی

[3] تحفۂ حمیدیہ۔ بدرالدین عبداللہ قریشی ۱۹۰۰ء بمبئی

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے — عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک

اکابرِ دین اور سیاست نے عملی اقدام کیے، مولانا محمد علی کی کوشش سے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں محاذ پر ایک طبی وفد نومبر ۱۹۱۲ء میں بھیجا گیا، اس میں شعیب قریشی (وزیر حضوری بھوپال) چودھری خلیق الزماں (وکیل لکھنؤ)، عبدالرحمن صدیقی (بنگال) اور عبدالعزیز انصاری تھے۔ یہ اس زمانے میں علی گڑھ کے طالب علم تھے مگر جوش کا عالم یہ تھا کہ ترکی کے محاذِ جنگ پر مجاہد اور خادم بن کر چلے گئے۔ ڈاکٹر سید عبدالرحمن جو اس وقت انگلستان میں طبی تعلیم سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے اور ڈاکٹر نعیم انصاری دہلی سے سیدھے قسطنطنیہ پہنچے۔ اس وفد کے تمام اخراجات ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے چندوں سے پورے کیے۔[1] ترک بھائیوں کی خدمت کے لیے ہندوستانی مسلمانوں کا اپنی قسم کا یہ پہلا کارنامہ تھا۔

چھ مہینوں کے بعد جنگ کے اختتام پر جب ڈاکٹر انصاری اپنا طبی وفد لے کر ہندوستان آئے تو ان کے استقبال و خیر مقدم کے لیے بمبئی میں ایک جلسہ ہوا، مولانا شبلی نعمانی جو اتفاق سے اپنے محبوب شہر میں موجود تھے ایک بڑی پُر درد نظم لکھی:

خبر آتی ہے ہم تک یہ جنابِ حضرتِ باری — کہ آئے خیریت سے میرِ اہلِ وفدِ انصاری
ہزاروں گرچہ ہیں ہمدرد بھائیوں کی خدمت کی — یہی تھا دردِ اسلامی، یہی تھی رسمِ غمخواری
جو پوچھو تو یہ انصاری بھی ہوا اور مہاجر بھی — وہ سب اہلِ وطن کو چھوڑ کر پہنچے پئے یاری

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر پھاہے لگائے ہیں — شہیدانِ وطن کے جامۂ پُرخوں بھی دیکھے ہیں
خوشا قسمت کہ اسلامی قرابت بھی تو سمجھے — کہ تم نے لیلیٰ اسلام کے مجنوں بھی دیکھے ہیں

۱۹۱۴ء کی پہلی جنگِ عظیم میں اتحادیوں کے خلاف ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا، ابھی تک

---

[1] [illegible] ۵۹۶ — ۵۹۷

سلطنت عثمانیہ کی وسعتیں حجاز و عراق اور فلسطین کی سرحدوں کو سمیٹے ہوئی تھیں، ارض مقدس اور دیگر مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں تشویش اور اندیشوں کا آسیب چھانے لگا، خلافت امت مسلمہ کی ہمیشہ سے سیاسی اور مذہبی علامت رہی ہے، انقراضِ خلافت کے اندیشوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جوامرد اور جیالا بنادیا، مولانا محمد علی شوکت علی ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری، مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمود الحسن نے صدائے احتجاج بلند کی اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کی ضمانت چاہی اور وعدہ مانگا، برطانوی حکومت نے مصلحت سے کام لیا لیکن جب اتحادیوں نے جرمنی کو مات دے دی تو مصلحت علانیہ عداوت بن گئی بساطِ سیاست پر انھوں نے غدارانِ اسلام کو وزیر اور شاہ بناکر مسلمانوں کے رخ پر لاکھڑا کیا، حجاز میں شریف حسین، اردن میں عبداللہ، عراق میں امیر فیصل انگریزوں کے مہرے بن گئے، فلسطین مسلمانوں کے صبر و تحمل کی امتحان گاہ بن گیا اور ارض مقدس یہودیوں کے ناپاک ہاتھوں میں چلا گیا۔

ہندو مسلم اتحاد کے سیاسی سفر میں تحریکِ خلافت ایک تاریخی سنگِ میل ہے ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے اس تحریک کو قومی رنگ دے دیا، مسلمانوں کی بے پناہ اکثریت نے خلافت تحریک کی آواز پر لبیک کہا، ہندوستان کے گوشے گوشے میں خلافت کمیٹیاں بن گئیں، ہر طرف جلسے ہونے لگے اور جلوس نکلنے لگے اور اترپردیش سے کربمبئی تک فضا اس ترانے کے بول سے گونجنے لگی:

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ابھی خلافت تحریک زور پکڑ ہی رہی تھی کہ سودیشی تحریک اور ترکِ موالات کے نعرے گونجنے لگے، کانگریس نے غیر ملکی کپڑا استعمال کرنے کی مخالفت کی اور دیسی صنعتوں اور ہاتھ کرگھا کی ترقی کو اپنے معاشی پروگرام میں بنیادی جگہ دی اس سودیشی بائیکاٹ کا نعرہ کانگریس کے پنڈال سے بلند ہوا اور مومن برادری کی کارگاہوں میں 'اشارہ' بن کر گونجا اور ملک کی تحریک آزادی سے تانے بانے جوڑ کر فرقہ پرستی اور برطانوی استعماریت کے خلاف ایک مستحکم محاذ کی صورت ابھر کر سامنے آیا، سیاسی کاموں میں حصہ لینے والوں میں اب تک زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ افراد تھے لیکن جب سے مسلمان فرقہ پرست سیاست سے نکل کر عام ملکی سیاست میں

داخل ہوئے پرانے لوگ خصوصاً علماء اور اساتذہ کانگریس کے زیادہ قریب آگئے اس طرح سارے ملک میں ہندو اور مسلم اتحاد کا خوشگوار منظر افق سیاست پر نظر آنے لگا اور آزادی کی تحریک رنگ پکڑنے لگی، تحریکِ خلافت کے کارکن اور ممبر کانگریس میں شامل ہونے لگ گئے اور ملک کی آزادی کی تحریک آگے بڑھنے لگی۔

بدیشی مال کے بائیکاٹ اور عدم تعاون کی تحریک نے مومن برادری کو بڑی آزمائشوں میں ڈال دیا تھا، خصوصاً مئو، مبارک پور، سرائے میر اور پھولپور (اعظم گڈھ) کے کرگھوں پر بُرا اثر پڑا، کاروبار ٹھپ ہوگیا، بدیسی مال کی گانٹھوں کو خلافت اور کانگریس کمیٹی کے اراکین نے مہروں سے بند کردیا اور کپڑے اور سوت کے تاجروں کی دکانوں کے آگے دھرنے شروع ہوگئے، مئو اور مبارک پور میں جہاں بافندگی کی صنعت اور کپڑوں کی بزازی پران کا غلبہ تھا لاکھوں روپے کا بدیسی مال آنا بند ہوگیا، لیکن برادری کے سربرآوردہ لوگوں نے اس تحریک کے سامنے سر جھکا کر ایسی سربلندی حاصل کی کہ ضلع بھر میں اس کی مثال نہیں ملتی، مبارک پور کے رہنما مولوی شکر اللہ اور مئو کی ذی اثر شخصیت مولوی عبداللہ کی رہنمائی میں عدم تعاون کی تحریک میں ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی، اس ضلع کی گرفتاری میں پہل قصبہ مبارک پور سے ہوئی، مقدمہ چلا اور اس قصبے کے اکیس مسلمان جیل گئے ان میں مولوی شکراللہ بھی تھے[1]

زنداں میں بھی عاشقانِ آزادی کے جنون میں فرق نہیں آیا اور نہ حوصلوں کو آہنی سلاسل پست کرسکے، مولوی شکراللہ نے مدینہ پریس سے ایک طلان شایع کروایا عنوان تھا: "مادرِ وطن کے قدموں پر سب کچھ نثار" اس میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ بدیشی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کا جو حکم ۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو دیا گیا ہے" اس کے بموجب ہندو سوراج کو حاصل کرنے کے لئے میں صدق دل سے اس خدائے وحدہٗ لا شریک کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کرتا ہوں کہ آج سے غیر ملکی کپڑے ہرگز نہ خریدوں گا نہ پہنوں گا اور اپنے دوسرے لوگوں کو بھی سودیشی کے استعمال کی ترغیب دیتا رہوں گا"[2]

---

[1] [illegible] ... کی سیاسی تحریکات کی تمام معلومات اپنے محترم دوست اور ... ڈاکٹر شبیب معنی کی ... سے ... حکیم محمد ... صاحب کی تصنیف ہے، حاصل کی ہیں ... [illegible]

[illegible] ... قومی بیداری ... ڈاکٹر شبیب معنی ... [illegible]

سودیشی ... [illegible] ... (۱) ... (۲) ... [illegible]

... مولانا شکراللہ مبارکپوری کا تذکرہ ... [illegible]

[2] [illegible]

۲۱ر فروری ۱۹۲۲ء کو دفتر خلافت سے ایک گشتی مراسلہ جاری کیا گیا اس کے داعی بھی مولوی شکر اللہ تھے، شرکا کے نام یہ تھے :

شیخ طیب (صدر) مولوی عبدالمجید (صدر خلافت و کانگریس) مولوی نعمت اللہ (نائب سکریٹری) حافظ نعیم اللہ (محاسب) شیخ علی حسن (خزانچی) شیخ سخاوت علی (نائب ناظم) حاجی عبدالحق، غلام رسول (نائب ناظم) حلیم اللہ (خزانچی) حاجی نعمت اللہ (صدر) عبدالرحمن (دلال) حاجی محمد بھیکو سیٹھ، مولوی فقیر اللہ، حاجی سمیع اللہ، حاجی محمد فتح حوالدار، محمد صادق حسن، حاجی عبدالحق کربلائی اور چودھری محمد اسماعیل۔

برادری میں ہمیشہ سے جماعتی اتحاد و تعاون اور امداد باہمی کے جذبات و احساسات موجود تھے اس نازک مرحلے پر جبکہ ان کی کرگھا صنعت کو دھچکا بھی پہنچا اور خسارہ بھی اٹھانا پڑا انہوں نے ملکی سیاست اور تحریک میں عملی قدم اٹھا کر یہ ثابت کیا کہ

ہو حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حرف مکرر کی طرح ایک اور عہدنامہ قصبہ مبارک پور کے بنکروں نے لکھ دیا :

"ہم لوگ ساکنان قصبہ مبارک پور اعظم گڈھ خدا کو حاضر و ناظر جان کر یہ عہد و پیمان اقرار کرتے ہیں کہ آج کی تاریخ سے بدیسی کپڑا اور سوت نہ منگائیں گے اور نہ فروخت کرینگے، اور اگر اس معاہدے کے خلاف کریں تو خلافت کانگرس جو مناسب کارروائی از قسم تاوان وغیرہ کریگی ہم لوگوں کو منظور ہوگا۔ الرقم ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۴۰ ہجری / ۸ رجولائی ۱۹۲۲ء دستخط فقیر اللہ، امانت اللہ، عبدالسبحان، محمد سعید معلم مدرسہ، شافی محمد، منور۔"

دوسرے ہفتے سوت فروشوں کی میٹنگ میں طے ہوا کہ ولایتی سوت بنٹ وغیرہ کی بجائے بدیشی سوت پندرہ دنوں کے اندر منگایا جائے ورنہ خلافت کانگرس مناسب کارروائی عمل میں لائیگی، تحریک کے ہراول دستے کے سالار مولوی شکر اللہ، منشی رقصاب، محمد منیر، شوکت علی، قاری کلیم اللہ اور علیم الدین کو سید محمد باقر علی سیکنڈ کلاس مجسٹریٹ تھانہ مبارکپور کی عدالت سے قانون کے تحت دفعہ ۵۰۶ کی رو سے ہر ایک کو چھ ماہ قید کی سزا ہوگئی۔ (۱۹ر اگست ۱۹۲۲ء) [1]

---

[1] ڈاکٹر شعیب احمد اعظمی - ایضاً۔ ص ۴۱- ۴۲ حاشیہ

لیتے رہے۔ مولوی اسلم انصاری کے قرابت دار رفیق انصاری اور شفیق انصاری دونوں بھائی
خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے اولین مجاہدین میں سے تھے، ان کے ساتھ اقبال انصاری
بھی تھے، اکابرِ شہر میں حافظ عبدالمجید انصاری قومی اور ملی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے،
مدرسہ اسلامیہ کی نگرانی، اس کی بقا اور توسیع سے متعلق نمایاں خدمات سرانجام دیتے رہے
جمعیۃ کی تمام تر تحریکات میں حافظ جی کے خاندان نے ملکی اور قومی سیاست کے ہر موڑ پر رہنمائی کی
تھی ان کے ہونہار صاحبزادے ڈاکٹر شکیل انصاری بڑے خوش الحان تھے۔ جلسوں
میں مترنم آواز میں نظمیں پڑھا کرتے تھے۔

حافظ شعیب خیرآبادی قوم پرور اور محب وطن تھے، جمعیۃ کے معاون رہے اور تمام تحریکات
میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ان کا اپنے وطن خیرآباد کے لوگوں پر بڑا اثر تھا، اپنی تحریر اور
تقریر کے ذریعے اپنے خیالات کا ابلاغ اور اظہار کرتے تھے۔

عبدالحی انصاری شہر اعظم گڑھ کے قوم پرست رہنما تھے، ضلع کانگریس اور صوبہ کانگریس کی
شاخوں کے رکن رہے، بڑے پرجوش اور سرگرم مجاہد آزادی تھے، آپ اعظم گڑھ بلدیہ کے ممبر
بھی رہ چکے تھے۔

سواد اعظم گڑھ کے قصبات اور قریات کے لوگوں پر مولوی عبدالباری مبارک پوری کا بڑا اثر
تھا، پورہ معروف، غاب پور، ولید پور اور آس پاس کے علاقوں کی قومی زندگی کے روح رواں
تھے، بڑے بااثر، فعال اور سرگرم کانگریسی رہنما تھے، جمعیۃ سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔
تبلیغی اور اصلاحی تحریکوں کا بھی ساتھ دیتے رہے، ۱۹۴۷ء میں مبارک پور میں جو فساد ہوا
اس میں بے گناہ مسلمانوں کی مدافعت کرنے کے جرم میں یوپی حکومت نے ان کی گرفتاری کے لئے
وارنٹ جاری کیے مگر یہ "برو ایں دام بر مرغ دگر نہ" کہتے ہوئے "عنقا" بنے رہے، مدرسہ
احیاء العلوم کے برسوں ناظم بنے رہے۔

اعظم گڑھ میں جب خلافت اور عدم تعاون تحریک کے تعاون سے پہلی خلافت کمیٹی بنی
تو اس کے مجلس عاملہ کے ممبروں میں مولوی یحییٰ کو بھی شامل کیا گیا تھا، آپ کا شمار زعماء
ملت میں کیا جاتا تھا، مولوی یحییٰ اعظمی قومی نظمیں لکھتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جب جواہر لال نہرو
اعظم گڑھ کے ایک جلسے میں شرکت کے لئے آئے تو اس شاندار اور بے مثال جلسے میں ان کی
نظم ڈاکٹر شکیل انصاری نے بڑی خوش الحانی سے پڑھی:

نہ پوچھو شہر بلیاؔ کے خاکستر کی اب عظمت
کہ اک اک ذرہ اس کا ردکش صد آفتاب آیا

ڈاکٹر سعید انصاری کی جامع صفات شخصیت تھی۔ قومی، ملی اور تعلیمی میدانوں کے یکتا شہسوار تھے۔ امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لائے تھے، پھر ہر تحریک کے روح رواں بن کر برسوں افق سیاست پر درخشندہ ستارہ بن کر چمکتے رہے لیکن چونکہ فعال طبیعت کے مالک تھے نچلا نہ بیٹھا گیا، تعلیمی میدان میں کود پڑے ڈاکٹر ذاکر حسین کے اصرار پر جامعہ ملیہ میں استاد کی حیثیت سے مسند درس و تدریس کو زینت بخشنے لگے، پرنسپل بھی رہے اور ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے ایک ادارۂ نسواں قائم کیا۔ خواتین کے لئے اسکول قائم ہوا تو نسوانی تعلیم کی تاریخ میں ایک نیا باب کھلا — جو آج تک اپنی تاریخ کو آگے بڑھا رہا ہے، ڈاکٹر صاحب کی بڑی باغ و بہار شخصیت تھی۔

مئو ناتھ بھنجن میں وہابی تحریک

مئو میں وہابی تحریک کا بڑا دور رہا ہے۔ تحریک شہیدین کے پہلے دور میں تو یہاں کسی قسم کی شرکت کا علم نہ ہوسکا لیکن دوسرے دور میں تحریک کے ساتھ مئو کی وابستگی اچھی طرح معلوم ہے رئیس العلماء مولانا فیض اللہ مئوی (م ۱۳۰۶ھ) عظیم آباد پٹنہ گئے تو سادقین صادقپور کی تنظیم و تحریک میں شامل ہوگئے آپ مجاہدین و سرمایۂ جہاد کی فراہمی کے لئے دورہ کرتے رہتے اور اس سلسلہ میں باربار مئو آنا پڑتا تھا۔ خراسانی تحریک کے لئے یہاں سے امدادی رقوم انہیں کے ذریعہ بھیجی جاتی تھی۔ مولانا محمد احمد ناظم مئو کی مشہور بزرگ ہستی کے بڑے والد حاجی ولی محمد اور چچا حاجی محمد علی در محمد گر مہتہ (م ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۰ء) کے زمانہ اور اس کے بعد بھی امداد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ مولانا محمد احمد ناظم (م ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء) جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کے حامی تھے لیکن تقسیم ہند کے بعد ہ تو وہ اور ان کے ہم خیال علماء نہ صرف مسلم لیگ کی بلکہ "کمیونزم" جیسی غیر فطری تحریک کے مخالف بن گئے۔ مولانا عبداللہ شائق مئوی (م ۱۳۹۲ھ، ۱۹۷۲ء) کٹر کانگریسی تھے اور خلافت کے دور میں سیاسی مشاغل بہت زیادہ تھے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ خیر البشر انصاری مئو کے ایم ایل اے تھے۔ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جمعیۃ العلماء کے تھے کانگریس کی طرف سے ۱۹۵۲ء میں پانچ سال اسمبلی کے ممبر رہے۔

بنارس کے مومن مدبرین

بنارس ہمیشہ سے یہاں کے مسلمانوں کے لئے میدان کارزار عمل بنا رہا، فرقہ وارانہ فسادات

نے بیسویں صدی کے آغاز (اکتوبر ۱۸۰۹ء) سے لے کر اختتام تک بنارس کی تاریخ کو خونچکاں بنا دیا تھا، ہندوؤں کا یہ مقدس مقام فرقہ وارانہ ذہنیت کی مسموم ہواؤں سے کثیف بن گیا تھا، مسلمانوں کے تہوار خصوصاً محرم وغیرہ بھی بڑی حد تک اشتعال انگیزی کا سبب بنے رہتے۔ [1]

وہابی تحریک میں بنارس کے علماء بھی شریک تھے اور قومی و ملی جنگ آزادی اور تحریکات میں بھی یہ مرد مومن پیش پیش رہے، کانگریس، خلافت اور دیگر سیاسی تحریکات میں بنارسی حضرات نے بڑی جوانمردی دکھائی ہے۔ مولانا عبدالجبار بنارسی (۱۳۲۴ھ-۱۲۸۶ھ) (محلہ مدنپورہ) کے دادا حاجی حافظ عبدالستار محلہ کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے، مولانا عبدالجبار دارالعلوم دیوبند سے [illegible] فراغت پڑھ کر سیاست کی نذر ہو گئے، تقریباً چھبیس سال تک جمعیۃ العلماء بنارس کے صدر رہے۔ [2]

مولانا حکیم عبدالعالی بنارسی (۱۳۲۱ھ-۱۹۰۳ء) نے مدنپورہ میں جہاں مومن برادری کی غالب آبادی تھی ایک فوجی تربیتی کیمپ زمانہ خلافت تحریک (۱۹۲۰ء) میں قائم کیا تھا جس میں نوجوانان مدنپورہ بنارس کو فنون سپہ گری کی تربیت دی جاتی تھی۔ مولانا انگریزی راج سے سخت نفرت رکھتے تھے، ترک موالات کے زمانے میں بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کی تحریک کے روح رواں تھے، خود ہمیشہ کھدر استعمال کرتے تھے جو اس دور کے مجاہدین کی قابل فخر وردی تھی۔ قومی تحریکات کی رہنمائی نے انہیں ملک کے دیگر قائدین سیاست کی صفوں میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ [3]

مولانا محمد اسحاق بنارسی ندوی (۱۳۰۹ھ - ۱۴۰۶ھ) مفتی محمد ابراہیم بنارسی (۱۳۰۲ھ-۱۳۹۶ھ) خطیب شاہی جامع مسجد کے خلف اکبر تھے۔ آپ علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، شعلہ بیان مقرر تھے اور ایک جادو بیان خطیب۔ جمعیۃ العلماء ہند میں شامل ہو کر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک رہے اور اپنی شعلہ بیانی سے مجاہدین کے سینوں میں آزادی کی روح پھونک دی۔ تقریروں کے سلسلے میں اشعار بھی کہے، انجمن اجرار مکاتب اور بعض دوسرے جلسے میں شریک ہوتے غرضیکہ کم و بیش ۲۵ سال تک خطابت کا جادو جگاتے رہے۔ شروع ہی سے آپ کو جمعیۃ سے گہری وابستگی تھی، آپ عرصہ تک جمعیۃ العلماء بنارس کے صدر رہے۔ مولانا

۱، ۲، ۳۔ وسیم احمد اعظمی، تذکرہ علماء بنارس، ص ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۱۶

کے تعلقات شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے لے کر تمام قومی یا نیشنلسٹ مسلمانوں سے یکساں طور پر تھے۔ تعلیمی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے، ملک کے اکثر علماء و اکابر سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے اور ملک کے مشاہیر علماء کرام بنارس آتے تو آپ ہی حق میزبانی ادا کرتے۔

مولانا حکیم محمد یوسف بنارسی (۱۹ ۱۲ء - ۹۶ ۱۳ھ) کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ آپ کے تعلقات جمعیۃ علماء ہند کے علاوہ خلافت کے بانیان مولانا محمد علی اور شوکت علی (علی برادران) سے بڑے گہرے تھے ۱۹۴۶ء کے پر آشوب زمانے میں آپ تقسیم ہند کی مخالفت میں پیش قدم تھے اسی لئے ہدف ملامت بنے رہے۔

مولانا عبد المجید حریری بنارسی (۱۳۱۲ھ - ۱۳۹۲ھ) جامع صفات بزرگ تھے مولانا حکیم عبد العالی بنارسی کے قریبی رشتہ دار تھے، عالم فاضل تھے، ادیب تھے، اور خطیب، مشاہیر ہند میں آپ کا شمار ہوتا ہے اور برادری کو آپ پر فخر ہے کہ آپ نے ہمیشہ اس کا نمایاں رکھا، صوبائی انصار کانفرنس گورکھپور منعقدہ ۲۶، ۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء اپنے خطبۂ صدارت میں آپ نے قوموں کی طبقاتی درجہ بندی کا ذکر کرتے ہوئے انصاری برادری کی ترقی کے اسباب بتائے۔ خالص دینی و علمی سعر وفیت کے باوجود آپ نے تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا، گرفتار بھی ہوئے، ۱۹۵۱ء میں مومن کانفرنس کے اجلاس میں آپ نے جو خطبۂ صدارت دیا تھا، وہ نثر کا بہترین نمونہ ہے۔[1]

انّاؤ کے انصاری سیاستداں

حسب سابق کی طرح یہاں بھی مشاہیر اور سیاسی مدبرین کے عنوان کے تحت تین انصاری رہنماؤں کے ذکر کا اعادہ مناسب ہوگا۔ مجاہد آزادی جناب حبیب الرحمٰن انصاری (۱۹۲۳ - ۱۹۱۴ء) کے بارے میں انیس الرحمٰن انصاری (نئی دہلی) نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس میں ان کی جامع شخصیت کے کئی پہلو اجاگر کئے گئے ہیں، طالب علمی ہی کے زمانے سے آپ نے سیاسی تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے مسلم اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ میں داخلہ لیا اور سات سال تک زیر تعلیم رہے پھر جب سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون کی سرگرمیاں

---

[1] وسیم احمد قاسمی۔ تذکرۂ علماء بنارس۔ ص ۱۸۹

[2] دسمہ ان کا ذکر دوسرے باب اترپردیش (شمالی ہند) کی انصاری برادری میں ہو چکا ہے۔

شروع ہوئیں تو تعلیم کا تانا توڑ کر عملی میدان سے ناطہ جوڑ لیا' یہ دور آپ کے لیے بڑی کشاکش اور آزمائش کا تھا ایک طرف شمعِ علم' اور دوسری طرف سیاسی سرگرمیوں کی روشن مشعل اور پروانہ وار آتشِ جنگِ آزادی میں کود پڑنے کا ابراہیمی جذبہ' علی گڑھ میں موصوف کے دورانِ قیام میں سیاسی افق کے درخشندہ ستارے مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر ذاکر حسین نمودار ہو چکے تھے۔

حبیب الرحمن انصاری پہلی بار ۱۹۴۶ء کے آزمائشی انتخاب میں یو۔پی اسمبلی کی کانگریس نشست جیتی' اس کے بعد دوسری مرتبہ ۱۹۵۲ء میں عام انتخابات میں اسی کے پرچم تلے پھر فتحیاب ہوئے اور اس کے بعد عرصہ تک سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے' ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

"حبیب الرحمن انصاری صاحب ایک نمایاں شخصیت کے حامل تھے۔ ایسی شخصیتوں کو تاریخ کے سنہرے صفحات پر اہم مقام دے کر نئی نسل سے روشناس کرانا وقت کا اہم تقاضا ہے" [۵۵]

"موصوف کی عملی زندگی کے روشن کارناموں نے ان کے فرزند ارجمند جناب ضیاء الرحمن انصاری صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے" آل انڈیا مومن کانفرنس کی بحیثیت صدر رہنمائی فرماتے رہے اور حکومتِ ہند میں وزارت کے عہدے پر فائز رہے۔

غازی پور کے انصاری غازیان

قصبہ یوسف پور (ضلع غازی پور) کے عبدالرحمن انصاری کا سلسلۂ نسب حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے' کمپنی بہادر کے زمانے میں ضلع بلیا کے صدر امین تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران دوسرے وفادار سرکاری ملازمین کی طرح آپ نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا لیکن ان کے تینوں صاحبزادگان حکیم عبدالرزاق انصاری' حکیم عبدالوہاب نابینا اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے تحریکِ آزادی میں حصہ لے کر قرضہ ادا کر دیا اور حتی المقدور تلافیٔ مافات کر دی۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری (۲۵ دسمبر ۱۸۸۰ء - ۱۰ مئی ۱۹۳۶ء) نے لندن سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جنگِ بلقان کے موقع پر طبی وفد لے کر محاذِ جنگ پر گئے تھے' اس وفد میں عبدالعزیز

---

[۵۵] کانگریس صد سالہ جشن ص۲۶ مجاہد آزادی جناب حبیب الرحمن انصاری' ضیاء الرحمن انصاری کی دہلی

انصاری اور لندن میں زیرِ تعلیم ڈاکٹر نعیم انصاری شامل تھے۔ وہ جب ممبرانِ وفد خیریت سے آئے تو ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے لیے سیاسی تحریکات کے کئی محاذ کھل گئے اور بہت جلد ان کا شمار ملکی و ملی عمائدین اور قائدین میں ہونے لگا، سیاسی مدبرین کی دمکتی کہکشاں میں رخشندہ اور درخشندہ ستاروں میں مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی، وقار الملک، حسین احمد مدنی، ذاکر حسین خان کے ساتھ ڈاکٹر مختار انصاری بھی تابندہ بن گئے۔ آپ کی کوٹھی دارالسلام جو لکھنؤ میں دریا گنج میں تھی بڑی تاریخ ساز ثابت ہوئی یہیں کانگریس کے عظیم رہنماؤں کی کئی فیصلہ کن نشستیں ہوئیں۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا پورا گھرانہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اسیر مالٹا کا بڑا معتقد تھا اور انہیں سے بیعت تھا۔

ڈاکٹر انصاری ایک عظیم مجاہد آزادی، قوم و ملت کے حقیقی ہمدرد، غمگسار اور عوام کے بے لوث خادم تھے، سیکولر کانگریسی ہونے کے باوجود آپ راسخ العقیدہ مسلمان تھے وہ سارے جہاں کے مسلمانوں اور انسانوں کا درد جگر میں رکھتے تھے ایک آفاق گیر اور عالمگیر نظریہ رکھتے ہوئے یہ اپنی برادری کو بھولے نہ تھے ورنہ اس کے خیال سے غافل رہے جس کے یہ چشم و چراغ تھے۔ ڈاکٹر مختار ایک شاہی شخصیت اور کردار کے حامل تھے اور وسیع النظری اور روشن خیالی کا پیکر تھے، ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک۔ ڈاکٹر انصاری کی عظیم خدمات کو نہ قوم فراموش کر سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی سیاسی اور قومی تاریخ ان کے عنوان سے خالی رہ سکتی ہے دہلی کی مشہور درسگاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالنے والوں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا بڑا حصہ تھا۔" [1]

غازی پور دیارِ پورب میں علم و دانش کا گہوارہ تھا، فرنگی محل کے آسمان کا ایک ستارہ کہکشاں سے بچھڑ کر غازی پور کے سطحِ علم پر نمودار ہوا، نام مولانا رحمت اللہ تھا جو بارہ پشتوں سے قطب الدین سہاری حضرت ایوب انصاری رضؓ کے نام لیوا کے سلسلۂ اولاد میں تھے۔ چشمۂ رحمت کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا، اس چشمۂ رحمت سے مئو، اعظم گڑھ اور مبارک پور کے تشنگانِ علم سیراب ہوتے رہے۔ علیگڑھ کے ہمارے انصاری دوست ڈاکٹر محمود الحق جو ادارۂ علوم اسلامیہ میں تھے غازی پور کے ایک انصاری علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔

---

[1] بشکریہ شمیم انصاری (سابق رپورٹر ہندوستان ٹائمز بمبئی) در حوالہ "انصاری ٹائمز" پندرہ روزہ بمبئی، یکم جون ۱۹۸۰ء

عبدالقیوم انصاری

سنہ ۱۹۴۶ء کے فیصلہ کن چناؤ میں مومن کانفرنس کے پانچ ممبران امیدوار بہار اسمبلی کے لیے کامیاب ہوئے[1] مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مزید تین انصاریوں نے نشستیں حاصل کیں، عبدالقیوم انصاری ریاستی وزارت میں لے لیے گئے ان کی کوششوں اور مطالبات کے نتیجے میں ۵۰۰ مسلم ویلفیر مکتب ساری ریاست میں قائم کیے گئے۔ ۱۲۰۰ ویبنکر سوسائیٹیوں کا قیام عمل میں آیا، مومن اور پسماندہ مسلم برادریوں کے لیے کالج کی سطح تک 'وظیفہ معاف' رکھا گیا اور میڈیکل اور دیگر فنی اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کے لیے نشستیں محفوظ رکھی گئیں۔[1]

عبدالقیوم انصاری یوپی کے اہلحدیث مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، تجارتی سلسلے کے سبب بہار میں بودوباش اختیار کرلی تھی، جب ڈاکٹر محمود کی تحریک سے حکومت بہار نے پسماندہ طبقہ کی مدد کے لیے تجاویز رکھیں اور "استحقاق مراعات" کا دستور بنایا تو انصاری برادری کو پورا فائدہ پہنچا، عبدالقیوم انصاری کی جدوجہد سے برادری تیزی سے زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھنے لگی، لیکن انصاری برادری کے انگریز نواز رہنماؤں نے جب دیکھا کہ کہیں "یہ ڈوبا ہوا تارہ مرکز نہ بن جائے" تو وہ لوگ مومن کانفرنس کی صفوں سے نکل گئے۔ اب انصاری صاحب مومن کانفرنس کے مسلمہ رہنما بن گئے ان کی اس قیادت کی وجہ سے غیر مومن برادری میں اختلاف، خودغرضی کے جذبات پیدا ہونے لگے، عبدالقیوم انصاری نے برادری کی فلاح وبہبود کے بے نمایاں کام کیے ہیں، پٹنہ میں عبدالقیوم انصاری ہوسٹل، مومن طلبہ کے لیے انہوں نے بنوایا تھا۔

کوپاگنج کی بساط سیاست

کوپاگنج میں سیاست کے بڑے شاطر کھلاڑی تھے، تقسیم ہند سے پہلے سیاسی خیالات اور مختلف سیاسی جماعتوں نے قصبہ کو تقسیم کر رکھا تھا یہاں تک کہ تعلیمی اداروں پر بھی سیاست کی قینچی چل جاتی تھی۔ اصل جھگڑا جمعیت علماء اور مسلم لیگ میں تھا۔ کوپاگنج میں مسلم لیگ کا بڑا زور دورہ تھا۔

---

[1] مومن کانفرنس کے جو پانچ امیدوار جیتے تھے (۱) عبدالقیوم انصاری (رانچی) (۲) محمد یسین انصاری [illegible] (۳) [illegible] (۴) [illegible] (۵) محمد یسین (مظفرپور)۔ مسلم لیگ کے منتخب امیدوار تھے (۱) [illegible] انصاری [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible] مبارک کریم (بہار شریف)

جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے قلیل تعداد میں تھے دونوں جماعتوں کی باہمی کشیدگی کے باعث جمعیۃ العلما کو الگ ایک مدرسہ جامع العلوم قائم کرنا پڑا۔ مئو میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ یہاں دارالعلوم کے مقابل ایک اور مدرسہ مفتاح العلوم کے نام سے تھا ان دونوں کے ارباب حل و عقد میں ہمیشہ ٹھنی رہتی تھی۔ اہل مفتاح العلوم نے جمعیۃ کا ساتھ دیا تو دارالعلوم کے ارباب بست و کشاد مسلم لیگ کے حامی ہوگئے۔ مولانا اسلام الحق کوپا گنجی (متوفی ۱۳۹۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء) کا رجحان جمعیۃ العلماء کی طرف تھا کیونکہ ان کے نزدیک اس کے نظریے عین دین شریعت کے مطابق ہیں جسے اکابرین نے بھی اپنایا ہے۔ جماعت اسلامی کو وہ لوگ صحیح راستہ پر گامزن دکھائی نہیں دیتے تھے "اس وجہ سے کہ اس کے عناصر و کارکنان آزاد خیال واقع ہوئے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ دین کے اندر سہولت چاہتے ہیں اور یہ تغیر دین ہے جو بہرحال معیوب ہے" مولانا اسلام الحق کو اس حقیقت سے انکار نہیں تھا کہ جماعت اسلامی کی تنظیم بڑی مستحکم ہے اور ان کے کارناموں کے منکر بھی نہ تھے اگر ایسی تنظیم کسی دوسری پارٹی نے پیدا کرلی ہوتی تو آج وہ اوج ثریا پر ہوتی۔ "جمہور کا بھی یہی خیال تھا کہ کسی بڑا جمعیت کے متعلق ان کے عقائد قابل قبول نہیں ہیں کیوں کہ وہ ان کو جید برحق نہیں مانتے اسلاف کے بہت سے مسائل ان کے ترک ہیں۔[1]

جمعیۃ العلماء کی تنظیم اکابرین دین و سیاست کے نزدیک مستحکم نہ تھی لیکن بہرحال وہ مسلمانوں کی ایک بہی خواہ جمعیت ہے جس کے عقیدہ میں کوئی خرابی بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔

کوپا گنج کے مولانا عبیداللہ (متوفی ۱۹۶۶ء) مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مجلس مشاورت ان تمام تنظیموں میں سے مسلم لیگ سے ایک زمانہ تک قریب رہے کیونکہ جب وہ اس کے ایک فرد تھے ان کا خیال تھا کہ یہ جماعت مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے کوشاں و سرگرداں تھی۔ ان کے نزدیک جمعیۃ العلماء مسلمانوں کے حق میں کچھ مفید ثابت نہ ہوسکی اس لیے کہ ان لوگوں کے پیر کاٹے گئے ہیں یہ خود اپنے پیروں پر نہیں بلکہ ان کا کل اختیار کانگریس کے ہیں۔

لیکن کوپا گنج کے بعض شیوخ اور علماء جمعیۃ العلماء کے سرگرم رکن رہے ان میں مولانا حافظ عبدالسلام (متوفی ۱۹۶۲) اور مولانا محمد سلیم (۱۳۲۲ھ - ۱۳۸۲ھ) قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے موقع پر جب جمعیۃ و لیگ کے درمیان سخت کشیدگی پیدا ہوگئی تھی آپ تنہا جمعیتی

---

[1] تذکرہ مشاہیر کوپا گنج، تالیف مولانا محمد عثمان معروفی، مفتی صادق ابوالکلام حبیب بندوی ۱۹۸۸ء ص ۲۵ - ۲۹

تھے اور مصباح العلوم کا پورا اسٹاف لیگی تھا، باہم کشیدگی کے نتیجہ میں آپ کو شاخ مصباح العلوم سے برطرف ہونا پڑا۔ [1]

تقسیم ہند کے بعد جب مسلم لیگ بھی ہجرت کر گئی تو کوپاگنج کی مسلم اکثریت اشتراکی بن گئی اور اتنی مضبوط کمیونسٹ پارٹی وجود میں آئی کہ یہ کیرالا کی پارٹی کی ثانی بن گئی۔

چیئرمین محمد مصطفےٰ شہید

کوپاگنج کی کمیونسٹ پارٹی کو محمد مصطفےٰ[2] ولد عبداللہ سیٹھ کوپاگنج جیسے جیالے نوجوان کی رہنمائی اور حمایت حاصل تھی۔ آپ کوپاگنج کے رئیس اعظم سیٹھ حاجی عبدالرب اور حاجی محمد ادریس سابق صدر کمیٹی مدرسہ مصباح العلوم کے بھائی تھے، دولت و ثروت قدم چومتی تھی، احسن الخالقین نے جسمانی طاقت و صحت سے نوازا تھا، بہادری اور دلیری نے حوصلہ مند بنا دیا تھا بلاشبہ آپ کو "شیر کوپاگنج" کہنا صحیح تھا، مزید برآں متقی اور دیندار تھے، وضع قطع، صورت و لباس میں صلحاء اور دینداروں کا طور طریقہ اختیار کر لیا تھا اور لازم پکڑ رکھا تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے قصبہ کے چیئرمین منتخب ہوئے اہل قصبہ کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، دفتر ٹاؤن ایریا میں کوئی ان سے الجھ گیا، اس کو بہانہ بنا کر اکثریتی فرقہ کے شرپسندوں نے آپ کے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں آپس میں، وہ مشغول رہے دن جب ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ مطابق ۱۲ جولائی ۱۹۵۸ء کو قصبہ میں معمولی خلفشار تھا کہ آپ سائیکل پر گھر لوٹ رہے تھے رات کا وقت تھا کہ اچانک شرپسندوں نے ایک مکان سے جہاں یہ گھات میں بیٹھے تھے نکل کر آپ کی سائیکل روک دی اور پے در پے آلہ جارحہ سے حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا اور تڑپتی ہوئی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے آپ کی زبان سے نکلی ہوئی اللہ کی آواز تیر کی طرح نکلی اور سناٹے کے سینے میں پیوست ہو گئی جس طرح ان کی بے وقت شہادت نے عوام کے سینوں کو غم و اندوہ سے زخمی کر دیا۔ وہ تعلق بند یہ تھا سہ نفوس سے خوش و درخشندہ کوکب مستجیب بود آپ کے لوح مزار پر یہ تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

یادگار شہید وطن حامی دین محمد مصطفےٰ چیئرمین ۱۳۷۷ء یغفر اللہ لہ

۱۳۷۷

ہے ہراں بخت و جہاں عزم و امید خاص و عام	مرد حق گو نرم خو خوش نگاہ و خوش کلام
تمام غم تاریخ ذی الحج کی تھی چھبیس ہے	بلبل حق این گلستان راہی دار السلام

۱۳۷۷ھ مطابق ۱۹۵۸ء

---

[1] رسالہ تذکرہ مشاہیر کوپاگنج

بلیا کے انصاری مجاہدین

انگریزوں کے لیے دیارِ پورب کا آخری ضلع بلیا "بلیات" کا آخری محاذ اور مخزن تھا یہاں کے انصاری جرنیلوں سے وہ ان کی شورہ پُشتی کے سبب خائف رہتے ان کی سنگینیں ان جیالے سورماؤں کے سینوں پر اُٹھی تھیں تو انہیں "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا"، کے مصداق اپنا حشر یاد آجاتا ملک کی آزادی میں یہاں کے مجاہدین میں حافظ محمد شفیق انصاری، ان کے نواسے کلیم احمد انصاری اور ان کے والد حاجی محمد شمشیر انصاری اقامہ ثلاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں قوم وملت وملک کے لیے سرفروشانہ جذبات رکھتے ہیں، جدّا علی کپڑوں کے تاجر اور زمیندار تھے، انگریزوں کے زمانے میں خاندان کے افراد سرکاری محکموں سے بطور ملازم وابستہ تھے لیکن جب ملکی مفادات کا خیال آیا اور آزادی کا جذبہ اُبھر کر آیا تو انہوں نے استعفیٰ نامہ دیکر کانگریس کا پرچم اُٹھایا، لیاقت علی، گاندھی جی اور نہرو جی کے ساتھ ساتھ قدم رکھ کر آزادی کی راہ پر چلنے لگے اور آج تک کلیم انصاری جنہیں پیار سے فقیر انصاری کہتے ہیں، بنا کر فقیروں کا بھیس تماشائے اہلِ کرم — دکھتے ہیں کئی دینی مدرسے انہیں کے وسیلہ، اعانت ہی سے فیضانِ علم دین کا خزانہ بنے ہوئے ہیں کئی اسکول میں رہنے ہیں اور کئی فلاحی ادارے ان کے جود وسخاوت کے بل پر قائم ہیں، سارے ضلع در برادری میں اس خاندان کو عزت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

لکھنؤ کے ظفر الحسن وکیل کے خاندان سے نکاحی رشتہ رکھنے والے بیا کے مصطفیٰ غفار مجاہدینِ آزادی میں بڑے ممتاز ہیں۔ چندر شیکھر کے زمانہ حکومت میں آپ مذہبی بورڈ کے چیئرمین تھے۔

مئو ائمہ کے انصاری قومی عمائدین اور سیاسی مدبّرین

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے مومن جماعتی تنظیم کی تحریکات زور پکڑنے لگی تھیں جمعیۃ المومنین ۱۹۲۲ء میں قائم ہوئی اسی کی بنیاد پر مومن کانفرنس کی عظیم الشان عمارت کی تعمیر کا آغاز ہوا مولانا یحییٰ شمس العلماء صدر المدرسین مدرسہ عالیہ عربی کلکتہ کے ذہن میں سب سے پہلے قوم وملت اور ملک کی اصلاح وترقی کے لیے تعمیری قدم

اٹھانے کا خیال پیدا ہوا، مولانا علی حسین عاصم بہاری نے عمائدِ قوم کے تعاون سے اسکی عملی تشکیل کا بیڑا اٹھایا اس کے تین اہم مقاصد تھے۔ تعلیم، تنظیم اور معاشرتی اصلاح، تنظیم کا یہ سفینۂ رقت کے بہاؤ پر چل پڑا الامت سلامت کے سوادِ اعظم میں اتحاد اور یگانگت کی ہوائیں چلنے لگیں سی رُخ پر فکری، معاشی، تعلیمی، سیاسی و سماجی اصلاحات کے بادبان کھلنے لگے اور ہندوستان کی ساری مومن بستیوں کے کندوں پر مومن کانفرنس اور مومن انصار جمعیتوں کے سفینے ڈولنے لگے۔

قصبہ سوائہ ضلع الہ آباد میں اسی سلسلے میں جلسہ تنظیم الانصار کا انعقاد ۲۹-۳۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو ہوا، اس قصبہ کی مومن برادری کی درد مند ممتاز ہستیاں اصلاح و درستگی کے لیے عرصہ سے فکر مند تھیں بالآخر مجد الشان کی مساعی حسنہ کی بدولت ایک قومی مدرسہ موسومہ انوار العلوم علم دین و قرآن کی روشنی جوار و حوالی قصبہ میں پھیلانے لگا، یہ مدرسہ قصبہ کے جانب پچھم بندہ عظیم پور میں یک پُر فضا مقام پر سیٹھ محمد خان محمد کی تعمیر کردہ عمارت میں جاری ہے۔ لیکن درد مندان قوم کے دلوں کی یہ منزل ہرگز نہ تھی جیسا کہ شیخ محمد صدیق انصاری پرتابگڈھی صدر استقبالیہ کمیٹی جلسہ تنظیم الانصار نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

> "جس قوم نے دنیا میں اپنے زندہ اور عزت کو برقرار رکھا وہ بہتر ہے اس قوم سے جس نے اپنے [illegible] دولت کو کھو [illegible] جس کی بنیاد [illegible] پیدا کی [illegible] دولت میں ترقی کی اس طرح [illegible] ہوئے [illegible] آپ حضرات سے سوال کرسکتا ہوں کہ کیا [illegible] القوم [illegible] زندگی [illegible] اور دنیا [illegible] برادری [illegible] عزت [illegible] نہیں ہے کہ ہم [illegible] کی تعداد [illegible] نہیں ہیں [illegible] ہماری قوم [illegible] دولت، علم [illegible] ہوئی ہے۔"

ذی فضل صدر موصوف نے برادری کو جھنجھوڑتے ہوئے اللہ کے بھروسے اٹھ کھڑے ہونے کی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

> [illegible] دنیا [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کریں [illegible] الاقدام من اللہ [illegible] کے بھروسے پر ہیں [illegible] ہماری [illegible] ہمارے اسلاف نے ہمیں ترقی کی [illegible]

سلف کے بزرگوں کی شان یہ تھی ؎

جو بھروسا تھا سے قوتِ بازو پہ تھا ہے تمہیں موت کا ڈر، ان کو خدا کا ڈر تھا

صنعت پارچہ بافی اور بافندگی کی تعریف کرتے ہوئے شیخ محمد صدیق انصاری صدر جلسہ نے محترف "اعیان و اکابر اسلام" کا حوالہ دیتے ہوئے آنحضرت صلعم کا ارشاد مبارک جو اس پیشۂ تجارت "کسب الید" اور "الکاسب حبیب اللہ" کے بارے میں ہے بیان فرمایا خیر تجارتکم المیزوان اللہ یحب المومن المحترف فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

تنظیم الانصار کی بنیاد ۱۹۳۳ء میں قصبہ کے سربرآوردگان قوم کی کوششوں سے عمل میں آئی تھی جن کے اسمار گرامی یہ ہیں:

منشی عبدالغنی، سیٹھ عبدالحکیم، حافظ محمد اسماعیل، منشی عبدالحلیم، حافظ محمد سلیمان، سیٹھ عبدالعزیز، سیٹھ عبدالصمد، سیٹھ بشیر احمد، ماسٹر عبدالحمید، سردار عبدالمجید، سیٹھ محمد یوسف عرف عبدالغفار عرف بابو محمد سلطان اور شیخ محمد حسن۔ تاجر سیکریٹری استقبالیہ و مینجر مدرسہ انوار العلوم قصبہ مئو ائمہ۔ حاجی عبدالسلام لدیت (دوالد ڈاکٹر عبدالغنی انصاری) جو ۱۲ سال ٹاؤن ایریا کے ممبر رہے ان کا تجربہ و تعاون حسب سابق رہا۔

اس جلسہ تنظیم الانصار کے تین کامیاب اجلاس ہوئے تھے۔ اس جلسہ کے صدر منتخب مولوی امین الدین مانی (بی۔ اے علیگ) تھے۔ مولوی علی حسین عاصم بہاری نے جلسہ کو خطاب کیا، نظام الدین اور ماسٹر محمد سلیمان تاجر نے صدارت کی تجویز و تائید کی قاری محمد کی تلاوت وجد آفرین تھی، الہ آباد کے چند مشہور شعرار حضرات جن کے اسمار گرامی یہ ہیں۔

محمد بشیر الہ آبادی، مولوی ابو نصر منہاج الدین عالی سہسرامی، حکیم محمد صدیق سہسرامی، محمد یوسف سیکریٹری اصلاح الانصار، منشی عبدالحکیم تاجر زمیندار و ممبر ٹاؤن ایریا کمیٹی قصبہ مئو ائمہ اور حافظ ابو سعید سعدی سیکریٹری تنظیم الانصار الہ آباد کی قومی نظمیں ہر تینوں اجلاس میں بڑی پسند کی گئیں۔ حافظ کمال الدین متعلم مدرسۂ انوار العلوم نے بڑی وجد آفریں تلاوت کلام پاک کی تھی، صدر موصوف حکیم محمد صدیق پرتابگڑھی نے بھی ایک قومی قصیدہ نہایت بہترین انداز میں سنایا تھا۔

اس جلسہ میں محفل وعظ کا بھی انتظام کیا گیا تھا، چنانچہ تحریک منشی محمد شفیع سب انسپکٹر و تائید مولوی ریاض الدین احمد (بی۔ اے۔ ایل ایل بی) وکیل و نیز دیگر حضرات زیر صدارت مولانا مولوی حافظ محمد حنیف صدر مدرس مدرسہ انوار العلوم کے مواعظ حسنہ سے محبان خدا و شیدائیان رسول (دردِ قوم)

نے کسبِ فیضِ روحانی کیا، اجلاسِ سوئم میں مولانا محمد یعقوب پرتابگڈھی نے نہایت عالمانہ مدلل وعظ فرمایا جو بہترین اسلامی تعلیمات کا مظہر اور مفید و قیمتی مضامین سے مملو تھا آپ نے تمام قوم سے عموماً اور کارکنانِ تحریک جمعیۃ المومنین اور عہدہ دارانِ انجمن سے خاص طور پر متدین زندگی بسر کرنے اور احکاماتِ شریعت پر کاوش کے ساتھ عمل پیرا ہونے کی التماس کی، مولوی حکیم الدین صدر انجمن ہدایت المسلمین محلہ دوندی پورہ و سیکریٹری دار المطالعہ اسلامیہ الہ آباد اور مولوی حکیم محمد زبیر پرتابگڈھی نے بھی عملی طور سے حصہ لیا تھا۔

نظام الدین (بی اے ایل ایل بی) ایڈوکیٹ و میونسپل کمشنر الہ آباد و ممبر ورکنگ کمیٹی آل انڈیا جمعیت المومنین نے اپنی پُرجوش تقریر میں تمام قوم سے آل انڈیا مومن کانفرنس کے نظام کو مستحکم بنانے اور ہندوستان کے تمام مقامی جمعیتوں کو بہترین طور پر منظم بنانے کی درخواست کی۔ بیجا اسراف سے بچنے کے لئے تقریبات اور تہوار کے مواقع پر سادگی اور اسلامی معاشرت برتنے کی زبردست ہدایت کی، ڈاکٹر عبد الرزاق صدر جمعیت الانصار اٹالہ الہ آباد، منشی عبد غنی تاجر و سیکریٹری تنظیم الانصار سوائمہ، محمد اکبر ناظم انجمن شعب الانصار اٹالہ الہ آباد، منشی محمد قمر الدین تاجر الہ آباد اور منشی مقبول احمد پرتابگڈھی نے بہت ساری تجاویز اور تائیدات کے ذمہ دار حضرات تھے۔ (اس جلسہ کی روئداد کو حکیم رمضان علی نے مطبع اسرار کریمی الہ آباد میں طبع کرایا تھا۔ قصبہ کے مشہور خادم اور مخیر ہستی سیٹھ ظہور احمد پہلوان کے ظہور منزل کے مہمان خانے اور ظہور ہال میں ان تقریبات کے انعقاد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ شیخ محمد امین الدین انی (بی. اے میگ) غازی پوری نے پہلے جلسے کی صدارت فرمائی تھی۔

مراد آباد کی دسویں صوبائی مومن کانفرنس (منعقدہ ۴-۵-۶ نومبر ۱۹۴۶ء)

فخر القوم ریاض الدین احمد (بی اے ایل ایل بی الہ آباد) اس صوبائی کانفرنس کے صدر تھے۔ ان کا خطبہ صدارت ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انہوں نے مختلف عنوانوں کے تحت مومن کانفرنس کی ابتدائی تاریخ، مقاصد، مسئلہ مراد اور شوشلزم، ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشمکش، مسلم لیگ اور مومن کانفرنس کے بنیادی اختلافات، مومن کانفرنس اور نیشنلسٹ مسلم جماعتیں، انتخابات، لیگ کا غلط پروپیگنڈا، مومن کی تنظیم، پروگرام، تعلیمی منصوبے اور اقتصادی اسکیم پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔"

یہ خطبہ صدارت جب فرزند حافظ عبد الجبار ستّار استقبالیہ باہتمام محمد خلیل الدین صدیقی اشاعت پریس الہ آباد میں چھپا تھا۔

سترھواں باب

بندۂ مومن کے روحانی سلسلے

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ (الفتح : ۱۰)

"جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے"

یہ آیت اہلِ طریقت کا طریقہ اور کلیہ بن گئی اور تصوف میں بیعت وارادت، خلافت وجانشینی کی بنیاد پڑ گئی، اوائل شیوعِ اسلام سے ہی ہندوستان میں اہلِ حق نے اپنے سینے قدم گرر کھے تھے۔ جگہ جگہ خانقاہیں قائم ہو چکی تھیں، ان میں رشد وہدایت دی جاتی اور روحانی تربیت کی جاتی تھی، پورا شمالی ہندوستان اور سلاطین دکن کے دور میں دکن اور کوکن کا سارا خطہ ان تمام سلسلوں خصوصاً چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کا مرجع تھا۔ کوئی شہر و قریہ نہ تھا کہ خانقاہوں سے خالی ہو، یہ ساری خانقاہیں علم ومعرفت اور روحانیت ومشیخت کا مرکز بن گئی تھیں، صوفیائے کرام کے سلسلوں کے چراغوں سے اور سلسلوں کے چراغ جل اٹھے، یہ اپنے بانیانِ سلسلہ کے ناموں سے معروف ہوئے، ان میں اشرفیہ سلسلہ جسے عام طور پر کچھوچھوی کہا جاتا ہے مومن برادری میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔

اترپردیش میں مشائخ اشرفیہ کے مریدین ومعتقدین کی کثیر تعداد تھی، مولانا قاضی اطہر مبارک پوری لکھتے ہیں:

> "مبارک پور اور سیکڑوں کے عام سنی مسلمان ان کی عقیدت ومحبت سے سرشار رہتے تھے۔ ہمارے بچپن تک ان حضرات کی تشریف آوری کے ایام میں عام کاروبار بند کر کے ان کے معتقدین ومریدین بہ تن وجان سے ان کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ بعد میں دیوبندی مکتبِ خیال کے لوگ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی سے بیعت ہوئے، ہمارے علم میں قصبہ اور ملحقات قصبہ میں مولانا مرحوم سے بیعت وارادت کا شرف سب سے

پہلے مولانا احمد حسین رسولپوری کی زوجہ محترمہ رحیمہ بنت حافظ نظام الدین متوفیہ (۱۳۰۹
ان میں ہوا۔[۱]

علمائے دین کے خانوادے ہمیشہ کسی نہ کسی صوفی سلسلے سے منسلک ہوتے تھے اور اگر ان
میں خلافت آجاتی تو پھر یہی گھرانہ بیعت وارادت اور رشد وہدایت کا چشمۂ فیضان بن کر تشنگانِ علم
وعرفان کو سیراب کرنے لگتا، دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی گھر کے افراد اپنی مرضی سے مختلف سلسلوں
میں بیعت رکھتے اور مختلف العقائد ہونے کے باوجود کسی قسم کا تنازعہ وقوع پذیر نہ ہوتا[۲]، یہ بھی
ہمارے تجربہ میں آیا ہے کہ مسلک کے اعتبار سے بھی کسی قسم کی تفریق نہ پائی جاتی، شادی بیاہ
کے معاملے میں بھی نہ پیری پیر کی کڑی تھی اور نہ مرید پیروں پر، بس یہی کافی تھا کہ اعتقاد سلامت
رہے یعنی پیرِ من خس است اعتقادِ من بس است۔

خواجگانِ چشت کا مرکز بھی مبارک پور کا قصبہ تھا جہاں مشہور روحانی شہزادہ حامدیہ چشتیہ
کے چشم وچراغ حضرت راجہ سید مبارک (متوفی ۱۲ شوال ۹۶۵ھ) نے علم ومعرفت کا چراغ روشن
کیا، انہیں کے فیوض وبرکات سے دیار پورب کے شہروں میں بالخصوص جونپور میں سلسلۂ چشتیہ
حامدیہ کو بیحد فروغ حاصل ہوا۔

دیار پورب میں جن علمائے فحول اور مشائخ کبار کو ان سے بیعت وخلافت کا شرف حاصل ہوا
ان میں مولانا حسن بن طاہر جونپوری (م ۹۰۹ھ)، مولانا دانیال بن حسن جونپوری (۹۹۲ھ)
مولانا محمد بن عبداللہ جونپوری (م ۹۲۳ھ ر ۱۵۰۵ء) اور مولانا شیخ بہاء الدین عمری جونپوری
کے نام مبارک زیادہ روشن ہیں، مولانا اللہ داد جونپوری صاحب حال وقال بزرگ تھے، علم و
فضل میں یکتا تھے، آخری دور میں خواجگانِ چشت میں سے کئی حضرات سوادِ اعظم گڑھ کے مختلف
قصبوں اور قریوں میں آباد ہو گئے، اور ایک دو بستیاں بھی ان کے نام سے آباد ہو گئیں، شیخ
ی، شیخ محمد بخش اور شیخ حسام الدین شاہ معروف "حامدی اول" (م ۱۲۹۶ھ) انہی اکابر
میں سے تھے۔

شیخ بہاء الدین عمری جونپوری (م ۹۱۱ھ) نے طریقۂ نقشبندیہ کی اجازت وخلافت

۱۔ [illegible] مبارک پور ص

۲۔ ایضاً ص ۱۲۵، ۱۹۲

شیخ کمال الدین بن اسمٰعیل شیروانی سے حاصل کی تھی، جو بزاتہ وسطی ایشیا کے خواجہ عبید اللہ احرار جنہیں ان کے معتقدین "ایشان" (وُے) کی تعظیمی عرفیت سے یاد کرتے تھے، فیض یافتہ تھے، شیخ بہار الدین عمری کو دوسرے پیرانِ طریقت کی طرح تمام مروجہ طُرق وسلاسل کی خلافت وبیعت حاصل تھی۔

اعظم گڈھ کے نواح سرائے میر میں شیخ میر علی عاشقان (۸۷۰ - ۹۵۵) شیخ بہار الدین عمری جونپوری کے خلیفہ تھے لیکن ان پر اپنے مرشد شیخ محمد بن علار الدین بن قاضی المعروف بہ قاضن کے طریقہ شطاری کا رنگ زیادہ چڑھا ہوا تھا، میر صاحب نے دو اور مشائخ سے کسب روحانی کیا تھا جو دیار جونپور کے رہنے والے تھے، ان میں شیخ شہاب الدین سہروردی حسینی جونپوری تھے جو دسویں صدی کے جونپوری شمار مشائخ میں اعلیٰ مرتبت ومقام کے حامل تھے، شیخ عبد القدوس شطاری نظام آبادی (اعظم گڈھ) عرف قدن شاہ شطاری کے روحانی فیض سے میر صاحب نے ظاہری علوم اور باطنی کمالات میں اور زیادہ ترقی کی۔ ان کی خدمت میں رہ کر میر صاحب اذکار واشغال میں اس قدر محو رہتے کہ آپ پر کشف وشہود کے دروازے کھل گئے۔

میر صاحب بڑے دبدبے کے صوفی بزرگ تھے ان کی خانقاہ دنیاوی جاہ وجلال کا منظر پیش کرتی تھی مگر یہ اسی طرح اہلِ عرفان کے لیے ایک شانی زاویہ بھی تھا جس میں مستفیدین غمِ روزگار سے یکسو اور معاش سے مستغنی ہو کر اذکار واشغال میں مشغول رہتے اور دن رات تزکیہ نفس، تہذیب اخلاق اور عبادت میں منہمک نظر آتے تھے[1] میر صاحب کی اولاد میں رشد وہدایت کا سلسلہ جاری رہا ان کے خلفار میں شیخ محمد مبارک محمد باقی اور پیر سید قیام الدین سگردی تھے۔ میر صاحب کا چشمۂ فیض گورکھپور تک جاری تھا۔

مولانا کرامت علی جونپوری (۱۲۹۰ - ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ - ۱۸۷۴ء) جن کی مساعیٔ جمیلہ کی کرامتوں سے شرقی بنگال کے مسلمانوں کی کایا پلٹ کردی۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے اہم خلیفہ تھے آپ کے اصلاحی وعظوں سے ڈھاکہ اور بنگال میں ہزاروں مسلمانوں کی اصلاح وتربیت ہوئی اور سیکڑوں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا، ہادیٔ بنگال کے مریدین و

---

[1] تذکرۂ علمائے مبارک پور ص ۳۷-۳۹ تذکرۂ علمار اعظم گڈھ۔ ص ۲۲۳-۲۲۴

معتقدین دیارِ پورب میں کثیر تعداد میں تھے۔ مبارک پور میں ان کے دو ممتاز مرید حافظ عماد اللہ زاوی (م ۱۳۲۰ھ) اور حافظ ضیاء اللہ نواروی تھے (م ۱۳۵۲ھ)، قصبہ اور اطراف میں جب بھی آپ کا وعظ ہوتا چندہ اور سامان دونوں ہی شریک رہتے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کا حلقۂ بیعت و ارادت وسطی ہند میں کامٹی ناگپور کے مواضعات تک پھیلا ہوا تھا[1]۔ آپ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹ھ۔ ۱۲۳۹ھ) اور ان کے نواسے حضرت مولانا شاہ اسحٰق بن محمد افضل محدث دہلوی (۱۱۹۶ھ۔ ۱۲۶۲ھ) کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن عالم اور بڑے قابل مدرس تھے۔ اعظم گڈھ میں آپ کے تلامذہ آپ سے فیضیاب ہو کر مختلف دینی درسگاہوں میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اس خطۂ دیارِ پورب میں ان کے مریدین و معتقدین کا بڑا وسیع حلقہ تھا؛ قصبۂ مبارکپور کے سواد میں محلہ کٹرا کے منشی حبیب اللہ اور ماؤ کے شیخ علیم اللہ آپ کے مریدوں میں تھے اسی طرح مولانا شمس الدین حبیبی کے ننہال کے بزرگ حضرت شاہ صاحب کے مریدوں میں شامل تھے لیکن سب سے ممتاز ہستی ان کے زمرۂ مریدین میں ہندوستان کے مشہور عالم اور علم دوست نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی (۱۲۸۳۔۱۳۷۰) کی تھی۔

حضرت شاہ ضیاء النبی بن سعید الدین رائے بریلوی (۱۲۴۲ھ — ۱۳۲۶ھ) کا دیارِ پورب میں سلسلۂ بیعت و ارادت دور دور تک پھیلا ہوا تھا[2]۔ آپ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ بہت سے علماء و فضلاء نے آپ سے استفادہ کیا تھا اور طریقت میں خواجہ احمد بن محمد یٰسین نصیرآبادی سے کسب روحانیت و علوم باطنی کیا تھا۔ شیخ فیض اللہ ورنگ آبادی سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ آپ کے مریدین میں مولانا عبدالقادر مئوی اور مولانا احمد حسین رسولپوری بہت مشہور تھے، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری خاص امتیازی شان رکھتے تھے۔

مولانا سید سبحان بن مولانا نقش امام مچھلی شہری (۱۲۳۳ھ — ۱۳۲۲ھ) کا تعلق بیعت و ارادت حضرت شاہ گلزار شطاری سے تھا۔ آپ نے بنارس میں محلہ لنگی گرٹولہ میں بیعت و

---

[1] کامٹی اور دینی مدارس، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل (ناگپور ۱۹۸۲) ص ۲۶، ۵۹

[2] تذکرہ علمائے اعظم گڈھ ص ۳۰۱-۳۰۲

ارادت اور رشد و ہدایت کا چشمۂ فیض جاری کر رکھا تھا، بنارس اور اس کے اطراف میں آپ کے مریدین کثرت سے تھے، مولانا عبد السبحان کا سلسلہ چار واسطوں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی سے مل جاتا تھا، مولانا عبد السبحان کے خلیفہ مولانا حافظ محمد صاحب ضلع اعظم گڈھ میں مسند خلافت پر متمکن تھے اور آپ کے مریدوں میں مولانا شاہ عبد الغنی پھولپوری کے دیندار گھرانے کے افراد شامل تھے۔ شیخ گلزار کشتوی کا حلقۂ ارادت اس دیار میں بہت وسیع تھا۔

مولانا حافظ قاری شاہ عبد الغنی بن شیخ عبد الوہاب بن شیخ امانت اللہ پھولپوری (ضلع اعظم گڈھ) (۱۲۹۳ھ) کے اساتذہ و شیوخ اور پیران طریقت کی فہرست بڑی طویل ہے، خود ان کی دینی و صلاحی، تعلیمی و تدریسی کارناموں کا ایک الگ عنوان کیا جا سکتا ہے آپ مولانا اشرف علی تھانوی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، حضرت پھولپوری مختلف النوع صفات کے جامع تھے علوم ظاہر و باطن میں اپنے وقت کے مشاہیر علماء و مشائخ میں شمار ہوتے تھے۔ ہند و پاک میں مولانا کے مریدین و معتقدین بہت کثرت سے تھے۔ مولانا بشارت نائب ناظم مجلس دعوت الحق ہردوئی حاجی نذیر احمد بکھراوی ناظم مدرسہ بیت العلوم سرائے میر، حاجی منشی محمد ناظر (سابق نائب ناظم مدرسہ بیت العلوم) اور ڈاکٹر عبد القادر محلہ پہاڑ پور شہر اعظم گڈھ، مولانا پھولپوری کے اعاظم خلیفہ تھے جبکہ آپ کے مریدین میں مولانا نصرت علی استاذ مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ، حافظ عبد الولی بہرائچی، مولانا نذیر الحسن سیتاپوری، عبد الحافظ لکھیم پوری، محمد جلیل جج شہر اعظم گڈھ اور حاجی حبیب الرحمن شیروانی امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔[۱]

دیار پورب میں شیخ عبد العلیم حسین قادری (م ۱۲۶۶ھ) اپنے سلسلہ قادریہ کے ممتاز نمائندے تھے آپ کے مرید مولانا شاہ محمد کامل دلید پوری حنفی (ضلع اعظم گڈھ) (۱۲۲۵ھ - ۱۳۸۳ھ) تھے جنہوں نے سلوک و طریقت کی منزلیں طے کر کے خلافت قادریہ حاصل کی۔ شاہ محمد کامل کو شیخ عبد العلیم کے علاوہ شیخ گلزار کشتوی سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی اپنے وقت میں سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور مشائخ میں آپ کا شمار ہوتا تھا اور اس دیار میں آپ کے مریدین و معتقدین بہت زیادہ تھے۔[۲]

---

[۱] تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۱۸۱ - ۱۹۰، اور تذکرۂ علمائے مبارک پور ص ۲۹ - ۳۰
[۲] تذکرۂ علماء اعظم گڈھ ص ۳۰۱ - ۳۰۲

اُس زمانے میں اس وقت کے مشہور مرشد حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کی ارادت و افادت نے بڑی دھوم مچا رکھی تھی، ان کے معتقدین ان کے آستانے میں برسوں رہ کر ان کی صحبت سے فیوض روحانی حاصل کرتے، تصوف کے اسرار و رموز اور اس کے حقائق و مقامات سے آگاہی حاصل کرتے تھے حضرت چاند شاہ اصطلاحی اور عرفی طور پر باقاعدہ عالم تو نہ تھے لیکن ان کی پرکشش شخصیت اور توجہ اور باطنی تربیت سے سیکڑوں بندگانِ خدا نے بڑا فیض روحانی پایا ان کی سادہ اور پُرسکون خانقاہ تہذیبِ اخلاق اور تزکیۂ نفس کی بے نظیر درسگاہ تھی [1]

مصلح الامت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری (۱۳۱۰ھ) کا نسبی تعلق اودے بنسی راجپوتوں سے تھا، اعظم گڈھ کا علاقہ قدیم زمانے سے اجودھیا کے سورج بنسی راجپوتوں کا مرکز رہا، اسلامی حملے کے دوران جو غزنوی عہد کے اوائل سے ہندستان پر شروع ہوئے تھے راجپوتانہ سے اکثر راجپوت خاندان فرار ہو کر اعظم گڈھ، فیض آباد وغیرہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کا شمار ان مشائخ میں ہوتا ہے جو تصوف کے ساتھ شیوخ کے زمرہ میں بھی نمایاں نظر رکھتے ہیں آپ بڑے مناقب و محاسن تھے، دور دور تک مریدین اور معتقدین کا روحانی و احسانی سلسلہ پھیلا ہوا تھا، آپ تزکیۂ نفوس اور تطہیر قلوب کے ساتھ طالبانِ علم کو درس بھی دیتے تھے کئی مدارس سے وابستۂ تدریس رہ چکے تھے، بدعتیوں کی ذہنی کجروی کے سبب آپ پر بڑی مصیبتیں پڑیں اور بیوقوفوں نے اذیتیں پہنچائیں لیکن آپ کے معتقدین نے ہمیشہ آپ کا ساتھ دیا اور حتی المقدور آپ کی خدمت کی۔ آخر میں الٰہ آباد میں محلہ روشن باغ میں آپ نے مستقل سکونت اختیار کی اور یہاں بھی بہت جلد مرجعِ خلائق بن گئے، الٰہ آباد میں بھی فتح پور، گورکھپور کی طرح ارادت مندوں کا خوب مرجع ہوا، لیکن مولانا کثرت مریدین کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، الٰہ آباد میں آپ کے دورانِ قیام میں آپ کی قدسی صفات سے امت کو بہت فائدہ پہنچا یہاں کی بہت سی بدعتیں ختم ہو گئیں اور سنت پھر جلوہ گر رہنے لگی، لیکن اسی دوران دمہ اور دورۂ قلب جیسے موذی امراض میں آپ مبتلا ہو گئے، تبدیلیٔ مقام کے لیے بمبئی (کرلا) میں ایک مکان لے کر وہیں رہنے لگے، یہاں بھی آپ کے روحانی فیوض و برکات نے اپنا کرشمہ دکھلایا اور خلقِ عامہ کو بڑا نفع پہنچا۔ اگرچہ

---

[1] تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ ص ۲۷۰-۲۷۱

ضعف و نقاہت حد درجہ بڑھی ہوئی تھی لیکن مریدین کی اصلاح و تربیت کا معمول برقرار رہا، مجالس کا انعقاد جاری رہا اور آپ کے ارشادات کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ سننے والے کا دل خشیت الٰہی سے کانپ اٹھتا، نسبت مع اللہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، دیارِ حبیبؐ پر حاضری دینے کی بے تاب تمنا دل کو تڑپا رہی تھی اور قلب کو گرما رہی تھی ۱۳۸۶ھ کو مریدین و ارادتمندوں کے کثیر مجمع کے ساتھ آپ جہاز پر سوار ہو گئے لیکن اثنائے سفر سانحۂ ارتحال نے بیت اللہ کے بجائے آپ کو معبودِ حقیقی سے راست ملا دیا۔[1]

سلسلۂ بیعت و ارشاد نے پورے ہندوستان میں ایک ایسی روحانی فضا پیدا کر دی تھی کہ ہر شخص کسی نہ کسی پیر کی تلاش میں رہتا تھا، فرنگی محل مولویوں کا مرکز لکھنؤ تھا اور ان کے پیران طریقت دیارِ پورب میں پھیلے ہوئے تھے، مولانا نظام الدین فرنگی محلی لکھنوی کے حلقۂ درس میں علوم ظاہر و باطن کی تحصیل کے لئے طالبان علم کا جمگھٹا رہتا تھا بہار میں اس وقت کے مشہور مرشد مولانا بشارت کریم نقشبندی (متوطن گڑھول شریف، ضلع مظفر پور) مرجع خلائق بنے ہوئے تھے، شاہ ابوالخیر دہلوی کے صاحبزادے مولانا شاہ بلال حسن فاروقی کا حلقۂ ارادت اسی دیارِ پورب میں پھیلا ہوا تھا، شیخ محمد بن علاء الدین بن قاضی سالم المعروف بہ قاضن کی روحانی سلطنت ترہت بہار سے لے کر اعظم گڈھ تک پھیلی ہوئی تھی، میاں نظام آباد (اعظم گڈھ) میں شیخ عبدالقدوس شطاری نظام آبادی شیخ قدن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ نے طریقہ شطاریہ عشقیہ براہِ راست اس کے بانی و امام شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا ان کے خلیفہ خاص شیخ حافظ واسطہ کار جیر پور تھے۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی (پیدائش ۱۲۷۲ھ) ذہانت و طباعی اور علوم و فنون میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔" ہندوستان میں بدعت کو ایک مستقل مسلک کی شکل میں منظم کرنے کا سہرا انہیں کے سر ہے، اس سلسلے میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد ان کے مریدین پانچسو کے قریب بتلاتے ہیں۔[2] اعظم گڈھ کے اطراف میں مسلک رضاخانی کو بڑی تقویت ملی، مولانا امجد علی گھوسوی نے بہشتی زیور مؤلفہ حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی

---

[1] تذکرہ علماء اعظم گڈھ ص ۳۲۳-۳۲۴

[2] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، تذکرہ علماء اعظم گڈھ بنارس ۱۹۷۶ مطابق ۱۳۹۶ھ ص ۹۳ (فٹ نوٹ)

کے طرز پر سترہ جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی جس کا نام "بہارِ شریعت" رکھا اس کتاب میں مولانا امجد علی نے مسلک بریلوی کے جملہ معتقدات کو بڑی خوبی سے جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب بریلوی حضرات میں جید مقبول ہوئی، در اس جماعت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ بریلوی جماعت کا اثر دور دور تک پہنچ چکا تھا اور انیسویں صدی میں بمبئی کے بیرونی مولوی حضرات اور مقامی علماء تک اپنے فتاویٰ پر علمائے بریلوی کے مو ہیر اور دستخطوں کے لئے ان سے رجوع کرتے تھے[1] چشتیہ، نظامیہ، قادریہ اور مداریہ سلسلوں پر بیعت رکھنے والوں پر رضا خانی مسلک کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا اور کچھوچھوی بھی بڑی حد تک متاثر تھے۔ ان میں برادری کی مستثنیٰ نہ تھی۔ بہار شریف کے اطراف میں سلسلۂ فردوسیہ میں برادری کے گھرانے بیعت تھے ان میں مولانا عاصم بہاری کا گھرانہ بھی تھا۔

وسطی ہند کے صنعتی مراکز، ناگپور، کامٹی اور برہانپور میں مہاجرین انصار کثیر تعداد میں آباد تھے شمالی ہند کے مشائخ اور پیرانِ طریقت کے مختلف سلسلوں میں بیعت وارادت کا یہاں بھی بہت زا حلقہ موجود تھا۔ اس میں انصاری برادری بھی نمایاں تھی۔ مولانا سید شاہ فضل الرحمٰن شاہ گنج مرادآبادی (م ۱۳۱۳) کے مریدین کی تعداد خاصی تھی، کامٹی کے مشہور بزرگ حضرت عبداللہ شاہ (م ۱۲۹۵ مطابق ۱۸۷۸) کے مرید اور خلیفہ حضرت شاہ غلام محمد تھے۔ ان کے مریدین زیادہ تر انصاری حضرات تھے۔ یہاں کے انصاری خاندان مئو سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا حلقۂ ارادت بھی کافی وسیع تھا[2]

دکن اور کوکن میں روحانی سلسلے

دارالسرور[3] برہانپور مرکزِ روحانیت تھا جس کی بنیاد خود حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفۂ خاص حضرت برہان الدین غریبؒ کے دم قدم سے پڑی تھی غلام علی آزاد بلگرامی نے اسے دلیروں کی سرزمین اور یہ مقام مقدس کہا ہے جس کی خاک کا طواف آسمان کرتا رہتا ہے۔

---

[1] منیر مدنی محمد مدنی، مجموعہ فتاویٰ (بمبئی ۱۳۱۲/۱۸۹۲) کتب خانہ جامع مسجد بمبئی

[2] کامٹی کی دینی تاریخ۔ ڈاکٹر محمد شرف مدنی ساحل (ناگپور ۱۹۸۲ء) ص ۴۶-۵۹

[3] مولوی معین مدنی ندوی۔ گہوارۂ علم۔ دارالسرور مرکزِ روحانیت۔ برہانپور (برہانپور ۱۹۷۸) ص ۴۹ (تاریخ)

زہے مقام مقدس کہ اولیاء خیزاست
کند سپہر طواف فضائے برہانپور

جب برہانپور آباد ہوا تو اس کی روحانی سلطنت کے حکمران خود برہان الدین غریبؒ
یہ بھی دیگر بزرگانِ دین کی طرح باشندگانِ دکن کو روحانی فیض پہنچانے کے لئے دکن آئے
تھے۔ یہ نصیر فاروقی کا زمانہ تھا۔ ان کے بعد حضرت بہاء الدین باجن ان کے جانشین بنے،
انہیں بزرگانِ دین کے فیوض و برکات سے یہاں سلسلۂ چشتیہ کی مشیخت و ارادت قائم ہوئی
اور چشمۂ فیضان جاری ہوا۔

حضرت خواجہ سید ہاشم کشمی نقشبندی مجددی جب قطب ارشاد بن کر دکن آئے تو یہ عقیدتمندوں
کے محور بن گئے۔ اس طریقۂ عالیہ کو مومن برادری کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بحد فروغ ملا۔
ان کے خلیفہ خواجہ محمد حسین شاہ امروہوی پیر طریقت کے مریدین میں شہر کے ثروتمند تاجر، شرفاء و رئیس و بزرگ
حضرات تھے ان میں سیٹھ حاجی محمد یعقوب ولد سیٹھ نور محمد انصاری کا گھرانہ بحد ممتاز تھا۔ انہوں نے
خواجہ سید ہاشم کشمی کے مزار اور ملحقہ مسجد کی تعمیر اور توسیع کے لئے خطیر رقم عنایت کی تھی؛
بڑے سخی اور کریم النفس تھے آپ کی ارادت پیر و مرشد سے عشق کی حد تک تھی
آپ کے دو صاحبزادے محمد یوسف ریاضت اور محمد صدیق ذکی بھی والدین کی طرح خواجہ محمد حسین
شاہ سے بیعت تھے۔ یہ دونوں حضرات شاعر تھے اور ان کی شاعری تصوف کے رنگ میں
ڈوبی ہوئی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے مریدوں میں حافظ نور محمد ولد میاں جی کلو صاحب سب سے دیرینہ
اور معمر مرید تھے، آپ کے دونوں صاحبزادے حافظ خدا بخش اور حافظ عبدالغفور اور آپ کے
پوتے حافظ علی احمد اور نثار احمد بھی سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت تھے، سیٹھ محمد ابراہیم و سیٹھ
الٰہی بخش کے خانوادوں کے علاوہ اور کئی دیگر گھرانے جن میں دینی شعور تھا اسی سلسلے سے
منسلک تھے۔

منشی محمد علیم اللہ خیالی برہانپور کے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے تھے آپ نے ہی
خواجہ سید ہاشم کشمی کا شجرۂ مبارکہ ترتیب دیا تھا، آپ کے مشابہ اور ہم نام اور تخلص میں
ہم قافیہ ہلالی حاجی منشی علیم اللہ مریدین میں اعلیٰ مرتبت رکھتے تھے اور خواجہ محمد حسین شاہ کی
خط و کتابت کی پوری ذمہ داری آپ کے سر تھی، بحرِ طریقت کے شناور تھے خلافت بھی

حاصل تھی لیکن پیری مریدی کے جھمیلوں سے دور طریقت کے ساحل پر بیٹھے مراقبت کرتے
رہے۔ ختم خواجگانِ نقشبندیہ کا انتظام آپ کے ذمے تھا۔

شہر کے سابق میونسپل ممبر منشی افضل حسین، ہدایت اللہ حکیم بابو اور منشی عنایت اللہ
پیر صاحب کے خوش اعتقاد مریدین تھے۔

برہانپور میں خواجگانِ اشرفیہ کا سلسلہ بھی بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا تھا، پیر طریقت شیخ
المقصود الحاج حضرت شاہ عبدالغفور بخش اللہ شاہ اشرفی کے مریدین کی خاصی تعداد موجود
تھی۔ آپ کی علم نوازی سے شہر کی دینی درسگاہوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا' جامعہ اشرفیہ
انوار العلوم' کی بانی اور سرپرست آپ ہی کی ذات بابرکات تھی۔

دارالسرور برہانپور کی بنیاد ہی روحانیت کے 'اساس' پر تھی جس پر حضرت برہان الدین کا
سایہ تھا، فاروقی حکمراں کا تسلط زمین کے ایک ٹکڑے پر تھا اور اولیاء کرام ٹوٹے دلوں کو
جوڑنے والے اور تالیف قلوب کرنے والے شہنشاہ تھے، بہاء الدین باجن قدیم دکنی
اردو کے شاعر، حضرت عیسیٰ جند اللہ حضرت شاہ منصور، خواجہ ہاشم کشمی جو مجدد الف
ثانی حضرت شیخ سرہندی کے خلیفہ تھے اور کئی دیگر پیرانِ طریقت اور مشائخ نے برہانپور کی
روحانی تاریخ میں اپنے فیوض و برکات سے بڑی روشنی پھیلائی ہے، حضرت مسیح اللہ اور
حضرت [illegible] جنیداری بھی نقشبندیہ سلسلے کے پیر تھے، حضرت مسیح اللہ کی خانقاہ اور مدرسے
میں مریدوں کی روحانی تربیت کی جاتی تھی اور پنجاب، لنکا اور افغانستان تک کے طالبانِ علم
تصوف خانقاہ میں آکر مقیم رہتے۔

برہانپور ہی میں حضرت برہان الدین راز الٰہی کی دعا سے اورنگ زیب عالمگیر کو اسی
طرح ملوکیت ملی جس طرح سیہ گڑھ کے حضرت شاہ جلال کی دعا سے مبارک شاہ کو خاندیس
کی ملوکیت نصیب ہوئی [اہل اللہ کی دعاؤں کی استجابت میں مشیت الٰہی کو زیادہ دخل ہوتا ہے]
میر شاہ عبداللطیف، میر محمد نعمان نقشبندی، سید شریف، شیخ ابراہیم مرشد باجوی اور نہ جانے کتنے اولیاء
کرام [illegible] تک برہانپور میں دفن ہیں۔ [1]

---

[1] اولیائے [illegible] ... (برہانپور ۱۳۵۹ھ) اور تذکرہ علماء دارالسرور [illegible] ... دونوں کتابوں کے مصنف [illegible] ... محمد یعقوب کے [illegible] ... ہیں اور منیف [illegible] مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔

دکن اور کوکن میں سب سے زیادہ قادریہ سلسلہ کو فروغ ملا، قادریہ طریقہ عموماً چشتیہ سے مربوط نظر آتا ہے، ایک صوفی اور پیر طریقت ایک ساتھ ان دونوں سلسلوں کے علاوہ کئی اور سلسلوں میں بیعت کرنے اور مرید بنانے کا مجاز ہوتا تھا بشرطیکہ ہر ایک سلسلہ کی خلافت رکھتا ہو، چنانچہ مالیگاؤں کے مشہور صوفی بزرگ حضرت مولانا برکت علی شاہ (سنہ ۱۲۷۰ھ - سنہ ۱۳۴۵ھ) سات سلسلوں سے منسلک تھے (۱) سلسلۂ عالیہ مجددیہ (۲) سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ (۳) چشتیہ (۴) قادریہ (۵) قرنیہ (۶) شاذلیہ اور (۷) اویسیہ۔

مولانا برکت علی شاہ اصلاً نقشبندیہ تھے اور اسی سلسلہ میں بیعت فرماتے تھے، آپ نے کئی شیوخ کی خدمت میں رہ کر روحانی تربیت حاصل کی تھی، سلوک مجددیہ کی تکمیل فرمائی اور طرق سبعہ (ساتوں سلسلوں) کی اجازت و خلافت پائی، کلکتہ آپ کے رشد و ہدایت کا مرکز تھا لیکن بہار شریف میں، مالیگاؤں اور کئی دیگر شہروں تک آپ کی تبلیغ کا اور بیعت کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

مالیگاؤں کے مؤرخین[1] لکھتے ہیں کہ مولانا برکت علی شاہ صاحب اس وقت یہاں آئے جب جامع مسجد تعمیر ہو چکی تھی، آپ کا انداز خطابت بڑا دلنشین تھا اور تاثر قریب قریب انقلاب انگیز تھا۔ دو تین مواعظ کے بعد ہی سامعین کی قسمتیں بدل گئیں اور ذہنوں کے دریچے کھل گئے، وہ لوگ جو فسق و فجور میں ملوث تھے تائب ہو کر شریعت کی پابندی کرنے لگے، بیعت کا سلسلہ بڑھا، اور شہر میں غلغلہ بلند ہوا کہ ہندوستان کے مایۂ ناز عالم اور صوفی مولانا برکت علی کی نگہ التفات سے اکتساب روحانی و باطنی کے لیے دروازۂ قلب کھل جاتا ہے اور قلبی بیعت ہو جاتی ہے۔

آپ کے اولین مریدین میں یہ لوگ شامل تھے۔ بابو ملا، حکیم محمد اسماعیل خدا بخش، مولانا عبداللہ (غالباً بانی مدرسہ بیت العلوم)، حاجی مدار بخش گجو، حاجی الٰہی بخش، مراد سیٹھ، الٰہی حاجی ستی والے، کمال سیٹھ، جان محمد، مولانا عبدالسلام، اولیا سیٹھ، محمد دلن، محمد بنگاری، نذیر سیٹھ اور سب سے عظیم شخصیت مولانا محمد اسحاق مقصود رفتہ رفتہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس روحانی نقش سے متاثر ہو کر آپ کے مریدین و متوسلین میں شامل ہو گیا، یہ سارے مومن برادری کے افراد تھے مریدوں اور عقیدتمندوں نے اسلام پورہ کے جنگل کے قریب ایک غیر مزروعہ افتادہ زمین پر

۱؎ نقوش تذکرۂ شعرائے مالیگاؤں۔ مؤلف حنیف مالیگانوی (مالیگاؤں ۱۹۷۹ء)۔ ص ۱۰۱، ۱۲۷ - ۱۵۰

۲؎ اوراق کے سفیر۔ مجموعہ مقالات (مالیگاؤں سنہ ۱۹۹۲ء) حضرت مولانا برکت علی شاہ۔ عبدالمجید صدیقی پروفیسر ایم۔ ایس۔ جی کالج، مالیگاؤں ص ۱۷ - ۲۵

پیچھے مریدین اور معتقدین کا ایک ہجوم جو عقیدت و محبت سے سرشار ہو کر والہانہ
انداز سے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھتا ہے اس طرح سب مولانا کی قبر تک پہنچتے ہیں وہاں
صندل رکھ دیا جاتا ہے جس میں رکھی ہوئی سبز رنگ کی چادریں اور پھول نہایت ادب و
احترام کے ساتھ مولانا کے مزار پر چڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد عرس شروع ہوتا ہے۔
"قل شریف، ختم شریف اور دعاؤں کے بعد تقریریں اور قوالیاں ہوتی ہیں۔ صبح کو
ان کے بھائی شکر اللہ صاحب نیاز فاتحہ کے لئے کھچڑا پکواتے ہیں جو بڑوں کے علاوہ
چھوٹے بچوں کو کھلایا جاتا ہے۔" [1]

تقریباً یہی نقشہ ہر شہر، قریہ اور دیہات میں مشہور اولیاء، پیروں اور فقیروں کے
مزاروں پر نظر آتا ہے۔

مالیگاؤں میں مولانا تقی بخش کے بزرگ مولانا صوفی عبدالرؤف جو تمام سلسلوں میں قابلِ
احترام بزرگ اور حضرت حافظ حامد حسن علوی کے خلیفہ تھے اکثر مالیگاؤں سلسلہ تصوف کی
نشر و اشاعت کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ خانقاہ برکتیہ (برکت پورہ) میں ختم خواجگان کی مجلس
منعقد کی جاتی تھیں ان کا اہتمام مولانا برکت علی شاہ کے مریدین حافظ محمد، صوفی مختار احمد،
ماسٹر محمد علی اور ماسٹر محمد صدیق ابنائے یوسف مکی کے ذمہ تھا۔

محمد بن تغلق (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) نے جب دلی کو جو چوبیس خواجوں کی چوکھٹ بن گیا
تھا اجاڑ کر دولت آباد کو نفوس بابرکات کے وجود سے مالا مال کر دیا تو دیارِ دکن سے لے کر
کوہسارانِ کوکن تک خلفائے چشتیہ کی سینکڑوں روحانی ولایتیں قائم ہو گئیں ان کی بارگاہیں
وہ خانقاہیں تھیں جن میں عقیدتمندوں اور مریدوں کا دربار لگا رہتا تھا۔ منتخب الدین زر زری
زربخش (متوفی ۷۰۹ھ) کے ہمرکاب عرفان و معرفت کے زر و جواہر لٹاتے ہوئے سات سو پالکی
نشین بزرگانِ دین آئے تھے، ان میں سے حضرت برہان الدین چشتی اور ان کے مرید و خلیفہ شاہ
صدر الدین چشتی نے کوکن کو مسکن بنایا۔ [2]

بہمنی دور میں خواجہ بندہ نواز سید محمد الحسینی گیسو دراز نے گلبرگہ کو عرفان و روحانیت کی

---

[1] نقوش ص ۹۹ — ۱۰۰

[2] ڈاکٹر مومن محی الدین — تاریخ کوکن۔ دہلی ۱۹۶۹ء، ص ۱۳۹ - ۱۴۰، ۲۴۴ - ۲۴۵

بہار آفریں فضا میں گل صد برگ بنا دیا تھا دار الخلافہ گلبرگہ میں مومن پورہ نام کے محلے میں آج
بھی ان کے نام لیوا موجود ہیں۔

عادل شاہی سلطنت کا دار الخلافہ بیجاپور تقریباً تمام سلسلوں کا مرجع تھا ان میں سب سے
زیادہ قادریہ اور چشتیہ خانقاہوں میں مریدین اور معتقدین کا ہجوم رہتا تھا، کوکن میں بھی انہیں
دونوں سلسلوں کے طفیل خانقاہیں آباد ہو گئی تھیں، جزائر بمبئی کے بیشتر نوائط مسلمان جنہیں
کوکنی مسلمان کہتے ہیں انہیں سلسلوں سے منسلک تھے۔ انیسویں صدی میں یہاں کشمیر اور شمالی
ہند کے مولوی حضرات آئے تو نقشبندیہ سلسلے کے نقوش اجاگر ہونے لگے۔ اسی زمانے میں مومن۔
انصاری مہاجرین بھیونڈی اور بمبئی میں کثرت سے آباد ہو چکے تھے، بمبئی میں یہ بائیکلہ اور اس کے
ارد گرد سکونت پذیر تھے ان میں ایک خاصی تعداد اہلحدیث کی تھی جنہیں عام طور سے وہابی کہا
جاتا تھا، یہ خود طریقۂ محمدی سے وابستہ تھے لیکن سید احمد شہید کا یہ سلسلہ اب وہابی تحریک بن چکا
تھا۔ بمبئی تو پیروں کا شہر تھا جس پر بقول ڈپٹی نذیر احمد " اری بمبئی تجھ پہ پیروں کا سایہ" یہاں
سایہ فگن پیر رہتے۔

انیسویں صدی میں بھیونڈی میں بھی الہ آباد کی پھولپور تحصیل کے مومنوں کی ایک الگ بستی
آباد ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ جونپور اور اعظم گڈھ کے مہاجرین انصاری بھی مختلف خطوں میں
بٹے ہوئے تھے، ان اضلاع میں سلسلۂ اشرفیہ (کچھوچھوی) کا بڑا زور تھا اسی لئے بھیونڈی
میں بھی اشرفیہ کا سکہ چل رہا تھا اور بیشتر پھولپوری گھرانے اسی سلسلے میں بیعت تھے۔ عورتیں
پیش پیش رہتی تھیں۔ یہاں برادری میں خاصی تعداد اہل حدیث کی بھی تھی جو غیر مقلدین ہونے
کے سبب لامذہبی کہلاتے تھے مگر اکثر دوسرے بھی لوگوں کی نظروں میں یہ بگڑے ہوئے
تھے، "وہابی" بن گئے۔ اترپردیش کے آباد مہاجرین انصاریوں کی پہلی نسل میں دینی تعلیم کا
بڑا رجحان تھا وہ پڑھے لکھے حضرات خصوصاً مولوی اور مدرس تصوف کی طرف میلان رکھتے
تھے، سلسلۂ اشرفیہ کے بڑے بوڑھے اوراد و وظائف کے علاوہ جمعرات کو گھروں میں شجرہ

نور اللہ [illegible] ابراہیم مومن، بشیر [illegible] حکیم محمد امین، مرحوم [illegible] عبد المجید انصاری
اور [illegible] صدیقی کچھوچھوی [illegible] بیعت تھیں، [illegible] بڑی خوش عقیدہ تھیں اور [illegible]
[illegible] رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا)۔

مبارکہ بھی پڑھا جاتا تھا، کچھ تعلیم یافتہ لوگ جو عربی و فارسی کی استعداد رکھتے تھے تصوف کے دوسرے سلسلوں سے بھی آشنا تھے، یہاں تک کہ فرقۂ مولویہ جو اس ملک میں اتنا مقبول نہیں ہوا، بھیرہ میں معروف تھا، قصبہ کے ایک عالم مدرس مولوی رفیع عرف بہ منشی رفیع نے "حق لطیفہ" کے عنوان سے مولانا جلال الدین رومی کے "صد اسمائے شریفہ" کا ایک وظیفہ جسے ان کے مرشد قبلہ مولوی و مرشدی شاہ عبداللہ معروف مولوی مثنوی صاحب نے مرتب کیا تھا اپنے فن خاص کا کیف [illegible] بنا کر "جمیع اہل خاندان و جان نثاران" میں تقسیم کر دیا تھا۔ "اپنے مکان پر محفوظ رکھ کر کل آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہ سکیں۔"[1] اس وظیفہ میں منشی رفیع کے مرشد نے ان صد اسمائے موصوفہ کو مولانا جلال الدین رومی کی تصنیفات سے منتخب کر کے یکجا کر دیا تھا تاکہ عام و خاص اسلام کے عاشق زار کے زبان میں جاری رہے اور اس سے دین و دنیا کا فائدہ حاصل ہو۔ [illegible]

قصبہ بھیرہ میں حضرت سید شاہ حسین قادری الحسنی والحسینی الجیلانی جو عرف عام میں دیوان شاہ کہلاتے تھے ایک نامی صوفی بزرگ گزرے ہیں جو مرتبۂ ولایت کو پہنچے۔ ہر سلسلہ کی اجازت اور خلافت ملی تھی مگر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تخصیص فرماتے تھے۔ آپ کی درگاہ کے سجادہ نشینوں میں بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں مولانا مسعود، ان کے صاحبزادے مولانا محمد امین اور مولانا [illegible] مدرس اول مسجد سلام آباد پیری مریدی کے لیے مشہور تھے۔[2]

ہمارے اسلاف کو دین سے جو رغبت و محبت تھی اور اہل اللہ سے جو گہری عقیدت تھی اس کا اندازہ ان کے روزمرہ دنیاوی و دینی عمل سے ہوتا تھا۔ ان کے کلمات کو وہ حرز جان بنا کر رکھتے اور ان کے رشد و ہدایت کی روشنی میں وہ خود چلتے اور کسب نور کرتے لیکن عقیدت کی روشنی سے کبھی کبھی آنکھیں چندھیا جاتیں اور شریعت و طریقت آپس میں گڈمڈ ہو جاتے جیسا کہ اس وظیفہ سے اندازہ ہوتا ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے:

> "حضرت مولانا کا ہر ایک اسم شریف بزرگ صفات سے زیادہ مفید ہے، ہر ایک اسم شریف کے فوائد بیان کرنے میں ضرورت صوفی کتاب کی ہے۔ اسی واسطے تبرکاً یہ مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی مختصر بیان پر قیاس کریں۔ یہی کیا کم ہے۔ اللہ پاک نے حضرت مولانا کے وجود مبارک سے کیا قدرت ظاہر کی۔ بلند یوں جانا چاہیے۔ اللہ پاک نے حضرت

---

[1] اس وظیفہ کی نقل کے لیے میں محترمی جناب مشتاق محمد موسیٰ رفیع صاحب کا شکرگزار ہوں۔

[2] مولانا محمد امین بن غلام محی الدین تکمیل دستور العمل نظام پورہ اسلام آباد بھیرہ کے عالم اور مدرس جامع مسجد بھیرہ [illegible]

مولانا کے وجود مبارک سے کیا قدرت ظاہر کیا۔ بلکہ یوں جاننا چاہیے۔ اللہ پاک اپنا اسم
اعظم جلالیت کے پردے میں ظہور فرمایا اور مولانا کو بطور آئینہ فانی کر کے خود بقا باقی شہود بہا
جلالیت اپنا "شانِ عظمت انتقام" ادا کیا" (کذا)
یہ وظیفہ طاعون، جذام و برص اور ہیضہ کے لیے اکسیر اعظم بتایا گیا ہے۔

خانقاہی نظام اور روحانی تربیت

ایسے عقائد، ورد و وظائف، اذکار، چلہ کشی اور ریاضت دراصل خانقاہی رہبانیت اور صوفیانہ تربیت کی پیداوار تھے۔ وہ صوفیائے کرام اور پیرانِ طریقت جن کی دینی علوم پر گہری نظر تھی اپنی خانقاہوں میں مریدوں کی روحانی تربیت اور ان سے ملحقہ مدارس میں شریعت کی تعلیم دیتے تھے، عموماً نماز فجر کے بعد مشائخین مریدین کے دلوں پر روحانی توجہ کر کے تزکیۂ نفس کا طریقہ بتاتے تھے، تاکہ تجلیات ربانی اور انوارِ عرفانی سے منور ہو جائیں۔ مدرسوں میں علم تصوف کے ساتھ فقہ، تفسیر اور حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی جس کے لیے مدرسین اور معلمین مقرر تھے۔ خانقاہوں میں مریدوں کے قیام و طعام کا انتظام تھا، بعض شیوخِ طریقت کا تعامل یہ تھا کہ لنگر کے کھانے کو ہر مرید کے برتن میں سے چکھتے تھے یہ برکتِ غذا کے لیے تھا، عقیدت مند مریدین پیر صاحب کا جوٹھا کھانے کو باعثِ برکت سمجھتے تھے۔[1] حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید شیخ جمال اُچی کی خدمت میں مخدوم جہانیاں جب وہ سات برس کے تھے ان کے والد لے گئے تو دستبوسی کے بعد حضرت شیخ نے ایک خرما دیا۔ مخدوم جہانیاں اس کو مع گٹھلی کے کھا گئے، پوچھنے پر فرمایا کہ آپ کے ہاتھ سے جو خرما ملا ہے اس کی گٹھلی دور کرنا بے ادبی ہے۔ شیخ نے دعا دی "تو وہ چراغ بنے گا جو خاندان کو قیامت تک روشن رکھے گا"[2]

تمام سلسلوں میں بیعت کا طریقہ اور دستور یکساں تھا، پیر صاحب مرید کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دعا کرتے، استغفار پڑھتے، شریعت کی پابندی اور اتباعِ رسول کی تاکید کرتے اور عمل صالح کی نصیحت کر کے دعا فرماتے، عورتوں کو مرید کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مرید ہونے والی

---

[1] مولوی معین الدین ندوی، [illegible] مرکز روحانیت، صفحہ ۱۱۹
[2] مولوی معین الدین، مولانا حبیب الرحمن [illegible] شرف، صفحہ ۲۲-۲۳

عورت کو پردہ کے پیچھے بٹھا کر پردہ کے نیچے سے اس کے دوپٹے کا ایک سرا حضرت مرشد کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا تھا پھر وہی تلقین، نصیحت اور دعا دی جاتی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بیعت یہی تھا جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے:

"اے پیغمبر جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات کی بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ تو شرک کریں گی نہ چوری کریں گی نہ بدکاری کریں گی نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی۔ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی بہتان باندھ لائیں گی نہ نیک کاموں میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے لئے خدا سے بخشش مانگو۔ بے شک خدا بخشنے والا ہے۔"

(ممتحنہ: ۱۲)

— مگر افسوس آجکل کے نام نہاد اور جعلی پیروں اور "بابوں" کا وطیرہ یہ ہے کہ جب "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" کا نقشہ نہیں کھنچتا تو ان کی ایسی حالت ہوتی ہے:

دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
(غالب)

صوفیانہ ریاضت و مجاہدہ کی نئی شکل آج کل "محنت" ہو گئی ہے، فرق مقصدیت میں ہے، اصل ریاضت و مجاہدہ "ذکرِ الٰہی" میں ہے محنت تو ایک نیا تصور ہے جماعتی تبلیغ و اشاعت کا، ذکر مومن کی جنت ہے دنیاوی اور اُخروی، اور مومن کا وہ وظیفہ ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو، اس کے لئے مجاہدہ و ریاضت کی سخت ضرورت ہے اور مرشد ربانی کی جستجو

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝

(الکہف: ۲۸)

"کسی ایسے شخص کی پیروی مت کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش (نفس) کی پیروی کرتا ہے اور اس کا کام حد سے بڑھ گیا"

ایسے لوگ جو اپنے رب کی رضا کے طلبگار ہیں کہ شام و سحر اسے پکارتے ہیں یہی تو ہیں مرشد کامل اور رہبر حق اور اصلی ذاکر، ذکر دعا سے افضل تر ہے اس لئے کہ اس میں عزوجل کے اوصافِ جمیلہ یعنی اسماء و صفات کا ذکر کیا جاتا ہے، اس کے انعامات اور اسماء مبارکہ کو تمام کیا جاتا ہے اس کی تعریف و ثنا، تنزیہہ و تقدیس، تہلیل و تحمید، تسبیح و تکبیر کا ورد کیا جاتا۔

ہے اور اگر یہ زبان و دل سے کیا جائے تو افضل ذکر ہے تاکہ معرفتِ خداوندی حاصل ہو،
خشیتِ الٰہی اور مراقبہ کی تڑپ پیدا ہو اور اس کی سب سے اعلیٰ و افضل قسم یہ ہے کہ بندۂ
مومن اپنی موضوع اور خود ساختہ حمد و ثنا میں نہیں بلکہ بلا تحریف و تعطیل اور تمثیل و تشبیہ
[illegible] کی وہی ماثورہ ثنا و تعریف بیان کرے جو ذاتِ باری نے خود اپنے لیے تجویز فرمائی ہیں،
یا آ[illegible] نے بیان فرمائی ہیں اور خود ان الفاظ سے حمد و ثنا کی ہے جو مختلف احادیث سے وارد
ہیں۔ لہ

تصوف کے دور میں اس کے جوہرِ پاک پر خود ساختہ اور من گھڑت اوراد و وظائف
کی تعلیم [illegible] دی گئی، اور انہیں 'دلائل الخیرات' اور 'حزب اعظم' بنا دیا گیا، تصورِ الٰہی
کی جگہ [illegible] شیخ نے لے لی، اور یہیں سے شخصیت پرستی شروع ہو گئی۔

[illegible] تھی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
[illegible] خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا
(اقبالؒ)

سلسلۂ [illegible] یہ کو دیگر سلاسل پر فضیلت حاصل ہے اس لیے کہ اس میں روحانی
جذبات کی [illegible] لیے حال، رقص اور سماع کے لیے نہ مزامیر کی اجازت ہے نہ معازف
و آلاتِ موسیقی [illegible]، مومنین کے نزدیک 'سماع' آیاتِ الٰہی یعنی قرآن پاک کا سماع ہے
یہی ہیوں اور [illegible] معرفت کا سماع ہے" اور ان پر جب رحمٰن کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں
تو سجدے میں [illegible] تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، مومنین کی صفات حسنہ یہی
ہیں۔ اس سلسلہ [illegible] بدعات و رسوماتِ غیر اسلامی سے حذر کرنے کی تلقین کی جاتی ہے بلکہ
پر [illegible] جائے قلب [illegible] تجلیاتِ ربانی سے اکتساب نور کرنے کی ہدایت ملتی ہے
تو [illegible] مخصوص [illegible] وہ تعلیم کہ مرد اللہ اور اللہ کے قدم میں سنے زندگی کا
[illegible] اباحت [illegible] دائرہ میں [illegible] لیکن جب علمائے دین اور فقیہان و مفتیان شرع

لہ دیکھیے [illegible] الکلم الطیب۔ اردو ترجمہ ذکر الٰہی، تقدیم و تقریظ
[illegible]
لہ دیکھیے آیات: مریم ۵۸ [illegible] بنی اسرائیل: ۱۰۹، مائدہ: ۸۳

مفتیوں سے استفسار کے لئے رجوع کیا جاتا تو وہ "یجوز التقبیل بھیئۃ السجود علی الاقدام" یعنی "نقش پائے ناز کے سجدوں" کو مباح قرار دیتے۔ بھیونڈی، کلیان اور بمبئی میں ایک عرصہ ۱۹۴۲ء سے "درباب جواز و عدم جواز تقبیل اقدام علماء و صلحاء و سادات کرام مابین اہل اسلام اختلاف شدید و نزاع جدید واقع تھا" مسئلہ یہ تھا کہ پیر صاحب جب کھڑے رہتے ہیں تو "اس کا مرید اس کے روبرو کھڑے ہو کے دین کا خط کہتے ہوئے رکوع کی صورت جھکے ہوئے بیٹ سجدہ میں جا کر یعنی دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کر کے اور دونوں کف دست پیٹے زمین پر رکھ کے ماتھا اور ناک اپنے پیر کے قدموں پر رکھتا ہے بعد اس کے پیر کے قدموں کو چومتا ہے اور آنکھیں اوس پر ملتا" [1]

سلسلے کچھ اور بھی تھے جن کی نسبتوں کے پیچ و خم میں ایک دو شکن زیادہ کر کے ایک نیا فرقہ بنا لیا جاتا جیسا کہ "پانچ پیریا" فرقہ تھا جس کا تعلق غازی میاں کی درگاہ کے پانچ مزاروں سے تھا۔ ان پانچ پیروں کو ماننے والوں میں ہندو مسلم دونوں ہی مذہب کے لوگ تھے۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ ۳۵ ذاتیں تھیں جو پانچ پیریا فرقے سے تعلق رکھتی تھیں ان میں مومن برادری کے جاہل افراد بھی ایک "ذات" بن کر شامل تھے۔ [2]

طریقِ خانقاہی

قرونِ وسطیٰ کے صوفی اور مشائخ جن مروجہ سلسلوں کے پیرو رہتے تھے ان کے روحانی نظام کے تحت پابند بھی تھے۔ فلسفیانہ نکتہ پیری اور شاعرانہ خیال آرائی کے علاوہ تصوف کا علمی پہلو بھی تھا اور روحانی و ادبی پہلو بھی تھے، اکتسابِ معرفت اور مشاہدۂ حقائق بھی م

---

۱ اس موضوع پر جامع مسجد کے کتب خانہ (بمبئی) میں یہ کتابیں موجود ہیں (۱) [illegible] تنقیح ہیئۃ السجود علی الاقدام مصنفہ قاضی محمد اسمٰعیل [illegible] (بمبئی ۱۹۴۲ء) [illegible] (۲) [illegible] در تقبیل اقدام بزرگان ذوی الاحترام مصنفہ مولوی [illegible] (۳) اجوبۃ الفاضل [illegible] [illegible] محمد یٰسین قنبہ کچھوی (چھپوا بمبئی)

۲ گیانندر پانڈے (انگریزی) ص [illegible]۔ اور نسیم احمد (انگریزی) بنگال کے مسلمان، دہلی ۱۹۹۰ء، ص [illegible]-۹۳

بھائی چارا ابرو کا صفایا کر کے اور سر ترشوا کر ہر کوئی قلندر بن جاتا، کوئی سر پہ تاج دھر کر اور کفنی اور سلیمانی پتھروں کا ہار گلے میں ڈال کر مستان شاہ بن کر کوڑے سے اپنے بدن پر ضرب لگاتا اور "اللہ ہو" کا نعرہ لگاتا، جلالی درویش جلال میں آ کر "سب جلا کر بھسم کر دوں گا" کی دھمکیاں دیتا اور کچھ مجذوب کسی دیوار کے سائے تلے پڑے بکتا اور سادہ لوح لوگ اس میں دعاؤں کی تاثیر ڈھونڈتے۔ یہ سارے دریوزہ گر اور گداگر تھے، نہ ان کا کوئی گھر تھا اور نہ ٹھکانہ۔ [illegible] زندگی کے حسین تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نہ ان کے پاس وسائل تھے ورنہ خود یہ [illegible] کے بل تھے ایسے فقیر، درویش جن کی زندگی کے پیراہنوں میں درد کے پیوند لگے رہتے تھے نہ جانے کہاں سے آتے تھے اور وقت کے پھیلتے بڑھتے گرداب میں کہاں کھو جاتے۔

۱۸۶۳ء میں شمالی ہند کے معاشی بحران کی رپورٹ میں غازی پور کے کلکٹر نے لکھا کہ بے روزگار جلاہے اب مزدوری کرنے لگے ہیں کچھ بہشتی بن گئے ہیں اور کچھ فقیر بن کر بھیک مانگنے لگے ہیں۔[1]

ہندوستان میں پیروں کی خود رو پیداوار سے خود ساختہ بزرگیں بھی [illegible] ہو گئیں [illegible] کے ساتھ ایک بے رونق مزار کسی جاہل اندھیرے گاؤں میں [illegible] غلاف میں ملفوف نظر آئیگا۔ پیشہ ور طبقات عدم تحفظ اور پست ہمتی کے سبب اپنی [illegible] و حفاظت کے لیے تصوراتی اور ماورائی ہستیوں میں روحانی قوت تلاش کرتے تھے چنانچہ بنگال کے ملاح خواجہ خضر کی یاد کرتے تھے جو ان کے سفینوں کو ساحل مراد تک پہنچا دیتا ہے، لوہار سمجھتے حضرت داؤد علیہ السلام سے اپنے بازوؤں کے لیے آہنی طاقت کا طلبگار رہتا ہے۔ "زندہ غازی" لشکر [illegible] کا پیر تھے، عطار (تیلی) "حسن تیلی" پیر کے نام کا چراغ جلاتا تھا۔ رنگریز "پیر علی رنگریز" کے رنگ میں ڈوبا رہتا، حلال خور بھی "لال بیگ" پیر کے نام کی تسبیح پڑھ کر تزکیہ نفس کرتا۔[2]

بعض بڑی بڑی درگاہوں سے مختلف کرامات وابستہ تھیں، پنجاب میں سخی سرور کے مزار پر حاضری دینے سے آشوب چشم کی بیماری کو شفا مل جاتی، مخدوم صاحب بھوت پریت اور آسیب اتارنے کی طاقت سلیمانی رکھتے ہیں، بہرائچ کے غازی میاں کے مزار سے استعانت مانگی جاتی

---

[1] [illegible] پانڈے (انگریزی)، ص [illegible]

[2] رفیع الدین احمد (انگریزی) بنگال کے مسلمان اور [illegible]، مسلم درگاہیں ہندوستان میں (انگریزی) ص [illegible]

دور کی شان و شوکت کا نمونہ تھی ان کی خانقاہ میں "حشم و خدم تھے صبح و شام نوبت بجتی تھی حرم سرا میں چار بیویاں تھیں فتوحات و نذرانے کا سلسلہ جاری تھا جو خدام و متوسلین اور مستورات پر خرچ ہوتا تھا" [1]

"خدمتِ خلق مشائخ عظام کا خاص شعار تھا اور وہ افضل الاشتغال خدمت الناس کو اپنا نصب العین قرار دیتے تھے" ان کی روحانی ولایت میں جہاں جہاں انکی خانقاہیں آباد تھیں، طالبین اور مسترشدین کا خاص خیال رکھا جاتا تھا ان کے تکیوں پر فقراء و مساکین کا تکیہ تھا اور ان کے جلوخانے دانا پینے کی چکی گھروں، اور لنگر خانوں کے سہارے ہزاروں تنگ دستوں کے سفینۂ حیات چلتے تھے۔ [2]

ـــ پھر وقت کے دھارے میں اور بدعات و مشرکانہ رسوم کے گرد و غبار میں تصوف کا جوہر پاک مکدر ہو گیا، جہل و بدعت کی آمیزش نے روحانی اقدار کے خیمے کو زنگ آلودہ کر دیا، جہاں حقائق کی جگہ حکایات نے لی، اس دھندلکے میں شریعت کا راستہ گم ہو گیا جب طریقت پر بڑی چہل پہل نظر آنے لگی خانقاہوں اور سلسلوں کی بکھری ہوئی زلفوں میں رہبر سماج کی دستاریں الجھنے لگیں اور مریدین متبعین کے ذہنوں کو پیشہ ور پیرانِ طریقت اور مفاد پرست سجادہ نشینوں کے جہالت آمیز عقیدے الجھانے لگے، نو مسلم پیشہ ور سماجی طور پر پچھڑے ہوئے ابھی تک اپنے آبائی عقائد و رسوم کے گرد و غبار کو جھٹک کر ذہن و دل کو ستھرا نہیں بنا سکے تھے۔ وہی ان عقیدوں کے عنکبوتی جالوں میں پھنس کر رہ گئے۔

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی، گئی روشن ضمیری (اقبال)

---

[1] تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص

[2] مومن محی الدین، تاریخ کوکن ص ۳۳۵

اٹھارھواں باب

مذہب، مسلک اور مکتبِ فکر و خیال

فقہ، احکامِ الٰہی کے جاننے کا نام ہے، یہ احکام کتاب و سنت اور ادلۂ شرعیہ سے ماخوذ ہوتے ہیں ان احکام کا جب ان ادلہ (شواہد) سے استخراج ہوتا ہے تو انہیں فقہ کہتے ہیں[1]۔ صحابہ سب کے سب صاحبِ فتویٰ نہ تھے بلکہ دین کے خصوصی معلمین یا حاملینِ قرآن تھے انہوں نے یا تو نبی کریمؐ سے براہِ راست دین کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی یا ان جلیل القدر اصحاب کرام سے اکتسابِ فیض کیا تھا، ان حاملینِ قرآن کو "قُرّاء" کہا جاتا تھا یعنی وہ لوگ جو کتابِ الٰہی کی قرأت بخوبی کرتے تھے۔ نبی کریمؐ کی حیاتِ مبارکہ میں چار حفاظ۔ قرّاء کو بڑی فضیلت حاصل تھی ان میں دو انصاری صحابۂ کرام تھے۔ سید الانصار حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابی بن کعبؓ۔ آپؐ لوگوں سے کہتے تھے انہیں سے قرآن کی تعلیم حاصل کرو (خذوا القرآن عن اربعۃ) حضرت ابی بن کعبؓ سے صحابہ کی کثیر تعداد نے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی۔ قرآن کی نقل و اشاعت کے سلسلہ میں کتابت کی بجائے قلب و صدر پر انحصار امتِ محمدیؐ کی عظیم خصوصیت ہے اس لئے اسلام اپنی تعلیمات دلوں پر ثبت کرتا ہے۔

جب اسلامی مملکت کی سرحدیں پھیلنے لگیں اور عرب سے جہالت کا خاتمہ ہو گیا تو لوگوں میں قرآن کی تعلیم عام ہو گئی اور استنباط (نتیجہ اخذ کرنے) کا سلسلہ فروغ پانے لگا یہاں تک کہ فقہ

---

[1] فقہ کے موضوع پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کے ماخذ اور مصادر یہ کتابیں ہیں (۱) فلسفۃ التشریع فی الاسلام۔ صبحی محمصانی [illegible] اردو ترجمہ [illegible] ۹۲ (۲) علوم القرآن تصنیف ڈاکٹر صبحی صالح (لبنان)۔ ترجمہ غلام احمد حریری۔ [illegible] (۳) اسلامی فقہ [illegible] (۲۷۹، ۹۵۶) (۴) فقہ سنت۔ [illegible] ۱۹۸۳ء (۵) تاریخ افکار و علوم اسلامی (دو جلدیں) (لاہور ۱۹۷۸ اور ۱۹۷۹) مؤلف علامہ راغب الطباخ، ترجمہ مولانا مفتی محمد حنیف۔ مسلک اور مکتب کے موضوعات پر مختلف مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ [illegible] حوالے دیے گئے ہیں۔ (مصنف)

نے تکمیل پاکر ایک مستقل علم وفن کی شکل اختیار کرلی، تو پھر قرّا کا لفظ فقہاء اور علماء سے بدل گیا، اور فقہ کی دو شاخیں پھوٹیں، ایک کو طریقہ "اہل الرائے والقیاس" کہتے تھے، اور یہ اہلِ عراق تھے کوفہ کی نئی بستی ان کا مرکز تھا اور دوسرے کو طریقہ "اہلِ حدیث" سے یاد کرتے اور یہ اہلِ حجاز تھے۔ اہلِ حجاز اہلِ عراق سے زیادہ صاحبِ روایت تھے اس لئے کہ مدینہ منورہ دارالہجرۃ صحابہؓ کرام کا مسکن تھا۔

عباسیوں کے دورِ حکومت میں شہر بغداد مہاجرین کے لئے شہر آرزو بن گیا مفتوحہ ممالک کے نو مسلم مرکزِ خلافت کی طرف کھنچے چلے آئے، عراق میں ایک نئی تہذیب کا خمیر بننے لگا جس میں عجمی عنصر سرایت کر گیا، اسی بلاد میں اہل الرائے کی جماعت جس میں ایک مستقل فقہی مذہب نے نشو و نما پائی اور پھر ایک باقاعدہ فقہی مذہب رواج پذیر ہوا جس کے امام اعظم و پیشوا کوفہ کے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت ہیں جن کے فقہی مقام کی برتری مسلّم ہے کوفہ جو امام ابو حنیفہ کا مولد و مسکن تھا اسلام کی وسعت و تمدن کا گویا دیباچہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں بسایا ہوا یہ شہر بقول خود ان کے "رمح اللہ (خدا کا علم)" "کنز الایمان" (ایمان کا خزانہ) تھا۔[1] اہلِ حجاز کے طریق فقہ کے راہنما مالک بن انسؓ تھے اور ان کے بعد امام شافعیؒ کی شخصیت سامنے آتی ہے۔ پھر امام احمد بن حنبلؒ اس قافلہ میں شامل ہو گئے جو جلیل القدر محدثین میں سے تھے اور ان کے تلامذہ نے حدیث کے سرمایہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ابو حنیفہ کے تلامذہ سے پڑھا اور فقہ حنفی کو اچھی طرح سیکھا اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے تلامذہ نے ایک چوتھے فقہی مذہب کو رواج دیا جس کے مقلدین کی تعداد ہمیشہ سے سب سے کم رہی یہیں فقہ کو ۴ مکاتب پر رکز کیا گیا۔

پھر ان چاروں فقیہوں کی تقلید اطراف واکناف میں ہونے لگی ان کے سوا دوسرے فقیہوں کے مقلدین ناپید ہوتے چلے گئے اور فقہاء نے فقہ اور اس کے طرق میں اختلاف کا دروازہ بند کر دیا کیونکہ عباسی دور میں اور اس کے بعد بھی علوم وفنون اور ان کے مباحث و مسائل اتنے پھیل گئے تھے کہ ان پر دسترس ہر کس و ناکس کا کام نہیں رہا اور اس طرح فقہاء نے اجتہاد کا دروازہ بھی بند کر دیا اور لوگوں نے اجتہاد سے عاجز و درماندہ رہ جانا قبول کیا اور یہ کہہ دیا کہ اجتہاد کی صلاحیتیں باقی نہیں رہیں اور اس منصب جلیلہ کا کوئی اہل نہیں رہا، اس لئے ائمہ اربعہ

---

[1] علامہ شبلی نعمانی۔ سیرۃ النعمان دہلی ۱۳۷۶/۱۹۵۶ء ص ۳۰

میں کسی ایک مذہب کی تقلید کا پابند کر دیا گیا اور بعضوں نے تقلید کو فرض قرار دیا اور انتقال بالمذاہب یعنی ایک مذہب سے دوسرے مذہب کی تقلید پر قدغن لگا دی۔ اس کے نتیجے میں علما پر بھی ایک جمود طاری ہو گیا اور فقہی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں، لوگوں کی قوتِ فکر ختم ہو گئی اور نظریۂ تقلید رائج ہو گیا، تقلید جامد کے اثرات، علمی ضعف، انحطاط اور ذہنی انتشار کی کیفیت کے سبب اس قدر گہرے ہو گئے کہ ہر خلیفہ اور ہر سلطان نے اپنے ہم مذہب عالم کو قاضی مقرر کرنا شروع کر دیا۔ حنفی مذہب کو ان شہروں میں اس وجہ سے غلبہ زیادہ حاصل رہا کہ خلفائے عباسیہ نے تقرر حنفیہ کے حوالے کر دی تھی۔ مالکی مذہب تمام بلادِ مغرب (افریقہ، اندلس) پر چھا گیا، اور جب امام شافعی کا فقہی مذہب ترمصر سے اس کا سیلاب بڑھا تو سارے ساحلی علاقوں کو لپیٹ میں لے لیا (دریائی غذا پسند کرنے والوں کو اس فقہی مذہب میں اس کی حرمت کی کوئی پابندی نہ تھی)۔ فقہ حنبلی کے مد و جزر میں آٹھویں صدی ہجری میں ضعف و اضمحلال آ گیا، حنبلی متبعین سب سے زیادہ سنت اور روایت حدیث سے شغف رکھتے ہیں۔[1]

ابن خلدون کے زمانے (۷۳۲-۸۰۸ھ / ۱۳۳۲-۱۴۰۶ء) میں مصر، عراق، خراسان اور ماوراء النہر میں شوافع نے فتوی اور تدریس میں احناف کے ساتھ برابر کا حصہ پایا تھا اور دونوں کے درمیان مناظروں اور علمی بحثوں کی گرم بازاری برسوں قائم رہی، اس اتار چڑھاؤ میں ایوبی عہدِ حکومت میں فقہ شافعی کے سبزہ پامال میں تازگی آئی اور پہلے کی نسبت اس کی گرم بازاری اور زیادہ ہو گئی کیونکہ یہ سلاطین بھی شافعی تھے۔ جب مصر کی حکومت سلطان ظاہر بیبرس بندقداری کے قبضہ میں آئی تو اس نے چار قاضی مقرر کر دیے پھر کعبۃ اللہ میں بھی چار مصلّے قائم ہو گئے جسے امام شوکانی نے بدعت ٹھہرایا۔[2]

سنت در دینِ نبی نشناختند   دینِ حق را چار مذہب ساختند

ساتویں صدی کے خاتمہ اور آٹھویں صدی کے اوائل کا پُر آشوب زمانہ تاریخِ اسلام کا ایک نہایت ہی نازک اور انقلاب انگیز زمانہ تھا، مشرق میں عربی خلافت کا جنازہ اٹھ چکا تھا تاتاریوں، منگولوں کی بربریت اور بہیمیت پچاس لاکھ مسلمانوں کا خون بہا چکی تھی۔ چھ صدیوں کا

---

[1] ممتاز محمد علی: تاریخ افکار و علوم اسلامی، حصہ دوم ۱۹۷۹ء، ص ۲۴-۴۴، ۹۴

[2] نیز دیکھو [illegible] (ملتان ۱۹۷۹ء)، ص ۵۷-۵۸

اسلامی تمدن نعشوں کے پُشتوں اور سروں کے میناروں کے تلے دب گیا تھا، ابن الاثیر اپنی کامل التواریخ میں انسانیت کے اس عظیم ترین سانحہ کو قہر خداوندی سے تعبیر کرتا ہے۔ اس عام بربادی نے مسلمانوں کی تمام اخلاقی قوتیں بھی فنا کر دیں، تاتاریوں کی ہیبت نے زندوں کو مردہ بنا دیا تھا، دہشت اور بزدلی کا یہ عالم تھا کہ نیشاپور کے قتل عام میں جب ایک مسلمان مسجد کے زیر سایہ محفوظ کھڑا دکھائی دیا تو ایک منگول سپاہی نے پوچھا "تو کیسے بچ گیا؟ یہیں کھڑے رہنا میں تلوار لے کر ابھی آتا!" اور اس کے آنے تک وہ دہشت زدہ بہادر وہیں کھڑا اپنی شہادت کا انتظار کرتا رہا۔ یہ واقعہ ان ہزاروں مسلمانوں کے احساس پسپائی کی ذہنی ماندگی کا سبب ہے جنہوں نے مایوس ہو کر حالات کے آگے سر جھکا دیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ پرانے دن لوٹ کر نہیں آئیں گے، پرانا نظام مر چکا ہے اور اس کے احیاء کی کوئی صورت نہیں، بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس ذہنی انتشار سے بچنے کے لیے تصوف کی عافیت میں، ڈھونڈ رہے تھے اور وہ "باقیات صالحات" جو زندگی کے منفی رجحانات کا شکار ہو گئے انھیں صرف اپنے ذہنوں میں پناہ مل سکی۔ ان کے دل، ماوراء النہر (ترکستان) اور خراسان کے شہروں اور قصبوں کی طرح اجڑ چکے تھے اور یہ لوگ صرف اپنے ماضی میں زندہ تھے[1] مسلمانوں کو اب موت سے خوف آنے لگا تھا اور جہاد کا تصور مٹ چکا تھا۔

برسوں تک جمعہ کے خطبے کسی سلطانِ اسلام کے ذکر سے خالی رہے، جب کوئی مرکز نہیں رہا تو شریعت کا بھی کوئی محافظ نہ رہا اور نہ امتِ مسلمہ کا کوئی قائد اور رہبر، یہی زمانہ تھا کہ مقلدین فروعی مسئلوں پر اُلجھنے لگے تھے، تاتاریوں کے "بگیر و بکش" کی چیخوں کی آوازوں میں قال اللہ و قال الرسول کی مرویات دب گئی تھیں، سفر لہو الحدیث اور شہوات نے دین کی حقانیت کی آواز دبا دی تھی، ہمت بھی نہ تھی کہ عمارتِ شریعت جو جل گئی تھی اس کی اس اینٹ کو جو پچھلی اینٹوں کے لئے بنیاد ہوتی ہے درست کر سکیں، وہ سارے علمی اور عملی مفاسد جو اس عالمِ آشوبی میں پیدا ہوئے اس کی شہادت نیشاپور کی مذہبی تاریخ دیتی ہے جہاں حنفیوں اور شافعیوں کی باہمی پیکار نے نیشاپور کے عالی نسب خاندانوں کو برسوں تلک سایۂ تلوار کے نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا علمائے عصر ایک

---

[1] مومن محی الدین، علاء الدین عطا ملک جوینی، مجلہ "علوم اسلامیہ" علی گڑھ، جون ۱۹۶۱ء

دوسرے کے خلاف قلم چلاتے رہے اور ان کے معتقدین اور متبعین ایک دوسرے پر تلواریں چلاتے رہے۔ تقلیدِ شخصی اور مذہبی فرقہ بندی کے التزام اور تعصب نے اسی زمانے میں پورا پورا زور پکڑا، ہلاکو کا پرپوتا غازان خان اگرچہ مسلمان ہو گیا تھا لیکن مذہب و علم کی قدر شناسی سے کوسوں دور تھا، مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہائے مذاہب کے ہاتھ آ گئی۔ تعلیمی ادارے قائم ہوئے اور ہر مذہب کے لیے الگ الگ قاضی، مدارس، "اوقاف"، ائمہ جمعہ اور مذہبی عہدے قرار پائے، لیکن یہی چیز بقول مولانا آزاد "صدہا مفاسد و مصائب کا باعث ہوئی"

"ایک طرف علمائے دنیا و فقہائے دولت کا ایک گروہ عظیم پیدا ہو گیا۔ دوسری طرف تعصب و تفرقہ کی آگ روز بروز بھڑکنے لگی۔ حتی کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بنا پر اب خواص و فقہاء ایک دوسرے کی تذلیل کرنے لگے۔" [1]

— اور سلاطین دہلی کے عہد میں احناف و شوافع کی صفیں اسی طرح ایک دوسرے کے مقابل ڈٹی رہیں اور یہ سلسلہ اسی قسم کی رنیا سے گذرتا گذرتا اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک پہنچا۔ چونکہ ہندوستان کے عوام فقہ حنفی سے متاثر تھے لہٰذا فقہ حنفی کی طرز پر فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا حکم دیا۔ قطب الدین ایبک سے لے کر اس کے عہد تک دینی طور پر جو کچھ ہوا ہے وہ فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے اس کے مرتبین میں وقت کے منتخب علماء کے نام ملتے ہیں جن میں شیخ نظام الدین برہانپوری، سید محمد قنوجی (م ۱۰۹۷ھ)، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی کے علاوہ چند اور سربرآوردہ علماء و فضلاء شامل تھے۔

دینِ حق را چار مذہب ساختند

ایک عام اندازے کے مطابق ہندوستان کی مسلم آبادی میں تقسیم ہند سے پہلے سب سے بڑی تعداد حنفیوں کی رہی ہے اور یہ طبقہ اعداد و شمار کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر تھا، اہل سنت میں احناف کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور شمالی ہند کی انصاری برادری اسی میں

[1] مولانا ابوالکلام آزاد، تذکرہ ص ۲۵۶۔۲۵۸

صدی کے اوائل تک یکسر حنفی مذہب کی پابند تھی اور یہ ہندوستان کے ہر گوشے میں آباد تھی۔ وہابی تحریک کے زیر اثر ایک خاصی تعداد انصاریوں کی عامل بالسنہ اور عامل بالحدیث ہونے کے سبب اہلحدیث کہلانے لگی، حنفیوں اور اہلحدیث کے درمیان فقہی مسائل پر خصوصاً نماز کے معاملہ میں جزوی طور پر چند اختلافات رونما ہو گئے اور یہی تصادم اور تخالف کا باعث بنتے رہے۔ قرأت فاتحہ خلف الامام (امام کے پیچھے مقتدی کا اس کے ساتھ ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھنا) رفع یدین (ہاتھوں کا اٹھانا) آمین بالجہر (زور سے آمین کہنا) جلسۂ استراحت (پہلی اور تیسری رکعت میں آرام سے بیٹھ کر اٹھنا) اختلافی مسائل تھے۔ ان کے علاوہ سینے پر ہاتھ باندھنا، ہاتھ اٹھا کر دعائے قنوت پڑھنا اور تراویح کی تعداد رکعت کے بارے میں احناف و اہلحدیث میں تقریراً اور تحریراً مباحث ہوتے رہے۔ مخالفین کو حضرت سید احمد شہید اور ان کے متبعین پر دوسرے اور اعتراضات تھے مثلاً زیارۃ القبور، ما اہل بہ لغیر اللہ (غیر از اللہ کسی دوسرے کے نام پر جانور ذبح کرنا) شفاعت النبیؐ اور ترکِ تقلید۔

انگریزوں کے خلاف جہاد اور بدعات اور غیر اسلامی رسوم و عقائد کے خلاف جنگ وہابیت کی دو اہم تحریک تھی۔ شاہ ولی اللہ کے خاندان میں دو نئے مجتہد الوقت پیدا ہوئے مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحیٔ دہلوی، مولانا شاہ اسماعیل شاہ ولی اللہ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے بیٹے تھے، اور شاہ عبدالحیٔ شاہ عبدالعزیز کے داماد۔ یہ دونوں امام الزماں مولانا سید احمد شہید رائے بریلوی کے مرید و داعی تھے، ان کی مشترکہ تبلیغ دین کے مساعی جمیلہ سے مسلمانوں میں مراسم شرک، غیر شرعی رسوم و رواج و بدعات کا تقریباً خاتمہ ہوا، ان کے شاگرد، خلیفہ، داعی سارے ملک میں پھیل رہے تھے جس سے پورب کا خطہ خاص طور سے متاثر تھا، خاص جونپور اور اس کے اطراف میں دعوتِ عزیمت کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، مولوی سید کرامت علی (م ۱۲۹۰ھ) جونپوری نے اپنے لئے بنگال کا علاقہ پسند کیا اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بنگال میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح کا نیک کام ان سے بڑھ کر کسی نے انجام نہیں دیا، اردو میں فقہ پر مفتاح الجنۃ مولوی صاحب کی مشہور تصنیف ہے۔ مولوی کرامت علی نے اصل وہابی تحریک سے جس کی بنیاد جہاد پر تھی الگ ہو کر ایک علاحدہ تحریک کی بنیاد ڈالی۔

بنگال میں مذہبی، سماجی اور معاشی اصلاحات کی غرض سے کئی مقامی تحریکیں ابھریں،

ان میں طریقۂ محمدی اولین بنیادی تحریک تھی جس کا نصب العین جہاد تھا' فرائضی تحریک کی روش میں ولی اللّٰہی عنصر غالب رہا مگر جہاں تک جہاد کا تعلق رہا یہ طریقۂ محمدی یا وہابی تحریک کے ہموار رہی لیکن مذہبی اور سماجی مسائل پر اس تحریک کا اپنا ایک علاحدہ لائحہ عمل تھا' جہاد کے میدان میں کھل کر سامنے نہیں آئی لیکن انگریز دشمنی میں فرائضی تحریک وہابیوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھی' دیہی عوام اور علماے جو حنفی مسلک کے تھے اس تحریک سے سب سے زیادہ وابستہ تھے۔ فرائضیوں نے بنگال کو دارالحرب قرار دے کر جمعہ اور عیدین کی نمازوں کو ترک کر دیا۔ حاجی شریعت اللّٰہ فرائضی تحریک کے بانی تھے اور جولاہوں کے پیر کہلاتے تھے' فرقۂ لاجمعہ اسی تحریک کا دوسرا نام تھا۔

بنگال میں رفع یدینی جماعت دراصل اہلحدیث کی جماعت تھی اور وہابی تحریک کے امتیازی مسائل جو عبادات سے متعلق تھے ان سے سروکار رکھتی تھی' ہادیٔ بنگال مولانا کرامت علی تعیّنی جماعت کے بانی تھے جو دراصل وہابی تحریک کی ایک شاخ تھی۔

فرائضیوں اور ان تینوں جماعتوں کے مابین مابہ النزاع مسئلۂ تقلید کا تھا' اور یہ اہل سنت یا حنفیوں کے نشانۂ تنقید و تعزیر بنے رہے' ان اختلافات کی جڑیں کاٹنے کے لیے مباحث و مناظرات کے ہتھیار استعمال ہونے لگے' رفع یدینیوں اور حنفیوں کے درمیان بڑے معرکے کے مناظرے ہوتے رہے' مقامی اصطلاح میں اسے 'بحث' کہتے تھے' بعض دفعہ نقض امن کا خطرہ لاحق ہو جاتا تھا اور حکومت ایسے موقع پر اس قسم کے اجتماع کو منسوخ کرنے کا اعلان کرا دیا کرتی تھی۔[1] بعض مباحثے جو سید کرامت علی کی تعیینی جماعت اور فرائضیوں کے 'فرقۂ لاجمعہ' کے مابین ہوئے اتنے تشدد اور شورش انگیز تھے کہ انہیں "جنگ جمعہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' ان تمام مباحث یا مناظروں کے ردِ عمل میں فریقین اپنے بنیادی مسائل کے حل کرنے میں ناکام ہونے لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ فرائضی تحریک نے زرعی' سماجی اور مذہبی اصلاحات کے اپنے لائحہ عمل کو مستقل اور مستحکم رکھا' ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ لوگ اپنی اپنی جماعتوں سے برگشتہ خاطر ہو کر سب سے زیادہ مؤثر اور مستحکم تحریک یا جماعت میں شامل ہو گئے۔ تعیینوں کی ایک بڑی تعداد احناف کے ساتھ ہو گئی بلکہ اہلحدیث اور رفع یدینیوں کی جدوجہد سے 'فرقۂ لاجمعہ' کے قرار دینے پر

---

[1] معین الدین احمد، بنگال کے مسلمان (انگریزی) ص ۶۵-۷۶، ۷۷- ۱۴۴-۴۵

ے جمعہ اور عیدین کی نمازوں کی تجدید کی، 'تقلیدِ شخصی' کی مذمت اور عمل بالحدیث کی تائید میں سب
سے عظیم مناظرہ مرشد آباد (بنگال) میں جمادی الاول ۱۳۰۵ھ کو منعقد ہوا تھا اس میں علمائے
احناف اور علمائے اہل حدیث کے مابین ایک ہفتہ تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر میں اہلحدیث کو
فتح ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس جماعت میں شامل ہو گئے۔[1]

ہر بحث کا نتیجہ مثبت یا منفی پہلو کا حامل نہ تھا، بعض صورتوں میں تو بحث مذاق بن جاتی اور
کج بحثی کا اکھاڑہ۔ ایک چالاک مولوی نے اپنے مخالف مولوی کو اپنے مکر و فن کا شکار بنانے کے
لیے، ایک جملہ عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا "میں نہیں جانتا" اس غریب نے ترجمہ صحیح طور پر کر کے
کہا "لا ادری" (میں نہیں جانتا) بس پھر کیا تھا فریق مولوی نے اعلان کر دیا "یہ بیچارہ کچھ
نہیں جانتا" اور سامعین نے اس کی شکست تسلیم کر لی۔[2]

ان مذہبی اختلافات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہر مسلک نے اپنے الگ الگ مکتب و مدرسے قائم کر لیے،
ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنالی اور علمائے کرام نے ایک دوسرے کے خلاف مسلک کی تردید میں
"پوتھیاں" اور نصیحت نامے لکھ لکھ کر طومار باندھ دیا۔

بحث اور مناظرے سے زیادہ موثر اور مفید عوام کی ذہنی تربیت کے لیے وعظ کی محفلیں ثابت
ہوئیں، منشی مہر اللہ (۱۸۶۱ - ۱۹۰۷) نے مذہبی اصلاحات، اشاعتِ دین اور مذہب اسلام
کی ترویج و تحفظ کے لیے سب سے زیادہ نمایاں کردار ادا کیا۔ منشی مہر اللہ پست سماجی طبقہ
سے تعلق رکھتے تھے اسی لیے عوام الناس میں اور خصوصاً نچلے طبقے کے مسلمانوں میں بیحد مقبول تھے
منشی مہر اللہ کے مواعظ میں مسلم معاشرہ کے عروج و زوال کے اسباب، نماز کی اہمیت، زکوٰۃ،
اوامر و نواہی، معاملات، تعلیم، مکاتب و مدارس کا قیام، تعلیمِ نسواں اور اجتماعی بیت کی اہمیت
وغیرہ کے بارے میں سیر حاصل بیان ہوتا تھا، ان وعظوں کا اثر یہ ہوا کہ لوگ دین کے قریب آنے
لگے، جمعہ کی نمازوں میں کثیر تعداد میں لوگ شامل ہونے لگے، لوگ ٹوپیاں پہننے لگے، ہر گاؤں میں

---

[1] دیکھیے جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات، تالیف محمد مستقیم سلفی، ناشر ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ و الافتاء بالجامعۃ السلفیہ، بنارس، مجلد ۱۹۹۲، نمبر ۳۰، ص ۲۴۸: کیفیت مناظرہ مرشد آباد، مولانا محمد سعید محدث بنارسی، بنارس ۱۳۰۵ھ

[2] بنگال کے مسلمان، ص ۸

[3] ایضاً ص ۹۵

وعظ کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اور انجمنیں تشکیل پانے لگیں[1] مدارس و مکاتب بڑی تعداد میں قائم ہو گئے۔

دیارِ پورب کی دینی فضا

سید احمد شہید کے خلفاء کی ساعی جمیلہ سے وہابی تحریک کو اس خطہ میں بید فروغ ملا، حافظ ابو اسحاق لہراوی بھیروی (م ۱۲۲۲ھ) وہابی مسلک کے اولین علمبردار تھے، آپ مولانا محمد فاخر محدث الہ آبادی (م ۱۱۶۴ھ) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور استاد کا مجتہدانہ رنگ آپ پر بھی غالب تھا، شاہ ابو اسحاق علم و عمل کی جامعیت میں نابغۂ روزگار تھے، مولانا عبداللہ جھاوڑ میاں الہ آبادی کا وہابی مسلک کے فروغ و اشاعت کے ضمن میں ذکر گذر چکا ہے، آپ نو مسلم راجپوت خاندان سے تھے، زمیندارانہ تعیش کوش زندگی جب نہ بھائی تو جالی بندھنوں کو چھوڑ کر الموم کر جراحیوں میں رہنے لگے جو مجاہدین بالاکوٹ کا مرکز تھا، مولانا عبداللہ جھاوڑ کثیر التصانیف ہیں تقلید شخصی، عمل بالحدیث اور اجتہاد کے موضوع پر آپ کی کئی کتابیں ہیں، شاہ رفیع الدین کی مشہور فارسی تصنیف "تنبیہ الغافلین" کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا ہے[2] مولانا عبداللہ جھاوڑ اپنے مخالفین کے بارے میں شدید تعصب رکھتے تھے اور ان کا شدید رد کرتے تھے، ظاہری نصوص پر عمل کرتے تھے اور حنفیہ و شافعیہ اور دیگر مذاہب کی تکفیر کرتے تھے۔

مئو کی انصاری برادری میں اہلحدیث کے بڑے نامور بزرگ، اساتذہ، شیوخ اور علماء گذرے ہیں جنہوں نے اس مسلک کو بڑی معرکۃ الآراء تصانیف اور مواعظ حسنہ سے بید فروغ دیا، حنفیت اور علمائے اہلحدیث کے مابین اثبات رفع یدین، قرأۃ خلف الامام، آمین بالجہر، جلسۂ استراحت، تورک، تعداد رکعت تراویح اور تقلید شخصی کے بارے میں تقریراً اور تحریراً مناظرے و مباحثے ہوتے رہے، ہندوستان کے جلیل القدر عالم حضرت مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری حنفی فقہاء کے بارے میں نہایت شدید رویہ رکھتے تھے اور بڑی شدومد سے ان کا رد کرتے، مگر یہ رد صرف تصانیف تک محدود تھا جو سراسر علمی و تحقیقی تھا[3] مئو کے اہلحدیث

---

[1] بنگال کے مسلمان ص ۱۱۰-۱۱۲

[2] کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات ص ۲

[3] تذکرہ علماء اعظم گڈھ ص ۱۲۳-۱۲۷

علماء نے تمام ممتاز مسائل پر جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے نہایت صراحت و وضاحت سے متعدد رسائل قلمبند کر کے مخالفین کو مسکت جواب دیا ہے۔ عام مناظرے جیسے بنگال میں ہوتے تھے اس خطے میں شاذ و نادر ہی ہوئے صرف ایک مرتبہ موضع بڑھنی (ضلع بستی) میں احناف اور اہلحدیث کے مابین مناظرہ ہوا تھا۔ ایک طرف عیان علمائے اہلحدیث موجود تھے اور احناف کی طرف سے حضرت مولانا حبیب الرحمن اعظمی اور مولانا عبداللطیف نعمانی (۱۸۹۸–۱۹۷۲ء)۔

مولانا فیض اللہ مئوی (م ۱۳۱۶ھ) کے صاحبزادے مولوی محمد علی ابوالمکارم (۱۲۷۵–۱۳۵۲ھ) نے اپنی کتاب "الجواب اسدید عما اورده فی اوشحة الجید" (اردو) میں تقلید ائمہ کے رد میں لکھی تھی۔ شرک و بدعت کے خلاف ان کی ایک اہم تصنیف بعنوان "الاجوبۃ الفاخرہ الفاضلۃ فی رد الرسائل العشرۃ الکاملۃ" شیخ فضل رحمان گنج مرادآبادی مشہور پیر طریقت کے ایک مرید کے دس رسائل کے جواب میں ہے۔

مولانا ابوالمکارم ایک زبردست عالم اور حاذق طبیب تھے بہت سے رسالوں کے مصنف تھے اور اپنے قلم کے زور سے بہت سارے محاذوں پر لڑتے رہے۔ انہوں نے عند الملاقات دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت ثابت کرنے کے لئے ایک مختصر رسالہ بھی لکھا تھا۔ شریعت کے خلاف وہ کسی عمل کو برداشت نہ کر سکتے تھے چنانچہ جب مئو میں ایک پارٹی "اہل خلافت" کے نام سے قائم ہوئی، اور ان کے کچھ افعال شریعت کے خلاف تھے (جیسے ولایتی کپڑے کا حرام کہنا) تو انہوں نے لوگوں کے استفسار پر ایک فتویٰ صادر کیا۔[1]

بریلوی مولوی حضرات جو اپنے آپ کو اہل سنت کہتے تھے، اور اتباع رسول کے بڑے دعویدار تھے وہ بھلا کس کو چھوڑتے دیوبندیوں کے تو دشمن تھے ہی جو پہلے ہی کریلا نیم چڑھا تھے، ان کی دریدہ دہنی کیسے بچے رہتے متشدد حنفی مولویوں نے وہابیوں پر تکفیر کا فتویٰ لگا دیا اور ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، غیر مقلدین کو تو بعض مساجد میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہ تھی "جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد" کئی فتووں کا عنوان بن گیا، مولانا رشید احمد گنگوہی جو شاہ ولی اللہی مکتب خیال کے پروردہ تھے وہ بھی اس ذہنی کجروی میں انتہا تک پہنچ گئے اور اپنے رسالے "سبیل الرشاد" میں تقلید شخصی کو ثابت کرتے ہوئے اہلحدیث کو بیدین

---

[1] جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات۔ دیکھئے محمد علی ابوالمکارم (اسمائے مصنفین) ص۲۴۹

سے نکالنے کا حکم دے دیا، غیر مقلدین کو سبّ و شتم کا نشانہ بنایا، ان کو بے ننگ و نام ٹھہرایا گیا، ان کے خلاف استفسار کا سلسلہ بندھ چکا تھا اور فتووں کا گنبد گونجنے لگا تھا۔

السوال (۱) "کیا فرماتے ہیں علمائے اہل سنت وجماعت اس امر میں کہ یہ گروہ غیر مقلدین اہل سنت وجماعت میں داخل ہے یا مثل اور فرقوں کے اہل سنت سے خارج ہے؟"

(۲) "انکے ساتھ مخالطت اور مجالست اور انکو اپنی مسجدوں میں آنے دینا درست ہے یا نہیں؟"

(۳) "اور انکے پیچھے نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟" بَیِّنُوْا تُوْجَرُوْا

الجواب: "جواب سوال اول کا یہ ہے کہ فرقۂ غیر مقلدین جنکی علامات ظاہری اس ملک میں آمین بالجہر یعنی آمین پکار کے کہنا اور رفع الیدین اور نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا اور امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ہے اہل سنت سے خارج ہیں اور مثل دیگر فرق فاسدہ رافضی، خارجی وغیرہما کے ہیں کیونکہ اونکے بہت سے عقائد اور مسائل اہل سنت کے مخالف ہیں۔"[1]

دیوبندیوں کے خلاف سارے ہندوستان میں بے شمار رسالے لکھے گئے[2] بالخصوص مولوی شاہ اسمعیل شہید دہلوی کی تقویت الایمان تو گویا ایک شعلہ آشام کتاب تھی جس نے اہل ایمان کے قلب کو گرما دیا تھا اور روح کو تڑپا دیا تھا مگر متبدعین کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا، فریقین کے مابہ النزاع مسائل تو حل نہیں ہوئے لیکن نزاع کی نوعیت عدالت دیوانی اور فوجداری مقدمات میں بدل گئی، حکومت دہلی نے ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۹۹ھ کو دونوں کے بیچ صلح کرا دی، اس طرح کے مقدمات کا ایک طویل سلسلہ جو منجانب حنفیان بخلاف اہل حدیث دائر ہوئے ہر جگہ پھیلا ہوا تھا (۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۴ء)

اعظم گڈھ کے خطے میں دیوبندی مکتب خیال کو فروغ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل طلبہ

---

[1] جامع الشواہد فی اخراج الوہابین عن المساجد کلکتہ مدرسہ محمدیہ (اردو) صفحہ ۲۰

[2] کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی میں یہ چند رسائل موجود ہیں (۱) ارشاد المتشابہتین (۲) برق محمدیہ بر رجم شیاطین نجدیہ (۳) سیف مقلدین علی اعناق وہابیین (۴) احسن الادلۃ النقلیۃ لدفع اہل البدعیۃ (۵) رد وہابیت: تحفۃ العراق والعجم (۶) رجم الشیاطین شہاب علی ابن عبد الوہاب (۷) تحفۃ محمدیہ فی رد فرقۂ مرتدیہ (۸) جمال المنۃ فی رد مقلد وہابیت (۹) انتظار الحق

کے ذریعے ہوا، دیوبندیت نہ کوئی مسلک تھا اور نہ مذہبی تحریک تھی بلکہ حنفیت کے ایک طبقے کی اصلاحی تحریک تھی جس کا زیادہ تر تعلق انسدادِ بدعات اور رسم ورواج کی اصلاح سے تھا، فقہی مسائل میں بھی اختلاف کی گنجائش نہ تھی البتہ زیادہ تر اختلاف کتابوں کی عبارتوں میں تھا[1] مگر دیوبندی اور غیر دیوبندی کے امتیاز اور تفریق نے درس وتدریس کی دیواروں میں رخنے ڈال دیئے تھے، مبارک پور کے احناف نے ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ مصباح العلوم کی بنیاد ڈالی جس کے مدرس اول مولانا محمد محمود معروفی (م ۱۳۲۷ھ) اور مدرس دوم مولانا محمد صدیق گھوسوی تھے، جب دیوبندی اور غیر دیوبندی کا اختلاف رونما ہوا تو مولانا صدیق مدرسہ کو پرانی بستی میں لے گئے اور اس کا نام مصباح العلوم ہی رکھا، یہ بریلوی نقطۂ نظر کا حامل تھا، اور قدیم مدرسہ جو پورہ صوفی میں قائم ہوا تھا احیاء العلوم کے نام سے جاری رہا۔ یہ دیوبندی مکتبِ خیال کا ترجمان تھا۔ دیوبندی مکتب خیال شاہ ولی اللہ کے فکری سرچشمہ سے سیراب تھا۔

اس علاقے میں مولانا امجد علی گھوسوی (۱۸۸۵ - ۱۹۴۸ء) اور ان کے تلامذہ کی "تبلیغی جدوجہد" سے بریلوی مسلک کو بڑی تقویت ملی ان کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے جن میں مولانا رفاقت حسین کانپوری، مولانا محمد سلیمان بھاگلپوری، مولانا محمد مصطفےٰ گھوسوی اور مولانا شمس الدین جونپوری کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل تھی، آخر الذکر نے اپنے شیخ و مرشد مولانا امجد علی کی بہار شریعت کی تلخیص کر کے اس کا نام قانونِ شریعت رکھا ہے، یہ کتاب بھی جماعت بریلوی میں بڑی مقبول ہوئی۔

دیوبندی مکتب فکر کے اعیان واکابر میں مبارک پور کے مولانا قاری مفتی شکر اللہ (م ۱۳۶۱ھ) کی شخصیت سب سے نمایاں اور اہم تھی، سواد قصبہ اور اطراف ضلع میں آپ کے علمی، دینی، اصلاحی اور تبلیغی کارنامے "یادگار زمانہ" بن گئے ہیں، آپ پر دار العلوم دیوبند کا اصلاحی، دینی اور سیاسی رنگ اس طرح چڑھ گیا تھا کہ اسی مکتب فکر وخیال کے سرگرم رکن وترجمان بن کر زندگی بھر عوام کی خدمت کرتے رہے، بدعات وخرافات کے خلاف آپ نے ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا، سودیشی مال کا بائیکاٹ، ترک موالات اور دیگر ملکی سیاسی تحریکوں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہے، موت وحیات، شادی بیاہ، ذات برادری کی غلط رسموں

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری۔ تذکرۂ علمائے مبارکپور۔ ص ۳۰

میں اصلاح اور سدھار پیدا کرنا ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے[1]، مولانا نے اپنے مدرسے احیاء العلوم کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تعلیمی و اصلاحی خدمات انجام دیں۔ آپ بڑے اثر انگیز مناظر بھی تھے بریلوی جماعت اور شیعہ فرقے سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے نہایت کامیاب واعظ تھے ایک موضوع پر بلا تکلف تین تین چار چار گھنٹے تقریر کرتے تھے۔

"۱۳۳۶ھ سے لے کر ۱۳۶۱ھ تک یعنی ربع صدی کی مدت تک مبارک پور اور اطراف میں وہ علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی کارنامے انجام دئے جو صدیوں کے کام پر بھاری ہیں"[2]

مبارک پور اب مناظروں اور محاکموں سے یکسر مامون و محفوظ نہیں رہا، کوئی نہ کوئی نزاعی مسئلہ ضرور کھڑا ہوجاتا جو بعض صورتوں میں نقضِ امن کا باعث بن جاتا، مابہ النزاع مسائل مثلاً" دیہاتوں میں جمعہ کی فرضیت، نماز جمعہ کے قیام کے لئے جگہ یا مکان کی قیود، جمعہ کی اذان کی تعداد اور مؤذن یا اذان دینے کی جگہ کا تعین اور دیہات میں جمعہ کا جواز وغیرہم بعض اوقات "جنگِ جمعہ" میں بدل جاتے"۔ ایسا ہی ایک مسئلہ جب مولانا محمد عثمان فتحپوری دیوبندی — (۱۹۰۰-۱۹۳۶ء) کے ایک طالب علم مولوی ظہیر الدین نے جو اس وقت مدرسہ اشرف العلوم کانپور میں ان سے پڑھ رہے تھے اپنے گاؤں میں جمعہ کی فرضیت کا جواز پوچھا تو مولانا نے سمجھایا کہ "ایک زمانے سے وہاں جمعہ ہوتا آیا ہے اور جہالت کا بھی شیوع ہے اس لئے اس مسئلہ میں تشدد مناسب نہیں" لوگوں میں دینی شعور پیدا ہو جائیگا تو اس وقت مناسب طریقے سے دیہاتیوں کو جواز یا عدم جواز کے بارے میں سمجھا دیا جائیگا۔

مولانا ظہیر نے مصلحت مسئلہ سے کام نہ لیتے ہوئے اپنے گاؤں میں جمعہ کے عدم جواز کا اعلان کر دیا، گاؤں کے لوگوں نے مولانا عثمان سے اس سلسلے میں استفسار کیا انہوں نے مسئلہ کی نزاکت کو واضح کر دیا اور اس وقت سے خود بھی وہاں جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا، جس پر ان کو [illegible] شریعت ہوگئی [illegible] مسئلہ نے آگے چل کر ایک نیا موڑ لے لیا، دیوبندیت اور بریلویت کے اختلاف کو کھڑا کر دیا، گاؤں کا ایک طبقہ دیوبندی مولویوں کی مخالفت پر تل گیا اور ایسا جنون سوار ہوا

---

[1] تذکرہ ... عامر، ص ۱۴۳۔ تذکرہ علماء مبارک پور ص ۳۴۔ ص ۲۵۔ ۲۱۵

[2] تذکرہ علماء مبارک پور ص ۲۱۴

کہ تنگ کے "شور ہو رہے تھے آپس میں" اور قتل ہوا فرد مولوی تو نہیں کوئی اور مارا گیا۔
دیوبندیہ اور بریلویت کے کئی محاذ کھل چکے تھے، اور جب کھل کر ایک دوسرے سے لڑنے
لگے تو اکبر الہ آبادی کو کہنا پڑا سه

کھل کھیلے دیوبند و بریلی کے مولوی
پاگل یہاں ہیں بند وہاں دیو بند ہیں

۱۳۲۶ھ میں مبارک پور میں دیوبندی جماعت کا علاحدہ جمعہ کا قیام شروع ہوا۔ بریلوی
جماعت کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تو الگ تھی ہی اہلحدیث کو تو ملحد اور کافر ثابت کر کے مسجدوں
سے نکالنے کو کہا گیا تھا لہٰذا انہوں نے بھی اپنی الگ مسجدوں کی راغ بیل ڈالی۔ اس طرح
مسجدوں کی صفیں ٹوٹنے لگیں تو مدرسے بھی بٹ گئے، اور مکتبوں کے ملاؤں کا حال جو کہ

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملاّ
کار طفلاں تمام خواہد شد

مغربی ہند میں جنگ ہفتاد و دو ملت

اتر پردیش کے مہاجرین نے وسطی ہند میں جہاں جہاں آباد ہوئے وہاں کے مقامی
باشندوں میں احناف کی اکثریت تھی، یہ خود بھی ماسوا ایک قلیل "چھٹکی" تعداد کے جو اہلحدیث
مسلک پر تھی۔ حنفی ہی تھے۔ لہٰذا ان کے درمیان کوئی اختلافی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ ایسے مسائل
کے کہ شرک و بدعت کے بارے میں سوا مسئلہ جواز یا عدم جواز کی سطح پر ہوتے تھے، پھر مسلکی
تصادم ناگزیر تھا۔

تقریباً یہی حال خاندیس کا تھا جہاں دکھنی مسلمانوں میں بیرونی مولویوں کی بڑی
دھاک تھی، شرکیہ امور، بدعات اور شیعی رسوم کا غلبہ تھا۔ سلاطین دکن کے زمانے سے
یہاں محرم، تعزیہ داری، سواریاں اور شدے نکلنے کا دستور تھا، عرس و نیاز و نذر کا رواج
تھا،[۲] اسلام کی اصل اور بنیادی تعلیمات سے یہاں کی برادری مقامی دکھنی مسلمانوں کے
زیر اثر بے بہرہ تھی۔[۲]

مالیگاؤں بڑا جدت طراز اور ایجاد پسند نوجوان شہر رہا ہے، یہاں تو جو بھی چاہے وہ

---

[۱] تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۲۲۶-۲۲۷، ۲۸۰۔

[۲] مومن محی الدین۔ تاریخ کوکن ص ۱۰۱-۱۰۸۔

اس کا حسنِ کرشمہ ساز کرے، ۱۳۳۲ھ / ۱۹۰۳ء میں مسجد یا فرش پر نماز جنازہ پڑھانے
کی بابت سخت فساد برپا ہوا تھا، اس بارے میں مناظرے اور مواعظ ہوئے شرطیں بدی
گئیں کہ اگر کوئی یہ ثابت کردے کہ کئی اصحاب یا ایک ہی صاحب کے جنازے کی نماز مسجد
کے اندر خواہ کہیں بھی پڑھی گئی ہو تو فی جنازہ پانچ روپیہ انعام دیا جائیگا گویا یہ معاملہ تھا کہ بجائے
ہاں کے قتل کے بعد جفا سے توبہ کی جاتی یہاں تو "خود ہی قتل کرے خود ہی لے ثواب الٹا"
کا معاملہ درمیان میں تھا" میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا"[1]

۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵-۲۶ء میں تو غضب ہی ہوگیا "قرآنی تحریف کی جنگ میں" اھدنا
یا نھدنا" کے فریقین کے مابین کئی مسجدوں میں ہاتھاپائی کی نوبت آگئی، دونوں جماعتوں نے
ایک دوسرے کے اماموں کو معزول کردیا، پھر بھی جماعت محمدی کہیں کہیں "نھدنا
الصراط" اور "ان اللّٰہ الصمد" وغیرہ نماز میں پڑھ کر صراطِ مستقیم سے ہٹتی ہی رہی،
بابت فتویٰ یا تو نے قرآن (معاذ اللہ) پڑھنے والوں کی قرات درست آئی "آئینہ قرات
کے نام سے یہ فتویٰ ۱۳۴۶ مطابق ۱۹۲۷ء میں چھپ کر شائع ہوا۔ یکم محرم ۱۳۴۱ھ کے جمعہ
میں خطبہ کے بعد جامع مسجد میں صدہا مصلیوں کے سامنے ایک مسیلمہ کذاب نے اپنے پیغمبر
ہونے کا دعویٰ کردیا۔

بمبئی میں بھی (۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء) میں مقلدین اور غیر مقلدین کے مابین مقدمہ
کے سلسلے میں جب کثرت سے جھگڑے ظہور پذیر ہونے لگے تو ان دو جماعتوں کے نام پڑ گئے تھے
عرشی اور فرشی۔ یعنی وہابی جوف اور ح کا تلفظ بھی ٹھیک سے ادا نہیں کرسکتے تھے اور امام
ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہا اللہ پہ زبان طعن دراز کرتے اور کہتے کہ "منجھی سا پیسی" کو
نہیں جانتے۔[2]

دکن کے علاقے میں کچھ اور صورتِ حال تھی، یہاں کے نوائط عموماً شافعی تھے، یہ اپنے
عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اسی لیے جب مہاجرین انصار بھیمڑی اور بمبئی میں آکر
آباد ہوئے تو انہیں "ہندستانی" کہہ کر پکارنے لگے، یہ ہندستانی اپنے ساتھ کوئی نیا مسلک

---

[1] تاریخ شہر لیگاؤں المعروف بہ فروغ مجید۔ صفحہ ۱۱۰
[2] علام نامی بفتاوی مدی بمبئی (مطبع محمدی بمبئی ۱۲۹۶ / ۱۸۸۰ء) صفحہ ۹۰۹

کر نہیں آئے تھے بلکہ یہ عموماً حنفی المسلک تھے، مگر چونکہ ان میں مبارک پور، مئو اور اعظم گڈھ اور جونپور اضلاع کے قریب کے اہلحدیث بھی تھے اسی لیے مقامی شافعی اور حنفی مسلمانوں میں یہ جماعت سب سے زیادہ نمایاں بن گئی اور اس کا ردعمل اور تعامل شبہ اور شکوک بن گیا چونکہ یہ غیر مقلدیت تھے۔ مقامی اصطلاح میں انہیں "لا مذہبی" (لمباجالی) لہابی یا لہابڑے کہتے تھے۔

انیسویں صدی میں جزائر بمبئی اور اطراف کے علاقے مثلاً بھیونڈی اور کلیان میں سب سے ذی اثر اور متمول طبقہ کوکنی مسلمانوں کا تھا، انہیں عموماً "کوکنی قوم" کہا جاتا تھا، بلکہ تشیع جن میں مغل (ایرانی) اور اثنا عشری خوجے شامل تھے۔ ان کی الگ الگ جماعتیں تھیں، اہل سنت میں میمن قوم کی تعداد کثیر تھی۔ یہ کچھ اور گجرات کے نومسلم تھے لیکن ان کی کئی پیڑھیاں سایہ اسلام میں گذر چکی تھیں پھر بھی آبائی ہندوانہ رسوم وعقائد کی باقیات یکسر ناپید نہ تھیں۔ شافعی علماء کا کوکنی قوم پر بڑا اثر تھا اور انہیں خصوصاً رؤسائے شہر کی حمایت اور سرپرستی حاصل تھی۔ بیرونی علماء کی بھی بڑی تعداد بسلسلہ ملازمت آباد تھی یہ لوگ مدرسوں اور مکتبوں میں درس و تدریس کے لیے بلائے جاتے تھے۔ یہ مولوی حضرات عموماً حنفی المسلک تھے، ان دونوں گروہوں پر بریلوی مکتب خیال کا بڑا گہرا اثر تھا۔

احناف و شوافع میں، یہ اختلاف مسائل زیادہ تر فقہی تھے، لیکن بریلوی مولویوں نے عقائد کے سلسلے میں بعض دفعہ ایسے مسائل کھڑے کر دیے تھے جن کی زد میں احناف و شوافع بھی آجاتے تھے اور اہلحدیث تو خاص طور سے ہدف تنقید و ملامت بن جاتے۔ حنفیوں اور شافعیوں کے مابین ۱۲۶۵ مطابق ۱۸۴۹ء میں دریائی جانوروں اور چھپکلیوں کی حرمت و حلت کے بارے میں ایک فقہی مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا، یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

(۱) دفع البہتان فی رد بعض احکام تنبیہ الانسان[۱]

"واضح ہو کہ معلوم ہو چکا کہ کئی روز ہوئے ایک آشنا شافعی المذہب کی زبانی سے معلوم ہوا کہ درسنہ ۱۲۶۲ ہجری ایک رسالہ بنام تنبیہ الانسان فی ما یحرم و یحل من الحیوانات ہندی زبان میں بمبئی کے مطبع محمدی میں کہ ظاہراً لوگوں کو فریب میں ڈالنے کے لیے ایسا اچھا نام جس کو دیا ہے۔۔۔۔ چھپا ہے۔ جس رسالے میں کئی جانور

---

[۱] دفع البہتان۔ (اردو) ص ۵۔ کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی۔

جیسے بلّی اور سہ خچر شافعی مذہب میں حلال لکھے ہیں اور کئی عوام جو ظاہر میں حنفی کہلاتے ہیں سو اس رسالے کو بغل میں مارے گلی کوچے میں لیے پھرتے ہیں اور شافعیوں کو تعصب سے کہتے ہیں کہ دیکھو کیسا تمہارا مذہب ہے کہ جس میں ایسے ایسے جانوروں کا گوشت کھانا حلال لکھا ہے۔"[1]

"مولوی حسین صاحب لکھنوی نے تنبیہ الانسان کے نام سے ایک فارسی رسالہ شائع کیا تھا اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ فقہ شافعی کی رو سے مینڈک، کچھوا، کیکڑا اور اسی قسم کے بعض دوسرے جانور حلال ہیں۔ مولوی محمد یونس حافظ نے اس کی تردید میں دفع البہتان لکھی۔ اس کے بارے میں مجمع الاخبار کے مدیر سید اشرف علی گلشن آبادی نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالحلیم کی زبانی معلوم ہوا کہ مولوی عنایت اللہ کوکنی "ہندستانی جو برسوں سے جزیرہ معمورہ بمبئی میں مقیم تھا اس نے اس کا (فارسی اصل) کا ترجمہ کیا تھا" قطع نظر حنفی، مالکی اور حنبلی مذہبوں کے جو تہمتیں اور افترائیں (کذا) اور ائمہ شافعیہ رحمہم اللہ پر باندھی اور لگائی گئی ہیں، ان میں سے ایک شمہ یہ ہے کہ اس کے نویں صفحے پر لکھا ہے کہ طوطا یعنے شافعیوں کے نزدیک حلال ہے سو غلط اور محض افترا ہے"

"رد دفع البہتان" کے خاتمے میں ان تمام اعتراضات کی تردید کی گئی ہے" معترض کی عبارت میں جھوٹ اور افترا جو بھرا ہے اس کا حال بھی بہ خوبی کھل گیا کہ نفسانیت سے خالی نہیں ہے۔"

(۲) رمضان کی وتر[2]

اس ملک کوکن میں اکثر لوگ ماہ رمضان مبارک میں جب تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ چکتے ہیں تب اگر حنفی مذہب کا امام ہو تو شافعی لوگ وتر کی نماز میں اس

---

[1] تحفۂ محمدیہ ص ۶۱

[2] رمضان کی نماز وتر کا رسالہ۔ کتب خانہ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی اردو قلمی ۲۰۹۵-۸-۲۸۳۔ یہ رسالہ قاضی محمد یوسف مرگے اور رضا میاں محمد علی رو گھے ابن المرحوم مادو رضا محمد حسین رو گھے کے ارشاد سے مطبع محمدی ۱۵ شعبان المعظم ۱۲۶۳ ہجریہ میں چھاپا گیا۔ اس رسالے اور فتوے کے جواب میں قاضی شہاب الدین مہرکی نے رسالہ احکام رجب (۲۷، ۱۵ م) قلمبند کیا۔ مطبع بمبئی ۱۲۶۳

> سے اقتدا نہیں لیتے بلکہ اس کے پیچھے صف باندھ کر علیحدہ جماعت کرکے نماز ادا کر لیتے ہیں اور اسی طرح شافعی مذہب کا امام ہو تو حنفی لوگ اس سے اقتدا نہیں لیتے بلکہ اس کے پیچھے صف باندھ کے جُدی [جُدا] جماعت کر کے وتر کی نماز پڑھ لیتے ہیں اور غالباً دونوں امام ایک ہی جگہ میں بلند آواز سے قرأت پڑھتے ہیں جس میں کتنی قباحتیں در پیش آتی ہیں۔“

بہت ساری قباحتوں میں ایک قباحت یہ بھی تھی کہ شافعی وتر کی تین رکعتیں ہیں اور افضل یہ ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھتے ہیں اور بعد اس کے فصل کر کے ایک رکعت اور پڑھتے ہیں۔ حنفی مذہب میں فصل نہیں بلکہ ’وصل‘ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک فتویٰ صادر ہوا جس پر شافعی اور حنفی مولویوں کے دستخط تھے۔ غلام محی الدین الہندوستانی، حاجی محمد جان احمد الحنفی، محمد صالح بن سلیمان میرداد المکی الحنفی اور دوسرے بیرونی مولویوں نے اس فتوے پر صاد کیا تھا۔

شہر کے ایک ممتاز قاضی شہاب الدین بمبئی نے ”وتر کی فصل وفصل بمطابق مذہب حنفیہ و شافعیہ[1]“ کے بارے میں لکھتے ہوئے مسلمانانِ بمبئی کی توجہ ’تفریق غفیر، سرتر عتب ابے حاجت بسبب تعدادِ جمعہ‘ ایک محلے میں دو جگہ‘ کی طرف منعطف کرائی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بمبئی میں چار یا پانچ جگہ جمعہ کی نماز قریب قریب کی مسجدوں میں ہوتی تھی اس تعدد جمعہ سے شافعیوں کی وقوع مساجد میں فساد اور بدعت کا خوف تھا ان کی مراد یہ تھی کہ ”ایک جگہ جماعت کرنے سے نماز جمعہ کو اظہار شعائر اسلام و کثرت اژدہام مسلمانان بے سوفہ ہو کر موجب رعب کا فران ہو۔

(۲) جواز الدعا فی الجلسة بین الخطبتین:

حنفیوں اور شافعیوں کے مابین ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں شہر بمبئی میں کچھ ایسے اختلافات پیدا ہو گئے تھے کہ نوبت ”تفسیق و تضلیل“ تک پہنچ گئی حالانکہ دونوں سنی مقلدین تھے۔ کئی برسوں سے یہ مسئلہ متنازعہ فیہ تھا کہ خطیب کا بوقت جلسہ بین الخطبتین (جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیانی وقفہ میں) ہاتھ اٹھا کر زبان سے دعا کرنا مشروع ہے یا نہ

---

[1] رسالہ احکام دینیہ وتر کی فصل وفصل میں مطابق مسائل مذہب حنفیہ و شافعیہ — قاضی شہاب الدین بمبئی سنہ ۱۲۶۳ھ

بہت سے[1] جمعہ سے متعلق اور بھی متنازعہ مسائل تھے جن کے بارے میں استفسار کیا جاتا تھا اور سوالات کئے جاتے تھے!

سوال: تثویب کے کیا معنی ہیں اور یہ جائز ہے یا نہیں؟ [یعنی جمعہ سے قبل سنت پڑھنے کا اعلان کرنا]

جواب: تثویب کے معنی ہیں اعلام بعد اعلام یعنی ایکبار خبر دے کر پھر خبر کر دینا۔

بروز جمعہ بعد اذان اول کے ندا معتاد (تثویب) سنت قبل الجمعہ کے لئے شافعی مساجد میں دی جاتی تھی تاکہ مصلین "سنتہ قبل الجمعۃ" پڑھ لیں اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔ ایک جواب یہ بھی تھا کہ "تثویب نزدیک متاخرین کے سب نمازوں میں سوا مغرب کے مستحسن ہے، بعض میں مکروہ، بعض میں مستحسن ہے۔" اس ضمن میں مفتی مولوی محمد عبداللطیف (بمبئی) نے تقویت الایمان مؤلفہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی رئیس فرقہ وہابیہ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قابل اعتماد نہیں ہے۔ بہت سے مسائل کے جواب اس میں غلط لکھے ہوئے ہیں"

سوال: خطیب کا بوقت جلسہ بین الخطبتین ہاتھ اٹھا کر زبان سے دعا کرنا جائز ہے یا نہیں:

مسئلہ متنازعہ فیہ میں دو فریق تھے:

ایک فریق کا قول تھا: "دعا جہراً برفع الیدین عند الجلوس فیما بین الخطبتین (ہاتھ اٹھا کر زبان سے دونوں خطبوں کے بیچ بیٹھ کر دعا کرنا) علمائے احناف کے نزدیک جائز اور مسنون ہے"

فریق ثانی کا قول تھا: "خطیب اور سامعین دونوں کا عند الحنفیہ ناجائز اور مکروہ تحریمی ہے ہاں اگر دعا قلبی بغیر تحریک لسان (زبان ہلائے بغیر) ہے تو مباح ہے"

---

[1] دیکھئے حسین فی جواز دعا فی جلسہ بین الخطبتین۔ مولانا محمد عثمان الحنفی القادری۔ بمبئی ۱۸۹۶۔ تحقیق قوال الطالبین فی الدعاء بین الخطبتین۔ ابوالانوار محمد عبدالغفور مدرس مدرسہ انوار العلوم نوانگر۔ مطبع حسینی واقع بمبئی۔ نور استعمہ۔ مولوی عبدالمجید خطیب بمبئی ۱۲۹۴/ ۱۸۷۷

سوال: خطیب کا منبر کے درجۂ اعلیٰ سے درجۂ سفلی پر اُترنا اور پھر درجۂ اعلیٰ پر عود کرنا کیا بدعت ہے؟

بعض مساجد میں خطیب دوسرے خطبے سے قبل منبر سے ایک سیڑھی اترتے تھے اور پھر چڑھتے تھے۔ اسے بدعت حسنہ کہا گیا ہے اس پر اس وقت بھی عمل کیا جاتا تھا جب خطیب ذکر اور دعائے سلطان کرتا تھا۔

سوال: خطیب کا خطبۂ ثانیہ میں بوقت درود وغیرہ پڑھتے وقت داہنے اور بائیں اپنا منہ پھیرنا کیا بدعت ہے؟

جواب اثبات میں ہے۔

مولویوں کی ایجاد پسند طبیعت عجب عجب گل کھلاتی تھی اور نئے کرشمے دکھاتی تھی، جب بھی کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہوا یا اس کے بارے میں استفسار ہوا فوراً ان کا شبابِ قلم جولانیاں دکھلانے لگتا، اثبات و نفی، جواز و عدم جواز، درست و نادرست کا حکم یا فتویٰ ہر انفرادی یا اجتماعی فعل و عمل کے ساتھ چسپاں کر دیا جاتا۔

"ایک عرصۂ دراز سے بلدہ بمبئی اور اسکے نواحی کلیان بھیونڈی وغیرہما میں درباب جواز و عدم جواز تقبیل اقدام علماء و صلحاء و سادات کرام، بین اہل اسلام اختلاف شدید و نزاع جدید واقع تھا" یعنی ان بزرگانِ دین اور پیرانِ طریقت کی قدم بوسی کرنا جائز ہے یا ناجائز کا سوال بریلوی اور مفتی کے دروازے پر برسوں دستک دیتا رہا، [1]

بعض ایسے جزوی اور فروعی مسائل تھے جن کا دین کے بنیادی اصولوں سے دور کا تعلق بھی نہ تھا اور نہ کسی کے عقیدے سے تباین و تخالف کا باعث بنتے لیکن مولوی حضرات ذاتی عناد اور باہمی عداوت کے انتقامی جذبے سے کام لے کر ایک فتنہ کھڑا کر دیتے:

"ایک شب مسجد حاجی زکریا میں امام صاحب کی غیر حاضری میں ایک صاحبزادہ نے جو حافظ قرآن بھی نہیں تھے نماز عشاء میں "مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى" کی جگہ بلفظ "لِتَخْشٰی" [2] پڑھا، پڑھتے ہی لوگ کہ صحیح پڑھو صاحب نماز تمام ہوئی اتفاق سے

---

[1] ردّ منکرین جواز تقبیل اقدام بزرگان ذوی الاحترام۔ مولوی عبدالحق دریا محلہ بمبئی

[2] سورۂ طٰہٰ: ٢٠

مولانا ولی محمد عرف احمد حسن صاحب جالندھری جو حال وارد بمبئی ہیں وہاں موجود تھے اور
چونکہ امام صاحب موصوف سے ایک زک اپنی عقلمندی کے سبب اٹھا چکے تھے وہ یہ کہ نماز
عید الفطر کے وقت ایسے وقت میں کہ جماعت کھڑی ہونے میں بہت کم وقت تھا وعظ فرمانے
کے لیے منبر پر تشریف لے گئے چونکہ وقت بہت تنگ تھا امام صاحب نے فرمایا یہ وقت
وعظ کا نہیں ہے مولوی صاحب کو یہی ناگوار گذرا تھا چہ جائیکہ بغیر وعظ کہے منبر پر
جا کر اترنا۔ اس دن سے کوئی موقعہ اور بدلے کا ڈھونڈھتے تھے، اتفاق وقت سے
یہ واقعہ نماز کا انکی موجودگی میں ہوا"

نماز تمام ہوتے ہی مولوی صاحب نے یکایک غل مچایا کہ نماز فاسد ہوئی، شور برپا ہوا
لوگ متحیر ہوئے بعض کہنے لگے کہ نماز ہوئی، بعض نے کہا نماز نہیں ہوئی، دیر تک
شور و غل ہوتا رہا، آخر الامر صبح کو صاحبزادۂ موصوف نے استفتا کیا علماء بمبئی نے بقول
عادت مشائخ فتویٰ جواز نماز کا دیا"

پھر اس کے بعد دونوں طرف سے استفتا اور فتووں کا ایک ایسا سلسلہ بندھا کہ علیگڑھ، جبلپور، منگلور، مالوہ کے مولویوں تک معاملہ پہنچا۔[1] عین راجہ بیان، انتقام لینے کے بھی کتنے داؤ پیچ ہیں، مفاد پرستی، خود پرستی، خود نمائی، تکبر و غرور علم و دانش اور ذاتی عناد علمائے سو کے وہ 'اوصاف' تھے جن سے دینی فضا یکسر مکدر ہو چکی تھی۔

انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے بین الملکی تجارت کے سبب بمبئی میں مرفہ الحالی اور خوشحالی کا نیا دور شروع ہوا، کوکنی مسلمانوں میں تنگیکر، کھتکھٹے، بہایمکر، خطیب، دفعدار، گھٹے، مقبے، قرنگتے اور حبیب کر خاندان بڑے متمول بن گئے تھے، دوشا محمد علی روگھے کئی جہازوں کا مالک تھا، ... اور جیون سیٹھ، جروں کی ساجھے داری میں چین سے افیون کی تجارت میں اس نے بڑی دولت کما لی تھی۔[2]

---

[1] مجموعہ فتاوی، منیر الدین احمد نقل ص ۳۱۲ / ۱۹۹۵

[2] Christian Dobbin, Urban Leadership in Western India, Politics and Communities in Bombay City 1840-1885, London 1972 P. 21-22

مقبہ اور رو گیے خاندان متمول اور مخیر تھے اور دانشور طبقہ کی سرپرستی کرتے تھے ان کی مالی استعانت سے کئی اہم کتابیں شائع ہوئی تھیں دین کی خدمت اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے علاوہ کھپولی (دہیزیل)، کلیان اور بھیمڑی میں بھی ثروتمند حضرات علمائے کرام کے بڑے مخیر مربی تھے، زین الدین فانکے رئیس قصبہ کلیان نے قاضی محمد اسمٰعیل مہری سے اور سیٹھ حاجی اسمٰعیل راج محمد رئیس قصبہ کھپولی نے مولانا حاجی مولوی محمد عبدالقادر باعلکظ سے کئی کتابیں لکھوا کر چھپوائی تھیں انیسویں صدی میں اسلام آباد بھیمڑی کی سب سے مشہور، متمول اور مخیر ہستی حاجی باقر فقیہ کی تھی جنہوں نے اپنے قصبہ ہی کے لیے نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں حجاج کرام کے لئے بھی فلاح و بہبود کے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں، فقیہ صاحب کی جود و سخا سے متاثر ہو کر مشہور کوکنی خاتون شاعرہ حمیدہ بنت شیخ محمد نار کرنے مثنوی سخاوت نامہ لکھی تھی جس میں اس نے انہیں سخی الزمان، غریب پرور، فیض گستر کے القاب سے نوازا ہے اور ان کی مدح میں اپنی مثنوی میں انہیں حاتم کا نظیر بتایا ہے۔

سخی ہیں سخاوت میں لاریب فیہ — جو مشہور ہیں حاجی باقر فقیہ
سخاوت میں مشہور ہیں ہر کہیں — جو حاتم کہوں بھی تو کچھ کم نہیں

کوکنی علماء کی تصانیف بیشتر فقہ شافعی پر ہیں لیکن اس کے علاوہ اور دیگر مذہبی موضوعات پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا ہے، "مولود شریف" تو بعض مصنفوں کا خاص موضوع تھا، عموماً یہ دستور تھا کہ ہر جگہ کا مقامی عالم اور مدرس اپنے مکتب و مدرسہ کے طالبانِ علم کے لئے ایک نصاب مرتب کر لیتا تھا اور مبتدیوں کے لئے اسلام کے بنیادی عقائد بیان کر دیتا تھا، اس نوع کی تصانیف کے عموماً عنوان "نور الاسلام"، "کفایت الاسلام" اور "معلم الاسلام" ہوتے تھے یہ عموماً فقہ شافعی پر مبنی ہوتے تھے۔ بھیمڑی کے مولانا حاجی میاں غلام محی الدین تالی متوطن نظام پور نے "درفقہ مذہب امام شافعی بزیر نگرانی مولانا محمد امین صاحب ولد مولانا مسعود صاحب بھیمڑی و مولانا بنگالی صاحب مدرس اول مسجد اسلام آباد بھیمڑی، مولانا یوسف ولد احمد صاحب قاضی کلیانکر و خطیب ملا احمد ولد حسین لابدلاپوری" معلم الاسلام کے نام سے [illegible] مرتب کیا تھا۔[1]

---

[1] مخطوطہ، کتب خانہ، مدرسہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی۔ [2] ایضاً

اس زمانے میں مقامی اور بیرونی مولوی حضرات اور علمائے کرام کا ایک جمگھٹا جزیرہ بمبئی میں موجود تھا، لیکن یہ سارے پرانے تقلید اور روایات کے ترجمان تھے، دین کے جزوی و فروعی مسائل میں اتنے الجھے ہوئے تھے کہ مسلم معاشرہ کے دیگر مسائل اور مشکلات پر ان کی سرسری نظر بھی نہیں پڑتی تھی، عوام میں جذبۂ مسلمانی موجود تھا لیکن روحِ ایمانی مردہ تھی، ۱۸۵۱ء میں جب شہر میں پارسی مسلم فساد ہوا تو مسلم علاقوں سے اٹھتے ہوئے "دین، دین" کے نعروں سے فضا ہفتوں گونجتی رہی۔ لیکن ان میں کتنے دیندار مسلمان تھے جو پابندِ احکامِ الٰہی تھے، کوکنی عمائدینِ شہر کے اردگرد جن مولویوں کا جمگھٹا موجود رہتا تھا وہ تو "سیٹھ صاحب" کی دلجوئی کے لیے "ایجاد بندہ" قسم کے اوراد و وظائف کی تعلیم دیتے تھے تاکہ ان کے لیے جنت کے دروازے کھل جائیں۔ مولانا شاہ محمد ابراہیم نے ناخدا محمد علی روگھے کے ساگوان اور اخروٹ کے منقش شہتیروں والے مکان واقع ناخدا میں ایک مجلس میں جس میں عمائدینِ شہر موجود تھے درود شریف کی فضیلت کے بیان میں فرمایا:

> "جو شخص اس درود شریف کو یکسو گیارہ مرتبہ بعد نمازِ عشاء پڑھ کر چالیس روز تک متواتر قبلہ رخ سوئیگا اس کو زیارت سردارِ دوجہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلعم نصیب ہوگی"

کوکنی علمائے دین میں سب سے ممتاز نہری خانوادہ تھا، اس خاندان میں متعدد شاعر اور صاحبِ تصنیف بزرگ گزرے ہیں جن میں قاضی غلام قاسم نہری، قاضی غلام علی نہری، قاضی غلام حسین نہری اور قاضی شہاب الدین نہری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، مؤخر الذکر کا اپنا ایک منفرد مقام تھا اور دیگر مولویوں کی طرح ان کی نظر مزاروں سے دور جاتی تھی بلکہ ان مسائل سے الجھی رہتی تھی جن سے عقلیت ذہنیت کی بو آتی تھی۔ جب رمضان کی وتر نماز کا مسئلہ ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے اپنے رسالہ "احکامِ دینیہ" میں لکھا:

> "۔۔۔ اور یہ سے مخرج وتر کے وصل و فصل پر نظر رکھنا اور اہم مہمات دینیہ سے اہمال کرنا اور اس کے ربط و ضبط سے [تجاہل] کرنا اور جس سے اگر دین میں فساد و رخنہ پیدا ہوا اور اس کا تدارک مشکل ہو غافل رہنا تو پھر خدا تعالیٰ کو کیا جواب دیا جائیگا"

سلہ پر ۵۵ ء ت ملفوظ یادگار بمبئی (مطبع باقری بمبئی ۱۲۲۱ھ)

وہ اس امر کو مکروہ اور خلاف اتباع سمجھتے تھے کہ اس طرح "وتر کا حکم دونوں مذہب [حنفی و شافعی] والوں پر جماعت سے پڑھنے کا جاری کرنے سے دونوں مذہب والے تکلیف اور تغیر اسلوب و تحریف میں پڑتے ہیں" انہوں نے حرم شریف کا جہاں چار مصلے تھے" حوالہ دیتے ہوئے

"وہاں کے ہر ایک جماعت کے مصلی حنفی اور شافعی بعد تراویح اپنی اپنی وتر مذہب کے جماعت چاروں سے [مل کر] جدا جدا پڑھتے ہیں اور کچھ وصل و فصل کا ذکر وہاں نہیں ہے" [کذا]

قاضی شہاب الدین نہری نے "امر و نہی" کی پابندی پر زور دیتے ہوئے مسلمانوں کی اخلاقی گراوٹ اور عام بے دینی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بعض فرقہ، مسلمانان علانیہ معرکہ کورت [کورٹ] محکمہ وقت میں منکر آیات قرآنی ہو کے کہتے ہیں اور شہادت دیتے ہیں کہ ہم مسلمان محمدی ہیں، لیکن آیات میراث کی جو قرآن میں ہیں ہم ان کے قائل اور مطیع نہیں ہیں در میراث کے باب میں ہم طریقہ کفر و ہنود پر اور انکے دستور پر جو جورووں کو اور بیٹیوں کو اور بہن کو میراث نہیں دیتے ہیں ہم بھی اسی رسم پر چلتے ہیں۔ اس فرقہ گمراہوں کو جس سے رخنہ عظیم بلکہ کفر صریح دین متین میں پیدا ہوا ہے قاضی شرع مبین و علماء دین کچھ استفسار اور ان کے بے شرعی پر زجر و توبیخ و انکار نہیں فرماتے تا موجب تنبیہ و عبرت دیگر ساں ہو"

قاضی صاحب نے ایسے "مفاسد غیر متدارکہ" کے انسداد پر زور دیتے ہوئے قوم کے علماء دین سے درخواست کی "اس کا سدباب اور استیصال کرنا لازم و واجب ہے" شاید انسانوں کے

سلہ رسالہ احکام دینیہ - قاضی شہاب الدین نہری - ۲۷ شعبان ۱۲۶۳ - ص۲، ص۱۱۔ اشارہ اسماعیلی خوجوں کی طرف ہے۔ کچھی میمن مسلمان بھی ۱۹۳۸ء تک میراث کے احکام پر سختی سے عمل نہیں کرتے تھے۔ راقم نے اپنی غیر مطبوعہ انگریزی تصنیف (۱۹۶۲ء) میں اسی موضوع پر سیر حاصل تبصرہ لکھا ہے۔ دیکھیے گجرات گزیٹیر ص۵۶

اس جنگل میں قاضی صاحب کی واحد آواز تھی جو گونجی لیکن کانوں پڑی سنائی نہ دی، کسی نے بجز ان "نماز" کسی اور مسئلہ، معاملات میں مثلاً بیع حلال و حرام، بیع و شراء، میراث و فرائض، معاش و اقتصاد، اعمال صالحہ و سیئہ اور شرک و بدعت پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا نہ آواز اٹھائی۔ افیون کی تجارت جو مسکرات کے دائرہ میں آتی ہے کسی مولوی کو جرأت نہ ہوئی اس کی تحریم کے بارے میں کچھ لکھتا، مغربی تہذیب کے دلدادہ رؤسائے شہر "گورنر" کی دعوت پر "بڑا کھانا" میں شرکت کرتے، بال ڈانس کرتے اور اپنے گھر والوں کی شادیوں میں خود اس قسم کے اختلاطی رقص و سرود کا اہتمام کرتے تھے۔[1] لیکن یہاں کسی مولوی میں نہ اخلاقی جرأت تھی اور نہ تقویٰ۔ "جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" — اس میں کوئی شک نہیں زمانہ ہی ایسا تھا اور سیاسی حالات ... تیور بھی خطرناک حد تک بدل چکے تھے۔ واں ایک خاموشی تیرے سب کے جواب ...

شیعہ انصاری۔ مومن

... دور میں دیار پورب میں کچھ انصاری گھرانوں نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا ... ان کی تعداد کم ہی رہی، مبارکپور، بریاپور، محمد آباد اور خصوصاً بنارس میں زربافوں کی جماعت ... افراد شامل تھے۔ مبارکپور کے محمد حسین جھتر نے جب شیعہ مذہب اختیار کیا تو انھیں کے نام ... دور میں حسین آباد یا حسین گنج کی بستی کا نام پڑا۔ غدر کے ہنگامے میں شیعہ مومن ... نے بھی ترک وطن کر کے بریاپور، بھیونڈی اور دیگر شہروں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ... جعفری کے ماننے والے اثنا عشری تھے اور امامیہ کہلاتے تھے۔

---

[1] ... ۱۵ فروری ۱۹۶۱ء

انیسواں باب

برادری کی جماعتی روایات

پیشہ ور جماعتوں اور سماجی طور پر پست طبقوں میں مومن برادری واحد جماعت تھی جس نے سب سے پہلے اپنی جماعت بندی کی بنیادوں کو استوار کیا، اہلِ حرفہ میں عہدِ وسطیٰ میں اس طرح کی جماعتی تنظیم اسلامی ممالک میں موجود تھی جسے 'صنف' کہتے تھے لیکن دراصل یہ ایک صنعتی تنظیم تھی جس کا دائرۂ عمل محدود تھا اس کا بنیادی مقصد صنعت کا تحفظ، صناعتوں کا انضباط اور صنعتی پیداوار کا فروغ اور نکاس تھا، اخلاقی اور مذہبی عنصر بھی شامل تھا جو بیع و شرا در مشارکت و مضاربت کی حد تک تھا۔

مومن برادری کی جماعت بندی اور اس کا استحکام اس کے طبقاتی وجود، صنعتی بقا اور ایک 'قبیلائی شناخت' کی برقراری کے لیے تھا شاید اس کی وجہ وہ صدیوں پرانی ذہنیت اور قنوطیت تھی جو اونچے طبقوں کے ناروا سلوک اور ذلت آمیز برتاؤ کا نتیجہ تھی اس شدید احساس نے مومن۔ انصاری برادری کے ذہین افراد میں ایک طبقاتی شعور پیدا کیا اور ان میں خود شناسی کی بصیرت پیدا ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد اتر پردیش کے موروثی جاگیرداروں اور نو مسلم شیخ زمینداروں نے بھی وقت کی آواز پر اپنا لہجہ بدل دیا تھا اور ایک حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر کے عصرِ حاضر کے تقاضوں کے جواب میں [illegible]انہ رجحانات کی طرف مائل ہو چکے تھے، زمینداروں کی اولاد علی گڑھ کی طرف چلی گئی اور برادری کے قدامت پسند اور بڑی حد تک دیندار خاندانوں کے بچے مکتب و مدرسوں کے منشی، ملا اور حافظ استادوں کے زیرِ تربیت علمِ دین حاصل کرنے لگے۔

زمینداروں کی اولاد مغربی تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر انگریزی حکومت کے کل پرزے بن گئی ان کا مقصد تھا کہ ڈپٹی کلکٹری اور صدر امین کے عہدوں تک پہنچیں تاکہ ان کی طبقاتی مرتبت کی کرسی اور اونچی ہو جائے، اعلیٰ تعلیم، دولت اور منزلت کو وہ اپنا پیدائشی حق تصور کرتے تھے، یہ "بابو لوگ" اور "صاحب لوگ" مغربی تہذیب و تعلیم سے بے حد مرعوب۔

تھے اور انگریزوں کی سائنسی ایجادات و برکات کو ایک مابعد الطبیعیاتی کرشمہ تصور کرتے تھے دنیاوی اعتبار سے بڑے کامیاب لوگ تھے۔ ان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے پاسبان اور امین بھی موجود تھے۔

برادری کے سماجی طور پر پست طبقہ اور اونچے طبقات کے مابین قدیم خلیج کا پاٹ اور وسیع ہو گیا۔ اس فرقِ مراتب اور تباین نے برادری میں خودداری، خودشناسی اور عزم و ہمت کے محرکات پیدا کر دئے۔ لیکن ساتھ ہی اس جماعت میں ایک کرب اور کسک بھی پیدا ہو گیا تھا اس لئے کہ انہوں نے اپنی حیثیت کی تباہ حالی دیکھی جو انگریزوں کے استحصال اور مہاجنوں کے استیصال کی معاندانہ کارروائیوں کا نتیجہ تھی، زمینداروں کی باہمی عداوت نے جب بھی بلوہ کروایا یہ "چھوٹے لوگ" ہی سب سے زیادہ جانی اور مالی خسران اٹھاتے جب ان میں طبقاتی شعور پیدا ہوا تو انہوں نے اتحاد و یگانگت کی بنیاد پر "برادری" کی عظیم عمارت کھڑی کر دی، ان کی پنچایت 'حصن حصین' بن گئی اور پنچایت کے سردار — سالار لشکر بن گئے عزم و ہمت سے زندگی کے ہر میدان میں آگے بڑھے، اور برادری میں علمائے کبار، شیوخ عظام اور اہل قلم اور اہل سیاست کی ایک فوج کھڑی ہو گئی۔ مبارک پور میں برادری کو "جنگی" کہا جاتا تھا اور انگریز ضلع بلیا، اعظم گڈھ اور غازی پور کے جلاہوں کو "متعصب جلاہا" کے نام سے پکارتے تھے اور بقول ان کے "مسلمانوں کا ایک مشتعل ہجوم سوسائٹی کا سب سے خطرناک عنصر ہوتا ہے۔"[1]

برادری کی پنچایت :

برادری کی پنچایت کا دائرۂ عمل بہت وسیع تھا اس کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مذہب، معاشرت و تمدن، مدنیت، صنعت اور کاروبار کے تمام مسائل و نکات پر اس کی دوررس نظر تھی۔ مذہب کی مقدس روایات کی حرمت، ہندو مسلم اور دیگر فرقوں کی حمایت، تعلقات باہمی کی برقراری اور استواری، سیاسی تحریکوں میں شمولیت۔ یہ سارے پنچایت کے موضوع تھے جن پر غور و خوض کیا جاتا، مسائل سلجھائے جاتے اور بعض معاملات میں فیصلے

---

[1] ۔۔۔ جیدل ذری ۱۸۶۴ء — ۱۹۲۰ء)

دے جاتے۔

مذہبی معاملات میں برادری کے افراد بڑے جذباتی واقع ہوئے تھے، ذرا سی ٹھیس پہنچنے پر ان کا پیمانۂ غیرت چھلک اٹھتا، رگِ حمیت پھڑک اٹھتی کوئی بھی جیالا بروقت سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ارد گرد ہجوم اکٹھا ہو جاتا، اسی لئے نہیں "جنگی" کہے تھے، فسادات تو ہندوستان کے ہر علاقے کا مقدر بن چکے تھے لیکن جس تواتر کے ساتھ ان کا اعادہ ہر محرم، بقرعید اور دیگر تہواروں پر ہوتا تھا اس سے بنارس، غازی پور، (۱۸۹۳ء) مبارک پور اور مئو (۱۸۹۱ - ۱۸۱۳) ۔ اور مغربی بہار میں شاہ آباد (۱۹۱۷) کے لوگ عادی بن چکے تھے۔ مبارکپور، کریا گنج اور مئو کے جلاہے بڑی جلدی مشتعل ہو جاتے تھے۔ [1]

مذہبی علامتوں، یادگاروں اور شعائر اسلامی کی تقدیس کا تحفظ ان کا شعور تھا، ان میں قربانی اور ایثار کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا، ذاتی مفاد اور مصلحت کو وہ اجتماعی مفادات پر قربان کر دیتے تھے، مئو اور بنارس میں جب غیر مسلم بیوپاریوں نے اپنے کارخانوں میں دوگنی مزدوری پر نوربافوں کو کام کرنے کی پیشکش کی تو معاشی بحران کے دور میں بھی انہوں نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اسطرح نسعت کے اجتماعی مفاد کو دھچکا پہنچتا، ہر نورباف اپنے وقت اور ہنر کا مالک تھا، یہی نسعت تھی جس نے اسے کسی کا دست نگر نہیں بنایا کیونکہ اسطرح نفس کی بجر دی اور فرد کی ذاتی خودکاری سے برادری کی اجتماعی ہیئت ور کار کردگی میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا، وہ قرض لیتے تھے لیکن کبھی یہ ذلت گوارا نہ کرتے کہ غیرت اور خودداری کے دائرے سے نکل کر اغیار کا احسان اٹھائیں۔

معاشی بحران کے دور میں برادری کی پنچایت کی میٹنگ ہوتی تھی۔ اس کی تنظیم مستحکم جماعت بندی اور اتفاق دیکھ کر انگریز حکام بھی تعجب کرتے۔ ۱۸۱۰-۱۸۰۹ء میں جب بنارس میں "رہائشی ٹیکس" کے سلسلے میں تمام طبقات نے احتجاج بلند کیا تو برادری نے ہڑتال کرا دی اور اپنے احتجاج کو ایک ٹھوس عملی شکل دے دی۔ یہ بنارس میں مرزپورہ کی برادری کی پنچایت کا فیصلہ تھا۔ [2]

---

[1] گیانندر پانڈے۔ (انگریزی) ص ۱۰۵

[2] ایضاً ۱۴۳-۱۴۴

برادری کے تمام دنیاوی معاملات پنچایت کی رائے سے طے کیے جاتے تھے، عقائد کے تعلق سے مومن برادری میں مذہب و مسلک کا تباین اور تفاوت نہ تھا، یہ ایک فروعی مسئلہ تھا جو جماعتی یگانگت پر کسی طور سے اثر انداز نہیں ہوتا تھا، یوں رشتۂ ازدواج کے معاملے میں بعض خاندان جو اپنے مسلک پر (اہل سنت یا اہلحدیث) متشدد تھے وہ اس معاملہ میں احتیاط برتتے تھے، برادری کے سارے خاندان ہمسر تھے، اخوت اور مساوات کی سطح پر کسی ذات پات کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا، مالی اعتبار سے درجہ بندی ضرور تھی لیکن دینداری کے مقابلے میں یہ تفاوت زائل ہو جاتا۔

شادی بیاہ کے معاملات میں پنچایت کے سردار اور پنچ کی رائے اور موجودگی ناگزیر تھی "پنچ کا تصور" بڑا ہمہ گیر اور معنی آفریں تھا، یہ گویا ساری برادری کی نمائندگی کرتا تھا، اس کے تعاون اور اشتراک کے بغیر کوئی کام سر انجام نہیں پا سکتا تھا، پنچ (پنچایت) یا "جماعت" کی اطاعت ہر مومن فرد کا فرض تھا اور ساری برادری کے لیے فرض کفایہ تصور کیا جاتا تھا، 'پنچایتی فیصلہ' حرفِ آخر تسلیم کیا جاتا اور اس کے حکم سے سرتابی کی کسی کو مجال نہ تھی، کم از کم برادری کی پنچایت میں اس مثل کے لیے کوئی جگہ نہ تھی "پنچوں کا کہا سر آنکھوں پر مگر پرنالہ یہیں رہے گا" بلکہ استطاعت اور فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ "پنچ کہیں بلی تو بلی ہی سہی"

ایک جولاہا درخت پر چڑھ کر پتے توڑتے وقت گر پڑا، چوٹ لگنے سے کراہنے لگا، محلے کے چوہدری بھائی جمع ہو گئے اور پوچھنے لگے:

"کس میاں بھائی کہاں چوٹ لگی ہے؟"

بیچارے نے بڑی بیچارگی سے جواب دیا "جہاں پنچ کہدیں وہیں چوٹ لگی ہے"

پنچایت کئی محلوں پر محیط ہوتی تھی بنارس میں جہاں کی پنچایت بڑی مستحکم تھی باون محلوں کی باونی پنچایت کہلاتی تھی، انیسویں صدی کے اختتام تک مشرقی اترپردیش اور بہار میں 'پنچایتی راج' کی تنظیم عروج پر تھی، دیہاتوں میں دس سے پچاس گھروں کی بھی پنچایت تشکیل دی جاتی تھی، بعض مقاموں پر کئی دیہاتوں کی برادری مل جل کر ایک منظم اور واحد پنچایت بنا لیتی، مبارکپور میں ۲۸ محلوں کی ایک متفقہ پنچایت تمام فیصلے کرتی تھی، اسی طرح" مئو میں بائیس محلوں کی پنچایت کہلاتی تھی 'چوراسی' جماعت جس کا وجود بھیونڈی، مالیگاؤں اور بمبئی میں بھی تھا چالیس تا پچاس میلوں تک کے قریوں پر محیط تھی، سورتی

مال کے بائیکاٹ اور ترکِ موالات کی خلافت تحریک کے زمانے میں تمام فیصلے اٹھائیس[۲۸] اور چوراسی[۸۴] جماعتوں میں کئے گئے ان میں مبارک پور کے نوربافت شامل تھے۔

مبارک پور کے مولوی مفتی قاری شکر اللہ اس تحریک کے سلسلے میں جیل تک گئے پورے

مبارک پور میں جب عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا تو مبارک پور ہی کے اکیس مسلمان [نوربافت] گرفتار ہوئے، عدالت میں مقدمہ چلا اور انہیں جیل ہوئی ان میں مولوی شکر اللہ بھی شامل تھے۔[۱]

برادری چاہے وہ بنگال کے تانتی بنکروں کی ہو یا کسی اور جگہ کی کفو کے بڑے پابند تھے اپنی لڑکیاں غیر کفو میں نہ دیتے چاہے وہ کتنا ہی مالدار اور زمیندار گھرانہ ہی کیوں نہ ہو۔[۲]

برادری کا سردار، چودھری، مہتو اور مہتر

ٹکڑی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے — اور یہ برادری کا سردار ہوتا تھا۔ مبارک پور میں اسے مہتر کہتے تھے، بنارس اور دیگر مقاموں میں یہ مہتو اور چودھری کہلاتے تھے۔ ناگپور میں سرپنچ، مالیگاؤں، بھیونڈی اور بمبئی میں سردار ہی کہتے تھے۔ سردار جامع اوصاف ہوتا تھا یہ انصاف پسند، بے لوث اور اخلاص و اخلاق کا پیکر ہوتا تھا۔ دینداری اس کا شیوہ، صداقت اس کا مشرب اور غیر جانبداری اس کا عمل تھا۔ برادری کے لوگ اپنے سردار کی بڑی عزت کرتے تھے اور یہ اس کے اخلاق کا نگراں اور پاسبان تھا۔ نوجوانوں کے چال چلن اور رکھ رکھاؤ پر اس کی نظر رہتی تھی، برادری کے خاندانوں کی عائلی، ازدواجی اور رشتہ داری کے تمام مسائل پر سردار پنچایت بلا کر دو جوڑ کر کے بحث و مباحثہ کرتا تھا، طلاق، ترکہ، جائداد، میاں بیوی کے کشیدہ تعلقات، رشتہ داروں کے جھگڑے، محلّہ کے گھرانوں کے اختلافات اور یہاں تک کہ سماجی خرابیاں، اخلاقی جرائم جیسے زنا اور ناجائز حمل وغیرہ سارے مقدمے پنچایت کی عدالت میں دائر کئے جاتے تھے کوئی ایسا سنگین معاملہ جس سے اطراف واکناف

---

[۱] شعیب اعظمی (مرتب) حکیم محمد اسحاق: پروانۂ چراغ مزار، خود ہی ما۔ صفحہ ۱۔۴۱

[۲] Crooke: 'The Tribes and Castes of North-western Provinces of India', 1896, P.70

کی ساری مومن برادریاں متاثر ہوتی تھیں بڑی جماعت مثلاً "چوراسی پنچایت" میں اٹھایا جاتا تھا۔ 'چوراسی' عدالتِ عالیہ کا حکم رکھتی تھی۔ اور اس کے قول فیصل پر عمل درآمد کیا جاتا۔

دیارِ پورب کے بعض سرداروں کی عظیم خدمات اور کارناموں کی داستانیں ہم تک پہنچی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ برادری کی یہ ممتاز ہستیاں نہ صرف برادری کے لئے بلکہ تمام مسلمانوں کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے لئے کتنا اہم اور مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہیں' مبارک پور کی نوربافِ برادری کے سردار شہاب مہتر کے کارناموں کی تحسین قصبہ کے تعلیم یافتہ زمیندار شیخ علی حسن فاروقی نے اپنی تاریخ "واقعات و حادثات: قصبہ مبارک پور میں دل کھول کر کی ہے" شہاب مہتر جیسے دور اندیش اور بے لوث شخص کی نظیر اس زمانے میں مشکل سے ملتی ہے" برادری کے ایک فرد عبدالمجید نے اپنی ڈائری میں ایام گذشتہ میں وقوع پذیر ہونے والی ۱۸۱۳ء کی سب سے خونریز جنگ' کے بارے میں لکھتے ہوئے شہاب مہتر کو ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ اور ترجمان بتلایا ہے۔ گورکھپور کی عدالت میں شہاب مہتر اور برادری کے ان افراد کی طرف سے جن کا مال دنیا ٹ چکا تھا ایک درخواست دی تھی یہ ایک فریاد تھی تنہا ایک برادری کی ہی نہیں بلکہ اس میں ملک کے سارے مسلمان مظلوموں کی آہیں سنائی دیتی تھیں:

"اب تک سارے ہندوستان میں ہندو مسلم مل جل کر بڑی محبت سے رہتے تھے اور اپنی مذہبی رسومات بڑی آزادی سے ادا کرتے تھے لیکن جب سے ہندوؤں کے ہاتھوں تھانداری آئی ہے، مسلمانوں پر تباہیاں آنے لگی ہیں۔" [1]

۱۸۹۰ء میں جب شیعہ سنی بلوہ ہوا تو برادری کی یہی لائق تعظیم شخصیت تھی جس نے لکھنؤ جاکر شیعہ حکام سے دادرسی کی اور اہلِ تشیع کے ظلم و تعدی کے خلاف شکایت کی' شہاب مہتر کے مساعیٔ جمیلہ سے قصبہ میں امن و امان برقرار رہا' ایک دوسرے موقع پر اسی نوعیت کے شیعہ سنی فساد پر جب برادری کے معصوم افراد گرفتار کئے گئے تو شہاب مہتر ہی نے اپنے اثر سے کام لیتے ہوئے محمد آباد تھانہ سے انہیں رہائی دلائی تھی۔ [2]

---

[1] گیانندر پانڈے۔ دا انگریزی، ص ۱۲۰   [2] ایضاً۔ ص ۱۲۶

۱۸۵۷-۵۸ء کے ہنگامہ خیز دنوں میں قصبہ اور نواح میں امن وامان برقرار رکھنے میں برادری کے سرداروں کا بڑا عمل دخل تھا۔[1]

آنے والی پیڑھیوں میں بھی قصبہ مبارک پور کی برادری کے مہتروں نے اس عہدے کی شاندار روایات کو قائم رکھا، بخش مہتر نے تو قصبہ کے ہندو مہاجنوں اور عام مسلمانوں کو ایک بڑے خطرے سے بچایا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب حکومت کے باغی بھپورتے کے رجب علی زمیندار نے ہندو مہاجنوں اور تھانے کو لوٹنے کے ارادے سے ہزاروں لوگوں کو مسلح کر کے قصبہ پر حملہ کرنا چاہا تو گدا حسین زمیندار کے ساتھ نوربافوں کے سردار بخش مہتر نے رجب علی کو خطرناک نتائج سے آگاہ کیا، یہ لوگ بھی مدافعت کے لیے تیار تھے، اس طرح موضع گھرا ضلع فیض آباد کے راجپوت بھی جب مہاجنوں کو لوٹنے کی نیت سے قصبہ پر چڑھ آئے تو بخش مہتر ہی نے ان کو للکارا تھا، راجپوت اپنے مسلح ساتھیوں کو لے کر لوٹ گئے۔[2]

اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد پر مدنیت کا جو تصور، عہدِ وسطیٰ میں استوار ہوا اس کی مثالیں صرف یونان و روما کی تہذیبوں میں ملتی ہے ہر اسلامی شہر کی تعمیر اور آبادکاری میں ایک مماثلت اور یکسانیت موجود تھی آبادی کے مرکز میں جامع مسجد اور اس سے متصل دکانیں، ہر جنس گرانمایہ کے الگ الگ بازار، کپڑے کا بزاز، جسے قیصریہ کہتے تھے اور محلوں کی پیشے اور صنعتوں کی بنیادوں پر تقسیم، غسال، حلال خور اور پست طبقات کی بیرون شہر بستیاں ــــ یہ ہر مسلم شہر کا نقشہ تھا، ہر مسلم باشندے کو اپنے شہر یا وطن، اپنے محلے اور اپنی برادری سے بڑا لگاؤ رہتا تھا۔

برادری میں بھی حب الوطنی کا جذبہ موجزن رہتا تھا، ہر فرد کو اپنے قصبے اور اپنے محلے سے دلی محبت تھی جو وابستگی اُسے اپنے گھر اور کنبے سے تھی۔ قصبہ کی قدیم روایات کی بقاء، باشندوں سے میل ملاپ اور فرقوں سے اتحاد، محلے کی سالمیت اور مسجد کی حرمت کو برقرار رکھنا برادری کا فرض کفایہ تھا۔

---

[1] گیانندر پانڈے۔ (انگریزی)۔ ص ۱۳۶

[2] تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۳۰۔ ۳۱

قصبہ مبارک پور کے بانی راجہ سید حامد مبارک سے دونوں فرقوں کے لوگوں کو بڑی عقیدت تھی، وہ ان کے قدوم میمنت لزوم کو باعث یمن و برکت تسلیم کرتے تھے اور جن کے مزار اور جامع مسجد کے وجود سے قصبہ میں خوشحالی کا دور دورہ تھا، دونوں فرقوں کی مشترکہ روایات اور تصورات کو ان کی بزرگی سے روشنی ملی تھی کیونکہ یہ "نور ہدایت" تھے، اس خوش عقیدگی نے برسوں قصبہ کے کسی مہاجن یا مسلمان دولت مند کو ان کے مزار سے بلند تر کوئی عمارت تعمیر کرنے سے روکے رکھا جیسا کہ ان کا "فرمان" تھا اس سے سرتابی کا نتیجہ تھا اس عمارت کی تباہی اور بنانے والے کی نسل کا خاتمہ، اور لوگوں نے انگنو کلوار ساہو کا عبرت ناک انجام دیکھا اس کا اونچا شوالا اپنا وجود جلد ہی کھو بیٹھا، وہ خود مارا گیا اس کا اکلوتا بیٹا پاگل ہو گیا، مسلمانوں کے یہاں کھانے لگا اور اس طرح انگنو کلوار کی نسل ختم ہو گئی۔[1]

یہ مذہبی منطق اور خوش عقیدگی برسوں تک قصبہ کی مقدس روایات کی بقا کی ضمانت دیتی رہی، قصبہ کی تمام مقدس یادگاروں کے تحفظ، بقا اور مرمت کے لئے "ایک گولک" (چندے کی پیٹی) قائم رکھا گیا تھا، اس کو سدا قائم رکھنے کے لئے قصبہ کے زمیندار تک دعا مانگتے تھے،

"اللہ ان جنبوں کو کچھ در عزم و ہمت عطا کرے تاکہ یہ صدقہ جاریہ ہمیشہ قائم رہے"۔[2]

مومن برادری کی باعتی تنظیم چوراسی محلوں پر مشتمل تھی، اس تنظیم میں ہر محلے سے ایک نمائندہ اس محلہ کا سردار ہوتا تھا چوراسی پنچایت مومنوں کے باہمی مسائل و معاملات کو حل و تصفیہ اور مفادات کا تحفظ کرتی تھی۔ اس کے ایک فنڈ کا نام "کوڑی فنڈ" تھا جو ہر فروخت شدہ ساڑی کی قیمت سے اس وقت فی روپیہ ایک "کوڑی" کے حساب سے جمع کیا جاتا تھا۔ یعنی فی روپیہ ایک پیسہ۔ اس فنڈ میں تعداد کے لحاظ سے اہلحدیث ایک روپیہ میں چھ آنے کے اور احناف دس آنے کے حصہ دار ہوتے تھے۔ یہ بڑی مفید تنظیم تھی اس کی مومنوں کی بڑی خدمات ہیں "کوڑی فنڈ بلڈنگ" اسی کی یادگار ہے۔[3] کوڑا گنج میں مسلم فنڈ اور بھیونڈی

---

[1] گیانندر پانڈے۔ ص ۱۳۴

[2] ایضاً۔ ص ۱۳۷ تذکرہ مولانا محمد ناظر صاحب ص ... اور رسائل المنوال والبدح ۲ ص ۵۲-۵۳

میں مومن چیمبر آف کامرس "اسی قبیل کی امداد باہمی کی تنظیمیں تھیں۔

بنارس کی "بادوتی" پنچایت کا راج "میلوں تک آباد قصبوں اور قریوں تک پھیلا ہوا تھا" لیکن ہر معاملہ میں تمام برادریاں یکزبان اور ایک دوسرے کی ہمنوا رہتی تھیں، انیسویں صدی کے اوائل میں جب شہر کے لوگوں پر رات کی چوکیداری اور گشت (عسس) کے لیے "پھاٹک بندی" کا ٹیکس لگایا گیا تو کلکٹر سائن کو نورباف برادری کی یکجائی اور "ہمزبانی" کا انوکھا تجربہ ہوا، برادری کے چودھری یا مہتو دوست محمد اور فتح محمد کا جن کی برادری یا پنچایت پر اثر تھا اس کے بارے میں حکام بالا کو ہر معاملہ میں رپورٹیں بھیجی جاتی تھیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے محلے کے سردار تھے، انہیں کے نام پر "مجلس" جمع ہوتی تھی اور انہیں کی صدارت ہوتی تھی [1] بنارس کے محلہ کتھبہ کے سردار بابا اللہ یک معزز اور با اثر چودھری (مہتو) تھے، اس خاندان میں سرداری موروثی تھی۔ [2]

پنچایت کا رواج بعض مقاموں میں برادری کی پسماندگی اور جمعیتی شعور کے فقدان کے سبب سے نہ تھا بلکہ گورکھپور، بستی، مئو، پٹنہ، الٰہ آباد، غازی پور، رحمان پور، مرزا آباد، ناگپور، مالیگاؤں، برہانپور، بھیونڈی، بمبئی، ضلع پورنیہ، نگینہ (ضلع گیا)، ہزاری باغ، میمن سنگھ (صوبہ بہار و اڑیسہ)، بھاگلپور، آسنسول، بردوان، دیناج پور، مٹیا برج (بنگال)، دارجلنگ، چٹاگانگ، خاندیس میں جلگاؤں اور دھولیہ میں برادری کے تمام معاملات اور تنازعات کا فیصلہ وہاں کی پنچایتیں کرتی تھیں۔ جو بڑی منظم اور شعور و درو رکھتی تھیں۔

بعض قصبوں میں جہاں برادری مختلف اضلاع سے انتقال مکانی یا ہجرت کر کے آباد ہوئی تھی وہاں کی پنچایت یا جماعت اپنے وطن کی نسبت سے مشہور تھی مثلاً پھولپوری جماعت (پھولپور اعظم گڈھ، پھولپور الٰہ آباد) بھدوہی، مئوی، مبارک پوری وغیرہ۔ بانس ضلع رائے بریلی میں باہمی تنازعات طے کرنے کے لیے بارہ محلوں کی الگ الگ بارہ پنچایتیں قائم تھیں، ہر محلہ کا سردار ہوتا تھا جو معمولی تنازعات اور مقامی معاملات طے کرتا تھا لیکن اہم معاملات پر بارہ محلوں کے سردار مل کر باہم صلاح و مشورہ اور فیصلہ کرتے تھے۔ [3]

---

[1] گزیٹیر بنارس، ص ۱۴۳، اور تذکرۂ علمائے بنارس ص ۱۹

[2] تاریخ مومن انصار۔ ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان دانا پوری۔ ج ۲۔ ص ۳۲

بعض سردار بڑے حکام رس ہوتے تھے اور ان کے اثر و رسوخ کے سبب حکام بالا بھی ان کا بڑا احترام اور لحاظ کرتے تھے لیکن اپنے محلہ یا قصبہ کے ہر ناگوار حادثہ کے لیے یہی جوابدہ بھی ہوتے تھے۔

ناگپور اور کامٹی میں انصاری مہاجرین جو اعظم گڑھ اور مئو سے آکر آباد ہو گئے تھے اپنے ساتھ اپنے وطن کی روایات لائے تھے اور کچھ خاندانوں میں سرداری کا موروثی منصب جاری رہا یہاں سردار کو سرپنچ بھی کہتے تھے کامٹی کے چند سردار خاندان یہ تھے: محمد عبداللہ جو غدر کے دور میں مئو سے آئے تھے اپنے محلے کے سرپنچ رہے، انصار برادری میں محمد عظیم اللہ سردار اعظم گڈھ کے تھے ان کے بعد ان کے نساجزادے محمد اسمٰعیل اس عہدے پر فائز رہے، مئو کا ایک اور خاندان جس میں سرداری کا عہدہ موروثی بن گیا تھا محمد عباد اللہ کا تھا ان کے چار بیٹوں میں سے حاجی عبد الرحمٰن سردار (م ۱۹۲۸ء) اور محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ مومن برادری کے سردار تھے۔ محمد یعقوب سردار کا شمار عمائدین شہر میں ہوتا تھا، یہ بڑے علم دوست اور مہمان نواز تھے۔ کامٹی کی ممتاز شخصیتوں میں حافظ محمد داؤد (م ۱۹۳۵) بھی شامل تھے یہ مومن برادری کے سردار اور شہر کی معزز ہستیوں میں شمار ہوتے تھے اپنے وقت کے ذی علم اور صاحب بصیرت بزرگ تھے، حلیم الطبع اور مہمان نواز تھے اور بے لوث اور با اخلاق سردار تھے، علمی و دینی امور سے بڑی دلچسپی تھی، کامٹی کی قدیم درسگاہ سراج المومنین کے بانیوں میں تھے۔[1]

ناگپور میں پنچایت کی دو عدالتیں دو سرداروں کے ماتحت قائم تھیں، معمولی معاملات پنچ کے سرداروں کے ذریعے سے طے پاتے تھے، اور بڑے اہم معاملات جن کا تعلق ساری برادری سے ہوتا تھا "چوراسی جماعت" یعنی "کل جماعت" یں سارے مومن افراد کے مجمع میں یا مجلس میں طے پاتے تھے۔[2]

برہانپور اور مالیگاؤں کے سردار خاندانوں کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے، ان دونوں شہروں میں جہاں برادری کثیر تعداد میں آباد تھی مئو اور مبارکپور کے انصاری خاندان تھے، مالیگاؤں میں سرداروں کے بہت سارے خاندان آباد تھے جنگ آزادی کے سرباختہ مجاہدین میں محمد شفیع میکو سردار، عبد الرحمٰن جنگو سردار بھی تھے، مالیگاؤں کی جامع مسجد کے بانیوں میں چند سرداروں کے نام ملتے ہیں، حاجی قیام سردار (م ۱۳۲۳ھ)، وزیر سردار (م ۱۹۱۰ء)

---

[1] ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل۔ کامٹی کی ادبی تاریخ، بزم غالب کامٹی ضلع ناگپور (۱۹۸۲)، ص ۲۴، ۹۰، ۱۵۰، ۱۵۲

[2] تاریخ مومن۔ انصار ج ۲ ص ۵۳

منشی محمد عبد الغفور سردار اور ان کے والد ماجد بدھو سردار (م ۱۳۲۹ھ)۔ تاریخ مومن۔ انصار میں یہاں کی برادری کی مختلف جماعتوں کے بارے میں لکھا ہے:[1]

"انصار مالیگاؤں کی زندگی کا یہ پہلا دور بالکل سادگی پر مبنی اور باہمی نزاع و مناقشات سے قطعاً پاک تھا، وطنی اضلاع کے لحاظ سے یہ متعدد جماعتوں میں منقسم تھے، ہر جماعت کا ایک جُدا سردار ہوتا تھا جو بہر صورت سربرآوردہ اور ممتاز شمار کیا جاتا تھا۔ تمام معاملات و امورات اسی کی رائے پر فیصل ہوتے تھے کوئی فرد اس کے احکام کی خلاف ورزی کا مجاز نہ تھا....."[1]

بمبئی کی برادری کے سردار

بمبئی میں ۱۸۵۷ء کے بعد برادری کی مختلف جماعتیں اپنے وطنی شہروں یا اضلاع کی طرف منسوب تھیں جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، ان میں پھولپوری، مئوی، مبارک پوری وغیرہ نام سے ممتاز تھیں جب کہ دیگر جماعتیں اس طرح صرف اپنے شہر کی نسبت کی طرف اشارہ کرتی تھیں، سو برس پرانی ایک دستاویز میں مندرجہ ذیل جماعتوں اور ان کے سرداروں کے نام ملتے ہیں۔

کُل جماعت پھولپور	: محمد حسن سردار
اہل جماعت مئوناتھ بھنجن	: سردار نور محمد
" " مئو قاضی طیب	: سردار عبد الستار اور سردار عبد الرحمٰن
" " بھدوہی	: سردار عبد اللہ زیانی اور سردار ولی محمد
" " مرادآباد	: سردار حاجی بخش
" " غازی پور	: سردار عبد الغفور
" " بہادر گنج	: مرتی سردار
" " نظام آباد	: سردار عطاء
" " بنارس	: سردار منشی اسماعیل

---

[1] تاریخ مومن۔ انصار ج ۲، ص ۲۴۰

اپنی چھوٹی جماعتیں ہیں مثلاً اعظم گڈھی، بنارسی، جہانگنجی، خیرآبادی، سگری جہاراج گنجی، ولید پور بھیرائی، لکھنوی، محمود آبادی، مبارکپوری اور جونپوری مگر یہ جماعتیں انیسویں[19] صدی کے بعد ظہور میں آئیں ورنہ غدر کے ہنگاموں نے جن اضلاع کی برادریوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ الہ آباد، جونپور اور اعظم گڈھ کی تھیں۔

پیر محمد سردار

ان تمام اولین جماعتوں میں پھولپوری جماعت سب سے زیادہ مضبوط، متمول اور با اثر تھی، اس جماعت کے سردار پیر محمد ولد عبدالشکور سردار تھے جو بڑے متمول اور مخیر تھے۔ آپ الہ آباد اپنے آبائی وطن میں ۱۸۲۳ء میں پیدا ہوئے اور غدر کے شورش خیز زمانے میں اپنے قصبے کے دیگر خاندانوں کے ساتھ بھیونڈی آئے ان کے ساتھ حاجی لعل محمد (دادو حاجی) سیٹھ بھی مع اہل و عیال ہجرت کر کے آئے، دونوں ہم وطنوں نے اپنا آبائی پیشہ بُننے تنے کا بڑی تندہی سے شروع کیا مقامی واجہ بنکر جو مال بناتے تھے یہ انہیں کے خطوط پر اپنے ہنر و فن کا مظاہرہ کرنے لگے، نیک اور مخلص لوگ تھے، خیرالرازقین نے بڑی برکت عطا فرمائی، بڑی ترقی حاصل کی اور بہت جلد دونوں صاحبان نے قصبہ کے علاوہ دور دور تک اپنی دھاک بٹھا دی، پیر محمد سردار نے برادری کے لئے خصوصاً اور عام مسلمان جماعتوں کے لیے جو فلاح و بہبود کے کارنامے سرانجام دیے ان کے صلے میں انگریزی حکومت نے آپ کو ایک تلوار انعام میں دی اور اسی تقریب میں آپ کی دستار بندی بھی ہوئی،

برادری کے افراد کے باہمی تنازعات اور مابہ النزاع مسائل سب سے پہلے پیر محمد سردار کے سامنے پیش کئے جاتے، قانونی چارہ جوئی کی نوبت آتی تو عدالت سے رجوع کرنا پڑتا، پنچایت کے صحیح فیصلوں کو عدالت بھی تسلیم کرتی تھی، محرم کے زمانے میں بوہرہ مسجد کے پاس ایک چواڑی نے جب ڈھول بجانے پر اعتراض کیا اور گرماگرمی ہوئی اور نقض امن کا خطرہ درپیش ہوا تو پیر محمد سردار نے اس کا سماجی بائیکاٹ کروا دیا، چواڑی کا جب [illegible] بند ہوگیا تو اس نے خوشامد کی گھوریاں پیش کر کے معافی مانگ لی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیر محمد سردار کا اثر نہ صرف اپنی برادری پر تھا بلکہ قصبہ کے سارے مسلمان بھی ان کا پاس کرتے تھے۔ پیر محمد سردار کے دو صاحبزادے تھے عبدالرحمٰن سردار اور عبدالحق سردار۔ پیر محمد سردار کی وفات ستر سال کی عمر میں ۱۸۹۳ء میں

ہوئی۔ ان کی بیوہ مدتوں تک چرخہ چلا کر گذارہ کرتی رہیں۔ ہم محلے والے انہیں "آپا" کہتے تھے۔ پیر محمد سردار کے معاصرین میں سے یہ ممتاز اور متمول ہستیاں تھیں: صابدین میاںجی، دار سردار حسین بن بڑی، حاجی لالا، فقیر محمد میاںجی الٰہی بخش اور بکس سردار۔[1]

محمد یونس ولد سبحان سردار

محمد یونس سردار پیر محمد سردار کے رشتہ دار تھے، ان کی پیدائش ۱۸۶۵ء میں بھیونڈی میں ہوئی، پیر محمد سردار کے بعد بھوئیواڑی جماعت کی سرداری کے منصب پر برادری کی اتفاق رائے سے فائز ہوئے۔ انصاف پسندی سے ہمیشہ کام لیا اس کی زد میں چاہے ان کا قریبی عزیز کیوں نہ رہا ہو، یہاں تک کہ اپنے بڑے صاحبزادے اکبر سردار مرحوم کو بھی نہیں بخشا اور ایک معاملے میں اس کے خلاف فیصلہ دیا، بڑے رعب وادب کے مالک تھے، ہم نے ان کا زمانہ دیکھا ہے جب وہ اپنے یک منزلہ مکان کے اونچے چبوترہ پر آ کر بیٹھ جاتے تو کھیلتے ہوئے سب دبک جاتے کیونکہ اس وقت ان کے تیور سے یہ عیاں ہو جاتا تھا ع بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے، ان کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہوا چار صاحبزادے پیچھے چھوڑے، اکبر سردار، محمد امین سردار، صابر (ٹُلّا) سردار اور سکندر سردار جو سکندر انصاری کے نام سے مشہور ہیں اور بحمداللہ بقید حیات ہیں یہی آخری یادگار ہیں۔ ان میں سے کسی کے حق میں سرداری نہیں آئی۔

حاجی عبدالرحمٰن سردار

بھیوپور جماعت کے اس سردار خاندان کی سماجی خدمات کی شاندار روایات کو حاجی عبدالرحمٰن ولد پیر محمد سردار نے دم مرگ د[illegible] ۱۹[illegible]ء زندہ اور برقرار رکھا، ان کے بارے میں "مصنف" راقم متکلم ہیں کہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس میں ذاتی تاثرات اور تجربات کو دخل ہے، یوں تو بھیونڈی کا بچہ بچہ عبدالرحمٰن سردار کے بارے میں مجھ سے زیادہ ہی جانتا ہے، برادری کے یہ آخری سردار تھے جن کی بے لوث خدمات اور سماجی کارناموں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا لیکن

---

[1] دیکھیے ذخیرۂ عاقبت یعنی توشۂ آخرت۔ محمد حسن سردار صاحب و منشی پیر محمد دگل جماعت بھوئیواڑہ بمبئی ۱۳۲[illegible]ھ

افسوس کہ دولت مند خود اپنی یادگاریں جیتے جی بنا کر چھوڑ جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو خاموشی سے برسوں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتے تھے ان کے نام کا قصیدہ تو در کی بات ہے مرثیہ پڑھنے والا بھی نہیں ملتا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ برادری میں شادی بیاہ کی مروجہ رسومات اور خرافات کا خاتمہ ہے، عبدالرحمٰن سردار نے پنچایت کے اصول و ضوابط کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور "پنچ" کا حق" اور "حقدار کا حق" دلانے کے لیے، انصاف سے دریغ نہیں کیا، وہ کئی سماجی اور تعلیمی اداروں سے منسلک تھے اور ان کا شمار عمائدین و اکابرین شہر میں ہوتا تھا۔

عبدالرحمٰن سردار کی شخصیت بڑی بااثر تھی حُکام بھی ان کے دبدبے اور رُسوخ کا اعتراف کرتے تھے،

ہم انہیں "ماں چاچا" کہتے تھے، اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں جب میں بصیرت کی آنکھوں سے ان کی شخصیت کی پرچھائیوں کو دیکھتا ہوں تو وہ مجھے اُجالوں کا ایک سفر نظر آتے ہیں، دیندار شخص تھے اور نماز کی تلقین ہمیں بھی دیتے تھے یہ اس پُر آشوب عہد کی بات ہے جب "آتش جوان تھا" اور تازہ وارد ہوئے انگلستان" ہوا تھا ساتھ میں ایک ڈگری اور بے دینی کی چار سالہ زندگی میں کیے ہوئے گناہوں کی پوٹلی لے کر آیا تھا۔

اس سفر انگلستان (۱۹۵۴ء) کے موقع پر جب میں نے اپنی بے بضاعتی اور "تلیس زدہ" کا ذکر ماں چاچا سے کیا تو وہ عجب مخمصے میں پڑ گئے بھلا لندن جا کر انگریزی پڑھنے والے کی مالی اعانت کی کس میں استطاعت تھی۔

ویسے بھی اس زمانے میں میری بے دینی مشہور تھی اور جب میں نے کالے پانی مومن پورہ، کے ترقی پسندوں کے ایک الوداعی جلسے میں بزرگوں کی نصیحتوں کے جواب میں یہ شعر پڑھا:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے !

— تو بزرگانِ دین نے یہ آیت پڑھ کر میرے مستقبل کا فاتحہ پڑھ دیا: "خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ" "خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔"
تعجب تو اس پر ہوا کہ سیاسی مصلحت کے پیشِ نظر شہر کے سربرآوردہ رؤسا انگریز حکام کی مدارت پر ہزاروں خرچ کر ڈالتے تھے، جب ماں چاچا مجھے الوداع اور خدا حافظ کہنے آئے تو چپکے سے میری جیب میں دس دس کے دو نوٹ ڈال دیے، میری آنکھیں جو پہلے ہی رو رہی تھیں اور بھیگ گئیں میں جانتا تھا کہ ان بیس روپوں کے پیچھے ان کے دردمند دل کا کرب چھپا ہوا تھا اور یہ شدید احساس بھی تھا کہ وہ خود تنگدست تھے ورنہ اپنی برادری اور محلے کے سب سے پہلے لندن اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے والے نوجوان کی وہ مدد کرتے۔ ماں چاچا کی اس بے لوث شفقت کا صلہ اور اجر تو اللہ تعالیٰ جو کسی کے حسنِ عمل کو ضائع نہیں کرتا ضرور دیگا لیکن میرے حق میں ان بیس روپوں کی واجب الادائیگی کا طریقہ ان کے حق میں بیس ہزار مرتبہ دعائے مغفرت کے سوا اور کیا ہے؟

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَعَافِہٖ وَاعْفُ عَنْہُ: "اے اللہ اس کی مغفرت فرما اور اس پر رحم فرما اور اس کو عافیت دے اور بخش دے"

عبدالرحمٰن سردار نے برادری کی تاریخ کے کئی دور دیکھے تھے، انکی کتاب یادداشت میں جنگ و زیادت کی سرخیاں بھی تھیں، ہجرت کے دورِ ابتلا کی جانسوز حکایتیں بھی ملتی ہیں، برادری کے ادبار و نکبت کا دھندلا دھندلا نوشتۂ دیوار بھی محفوظ ہے اور پھر اخیر عمر میں انہوں نے برادری کے عروج کا وہ زمانہ دیکھا جب وسعتِ قلب اور وضعداری کے تانے بانے ٹوٹنے لگے تھے، باہمی محبت، قرابت داری اور رشتہ داری کے تعلقات پر ذاتی مفاد اور لوٹ کھسوٹ اور حق تلفی کی قینچیاں چلنے لگی تھیں اور رکھ رکھاؤ [illegible] کی سطح پر دوڑتے نظر آتے کبھی کبھار کسی "حقدار" کے سینے میں گھس جاتا تھا۔ گرچہ سر پر چھاپا پڑنے کے ساتھ ساتھ دلوں پر بھی حسد، رقابت اور عناد کی چھاپ پڑنے لگی تھی۔

عبداللطیف سردار ناخواندہ تھے لیکن حال کی تحریریں اور مستقبل کی لوح پر لکھی ہوئی دھندلی عبارتیں پڑھ لیتے تھے، انہیں اس بات کا شدید احساس ہو چکا تھا کہ برادری کی خوشحالی اس سے دنیاوی نعمتوں کا تعاقب کرا رہی ہے اور یہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی قوم آخرت

کو پیچھے چھوڑے جارہی ہے۔ کرنسی نوٹوں کی رنگین پتنگیں لوٹنے والوں کے ہاتھوں سے آخرت کی ڈور چھوٹتی جارہی ہے — اخیر عمر میں جب بھی وہ مجھے ملے ان کی گفتگو کی مایوسیت سے میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں اور تلخ تجربات کے ہچکولوں سے اندر ہی اندر ٹوٹ چکے ہیں، انہیں اس حقیقت کا شدید احساس ہو چکا تھا کہ اب ہر شخص صرف اپنی ذات میں زندہ رہنا چاہتا ہے اور اپنے ذاتی مفاد کے دائرے میں کم سے کم افراد کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، عائلی زندگی کے اتحاد، سالمیت اور انجماد کے تار و پود بکھر گئے تھے، بھرے پرے گھرانے تقسیم، ترکہ اور جائیدادی تنازعات کی کدال سے ٹوٹ ٹوٹ کر گھروندے بنتے جا رہے تھے — اور ان کا گھرانہ خود — کئی گھروندوں میں تقسیم ہو گیا، جب خود برادری کے سردار گھرانوں کا یہ عالم تھا تو پھر بھلا برادری کس سے انصاف کی طلبگار رہتی؟

عبدالرحمٰن سردار کے تین صاحبزادے ہیں: عثمان عبدالرحمٰن سردار، محمد یسین عبدالرحمٰن سردار اور حاجی محمد صدیق عبدالرحمٰن سردار — لیکن ان میں سے کوئی سردار بننے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، صرف اس بات کے اہل تھے کہ اپنے ناموں کے آگے "سردار" لکھ لیں، انہیں کے رشتہ دار حسن سردار بھی ہیں، جنہوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے۔

ان کے علاوہ ہر محلے میں ایک سردار ہوتا تھا جو اپنے محلے کے ہنگامی مسائل اور معاملات کو حل اور طے کرتا تھا، قیصر باغ (تھانہ روڈ) میں کریم بخش سردار اور ان کے بعد طیب سردار، واجہ محلے میں یعقوب سردار (والد منشی آفاق ایاس) — ایسی ہی ذمہ داریاں نبھاتے تھے۔

بھیمڑی میں دوسری ممتاز اور نمایاں جماعت بھدرہی کے مومنوں کی تھی، ان کے پہلے سردار محمد ابن نامو حافظ تھے، حافظ جی بھی ۱۸۵۷ء کے قافلۂ مہاجرین انصار کے ساتھ آئے تھے ان کے ساتھ جونپور کے سنگرامو، اور بنارس کے بھی خاندان تھے، یہ مہاجرین پھولپوری جماعت کی بستی سے بہت دور درگاہ دیوان شاہ کے اطراف و اکناف میں بس گئے تھے، یہیں ۱۸۹۰ء میں محمد سردار پیدا ہوئے۔

نامو حافظ کے فرزند محمد بھدرہی جماعت کے سردار تھے، عہد برطانیہ کے زمانے سے لے کر مسلسل ۴۶ سال تک یہ منتخب ہو کر بلدیہ کے رکن رہے اور جب ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء کو جاں بحق ہوئے تو بھیمڑی نظام پور بلدیہ اپنے ایک فعال رکن سے محروم ہو گیا، ان کے دو صاحبزادے تھے محمد یوسف سردار جو عالم شباب میں اللہ کو پیارے ہو گئے، دوسرے جامزگ (۵ اپریل

کسقدر اسلامی چرچا اسلامی خدمت کا شوق و جوش و اسلامی تعلیم ان میں پائی جاتی ہے۔۔۔۔"[1]

مولانا عبدالسلام مبارک پوری تاریخ المنوال والبلہ میں خود اپنی برادری کی تعریف میں بجا طور پر رطب اللسان ہیں اور ایک حدیث شریف المومن غر کریم کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں کہ شیخ مومن سیدھا سادہ دھوکا کھانیوالا ہوتا ہے اور بخشش کرنے والا سادہ مزاج ہوتا ہے اور اس کی سادہ مزاجی اور سادہ لوحی کے سیکڑوں افسانے بنائے گئے ہیں۔ ان کی بخشش کا کیا پوچھنا۔ زکوٰۃ اور فطرہ بہ پابندی سے دیتے ہیں۔[2]

حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد اور فرض کفایہ کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ میت جب غریب کی ہو، تو انگر کی ایک جم غفیر امڈ آتا ہے ان کی بستیوں میں رہنے والے اہل تشیع (اسمٰعیلی اور بوہرے) اس عمل سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ نقل مکانی سے محترز رہتے ہیں۔ زندوں کی خوت پر رشک، میت کے جنازے پر رشک۔ گرے پڑے وقتوں میں یہی انصاری اور مومن حضرت ہی کام آتے ہیں، مبارک پور، کامٹی، برہانپور اور بھیونڈی اس قسم کے شاہد ہوتے ہیں۔ "مالیگاؤں جیسی موت مٹی کہیں نہیں ہوتی خواہ وہ میت غریب ہو یا دولتمند اس تجہیز و تکفین میں صدہا لوگ جلد آکر شریک ہوجاتے ہیں"۔[3]

سیاسی تحریکوں میں مومن مجاہدین کے شاندار کارنامے تاریخ کو یاد ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں اجودھیا اور مہوان گڑھی کے جہادوں میں، چائل (الہ آباد) اور عظیم آباد پٹنہ کے مقدموں میں مومن۔ انصاری یا شیخ نوربافان ہی کی تعداد سب سے زیادہ تھی، تحریک خلافت ترک موالات اور عدم تعاون کے دور سے لے کر تقسیم ہند کے پر آشوب زمانے تک یہی بلاے جان فگن بنے رہے دار و گیر کے سلسلے سے زنداں کے سلاسل تک پہنچے، ہندستان کے کونے کونے تک میں انصاری مجاہدین کے نعرے گونجتے رہے۔ اجودھیا، اٹاوہ، الہ آباد، مراد آباد بنارس، بلیا، چمپارن، چھپرا، چھوٹا ناگپور، بھاگلپور، راوڑکیلا، رانچی، مظفرپور اور مالیگاؤں تک جنگ آزادی کے محاذوں پر جلاہوں کی سرفروشیوں کا بازار گرم رہا۔

---

[1] مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ کتاب المنوال والبلہ حصہ ۲ ص ۳۳

[2] ایضاً حصہ اول ص ۱۱

[3] تاریخ شہر مالیگاؤں المعروف تذکرۂ مجید ص ۹۱

ان کا جذبۂ دین دیکھ کر انگریز بھی مرعوب ہو جاتے اور متعصب جلاہا کہہ کر خود اپنے تعصب اور
عصبیت کا اظہار کرتے۔

"ہندستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک دیکھو تو ان حضرات شیخ نوربافان کا
تدیُّن دینداری یکساں نظر آئیگا، خواہ بنگال ہو یا پنجاب پشاور ہو یا راجپوتانہ، ملک متوسط
ہو یا ممالک مغربی و شمالی، ریاست دکھن ہو یا دوسری ریاست، خدا نے ان کو اپنے دین
کا ناصر بنایا ہے۔ لاکھوں مسجدیں ان کی بنائی ہوئی ہیں، تمام جگہ امام ان کا، واعظ ان کا
فقیہ ان کا، مدرس ان کا، مزکی۔ محقق ان کا، سردار ان کا، جامع مسجدیں ان کی،
خطیب ان کا، مدرسے ان کے، علمائے واردین صادرین [الخ] کی خدمت ان کے
دم سے کی جاتی ہے۔ نحن انصار اللہ، ہم دین خدا کے مددگار ہیں[1]"

برادری کی روایات اتنی مختلف النوع اور قومی کردار اتنا پہلودار ہے کہ ع "کرشمہ دامن دل
می کشد کہ جا اینجاست" کا معاملہ درمیان میں ہے۔ دینی روایات کا جائزہ لیجیے تو ہمارے لیے
یہ فخر و مباہات کی بات ہے کہ جتنے حفاظ کرام ہماری برادری میں پیدا ہوئے اور آج بھی موجود
ہیں اتنی تعداد شاید ہی کسی اور جماعت میں ملیگی، اہل تشیع میں تو سرے سے حفظِ قرآن کی کوئی
روایت ہی موجود نہیں۔ پانی پت فن قرأت کے ماہرین کا گہوارہ تھا، یہاں کے انصاریوں میں حفاظ
کی ایک بہت بڑی جماعت تھی، اسی طرح ٹانڈہ میں بھی بے گنتی حفاظ موجود تھے، حجاج کرام
بے شمار ہیں، اور شاید ہی کوئی قوم ہے جو حج ادا کرنے میں مشہور ہیں، اتنی کثرت نہ ہوگی۔ حج بیت اللہ
سے مشرف ہونے اور اس فرض کی ادائیگی کی روایت برسوں سے برادری میں چلی آرہی ہے۔ بمبئی
گزیٹیر (سنی مسلمان) کے بیان کے مطابق جب بھیونڈی میں غدر کے بعد مومن ہجرت کر کے آئے تو انہوں
نے یہی بتایا کہ دراصل وہ حج کی نیت سے ہجرت کر کے آئے ہیں، اور جب بھیونڈی میں انہوں نے
ساڑیوں کی تجارت کی گرم بازاری دیکھی تو وہیں رک گئے کیونکہ ان کا زادِ راہ ختم ہو چکا تھا اور کچھ
[illegible] کی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر چکے تھے — اور ان میں سے جو صاحب استطاعت

---

[1] تاریخ مومن انصار ج ۲ صفحہ ... ورق ۵۶۔ اور دیکھیے تذکرہ نقش پانی پتی، مظفر ابتوہر، اردو مخطوطہ
کتب خانہ جامع مسجد بمبئی

ہو گئے' انہوں نے اپنی نیت پوری کی۔ [1] ان کے علاوہ کچھ فنی یا تکنیکی اور صنعتی و تجارتی روایات بھی برادری کی قومی شناخت کی خد و خال بن گئی ہیں' ان کا بیان آگے آرہا ہے۔

شادی بیاہ کی روایات

اگوا:

برادری میں 'اگوا' — اگوائی کرنے والے بزرگ حضرات کا وجود ہر جگہ ملیگا۔ شادی بیاہ کی بات چیت بغیر ان بزرگوں کے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی' یہ ایک بڑی اہم سماجی خدمت ہے' دسلام و پیام' تو عشق و محبت کی روایت تھی جب دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی تو کسی بڑی بوڑھی یا پیشہ ور نائکہ کو ہمراز بنایا لیجاتا' ایسی معیوب باتوں کا برادری کے ذمہ دار حضرات سخت مذمت کرتے۔

وسطی ہند میں شادی کے رشتے کے لئے چند محلہ کی ثقہ خواتین بعد نماز جمعہ لڑکی یا لڑکے کے گھر آنا جانا شروع کردیتے اور پھر اگوا پیغام لے کر جاتے' اگر 'ہامی' بھرلی جاتی تو بات آگے بڑھتی بصورت انکار پیامبروں سے کہہ دیا جاتا "گھر میں صلاح نہیں ہے" پھر بڑے رسان سے دلجوئی کے لئے کہا جاتا "گھر آپ کا ہے' آنا جانا رکھئے" [2]

اگوا منگنی سے لے کر بیاہ اور گونا یا رخصتی تک' 'پیرا پھیری' کرتے' ان کی بڑی خاطر تواضع ہوتی تھی' جہیز پہنچانے اور سامان کے اندراج وغیرہ کی ساری ذمہ داریاں انہیں کے سر ہوتیں۔ تہواروں پر دونوں گھرانوں سے نو بیاہتا جوڑے کے لئے 'عیدی' انہیں کے ہاتھ بھیجی جاتی۔ بعض اگوا پیشہ ور اور بعض خاندانی ہوتے تھے۔

برادری کے قومی کردار کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ جب شادی کے موقع پر جماعت بیٹھتی ہے تو لڑکی اور لڑکے والے پنچ سے تعاون کی درخواست کرتے ہوئے بڑی خود سپردگی' انکساری اور سادہ لوحی سے کہتے ہیں "اوپر اللہ اور نیچے پنچ اب آپ ہی لوگ بیڑا پار لگائینگے" ایک

---

[1] صوبہ بمبئی گزیٹیر۔ ضلع تھانہ' حصہ ۱۳ نمبر دہم۔ جز اول ۱ ۔ ۲۲۵

[2] انصار سو دنیر اندور ۱۹۸۵ء مدیر محمود نشتری' معاون محمد الیاس انصاری' مضمون "اندور انصار برادری کے رسم و رواج اور طریقہ شادی" از چودھری بدرالدین انصاری

اور روایت ہے کہ محلہ کے سارے نوجوان "ہاتھ بٹ" لگاتے ہیں۔ اب ان کی تنظیمیں بن گئی ہیں۔

برادری کی صنعتی اور تجارتی روایات

امداد باہمی کے اصولوں اور اشتراک تعاون کی بنیادوں پر برادری نے ہر شہر اور قصبہ میں کوآپریٹیو سوسائٹی یا امداد باہمی کے ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ مومن کانفرنس کی تحریک تعلیم و اخلاق کے ساتھ اصلاح معاشرت اور اقتصادی حالت کی بہتری کے خطوط پر قائم تھی۔ برادری کو مفید صنعت و تجارت کی طرف راغب کرنا اور موجودہ صنعت پارچہ بافی کو فنی حیثیت سے ترقی دینا اور اسکا جماعتی دائرہ عمل قبیلہ نوربافان تک محدود رکھنا مومن کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے اہم نکات تھے ان ہی نکات سے امداد باہمی کے تصورات نے جنم لیا۔

کرگھا بننے والوں کی زبوں حالی آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ناقابل بیان تھی، سوت پر کنٹرول، موٹا سوت کی فراہمی۔ گرانی۔ لاگت کی زیادتی اور قیمت فروخت کم اور جب سے پاور لوم مشینوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو کرگھا کی صنعت کے سارے تار و پود ٹوٹنے لگے تھے، ہینڈلوم کی صنعت کو سنبھالا دینے کے لئے حکومت امداد دینے کا اعلان کرتی تھی لیکن اعلان سے امکان تک سارے خراب بکھر جاتے تھے۔ کپڑوں کی خرید و فروخت کا باقاعدہ کوئی انتظام نہیں تھا اور اس صنعت کی پیداوار سے زیادہ فائدہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کو پہنچتا تھا جو کم سے کم قیمت پر کپڑا خریدتے تھے اور زیادہ منافع حاصل کرتے تھے۔

کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم ہونے سے بہت پہلے مئو ناتھ بھنجن، مبارک پور اور کوپا گنج کے شیخ انصار نوربافان امداد باہمی اور اشتراک تعاون کی بنیادوں پر "تنہ" قائم کر چکے تھے۔

مبارک پور اور مئو میں "کوڑی" کا طریقہ قائم تھا ان دو مقاموں میں جس قدر روزانہ مال فروخت ہوتا تھا فی روپیہ تین پیسہ کوڑیاں نکالی جاتی تھیں اس سے مساجد کی مرمت وغیرہ کی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۲ء تک جاری قائم رہا جس سال کتاب المنوال دائمہ زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔

مئو میں برادری کی جماعتی تنظیم بڑے پیمانے پر اور چوراسی محلوں پر مشتمل تھی اسی لئے اسے

---

۱ مولانا مہر السلام - حصہ دوم صفحہ ۵۲-۵۳

"چوراسی" جماعت کہتے تھے۔ اس پنچایت میں ہر محلے سے ایک نمائندہ منتخب ہو کر آتا تھا، مقامی سواد خصوصی حیثیت رکھتا تھا۔ برادری کے باہمی مسائل اور معاملات کا تصفیہ کرنا۔ مشکلات کا حل ڈھونڈھنا اور مفادات کا تحفظ کرنا چوراسی کے دائرۂ عمل میں شامل تھا۔

برادری کی ایک جماعتی روایت "فنڈ" کا جمع کرنا تھا، مئو میں اس مالیاتی ادارہ کا نام "کوڑی فنڈ" تھا جو ہر فروخت شدہ ساڑی کی قیمت سے (اس زمانے میں) ایک کوڑی کے حساب سے جمع کیا جاتا تھا (یوں سمجھئے کہ فی روپیہ ایک پیسہ) اس کوڑی فنڈ میں تعداد کے لحاظ سے اہلحدیث ایک روپیہ میں چھ آنے کے اور احناف دس آنے کے حصہ دار ہوتے تھے۔ مئو کی برادری کی اس مفید تنظیم نے کوڑی کو کروڑوں میں بدل دیا "کوڑی بلڈنگ اسی کی یادگار ہے"۔[1]

کوپاگنج میں "مسلم فنڈ" کے نام سے ایک "مالیہ" قائم تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو سود کی لعنت سے بچانا تھا، اس مسلم فنڈ سے قصبہ اور قرب وجوار کے بنکروں کی مالی حالت میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کی بدولت ہینڈ لوم یا ہتھ کرگھا سے پیڈل لوم اور پاور لوم لگائے گئے۔

بھیونڈی میں مومن ویورس چیریٹی فنڈ ایک پرانا مالیاتی ادارہ تھا۔

کوآپریٹیو سوسائٹی کا تصور بہت پہلے جماعت کے رہنماؤں کے ذہن میں آ چکا تھا، صوبائی مومن کانفرنس یوپی (الٰہ آباد) نے پراونشیل ہینڈ لوم ویورس بورڈ کا منصوبہ بنایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ "کرگھا صنعت" یعنی دستی کرگھے پر جو پارچہ بافی ہوتی ہے اس کی تنظیم کرکے اسے ترقی کی راہوں پر لگایا جائے۔ سوت کی خرید و فروخت، بہتر ڈیزائن اور قسم کے کپڑے کی تیاری، بکری اور اسے بازاروں تک پہنچانے کا سامان پیدا کیا جائے۔[2] اس منصوبے سے بہار سے لے کر بمبئی تک کوآپریٹیو ویورس سوسائٹیوں کی ایک بہت بڑی تعداد قائم ہو گئی جو باہمی تعاون اور اشتراک بہبود کی بنیادوں اور جذبوں پر قائم رہا۔ برادری کی یہ صنعتی اور تجارتی روایت تھی۔

برادری کی ورزشی اور کسرتی روایات: کھیل کود کے میدان سے

پیشۂ آبا سپہ گری تو نہ تھا لیکن جہاد ذریعۂ عزت فزوں رہا، ہندوستان آئے تو فرصت کے

---

[1] تذکرہ مولانا محمد ناظم صاحب ص ۳۴

[2] خطبۂ صدارت فخر نصار ماسٹر ریاض الدین احمد بی اے ایل ایل بی الٰہ آباد صدر صوبائی مومن کانفرنس الٰہ آباد ۲۵۔۲۶ نومبر ۱۹۳۵ء

اوقات میں جائز تفریح اور کھیل میں بارِ خاطر کو ہلکا کرنے کے لیے اور تفریحِ طبع کے سامان پیدا کر کے قوت میں اضافہ کرنے لگے۔ دوڑ میں مقابلہ، پہلوانی، تیر اندازی، نیزہ بازی، شہسواری شکار اور شمشیر بازی جائز کھیل تھے۔

اسلامی حکومت میں عسکری نظام کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اسی سلسلے میں شہسواری، شمشیر بازی، نیزہ بازی، پیراکی اور پہلوانی جیسے ورزشی اور کسرتی کرتب اور مشق کی تعلیم دی جاتی تھی، رسول اکرمؐ فرماتے تھے "مومن تلوار سے نبرد آزمائی کرتا ہے اور زبان سے بھی لڑتا ہے۔" آنحضرتؐ ہر ہنر اور کرتب جانتے تھے، عرب کے ایک مشہور پہلوان رکانہ کو پچھاڑ دیا تھا، آپ نے دورانِ سفر میں حضرت عائشہؓ سے مذاقاً دوڑ بھی کی ہے اور صحابۂ کرام کو تعلیم[1] دینے کی غرض سے دوڑ میں مقابلہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن خطابؓ فرمایا کرتے تھے "اپنے بچوں کو پیراکی، تیر اندازی اور شہسواری سکھاؤ اور انہیں اچھے اشعار بھی سناؤ"۔ حضرت علیؓ اپنی جوانمردی اور شمشیر بازی کے سبب 'فتوت' کا مثالی تصور بن گئے تھے۔ عربی ضرب المثل "لا فتیٰ الا علی و لا سیف الا ذو الفقار" کی شاہیت اور تصوریت نے ایران میں 'فتیان' تحریک کی بنا ڈالی جو عہدِ وسطیٰ کے 'اسکاوٹس' تھے، ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کی 'شولری' یا "نظامِ فتوت" کو دراصل سلجوقی عہد کے جوانمردوں اور فداکاروں سے عرفان اور فیضان ملا تھا۔ ایران میں انہیں "عیار" بھی کہتے تھے لیکن فتیان و 'اخی' سے پاکیزہ اور متصوفانہ تصورات وابستہ تھے، یہ سارے حضرت علیؓ کے نام اور کام سے فیضان حاصل کرتے رہے۔ حضرت علیؓ بڑے ماہر پہلوان تھے، غزوۂ اُحُد کے آغاز میں مبارزتِ قریش کے مقابلے میں آپ نے مشرکین کے علمبردار طلحہ بن ابی طلحہ کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر دئیے تھے۔

ایران میں ورزش، زوری اور پہلوانی کو بڑی اہمیت حاصل تھی، وہاں عہدِ قدیم سے 'زور خانے یا اکھاڑے' موجود تھے۔ اس عہد میں ایران اور توران کی خانہ جنگیوں کے اٹوٹ سلسلے سے کئی رزمیہ داستانوں کی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں جن کے کردار زابلستان اور سیستان کے سورما اور پہلوان تھے، ان میں رُستم کا نام ہی رزمیہ ادب میں بہادری کی علامت بن چکا ہے۔

ایرانیوں کی قربت اور انصاریوں کی ایران میں قدیم سکونت کے سبب جمال ہمنشیں کا اثر

---

[1] مسند احمد بن حنبل اور سنن ابوداؤد

یہ ہوا کہ پنجاب میں ہر شہر اور قصبہ میں انصاری پہلوان دادِ شجاعت دیتے رہے۔ فن کشتی کے ماہرین اور شائقین ملتان، راولپنڈی، سیالکوٹ، لدھیانہ، گوجرانوالہ، منٹگمری، جھنگ، وزیرآباد جہلم، فیروزپور، جالندھر، پٹیالہ، لاہور، امرتسر، لائلپور اور گورداسپور کے ضلع میں بکثرت موجود تھے (سنہ ۱۹۳۰ء)[1] غرضیکہ پنجاب سے لے کر بنگال تک اور یوپی سے لے کر مغربی ہند تک برادری میں سینکڑوں پہلوان، سورما اور فن کشتی کے دلدادہ موجود تھے۔ امرتسر کے غلام پہلوان رستم ہند اور کلو پہلوان ولایت تک مشہور تھے۔

مبارک پور کے تاریخی قصبہ میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کے جدِ اعلیٰ حضرت شیخ علی[2] پہلوانی اور شہ زوری میں مشہورِ زمانہ تھے اور دور دور تک اس فن کے استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ آپ کا ایک اکھاڑہ قدم رسول محلہ پورہ رانی میں تھا آپ اس کے خلیفہ تھے، اسی برس کی عمر میں بھی وہ ایسے کشتی باز تھے کہ قوی اور جوان پہلوان بھی کشتی میں ان سے عہدہ برآ نہ ہوتے۔ ان کے شاگرد بھی نامی گرامی تھے اور اس درجے کے کہ ہندستانی ریاستوں میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ ان کے صدہا شاگردوں میں سے غوثی خلیفہ، حاجی خوشحال، دوست خلیفہ، وحد خلیفہ، دلی، عالم وغیرہ نے فن کشتی میں بڑا نام پیدا کیا تھا اور وہ ان کی پشت کو حالت کشتی میں کسی نے نہ لگایا اور نہ ان کے مقابلے میں کوئی جوان کھڑا ہوا۔ یہ روز کے اکھاڑے کے کشتی باز تھے۔ قصبہ میں پانچ اکھاڑے تھے مگر ان میں شیخ علی میاں جی کے قدم رسول کا اکھاڑا ہمیشہ سے سب پر بالا رہا۔ آپ کو پہلوانی اور اکھاڑہ کی رقابت میں شہید کر دیا گیا تھا۔

غدر کے ہنگامہ میں مئو کے مشہور پہلوان الٰہی بخش ایولہ (ضلع ناسک) میں آکر بس گئے، بیحد طاقتور اور جفاکش پہلوان تھے ایولہ سے پیدل مالیگاؤں تک آتے رہتے تھے (۱۲۰۶ھ)

تیمم اور اکھاڑا برادری کی ہر بستی میں تھا، وسطی ہند اور دکن میں بہمنی سلطنت کے زمانے میں ہر شہر اور ہر قصبہ میں ورزش گاہیں یا زورخانے قائم تھے، مبارزت عام تھی، احمد نظام شاہ بحری جو خود تلوار کا دھنی تھا انصاف کے طلبگاروں اور حقوق کے دعویداروں کو آپس میں مبارزت کا حکم دیتا تھا، اس روز عام منادی کر دی جاتی، ابن بطوطہ نے (چودھویں صدی) میں یہ منظر

---

[1] تاریخ مومن۔ انصار ج۔۱۔ ۱۹۰۹

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرہ علمائے مبارک پور،

دیکھا تھا جب "غالب کے اُڑیں گے پرزے" کی خبر پھیل جاتی تو تماشائیوں کے ٹھٹ لگ جاتے "کہ خوش تماشا ہے" عورتیں جو خود تماشا گاہِ عالم" تھیں بہر تماشا جمع ہو جاتیں۔ اس دو بدو شمشیر بازی میں جب کوئی سپاہی جان دے بیٹھتا تو عورتیں چلاتی ہوئی گھروں کو لوٹتیں "خان بھائی جیتے، ہم ہارے"۔ [۱]

اکھاڑے کے نگراں اور تعلیم دینے والے کو خلیفہ یا اُستاد کہتے تھے، پہلوانی یا فنِ کُشتی کے معلم کو خاص طور سے استاد کہتے تھے، اکھاڑے میں ورزش اور کرتب کے گُر سکھائے جاتے، تعلیم سے ملحق ایک مدرسہ بھی ہوتا تھا جس میں تزکیۂ روحانی اور تہذیبِ نفس کے درس دئے جاتے تھے۔ اکھاڑے محرم میں اٹھائے جاتے تھے۔ یہ ادارہ شیعی عقائد کا مظہر تھا۔ بہمنی سلطنت میں اس قسم کے چار اکھاڑے تھے جو اپنے موجد، بانی یا خلیفہ کی طرف منسوب تھے، ہر اکھاڑے کے روحانی خلیفہ حضرت علی رض تسلیم کئے جاتے تھے اور انہیں سے سارے صوفیانہ سلسلے بھی نکلے تھے، انہیں کے نام کے نعرے لگائے جاتے "ایک نعرہ حیدری — یا حسین!!"

اکھاڑے بیسویں صدی تک سارے مغربی ہند میں قائم ہو چکے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو باشندے بھی استفادہ کرتے تھے، کامٹی، برہانپور، مالیگاؤں، بھیونڈی اور بمبئی میں محرم کے عشرہ میں سارے مظاہرے ہوتے تھے اور اکھاڑے اٹھائے جاتے تھے۔

دارالسرور برہانپور میں برادری کے استادوں اور پہلوانوں نے کئی اکھاڑے اور زور خانے قائم کر رکھے تھے، ان میں شمشیر بازی، نیزہ بازی، پٹا بازی، بچھوا چلانا، لکڑی سے دفاع کرنا اور بنوٹ چلانا اور جارحانہ حملہ کرنے کے ہنر سکھلائے جاتے تھے۔ تارکینِ وطن نے برہانپور میں اپنی آبائی روایات کو زندہ رکھا۔ تقریباً ہر محلہ میں جہاں برادری آباد تھی ایک اکھاڑا ضرور قائم تھا۔

محلہ قلعہ میں استاد جان محمد جیوان کا اکھاڑا فنِ سپہ گری اور کُشتی کی تربیت کے لیے مشہور تھا۔ وہ استاد [illegible] تھے کانپور سے ترکِ وطن کر کے جبلپور چلے گئے، حالات کے تھپیڑوں نے برہانپور پہنچا دیا اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ فنِ سپہ گری میں بے نظیر تھے۔ محلہ حریر پورہ کی "حریر و پرنیاں کی لطافت انگیز فضا میں کرگھوں کے شور کے ساتھ داؤ

---

[۱] [illegible] صفحہ ۲۷۳

پیچ کی آوازیں رحمن استاد کے اکھاڑے سے گونجتی رہتی تھیں جہاں سے فنِ کشتی کے کئی استاد تربیت پاکر نکلے۔ رحمن استاد بنارس سے ترکِ وطن کرکے آئے تھے، دوسرا استاد کا اکھاڑا بھی حریرپورہ میں تھا۔ استاد سراج الحق کا اکھاڑا حیدری اور انصار برادری کے شیخ نتھو کے اکھاڑے کے استاد شیخ دلار تھے۔

کٹیا کلیان پور سے ہجرت کرکے محمد علی بکھیدن برہانپور آئے۔ اکھاڑا قائم کیا اور نامور شاگرد پیدا کیے۔

نیا محلہ استاد عبدالرحمن کے اکھاڑے کے لیے مشہور تھا۔ لال باغ میں رمضان استاد کے اکھاڑے پر بڑی بہار تھی۔ سوت پورہ (جھوپڑی پورہ) میں نصراللہ استاد اور اسحاق استاد کا طوطی بولتا تھا، شیث محمد پہلوان بھی یہیں تھے ان کا اکھاڑا فنِ سپہ گری میں مشہور تھا۔ اکبر استاد کا سو پشت سے پیشۂ آبا سپہ گری تھا محلہ سنوارہ کے شاگردوں کی ورزشی صدجیتوں کو انہوں نے ہی سنوارا۔ ایک مستان پہلوان بھی مشہور تھے ان کا اکھاڑا بھی خوب مشہور تھا۔

مالیگاؤں توران وایران کے رستم واسفندیار کی طرح پہلوانوں کا شہر تھا۔ خلافت تحریک میں کرم اللہ اکھاڑے کے پہلوان لوگ ہی مردانہ وار میدانِ جہاد میں اترے تھے۔ مالیگاؤں کے دو مشہور مجاہدینِ آزادی غفور اور شکور جو دونوں سگے بھائی تھے خلافتی فساد ۱۹۲۲ء کے موقع پر پکڑے گئے اور تختۂ دار پر چڑھائے گئے۔ یہاں برادری کے نوجوانوں میں پہلوانی کا بڑا شوق تھا۔

مالیگاؤں میں کئی اکھاڑے تھے۔ محرم میں جب تعزیے اٹھائے جاتے تو ساتھ میں پٹہ بازی کے اکھاڑے بھی رہتے۔ مولانا شاہ علی حسین کچھوچھوی کی خانقاہ کے قریب موہن پر منبود دھوبی نے محرم کے جلوس میں اپنے دونوں ہاتھوں میں پٹے لے کر کھیل شروع کیا، ایک پٹے سے اسے ایسا زخم لگا کہ وہ اسی جگہ مرگیا اور اسے وہیں دفن کردیا گیا۔ اس جگہ کو موہن پیر چوک کہنے لگے۔[۱]

مالیگاؤں میں اسلام پورہ میں ایک مسجد اکھاڑے کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ محرم کی گردش ۱۸۸۵ء کے اوائل سے شروع ہوئی اور جب نے تشددوں کو شہ دی اور اکھاڑے بھی اٹھنے لگے۔

بھیونڈی میں محرم کے دنوں میں اکھاڑے بڑی دھوم دھام سے اٹھائے جاتے، ورزش اور

---

[۱] تاریخ شہر مالیگاؤں، المعروف بہ فرحت مجید۔ ص۱۴

[۲] ایضاً ص۱۲

کرتب کے علاوہ پٹا بازی کے مظاہرے ہوتے تھے۔ مبارک پور اور الٰہ آباد کے پھولپوری خاندانوں میں پٹا بازی کی روایت چلی آ رہی تھی۔ بنگالی پورہ اور دواجہ محلہ میں نبو سیٹھ پٹا باز اور ملا چیتر بہت مشہور تھے۔

عشرۂ محرم میں اُستاد بیڑا کا اکھاڑا ہر محلہ کے نکڑ پر کرتب دکھانے کے لیے موجود رہتا، شاگردوں کی ٹولیاں اپنے لکڑی چلانے بنوٹ، پٹا بازی، گدکا (گتکا) کے فنون کا مظاہرہ کرتے۔

ایولہ میں متوالہ کا خاندان آباد تھا پہلوان الٰہی بخش بندوق والے بڑے مشہور تھے مالیگاؤں سے ایولہ پیدل آتے جاتے تھے۔

ممبئی میں، نیورہ کے علاقہ میں جھولا میدان میں مشہور سیاسی رہنما حاجی باب اللہ غازی نے ایک اکھاڑے کی بنیاد ڈالی تھی۔ فنِ کشتی کے علاوہ بنوٹ (لکڑی گھمانے) کے فن میں غازی صاحب بڑے ماہر تھے۔ خود بھی کسرتی بدن کے تھے۔ اس فن میں آپ کے متعدد شاگرد ہوئے، پاکستان کے کالا خاندان کے عظیم پہلوان، بسلین، گوگا اور بھولو پہلوان تقسیم ہند سے قبل جب کبھی ممبئی کشتی کے مقابلے کے لیے آتے تو آپ کے اکھاڑے میں ورزش کیا کرتے تھے اور غازی صاحب کا احترام ایک اُستاد کی حیثیت سے اور اجازت لے کر اکھاڑے میں اُترتے۔ آپ نے اپنے اس ذاتی اکھاڑے کو وائی ایم سی اے کی تحویل میں دے دیا۔

فٹ بال، کرکٹ اور دیگر کھیلوں کی روایات

انگریزی تعلیم حاصل کرنے والی پہلی نسل کے نوجوانوں میں مغربی تہذیب و ثقافت کی مرعوبیت کا اثر بڑی حد تک تھا ان کا تہذیبی رشتہ پرکھوں کی روایات اور قدامت پسندی سے یکسر ٹوٹ گیا تھا۔ پھر بھی جائز کھیلوں کے طور طریقے بھی بھولے نہ تھے، صحابۂ کرامؓ جیسے پاکیزہ نفوس ہنستے کھیلتے زندگی کی باتیں کرتے تھے ویسے ہی عبادات و واجبات کی ادائیگی کے بعد وہ ان ورزشی کھیلوں میں حصہ لیتے جو قوت میں اضافہ کا موجب ہے۔ نئی نسل اور پرکھوں کے درمیان بہرحال یک ذہنی و عملی نسبت ضرور رہی تھی۔ جو زندہ تھے وہ اکھاڑے میں اترجاتے، بنوٹ چلاتے، گتکا سیکھتے اور پٹا بازی کرتے جو اسکولوں میں پڑھتے تھے یا انگریزوں سے میل جول رکھتے تھے یا ان کی کمپنیوں میں ملازم تھے وہ ان کے مغربی کھیل فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال اور کرکٹ کھیلتے۔ یہ سارے انگریزوں کے دین تھے۔ اندور کے جعفر انصاری، ڈاکٹر عبدالحمید انصاری اور اسرار الحق شرتی بڑی مشہور کھلاڑی تھے۔

فٹ بال کے کھیل میں عالمگیر شہرت کامٹی ناگپور اور بمبئی کے کھلاڑیوں کو نصیب ہے جن پہ ملک و قوم دونوں کو ناز ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے کامٹی کے کھلاڑی فٹ بال میں اپنی مشاقی از مہارت کی روایت قائم کئے ہوئے ہیں۔ نورالاسلام فٹ بال کلب کا انگریزوں کی ٹیم سے مقابلہ ہوتا تھا۔ قمرالدین کپتان کی قیادت میں فتح کا سہرا نورالاسلام کلب کے سر رہتا۔ مشتاق کپتان محمڈن فٹ بال ٹیم کلکتہ کی طرف سے کھیلتے تھے، یہ صدر جمہوریہ کا ایوارڈ حاصل کر چکے تھے۔ ستار انصاری کو بہترین کھلاڑیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ صلاح الدین ویسٹ بنگال ٹیم کی نمائندگی کرتے تھے ان کے علاوہ برادری کے اور دیگر کھلاڑی مثلاً محمد علی اور مختار انصاری اس میدان کے عظیم شہسوار تھے۔ ناگپور کے لیلین کپتان اور عابد انصاری برسوں محمڈن اسپورٹنگ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ ہاشم کپتان نے سنتوش ٹرافی کے لیے پہلے قدیمی مدھیہ پردیش اور بعد میں مہاراشٹر اسٹیٹ ٹیم کی کپتانی انجام دی۔ عالمی کپ فٹبال ٹورنامنٹ میں عبدالخالق نے ہندوستانی ٹیم میں اپنی اچھی کارکردگی کا ثبوت دیا۔ فٹ بال کے یہاں ایسے ایسے ماہر کھلاڑی پیدا ہوئے ہیں کہ

ع سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے نہیں کا سلسلہ ہے۔

اُخوت اور بھائی بندی

برادری کے جذبۂ اخوت، مساوات، اتحاد اور امداد باہمی نے ہر شہر، قصبہ یا قریہ میں اس کی بستی کو ایک ایسی یگانگت، یکسانیت اور مماثلت دے رکھی تھی کہ ایک شہر کا انصاری دور دراز کے کسی قریہ میں انصاری بستی میں جا کر اجنبیت کی جگہ اپنائیت محسوس کرتا ہے طرز معاشرت میں یک رنگی، برتاؤ میں اپنا پن، بول چال میں وہی دل لبھانے والی باتیں اور وہی والہانہ انداز جیسے برسوں سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔

برادری کا کوئی بھی فرد وطن سے کوسوں دور رہ کر بھی پرکھوں کی سرزمین کو کبھی نہیں بھولتا، اس نے کسی وقت اور کسی حالت میں بھی صلۂ رحمی اور بھائی بندی کے رشتوں کو ٹوٹنے نہیں دیا جب کوئی ہم وطن ملیگا پہلا سوال ہوگا "کیسے ہیں بادِ صبا اہلِ چمن میرے بعد" بھیونڈی مالیگاؤں اور برہانپور وغیرہ صنعتی مراکز سے تازہ واردان کو "ملکی" کہتے ہیں۔ ہر ملکی کا ملک جانا فرض منصبی ہے، اور جب کبھی پردیس میں اس کا جانا پہچانا مل جاتا تو گویا یادوں کا دفتر کھل جاتا۔ وہ بڑے پیار اور چاؤ سے بستی کے چھوٹے بڑے کے بارے میں پوچھتا رہتا۔

ہندستان کی دیہی زندگی کا یہی سب سے پیارا پہلو ہے، ابن خلدون مشہور فلسفی مؤرخ بھی کہتا ہے
"دیہاتی لوگ بہ نسبت شہریوں کے بھلائی کی تحصیل کے بہت قریب ہوتے ہیں (اھل البدو
اقرب الی الخیر من اھل الحضر) ان کا رشتہ بڑا پرخلوص اور ان کی باتیں بڑی بے ریا ہوتی
ہیں۔ ہر غریب الوطن اپنے دادوں کے بارے میں اچھی باتیں سن کر یک گونہ بیخودی محسوس کرتا ہے"

جماعتی اصلاحات

قدامت پسندی کے باوجود برادری کے پنچایتی ڈھانچے اور جماعتی روایات میں سماجی اور معاشی تبدیلیوں
کے سبب اصلاحات ہوتی رہتی ہیں اور بعض حالات میں روایات کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ بزرگان
قوم جو دینیات صالحات میں سے ہیں پرکھوں کی روایات و اقدار کو گلے سے لگائے رکھتے ہیں لیکن
تعلیم یافتہ طبقہ جو جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے نئے اقدار کا شعور رکھتا ہے وہ پنچایت اور برادری
کے حقوق، پابندیوں اور روایتوں کو بالائے طاق رکھ کر "کرو ہی تو راگ سناؤ" کے مصداق من مانی
کرتا ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں اب کفو کی پابندی لازمی نہیں رہی۔ اکثر جگہوں پر
پنچایت معطل ہو کر رہ گئی ہے اور اس کا انجر پنجر ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ بعض رسموں کا ختم ہو جانا بہر حال
ایک نیک فال ہے۔

شادی ایک شرعی تقریب ہوتی ہے جس میں اخوت اور اجتماعی اتحاد کا مظاہرہ ہوتا ہے،
عورتوں اور بچوں کے لیے خصوصاً یہ تقریب سعید نشاط و شادمانی کا ذریعہ بن جاتی ہے لیکن
بعض متمول در متجدد اپنے وقار اور تمکنت اور بعض دفعہ ثروت و دولت کے غرور میں اپنی
علیحدہ شناخت قائم کر کے منفرد بننا چاہتے ہیں اور دعوت ولیمہ وغیرہ میں مقامی روایات کو
یکسر بالائے طاق رکھ کر مغربی طور طریقہ پر عمل کرتے ہیں۔

بعض مقاموں میں جماعتی روایات میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کامٹی کے محمد
نور الحسن صدیق نے ۱۹۳۶ء میں الفاروق پریس سے ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں
مومن برادری کو چند نصیحت آمیز باتیں بتائی ہیں۔ اور اس کے پنچایتی نظام "چوراسی" کی اصلاح
و درستگی کے لئے مفید مشورے دیے ہیں۔ کامٹی کی برادری کے بزرگ محمد ظہیر وارثی نے
دیباچہ میں بڑی فکر انگیز باتیں کہی ہیں۔

بعض جگہوں پر برادری کی پنچایت مملوکہ جائداد کی نگراں ہوتی تھی جیسے جماعت خانہ۔ کنواں

وغیرہ۔ اسے پنچوں کی باوڑی اور پنچوں کی مسجد کہتے تھے۔ اس قسم کے وقف کو پنچ (مجوباجی) کہتے تھے۔

پوربی بولی

مومن برادری کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کی جو تاریخی یادگاریں آج بھی زندہ اور برقرار ہیں ان میں برادری کی گھریلو بولی پوربی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ بولی برادری کی معاشرتی زندگی اور تمدنی تاریخ کی آئینہ دار ہے۔ گو پورے وثوق سے کہا نہیں جاسکتا کہ اس بولی نے تاریخ کے کس دور میں اپنی زبان کھولی لیکن امیر خسرو دہلوی کے کلام میں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی ہے۔

ہر زبان اور بولی میں موجود ایک قوت نامیہ ہے اور اس کے ارتقاء کا ایک نامیاتی سلسلہ مختلف ادوار میں مختلف عوامل اور محرکات کے دباؤ کے تحت چلتا رہتا ہے، قومی اختلاط تہذیبی تصادم اور مراسم، زمانی تغیرات، سیاسی تبدیلیاں اور بعض حالات میں دینی اثرات بھی زبان کی لسانی نشوونما پر اثر انداز ہوتے ہیں، زبان عموماً شہروں میں زبان کھولتی ہے اور بولی دیہی ماحول میں بولنا سیکھتی ہے۔ فارسی اور پراکرت بولنے والوں کے تال میل اور سماجی میل جول سے جس طرح اردو کا خمیر اٹھا ہے پوربی بولی بھی، ہندی، اور برج بھاشا کے لسانی ڈھانچے میں ڈھل کر نکلی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں سنسکرت اور فارسی کے کچھ عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں جو الفاظ اور شبدوں کے بگڑے تیوروں سے نمایاں ہیں، بولی کے دیہاتوں میں شہری تصورات اور تصنعات سے بہت دور جہاں 'ہندی' کا چلن تھا، یہ بولی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو میں دیہی حسن کی ساری سادگی سمیٹ کر جوان ہوئی، ہر زبان اور بولی کی تاریخ ارتقاء دراصل ایک سفرنامہ ہے جس میں کھونٹ کھونٹ کے لوگوں کی بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔

اردو (ہندی) اور پوربی بولی کے لسانی دھارے ایک ہی سوتے سے پھوٹے ہیں

اور ایک ہی "رودِ گنگا" کے دو کنارے ہیں، ایک کنارے پر شہری تمدن کے سایہ دار درخت ہیں اور دوسرے کنارے پر دیہی معاشرت کی کھیتیاں لہلہا رہی ہیں' — انہیں کھیتوں کے پھیلتے بڑھتے سایوں میں ہمارے پُرکھوں کے سائے بھی ڈولتے رہتے تھے اور رکھوں کے مسلسل اور اٹوٹ شور میں ان کی صاف گوئی اور حق گوئی کی آوازیں بھی گونجتی رہتیں۔

پوربی بولی یو۔پی کے مشرقی اضلاع میں مختلف لہجوں اور نحوی ہیئت کی تبدیلیوں کے ساتھ رائج ہے، بھوجپوری اور پوربی میں یہ فرق زیادہ نمایاں ہے۔ یوپی (دیار پورب) کے تمام باشندوں کا یہی ذریعۂ اظہار ہے اور ایک طرح سے گھریلو بہنیں "ملاقاتی" بولی ہے۔ اور بستیوں میں محلّوں کی شناخت ان سے اٹھنے والی آوازوں سے کی جاتی ہے اسی طرح پوربی بولی بولنے والے کے لہجے اور محاورات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کس ضلع کا ہے اور کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یوپی کے مغربی علاقے میں اردو کا کرختداری لہجہ رائج ہے۔

پوربی بولی کا لہجہ ہر ضلع میں مختلف ہے، لیکن اس کے صوتی لہجے کی لٹک، لُٹک اور لگاوٹ اور نسائی مزاج کی نزاکت اور بانکپن نے اس میں ایک ایسی لچک پیدا کر دی ہے جو صرف بانکی اداؤں والی رقاصہ میں ہوتی ہے، صرف ایک مثال سے اندازہ لگ جائیگا کہ ایک جملہ کس کس طریقے سے ادا کیا جا سکتا ہے جب کہ معنوی یکسانیت برقرار رہتی ہے۔ یہ کہنا ہو کہ "اسکی بیوی اپنے شوہر کی راہ صبح سے بیٹھی دیکھ رہی ہے۔" ٹھیٹ پوربی میں اس طرح سنائی دیگا:

— "اوھکر مہرارو بھنسارے سے اپنے مرڈوا کی باٹ نہارت بیٹھی ہے۔" ذرا شائستہ لہجہ میں اس کا اظہار یوں ہوگا:

— اور اوکر تیا (عورت) صبح سبیرے سے اپنے آدمیا کا رستہ دیکھت بیٹھی ہے۔"

اور کرخت لہجہ یہ ہوگا:

— اور اُگھروالی سویرے سے اپنے گھروالن کا رستوا دیکھت بیٹھی ہے۔

لسانی خصوصیات

اس بولی میں 'مصادر' اور 'افعال' میں بھی وہی لچک اور لگاوٹ موجود ہے 'اسے پوربی میں مُٹھرا اُٹھرا کر بولنا کہتے ہیں۔ مصادر کی نوعیت بڑی انوکھی ہے اور ان کی سب سے اہم خصوصیت ان کی طاقت ابلاغ و ترسیل ہے جس سے 'حرکت'، 'عمل' یا 'آواز' کی کیفیت اور صورت نظر آتی ہے:

الالانا : چلّانا، رونا
اسکسانا : کسلمندی، سستی دکھانا
پاڑنا : دبکیر، گرانا
تیجی دکھلانا : تیز بات کرنا
چیکرانا : چیخیں مارنا
للانا : شوخی کرنا
گل گلانا : زیادہ گل گل بات کرنا
السیانا : سستی دکھانا

بھانجا پھیلانا : فنی اصطلاح ہے 'بھانجی پاڑنا اور بھی مارنا رخنہ ڈالنا کے معنی میں ستعمل ہے۔ آڑا پھیلانا (دبنا)
ڈکرانا : (خنزیر۔ ڈکر) کی آواز سے مماثلت دینا
نہارنا : دیکھنا
گُھرّانا : درشت لہجے میں بولنا
بھنّرنا : بپ بپ کھانا

اسی معنی میں پلیتا ہے

اسمائے ضمائر میں واحد متکلم (میں) کہیں کہیں جمع متکلم 'ہم' کے طور پر استعمال ہوتا ہے: مثال میں جارہا تھا 'بجائے' ہیں جات رہیں 'کہ کہیں گے' ہم جات رہیں '

تم (واحد) کے لیے صیغہ' امر وہی ہے جو اردو میں ہے۔ کھاؤ، جاؤ، گاؤ۔ لیکن لحاظ اور پاس ادب کی خاطر کہیں گے۔ کھاوا، جاوا، گاوا۔

آپ کے لیے 'توُن' بولتے ہیں۔ تُون (تُن)، بولت تھیو: آپ بول رہے تھے۔

زمانہ' مستقبل میں ہر فعل میں یہں۔ ایہں کا لاحقہ لگتا ہے: وہ آئینگے: اُوائیں' جیہں۔ تم کے لیے زمانہ' مستقبل ہوجائیگا۔ تم ایوّھیو: تم آؤگے

حالت اضافی یا جرّی کی مثالیں: میرا = مورا۔ ہم = ہمار' تیرا' تور' اور تمہارا = تہار اُتہار

پوربی کی ایک خصوصیت 'الف' کا اسم کے ساتھ بطور لاحقہ کا استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کے لیے "وا" اور مؤنث کے لیے "یا" عورت = عورتیا، مرد = مردوا، کتاب = کتیب

بہنیا، بھیا (بہن بھائی)
ناموں کے بگاڑنے کا رواج عام ہے[1]، اچھے خاصے نام کو اسی طرح 'وا' اور 'یا' کی بیساکھی دے کر ٹانگ توڑ ڈالی جاتی ہے مثلاً ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ: کریم = کریمو، کریما ایوب = ایوبا، بعض ناموں کو تو نعم البدل دے دیا جاتا ہے، ہر یعقوب، حقو کہلاتا ہے: مومن خواتین کے ناموں کا کچھ ایسا سحر ہے کہ ہر سارہ یا سائرہ "سیڑی" بن جاتی ہے، اور ہر رابعہ رُبّو بن جاتی ہے، فاطمہ نام بگڑ کر فتو (پھتو)، کلثوم۔ کُلسیا اور سکینہ بکیا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بدر النساء۔ بدرو یا بدرن، خیر النساء۔ خیرن، شمس النساء شمسن غرضکہ ساری "نساؤں" کی نسوانیت بدل جاتی ہے۔ مردوں کے نام بھی بگاڑ دئے جاتے ہیں۔ یوسف بوہروں کی طرح ایسب یا اِسبا بن جاتا ہے۔ دراصل یہ مخفف نام سہولت کے لئے ہیں۔

مومنوں کو شعائر اسلامی سے جو لگاؤ اور وابستگی ہے اس کے مظاہر نام ہیں، اسلامی تقویم کے مہینوں، دنوں اور تہواروں کا نام اختیار کرنا ان کے لئے باعث خیر و برکت ہے، جس مہینے یا دن کو جو پیدا ہوا وہ اس تعلق سے رمضانی، شعبان، رجب، شبراتی (شب برات)، بناتی (بارہ وفات) جمعراتی، بدھو یا بدھی اور حسن بن جاتا ہے، جنت میں آکر مومن حرمین شریفین کی یادگاروں کو بھی وجہ تسمیہ بنا کر حج کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے۔ مثلاً کعبہ کے پرنالے میزاب، مسجد حنیف اور بذاتہ کعبۃ اللہ اور بیت اللہ جیسے نام رکھے جاتے ہیں۔

نام سن کر مسمیٰ کی طرف دھیان جاتا ہے، اللہ کے نزدیک اچھے نام وہی ہیں جن کے معانی اچھے ہوں، کنیت کا رکھنا بھی سنت ہے اور ایک طرح کی تکریم ہے، لیکن جہل اور سادگی نے ایسے ایسے ناموں کو رائج کر دیا تھا کہ جو مجذوب کی بڑ لگتے ہیں۔ لیکن ان ناموں کے پیچھے کوئی وجہ ضرور ہوگی، پیر اور صوفی سے خوش اعتقادگی کا اظہار جس کے ہاتھوں مسلمان ہوئے یا بیعت کی، کوئی واقعہ یا پھر کوئی مہمل بات وجہ تسمیہ بن جاتی ہے:

---

[1] وہ بوہروں میں ابراہیم کو ، بردو یا ابلا، یوسف کو اسبا، سیرا، ایسف اور خدیجہ کو خجی یا ضنیجہ اور فاطمہ کو فتو دی بنا دیتے ہیں۔ گزیٹیر صوبہ بمبئی۔ گجرات کے مسلمان ج ۹ حصہ ۲ صفحہ ۶۰-۶۱

مثال کے طور پر یہ نام بڑے معروف تھے:

بچن، بچو، بدلو، بھیکو، بھلی، بھکو، بھوندو، جوکھو، نوکھو، نکو، چھیدی، چھدو، ہنو، انگنو، لکھو، مدارن، بھورے، بھکاری، چاند، دھنا، سمن، بھولن۔ (شیخ) پہاڑ، گھیدو، گھسی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی حکم دیا ہے کہ "نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں، آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو" (الحجرات : ۱۱)

بجائے کنیت رکھ کر سنت نبوی کی تکریم کرنے کے برا نام دینے کا دستور بن گیا تھا، کسی کی جسمیتی، بری عادت، کمزوری، تلون مزاجی یا کسی اور سبب سے اسے کسی اور معنی خیز عرفیت سے منسوب کر دیتے تھے۔ گھن (گل گل بات کرنے والا)، ٹینی (اکڑنے والا)، ٹوٹو (ابھرے دانت) بڑ بڑیا (بک بک کرنے والا) باٹا اور موٹو۔ موٹے آدمی کو پکارتے تھے۔

نبی کریم نے کسی کو ایک موٹے شخص کو "طفیلی" کہتے ہوئے سنا تو فوراً ٹوک دیا اور وعید فرمائی۔ تسمیہ (اسامی) اور کنیت کے بارے میں شارع علیہ السلام سے جو حدیثیں مروی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ دینی نام رکھے جائیں جو خود اللہ کو پسند ہیں، اللہ کو عبدالرحمٰن اور عبداللہ نام بہت پسند ہیں، اور یہ کہ منصوص ناموں کی بجائے نئی اصطلاحات اختیار کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

پوربی محاورے اور ضرب الامثال

پوربی بولی میں مثالیں اور کہاوتیں بڑی بہتات سے آتی ہیں، لیکن بڑی بوڑھیوں کی زبانی ایسے محاورے بھی سننے میں آتے ہیں جن کا تعلق خاص برادری سے ہے مثال:

جلاہے کا ناتا۔ کتھری (گدڑی) کا ناقہ (تاگا) یعنی جس طرح گدڑی کی بخیہ گری ایک دھاگے سے کی جاتی ہے ایک بخیہ ادھڑنے سے دوسرے سارے بخیے ادھڑ سکتے ہیں اسی طرح جلاہے کی رشتہ داری اور ناتے کا سلسلہ ایک دوسرے سے تیسرے تک نکل جاتا ہے گویا ساری برادری آپسی رشتہ داری کے سلسلے سے اس گدڑی کی طرح ہے جو ایک سوئی اور ایک دھاگے سے سی پرو دی گئی ہے، ایسی مثالیں اب صرف پسماندہ دیہاتوں میں سنائی دیتی ہیں جیسے یہ ہیں:

بجرے آگے کا جنل تھیلے میں سے آگے نکال لئے۔

بنا باندھ کا ٹیکہ دے ماتھا پر لے

پیسہ نہ فقیر دھسڑدا پار

گئیں بھینس پانی میں

کھات رہیلی جگروا کوٹ نکلی پان

نہ نو من تیل ہوئی نہ رادھا ناچے

کتّی کا جان باپ کموا کے سواد نہ آئے

ڈمری کی مرغی ٹکا بچڑائی۔ (دیکھو ۱)

کھیت کھائے گدھا مارل جائے جلاہا۔

جب کا آم تب کا لبیدا

دمڑی کی ہڑیا، گئی کتے کی جات پہچان گئی

بھینس کے آگے بین بجاوے، بھینسی بیٹھی پگورائے۔

ناچے کے ڈھنگ نہ انگنوا ٹیڑھ

آن کے مڑیا گمون بتاوے آپ گا رونے پچاوے

جلاہے کی بٹیا نہ نیہر ویں سکھ نہ سسرویں سکھ۔

اگہن کی بوندی دیگلی، پرتلا ہی چوڑا۔

ادھ گگری جل چھلکت جائے

بنا رے کے موئے ڈانگر نہ مرت۔

گئے میاں رہیوں در گجوں، نہ یہ کت نہ وہ مت

بڑا مارے روؤے نہ دے

بنیہ اپڑ رسینڈی میں گاوے

روزہ نہ بخشوائے گئیلن نماز گلے پڑل۔

موا دیں تو نہ بیان دھکا ہیں مجادر

دبے کی بہری مارے گاؤں کی سرپنچ۔

مرے نہ تو گھر بھرے نا

اپنے ہی مرلے سرگ (جنت) دیکھنے کی بلے۔

پیسہ نہ کوڑی بجار جالیں دوڑی۔

لاؤ موری اوڑھنی میں جیئوں باجار

باتھیں سے چھوڑ کے اُڑاُڑ بلا دے

بجتار (شوہر) کا پیسہ بھیوا کا نام

یار کا غصہ بجتار کے سر

اصطلاحات

بافتگی کی صنعت نے اصطلاحات اور محاورات کا ایک جامع اور معنی خیز ذخیرہ جمع کر دیا ہے، کچھ تو ماہر کاریگروں کی اختراعات ہیں اور کچھ تکنیکی ضرورت نے وضع کیے ہیں:

آڑا۔ آڑا: تانے بانے کو آنکڑوں پر اور لکڑیوں پر پھیلا کر تانی تنا جاتا ہے اُسے آڑا کہتے تھے، مقامی بولی میں اسے آڑا پھیلانا یا طانا کہتے تھے، کاریگر کے علاوہ محلّے کے بچے بھی تگی پکڑتے تھے۔ اس تعاون کے سلسلے میں سبھی ساتھیوں کی چلئے بسکٹ سے مدارات کی جاتی تھی۔

تگی: تانے بانوں کا لپٹا ہوا بنڈل، کانجی لگے ہوئے سوت کے لچھے۔

پاؤڑی: پرسل

پرکھری: وہ کھڈا جس میں پاؤڑی (قدمچہ) لگا ہوا ہوتا ہے۔

جیبھا: جیبھ زبان

گیبھا:

نال: شٹل (Shuttle) ڈھونا کی پرانی شکل جو دوزنی اور کشتی نما ہوتی ہے۔

ناکو: نال کے نوکدار سرے کو ناکوا کہتے ہیں

کرسنچا: ڈابی کی ایک پرانی شکل جس کی مدد سے جالا فریم کو اوپر سے نیچے کیا جاتا ہے

کر: دم کو کہتے ہیں "دم" پیدا کرنے والے سنچے (فریم) کو کرسنچا کہتے ہیں۔

مالا : ہتھے کا اوپری حصہ جس کو ہاتھ سے پکڑتے ہیں

تراوچی : ہتھے کا نچلا حصہ جس پر شٹل (ڈھوٹا) دوڑتا ہے

ہتھوا : ہاتھا، ہتھوا

سیل : ہتھے کو لٹکانے والی لکڑیاں

پھنی : کنگھی

کھرکوٹ اور جبلیا : ان دونوں پر لپیٹن (کپڑا رول کرنے والے چوکور لکڑے) کو رکھا جاتا ہے

قالبوت : بھیونڈی میں قالبوت (کالبد) پترے کا ایک سانچا فرما (DIE) ہوتا تھا جس کی مدد سے کانجی (کلف) لگے ہوئے پرچے سے ٹوپی بنائی جاتی تھی اور اس پر برادہ لگایا جاتا تھا لیکن شاید کسی دوسری چیز کا نام بھی ہو سکتا ہے

تسگرا : بھیونڈی میں تسگرا مٹی کا ایک برتن ہوتا تھا جس میں کاریگر بھری ہوئی نرمی (کانڈی، …) رکھتے تھے۔ تسگرا بسکالی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

بسکالی : یہ کپڑے کو کھینچ کر اور تان کر رکھتا تھا اسکو ستی کہتے تھے

پنک (ستی) "

کوچ، کوچی : برش۔ دھاگوں پر کانجی لگانے اور تانے کو سیدھا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ترت : یہ تعداد میں دو ہوتے تھے اور بچاؤ کی غرض سے گھٹنوں کے اوپر باندھ لیتے تھے تاکہ اگر شٹل (ڈھوٹا) کٹ جائے یا گرے تو پیروں (ساق) میں چوٹ نہ لگے، خصوصاً شاگردوں کی تربیت کے وقت استعمال ہوتا تھا۔

گردونک : بڑا لپیٹنے (رول) کرنے کے لیے جو چوکور ڈھانچا کر گھے کے برابر اس پر لگایا جاتا تھا اسے گردونک کہا جاتا تھا۔ یہ فارسی کے مصدر "گردانیدن" لپیٹنا کا اسم فاعل اور … تصغیر ہے

محاورات

محاورات وضع کرنے میں مقامی اثرات کو بڑا عمل دخل تھا، بنگاؤں میں اس قسم کے محاورات حالات کے زیر اثر پہلی بولی کا حصہ بن گئے تھے

مرّی بند : مرّی دھاگے کی ایک گرہ کو کہتے ہیں۔ احتجاجاً جب روز کارخانے بند رہتے ہیں

اسے 'ٹھری بند' کہتے ہیں یعنی چھوٹا سا چھوٹا کام 'ٹھری لگا' تانگ بند کر دیا جاتا

پھدیہ (فدیہ) : پیسہ — للچھودُں، للچھوں : فارسی کے کوں

کھٹی : خانقاہ — (صنعتی لاحقہ) کی طرح جیسے گلگوں گل رنگ کی طرح۔

کٹ گھر، سُٹر گھر : — (ہر جگہ استعمال ہوتا ہے)

ترایا : تین راستے

ادب خانہ : سنڈاس، بیت الخلاء — بیت اللطف : کیسی خانہ

گجری اگزری : وہ بازار یا ہاٹ جہاں کپڑے بُن کر جلا یا بیچا جاتا ہے، یہ بازار عموماً شام میں لگتا ہے۔ مالیگاؤں میں اسے سپاٹی بازار کہتے ہیں۔

پوربی کادیہ اور لوک گیت

پوربی کا صوتی لہجہ، دیہی مزاج اور بولی کی مٹھاس، سنگیت، گیت و شاعری سے تال میل رکھتی ہے، ہندی کادیہ میں پوربی بولی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کا بھرپور نقش (ریختہ) ہی ہندی کادیہ کا روپ ہے، امیر خسرو کی 'ہندوی' اور اس کے زمانے کا سنگیت پوربی بولوں اور ٹکھڑوں سے سجا ہوا ہے، سنگیت کے سُر اور پوربی کے میٹھے بولوں کی ہم آہنگی نے ہندوستانی فنِ موسیقی کو ایک جاندار آواز بخشی ہے۔ خیال کے بول، ٹھمری و دادرا کی بندشیں، بھیروی کی استھائی، پوربی بولوں میں رچ بس کر سرگم بن جاتی ہے اور چھتیس [۳۶] راگنیوں کے سُر نف میں اپسرائیں بن کر تیرنے لگتے ہیں۔ ٹھمری تو پوربی گیت کا ہی ایک روپ ہے۔

پوربی لوک گیتوں میں دیہی عوام کی مسرتوں اور خوشیوں کی چاشنی اور غم و اندوہ کا تیکھا ملا ہوا ہے، ان میں انسانی رشتوں کی سچائی کی آواز سنائی دیتی ہے اور انسانی جذبات کی دھڑکنیں گونجتی رہتی ہیں۔ ان میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی ہوئی ہے اور آدھے ادھورے گاؤں کے ماحول کی ٹوٹی پھوٹی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ سانجھ کی بیلا میں ڈھور ڈنگر جب گھر لوٹتے ہیں تو ریوڑ کا گرد ریا انھیں کھدیڑتا ہوا گنگنا تا رہتا ہے، پنکھ پکھیرو پیپل اور بڑ کے گھنے درختوں پر بسیرا لیتے وقت جو بے ہنگم شور مچاتے ہیں اس سے رات بیدار ہو جاتی ہے۔ کھیتوں کی باؤلیوں اور پنگھٹوں کے متوالے پنہاریوں کے کانسی کے گاگروں سے کھنک اُٹھتے ہیں، اور جب شام کی امنگیں دم توڑنے لگتی ہیں تو اپنے پیا سے بچھڑی ہوئی

برہن کی جاں گداز آواز بیگستوری کے سُروں میں ڈوبی ہوئی ابھرتی ہے:

بدلیسیا تناں برکھے

ساون بھادوں

کونریا، پپیہا بولیں — مورا پھاٹے کرجوا رے۔ بدیسیا.....

— اور جب زخمی پرندہ کی طرح برہن تڑپ کر خاموش ہوجاتی ہے تو سارے گنگناتے ہوئے سُر سناٹے کے ساگر میں ڈوب جاتے ہیں

بابل کے گیتوں کی گونج امیر خسرو کے عہد (چودھویں صدی) سے سنائی دے رہی ہے۔ کاہے کو بیاہی بدیس ارے لکھیا بابل مورے۔ ان گیتوں میں معنویت کی ایسی گہرائی ہے اور ان دہ گیں جذبات کی ایسی تڑپتی ہوئی لہریں ابھرتی ہیں کہ سننے والے کے دل میں دلہن کی رخصتی کے موقع پر طوفان امڈ آتے ہیں جو روتی ہوئی کہتی ہے۔ بابل مورا نیہر چھوٹو جائے اور جب وہ روتی ہوئی سہیلیوں کے جھرمٹ میں اس انگنائی کو یاد کرنے لگتی ہے جہاں اس کا بچپن گذرا تھا اور لڑکپن میں سہاگ اور پیا کے سنہرے خواب بُنے تھے۔ اس آنگن سے گذرنا اس کے لیے ایسا مشکل بن جاتا ہے۔ تو پربت پر چڑھنا:

انگنا تو پربت بھئے — ڈیوڑھی بھئی بدیس

چوکھٹ پار کرکے وہ اجنبی پردیس کی سرحد میں داخل ہوجاتی ہے اور یہیں سے اس کے نئے جیون کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس کا اپنا گھر اجنبی سا لگنے لگتا ہے اور جہاں اس نے مرادوں کے دن اور آرزوؤں کی راتیں گذاری تھیں۔ یادوں کا بوجھ لاد کر جب دلہن گھر کی چوکھٹ سے باہر آکر نئے جیون کے سفر میں پہلا قدم اٹھاتی ہے تو اس ایک قدم میں صدیاں بیت جاتی ہیں اور ہر قدم — ایک کٹھن کوس کا سفر بن جاتا ہے۔

— اور جب دن گذرنے لگتے ہیں۔ موسم بدلنے لگتے ہیں تو وہ دیکھتی ہے "آمد [illegible] کی ہے اب برکھا رت آئی ہے تو اس کو میکے کی یاد تڑپانے لگی ہے

اماں مورے بابا کو بھیجو ری — ساون پھیرا اب آئیگا

جیوے مورا بیرن بھیا۔ ڈولی بھیج بلاوے گا

پوربی میں کجری بڑی مقبول صنف تھی اسے دن کو گاتے تھے، چرواہے گیت کی ایک قسم سے ہے کھیتوں میں، چوپال میں اور تہواروں پر گاتے تھے مگر مسلمان عورتیں زیادہ تر شادی

بیاہ اور غم کے گیت ہی گاتی تھیں۔

دکن میں دکھنی اردو کے اثر سے پوربی بولی پہنچنے نہ پائی لیکن عوامی گیتوں کی تخلیق ہوتی رہی اور اسی علاقائی بولی میں جو دکھنی زبان سے مماثلت رکھتی ہے لوک گیت ڈھلتے رہے یہاں کی مومن اور دیگر مسلمان جلاہنیں دکھنی بولی کا یہ چرخہ نامہ سوت کاتے وقت گاتی تھیں، اس میں حمد و ثنا بھی ہے اور نبی اکرمؐ سے عقیدت اور محبت کا اظہار بھی موجود ہے۔ یہ سلاطینِ دکن کے عہد کی تخلیق ہے[1] سید محمد گیسو دراز جو خواجہ غریب بندہ نواز کے القاب سے مشہور ہیں ان سے عقیدت کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔

اول بسم اللہ کے بولی۔ اس میں پھرتے ہے سوگواری۔ دونوں بازوان کے زور یں گے ما[ں][2]
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ — چھوڑو دنیا کا فرقہ۔ فرقہ گے ماں
یا تو تن کا چرخا۔ کا رو غفلت کا برقہ
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ
دونوں درماں کلمہ کے کل ہے۔ ہاٹ گرانے حق کا بل ہے۔ چرخا پھرتا سو توکل ہے گا ماں
یار تھکا جیب ہے نکلا۔ دستگیر کرے ہے حبیب کا چکلا
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ
مال ایمان کو اپنے تانو۔ دونوں کا نانا شہد جانو۔ چرخا پھرتا سو ہی پانو گے [م]اں [ ]
نانو سینے میں کر کر تانا۔ دم کے تاراں گن گن بہنا۔ حلق پڑے کو پرونگے [م]اں [ ]
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ
دیکھے تاراں چوبیس ہزار۔ رات دن کا تانا او تار۔ تانا بیچ شہ کے دربار گے [م]اں [ ]
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ
چرخا نامہ کیا خوب باندی۔ خواجہ درویش کے گھر کی باندی۔ تو تو بیوڑ رہے ہیں نانو سینگے [ماں]
ہر دم اللہ اللہ۔ نبی ہمارے صلی اللہ

---

[1] چرخا نامہ کے دو نسخے مخطوطات ([illegible] اور مابعد [illegible]) کتب خانۂ سالار جنگ حیدرآباد میں ہیں۔ راقم عزیزہ شاکرہ (حیدرآباد) کا ممنون ہے جنہوں نے انہیں نقل کر کے روانہ فرمایا۔ نصیر الدین ہاشمی نے فہرست مخطوطات سالار جنگ میں ایک کا پند و نصائح میں اور دوسرے کا تصوف میں ذکر کیا ہے۔

[2] "ماں" دراصل چرخہ گھما کر گاتے وقت کی 'دھن' کی الاپ ہے۔

دوسرا چرخا نامہ :

صلی دسہیلی، مانڈو نکاری چرخا۔ کاڑو غفلت کاری برخاکی۔ ماں

ساری سینی کی کھلی تو باندی مال   یاد حق کا جیب ہی نکلا۔

ونڈ پر بیتی کا چکلا   دم کی تاراں کاڑ کربلا کے ماں

دم کی تاراں چڑھیں ہزاراں   رات دن کرتا نہ سستیاں [کذا]

چرخی پھیرت سو توکل بے کے ماں   تی ایمان کی تانی ماں

چرخا نامہ تو نے باندی   پان پربستی میں تو نانڈی

ہر دم اللہ اللہ نبی ہمارے صلی اللہ گے ماں   تو ہی درویش گھر کی باندی

ہر دم اللہ اللہ نبی ہمارے صلی اللہ گے ماں

پوربی کی شاعری

پوربی بولی کی معنویت، لوچ اور لگاوٹ نے اسے ہمیشہ خاص و عام میں مقبول رکھا ہے، یوپی کے شاعروں اور ادیبوں نے اسے سراہا ہے، اور اپنی تخلیقات میں اسے سمویا ہے، قرۃ العین حیدر کے صنم خانے اور کارِ جہاں دراز کے علاوہ ان کی تمام تخلیقات میں ان کے کردار پوربی بولتے نظر آتے ہیں یا کم از کم واقفیت کا اظہار کرتے ہیں، شاعروں کے لطیف جذبات نے بھی ترسیل و ابلاغ کے لئے پوربی بولی کو اپنایا ہے، مبارک پور کے ایک شاعر خلیفہ دین علی شاہ پوربی زبان میں استاد تھے ان کی نظم "پھول" کے نام سے آج تک مہک رہی ہے جس میں "پھول بن کیاری" میں پیرویں قطار اندر قطار کی طرح دنیا بھر کے پھولوں کے نام اور رنگ و بو کا ذکر ہے یہ نظم جہاں پوربی شاعری کا ایک شاہکار ہے کہ بیان ہونے کے باوجود انھوں نے تخیل کی کارفرمائی کا ایسا رنگین ثبوت دیا ہے۔[1]

صوفیائے کرام نے ہندوی اور پوربی بولی کو بھی رشد و ہدایت کا ذریعہ بنایا تھا، حضرت چاند شاہ ٹانڈوی تو پوربی لہجے میں پند و نصائح کرتے تھے، یوپی کے خصوصاً دیار پورب کے علمائے کبار اور شیوخ بھی پوربی بولنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ مغربی ہند میں اترپردیش کی طرف سے آنے

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری۔ تذکرہ علمائے مبارکپور ص ۱۳۳، ۱۳۲

[2] مولانا حبیب الرحمن قاسمی۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ۔ ص ۲۴۱

والے شیعہ شاعروں نے انیسویں صدی میں بمبئی کے شاعروں کے لیے بڑے معرکے کے پوربی مرثیے لکھے ہیں، مالیگاؤں میں جہاں پوربی بولی برادری میں رائج تھی وہاں دکن سے آنے والے قدیم باشندے بھی اس پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ امیرخان قریشی امیر (د ۱۸۷۰-۱۹۳۸) مالیگاؤں کے پہلے عوامی شاعر تھے۔ پوربی میں ان کا کلام چاوڑی سے لے کر ملا باڑے تک طوائفوں کے ڈیرے میں ہر رات بجنے والی رقص و سرود کی رنگین محفلوں سے سنائی دیتا تھا۔ باذوق نستعلیق اور مہذب طوائفیں کثرت سے امیر قریشی کی نعتیں، غزلیں، ٹھمریاں، دادرا اور خیال ساز و آہنگ کے ساتھ ایسی ملک کے ساتھ گاتی تھیں کہ ساری محفل رقص و سرود کے بجائے نغمہ زار فردوس گوش بن جاتی شاعر کا شگفتہ کلام، نازنین بتاں خود آرا اور عشوہ آفریں مطربان خوشنوا کا سرمدی نغمہ ایسا سماں باندھ دیتا کہ سننے والوں پر بے خودی طاری ہو جاتی۔

مالیگاؤں میں چونکہ پوربی بولی کا رواج عام تھا اس لیے شاعروں نے بھی اس میں تجربے کیے لیکن جو مقبولیت امیر قریشی کے کلام کو حاصل ہوئی اس سے دوسرے شعرا کی پوربی شاعری کا ناطقہ بند ہو گیا۔ گو یہ امیر کی زبان نہ تھی پھر بھی اس میں انھوں نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے ان کی بہت سی نعتیں، سلام اور مرثیے مالیگاؤں میں برسوں تک گونجتے رہے، ورد عوام کی زبان پر چڑھتے رہے، لیکن خصوصیت سے ان کی وہ تضمین جو انھوں نے مخمس میں قدسی مشہدی کے مشہور فارسی قصیدے کی کی ہے ان کے اعجاز سخن کی معجز نمائی ہے۔ ؎

بیں کو دیاں اُٹھیں آج نبی کے تبی	جگرے کارن ہے بُلبل سگروا کاش در مرئی
یہاں ابھی آنے والے ہیں	جن کے سبب ہوئے سارے
ریت کے بیٹ بھرے آج کلی رنس ربی	مرحبا سید مکی مدنی العربی
محبوب ملنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو بلایا ہے	

دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کا لکھوں کا نہ لکھوں! سوچ کرت ہوں ہر دم

اب تِرسِلگو موروں اگوں نہیں سرکٹ ہے قلم

ذرا بھی نہیں آگے بڑھتا

---

[۱] حفیظ مالیگانوی، نقوش عدد ۴۴-۴۶

امیر اپنی تخلیقات ایک مہذب اور شائستہ طوائف منّا جان کے لیے لکھتے تھے جو ملا بار ملے میں رہتی تھی اور بڑی اونچی چیز تھی یعنی نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز کا معاملہ تھا حسن و جمال کا پیکر تھی اور امیر کی رعنائی خیال اسی کے تصور کی دین تھی اور آواز ایسی جادو اثر اور دلکش کہ بقول شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو، جب غزل چھیڑتی تو سننے والے عمر رفتہ کو آواز دیتے، منا جان کو پوربی زبان میں بڑی مہارت حاصل تھی، نہ وہ تو اسی زبان میں امیر قریشی کی غزلیں، نعتیں، گیت، خیال، دادرا اور ٹھمری گاتی تھی، جب امیر نے ایک محفل میں اسے یہ تضمین سنائی تو وہ تڑپ اٹھی اور "دل و جان بہ فدایت" کہتی ہوئی امیر صاحب سے شادی کی متمنا ظاہر کی، عاشقی صبر طلب تھی مگر یہاں تمنا بیتاب تھی۔ منا جان منا بیگم امیر بن کر ڈیرے سے اٹھ کر امیر قریشی کی چھاؤنی میں بس گئی۔ منقلب القلوب نے دل پھیر دیا لذت خواب سحر اور بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کی جگہ اب صبح خیزی اور سعادت طلبی تھی، نیکیاں تھیں اور پابندی احکام الٰہی، سیدی مکی مدنی عربی کے روضۂ نبوی کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئیں اور جب تک زندہ رہیں اپنے شوہر کی خدمت میں لگی رہیں۔
یہ پوربی بولی کا معجزہ تھا اور امیر قریشی کے پوربی نعتیہ کمال درجہ سے زیادہ عشق رسالت مآب کا کرشمہ تھا۔

کھیلا بائی اسٹریٹ، ڈونگری، بمبئی کے علاء الدین صابر پوربی زبان کے ایک غیر معمولی شاعر تھے ان کے استاد فخر ایجوری تھے علاء الدین صابر پتنگوں کے لئے [illegible] جس سے گذر بسر ہوتی تھی۔ عسرت کی زندگی گذارتے تھے لیکن مزاحیہ شعر کہہ کر لوگوں کو ہنساتے تھے پتنگ ڈور اور مانجھا ان کی شاعری کی بنیادی علامتیں تھیں جس میں گہرا طنز بھی چھپا ہوا تھا اور جس میں بڑی کاٹ بھی تھی، ان کی زندگی کی پتنگ تنگدستی کے ہاتھوں عسرت و ادبار کی ہواؤں میں جھونکے کھاتی رہی اور کٹتی ہارتی رہی، پھر بھی صبر کی ڈور انہوں نے ہاتھوں سے چھوڑی نہیں وہ دوسروں کو ہنسانے کے ساتھ ساتھ خود اپنی بدنصیبی پر ہنستے رہتے تھے۔

پوربی کے لوک گیتوں کے سُر جو خوشیوں کے سرگم سے پھوٹ کر ابھرتے تھے اب آدھے ادھورے گاؤں کی چیخوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں ہندوستان پہلے دیہاتوں میں بستا تھا اب شہروں میں اجڑ رہا ہے جہاں پوربی فلمی گیتوں کے ساتھ بندوقیں چلنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ اگر [illegible] کی ایسی خرابی ہوتی رہی تو شاعری کا دم گھٹ جائیگا، پوربی کویتا کی سانس اکھڑ جائیگی اور شاید صرف مرثیے اور نوحے لکھنے والے رہ جائیں گے۔

بیسواں باب

برادری کے رسوم و رواج اور تہوار

برادری کے مروجہ رسوم و رواج کے خطوط انیسویں صدی کے اس خاکے میں نظر آتے ہیں جو مرقع[1] دہلی کے نام سے اردو اور فارسی میں اسی عہد میں لکھی گئی تھی۔ بدعات، مشرکانہ رسوم، عقائد اور ان کے ساتھ وابستہ غیر اسلامی مظاہر کا یہ ایک عبرت نگاہ مرقع ہے۔ یہ اسلامی تہذیب کے زوال کی ایک "تصویرِ درد" ہے۔ اس میں عرس، میلے ٹھیلے، مزار پرستی، درگاہوں کی زیارت، دیوالی، دسہرہ اور بسنت کے تہوار، رقص و سرود وغیرہ کے تماشے دیکھنے میں آتے ہیں جن میں مسلمان شریک رہتے تھے۔ دہلی کے مسلمان ہولی، دیوالی اور دسہرہ کے تہوار ہندو دوستوں کے ساتھ مناتے تھے لیکن بسنت کا تہوار ایک ہفتہ تک باری باری قدم شریف، قطب صاحب، حضرت نظام الدین اولیاء، شاہ ترکمان، شاہ حسن رسول نما اور واحدی پورہ کے مزاروں اور درگاہوں پر دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔[2]

یہ صرف دہلی ہی کا مرقع نہیں بلکہ اس میں بہرائچ، ردولی شریف، کچھوچھہ شریف، گلبرگہ اور کلیر شریف کے عرسوں اور درگاہوں کے جلوے نظر آتے ہیں ایسا لگتا تھا کہ شرک کے گرد و غبار میں توحید، تقویٰ اور شریعت کی راہیں گم ہو چکی تھیں، باطل عقائد نے ذہنوں کو بتخانہ آزر اور دلوں کو ظلمت کدہ بنا دیا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی اکثریت وہ ہے جو ہندو مذہب کی گود سے نکل کر اسلام کی آغوش میں پہنچی۔ صوفیائے کرام کی تبلیغ کا اثر سب سے زیادہ سماجی طور پر پست پیشہ ور طبقات پر ہوا تھا یہ اپنے ساتھ موروثی رسومات کو گلے سے لگائے برسوں دائرۂ اسلام میں زندگی بسر کرتے رہے لیکن اسلام کی تعلیمات سے یکسر بے بہرہ رہے۔ جب مسلمانوں میں آویزش اور آمیزش کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا، باہمی معاشرت سے باہمی مفاہمت کی راہیں کھلیں لہٰذا مذہبی ماحول سے غیر اسلامی روایات اور عقائد داخل ہوئے ان میں شیعی عقائد کو

۱۔ مطبوعہ مولانا آزاد [illegible] دہلی [illegible]۔ ۲۔ ایضاً

بھی دخل تھا، عہدِ وسطیٰ کے نومسلم پیشہ ور طبقات، نومسلم راجپوت رو تارے، یمن قوم اور اشرافِ عشری خرجوں نے بعض حالتوں میں اپنی شناخت اور قدیم روایات و رسومات کو تبدیل شدہ شکلوں میں برقرار رکھا، ذہنی کجروی، توہمات، بدعات اور غیر اسلامی عقائد کی پرچھائیاں ان کی طرزِ معاشر تمدن اور دینی زندگی پر ڈولتی رہیں۔ رسوم و رواج کے برتنے کے معاملے میں عورتیں بڑی پیش پیش رہتی ہیں، شاید اس کی وجہ ان کی ضعیف الاعتقادی اور وہم پرستی ہے۔ برادری کے تعلق سے اگر ان تمام مروجہ رسومات کا جو شادی و غمی کے موقعوں پر آج سے چند سال پیشتر ادا کی جاتی تھیں ذکر کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ کیا کیا ستم ایجاد کیے گئے تھے کہ جن سے اسلام کی روح تڑپ اٹھتی تھی، جہاں جہاں مومن بستیاں آباد ہوئیں وہیں رسومات و روایات پھر سے زندہ ہوگئیں جنہوں نے اتر پردیش میں جنم لیا تھا، عہد سے لے کر لمحہ تک بدعات و رسومات کا ایک اٹوٹ سلسلہ چلتا رہا۔

لڑکا پیدا ہوتا تو ایک بکرا ذبح کیا جاتا، زچہ کے بستر یا تکیہ کے نیچے لوہے کا ٹکڑا رکھ دیا جاتا، تاکہ آسیب سے محفوظ رہے، رفعِ بلا اور دفعِ مصائب کے لئے چھلا پہنایا جاتا اور گلے میں دھاگا، تعویذ یا گنڈا ڈال دیا جاتا، دم۔ جھاڑ پھونک (رقیہ) مغرب کے وقت پانی بچے کو نظرِ بد سے پھنکوانا (رقیہ کرانا) عام معمول تھا، نظرِ بد سے بچانے کے لئے بچے کو کاجل کا ٹیکہ لگاتے تھے اور اس کے اتارنے کے لئے پھٹکری کا آگ میں جھونکنا دستور بن چکا تھا۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ سارے اعمال شرک و بدعت کے دائرے میں داخل تھے، ان کے انسداد کے لئے علمائے دین نے ڈھیر ساری کتابیں تصنیف کی تھیں۔

(جلاہا) مومن برادری کے بارے میں ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ "یہ شریعت کے بڑے پابند ہوتے ہیں، ترکہ اور میراث کے شرعی احکام پر سختی سے عمل کرتے ہیں، دو بہنوں کو جمع کرنے (جمع بین الاختین) کو سخت حرام سمجھتے ہیں (یعنی دو بہنوں سے شادی کرکے انہیں آپس میں سوکنیں بنادینا) لیکن جو جاہل اور گنوار دیہاتی ہیں وہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں اور ماتا بھوانی اور سیتلا دیوی کی منتیں مانتے ہیں تاکہ ان کے بچے چیچک کی وبا سے محفوظ رہیں، درگاہوں اور شہیدوں کے مزارات کی زیارت کرتے ہیں، عید اور شب برأت کے موقعوں پر نذر و نیاز کرتے ہیں اور شیرینی تقسیم کرتے ہیں۔" [1]

---

[1] ڈبلیو کروک۔ شمالی ہند اور اودھ کی قومیں (انگریزی) ص ۹۱ ۔۔۔

عورتوں کی ضعیف الاعتقادی ہی کی روشنی میں قرآن کریم نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ تاکید کی تھی کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔[1] آنحضور صلعم اپنے خطبات میں انہیں ہمیشہ نصیحتیں کرتے، ایک دفعہ جب سورج گرہن ہوا تو حضورؐ نے صلوٰۃ الکسوف پڑھانے کے بعد فرمایا کہ "میں نے جہنم کو اسی نماز میں اسی دیوار کے پیچھے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، میں نے عمر بھر میں اتنا خوفناک اور لرزہ خیز منظر کبھی نہیں دیکھا، میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں جھلس رہی ہیں"۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایام جاہلیہ کی رسموں کو ختم کرنے کے لیے کئی حدیثیں وارد ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم ٹونے ٹوٹکے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ احادیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اس سے گلو خلاصی کے لیے کسی شکل سے بچو ولی خود چھلا پہننا یا گلے میں دھاگے ڈالنا شرک ہے، مسند احمد کی ایک مرفوع روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے گلے میں تعویذ لٹکاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کو پورا نہ کرے، یہ بھی شرک ہے۔[3] ہمارے ہاں بخار کی وجہ سے دھاگہ دَم کیا ہوا دیکھتے تو اسی وقت اسے کاٹ ڈالتے یہاں تک کہ سیپی وغیرہ لٹکانے سے بھی منع کرتے تھے۔[4] دوا اور شرعی رقیہ یعنی جھاڑ پھونک جو کہ آیات قرآنی پر مبنی ہو، جائز قرار دی گئی ہے۔[5] اسی طرح تعویذ اور جب کے اعمال بھی شرک ہیں "تمائم" ان تعویذات کو کہا جاتا ہے جو نظر بد سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں کے گلے میں ڈالے جاتے ہیں۔ اگر یہ تعویذ قرآنی آیات پر مشتمل ہوں تو بعض اہل علم نے ان کو جائز قرار دیا ہے اور بعض نے ناجائز قرار دیا ہے، ان لوگوں میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شامل ہیں شرکیہ تعویذات کے علاوہ نظر بد اور زہریلے کیڑے کے کاٹنے کے بارے میں شارع علیہ السلام سے رخصت دی ہے۔ اسے رقی اور عزائم کہتے ہیں۔[6]

---

[1] سورہ الممتحنہ: ۱۲

[2] متفق علیہ (حدیث)

[3] قرۃ عیون الموحدین، شیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل شیخ، ترجمہ [illegible] لاہور ص۱۲۵ ۔ ۵۱

[4] [illegible] جامع الامام علی القاری [illegible] بالاردیۃ و الرقی و التمائم (فارسی) بھوپال ۱۲۹۵

[5] قرۃ عیون الموحدین، ص۱۲۰ ۔ ۱۹۱

بعض رسموں کے پیچھے ایک نفسیاتی خوف مستور ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس سے نحوست آتی ہے یا خیر و برکت میں کمی رہ جاتی ہے، مثلاً رواج ہے کہ بلاؤں کو دور کرنے کے لئے زچہ کے پاس تلوار یا چھری رکھ دی جائے یا بچہ پیدا ہونے سے پہلے کچھ اناج اور سوا روپے، چھاج (سوپ) یا چھلنی میں مشکل کشا کے نام کا رکھا جائے۔ بظاہر لوگ انہیں مباح سمجھتے ہیں لیکن یہ مومن کا کام نہیں اگر کسی رسم کے پیچھے نحس یا برکت کے تصورات کام کر رہے ہیں تو ایسی رسم ادا کرنا سراسر توحید کے عقیدے کے خلاف ہے۔ [1]

برادری میں شادی بیاہ کی جو رسومات ادا کی جاتی تھیں ان پر غیر اسلامی روایات کا بڑا اثر تھا، ان میں یہ ساری رسمیں شامل تھیں، ابٹن لگانا، کنگنا باندھنا، سر پر سے دونوں ہاتھوں کو (آرتی کی صورت) گھما کر بلائیں لینا اور پھر اپنے رخساروں پر انگلیاں توڑنا، پھوپھی کا بھتیجے دولھے کے سر پر آنچل رکھنا جب نائی اسے نہلا کر ناخن کاٹتا تھا، مرد کو مہندی لگانا، دولھا میاں کے سر پر سے سکے نچھاور کرنا، دلہن والوں کا برات پہنچنے پر چاول مارنا، برادر نسبتی کا اپنے ہونے والے بہنوئی کے جوتے چرانا اور حق مانگنا، داماد کا ساس (خوشدامن) کی سلامی کرنا، اور موقع ملتے ہی خوشدامن کا دامن پکڑ کر "سلامی کا حق مانگنا"، بہنوں کا بھاوج (دولہن) کو حجلۂ عروسی میں داخل نہ ہونے دینے کے لئے کواڑ بند کر کے حق مانگنا ۔۔۔ غرضیکہ ان سارے حقوق کے بوجھ تلے "فرائض" دبے رہتے تھے، شوہر اور بیوی کے باہمی فرائض و حقوق کے بارے میں جو احکام شریعت نے دیئے ہیں انہیں ڈھول باجے گانے، جلوہ یا آرسی مصحف، ٹونے ٹوٹکے اور جوتی چھپائی، تصویریں جیسی خرافات میں بھلا بیٹھے ہیں، خطبۂ نکاح میں نہ تو نصیحت اور نہ ہدایت دینے والے مولوی حضرات یہ بتانے کی ضرورت سمجھتے ہیں کہ شوہر کے کیا فرائض و حقوق ہیں، نان نفقہ کی مالی ذمہ داریاں، حسن اخلاق اور حسن سلوک، دلجوئی اور حسن معاشرت، ادائیگی حق مہر وغیرہ اور بیوی کے حقوق و فرائض کیا ہیں شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری، حفظ ناموس اور حفظ خانہ، خاوند کی خوشی اور خواہش کا احترام، پردہ کا اہتمام وغیرہ۔ ارشاد نبوی ہے: خیر متاع الدنیا امراۃ الصالحۃ "دنیا کی بہترین متاع ایک صالح بی بی ہے" (مسلم)

بعض حالات میں مقامی اثرات کے تحت اور مقامی باشندوں کے غلبہ کے سبب انہیں وہ رسمیں

---

[1] اسلامی دعوت اور خواتین۔ مرتبہ ابوسلیم محمد عبدالحی۔ مکتبۃ الحسنات رام پور ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۲

ادا کرنی پڑتی تھیں جنہیں وہ خود مذموم سمجھتے تھے اس کی مثال اسلام آباد۔ بھیونڈی کی انیسویں صدی کی سرکاری گزیٹیر میں ملتی ہے جب یہ یہاں مہاجرین مقامی مسلمانوں کے زیر اثر اور زیر تسلط تھے اور برسوں (۱۹۰۱ء) انہیں ان کے (شافعی) قاضی سے نکاح پڑھوانا پڑتا تھا اور ان کی طرح ڈھول، شادیانہ باجا گاجا بارات کے ساتھ بجوانا پڑتا تھا۔[1] ان میں بعض علانیہ طور پر اہلحدیث تھے وہ احتراز کرتے لیکن کوئی مسلمان نہ انہیں اپنی مسجدوں میں نماز پڑھنے کی اجازت دیتے اور نہ انہیں کسی مذہبی تقریب میں شرکت کی دعوت دیتے ان کا ایک طرح سے سماجی بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔[2]

اعظم گڑھ، بنارس اور الہ آباد کے دیندار سنی حنفی اور اہلحدیث اپنی آبائی رسومات کو ترک کر چکے تھے۔ ان کی شادیاں بڑی سادگی سے ہوتی تھیں اور تمام خرافات سے پاک رہتی تھیں۔ نہ ابٹن کا استعمال ہوتا تھا اور نہ مہندی وغیرہ دولہا دولہن کو لگانے کا رواج تھا۔ پیدائش کے وقت نوزائیدہ کے ایک کان میں اذان دینے اور دوسرے میں اقامہ کہنے کا شرعی طریقہ رائج تھا اور سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے تحنیک بھی کرتے تھے۔ میت سے متعلق جن رسموں کا دوسرے فرقوں میں چلن تھا جیسے تیجہ، دسواں، بیسواں، چہلم اور برسی وغیرہ ان کا مومن برادری کے مذہبی طور پر شعوری طبقہ میں رواج نہ تھا۔[3]

جہیز کی حد تک برادری بہت دور تھی، حسب استطاعت لڑکی کو جہیز دیا جاتا، اس میں چند زیورات شامل ہوتے تھے: آویزہ، ہار، کمر بند، چوڑیاں اور پازیب۔[4] کوئی مسلمان عورتوں کی تقلید میں "ہندوانہ آرائشگی" کا سہاگنی ہار ("گلسترّ" دمنگل سوتر)، ساڑھی چولی وغیرہ پہننے کا رواج نہ تھا۔ عورتیں اور مرد غیر مسلموں کے رہن سہن کی تقلید کرتے تھے اور نہ ان کی پوشاک و رہن سہن سے تشابہ اختیار کرتے تھے۔

سگائی اور شادی وغیرہ کے معاملے میں برادری کی عورتیں ہندوؤں کی طرح شگن لیتی تھیں (دن کے چنے میں نکالنا نہیں کرتے تھے بعض مہینوں کو نحس قرار دیتے اور زمانے کی مذموم روایات ان کی دوسری تقریبات پر بڑی اثر انداز ہوتی تھی۔ صفر کے مہینے کو وہ خالی، تیرہ تیزی کا مہینہ کہتے تھے، یعنی تیرہ دن کو نامبارک سمجھ کر کوئی "معاملہ" نہیں کرتے تھے۔[5] آخری چہار شنبہ

---

۱ صوبۂ بمبئی گزیٹیر تھانہ ج ۱۳، حصہ اول مطبوعہ بمبئی ۱۸۸۲ء، ص ۲۲۵-۲۲۶، ج ۱۳، ص ۳۹

۲ ایضاً ص ۲۲۶ ۳ ایضاً ص ۲۲۵ ۴ ایضاً

۵ [illegible]

کر تہوار کی شکل میں مناتے تھے اور ایک مزعومہ سنت پر عمل کرنے کے لئے آبادی سے باہر سیر
کو جاتے تھے[1] بمبئی، بھیونڈی، برہانپور اور مالیگاؤں میں خاص طور سے عورتیں سیر یا سیل
کو جاتی تھیں؛ اس تہوار کا ذکر انگریز مؤرخین بھی کرتے ہیں۔ یہ تفریح مرزا غالب کو بھی پسند تھی۔

میت سے متعلق وہ عقائد اور رسوم جن کا ثبوت نہ تو شریعتِ حقہ اور نہ تو اصحابِ کبار اور تابعین ابرار
کے آثار و تعاملات سے پتہ چلتا ہے عام مسلمانوں کی طرح برادری کے ایک طبقہ میں جو بریلوی عقائد
کے زیر اثر تھا۔ مروج تھا مثلاً کفنی پر کلمہ لکھنا[2] جس پیر سے بیعت تھی اس کا شجرہ قبر میں رکھنا
درخت کی ٹہنی لحد میں رکھنا اور پھر اس کے بعد ایصال ثواب کے لئے ایک سالہ منصوبہ۔ تیجہ،
دسواں، بیسواں، چالیسواں اور پھر برسی، جن میں قرآن خوانی ہوتی تھی اور کھانے پر نیاز و
فاتحہ دلایا جاتا تھا، قبروں پر چراغ یا موم بتی اور اگر بتی وغیرہ جلانے کا رواج نصرانیت کی تقلید
میں تھا[3] قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھاتے ہوئے دیکھ کر تیرھویں صدی عیسوی کے سیاح ابن
بطوطہ کو بڑا تعجب ہوتا تھا کیونکہ نہ تو اس کے مالکی مذہب میں اس کی کوئی گنجائش تھی اور نہ تو اس کے
ملکِ مغرب میں اس کا رواج تھا[4] انیسویں صدی (۱۸۹۷ء) میں اس کا بھی رواج تھا کہ:

"قدیم ایام سے بندر معمورۂ بمبئی میں یہ مروج ہے کہ جنازہ کے آگے آگے کلمۂ طیب
کا ذکر کرتے ہوئے چند آدمی میت کو قبرستان تک لے جاتے ہیں اور قبرستان پہنچ کر
اوس کا ثواب اوس میت کو بخش دیتے ہیں اور جب واپس لوٹتے ہیں تو اسی طرح
کلمۂ طیب پڑھتے آتے ہیں اور اوس کا ثواب میت کے مکان پر پہنچ کر اوسکو بخش
دیتے ہیں۔"[5]

سوال یہ اٹھایا گیا تھا کہ آیا اس کلمہ کا ذکر میت کے آگے اور واپسی کے وقت جہراً پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟[6]

---

[1] صوبۂ بمبئی گزیٹیر۔ تھانہ ج ۱۳، جزء ۱ مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۴ء، ص ۲۲۵
[2] تقویۃ الایمان۔ مولوی شاہ اسمعیل شہید دہلوی، تذکیر الاخوان بقیہ تقویۃ الایمان ص ۶۶ - ۹۷
[3] ایضاً اور دیکھئے مولانا اولاد حسن قنوجی منع افروختن سراج بر قبور (اردو) ۱۲۶۸ھ
[4] فیصلۂ محمدی۔ مولانا محمد صاحب جوناگڈھی۔ جید برقی پریس دہلی ۱۹۲۶
[5] الاجازہ فی الذکر الجہر مع الجنازہ۔ مولانا محمد عزالدین سنی ہزاروی۔ مطبع مجتبائی بمبئی ۱۸۹۷
[6] ایضاً ص ۱ - ۱۵

تک ذہنی و فکری اُفق پر گرد و غبار چھایا ہوا ہے، نذر و نیاز، فاتحہ، گیارہویں شریف کی نیاز کا کھانا، شب برأت کا حلوا، روزِ عاشورہ کا ملیدہ اور کھچڑا، عُرس کی شیرینی ان تمام ماکولات میں غیر شرعی طبّاخی کی ایسی تلخیاں گھلی ہوئی تھیں کہ دینی ذائقہ کڑوا کسیلا بن گیا تھا، منتوں کے پکوان کا مینو (طعام نامہ) ملاحظہ فرمائیں تو اندازہ ہو تب ہے کہ مسلمان بیبیاں امور خانہ داری سے جس حد تک واقف تھیں امور اسلامی کے عشر عشیر سے ناواقف محض تھیں، خرافات کے اس دستر خوان کے پکوان سے آپ کی قوت شامہ ضرور لذت اندوز ہو گی ان میں کئی قسم کے ٹوٹکے بھی تھے:

"خدائی رات کے گلگلے، بی بی کی پڑیاں، مشکل کشا کے روزے، رجب تھیلے کے مرغ، شاہ سلطان کی روٹ، بی بی جان کی کڑھائی (کہ مشکل پیچ ہو)، بی ٹیک کی سیدری کہ مرلو ٹیک پڑے، ترت پھرت کی پڑیاں پیر دیدار در رجب کے کونڈے، بی جاگتی جوت کی نوبت، بی بی کی صحنک، بی کشٹی کا کونڈا کہ جس میں جلدی کشٹ یعنی مشکل آسان ہو، بی حمال بحال کی کٹی، بی اس کی ھیچیا، شب مرتضی کا ملیدہ، بڑ پیروں کی نیاز، ستی کا ٹکا، بارہ وفات میں بارہ روز تاشوں کا ذقہ، شاہ جلال بخاری کا کونڈا وغیرہ [1]

گیارہویں شریف کی نیاز اور مروجہ میلاد کی مجلسیں کوکن کے مسلمانوں کی دینی زندگی اور معاشرت کے تکلفات میں شامل تھیں۔ مولود و میلاد کی مجلسیں بڑے ہی کر و فر کی تہذیبی چمک دمک سے باقاعدگی سے منعقد کی جاتی تھیں، جب وہابی مولویوں نے ان بدعات کو ہدفِ تنقید اور تردید بنایا تو مجمع الاخبار کے مدیر اور تحفۂ محمدیہ فی ردِّ فرقۂ مرتدیہ کے مصنف مولوی سید اشرف علی گلشن آبادی نے بڑے فخر سے لکھا:

"یہاں کے رئیس و دیندار مسلمان لوگ ہمیشہ مولود شریف کی مجلس کرتے ہیں خصوصاً ربیع الاول کے مہینے میں۔ ہر ایک رئیس کے یہاں نیاز کے کھانے پکتے ہیں، ہزاروں آدمی فیض پاتے ہیں بلکہ شادی و غمی میں بھی مولود شریف کی مجلس ہوتی ہے، نعت کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں اور آنحضرتؐ کے کمال محبت سے جو بیان کا شعبہ بلکہ

---

[1] خواجہ احمد فاروقی۔ اردو میں رہائی ادب (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۹ء)، ان رسومات کی تصدیق نایاب اور قدیم مخطوطہ "قانونِ اسلام" سے ہوتی ہے۔ (ڈاکٹر شیر نگر۔ دفیرۂ بزرگ جا۔ سندن)۔

مین ایمان ہے سلام کے وقت سب مجلس کے آدمی تعظیماً کھڑے ہوتے ہیں اور
دست بستہ ہو کر ادب سے درود و سلام پڑھتے ہیں۔ ؎

بھیونڈی میں برادری کی کسی تقریب میں محفل میلاد منعقد نہیں ہوتی تھی، صرف ۱۲ ربیع الاول کو جسے عام طور سے بارہ وفات بھی کہتے تھے عید میلاد النبیؐ کا جلوس نکلتا تھا جس کی قیادت شہر کا کوئی سربرآوردہ شخص کرتا تھا۔ اس سلسلے میں شاعرے بھی منعقد کیے جاتے تھے ان تمام تقریبات کا اہتمام جشن عید میلاد النبیؐ کی کمیٹی کرتی تھی جس کے سربراہ غلام رسول ہدایت اللہ تھے۔ اس کے چند فعال اراکین یہ تھے: (۱) غلام قاسم عبد السبحان اشرفی (۲) علی احمد عبد القادر منشی (۳) عبد الغفار انصاری (۴) عبد الستار تحسین (۵) محمد یوسف کامریڈ (۶) سلیم مقادم فیض آبادی (۷) پیر محمد غرقاب (۸) شفیق آفاقی اور (۹) محمد یونس مقادم۔

سامانات قیصر باغ اور تقاشہ روڈ نے ۱۹۴۳ء میں عید میلاد النبیؐ کے جلوس اور مشاعرہ کا آغاز کیا۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتا تھا۔ شہر کے تمام محلوں کی ٹکڑیاں جلوس میں شریک ہوتی تھیں۔ پورے شہر کا گشت کرتا ہوا اور نعرے لگاتا ہوا یہ جلوس درگاہ دیوان شاہ کے وسیع میدان میں ختم ہوتا تھا۔ شب میں آل انڈیا نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا جاتا تھا دوسرا غزل کا ہوتا تھا۔

بھیونڈی اور غالب مسلم آبادی والے شہروں سے پرانی روایات آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہیں کچھ تو سیاسی فضا مدد رہی ہے اور کچھ مصلحِ مرسلہ کے تقاضے عنان گیر بن جاتے ہیں۔ دینی شعور نے عورتوں میں حرام و حلال اور شرک و بدعت کی تمیز پیدا کر دی ہے بحمد اللہ برادری کے رسوم و رواج میں بڑی خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں وہ بھی دن تھے کہ ہر جمعرات کی شام میں خود و [illegible] میں [illegible] لڑکیاں ہمک ہمک کر نور نامہ پڑھتی تھیں ؎

اول اس کی پہلے میں حمد و ثنا ‎ کہ قدرت سے جس کی ہے کیا کیا بنا

مگر اب فضا بدل گئی ہے اور انسانی قدرت سے بنائے ہوئے ٹی۔ وی کے پردۂ سیمیں پر وہ ہر رات رنگین فلمیں دیکھتی ہیں اور جھوم جھوم کر فلمی گانے گاتی ہیں۔ نور نامہ، معجزات نامہ، شہادت نامہ اور وفات نامہ سب کے سب بے نام ہو کر رہ گئے ہیں جس طرح ان دکنی مثنویوں نے شہرت پائی ہے۔

؎ نقوش مدنی، زیارت حرمین، ص ۵۵

مالیگاؤں : ماتم یک شہرِ آرزو — !

بھیڑی : وہی نقشہ ہے دلے اسقدر آباد نہیں

مالیگاؤں کے لوگ بڑے اختراع پسند واقع ہوئے ہیں اور بڑے تیز رفتار ہیں، صنعت و حرفت، صحافت و ادب، تعلیم و تدریس یہاں تک بدعت اور جنگ و فساد میں بھی یہ سبقت لے جاتے ہیں، برادری بڑی فعال ہے اور افراد فعال جب کہیں، ہر بات میں ایک نئی بات ہر عمل میں ایک جدت میلاد شریف کی محفل مشاعرہ کی محفل بن جاتی جس میں شعرائے کرام اپنی کہی ہوئی تازہ بتازہ نعتیں اور سلام خوش الحانی سے سناتے، سننے والوں کا اژدہام ہوتا، مستورات بھی اوٹ میں رہ کر "کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں" کا نظارہ درمیان میں رکھتی تھیں گرمیوں کے دن ہوتے تو شربت کے جام چلتے اور سردیوں میں چائے اور قہوے کی گرما گرم پیالیوں کا دور چلتا جب رات شب کے سر سے سلما ستاروں سے بھرا ہوا آنچل ڈھلکنے لگتا اور سرد ہوائیں چلنے لگتیں تو لوگ "اٹھئے بس اب تو لذت خوابِ سحر گئی" کہتے ہوئے رخصت ہوتے۔ سرد ہوائیں جھومتے گھروں کی طرف چل پڑتے" بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں وہ ایسے ڈوبے رہتے کہ ہر منارے سے بلند ہونے والی اذان کی آوازیں "مکے اور مدینے" تک پہنچتی تھیں لیکن ان کے کانوں میں تک یہ "سلام" گونجا رہتا تھا :

یا نبیؐ سلام علیک — یا رسولؐ سلام علیک
یا حبیبؐ سلام علیک — صلوٰۃ اللہ علیک

حضرت حفیظ مالیگانوی نے کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچا ہے جس کو ہمارے قلم نے افسانہ بنا دیا ہے، محفل میلاد کے خاتمے پر وہ لکھتے ہیں :

"یہ محفل کبھی کبھی ایسے موڑ پر پہنچ جاتی کہ شعراء رشک و رقابت سے مجبور ہو کر ایک دوسرے پر طنز و تنقید کے اشعار بھی پڑھتے لیکن محفل کے تقدس کو مجروح نہ ہونے دیتے" [1]

---

[1] نقوش تذکرۂ شعرائے مالیگاؤں۔ مؤلف حفیظ مالیگانوی، مالیگاؤں ناسک، ۱۹۶۹ء، ص ۵۹ ۔ ۶۰

محرم

بدعات محرم تمام تر اہلِ تشیع کے زیر اثر سنیوں میں پھیلی تھیں مسلمانوں کی شاید ہی کوئی بستی ان بدعات سے محفوظ رہی ہو۔ برادری کا وہ طبقہ جس میں دینی علوم کا فقدان تھا یا دینی تعلیم سے یکسر بے بہرہ تھا وہ تعزیہ داری، شدہ اور علم اٹھانے میں شیعوں سے بھی زیادہ بالادستی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مبارک پور میں شیعہ حکام کی پیروی کے سبب کئی مرتبہ شیعہ سنی فسادات ہوئے تھے۔ بمبئی میں بھی مغل (ایرانی) شیعوں اور سنیوں کے مابین جھگڑے ہوتی رہتی تھیں ۱۸۳۰ء میں بھیونڈی میں رام نومی اور محرم کے تہواروں کے تصادم سے ۱۴ اپریل تا ۱۸ اپریل ہندو مسلم ہنگامہ برپا رہا تھا۔ ڈھائی سو مسلمان پکڑے گئے تھے اور چالیس مسلمان ہوائیوں کو ایک تا دس سال کی سزائیں عدالت سے ملی تھیں۔[1] ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء کو مالیگاؤں میں تعزیوں کی گردش کے اثنا میں فساد چھوٹ پڑا۔ بہتوں کو سزائے قید ہوئی اور ایک شخص کلو نام کا مسلمان تھا اس کو راوامیاں کے کھیت میں صبح کو پھانسی دی گئی۔[2]

محرم کے دنوں میں علم اور نشان نکالے جاتے، تعزیوں کا جلوس ڈھول، تاشے، نفیری اور دوڑتی اکھاڑے کے ساتھ شہر اور قصبے کی تمام خاص شاہراہوں سے گزرتا تھا۔ ایک اژدہام ہوتا اور دیدار کے لیے ساری بستی "امڈ آتی"، عورتیں اور مرد شانہ بشانہ طواف میں نظر آتے، پڑھو اور پڑھتے جاتے، منتیں مانی جاتی تھیں اور کہیں کہیں نظر بچا کر سر بھی جھکا دیا جاتا تھا"[3]

ایام عشرۂ محرم میں مالیگاؤں اور بھیونڈی میں بڑی رونق رہتی تھی، ہر رات محرم کی مجلسیں بنگلے میں ہوتی تھیں، جن میں شیعہ مصنف کی کتاب 'مناظر الشہادتین' بڑے لحن اور انداز سے پڑھی جاتی تھی، محرم کا چاند دیکھتے ہی نقارے پر چوٹ لگتی، شامیانے تن جاتے، بعض جلسوں میں منظوم مرثیے اور اختتام پر فاتحہ کے بعد نان خطائی (شیرینی) تقسیم کی جاتی تھی۔ [illegible] میں [illegible] مولوی عبدالمجید (۱۸۷۰ - ۱۹۳۳ء) کی مجلسوں میں

---

[1] [illegible] ۱۹۶۲ء، ص ۲۹، ۴۰

[2] [illegible] معارف [illegible] ص ۲۹

[3] [illegible] بمبئی گزیٹیر [illegible] ص [illegible]

سامعین کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی تھی۔

محلے کے نوجوان "میں" بنا کر مرثیہ خوانی کرتے، تعزیوں کے جلوس کے آگے ڈھول پیٹنے والوں میں "ملکی کاریگر" پیش پیش رہتے تھے، جو اپنے وطن میں سیکھے "فن ڈھول نوازی" کا مظاہرہ 'چوتالہ' اور 'تین تالہ' بجا کر کرتے، ضعیف الاعتقاد اور جاہل عورتیں تعزیے کا طواف کرتیں، بچوں کو تعزیے کے سامنے سے اچھالتی تھیں اور منتوں کی اولاد کو امام حسین کا فقیر بنا کر دھانی بے سیون کرتا پہنا کر فقیر بناتی تھیں، یہ اڑوس پڑوس کے گھروں سے کھچڑے کی نیاز کے لیے اناج اکٹھے کرتے تھے، مالیگاؤں میں ایک بڑا فحش دستور تھا کہ محرم کے دنوں میں جو گیڑا (امرد) کو زنانہ ملبوسات سے مزین کر کے گھر گھر لے جا کر نچاتے اور اس کے ذریعہ کچھ پیسہ وصول کرتے۔ اس زمانے (انیسویں صدی) میں صدیق نام کا زنانہ اس بیہودہ بات میں بڑا ماہر تھا، خوشآمد پورہ میں اشرفی بابا کی مجلس میں خدا بیاں رکنی درد بھری مجلس سننے کے لیے بڑی بھیڑ ہوتی تھی[1]

یادِ حسین میں روزِ عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا اور شربت سے افطاری کی جاتی تھی۔ دن بھر جو بھی ان کے دینی جذبات کی طرح ٹھنڈا رہتا۔ تمام مومنین کے ہر گھر میں 'چرمئی' کی بھاجی پکائی جاتی اور ملیدہ پر نیاز دلائی جاتی۔ غرضیکہ کیا کیا ستم ایجاد کیے کہ جن سے دین کی روح پر اس سے زیادہ ستم ہوتے تھے جو کربلا میں معصومین پر ڈھائے گئے تھے۔

بھیمڑی میں منتوں کے تعزیوں میں صدرالدین بن سیٹھ کا کوہ پیکر تعزیہ، حجن اماں (درگاہ روڈ)، منی تعزیہ والے اور عبدالرزاق بیڑی والے کے تعزیے خاص طور سے بنائے جاتے تھے، مالیگاؤں میں تو تعزیوں کی قطار اندر قطار گردش میں رہتی تھی، وہاں تو ہر چیز پر شرط رکھی جاتی تھی تھو جمعدار کا تعزیہ آگے جائے گا کہ لعل شاہ کا تعزیہ، جوش بوستے کے ساتھ پٹہ بازی کے اکھاڑے بھی ہوتے تھے، بھیمڑی میں سب سے نمایاں اکھاڑا استاد غمرو دادا کا ہوتا تھا۔

محرم کی گیارھویں تاریخ کی صبح رات بھر کی گردش کے بعد سارے تعزیے قطار میں کھڑے کر دیے جاتے، فاتحہ پڑھی جاتی، ختم کا تبرک بٹوایا جاتا اور پھر تعزیہ ڈبونے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی۔ چندن پوری میں گرنا ندی کے پاس ہاتھی کنڈ میں تعزیوں کو "ٹھنڈا" کر دیا جاتا،[2] اس دن کربلا کا

---

[1] حفیظ مالیگانوی، نقوش ماضی اور اجالوں کے سفر ص۱۲۱

[2] تاریخ شہر مالیگاؤں ص ۳۸-۳۹

منظر عجب ہوتا تھا، پر درد ہوتا تھا، گویا میدان عاشقاں بن جاتا تھا، سال بھر کے بچھڑے ہوئے محبوب کو نے کھڑے میں محو اختلاط رہتے، شاید اپنی ناکام زندگیوں کا ماتم کرتے نظر آتے لیکن یہ دل گداز منظر دیکھ کر ماتم حسین سے زیادہ اس جنسی بے راہ روی پر ماتم کرنا ضروری تھا۔ [۱]

محرم کا ذکر بھی ایگاؤں کی سماجی اور ادبی زندگی کا ایک نمایاں پہلو تھا، ان دونوں شعرائے کرام کے شعری مقابلے ہوتے تھے، آمنے سامنے تخت پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتے تھے اور ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں شعر بولے جاتے، مقصد یہ تھا کہ اپنی علمی قابلیت اور شعری برتری ثابت کریں۔ جیتنے والے کو ایک ریشمی صافہ اور زر نقد انعام میں دیا جاتا تھا۔ [۲]

عرس

مسلم معاشرے میں کسی بھی صالح فرد یا برگزیدہ ہستی کے روز وصال کا جشن منانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ [۳] مشکوٰۃ شریف کے باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں لکھا ہے کہ نسائی نے ذکر کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ "میں نے سنا رسولِ اکرمؐ سے کہ مت بناؤ میری قبر کو عیدگاہ"۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپؐ نے یہود و نصاریٰ کے اس عمل پر لعنت فرمائی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے شاگرد رشید اور حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خاص خلیفہ حضرت قاضی ثناء اللہ نقشبندی پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں:

"جاہل لوگ اولیاء اور شہداء کی قبروں سے جو برتاؤ کرتے ہیں یعنی قبروں کو سجدہ کرنا اور ان کا طواف کرنا، ان پر چراغ جلانا اور ہر سال عید کی طرح وہاں پر جمع ہونا جسے عرس کا نام دیتے ہیں یہ سب ناجائز ہیں"۔ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی (۱۱۹۶-۱۲۶۲ھ) نبیرہ (نواسے) شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں عرس کا دن مقرر کرنا جائز نہیں۔ [۴] بزرگانِ دین، محدثین اور

---

[۱] ۱۹۲۴ء میں جب ہم اپنے ڈاکیومنٹ میں پہلی مرتبہ ایگاؤں گئے تو یہ منظر نظر آیا۔ "آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں جس ... دھوکا نہیں دے سکتیں، اندازہ ہے وہ نقشہ بدل گیا ہو اور ہو بھی تو دیکھنے والے استعداد پیدا نہ ہو"

[۲] حفیظ ایگانوی، نقوش ص۳۶، ۷۰

[۳] دراصل قرآن پاک ... کی تصنیف تذکرہ حضرت دیوان شاہ صابری (۱۹۶۵ء) اور شاہ ... ۲۲۳ میں ... بیان ہے ... رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۔

[۴] مسائل اربعین ص۱۲

فضلائے کرام نے صریح الفاظ میں روایتی عُرس کو ناجائز بتلایا ہے اور "عرس" اور اس سے متعلق تمام شرکیہ امور جیسے قبروں پر پھول چڑھانا، اگربتی جلانا، چادر چڑھانا، چراغ جلانا، قبروں پر سجدہ کرنا، طواف کرنا، نذر یعنی منت ماننا، چڑھاوے چڑھانا وغیرہ کی مذمت کی ہے اور ان کے انسداد اور تردید کے لیے سینکڑوں رسائل اور فتاوے تحریر کیے ہیں[۱]۔

—— لیکن "زمیں جنبد نجنبد گل محمد" آج بھی مزاروں اور درگاہوں پر عقیدتمند زائرین اور جبہ عین استعانت اور استغاثہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" کے ورد میں مشغول دکھائی دیں گے، شاہ ولی اللہ نے ان تمام امور کی سختی سے مذمت کی ہے۔

برادری کی عورتوں کو عرس اور میلوں ٹھیلوں کا بڑا شوق تھا، بہرائچ چھوٹ تو غازی میاں کے میلے کا بدل مالیگاؤں کے کھیکن شاہ اور کوکن میں حاجی ملنگ بابا اور دیوان شاہ کے میلوں میں مل گیا، بمبئی میں تو پیروں کا سایہ تو تھا ہی —— ایسے سایہ دار شہر میں ہر سال نہ جانے کتنے عُرسوں کے پڑاؤ پڑتے تھے بھیونڈی میں دیوان شاہ کے اپریل یا مئی میں منعقد ہونے والے عرس کے جمگھٹے میں مومن عورتوں کی چہل پہل سب سے زیادہ رہتی تھی آج سے چند سال پیشتر جب پردے در حجاب کا اتنا دستور نہ تھا درگاہ کے صحن میں مستورات کی جلوہ نمائیاں عام تھیں، نذر، غلاف، چادر اور چڑھاوے چڑھا کر ثوابِ دارین اور بچوں کے کھلونوں سے لدے پھندے بیل گاڑیوں میں صبح ہوتے تک لوٹ آتے۔

"زندہ دلانِ مالیگاؤں" ایک زمانے تک (وہ زمانہ شاید گذر گیا ہو —— باقیات تو موجود ہیں) "اپیقوریت" کے فلسفہ "مذہبات" کے قائل رہے اور جہاں "سر و رہ" ملتے، میلاد ہو یا محرم کا دنگل، مشاعرہ ہو یا عرس، ان کا ادبی ذوق، رومانیت، جمالیات پرستی اور اختراع پسند طبیعت نت نئے روپ میں اپنا مظاہرہ کرتی رہی، "ذکر جانے تو مارا کردگستاخ" کو بہانہ بنا کر، گر یہ "عرض نیاز" کسی قابل سمجھا جائے تو بارِ خاطر نہ ہوگا کہ بدعات میں بھی ان کی رنگین مزاجیوں نے حسن

---

[۱] دیکھیے: فتاوی رحیمیہ ج ۲ ص ۲۱۹، فتاوی رشیدیہ ج ۲ ص ۹۹ اور ۱۳۹، فتاوی دار العلوم ج ۳ ص ۲۳۱ اور ۹، شاہ ولی اللہ تفہیمات ج ۲ ص ۴۵، تذکیر الاخوان بقیہ تقویت الایمان ص ۱۸۱، غایۃ الاوطار اردو ترجمہ در مختار ج ۴ ص ۱۷۹، ۲۴۲، ج ۲ ص ۲۳۵۔ ان کے علاوہ مولانا عبد الغفور دانا پوری، ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، اور مولانا ابو القاسم سیف بنارسی کی تصانیف ملاحظہ فرمائیں۔

سکھیر کی مسجد کے امام تھے۔ اس لیے یہاں بھی انھیں کو امام بنا لیا گیا۔ یہ سب شاعر تھے، طوائفوں کا ناچ دیکھتے اور ان کا گانا سنتا شاید ان لوگوں کی نگاہ میں پرانا زمانہ تھا، جب تک عرس جاری رہتا۔ یہ حضرات پابندی سے شریک ہوتے۔ [1]

ان یادگار زمانہ بزرگوں کے تعامل کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ "رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی" بہرحال خطائے بزرگاں گرفتن خطاست، پھر بقول اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو۔

گو علماء کرام کی شدید مخالفت کی وجہ سے یہ محفلیں 'یادِ رفتگاں' بن گئی ہیں پھر بھی باقیات صالحات میں ایسے حضرات موجود ہیں جو عمر رفتہ کو آواز دے کر پرانی یادوں کو حافظہ کی کال کوٹھری میں ٹٹولتے رہتے ہیں اور ان یادوں کے تعاقب میں ماضی میں بہت دور نکل جاتے ہیں اور پھر بڑے اداس لہجہ میں غزل چھیڑ کر مقطع میں سخن گسترانہ بات کہہ دیتے ہیں:

"اب نہ عرس کی محفلیں رہیں نہ خوبصورت طوائفوں کے جھمگھٹے لیکن بھیکی شاہ کا مزار آج بھی گرنا اور موسم مذی کے سنگم پر اپنی موجودگی سے دورِ گذشتہ کی شوخی اور چھچھلتی نغمہ ریزی کی یاد دلا کر دلوں کے زخم تازہ کر دیتا ہے۔" [2]

یہ حضرات گویا زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں ؎

گذر گئی ترے مستوں پہ ایسی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

(اسغر گڑوی)

اتر پردیش کے دیار پورب میں جہاں علماء و فضلاء اور اہلحدیث کا غلبہ رہا تھا وہاں بدعت کا بھی غلبہ قائم رہا۔ مبارک پور میں بانی مبارک پور سید حامد مبارک شاہ پر حاضری دینا باعث خیر و برکات سمجھا جاتا تھا، موجودہ قصبہ کے مشرقی حصہ میں ملک طاہر بابا کا روضہ بڑا متبرک تصور کیا جاتا تھا، سید سالار مسعود غازی کا نشان

---

[1] ایضاً ۔ نث نوٹ۔ گرنا اور موسم ندی کے سنگم پر مجہول النسب بھیکی شاہ کا مزار ہے گوپال پور کے راستے میں ایک درویش تھے جن کا مزار مرجع خلائق تھا۔ یہیں عہد رفتہ میں بڑا شاندار عرس ہوتا تھا۔ مشہور قوال بھی شریک مجلس ہوتے کہتے ہیں کہ طوائفوں کے ناچ اور گانے سے متاثر ہو کر یہاں کے دولت مند دیہاتیوں کی ورش کر دیتے۔ وتش دیتے کہ طوائفوں کو تنگیٔ داماں کی شکایت نہ رہتی، ایضاً ص ۱۳۸

[2] نقوش۔ حقیقو ایلگازی۔ ص

اکیسواں باب

مذہبی، معاشرتی اصلاحی تحریکیں اور مومن مصلحین و مبلغین

وہ مسلمان جن کے ذہنوں پر اسلامی تعلیمات اور تربیت کے اثرات گہرے مرتب نہیں ہو پاتے اور دلوں پر توحید کی تجلی کا پرتو نہیں پڑتا ان کا تعلق اسلام سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے، غیر اسلامی عقائد اور شرکیہ امور کی گردش انہیں محورِ اسلام سے دور اور دینی دائرے سے باہر اٹھا کر پھینک دیتی ہے، ان کے ذہنوں کے دریچے روحانی ہواؤں کے رُخ پر نہیں کھلتے اور یہ صرف رسمی مسلمان بن کر رہ جاتے ہیں۔ جب بھی کوئی مذہبی تحریک اپنے جلو میں کوئی ذہنی، فکری اور اخلاقی انقلاب لاتی ہے تو جن کے ذہنوں کی کھڑکیاں "شرحِ صدر" کے لیے کھلی رہتی ہیں، ان تبدیلیوں کو قبول کر لیتے ہیں اور پھر یہ تحریک مقبولیت کا علم اٹھائے ایک تہذیبی انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔

وہابی تحریک اور اہلحدیث

اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ برصغیر ہند کے مسلمانوں کا بھی دورِ انحطاط شروع ہو چکا تھا، تہذیب و ثقافت کی شکستگی کے ساتھ صدیوں پرانے فکری و ذہنی نظام میں بھی دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔ دوسری صدی کے آغاز تک مسلمانوں کی مذہبی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ دین چند فقہی مسائل کے مجموعہ کا نام رہ گیا تھا۔ شریعت کو ڈھونڈھیں تو جواب ملتا ہے قدوری (۴۲۸ھ)، ہدایہ (۵۹۳ھ)، منیۃ المصلی (ساتویں صدی ہجری)، کنز الدقائق (۷۱۰ھ)، شرح وقایہ (۷۴۵ھ)، درمختار (۱۰۷۱ھ) تک میں اور بات ٹوٹی ہے جا کر فتاویٰ عالمگیری پر جس کو بحکم اورنگ زیب عالمگیر پانچ سو کے قریب علماء نے مرتب کیا تھا، عمل بالحدیث کا پتہ نہ تھا۔ اس لیے بھی کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تک اس کے عروج اور تعلیم کی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کا التزام و اہتمام ہوا تھا۔ نام نہاد علماء سو اپنی مصلحتوں اور سلاطین و امراء کی خواہشوں کے مطابق دارالافتاء اور دارالقضاء کے اجارہ دار بن کر فتوے صادر کرتے تھے اور فیصلے کرتے تھے، حق و باطل کے بیچ کی امتیازی لکیر مٹ چکی تھی، اسلامی تعلیمات

کے چراغوں کی روشنی ماند پڑ گئی تھی، پرانے مدرسوں اور مکتبوں میں، تھوڑی بہت رونق رہ گئی تھی، روشنی ملتی بھی تو عزلت گزیں متقی پرہیزگاروں میں جو شہروں سے دور پڑے تھے۔

اندھیرے گاؤں میں اک بے چراغ مسجد میں
ہر ایک ہم سے بڑی روشنی کے ساتھ ملا (مومن محی الدین)

مسلمانوں میں مراسم شرک، غیر شرعی رسم و رواج اور بدعات کا بازار گرم تھا اور انہیں کے دائرے کے اندر یقین و عمل کی دنیا محدود تھی، بارہویں صدی مسلمانوں کے لئے کشمکش اور آزمائش کا دور تھا، ان کے سیاسی تنزل کی آخری سیڑھی آگئی تھی لیکن اسی زینے سے پھر اوپر چڑھائی بھی شروع ہو گئی۔ مذہبی احیا، معاشرتی اصلاح اور متعدد علمی و دینی تحریکوں کے آغاز کا زمانہ بھی یہی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ کے علمی و دینی خانوادہ میں کئی چراغ روشن ہو چکے تھے بارھویں صدی کی اس عظیم ہستی نے مجددانہ اور مصلحانہ جدوجہد کا آغاز کیا، تیرھویں صدی ان کے اولاد و احفاد اور ان کے اخلاف کا دور تھا، شاہ عبدالعزیز (متوفی ۱۲۳۹ھ)، شاہ عبدالقادر (م ۱۲۳۰ھ)، شاہ رفیع الدین (م ۱۲۲۹ھ)، شاہ عبدالغنی (م ۱۲۲۷ھ)، شاہ محمد اسماعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ)، شاہ عبدالحئی دہلوی (م ۱۲۴۳ھ)، شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی (م ۱۲۶۲ھ) وغیرہ کے انفاس قدسیہ سے شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا نونہال ان نونہالانِ چمن ولی اللہی سے گلستانِ ربانی بن گیا، جب ارباب صفا کا قافلہ بڑھا، تو ان میں ایک مرد میدان نمایاں ہو گیا۔ یہ تھی تیرھویں صدی کے مجدد اعظم سید احمد شہید کی ہستی۔ شاہ ولی اللہ نے جو خواب دیکھا تھا سید احمد شہید اسی کی تعبیر تھے شاہ عبدالعزیز نے جو نونہال لگایا تھا یہ اس کی بہار تھے۔ شاہ صاحب نے جو تمنا کی تھی سید احمد انہیں کی منہ مانگی مراد تھے۔

می خواست رست خیز ز عالم بر آورد
آن باغبان کہ تربیت این نہال کرد

[illegible] سے ظلمت کدۂ ہند میں رشد و ہدایت کی شمع روشن کی جس کی ضیا پاشیوں سے گمراہ [illegible] آپ وہ جوہر ذہن [illegible] کا عنایت کیا یہ تھے شاہ [illegible] ہندوستان کے مجاہدین آزادی کو ایک سلسلہ [illegible] تھے جنہوں نے علمائے سو اور جعلی پیرانِ طریقت کے خلاف [illegible] کے ایمان کی بنیادیں لرزا دیں۔

مراسم شرک و بدعت کے انسداد کے لئے آپ نے اپنے قلم کو شمشیر و خنجر بنا کر تقویت الایمان جیسی روح انگیز اور ایمان پرور کتاب لکھی جس کی اب تک پچاس لاکھ سے زائد اشاعت ہو چکی ہے[1] ولی اللہی مکتب فکر نے جس تحریک کی بنیاد ڈالی وہ فقط عقائد اور عبادات کے ظاہری اور باطنی اعمال سے ہی تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ اس کا مقصد اور لائحہ عمل سلف صالحین کے تمسک اور تعامل کے حبل المتین کو مضبوطی سے تھامے رکھنا تھا' ہندوستان میں وہابی تحریک کا مقصد اسلام کا تحفظ بھی تھا جو سترھویں صدی سے انگریزوں کی پھیلتی بڑھتی استبدادیت و استعماریت کی زد پر تھا اور جہاد جس کا نعرہ تھا۔

دیارِ پورب کے مصلحین

دیارِ پورب میں علماء دین کے وجود بابرکات سے مذہبی اور معاشرتی اصلاحات کا سلسلہ وہابی تحریک کے آغاز سے ہوا' اس تحریک سے جن بستیوں کو فیض پہنچا ان میں مئو' مبارک پور' ناس اور کوپا گنج شامل تھے' اس علاقے میں مسلک کے علمبردار حضرت شاہ ابو سحق نہراوی' متوفی ۲۳۴ھ ہیں' مولانا اسحاق اپنے استاد مولانا محمد فاخر زائر الہ آبادی (م ۱۱۶۴ھ) کی طرح عمل بالسنہ کے ساتھ فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے اور اپنے اجتہاد اور تفقہ پر عمل کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "نور العینین فی اثبات رفع الیدین" میں کیا ہے[2]۔ علم روایت کے ساتھ علم درایت میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے' اس علاقے کے اہلحدیث علماء کا ذکر گذشتہ صفحات میں مومن مجاہدین کے باب میں گذر چکا ہے۔

خانوادۂ ولی اللہی کے انفاس قدسیہ اور شیوخ کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد پورے ملک میں پھیل گئے تھے اور وہابی تحریک کی اشاعت میں کوشاں رہے' دیارِ پورب میں جونپور کو خاص اہمیت حاصل تھی' مولانا سخاوت علی جونپوری سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور ان کے خلیفہ مجاز تھے۔ متعدد مشاہیر اساتذہ سے کسب فیض اور تحصیل علوم کے بعد مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا عبدالحی دہلوی سے علوم کتاب و سنت کی تکمیل کی' کچھ دنوں نواب باندہ کے ساتھ رہے۔ اپنے وطن لوٹ

---

[1] جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات۔ ص ۳۹۰

[2] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری' تذکرہ علمائے مبارکپور' ص ۳۶' ۹۳' ۹۶

رہے تشنگانِ علم و عرفان کے لیے سرچشمۂ فیضان بن گئے۔ آپ کی ذات بابرکات سے ریاست جونپور و گرد و نواح میں بڑا فیض پھیلا۔ ان کے ارشد تلامذہ میں سے سینکڑوں عالم اور شیوخ پیدا ہوئے جنہوں نے دور دور تک ان کی تعلیمات کو پھیلایا، علم دین کے چراغ روشن کئے اور بدعات کو مٹایا۔

مئو ناتھ بھنجن کا قدیم قصبہ عالمگیر کی بیٹی شہزادی جہاں آرا کی جاگیر میں تھا، اسی کی سرپرستی میں قدیم صنعت پارچہ بافی کو یہاں حد درجہ فروغ حاصل ہوا، یہاں اس زمانے میں دین کا چرچا ضرور تھا لیکن تیرھویں صدی سے پہلے مئو کی کسی علمی حیثیت کا سراغ اور اس عہد کی کسی علمی شخصیت کا نام نہیں ملتا۔ علم دین سے بے بہرہ ہونے اور اس کی طرف غفلت برتنے کی وجہ سے یہاں "صحیح اسلامی عقائد اور دینی تعلیمات سے ناواقفیت اور جہالت عام تھی اور اس کے نتیجے میں اعتقادی و عملی گمراہی، بدعات و خرافات، تعزیہ سازی و تعزیہ پرستی وغیرہ کا عمل دخل رہا، اس پر ملک طاہر بابا کا روضہ اور اس کے ارد گرد پختہ قبریں اور اہل سنت کے محلوں میں بھی تعزیہ سازی کے مرکز غلو و گمراہی کی حیثیت سے اب تک قائم ہیں۔"[1]

علمائے اہلحدیث اور سلفی علماء کی کوششوں سے بڑی حد تک ان بدعات کا استیصال ہوا لیکن آج بھی جب کہ مئو میں شیعوں کے برائے نام ایک دو گھر ہیں لیکن سنیوں کے متعدد محلوں میں دیوبندی و بریلوی احناف کے زیر اہتمام متعدد تعزیے اٹھتے یا بنتے ہیں، بقول ان کے مصالح مسلکی کے تحت یہ تعزیے اٹھائے جاتے ہیں یا پھر بنا کر عشرۂ محرم میں رکھ دئے جاتے ہیں، شاید مصلحتی تعزیے ہوں۔[2]

مولانا فیض اللہ مئوی (۱۲۳۰ھ - ۱۳۰۶ھ) کا شمار مشاہیر علماء میں ہوتا ہے، مولانا محمد علی جونپوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اعظم گڈھ ضلع میں آپ کا اثر بہت نمایاں تھا، صادقپور کی تنظیم و تحریک میں شامل ہو کر اس کے نظام کے مطابق اطراف و اکناف کے تبلیغی دورے کرتے رہے۔ مجاہدین کی "خراسانی تحریک" سے منسلک رہے۔ بڑے اعلیٰ درجے کے واعظ تھے، وعظ و تذکیر کے ذریعے خلقِ خدا کو فیض پہنچاتے رہے، آپ کتاب و سنت کے جذبہ کو فروغ دیتے رہے، عمل بالحدیث کے لئے لوگوں کو ترغیب دیتے رہے اور اصلاح کی

---

[1] محمود [illegible] تذکرہ مرتبہ مظہر صاحب، فیض عام اکیڈمی جامعہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن یوپی، ۱۹۸۸ء ص ۲۰-۲۱
[2] ایضاً ص ۲۱

کوشش فرماتے رہے، آپ جب وعظ فرماتے تو تمام سامعین انتہائی خاموشی اور حضورِ قلب کے ساتھ ہمہ تن گوش بنے رہتے۔ آپ جہاں رہتے جمعہ کو بالالتزام آپ کا بیان ہوتا زبان میں اثر تھا لوگ دور دور سے آپ کا وعظ سننے آتے اور شاد و مستفید ہوتے، یہی شغل زندگی بھر رہا، درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور سلوک و تصوف کے ذریعہ خلقِ خدا کی اصلاح میں کوشاں رہتے، اطراف و جوانب میں اتباعِ سنت کا جذبہ اور عمل پیدا ہو گیا۔[1]

مولانا فیض اللہ مئوی کے سرچشمۂ فیض سے بکثرت تشنگانِ علوم مستفیض ہوئے اور ایسے عالم کامل پیدا ہوئے جن میں ہر ایک اپنی ذات سے بحر العلوم تھا۔ مولانا حسام الدین مئوی (م ۱۳۱۱ھ)، مولانا خدا بخش مہراج گنجی (م ۱۳۳۳ھ)، مولانا سلیم اللہ مئوی (م ۱۳۲۲ھ)، مولانا محمد علی ابو المکارم مئوی (م ۱۳۵۲ھ) جو مولانا فیض اللہ کے صاحبزادے تھے، مولانا محمد شفیع بانیٔ مدرسہ الاصلاح سرائے میر (م ۱۳۶۵ھ)، مولانا عبد الرحمٰن محدث مبارکپوری (م ۱۳۵۳ھ) اور مولانا شاہ محمد گھوسوی (م ۱۳۲۳ھ) کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی (م ۱۳۳۲ھ) آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

مولانا فیض اللہ مئوی نے درس و تدریس، رشد و افادہ اور وعظ و تذکیر کے ذریعے توحید خالص اور اتباعِ سنت کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس کی صدائے بازگشت اطراف و اکناف میں برسوں تک گونجتی رہی ان کے شاگرد اور خلف الرشید حکیم مولانا ابو المکارم مئوی نے اس نعرے کو فلک شگاف بنا دیا لیکن مخالفین ان کے خلاف ایسا شور و غل مچاتے تھے اور غوغا برپا کرتے تھے کہ حق گوئی کی آواز دب جاتی تھی مولانا محمد احمد صاحب ملا مئوی (۱۳۶۷ھ مطابق ۱۹۴۹ء) کو خصوصاً مخالفین کی طرف سے سخت مزاحمتیں اور اذیتیں جھیلنی پڑیں لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔[2] مولانا محمد احمد ملا صاحب کے صاحبزادے مولانا احمد مئوی (۱۲۹۰۔۱۳۶۷ھ) اپنے عظیم المرتبت والد کے نقشِ قدم پر چلے اور "نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد ز اول" کے مطابق مسندِ صدارت مشیخت کے شایانِ شان فقید المثال اور باکمال ثابت ہوئے۔

دیارِ پورب میں ولی اللہی مکتبِ فکر کے اہلحدیث علماء اور مصلحین کی تبلیغی مساعی جمیلہ سے خلقِ خدا کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ۱۸۷۶ء میں ضلع اعظم گڑھ (چکلہ۔ چکلا) کے افسر

---

[1] اور [2] محفوظ الرحمٰن فیضی۔ ایضاً ص ۳۸، ۳۴، ۳۶۔۴۰

ریڈ نے بندوبست اراضی کی رپورٹ میں لکھا کہ وہابی عقائد کے زیر اثر مئو، کوپا گنج اور مبارک پور
خاص میں شیخ مومنوں نے ہندوانہ رسوم و رواج سے اپنی برأت کا اعلان کر دیا ہے اور غازی
میاں کے میلے میں بہرائچ جانا ترک کر دیا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ ریڈ اسکے سالانہ عرسوں میں وہ
رونق نہیں پاتا تھا جو گذشتہ برسوں میں اس کا خاصہ تھا وہابی تحریک نے مشرکانہ رسوم اور بدعات
کو بیخ سے ختم کر دیا اب وہ لوگ جو غازی میاں کا عَلَم اٹھاتے تھے اور مبارک پور کے نواح زادہ میں
میلہ لگاتے تھے وحدانیت کے علمبردار بن گئے تھے راجہ سید مبارک شاہ (مبارک پور) کے جعلی
مزار پر وہ نہ حاضری دیتے تھے اور نہ تعزیہ داری کرتے تھے۔ [1]

دیوبندی مکتب فکر و خیال کے ترجمان مبلغین اور مصلحین نے دیار پورب کی دینی اور معاشرتی
اصلاحی تحریکوں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں مومن مبلغین و مصلحین بھی بلا استثنا شامل تھے، وہ علمائے دین
جو کسی خاص مکتب فکر کی نمائندگی کرتے تھے حالات کے تقاضوں کے جواب میں اپنے دور میں
اصلاح کی جد و جہد کرتے رہے۔ اصلاحی دورے، مواعظ اور تبلیغات کے ذریعے بدعات کا انسداد
اور خرافات کا ازالہ ہوتا رہا۔

مولانا شاہ ولی محمد گھوسوی (۱۲۸۴ھ - ۱۳۳۳ھ) نے اپنے اصلاحی دوروں میں بنگال
چوبیس پرگنہ، کلکتہ اور رانچی کے بے شمار مبتدعین کی اصلاح اور تربیت کی۔ مولانا محمد شفیع (۱۲۷۶
۔ ۱۹۴۵ء) بانی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اس علاقے کے بڑے پرجوش مبلغ اور مصلح تھے۔ مرسما
ازالہ بدعات کے لئے وعظ کرتے تھے۔ اعظم گڑھ کے ان دیہاتوں کا اصلاحی دورہ کرکے جہاں
تیجی [illegible] اور دھوم دھڑکے سے سنی مسلمان تعزیہ داری کرتے تھے گاؤں کی سربرآوردہ شخصیتوں
نے تعزیوں سے بدعت محرم ختم کرائی اور اب وہاں یا حسین کے نعروں کی جگہ نعرۂ تکبیر گونجنے
لگا۔ ان تمام مسلمانوں کی [illegible] دوری میں جہالت اور غیر قوموں کے اختلاط سے مشرکانہ رسمیں
داخل ہو گئی تھیں بالخصوص شادی بیاہ کے سلسلے میں حد درجہ اسراف بیجا کرکے لوگ خوان اسباب
[illegible] میں شامل ہو جاتے، برتنوں کی بڑی تعداد کے دلہن کے گھر جاتے اور ساتھ میں گائے
دینے [illegible] رواج تھا، نام و نمود کے لئے جہیز اور ولیمہ پر بڑا خرچ کرتے کہیں کہیں بیچی
دیکھا دیکھی دینے کا دستور تھا [illegible] کی طرح ملبوسات اور زیورات پر خطیر رقم خرچ کرتے تھے دہ

---

[1] [illegible] ۹۰-۹۶

شہرت طلبی کی غرض سے جتنی چادر ہوتی تھی اس سے زیادہ پیر پھیلاتے تھے[1] اس کے برخلاف حافظ عبدالشکور فیض آبادی نے ایک رسالہ "تحفۃ الاخاف" لکھا جس میں انہوں نے شادی بیاہ میں بارات کی اباحت کا فتویٰ دیا۔[2]

مولانا محمد شفیع نے اپنے مؤثر مواعظ کی خوش بیانی سے دیار کے دیندار لوگوں میں بیداری پھیلائی، ان کے تعاون سے ایک اصلاحی تنظیم عمل میں لائی گئی جس کا نام "انجمن اصلاح معاشرہ" تھا، اس انجمن کے دستور میں گیارہ دفعات تھیں جن میں بارات، کپڑا اور زیور کی تحدید کی گئی اور کم سے کم مہر بالخصوص مہر فاطمی کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا، حسب استطاعت ولیمہ کرنے اور اسراف و خرافات سے بچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس انجمن کے بنیادی اراکین تھے: مئو اور اس کے اطراف کے تین بزرگ محمد شاہ، قدرت اللہ شاہ اور مولانا محمد اسمٰعیل۔ جن مواقعات میں اس انجمن کی تنظیم کی گئی (۱۳۲۱/۱۹۰۲) وہ چھتیس ۳۶ کے قریب تھے۔[2]

حضرت مولانا محمد طاہر معروفی (۱۲۲۴ - ۱۲۹۶) پورہ معروف میں اس بستی کی عمومی نسل کے لئے ہر جمعہ کو وعظ کیا کرتے تھے جس میں بدعات اور شرکیہ امور پر سخت تنقید کرتے تھے چنانچہ آپ کے اصلاحی وعظوں کا یہ اثر ہوا کہ اس بستی سے بدعات کا خاتمہ ہو گیا۔[3]

الامام مولانا عبدالشکور بن ناظر علی کاکوروی لکھنوی (۱۲۹۳ھ - ۱۳۸۱ھ) نے شیعیت کے خلاف بڑی معرکہ آرائیاں کیں جن کے نتیجے میں ایسی بدعتیں جو شیعوں کے اختلاط سے پیدا ہو گئی تھیں ختم ہو گئیں۔ شیعوں کے مقابلے میں آپ اپنی مثال تھے۔[4]

مولانا شکراللہ مبارک پوری جامع صفات تھے اور ایسے مرد مجاہد تھے جو بیک وقت سیاسی، دینی، معاشرتی اور اصلاحی محاذوں پر قلم کی تلوار اور زبان کی شمشیر بے نیام چلاتے تھے، موت و حیات، شادی بیاہ اور ذات برادری کی غلط رسموں کا قلع قمع کر کے رکھ دیا اور صلاح اور سدھار کا ایک عہد آفریں سلسلہ آپ نے دیار پورب میں قائم کر دیا تھا۔

---

[1] تذکرہ علماء اعظم گڑھ ۲۶۲-۲۶۳ اور دیکھئے سی۔ ای۔ مس بیگ کی اردو ریڈر کی کتاب "زنانہ تعلیم" جس میں روز ولادت سے لے کر عقد نکاح تک جو رسومات ہوتی تھیں اور صرف ہوتا تھا اس بارے میں نصیحت کی گئی ہے (بمبئی لائبریری بمبئی ۱۳۳۳)۔

[2] اہلحدیث کی تصنیفی خدمات ۲۴۹

[3] تذکرہ علماء اعظم گڑھ ۲۸۶

[4] ایضاً ۳۱۳ فٹ نوٹ

بزرگانِ دین میں بعض منفرد طور پر نہ صرف ذاتی اصلاح کے لئے کوشاں رہتے بلکہ اہلِ خاندان کو بھی خلافِ شرع امور پر وعید کرتے اور برابر ٹوکتے رہتے، یہ وہ لوگ تھے جو مع اللہ کی خاطر اس دعا کے ٹکڑے "اَللّٰھُمَّ .... اِلَیْکَ اَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ" پر سختی سے عمل کرتے تھے بعض صالحین اتباعِ سنت اور سفر و حضر کے معمولات پر اتنی سختی سے عمل کرتے تھے کہ نمونۂ روزگار بن گئے تھے یعنی وہ تفردات جو محض استحبابی درجہ رکھتے ہیں ان پر بھی سختی سے عمل پیرا رہتے مثلاً مہرِ فاطمی کے بغیر نکاح نہ پڑھانا، صرف کھدر کے کفن کی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھانا وغیرہ۔ [1]

مولانا اسلام الحق کوپاگنجی (۱۲۲۲) نے شدھی سنگٹھن کی تحریک کے خلاف قصبہ میں علماء وطلبہ کی ایک انجمن "ضیاء الاسلام" قائم کی تاکہ اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کیا جائے جن کے خلاف آریہ سماج کے جلسے اور مناظرے چیلنج کرتے رہتے تھے۔

بدعات کے انسداد کی خاطر تحریری اور بالمشافہ مناظرے بھی ہوتے تھے، عقاید شرکیہ کے متعلق ایک مناظرہ مولانا سیف بنارسی اور مولوی فاخر حنفی الہ آبادی کے درمیان ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں ماہ جمادی الاول ۱۳۳۱ھ میں ہوا تھا لیکن مقابلہ شعر و شاعری میں ہو کر رہ گیا۔ [2]

مئو میں جہاں اہلحدیث کی غالب تعداد تھی وہاں دوسرے مسلکوں کے پیروکاروں سے تصادم ناگزیر تھا، پچاس برس پہلے جب مئو میں حنفی اور اہلحدیث کی خوب نوک جھونک ہوتی تھی دونوں طرف جلسے رہتے تھے، جامع مسجد فیض عام پر جلسہ تھا، مولانا محمد احمد ناظم جامعہ فیض عام مئو کی عالی مرتبت شخصیت تھے۔ ناظم صاحب اپنی صنعت (دوکان) کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد سادی ہی کی پگڑی باندھ کر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور اس موضوع پر کہ "احناف کے یہاں اکابر کے احترام میں بڑا غلو پایا جاتا ہے" برجستہ دو گھنٹہ تقریر فرمائی جس کا احناف میں بڑا چرچا ہوا کہ ناظم صاحب بھی میدان میں آگئے۔ [3]

---

[1] [illegible] ص ۳۲

[2] [illegible] صفحہ ۲۲۲-۲۲۳ [illegible]

[3] [illegible] تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم۔ فیض عام اکیڈمی، جامعہ فیض عام (مئو ناتھ بھنجن ۱۹۸۸) ص ۹۳

مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی (۱۳۰۳-۱۳۸۶ھ) کا آبائی وطن اعظم گڑھ کا محلہ آصف گنج تھا، بنارس کے مدرسے 'اشاعۃ العلوم' کے فارغ یافتہ تھے، جامع مسجد گیان باپی کے خطیب مقرر ہوئے (۱۳۴۶ھ) تو آپ نے اپنے جمعہ کے خطبات کے ذریعے اصلاح عقائد واحیاء سنت اور جاہلانہ رسوم کے انسداد اور استیصال کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا۔ اصلاحی دورے بھی کرتے تھے، بنارس اور اطراف بنارس کا کوئی گوشہ آپ کے وعظ سے خالی نہ رہا اور نہ ہی کوئی خطہ آپ کے اصلاحی کتابچوں سے محروم رہا، مولانا کے محلے میں مسلمان عورتوں میں برقع یا حجاب کا رواج نہ تھا عام طور پر عورتیں "جھولا" (بغیر آستین کا بلاؤز نما کرتا) پہنتی تھیں۔ مفتی صاحب نے اپنی مومن برادری ہی کو نہیں عام مسلمان خواتین میں پردہ کی اہمیت اور رواج کی حرمت کو واضح کیا، بحمدللہ رفتہ رفتہ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کا معاملہ یکسر ختم ہو گیا اور حجاب یا برقع کا رواج عام ہوا۔ مفتی صاحب نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے جو آواز بلند کی اس کی گونج ویران مسجدوں میں سنائی دینے لگی، باجماعت نماز کا اہتمام ہونے لگا۔ اسی طرح بدعاتِ محرم کے انسداد کے لیے انہوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ محرم کے باجے اور ماتم کی حرمت کو واضح کیا۔ مگر مخالفین آپ کو ایذا پہنچانے لگے، آپ کے مکان کو گھیر کر دس روز تک مکان کے دونوں جانب دن رات نقارہ پیٹتے رہے۔ مگر مقلب القلوب نے دلوں کو پھیرا، پھر اہل خانہ کا صبر اور ان کی دعائیں کام آئیں نقارے کی شیطانی آواز اور عفریتی چنگھاڑ بند ہو گئی اور یہ رسم بد بھی بند ہو گئی۔

"غرض اصلاحِ معاشرت، احیاء سنت اور غلط رسم ورواج کے خلاف مسلسل جہاد کرتے رہے، عوام و خواص کی طرف سے اظہار ناراضگی و برہمی بھی ہوا مگر آپ نے بگڑے ہوؤں اور معاشرہ کو سدھارا" [1] مولانا عبدالقیوم بنارسی (۱۳۴۶-۱۴۰۶ھ) ایک اگاڈیمی ڈھاکہ مشرقی پاکستان کے صدر رہ چکے تھے۔

علمائے اہلحدیث اور ان کے مخالفین کے مابین ایک دوسرے کی تردید اور مذمت میں تصنیفات کا لامتناہی سلسلہ آج تک جاری ہے، ان میں عبادات کے فروعی مسائل جیسے تقلید، رفع الیدین، آمین بالجہر، تراویح کی تعداد رکعات وغیرہ جو بہ النزاع بنے رہے ہیں اور فاتحہ و نیاز جیسے غیر مسنونہ اور مراسم شامل ہیں۔ "رسم الخط ورسم المجزات" کے موضوع پر وہابیوں کی تصنیف کے جواب میں کثرت

---

[1] وسیم احمد اعظمی۔ تذکرہ علماء بنارس ۱۹۹۰ء، ص۲۳۴، ص۲۳۱

استدعا رساکنانِ بنگالہ" پر مولانا خلیل الرحمن پرمتی المصطفیٰ آبادی نے "رسالۂ فاتحہ در ردِ بدعیہ"
لکھی جس میں گیارہویں کی نماز، قبر پرستی، میلاد اور محرم وغیرہ کے موضوعات پر اہلحدیث کی تصنیفی
خدمات کے لیے امت مسلمہ کا سنجیدہ طبقہ مرہونِ منت ہے۔ حدیث و قرآن کی روشنی میں ہمارے
بزرگانِ دین نے عصر حاضر کے مسائل پر مجتہدانہ نظر ڈالی ہے اور ایسا کوئی موضوع نہیں رہا جو
ان کے احاطۂ قلم سے باہر رہا، یہاں تک وبا پھیلنے پر اس کے بارے میں جو احادیث وارد ہیں
ان کی روشنی میں بھی محدثین کرام نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں، مولانا عبیدالرحمن محدث
مبارک پوری نے جو برادری کے عظیم المرتبت عالم گذرے ہیں "حیات الماعون فی منع الفرار
من الطاعون" میں طاعون زدہ مقامات سے فرار کی حرمت کے براہین پیش کرتے ہوئے
بھاگنے والوں کے حیلوں اور بہانوں کو نقل کرکے ہر ایک کا مدلل جواب دیا ہے۔[۲]

مصلح الامۃ حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوری (متوفی ۱۳۸۷ھ)

"حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مصلح امت حضرت مولانا وصی اللہ فتحپوری
کا ذکر تو باب بندۂ مومن کے روحانی سلسلے" میں تفصیل سے گذر چکا ہے، لیکن چونکہ آپ کی ذات
و صفات شخصیت کے کئی اور پہلو تھے اسی لیے ان کا ذکر ایک مصلح عظیم کی حیثیت سے ان صفحات
میں پایا جارہا ہے۔ آپ کی اصلاحی سرگرمیوں کا دائرۂ عمل دیارِ پورب سے لے کر مغربی بنگال میں
بمبئی دریا تک پھیلا ہوا تھا، ہر جگہ آپ کے ارشد تلامذہ، مریدین اور مسترشدین کی بڑی تعداد
تھی اور اکابر و اماثل بھی آپ سے بیعت تھے اور بڑی خدمت بجا لاتے تھے۔
موضع قصبہ کی اصلاح میں حضرت مولانا کو بہت دخل تھا، ان کی آمد سے پہلے اس قصبہ
میں بہت سی خرافات اور رسومات فاسدہ کا رواج تھا۔ آپ نے ایک عرصہ تک یہاں قیام کیا
پٹھان پورہ کی مسجد کے حجرے میں رہتے تھے جہاں کبھی گرفت و یادِ خدا را ہبانہ ساخت، کے

۱ـ [illegible] مسجد ببئی مطبوعہ ۱۲۶ھ

۲ـ [illegible] حضرت عمر [illegible] عبدالرحمن بن عوف کی روایت جو رسالہ [illegible]
حضرت عمر [illegible] تمام لوگوں کے ہمراہ مقام سرغ (ملک شام) سے واپس مدینہ تشریف لائے کیونکہ وہاں وبا پھیلی
تھی [illegible] حضرت شاہ ولی اللہ۔ مترجمہ مولانا [illegible] رشیدی ادارہ
ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور [illegible] ۱۹۷۰ء۔ صفحہ ۳۰۹ تا ۴۱۵

مصداق عزلت گزینی اختیار کرلی تھی یہی آپ کی عادت تھی بعد میں رئیس کرپا گنج حاجی عبدالرب صاحب کی کوٹھی میں رہنے لگے تھے۔ یہیں ان کے عقیدتمندوں کا مجمع لگتا، اصلاح و تزکیۂ نفس کا سبق دیا جاتا۔ آپ کو کوپاگنج سے جو قلبی لگاؤ تھا اس نے انہیں اس کے خیال سے فتحپور، گورکھپور، الٰہ آباد اور بمبئی کے قیام میں بھی غافل نہیں رکھا، برسوں تک یہیں سے تعلق رہا جس کی وجہ سے شرکیہ مراسم اور رسومات فاسدہ کا انسداد ہوگیا اور بہت سے لوگ جو ضلالت و گمرہی کے راستے پر بھٹک رہے تھے صراط مستقیم پر آگئے اور تسبیح و مصلیٰ کے عادی ہوگئے۔ آپ کا حلقۂ ارادت پھیلتا گیا، مریدین کی کثرت کے علاوہ مجازین و خلفاء بھی حلقہ بگوش عقیدت بن گئے حکیم مولانا بشیر الدین، مولانا عبدالقیوم، مولانا نثار احمد، مولانا انوار احمد، مولانا محفوظ الرحمٰن، مولانا محمد حنیف بستوی ثم کرپاگنجی قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر مجازین بیعت میں ہیں اور آخر کے چار مجازین صحبت ہیں۔[1]

کوپاگنج کی عظیم برگزیدہ ہستی مولانا عظیم اللہ (متوفی ۲۶ مئی ۱۹۶۷ء) گو مصلح الامت سے بیعت نہ تھے لیکن آپ انہیں انتہائی وسیع العلم، ہمہ گیر اور جامع اوصاف ہستی تسلیم کرتے تھے ان کے نزدیک یہ مجاہد اسلام اور صوفی کامل تھے، مولانا کا تبلیغی نظام کا بڑا کارگر اور موثر تھا، مولانا فتحپوری کے بارے میں اسی قصبہ کے مولانا اسلام الحق (متوفی ۱۶ دسمبر ۱۹۶۷) کے خیالات بھی بڑے بلند تھے ان کے اصلاحی و تبلیغی کاموں سے لوگوں کو خصوصاً کوپاگنج کے ندا طبقہ میں ان کے طفیل سے بڑے مفید اور اچھے اثرات سامنے آئے اور بیشمار لوگوں نے ان کے مواعظ حسنہ اور اصلاحات سے فائدہ اٹھایا"[2]

مولانا فتحپوری کے حلقۂ ارادت میں کوپاگنج کے کئی مشاہیر شامل تھے جن میں یہ لوگ قابل ذکر ہیں: حکیم مولوی محمد شفیع ولد حاجی عبداللہ ولد حاجی محمد یعقوب (۱۸۸۰-۱۹۵۸)۔ مولوی حافظ عبدالمنان نابینا (۱۹۰۲ء-۱۹۶۹ء)، مولانا عبدالقیوم (۱۳۲۵ھ - ۱۴۰۲ھ)۔ برادری کے رئیس اور مخیر بزرگ حکیم عارف الحاج نثار احمد (۱۹۲۳-۱۹۸۴ء) مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ سے بیعت تھے۔ اپنے پیر و مرشد سے عشق کے درجہ میں محبت رکھتے تھے، بالآخر ان کے مجازین صحبت میں داخل ہوئے۔ شیخ ہی کے اشارہ سے خدمت خلق کے لئے الٰہ آباد

---

[1] و [2] تذکرۂ مشاہیر کوپاگنج ص ۲۵، ۴۶، ص ۶۵

میں آپ نے طب پڑھی، مولانا انوار احمد (ولادت ۱۳۴۲/۱۹۲۳) نے اپنے مرشد مولانا فتحپوری کے ایماء سے ایک مدرسہ قائم کیا۔

مولانا فتحپوری کئی برس کرباگنج میں مقیم رہے خانقاہ فتحپوری کے علاوہ کئی مدرسے اور مسجدیں انہیں کے ایماء پر تعمیر کی گئیں۔ ان کی آمد سے پہلے کرباگنج کا ماحول ابتر تھا۔ قدم رسول کی زیارت کے سلسلے میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا، بدعت عام تھی اور جہالت جڑ پکڑ چکی تھی۔ لوگ عقیدت میں آکر قدم رسول کو سنوارنے اور اس پر پھول چادریں وغیرہ چڑھانے لگے تھے۔[1] کرباگنج کا معاشرتی ماحول اس زمانے میں بجد خراب اور ناگفتہ بہ تھا مولانا اسلام الحق نے اس کا پس منظر یوں بیان کیا ہے:

> ''دو شہروں کا باہمی سلوک اور آپس کا ربط ٹھیک نہیں ہے، ہر شخص (عالم دین) الگ الگ ہو کر ایک خاص نظریہ رکھتا ہے۔ زندگی بسر کرنے کے لئے کچھ خاص نصب العین یعنی ڈھنگ [یا پیشہ] جس کی وجہ سے .... گھرانے وہ ہوتا ہے جو آپس کے تعلقات اور باہمی معاملات کیلئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے علاوہ تقریباً ہر عالم کے اندر یہ بات پیدا ہو گئی ہے کہ اس کے پاس لوگ جائیں اس کے گروہ (پارٹی) کو تقویت حاصل ہو، اس کے مریدین اور ماننے والے بکثرت ہوں .... وہ بھی الگ الگ حلقوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے .... آپس کے تعلقات بگڑتے ہیں معاشرہ میں ... خوشگواری و ربط و سلوک کی کمی ہوتی ہے اور آج ہمارے معاشرہ میں جو برائیاں عام طور پر موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے تو تہذیب و ثقافت کا شائبہ تک نہیں جس کی وجہ سے معاشرہ بگڑا ہوا اور فساد معلوم ہوتا ہے ....''[2]

حکیم مولانا نثار احمد بن حکیم محمد شفیع (۱۹۲۳-۱۹۸۴ء)

عارف باللہ مرشد شاہ وصی اللہ کی توجۂ خاص سے اور خود مرید کے مجاہدہ ریاضت نفس تصور شیخ اور حضوری مجلس سے حکیم مولانا نثار احمد کی اصلاح نفس اور تطہیر قلب کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ آپ پر کبھی کبھی گریہ طاری ہو جاتا، آپ کی صحبت میں خشیت الٰہی اور خوف خدا طاری ہو

[illegible] ص ۳۵ - ۴۲ ، ص ۴۵

جاتا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد اوراد و نفل سے فارغ ہو کر گھنٹوں پند و نصیحت فرماتے اور مواعظ حسنہ سے سامعین کی ایسی قلب ماہیت ہو جاتی کہ وہ خود عالم جذب میں ڈوبے رہتے، تنشیطِ طبع کے لئے کبھی کبھی ہنستے ہنساتے تھے۔ مولانا محمد عثمان معروفی، مصنف "تذکرہ مشاہیر کوپاگنج" سے ایسے چند طغرے شیشے پر بنا کر کمرہ میں آویزاں رکھتے تھے جو اصلاحِ نفس کے لئے مفید تھے مثلاً اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ [1]

مولانا مودودی کے بعض نظریات سے اختلاف

آزادیٔ وطن سے پہلے جب بہت ساری سیاسی جماعتیں اور تحریکیں استعماریت کے خلاف اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی جد و جہد میں معرکہ آرا تھیں، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی تجدید فکر کا نعرہ بلند کیا، خلافت کی اجتماعی تحریک کے مقابلے میں اس سے علاحدہ نظریات اور اسلامی تفکرات کو بنیاد بنا کر اسلامی تنظیم و تحریک "جماعت اسلامی" کا نام دے کر رہبری، دین کے بنیادی عقائد توحید، رسالت اور آخرت پر اور اسلامی تعلیمات پر نئے علمی اور فکری انداز سے زاویوں کے ساتھ ترجمان القرآن (اجرا ۱۹۳۲ء) میں گفتگو ہونے لگی۔ مولانا مودودی کی انقلاب انگیز تحریروں نے رفتہ رفتہ عوام اور مفکرین اسلام کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کی بنیاد پڑی اور ایک تحریری دستور طے ہوا اور متفق رائے سے مولانا مودودی کو امیر جماعت چنا گیا، ملک کی تقسیم تک متحدہ ہندوستان کے امیر جماعت مولانا مودودی ہی رہے — لیکن وہ اکابرِ دین جو جمعیۃ العلماء کے ساتھ اور دین کا یک فہمی نظریاتی اور بنیادی عقیدہ رکھتے تھے وہ مولانا مودودی کے نظریات کے سخت مخالف تھے ان کا اعتراض یہ تھا کہ بہت سارے مسائل جن کا حل نکالا گیا ہے لائق ترک ہیں اور صحیح راستے سے ہٹ کر ہیں اس وجہ سے کہ آزاد خیالی نے جماعت کو اسلام کے بنیادی "الاحکام السلطانیہ" سے دور کر دیا ہے، اس لئے کہ یہ دین کے اندر سہولت چاہتی تھی اور علماء اسے تغیرِ دین سے تعبیر کرتے تھے جو بہر حال معیوب تھا، احادیث اور صحابہ کرامؓ کے متعلق بھی ان کے عقائد اور خیالات لائق تنقید تھے کیونکہ وہ ان کو معیارِ حق نہیں سمجھتے تھے۔ ان تمام تعبیرات سے علماء کے ایک طبقہ کو جو عقائد میں صحیح راستے پر تھا، "مودودیت" کا

---

[1] الزمر: ۳۶ [2] تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۱۸۸

اندیشہ ہونے لگا تو انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور متعدد تصانیف منظر عام پر آئیں مثلاً:

۱۔ مودودیت اور احادیث نبویہ۔ مولانا عبداللہ روپڑی (۱۳۰۳-۱۳۸۴ھ)۔ یہ کتاب دراصل ایک استفسار کا جواب ہے جس میں پانچ سوالات ہیں اور سب مولانا مودودی کے نظریۂ حدیث سے متعلق ہیں۔

۲۔ تحریک جماعت اسلامی کا پس منظر۔ مولانا محمد داؤد راز۔ اس کتاب میں مولانا مودودی کے ان چند غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو آیات قرآنی واحادیث رسول میں ان سے ہوئی ہیں اور احادیث کے سلسلہ میں ان سے ہوئی ہیں اور احادیث کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کی بھی تردید کی گئی ہے [۱]

۳۔ جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ مولانا محمد اسماعیل گجرانوالہ: یہ کتاب دراصل مولانا مودودی کی کتاب "تفہیمات" و "مسلک اعتدال" اور مولانا احسن اصلاحی کے ایک مضمون بسلسلۂ حجیت حدیث کے جواب میں ہے جن میں ان حضرات نے منکرین حدیث سے اتفاق فرمایا ہے۔

۴۔ تنقید المسائل۔ مولانا محمد صاحب گوندلوی: مولانا کی کتاب "روداد جماعت اسلامی (حصہ دوم صفحہ ۱۲) کی عبارت جس کا مفہوم یہ ہے کہ "میں (یعنی مولانا مودودی) جس دین کو لے کر آئے ہیں اس پر اگر کوئی لبیک نہ کہے گا تو اس کی موت یہودیت یا نصرانیت پر ہوگی" پر اچھی خاصی بحث کی گئی ہے۔

۵۔ تحقیق مسئلہ دجال۔ مولانا محمد سلیمان مئوی (۱۳۱۲-۱۳۹۹ھ)۔ اس کتاب میں مولانا مودودی کے اس قول کی بدلائل تردید کی گئی ہے کہ "یہ کانا دجال وغیرہ افسانے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے" (ترجمان القرآن مجریہ رمضان و شوال ۱۳۶۴ھ)

۶۔ نیا مذہب نکر۔ مولانا عبدالمبین منظر (۱۹۲۱-۱۹۸۹ء): یہ کتاب مولانا مودودی کے "مسلک اعتدال" کے جواب میں ہے جس میں انہوں نے احادیث رسول کے سلسلہ میں منکرین حدیث کی روش اختیار کی ہے" [۲]

دیار پورب میں جب فتنۂ مودودیت نے سر اٹھایا تو اعظم گڑھ کی بستی چھاؤں کے مولانا

---

[۱] جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات۔ صفحہ ۳۶۳، ۳۰۸

[۲] ،، ،، ،، ،، ،، ،، صفحہ ۳۸۱ - ۳۸۲

شاہ عبدالغنی پھولپوری (۱۲۹۳-۱۳۹۳) اس کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوگئے "آپ برملا اپنی مجلسوں اور مواعظ میں اس کی بھرپور مدلل تردید اور اس رویہ کی مذمت کرتے۔ اپنے عقیدتمندوں کو خبردار کرتے اور اس فتنہ سے احتراز کرنے کی ہدایت فرماتے اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ملک کے مشاہیر علماء کرام جیسے شیخ الاسلام مولانا سید احمد حسین مدنی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، مولانا ابو وفا شاہجہاں پوری، مفتی محمود حسن گنگوہی کو اپنے مدرسہ بیت العلوم کے جلسہ میں تقریریں کرنے کے لئے مدعو کیا" جس کا اثر یہ ہوا کہ اس فتنہ کی فریب کاریاں اس دیار کے لوگوں پر واضح ہوگئیں اور عوام کی کثیر تعداد اس جماعت سے الگ ہوگئی۔

سرائے میر کا مدرسۃ الاصلاح بھی اس فتنہ کی لپیٹ میں بری طرح آگیا تھا۔

مولانا کی ذات بابرکت تھی کہ سیتاپور میں جب مدرسہ اسلامیہ عربیہ میں مدرس اول تھے تو وہاں کے لوگوں نے ایک مرتبہ مولانا سے کہا کہ آپ بھی یہاں کی رسم کے مطابق تیجہ، دسواں، بیسواں وغیرہ کی تقریبات میں شرکت کیجئے۔ مولانا نے یہ سنتے ہی بڑی خفگی سے جواب دیا کہ "ان خرافات کے لئے کسی بدعتی روحی ملا کو بلا لو میں یہاں دین بیچنے نہیں آیا ہوں" ـــــ اس واقعہ کے چند روز بعد تا مدرسہ اسلامیہ سیتاپور سے الگ ہوگئے۔[1]

تبلیغی جماعت

اسلام ایک تبلیغی دین ہے اور ہر مومن کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے لئے کوشاں رہے، پہلی قوموں کی گمراہی اور تباہی کا بڑا سبب اسی فریضہ سے علماء کی غفلت تھی۔ یہ فرض کفایہ بھی ہے اور حقوق العباد میں شامل ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے "فرائض اور قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ (ترمذی بروایت ابوہریرہؓ)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے داعیانِ حق کو بہت سراہا ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ

"اور شخص سے کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔" (حٰم السجدہ: ۳۳)، بھلائی کی طرف رہنمائی کرنے والا ایسے ہے جیسے خود اس نے

---

[1] تذکرہ علماء اعظم گڑھ۔ ص ۱۸۸

بھلائی کی ہو" (ترغیب و ترہیب، بزاز)

بھلائی کے لیے دنیا میں ہزاروں عمل ہیں۔ ہر نیک عمل کرنے پر جنت کا وعدہ کیا گیا اور جنت میں محل بنانے کی خوشخبری دی گئی ہے (حصن حصین) لیکن بہتر تو یہ ہے کہ جنت کی بشارت دینے کے بجائے اس کے حق میں دعا کی جائے مگر سب سے پہلے مغفرت کی۔ اگر کوئی کسی کو کلمہ پڑھوا رہا ہے اور کوئی وضو اور غسل وغیرہ کے مسائل بتا رہا ہے تو وہ بھی بہرحال خدا ہی کی راہ میں یک خدمت انجام دے رہا ہے۔

تبلیغی جماعت یک اہم دینی تحریک ہے جو میوات کے مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی رہنمائی میں خاموشی کے ساتھ چل رہی تھی جس نے دس بارہ سال کے اندر اس علاقے کی کایا پلٹ کردی اور میو قوم جو جہالت اور گمراہی میں پڑی ہوئی تھی اس میں تبلیغ و اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ایسی روحِ ایمانی پیدا ہوگئی کہ یہ لوگ خود گاؤں گاؤں پہنچ کر خیر و صلاح کی دعوت دینے لگے۔ ایک زمانہ تھا کہ بسا اوقات یہ لوگ پیدل گشت کرتے ہوئے دو دو سو میل تک چلے جاتے تھے ان کا رختِ سفر اور زادِ راہ ان کے کندھے پر ہوتا تھا، کسی پر اپنا بار نہیں ڈالتے نہ کسی سے کچھ طلب کرتے۔ محض اللہ کی خوشنودی ان کے مدنظر ہوتی۔ جن جن بستیوں پر سے ان کا گذر ہوتا وہ مذہبی بیداری اور کلمہ و نماز کے نور سے منور ہو جاتی۔[1]

مولانا کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف امیر منتخب ہوئے۔ آپ کے دور میں جماعت نے بڑی وسعت اختیار کی اور عالمی پیمانے پر بھی نمایاں دینی خدمات انجام دی ہیں۔ لاکھوں بے نمازیوں، شراب خوروں، جوابازوں اور سماج دشمن شرپسندوں کی اصلاح کرکے مسجدوں کی رونق بڑھادی۔ تبلیغی جماعت کے چھ اصول ہیں جن سے اس کا نصب العین اور طریق کار وغیرہ واضح ہوتا ہے:[2]

(۱) کلمہ و ایمان یقین (۲) نماز یعنی شکل مخصوص (۳) علم۔ فضائل و مسائل، اللہ کا دھیان (۴) اکرام مسلم یعنی مسلمانوں کی نوعیت کا لحاظ (۵) اخلاصِ نیت یعنی تصحیح نیت (۶) تفریغ وقت۔ یعنی نفس کے خلاف مجاہدہ۔

"یہ چھ باتیں ہیں جن کے گرد تبلیغی جماعت کی ساری کوششیں صرف ہوتی ہیں۔ یہ چھ باتیں

---

[1] ... اسلامی دعوت، [illegible] مرتبہ محمد سلیم محمد عبدالحی ملا، ۲۰۱۔۲۰۲

بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا کیا مطلب ہے۔ اور صرف یہی باتیں کیوں؟ اور کب تک؟ اور سیاست و اجتماعیت میں تبلیغی جماعت کیا رہنمائی کرتی ہے؟ اور یہ کہ اس کا تصور دین وہی ہے جو قرآن کا ہے یا رہبانیت سے اس کے ڈانڈے مل جاتے ہیں؟" [1]

یہ سارے سوالات دو دہائی قبل ایک خاص نقطۂ نظر رکھنے والی بنیاد پرست جماعت نے اٹھائے تھے۔ پھر "تبلیغی نصاب" جو گویا علم کی انتہا در حرفِ آخر ہے تنقید کا نشانہ بنا ["ضعیف الاسناد احادیث جن کا تعلق کسی چیز کے حلال و حرام ہونے سے نہ ہو بلکہ ایک ایسے کام کا ذکر جس کو کیجئے تو ثواب نہ کیجئے تو کوئی گناہ نہیں، محدثین کے اس اصول کی بنا پر کہ فضائل اعمال میں ہیں قابل قبول ہیں"] [2]

پھر سنجیدہ اور ثقہ حضرات جو علوم دینیہ سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں شاکی بن گئے کہ "چالیس دن کا چلہ کشیدہ" اپنے آپ کو داعی مطلق کچھ بیٹھتا ہے اور اذانِ عثمانی سے ماقبل یا مابعد اپنے بیان میں ایسے 'علم الیقین' کے ساتھ "تبلیغ و محنت" کے بارے میں اجر و ثواب کی بشارت دیتا ہے اور "کتابوں میں لکھا ہے اور بزرگوں نے کہا ہے کہ" حجابوں پر پردہ ڈال کر ایسے انکشافات کرتا ہے کہ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے" "رجماً بالغیب" کی ایسی بہت سی ہوائیاں اڑانے سے مصلیان میں سے جو عالم دین رہتے ہیں ان کے چہروں پر یہ سن کر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں اور بڑی دبی زبان سے کہتے ہیں "وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ" (کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ اسراء - ۳۶)

ظن کی اساس پر کوئی رائے دینا باطل اور بے بنیاد ثابت ہو سکتی ہے ظن کی حرمت کی دلیل میں قرآن کریم یہ آیت پیش کرتا ہے:

"أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ" (کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہہ رہے ہو جن کا تمہیں علم نہیں" (اعراف: ۲۸)

---

[1] اسلامی دعوت اور خواتین۔ مرتبہ ابو سلیم محمد عبد الحئی صفحہ ۹۶ - ۲۰۱ - ۲۰۲

[2] شرح اربعین نووی مع عربی متن و شرح (اردو) عربی تصنیف امام ابو زکریا محی الدین النووی۔ اردو ترجمہ و شرح حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی ادارہ اشاعت کراچی ۱۹۷۶ صفحہ ۱۰ اور دیکھئے "تبلیغی نصاب۔ ایک تنقیدی مطالعہ" تابش مہدی۔

اخباروں[1] میں بھی مراسلات اور خبریں چھپ چکی ہیں اور تجربہ میں بھی آیا ہے کہ کچھ مسجدوں میں جمعہ کو جب بیان ہونے لگتا ہے (جو یقیناً خطبۂ مسنونہ کا نعم البدل نہیں بلکہ بظاہر ایک نئی چیز یا مقدمۂ خطبہ ہے) تو مصلیان کو تحیۃ المسجد اور دوسری نفلیں جو بظاہر فقہی اصطلاح میں "ذات اسبب" ہوتی ہیں اور یہاں تک کہ سنت پڑھنے سے بھی روک دیا جاتا ہے، یہ صحیح ہے کہ اللہ کے رسول ؐ نے جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ سے مروی ہے حضرت سلیک غطفانی کو جب وہ جمعہ کے دن مسجد میں نماز پڑھنے سے پہلے بیٹھ گئے تو نبی صلعم نے جو منبر پر تشریف فرما تھے فرمایا کہ کیا تم نے دو رکعتیں پڑھ لی ہیں۔ انھوں نے جواباً عرض کیا، نہیں، آپ ؐ نے فرمایا، اٹھو دو رکعتیں نماز پڑھ لو[2]۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خطبۂ مسنونہ کے دوران بھی تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کا پڑھنا جائز اور مستحب ہے۔ اور کسی بیان دینے والے یا داعی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بیان کو سنت رسول سے زیادہ اہمیت دے اور صحیح اور صریح سنت کو اپنے مذہب کی قید کی حجت لے کر ترک کردے اور مسجد میں داخل ہونے والوں کو تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں سے باز رکھ کر بیٹھ جانے کا حکم صادر فرمائے۔ بیان کے اختتام پر دوسرا حکم نافذ ہوتا ہے "ہاں تو بھائی لوگ اب آپ سنت پڑھ لو"! — اس حدیث میں غالباً مصلحت یہی ہے کہ مصلیان سب کچھ چھوڑ کر بیان سنیں (واللہ اعلم)۔

بیان دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ فضائل سے ہی نہیں فقہی مسائل سے بھی واقف ہو اور اپنے علم و انتہائی امکانی حد تک استعمال کرتے ہوئے عوام الناس کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی سنت کا وہ راستہ دکھائیں اور بتائیں جو اللہ کے رسول ؐ کی سنت کے مطابق ہو اور جس کا علم نہ ہو اس کے بارے میں خاموش رہے۔ ہر کوئی شریعت کے رمز سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

[illegible] بہت ساری فقہی ہیں اور پھر جماعت کے اصول بن جاتے ہیں مثلاً ثواب و جنت کا [illegible] جس نے چالیس دن کے چلے کے دوران اول تکبیر سے باجماعت پانچوں وقت کی نماز ادا

---

[1] [illegible] روزنامہ انقلاب بمبئی مورخہ جمعرات ۲۵ مارچ ۱۹۹۳ مطابق یکم شوال المکرم [illegible] [illegible] اور [illegible] معنی [illegible] مستحب ہے لیکن اگر [illegible] [illegible] صلاۃ التحیۃ [illegible] بیان حکم صلاۃ التحیۃ فی الاوقات المکروھۃ [illegible] نواب صدیق حسن خاں

[2] [illegible]

کی اس پر جنّت واجب ہو جائیگی" یا تسبیحات کا متعین شمار کسی بشارت کا حامل ہوتا ہے۔
بہر حال ہمارے نزدیک جنت کی بشارت دینے سے بہتر ہے کہ اس کے لئے دعا دی جائے پھر
اللہ تعالیٰ نے فرمایا بھی تو ہے کہ :-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ
جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ٥ (آل عمران : ۱۴۲)

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا
ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اسی کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر
صبر کرنے والے ہیں"

مفتی ملول اصلاحی اپنے مضمون "اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت" میں لکھتے ہیں۔[1]

"یہ تصور کرنا کہ ایک مسلمان آننا بے باک ہو جائے کہ دوسرے مسلمان کے لئے "دوزخ یا
(جنت) کے انجام کا فیصلہ دے انسان کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ تسلیم
کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک مسلمان فرد کو دوسرے مسلمانوں کے انجام کے بارے
میں اس قسم کے فیصلے صادر کرنے کا اہل سمجھے۔ یہ اختیار تو صرف اللہ تعالیٰ کا ہے
...... ایسے شخص کو ہمیشہ اپنے سے یہ سوال کرتے رہنا چاہئے کہ وہ کہیں ایسا کردار
تو انجام دینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے"

خانقاہی اور راہبانی طریق عمل کے باوجود تبلیغی جماعت کے دینی کارناموں کو سراہنا چاہئے حالانکہ
اس کے ایسے بھی مخالف گذرے ہیں کہ جو خود تو دیوبندی تھے اور تبلیغی دورے کر کے کلکتے سے بمبئی
تک کے قلابے ملا دیتے تھے لیکن بہت سے معمولات علماء دیوبند سے الگ تھے اور ایسی خالص
دینی جماعت سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مولانا شاہ محمد سعید خان منگرانوی (۱۹۰۷ - ۱۹۷۶ء)
تبلیغی جماعت میں کام کرنے والوں سے بات چیت تو بڑی بات ہے اس کے [کذا] سلام
کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتے تھے...... جس مسجد میں تبلیغی نصاب پڑھا جاتا ہے مولانا اس
میں نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے تھے"[2]

جس طرح کچھ علماء تفاخر بالنسب کے زعم میں آ کر بڑی اہانت سے کہا کرتے تھے کہ جولاہا، تیلی

---

[1] دیکھئے انقلاب عید نمبر ۱۹۸۶ء

[2] تذکرہ علمائے اعظم گڑھ۔ ص ۲۶۲

روز نماز پڑھ کر دمی، براق اور معراج کا منتظر ہو جاتا ہے اسی طرح کچھ سنجیدہ حضرات کہتے ہیں کہ چالیس دن کے چلہ کی "تعلیم" کے بعد ہر نیا "مبلغ نماز" فضائل کی کنجی جیب میں رکھ کر باب علم اور جنت کا کلید بردار بن جاتا ہے۔ یہ بلا تعریف تعارف تبلیغی جماعت کی اسلامی خدمات و احسانات کا اعتراف ہر مسلمان کو کرنا چاہئے اور یہ حق ہے۔

مالیگاؤں کی تبلیغی جماعت

مالیگاؤں میں تبلیغی جماعت کی بنیاد پڑنے سے پہلے کچھ دیندار مومنین تبلیغ نماز کے لئے گشت کرتے پھرتے تھے ان میں عبدالرحیم کے صاحبزادے بجد نمایاں تھے۔ یہ خاندان قصبہ مئو کوپا گنج ضلع اعظم گڑھ سے غدر کے پرآشوب زمانے میں ہجرت کر کے مالیگاؤں میں آکر آباد ہو گیا تھا، ننہال کے بیشتر افراد وطن میں بس گئے۔ بڑے بھائی محمد الیاس مشتاق برکتی (متوفی ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء) ہینڈلوم پر ساڑیاں بن کر گھر کی کفالت کرتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی محمد یونس نے مدرسہ حنفیہ سنیہ سے درجہ عالمیت کی سند حاصل کی۔ دوسرے بھائی منشی محمد حنیف نے جدوجہد اور محنت کر کے خاندان کو عسرت و افلاس سے نجات دلائی۔ خاندانِ رحیمی کے دو فرزندان محمد الیاس اور مولوی محمد یونس کو وہاب العطایا نے صالح مذاقِ شعری اور خوش الحانی سے نوازا تھا۔ محمد الیاس مشتاق برکتی نے حمد و نعت گوئی کو ذریعہ نجات سمجھا اور مداح رسول کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ منشی محمد حنیف نے تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن کی حیثیت سے شہر میں بڑا نام کمایا۔

مولانا محمد یونس (المتوفی ۱۳ اگست ۱۹۶۲ء) میں بھی دینی جذبہ بڑا شدید تھا۔ عالم باعمل تھے۔ عام مسلمانوں کی نماز سے کوتاہی و دوری نے انہیں خلق خدا اور مسجد کے بہت قریب کر دیا تھا، ان کا درد پنہاں نغمہ کے قالب میں ڈھل گیا۔ آپ ہر صبح اذان سے قبل اسلام پورہ کی بڑی جامع مسجد کے بلند مینار پر چڑھ جاتے اور درد میں ڈوبی اپنی سحر انگیز آواز اور وجد آفریں ترنم سے اہل غفلت اور سوتے ہوؤں کو "آداب سحر خیزی" سکھاتے ؎

اے بندگانِ الٰہی اٹھو نماز پڑھو
نماز سے کبھی غافل نہ ہو، نماز پڑھو

یہ کیف ترنم سے [illegible] کیف آفریں لہراتی [illegible] کی درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی
صدا ایک ایک بند [illegible] کے جادو کے ساتھ سوتے ہوئے لوگوں

کی زندگی میں خلل انداز ہونے لگا۔ دیکھا گیا کہ بہت سارے لوگ مولانا کو سننے کے لیے سڑکوں پر مع اندھیرے کھڑے رہتے تھے۔ مسجد کے مصلّیوں نے بھی دیکھا تو ایک منصوبہ بنایا اور مولانا کی نظم کو جماعتی طور پر پڑھتے ہوئے گلی گلی گشت کرنا شروع کیا۔" [1]

نیاپورہ کے غلام رسول (جو اب مولانا یونس کے چھوٹے بھائی منشی محمد حنیف کے داماد ہیں) نے مولوی صاحب کے اشتراک و تعاون سے تبلیغ نماز کے سلسلے میں ایک دعظ کا اہتمام کیا۔ اور پھر یہ عمل سارے شہر میں عام ہو گیا۔ خوش آمد پورہ کا اشرفیہ چوک بھی خاندانِ رحیمی کے ان دو بلبلانِ خوشنوا کی نغمہ بار، ایمان پرور اور روح انگیز آوازوں سے برسوں گونجتا رہا۔ تبلیغ نماز کا یہ نغماتی طریقہ بڑا کارآمد ثابت ہوا۔

اعلی مالیگاؤں بڑے جدت پسند واقع ہوئے ہیں شاعری ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے شبستانِ محبت میں پہنچتے ہیں تو حریر و پرنیاں کی طرح بڑی سلیف اور مس انگیز شاعری کرتے ہیں، ذہن کے مینارے پر چڑھتے ہیں تو روح کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ کر آسمانوں کی تہوں میں اس شاعری کی تلاش کرتے ہیں جو خدائے عز و جل کے حضور پیدا ہوتی ہے۔

تو واحد صمد ہے ہمیں بھی اکائی دے	ہم ہیں انا کی قید میں ہم کو رہائی دے
ان کی نگاہ میں تو سمندر بھی کچھ نہیں	مجھکو تو بوند بوند سمندر دکھائی دے

(امین صدیقی مالیگاؤں)

مالیگاؤں کی تبلیغی جماعت کے بارے میں "گہوارہ مسجد نورانی مسجد تک" "تحریک آزادی سے تبلیغی جماعت تک" اجالوں کے سفر کے اخیر میں جو مضمون چھپا ہے وہ بڑا فکر انگیز اور لائق تحسین ہے، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے کارناموں کو سراہتے ہوئے فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں:

"ملک بھر میں ہر دو جماعتوں کے کل ہند عامی اجتماعات کے انعقاد کے سائے میں اپنی پہچان پالینے کے بعد، پورے ایمانی تقاضات کے ساتھ زندگی گذارنے کا مصمم ارادہ لے کر اب یہ بے بضاعت قافلہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو چکا تھا۔"

---

[1] اجالوں کے سفر ۱۲۳-۱۲۴

> آزادی کے بعد کے اپنی ناساعد حالات کے پس منظر میں، مالیگاؤں کی مسجد گہوارہ میں
> جماعت تبلیغ کا پہلا گروپ مولوی عبدالملک مرادآبادی کی قیادت میں وارد ہوتا ہے۔
> اس جماعت میں شامل افراد کی مومنانہ حرارت سے بھرپور زندگی کا پرتو اُن کی نشست و
> برخاست میں، اور ان کے اخلاصِ نیت کا مظاہرہ ان کے اندازِ کلام سے برابر مترشح تھا
> جس سے مصلیانِ مسجد کا متاثر ہونا بعید نہ تھا۔ [1]

یہ جماعت دھولیہ گئی اس کے ساتھ اسلام پورہ کے منشی محمد نذیر بھی گئے۔ جب پہلی جماعت کی تشکیل ہوئی تو بدر کے بارہ کے، ماسٹر عبدالرحمٰن کو امیر جماعت ہونے کا شرف حاصل ہوا، اس جماعت کے دوسرے ہمراہیوں میں ماسٹر زین العابدین، حاجی رجب علی، مولانا محمد اسحٰق، منظور حکیم، عبدالجبار تانی والے اور منشی محمد حنیف تھے۔ مبلغین دین کی جو درگت بنتی تھی اس کی مثال 'ایام الجاہلیہ' میں ملتی ہے لیکن اخلاصِ نیت اور استقامت کا یہ عمل برسوں جاری رہا ـــــ اور پھر جماعتوں کی رونقیں بڑھنے لگیں، دیہاتوں کے سناٹوں میں اللہ اکبر کی تکبیریں گونجنے لگیں۔ گہوارہ مسجد جو نورانی مسجد کے نام سے معروف ہے گہوارہ ایمانی بن گئی اور یہ مسجد بھی نظام الدین دہلی اور تاج المساجد بھوپال کی طرح مرکزیت کی حامل بن گئی ہے یہاں سے سال سال بھر کے لئے نکلنے والی جماعتیں بیرونی ممالک میں جیسے امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، ملیشیا، انڈونیشیا، افریقہ اور چین و جاپان تک جا چکی ہیں اور اسی طرح پوری دنیا سے یہاں جماعتوں کے آنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ احمد ابلی حاجی تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماعات میں جم غفیر دیکھ کر روحِ ایمانی تازہ ہوتی ہے۔

مالیگاؤں کے مصلحین

مولانا عبداللہ لعل محمد (متوفی ۱۰-۳-۱۹۰۰)

مالیگاؤں کے علمائے ربانی جنہوں نے اس شہر ہنرمنداں میں روحانیت کی شمعیں روشن کیں اور علم دین کی تجلیاں بکھیریں ان میں مولانا عبداللہ جو قصبہ پورہ معروف ضلع اعظم گڑھ کے مہاجر انصاری خانوادہ کے چشم و چراغ تھے ان اجالوں کی شاہراہوں کے پیچھے نورانی سفیر تھے۔ مولانا عبداللہ ولی اللہی مکتب فکر کے ترجمان تھے اور دارالعلوم دیوبند کے پروردہ۔ شہر کی تاریخ کے

---

[1] تاریخ کے سفر ص ۲۹ ، ۱۹۹۰

ویرانے میں علم و دانش کا چراغ سب سے پہلے انہوں نے روشن کیا، بیت العلوم اس خطہ کی پہلی اور واحد دینی درسگاہ تھی جو انہوں نے قائم کی۔

مولانا عبداللہ نیکی کی ترغیب دیتے تھے اور بدعت سے روکتے تھے۔ مولانا کی تبلیغ و اشاعت اسلام کی سرگرمیاں اور اصلاح عقائد و نفس کے لئے مساعئ جمیلہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ؒ اور سید احمد بریلوی ؒ کی یاد دلاتے ہیں۔[1]

مولانا محمد اسحٰق مقصد (۱۲۶۹-۱۳۴۶ھ)

مولانا محمد اسحٰق نابغۂ روزگار تھے اور شہر کے بطلِ جلیل "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" — یعنی جامع صفات تھے آزادئ وطن کے لئے سرفروشی کی تمنا رکھتے تھے، قوم کے لئے دل میں تڑپ تھی روح میں تصوف کا نور جلوہ گر تھا اور شعر و سخن میں ذوقِ لطیف رکھتے تھے۔ ان کی عبقریت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر آج بھی قائم ہے۔ آپ کی بڑی عظیم شخصیت تھی اور عظمت کا اظہار اور اعتراف ان کے معتقدین عرس منا کر کرتے ہیں جو قاطع بدعت تھا اس کے عرس کو بربانِ قاطع بنا دیا گیا۔

مولانا محمد اسحاق کا دینی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے دارالافتاء کے قیام کا بیڑہ اٹھایا، چونکہ شہر میں علم میراث سے ناواقفیت کی بنا پر اکثر ترکے کے معاملات غلط طریقے پر انجام پاتے مثلاً مرنے والا اپنی پوری جائداد کسی مسجد یا مدرسے کو وقف کرنے کی وصیت کر جاتا اور اس طرح قرآنی وارثین یعنی ذوی الفروض اور عصبات (میت کے وہ رشتہ دار جن کا ترکہ میں حصہ متعین نہیں) ترکے سے مکمل طور پر محروم کر دئے جاتے، بیوی کے انتقال کے بعد اس کا مہر بھی مسجد یا مدرسے کو دے دیا جاتا اسی طرح بیوی کے جہیز کو سسرال کی ملکیت سمجھ لیا جاتا اور اس کی کمائی پر شوہر کا مکمل اختیار مانا جاتا۔ متبنی یعنی لے پالک جائداد میں جن کے دعویدار بن جاتے حالانکہ وہ شریعت کی رُو سے کسی موقف میں بھی نہ تھے۔ ایسی ہی مختلف خرابیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا اسحٰق نے برادری کے ایک نہایت قابل اور اپنے

---

[1] اجالوں کے سفیر مولانا عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ شہر علم و فضل کے بانی مولانا عبدالاحد ادیب قاضی شریعت دارالقضاء مالیگاؤں ص ۱۰-۱۶

جو نہار طالب علم قاری محمد حسین کو علم فرائض سیکھنے پر توجہ دلائی، ان کے پیش نظر قرآنی حکم اور شارع علیہ السلام کی یہ ہدایت تھی:

"وہ [illegible] ہے کہ وہ نصف علم ہے اور سب سے پہلے جو علم میری
امت سے اٹھایا جائیگا وہ علم فرائض (یعنی ترکے اور میراث کا علم) ہے" [1]

ابو العمید مولانا محمد عبد المجید وحید نعمانی اشرفی، چشتی صابری (ولادت ۳۰۳، مطابق ۱۹۰۵ء)

آپ کا پورا گھرانہ حافظ و قاری تھا۔ آپ کے والد حاجی حافظ قاری مولانا مولوی محمد نصر اللہ عرف حافظ بدو (ماہین ضلع اعظم گڈھ) کے تھے اور والدہ ولید پور اسی ضلع کی تھیں۔ سلسلۂ تصوف سے ایک خالص فکری و ذہنی مزاج بنا دیا تھا۔ مولانا اس حصار میں محصور تھے جو صوفی گھرانوں میں پرورش پانے والوں کے گرد عموماً کھینچ دیا جاتا ہے ان کے گھروں کے دریچے اسی رُخ پر کھلتے ہیں جدھر سے خانقاہوں کی روشنی آتی ہے۔ آپ نے مالیگاؤں کی تاریخ المعروف بہ فروغ مجید (۱۹۲۴ء - ۱۳۴۳ھ پر دو نام تاریخی) لکھ کر ماضی کے دھندلکے سے شہر کے خد و خال اور ٹیڑھی ترچھی گلیوں کے اُلجھے ہوئے خطوط اُجاگر کئے ہیں۔ کئی اور کتابوں کے مصنف تھے [2] 'مجربات مجید' کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ تعویذات لکھتے تھے۔ فتاویٰ مجیدیہ میں مفتی مصنف نے ادق سوالات کے معقول جواب منقول فرمائے ہیں۔ مصابیح شرعیہ (مطبوعہ ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء) میں بعض متنازعہ واقعات درج ہیں۔

مولانا عبد المجید ایک خاص حلقہ میں اچھا رسوخ رکھتے تھے لیکن کتاب و سنت سے تمسک رکھنے والے آپ کے سخت مخالف تھے جس کا تحریری شکوہ مولانا موصوف اپنی کتابوں میں کرتے رہے ہیں۔ شہر میں جب بھی کسی مسئلہ پر تنازعہ کا ماحول پیدا ہوا، مولانا عبد المجید اپنے حرف برہنہ کی شمشیر لے کر میدان میں کود پڑتے تھے۔ سنہ ۱۳۵۰ھ میں "اظہارِ حق" نامی ماہنامہ کی اشاعت پر الزام و تردید کا سلسلہ شروع ہوا، اس میں خاص خاص راتوں میں مساجد

---

[1] [illegible] کے سفیر - مولوی عبد المجید وحید اشرفی، از حنیف جعفری [illegible]
[2] [illegible] صاحب وحید۔ سابق امام مسجد نعمانی شرقی [illegible] شہر مالیگاؤں —

[illegible] مالیگاؤں [illegible] فہرست کتب

میں چراغاں کا حکم، شب برأت کا حلوہ اور مروجہ عرفہ و میلاد کے متعلق مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، مدرسہ جامع العلوم کانپور کے جوابات نقل کیے گئے تھے، محلہ نیاپورہ کے شیخ منشی محمد ابراہیم کے ایک اور استفتار کے جوابات نقل کیے گئے تھے۔ یہ سارے فروعی مسائل تھے، جو اختلاف و انتشار کا سبب بن کر قوم و ملت کی تشخیص اور شناخت کو کھوتے جا رہے تھے۔[1]

مالیگاؤں کی برادری میں ایسے بزرگ حضرات بھی تھے "جو محرم کی مجلسوں کے بڑے مقبول ذاکر" تھے لیکن دین کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔ ہر سال محرم کی مجلس وعظ کے لئے تبلیغی جماعت کے دو مشہور برادران جن کا ذکر گذر چکا ہے، محمد الیاس مشتاق اور مولوی محمد یونس پورے اہتمام سے بلائے جاتے، روزانہ رات میں عشرۂ محرم تک مجلس اشرفیہ چوک میں منعقد ہوتی تھی، سامعین کا ایک جم غفیر ہوتا تھا، محمد الیاس مشتاق عنا اشہادتین کا نثری حصہ پڑھتے اور منظوم حصہ جو مرثیوں پر مشتمل ہوتا تھا مولوی یونس اپنے خوش ترنم سے سناتے۔ مولانا حافظ شاہ اللہ مولوی خدا بخش اور دیگر سند یافتہ مولوی حضرات ہر سال محرم کے وعظ کے لئے بلائے جاتے تھے۔ ان کے برخلاف علمار کا ایک دانشور اور روشن فکر طبقہ جو ہمیشہ کتاب و سنت پر نظر رکھتا تھا تحفظ دین کا ضامن بنا رہا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی (م - ۲ر جنوری ۱۹۹۳ء)

مالیگاؤں کے علمار اور اکابر کا وہ طبقہ جو دانشور بھی تھا اور روشن فکر بھی، مولانا عبدالحمید نعمانی کی قیادت میں بڑی نمایاں خدمات انجام دیتا رہا مولانا برادری کے فعال مصلح اور قافلہ سالار تھے، قوم کے لئے بڑا درد مند دل رکھتے تھے۔ جبکہ برادری کی اٹھان، صنعت پارچہ بافی کی ترقی اور استحکام کے لئے انہوں نے جو عظیم کارنامے سرانجام دئے انہیں برادری کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ آپ نے شہر میں پھیلی ہوئی بدعات کے انسداد و استیصال کے لئے بڑی جدوجہد کی انہیں کی کوششوں سے بھیکن شاہ کے عرس پر پابندی لگی، تعلیم یافتہ طبقہ کی رہبری اور سیاسی تربیت آپ کی اعلیٰ قیادت کی رہین منت ہے۔ آپ کا سب سے عظیم دینی و تعلیمی کارنامہ معہد ملت کا قیام ہے مولانا عبدالحمید نعمانی ایک متبحر عالم، صحافی، عظیم مبلغ اور ذی اثر مصلح دین بھی تھے۔ آپ صحیح معنوں

---

[1] اجالوں کے سفیر، مولوی عبدالمجید وحید اشرفی از لطیف جعفری ص ۱۰۰

میں عظمت تھے۔

حضرت مولانا محمد عثمان (۱۹۱۰ء-۱۹۸۴ء)

مولانا محمد عثمان کا ذکر کئی بار اس حقیر تصنیف کی زینت بن چکا ہے، دراصل یہ ان کی پہلودار شخصیت کا تقاضہ ہے کہ ان کے ہر پہلو کو اجاگر کیا جائے، شہر مالیگاؤں میں جن بزرگانِ دین نے علم و فضل، تعلیم و تدریس کی شمعیں روشن کی ہیں ان میں مولانا محمد عثمان نے تعلیم نسواں کی (جامعۃ الصالحات) میں جو چراغ روشن کیا وہ سب سے زیادہ فروزاں ہے۔ انہوں نے خود اپنے علمی گھرانے کی خواتین کو زیورِ علم سے آراستہ کیا۔ ڈاکٹر اشفاق انجم جو مولانا کے بھتیجے جلیل احمد کے صاحبزادے اور آپ کے پوتے لگتے ہیں اور جن کا عصرِ حاضر کے اساتذہ و ادبا میں علمی و ادبی مرتبہ مسلم ہے، روایت کرتے ہیں کہ مولانا محترم کو ہمیشہ سے تعلیم نسواں خصوصاً بناتِ اسلام کی دینی تعلیم کا خیال تھا، کیونکہ اس اہم اور بنیادی ضرورت کو نظر انداز کرنا بدبختی کی بات تھی۔ آج مولانا کا قائم کردہ جامعۃ الصالحات ایک ایسا مینارۂ نور ہے جس کی نورانی کرنوں سے دخترانِ قوم کے قلوب و اذہان منور ہو رہے ہیں۔ [1]

مولانا عثمان کے بارے میں ان کے ایک محترم شاگرد عبدالمجید سرور (ایڈیٹر سرور ٹائمز مالیگاؤں) نے آپ کی سوانح عمری میں اپنے استاذ ذی الاکرام کے محاسن و مناقب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> مولانا عثمان ایک جدید ذہن و فکر رکھنے والے عالمِ دین تھے۔ عصری ہم آہنگی اور احساس سے
> [illegible] یہ شعور تھا کہ ہر نئی تحریک کو بدعت یا شجرِ ممنوعہ نہیں قرار دیتے تھے۔ وہ دینی مزاج
> اور [illegible] تھے۔ وہ خشک جامد مذہبیت پر یقین نہیں رکھتے تھے، وہ ایک روشن خیال
> اور عصری تقاضوں سے واقفیت رکھنے والے عالمِ دین تھے۔ وہ ہر قسم کی گروہی، علمی،
> مسلکی اور ذاتی عداوت کے شعور سے پاک تھے۔ مولانا محمد عثمان ایک باکردار
> [illegible] طبیعت رکھنے والے عالمِ دین بھی تھے۔ ان میں اسلاف
> کے اوصاف، کردار حمیدہ درجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ وہ جامعۃ الصالحات
> [illegible] زندگی میں بھی ان کے کارنامے [illegible]

---

[1] [illegible] مولانا محمد عثمان [illegible] جامعۃ الصالحات، مالیگاؤں، عبدالمجید سرور، ص [illegible]

دیکھے جا سکتے ہیں"۔ [1]

مولینا کسی قسم کی علمی، تحقیقی اور صحافتی بددیانتی کے بھی سخت خلاف تھے۔ دینی حلقے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کے یہاں تنگ نظری اور عصبیت جاہلیہ نہ تھی ان میں شعار حق کی جرأت اور غیرت مندانہ کردار کے تمام اوصاف موجود تھے۔ مولانا نظرؒ جرأت مند اور عالم باعمل تھے، ان کے عشق رسولؐ اور سنت رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ حصول علم دین کے بعد انہوں نے محض اپنے نبیؐ کی اتباع سنت میں کچھ عرصہ بکریاں بھی چرائی ہیں"۔ [2]

مولانا جمال الدین لبیب (ولادت ۱۳۲۶ھ)

بیت العلوم کے فارغ تھے پھر گجرات کی مشہور دینی درسگاہ تعلیم الدین ڈابھیل سے مزید تحصیل علم کی (۱۳۴۸ھ) آپ ان فارغ التحصیل مدنیوں میں سے ایک ہیں جن پر گجرات ڈابھیل کو ناز ہے۔ آپ ایک مصلح اور رہنما تھے اور مخلوق خدا کی ظاہری و باطنی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا، شہر کے صنعتی ماحول میں اور شور و غل سے بھرپور فضا میں آپ نے مالیگاؤں کے شہر خموشاں یعنی بڑا قبرستان میں ۱۳۷۵ھ میں مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ مالیگاؤں کے قبرستان جس میں دیوبندی اور بریلوی جماعتوں کے آباء و اجداد مدفون ہیں وہاں آپ نے حکیمانہ اور مدبرانہ طریقہ کار سے مدرسہ کو جاری و ساری رکھا۔ دونوں ہی جماعتوں کے علماء سے ان کے مراسم تھے مگر غالی اور متشدد قسم کے بریلویوں اور دیوبندیوں کو ناپسند فرماتے تھے بلکہ امت کے افتراق اور اختلاف کا ان کو سبب اور ذریعہ گردانتے تھے، مولانا جمال الدین لبیب نے دونوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو پاٹنے کے لیے ایک درمیانی راستہ نکال لیا تھا۔ دونوں جماعتوں کو قریب تر لانے کی جد و جہد رائیگاں نہ گئی نہ جانے کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں نے ان کے مواعظ سے ہدایت پائی اور اپنے غلط عقائد و نظریات سے تائب ہوئے۔ [3]

---

[1] اور [2] اجالوں کے سفیر۔ حضرت مولینا محمد عثمان ایفؒ ص۷۹ ، ص۸۱

[3] ایضاً۔ مولانا جمال الدین لبیب صاحب کی ذات۔ علماء اسلاف، از مولانا طاہر خان الحق گڑھا ص۱۰۰ ۔ ص۱۰۵

ان بزرگانِ دین کے علاوہ برادری اور غیر برادری میں ایسے حضرات بھی تھے جو مصلحین اور مبلغین کے زمرے میں شامل تھے۔ مولوی ثوبان ام المدارس بیت العلوم کے اولین فارغین میں سے تھے (۱۳۴۶/۱۹۲۷) جن کی دستار بندی کی گئی تھی۔ عید کی نماز عیدگاہ پر ادا کرنے کی فضیلت سے عوام الناس کو آگاہ کرنے کے لئے اور ترغیب دینے کے لئے مولانا تقی (متوفی ۱۳۸۰) اور مولانا برکت علی کے صاحبزادے عبدالرحیم شاہ نے ایک رسالہ بنام "انتباہ بوسیل عیدگاہ" شائع کروایا جس میں بہت سے علمائے کرام کے فتاوے شامل تھے۔ مولوی محمد ثوبان ہر سال عیدگاہ پر عیدین کی نماز کی امامت کرتے رہے۔ مولوی ثوبان اتباع سنت کے سخت پابند تھے زندگی کو دین متین اور شرع مبین کے حصار میں گذارنے کی سعی کرتے رہے اور ہمیشہ سنتوں کو زندہ اور باقی رکھنے کے لئے عملی قدم اٹھاتے رہے۔ بدعات سے ہمیشہ دور رہے۔[1] البیان:

مذہبی و معاشرتی اصلاحات کے سلسلے میں، لیگاؤں کے ہفتہ وار البیان نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ نومبر ۱۹۷۰ء کو اس کا اول شمارہ نکلا۔ البیان نام مشہور عالم و عالمی شخصیت مولانا عبدالحمید نعمانی نے رکھا۔ اس کے اجراء کا مقصد تھا قرآن و حدیث کا صحیح علم عوام تک اس طرح پہنچانا وعلم پر عمل کی ترغیب ہو سکے۔ صحیح علم اور اخلاص نیت کے ساتھ عمل صالح کی طرف رغبت ہو، ساتھ ساتھ ہجرہ کے حساب سے آنے والے تہوار اور مروجہ رسوم و رواج کے بارے میں کیا سنت ہے اور کیا بدعت ہے اس بارے میں معلومات بہم پہنچانا۔ ان کے علاوہ مسائل حج و قربانی وغیرہ سے آگاہی دینا۔ اصلاحی نظموں کی اشاعت کرنا اور مضامین شائع کرنا جن پر سیاسی تعلیمی اور معاشی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے۔ محرم کی بدعات کا انسداد اور شرکیہ امور کا استیصال البیان کا مطمح نظر ہے۔ اخبار کے مدیر سیٹھ احمد محمد ابراہیم (جو ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی ایل۔سی۔ای۔ایچ شہر کے بڑے اور بزرگ ہیں) ایک عالم دین ہیں۔ ایمرجنسی کے دوران نسبندی کے خلاف تحریک چلانے کے جرم میں آپ کو زندانی بنا دیا گیا تھا۔ البیان کو جن ممتاز شخصیتوں کا تعاون حاصل رہا ہے ان میں [illegible] ہیں۔ مولانا اسرار الحق، مولانا عبدالحمید نعمانی مرحوم، مولانا محمد ایاس، مولانا محمد حنیف ملی، مولانا عبدالماجد زبیری، مولانا نصیر احمد ملی (مرحوم)، عبدالرشید عثمانی، مولانا زبیر الیوبی؛

---

[1] ایضاً صفحہ [illegible] مالیگاؤں کے ہیرے [illegible] مولوی ثوبان، از اسحاق خضر [illegible] تہذیب

[illegible]

مولانا حافظ جاوید احمد علی۔ اخبار کے خصوصی معاونین عبدالرشید محمد امین اور محمد نورانی درگاہی تھے۔

جزیرۂ بمبئی کے مخالفین اصلاح

حضرت سید احمد شہید کا اکتوبر ۱۸۲۳ء کا سفر بمبئی طریقۂ محمدی کا کوئی سنگ میل ثابت نہیں ہوا، اس شہر میں جہاں مغربی مرعوبیت کا تسلط چھایا ہوا تھا، انگریزوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کرنے کی کس میں ہمت تھی۔ یہاں کے تاجر مسلمان ذاتی مفاد اور مصلحت کو اور جہاد کی جگہ جمود کو ترجیح دیتے تھے۔ بیعت کرنے والوں کا جم غفیر سید صاحب کے جائے قیام پر اکٹھا ہوتا رہا لیکن جیسے ہی وہ رخصت ہوئے ان کا نعرۂ جہاد بمبئی کے شور و غل میں ڈوب گیا، علماء کرام جن کی کثیر تعداد شوافع کی تھی وہ بھلا کیسے ایک "غیر مقلد امام" کی تقلید کر سکتے تھے۔ یوں بھی سید صاحب کو مجاہدین کی تلاش تھی انہیں نہ تو کتابی مدرسین کی ضرورت تھی اور نہ خانقاہوں کے دریچوں سے جھانکنے والے پیران طریقت کی تلاش تھی ـــــ وہ تو آگے بالاکوٹ کی طرف بڑھ گئے ؎

جادۂ راہِ وفا جُز دمِ شمشیر نہیں

ـــــ سید احمد شہید کی شہادت کے خون کے قطروں سے سارا ہندستان سرخرو ہو گیا اور لالہ زار بن گیا ؎

وہ ایک پھول کہ صدیاں مہک اٹھیں جس سے ‌ ‌ ‌ ‌ ہوائے دشت میں صدیوں کے بعد کھلتا ہے

ـــــ پھر بائیس برس بعد سید صاحب کے خلیفہ مولانا ولایت علی نے بمبئی کے مسلمانوں کو یاد دلایا جو بھلا بیٹھے تھے کہ ؏ تیرے ترکش میں کوئی کبھی تیر بھی تھا۔ مولانا ولایت علی خود اپنے مواعظِ حسنہ کے حرف برہنہ کے تیروں سے گھائل ہو گئے۔ بھلا وہ قدامت پسند مسلمان جن کی مذہبی روایات، مولود شریف، فاتحہ و نیاز اور ایصالِ ثواب کی رسمیں ہدف تنقید بن رہی تھیں کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ اس طرح ان کا معاشی مفاد مجروح ہو جائے، ان کا کہنا تھا کہ

> "اکثر دولتمند مرحوم، مولود شریف گیارہویں وغیرہ خاص مہینوں میں اموات کی فاتحہ اور بزرگوں کے عرس شریف کے ایام میں ہزاروں روپیہ نیاز وغیرہ نیک کاموں میں خرچ کرتے تھے اور سیکڑوں مشائخ پیرزادے غریب سادات اور محتاج و فقیر فیض پاتے تھے تب ان مولویوں نے عرس نیاز فاتحہ وغیرہ ہم چہلم برسی کو بدعت اور حرام

کہنا شروع کیا"[1]

آخر یہ ثواب بٹورنے والے علماء، سادہ لوح عوام الناس اور عمائدین شہر جنہوں نے اس قسم کے ثواب دارین کے کاموں سے اپنی ساکھ قائم کر رکھی تھی کب تک ان "حرام و ناجائز و نادرست" کے فتووں کو برداشت کرتے۔ بمبئی میں بریلوی مکتب فکر و خیال کے زیر اثر مقامی علماء عقائد کی سطح پر باوجود اختلاف مذہب کے ان سے بڑا گٹھ جوڑ رکھتے تھے گو مقامی علماء بیشتر شافعی المذہب تھے اور بیرونی مولوی اور مدرسین حنفی المسلک پھر بھی یہ دونوں گروہ اہلحدیث، وہابیوں کے سخت مخالف تھے، اس گروہ کی جارحانہ کارروائیاں اور اس کا معاندانہ رویہ اس دہشت کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ انہیں انتہا پسند اور ایک سلطانی طاقت سمجھتے تھے، مولوی لیاقت علی جو غدر کے ہنگاموں کے بعد بمبئی اور گجرات میں وہابی تحریک پھیلانے کے لئے دورہ کر رہے تھے عوام پر بڑے اثر انداز ہو چکے تھے، وہابیوں نے جنگ آزادی میں جو نمایاں کردار ادا کیا تھا اس سے اہالیان بمبئی بے خبر نہیں تھے۔ ایسے جارحانہ ماحول میں وہابی مولویوں کا کسی قسم کا علانیہ عملی اصلاح کے لئے قدم اٹھانا ان کے لیے بڑا مشکل امر تھا جبکہ با رسوخ رؤسائے شہر انہیں کسی مسجد میں گھسنے نہ دیتے تھے اور وعظ کہنے سے روک دیا جاتا بلکہ "اخراج وہابین عن المساجد" کے فتوے پر عمل کیا جاتا تھا۔ مولانا ولایت علی کا جو حشر ہوا تھا وہ معلوم ہے، اسلام آباد بھیمڑی کے مولوی سلیمان بھاگ کر مکہ معظمہ چلے گئے۔

مولوی ولایت علی (۱۲۶۵ھ ، ۱۸۴۹ء) اور مولوی لیاقت علی (۱۸۵۷ء) کے بعد بمبئی میں مولوی نذرالہدیٰ احمدنگری دعوت و عزیمت کے داعی بن گئے یہ بھی سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے خلفاء کی طرح حقانیت کے علمبردار اور بیباک مجاہد تھے۔ سہارنپور میں ان کے مخالفین نے ان کو جب دو چار کر دیا تھا اور انہیں کذب و دروغ کا ایسا نشانہ بنایا اور بدنام کرنے کے لئے ایسی ایسی مہم چلائیں جن کو وہ برداشت نہ کر سکے اور بمبئی چلے آئے مگر ان سے پہلے ان کی تحریرات پہنچ گئیں ایک کتاب تنبیہ المومنین[2] بمبئی میں مشہور ہو چکی تھی جسے قاضی محمد حسین راجپورا (مالوہ) نے ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں شائع کیا۔

---

[1] صحیفہ محمدیہ دوازدہم، ص ۵۲-۵۰

[2] مختصر نامہ ۱۸۵۶ء، ص ۳۴

وہابیوں اور اہل سنت کے بیچ مابہ النزاع وہ عقائد اور مراسم تھے جن کا تعلق اسلاف کے تعامل سے نہ تھا۔ اسی دوران ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا۔

"سید شاہ ابوالحسن قادری بیجاپوری پونہ سے ایک تازہ کتاب مسمّٰی بنام "منتج المومنین در دفع الہتان" تالیف کی ہوئی بنام محمد حسین ساکن اپرا اور چھپی ہوئی شہر پونہ کی جسمیں تمام تحریرات مولوی نورالہدیٰ ساکن احمد نگر کی ہے" (ص۱)

"اس کتاب میں مولوی شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی کی تقویۃ الایمان کی طرح نذر و نیاز فاتحہ درود اور شرک و بدعت کا بطلان کیا گیا ہے۔ اس میں غیر خدا کے نام پر ذبح ہونے والے جانوروں کو حرام اور زیارت قبور اور اولیاء کرام سے استغاثہ و استعانت کرنے اور ان سے فیض باطنی کرنے کو ناجائز قرار دیا گیا ہے اور ان کی ارواح کو وسیلہ کر کے ان سے حاجت دینی و دنیوی طلب کرنے کو بھی نادرست کہا گیا ہے۔" [۱]

"یہ کتاب پونہ کے اہل سنت وجماعت اور وہابیوں کے مابین رفع نزاع بنگی مومنوں کی ایک پنچایت کے انعقاد پر مقدمہ معین ہوا تھا اور اس مقدمہ میں سرکار عدالت شعار سے حضرت مفتی شیخ علی صاحب صدر عدالت بمبئی کے سامنے مقرر ہو گئے تھے ــــ اسی سلسلے میں سید شاہ ابوالحسن قادری بیجاپوری یہ کتاب لائے تھے اور بمبئی اور بیرون بمبئی کے علماء کے تعاون سے ایک خفرنامہ تب کر کے عوام الناس کو خبردار کر دیا گیا تھا۔"

محمد امین ابن محمد علی رو دگھے کی مالی استعانت سے یہ خفرنامہ ۱۸۵۶ء میں شائع ہوا، اس پر تیس سے زیادہ مقامی اور بیرونی مولوی حضرات کے دستخط اور مواہیر تھے۔ [۲]

وہابیوں کی تضحیک کے لئے اہانت آمیز القاب اور اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں ہر وہ نام جس سے وہابیت کی "بو" آتی تھی وہ انکے نزدیک مردود تھا اور ایک ایک معمولی بات کے لئے فتویٰ صادر کیا جاتا اور اہلحدیث کے خلاف محاذ قائم کر لیا جاتا۔ "شہر بمبئی میں محلہ جدید بنگالی پورہ کی مسجد

---

[۱] و [۲] خفرنامہ۔ محمد امین رو دگھے ۱۸۵۶ء بمبئی۔ بمبئی یونیورسٹی لائبریری ص۱

[۳] "جمال الملۃ والدین فی رد عقائد الوہابین" ص۱۔ اور دیکھئے قانون شریعت محمدی۔ منشی محمد فرحسین فخر رئیس سہسوان آگرہ ۱۲۸۹ھ

میں متولیان نے ایک رباعی مادۂ تاریخ لوح سنگین پر کندہ کرا کے اندرون مسجد دیوار پر نصب کردی تھی۔

بفضل خداوند معبودِ مطلق ۔۔۔ بنی جب کہ یہ سجدہ گاہ سُنّیہ

دہی شوق نے سالِ تعمیر لکھا ۔۔۔ عبادت کہ مذہب احمدیہ

استفتاء اس بارے میں تھا کہ مذہب احمدیہ کا لفظ شرعاً اہل سنت کے نزدیک جائز ہے یا ناجائز؟ فتویٰ یہ صادر ہوا کہ "وہابی غیر مقلد کا مذہب مثل روافض کے محمدی ظاہر کرتے ہیں اور مذہب احمدی مذہب محمدی ایک معنی رکھتا ہے۔ بس مسجد میں ایسا پتھر لگانا جس پر ایسے الفاظ کندہ ہوں سراسر خلاف ہے جس سے صاف طور پر بھی جاتا ہے کہ یہ مسجد وہابیوں کی یا کسی اور دوسرے نئے مذہب والوں کی ہے لہٰذا اہل سنت میں روکی مذہب۔ مذہب احمدی کے نام سے مشہور نہیں اس لئے مسلمانوں کو چاہئے [illegible] پتھر دور اکھڑوا ڈالیں"۔ (ماخوذ از رسالہ کشف بجواب قاری محمد عبدالرحمٰن پانی پتی انصاری)

"صورت مسئولہ مذکورہ بالا" کے بارے میں یہ فتویٰ مولانا نجف علی رامپوری (نزیل بمبئی) نے صادر کیا تھا جس پر ملک کے مقتدر علماء کے مواہیر تھے جن میں یہ قابل ذکر ہیں: احمد رضا بریلوی عبدالرشید دہلوی اور محمد ظہر الدین السنی الحنفی القادری الہزاروی وغیرہ۔[9]

وہابی مولوی حضرات بھی بڑے ستم ظریف واقع ہوئے تھے "زقزقہ مقلدین وہابیہ" میں سے ایک شخص نے گمنام ہو کر رسالہ "حرکات المقلدین" عاشق شاعر کے نام سے مطبع انصاری (نزیل دہلی، بمبئی) میں طبع کرایا"۔ اس کا اصل مصنف عبدالمجید نامی وہ شخص تھا کہ جس نے قبل ازیں ۱۲۹۹ ہجری میں شہر بمبئی میں آکر مسجد نا خدا میں حنفی بن کر اجازت وعظ کی لی اور ترجمہ قرآن شروع سے پڑھوایا پھر وعظ بیان کیا تقیہ کر کے مقلدین کا۔ اس طرح دوسرے روز مرغی محلہ، کماٹی پورہ میں بھی وعظ بیان کیا۔ خادم دین متین محمد وزیر الدین واعظ جامع دہلی نے اس کے غیر مقلد وہابی ہونے اور اپنے مقلد سنت جماعت ہونے کا محضر دہلی کے علماء سے مزین بمواہیر و دستخط منگا کر

---

[9] بحوالہ [illegible] بر اطلاق مذہب محمدیہ (مطبع گلزار حسنی بمبئی، ۱۳۱۷ / ۱۹۰۰) باہتمام محمد اسماعیل بن [illegible] قادری المشرب شافعی مذہب)

کردیا تھا....." [1]

مولوی عبدالمجید بھائی کلہ میں اپنے مذہب [اہلحدیث] کے لوگوں [مومن۔ انصار] میں ہر جمعہ کو وعظ بیان کرتا تھا، دینی تحریک پر کتابیں اور "پارہ مترجم قرآن" چھپوا کر تجارت شروع کردی تھی"

ہندستانی مہاجرین کی کثیر تعداد بھائیکلہ اور ناگپاڑہ کے علاقے میں آباد تھی، ان میں لبہاجابی یا بہاری یا بہار بڑوں کی خاصی تعداد موجود تھی، مگر یہ سارے ہندستانی۔ مقامی مسلمانوں کے معاندانہ رویے سے مضون و مامون نہ تھے۔ ذات پات کی تفریق کی دیوار بمبئی میں ہمیشہ سے کھڑی تھی یہ دکنی، یہ کوکنی، یہ ہندستانی کا لیبل چسپاں کردیا جاتا۔ اس قسم کی تفریق اور امتیاز کے تجربوں سے مومن، انصاری اپنے وطن میں گذر چکے تھے جہاں ان کے سلام کا جواب دینا عرفی شرف ربار سمجھتے تھے بلکہ بعض مواقع پر سلام مسنون کرنے والے کو سزا دینے پر آمادہ ہو جاتے اور" کہتے۔ ہم کو سلام کرنا ہماری برابری کا دعویٰ ہے" بعض جگہ زمینداروں کے یہاں نشست گاہ کے معیار مقرر تھے فلاں قوم کا شخص نیچے فرش پر اکڑوں بیٹھے گا اور فلاں شخص چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتا اور اسی طرح کے بہت سے آداب تجویز کیے گئے تھے" [2]

اہلحدیث حضرات تو خاص طور سے ہدف تضحیک بنتے ان کی طرز عبادت، طہارت، دینی عقائد اور تلفظ تک کا مذاق اڑایا جاتا۔

" ان کو استنجا کرنے کی بھی تمیز نہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہدیش [حدیث] کران [قرآن] پر عمل کرتے ہیں، آٹھ [رکعت] تراویح پڑھنے میں شنت [سنت] ہے، جو پوچھا جاتا ہے بھائی کیا پیشہ کرتے ہو کہتے ہیں بُننے کا پیشہ کرتے ہیں، لی جنگ بھائی ہیں [؟]۔ پھر کوئی کہتا ہے۔ سنت ہے آمین جور [زور] سے کہنی۔ ارے بھائی تو کیا پیشہ کرتا ہے۔ شاب [صاحب] میں تو نقانی ہوں۔ کوئی کہتا ہے مولود سریپ [شریف] پڑھنا کھلاپ سرع ہے [خلاف شرع ہے] پگیمبر [پیغمبر] کے جمانہ [زمانہ] میں کہاں تھا۔ حدیش میں کل بدعۃ ضلالۃ آیا ہے۔ ارے بھائی تو کیا کرتا ہے؟ شاب میں تو بڑھئی ہوں۔ کوئی کہتا ہے بڑے پیر کی گیارہویں کا کھانا حرام ہے اور

---

[1] و [2] سیف المقلدین علی عنق الراہبین (مطبع دت پرساد بمبئی ۱۳۰۰ھ — ۱۲۹۹ھ) باہتمام محمد یعقوب از مولانا قاضی محمد وزیرالدین دہوی [؟] البد حاجی ور محمد حاجی ابوبکر ٹھیکیدار کولسہ محلہ بمبئی۔ حاجی عبدالکریم ولد حاجی محمد حسین ساکن بمبئی ص ۔۵۔ ۱۵

سوم و چہلم کرنا حرام ہے۔ پوچھا جاتا ہے بھائی تو کیا کام کرتا ہے؟ کہتا ہے میں دھنیا ہوں۔ روئی دھنکتا ہوں کوئی کہتا ہے شاب شابی (شافعی) حنفی تو ہم نہیں ہم تو محمدی ہیں۔ حدیث بکھاری مسلم (حدیث بخاری و مسلم) کو مانتے ہیں۔ بھائی کون لوگ ہو تم؟ شاب ہم سیک (شیخ) تیلی ہیں" ؂

"بہت سے وہابی ہیں دھوبی و تیلی — رہ حق سے منہ موڑ گمراہی لے لی
گلے میں پڑی شرک کی انکے سیلی — ہوئی ان کمینوں کی بدعت سہیلی
حدیثوں کی ہے جو کتاب اک بخاری — تو کہتے ہیں جاہل یہ اس کو بکھاری
یہی عرض ہے اب بدرگاہ باری — جہاں سے غارت یہ فرقہ ہو ناری
نبی کو کہیں یہ بڑا اپنا بھائی — یہ اقوال کیا وہابیوں کے ہیں واہی
وہابی بہت ہیں بلا ہے دہائی — سوا ان کے بھٹیارے کنجڑے قصائی

جو بدگو ہے اس امت باصفا کا
وہ دشمن نبی کا وہ دشمن خدا کا

بمبئی کی مومن برادری کی حنفی جماعت کو بھی اہلحدیث سے بڑی کد تھی، مدنپورہ اور اگری پاڑہ کے علاقے میں ان کی دو مسجدیں تھیں ایک مومن پورہ (کاماٹی) کی بڑی مسجد اور دوسری گوشت بازار کی بنگالی مسجد مگر جب یہ سلف کی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے تو ان کے آمین بالجہر سے مصلین بہت چڑتے تھے۔ جیسے ہی مدنپورہ میں دونوں جماعتوں کے مابین ایک مناظرہ ہوا تو اہلحدیث کمزور پڑ گئے، احناف کو بڑا اچھا موقع ہاتھ آیا "جھٹ" وہابیوں کا مناظرہ سے فرار نامی رسالہ چھاپ کر رسوا سر عام کر دیا۔

بمبئی کا ایک مسلم طبقہ جو غیر تعلیم یافتہ تھا کسی نئی بات یا عمل کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا ان کی نظر میں یہ "بدعت" تھی جمعہ کی نماز میں وسطی شہر کی ایک مسجد کے خطیب نے خود اپنے لکھے ہوئے خطبوں کو پڑھنا شروع کر دیا ان میں "افعال تعزیہ عشرۂ محرم" پر کڑی تنقید تھی اور "باہم عداوت، تفرقہ و انفصام اتحاد و اتفاق، دروغ گوئی، تکفیر، غیبت، چغلخوری، عداوت و تمازی، بدخوئی و بغض کو شیوۂ اسلام اور شعار اسلام کے منافی اور انہیں معایب قرار دیا تھا، ان کلمات تنقید و الفاظ تنبیہ" کے خلاف فتویٰ صادر ہو گیا کہ ایسے "شخص کی امامت ہرگز درست نہ ہوگی"۔

اس "اظہارِ حق" کو حامیٔ سنت ماحیٔ بدعت، وہابی شکن [بدعت ؟ فگن (؟)] حاجی عیسیٰ صاحب و حاجی صدیق سیٹھ صاحب نے مع تصدیقات و مشہور علمائے شہر بمبئی (۱۳۲۳ - ۱۳۲۴ھ) میں شائع کیا، اسماعیل مہری، مولوی قاضی غلام حسین الہری، محمد عمر حنفی قادری دہلوی، قاضی محمد علی مسجد مرغا گرن واقع تاڑدیو قریب طبیلا ٹرام، محمد صدیق علی بریلوی، محمد عبداللہ قادری اور عبدالصمد غلام المتخلص بہ ضیاء کے دستخط اس فتویٰ اور اظہار حق پر تھے۔

بنگال کے مسلمین

بنگال کے مسلمانوں کی ذہنی پستی اور دینی زوال کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا سرمایۂ ایمانی اثاثہ لٹ بیٹھے تھے اور بقول اقبال؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

بنگال کی قصباتی اور دیہی بستیوں میں ملاؤں نے دین کی مرغی حرم کر رکھی تھی، پیروں نے سادہ لوح جاہلوں، کلوسوں اور تیلی تنبولیوں کی قسمتوں کو تعویذ اور گنڈے کے طلسمی دھاگوں سے باندھ دیا تھا، مکتبوں کے پڑھے ہوئے کٹھ ملا اور میاں جی فاتحہ کے طریقے سیکھ کر دکھونڈکر، بن جاتے اور تعقات سے بے کرامت تک کے اجارہ دار بن بیٹھتے۔ تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی انہیں کے ہاتھوں انجام پاتی تھیں۔ ۱۸۷۱ء[1] میں نواکھالی کے ضلع مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ان ملاؤں کی آمدنی کے وسائل بہت وسیع تھے اور ان کا دائرۂ عمل عوام کی زندگی کے ہر شعبے تک پھیلا ہوا تھا، ہر روحانی عمل اور معاشرتی رسوم کی ادائیگی کے لئے فیس کی شرحیں مقرر تھیں، ولادت کے وقت اور اس کے بعد نوزائیدہ بچے کے لئے دعاؤں اور رسموں کی فیس سے لے کر قبر میں دفنانے کے بعد کی دعاؤں تک کی فیس شامل تھی، فاتحہ میں چھوٹا فاتحہ اور بڑا فاتحہ، نیاز کا فاتحہ ایصال ثواب کے لئے ہوتا تھا غرضیکہ فاتحہ خوانی نے ان کی زندگی میں راحت اور دولت کے دروازے کھول دیئے تھے، ملا اور کھونڈکر کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ جھاڑ پھونک، آسیب اور جنات اتارنے کا تھا "حصہ بقدر جثہ"، یعنی یہ بھوت پریت کی "پلیدیت" پر موقوف تھا، جنات صرف کالی مرغی لے کر ٹلتا تھا۔ یہاں کی مثل بھی الٹی تھی "دو ملا ہوں یا دس ملا مرغی بہر طور حلال تھی"

---

[1] بنگالی مسلمان (انگریزی) ص ۲۹، ۸۹

اس لیے حرام تو کوئی چیز ہی نہیں تھی حرمت و حلت سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا، مشرقی بنگال کے مدرس کے اسسٹنٹ انسپکٹر عبدالکریم نے ۱۹۰۰ء میں اپنی رپورٹ میں لکھا کہ یہ ملا لوگ رشوت لے کر ناجائز شادیوں کو جائز قرار دیتے تھے اور بعض ایسے واقعات بھی اس کے علم میں تھے کہ مطلقہ کو اس کے خاوند سے بغیر حلالہ کرائے رجوع کروا دیتے تھے۔[1]

پیری مریدی کے کچے دھاگے میں ہر دیہاتی مسلمان بندھا ہوا تھا، تعویذوں اور گنڈوں کا بازار پیران حرم کے سبب بڑا گرم رہتا تھا، اور عرس و نذر و نیاز کی دینی فضا چھائی رہتی تھی، مجہول پیروں کی قبریں بھی پوجی جاتی تھیں اور ہر گلی کوچے میں کسی نہ کسی قبر یا مرقد پر چراغ روشن رہتا تھا اور پھولوں کی چادر چڑھی رہتی تھی، ایک مقامی مصنف صدیقی علی نے "[illegible]" میں قبر پرستی کی مذمت کرتے ہوئے مختلف شہروں کی ان درگاہوں کی ایک طویل فہرست دی ہے جہاں بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا تھا۔[2]

بارہ وفات کے مہینے میں مولود شریف اور عید میلاد النبیؐ کی گہما گہمی رہتی تھی، مسلمان اسے کاروبار بند کر کے ثواب لوٹتے، عشرہ محرم میں ایسا زبردست ماتم مچا رہتا کہ ہر دیندار مسلمان اپنا پیٹ پیٹتا، مسجدیں نمازیوں سے خالی رہ جاتیں لیکن محرم کی مجلسوں میں بڑی رونق رہتی تھی .... پھر ذہنی انقلاب کی ایک رو چلی، اصلاحی تحریکوں کے بہاؤ میں بدعات و خرافات کا کوڑا کرکٹ صاف ہونے لگا اور برسوں کی سیلابی جدوجہد سے بنگال کے مسلم معاشرے کی تطہیر اور صفائی ہونے لگی۔

فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ (۱۷۸۱-۱۸۴۰) جو جاہلوں کے پیر تھے اور ان کے صاحبزادے اور جانشین دودو میاں (۱۸۱۹-۱۸۶۲ء) نے مذہبی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا، مذہبی و دینی [illegible] میں بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیے، مولانا عنایت علی (۱۷۹۲-۱۸۵۰ء) اور بانی بنگال مولانا ولایت علی (۱۷۹۱-۱۸۵۲ء) نے چوبیس پرگنہ، جیسور اور فرید پور کے علاقوں میں زبردست اصلاحات کیں، علمائے صادق پور میں مولانا کرامت علی جونپوری نے گاؤں گاؤں کا تبلیغی دورہ کر کے مسلمانوں کو طریقۂ محمدی کا راستہ دکھایا۔ اس طرح بہت ساری بدعات کا قلع قمع ہوا، شرکیہ امور کا سدباب ہوا اور ایک خوشگوار دینی فضا چھانے لگی۔

۱۔ [illegible] ص ۲۰۲

۲۔ ایضاً ص ۲۰۱

اس سلسلے میں "انجمن" نام کی تنظیم نے مدارس اور مکاتب کے قیام اور تاسیس سے تعلیم و تربیت کی شاندار روایات قائم کیں بنگالی زبان کے ساتھ عربی، فارسی اور اردو کی تدریس و تعلیم کا انتظام کیا گیا، دین کے تفقہہ کے لیے ان زبانوں کا علم ناگزیر تھا جیسا کہ رنگپور کے خان بہادر عبدالمجید چودھری کا خیال تھا، یہ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی شاخ کے صدر تھے۔ اس سے پہلے اس طرف کسی نے دھیان نہیں دیا تھا صرف بنگالی زبان کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جاتی رہی۔ مولانا دلاور حسین احمد نے جو بنگال کے انسپکٹر جنرل رجسٹریشن تھے مولویوں سے یہ فتویٰ مانگا تھا کہ تمام نمازیں بنگالی زبان میں ہونی چاہئیں۔[1]

سلاطینِ بنگال کے زمانے سے دینی اور معاشرتی صلاح کے لیے علمائے بنگال کا ایک با شعور طبقہ کوشاں تھا، انیسویں صدی سے "بحث" کا آغاز ہوا اور وعظ کی مجلسوں سے عوام الناس کا بڑی حد تک سدھار ہوا، وہابی تحریک، فرائضی تحریک اور تعیینونی تحریک نے دینی اور معاشرتی اصلاحات کے دروازے کھول دیے، اہلِ قلم نے ارکانِ دین، عقائد، و موزوابی، مسائل اور فضائل کے موضوعات پر ڈھیر ساری کتابوں کا ڈھیر لگا دیا، ان میں وحدانیت کا صحیح تصور بھی ملتا ہے اور شعائرِ اسلام کا سدھارات بھی دکھائی دیتا ہے، بنگالی میں ان نوعیت کی کتابوں کو "پوتھی" کہتے تھے اور حدیث و سنت پر مبنی تصانیف کو نصیحت نامہ کا نام دیا گیا تھا ان میں مندرجہ ذیل کتابیں بے حد مقبول تھیں:

افضل علی (سولھویں صدی): نصیحت نامہ۔ نصراللہ خان (۱۵۶۰-۱۶۲۵) شریعت نامہ۔ مطلب (۱۵۵۹-۱۶۶۰) کفایت المصلین۔ عبدالکریم کھوندکر (سترہویں صدی): ہزار مسائل، منشی سمیر الدین: بیدار الغافلین

عبادات کے علاوہ "معاملات" کے فقہی مسائل مثلاً شادی بیاہ، فرائض (میراث) اور دیگر متعلقہ موضوعات پر بنگالی اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کی گئی تھیں۔ جمعہ کے نماز کے مسائل و فضائل پر "کتاب شاہی احکام جمعہ" — "لاجمعہ" فرقے کی رد میں لکھی گئی تھی، اسی طرح مولانا کرامت علی جونپوری نے "رسالہ در مباحثہ و محاکمہ" لکھا جو اسی فرقہ کے بعض عقائد کی تردید میں تھے۔[2]

---

[1] بنگالی مسلمان (انگریزی) ص ۹۲، ۱۲۹

[2] کتب خانہ جامع مسجد کے اردو مخطوطات بمبراہ۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ص ۱۱۴

بعض رسائل بے نمازیوں کی وعید کے بارے میں لکھے گئے تھے جن میں نماز کے وہی فضائل بیان کیے گئے تھے جو مروجہ "تبلیغی نصاب" میں موجود ہیں، نماز کے بارے میں بعض علماء اتنے متشدد واقع ہوئے تھے کہ بے نماز بیویوں کو طلاق دینا احسن خیال کرتے تھے۔ [1]

دین کی عظیم عمارت پانچ بنیادی ستونوں (ارکانِ دین) پر قائم ہے، نماز کی تبلیغ ایک رسمی مسلمان کو نمازی بنا سکتی ہے کردار کا غازی نہیں بنا سکتی، معاملہ یہ ہے کہ ہر مسلمان نمازی بنے ایسا مشرف بہ اسلام، صرف نماز کے فضائل کے وسیلے سے جنت کی تلاش کرتا رہتا ہے اور مسائل کی دشوار گزار گھاٹی سے ناواقف ہی رہ جاتا ہے، بنگال کے مبلغین اس اہم نکتہ کو بھولے نہ تھے اور فقہی مسائل و احکام پر متعدد ابتدائی رسائل تصنیف کیے جس کا اثر یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ طبقہ حرمت و حلت کے مابین الجھی ہوئی لکیروں کی نشاندہی کرنے کے قابل ہو گیا، دینی درسگاہوں کے سند یافتہ دانشور علماء نے اس طرف سب سے زیادہ دھیان دیا، یہ ابھرتا ہوا نوجوان طبقہ بنگال کے مدارس سے متوسطات تک کی تعلیم پانے کے بعد بیرونی درسگاہوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لیتا تھا، مدرسہ عالیہ رامپور، چشمہ رحمت غازی پور، مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ اور دار العلوم دیوبند میں بنگالی طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی تھی ان میں مومن، انصاری طالبانِ علم بھی شامل تھے، مقامی مدارس میں اعلیٰ تعلیم کے لیے شرافت نامہ پیش کرنا پڑتا تھا، محلہ یا بستی کا کوئی سربرآوردہ شخص ہی دے سکتا تھا۔ فقہی مسائل اور شرعی احکام پر جو تصانیف منظر عام پر آئیں وہ زیادہ تر حنفی نقطۂ نظر، قاضی خان، فتاویٰ عالمگیری، دُرّ المختار و دیگر کتب فقہ پر مبنی تھیں۔ محمد نعیم الدین (۱۸۳۲ء - ۱۹۰۸ء) کی معرکۃ الآراء تصنیف "زبدۃ المسائل" (دو جلدوں میں مطبوعہ ۱۸۷۳ء اور ۱۸۹۱ء) کا فیض عام آج تک جاری ہے۔

ان تمام کوششوں کا یہ خوشگوار نتیجہ نکلا کہ بنگال کے مسلمانوں کے دینی شعور کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، مومن، تانتی بنکروں میں دین کا صحیح شعور پیدا ہوا، ان کی ایک کثیر تعداد کا میلان مسلک اہلحدیث کی طرف تھا، جو سنی حنفی تھے اپنے مسلک پر تشدد کے ساتھ قائم رہے، اوہام پرستی، باطل عقائد اور شرکیہ امور کا خاتمہ ہونے لگا، دینی شعور پیدا ہوا تو دین، اسلام اور حق دوست ہو کر بنگالیوں کے ناموں کے لاحقے بن گئے اور یہ بہت سب سے زیادہ ہو گئے، جیسے شمس الدین، نذر الاسلام، انوار الاسلام، ضیاء الحق، شمس الحق وغیرہ۔ [1]

۱۔ [illegible] بنگال کے مسلمان [illegible] ص ۲۳ [illegible]

بائیسواں باب

لباسِ تقویٰ کے مومن بافندہ برادری کے علمائے کرام

تذکرہ علماء ضلع اعظم گڈھ

ہمارے اکابرین، بزرگانِ سلف اور عصرِ حاضر کے عالم و کاملین جنہوں نے دین کی خدمت کی، میدانِ دعوت و عزیمت میں سرفروشی دکھلائی، حریت کی روح پھونکی، امتِ مسلمہ کو توحید پرستی کا درس پڑھایا، اصلاحِ معاشرہ کے لئے مصلحین قوم کا کردار ادا کیا اور مشرکانہ رسوم و عقائد کی بیخ کنی کی۔ اور علم و دانش کے ایوان میں شمعیں روشن کیں۔ یہ سارے ہمارے لئے قابلِ صد احترام ہیں۔ یہ طبقہ اشرف کے مسند نشینوں میں سے تھے یا اجلاف کے خاک نشینوں میں شمار ہوتے ہوں ہمارے لئے قابلِ صد فخر ہیں کیونکہ یہ یادگارِ زمانہ لوگ ہماری قوم کے روحانی پیشوا رہے اور میدانِ حریت و دعوت کے سالار رہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا

(مریم: ۱۵)

"اور جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس دن وفات پائیں گے اور جس دن زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے ان پر سلام اور رحمت رہے۔"

کسی مخصوص طبقہ کے چنندہ افراد کو شناخت کرکے ان کے کارناموں کو سربنامہ تذکرہ کائنات کا شرف ایک حق ہے۔ صرف مومن برادری کے مشاہیر علماء و فضلاء اور کار گزار شعر و سخن، علم و ادب کے نواسنجوں اور انشاء پردازوں تک بیان کی تحدید کی گئی ہے۔ اس سے نہ کسی عصبیت کا مظاہرہ مقصود ہے اور نہ نظر انداز کرنے کا اتہام۔ صرف منظور ہے گذارش احوالِ واقعی ورنہ یہ سارے علماء و فضلاء، اساتذہ و شیوخ اور اکابرین یکساں تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ اس اختصاص میں تحزب و مباہات کا شائبہ تک نہیں۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
ضمیرِ بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی — بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

(اقبالؒ)

دیارِ پورب کے علمائے کرام

تذکرۂ علمائے مبارکپور:

اعظم گڑھ کا ضلع اسی صدی سے مردم خیزی میں سب سے زیادہ بہار آفریں ثابت ہوا، ہر قصبہ اور قریہ میں دینی علوم کی درسگاہیں کھل گئی تھیں جن میں اربابِ درس و تدریس اور مسجدوں میں حفاظ، دار الافتاؤں میں مفتی، فقیہ، قاضی اور محدث حضرات اور خانقاہوں کے حدود سے ملحقہ ہوئے حجروں میں پیرانِ طریقت مسندِ درس و افادہ بچھائے بیٹھے تھے اور دستار فضیلت باندھے اربابِ علم سربلند تھے، ہر ایک اپنی اپنی جگہ ایک روحانی سلطنت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مختلف قصبوں سے آتی تھیں، طالبانِ علم کے انبوہ در انبوہ کشاں کشاں آ رہے تھے، بستیاں منظومات اور درسگاہوں سے معمور تھے۔ سونا تھ بھنجن میں تو ہر گھر تک دینی تعلیم کا انتظام تھا اور زنانے مدرسے جاری تھے، مبارکپور میں سیاسی اور فنی حضرات کا جمگھٹا موجود تھا۔ حفاظ اپنے مکانوں میں رکھے پڑھتے رہتے اور بچوں کو حفظ کراتے، ٹانڈہ میں ہر کوئی حافظِ قرآن تھا جتنے حفاظ یہاں پیدا ہوئے دیارِ پورب میں کسی اور جگہ اس کی مثال نہیں ملتی، شاہ صاحب حضرت پانی پت تعلیمِ قرآن کی آبرو رکھے ہوئے تھا۔ مبارکپور کے اٹھائیس محلوں میں بیسویں صدی کے اول نصف میں بڑی رونق رہتی تھی اور دینی و علمی فضا قائم تھی۔ میاں صاحب جان محمد، میاں صاحب عبداللہ، میاں صاحب عبدالحمید اور میاں صاحب علی وغیرہ اپنے وقتوں کے فارسی صدر مدرس تھے۔

علمی اور درسی سلسلوں میں مکتب شاہ ولی اللہ کو سب سے زیادہ عروج حاصل ہوا جنہیں کے مبارک دور سے علم حدیث کو عروج و ارتقاء حاصل ہوا اور اہلحدیث میں بڑے عالی مرتبت اور نابغۂ روزگار محدثین پیدا ہوئے اور فقہائے محدثین کے طرز و اسلوب پر علوم حدیث کی تعلیم و تدریس تالیف و تصنیف اور نشر و اشاعت کا زبردست سلسلہ شروع ہوا۔ ان محدثین کبار میں محدث کبیر محمد عبدالرحمن مبارکپوری کی ذاتِ گرامی پورے عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں متعارف ہے۔ ؎ آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند۔ ان کے سینکڑوں شاگرد زمرۂ علمائے کبار میں شمار کئے جاتے ہیں۔

عطا کی ہے شاید متاخرین علمائے ہند میں سے کسی کی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ مقدمۂ تحفۃ الاحوذی
اپنی مثال آپ ہے۔ ان کتابوں نے آپ کو زندۂ جاوید شخصیت بنا دیا اسی طرح دیگر تصانیف بھی
آپ کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں اور عبقریت پر دال ہیں۔ مولانا خود اپنی تصانیف اور فتاویٰ میں مجتہدانہ
شان رکھتے تھے، فقہ خاص طور سے احناف کے بارے میں علمی وتحقیقی حد تک نہایت شدید رویہ
رکھتے تھے آپ ہر مسلک والے کو اس کے مسلک کے مطابق مسئلہ بتایا کرتے تھے، اپنے دادا "بڑے
حافظ" کی طرح آپ بھی "بڑے مولانا صاحب" کے لقب سے متعارف تھے۔

مولانا کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی علم وفضل، تقویٰ وطہارت، زہد وقناعت انزوا و
عزلت، سادگی اور دنیا سے بیگانگی میں اپنی نظیر آپ تھے تصنیف وتالیف، عبادت وحکمت
زندگی کے مشاغل تھے، خشیت الٰہی کا غلبہ تھا اور بڑے رقیق القلب تھے۔ چہرے پر جمال تھا
اور علم وفضل میں جلال تھا علم نبوت کے اس زبردست امین کا دورۂ قلب سے ۱۶ شوال
۱۳۵۳ھ کو دور حیات ختم ہوگیا۔ حضرت العلام مولانا محمد احمد مئوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔
جنازہ مشہودہ تھا۔[1]

مولانا حافظ حکیم عبدالرحیم مبارک پوری (متوفی ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء)

"بڑے حافظ جی" مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری کے والد ماجد تھے۔ قصبہ کے مشہور اطباء
وعلماء میں ان کا شمار ہوتا تھا، چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا محمد فیض اللہ مئوی تلمیذ مولانا سخاوت
علی جونپوری اور مولانا حسام الدین مئوی سے علوم دینیہ وفقہیہ کی تکمیل کی اور حدیث کی تعلیم مولانا
قاضی شیخ محمد مچھلی شہری سے کی، حافظ صاحب نے قاضی موصوف سے سند مسلسل بالاولیت، سند مناولۂ
بلوغ المرام اور سند اتحاف الاکابر حاصل کی تھی جو بہت بڑا اثاثہ تھا۔ اہلحدیث کے مسلک پر تھے۔ طبابت
وتدریس کا سلسلہ گھر پر رکھتے تھے۔ قصبہ کے سینکڑوں حفاظ نے ان کی شاگردی میں حفظ قرآن
کی نعمت پائی۔ ان کے مخصوص ارشد تلامذہ میں حافظ شاہ نظام الدین مئوی اور مولانا عبدالسلام
مبارکپوری قابل ذکر ہیں۔ مسلک اہلحدیث کے فروغ میں آپ کی مساعی جمیلہ کو بڑا دخل ہے۔[2]

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند، تذکرہ علماء اعظم گڑھ، تذکرہ علمائے مبارکپور وتابعات اہلحدیث کی تصنیفی خدمات اور جماعت
اہل حدیث کی تدریسی خدمات اور دونوں کے علاوہ الشیخ عبدالرحمٰن عبیداللہ رحمانی مبارکپوری فاضل جامعہ سلفیہ مدینہ منورہ
کے زیر ترتیب تذکرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ [2] تذکرۂ علمائے حال ص۳۲، تراجم علمائے اہلحدیث ص۳۹۵، تذکرۂ علمائے
مبارکپور ص۱۲۶-۱۲۷، تذکرۂ علماء اعظم گڑھ ص۱۵۵-۱۵۶

مولوی حکیم محمد شفیع آپ کے صاحبزادے قصبہ کے کامیاب و مشہور اطباء میں شمار ہوئے۔

مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارکپوری (۱۲۸۹-۱۳۴۲ھ)

عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارکپور کے مشہور علمائے دین سے تھے۔ آپ کے والد موحد اور عامل بالحدیث تھے۔ مولانا کا خاندان قصبہ میں بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے والد شیخ خان محمد بڑے متقی بزرگ تھے۔ (۱۲۵۷-۱۳۲۶ھ) مولانا کے نانا حکیم امان اللہ شاہ ابو اسحاق بہردی کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا عبدالسلام نے عربی کی ابتدائی درسی کتب کافیہ و شافیہ تک مولانا عبدالرحیم مبارکپوری اور دیگر علماء سے پڑھیں قطبی شرح تہذیب اور شرح جامی مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری سے اور شرح وقایہ مولانا سلام الدین مئوی سے پڑھ کر اور مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرکے دہلی گئے اور شیخ الکل حضرت سید میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے صحاح ستہ تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی اور نخبۃ الفکر کا درس لیا اور شیخ حسین عرب یمانی سے اجازت نامہ حاصل کیا۔ اجازت حدیث مسلسل بالاولیہ دہلوی امام حضرت قاضی محمد مجتبیٰ شہری سے حاصل کی اور طب یونانی کی تعلیم حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنوی اور دیگر علماء طب سے حاصل کی۔

مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں زندگی بسر کی۔ مولانا کی اہم تصنیف سیرۃ البخاری ہے۔ یہ بڑی ہی بے نظیر علمی و تحقیقی کتاب ہے جس کی سلاست بیان، طرز استدلال، استقصائے واقعات، تفصیل مطالب اور تحقیق مسائل کا اعتراف مولانا سید سلیمان ندوی جیسے بزرگ نے کیا ہے۔

مولانا نے اولاد و احفاد میں مولانا حافظ عبدالعزیز، محدث کبیر عبیداللہ رحمانی مؤلف مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، ڈاکٹر محمد عزیز ندوی، عبیدالرحمٰن طالب رحمانی علم و فضل سے مالا مال ہیں۔ محدث مرحوم شیخ عبیداللہ رحمانی کے تین لڑکے ہیں: جناب فضل الباری، عبدالرحمٰن، عبیدالسبحان اور حافظ محمد عزیز۔ موصوف نے ام القریٰ (مکہ معظمہ) یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرلی ہے۔

مولانا حکیم الٰہی بخش (۱۲۹۰-۱۳۵۶ھ)

مولانا حکیم الٰہی بخش کا شجرۂ نسب یہ ہے: بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھون بن شیخ

محمد عرف لالن بن شیخ غلام محمد پورہ دولہن مبارکپوری اعظم گڈھ کے مشہور اطبا اور ماہر حکماء میں شمار ہوتے تھے۔ قصبہ کے مشہور محدث کبیر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور حدیث کی تحصیل کی۔ اس کے بعد کانپور مدرسہ فیض عام میں معقولات و منقولات کی تکمیل کی۔ مولانا حکیم فیض اللہ سے علم طب حاصل کیا ۱۳۱۶ھ میں فاتحہ فراغت پڑھی اور اسی سال مدرسہ احیاء العلوم کے قیام عمل کے بعد اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۳۲۶ھ میں مولانا شکر اللہ دیوبندی مبارکپوری کو نظامت کی ذمہ داری سپرد کر کے آخر عمر میں مستقل طور پر شہر مئو میں مطب کرنے لگے اور ضلع کے طبی بورڈ کے صدر منتخب ہو گئے تھے۔ آپ کے والد مولوی حکیم عبداللہ اپنے زمانے کے طبیب حاذق تھے۔

مولانا شکر اللہ مبارکپوری

حضرت مولانا حاجی قاری، مفتی استاذ العلماء محمد شکر اللہ بن شیخ عبدالوحید مبارکپوری علمی و دینی دور کے خاتم اور دوسرے علمی و دینی دور کے بانی تسلیم کئے گئے [illegible] مدرسہ [illegible] بڑے تو مولانا محمود معروفی (متوفی ۱۳۰۰ھ) سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شوق تحصیل علم میں دامن چھڑا کر گھر سے چپکے سے نکل بھاگے اور الہ آباد جا کر مدرسہ سبحانیہ میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور پھر ضلع سیتاپور کے ایک مدرسہ میں پہنچ گئے جہاں سلسلۂ خیرآباد کا معقولات میں مبارکپور کی طرح اس کا فیض جاری تھا۔ مولانا عبدالعلی [illegible] جونپوری (م ۱۳۵۲ھ) سے کسب علم کر کے دارالعلوم دیوبند پہنچے جو اس وقت اکابر علماء اور ماہر فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن، مولانا حافظ احمد صاحب، مولانا انور شاہ کشمیری اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم کا فیضان علم جاری تھا۔ ۱۳۲۶ھ سے جب سے مولانا حکیم الٰہی بخش نے مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت سپرد کی ۱۳۶۱ھ تک مبارکپور اور اطراف میں جو علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی، قومی، ملی اور سیاسی کارنامے مولانا شکر اللہ نے انجام دئے وہ صدیوں کے کارناموں پر بھاری ہیں۔ دیوبندی مکتب فکر کے ترجمان تھے بدعات و خرافات کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ خطیب شعلہ بیان اور واعظ بلاغت لسان تھے، موت و حیات، شادی بیاہ، ذات برادری کی غلط رسموں میں اصلاح اور سدھار پیدا کرنا ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ خلافت تحریک میں شامل ہوئے تو مبارکپور کے رہنما بن گئے مئو کی ذی اثر شخصیت مولانا عبداللہ اور مولانا شکر اللہ کی رہنمائی

حاذق تھے۔ برادری کے چودھری اور سردار تھے۔

ابوالحسن مولانا حافظ عبدالعزیز بن مولانا عبدالسلام بن خان محمد

مولانا عبدالسلام مبارکپوری کی چار اولاد ذکور میں سب سے بڑے اور [illegible] ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری اور مولانا عبداللہ غازی پوری سے پڑھا تھا۔ حافظ قرآن، ذہین و فطین، شیریں بیان، خوش الحان اور پاکیزہ خصلت عالم تھے، مشرقی بنگال کے ضلع بوگرا کے مقام کدون میں مستقل قیام کرتے تھے۔ ۱۳۹۰ھ میں انتقال کیا، دختری اولاد بنگال میں موجود ہے۔[1]

حکیم مولوی محمد اصغر مبارکپوری

بن شیخ قاری محمد علی بن حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارکپوری ساکن محلہ پورہ معروف۔ مولانا عبدالرحمٰن محدث کبیر مبارکپوری کے برادرزادہ اور ان کے تلمیذ رشید تھے اور انہیں کے شاگرد مولانا محمد محمود معروفی سے مدرسہ احیاء العلوم میں ابتدائی کتابیں پڑھیں پھر اپنے چچا مولانا مبارکپوری سے فیض علم حاصل کیا اور انہیں کے مدرسہ دار التعلیم میں فارسی اور عربی زبانوں کے مدرس مقرر ہوئے۔ طب و حکمت سے بھی واقف تھے، بہترین مطب ساز بھی تھے۔ ۱۳۴۶ ہجری میں مبارکپور میں انتقال کیا۔[2]

مولانا محمد حنیف رہبر شکری بن حافظ عبدالرحیم شکری (م ۱۳۷۷ھ)

مولانا شکراللہ کے خواہرزادے تھے انہوں نے ہی ان کی پرورش و پرداخت کی اور زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مدرسہ مفتاح العلوم مئو اور مدرسہ دارالعلوم دیوبند سے مختلف علوم و فنون میں فضیلت حاصل کی۔ بڑے لطیف مزاج اور محبتی شخص تھے۔ شاعری میں رہبر تخلص تھا اور مولانا حسرت موہانی سے شرف تلمذ حاصل کیا، مضمون نگار بھی اچھے تھے اور مختلف رسائل میں ان کے مضامین چھپتے تھے۔ مقامع الحدید بجواب مصباح الجدید ان کی مشہور تصنیف ہے جس کا انداز بیان بہت دلچسپ ہے۔[3]

مولانا محمد نعمت اللہ (م ۱۲۶۲ھ) بن حافظ

عبدالسبحان بن شیخ بچھن ساکن محلہ پورہ رانی کا نتران مئو سے ترک وطن کر کے

---

[1] تذکرہ مدرسہ مبارکپور ص۲۳۷-۲۳۸

[2] ایضاً ص۲۱۱ تذکرہ علماء مئو اعظم گڑھ ص۲۵۹

[3] تذکرہ علماء مبارکپور ص۲۸۶ - تذکرہ علماء اعظم گڑھ [illegible]

مبارک پور میں بس گیا تھا مدرسہ احیاء العلوم میں عربی کتابیں پڑھ کر مولانا موصوف کانپور گئے اور
پھر وہاں سے دارالعلوم دیوبند چلے گئے۔ جب مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم مولانا شکر اللہ مقرر ہوئے
تو ان سے وابستہ ہو گئے اور علمی و دینی خدمت انجام دیتے رہے۔ مولوی صاحب بہترین قاری
خطاط اور خوشنویس تھے۔ ہندی اور انگریزی میں بھی دسترس حاصل تھی۔ مدرسے سے سبکدوش
کر دیے گئے تو کئی سال تک مختلف قرآن [illegible] لکھ کر گذر بسر کرتے رہے۔ صبر و شکر، توکل
و قناعت، سادگی اور شرافت، محبت و شفقت یہ سارے اوصاف آپ میں جمع تھے۔ آپ کی درسگاہ
سے سینکڑوں طلبہ عالم و فاضل بنے۔

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا قاضی خاندان

مبارکپور کے بانی کڑا مانکپور کے حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد (متوفی ۹۹۵ھ)
کے ساتھ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کا جد [illegible] عالم مصنف اور مفسر [illegible] قاضی خاندان مانکپور
سے یہاں آ کر یہیں مستقل آباد ہو کر حکومت وقت کی طرف سے نیابت قضا کا عہدہ سنبھالا اور
راجہ صاحب کے بعد اس قصبہ میں گویا ان کا نائب بن کر رہے۔

شیخ علی شہید مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے جد اعلیٰ تھے۔ اس خاندان میں علمی و روحانی دولت
کے ساتھ ساتھ دولت و ثروت بھی زمانۂ قدیم سے چلی آئی تھی۔ شیخ علی نیابت قضا کے عہدہ پر
سرفراز تھے، پہلوانی اور شہ زوری میں مشہور زمانہ تھے اور سواد قصبہ میں اس فن کے استاد مسلم
مانے جاتے تھے، زہد و تقویٰ میں بے مثل تھے۔ کہا جاتا ہے حضرت شیخ علیؒ کو پہلوانی اور طاقت
کی رقابت میں شہید کر دیا گیا۔

شیخ امام بخش (م ۱۲۶۵ھ کے بعد)

قاضی شیخ علی کے صاحبزادے اور ان کے جانشین تھے۔ بڑے متقی اور دیندار بزرگ تھے۔ قصبہ
[illegible] قاضی [illegible] بعد راجہ صاحب کے مستقل امام [illegible] مبارکپور کی عیدگاہ میں عیدین کے
امام تھے۔ [illegible] (۱۲۲۴ھ) [illegible] تھے۔ [illegible] کی عیدگاہ کی [illegible]
[illegible] مبارکپور اور اس کے اطراف و اکناف میں مسلمانوں کی بہت بڑی بڑی
بستیاں تھیں۔

[illegible] قصبہ [illegible] کے [illegible] مقامات میں قضا کی نیابت فرماتے تھے جس میں
[illegible] نکاح خوانی، [illegible] کی پابندی، [illegible] سنت رسول، امامت جمعہ و جماعات، وعظ و تذکیر

تنازعات، زن و شوئی کے معاملات و قضایا کے امور آپ کے سپرد تھے۔

شیخ امام بخش کے دو صاحبزادے تھے: شیخ محمد رضا اور شیخ حسام الدین اور دونوں بھائی اپنے والد کی حیات ہی میں قصبہ اور ملحقات میں نیابت قضا کی خدمت انجام دیتے تھے۔ شیخ امام بخش کے پوتے شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا (م ۱۲۹۷ھ) بھی اسی عہدے سے وابستہ تھے۔ شیخ محمد رضا کی امانت گزاری و دیانتداری کے پیش نظر ان کو مزید اعزاز دے کر پندرہ سولہ مقامات کا نائب قاضی بنا دیا گیا۔ اس پورے علاقے کے جملہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار تھے۔

شیخ حسام الدین شاہ

زہد و تقویٰ، خشیت الٰہی اور پارسائی میں بہت پہنچے ہوئے تھے اور ولی کامل سمجھے جاتے تھے۔ آپ کی ولایت اور بزرگی کا شہرہ دور دور تک تھا، درس و تدریس اور دینی و علمی خدمت میں باقی زندگی گزار دی۔ آخر وقت میں مجذوبانہ حالت پیدا ہو گئی تھی اور روایت ہے کہ ان کو رب المشرقین والمغربین نے طی الارض کی کرامت سے نوازا تھا۔ لوگوں نے ان سے چلنے کے لیے کہا اور انھوں نے کہا چلو میں آتا ہوں اور اس کے بعد دیکھا گیا تو وہ وہاں پہلے سے موجود رہا کرتے تھے، عوام و خواص میں "حاجی بابا" کے لقب سے مشہور تھے۔ ۱۲۹۰ھ میں رحلت فرمائی۔

شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی شہید رحمہم اللہ

اس خانوادۂ قضاۃ و مشیخت کے خاندانی عہدہ و روایت کے آخری فرد تھے۔ خاندانی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جید عالم، متقی اور دیندار بزرگ تھے ساتھ ہی اسلامی شان و شوکت کے مالک تھے۔ خاندانی رسم کے مطابق پالکی نشینی کا استحقاق حاصل تھا وہ اسی شان سے جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے جاتے تھے ارباب علم و دانش دو رویہ قطاریں باندھ کر معیت میں چلتے تھے۔

شیخ محمد رجب کے دو صاحبزادے تھے۔ میاں جی حاجی علی محمد اور میاں جی ولی محمد۔ اول الذکر نے خاندانی روایت کا بھرم قائم رکھا، ان کے چار صاحبزادے تھے: (۱) میاں جی عبداللہ (م ۱۲۵۷) (۲) میاں جی حاجی اسعد اللہ (م ۱۳۰۲) (۳) میاں جی حاجی محمد حسین (م ۱۲۹۰) اور میاں جی حاجی محمد حسن جو دانش اظہر صاحب کے دادا جان ہیں۔ میاں جی حاجی اسعد اللہ میں خاندانی روحانیت کا رنگ نمایاں تھا اور اہل دل و اہل حق کی صحبت میں وقت گزارتے تھے۔ میاں جی محمد حسین نیابت قضا کی رہی سہی روایت کو جوڑے اور سنبھالے رہے۔ میاں جی ولی محمد کے دو فرزند تھے ایک میاں جی محمد شفیع اور دوسرے میاں جی حاجی محمد عمر۔

ملحقات وسواد کے اہلِ علم

سوادِ مبارک پور میں بھی نوربافوں کی بستیاں تھیں، صاحبِ مال و ثروت کے لیے گربت، دھنا سیٹھ، دھنی وغیرہ القاب خاص طور سے مبارکپور، مئو اور کوپا گنج کے علاقے میں مشہور تھے۔ ایسے ہی مولوی دھنا سے (دھنا سیٹھ کا مخفف)۔ ان زمانے کے مالداروں میں سے تھے، اسی لیے اس لقب سے مشہور ہوگئے، علم و عمل اور وضع قطع میں سلف کا نمونہ تھے، مطالعہ کا بہت شوق تھا اور بڑا علمی ذوق تھا۔[1] آپ قصبہ پورہ معروف کے مولانا طاہر انصاری اور مولانا شاہ اسحاق دہلوی کے شاگرد تھے۔

مولانا حافظ خدا بخش

بن شیخ حاجی حسن بن شیخ عیسیٰ مبارک پوری مہاجر مکی کا گھرانہ دینی و دنیاوی اعتبار سے ان کے آبائی وطن اور اطراف میں بہت ممتاز تھا حاجی حسن مشہور تاجر تھے۔ مبارکپور سے ریشمی علاقے کی تجارت تھی اور حیدرآباد تک کاروبار کا سلسلہ جاری تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بڑا جذبۂ جہاد پیدا ہوگیا تھا اپنے دروازے پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا اور اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حافظ خدا بخش نیک نفس، منکسر مزاج، خداترس، غریب نواز، ذاکر و شاغل بزرگ تھے اور انجذاب و ذوق اور جذب کی حالت میں گھر سے غائب ہو جاتے مگر نہایت تقویٰ و طہارت اور عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ نہایت کامیاب تاجر تھے۔ غریبوں اور مساکین کی خفیہ طور پر مدد کرتے تھے۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو بہت مشہور ہوا۔ ان کے پڑوس میں ایک غریب آدمی تھا۔ اس کی بیوی اکثر لڑائی جھگڑا کرتی اور گھر سے بھاگ جاتی تھی۔ حافظ صاحب نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا میں غریب آدمی ہوں میرے پاس کھانے کا انتظام نہیں ہے اور میری بیوی مجھ سے زیورات کا مطالبہ کرتی ہے۔ حافظ صاحب سن کر خاموش ہوگئے۔ کچھ دنوں بعد اسے کھجور تالاب کے ایک گھاٹ پر بلایا اور تنہائی میں زیورات کی ایک تھیلی دے کر کہا یہ زیور اپنی بیوی کو دے دو مگر اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ والد کے بڑے خدمت گزار بیٹے تھے۔ حج بیت اللہ کا سودا سمایا تھا، تیسری بار کامیابی نصیب ہوئی

---

[1] تذکرۂ علمائے مبارک پور، ص ۱۱۸

حافظ عبداللہ مئوی غازی پوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور مولانا امانت اللہ غازی پوری کا چشمۂ فیضان جاری تھا، یہیں مولانا نے بھی اپنا فیض درس و افادہ کا سلسلہ شروع کردیا، آپ کے ارشد تلامذہ میں خود آپ کے برادر خورد مولانا احمد حسین رسولپوری، مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی وغیرہ تھے پینتیس ۳۵ سال تک چشمۂ رحمت کے تشنگان علم آپ کے درس و افادہ سے سیراب ہوتے رہے۔ اس پوری مدت میں مفتی شہر بھی رہے۔ اور علمائے اہل حدیث اور علمائے احناف میں جگہ جگہ ہونے والے مناظروں اور مناقشوں میں احناف کا علمبردار اور ترجمان بنا رہا۔ آپ کا مقابلہ مولانا احمد رضا خان سے بھی ہوتا رہا۔ غرض کہ آپ علمی و فقہی مباحث و مناقشات کے مرد میدان تھے علوم نقلیہ و عقلیہ میں جامع المعقول والمنقول اور علم کلام میں پوری دسترس رکھتے تھے، طب و طبابت میں حذاقت و مہارت رکھتے تھے خطاطی اور خوشنویسی میں کمال حاصل تھا۔ ان کے رشید تلامذہ میں بڑے مشاہیر حضرات شامل ہیں۔ مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی (م ۱۳۴۲ھ) مولانا احمد حسین رسولپوری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ محمد سرینوی، مولانا شیخ محمد عباسی مئوی (منصف قانون گو۔ گورکھپور)، مولانا ابو محسن حیدری غازی پوری، مولانا محمد لطیف امروہی، مولانا حکیم فیاض المئوی، مولوی حکیم یعقوب حسین سکٹوی، مولوی نور محمد، مولانا شیخ محمد مبارک پوری۔

مولانا نے کئی اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ان میں سے ستو ید توضیح الغرض المعتبرہ فی تحقیق الشربہ (حقہ، دخان کی حلت و حرمت اور کراہت کی بحث میں ہے)، کتاب شہادت و طاعون زدہ اموات کے بارے میں، الخطب المنبریہ من الآیات القرآنیہ۔ درۃ الثمین للنور فی الاذان الجمعۃ عند المنبر، سفرنامۂ حجاز، مطبوعہ اور معروف ہیں۔ مولانا کا انتقال ایک مدت بعد ۱۳۴۱/۱۹۲۲ میں ہوا۔[1]

مولانا احمد حسین رسولپوری (۱۲۹۸-۳۵۹)

مولانا حکیم حاجی احمد حسین بن عبدالرحیم عرف بابا اللہ بن شیخ جمال الدین عرف جمن بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسولپوری مبارکپوری، اعظمی خانوادہ علمائے رسول پور کے رکن اشین اور وہاں کے دوسرے علمی سلسلے کے واسطۃ العقد اور مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے جد مادری ہیں۔ بڑے بھائی حضرت مولانا حاجی حکیم مفتی ابوالمجد عبدالعلیم کی تربیت دادا اور نانا

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرہ علمائے مبارک پور ص۱۵۷-۱۹۸، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص۹۲-۱۰۰

نے آپ کی بھی تربیت کی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد چشمۂ رحمت غازی پور گئے۔ بڑے بھائی سے نور الانوار اور میبذی پڑھی، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی (م ۱۳۲۷ھ) سے شافیہ، قطبی، التحقیق، المفتاح اور سبعہ معلقہ کا درس لیا۔ پھر وہاں سے مدرسہ حنفیہ جونپور تشریف لے گئے، کانپور میں مولانا اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰-۱۳۶۲) مدرسہ جامع العلوم میں سرچشمۂ فیضان علم بنے ہوئے تھے، ہدایہ، جلالین، مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں فضیلت حاصل کی اور کتاب و سنت میں ان سے خصوصی تلمذ کر کے سلسلۂ ولی اللہی سے منسلک ہوئے۔ پھر عالی درجہ حاصل کرنے کے لئے مدرسہ عالیہ رامپور میں علوم و تربیت کو پہنچے، عربی ادب و عربیات کی تعلیم مولانا شیخ محمد طیب بن محمد صالح مکی (م ۱۳۴۴ھ) سے حاصل کی اور ایسا کمال پیدا کیا کہ عربی ادب و شاعری میں ہندو شرق میں ان کی ہمسری نہ کر سکا۔ دیوان احمد آپ کے عربی کلام کا مجموعہ ہے (مطبوعہ ۱۳۰۰ بمبئی)۔ رامپور ہی کے زمانۂ قیام میں مولانا حکیم محمد حسین خان سے طب و حکمت کی تحصیل کی۔

مولانا حکیم محمد حسن بن انصاری (پورہ شاہ شیخ معروف) (م ۱۲۹۶)

سید احمد شہید کے شاگردان رشید مولانا کرامت علی اور سخاوت علی جونپوری سے علوم ظاہری و فنون باطنی تحصیل کی۔ مولانا کرامت علی سے خرقۂ خلافت و اجازت ملی تھی، آپ نابغۂ فنی بھی تھے، علم طب میں حذاقت کے حامل تھے، بڑے نفیس خطاط تھے، درجنوں کتابیں جو مبسوط و ضخیم تھیں انہیں کی خوشنویسی کے نادر نمونے تھے۔ شاہ محمد اسحٰق نبیرۂ شاہ عبد العزیز سے حجاز میں حدیث کا علم حاصل کیا۔

مولانا حسن علی کے بھی ماہر تھے اور اپنی تصنیف کی خود ہی کتابت کرتے تھے۔ مولانا کی تصانیف کی فہرست یہ ہے: (۱) تحفۃ الاخیار فی فضل المدینۃ و مناقب سید الشہداء (۲) احسن المیراث فی بدیۃ احیاء الی الاموات (۳) القلائد من الفرائد (۴) حاشیہ قصیدہ بردہ (۵) حاشیہ مستقی الاوّل (۶) سبیل الآخرت (۷) تجہیز الاموات (۸) مجربات احمدی (۹) دیوان احمد۔

مولانا نور محمد بن شیخ محمد حسن

(امام و خطیب جامع مسجد راجہ مبارک شاہ) کا سلسلۂ نسب اوپر جا کر مولانا قاضی طہ مبارکپوری کے خاندان سے مل جاتا ہے، چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا عبد العلیم سولپوری صدر مدرس اور دوسرے علماء و اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی۔

مولانا محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین بن شیخ باب اللہ (۱۳۲۸-۱۳۸۷)

قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کے ماموں تھے، مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں مولانا شکر اللہ مولانا نعمت اللہ اور مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور اور عربی کالج رائیدرگ آندھرا اور مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دیں۔ تدریس و تعلیم کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ جاری رکھا ان کے کئی علمی وتحقیقی مقالات ومضامین مقتدر جرائد ورسائل میں چھپ چکے ہیں۔ کوکن کی ایک جامع مسجد کے لئے عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا جو چھپ چکا ہے، منظوم تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ فن تجلید کے بھی ماہر تھے اور نہایت عمدہ، پائدار اور دیدہ زیب جلدیں بناتے تھے۔

مولانا حکیم مفتی محمد شعیب رسولپوری (۱۳۰۹-۱۳۹۵ھ) بن مولانا عبد العلیم بن شیخ باب اللہ نے علم وفضل کے گہوارے میں پرورش پائی۔ آپ کے والد محترم مولانا عبد العلیم رسولپوری کے زیر سایہ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں اور وہیں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی، مولانا عبد الصمد شمشاد لکھنوی اور مولانا محمد اسمٰعیل سے اکثر کتب درسیہ پڑھیں اور پھر مدرسہ عالیہ رامپور میں تعلیم پاکر سند فراغ پائی۔ والد کی جگہ مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور کے صدر مدرس اور شہر کے مفتی اعظم رہے۔ سینکڑوں علماء ان کی محفل درس سے فیضیاب ہوکر دیار پورب میں پھیل گئے بڑے دلنشین وعظ کرتے تھے، طبابت بھی کرتے تھے۔

مولوی محمد یوسف بن حاجی کریم بخش انصاری (ساکن محلہ حیدرآباد)

مبارک پور کے باشندوں کے لئے بظاہر کوئی گمنام مبارکپوری تھے لیکن بمبئی اور بمبئی کے بھنڈی کے ارباب بصیرت کے نزدیک "در حساب خرد خرد ان بیش" تھے مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ اور مولانا شکر اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا پھر الہ آباد جاکر مدرسہ مصباح العلوم میں تعلیم حاصل کی اور فاتحۂ فراغت پڑھی۔ صحافت سیاست اور پھر خلافت تحریک نے اس "یوسف بے کارواں" کو "متاع عزیز" بناکر بمبئی کے اردو بازار میں خلافت اخبار کے مسند پر کالم نویس بناکر بٹھا دیا۔ اس کے مدیر معاون بھی رہے۔ بعد میں اپنا اخبار ترجمان، پرنٹنگ پریس بلڈنگ سے نکالا۔ سر عبد الکریم سیلک مل اسرار قد کے مالک عبد الکریم سیٹھ کی مالی اعانت سے یہ اخبار نکالا تھا۔ سنی جمعیۃ العلماء کے سکریٹری رہے۔ دار العلوم صمدیہ بھیونڈی کے ناظم

رہے، دارالعلوم جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے سرگرم رکن تھے بھیونڈی میں ۱۹۶۶ء میں بعد ازوفات دفن ہوئے۔ مولانا موصوف برہانپور کے مشہور مخیر اور متمول ہستی سیٹھ حاجی محمد یعقوب انصاری کے ہمزاد بھائی تھے۔

مبارکپور اور اطراف کے بہت سارے علماء بسلسلۂ معاش مغربی ہند اور گجرات میں جاکر بس گئے تھے مولوی عبدالصمد مبارکپوری کا مستقل قیام بمبئی میں تھا، یہاں کھانڈ بازار محلہ میں ایک چھاپ خانے کے ناظم و مہتمم تھے۔ مولوی محمد طفیل العلوی جنہوں نے مدرسہ حنفیہ جونپور، مدرسۂ چشمۂ رحمت غازی پور اور مدرسۂ عالیہ رامپور میں تعلیم حاصل کی تھی۔ بسلسلۂ ملازمت بمبئی آئے اور مدرسہ کوجعفریہ میں دینیات پڑھنے لگے بعد میں مدرسہ ہاشمیہ میں اور پھر مدرسۂ رحیمیہ میں مدرس بن گئے اور یہیں ۴ راگست ۱۹۵۹ء/۱۳۷۹ھ کو وفات ہوئی۔ مولانا سراج الدین گونجی، مالیگاؤں میں پڑھاتے رہے، کوپاگنج کے حکیم مولانا اسداللہ بھیونڈی میں رہے۔

تذکرۂ علمائے مئوناتھ بھنجن

مئوناتھ بھنجن کا ایک تاریخی نام شہزادی جہان آرا کے نام کی مناسبت سے جہان آباد تھا۔ تک عہد میں یہاں کئی مدرسے جاری تھے قدیم شاہی مسجد میں ایک مدرسہ مفتاح العلوم قائم تھا اس کے پرانے حجروں کی جگہ نئے حجرے تعمیر کئے گئے تھے۔ ضلع اعظم گڈھ کی علمی و دینی تاریخ میں دارالعلوم مئو، فیض عام اور جامعہ اثریہ، مدرسہ مرقاۃ العلوم دارالحدیث مرکزی اور بنیادی حیثیتوں کے حامل ہیں۔ مدرسۂ عالیہ سینکڑوں علمائے کرام کا مدرعلمیہ رہ چکا ہے ان مدرسوں کی آغوش تعلیم اور گہوارۂ تربیت سے بڑے نادرۂ روزگار اور نابغۂ عصر اور شہرۂ آفاق علماء، محدثین اور اساتذہ پرورش پاکر نکلے ہیں، ان کی علمی تحقیقات و تدقیقات کا غلغلہ عرب و عجم تک گونجتا رہا۔ ان میں کثیر تعداد برادری کے افراد کی تھی۔ مولوی فیض اللہ مئوی جب مولانا سخاوت علی جونپوری کی درسگاہ سے تربیت پاکر وطن تشریف لائے تو اس وقت یہاں کی یہ حالت تھی کہ گھر گھر غازی میاں کے جھنڈے اور تعزیہ داری کی بیہودہ رسم ادا ہوتی تھی عموماً بدعات و خرافات میں مبتلا تھے[1] اسی عہد میں ۱۲۶۵ھ ۱۹۶۹ء میں اس ضلع کی پہلی

[1] مدرسۂ عالیہ مئو کی صد سالہ تقریب صفحہ ۳ ۴ ۵ ۱۹۹۳ء عبدالقیوم مظلی مسد عجیب مستعد بہ

دینی درسگاہ مدرسہ عالیہ مئو کی بنیاد ڈالی گئی۔ بانیان یہ بزرگ ہستیاں تھیں۔ مولانا فیض اللہ، حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکہ مکرمہ، حضرت مولانا الٰہی بخش کوپاگنجی اور حاجی عبدالرحمٰن۔ ڈومن پورہ کا یہ مدرسہ پہلے مدرسہ اسلامیہ کے نام سے موسوم تھا۔

رئیس العلماء استاذ الاساتذہ علامہ مولانا فیض اللہ بن بدھو محمد مئوی (م ۱۳۱۶ھ)

اپنے وقت کے مشاہیر اصحاب درس میں سے تھے۔ مولانا سخاوت علی جونپوری (م ۱۲۷۴ھ) کے حلقۂ درس میں شامل ہوکر جب علوم مروجہ کی تحصیل کی، مولانا کی نگاہ جوہر شناس نے اپنے تیز فہم شاگرد کی صلاحیتوں کا اندازہ کرلیا۔ طالب علمی کے زمانہ میں مولانا فیض اللہ نے علماء صادق پور کی انجمن میں (جو شہادت بالاکوٹ کے واقعۂ ہائلہ کے بعد شہیدین کی تحریک جہاد کی تنہا امین اور علمبردار تھی) شامل ہوکر دورے کرتے رہے۔ پھر جب وطن مئو واپس آئے تو درس و تدریس کا سلسلہ گھر پر شروع کیا لیکن جب طالبان علم کا ہجوم بڑھا تو یہ سلسلہ درس و تدریس جامع مسجد میں بھی شروع کرنا پڑا۔ مولانا شبلی نعمانی کے خسر شیخ حبیب اللہ نے جب شہر مئو کے دوسرے اہل استطاعت اصحاب کے تعاون سے ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو مولانا فیض اللہ کو مدرس اعلیٰ مقرر کیا۔ اس سرچشمۂ فیض سے بکثرت تشنگان علوم سیراب ہوئے۔

مولانا فیض اللہ مئوی اپنے استاذ بھائی حضرت سید خواجہ احمد بن محمد یٰسین نصیرآبادی (م ۱۲۹۵ھ) سے بیعت اور ان کی توجہ سے خلافت سے سرفراز تھے۔ وہ لوگوں کو اوراد سلوک طے کراتے تھے اور وعظ و تذکیر کے ذریعہ خلقتِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہے۔ اتباع کتاب و سنت کے جذبہ کو فروغ دیتے رہے۔ "آپ جب وعظ فرماتے تو ایک سماں بندھ جاتا، تمام سامعین انتہائی خاموشی اور حضوری قلب کے ساتھ سنتے اور "کأن علیٰ رؤسہم الطیر" کا منظر ہوتا۔ قیامت کے احوال و مناظر کا بیان اتنا رقت انگیز ہوتا کہ لوگ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے تھے" لوگ دور دور سے آپ کا وعظ سننے آتے اور متاثر و مستفید ہوتے" [1]

---

[1] مولانا فیض اللہ مئوی کے تفصیلی حالات کے مآخذ یہ ہیں: تراجم علماء حدیث ہند مؤلفہ مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی۔ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) شمارہ اکتوبر ۱۹۶۵ء مقالہ مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی مئوی تذکرہ مولانا محمد احمد صاحب، محفوظ الرحمٰن فیضی ص ۳۰۔۳۱ تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۲۲۹-۲۳۰۔ دستکار اہل شرف حصہ اول تذکرہ شاہ بینوا، محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ص ۵۵

مولانا عبداللہ مئوی (۱۲۵۲ھ-۱۳۲۱ھ)

شیخ فاضل مولانا حکیم عبداللہ بن عل محمد مئوی مولانا عبدالحکیم لکھنوی، [illegible] مولانا تراب علی لکھنوی اور مولانا سخاوت علی جونپوری کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ بعد میں مولانا مدرسہ حنفیہ میں داخل ہو گئے۔ اور مولانا عبدالحلیم ابن امین اللہ فرنگی محل سے بقیہ کتابیں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ ۱۲۶۶ھ میں آپ حکیم یعقوب کی معیت میں حج کے لیے گئے تو وہاں حضرت شیخ عبدالغنی بن ابوسعید عمری محدث دہلوی سے حدیث کی سند لی (غالباً یہ دوسرے حج (۱۲۹۰ھ) کا واقعہ ہے۔

آپ کا قیام مئو نانگر ضلع بلیا میں تھا جہاں درس و تدریس کے ساتھ طبابت بھی کرتے تھے۔ جب سن رسیدگی آئی تو نقل مکانی کر کے وطن آ گئے اور یہیں ۱۳۲۱ھ میں سپرد خاک ہوئے۔[1]

مولانا حافظ عبداللہ مئوی (غازی پوری) (۱۲۶۲ھ-۱۳۳۷ھ) بن شیخ عبدالرحیم

ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے محنت مزدوری کرتے تھے ساتھ میں تحصیل علم بھی۔ ۱۲ برس کی عمر میں حافظ سے فارغ ہوئے نہایت ذہین اور طباع واقع ہوئے تھے۔ ۱۲۷۵ھ کے ہنگامۂ غدر میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے اور مئو کو خیرآباد کہہ کر غازی پور میں بادلی اور یہاں کے مشہور مدرسۂ چشمۂ رحمت میں مولوی رحمت اللہ فرنگی محل سے بقیہ درسیات پڑھیں اس کے بعد مدرسۂ حنفیہ جونپور میں داخلہ لے کر مفتی محمد یوسف فرنگی محل سے بقیہ نصاب کی تکمیل کی۔ آخر میں جملہ علوم رسمیہ و فنون مروجہ سے فارغ ہو کر دہلی پہنچے اور میاں صاحب سید نذیر حسین کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر چیدہ مستند اور نمایاں شاگرد بنے۔ میاں صاحب فرماتے تھے کہ میرے درس میں دو عبداللہ آئے۔ ایک عبداللہ غزنوی، دوسرے عبداللہ غازی پوری" خود حافظ عبداللہ [illegible] اساتذہ کے القاب سے نوازے جاتے ہیں جن طلبہ کو حافظ صاحب سے شرف تلمذ حاصل ہوا ان میں مولانا شبلی نعمانی، مولوی سعید بنارسی، مولانا شاہ عین الحق پھلواروی، مولانا محمد علی واعظ مئوی، مولوی عبدالرحمن مبارکپوری، مولوی عبدالسلام مبارکپوری، مولوی عبدالرحمن بقا غازی پوری، شاہ وارث حسن کوڑہ جہان آبادی، مولوی

۱؎ [illegible] ۱۲۹۲ھ [illegible] وفات ۱۳۲۱ھ [illegible] تذکرۂ شاہین [illegible] دیکھئے تذکرۂ علماء اعظم گڑھ ص ۱۹۶

۲؎ [illegible] تذکرۂ علماء اعظم گڑھ ص ۱۹۵

ابوبکر جونپوری، سید داؤد غزنوی، مولوی علی حسن قدوائی اور مختار مجلی شہری۔

مولانا حافظ عبداللہ مئوی کے مشاہیر فیض یافتگان میں مئو تلامذہ کی فہرست میں نصف سے زیادہ علماء کی تعداد محلہ ڈومن پورہ سے تعلق رکھتی ہے جو دیگر تمام محلوں میں سب سے زیادہ مردم خیز ثابت ہوا اب اس وقت بھی تدریسی و تحقیقی کام کرنے والے قابل ذکر اہل علم کی جو تعداد بیک وقت اس محلہ میں ہے دوسرے محلوں میں نہیں ہے۔[1] مثال کے طور پر ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری، ڈاکٹر عبدالعلی اور دیگر معاصرین۔

جمال شاہ مئوی

باب بندۂ مومن کی کرامات میں آپ کا ذکر گذر چکا ہے۔ مولانا محمد شبیں مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے محلہ پٹھان ٹولہ میں رہتے تھے۔ ابتداء میں بالکل رند مشرب تھے پھر نجانے کیا افتاد پڑی کہ لاپتہ ہو گئے اور کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا حتیٰ کہ کھو گئے ہم ایسے کہ انہی کے ہو گئے۔ محلہ بھاٹ ٹولہ کے ایک بزرگ روشن علی شاہ کے مرید ہو گئے تب واپس مئو لوٹے۔ صاحب کرامت بزرگ تھے ان کی صحبت میں کئی ہندو مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کی نسبت یہ مشہور ہے کہ ایک بار وہ وجد و جذب کے عالم میں اٹھے اور سیدھا بمبئی پہنچ گئے پھر وہاں سے حج بیت اللہ کے لئے چلے گئے اور پھر وہیں سے لوٹ کر نہیں آئے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

شیخ الشیوخ ملا حسام الدین مئوی ابن جمال الدین عرف جگن

مولانا حسام الدین اس دیار کے علمائے اعلام میں سے تھے۔ آپ مولانا نیتقو سندسوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ تکمیل کے بعد استاذ محترم کے ایما پر مئو میں مدرسہ سندیہ کے نام سے پہلی درسگاہ قائم کی اور خود اس کے پہلے مدرس بن کر باب مدینۃ العلم بن گئے۔ اس کے بانیوں میں حاجی عبدالرحمن اور محلہ ڈومن پورہ کے دوسرے بزرگانِ دین بھی تھے۔ ملا صاحب کی خداداد لیاقت علم اور کمالِ فن کی وجہ سے یہ مدرسہ بہت جلد مرجعِ خلائق بن گیا اور یہاں سے بہت سے باکمال علماء و فضلاء پیدا ہوئے اس مدرسہ کا نام مدرسہ اسلامیہ سے مدرسہ عالیہ ہو گیا۔ قصبہ مئو میں آپ کا علمی وقار اس درجہ کا تھا کہ جب تک آپ کے دستخط نہ ہو جاتے کوئی فتویٰ صادر نہ ہوتا تھا۔ فقہ اور حدیث میں کامل دستگاہ اور مہارت رکھتے تھے۔ مولوی عبدالغنی اور مولانا احمد

---

[1] تذکرہ مولانا محمد ناظم صاحب۔ ایضاً ص ۱۲ (ذیل) اور ص ۱۲

صاحب آپ کے دونوں صاحبزادے آپ کے زیر تربیت رہے اور علمائے کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا عبد الغنی (م ۱۳۴۸ھ/۱۹۲۹ء) کے صاحبزادے مولانا عبداللہ اور مولانا بشیر ملا صاحب کے پوتے ہیں اور مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب فیضی و مولانا مفتی ذکی الرحمن صاحب فیضی مولانا اسعد صاحب کے پوتے اور ملا صاحب کے پڑپوتے ہیں۔[1]

مولانا فیض اللہ اگر سرچشمۂ فیض تھے تو ان کے ارشد تلامذہ نے اس سرچشمہ کو علم وفضل ودانش وعرفان کا بحر ذخار بنادیا۔ اور اس سے جو سوتے پھوٹے انہوں نے پورے دیار پورب کو سیراب کردیا۔

مولانا محمد علی ابوالمکارم مؤی (م ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)

مولانا محمد علی ابوالمکارم مولانا فیض اللہ کے چار فرزندوں میں سے تھے، تین آپ کی زندگی میں فوت ہوگئے صرف یہی زندہ رہے، جید عالم، محقق ومدقق باکمال مصنف، طبیب حاذق اور معروف ومقبول شخصیت کے حامل ہوئے۔ مولانا کے علمی عمق اور دقت نظر کے مداح ان کے سارے معاصرین تھے یہاں تک کہ آپ کی علمی قدردانی کے طور پر علامہ نواب صدیق حسن خاں ریاست بھوپال سے آپ کو تیس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مختلف علمی مباحث اور اختلافی مسائل پر تیس سے زیادہ محققانہ کتابیں اور رسائل آپ کی تصنیف ہیں۔ خیر الرازقین نے آپ کو طبابت وتجارت کی برکات سے ثروت مند بنادیا اور آپ نے تسلیم وتکریم نعمت کے طور پر مال وزر سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا اور رفاہ عام کے دینی امور سرانجام دئے۔ اپنے جیب خاص سے مؤ اور اس کے اطراف میں متعدد پختہ مسجدیں تعمیر کرائیں گویا یہ ان کا ذوق ایمانی اور شعار دینی ہوگیا تھا۔ آپ کی مساعی جمیلہ سے توحید خالص اور اتباع کتاب وسنت یعنی سلفیت کے اس جذبہ کو جس کی تخم ریزی آپ کے والد بزرگوار مولانا فیض اللہ نے کی تھی آپ نے آبیاری کی اور اسے نہال چمنستان علم بنادیا، ملا حسام الدین آپ کے استاد تھے۔ مسلک اہلحدیث کی ترویج واشاعت میں بڑی فراخدلی سے خرچ کرتے تھے۔ آپ کا ایجاد کیا ہوا روغن احمر آج بھی سارے ملک میں مشہور ہے اسی پر آپ کی ایک تالیف بھی ہے۔ علوم دینیہ عربیہ اور حدیث کی تعلیم چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا حافظ

---

[1] تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب ص۲۹-۲۰

عبداللہ غازی پوری اور سید میاں نذیر حسین دہلوی سے حاصل کی۔ حکیم سید عبدالحفیظ دہلوی سے طب و حکمت کی تحصیل کی۔ تصنیف و تالیف سے شغف تھا۔ [۱]

مولانا بہادر حسین مئوی (م ۱۲۷۰)

بنارس میں تحصیل علم کی، نہایت تیز فہم اور قوی الحفظ تھے اسی لئے علماء عصر میں ایک امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ نہایت صالح، متقی اور دیانت شعار تھے۔ پارچہ بافی تحصیل معاش کا ذریعہ تھا۔ [۲]

مولانا سلطان احمد مئوی (۱۲۰۵-۱۳۲۵)

آپ زمرۂ علمائے اعظم گڑھ میں نہایت ممتاز تھے اور اس سرزمین کے ہونہار فرزند مدرسۂ چشمۂ رحمت کے بحر العلوم کے آبدار موتی بنے۔ فراغتِ تعلیم کے بعد علماء و فضلاء کی تقلید سنت میں وطن مالوف مئو آئے اور وہ کارنامۂ نمایاں انجام دیا جسے آج اہلِ علم اپنا مرتبہ سمجھتے ہیں یعنی ... مئو کی بنیاد ڈالی جو ضلع کی علمی تاریخ میں ایک مرکزی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے قائم کردہ درسگاہ کی تنظیم و ترقی میں زندگی کی آخری سانس تک منہمک رہے۔

آپ کے صاحبزادے محمد مصطفیٰ [illegible] (۱۹۹۱) ایک مشہور شاعر ہوئے۔ [۳]

مولانا عبدالقادر مئوی (۱۲۷۹-۱۳۳۲)

آپ کے اولین اساتذہ میں مولوی ذکاء اللہ ... مئوی اور مولانا ابو المکارم محمد علی کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا فیض اللہ مئوی سے ۱۳۰۳ھ میں سند فراغ لی۔ مولانا سید میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی، مولانا محمد طاہر سلہٹی اور مولانا عبدالحکیم پنجابی سے صحاحِ ستہ پڑھ کر حدیث کی سند لی۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ آپ کی تدریسی خدمت مدرسہ مسلمین شہر کاشی، چھاؤنی ناگ پور اور مدرسۂ احمدیہ آرہ کو میسر رہیں۔ حل المغلقات فی بیان طلقات، تفریح الجنان باحکام القیام فی رمضان، عمدۃ الکلام فی الرد علی درۃ انتظام، الروضۃ الناظرہ فی علم المناظرہ اور تاریخ حضرت عمر بن عبدالعزیز آپ کی تصنیفات ہیں۔ مولانا مسلک اہلحدیث کے پابند تھے۔ [۴]

---

[۱] ایضاً ص ۳۵، تذکرۂ علماء مئو ص ۷۱، تذکرہ مولانا محمد ... ص ۲۳، تراجم علمائے اہلحدیث ص ۲۲۰، ۲۲۱
[۲] تذکرۂ علماء اعظم گڑھ ص ۹۶
[۳] ایضاً ۹۹-۱۰۰، تذکرۂ سخنوران مئو۔ اثر انصاری ص ۲۵-۲۶
[۴] مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی، تذکرۂ علماء مئو ص ۹۱

مولانا عبداللہ شائق بن محمد اسماعیل مئوی (۱۳۰۹-۱۳۹۴ھ)

علوم عربیہ متداولہ کی تحصیل مختلف اساتذہ سے کی اور سند فراغ لے کر مئو کے مدرسۂ فیض عام میں استاذ مقرر ہوئے، مولانا عبداللہ مسلکاً اہلحدیث اور سیاست میں کٹر کانگریسی تھے۔ بڑے اچھے شاعر تھے اور تلامذہ کی بڑی تعداد آپ سے اصلاح لیتی تھی۔ مولانا کی اہم خدمات میں دارالحدیث (۱۳۷۴/۱۹۵۴) کا قیام ہے، آپ کی مساعی جمیلہ سے یہ مدرسہ ترقی کر کے بام عروج پہ پہنچ گیا اور قصبہ کے ممتاز مدرسوں میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن محدث اعظمی کی کتاب "الاعلام المرفوعۃ" کے رد میں "الآثار المقبولۃ" تصنیف کی جو طبع ہو کر حلقۂ غیر مقلدین میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی[1] آپ کی ایک دوسری تصنیف نبی کی نماز (اردو) ہے۔

مولانا عنایت اللہ مئوی (۱۲۹۶-۱۳۸۰) بن باب اللہ

علمائے اعظم گڈھ میں بڑی شہرت و احترام کے حامل تھے۔ علوم مروجہ سے فراغت کے بعد فن طب کی تعلیم و تحصیل کی پھر ناصر العلوم گھوسی میں مدرس ہو گئے۔[2]

مولانا ابوالحسن محمد صابر بن حافظ محمد اسمٰعیل بن شیخ بدھو مئوی حنفی (۱۸۹۲-۱۹۴۹)

نے متوسطات تک مولانا سلطان احمد بانی مدرسۂ دارالعلوم مئو اور دیگر اساتذہ سے تعلیم پائی۔ اسی مدرسے سے سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا اس کے بعد مدرسۂ مظہر العلوم بنارس میں بھی مدرس رہے۔ اس زمانہ میں بے شمار طلبہ نے مولانا محمد صابر سے فیض پایا۔ مولانا حبیب الرحمٰن محدث مئوی اور مولانا عبداللطیف جیسے اساطین علم و فن آپ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ تصنیف میں "نظام القواعد" فارسی کے قواعد میں ہے۔ اس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے بڑی شاندار تقریظ لکھی ہے۔[3]

مولانا محمد محمود احمد بن غلام محمد بن دوست محمد مئوی (۱۲۷۵-۱۳۳۷ھ)

علمائے اعظم گڈھ میں صلاح و تقویٰ اور علم فقہ میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ درس مروجہ کی تکمیل مولانا عبدالحئی فرنگی محل (م ۱۳۰۴) کی خدمت میں رہ کر حاصل کی۔ مولانا طبابت کے ساتھ جلد سازی بھی کرتے تھے۔

---

[1] تراجم اہلحدیث ص۲۳۱۔ جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات ص۱۵۰

[2] اور [3] تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ ص۲۲۹، ۲۷۸-۲۷۹ و ۳۱۵

مولانا نور محمد بن محمد اسماعیل مئوی (ولادت ۱۲۷۳)

آپ نے کتب عربیہ ملا حسام الدین مئوی سے پڑھ کر مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے اور وہاں مولانا حافظ عبداللہ اور مولانا عبدالحلیم رسول پوری سے تکملۂ فنون کی تکمیل کی۔ پھر مولانا سید نذیر حسین محدث سے حدیث پڑھی۔ اور سند و اجازت لی۔ قاضی محمد مچھلی شہری جونپوری سے مسلسل بالاولیۃ کے علاوہ بلوغ المرام کی سند بھی حاصل کی مختلف مدارس میں تدریسی خدمت انجام دینے کے بعد مدرسۂ فیض عام میں مسند درس وافادہ پر رونق افروز ہوئے۔ مئو کے مشہور رئیس محمد گربست کی جانب سے دس روپے ماہانہ نذرانہ ملتا تھا اسی پر گذر بسر کرتے تھے۔ [1]

مولانا بہادر مئوی (م ۱۲۷۲ یا ۱۲۸۲)

بڑے جید عالم اور نہایت باخدا اور متقی بزرگ تھے جُلکری پیشہ تھا۔ مولانا سید عبدالحی نے نزہتہ الخواطر میں آپ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا احمد مئوی (۱۲۹۰-۱۳۶۷ھ)

ملا حسام الدین کے صاحبزادے جو بڑے مولوی صاحب کہلاتے تھے وہ بڑے علماء اعلام میں سے تھے [2] اور جملہ علوم و فنون منقولات و معقولات میں تبحر رکھتے تھے۔ علم و فضل، اتباع شریعت و سنت، تقویٰ و طہارت، تواضع و خاکساری، زہد و قناعت، صبر و توکل، تہجد گزاری و شب بیداری میں سنت پدری کے تھے۔ ابتدائی تعلیم عربی مشکوٰۃ اور شرح جامی مدرسۂ اسلامیہ (مدرسۂ عالیہ) میں پڑھ کر مدرسہ جامع العلوم کانپور تشریف لے گئے۔ ۱۳۱۶ھ میں مدرسہ حمیدیہ آرہ پہنچ گئے جہاں حافظ عبداللہ غازی پوری جیسے اساتذہ اصحاب مسند تھے حافظ صاحب سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، حماسہ و معلقات اور رسالہ میر زاہد وغیرہ سبقاً سبقاً پڑھیں پھر منتہی کتابیں شیخ الکل میاں صاحب سے دہلی میں جاکر پڑھیں یہاں سے سند فراغ لے کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے شرح چغمینی، شمس بازغہ، رسالہ میر زاہد، جامع ترمذی و دیگر کتب نظامیہ مکرر پڑھیں۔ مولانا رشید گنگوہی سے بھی استفادہ کیا۔

۱۳۲۷ھ میں مئو کے مشرقی حصہ میں میاں ولی اللہ حاجی ولی محمد والد محمد گربست، میاں تاج الدین سردار وغیرہ نے مدرسۂ اسلامیہ کے نام سے جامع مسجد پر مدرسہ قائم کیا۔ مولانا تبھی اس

---

[1] تراجم علمائے اہلحدیث ص ۴۳۰-۴۳۱ [2] تذکرۂ علمائے اعظم گڈھ ص ۴۲-۴۵

چشمۂ فیض کی آبیاری کرتے رہے اسی مدرسہ کا نام آگے چل کر فیض عام ہوا تاحیات اسی مدرسہ
کے لیے اپنی تدریسی خدمات اور زندگی وقف کردی آپ کے تلمیذ رشید مولانا محمد احمد ناظم اعلیٰ تھے۔
اس طرح "احمدین" کے جتماع اور قران السعدین کی برکتوں سے مدرسہ فیض عام شہرۂ آفاق
بن گیا اور فارغ التحصیل فیضیوں کا فیض عام ہو گیا۔ یہی دور درحقیقت مدرسہ کا زرّیں
دور تھا۔ اور یہ دور آگے چلتا رہا لیکن مولانا احمد مئوی کا دور حیات ختم ہو چکا تھا۔ اس
مجمع البحرین سے بڑے گوہر آبدار نکلے۔ مولانا مئو کے تلامذہ میں بڑے برگزیدہ اعاظم رجال
تھے جن سے اس دیار علم و فن کو زندگی ملی۔

آپ کے تلامذہ کی فہرست بیحد طویل ہے کم از کم ۵ تلامذہ صرف مئو اور مضافات کے
تھے۔ یہ سارے علماء و فضلاء کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔

مولانا احمد مئوی کے کمال فن اور مرجعیت نے قصبہ مئو کو علم و دانش کا مامن و ملجا بنا دیا۔
یہ سلسلہ ان کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں کے ذریعہ آج تک برابر جاری ہے
تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب (مطبوعہ دسمبر ۹۸۸ء ۱/ ربیع الآخر ۱۴۰۹ھ) کے فاضل
مؤلف محفوظ الرحمن فیضی نے مولانا احمد (بڑے مولوی صاحب) کے ان تمام شاگردوں کے
نام گنوائے ہیں جو بحمد اللہ ان کے زمانہ تالیف میں بقید حیات ہیں۔ (اللہ تعالیٰ انہیں عمر
دراز عطا فرمائے) ان میں چند ممتاز علماء و فضلاء اور جامعہ کے فارغین "فیضیوں" کے اسماء گرامی
یہ ہیں:

شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری

مولانا عبد السلام مبارکپوری کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف مرعاۃ المصابیح
شرح مشکوٰۃ المصابیح کی بڑی شہرت ہے۔ والد بزرگوار نے کتاب المنوال وابلہ پر کسی مصلحت
سے یا پدرانہ شفقت سے آپ کا نام مرتب کی حیثیت سے دیا ہے (مطبوعہ ۱۹۱۲ء) اہلحدیث
کی روایتوں کے امین ہیں اور خاندان کے دینی علمی و تحقیقی کارناموں میں آپ کا بھی معتد بہ
حصہ ہے۔

مولانا محمد احمد ناظم (۱۸۹۲ء - ۱۹۶۲ء)

مئو ناتھ بھنجن کی سرزمین سے جو نامور علماء پیدا ہوئے اور جنہوں نے علم دین کی بیش بہا خدمت
انجام دے کر ایک دینی فریضہ ادا کیا اور ساتھ ہی اس سرزمین کا نام بھی اونچا کیا، ان نیک نام

علماء میں مولانا محمد احمد ناظم صاحب فیض عام، ایک ممتاز اور بلند مقام رکھتے ہیں[1]، آپ کے والد ایک جید حافظ قرآن تھے۔ آپ کے بڑے والد حاجی محمد علی (والد حافظ فضل الرحمٰن متوفی م ۱۳۵۹/ ۱۹۴۰) اور خاندانی چچا حاجی ولی محمد (والد محمد گرجست رئیس مئو، متوفی ۱۳۵۰ / ۱۹۳۲) جو بڑے صاحب جاہ و ثروت اور صاحب دل رئیس تھے ——— یہ تمام لوگ ملا حسام الدین مئوی (م ۱۳۱۰ھ) اور رأس العمار حافظ عبداللہ غازیپوری (م ۱۳۳۷) وغیرہ کی دعوت و تحریک سے اہلحدیث مسلک کے ہو گئے تھے۔ یہی خانوادہ علمی تھا جو بالاکوٹ کے شہیدین کی تحریک جہاد و حریت کی یادگار "فرسانی تحریک" سے وابستہ تھا۔ آپ کے خاندان میں حفاظ کی بڑی تعداد تھی۔ مولانا محمد احمد ملا حسام الدین کی نظر کیمیائے اثر نے مولانا محمد احمد صاحب کو علم و فن کا گوہر آبدار بنا دیا پھر یہ بنارس، کانپور اور آرہ کے گنجینہ ہائے علوم سے دانش و فضل کے موتی مرجان چنتے چنتے گھر والوں کی اجازت کے بغیر دارالعلوم دیوبند چلے گئے، یہاں انہوں نے اکابر علماء و اساتذہ سے منقولات و معقولات کی منتہی کتابوں سے کتساب فیض کیا۔ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی سے صحیح بخاری و جامع ترمذی، مہتمم مولانا محمد احمد صاحب اور مولانا انور شمیری سے صحیح مسلم، مولانا شبیر عثمانی سے ابوداؤد، مولانا حسین احمد مدنی سے بیضاوی اور مولانا غلام رسول سے صدر شمس بازغہ، شرح چغمینی وغیرہ معقولات پڑھیں اور ۱۳۲۱ میں درس نظامیہ کی تکمیل اور فراغت حاصل کی۔ برادر عم زاد محمد گرجست نے اپنے تجارتی فرم اور کاروبار کا آپ کو کارپرداز بنا دیا اور پھر جلد ہی آپ کو فرم میں شریک اور حصہ دار بنا لیا گیا اس طرح اللہ غنی حمید نے موصوف کو گنجینۂ علم کے ساتھ دولت و مال سے بھی نوازا۔

آپ کے کمال علم و فضل اور تجارت میں خوش سلیقگی اور خوش انتظامی کے جوہر نمایاں ہوئے تو فیضِ عام کی نظامت کی ذمہ داری بھی آپ کے سپرد کر دی گئی اس وقت سے لے کر تادم واپسیں ساٹھ اکسٹھ برس تک ناظم صاحب فیض عام و اس سے متعلقہ اداروں کے لیے وقف ہو گئے اور فیضِ عام بن گئے۔ علمی مشاغل میں اصل محبوب مشغلہ اور ذوق مطالعہ اور کتب بینی تھا جو جنون کی حد تک اور انجذاب کی حالت تک پہنچ گیا تھا: دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہتی۔

---

[1] اس حصہ کا اصل مآخذ جناب مولوی محفوظ الرحمٰن فیضی صاحب کی تالیف تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب فیض عام اکیڈمی مئوناتھ بھنجن مطبوعہ ۱۴۰۹/ ۱۹۸۸ ہے۔

مطالعہ کے دوران تعلیقات لکھتے رہتے آپ کے علم میں وسعت کے ساتھ جامعیت بھی تھی منقولات تفسیر وحدیث، فقہ واصول فقہ کے ساتھ معقولات میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اسماء الرجال پر بھی گہری نظر تھی۔ ہر علم وفن کی کتابیں بلا تامل پڑھاتے تھے اکتساب علم اور استفادہ کرنے والوں کی تعداد کثیر ہے۔

ناظم صاحب سینکڑوں اوصاف کے حامل تھے۔ ان کے کارنامے بیان کرنے کے لئے دفتر کے دفتر سیاہ کرنے پڑیں گے۔ فیض عام بلڈنگ۔ مسلم انٹر کالج (۱۹۴۱) مدرسۃ البنات (۱۹۸۰) جامع مسجد فیض عام کی تعمیر جدید وغیرہ آپ کی تعمیری یادگاریں ہیں۔ آپ مئو کی چوراسی جماعت کے ایک اہم اور فعال رکن تھے۔

مفتی مولانا حبیب الرحمٰن فیضی

آپ مدرسہ فیض عام مئو کے ناظم اور شیخ الحدیث ہیں۔ اس تاریخی قصبہ کی علمی میراث اور اس دینی درس گاہ کی علمی روایات کے امین اور محافظ ہیں۔ اور ملا حسام الدین اپنے پردادا کے نوادر کی تعلیمی، دینی اور تدریسی اقدار کے حامل ہیں اور اسی علمی کہکشاں کے تابندہ ستارے ہیں۔ آپ نے مولانا محمد احمد ناظم کے دور نظامت میں ان ہی کے زیر تربیت ۱۹۳۵ء میں مدرسہ فیض عام سے سند فراغ لی اور دوسرے ہی سال میں ناظم صاحب نے آپ کی علمی استعداد اور لیاقت دیکھ کر آپ کو اعزازی مدرس بنا دیا مفتی صاحب اول اول شرح تہذیب و شرح جامی پڑھاتے رہے لیکن ان کی تدریسی لیاقت دیکھ کر ناظم صاحب نے ان کو اپنا معاون بنا لیا۔ پھر نائب ناظم نیز صدر مدرس اور شیخ الحدیث وغیرہ عہدوں پر سرفراز ہوئے اور ناظم صاحب کے انتقال کے بعد مفتی صاحب جامعہ فیض عام اور اس سے متعلقہ اداروں فیض عام گرلز اسکول (مدرسۃ البنات) اور جامع مسجد فیض عام کے ناظم ومتولی اور مسلم انٹر کالج کے مینیجر مقرر ہوئے اور اس طرح جماعت نے جملہ اداروں کے انتظام وانصرام کی ساری ذمہ داریاں آپ کے سر پر ڈال دیں جنہیں آپ نہایت خوش اسلوبی سے فرض منصبی سمجھ کر انجام دیا۔

مولانا مفتی موصوف بڑے اچھے ناظم، قابل استاد، عالم وفاضل، شاعر اور ادیب بدل ہیں۔ بڑی مدلل تقریر کرتے ہیں۔ اپنے مربی اور استاد ناظم صاحب کی طرح نادر ونایاب کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ آپ کی علمی وتعلیمی فضیلت کے معترف ومداح مولانا عبد اللہ شائق جیسے عالم شخص ہیں۔

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن اور مولانا مفتی فیض الرحمٰن بڑے مولوی صاحب کے اکلوتے صاحبزادے محمد احسان اللہ (م ۱۳۵۲/ ۱۹۳۴ء) کے صاحبزادے ہیں۔

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی

جامعہ فیض عام کے مایۂ ناز فرزند ہیں۔ صاحب تصنیف ہیں اور بڑے دقیق مدرس ہیں، مولانا موصوف ۱۹۷۳ء سے ڈومن پورہ کی جامع مسجد کے مستقل خطیب و امام ہیں۔ آپ کے والد منظور الحسن تقریباً تیس بتیس سال سے مسجد کے مؤذن چلے آرہے ہیں اور جد امجد حاجی نثار احمد مسلسل چالیس سال تک تا وفات (م ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۲ء) اسی جامع مسجد میں امامت کرتے رہے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد عظیم اللہ جو مدرسۂ عالیہ میں مدرس تھے اور مولانا عبد اللہ شائق (م ۱۳۹۵ھ/ ۱۹۷۲ء) قابل ذکر ہیں۔ درس و تدریس کے ساتھ مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی کو تصنیف و تالیف کا بھی شوق ہے اور متعدد تصانیف آپ کے زور قلم، علمی فضیلت اور ادبی ذوق و شستگی کا نتیجہ ہیں۔ سوانح عمری اور تذکرہ نویسی کا شوق زیادہ ہے۔ آپ نے محمد احمد ناظم صاحب کا تذکرہ لکھ کر ایک علمی اور تاریخی خدمت انجام دی ہے یہ ناظم صاحب کا تذکرہ بھی ہے اور جامعہ فیض عام کی تاریخ بھی اور اس نے ایک ایسے مستند ماخذ کی حیثیت اختیار کر لیا ہے جس سے آئندہ مئو کے رجال اور علماء کا تذکرہ لکھنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔ سوانح عمری خادم الحرمین الشریفین امیر فیصل اور آخری خلیفۂ راشد مہدی موعود اسی قبیل کی تصنیف ہیں۔ قبروں پر مساجد کی تعمیر اور اسلام دراصل علامہ ناصر الدین البانی کی کتاب "تحذیر الساجد من اتخاذ القبور مساجد" کا عربی ترجمہ ہے اسی عرب مصنف کی کتاب "صفۃ صلاۃ النبیؐ" کے مقدمہ اور شیخ عبد الرحمٰن عبد الخالق کی کتاب "الاصول العلمیۃ للدعوۃ السلفیۃ" کا ترجمہ بعنوان اتباع سنت اور تقلید ائمہ اربعہ کی نظر میں کیا ہے۔ مختصر احکام طلاق، مشروع و ممنوع حلالہ (حنفی نقطۂ نظر)، زیور میں زکاۃ، نماز نبوی اور اصول دین، فقہ اور عقائد و ارکان سے تعلق رکھتی ہیں۔

مولانا مختار احمد ندوی

مولانا مختار احمد ندوی نے مدرسۂ عالیہ اور فیض عام میں تعلیم پائی۔ سند فراغت لے کر ندوۃ العلماء سے ندوی بن کر لوٹے، اشاعت دین، اصلاح المساجد، جامعات اور مدارس کی بنیاد و تنظیم کا ٹھوس اور تعمیری کارنامہ سر انجام دیا۔ جامعۂ محمدیہ منصورہ، مدرسہ عائشہ، جامعہ محمدیہ طبیہ کالج (مالیگاؤں) اور دار السلفیہ تحقیقی ادارہ کا قیام مولانا موصوف کی مساعی جمیلہ کے مرہون منت ہیں۔ مولانا

آزاد ہائی اسکول (مومن پورہ بمبئی) کے قیام میں آپ کا معتدبہ حصہ ہے۔ ادارۂ اصلاح المساجد بمبئی جو تعمیر مساجد (اہلحدیث) کے لیے ایک معتبر اور نامور رفاہی ادارہ ہے اس کی تصدیق اور اسی کے واسطہ سے مئو کی جامع مسجد فیض عام کی تعمیر جدید ہوئی۔ فضیلت مآب شیخ جاسم السبیعی برادران کویتی کے گرانقدر عطیہ سے جامع مسجد فیض عام کی طرح میرٹھ میں باہتمام ادارۂ اصلاح المساجد ایک شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ جامع مسجد اہلحدیث ڈومن پورہ پچھم کی تعمیر جدید مولانا نذری موصوف کی ذاتی دلچسپی اور خصوصی توجہ سے اسی ادارے کے زیر اہتمام عمل میں آئی۔ [1]

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

مئو ناتھ بھنجن کے مردم خیز محلہ ڈومن پورہ (جبہ) میں ۸ر اگست ۱۹۳۹ء کو حاجی محمد یٰسین کے گھر پیدا ہوئے، علمی و دینی فضا میں پرورش پائی، ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں حاصل کرکے قصبہ کی مشہور درسگاہ فیض عام سے عربی زبان و ادب اور علوم اسلامی میں تحصیل کمال کیا پھر عربی و فارسی بورڈ الہ آباد سے مولوی، عالم و فاضل کے امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کی اور اس طرح حافظ، مولوی، عالم اور فاضل کے درجہ ہائے امتیازات آپ کی دستار فضیلت میں چار چاند لگ گئے۔ اس علمی عبقریت کی بنا پر عالم اسلام کی قدیم اور اعلیٰ درسگاہ جامعہ ازہر نے آپ کو عربی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ دیا، قاہرہ میں ۱۹۶۶ء میں اسلامی علوم میں ایم۔ اے کرکے علمی مرتبت میں ایک زینہ اور اوپر چڑھے اور قاہرہ یونیورسٹی سے عربی ادب میں مزید ایم۔ اے کیا تو فضل و دانش کے اوج کمال پر پہنچے لیکن انہیں ستاروں سے آگے کے جہان کی تلاش تھی — اور یہ دنیا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں آباد تھی۔ جہاں کے شعبۂ عربی سے آپ نے پہلے ۱۹۷۲ء میں ایم۔ فل کیا اور تین سال کے عرصہ میں اسی شعبہ سے ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کی۔ آپ کے تحقیقی مقالہ کا عنوان تھا: تحقیق کتاب تخریج احادیث بہجۃ المجالس لابن عبدالبر (الجزء الثانی)۔ اس طرح آپ کا تعلیمی سفر منزل تک تو پہنچ گیا لیکن تحقیقی اور تصنیفی میدان میں آپ برابر منزلیں مارتے ہوئے اور سنگ میل قائم کرتے ہوئے محو سفر ہیں اور جامعہ سلفیہ میں ۱۹۶۶ء میں تقرر کے بعد سے تادم حال آپ کا اسپ قلم عربی زبان و ادب، دینی علوم، علم رجال اور تاریخ و تذکرہ کے ہر میدان میں جولانیاں دکھلا رہا ہے، اب تک سینکڑوں مضامین، تقریظات، تراجم اور تصانیف عربی اور اردو میں شائع ہو چکے ہیں جن کی مختصر فہرست درج ذیل ہے:

---

[1] تذکرہ مولانا محمد احمد ناظم صاحب ص ۲۰۷ - ۲۰۶ و ذیل

(۱) فتح المنان بتسهیل الاتقان (عربی): یہ کتاب علامہ جلال الدین سیوطی (۸۴۹ - ۹۱۱ھ) کی تصنیف "الاتقان فی علوم القرآن" کی تلخیص ہے۔ اس میں "مناہل العرفان" وغیرہ سے بعض مفید مباحث کا اضافہ اور ضمیمہ میں کتب تفسیر کا تعارف شامل ہے۔

(۲) مسئلۃ حیاۃ النبیؐ (عربی) یہ کتاب مولانا محمد اسمٰعیل گجرانوالہ کے رسالہ کا ترجمہ ہے۔

(۳) النظام الالٰھی لرقی والانحطاط: (عربی) یہ کتاب مولانا محمد تقی امینی کی کتاب "عروج و زوال کا الٰہی نظام" کا ترجمہ ہے۔

(۴) مسألۃ زیارۃ القبور فی ضوء الکتاب والسنۃ (عربی)۔ یہ کتاب مولانا محمد اسمٰعیل گجرانوالہ کی کتاب "زیارت قبور" کا ترجمہ ہے۔

(۵) حصول المأمول من علم الوصول (عربی): یہ کتاب نواب صدیق حسن خان (۱۲۴۸ - ۱۳۰۷ھ) بن اولاد حسن خان قنوجی ہند کے مایۂ ناز عالم کی مذکورہ کتاب کی تلخیص ہے۔

(۶) رحمۃ للعالمین (عربی) یہ کتاب مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی "رحمۃ للعالمین" کا ترجمہ ہے۔

(۷) حرکۃ الانطلاق الفکری وجھود للشاہ ولی اللہ فی التجدید (عربی) یہ کتاب مولانا محمد اسمٰعیل گجرانوالہ کی کتاب "تحریک آزادیٔ فکر" کا عربی ترجمہ ہے۔

(۸) قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (للشاہ ولی اللہ محدث دہوی) (عربی): خلفائے راشدین کے مناقب وفضیلت پر شاہ ولی اللہ کی تصنیف، کا عربی ترجمہ

(۹) عصر الالحاد: خلفیۃ التاریخیۃ وبدایۃ نہایۃ (عربی): یہ کتاب مولانا محمد تقی امینی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

(۱۰) تاریخ المجاہدین (عربی): یہ کتاب مولانا غلام رسول مہر کی کتاب "سرگذشت مجاہدین" کا ترجمہ ہے جو زیر ترتیب ہے۔

ان کے علاوہ عربی تراجم جو اردو اور فارسی سے کیے گئے ہیں مجلۃ الجامعۃ السلفیۃ نشرۃ الجامعۃ السلفیۃ، مجلۃ المنار، صوت الجامعۃ اور صوت الامۃ اور دیگر متعدد جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عربی سے اردو تراجم بھی آپ کے سرمایۂ ادب کا گرانقدر حصہ ہیں۔ اردو میں آپ نے جو تراجم کیے ہیں وہ علمی اور دینی حلقوں میں بنظر استحسان دیکھے جاتے ہیں۔ ان میں یہ کتابیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

(۱) خاتونِ اسلام (اردو): اس کتاب میں اسلام و دیگر مذاہب و ادیان میں عورتوں کے مقام کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے دینی و سیاسی حقوق و فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲) اصلاح المساجد من البدع والعوائد: شام کے مشہور سلفی عالم علامہ شیخ محمد جمال الدین قاسمی کی معرکۃ الآرا تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں بدعات و رسوم اور متولیان مساجد کی پیدا کردہ برائیوں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(۳) مختصر زاد المعاد فی ھدی خیر العباد: یہ کتاب علامہ ابن قیم کی مذکورہ عنوان کی کتاب کی تلخیص اور ترجمہ ہے۔ اس میں سیرت رسول ﷺ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

(۴) آپ بیتی: عباس محمود عقاد کی خود نوشت سوانح عمری "انا" کا ترجمہ ہے۔

(۵) عظمتِ رفتہ: ڈاکٹر عبد الحلیم عویس کی کتاب "سقوط ثلاثین دولۃ" کا ترجمہ ہے اس میں ۳۰ مسلم حکومتوں کے اسباب و زوال کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

(۶) تاریخ ادب عربی: اس میں عربی ادب کے مشاہیر، ادبی ارتقاء اور فنی و تہذیبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۷) رسالت کے سائے میں: یہ کتاب شیخ عبد الحلیم عویس مصری کی کتاب "فی ظلال الرسول ﷺ" کا ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری کے تصنیفی سفر سے ایک خاص ذہنی جہت اور مقصدیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ عربی کی گرانقدر تصانیف کا اردو ترجمہ کرکے غیر عربی داں محققین اور طالبات علم کو بھی فیض پہنچایا جائے تاکہ وہ بھی کہہ سکیں ہم ہیں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر۔ حافظ صاحب کو عربی زبان و ادب پر جو قدرت حاصل ہے اس پر نہ فقط ان کی تصانیف شاہد ہیں بلکہ خود عرب و مصری علماء بھی معترف ہیں۔ ڈاکٹر موصوف ہندوستان کی مشہور اسلامی یونیورسٹی جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) کے ریکٹر (وکیل الجامعہ) اور عربی کے پروفیسر ہیں اور ادارۃ البحوث الاسلامیہ کے نگراں اور ناظم ہیں۔ عالم اسلام کے حلقۂ اساتذہ و شیوخ اور زمرۂ علماء کبار میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء آپ کی نظامت میں متنوع کتب دینی و علمی میں شاندار کارنامے سرانجام دے رہا ہے۔

ڈاکٹر موصوف بے حد مخلص، ملنسار اور منکسر المزاج انسان ہیں۔

حافظ ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید ازہری (ولادت ۸ جون ۱۹۴۳ء)

مئوناتھ بھنجن کے تاریخی قصبہ کے مردم خیز محلہ ڈومن پورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق مئو میں ہوئی اور وہیں اس بات کا شہرہ ہوا کہ آپ نے ایک پورے رمضان میں قرآن کا حفظ کیا، صبح سے کرگھے پر بیٹھ جاتے اور حفظ کرتے اور رات تراویح میں حفظ کیا ہوا حصہ ترتیل سے سناتے۔ عربی اور علوم اسلامی دراسات کے بورڈ (یوپی) سے پہلے درجہ میں عالم (۱۹۶۱) اور (۱۹۶۳) میں فاضل کا امتحان پاس کیا، پھر جامعہ ازہر تشریف لے گئے، آپ کے ساتھیوں میں مئو کے مولوی مظہر اور ڈاکٹر حافظ مقتدی احسن بھی تھے۔ مؤخر الذکر کی طرح آپ نے بھی ۱۹۶۶ء میں پہلے ازہر یونیورسٹی سے علوم اسلامی میں ایم۔ اے کیا، اس میں بھی شاندار کامیابی حاصل کی، پھر پانچ سال بعد امریکن یونیورسٹی کے مرکز دراسات عربی سے ایم۔ اے کیا۔ پھر بسلسلہ ملازمت نائیجیریا چلے گئے، جہاں درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔ احمدو بیلو یونیورسٹی نائیجیریا سے [illegible] میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ عبد اللہ بایرو کالج، کانو نائیجیریا یونیورسٹی میں ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۶ء لیکچرر رہے اسی شعبۂ علوم اسلامی میں ترقی کر کے ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء تک ریڈر کے عہدہ پر سرفراز رہے۔ قاہرہ کے دوران طالب علمی میں امریکن یونیورسٹی کی [illegible] شعبہ کے نائب نگراں رہے اور بایرو یونیورسٹی کانو میں گریجویٹ ریسرچ یونٹ کے [illegible] کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبد العلی عربی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں اور بین الاقوامی سیمیناروں میں ان تینوں زبانوں میں انہوں نے مقالے پڑھے ہیں، نائیجیریا سے لوٹنے کے بعد آپ دار سلفیہ ممبئی کے تحقیقاتی شعبہ کے ڈائرکٹر رہے لیکن چار سال بعد (۱۹۹۰) [illegible] لندن کی دعوت پر [illegible] بن کر انگلستان چلے گئے۔

ڈاکٹر عبد العلی کے مضامین عرب و ہند کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں، کئی کتابوں کی آپ نے تدوین و ترتیب کی ہے جو عالمانہ تحشیہ، تصحیح اور تحقیقی مواد کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔

تحقیق تفسیر سورۃ الاخلاص (عربی): یہ کتاب شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ الاخلاص کی تصحیح اور تخریج و تعلیق پر مشتمل ہے۔

تحقیق تفسیر سورۃ النور (عربی): اس کتاب میں علامہ ابن تیمیہ کی سورۃ النور کی تصحیح و تخریج کی گئی ہے۔

تحقیق تفسیر الآیۃ الکریمۃ (عربی) علامہ ابن تیمیہ نے مشہور آیت لا الٰہ الا انت الخ کی دلنشین و مفید تفسیر کی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس کتاب کی تصحیح و تحقیق کی ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ الحرانی کی اس معرکۃ الآرا تصنیف کا اردو ترجمہ بہت پہلے عبدالرحیم پشاوری نے کیا تھا اور یہ محمود احمد غضنفر کی تنقیح و ترتیب کے ساتھ پاکستان سے شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی کاوش اور عالمانہ تصحیح و تخریج نے کئی نادر اور اہم عربی تصانیف کو عربی علماء اور محققین سے روشناس کرایا ہے۔ جن میں تحقیق کتاب الزھد ابن ابی عاصم (عربی)، تحقیق کتاب الامثال (عربی) پر شیخ اصفہانی اور اسی عنوان پر رامہرمزی کی کتاب اور بیہقی کی "تحقیق کتاب شعب الایمان" شامل ہیں۔ حافظ ڈاکٹر عبدالعلی نے بڑی نیک طبیعت پائی ہے اور ایک شریف النفس انسان ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر نور الحسن انصاری (۱۹۲۷-۱۹۹۰ء)

ابتدائی تعلیم جد امجد مولانا محمد نعمان سے حاصل کی، مولانا دار السلام عمر آباد (مدراس) کے شیخ الجامعہ تھے، مئو کے اس علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس میں بڑے ذی علم و فضل شخصیتیں پیدا ہوئیں مثلاً مولانا الحاج ابو القاسم محمد علی قدسی (سابق خطیب جامع مسجد اہل حدیث کوچین کرالا) مولانا عبدالقیوم اعظمی وغیرہ۔ دہلی یونیورسٹی سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ۱۹۶۲ء میں حاصل کی آپ کے مقالہ کا عنوان تھا "فارسی ادب اورنگ زیب کے عہد میں" اور پھر وہیں شعبہ فارسی میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کیا اور صدر شعبۂ فارسی کے عہدے پر تھے کہ داغ مفارقت دے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں ایران تحصیل کمال علم کے لئے گئے اور تین سال کے بعد دانش گاہ تہران سے زبان و ادبیات فارسی میں "دکترت" کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر نور الحسن انصاری نے اردو، فارسی اور انگریزی میں کئی کتابیں اور انگریزی میں کئی کتابیں اور تراجم یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) تصحیح و مقدمہ بر مآثر محمود شاہی (۲) فارسی ادب بعہد اورنگ زیب (۳) تصحیح و مقدمہ و تعلیقات تحفۃ الہند۔ (۴) نعمت خان عالی کے وقائع محاصرۂ قلعۂ گولکنڈہ کا انگریزی ترجمہ (۵) نظری کی تاریخ زبان فارسی کا انگریزی ترجمہ (۶) ترجمہ کتاب داستانہای دل انگیز اور (۷) احوال و آثار امیر خسرو۔

ڈاکٹر نور الحسن استادان فارسی کی کل ہند ایسوسی ایشن کے فعال رکن اور عہدہ دار تھے، بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے اور جاندار مقالے پیش کرتے تھے۔ آقایان فارسی

گو کے لہجہ میں فارسی بولتے تھے۔ اور اس قند فارسی سے طلبہ و طالبات بھی سینکڑوں کی تعداد میں فیضیاب ہوئے بڑے لائق استاد تھے۔ 'بناف' کے نام سے ایک مجلہ فارسی یونیورسٹی سے نکالتے تھے۔ ایران و ہند کی تمام یونیورسٹیوں میں معروف تھے اور فارسی کے اساتذہ میں مشہور اور اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔

امیر الہند محدث جلیل ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن الاعظمی (۱۳۱۹ھ - ۱۴۱۲ھ)

'موت العالِم موت العالَم' کی زندہ مثال ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کو دیکھنے میں آئی جب 'محدث جلیل' فاضل اجل ابو المآثر حضرت علامہ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی راہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ عالم دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے، علم و فضل کا آفتاب غروب ہوا، مکے اور مدینے تک پہنچنے والی مؤذن کی اذان کی گونج کا ارتعاش فضا میں تھرتھرا رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ عقیدتمندوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ ۱۱ رمضان المبارک ۱۴۱۲ھ کو روزہ دار مسلمانوں نے محض ایک عظیم المرتبت شخصیت کو نہیں دفن کیا بلکہ ایک امت کو دفن کیا۔ جنازہ کی مشایعت کرنے والوں کا جم غفیر بھی عنداللہ متوفی کی مقبولیت کی ایک علامت ہے۔ اسلامی تاریخ میں اس کی ایک مثال امام احمد بن حنبلؒ کے نماز جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد سے ملتی ہے جو علامہ ذہبی کی روایت کے مطابق ایک محتاط اندازے کے مطابق آٹھ لاکھ تھی۔ ان کے علاوہ مستورات کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اس مشینی زندگی کی مصروفیت و مشاغل کو دیکھتے ہوئے جب ہم سنتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی نماز جنازہ میں تخمیناً دو لاکھ فرزندان اسلام شریک ہوئے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس پوری صدی میں ہندوستان میں کسی عالم دین کا اتنا بڑا جنازہ نہیں اٹھا جس کی نماز جنازہ ایسے مقدس ترین مہینے کے عشرہ میں روزہ داروں نے ادا کی ہو۔ یہ شرف یقیناً صرف محدث جلیل ابو المآثر حضرت مولانا حبیب الاعظمی کو حاصل ہے۔ مولانا موصوف کے زہد و تقویٰ، خلوص و للہیت، علم و فضل، علوم اسلامی کی بے لوث اور بے غرض اشاعت اور ساری زندگی حدیث نبویؐ کی شب و روز خدمت اور بے پناہ جذبۂ احیاء سنت کے پیش نظر یقین کامل ہے کہ ایسے عظیم بندۂ مومن کا ٹھکانہ علیین میں ہو گا اور ملاء اعلیٰ سے آواز آئی ہو گی۔

سلامٌ علیکم طبتم فیہا خالدین

محدث العصر کا تاریخی نام اختر حسن تھا، ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی قصبہ بہادر گنج جو مئو کے قریب ہے وہاں کے مدرسے میں مولانا عبد الغفار عراقی کے بھائی مولانا ابو الحسن عراقی سے کسب فیض

کرکے مظہر العلوم بنارس سے فاتحہ فراغ پڑھا، دار العلوم مئو میں مولانا کریم بخش سنبھلی کے مدد زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ دورہ حدیث مکمل کیا۔ فراغت کے بعد یہیں درس و تدریس کی مسند پر جلوہ فگن ہوگئے پھر مئو کے دوسرے بڑے مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم کے صدر مدرس بنے۔ المعہد العالی مرقاۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی اور آپ کی مساعی جمیلہ سے یہ آج مینارۂ علم بن کر علم و دانش کا اجالا دور دور تک پھیلا رہا ہے۔

مولانا مرحوم کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا ان کے بے شمار تلامذہ اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں، ملک کے خاص خاص علمی و دینی حلقے اور اہل علم مولانا کے مقام و مرتبہ کے معترف تھے جن میں ملک اور بیرون ملک کے علماء کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبد الشکور فاروقی، مولانا ابو الوفا (صدر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد)، علامہ شیخ محمد زاہد کوثری (قاہرہ) شیخ احمد محمد شاکر (قاہرہ) اور عالم اسلام کی مشہور علمی شخصیت معروف عالم حدیث اور نامور محقق شیخ عبد الفتاح ابو غدہ (مقیم سعودی عرب) جیسے اساطین علم اور مشاہیر امت کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔

ہندوستان میں علم حدیث کے سلسلۃ الذہب کی پہلی کڑی دسویں صدی ہجری کے ممتاز محدث شیخ علی متقی برہانپوری (صاحب کنز العمال) کی ذات گرامی تھی واسطۃ العقد تھے شاہ ولی اللہ اور پھر اس میں ان کی صلبی و معنوی اولاد کے گوہر پروئے گئے، اور عصر حاضر میں مئو کا یہ چمکتا ہوا موتی گوندھا گیا۔ حدیث و اسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی نادر و نایاب مخطوطات کے دلدادہ تھے ان کا اہم تر یادگار کارنامہ احادیث کی بہت سی نادر کتابوں کی اشاعت ہے۔ ان میں یہ چند مشہور کتابیں شامل ہیں:

مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ مصنف عبد الرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (عبد اللہ بن مبارک)، مجمع بحار الانوار (ملا محمد بن طاہر پٹنی) الحاوی علی رجال الطحاوی وغیرہ۔ آخر الذکر رجال طحاوی پر خود مولانا کی بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیف ہے۔ اردو میں بھی مولانا موصوف کی متعدد تصانیف ہیں جو اکثر ردو مناظرہ میں ہیں۔ مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ فقہ حنفی پر مولانا کی نظر بڑی وسیع تھی۔ اس کی تائید و حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔ مولانا کے اوصاف حمیدہ کے بیان کے لیے سفینہ درکار ہے۔ دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار۔

آپ کے صاحبزادے مولانا رشید احمد الاعظمی المآثر کے مدیر ہیں۔ آپ کے ایک پوتے اسلم اعظمی قطر قونصل بمبئی میں ملازم ہیں، دوسرے پوتے محمد اسعد الاعظمی (ولادت ۱۹۵۸) مئو کے نامور شعراء میں سے ہیں۔

تذکرۂ علماء کوپاگنج

یہاں کے مسلمانوں میں زیادہ تر حنفی مسلک دیوبندی النسبت علماء کرام پیدا ہوئے ہیں۔ چار بڑی دینی درسگاہیں ہیں جس میں قصبہ کا سب سے قدیم مدرسہ مصباح العلوم (قائم شدہ ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴) ہے۔ بانیانِ مدرسہ میں حاجی محمد یعقوب عرف چمڑاد اور حاجی عبدالواحد پیش پیش تھے۔ اس کے اساتذہ میں مولانا دین محمد کوپاگنجی (م ۱۳۳۴ھ) مولانا عبدالصمد اور مولانا محمد اسحٰق (م ۱۳۴۴ھ) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ جامع العلوم کی بنیاد میں سیاسی محرکات کارفرما تھے۔ وصیۃ العلوم قصبہ کے پیرِ طریقت مولانا شاہ وصی اللہ (م ۱۳۸۷/۱۹۶۷) کے نام نامی کی طرف منسوب ہے۔ اس کا قیام (۱۳۷۰/۱۹۵۰) میں عمل میں آیا۔ بانیانِ مدرسہ تھے: حاجی محمد سعید، ممتاز، مولانا حفیظ الرحمن، مولانا عبدالقیوم، مولانا شیر احمد، حاجی عبدالرب، حکیم بشیر الدین، حکیم حفیظ ستار، مولانا نور محمد بن مولانا سراج الدین نے بعد میں مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ مدرسہ مراد العلوم کی بنیاد ۱۴۰۲/۱۹۸۳ میں رکھی گئی۔ ابتداءً اس مدرسہ کو حکیم مولانا شیر احمد امامِ جمعہ و عیدین کی سرپرستی میسر تھی۔

کوپاگنج کی تاریخ کے علم و دانش کے باب میں نہ کسی جید عالم اور نہ کسی عظیم شاعر اور ادیب کا نام ملتا ہے جو شہرۂ آفاق ہوا ہو۔ مولانا عبدالصمد حکیم مولوی الٰہی بخش، مولانا شیخ محمد یونس پورہ، مولانا محمد اسحٰق عطا حسین اور فیض اللہ مغتنماتِ زمانہ میں سے تھے۔ ولی نذیر مولانا (م ۱۳۸۶ھ) کا شمار ان صفِ اول کے علماء میں ہوتا ہے جن پر اس قصبہ کو ناز ہے وہ عالم باعمل تھے۔ مولانا عظیم اللہ (م ۱۹۷۷) ایک باشعور اور دیندار عالمِ دین تھے۔

؂ اس مقالے میں ہم نے تذکرہ مشاہیر کوپاگنج تالیف مولانا محمد عثمان معروفی، مئو۔ کوپاگنج ۱۹۸۵ء سے استفادہ کیا ہے۔

مولانا الٰہی بخش (۱۲۵۸ - ۱۳۱۹)

شیراز ہند جونپور کے مدرسہ امامیہ جونپور اور پھر مدرسہ حنفیہ میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔ مولانا سخاوت علی جونپوری سے بھی استفادہ کیا۔ مولانا عبدالحلیم بن امین اللہ فرنگی محلی (۱۲۳۹ - ۱۲۸۵) سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مدرسہ ناصر العلوم گھوسی کے صدر المدرسین مقرر ہوئے۔ آپ کا جنازہ جنازۂ مشہورہ تھا۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا محمد اسحٰق۔ مولانا دین محمد۔ مولانا سراج الدین۔ مولانا بخش سندیؒ مولانا محمد محمود مروی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

حکیم مولانا عبدالرحمٰن ولد محمد شرف (م ۱۹۴۰)

قصبہ کے مشہور معروف طبیب حاذق تھے، علاج معالجہ میں آپ کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ متقی، عابد شب روزہ دار اور عالم باعمل تھے۔

حکیم مولانا اسداللہ

اپنے وقت کے جید عالم اور طبیب حاذق تھے۔ آپ کی علمی صلاحیت و استعداد نے آپ کو جنس گرانمایہ بنا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ ہر شہر کے طبابت و حکمت کے بازار میں "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" کے مطابق تھوڑے رہتے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ بمبئی، مالیگاؤں، بھیونڈی اور اکولہ میں زیادہ رہے اور یہیں ان شہروں میں آپ کا علمی فیض زیادہ جاری رہا۔ ۱۹۲۲ء میں انتقال ہوا۔

مولانا محمد اسحٰق بن ضیاء الدین بن شیخ بھیکن (۱۲۷۲ھ - ۱۳۴۱ھ)

چشمۂ رحمت غازی پور میں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری سے جو اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ علوم و فنون کی تکمیل کی پھر حدیث کی تکمیل کے لئے سید نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مقامی مدرسہ مصباح العلوم میں مسند درس و افادہ کی رونق بخشی اس سے پہلے کچھ دنوں تک آپ مئو کے محلہ اورنگ آباد میں تعلیمی و تدریسی خدمت انجام دیتے رہے اور ایک کثیر جماعت نے آپ سے استفادہ کیا۔

مولانا دین محمد (م ۱۳۳۴، ۱۹۱۵)

مرجع علماء اور استاذ الاساتذہ تھے مولانا عبدالصمد ناظم مدرسۂ مصباح العلوم کے والد تھے۔ موصوف کی ذات گرامی سے اس مدرسہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی، مولانا کے خلوص، شفقت و حسن کارکردگی کا یہ اثر ہوا کہ ان کے حلقہ درس میں دور دور سے طالبان علم آ کر شامل ہونے لگے۔ آپ کا وعظ بہت مؤثر اور دلنشیں ہوتا تھا۔ اور اس سے عورتوں کو بڑا نفع پہنچا اور بہت ساری گھریلو برائیاں

آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں۔

مولانا عبدالصمد کوپا گنجی (۱۳۰۵-۱۳۸۶ھ)

اپنے دیار کے مشاہیر علماء میں سے تھے، تبحر علمی، صلاحیت اور استعداد کی بنا پر "بڑے مولانا" کے لقب سے مشہور ہیں، مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد سے تحصیل علم کر کے نامور معقولی عالم اور محدث مولانا ماجد علی جونپوری سے میڈھو کے مدرسہ میں تمام علوم کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی۔ مولانا نے اہل وطن کی خواہش پر مدرسہ مصباح العلوم میں اپنی پوری زندگی درس و تدریس میں گذاری۔ آپ کے ارشد تلامذہ میں مولانا شکر اللہ مبارکپوری، مولانا اسلم الحق کوپا گنجی، مولانا محمد ایوب مئوی شیخ الحدیث مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل، مولانا عبدالستار مئوی اور مولانا حفیظ اللہ کوپا گنجی جو اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ بڑے اچھے شاعر تھے۔[1]

مولانا محمد صابر ولد عبدالقادر (مہرنہ پورہ)

صاحب تقویٰ جید عالم تھے مسلک اہلحدیث کے پابند تھے [illegible] کے سبب [illegible] حاصل کرتے تھے۔ [illegible] کرنے والے کاریگروں کو [illegible] بڑی غیور طبیعت پائی تھی۔ کم سخن، کم آمیز اور خلوت پسند تھے۔ ۱۲۵۶ھ کے لگ بھگ [illegible] کی عمر میں وفات پائی۔ کوئی اولاد نرینہ نہ تھی صرف دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں تھیں۔

مولانا سراج الدین بن میاں جی فتح محمد بن خدا بخش بن محمد خلیل بن عبد [illegible] بن نظام الدین (۱۲۴۷-۱۲۹۲ھ) نے مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور اور مدرسہ علوم جونپور سے معقولات و منقولات کی کتابیں پڑھیں۔ درس و تدریس [illegible] بنگال میں پڑھاتے رہے پھر مستقل طور پر [illegible] چلے گئے۔ آپ کے تلامذہ میں مولانا عبدالقیوم اعظمی اور مولانا [illegible] خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حکیم مولانا فیض اللہ

مسلک اہلحدیث کے پابند تھے صاحب تقویٰ عالم باعمل تھے ۱۲۵۶ھ میں وفات پائی۔ مولانا بخش اللہ تعلیم کے شوق میں کوپا گنج سے غازی پور تیس میل کی مسافت پاپیادہ قطع کرتے تھے۔ عابد و زاہد صاحب تقویٰ عالم باعمل تھے، وعظ و تقریر میں مشہور تھے۔

---

[1] تذکرہ علماء اعظم گڑھ ص ۱۹۴-۱۹۵

حکیم مولانا محمد ایوب ولد محمد اسحٰق (محلہ ہونسہ پورہ) اور اسی محلہ کے مولانا عظیم اللہ بن شیخ (۱۲۱۰-۱۳۶۰) بڑے لاابالی قسم کے تھے۔ مگر علمی استعداد وہبی وصف تھا کہ استادوں کو بھی مات دے دیتے تھے۔ مولانا محمد اسحٰق کے بعد ان کی جگہ پر مولانا عظیم اللہ مصباح العلوم میں مدرس منتخب ہوئے۔

میاں جی عبدالشکور ولد محمد اسحٰق (محلہ ہونسہ پورہ) لوجہ اللہ اپنے مکان پر محلہ کے بچوں کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے تھے اور سارے بچے ناظرہ پڑھا کرتے تھے۔ آپ کی دینداری، دیانتداری اور اخلاص کا یہ اثر تھا کہ مرجع خلائق اور واجب التعظیم بن گئے ۱۹۶۵ء میں وفات پائی، ماسٹر عبدالسلام مقیم امریکہ آپ کے لڑکے ہیں۔

حکیم مولانا منظور احمد بن مولانا سراج الدین (۱۸۹۶-۱۹۵۳)

اس دور کے مشہور عالم اور حکیم تھے۔ آپ کے والد ایک جید عالم تھے۔ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور یہیں سے حکیم محمد عثمان بانی طبیہ کالج الہ آباد سے فن طب کی تحصیل و تکمیل کی اور مٹیا برج کلکتہ اور مفتاح العلوم مئو میں پڑھانے اور مطب کرنے کے بعد طبیہ کالج الہ آباد میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۹ء تک بحیثیت پروفیسر رہے، ۱۹۴۷ء میں شعبۂ طب دارالعلوم میں طب کی تعلیم دیتے رہے اور اسی درسگاہ کے ناظم مقرر ہوئے، و تادم حیات خدمت کرتے رہے۔

مولانا اسلام الحق کوپا گنجی (ولادت ۱۳۲۲)

شیخ اسعد اللہ بن الحاج محمد یعقوب بن ولی محمد کے صاحبزادے تھے ابتدائی تعلیم محلہ کے میاں جی دلدار سے لے کر جونپور میں اٹالہ مسجد کے مدرسے میں چلے گئے۔ پھر قصبہ کے مدرسہ مصباح العلوم میں کچھ کتابیں پڑھیں۔ بقیہ کتابیں مدرسہ یوسفیہ مینڈھو میں پڑھیں پھر ادھر ادھر تحصیل علم کے لئے سفر کرتے ہوئے دیوبند پہنچے۔ علوم مروجہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لوٹے۔ درس و تدریس کا سلسلہ مختلف شہروں میں قائم رہا لیکن کوئی بھی جگہ راس نہ آئی اور نہ پابند ملازمت رہے تاآنکہ دارالعلوم دیوبند میں یہاں ۱۳۷۰ھ سے آخیر عمر (۱۳۹۵) تک تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانہ قیام میں متعدد کتابوں پر حواشی اور تشریحی و تفسیری شذرات لکھے۔ تصنیف کی فہرست میں یہ کتابیں شامل ہیں: شرح قطبی تصورات، شرح قطبی تصدیقات، توضیح الحسن تعریب الحسن، التحقیق المرضی شرح میبذی، فیض المبہم مقدمہ شرح مسلم۔ جمعیۃ الانصار سے متاثر تھے اور اسی سے وابستہ تھے۔

مولانا محمد سلیم (۱۳۲۲-۱۳۸۳) دیوبندی جمعیۃ العلماء کے سرگرم رکن تھے۔ دارالعلوم مئو میں پڑھاتے تھے اور آخر عمر تک یہ سلسلہ قائم رکھا، عربی ادب میں آپ کی صلاحیت بہت عمدہ تھی نفحۃ الیمن جو درس نظامیہ میں داخل تھی آپ نے اس کی ایک بہترین شرح لکھی تھی۔ عربی شاعری میں اچھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔

مولانا عبدالرؤف کوپاگنجی (۱۳۲۲-۱۳۸۳)

احیاء العلوم مبارکپور میں دو سال پڑھ کر دیوبند گئے مگر پھر مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد سے ۱۳۴۵ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ آخر عمر تک مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف سے وابستہ رہے۔ اس کے صدر المدرسین تھے۔

مولانا عبدالقیوم بن مولا بخش (۱۳۳۵-۱۴۰۲)

مولانا عبدالصمد، مولانا عظیم اللہ اور مولانا سراج الحق کے شاگرد رہے۔ [illegible] میں مہارت رکھتے تھے۔ دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ قصبہ کے بیشتر علماء روشناس کی طرح آپ بھی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری سے بیعت تھے۔ مدرسہ مصباح العلوم کوپاگنج، اور مدرسہ عربیہ حفظ العلوم [illegible] میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر داں (ضلع سیوان بہار) کے مدرسہ میں [illegible] آپ کے شیخ و مرشد نے بھیجا تھا آخر عمر تک رہے [illegible] لکھی۔

حکیم عارف الحاج مولانا نثار احمد (۱۳۲۲-۱۴۰۲)

حکیم محمد شفیع کے لڑکے تھے، آپ کا خاندان معزز اور متمول تھا۔ ایک زمانے میں آپ ہینڈلوم صنعت کے بہت بڑے سیٹھ اور گرہست تھے۔ کئی مدرسوں میں جن میں مصباح العلوم (کوپاگنج)، دارالعلوم دیو(؟)، منڈھیرا (ضلع علی گڑھ)، دیوبند اور ڈابھیل کے نام قابل ذکر ہیں تحصیل علوم کیا۔ فراغت کے بعد مسیح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اپنے پیر و مرشد سے عشق کے درجہ میں محبت رکھتے تھے۔ علماء کرام کا بیحد اعزاز و اکرام کیا کرتے تھے۔ متواتر تیس برس تک آپ نے بڑے وقار و تمکنت اور دبدبہ و شان و شوکت کے ساتھ قصبہ کی امارت و رہبری کی۔ بڑے جلیل القدر عالم جید و دیندار تھے۔ دنیاداروں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ تزکیہ و اصلاح نفس کے لیے آپ کی مجلس گویا تطہیر قلوب کا باعث بن جاتی جس میں خشیت الٰہی کا جذبہ کارفرما رہتا۔

مولانا نوار احمد بن مولانا سراج الدین (۱۹۲۳-۱۹۶۹)
دیوبند میں دو سال متوسطات کی تعلیم حاصل کی۔ مفتاح العلوم مئو سے ۱۹۴۸ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور طب وغیرہ پڑھنے کے بعد دارالعلوم مئو میں مستقل مدرس ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں الگ ہو کر اپنے شیخ و مرشد حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی خدمت میں رہکر مجاز صحبت کے شرف سے سرفراز ہوئے۔ انہیں کے نام پر وصیۃ العلوم قائم ہوا تو آپ اس کے ناظم مقرر ہوئے۔

مولوی نظیر القیوم بن منظور العزیز بن رحمت اللہ بن حاجی عبدالواحد ڈھونرا (۱۳۴۷ھ، ۱۳۴۷ھ)
مولانا عظیم اللہ نے تعلیم و تربیت کی۔ زیادہ تر تعلیم ان کی حضرت شاہ وصی اللہ فتحپوری کے یہاں ہوئی اور وہیں سے فارغ التحصیل بھی ہوئے۔ اذکار و اشغال میں زیادہ وقت گذارتے۔ شاعر بھی تھے اور صوفی منش تہجد گزار اور عابد شب زندہ دار شخص تھے۔

مولوی شمس الدین (م ۱۴۰۱/۱۹۸۱)
دیوبند کے فارغ تھے۔ جامع العلوم کوپا گنج میں مدرس ہوئے کچھ دنوں بعد مصباح العلوم چلے گئے، پھر چند مجبوریوں کے سبب مدرسہ مفتاح العلوم گدڑی بازار بلیا میں مدرس ہوئے۔ اچھی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ٹاؤن ایریا کے ممبر منتخب ہوئے۔

محمد عثمان بن الحاج القاری محمد حنیف معروفی (ساکن پورہ معروف محلہ بانسہ، جعفر پور، اعظم گڈھ) (ولادت ۱۹۲۸) یک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کے اساتذہ کی فہرست جیدہوں ہے۔ علوم دینیہ و نقلیہ کا گہرا علم تھا۔ فتویٰ نویسی، خوشنویسی کے علاوہ ۱۹۵۰ء ۱۲-۶۹ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب عربی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۴ء میں جامع العلوم میں فراغت قرأت کی دستار محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن نے باندھی۔ اور ۱۹۸۰ میں دارالعلوم دیوبند سے دستار فضیلت لی۔ آپ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مضمون نگاری اور شاعری بھی کرتے ہیں، تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل ہے۔ تذکرہ نویسی اور تاریخ نویسی کی قلمرو میں بھی آپ کا سکہ اور قلم چلتا ہے۔ مشاہیر پورہ (مطبوعہ ۱۳۹۶) اور تذکرۂ مشاہیر کوپا گنج کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی بعض کتابیں ہیں کچھ مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ۔

کوپا گنج کے علماء و مشاہیر کے حالات، اس قصبہ کی تاریخ کے لئے یہاں کی علمی، ادبی، دینی اور سیاسی اعتبار سے تصنیفی میدان میں مولانا محمد عثمان معروفی اولین شخص ہیں۔

سے بھرے ہیں۔ اکثر خاندان مئو مبارک پور کے یہاں بھی آباد ہیں"[1]

جب فاتحین بنارس کے ساتھ علوی اور سادات حضرات یہاں آئے تو رزقِ حلال جان کر بُنکاری کا پیشہ اختیار کیا، نُور باف کی عرفیت عام ہو گئی اور شیعی مذہب کو غلبہ حاصل ہوا یہی وجہ ہے کہ بنارسی انصاری حضرات میں شیعوں کی تعداد کثیر ہے۔ بہر حال مسلکاً نہ سہی صنعتاً یہ بھی برادری میں شامل ہیں جس طرح آج بھیونڈی میں نوائطی اور خان و سید حضرات پاور لوم اور پارچہ بافی کر کے "جلاہوں" میں شامل ہو گئے ہیں۔ ہم ان حضرات کا جن کی شناخت ممکن ہو سکی ہے مختصر تذکرہ قلمبند کر رہے ہیں۔ ان میں، جر طبقہ کے ان افراد کا بھی ذکر ہے جن کے محالے قائم تھے یا جز بزازی کرتے تھے،

مولانا حافظ عبدالرحیم بنارسی (۱۲۴۳-۱۳۶۱)

ایک غریب بُنکر خاندان کے فرد تھے، حافظوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے والد حافظ کریم اللہ بنارسی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، جامعہ مظہر العلوم بنارس سے فارسی و عربی میں سند حاصل کی دن بھر بُنتے تننے میں مصروف رہتے اور اسی پہ گذر بسر کرتے۔ کرگھے کی کھٹ کھٹ کی آوازوں میں ندائے علم کی بانگ تیز ہوئی تو خاموشی سے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے تانا بانا جوڑ لیا، تفسیر و حدیث و معقولات کا درس دیا، ایک خوش الحان حافظ اور مقبول واعظ تھے وعظ و تبلیغ کے ذریعے اطراف میں، اشاعتِ دین کے کاموں میں کامرانی حاصل کی تذکرۂ مشائخ بنارس میں مولانا عبدالسلام نعمانی نے آپ کے خاندان و افراد کا ذکر کیا ہے۔[2]

مولانا عبدالرحمٰن مئوی بنارسی (م ۱۳۰۵)

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد شہر بنارس کی مشہور مسجد گیان باپی میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اور ساتھ ہی بی بی روضہ کی مسجد و تع چوک بنارس میں خطابت و امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ایک طرف مسند درس و افادہ پر رونق افروز رہے۔ اور دوسری طرف بزازی کی دکان پر تاجر بن بیٹھے اور بنارس میں اسی سلسلے کے سبب مستقل سکونت اختیار کر لی، کپڑے کی تجارت میں خیر اسرار قلین نے رزق کثیر سے نوازا۔ ڈاکٹر مصطفی آپ کے صاحبزادے ہیں، مولانا کے نواسوں میں مولانا عبدالمعید بنارسی اور مولانا عبدالحمید مکی بنارسی علم و فضل میں

---

[1] عبدالسلام مبارکپوری۔ تاریخ مئو ماہنامہ۔ ج ۲۔ ص۔

[2] تذکرۂ مشائخ بنارس۔ مولانا عبدالسلام نعمانی، مطبع بنارس ۱۹۷۰ء ص ۱۳۳

بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ مولانا عبدالرحمٰن سید نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد تھے۔

مولانا عبدالسبحان بنارسی (۱۲۲۶-۱۳۲۳ھ)

نسباً عباسی و انصاری ہیں[1]، مچھلی شہر میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنے والد بزرگوار مولانا فضل امام مچھلی شہری سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور فارسی کی تکمیل شیخ برکت اللہ انصاری سے کی۔ تحصیل علوم کے لیے بنارس گئے جو مشہور زمانہ اساتذہ و شیوخ کا مرجع بنا ہوا تھا، مولانا رحمت اللہ دہلوی تلمیذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی، مولانا غلام حسین جونپوری (م ۱۲۶۹)، مولانا قطب الدین فرنگی محلی، مولانا عبدالحق لکھنوی نحوی صرفی، مولانا غلام یحییٰ فرنگی محلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا حکیم حافظ عبدالمجید بنارسی (۱۲۷۱-۱۳۵۶)

آپ کا نام و نسب اس طرح ہے: عبدالمجید بن عبدالقادر بن سردار باب اللہ ساکن محلہ کتیھر شہر بنارس۔ سردار باب اللہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اپنے محلہ کے معزز و باثر سردار تھے اور غالباً انصاری برادری کے تھے۔ ان کے صاحبزادے رجب کو بھی سرداری ملی تھی۔ مئو کی مشہور عالم ہستی ملا حسام الدین سے پندرہ ماہ کے اندر حفظ قرآن مکمل کیا۔ مولانا عبدالرحمٰن مئوی (متوفی ۱۳۱۵ھ مذکورہ بالا) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور پھر دہلی جا کر درس پڑھا۔ آپ کے خسر مولانا عبدالرحمٰن مئو کپڑے کے بڑے تاجر تھے۔ جیسا کہ اوپر ان کا ذکر ہو چکا ہے مولانا عبدالمجید کے صاحبزادے تھے۔ فن طب کی تکمیل کی۔ مطب کرتے رہے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، زیادہ مدت حدیث شریف کے درس و تدریس میں گذری۔ سلطانہ رضیہ بیگم کی شاہی مسجد "بی بی رضیہ" کے خطیب تھے اور شہر کی چھوٹی عیدگاہ میں عیدین کے امام مقرر تھے۔ بنارس کے جید علماء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد حفیظ اللہ بنارسی (۱۲۹۰-۱۳۴۰)

مولانا محمد حفیظ اللہ بن سردار حاجی نور محمد بنارسی قوم کے سردار تھے اور برادری میں بڑی موثر شخصیت کے مالک تھے اور قابل احترام ہستی تھے۔ جامع منقول و معقول علوم کے فاضل ذات تھے اور آپ کے اساتذہ میں مولانا امان اللہ مئوی (م ۱۳۰۹)، مولانا حکیم عبدالمجید مئوی (م ۱۳۵۶)، مولانا عبدالعلیم رسولپوری (م ۱۳۲۱) اور مولانا احمد حسین رسولپوری (م ۱۳۵۸)

---

[1] آپ والد کی طرف سے عباسی اور والدہ کی جانب سے انصاری ہیں۔ وسیم احمد قاسمی: تذکرہ علمائے بنارس ص ۵۹۔

تھے۔ علوم متداولہ کے بعد ۱۳۲۲ھ میں کچی باغ (آزاد پارک) میں منعقدہ ایک اجلاس عام میں بڑے اعزاز کے ساتھ دستارِ فضیلت باندھی گئی۔ مولانا موصوف نیک و صالح، متقی اور درد مند دل رکھنے والے شخص تھے۔

مولانا محمد خلیل الرحمٰن بنارسی (۱۲۹۲-۱۳۵۴)

ایک عالم خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو تین پشتوں سے علوم و معرف کا گہوارہ رہا اور ساتھ ہی نقش، نمال اور ریشم بافی میں باکمال تھا اور اپنے والد مولانا محمد اسمٰعیل (م ۱۲۹۴ھ) کے بعد ان کے صحیح جانشین اور ان کے علمی منصب پر فائز ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "ہدیۃ المستکبرین فی حرفۃ النبیین" جیسا کہ عنوان سے عیاں ہے اہلِ حرفہ اور دستکار کی شرف کی فضیلت پر ہے۔ قابلِ ذکر ہے آپ ہر جمعہ کو کچی باغ بنارس کی بڑی مسجد میں نماز کے بعد تقریر فرماتے تھے۔ آپ جامعہ مظہر العلوم بنارس کے سب سے پہلے مہتمم تھے۔ انگریزی حکام مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے۔ آپ کی دینداری تقویٰ و طہارت اور ریاست و امارت کا ایسا دبدبہ تھا کہ ۱۹۰۶ء میں جارج پنجم جب اپنی شہزادگی کے زمانے میں ہندستان آئے تو آپ کے دولتکدے پر بھی حاضری دی تھی (متوفی ۱۹۳۶ء)۔ ۲۲ جون ۱۹۱۴ء کو حکومت نے آپ کو خان صاحب کے خطاب سے نوازا۔ بنارسی کپڑوں کے کامیاب تاجر تھے اور اس تجارت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی برکتوں سے نوازا کہ شہر کے رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ تین صاحبزادے یادگار چھوڑے۔ مولانا نسفی الرحمٰن، مولانا حفیظ الرحمٰن اور حافظ عزیز الرحمٰن۔[1]

مولانا حافظ حاجی محمد اسمٰعیل بنارسی جید عالم تھے، ایک رسالہ بعنوان "درۃ المنتظم جزء فاتحہ خلف الامام" کے مسئلہ پر ہے آپ کی تصنیف ہے۔ آپ کا انتقال ۱۲۹۴ھ میں ہوا۔

مولانا ولی اللہ بنارسی (۱۸۹۰-۱۹۴۴)

مولانا ولی اللہ بن حاجی محمد حسین بنارسی کا آبائی وطن پٹنہ تھا، کاروبار کے سلسلہ میں نقل مکانی کر کے بنارس سے محلہ مدنپورہ میں بس گئے۔ اور آبائی پیشہ پارچہ بافی اختیار کیا، عابد شب زندہ دار تھے اور جب مدنپورہ میں جہاں بنکر برادری کثرت سے آباد تھی عربی زبان کی تعلیم کا معقول انتظام نہ تھا، محلہ کے ایک غیر مسلم پرچون فروش کے طعنے کہ جلاہا (جولاہا) جلاہا ہوتے ہیں، آپ کے جذبہ

---

[1] تذکرۂ مشائخ بنارس، طبع اول ص۸۵

تحصیل علم کو ابھار دیا۔ سید سے لکھنؤ پہنچے اور مولانا عبدالعلیم فرنگی محلی (م ۱۲۸۵) کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، علم طب و حکمت میں خاصی استعداد پیدا کر لی ذہانت کے بعد پیشہ آبا بنکاری جو ذریعہ عزت نہیں تھا ترک کر کے طبابت کی نبض تھام لی۔

مولانا احمد اللہ بنارسی (۱۸۶۰ - ۱۹۴۲)

مولانا ولی اللہ کے بیٹے تھے۔ مرزا پورہ کے علاقہ میں دینی تعلیم کا فروغ آپ ہی کی ذات بابرکات اور مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا۔ آپ نے دیوبند میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے مشکوٰۃ علم سے اکتساب نور کیا تھا۔ عربی کی ابتدائی اپنے بھائی مولانا عبدالغفور بنارسی (م ۱۳۲۲) سے حاصل کی۔ ۱۸۹۰ء میں دیوبندی مولانا بن کر آئے تو والد کے مطب میں طبابت کرنے لگے اور تبلیغ و تعلیم کا سلسلہ خود اپنے گھر پر قائم کیا آپ کا یہ حسن عمل محلہ والوں کے لیے حسن عقیدت میں ڈھل گیا، اور ان کی تجویز پر ایک دینی مدرسہ کی تاسیس عمل میں آئی اور استاد سے حسن عقیدت کی بنا پر "محمود المدارس" نام دیا اور خود صدر المدرسین بن گئے۔ طلبہ کا رجوع بڑھتا گیا اور آپ کی شہرت بڑھتی گئی اور مدرسہ کی عمارت بلند ہوتی گئی اور اطراف و اکناف کے طالبانِ علم کشاں کشاں مدرسہ میں تحصیل علم کے لیے آنے لگے۔ عیدگاہ کے امام تھے۔ ایک اردو کتاب "ہمارا عقیدہ" یادگار چھوڑی ہے اور سینکڑوں ارشد تلامذہ جو علم و فضیلت کے مرتبوں کو پہنچے۔

مولانا عبدالغفور بنارسی (۱۲۱۰ - ۱۳۲۲)

مولانا ولی اللہ کے دوسرے بڑے صاحبزادے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (م ۱۲۶۴-۱۳۰۴) کے ارشد تلامذہ میں سے تھے آپ جید عالم اور حاذق حکیم تھے۔ کچھا عیدگاہ بنارس کے تاحیات امام عیدین رہے۔ مولانا عبدالغفور نے [illegible] سال کی طویل عمر پائی۔

ان کے خاندان میں ابھی تک علم و دانش کا چراغ روشن ہے۔ مولانا ولی اللہ کے پرپوتے مولانا حسین احمد بنارسی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔

مولانا محمد فیض القدیر بنارسی (۱۳۲۶-۱۴۰۳)

مولانا احمد اللہ کے لڑکے اور مولانا ولی اللہ کے پوتے تھے۔ علم و فضیلت میں خاندانی روایات کے امین اور حامل تھے، استاد القراء قاری حمید الدین سنبھلی استاذ شعبہ قرأت محمود المدارس سے قرأت حفص کی تکمیل کر کے سندِ فراغ حاصل کی۔ مادرِ علمی محمود المدارس میں جسے آپ کے جدِ امجد نے قائم کیا تھا تاحیات تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

مولانا الحاج عبدالجبار بنارسی (۱۳۲۲ - ۱۳۸۶)

آپ کا خاندان دینداری اور تمول میں بڑی شہرت رکھتا تھا، آپ کے دادا حاجی حافظ عبدالغفار نہایت متقی، پرہیزگار اور صاف ذہن انسان تھے۔ محلہ کے بڑے تاجروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اپنی خوش معاملگی اور صدقت کی بنا پر وہ "التاجر الصدوق" کے صحیح مصداق تھے۔ مولانا عبدالجبار نے مجمود المدارس میں استاذ القرار مولانا قاری حمیدالدین سنبھلی سے تجوید کے بعد قرأت حفص کی تکمیل کی اور سند فراغ حاصل کی۔ پھر دیوبند سے تحصیل تعلیم کرکے درس و تدریس اور سیاست میں سرگرم رہے چھبیس[۲۶] سال تک جمعیۃ العلماء بنارس کے صدر رہے اور تیئس[۲۳] سال تک جامعہ اسلامیہ کے ناظم اعلیٰ رہے۔ مولانا کثیر العیال تھے انیس[۱۹] اولاد تھی جن میں چھ لڑکیاں اور تیرہ صاحبزادے تھے، جن میں دو صاحبزادے حافظ قرآن ہیں اور دو صاحبزادے اور ایک پوتا فاضل دیوبند ہیں بنارس کے مشہور ادارہ **جامعہ اسلامیہ** اور اس سے متعلق تمام ذیلی اداروں کو اس خاندان کی سرپرستی حاصل ہے۔ قومی و دینی امور میں مولانا عبدالجبار کی اولاد پیش پیش رہتی ہے۔

مولانا حکیم عبدالحمید بنارسی (۱۹۰۹-۱۹۶۹)

الحاج مولانا حافظ قاری حکیم عبدالحمید بن مولانا حافظ قاری حکیم محمد عمر بن حافظ جمن بنارسی کو مظہر العلوم سے دستار فضیلت عطا ہوئی۔ مولانا مرحوم کی نرینہ اولاد میں بھی قاری اور حافظ ہیں، قاری حافظ حکیم محمد حنیف، حافظ محمد رفیق اور حافظ انیس احمد۔

مولانا عبدالمجید مکی بنارسی (۱۳۲۶ - ۱۴۰۶ھ)

سردار یاب سند کے خاندان سے تھے۔ آپ کے والد حکیم حافظ عبدالمجید بنارسی (۱۲۷۸-۱۳۵۶ھ) جید عالم، طبیب حاذق تھے۔ مظہر العلوم بنارس کی تعلیم کے دوران میں ۱۳۴۱ھ میں الٰہ آباد کے عربی فارسی بورڈ سے منشی کا اور ۱۳۴۲ھ میں مولوی کا امتحان پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے "مدرسہ نظامیہ" فرنگی محل لکھنؤ کے ساتھ ہی ساتھ تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے طب کی بھی سند حاصل کی۔ مزید علوم کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہوا تو سہارنپور گئے اور اکابر شیوخ سے استفادہ کیا۔ پھر اپنے وطن ہی سے وابستہ رہ کر تقریباً ۳۵ سال کی طویل مدت تک تدریسی خدمات انجام دیں اور ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ آپ کی ذات بابرکات علماء کا مرجع تھی فقہی جزئیات، مسائل دینی اور دیگر دینی ضروریات کے لئے آپ سے رجوع کرتے تھے آپ کی فقہی بصیرت سے ایک عالم استفادہ کرتا

تھا۔ لاریب آپ ایک عالم باعمل اور مستند فقیہ و مفتی تھے۔ قلمی یادگاروں میں "جمال نبوی" چالیس مقبول دعائیں دو رسالے ہیں۔ آپ سلف صالحین کے بہترین نمونے تھے۔

مولانا حافظ نعمت اللہ بنارسی (المتوفی ۱۳۶۹) بن حافظ ولی محمد بنارسی نے مطلع العلوم بنارس سے ۱۳۳۴ھ میں فراغت کی سند لی، ادبار و عسرت میں زندگی گذاری آبائی پیشہ دستکاری تھا، نماز جنازہ میں شرکت کی پابندی کرتے تھے، فرض کفایہ اور حقوق العباد کا پاس رکھتے تھے۔

مولانا عبد الحی بنارسی (۱۳۱۷-۱۳۸۲)

مولانا عبد الجبار کے بڑے بھائی تھے۔ 'محمود المدارس' بنارس سے تحصیل علم کے بعد دار العلوم دیوبند گئے، جلالین، مشکوٰۃ شریف، میبذی، ملا حسن اور مختصر المعانی کتابوں کا درس لے کر واپس آگئے، ذکی الطبع، ذہین و فطین اور باصلاحیت انسان تھے لیکن خلل دماغ اختلال درس و تدریس کا باعث بن گیا، آپ مولانا احمد اللہ بنارسی کے داماد تھے۔

مولانا عبد القیوم بنارسی (۱۳۴۶-۱۴۰۳)

آپ کے دادا مولانا حافظ محمد اکرام بڑے ذہین و ذکی، ستعد و عابد تھے شاہی مسجد گیان باپی کے خطیب و امام تھے، اسی طرح آپ بھی مسجد کمال شاہ کے خطیب جمعہ اور عیدین تھے آپ کی تقریر ہمیشہ اصلاحی ہوتی تھی، اختلافی مسائل چھیڑنے سے محترز رہتے آپ کا مقولہ تھا "پہلے مسلمان بنو" عمل بالحدیث کی ترغیب دیتے تھے۔ اصلاحی تحریک کے سلسلے میں مالیگاؤں، بمبئی، دیناجپور، پورنیہ اور مشرقی پاکستان کے دورے کئے، دینی اصلاحی موضوعات پر آپ کے کئی مضامین ترجمان دہلی، الاسلام دہلی اور اہلحدیث دہلی میں شائع ہوئے۔ مرحوم کے ایک صاحبزادے بلال احمد کی نئی سڑک پر کپڑے کی دکان تھی۔

مولانا نیاز احمد بنارسی (۱۹۲۶-۱۹۸۴)

آپ کا آبائی پیشہ دستکاری تھا جس کی وجہ سے تدریسی خدمت کا موقع نہ ملا، مگر آپ جامع علوم تھے، حافظ قاری مولانا نیاز احمد کے والد قاری محمد احسن بنارسی بھی جامع صفات تھے۔ مولانا نیاز عربی زبان میں قادر الکلام تھے تبلیغ و تقریر کے ذریعہ دین کی خدمت کرتے رہے۔

مولانا محمد نعیم الدین بنارسی (۱۳۶۰-۱۳۸۳) کمسنی میں علم دوستی کا یہ سوز جزو ذات ہو گیا، جامعہ اسلامیہ مدنپورہ بنارس سے دورۂ حدیث کی تعلیم مکمل کر کے سند فراغت حاصل کی پھر آبائی پیشہ بنارسی ساڑیوں کی تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا۔

مولانا عبد المعید بنارسی (۱۳۲۹-۱۴۰۱ھ)

سردار باب اللہ کے پڑپوتے تھے، مدرسہ رحمانیہ مدنپورہ سے تکمیل حفظ کیا، جملہ علوم وفنون کی تکمیل مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل اور جامعہ مظہر العلوم بنارس سے کی۔ فن حدیث میں اپنے والد بزرگوار مولانا حکیم عبد المجید اور مرعاۃ المصابیح کے مصنف مولانا عبید اللہ مبارکپوری سے اکتساب فیض کیا، فن طب کی تحصیل وتکمیل استاذ الحفاظ حافظ جمن کے بڑے صاحبزادے مولانا حافظ محمد عمر بنارسی (م ۱۳۶۱ھ) سے کی۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیگر جامعات میں مسند تدریس پر جلوہ افروز رہے، درس وتدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف بھی کرتے رہے۔

مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی (۱۳۰۳-۱۳۸۶ھ)

آبائی وطن اعظم گڑھ کا محلہ آصف گنج ہے۔ جامعہ مظہر العلوم بنارس ان کے زمانے میں شیوخ عظام کا مرجع بنا ہوا تھا۔ مولانا امان اللہ بن حاجی عبد الغنی مئوی (م ۱۳۴۹) نے مولانا شاہ عبد المجید بن شاہ مولوی کریم بخش مئوی (م ۱۳۵۹ھ)، مولانا احمد حسین بن عبد الرحیم بن شیخ جمال الدین رسولپوری (م ۱۳۵۹ھ) وغیرہ اس درسگاہ کے اساتذہ تھے۔ مفتی موصوف نے تفسیر حدیث، فقہ اور اصول فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی تکمیل فرمائی اور ۱۹ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔ شاہی مسجد کے اواخر عمر تک خطیب رہے۔ آپ نے پوری زندگی دینی خدمات کی انجام دہی میں گذار دی۔ آپ کے مواعظ حسنہ اور اصلاحی کتابچوں نے بنارس کے اطراف تک اصلاح عقائد، احیاء سنت اور رد بدعات اور جاہلانہ رسوم کے سدباب کے لئے بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ اصلاحی تحریک سے مسلمان مستورات میں برقع کا رواج ہوا، عام طور پر عورتیں بغیر آستین کا بلاؤز نما کرتہ "چھوہا" پہنتی تھیں۔ مسجدیں آباد ہوئیں اور محرم کے ڈھول باجے خاموش ہو گئے۔ اصلاح معاشرت کے ساتھ رفاہ عام پر بھی آپ نے خاص طور سے دھیان دیا۔ محمود پور نئی بستی (مغلسرائے) میں ایک مسجد اور مدرسہ تعمیر کرایا۔ بڑی مسجد رسول پورہ میں مدرسہ چراغ سوم (۱۳۵۰ھ) کا قیام آپ ہی کی سعی جمیلہ کا رہین منت ہے۔ صدقہ جاریہ کے بہت سارے امور سرانجام دیئے، فتویٰ نویسی آپ کا خاص دینی شغل تھا۔ مفتی بنارس کہے جاتے تھے، سو سے زائد تصنیفات آپ کی علمی یادگار ہے۔

مولانا شاہ نعیم الدین حسن بھوپالی (م ۱۳۵۸ھ) سے بیعت تھے اور خود سرچشمہ تصوف وسلوک بن کر تشنگان عرفان ومعرفت کو سیراب کرنے لگے۔ مولانا مفتی عبد السلام

آپ کے صاحبزادے جانشین بنے۔ مولانا محمد اسحاق بنارسی آپ کے خلف اکبر تھے۔

مولانا محمد اسحاق بنارسی (۱۳۲۸-۱۴۰۶ھ)

مولانا محمد اسحاق ابن مولانا محمد ابراہیم بن الحاج منشی لال محمد بن امام الدین بنارسی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا امان اللہ مئوی (م ۱۳۴۲)، مولانا محمد عمر گھوسوی (م ۱۳۹۱)، سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳)، اور محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن مئوی (م ۱۹۹۲ء) کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔ مولانا محمد اسحاق شعلہ بیان مقرر تھے خطابت میں بادہ بیانی تھی جمعیۃ العلماء ہند میں شامل ہو کر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے ساتھ جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔ مولانا کو جمعیۃ سے قلبی وابستگی تھی، عرصہ تک آپ اس کے صدر رہے۔ عملی طور پر علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود آپ نے عمر بھر اس کی سرپرستی فرمائی۔ تجارت کے سلسلے میں بمبئی آتے تو صابو صدیق مسافر خانہ کے پاس عبدالکریم منزل میں آ کر ٹھہرتے اور عربوں کے ساتھ بنارسی کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ یہاں ۱۹۵۰ء سے قاضی اطہر مبارکپوری بھی روزنامہ انقلاب اور ماہنامہ البلاغ سے متعلق ہو گئے تھے دونوں حضرات میں بڑی دوستی تھی۔ مولانا محمد اسحاق بنارسی بڑے کامیاب تاجر تھے۔ تجارت اور دین دونوں سے آپ وابستہ رہ کر خدمت کرتے رہے، "انجمن معارف اسلامیہ" دوسری دینی و تعلیمی تنظیموں کے سرگرم ممبر رہے۔ ریاض العلوم مہلی کے قیام اور اسے دینی و تعلیمی مرکزیت دینے میں مولانا موصوف کا بڑا دخل تھا، حضرت اسعد مدنی، قاضی اطہر مبارکپوری کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں ادارہ ریاض العلوم کا سنگ بنیاد رکھا آپ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ آپ نے "انجمن تعلیمات دین" کے تحت تربیت میں مدارس و مکاتب قائم کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا۔ جامعہ مسبتان کا قیام بھی آپ ہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ جامعہ مظہر العلوم بنارس کے بیس سال تک ناظم اعلیٰ رہے۔ انجمن تحفظ مساجد بنارس کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔ ملک کے مشاہیر علماء کرام جب بنارس آتے تو نیاز خاطر جناب رکھتے تھے، آپ کے یہاں مہمان رہتے تھے۔ مولانا محمد اسحاق بنارسی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کے دو صاحبزادے ہیں مولانا جنید محمد فوزی اور مولانا عبد الوہاب بزمی۔

آپ کے ایک ہمنام مولانا محمد اسحاق بنارسی (۱۳۰۳ - ۱۳۸۸ھ) بن عبدالعزیز بھی بڑے مشہور عالم دین تھے، تصنیف و تالیف کا بھی ذوق تھا، بڑے پُر اثر واعظ تھے۔ مرحوم کے صاحبزادوں میں سے دو عالم ہیں۔ ایک مولانا نصیر الدین "چراغ علوم" کے شیخ الحدیث

ہیں، دوسرے مولانا محمد نعیم الدین تھے۔

مولانا محمد اسماعیل بنارسی ابن حکیم باب اللہ (م ۱۲۹۴) صاحب تصنیف تھے۔ آپ صاحب کرامات باکمال بزرگ تھے۔ مولوی خلیل الرحمٰن ناظم مدرسہ مظہر العلوم بنارس کے دادا بزرگوار تھے نہایت جید عالم تھے فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ان کا رسالہ درۃ النظام ان کے علم و فضل کا بین ثبوت ہے۔

مولانا حکیم محمد حسین الہی (۱۳۱۳-۱۳۶۹) بن حکیم رحمت اللہ بنارسی اچھے حکیم تھے۔ آپ کے والد اہل علم اور دنیا تجارت تاجر تھے۔ حکیم محمد حسین الہیٰ نے الہ آباد یونیورسٹی سے منشی کامل، ملا فاضل، فاضل طب، فاضل ادب اور فاضل انگلش کے امتحانات پاس کئے۔ علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ دین کی ترویج و تبلیغ میں بڑی سرگرمی دکھلاتے تھے۔ ان کا ایک بڑا اچھا کتب خانہ آج بھی موجود ہے۔ مولانا مرحوم کے صاحبزادگان میں محمد منظور الحق، محمود الحق اور منصور الحق بقید حیات ہیں۔

مولانا حکیم محمد عمر بنارسی (م ۱۳۹۰) کے والد حافظ عبدالمجید حقی بنارسی (م ۱۳۲۷ھ) بنارس کے استاذ الحفاظ تھے۔ تطبیق تمہید شہر بنارس میں یک مدرسہ 'حافظ جی' کے نام سے قائم ہے۔ یہ پورا خانوادہ حافظ قرآن ہے۔ دہلی سے طب کی سند لے کر بنارس لوٹے تو جامعہ مظہر العلوم میں طلبہ کو حفظ کی تربیت دینے لگے ان گنت حفاظ نے آپ سے حفظ کیا۔

مولانا محمد عمر منطقی (۱۳۰۲-۱۳۸۷ھ) بن شیخ چھوٹک بن مراد علی عرف مرادن سردار بنارسی کو علم منطق سے بہت زیادہ شغف تھا، تحصیل علم سے فراغ پڑھ کر یک عرصے تک جامعہ مظہر العلوم بنارس میں مسند درس و تدریس پر جلوہ افروز رہے۔ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے، عربی کے ساتھ انگریزی میں بھی اچھی استعداد رکھتے تھے۔ بڑے عابد و زاہد اور متقی عالم تھے۔

مولانا حکیم حفیظ اللہ بنارسی (۱۲۷۰-۱۳۷۷ھ)

عربی علوم اور علم طب کی تحصیل سے فراغت کے بعد اپنے مطالعہ کی مدد سے عربی و فارسی علوم میں ایسا تجربہ پیدا کیا کہ ان زبانوں کے جید عالم بن گئے اور علم طب و حکمت میں بھی ایسی حذاقت کے حامل ہوئے کہ گنے چنے چوٹی کے اطبا و حکماء بنارس میں شمار کئے جاتے تھے۔ آپ کی حذاقت اور مسیحائی کا شہرہ اطراف و اکناف کے اضلاع تک پھیلا ہوا تھا، آپ کے تینوں

صاحبزادگان بھی سنتِ پدری پر چل کر حکیم بنے، مولانا حکیم شرف الدین، مولانا حکیم محمد یوسف اور محمد احسن۔

حکیم مولانا محمد یوسف قاسمی (۱۳۱۹-۱۳۹۶ھ)

اساتذہ کے قاسمی ہونے کی وجہ سے آپ اپنے کو قاسمی لکھتے تھے۔ حکیم صاحب کی عظیم المرتبت شخصیت ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ہے جو ہر صنعت میں تفرد رکھتی ہیں۔ سیاست کے میدان کے یکہ تاز شہسوار تھے، جمعیۃ علماء ہند سے وابستگی کے ساتھ کانگریس کی تحریکات میں جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ عرصہ تک جمعیۃ علماء بنارس کے صدر اور سرپرست رہے۔ آپ بہت بڑا کتب خانہ رکھتے تھے، علمی ذوق بڑا پاکیزہ تھا، نادر و نایاب کتابوں کے دلدادہ تھے۔ آپ کا کتب خانہ گنجینۂ علوم تھا، کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ علوم قرآن اور حدیث پر گہری نظر تھی، علم سیاست، تاریخ اور ادب کی بصیرت رکھتے تھے۔

مولانا عبدالمجید حریری (۱۳۰۲-۱۳۹۰ھ)

ان کا خاندان بنارس میں عہد قدیم سے مرچڑہ میں آباد تھا۔ عنفوان عمر میں دستگاہ حاصل تھی، وکالت کی اعلیٰ ڈگری بنارس ہندو یونیورسٹی سے حاصل کی تھی، علاوہ ازیں علوم شرعیہ کا مطالعہ، عربی وفارسی پر بڑا عبور حاصل تھا، اردو زبان کی طرف بڑھتے گئے، منفرد اسلوب نگارش نے آپ کو انشاء پرداز بنا دیا تھا اور قلمکاری و وطن کی محبت نے تحریک آزادی کا علمبردار بنا دیا تھا۔ صاحب تصنیف تھے آپ کے کئی خطبات صدارت اپنے اسلوب، زبان اور فصاحت و بلاغت کے سبب علم و ادب کا گرانقدر سرمایہ تسلیم کئے جاتے ہیں، ان میں مومن کانفرنس کلکتہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۹ء کے مومن کانفرنس گورکھپور کے خطبات اپنے مرتبوں کے اعتبار سے مومن تحریک کی تاریخ کے زریں عنوان بن گئے ہیں۔ آپ کی تقریر و تحریر کا موازنہ مولانا محمد حسین آزاد اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی طرز نگارش سے کیا جاتا ہے۔ مولانا موصوف یادگار زمانہ لوگوں میں سے تھے، ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی۔ بیرون ملک کے علماء و فضلاء سے بے تکلف الملاقات رکھتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالعزیز میمنی، رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے علمائے وقت آپ کے مداح اور مہمانوں میں سے تھے۔ علمائے عصر میں محمد بن یوسف سورتی، مولانا عبیداللہ سندھی اور زریں عرب دوست محمود فرازی آپ کے حلقۂ دوستاں میں شامل تھے۔ ڈاکٹر اسکالمی نے آپ کو ہفت

زبان" کا خطاب عطا کیا تھا، انگریزی، عربی، روسی، ترکی، اردو فارسی میں روانی سے گفتگو کرتے تھے۔

حکومتِ ہند نے ۱۹۴۹ء میں بطورِ سفیر آپ کو جدہ بھیجا، سبکدوش ہو کر شاہ سعود بن عبدالعزیز کے حکم سے سرکاری کتب خانہ ریاض کی تنظیم و ترتیب کے کاموں کو خوش اسلوبی سے انجام دیا اور جب تکمیل فرائض کے بعد شاہ سعود نے تہنیتی جلسہ منعقد کرایا جس میں ملک کے اہلِ علم و فضل حاضر تھے، مولانا کی تقریر اور اندازِ گل افشانی گفتار سن کر سامعین "مرحبا مرحبا احسنت" کے پھول نچھاور کرتے رہے۔ قیامِ حجاز کے دوران آپ کی علمی فضیلت اور زباندانی سے جو اکابر ہستیاں بے حد متاثر ہوئیں ان میں شیخ ابن الحسینی مفتی اعظم فلسطین، شیخ الازہر احمد، مومن اشنذوی، استاذ جامعہ ازہر شیخ علی مصطفیٰ اور شاہ فیصل مرحوم کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔

مولانا مرحوم کی سعادت مند اولاد میں ڈاکٹر ابوالعباس عصری علوم میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔

علماء بنارس کی طویل فہرست میں ایسے بہت سارے نام ملتے ہیں جن کے ذکر کے لئے بڑا سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے۔

مولانا امام الدین رام نگری بنارسی (۱۸۸۶ - ۱۹۸۲) کا ذکر باب کارگہِ شعر و سخن و علم و عمل میں آ رہا ہے، مولانا منت اللہ بنارسی (م ۱۳۵۴) مولانا حکیم جلال الدین بنارسی (۱۲۲۶ - ۱۲۹۳) مولانا حیات محمد بن فقیر محمد بنارسی (۱۲۰۹ - ۱۲۴۱) مولانا خلیل احمد مظہری بنارسی (م ۱۳۶۵ھ) مولانا حکیم شرف الدین (م ۱۳۵۳) بن حفیظ اللہ، مولانا مفتی عبدالصمد بنارسی (م ۱۳۲۰)، مولانا حکیم عبدالعلی بنارسی (۱۳۲۱ - ۱۳۸۸ھ)، مولانا حکیم عبدالصمد حاذق بنارسی (۱۳۰۰ - ۱۳۹۴) مولانا عبدالمتین بنارسی (۱۸۹۸ - ۱۹۶۳)، مولانا عظیم اللہ بنارسی (م ۱۳۴۶)، مولانا محمد رمضان بنارسی (۱۲۹۴ - ۱۳۸۶)[1]

دیگر اضلاع کے علمائے کرام

مولانا عبدالوحید: سنبھل ضلع مراد آباد کے انصاریوں میں مولانا عبدالوحید کی حیثیت بیحد

---

[1] تذکرہ علماء بنارس ص ۱۸۹ - ۱۹۶

ممتاز ہے، مظاہر علوم سہارنپور میں درس دیتے تھے آپ کے تلامذہ میں بڑے بڑے اکابر و اعاظم علماء کے نام ملتے ہیں جن کے درس و افادہ کے چراغوں سے ایک پوری صدی روشن ہو گئی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا جو تبلیغی جماعت کے ستون اور سربراہ تھے، مولانا محمد ادریس کاندھلوی مصنف خطبات اسلامی، التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ، و صدر مدرس مدرسہ اشرفیہ لاہور (پاکستان)، مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی مصنف الطیب الشذی اور مدرس عالیہ مدرسہ فتحپوری دہلی مرحوم، حضرت مولانا شاہ عبدالرحمٰن کامل پوری سابق صدر مدرس مظاہر علوم سہارنپور اور مولانا عبدالرحیم لکھنوی جیسے ارباب علم و فضل و عمل نے آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا، مولوی رضوان الرحمٰن سندیلوی مفتی اندور بھی آپ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

مولانا عبدالوحید کے انتقال (۱۳۵۵ھ) کے بعد مولانا محمد حیات سنبھلی شیخ الحدیث مدرسہ حیات العلوم جس کی تاسیس آپ ہی کی رہین منت ہے، آپ کے جانشین بنے یہ مولانا عبدالوحید کے برادر نسبتی تھے۔ دارالعلوم مئو میں بھی چراکا بر اساتذہ آپ کے حلقہ تلمذ میں شامل تھے ان میں سب سے زیادہ ممتاز مولانا قادری ریاست علی بحرآبادی تھے۔

علامہ عبدالرحیم گورکھپوری ایک مؤرخ تھے جن کو انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگردوں میں سے تھے جنہوں نے انگریزی زبان کی تحصیل و تعلیم پر قدغن لگایا تھا ملا صاحب جن کے خیالات ملحدانہ تھے بھلا ایسے فتوی کو کیا خاطر میں لاتے متبحر عالم اور ادیب کامل تھے شہزادہ غلام محمد پسر سلطان ٹیپو کی فرمائش پر کارنامۂ حیدری (مطبوعہ ۱۸۴۸ء کلکتہ) لکھی جو سلطنت خداداد کے حکمرانوں کی بے نظیر تاریخ ہے۔ گورکھپور کے باشندہ برادری کے علمی حیثیت سے مایۂ ناز فرزند تھے۔ [1]

حافظ محمد فضل لکھنوی بڑے خوش الحان قاری تھے کبھی کبھی عین حالت قرأت میں حافظ صاحب پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وجد میں آکر بے حال ہو جاتے ان کی قرأت کی صدا غیب سے آتی سنائی دیتی گویا نوائے سروش تھی، ہزاروں ختم قرآن کا کرنا آپ سے ثابت ہے۔ تین سو ختم تو صرف تراویح کے شمار میں آتے تھے بلکہ اس کے مضاعف کیونکہ جو تراویح میں پڑھا ہر روز دن میں اس کا دورہ کرتے، لکھنؤ کے محلہ قدوۃ العارفین کے تکیہ کی مسجد میں رمضان مبارک

---

[1] دستکاران اہل شرف، تذکرہ مسلم جین ص۲۶۔

تیئیسواں باب

کارگہِ شعر و سخن و علم و ادب

دیارِ پورب کے انصاری شعرائے کرام

شاعری کے محاسن و مناقب کی تحسین شارع علیہ السلام سے ثابت ہے گو آپ کے مزاجِ اقدس کو شاعری کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی جیسا کہ قرآن پاک میں آتا ہے وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ("ہم نے اس کو شعر نہیں سکھایا یہ اس کے شایان شان ہے" یٰسین: ۶۹)۔ حضور صلعم نے کئی معاصر شعرا کا کلام سنا ہے۔ آپؐ نے اچھے اشعار پر تحسین کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صحابی رضؓ نے سو کے قریب علی التواتر اشعار سنائے اور آپؐ فرماتے گئے "هيه" (اور سناؤ)۔ آپؐ کے اصحاب کرام میں کئی معروف شعرا گذرے ہیں جن میں حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ اور رواحہ انصاریؓ کے اسمار گرامی خاص ہیں۔ کفار و مشرکین کے بعض شاعر جو آنحضرتؐ اور دینِ اسلام کے خلاف ہجو و بہتان کا زہر اگلتے تھے اسی کا جواب دینے کے لئے حضورؐ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ جو خود ایک خوش الحان قاری تھے فرمایا کرتے تھے: "اپنے بچوں کو تیراکی، تیر اندازی اور شہسواری سکھاؤ اور انہیں اچھے اشعار بھی سناؤ۔" ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جن سے بارہ سو کے قریب احادیث مروی ہیں بڑا اعلیٰ شعری ذوق رکھتی تھیں، فرماتی تھیں، اپنی اولاد کو شعر سناؤ اس سے زبان میں مٹھاس آئے گی"

قرآن حکیم میں شاعروں کے بارے میں آیا ہے" اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں" سورۃ الشعراء: ۲۲۴-۲۲۵) —— لیکن ظہور اسلام کے بعد عربی شاعری میں مقصدیت اور روحانی افادیت کے عناصر پیدا ہونے لگے یعنی توحید اور ایمان کے پاکیزہ جذبات کے بلیغ اشارے ملنے لگے۔

فارسی شاعری نے عجم میں آنکھیں کھولیں عجمی روایات کے گہوارے میں اور ثقافتی اقدار کی آغوش میں پرورش پائی، عربی شاعری نے فارسی ناظورۂ سخن کو نعمتِ غزل عطا کی جس کی مشاطگی چابکدست ہاتھوں نے کی اس کی الھڑ آنکھوں میں تشبیہوں کا کاجل لگایا اور رخساروں کو استعاروں کے غازے سے دمکایا، ایمائیت اور رمزیت کی ادائیں اور اشارے سکھائے، لاکھوں بناؤ پیدا کیے گویا کہ "بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست" سعدی، شیرازی نے اس کا عہدِ قریب شباب دیکھا اور حافظ شیرازی نے اس کے وصل کا خواب دیکھا۔

— اسی فارسی کا عکسِ جمیل اردو میں بھی نظر آتا ہے سلاطین دہلی کے ایوان علم وادب میں یہ فارسی کی ہمنشین تھی جہاں ہمنشینی نے اردو کا بھی رنگ وروپ نکھار دیا، امیر خسرو کی ہندی (ہندوی) کے کچے راستے پر اردو کی شاعری فارسی کی آمیختہ لسانی بیساکھی لے کر چلی۔ دکھنی اور ریختہ کی منزلوں سے آگے بڑھی، مغلوں کے زوال پذیر عہد میں اردو شاعری کو عروج ہوا، اور اردو غزل "حجلۂ عروسِ سخن" میں بننے سنورنے لگی، بڑے بلند پایے کے شعرا پیدا ہوئے اگلے زمانے میں یک میر تھے، لوگ معتقدِ میر بن گئے، یاروں نے بہت زور غزل میں مارا، نہ [illegible] نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔ ایک غالب پیدا ہوئے بڑے بڑے سخنوروں نے اعتراف کمال کیا کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور پھر دوسرے سخن فہم آئے جو غالب کے طرفدار نہ تھے انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں قافیے بوئے اور ردیف کاٹے؛ مضامینِ نو کے خرمن کی خبر خوشہ چینوں کو ہوئی — تو زمین پامال ہو گئی، گل و بلبل [illegible] کے قصے ختم ہو گئے، فراقِ یار میں طولانی شبِ ہجراں کے شکووں کے بل [illegible] غم جاناں کے ساتھ اب غم دوراں اور ستم ہائے روزگار کے شکوے [illegible] لگے۔

ترقی پسند تحریک نے متبذلات، فرسودہ روایات اور عشق و محبت کی داستانوں [illegible] کر دیا، [illegible] میں نئی آوازیں گونجنے لگیں، شاعری میں مقصدیت [illegible] اور نئی علامات جلوہ پذیر ہونے لگیں، انسانی رشتوں کی پہچان، [illegible] ادبی رجحانات نے ترقی پسند [illegible]

کے لیے ایک نئی آواز، ایک نئی پرواز اور ایک نیا اُسلوب عطا کیا، تہذیب یافتہ شعورِ حیات، حقیقت پسندی اور طبقاتی کشمکش کا ادراک ایک فنکارانہ اظہار بن گیا ــــ لیکن یہ صرف ایک خاص نظامِ زندگی تک محدود تھا اور اس کی حد یہاں دنیا تک تھی اور تحدیث مادہ پرستی تک، روحانی اقداریت اور دینی جذبات سے کھوکھلی شاعری بے روح اور بے جان ثابت ہوئی۔ آزادی ملی تو سکہ بند ترقی پسندی کو دھچکا لگا، خرونیت اور قنوطیت نے لہجہ تبدیل کر دیا، شب گزیدہ سحر کی باتیں صبح و شام ہونے لگیں، دار و رسن کے تذکرے عام ہو گئے، زبانوں پر مہر لگ گئی تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی گئیں، غزلوں اور نظموں سے زنجیر و سلاسل کی جھنکار سنائی دینے لگی ــــ اور اب اس نظامِ زندگی کا خواب جو معاشیات اور مادیت کے تانے بانے سے بُنا گیا تھا اس طرح ٹوٹ گیا ہے جیسا کہ شرک کرنے والوں کے بارے میں آیا ہے۔

"جن لوگوں نے خدا کے سوا اوروں کو کارساز بنا رکھا ہے ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک طرح کا گھر بناتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ تمام گھروں سے کمزور مکڑی کا گھر ہے کاش یہ اس بات کو جانتے۔" (العنکبوت ۴۱)

ترقی پسند شاعری جو اشتراکیت کی مصنوعی آلۂ تنفس کے ذریعے سانس لے رہی تھی جانکنی کے عالم میں ہے۔ اب ایک عرصے سے جدیدیت کا ادبی رجحان اور ذہنی مشروطیت کا دور شروع ہو گیا ہے، جدید نظم کے دورِ انتشار میں پورا لسانی ڈھانچہ اور علامت و تمثیل کی زبان بدل گئی ... یہ ترقی پسند شاعری کا ردِ عمل تھا۔ جدیدیت کی تحریک نے ذہنی آزادی، خیال اور پابندیوں سے مکمل بے نیازی تو بخشی مگر منفی آگہی اور نا امیدیوں کے شعور اور مغربی مرعوبیت کے دباؤ نے شاعر کے احساسات اور ادراک میں اضطراب پیدا کر دیا ہے اور وہ اپنی ذات کی خلا میں ایک کربناک تنہائی محسوس کرنے لگا ہے ــــ اور آج کل کے دہشت ناک ماحول میں ہمارا شاعر اور ادیب سماجی و ذہنی نا مساوات، بے روزگاری اور نا امیدی کے زہرناک تجربات سے دوچار ہے، جدیدیت کی جھنجھلاہٹ اسی طرزِ فکر کا داعیہ ہے۔

اردو ادب میں حیاتِ دین نے ایک تازہ روح پھونکی ہے، حالی اور اقبال کے اسلامی افکار نے بھی ذہنوں میں نشیمن بنا لیا ہے، یہ اسلامی ادب ہے جس کا آج

ہمسایہ ملک ایران میں شعر اعتصاب نے ڈالا تھا اور پڑوسی ملک کے مذہبی جذبات سے سرشار اور اسلامی تاریخ کے واقف کار دانشوروں نے اپنی زبان اور اپنے دینی ماحول میں پروان چڑھایا۔ یہ ادب مذہبی مقصدیت اور ادعائیت کا حامل ہے اور روحانی افادیت کا سرچشمہ۔ یہ ان جذبات کا ترجمان ہے جو شاعر اپنی ذات کے آئینے میں تجلیاتِ ربانی کو منعکس دیکھتا ہے۔ جدید تصوف کا یہ وہ سلسلہ ہے جس میں نہ پیرانِ طریقت کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ تصورِ شیخ کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے۔

> "خدا وہ ذات ہے جس سے انسان کو شرف اور شعور ملتا ہے۔ زندگی کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس مہلت میں انسان خدا سے اپنا تعلق قائم کرلے۔ تلاشِ حق میں انسان کی ساری صلاحیتیں حدِ کمال تک پہنچ جاتی ہیں اور روح انتہائی بلندیوں کو چھو لیتی ہے جہاں کمال اور بلندی دونوں جمع ہو جائیں وہاں تاریخ انسان کی تہ میں چھپی ہوئی شاعری ایک ایسے احساس میں بدل جاتی ہے جو صرف خدائے عزّ وجل اور بزرگ و برتر کے حضور پیدا ہوتا ہے" [1]

اس اسلامی ادب کے نمائندے اور مذہبی شاعری کے ترجمان ظاہری اور باطنی اوصاف سے متصف اور دینی کردار کے حامل ہوتے ہیں جو قول و فعل میں یکساں مذہبی رویہ رکھتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ کسی قسم کے فلسفۂ تصوف سے متاثر ہیں یا روحانیت کے ماورائی تصورات، نظریات یا تعلقات کے زیر اثر شعر کہتے ہیں غلط ہوگا۔ یہ صرف 'شرحِ صدر' کا نتیجہ ہے، اس شاعری میں فنکار کی طرزِ حیات ہی نہیں طرزِ عبادت کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

کوئی ادب اور نہ کوئی فن جامد رہتا ہے بلکہ اس میں معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی بہاؤ ہوتا ہے ٹھہراؤ نہیں، کبھی یہ سیلاب بن کر آتا ہے اور کبھی پُرسکون لہریں بن کر ذہن کے ساحل سے ٹکراتا رہتا ہے۔ اردو ادب ان محرکات اور عوامل اور فکری رجحانات کی فعالیت سے مستثنیٰ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے اور جب تک یہ وقت کے شانوں پر پریشان رہیگی، شاعر کو تہجد گزار اور عابدِ شب زندہ دار کی ع

---

[1] آوازِ دوست، مختار مسعود ص ۱۹۹

نیند نہیں آئیگی۔ یہی اردو کی بقا کی ضمانت ہے۔

ادبی انجمنیں اور شعراء کرام

زندہ دل، یار باش اور مجلسی ارباب ذوق خود اپنی ذات سے ایک انجمن سے کم نہیں رہتے، ایک ہنگامے پر موقوف زندگی رہتی ہے۔ بعض ایسی چہکتی ہوئی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں کہ باتوں میں گلوں کی خوشبو رچی بسی رہتی ہے، بعض آشفتہ سر بھی ہوتے ہیں اور دل شکستگان، جو جراحتِ دل کے لئے مرہم کی جستجو میں رہتے ہیں، یاروں کی محفل اور دوستوں کی صحبت میں غم دل سنا کر جی ہلکا کر لیتے ہیں۔ ہمارے بعض شاعروں کی یہ کیفیت ہوتی ہے جو غالب نے بیان کی ہے ؎

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجئے ۔۔۔ کبھی حکایتِ صبر گریز پا کہیئے

ادبی انجمنیں اسی مقصد کے تحت تشکیل پاتی ہیں، ہر فنکار اپنی تخلیق کے بعد اس کے اظہار کے لئے اضطراری کیفیت اور دور سے گذرنے لگتا ہے تاکہ اس کے شہکار کا فنی منصب تسلیم کر لیا جائے، یہی اس کے حوصلوں کو بڑھاوا دیتا ہے، اس ادعا میں شاعر سب سے زیادہ مضطرب رہتا ہے، اظہار تمنا کے لئے وہ کسی سخن فہم یا اپنے ہی جیسے شاعر کی تلاش کرتا ہے "تاکہ میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے"۔

دو شاعر اسی اضطراری کیفیت سے گذر رہے تھے کہ دونوں کی مڈبھیڑ ہو گئی، سنی ہوا کہ ایک دوسرے کو اپنا تازہ کلام سنائیںگے اور تحسینِ باہمی کی لذت اٹھائیں گے۔ پہلے شاعر نے ابتدا لے غزل سرائی کی، مطلع سے لے کر مقطع تک راستہ بھر اپنا کلام سنایا ۔۔۔ اور پھر بھاگ نکلا، دوسرا شاعر اس کے تعاقب میں دوڑا، راہ گیروں نے سمجھا کوئی گرہ کٹ ہے اور پوچھا میاں یہ کیا تماشہ ہے، محروم و بدنصیب شاعر نے روہانسا ہو کر کہا "بھئی میں نے اس ہزل گو کا پورا کلام سنا، مرتا کیا نہ کرتا، جب میری باری آئی تو یہ بدنصیب بھاگ نکلا۔

ایسا ہی ایک دوسرا واقعہ گذرا ہے، ایک شاعر اپنی غزل سناتے سناتے گڑھے میں گر پڑا، سننے والا بھی شاعر تھا، بھاگ نکلا، گڑھے میں سے خاک بسر شاعر نے بڑی خاکساری سے عرض کیا "ارے بھائی مقطع تو سنتے جاؤ! عرض کیا ہے۔

مگر وہاں ایک خامشی ترے سب کے جواب میں۔

مقطع میں ایک سخن گسترانہ بات پیدا ہوگئی ہے مگر یہ بات ایک بڑے صاحب ذوق شاعر کی ہے جرات ایک مشاعرے میں پٹ کر آئے تھے اور سرپٹیوں سے بندھا ہوا تھا۔ یاروں نے پوچھا" ارے کیا رات مشاعرے میں پٹ گئے"، مہذب شاعر نے جواب دیا" جی نہیں کل رات مشاعرے میں ایک دوسرے شاعر سے میرا خیال لڑ گیا تھا۔

دیار پورب کے سخنوران

ہم نے ہندوستان ہی میں نہیں ایران میں بھی شاعروں کو کلام سنانے کے لئے ہمیشہ بے چین پایا ہے، برادری کا تعلق چونکہ اردو زبان و ادب سے بڑا گہرا رہا ہے اسی لئے شاید ہی کوئی بستی شاعروں سے محفوظ ہو۔ ہم ان انصاری شعراء کا ایک سرسری جائزہ لے رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی شناخت مشتبہ ہے۔

دیار پورب میں تو دہلی اور لکھنؤ کے دبستان ہائے شاعری تو ہماری تاریخ ادب کے دو اہم باب ہیں۔ شاعروں کا ایک دفتر مسلسل وجود میں آیا ہے۔ مبارک پور، مئو، جونپور، عظیم آباد، الٰہ آباد، میرٹھ، آگرہ، بنارس، دہلی اور لکھنؤ کی ادبی فضاؤں میں ہزاروں شاعروں کے کلام گونج رہے ہیں۔ خمخانۂ جاوید، سلک گہر، نمود سحر وغیرہ میں ممتاز شعراء کے احوال و کوائف دستیاب ہیں۔

مبارک پور

مبارک پور میں علماء و فضلاء کے ساتھ شعراء اور ادباء کا بھی بڑا جمگھٹا رہا ہے، مولانا محمد عثمان ساحر اور قمر الزماں مبارک پوری، مولوی نور محمد بن شیخ جمن، منشی حبیب اللہ حبیب، حافظ نظام الدین رضا، عبداللہ شفا، عبدالکریم عاشق کے اسماء گرامی خاص ہیں۔

شاعری کے دوسرے دور کے (۱۹۲۵ تا ۱۹۳۶) ممتاز ترین شعراء میں قاضی اطہر مبارک پوری، بسمل مبارک پوری، محمد حنیف رہبر، ظفر ادیبی، فقیر اللہ اسعد ۱۹۱۱، ابوالطیب مبارک پوری ہیں۔ چند شعراء کے کلام کا انتخاب "صد رنگ" کے

نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے، نمودِ سحر بھی ایک ایسا ہی مجموعۂ کلام ہے مبارک پور جس میں تین استاد شعراء کی بڑی دھوم تھی اور مشاعروں میں جن کو بڑی اہمیت حاصل تھی وہ تھے، عبداللہ شفا، میاں صاحب عبدالکریم عاشق اور محمد زماں زماں۔

میاں صاحب عبداللہ شفا محلہ کٹرا مبارکپور میں رہتے تھے۔ میاں صاحب عبداللہ کے نام سے مشہور تھے 'نعت محبوب' ان کے مطبوعہ مجموعہ کلام کا نام ہے، اس بیاض میں نعتیں غزلیں اور ہندی کے دوہے وغیرہ ہیں، صوفی منش آدمی تھے، نمونۂ کلام یہ ہے۔

کوئے جاناں میں گئے چاک گریباں کتنے | جان پر کھیل گئے عاشقِ بے جاں کتنے
لے چلا جب وہ اندھیرے میں پئے قتل مجھے | چمک اٹھے ہیں ستارِ سرمژگاں کتنے

منشی قمر الزماں (متوفی ۱۳۰۷ھ) مبارک پور کے شعراء میں دورِ قدیم کے اساتذہ میں سے تھے، منشی حبیب اللہ حبیب سے شرف تلمذ رکھتے تھے، اس کا اعتراف فخریہ انداز میں اپنے اشعار میں کیا ہے۔ زماں غزل کے بادشاہ تھے۔ ان کا اپنا ایک حلقۂ تلامذہ تھا، انتخاب دیوان زماں کے نام سے ان کا ایک مجموعۂ کلام منظر عام پر آچکا ہے نمونۂ کلام ؎

رنج اچھا ہے نہیں اور نہ راحت اچھی | آپ جس حال میں رکھ دیں وہ حالت اچھی
تم جو آجاؤ یقیں ہے کہ سنبھل جائے گا | ورنہ بیمارِ الم کی نہیں حالت اچھی

میاں صاحب عبدالکریم عاشق مبارک پور کے قدیم شعراء میں خاص مقام رکھتے تھے ان کی بزرگی اور فن شعری کے سب لوگ معترف تھے، غزل سے لگاؤ تھا، مگر جذبۂ روحانی اور عشقِ پیمبر سے بھرپور نعتیں بھی کہی ہیں اور نعت گو شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

مست ہوں بادۂ توحید کے پیمانے کا | فیض ہے ساقیٔ کونین کے میخانے کا
اے جنوں وادیٔ طیبہ میں خدارا لے چل | دل بہلتا ہے وہیں آپ کے دیوانے کا

استاذ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے تذکرۂ علمائے مبارکپور میں ان شعراء کے علاوہ استاذ الشعراء مولوی علیم اللہ خیالی مبارک پوری برہانپوری کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ان کا تذکرہ خم خانۂ جاوید مصنفہ لالہ سری رام دہلوی

اور سالک گجر مصنفہ جاوید انصاری برہانپوری میں صراحت کے ساتھ ملتا ہے۔ مبارک پور سے برہانپور والدین کے ساتھ نقلِ مکانی کر کے آئے تو ابتدائی تعلیم مولوی حافظ محمد شفیق اسعد برہانپوری سے حاصل کی، زمانۂ طالبعلمی سے ہی شعر و سخن کی طرف رجحان تھا، ہنر غازی پوری سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور ان ہی کے فیضِ تربیت اور خداداد استعداد وصلاحیت کی بناء پر بہت کم عرصے میں فنِ شاعری میں قدرتِ کاملہ حاصل کر لی۔ ان کے کلام میں اصلاحی، اخلاقی، قومی اور فلسفیانہ مضامین ملتے ہیں۔ آپ نے خواجہ احمد حسین شاہ صاحب امروہوی کے سلسلۂ نقشبندیہ میں شرفِ بیعت حاصل کی اور برہانپور کے پیرِ طریقت خواجہ سید ہاشم کشمی سے بھی ارادت رکھتے تھے آپ ہی نے خواجہ صاحب کا شجرۂ مبارکہ ترتیب دیا تھا۔ مولوی منشی غلام حسین عاشق مبارک پوری اپنے والد مولوی غلام عباس مبارک پوری سے اصلاح لیا کرتے تھے، متعدد رسالوں اور گلدستوں میں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے، نمونۂ کلام ؎

کل تو آنکھیں نہ لگیں شمع سے تا صبحِ مری	آج کیا حال کرے گی شبِ ہجراں میرا
رحمتِ حق سے تو محروم رہے گا واعظ	بخشے جاتے ہیں وہی جو کہ خدا کرتے ہیں

مبارک پور کے مردم خیز قصبہ کو منور کرنے والوں میں استاذ الشعراء محمد یٰسین فغاں (ولادت ۱۳۲۹ھ) کا نام نہایت تابندہ ہے، گیارہ بارہ سال کے تھے کہ آپ کے دادا حکیم مولوی امیر علی کا سورت میں (۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) میں انتقال ہو گیا، انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پارچہ بافی کا پیشہ اختیار کر لیا، خیر الرازقین نے اپنے فضلِ ربی سے انہیں خوشحال بنا دیا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں فغاںؔ کا ذوقِ شعری جوان ہوا اور یہ اپنا ابتدائی کلام میر زین الدین رشیدؔ کو دکھانے لگے، فغاںؔ مشاعروں کے مہیب شاعر تھے اردو کی اشاعت اور ذوقِ شعری کی تسکین کے لئے (۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) میں "بزمِ انجمن ترقیٔ ادب" کی بنیاد رکھی اسی کے زیرِ اہتمام عظیم الشان مشاعرے کرنے لگے، فغاںؔ گجرات علاقے کے ایک قابلِ احترام استاد تسلیم کئے جاتے تھے حلقۂ تلامذہ بھی وسیع تھا، فغاں کی غزلیات کا ایک مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ نمونۂ کلام ؎

میرے عزمِ مستقل نے مجھے ساحل پہ پہنچایا	رہے گرداب میں دامانِ ساحل دیکھنے والے [1]

[1] مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے تذکرہ علمائے مبارکپور سے کلی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

کوپاگنج کے شعرا و ادبا

اربابِ ذوق کی اس قصبہ میں کبھی کمی نہ رہی کئی علمی و ادبی انجمنیں قائم تھیں، انجمن توضیح البیان (۱۳۷۶)، انجمن ضیاء الاسلام (۱۳۴۵ھ)، دائرۃ الارشاد (۱۳۸۰ھ) اور بزم شبلی (۱۹۶۷) بڑے فعال اور سرگرم ادارے تھے۔ بزم شبلی کے روحِ رواں ابوالکلام جوہر تھے اسی کے زیر اہتمام پندرہ روزہ نشستیں منعقد کی جاتی تھیں قصبہ کے معروف شعرا اور ادبا اپنی تحقیقات پیش کرتے تھے۔ اسی بزم سے متعلق ادارہ "گہوارۂ ادب" تھا جس کے زیر تحت دو ضخیم اور عظیم الشان قلمی گلدستے "الکلام" کے نام سے (۱۹۶۷) میں جاری ہوئے تھے۔ قصبہ کی دیگر انجمنوں میں اصلاح اللسان، علم البیان، تنظیم المسلمین، ہدایت المسلمین، حیات المسلمین، دینی اور اصلاحی نصب العین کی حامل ہیں۔ مدرسوں میں بھی طلبہ کی اپنی اپنی انجمنیں قائم ہیں۔

بزم شبلی کی وجہ سے قصبہ میں شاعری کا ایک نیا ذوق پیدا ہوا، متقدمین شعرا میں بندہ علی شاہ (م ۱۹۰۷) سب سے زیادہ مشہور قادر الکلام اور برجستہ گو شاعر تھے، پوربی میں بھی شاعری کرتے تھے، خدا بخش کارندہ (متوفی ۱۹۰۹) کے لڑکے منشی عبدالمجید (م ۱۹۰۷) ایک نامور شاعر تھے۔ فہرست شعرائے کوپاگنج خاصی طویل ہے[1]

تذکرۂ سخنورانِ مئو

اسی عنوان سے اثر انصاری نے ایک تذکرہ مرتب کیا ہے[2] جس کا انتساب انہوں نے "بصد احترام جناب ڈاکٹر نور الحسن انصاری — ریڈر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی کے نام" کیا ہے۔ قصبہ میں 'بزم ادب مئو' ایک علمی و ادبی ادارہ دانشورانِ مئو کے تعاون سے عمل میں آیا اس کے قیام میں بزمی بنارسی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا اور جسے مولانا

---

[1] دیکھیے ص ۱۳۲۔ ۵۰م۔ تذکرہ مشاہیر کوپاگنج اور اس کتاب کا باب پورب دیس کے نور باف

[2] مطبوعہ ۱۹۸۱، مرتبہ تھا بھیج

محمد ضمیر قدسی، بزمی مئوسی، فضا ابن فیضی، اثر انصاری، حکیم عبدالرشید انجم، حافظ عبدالمتین تیر اعظمی، منشی فضل الرحمٰن مبتلا، ضیاء انصاری، نثار خیر آبادی، عارف صدیقی، نثار الہ آبادی، عبدالشکور شاکر، ماسٹر عبدالرؤف گرافز، مولوی عزیز الرحمٰن، منشی ظہیر الحق نشاط انیس ادیب محمد اکرم۔ ان کے علاوہ ہندو حضرات میں ماسٹر رام کمار سنگھ فہیم کا نام بھی ممتاز ہے۔

ادارہ بزم ادب کی نشستوں سے جن لوگوں کو فیض پہنچا اور شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا ان میں ساہر انصاری، سردار شفیق، غنی احمد غنی، ایم۔ اے دل حسینی، بسمل انصاری، مشتاق شبنم، نور انصاری، ثنا انصاری، احسان انصاری، محسن اعظمی، کلیم جہانگیری، اشہر اعظمی، کیف مبارکپوری، شفق انجمی، رحیمی رحمانی، رضوان اعظمی، مختار اختر وغیرہم کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

اب جب بزم کے تعاون سے قصبہ کے یک صاحب ذوق اور ذی علم تاجر سیٹھ منور علی نے اعلیٰ پیمانہ پر ایک اردو لائبریری دانشکدہ مئو کے نام سے قائم کی اس لائبریری کو کتابیں عطا کرنے والے معطیان ہیں، زین العابدین سوداگر ور سہیل الرحمٰن۔ موخرالذکر دانشکدہ مئو کے جنرل سکریٹری ہیں۔

اس ادارے کو سیاسیات سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے اسی لئے ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔ اس ادارے کے سرپرست ہیں مولوی عبدالباقی اور فخر الدین صاحبان، عہدیداران اس طرح ہیں: سیٹھ منور علی (نگراں) فضا ابن فیضی (صدر) اثر انصاری (نائب صدر) نثار احمد انصاری (جنرل سکریٹری)۔ غنی احمد (نائب سکریٹری)، ماسٹر وکیل احمد (خازن) اراکین و معاونین میں یہ لوگ شامل ہیں: سیٹھ مسعود علی، سہیل الرحمٰن، مختار علی، عبدالغفار، مولوی جمیل احمد انیس ادیب، مولوی حسین احمد، ممتاز احمد طرفدار، نذیر احمد سردار، زین العابدین سوداگر، مختار احمد اختر، مولوی عطاء الرحمٰن، مختار احمد نعمانی، ممتاز احمد انصاری، نور الہدیٰ ور دھنی احمد صاحبان۔ ممتاز شعراء جن کے تذکرے سخنوران مئو میں شامل ہیں اس طرح ہیں۔

مولانا فیض الحسن فیض اعظمی (ولادت ۱۸۹۶)

آپ رسیم خیر آبادی اور بعد میں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے

تھے۔ نفاست پسند، نیک کردار، خلیق اور شفیق بزرگ ہیں۔ قادر الکلام شاعر ہیں، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں، اصغر گونڈوی کی شاعری سے متاثر ہیں۔ نمونہ کلام:

میں اور سنگِ درِ دوست پہ جبیں سائی — خدا کی شان کہاں لے گئی خفت میری
ہر برگِ گل سے صاف نمایاں ہے حسنِ دوست — رنگینیٔ بہار نے کیا گل کھلا دیا
جلوۂ حسنِ رخِ یار ہے چلمن کے قریب — روشنی اک آگ سی ہے روزنِ ایمن کے قریب

صفا انصاری (۱۸۹۸-۱۹۷۵)

آپ مولانا سلطان احمد بانیٔ مدرسہ دار العلوم مئو کے خلف الرشید ہیں، بچپن میں اپنے شفیق چچا شیخ حسام الدین کے زیر سایہ پرورش پائی۔ سیاست اور ادب نے آپ کے کلام میں قوس قزحی رنگ پیدا کر دیے۔ کچھ غزلیں ایسی ہیں جن پر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا پرتو نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ آزادی کے بعد جو سلوک ہوا ہے اس کا شکوہ کرتے ہیں سہ

ہم نے دیکھا ترا انداز رواداری کا — دور دورہ ہے تری بزم میں عیاری کا
جتنے غدار تھے ان سب کو نوازا تو نے — اور الزام وفادار پہ غداری کا

محمد یوسف رسا اعظمی (۱۸۹۲-۱۹۵۶)

نوح ناروی اور جلیل مانکپوری سے شرف تلمذ حاصل تھا، گھر پر بچوں کو تعلیم دیتے تھے اور ساڑیوں کے کناریوں پر خوشنما نقش و نگار کرتے تھے، زبان و بیان میں شوخی، ندرت اور اسلوب میں پختگی تھی۔ نثر گوئی میں کمال اور تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ نمونہ کلام سہ

آج باقی نہیں انساں کی طبیعت میں خلوص — رہ گئی صرف نمائش ہی کی عادت باقی
کھنچ گئی تھی مری آنکھوں میں جو تصویرِ خیال — نظر آئی شبِ تاریک کی صورت جیسی

محمد حبیب اللہ نیر (ولادت ۱۹۰۶)

تلمیذ مولانا محمد ضمیر قدسی، ایک وقت تھا کہ آپ تجارت کے شہزادے تھے، اور ادب

کے تاجدار۔ جو آج بھی ہیں، پاکیزگی بیان، ایمائیت میں شوخی، فکر و فن میں پختگی آپ کی شاعری کے اوصاف ہیں، قومی نظمیں بھی کہتے ہیں، شانِ ادب کے صدر ہیں، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پھول پامالِ خزاں، اب بھی سرِ راہ گذر — موسمِ گل میں یہ ہنسنے کی سزا ہے جیسے
ہوش آیا تو نہیں ہے کہیں دیوانوں کو — شورشِ طوقِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
دلِ پُر داغ کو میرے سب اک غم خانہ کہتے ہیں — بڑے نادان ہیں گلزار کو ویرانہ کہتے ہیں

خلیق الرحمٰن گمانؔ انصاری (ولادت ۱۹۵۵)

منشی فضل الرحمٰن تبسا کے شاگرد ہیں، مفتاح العلوم اور مظہر العلوم میں تعلیم پائی، اور نذر کی بن کر بوٹے، تجارتی کاموں میں مصروف رہتے ہیں عروس سخن کی مشاطگی کرتے ہیں، بڑی رومان انگیز غزلیں کہتے ہیں ؎

نہ چھیڑ چھیڑ کے سرپھری ہوا سے کبھو — ڈھلک نہ جائے عروس حیات کا آنچل
تمام عمر غمِ دل کی ترجمانی کی — بنا دیا ہے حقیقت کو میں نے افسانہ
جنبش پر دوں سے کہدو میرا پیچھا نہ کرے — جانے لے جائے کہاں مجھکو مری بے خبری

محمد اسعد الاعظمی (۱۹۵۸)

مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن الاعظمی کے پوتے ہیں، دینی ماحول میں پرورش پائی، کمسن ہیں مگر شاعری جوان ہے۔

یہ شفقت یہ رحم و کرم یہ اپناپن — دیارِ غیر میں سب اپنا گھر لگتا ہے مجھے
ٹوٹ جاتے ہیں سلگتے ہوئے خوابوں کے طلسم — جب وہ چپکے سے مجھے آکے جگا دیتے ہیں

شفیق احمد شفیق (ولادت ۱۹۴۰)

دانش کدہ مئو کے تقریباً دس سال تک لائبریرین رہے، سوتی ساڑیوں کی نگاری کرتے ہیں، دراز خط کے تانے بانے سے شعر و سخن کے گل بوٹے بناتے ہیں۔ بڑی رنگین نظمیں کہتے ہیں، اور دلنواز غزلیں۔

منزلِ جنوں میں ابھی کب رہا ہوں میں تنہا
راستے کا سناٹا میرے ساتھ چلتا تھا

عارض ولب اس کے ہیں دلچسپ بابوں کی طرح
میں اسے روزانہ پڑھتا ہوں کتابوں کی طرح

گذریں گے اس طرف سے ابھی کچھ برہنہ پا
دامن میں اپنے راہ کے پتھر سمیٹ لو

فیض الحسن فضا ابن فیضی (ولادت ۱۹۲۲)

مولوی منظور الحسن کے خلف رشید ہیں، مدرسہ فیض عام کے فارغ التحصیل ہیں، منشی، مولوی، عالم و فاضل ہیں جدید لب و لہجے اور جدید تجربے کرتے ہیں۔ نئی نئی ترکیبیں، خوبصورت بندشیں، دلآویز تشبیہیں اوصافِ کلام ہیں۔ استادی کا درجہ حاصل ہے۔

چھونے والے تو اسے موجِ صبا بن کے نہ چھو
زندگی پھول کی پتی ہے بکھر جائیگی

میں وہ سرگشتۂ آلامِ زمانہ ہوں فضا
غم کسی کا ہو مرے رُخ سے عیاں ہوتا ہے

یہ سوچتا ہوں کہ ہے کوئی پڑھنے والا بھی
مرے قلم نے تو لکھنے کو لکھ دیا ہے بہت

محمد ابوبکر اثر انصاری (ولادت ۱۹۲۲)

خلف رشید صفی انصاری نبیرۂ مولانا سلطان احمد بانی مدرسہ دار العلوم مئو۔ گھر میں شاعری کا چرچا تھا لیکن آپ کے ذوق شعری پر قدغن تھا۔ تمام پابندیوں کے باوجود اندر کا شاعر بول اٹھتا تھا ؎

زندگی لے گئی یوں مجھ کو تباہی کی طرف
روشنی جیسے لپکتی ہے سیاہی کی طرف

آپ کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں کم و کیف اور فکر پریشاں تذکرۂ سخنورانِ مئو جس سے استفادہ کیا جا رہا ہے آپ نے مرتب کیا ہے۔

ضیاء الرحمٰن ضیا (م ۱۹۷۳)

مولوی فیض الرحمٰن فیقؔ کے صاحبزادے تھے۔ رند مشرب تھے طرح حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ؎

کبھی ستاروں کی انجمن میں کبھی ہجوم گل و سمن میں
جہاں جہاں تیری خلوتیں ہیں وہاں وہاں میں پکار آیا

میں بارگاہِ خدا میں پہنچا جب اعتراف گناہ کرنے
اٹھا یہی شور ہر طرف سے حرم میں کیوں بادہ خوار آیا

ظفر احمد تابر انصاری (ولادت ۱۹۴۰)

حضرت رضا ابن فیضی سے مشورۂ سخن لیتے ہیں۔ ان کی توجہ خاص نے ان کے فکرد خیال کو رعنائی اور ندرت بخش دی ہے۔ واقعہ نگاری اور منظر کشی میں بڑی فنکارانہ مہارت ہے ؎

کچھ دیر تو رک جاتے جو میری طرح دھوپ میں چل کے آئے ترے گاؤں میں
کس قدر دلنواز و سکوں بخش ہیں یہ درختوں کے سائے ترے گاؤں میں
ہیں یہ جگنو بھی تشنگی سے بھری پنگھٹوں کی چھلکتی ہوئی گاگریں
عمر بھر جس کو رہنا ہو پیاسا وہی، پیاس اپنی بجھائے ترے گاؤں میں

عبدالحق بدر مفتاحی (ولادت ۱۹۵۷)

جامعہ مفتاح العلوم مئو سے درس نظامیہ (عربی و فارسی علوم) میں سند فراغت حاصل کی۔ درس و تدریس کا سلسلہ بند کر کے صنعت پارچہ بافی سے ناتا باناجوڑ لیا۔ آپ کے کلام میں سادگی کا عنصر غالب ہے۔

عمر رفتہ جو گزرتی تھی سو گزری لیکن	جانے کس حال میں اب عمر رواں گذرے گی
انوار تجلی کا جب شوق ہمیں ہوگا	جلووں کے تصور میں سو طور بنا لیں گے

محمد طیب انصاری (ولادت ۱۹۵۲)

۱۹۶۶ء میں الہ آباد بورڈ سے منشی، ۱۹۶۸ء میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور ۱۹۷۵ء میں منشی کامل کے امتحانات کامیاب کئے، شعر گوئی کا شوق و شعر فہمی کا ذوق بدرجۂ اتم موجود ہے، غزلیں رومان انگیز ہوتی ہیں، انداز بیان بڑا شگفتہ ہے۔ دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جس نے خلوص دل سے اخوت کی بات کی
اس آدمی کو ننگِ وطن کہہ دیا گیا

تسکین مل گئی دلِ آشفتہ حال کو	اپنی طرح اسے جو پریشاں بہت ملے

احسان اللہ احسان انصاری (ولادت ۱۹۲۴)

اثر انصاری سے اصلاحِ سخن لیتے ہیں، بزمِ ادب مئو میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں، غزل گوئی میں مشقِ سخن کرتے ہیں سہ

گریۂ خاموش اعجازِ بیاں سے کم نہیں — میرے دل کی بات ان کی زباں تک آگئی

مجھ کو رہنے دے یوں ہی محوِ خیال — اے غمِ آگہی نہ دے آواز

خلیل الرحمٰن تمنا انصاری (ولادت ۱۹۴۵)

علمی خاندان میں اور شعری ماحول میں پروان چڑھے، زبان میں سلاست اور کلام میں موزونیت ہے۔ نمونۂ کلام سہ

چوٹ لگی ہے جس سے ملے ہیں سچ ہے یہ بہتان نہیں

اس نگری کے رہنے والے پتھر ہیں انسان نہیں

دل کا حال کیا کہیے درد کے بگولوں میں — جیسے ریگزاروں میں جیسے کوئی گھر تنہا

اصغر علی ناصر انصاری (ولادت ۱۹۴۲)

منشی اور منشی کامل کے امتحانات پاس کر چکے ہیں، طبیعت نہایت موزوں پائی ہے، کلام میں برجستگی، زبان میں سلاست اور اندازِ فکر میں ندرت ہے۔ بطورِ نمونہ کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اے غمِ شوق یہ ہے کون سی منزل کہ جہاں — ایک اک لمحہ گزرتا ہے مہینوں کی طرح

دامانِ گل پہ ہے جو مرے دل کے لہو کا رنگ — کہتے ہیں لوگ سرخیٔ خونِ بہار ہے

فیض الحسن بسمل انصاری (ولادت ۱۹۳۸)

شاعری کے لیے بڑی موزوں طبیعت پائی ہے، اہلِ فن اور اربابِ ذوق کی صحبتوں میں رہ کر شاعری نکھر گئی ہے سہ

کیا تجربہ جوان کو زمانے کی دھوپ کا — جو زلفِ دلبراں کی پناہوں میں رہ گئے

شعلے تراش لینگے انھیں پتھروں سے ہم — ہر دل کی یہ برف پگھلنے تو دیجیے

"تذکرہ سخنورانِ مئو" میں اور بہت سارے شعراء کا ذکر ملتا ہے جو اس طرح ہیں :
(ملک) میر حامد حسین، حافظ عبدالمتین رسڑوی، شاکر اعظمی، مرزا عبدالرحمن اچٹم، ششدر اعظمی، مولانا عزیز الرحمن، نشاط اسیمابی، حکیم انجم اعظمی، رام کمار سنگھ فہیم، بزمی بنارسی، وفا اعظمی، مبتلا غازی پوری، سہدیو رام کیف مبارک پوری، محمد عبداللہ وہبی انصاری، شوق اعظمی، انیس احمد دیب، عارف صدیقی، محشر اعظمی، غنی احمد غنی، مشتاق شبنم، وکیل اشہر، مختار احمد ول حسینی اعظمی، کلیم جہانگیری، مختار احمد اختر، ڈاکٹر منور انجم محسن اعظمی، انور مصباحی، رضوان اعظمی، عبدالسلام خاقانی، عامر الاعظمی، عابد ربانی۔

حضرت جلیل مانکپوری

جلیل مانکپور (الٰہ آباد) کے نورباف خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کی اکلوتی چھوٹی بہن سکونت بی کی شادی مالیگاؤں کے ایک مُعتبر خاندان میں ہوئی، صاحبزادے شتاق جلیلی فلموں میں گانے لکھتے رہے، سکونت بی کے پوتے عبدالحمید کیفی اور نواسے محمد حنیف سیٹھ مالیگاؤں کی معروف شخصیتوں میں سے ہیں۔

جلیل مانکپوری حافظِ قرآن تھے، فارسی کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، اصول و زدرع اور لُغت کی تحقیق میں درک رکھتے تھے، صرف و نحو اور عروض میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے یہی وجہ تھی کہ آپ کے استاد امیر مینائی نے "امیراللغات" کی تدوین آپ کے سپرد کر دی تھی، جب امیر مینائی کو نظامِ دکن کی دعوت ملی تو اپنے منتخب تلامذہ اور اہلِ خاندان کے ساتھ دیارِ دکن پہنچے، امیر مینائی کے ساتھ جلیل بھی تھے، مہاراجہ کشن پرشاد علم و ادب کے بڑے قدر داں تھے، اور ان دونوں نونہالانِ چمنِ ادب کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، فنِ عروض و نحو میں جلیل مانکپوری کا درجہ عرب کے ماہرِ فن عمر بن عثمان شیرازی سیبویہ کے برابر ہے۔

آپ ایک دیدہ زیب ساحر اور غایت درجہ خوش لباس اور خوش ادا صاحب سخن تھے اہلِ سخن پر قدر حاصل تھی میرزا غالب کی ٹکسالی زبان میں لکھتے تھے، مرزا داغ دہلوی کی وفات (۱۹۰۵ء) کے بعد نواب میر عثمان علی خان کے استاد مقرر ہوئے، اور دفعتاً سے چلے جو سینے یکدم خس و خاشاک کی طرح حسد کی آگ سے جل اٹھے استاد شہ پر خاش کا خیال آیا لیکن وہ تاب مجالِ حالت کہاں تھی ادھر جلیل نوربافی کی شاعری کا نور چمکا اور ایسی شعلہ خیز نظم انکی مدح میں کہہ ڈالی کہ جس کا ہر شعر شمشیرِ برہنہ تھا اور ہر حرف برجستہ گویا ایک چنگاری تھا کہ امارت و امیری کی سوکھی گھاس کو اس مردِ فقیر کی آتشِ نوائی نے جلا کر خاک کر دیا۔

ملہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ معارف مارچ ۱۹۲۶ء

برادری کے اہلِ قلم

تصنیف و تحقیق میں بیّن فرق ہے، اول الذکر میں طبع آزمائی، تخیل کی پرکاری اور ذہن کی دوررسی کو دخل ہے۔ مؤخر الذکر ایک صبر طلب ریاضت ہے جو دقیقہ سنجی کا متقاضی ہے، تحقیق ذہنی تنظیم اور تسلسل تشکیل کا طلبگار ہے اور اگر یہ استعداد نہ ہو تو تحقیق کی صورت مسخ ہو جائیگی اور جمع کیا ہوا تحقیقی مواد۔ مواد بن کر فاسد خون پیدا کریگا۔ محقق چاہے حاذق حکیم ہی کیوں نہ ہو جب تک تربیت یافتہ ذہن نہ رکھتا ہو مواد کا ملغوبہ ہی تیار کر سکے گا جو حلق سے نیچے نہ اتریگا اور نہ صالح خون پیدا کریگا۔

مؤرخ اور مصنف میں ایک قدر مشترک ضرور ہے وہ ہے لکھنے کا ڈھنگ جس طرح جینے کا بھی ایک ڈھنگ ہوتا ہے۔ اگر قلمکار کا طرزِ حیات دینی طریقے سے مرتب ہے تو اس کا قلم بھی پاکیزہ روشنائی کے سمندر میں ڈوب کر سجدہ ریز ہو کر وہ پاکیزہ باتیں لکھیگا جو تطہیر قلب اور تزکیۂ نفس کا باعث بن سکتی ہیں، حرفِ برہنہ بھی لکھیگا تو معانی و استعارات کا حجاب پہنا کر پیش کریگا، حق کی ادائیگی اور اظہار میں اس کے قلم میں تلوار کی دھار پیدا ہو جاتی ہے معاشرہ کے جسم کے ناسور کے لئے اس کا قلم نشتر بن جاتا ہے، وارداتِ قلبی، غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی حکایتیں بیان کرتے وقت وہ "نخنی قلم، براو جگر یا نم" کی طرح ان پر آنسو ٹپکاتا ہے۔ نوکِ قلم سے فکر کی گرہوں کو کھولتے جب اسکا قلم ناخن بن جاتا ہے تو خدا لگتی بات کہہ اٹھتا ہے وہ بات محبوب کی نگاہ کی طرح دل سے جگر تک اتر جاتی ہے۔ اہلِ قلم کو اہلِ دل اور اہلِ حق بھی ہونا چاہئے۔

جہاں تک مقصدیت کا تعلق ہے محقق و مؤرخ کی جہت الگ ہے وہ ماضی کے گڑے کوس کا سفر تحقیق کے خارزاروں میں کرتا ہے، تاریخ کے دریچوں میں، گنجینۂ ماضی کے ٹکڑوں کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر جوڑتا رہتا ہے، وہ ان کہی اور ان سُنی باتیں بھی سنتا ہے اور عجیب عجیب آوازیں بھی اس کے کانوں میں پڑتی ہیں، کبھی پانی پت کے میدان سے لشکریوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بلند ہوتی ہیں، "بجھیر!" "بخش" کی آوازیں آتی ہیں، حکمرانوں کے شبستانِ حرم اور حریمِ ناز سے نغمہ و سرود کے زمزمے بلند ہوتے سنائی دیتے ہیں۔ درباریوں کے "احسنت" کے تحسین آمیز اور تملق سے معمور کلمات ابھرتے ہیں، شاعروں کے قصیدوں میں زمین و آسمان کے قلابے

ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ عجیب عجیب آوازیں ماضی کے کھنڈروں سے اٹھتی ہیں۔ صرف ایک آواز جو جبروت کی صدیوں کے ملبے میں دھنسی ہوئی ہے۔ وہ آواز سنائی نہیں دیتی — وہ عوام کی آواز تھی۔

ایک کامیاب مورخ چند لفظوں کا مصنف ہوتا ہے باقی لفظوں کا مورخ، یہی اس کا حدِ کمال ہے۔ اچھا مورخ ایک اچھا انشاء پرداز بھی۔ عہد غزنوی کا ابوالفضل بیہقی اور منگولوں اور تیموریوں کے زمانے کے مورخین میں سے رشید الدین فضل اللہ، علاء الدین عطا ملک جوینی اور حافظ ابرو اور مغلوں کے عہد کا علامی فہامی ابوالفضل بڑے عظیم مورخ اور انشاء پرداز تھے۔

لکھنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے جب جوں قلم کی عمر بڑھتی جاتی ہے اس میں شباب پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ عمر ایک لمحہ کی بھی ہوتی ہے اور ایک عصر کی بھی اور اتنی سی مدت میں مورخ خود تاریخ بن جاتا ہے۔ برادری میں اہل قلم کی ہجرت خود ایک تاریخ ہے لیکن اس کے لئے کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیان کے لئے۔ چونکہ یہ ایک قصۂ طولانی ہے اس لئے ہم صرف ان چند ادیبوں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں جنہوں نے برادری کے بارے میں لکھا ہے۔

چند ممتاز مومن قلم کار

مولانا حکیم چوہدری عبدالسلام مبارکپوری (۱۲۹۶ھ-۱۳۴۲ھ) کا ذکر عباس تقوی کے مومن بافندے میں بڑی صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مولانا ایک فقید المثال مدرس، ادیب، متبحر عالم اور ایک بے نظیر ادیب و مورخ و نقاد تھے۔ آپ کی تاریخ ساز تصنیف تاریخ تمدن اور اس کا دوسرا حصہ کتاب المنوال والبطہ نے مومن برادری کی تحریکات اور جماعتی تنظیم کو نئی جہت دکھلائی۔ یہ کتاب جس پر مصنف کی حیثیت سے مولانا موصوف نے اپنے صاحبزادے شہید شدہ مبارکپوری کا نام دیا، عربی شرفاء اور تفاخر بالنسب کے مارے ہوئے شیوخ کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ تھا جو پیشہ ور برادریوں اور خصوصاً پارچہ بافوں کو نہایت حقارت سے دیکھتے تھے اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیت اور علمی، تمدنی اور اخلاقی ترقی دیکھ کر چراغ پا ہو جاتے تھے جس کی وجہ سے اس طبقہ کے بعض اہل علم و فضل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے کو چھپاتے تھے۔

ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان داناپوری ثم الدہلوی

کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں بجرم وفا، سارد ا ایکٹ پر محققانہ نظر، جواہرات جنت، حسرت ارمان قابل ذکر ہیں، آپ کی اہم تصنیف تاریخ مومن۔ انصار (دو حصے) دراصل مولانا عبد السلام مبارکپوری کی مذکورہ بالا کتاب المنوال والہ کی تلخیص ہے مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ ڈاکٹر حافظ ارمان نے اس کے دوسرے حصے میں ہر انصاری بستی کے ممتاز افراد کے اسمائے گرامی گنوائے ہیں جو ان کے معاصرین تھے (سنہ ۱۹۳۰ء)

مولانا محمد یحییٰ انصاری (ولادت ۱۸۹۵)

مومن تحریک کی حیات اولی کا یہ "مرد مومن" جو برادری کے پہلے قومی رسالہ 'المومن' کے مالک و مدیر تھے اپنی ذات سے ایک مکمل داستان ہیں آپ حاجی الطاف حسین رئیس، نئی باغ کلکتہ کے صاحبزادے تھے آبائی وطن بہار شریف (ضلع نالندہ صوبہ بہار) ہے۔ مدرسہ دارالہدیٰ کلکتہ سے ابتدائی تعلیم کی تکمیل کر کے سنہ ۱۹۱۸ء میں مدرسہ عالیہ (کلکتہ) سے ثانوی کا امتحان کامیاب کیا، مولوی اور فاضل کی تکمیل اپنے آبائی وطن میں کی، فارغ التحصیل ہوتے ہی دیگر بزرگانِ قوم کے شانہ بشانہ مومن تحریک کے زرخیز نہال تنظیم کی بیداری میں منہمک ہو گئے۔ آپ تحریک کے نہایت ہی فعال اور سرگرم بنیادی ارکین میں سے تھے، تحریک کے ذریعے گراں بہا قومی و ملکی خدمات انجام دیتے رہے، آل انڈیا مومن کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ممبر اور جمعیۃ المومنین کلکتہ کے رکن کی حیثیت سے برسوں قوم کی قیادت کا فرض ملکی اور شہری سطح پر انجام دیا، آپ مومن ہائی اسکول کلکتہ کے بانیان میں سے ہیں۔ آپ کا انتہائی گرانقدر اور اہم کارنامہ رسالہ 'المومن' کا اجرا ہے جو سنہ ۱۹۲۲ء میں قوم نورباف کے پہلے آرگن کے طور پر منظر عام پر آیا اور عرصہ دراز تک آپ کی سرپرستی و ادارت میں قوم نصار کا نقیب اور ترجمان بن کر برادران ملت کے اندر قومی بیداری کی روح پھونکتا رہا، المومن کی خدمت میں ماسٹر حمایت حسین ہمیشہ آپ کے شریک کار اور معاون رہے۔

مولانا امام الدین رام نگری بنارسی (۱۸۸۷ - ۱۹۸۲)

مولانا حافظ امام الدین بن الٰہی بخش انصاری کے جد امجد اور مورث اعلیٰ سید پور ضلع غازی پور کے باشندے تھے۔ پھر وہ وہاں سے منتقل ہو کر ریاست بنارس کے مرکزی مقام رام نگر میں بس گئے۔ مولانا نے باضابطہ کسی استاد سے یا مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی۔ علمی ذوق اور ادبی صلاحیت رکھتے تھے پڑھنے کا شوق ہوا تو لکھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی پھر معیاری مضامین لکھنے لگے اور موقر رسائل و جرائد میں چھپنے لگے۔ مولانا کے تعلقات بنارس کے منتخب علماء کرام سے استوار ہوئے تو عالمانہ شان پیدا ہو گئی۔

پہلے خیاطی کرتے تھے پھر بالمعاوضہ مضامین لکھنے لگے خواجہ حسن نظامی نے بھی آپ کی تصنیف کو شائع کیا۔ آپ اپنی ادارت میں "ترجمان مومن انصار" کے نام سے ماہنامہ رسالہ مولانا مفتی ابراہیم بنارسی کی نگرانی میں ۱۹۲۴ء سے نکالنے لگے جو بارہ سال کے بعد بند ہو گیا۔ در آپ نے پھر لکھنا شروع کر دیا آپ کے ادبی مضامین لاہور سے شائع ہونے والے رسائل 'نیرنگ خیال'، 'ادبی دنیا'، 'شاہکار'، 'عالمگیر'، 'ادب لطیف' اور 'ہمایوں' وغیرہ میں چھپتے رہے مقالات اور مضامین کے علاوہ مستقل ہندی زبان میں تقریباً تیس ۳۰ اور اردو میں تخمیناً پچاس تصنیف علمی یادگار ہیں، آزادیٔ ہند کے بعد "مکتبہ تحفظ ملت" جس سے آپ کا ربط تادم مرگ رہا چار کتابوں کا ہندی ترجمہ کیا، اردو اور ہندی میں اسلامی تعلیمات کی اشاعت کے لئے دو ادارے قائم کئے "مکتبہ تحفظ ملت" اور "اسلامی ساہتیہ سدن"۔ مولانا اچھے مقرر بھی تھے، ہندی، اردو اور فارسی کے ادیب اور شاعر بھی تھے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے تخلص حافظ تھا۔[1]

کسی تحریک کو فروغ دینے اور پروان چڑھانے کے لئے پریس اور اشاعت و طباعت کے وسائل بھی بے حد ضروری ہیں مومن تحریک جو اوائل ہی میں حیرت انگیز طریقہ پر ایک نہایت ہی موثر و ہمہ گیر تحریک بن گئی تھی اس کا ایک بڑا سبب مومن برادری کے اپنے جماعتی اخبار اور رسائل بھی تھے جن کا اجراء ملک کے مختلف مقامات سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہا

---

[1] تذکرہ علماء بنارس۔ بسیر محمد قاسمی ص ۳۹ - ۴۲

اور قوم میں صور بیداری پھونکتا رہا المومن (کلکتہ) اور ترجمان قوم انصار (رام نگر بنارس) کے بعد منشی فتح محمد خورشید امرتسری نے سہارنپور سے ہفت روزہ 'الانصار' جاری کیا۔ اخبار اسٹریٹ لاہور سے منشی اللہ دتہ عاصی نے "انصاری" نام کا ایک ماہنامہ نکالا، پھر پھلواری شریف بہار سے مولوی محمد حفیظ اللہ نے ماہنامہ 'مساوات' اور بدایوں سے ستمبر ۱۹۳۲ء میں تاریخ پارچہ بافی کے فاضل مرتب و مؤلف جناب مولوی محمود الحسن بدایونی نے ماہنامہ رسالہ 'مومن' جاری کیا، یہ ماہنامہ ابتداءً ۱۹۳۲ء میں مداری گیٹ بریلی سے جاری ہوا تھا لیکن اکتوبر ۱۹۳۳ء میں اس کا دفتر بریلی سے منتقل ہو کر بدایوں آ گیا تھا جہاں سے یہ رسالہ برسوں تک باقاعدگی سے نکلتا رہا، جنوری ۱۹۳۶ء میں کانپور سے آل انڈیا مومن کانفرنس کے سرکاری آرگن کی حیثیت سے بڑے طمطراق سے ہفت روزہ مومن گزٹ کا اجرا ہوا جس نے اپنے ابتدائی دور میں مومن برادری کے اندر ہمہ گیر مقبولیت حاصل کر لی تھی، اب شاید صرف ایک رسالہ باقی ہے جو آکھری آکھری سانس لے رہا ہے وہ مولوی محمود الحسن بدایونی کا ماہنامہ 'مومن' ہے، ماہنامہ انصار میگزین بھی ۱۹۶۰ء تک نکلتا رہا، انصاری دنیا مراد آباد سے جاری ہوا تھا۔

مومن برادری اور صنعت بافندگی کے بارے میں لکھنے والوں میں پروفیسر محمد ایوب قادری (ایم۔اے۔ کراچی) کا نام بیحد نمایاں ہے۔ موصوف نے کئی تحقیقی مقالے بھی شائع کئے ہیں عہد بنگش کی سیاسی، علمی اور ثقافتی تاریخ کو آپ نے بڑی تحقیقی کاوش سے مرتب کیا ہے (مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵ء) "مولانا محمد احسن نانوتوی" کا تذکرہ (مطبوعہ روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی ۱۹۶۶ء) آپ کی قابل قدر تصنیف ہے۔

آنالہ الہ آباد کے محمد ایوب انصاری کی گراں بہا تصنیف نجابت و شرافت یا لباس تقویٰ کی تصنیف و تالیف اور اشاعت کے پیچھے حاجی قمر الدین پرفیومرس کا بڑا مددگار ہاتھ ہے۔

اہم تصانیف میں 'آئینہ انصار' (کلکتہ) حقیقۃ الانصار، مؤلف حکیم علی احمد کاکوروی شائع کردہ ماہنامہ انصاری (لاہور جولائی ۱۹۳۶ء) تاریخ پارچہ بافی اور منشی فتح محمد خورشید امرتسری کی گرانقدر تصنیف تذکرۃ الانصار قابل ذکر ہیں، مولوی شمس الحق دربھنگوی نے اسی نام سے یعنی تذکرۃ الانصار لکھی ہے۔

ڈاکٹر احمد سجاد (ایم۔ اے ڈی لٹ) جو رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں

پروفیسر ہیں برادری کے بڑے ہمدرد فرد ہیں، ان کی ہستی، علمی اور ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ تحریک آل انڈیا مومن کانفرنس: تاریخ کے آئینے میں، انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ اور فکر صحیح کو بڑی بیباکی سے پیش کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی ملک و ملت اور بالخصوص بنکروں اور انصاریوں کے مسائل پر انہوں نے جو گراں قدر مواد اس کتاب میں پیش کیا ہے اس کی حیثیت ایک اہم علمی اور تحقیقی مقالے سے کم نہیں ہے۔ ان کی زیر تصنیف کتاب 'بندہ مومن کا ہاتھ' مومن کانفرنس کے بانی مولانا عاصم بہاری کی سوانح عمری ہے جو کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔ دانشوروں اور مضمون نگاروں میں سے جو برادری اور جمعیت بارے میں لکھتے رہے ہیں ان کے چند نام یہ ہیں:

امانت علی انصاری، پروفیسر محمد حنیف انصاری (جبلپور)۔ ڈاکٹر محمد ممتاز انصاری (پی۔ ایچ۔ ڈی)، سلطان احمد انصاری (صدر گوما پرکھنڈ مومن کانفرنس ضلع گریڈیہہ بہار) عبدالرشید انصاری، نصیر انصاری (شاعر بھوپال)، شیخ امام الدین (ایڈوکیٹ رانچی بہار)، حاجی امین انصاری (صدر گوملہ ضلع مومن کانفرنس)، چاند اشرف انصاری۔ حاجی ماسٹر عبدالعزیز انصاری (شریف نگر مراد آباد)۔ محمد منان (ایڈوکیٹ۔ سکریٹری ضلع مومن کانفرنس مظفر پور) انیس الرحمٰن انصاری (نئی دہلی)۔ پروفیسر صلاح الدین انصاری (ایم۔ پی)، پروفیسر نثار احمد انصاری (گجرات)، عبدالرؤف انصاری (ڈیری آن سون)

حاجی عبدالواحد انصاری (دہلی)، رشی الرحمٰن انصاری (کلکتہ) احمد نصیر انصاری (بھوپال)، عبدالحیٔ انصاری (دہلی) تاج الدین شاہنواز بجاپئی (کرناٹک)، جلیل ساز (ناگپور۔ شاعر) حاجی عبداللہ سردار مرحوم (سیٹھ رانچی) ڈاکٹر قربان الدین مرحوم (کلکتہ) حاجی عبدالرحیم (مرحوم)، حاجی امام علی مرحوم، جنت حسین انصاری مرحوم (گریڈیہہ بہار) عبدالعزیز مرحوم (چھپرا۔ بہار)، منیجر محمد بشیر الہٰی بخش، ولی محمد شمس الدین حاجی محمد لیٰسین انصاری، چودھری اسلام الدین عرف چھپن ٹھ، مجاہد آزادی حکیم حاذق اٹاوہ، حکیم ضیاء الدین ضیا فاضل الطب والجراحت (ایم۔ اے۔ ی) علیگ، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل (ناگپور)، نثار اختر انصاری (ناگپور)، محمد ظہیر وارثی (کامٹی)، ڈاکٹر اشفاق انجم (مالیگاؤں)، محمد یوسف حسن (بھیونڈی)، ایڈوکیٹ یٰسین مومن (بھیونڈی)، عبدالملک مومن (بھیونڈی)

چوبیسواں باب

وسطی ہند کی انصاری برادری: جبلپور، اندور اور اوجین

جبلپور۔ جبلپور وسطی ہند کا بڑا شہر ہے اس کی جغرافیائی ہیئت اور صوبائی الحاق اور تحدید میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ آج سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے تاریخ مومن۔ انصار میں اس کے مورخ ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان داناپوری جبلپور کی مومن برادری کے بارے میں لکھتے ہیں: [1]

> "یہاں زیادہ تر خاندان انصار آگرہ اور کانپور سے جاکر دکن آباد ہوا۔ اس شہر اور اس کے قصبات میں کافی تعداد میں ہیں۔ زیادہ تر چمڑے کی تجارت کرتے ہیں اور جوت کی دکانداریاں بھی کر رہے ہیں۔ ملازمت پیشہ، خیاطی پیشہ اکثر ہیں۔ تھوڑے سے زراعت پیشہ بھی ہیں۔ عزیز الرحمٰن صاحب وکیل و ڈاکٹر شہامت علی صاحب کی ہستیاں یہاں والوں کے لئے بسا غنیمت ہے۔ [کذا] پچھلے دنوں میں عرصہ ہوا آریوں سے مباحثہ مسلمانوں سے یہاں ہوا تھا جس کی روئداد "مباحثہ جبلپور" کے مشہور ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ حضرات شیخ انصار نے دل کھول کر چندے دیئے تھے اور مباحثہ کے لئے پوری مدد کی تھی جس سے ان کے دینی جوش کا پتہ چلتا ہے۔ حافظ بھی ہیں، مساجد آباد رکھتے ہیں علوم انگریزی کی طرف بھی توجہ بہت کچھ ہے خوشحال اور بہت خلیق لوگ ہیں۔ کچھ آدمی ایسے بھی ہیں جو اپنے آبائی پیشہ پارچہ بافی پر قائم ہیں خصوصاً دیہاتوں میں اور کپڑے کی تجارت کرتے ہیں"۔

جبلپور میں ایک زمانے میں ریشم اور سوتی کپڑوں کی صنعت عروج پر تھی، اردگرد کے قصبات اور قریات میں بھی انصاری بافندوں کی بستیاں تھیں مثلاً "نرسنگھ پور اور چھوٹی بگوہ میں جاش پور اور بالاسو میں ترک سکونت کر گئے تھے۔

جبلپور کی ممتاز مومن بستیاں

جبلپور میں مومن برادری کی گنجان بستی مومن پورہ، نئی بستی اور انصار نگر گوہل پور کے

[1] تاریخ مومن انصار حصہ ۲ صفحہ ۴۶

علاقے میں ہے۔ ڈاکٹرس، سیاسی مشاہیر اور صنعتکاران اور جگہوں کی طرح جبلپور میں بھی موجود ہیں۔ سیاسی رہنماؤں میں محمد رمضان بابا کا نام سب سے زیادہ درخشندہ ہے۔

محمد رمضان بابا سنہ ۱۹۱۲ء میں بمبئی کے ایک معزز مومن خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا سردار اللہ بخش برادری کی جماعت کے سردار اور مہتو تھے، سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہد تھے، والد الٰہی بخش ایک محب الوطن اور قوم پرست انسان تھے۔ محمد رمضان کی تعلیم بمبئی، لکھنؤ اور جبلپور میں ہوئی۔ میٹرک میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور پھر ان کے کانوں میں ہندوستان چھوڑ دو کی آوازیں گونجنے لگیں اور قوم و ملک کے کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ یہ بھی ہو رہے۔ اور کئی سیاسی جماعتوں کے رکن بن گئے آل انڈیا مومن کانفرنس، کل ہند ایکتا کمیٹی، جمعیۃ علمائے ہند اور کل ہند انسانی برادری کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں اور یہ ہندوستان گیر اور ملکی سطح کے سربرآوردہ رہنماؤں مثلاً راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا عاصم بہاری، عبدالقیوم انصاری، رفیع احمد قدوائی، روی شنکر شکلا کے بہت قریب رہے۔ بڑے بڑے لوگوں کا ان کو اعتماد حاصل تھا اور عوام کو ان کی رہنمائی حاصل تھی، وسطی ہند کے وہ سارے نیتا مثلاً ڈی پی مشرا، پنڈت راجیشور گرو، مہیش دت مشرا، سوبیل جین، ملایم چند جین اور سیکڑوں احباب اور ساتھیوں کے یہ بڑے پیارے "رمضان بابا" تھے۔ جبلپور میں ان کا طوطی بولتا تھا اور دسمبر ۱۹۸۵ء تک یہ مومن کانفرنس کے ممبر اور برادری کے بڑے خیر خواہ رہے تھے۔

پروفیسر محمد حنیف انصاری۔ مومن کانفرنس کے بڑے فعّال اور سرگرم رکن تھے اور اس کی انڈیا ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے (دسمبر ۱۹۸۵ء)، آپ نے عربی میں بی۔ اے کیا ہے، ایم۔ اے فارسی اور اردو اور بی۔ ایڈ کی بھی ڈگری رکھتے ہیں ساہتیہ رتن (ہندی) ہونے کا شرف بھی حاصل ہے جبلپور انصار مومن برادری کے اول گریجویٹ ہوتے کی وجہ سے عام طور پر حنیف بی۔ اے کے نام سے مشہور ہیں۔ کل ہند مومن کانفرنس مدھیہ پردیش کے سرپرست ہیں۔

خلیل انصاری (ایم۔ ای، ایم ای لندن) سمندری جہازوں کے ماہر انجینئر ہیں۔ اسی وسیلے سے بحری سفر کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی انصاری (ایم بی بی ایس) جبلپور کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ انجمن اسلامیہ

ٹرسٹ کے متولی اور اس کے سابق صدر ہیں۔ برادری کی خدمت کے لئے پیش پیش رہتے ہیں اور سرگرم سماجی ورکر ہیں۔

ابو رقاعہ انصاری (ایم اے بی ٹی) انجمن اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول گوہل پورہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۳ء سے سنہ ۱۹۶۵ء تک نیشنل گیمس میں ایک عہدے پر فائز تھے۔

صغیر احمد انصاری: سیاسی میدان کے مرد مجاہد ہیں، بڑے مقبول شخص۔ یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۳ء میں کمیونسٹ پارٹی کے محاذ سے اور سنہ ۱۹۷۹ء میں کانگریس پارٹی کے ٹکٹ پر جبلپور کارپوریشن کے چناؤ میں کامیاب ہوئے۔ بنکروں اور بیڑی مزدوروں کے حامی اور مقبول لیڈر ہیں۔

نذیر احمد انصاری (بی ایس سی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی)۔ راجیہ ہاتھ کرگھا سوسائٹی کے ڈائریکٹر تھے۔ نیشنل پاور لوم سوسائٹی کے صدر ہیں۔ مومن عیدگاہ جبلپور کے سیکریٹری بھی ہیں۔ قومی و ملی بہبود و فلاح کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ برادری کے لئے بڑا درد مند دل رکھتے ہیں۔

محمد قدوس انصاری (بی۔ اے۔ آنرز) پی۔ ایچ۔ ای ڈپارٹمنٹ میں ایگزیکیوٹیو انجینئر ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کا شوق رکھتے ہیں۔

منیر احمد انصاری: جبلپور کے دینی مدرسہ درس قرآن کے صدر، نگینہ مسجد کے متولی، موتی نالہ بلاک کانگریس کمیٹی کے صدر اور گاندھی ہاتھ کرگھا نگر کمیٹی کے بھی صدر ہیں۔ بھارت پاور لوم کمیٹی کے صدر رہے اور کوآپریٹیو پاور لوم اونرس ایسوسی ایشن جبلپور کے سیکریٹری ہیں۔ صنعت پارچہ بافی اور ہاتھ ماگ کے فروغ کے لئے آپ کی مساعی جمیلہ قابل صد تحسین ہیں۔

مشتاق احمد انصاری: سنہ ۱۹۶۱ء میں میڈیکل کالج سے ایڈیشنل سینیٹری انسپکٹر کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ اور پھر حفظان صحت کے شعبے میں ایک عہدے پر فائز ہوئے۔ جبلپور میں فوڈ انسپکٹر ہیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن ساؤتھ ایشیا کا ایوارڈ نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں عطا ہوا۔

ڈاکٹر محیط انصاری (ایم بی بی ایس) دارثی کلینک گوہل پور جبلپور میں طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دینی امور سے بیحد دلچسپی رکھتے ہیں۔ مدرسہ عربیہ حنفیہ مذہب اہلسنت کے مبلغ اور سرگرم رکن ہیں۔

عبدالباقی انصاری: موتی نالہ حلقے سے سنہ ۱۹۶۳ء اور سنہ ۱۹۶۹ء میں کانگریس پارٹی کے ٹکٹ پر کارپوریشن کے انتخابات میں شاندار طریقے پر کامیاب ہوئے اور سنہ ۱۹۸۲ء میں جبلپور

میونسپل کارپوریشن کے ڈپٹی میئر منتخب ہوئے۔ بنکر پاور لوم فیڈریشن کے ڈائرکٹر ہیں، ج کمیٹی کے ممبر ہیں، ٹریکٹر فرم جبلپور میں شراکت داری ہے۔

جمیل احمد ولد سردار محمد صدیق انصاری: انصار نگر گوہل پور کے مددگار، انصاری ہیں فاران ہائی اسکول کے چیرمین اور نائب صدر ہیں، ایم۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی ہے مگر حساب کتاب سے تعلق رکھتے ہیں، ڈیفنس اکاؤنٹ جبلپور میں آڈیٹر ہیں۔

فیروز کمال: صاحب اوصاف شخصیت ہیں۔ کئی اداروں کو آپ کی خدمات حاصل ہیں مدھیہ پردیش مصنف فورم کے شعبۂ اردو کے سکریٹری ہیں۔

حفیظ الرحمٰن انصاری: الیکٹریکل انجینیرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا ہے۔ سنٹرل ریلوے دہرہ اسمال اسکیل سروس انسٹی ٹیوٹ اندور سے انڈسٹریل مینجمنٹ کا کورس بھی کیا ہے۔

محرم علی (بی ایس سی ایل ایل بی): ڈگریوں کی روشنی میں آپ کے مشاغل اور آپ کے پیشہ کی نوعیت مختلف ہے۔ بجائے عدالت کے آپ ڈیفنس اکاؤنٹ کے محاسب شعبہ میں آڈیٹر بن گئے ہیں۔ فاران ہائی اسکول نئی بستی جبلپور کے سکریٹری ہیں، ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر سوسائٹی گرلس ہائی اسکول گوہل پور جبلپور کے بنیادی ممبر اور جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ عوام کی خدمت، برادری کی بہبود آپ کا سطح نظر ہے۔

محبوب احمد انصاری (گوہل پور جبلپور) نے الیکٹرونکس میں ڈپلوما حاصل کیا، ویسٹرن ٹی وی ڈرن ستنا میں سروس انجینیر ہیں۔ انصار نیشنل فیڈریشن جبلپور کے جنرل سکریٹری ہیں۔

جبلپور کی مومن۔ انصاری برادری آج سے چند سال قبل نہ تو اتنی فعال تھی اور نہ خوشحال عموماً لوگ دکانداری کرتے تھے یا ملازم پیشہ تھے لیکن تعلیم کے فروغ اور علمی و دینی شعور نے برادری میں یک تازہ روح پھونک دی ہے۔ فاران ہائی اسکول کا قیام، تعلیم اور فلاح و بہبود کے اداروں کا وجود اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ "سسکتی ہوئی تاریکیاں دم توڑ رہی ہیں اور علم و ادب کے شعور نے سارے میں اُجالا پھیلا دیا ہے۔ پبلک ایجوکیشن سوسائٹی کئی اسکولیں چلا رہی ہے۔ فاران ہائی اسکول کی مجلس انتظامیہ میں یہ لوگ ہیں: صدر محمد علی، سکریٹری محرم علی، نائب صدر (چیرمین) جمیل احمد، خازن محمد اسلام اور بشیر احمد جوائنٹ سکریٹری (۱۹۸۵)

بیشتر طور پر جبلپور میں پارچہ بافی کسی بڑے وسیع پیمانے پر نہیں ہو رہی ہے۔ دی کوآپریٹیو پاور لوم ایسوسی ایشن کا دم غنیمت ہے۔ منیر احمد انصاری سکریٹری ہیں۔

اندور:

مالوہ کے نام سے تصور میں رنگین راتوں کا سحر چھا جاتا ہے۔ "شبِ مالوہ" نہ جانے کتنی نظموں
اور شعروں کا موضوعِ سخن بنا ہے۔ رات کی رانی کی لطیف اور خواب آور نکہتوں میں بسی ہوئی بہاروں
کی راتیں باز بہادر کے رومان پرور عہد میں رت جگائیں منائی تھیں۔ ان کے تصور سے شام
جان معطر اور ذہن مسرور ہو جاتا ہے اور فضا میں گجرے مہکنے لگتے ہیں۔ پھر یہ علاقہ راجواڑی بن
گیا اور اہلیا بائی ہولکر مہارانی (۱۷۶۵ - ۱۷۹۵) کے ثقافتی دور میں، مالوہ مختلف فنون
اور صنعتوں کا مرکز بن گیا، دستکاروں اور کاریگروں کو مہارانی کی سرپرستی حاصل ہوئی اور یہاں
کے کوشٹی اور سال بکروں کے کرگھوں پر بنی ہوئی زری کناری کی مہیشوری پگڑی یا پان کی
مانگ منڈیوں میں بڑھ گئی۔[1] اسی زمانے سے یہاں مومن انصاری نوربافی بھی آکر بسنے لگے
جن کی تعداد غدر کے ہنگاموں کے بعد بڑھتی گئی۔

آزادیٔ ہند سے قبل اندور کے رانی پورہ "توڑہ"، جونی اندور، نیا پورہ اور مومن پورہ محلوں میں
بُنکر کثیر تعداد میں آباد تھے۔ ایک مدت سے یہ کرگھوں پر پگڑی بُنتے آئے تھے لیکن جب ملیں قائم
ہوئیں اور پاور لوم کی طاقت بڑھی تو دستار سر سے اتر گئی۔ نہ صنعت میں منفعت رہی اور نہ
برکت۔ اور جب چھٹنی ہونے لگی تو برادری کے گنے چنے بُنکر برسرِ روزگار رہے، باقی بکھر گئے۔
ملازمت اور مزدوری ذریعۂ معاش بن گیا، کرگھے ایک ایک کر کے دم توڑتے رہے اور تانا بانا
ٹوٹ کر رہ گیا اور ۱۹۴۷ء کے بعد سے موجودہ دور تک کی نئی نسل کو آبائی پیشے کی جگہ کی خانہ
پُری چھوڑ دینا پڑتی ہے۔ عزیمت انصاری اپنی جگہ قائم ہے ور انصار برادری نے اپنا آبائی
پیشہ چھوڑ دیا لیکن شناخت نہیں چھوڑی۔ اور آج بھی برادری میں معزز با اثر رؤسائے شہر
موجود ہیں۔ سیاست، ادب اور تعلیم کے تعلق سے بہت سارے افراد نمایاں کام سرانجام دے
رہے ہیں۔[2]

---

[1] شبیر حکیم۔ ماجرائے وطن صفحہ ۱۰۱-۱۰۳

[2] انصار سووینیر ۲۰۰۳ء - اندور - مدیر محمود نشتری، معاون محمد الیاس انصاری، مضمون تمدن انصار برادری
کے رسم و رواج اور طریقۂ شادی - چودھری بدرالدین انصاری۔

اندور اور اُجین کی انصاری برادری کی جماعتی روایات

شادی بیاہ کی رسوم و رواج اور معاشرت میں دونوں شہروں کی انصاری برادری اپنے بزرگوں کے اجداد کی روایات و اقدار کی حامل ہے[1] مگر مقامی حالات اور معاشی عوامل و محرکات کے سبب تھوڑی بہت تبدیلیاں ضرور ہوئی ہیں اور کچھ نئی باتیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔

شادی[2] کے رشتے باہمی رضامندی سے طے کئے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے محلے کی باا ثر خواتین اور عموماً معمر اور تجربہ کار عورتیں نماز جمعہ کے بعد دونوں گھروں میں چند بار خطابت یا پیغام لے کر جاتی ہیں۔ اگر رشتہ منظور ہوتا ہے تو لڑکی والوں کی طرف سے کوئی بزرگ خاتون رشتہ کی منظوری دے دیتی ہے یا "ہامی" بھر لیتی ہے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد لڑکے والوں کی طرف سے دو بزرگ حضرات "پیامی" کی حیثیت سے (جنہیں اور جگہ اگوا کہتے ہیں)۔ لڑکی والوں کے یہاں بھیجے جاتے ہیں جہاں چند بزرگوں اور افراد خاندان کی موجودگی میں رشتہ کی منظوری کو نشاد کر دیا جاتا ہے۔

<u>بات چیت</u> — اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ "لڑکی اور لڑکے والوں کی طرف سے رشتہ داروں کو بات چیت دینے کا لفظ عورتوں کی طرف سے دیا جاتا ہے"۔ ایک مقررہ دن برادری کے پنچ حضرات لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں جہاں ان کے رشتہ دار اور محلے کے پنچ حضرات موجود رہتے ہیں۔ سبھی حضرات کی موجودگی میں پنچوں کے روبرو کوئی بزرگ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے "پنچوں کی لڑکی پنچوں کی سپردگی میں طالب کو مطلوب کی جانب سے دی گئی"۔[1]

خاطر تواضع کے بعد دوپہر میں عورتوں کے ذریعے لڑکی والے کے یہاں مٹھائی اور پھل وغیرہ بھیجے جاتے ہیں یہ انتہائے مسرت ہی نہیں، نئی رشتہ داری کے استحکام کی علامت ہے۔ مٹھائی رشتہ داروں میں تقسیم کردی جاتی ہے تاکہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کا اس نئے رشتے کا علم ہو جائے۔ جب تک شادی نہیں ہو جاتی دونوں طرف سے تہواری ، عیدی کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

---

[1] و [2] مقدر رسوو سیتر۔

پوچھنی۔ شادی کی تاریخ اور دن طے کرنے کے لیے 'پوچھنی' کی رسم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کسی زمانے میں یہ سارے معاملات امور نائی یا نائن کے ذریعے طے کیے جاتے تھے۔ اگوا کے ذریعے یا رشتہ دار اور محلے کے پنچوں کے ذریعے سارے امور انجام دیے جاتے ہیں۔ دن اور تاریخ مقرر کرتے وقت (بعض افراد مہینوں کو "براتے ہیں" مثلاً صفر کے مہینے کو منحوس سمجھتے ہیں اور خیر و برکت سے "خالی" مہینہ جانتے ہیں اس مہینے میں بیاہ شادی کرنے کو منحوس سمجھتے ہیں اور خصوصاً تیرہ تاریخ تک تو بہت ہی منحوس سمجھتے ہیں اس لیے اس مبارک مہینے کو بعض لوگ تیرہ تیزی کہتے ہیں)۔ بارات، نکاح، بدائی (وداعی) وغیرہ تفصیلات طے کر کے لڑکے والے کی طرف سے گڑ تقسیم کیا جاتا ہے "گڑ" کی رسم ہمارے اسلاف نے قائم کی ہے جسے قائم رکھنا انصار مومن برادری کے بزرگوں کی شان اور وقار کو قائم رکھنا ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہمارے لیے باعثِ عزت ہے"
[یہ اعظم گڑھ کے انصاریوں کا خیال ہے] [1]

آکھت۔ لڑکی والوں کی طرف سے آکھت (ڈھائی سیر چاول گڑ اور دو روپے) لڑکے والوں کے بزرگ کو دیئے جاتے ہیں اور گلے مل کر نئے رشتہ کا اظہار کرتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں اور مزید دو روپے پیش کرتے ہیں۔

شادی: پوچھنی طے ہو جانے کے بعد دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگتی ہیں۔ ایک ہفتہ یا پانچ دن کی ہلدی (اُبٹنا) لگائی جاتی ہے جس کا گھر گھر اذن (بلاوا) دیا جاتا ہے۔ عورتوں کے جمگھٹے میں لڑکے اور لڑکی کو ان کے اپنے گھروں میں ابٹن لگایا جاتا ہے ڈھول پر شادیانے کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اُبٹنا کے بعد بتاشے یعنی شیرینی تقسیم کی جاتی ہے اور پان تمباکو سے تواضع کی جاتی ہے حسب حیثیت دونوں گھروں میں موجودہ رواجوں کے تحت بجلی کے قمقموں سے چراغاں کیا جاتا ہے۔ اُبٹنا لگنے کے بعد سے نکاح خوانی کے دن تک رشتہ دار اور متعلقین کے گھروں کی عورتیں دولہا اور دلہن کے لئے ہار پھول یا 'سہرا سہاگ' لاتے ہیں۔ پھولوں کے ہار، مٹھائی پھل وغیرہ بہن بیٹیاں بڑے چاؤ اور ارمان سے لاتی ہیں اور انھیں اس کے بدلے میں انعام کی شکل

---

[1] انصار سوونیر۔ ایضاً

میں نیگ بھی ملتا ہے۔ انبساط و شادمانی کا ایک مظاہرہ رت جگا کی شکل میں بھی ہوتا ہے [1]

رت جگا: چند سال قبل جب انصار برادری میں گانا بجانا بھی ہوتا تھا تب رت جگے بھی ہوتے تھے بارات سے دو یا تین دن قبل رت بھر دلہن کی سہیلیاں بہن اور محلہ کی عورتیں رات بھر جاگ کر گانا بجانا کرتی تھیں، گلگلے تلے جاتے تھے اور صبح کی نماز کے وقت رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے محلہ کی مسجد کے طاقوں کو ان سے بھر دیا جاتا تاکہ نمازی حضرات اپنا منہ میٹھا کریں۔ بارات سے یک دو روز قبل دو روپے نقد دو بزرگوں کے بدست لڑکی والے کے یہاں بھیجے جاتے ہیں اور یہ دریافت کیا جاتا کہ بارات کس طرح لائی جائے [ڈھول، تاشہ کے جھیتم ۔ ایک قسم کا ڈھول ۔ بچے اور بچیاں بارات کا کھیل کھیلتے وقت عموماً پوچھا کرتی تھیں]۔ لڑکی والے کی فرمائش ہوتی اس کا اظہار کر دیا جاتا ورنہ کوئی قید نہیں رکھی جاتی۔ [2]

ڈال یا ڈالا: [ترکوں کی رسم بھی جسے ساچق کہتے ہیں] بارات سے ایک روز یا نکاح کے دن کی رسم جس میں دولہا کے یہاں سے دلہن کے لیے مٹھائی وغیرہ لے کر جاتے ہیں اس روز دلہن کے مہندی لگائی جاتی ہے۔ ڈال میں زیورات، شادیانے کا جوڑا اور نقش و نگار بنی ہوئی مٹی کی ہنڈیوں میں دہی، شکر اور دیگر اشیائے خوردنی بھی شامل تھیں۔ ڈال ہر جگہ کی تقریباً مختلف ہوتی ہے۔ ہندی میں اسے بَری بھی کہتے ہیں]

اندور اور اوجین میں ڈھائی سیر چاول، ڈھائی سیر گڑ، کچھ نقد رقم ایک خوان میں رکھ [سہاگ پڑے کی شکل میں کچھ سوکھے میووں کے ساتھ لیجاتے ہیں خوان میں تین جوڑے پڑے ایک جوڑا دلہن کی شادی کے نام سے دوسرا منگنی کے نام سے اور تیسرا مادری جوڑا کہلاتا تھا۔ دلہن کے سنگھار کا سامان جیسے تیل کنگھا، چوڑیاں، مہندی، جوتے موزے، رومال، برقعہ یا چادر وغیرہ رکھ کر ایک سفید کپڑے میں لپیٹ دیا جاتا تاکہ یہ ساری اشیاء ڈھکی ہوئی ہونی چاہئیں [تاکہ نظر بد نہ لگ جائے] کلاوہ [تکلے پر لپیٹا ہوا کچی سوت یا دھاگا جو کہ پیلا اور سرخ] انگلی پر لپیٹ دیا جاتا [اسے نارہ بھی کہتے ہیں]

---

[1] و [2] انصار سوشل ... مضمون اندور انصار برادری کے رسم و رواج اور طریقہ شادی۔

چودھری بدرالدین انصاری۔

گوڈال کی یہ رسم، جسے ساچق، فارسی میں جہاز اور ہندی میں بری کہتے ہیں تقریباً ہر ملک میں رائج تھی لیکن ہندوستان میں یہ رسم غیر اسلامی عناصر سے ملوث ہے۔ تا " نعار برادری کے بزرگ اور جماعت کے پنچوں نے یہ رواج اس لئے قائم کیا ہے کہ " اگر لڑکی والے غریب بلے سہارا ہیں تو وہ یہ لائے ہوئے گڑ اور چاول پکا کر اپنے مہمانوں کو اور خصوصاً داماد کو کھلا کر وداع کریں۔ اسی لئے ڈال کی رسم دولت مند ہو یا غریب انصاری برادری میں اب تک رائج ہے لا[1]

اندور اور اوجین کے علاوہ اردگرد کے قصبات اور قریات میں تقریباً یہی رسوم رائج ہیں۔ نکاح خوانی اگر دوپہر یا عصر اور مغرب کے درمیانی وقت میں ہو جاتی ہے اور تنگیٔ وقت یا وقتِ زوال کے سبب اگر دلہن کی رخصتی طے نہیں پاتی تو نوشاہ میاں دوست و احباب کی معیت میں 'عصرانہ' کے لئے چلے جاتے ہیں اور پھر دلہن کی رخصتی تک سسرال میں ٹھہرے رہتے ہیں؛ طعام شب کے بعد دلہن اور اس کے جہیز کے ساز و سامان کے ساتھ اپنے گھر لوٹ آتے ہیں۔ مہر میں بھی اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ اس کی تحدید نہیں رہی شرعی حدود کو بھی پار کر گئی ہے پہلے مبلغ سوا سو روپے ۱۲۵ سکۂ رائج الوقت تھا اب مبلغ پانچسو سے ایک ہزار بلکہ "تفاخر بالتمول"[2] اگر مقصد ہے تو کوئی حد ہی نہیں رہتی۔

برات: اگر شب گشت کے بعد نماز عشاء دلہن کے گھر جاتی ہے تو دوست احباب کے تواضع کے بعد دولہا کو سنوارا جاتا ہے۔

شکرانۂ ایزدی اور اظہار مسرت کی خاطر محلہ کی مسجد کا نیگ (نقد) اور بہن بیٹیوں کا حق سی وقت دے دیا جاتا ہے۔ بارات شرعِ محمدیؐ یعنی میلاد پڑھتے ہوئے روانہ ہوتی ہے" [گذار] دلہن کی جانب سے پانچ بزرگ (پنچ) بارات کا استقبال کرتے ہیں، نکاح کے بعد دلہن والوں کا جو حق، یا نیگ واجب الادا ہوتا ہے وہ نوشاہ کی جانب سے پنچوں کو دے دیا جاتا ہے۔ باراتیوں کو رات کا کھانا (حسب استطاعت) کھلایا جاتا ہے۔

سلامی: بعد از طعام شام نوشاہ میاں کو مستورات کی محفل میں بلایا جاتا ہے۔ بعض

---

[1] انصار سورنیمبر۔ مضمون اندور انصار برادری کے رسم و رواج در طریقۂ شادی۔ چودھری بدرالدین انصاری۔ [2] جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

جگہ آرسی مصحف کی رسم عمل میں لائی جاتی ہے مگر یہ عموماً مہذب گھرانوں میں ادا کی جاتی ہے۔ نوشاہ میاں کے تخیل میں "صد گلستان نگاہ کا سامان کئے ہوئے" کا منظر بہار دکھلانے لگتا ہے۔ خوشدامن کا دامن پکڑا جاتا ہے سلامی کی رقم کے علاوہ گھڑی یا سونے کی کوئی چیز بھی بطور ہدیہ مل جاتی ہے۔

رخصتی :- دلہن کی وداعی (بِدائی) کا منظر بڑا درد انگیز اور اندوہ گیں ہوتا ہے۔ بڑی بوڑھی عورتوں کی یادوں میں "بابل کے گیتوں کے سُر ابھرنے لگتے ہیں۔ جہیز کا سامان نوشاہ کے بزرگوں کو سونپ دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کوئی بزرگ آکھت کی شکل میں ایک سُوپڑے (سوپ) میں کچھ اناج بھی نوشاہ کے کسی بزرگ کو پیش کرتا ہے جسے وہ دامن پھیلا کر قبول کرتا ہے پھر دونوں بزرگ گلے لگ کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور نئی رشتہ داری کا اعادہ کرتے ہیں۔

دعوتِ ولیمہ : شادی کی تقریب سعید مسرتوں سے معمور ہوتی ہے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب اعزا و اقربا سرور و نشاط کی فضا میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس خوشی کے موقع پر نوشاہ یا دولہا اپنی استطاعت کے مطابق انھیں کھانے پر مدعو کرتا ہے اور یہ سنتِ نبویؐ ہے اور چند فقہا کے نزدیک یہ صرف مستحب ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب نیل الاوطار میں ہے کہ "مالدار کے اوپر دعوت ولیمہ کی سب سے کم حد ایک بکری ہے اور اگر اس بات کا ثبوت موجود نہ ہوتا کہ نبی کریمؐ نے خود اس سے کم دعوت کی ہے تو ایک بکری کی دعوت ہر شخص پر علی الاطلاق فرض ہوتی فقہا کا بہر صورت اس بات پر اتفاق ہے کہ زیادہ سے زیادہ ولیمہ کی کوئی حد متعین نہیں ہے اور کم سے کم آدمی کی استطاعت پر موقوف ہے۔[1] ولیمہ ہر مسلمان مرد کی شادی میں ضرور ہوتا ہے"۔[2]

عموماً نکاح کے فوراً بعد یا سلامی کے وقت بعض لوگ سونے کا بٹن، یا سونے کی گھڑی وغیرہ دولہا کو "ہدیۃً" پیش کرتے ہیں۔ شارع علیہ السلام نے مردوں پر زینت کی دو چیزیں حرام قرار دی ہیں جبکہ عورتوں کے لئے یہ حلال ہیں یعنی سونے کے گہنے اور خالص ریشم

---

[1] نیل الاوطار صـ ۶ /۱۰۲ اور دیکھئے البہی الخولی۔ عورت اسلام کی نظر میں۔ ترجمہ : جاوید احسن مجاہد اسلامی (دہلی) صـ ۸۳-۸۵

پہناد مسلم) اس ممنوع رسم سے یعنی حرام چیز سے اس طرح جب ازدواجی زندگی کی ابتدار کی جاتی ہے تو انتہا کا قیاس کیا جا سکتا ہے!

اندور میں مومن۔انصار برادری کی تعلیمی، سیاسی اور ادبی سرگرمیاں اور ممتاز شخصیتیں

مدھیہ پردیش کی مومن انصاری برادری[1] یوپی اور جنوبی و مغربی ہند کی برادری کے مقابل میں پس ماندہ بھی نہ تو اتنی فعال تھی اور نہ مالی اعتبار سے تنی خوشحالی اور نہ معاشی لحاظ سے اتنی مستحکم تھی پارچہ بافی کی صنعت کو اندور، بھوپال اور اوجین میں کچھ فروغ حاصل تھا لیکن برادری کا یہ جماعتی اور آبائی پیشہ اس صوبہ میں اتنا مقبول نہ تھا جتنی کہ دوسری صنعتیں بھی اور پیشے تھے، کثیر تعداد ملازم پیشہ تھی، خیاطی، دوکانداری اور چھوٹا موٹا کاروبار کرنے والے بھی کم نہ تھے۔ رتلام، بھوپال، اندور اور اوجین کی ملوں کے مزدوروں میں انصاریوں کی بڑی تعداد تھی۔

تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک سماجی اور طبقاتی شعور کا حامل تھا مگر تنظیمی اعتبار سے بکھرا ہوا اور پراگندہ تھا، اندور اور اوجین میں برادری کے باہمی تنازعات نے اندرونی تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ پراگندہ طبع لوگوں میں اس جماعتی انتشار نے بہت سارے الجھاوے پیدا کر دیے تھے اور جو باشعور افراد تھے وہ یہ کرب زیادہ محسوس کر رہے تھے۔ ان سے برادری کا یہ المیہ دیکھا نہ گیا۔ برادری کا حال یہ تھا کہ تمام صوبے میں شطرنج کے مہروں کی طرح بٹے ہوئے تھے، شاطر کھلاڑی اس سادہ لوح قوم کو بساطِ سیاست کے مُہرے بنا کر انہیں اپنے حریفوں کو شہ اور مات دینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اندور کے تین غیر سیاسی اور ملازم پیشہ حضرات نے برادری کی شکستہ کارگہ شیشہ گری میں جماعتی اتحاد و اتفاق کی روایات و اقدار کو شکستوں سے چُور ہوتا دیکھا تو انہوں نے مثبت اقدام کا مثلث بنا لیا، مگر اقانیم ثلاثہ کا ایک ستون کسی وجہ سے الگ ہو گیا لیکن محمود نشتری اور محمد الیاس انصاری نے مساعیٔ حسنہ سے مساوات و اخوت

---

[1] یہ ساری تفصیلات انصار سوونیر، اندور سے لی گئی ہیں۔ راقم مدیران کا شکر گزار ہے۔

کی تکمیریں دوں پر کھینچ کر دائرۂ عمل کو اتنا وسیع بنا دیا کہ ایک عظیم تنظیم بنام انصار مومن کانفرنس مدھیہ پردیش وجود میں آ گئی۔ یہ ۱۹۸۵ء کا یادگار سال تھا جس کے اغراض و مقاصد اس طرح ہیں:

(۱) برادری کے پسماندہ افراد کی تعلیمی، اقتصادی ترقی کیلئے کوشش۔

(۲) معاشی پسماندگی کے پیش نظر برادری کے پچھڑے پن کو دور کرنے کے لئے وسائل کی تلاش اور فراہمی۔

(۳) ذہین ہونہار طلباء و طالبات کی مالی معاونت اور برادری میں جو اعلیٰ تعلیم کی حیثیت [قابلیت] رکھتے ہیں ان کی حوصلہ افزائی۔

(۴) برادری کا مدھیہ پردیش کے ہر ضلع میں سروے تاکہ آبادی، پیشہ، تعلیم وغیرہ کے اعداد و شمار یکجا کئے جا سکیں۔

(۵) برادری میں پائی جانے والی سماجی برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش نیز مسلمانوں کے دیگر پسماندہ طبقوں سے باہمی میل جول تاکہ اسلامی بھائی چارگی کا احساس قائم ہو سکے۔

اندور کی جماعت انصار کے نوجوانوں نے مسلم بھائیوں کی تقریبات میں کھانا پکانے اور کھلانے کے ظروف اور دیگر لوازمات وغیرہ رعایتی کرائے پر دینے کا معقول انتظام کیا تھا۔

اندور میں تعلیم کے فروغ کے لئے کئی سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔ سینٹ ابوایوب ایجوکیشن سوسائٹی "بیادگار میزبان رسول کریم صلعم حضرت ابوایوب انصاری رضؓ" قائم کی گئی جس کے ماتحت سینٹ ابوایوب انگلش میڈیم کے۔جی اسکول چل رہا ہے۔ اس سوسائٹی کا مقصد مادری زبان کو بھی فروغ دینا ہے۔ اس کے صدر حاجی آفتاب احمد انصاری ہیں (۱۹۸۵) سیکریٹری قطب الدین انصاری، خازن محمد اسلم انصاری اور محمود نشتری (بی اے کامل مینگ) سوسائٹی کے نائب صدر ہیں۔ ڈاکٹر رفیق محمد انصاری (ملقب ڈاکٹر صاحب) مذکورہ بالا اسکول کے سرگرم رکن رہ چکے ہیں۔ اکرام الحق نشتری بھی اسکول کی ترقی کے لئے سرگرم رہتے ہیں۔

اسلامیہ کریمیہ بائر سکنڈری اسکول اندور میں بھی برادری کے طلبہ و طالبات کافی تعداد میں موجود ہیں۔

صنعت و تجارت سے دلچسپی رکھنے والے افراد میں صرف صنعتکار ہی نہیں مل مزدور اور معمولی خواندہ لیکن خیر خواہ حضرات بھی شامل ہیں۔ اندور کے نیا پورہ محلہ میں برادری بر سوں سے بسی ہوئی ہے۔ نیا پورہ آزاد کو آپریٹیو اسٹور اشتراک تعاون اور بہبود باہمی کی بنیاد

پر اُستوار ہوا ہے۔ قاضی عبدالمجید انصاری نے ۱۹۵۹ء میں اس کی بنیاد ڈالی تھی۔ اندور رُنگر کوآپریٹیو سوسائٹی جب قائم ہوئی قاضی صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے تھے اور بھی دیگر سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں مثلاً نورانی سوسائٹی سہیل کوآپریٹیو ایسوسی ایشن سوسائٹی اور پبلک فنڈ سوسائٹی۔ اسی محلہ میں مسلم جماعت خانہ کمیٹی بھی ہے اس کے صدر سخاوت حسین رہ چکے ہیں جو برادری کے بڑے خیر خواہ اور سماجی ورکر ہیں، مشتاق احمد سونی اسٹار سوسائٹی کے بنیادی صدر ہیں۔ ڈاکٹر فہیم الحق انصاری (بی ایس سی۔ یل ایل بی۔ ڈی ایچ پی) آج سوسائٹی کے سیکریٹری ہے گھڑی والی مسجد کمیٹی کے بھی سیکریٹری رہ چکے ہیں۔

انصاری سوسائٹی اندور کی سب سے فعال سوسائٹی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کچّی مسجد کمیٹی بھی سرگرم رہتی ہے۔ تنظیم المسلمین دینی اور سماجی خدمات انجام دے رہی ہے۔ انجمن اصلاح المسلمین بھی اسی راہ پر گامزن ہے۔ نوجوانانِ جماعت انصار کی سرگرمیاں بڑی گوناگوں ہیں۔ جماعت سماجی، تعلیمی اور ورزشی امور میں بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ اندور میں دیندار لوگوں میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جو خالص صوفیانہ عقائد و طریقت کا حامل اور پیروکار ہے انجمن شیدائے اشرفی حلقۂ یارانِ طریقت ہے جس کا چشمۂ فیض کچھوچھہ شریف ہے۔

انجمنِ اسلام بھی اندور میں اپنا اثر رکھتی ہے۔ بیت المال ایک خاص اسلامی عمل ہے۔ اندور میں مومن برادری نے بیت المال قائم کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی افادیت مسلّم ہے۔ حاجی عنایت اللہ انصاری جو انصاری سوسائٹی و کچّی مسجد کمیٹی کے صدر ہیں وہ اس انجمن اسلام بیت المال کے نائب صدر بھی ہیں۔

اندور کی ورزشی روایات بھی قابلِ قدر ہیں، ہاکی اور فٹ بال کے مشاق اور مشہور کھلاڑی موجود ہیں، گولڈن ہاکی کلب نیاپورہ۔ ابتدا سے لے کر آج تک مشہور ہے۔

مومن برادری کی سیاسی تاریخ اور روایات میں حُبّ الوطنی، جہادِ آزادی اور قومی و ملّی دردمندی کے بہت سارے زرّیں اور جلی عنوانات نظر آتے ہیں۔ عموماً کانگریس اور اس کے ماتحت جماعت جمعیۃ العلماء کی طرف رُجحان رہا ہے آل انڈیا مومن کانفرنس سے ہر مومن کو ہمدردی اور لگاؤ رہا ہے۔ اندور میں جنتا پارٹی کے علاوہ اشتراکی خیالات رکھنے والے انصاریوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ بلدیہ کے انتخابات میں بھی مومن افراد حصہ لیتے تھے اور کامیاب ہو کر اپنے اپنے محلوں کی خدمت کرتے رہے۔ برادری

کے خاص محلے نیاپورہ، محلہ جونی اندور مومن پورہ، ساؤتھ توڑہ اور رانی پورہ ہیں۔ مگر کچھ خاندان دوسرے محلوں میں بھی آباد ہیں جیسے دولت گنج (اردو میدان)۔

اردو کے فروغ و اشاعت میں اندوری انصاریوں نے نمایاں کام کئے ہیں۔ بزم ادب لائبریری اور اردو میدان انہیں کی مساعیٔ جمیلہ اور اردو سے محبت کی یادگاریں ہیں۔ اندور اسلامی لائبریری میں بھی دینی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔

ممتاز شخصیتیں:

شعراء و ادباء

عبدالرؤف نشتر:

شب مالوہ کے ایوانِ ادب میں سب سے روشن چراغ تھے اور اسی چراغ سے بہت سارے نشتری شعراء نے کسبِ نور کیا ہے۔ صحافت کے آسمان کے تابندہ انجم تھے۔ خطابت میں شعلہ بیان مقرر تھے۔ سیاست کے میدان میں مزدوروں کے رہنما، کانگریس کے ہمنوا اور بلدیہ نگر نگم اندور کے دس برسوں تک سیاسی حلقہ میں نگینہ کی طرح جڑے رہے۔ بنکر سوسائٹی کے صدر رہ چکے تھے، مومن برادری کے مایۂ ناز فرزند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ۸۰ سال کی طویل عمر عطا فرمائی تھی۔

محمود ولد عبدالغفور مقادم۔ نشتری (بی۔ اے کامل)

آبائی پیشہ نوربافی تھا لیکن شاعری ذریعۂ عزت تھی۔ اردو اکادمی مدھیہ پردیش کی مالی اعانت سے آپ کا شعری مجموعہ "عکسِ خیال" شائع ہو چکا ہے۔ مضمون نگار بھی ہیں۔ عبدالرؤف نشتر کے شاگرد ہیں۔ اخبارات و رسائل میں بھی آپ کا کلام شائع ہوتا ہے۔

مقصود نشتری:

اسی حلقۂ خاندِ نشتری سے منسلک ہیں۔ انصاری برادری کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے مخلص اور بے لوث خدمت گذار ثابت ہوئے ہیں، اسلاف کی شاندار تہذیبی روایات اور ثقافتی میراث کی بقا و تحفظ کی خاطر جدوجہد کرتے ہیں جیسا کہ ان کی ایک نظم نما غزل سے ہویدا ہے ؎

کو بکہ مخالف ہیں زمانے کی ہوائیں   آؤ کہ یہ ثابت کریں انصاری ہیں ہم لوگ

اسلاف کی عزت کو سدا رکھیں گے قائم ثابت یہ کریں گے کہ وفادار [کنداں] ہیں ہم لوگ

<u>عبدالقادر قیصر اندوری</u>

برادری کے ممتاز فرد ہیں اور ذہین شعرا میں منفرد شعور۔ خود مزدور تھے اور مزدوروں کے ساتھی تھے اور بنکر سوسائٹی کے صدر رہے۔ شعری مجموعہ "قصر سخن" وسطی ہند کے قصر ادب کا حصہ ہے۔ سنہ ۱۹۸۰ء میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے رکن مقرر ہوئے۔ ۷۵ برس کی عمر پائی۔

<u>احمد نور ولد محمد عمر انصاری - نور اندوری</u>

مالوہ کے شعری و ادبی حلقوں میں بے حد معروف ہیں اور ہندوستان کے ارباب ذوق میں مشہور اور کل ہند مشاعروں میں مقبول جن میں اپنے منور کلام سے اجالا پھیلاتے ہیں۔ جب غزل پڑھتے ہیں تو مجسم غزل بن جاتے ہیں یہی ان کے شعری مجموعے کا بھی نام ہے۔

<u>شکیل احمد انصاری (ایم کام)</u>

شاعر نہیں پر شعر فہم ضرور ہیں۔ سماجی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑے جوش و ولولے سے حصہ لیتے ہیں، افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔ کتاب خواں بھی ہیں اور صاحب کتاب بھی۔ قومی و ملی اور خصوصاً برادری کی خدمات کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے۔

<u>مسعود نشتری اشرفی</u> (بی۔ اے) جامع صفات شخص ہیں، نشتری سے نشان ملتا ہے کہ آپ بھی عبدالرؤف نشتر کے حلقۂ تلامذہ میں ہیں؛ اشرفی کا لقب کسوٹی ہے اس بات کو پرکھنے کے لئے کہ آپ بھی اقلیم تصوف کے 'سکۂ نوبہار' ہیں۔ انجمن رشید امیان اشرفی میں آپ کی سیکریٹری شپ کا سکہ چلتا ہے۔ خوشنویسی کا بھی شوق ہے اور خوش مزاج بھی واقع ہوئے ہیں، تزئین کاری کے فن سے واقف ہیں۔

<u>اکرام الحق نشتری</u>: خوش فکر شاعر ہیں۔ انصار سوسائٹی اور سینٹ ابو ایوب انصاریؓ اسکول کے "انصار اللہ" میں سے ہیں، خوشنویس، خطاط، کاتب، کہانی نویس، افسانہ نگار اور تزئین کار ـــ جملہ فنون کے سادہ و پرکار فنکار ہیں۔

<u>اسرار الحق نشتری</u>: ثقافتی جلسوں اور مشاعروں کے جانے پہچانے شخص ہیں۔ ڈائمنڈ ہاکی کلب کے کھلاڑی بھی ہیں۔ آئینٹ ہاکی کلب گرین اسٹار فٹبال کلب کے کپتان ہیں اور جماعت انصار کے سرگرم رکن ہیں۔ نیز برادری کے کاموں سے وابستہ ہیں۔

سماجی خدام:

چودھری عبدالباری: محلہ نیاپورہ انصار برادری کے چودھری تھے اور اسی ناطے سے تمام تقریبات کے صدر نشین رہتے۔ ان کی ذاتِ گرامی سے برادری کو بڑے فائدے پہنچے۔ انصار کمیٹی کے بانی اور آزاد کوآپریٹیو اسٹور کے بھی صدر رہے۔ تقریباً ۶۵ سال کی عمر پائی۔

حاجی منو مقادم: جو اندور مومن پورہ کی برادری کی بڑی فعال اور باعمل شخصیت تھے بنکر سوسائٹی کی رکنیت حاصل تھی، برادری کے بڑے خیر خواہ تھے۔ ۸۰ سال کی طویل عمر پائی۔

حاجی عنایت اللہ انصاری: انصاری سوسائٹی و کچی مسجد کمیٹی کے صدر نشین تھے نائب صدر انجمن اسلام بیت المال کے ناطے سے آپ کی شخصیت قابلِ احترام تھی۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کے خازن تھے۔ اپنے زمانے کے زبردست کھلاڑی تھے ہاکی، فٹ بال اور والی بال سے خاص لگاؤ تھا۔

چودھری بدرالدین انصاری: چودھری ہونے کے ناطے برادری میں بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ برادری کی شادی و غم میں شریک رہتے اور مشیر کی حیثیت سے مانے جاتے تھے۔ ۵۲ سال تک مل میں مزدور رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بچوں کو دینی تعلیم دیتے ہیں اور قرآن کریم کا ناظرہ کراتے ہیں۔

حاجی قطب احمد انصاری: سینٹ ابوایوب انصاری ایجوکیشن سوسائٹی اور کئی دیگر اداروں کے صدر رہ چکے ہیں۔ انصاری سوسائٹی کی مجلس عاملہ میں تھے تنظیم المومنین کی منتظمہ کمیٹی کے رکن رہے، خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتے ہیں۔

قاضی عبدالمجید انصاری: قاضی کا لقب بتلاتا ہے کہ عہدۂ قضاۃ کا آپ کے خاندان کو شرف حاصل تھا ۱۹۵۹ء میں آزاد کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۶۲ء میں اندور بنکر سوسائٹی کے صدر بنائے گئے ۱۹۷۰ء میں اندور مومن کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے ۱۹۶۰ء سے نیاپورہ مدینہ مسجد کے امام اور مدرسے کے مدرس رہے ۱۹۶۵ء میں دوبارہ مومن کانفرنس اندور کے صدر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

عبدالوحید انصاری (ایم۔ اے ایس اے ایس): آپ مدھیہ پردیش مسلم ایجوکیشن سوسائٹی جبلپور کے جنرل سیکریٹری تھے جب سے ریلوے میں آڈیٹر بن کر آئے ہیں تو اندور ہی کے

انصاریوں میں شمار ہونے لگے ہیں۔

حاجی یار محمد انصاری: انصاری سوسائٹی کے خازن ہیں۔ بیت المال کی رکنیت حاصل ہے۔ بڑے مخلص خادم قوم ہیں برادری کی فلاح و بہبود کے لیے کئی کام انجام دے رہے ہیں۔

سخاوت حسین: سماجی ورکر ہیں، برادری کے لیے بڑا دردمند دل رکھتے ہیں۔ مسلم جماعت خانہ کمیٹی نیاپورہ کے صدر ہیں۔ صنعتکار ہیں اور نیو الائیڈ اسٹیل انڈسٹریز کے مالک ہیں ۱۹۸۵ء میں کل ہند مومن کانفرنس کے اندور اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

آفتاب احمد انصاری (بی اے ایل ایل بی): آل انڈیا ٹیکسٹائل ایسوسی ایشن سے ویونگ (بنائی) میں ڈپلوما حاصل کیا ہے، کئی سال سجن مل رتلام میں سپروائزر رہے، پھر دیو ز مل اوجین میں ڈپٹی ویونگ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ برادری کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور اپنی شناخت برقرار رکھی ہے۔

مشتاق احمد سرفی: کئی سوسائٹیوں سے وابستہ ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں اسٹار سوسائٹی کے بانی صدر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں بزم ادب لائبریری کی نشاۃ ثانیہ آپ کے ہاتھوں ہوئی ۱۹۸۳ء میں سہیل کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور بانی صدر بنے، نورانی سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے ایک بلڈنگ تعمیر کرائی۔ پبلک فنڈ سوسائٹی کے ممبر رہ چکے ہیں تحریک گنج مسجد کے خازن، پختہ مسجد اور کچی مسجد ساتی پورہ اور جامع مسجد اندور کے متولیان میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔

قطب الدین انصاری (بی اے): اندور کے ممتاز افراد میں سے ہیں۔ انصاری سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔ سینٹ اپالوب انگلش میڈیم کے۔ جی۔ اسکول اور مسلم مسافر خانہ کے سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ مدھیہ پردیش جنتا پارٹی، اقلیتی فورم کے جنرل سیکریٹری تھے۔ انجمن اصلاح المسلمین اور مسلم پرسنل لا بورڈ اندور کے سیکریٹری کی حیثیت سے دینی اور سماجی میدان میں سرگرم رہے۔ کئی مسجدوں کے متولی ہونے کا شرف حاصل ہے بھوپال تک آپ کی سرگرمیوں کا بازار گرم ہے۔ برادری کے بے لوث خدمت گار ہیں۔ ان اوصاف حمیدہ کے علاوہ قطب الدین انصاری آسمان صحافت کے درخشاں ستارے بن کر چمک رہے ہیں۔

محمد سلیم انصاری (بی کام): کئی میدانوں کے سرگرم سپاہی ہیں سیاست میں عمل دخل ہے، سماجی خدمات کی لگن ہے اور قومی تنظیموں سے وابستگی ہے۔ جنتا پارٹی اندور کے

سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ سینٹ ابوایوب انصاری ایجوکیشنل سوسائٹی کی مجلس عاملہ میں خازن تھے۔ ان کے علاوہ انصاری سوسائٹی کے مدد سے دلچسپی لیتے ہیں۔ انجمن اصلاح المسلمین کے رکن رہے اور برادری کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ کارپوریشن کا الیکشن لڑ چکے ہیں۔

حاجی مشتاق احمد انصاری: جنتا پارٹی کے سرگرم رکن ہیں۔ اور حلقہ نمبر ۴ کے صدر رہے۔ گوا ہندو مسلم فیڈریشن کے سوبالی صدر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑے جوش و ولولہ سے حصہ لیتے ہیں۔ اور انصاری برادری کی خدمت کو مقدم رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر فیض محمد انصاری: ۱۹۳۴ء سے ۱۹۶۸ء تک کپڑا مل میں ملازم رہے۔ مل مزدوروں میں اپنی خوش مزاجی اور ہمدردی کے باعث ڈاکٹر صاحب کہلاتے تھے شاید اس لئے کہ ان کی دلداری جراحتِ دل کے لئے مرہم کا کام دیتی تھی۔ مزدوروں کے لیڈر بھی تھے۔ ایم پی کے الیکشن میں آزاد امیدوار تھے۔ برادری کے ایک جیالے فرد تھے۔ انصاری سوسائٹی کے نائب صدر اور ابوایوب اسکول کے سرگرم رکن تھے۔ دس سال تک قبرستان کمیٹی کے ناظم اعلیٰ رہے۔

محمد جمیل انصاری: نیا پورہ کوآپریٹیو اسٹور کے صدر رہے (۱۹۸۵ء)۔ برسوں تک احمد آباد مل میں ملازم رہے پھر اندر کمیشن فرم میں کام کرتے رہے، برادری کے سرگرم اور فعال خادم قوم ہیں۔

عبدالحمید انصاری: انجینئر ہیں، انسٹی ٹیوشن آف انجینیرس (انڈیا) سے ڈپلوما حاصل کیا۔ بڑے محنتی شخص ہیں، خاموشی سے قوم کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔

محمد نوشاد انصاری: (ایم کام)، بڑی محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ زمانۂ طالبعلمی میں بھی سیاہی کا کام کرکے پڑھائی جاری رکھی اور منزلِ مقصود کو پہنچے اور سی پر دکر خدمت شخصیت حاصل کی۔ سلامیہ کریمیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں درس و تدریس دیتے ہیں اور صوبہ میں تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لئے بڑی جد وجہد کرتے رہتے ہیں۔

جعفر علی انصاری (ایم کام): ہاکی کے بڑے اچھے کھلاڑی ہیں۔ برادری کے ذہین و ہونہار نوجوان ہیں۔ ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائٹیز میں سب آڈیٹر ہیں۔

محمد شبیر انصاری عرف بچو بھائی: کانگریس آئی کے سرگرم رکن ہیں۔ پولس صلاح کار کمیٹی

کے ممبر اور مسلم جماعت خانہ کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہر ممکن کوشش کرتے رہے
بجلی ڈیکوریشن کے ماہر الیکٹریشین بھی ہیں۔

عبدالوارث انصاری: جنتا پارٹی کے سرگرم رکن اور حلقہ کے سیکریٹری ہیں، مسلم ٹرسٹ کے جوائنٹ سیکریٹری کی حیثیت سے قوم و ملت کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدمتِ خلق کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

نور الامین انصاری (امین پہلوان): ورزش، اکھاڑہ اور پہلوانی برادری کی جماعتی روایت کا ایک مضبوط و توانا پہلو ہے امین پہلوان کئی کشتیاں لڑ چکے ہیں، نوجوانانِ جماعت انصار اندور کے پندرہ برسوں تک صدر رہے۔

ڈاکٹرس

ڈاکٹر مسز شوکت رحمٰن:

اندور کی برادری میں ڈاکٹروں کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور مستورات کے لئے خاتون ڈاکٹر کا وجود ابھی تک محبوب ہے۔ ڈاکٹر مسز شوکت رحمٰن (ایم بی بی ایس ڈی جی او) مقبولات میں سے ہیں، آپ نے اقوام متحدہ کی جنرل کالج کے انٹرنیشنل مقابلے میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور ڈاکٹری کے امتحانات میں امتیازی مقام حاصل کرتی رہیں۔ ڈی جی او کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل ہوئی۔ نیا پورہ اندور، ہاجرہ میٹرنٹی اینڈ نرسنگ ہوم سے وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن انصاری (ایم بی بی ایس):

ہاجرہ میٹرنٹی اور نرسنگ ہوم نیا پورہ اندور آپ ہی کی محنتوں کا نتیجہ ہے اور قوم کی خواتین کے لئے ایک بے مثال زچہ خانہ۔ ڈاکٹر رحمٰن بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں میڈیکل کالج اندور کی ہاکی ٹیم کے کپتان تھے۔ گولڈن ہاکی کلب نیا پورہ اندور کے سیکریٹری رہ چکے ہیں، اندور اسلامی لائبریری کے بانی سیکریٹری تھے۔ جماعت اسلامی کے رفیق ہیں۔

ڈاکٹر عبدالغنی انصاری (ایم بی بی ایس): اندور کے مشہور فزیشین اور سرجن ہیں۔ رانی پورہ میں مطب ہے اور انصاری نرسنگ ہوم ہے۔ ایسوسی ایشن آف نرسنگ ہوم کے ممبر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید انصاری: میونسپل کارپوریشن ہسپتال میں ملازم ہیں۔ اسپورٹس سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہاکی کے کھلاڑی ہیں۔ تیراکی میں مشاق، گولڈن کلب نیا پورہ ٹیم کی

طرف سے بیرونِ شہر کے ٹورنامنٹوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ حق کلینک نیا پورہ میں بیٹھتے ہیں اور مریضوں کے مسیحا مشہور ہیں۔

صنعتکاروں، تاجروں اور دوکانداروں میں انصاری برادری کے جن چند افراد کا شمار ہوتا ہے ان میں اپسر البس والے حاجی مشتاق احمد انصاری، حاجی جی اینڈ سنز، ماسٹر محمد عثمان انصاری پلاسٹک ورکس والے، حاجی آفتاب احمد انصاری کا میٹرو آٹو انجینیرنگ اینڈ گرینڈنگ، ایچ انصاری کی نوبل انڈسٹریز۔ سخاوت حسین انصاری کی نیو الائیڈ اسٹیل انڈسٹریز، محمد انور انصاری اور محمد نثار انصاری کی شبیر انجینیرنگ ورکس وغیرہ مشہور ہیں۔ مشتاق احمد انصاری اور برادران کی شاد ہوٹل بھی اندور میں مشہور ہے۔

اوجین کی جماعتِ انصار مومن

اوجین کے چودھری محمد بشیر انصاری[1] اور ان کے چند ہم خیال دوستوں نے ۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء کو برادری کے باشعور اور سنجیدہ حضرات کے تعاون سے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں برادری کی اصلاح اور فلاح وبہبود کے مسائل پر غور وخوض کرنے کے بعد جماعت انصار مومن کا قیام عمل میں لایا گیا، چودھری محمد بشیر انصاری کو جماعت کا صدر مقرر کیا گیا اور ایک مجلس عاملہ کی تشکیل کی گئی اور ایک دستور مرتب کیا گیا اور ممبر سازی کی مہم چلائی گئی۔ اس طرح جماعت مستحکم ہوتی گئی اور اس کا دائرۂ عمل پھیلتا گیا ہر سال یوم جمہوریہ کے موقع پر اس کا سالانہ اجلاس ہونے لگا اور جماعتی اتحاد واتفاق قائم کرنے کے لیے مختلف منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا اور عملی اقدام کئے جانے لگے، ان مساعیٔ حسنہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ برادری کے افراد میں اخوت کے رشتے استوار ہوئے اور شادی بیاہ، موت میت اور دیگر تمام تقاریب میں شانہ بشانہ کام کرنے لگ گئے اور باہمی اشتراک تعاون کے جذبے میں دن بدن خلوص اور محبت سے نکھار آنے لگا۔

---

[1] خضر رسول نمبر ۱۹۷۵ء جماعت انصار مومن: صدر چودھری محمد بشیر انصاری۔

دستور کے نکات کی بنیاد مساوات اور اخوت پر رکھی گئی تھی، شادی بیاہ میں فضول خرچی، نمائش تموّل اور جہیز میں مرعوب کرنے کے لئے، ضرورت سے زیادہ اور استطاعت سے باہر ساز و سامان دینے کا رواج ختم کردیا گیا۔ نادار لوگوں کی شادی کے وقت میں مدد کر کے گھر بسایا جانے لگا، بیکس اور غریب کی میت کی تدفین و تکفین کے سارے اخراجات کا بار جماعت اٹھاتی ہے اور "سیوم" تک سارے کام کمیٹی کے ممبران اپنے ہاتھوں اور جماعت کے پیسے سے کرتی ہے میت کے دن کھچڑی جماعت کی جانب سے پکاکر کھلائی جاتی ہے بعض صورتوں میں میت کے پسماندگان اگر صاحب استطاعت ہوتے ہیں مگر ایسے رنج و غم کے موقع پر خود ہی سارا کام انجام نہیں دے سکتے تو کمیٹی کے ممبران خود ہی سارا کام انجام دینے کے بعد اخراجات کا حساب صاحب خانہ کو دے دیتے ہیں تاکہ وہ حسب سہولت ایک ماہ کے اندر رقم جماعت کو واپس کردے چرم قربانی وغیرہ جمع کر کے اس کی فروخت سے مستضعفین اور ضرورتمندان کی مدد کی جاتی ہے۔ بے روزگار افراد کی مالی استعانت کر کے جماعت کوئی چھوٹا موٹا سا دھندا شروع کرادیتی ہے یا وسیلۂ رزق کے لئے سلائی مشین، چارپہیوں والا ٹھیلا یا تجارت کا سامان خرید کر دے دیا جاتا ہے۔

۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک ۹ سال کے درمیان جماعتِ انصار نے ادجین کے غریب حاجتمندوں کو ۲۵ سلائی مشین اور تین ٹھیلے عطا کئے، علاوہ ازیں غریب، نادار طلبہ، مریض افراد اور اپاہج لوگوں کی مالی مدد بھی کرتی رہتی ہے۔

جماعت نے برادری کے معاشرے کو تمام سماجی برائیوں سے پاک اور منزّہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، دستور کے تحت خرافات اور برائیوں کے انسداد کے لئے جہاد کررہی ہے، قوم کے اتحاد و اتفاق کو ایک مرکزی حیثیت دینے کے لئے جماعت خانہ کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے (۱۹۸۵) اس طرح برادری کی تقریبات کے انعقاد کے لئے یہ جماعت خانہ ہر لحاظ سے ایک افادی حیثیت کا حامل ہو جائیگا۔ اسی عمارت میں ایک مدرسۂ اطفال کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ ادجین شہر کی جماعتِ انصار مومن کی دہ سالہ کارگذاریوں کی مختصر روداد ہے۔

لہ انصار سووینیر، ۱۹۸۵ء - جماعت انصار مومن: مسز پردھری محمد بشیر انصاری

اوجین کے ممتاز انصاری حضرات:

اوجین کے تاریخی شہر میں اردو کی نشوونما اور فروغ کے لئے انصاری ادبا و شعرا محدود وسائل کے باوجود جان توڑ کوشش کرتے رہتے ہیں۔ عبدالرؤف قمر انصاری بزم اہل ادب اوجین کے سیکریٹری ہیں آپ کا مدھیہ پردیش کے نامور شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے آپ کا کلام نشر ہوتا ہے۔ جماعت انصار مومن شہر اوجین کے سرگرم رکن ہیں۔

محمد الیاس انصاری (بی اے) ادبی و سماجی سرگرمیوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔ محمود نشتری (بی اے کامل علیگ) کے ساتھ مل کر آپ نے ۱۹۸۵ء میں انصار اندور کے نام سے ایک سوونیر نکالا تھا۔ اس کے مدیر اول الذکر اور مؤخر الذکر معاون (مدیر) تھے۔

محمد ذاکر انصاری: جماعت انصار مومن شہر اوجین کے نائب صدر ہیں (۱۹۸۵ء) اور برسوں سے برادری کی سماجی ترقی اور بہبود کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ جماعت خانہ کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ کی جد و جہد قابل تحسین ہے۔ بڑے مخلص اور محنتی سماجی خادم ہیں۔ مانک پورہ اوجین میں قیام رکھتے ہیں۔

چودھری محمد بشیر انصاری: قوم کے سردار یا چودھری ہیں۔ اسی لئے بڑی عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جماعت انصار مومن شہر اوجین کے گذشتہ دس برسوں سے صدر ہیں (۱۹۸۵ء) غریبوں کے ہمدرد ہیں بے آسرا لوگوں کا سہارا ہیں، جماعتی نظام کو استحکام پہنچانا اور برادری میں نظم و ضبط رکھنا آپ کا نصب العین ہے۔ مرگیٹ دولت گنج اوجین میں رہتے ہیں۔

عبدالرشید انصاری: جماعت انصار مومن کے فعال سیکریٹری ہیں، جمعیتہ العلمائے ہند شاخ اوجین کے نائب صدر اور ضلع وقف کمیٹی کی مجلس عاملہ کے رکن بھی ہیں، کانگریس (آئی) کے سرگرم رکن ہیں۔ کل ہند مومن جماعت [کانفرنس؟] سے بھی وابستہ ہیں۔ ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔

محمد ایوب انصاری: فنون لطیفہ کے دلدادہ ہیں، مومن جماعت انصاری کے ایک

خوشنویس کاتب ہیں اور جماعتی کاموں کو خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں، ایم پی، الیکٹری سٹی بورڈ میں ملازم ہیں، محلہ کوٹ میں رہتے ہیں۔

محمد نظیر انصاری: جماعت انصار مومن کے خازن کے عہدہ پر سرفراز ہیں، جماعتی فرائض کو بڑی مستعدی اور دیانتداری سے بجالاتے ہیں، مخلص اور فعال خادم قوم ہیں۔ اتفاق و یگانگت کے زبردست مبلغ ہیں۔

محمد نصیر انصاری: برادری کے سرگرم، مخلص اور فعال نوجوان فرد ہیں، جماعتی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں، جماعت انصار اوجین کی نوجوان کمیٹی کے سیکریٹری ہیں۔ دولت گنج اوجین کے رہنے والے ہیں۔

ارشاد احمد انصاری (بی اے) جماعت انصار نوجوان کمیٹی کے سرگرم رکن ہیں اور برادری کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں اور پیش پیش رہتے ہیں۔

عبدالرب انصاری انجمن ترقی اردو کے نائب صدر ہیں۔

وسطی ہند میں ہوشنگ آباد، ریوا اور بھوپال میں بھی برادری کثرت سے آباد ہے، بھوپال میں "خان" انصاریوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ نیو بھوپال شہر کھلنے کے بعد بنکر زیادہ تر انصاری حضرات تھے۔ لکھنؤ کے طیب انصاری اس وقت میں اسپورٹس کے ڈائریکٹر تھے۔ آپ ہاکی کے کھلاڑی کی حیثیت سے بیرونی ممالک میں بھی جانے پہچانے جاتے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں بطور ہاکی پلیئر کے ہندستان کی نمائندگی کی تھی۔ ان کے اکلوتے صاحبزادے شعیب انصاری کم از کم تیرہ ممالک اسلامی کے آڈیٹر جنرل ہیں آپ پاکستان میں اسی عہدے پر فائز رہے۔

طیب انصاری فی الحال جدہ میں ہیں اور ایک فعال کھلاڑی کوچ ہیں۔

بھوپال ہی کے محمد انیس انصاری (بی اے) ہاکی، کرکٹ اور فٹبال کے مور کھلاڑی ہیں آپ ایک کامیاب افسانہ نگار اور ناول نویس بھی ہیں، مدھیہ پردیش اردو اکادمی میں پروگرام اسسٹنٹ اور کارگزار اکاؤنٹنٹ رہ چکے ہیں۔

مدھیہ پردیش کے شہروں میں بافندگی کی صنعت کو اتنا فروغ حاصل نہیں رہا، اسی لئے زیادہ تر افراد ملازم پیشہ ہیں۔ اوجین میں انصاری ٹریڈرس پاور لوم فیکٹری کے کپڑے بڑے مقبول ہیں۔ ماسٹر نظیر احمد انصاری امریکن ٹیلرس کے مالک کنٹھال اوجین کے ماہر ہوئے خیاط ہیں۔

پچیسواں باب

کامٹی اور ناگپور کی انصاری برادری

کامٹی[1] — مالیگاؤں کے مقابلے میں جواں تر اور زرخیز شہر ہے جو انیسویں صدی کے
اوائل میں انگریزی سلطنت کے نقشے پر وسط ہند میں نمودار ہوا۔ کنہان ندی کے دو پہلے پہلو
میں پرسوں سے گھاس پھوس کی چند جھونپڑیوں پر مشتمل آدھا ادھورا گاؤں تھا، آب و
ہوا کے لحاظ سے یہ صحت بخش اور پُر سکون جگہ تھی۔ انگریزوں اور اپا صاحب مادھوجی کے
مابین ۱۸۱۷ء کی سیتا بلڈی کی فیصلہ کن جنگ میں جب اور بھونسلوں کو شکست ہوئی
اور ناگپور کا قلعہ سر ہوا اور انگریزوں کو سربلندی نصیب ہوئی تو کامٹی کے نصیب جاگے تب دیکھا
کہ پانچ ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین پر انگریز فوج کی چھاؤنی قائم ہو چکی ہے۔ کنٹونمنٹ بورڈ
قائم ہوا اور پانچ سال بعد تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا، فرنگیوں کو دیہی زندگی سے طبعی لگاؤ
رہا ہے، کامٹی کی آب و ہوا ان کے مزاج اور طبیعت کی موزونیت سے موافقت رکھتی تھی،
اس فوج میں مدراس کے ہندو اور مسلمان فوجی بھی تھے جو غدر سے قبل اور اس کے بعد بھی
اپنی جانبازی اور وفاداری کا ثبوت دے چکے تھے اور مدراس پائنرس رجمنٹ کے نام سے یہ
ہندوستانی دستہ مشہور تھا۔ نواب باندہ پر انگریزوں نے فوج کشی کی تو اسی دستے کا نواب
کی شکست میں بڑا ہاتھ تھا، باندہ کی تاراجی اور مالی استحصال نے مدراس رجمنٹ کو مالا مال
کر دیا، یہ فوجی پھر کامٹی ہی کے ہو کر رہ گئے اور ان میں شہر کی عظیم المرتبت اور متمول شخصیتیں
پیدا ہوئیں اور ان کی نسل یہیں پھولی پھلی۔ فوجی چھاؤنی کی ہماہمی دیکھ کر ہزاروں کاروباری

---

[1] اس باب کے لئے [illegible] مترجم نے مندرجہ ذیل مصادر سے کلی طور پر استفادہ کیا ہے جس کا اعتراف کیا جاتا ہے
ان میں ڈاکٹر محمد شریف، مدیر ساحل، ظہیر وارثی، عبدالرحیم نشتر (مضمون)۔ شیخ محمد غلیم الجبوری، رحمت اللہ اختر
حکیم عزیز قدوسی، زمان انصاری وغیرہ اور مصنفین کی تعلیقات شامل ہیں ان تمام مصادر کے بے راقم
اپنے دوست محمد ایوب انصاری (کامٹی) ڈائرکٹر انڈیا کمپیوٹر اینڈ کمیونیکیشن سروسز) کا
حد درجہ مشکور رہے۔

دکانداری کرنے لگے اور آبادکاری میں روز بروز اضافہ ہونے لگا چنانچہ ۱۸۶۸ء میں کامٹی کی آبادی ۵۰۹۲۰ کے لگ بھگ ہوگئی، انتظامی امور کے لئے شہر اور چھاؤنی (کنٹونمنٹ) کو دو منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا اس سے شہر کی تجارت کو فروغ ملا، دکانیں چمک اٹھیں، اناج اور روئی کی منڈیاں ذخائر سے معمور ہوگئیں — اور جب ۱۸۵۷ء کے قہرمانی دور کے بعد یوپی کے نوربان انصاری حضرات ترکِ وطن کر کے کامٹی میں سکونت پذیر ہونے لگے تو بازاروں اور منڈیوں کی رونق اور بڑھ گئی اور محلّوں سے کرگھوں کا شور بلند ہونے لگا۔

انصاری مہاجرین کی کامٹی میں آمد

غدر کی فتنہ سامانی — خانہ ویرانی کو کیا کم تھی! حکومت کی نظروں میں جو مجرم تھے وہ دار و گیر کی آزمائشوں سے گذرے جو مشتبہ ٹھہرے وہ لائق تعزیر بنے شورہ پشت جلاہوں کی کارگاہوں کو جلایا گیا، ان کا مال و متاع لوٹ لیا گیا، چرخے کی ماں ٹوٹ گئی اور کرگھے کا دم اُکھڑ گیا، ان کی قبائے زندگی میں یوں ہی درد کے ہزاروں پیوند لگے رہتے تھے۔ ایک ایک کر کے بخیے اُدھڑ گئے اور ان کے پاؤں خود اپنی زمین سے اُکھڑ گئے، گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ اور یہ ساری سناٹوں کی بستیاں بن گئیں۔ بیسویں صدی سے پہلے ہندوستان کی تاریخ میں انسانوں کا ایسا عظیم "خروج" وقوع پذیر نہیں ہوا تھا، قافلے در قافلے نکل پڑے ایسی آشفتہ حالی اور معاشی بدحالی میں بھی برادری نے جماعتی روایت اور اخلاقی و معاشرتی اقدار کا ہر قدم پر خیال رکھا۔ پنچ کے ساتھ ہے پنچایت کے سردار، مہتو یا چودھری کا احترام برقرار رکھا، اسی لئے جب ہر گاؤں کے سردار نے ہجرت کا فیصلہ کیا اسی کے مطابق گاؤں کی برادری نکل پڑی مگر وہ افراد جو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل نہ تھے۔ بچھڑ کر رہ گئے، یہی زندہ پونجی تھی جسے اللہ کے حوالے کر کے "بسپردم بتو مایۂ خویش را" کہتے ہوئے کارواں در کارواں نکل پڑا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
دل میں رکھتے تھے جو اک حسرتِ تعمیر سو ہے

— یہی حسرتِ تعمیر برادری کی حوصلہ مندی کی تعبیر بن گئی، انوارِ نوربافی سے سارا وسطی اور مغربی ہند اور دکن منور ہوگیا، ہر قریہ، ہر بستی جہاں جہاں سے کرگھوں کے ضرب کی آوازیں اٹھتی سنائی دیں یہ دہیں درویشانہ صفت جمع ہوگئے اور پھر آہستہ آہستہ دوسری بستیوں

میں تقسیم ہو گئے، صنعت بافندگی کی نشاۃِ ثانیہ ان کی حیاتِ نو کی علامت بن گئی۔

کامٹی میں انصاری مہاجرین کے ممتاز خاندان اور مشاہیر

۱۸۵۷ء کے قیامت خیز اور شورش انگیز دور میں مئو کا مردم خیز قصبہ اور اعظم گڈھ کا ضلع "کوئی ویرانی سی ویرانی ہے" کا نوحہ پڑھ رہے تھے، ہزاروں خاندان اجڑے۔ اور اس اجڑے دیارِ پورب کے تباہ حال نوربافوں نے تازہ بستیاں آباد کرنا شروع کر دی تھیں کامٹی میں مئو کے آشفتہ حال بنکروں کی تعداد زیادہ تھی، یہ لوگ اپنے خاندانوں، قرابت داروں اور ہم وطنوں کے ساتھ سردار کی سربراہی میں ایک ہی علاقے میں بستے گئے، یہ ایک فطری عمل تھا اس طرح ان کے مختلف محلے آباد ہو گئے، اور برادری کی تمام وطنی روایات، رسوم و رواج اور جماعتی اقدار اس نئے وطن میں جڑ پکڑنے لگے۔

پنچایتی نظام برادری کے مدنی تصورات، معاشرتی اختلاط اور جماعتی تنظیم کی عظیم روایات کا سب سے اہم مظہر ہے اور جماعتی و انفرادی زندگی کا محور، مہد سے لے کر لحد تک "پنچ" کا دستور برادری کے لئے منشور تھا۔ کامٹی میں سردار خاندانوں کا موروثی اقتدار قائم رہا، پنچایت قائم ہوئی اور مرکزی پنچایتی نظام۔ جو اسی بھی فعّال رہی۔

محمد کریم امرائی (مئو) تھے جن کی انصاری برادری کے سرپنچ تھے ان کے چار بیٹے تھے: عبد اللہ، عبد الوارث، محمد اسماعیل اور حافظ محمد جمال الدین۔ یہ خاندان کامٹی کا مہرِ درخشاں بن گیا۔

عبد اللہ سردار برادری کے پہلے سرپنچ تھے۔ برادری کی پہلی مسجد جو وارث پورہ محلہ میں تعمیر کی گئی تھی اس کے اعتبار سے اس کے سب سے بڑے متولی تھے اور وقف اسٹیٹ دوبائی کی مجلس عاملہ کے بنیادی رکن تھے ان کی تولیت کا زمانہ طویل تھا، مسجد کو وقف کردہ املاک نصف سے زیادہ انہیں کی کوششوں کے طفیل ہیں، ان کے ہاتھوں میں برادری کی جماعتی زندگی کی دنیوی قیادت کی باگ تھی۔ عبد اللہ سردار جنگِ آزادی کے دو سال بعد مئو سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے۔ ان کے بعد ان کے لائق فرزند محمد سعید ان کے جانشین بنے۔

محمد سعید (متوفی ۱۹۲۹) بجد خلیق، شریف الطبع اور ملنسار شخص تھے۔ زہد و تقویٰ آپ کے اوصافِ حمیدہ کے خاص پہلو تھے قومی اور سماجی خدمات کے صلے میں کنٹونمنٹ بورڈ

کے ممبر نامزد کیے گئے، جو اُن کے زمانے میں ایک بڑا سماجی اور شہری اعزاز تھا۔ جب ۱۹۲۷ء میں میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کی رکنیت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ قدیم مسجد وارث پورہ کے متولی اور برادری کے سرپنچ مقرر ہوئے تو محمد سعید نے علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت کے لیے کوششیں شروع کیں، ۱۹۱۰ء میں مقامی بااثر افراد قوم مومن کے تعاون سے مدرسہ سراج المومنین قائم کیا جو مسلمانان کامٹی کی سب سے قدیم درس گاہ ہے۔ حاجی عبدالرحمن سردار، ملا حاجی عبدالوارث اور حافظ محمد داؤد جیسی علم دوست اور مخلص ہستیوں کی مساعیٔ جمیلہ کا یہ روشن سراج ہے، جو ایمان افروز بنا اور مومنین کے لیے مینارۂ نور علم ہے۔ منشی محمد سعید اپنے عہد کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاعر اور استاد تھے۔ آپ مدرسہ کے مہتمم تعلیمات تھے۔ یگانۂ روزگار تھے اور سلیم الطبع شخصیت کے مالک تھے۔

محمد خورشید حق (متوفی ۱۹۶۲) منشی محمد سعید کے ہونہار بیٹوں نے آبائی میراث کی علمی و دینی روایات کو برقرار رکھا۔ محمد خورشید حق والد بزرگوار کی جگہ مسجد کے متولی بنے ۱۹۳۷ سے ۱۹۵۷ تک آپ مدرسہ سراج المومنین کے ناظم رہے۔ سیٹھ محمد احمد جو سیٹھ الٰہی بخش حاجی مرحوم کے واسطے سے ایک عالی مرتبت شخصیت تھے نائب متولی مقرر ہوئے۔ ناساعد حالات اور باہمی آویزشوں سے محمد خورشید حق کی دیانت دارانہ خدمات کو وہ حق تحسین نہیں ملا جو ان کا حق تھا پھر بھی وہ ایک اچھے منتظم اور سیاسی مدبر تھے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر انیس خورشید (حال مقیم پاکستان) بین الاقوامی شہرت کے ایک ماہر فن کتاب داری (لائبریری سائنس) ہیں کئی انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں۔ خورشید حق کی چھوٹی بیٹی ناگپور کے ہر دلعزیز شاعر شاہد کبیر سے بیاہی ہوئی ہیں۔ محمد سعید کے دوسرے بیٹے محمد یوسف سردار گوشہ نشین رہے۔

عبدالقادر انگر (م ۱۹۴۰ء) جو منشی محمد سعید کے چچا عبدالوارث کے صاحبزادے تھے برادری کے سردار مقرر ہوئے۔ عبدالوارث کے اکلوتے بیٹے تھے۔ تجارتی کاروبار امراؤتی تک پھیلا ہوا تھا ان کے والد بڑے کامیاب تاجر تھے پارچہ بافی کے کرگھے تھے۔ انگر تجارتی دیانت داری اور کاروباری ایمانداری کے ساتھ معاملات کرتے رہے جس کے نتیجے میں خوشحالی اور آسودہ حالی نصیب ہوئی۔ انگر مومن برادری کے سردار کی حیثیت سے فیصلہ کرتے وقت اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی جرم ثابت ہونے پر سزا کا مستحق

ٹھہرائے تھے۔

حمید جمال (متوفی ۱۹۸۰) حافظ محمد جمال الدین (م ۱۹۳۲) محمد ترسم خاندان کے مذہبی جمال کے پوتے تھے۔ والد کا خاندان ممالک متوسط و برار کا مشہور تاجر خاندان تھا۔ حمید جمالی موضع کندری ڈگرس ضلع ایوت محل میں پیدا ہوئے (۱۹۱۸) مدرسہ سراج المومنین کامٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ادیب فاضل کی سند لی اور ناگپور یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ میں اردو میں ایم۔ اے کیا۔ ربانی ہائی اسکول میں ۱۹۷۱ء تک درس و تدریس میں معروف رہے۔

حاجی سردار عبدالرحمٰن سیٹھ (متوفی ۱۹۲۸ء)

محمد عباد اللہ مئو کی انصاری برادری کے سردار تھے، بغاوتِ ہند کے زمانہ دار و گیر میں ہجرت کے لئے عنانِ عزیمت کامٹی کی طرف موڑی اور یہیں پناہ لی تجارتی میدان میں جولانیاں دکھلائیں تو فضلِ ربی نے دولت اور اولاد دونوں نعمتوں سے نوازا، دینداری اور تقویٰ کی زندگی بسر کرتے رہے، درویشانہ صفات کے مالک تھے، چار بیٹے تھے: ڈومن سیٹھ (متوفی ۱۹۰۴)، حاجی عبدالرحمٰن سردار (متوفی ۱۹۲۸)، عبدالکریم (متوفی ۱۹۱۱) اور محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ (متوفی ۱۹۲۰)۔

ڈومن سیٹھ اور عبدالرحمٰن سردار دونوں بھائی دینی و تعلیمی امور میں بڑی دلچسپی لیتے تھے والد کے بعد دونوں بھائی مسجد وارث پورہ کے متولی بنائے گئے ان کے ساتھ عبداللہ سردار والد بزرگوار حافظ عبدالشکور، حاجی سالار بخش اور عید و سردار صاحبان بھی تھے۔ حاجی فتح محمد جوان کے والد کے معاصرین میں سے تھے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتے تھے اور بچپن سیٹھ اور عظیم اللہ سردار کی طرح دستوری مجلس منتظمہ (قائم شدہ ۱۹۲۴) کے رکن تھے۔

۱۹۰۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کامٹی میں طاعون کے عفریت نے بیس ہزار کے قریب انسانوں کو نگل لیا، بساطِ حیات الٹ گئی تو سارا معاشرہ مفلوج ہو گیا، زندگی کے تار و پود تاراج ہو گئے، گھر یلو مکتبوں میں کرگھا چلانے والے میاںجی اور حفاظ حضرات جو تعلیم قرآن بھی ساتھ ساتھ دیتے تھے ان کا سلسلہ ٹوٹ گیا کیونکہ اس وبا میں بے غرض لوگ جو خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ اللہ کی خوشنودی کی خاطر قرآن کے ناظرہ اور

حفظ کی تعلیم دیتے تھے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس وقت کے ہوشمند حضرات کو یہ کمی کھٹکنے
لگی تو انہوں نے پہلی بار ایک مرکزی دینی درسگاہ قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس کے بانیوں
اور کارپردازوں میں اس وقت کی عظیم شخصیتیں تھیں۔ منشی محمد سعید، حافظ محمد داؤد،
سیٹھ حاجی الٰہی بخش حاجی منو اور سردار عبدالرحمٰن۔ مدرسۂ سراج المومنین (قائم شدہ
۱۹۱۸ء) انہیں بزرگانِ دین کا صدقۂ جاریہ ہے۔ اس مدرسہ کا تعلیمی افتتاح اس
وقت کی سب سے زیادہ مقبول و محترم مذہبی و علمی ہستی حاجی ملا عبدالوارث کے مبارک
ہاتھوں سے ہوا، شروع میں اس کی حیثیت ایک مدرسۂ شبینہ کی رہی جس میں کئی برس
حافظ محمد داؤد اعزازی طور سے معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے اس دوران مدرسہ
میں طلبہ کا رجحان بڑھنے لگا تو سردار عبدالرحمٰن کی انتھک کوششوں سے ایک نومسلم
مسماۃ رحمت بی صاحبہ کے مالی تعاون سے ۱۹۱۹ء میں ایک عمارت کی تعمیر عمل میں
آئی۔ اس سے پہلے حاجی سردار عبدالرحمٰن ـ آرمی کنٹراکٹر تھے۔ کنٹونمنٹ بورڈ کے
صاحب وقار رکن نامزد ہوئے اور دیگر قومی اعزازات سے نوازے گئے تھے وہ ایک
عظیم اور موثر شخصیت کے مالک تھے تعلیمی ترقی اور سماجی بہبود و فلاح کے لئے ہمیشہ
کوشاں رہے۔ ان کی سرگرمی میں لوگوں میں تعلیمی شعور اور شوق پیدا ہوا۔ ان رجحانات
کو ایک نئی جہت دینے کے لئے انہوں نے مدرسہ سراج المومنین میں تعلیمی اسناد
اور انعامات کی تقسیم اور تشہیر کے لئے تین سالانہ عظیم الشان ایسے جلسے کئے جن کی
یاد ابھی تک ذہنوں میں محفوظ ہے۔ عبدالرحمٰن سردار کثیر الاولاد تھے سات بیٹے
تھے: محمد اطہر، عبدالقدوس، محمد، عبدالشکور، محمد یوسف داؤد اور سلیمان۔ محمد عمر
اطہر انصاری کامٹی کے مشہور شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ (۱۹۲۴ء)

محمد عباد اللہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادے چمڑے کے ایک بہت بڑے تاجر تھے۔
مومن برادری کے سردار تھے عمائدینِ شہر اور رؤسائے قوم میں شمار ہوتے تھے، علم دوست
تھے اور عالموں کے قدردان اور مہمان نوازی میں سیر چشم واقع ہوئے تھے ان کے دو بیٹے
تھے۔ محمد رستم احقر اور محمد قمرالدین جو ماہ و قمر کی طرح تابندہ رہے۔ محمد رستم تعلیم شاعری
میں احقر تخلص رکھتے تھے لیکن کلام میں بجد مؤثر تھے۔ قمرالدین بین الاقوامی شہرت

کے فٹ بال کھلاڑی بنے، برسوں کاسٹی کی قدیم اور پہلی فٹ بال ٹیم انوارالاسلام کے
لاثانی کیپٹن رہے۔

محمد عظیم اللہ سردار۔ برادری میں بڑی اہم شخصیت کے مالک تھے۔ اعظم گڈھ سے
نقل وطن کرکے کاسٹی آئے۔ مسجد وارث پورہ (اسٹیٹ سوسائٹی) کے پہلے چار اکابرین مشیروں
اور متولیوں میں آپ بھی تھے، آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے محمد اسماعیل سرداری کے
منصب پر فائز ہوئے ان کے دو بیٹے تھے محمد حنیف محمد اسماعیل اور حاجی محمد (م ۱۹۰۹)
محمد حنیف کی ساری زندگی محراب ومنبر کے روبرو امامت کرتے گذری (متوفی ۱۹۶۹)۔
دو بیٹے وکیل احمد (متوفی ۱۹۰۵)، محمد خورشید اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ آپ شاعر تھے۔

سیٹھ محمد احمد: حاجی الٰہی بخش حاجی منو کی مشہور فرم کے سیٹھ محمد احمد نائب متولی
مسجد وارث پورہ تھے انہوں نے اپنے فرائض منصبی نہایت خلوص اور للہیت کے
ساتھ ۱۹۳۷ء تک بخوبی ادا کئے اور دس سال کے اندر اوقاف کی جائداد میں بڑا
اضافہ ہوا۔ نظام مسجد کے استحکام اور اوقاف کی نگرانی میں انہیں کے ساتھ حافظ
عبدالرحمٰن مؤذن کی کارگذاریاں بھی ناقابل فراموش ہیں، انہوں نے ۲۵ سال تک
خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ قلیل رقم بطور نذرانہ قبول کرکے مسجد اور عباد اللہ کی
جو خدمات انجام دیں وہ صرف معبود حقیقی کی رضامندی کے لئے وقف رہیں، سیٹھ
محمد احمد کے زمانہ تولیت میں جو تعمیری ترقیات ہوئیں ان میں ———
سیٹھ علیم الدین کا تعاون شامل حال رہا۔ آپ مجلس انتظامیہ کے رکن تھے اور سیٹھ
محمد احمد کے رفیق خاص تھے۔ ان دونوں کے ساتھ سیٹھ حاجی عبدالعظیم بھی مدرسہ
سراج المومنین کی ترقی وانتظام کے لئے عملی اور پرجوش کوششیں کرتے رہے۔ انہیں
مخلص خدام قوم کی رہنمائی میں ۱۹۲۲ء میں مدرسہ کی دوبارہ توسیع وتعمیر عمل
میں آئی۔ باہمی اشتراک سے قومی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور بازوئے پرواز کو قوت
ملتی ہے۔ حاجی علیم الدین ۱۹۵۲ء میں مدرسہ کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہے۔
۱۹۷۲ء تک یہ مدرسہ درجہ بدرجہ مینارۂ نور بنتا گیا اور جب عرصہ پہلے سے چوراسی
کے فیصلہ کے مطابق مدارس پر آڑھت داروں سے مال کی بکری پر جو ایک پیسہ فنڈ
دیا جاتا تھا وہ سلسلہ بند ہو گیا تو حاجی سیٹھ علیم الدین کی ذاتی کوششوں اور ان کے

رسوخ کی بنا پر مدرسہ کے مالی معاونین کا ایک مستقل حلقہ قائم ہوا انہیں کی کوششِ خاص سے وارث پورہ میں عبدالرزاق مرحوم کے وارث حاجی سیٹھ محمد عبداللہ بمبئی والے نے مرحوم کے دو مکانات مدرسہ میں وقف کئے جو مدرسہ کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گئے، حاجی علیم الدین کی سربراہی میں مجلس انتظامیہ کی کارکردگی اوجِ کمال پر پہنچی، ان کے معاونین میں حافظ محمد داؤد کے فرزند رشید حاجی جمال الدین داؤدی کا نام بڑا نمایاں ہے۔

الٰہی بخش نام کے ایک اور صاحب بھی مئو کے کاشی میں آباد تھے، بیحد نیک اور شریف النفس انسان تھے، انیسویں صدی کی آخری دہائی میں رحلت کی اور دو بیٹے محمد یحییٰ اور محمد بکا کو یادگار چھوڑے، دونوں بھائی ادبی ذوق رکھتے تھے اور شاعر کی حیثیت سے کاشی کی ادبی تاریخ میں ان کے نام شامل ہیں۔ رخت سازی ذریعۂ معاش تھا۔ محمد یحییٰ برق (م ۱۹۲۶ء) کے دو لڑکے ہیں: حفظ الکریم اور رحمٰن۔

محمد اسماعیل کے صاحبزادے محمد عبدالرحیم جوہر کا نام بطور شاعر مشہور ہوا، اجداد کا تعلق مئو سے تھا، یہیں کی خاک سے اٹھے اور کاشی کی سرزمین پر بسے۔ محمد جوہر بڑے دیندار شخص تھے اور ایمان و آگہی کے جوہر ایک سے ان کی زندگی کا دامن بھرا رہا۔ نعتیہ کلام اور ایک لڑکا ولکیں احمد جوہر اور بیٹی یادگار ہیں۔

محمد اسماعیل انصاری بھی مئو کی باوقار شخصیت تھے تین بیٹے تھے: میاں عبد المجید (م ۱۹۱۵ء)، عبدالواحد (م ۱۹۰۱ء) اور عبدالمجید آغا جو "آغائی" کے بانی بنے اور تینوں بیٹے محمد نفیس رحمٰن، انیس الدین اور منیر علی احمد "آغائی" کے آبائی لقب سے مشہور ہو کر بنکروں کے تعاون کی یاد دلاتے ہیں۔

شیخ محبوب نے قصبہ بہادر گنج (ضلع اعظم گڈھ) سے ترکِ تعلق کر کے ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور میں ہجرت کر کے آئے اور کاشی کی سرزمین سے رشتۂ وطنیت جوڑا۔ ایک نیک اور زندہ دل انسان تھے، خدا ترسی نے انہیں خدا کے بندوں کی نظروں میں خدر سیدہ بنا دیا، محمد رحیم اللہ خلف رشید تھے۔ یہ بھی سنت پدری میں اسی راہ پر چلے جو ہر مومن کا راستہ ہے۔ متقی اور دین پرور شخصیت تھے، سوتی کپڑوں کے تاجر تھے (م ۱۹۲۰ء) محمد شفیق اللہ عادل اکلوتے بیٹے تھے اور علیم اللہ بھائی تھے۔ محمد شفیق اللہ عادل ربانی ہائی اسکول کاشی کے بانیات میں رہے اور اس کو نئی زندگی دینے والوں میں سے تھے۔ کئی برسوں تک کاشی ویورس کوآپریٹو سوسائٹی

کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے۔

خان محمد کا سردار خاندان کامٹی کے قدیم آباد کاروں میں سے تھا، ان کے دو بیٹے تھے۔ دین محمد اور غلام محمد۔ غلام محمد کے بھی دو لڑکے تھے حافظ محمد عبداللہ اور عبدالرحمٰن دین محمد بینڈ لوم کپڑوں کے بڑے کامیاب تاجر تھے شہر کے ملک التجار تھے۔ رشتہ داروں کی مدد کرتے تھے اور صلۂ رحمی کا پُرخلوص جذبہ رکھتے تھے، شہر میں بڑے احترام کی نظروں سے دیکھے اور یاد کئے جاتے تھے۔ حافظ محمد عبداللہ ابن غلام محمد کو ۱۹۵۲ء میں مومن برادری کا سرپنچ مقرر کیا گیا تھا حافظ جی کے چار بیٹے تھے: ظہیر الحسن، حبیب الرحمٰن، محمد کبیر انصاری اور حافظ محمد نذیر۔

عبدالستار فاروقی (۱۹۰۵-۱۹۷۷) کامٹی کے ان مشاہیر میں سے ہیں جن کے بارے میں جتنا کچھ اور جا ہے وسعت مرے بیاں کے لیے نا۔ مایۂ ناز ہستی تھے اور بڑی متنوع خوبیوں اور اوصاف کی حامل شخصیت تھی ان کا خاندان مئو سے تعلق رکھتا تھا جہاں سے ان کے دادا ترکِ وطن کرکے آئے تھے، ان کے لڑکے عبدالغفور (م ۱۹۳۰) تھے اسی کنبہ کے محمد سلیم کے اکلوتے صاحبزادے سراج الدین سراج (م ۱۹۲۱) تھے جو کامٹی کے علمی، ادبی اور تعلیمی حلقے کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ عبدالغفور کے چار بیٹے تھے: محمد عبدالرحیم۔ عبدالستار فاروقی۔ عزیز الرحمٰن اور ریاض الرحمٰن۔

محمد عبدالرحیم صحت عامہ کے شعبہ (ناگپور) میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے، تعلیمی حلقے میں بھی معروف تھے اور آخری دم تک ربانی ہائی اسکول کامٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے بڑی شاندار خدمات انجام دیں۔ فرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی کے صدر رہے (متوفی ۱۹۷۵)۔

عزیز الرحمٰن کورٹ کی کاٹ کامٹی میں ملازم تھے۔ ریاض الرحمٰن محکمۂ تعلیم بھوپال میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز رہے۔

میاں جی غلام حسین کا علمی خانوادہ مئو میں بڑا مشہور تھا، فارسی، عربی اور اردو کے علماء و اساتذہ کو میاں جی یا منشی کہتے تھے، میاں جی محمد سلیمان (متوفی ۱۹۰۴) انہیں میاں جی کے صاحبزادے تھے، ان زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے اور تصوف و طریقت اور عرفان و سلوک سے گہرا تعلق تھا۔ ان کے لڑکے محمد احمد

تھے جو خام چمڑے کے کامیاب تاجر تھے۔ طاعون کی وبا سنہ ۱۹۰۴ء میں لقمۂ اجل ہو گئے۔
محمد احمد مرحوم نے دو بیٹے یادگار چھوڑے: عبدالرشید (متوفی ۱۹۰۸) اور حافظ محمد بشیر
(متوفی سنہ ۱۹۲۱ء) انہیں حافظ جی کے مایۂ ناز فرزند محمد ظہیر وارثی (ولادت ۱۹۱۶) ہیں
جو کامٹی کے مسلمانوں اور انصاری برادری کے لئے 'باعثِ فخر و افتخار' ہستی ہیں اور جن کی
ذاتِ گرامی یہاں کی علمی، دینی، تعلیمی اور ادبی سوتوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کی 'حکایتِ لذیذ'
ذوقِ حضوری کے لئے 'دراز تر لکھنے' کی طلبگار رہے۔

حاجی الٰہی بخش سُتّو (متوفی ۱۹۲۶) سوتی کپڑوں کے بڑے تاجر تھے، ہینڈلوم کپڑوں
کی بُنکاری میں بڑی دولت کمائی، پھر کامٹی میں یہی آبائی پیشہ اختیار کیا اور یہاں بھی نصیب
نے یاوری کی، جود و سخاوت میں دریادلی اور مہمان نوازی میں سیر چشم واقع ہوئے تھے۔
احباب کا بڑا خیال رکھتے تھے مجلسی آدمی تھے، دینی کاموں میں بڑے انشراح سے صدقہ
و خیرات کرتے، مساجد و مدارس کی تنظیم و تعمیر میں زرِ کثیر سے اعانت کرتے تھے۔ لاولد
تھے انہوں نے تو دوسرے اپنے حقیقی بھتیجے عبدالشکور کو اپنے بیٹے کی طرح پالا، در تعلیم دی۔
منشی محمد سعید کے لڑکے محمد خورشید حق جب برادری کی پہلی مسجد کے بڑے متولی اور
سرپنچ بنے تو دوسرے متولیان کا دستور کے مطابق انتخاب عمل میں آیا، ان میں حاجی
سالار بخش کے صاحبزادے سیٹھ محمد بشیر، حاجی عبدالجبار، حافظ عبدالشکور قمر، برادرزادہ
سیٹھ حاجی الٰہی بخش اور شامل تھے لیکن انتظامی کارکردگی سیٹھ الٰہی بخش کے سپرد رہی۔
کی بے لوث خدمات اور مسجد سے والہانہ شیفتگی برسوں ایک شاندار مثال بنی رہی۔ حاجی
الٰہی بخش حاجی ستو اپنے وقت کے ایک بڑے متمول اور صاحبِ خیر اور سب سے زیادہ بااثر اور
ممتاز بزرگ تھے ان کی وجہ سے مدرسہ سراج المومنین مالی دشواریوں سے آزاد رہا۔ ۸۰ سال
میں ان کا انتقال ہوا جو ایک مؤثر قومی سانحہ محسوس کیا گیا۔

حکیم حاجی شمس الدین کے آبا و اجداد غدر کے مارے ہوئے تھے کامٹی میں حیاتِ نو میسر
ہوئی، باشندگی کے تار و پود سلجھائے، حاجی ملا عبدالوارث جیسی عظیم المرتبت شخصیت کے
داماد تھے۔

منشی امان اللہ ٹانڈہ کے رہنے والے تھے جب کامٹی آئے تو یہاں سنہ ۱۸۹۰ء میں نقیر محمد
پیدا ہوئے جو ناظم کے لقب سے مشہور ہوئے عربی و فارسی میں بڑی دسترس رکھتے تھے،

پارچہ بافی کے ساتھ ساتھ طلبہ کو درس قرآن بھی دیا کرتے تھے۔

پہاڑن کا خاندان مئو سے ترک وطن کر کے آیا تھا، ان کے لڑکے عبدالمجید (م ۱۹۱۰) عطر فروشی کرتے تھے اور ان کے لڑکے ابو بکر شہرت شعر گوئی کرتے تھے، عبدالمجید کے دو اور لڑکے تھے۔ عبدالستار اور محمد، پارچہ بافی ذریعۂ معاش تھا۔

حاجی شیخ امیر ضلع فیض آباد کے گاؤں نواری کے نواسی تھے، ان کے لڑکے یار محمد انور سنہ ۱۹۰۰ء میں کامٹی میں پیدا ہوئے جہاں سات سال قبل حاجی صاحب آکر بس گئے تھے۔ تین بیٹے اور تھے مولوی لعل محمد صوفی۔ سلوک وطریقت کے سالک تھے، علم ودانش میں فضیلت رکھتے تھے اور درس وافادہ کی مسند کو زینت بخشتے تھے۔

مئو کے شیخ کوتارو کا خاندان بڑا مذہبی تھا، صاحبزادے نور محمد (متوفی سنہ ۱۹۳۲ء) کے لڑکے محمد اسماعیل بڑے دیندار شخص تھے مدرسہ فتحیہ اسلام کامٹی میں عربی کے مدرس تھے اور اسماعیل پورہ کی مسجد کے امام تھے۔ اس مسجد کے متولی حاجی حافظ عبدالکریم تھے۔ محمد اسماعیل فی سبیل اللہ خدمت امامت وتدریس بلا حق المحنت کرتے تھے، سماجی کام بھی انجام دیتے۔ بڑے بے لوث، مخلص اور نیک نیت انسان تھے، نیک اعمال، اخلاق حمیدہ، حسن خلق وخدمت خلق کے صلے میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ تین بیٹے یادگار ہیں خلیل الرحمٰن (کیفی اسماعیلی)، محفوظ اکبر اور نسیم احمد۔

عبدالرحیم نوربافی، اعظم گڑھ کے تھے کامٹی آئے تو کارگاہ سے عبادت گاہ تک کی دوڑ میں زندگی تمام کر دی، دو بیٹے تھے: عبدالرشید اور عبدالحفیظ: عبدالرشید (متوفی ۱۹۶۷) کثیر العیال تھے۔ محمد عمر انصاری، محمد سلیم، محمد یوسف، محمد شفیع (نظر رشیدی) اور محمد بشیر۔ محمد شفیع نظر رشیدی کے نام سے مشہور ہوئے۔ پارچہ بافی آبائی پیشہ تھا۔

محمد اللہ سوداگر پیشہ تھے شہزادپور (ضلع فیض آباد) سے بسلسلۂ تجارت کامٹی آئے، صالح، دیندار اور وضعدار انسان تھے۔

سردار خاندان میں عید و سردار اور ان کے لڑکے عبدالغنی سردار کا ذکر ضروری ہے۔ مسجد وارث پورہ جب محمد خورشید حق کی تولیت میں تھی تو عبدالغنی سردار اپنے والد عیدو سردار کی جگہ ان کے مشیروں میں شامل تھے، بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب کامٹی کی برادری کی عظیم شخصیتیں کالعدم ہو گئیں تو عیدو سردار کا دم غنیمت تھا۔ حافظ عبدالشکور

بھی اپنے والد کے جانشین مشیر مقرر ہوئے تھے۔

شیخ عیدو، ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) کے لُٹے ہوئے کارواں کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں کامٹی آئے رخت سازی کا پیشہ اختیار کیا، ملبوسات تیار کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حلال کمائی سے دامن بھر دیا، ان کے دو بیٹے تھے: عبد الرحمن اخفر (۱۸۹۶ - ۱۹۰۰) اور نصیر الدین (متوفی ۱۹۸۰)۔ والدین کے انتقال کے بعد عسرت اور تنگدستی نے قافیہ تنگ کر دیا رخت سازی کے بخیے اُدھڑنے لگے اس پر طرّہ کثیر العیالی۔ کب تک درد کے پیوند لگا کر زندگی کی قبلے تن ڈھانپے رہتے۔ اخفر کی بیوی بھی داغِ مفارقت دے گئی تو مایوسیت اور قنوطیت سے نڈھال اخفر۔ امیدوں کی کشتِ ویراں میں خزاں نصیب پودے کی طرح سوکھ گئے، جام و مینا سے ہونٹوں کو ترک کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اولاد جوان ہو گئی، گھر میں بہار آ گئی، بچوں نے خشت سازی (اینٹ کی بھٹی) شروع کی اور تپ کر کندن بنتے چلے گئے" پژاوے کا پژاوا (بجاوہ) کنگر ہو جانے سے محفوظ و مصئون رہا۔ بیٹوں کے کاروبار میں ترقی ہوئی تو خوشحالی کی تعمیر ہوئی اور نیکیوں کی تعبیر نکلی۔ اخفر کا شرح صدر ہوا تو اللہ کے گھر تک جا پہنچے۔

نصیر الدین آپ کے بھائی سوت کے بہت بڑے تاجر تھے۔ بڑے متقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شخص تھے۔ تعلیمی اور سماجی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہ بھی کثیر الاولاد تھے پندرہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن جب آنکھ بند ہوئی تو سر بالین فقط ایک دختر اور پانچ بیٹوں کو دیکھا یہی پسماندگان تھے ان کے بیٹوں میں محمد حنیف منظر اور محمد یوسف سوز خضری کامٹی کی ادبی تاریخ میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔[1] اس خاندان میں جو دوستی و ادب کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہا، منشی اخفر اہل البر و الاحسان میں سے تھے، جن کی نسل میں ۰۰ سٹر نیاز ور خاص طور سے سیٹھ مشتاق کامٹی شہر کے مشاہیر میں شمار ہوتے ہیں۔ صاحب دولت و صاحب علم و عمل افراد سے یہ خاندان "ہمہ آفتاب" ہے۔

عبد العزیز قدوسی۔ کامٹی کے ہر دلعزیز شاعر کے پردادا مبارک مئو میں مسکن رکھتے تھے، برکت اللہ ان کے لڑکے تھے، انیسویں صدی کے اواخر میں جبلپور تلاشِ معاش

---

[1] مدرسہ سراج المومنین نادرشٹ پورہ کامٹی کی پانچ سالہ رپورٹ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۵ء مع کامٹی کی مختصر تاریخ ص۲۵

میں آئے لیکن رزق کے دروازے کامٹی شہر میں کھلے۔ برکت اللہ کے لڑکے عبدالقدوس تھے، اُن کے کل چھ بیٹے تھے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے عبدالعزیز قدسی مشہور ہوئے یونس انسر بھی تھے ڈاکٹری اور شاعری میں نام پیدا کیا، ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی اور محمد الیاس ندوی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور لائق فرزند نکلے، محمد یوسف قدوسی اور محمد خورشید قدوسی آبائی پارچہ بافی کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔

حاجی عبدالرحمٰن، اعظم گڈھ کی تحصیل مورٹ کے مرکزی قصبہ ادری سے کامٹی آئے لیکن کھولاپور (ضلع امراؤتی) میں کاروبار کو فروغ ملا۔ تین بیٹے یادگار رہے۔ حاجی عبداللہ، حاجی محمد اور حاجی عباداللہ۔ اس خاندان میں صنعت پارچہ بافی کو فروغ نہ ملا اور نہ سرپرستی ملی بلکہ بیڑی سازی۔ ساز گار ثابت ہوئی۔

حاجی عبداللہ کامٹی کے مشہور شاعر عبدالجلیل عرشی کے جدامجد تھے، حاجی صاحب کے لڑکے حافظ دین محمد (متوفی ۱۹۴۳ء) تھے جنہوں نے بیڑی سازی کا کاروبار بڑے اعلیٰ پیمانے پر شروع کیا، یہ "فرم باکی بیڑی کامٹی" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ حاجی دین محمد کو اللہ غنی نے بڑی نعمتوں سے نوازا تھا، دولت میں برکت دی تھی، دل میں سخاوت کا جذبہ در صدقات میں بڑا لمبا ہاتھ فضلِ ربی نے عطا کیا تھا۔ کامٹی کا ہر علمی، تعلیمی، دینی اور ادبی ادارہ ان کی فیاضی، فراخدلی سے فیضیاب ہو چکا ہے۔ دینی خدمات کی انتہا نہیں تہذیبی و ثقافتی کارناموں کا شمار نہیں، حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ کے منصب اعزازی سے مشرف کیا تھا، حافظ دین محمد بڑے علم دوست تھے انہیں اوصاف حمیدہ کے حامل ان کے صاحبزادے عبدالرشید صدیقی بھی تھے جس نے صدقہ و خیرات، احسان و سلوک اور علم دوستی کی روایتوں کو برقرار رکھا۔

عبدالرشید صدیقی (متوفی ۱۹۷۳) کے علاوہ حافظ دین محمد کھولاپوری (براد والے آنریری مجسٹریٹ) مالک باکی بیڑی فیکٹری کامٹی کی اولاد صلبی میں تین اور بیٹے تھے: حاجی عبداللطیف انصاری (حال مقیم کراچی)، عبدالجلیل جلیل عرشی (شاعر) اور عبدالحفیظ۔

حاجی عبدالرحمٰن کے لڑکے حاجی عباداللہ کے صاحبزادے مشہور ادبی شخصیت فیض انصاری ہیں، عباداللہ (متوفی ۱۹۲۱) ایک دیندار شخص تھے تین اور لڑکے تھے: محمد

ابراہیم، عبدالقادر اور محمد یعقوب، عبدالقادر بھی کامٹی کی مشہور شخصیت ہیں۔
حافظ عبدالحلیم کوپاگنج (اعظم گڈھ) کے بلاقی انصاری خاندان کے فرد تھے، حافظ قرآن تھے، ادب سے لگاؤ تھا، سیاست سے شغف تھا، ان کے بیٹے سراج احمد انصاری تھے اور ان کے صاحبزادے خورشید احمد۔ تابش حلیمی کے نام سے بڑی آب و تاب سے چمکے۔

کامٹی کے مومن علمائے عظام اور حفّاظ کرام

کامٹی کے مہاجرین میں جو کامٹی آکر بسے تھے صرف نورباف ہی نہیں تھے اور نہ تاجر جو دیار پورب میں کارگاہوں کے مالک تھے بلکہ ان میں وہ عظیم ہستیاں بھی تھیں جو درسگاہوں کے فارغ اور تعلیم گاہوں کے اساتذہ و شیوخ تھے، ان میں علمائے عظام کا مبارک مجمع تھا اور حفاظ کرام کا ایمان افروز حلقہ بھی موجود تھا، بعد کو انہی کی نسل سے علمی، دینی اور ادبی میراث کے محافظ اور امین پیدا ہوئے، ایوانِ ادب میں شعرائے کرام کی مسندیں زینت بخشنے لگیں، مدرسوں اور مکتبوں میں علم و عرفان کے چراغ جگمگا اٹھے اور صوفیوں کی خانقاہیں آباد ہونے لگیں، مسجدوں سے اذان کی مکہ اور مدینہ تک پہنچنے والی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کامٹی کے پہلے عالم دین مولانا محمد خان افغانی نے جو بعد میں بڑے مولوی کے نام سے مشہور ہوئے گورا بازار کی مسلم قبرستان سے ملحقہ یک باغ میں کامٹی کی پہلی مسجد کی تعمیر کی سعادت حاصل کی اور انہی کے مذہبی اثرات اور رشد و ہدایت کے چراغوں سے کامٹی میں روحانی اجالا پھیلا۔ ان کی باعظمت ذات بابرکات کے صدقے میں دینی علوم کے دروازے کھلے، اور اسی راستے سے کامٹی کی کئی نسلوں پر فصل بہار آئی اور علم و فضل کے آسمان پر کئی ماہتاب فروزاں ہوئے اور کئی مہر درخشاں چمکے۔ ان میں کامٹی کے مشہور عالم دین اور صاحب باطن بزرگ حافظ محمد شکر اللہ سب سے زیادہ تابندہ اور تابناک ہیں۔

مولانا حافظ محمد شکر اللہ (۱۸۳۲ء-۱۹۰۸ء)

ناگپور اور کامٹی کے مؤرخ اور ادیب ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل "کامٹی کی ادبی تاریخ" میں رقمطراز ہیں:

" مولانا حافظ محمد شکر اللہ (۱۸۳۲-۱۹۰۸ء) پہلے بزرگ ہیں، جن کی تدریسی خدمات

سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا، وہ غازی پور (ضلع اعظم گڈھ) سے کامٹی آئے تھے، پارچہ بافی کی صنعت سے اپنی روزی روٹی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور دینی علوم کے جید عالم تھے۔ چنانچہ اپنے کرگھے کے اطراف گھاس پھوس کی چٹائیاں بچھا کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور متعدد لوگوں کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان میں حاجی ملّا عبدالوارث، منشی سعید، حافظ محمد ابراہیم خلیل، حافظ محمد عبداللہ حافظ، محمد اسحٰق اسحٰق، (منشی) محمد فیض اللہ فیض، (منشی) عبدالقادر اخگر، (منشی) عبدالرحمٰن اخضر، عبدالمجید آغا کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں:[1]

سیٹھ محمد احمد بھی حافظ شکر اللہ کے ارشد تلامذہ میں شامل تھے۔

حافظ محمد شکر اللہ سے کامٹی کی کئی نسلوں کو فیضانِ علم حاصل ہوا، یہ برادری کے پہلے واجب التعظیم بزرگ عالم تھے جو کرگھے پر بنکاری کرتے تھے گھاس پھوس کی چٹائیوں پر مسند درس و افادہ بچھا کر خود اپنا لباس تقویٰ تیار کرتے رہے اور طالبانِ علم کے روحانی و اخلاقی و دینی تانے بانوں کو سنوارتے رہے یہ سلسلہ چالیس سال تک فی سبیل اللہ قائم رہا۔ اس طویل عرصے میں لاتعداد طلبہ نے اردو، فارسی اور عربی میں دسترس حاصل کی ان میں سے ایک کثیر تعداد نے بزمِ شعر و ادب کو سجایا اور مسند درس و افادہ کو زینت بخشی آپ حاجی شاہ امداد اللہ سے دورانِ ایامِ حج بیعت ہوئے، لوٹے تو فیض باطنی اور علمی سیادت نے آپ کو مرجع خاص و عام بنا دیا لیکن ۱۹۰۴ کے طاعون نے ان کو اور انکی نسلی اولاد کو لقمۂ اجل بنا دیا۔

<u>حافظ قاری محمد عبداللہ</u> (۱۸۷۸-۱۹۷۲)

حافظ محمد شکر اللہ کے بعد مومنانِ کامٹی کی دوسری عظیم شخصیت حافظ قاری عبداللہ کی تھی جن کا نام نامی حافظ قاری کے نام سے آج بھی زندہ و پائندہ ہے آپ حافظ شکر اللہ کے شاگرد تھے، انہوں نے بھی محلہ وارث پورہ میں مسند درس و افادہ بچھائی اور سرچشمۂ علم و فضل کو تشنگانِ علم کی پیاس بجھائی اور برسوں تک شدید محنت اور غایت درجہ اخلاص اور للہیت کے ساتھ ترویج و اشاعتِ علم اور تبلیغ دین میں کوشاں رہے

---

[1] کامٹی کی ادبی تاریخ۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل (کامٹی ضلع ناگپور ۱۹۸۲) صفحہ ۲۲

انہیں کی تشویق و ترغیب سے حفظ قرآن کی رغبت ناظرہ ختم کرنے والے طلبہ میں پیدا ہوئی اور حاملین قرآن کی صفیں دیکھتے ہی دیکھتے کھڑی ہو گئیں۔ حافظ قاری عبداللہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ اپنے معاصرین میں حافظ قاری عبداللہ نے سب سے زیادہ طویل عمر پائی اور اپنے وطن مالوف میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا ؎ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

آپ خان محمد سردار متوی کے پوتے تھے۔

حاجی ملا عبدالوارث (متوفی سنہ ۱۹۴۲ء)

آپ کی ذاتِ والا صفات شریعت مطہرہ اور اسوۂ حسنہ کا نمونہ تھی آپ مسجد وارث پورہ کے رشتے سے متعلق تھے، اپنے بیالیس ۴۲ سالہ طویل دورِ امامت میں شہر، محلہ اور مسجد کی جس دینداری، پاکیزہ نفسی اور خلوص وللہیت کے ساتھ بہترین خدمات انجام دی ہیں وہ کامٹی کی دینی تاریخ کا سب سے زریں باب ہے اس بے مثل خدمتِ دین کی کامٹی کی مسلم آبادی مجموعی طور پہ کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ ملا صاحب نے تقویٰ اور شرعِ مبین اور دین متین پر صحیح طریقہ پر عمل کر کے لوگوں کے سامنے اسلاف کا ایک نمونہ پیش کیا، ترغیب و ترہیب دی، ایمان و آگہی کی نعمتوں سے نوازا اور اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کو یہ پیغام دیا ؎

بیخبر! تو جوہر آئینۂ ایام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

ان کے بھائی حافظ عبدالرحیم نے بھی علم دین کے نشر و اشاعت کامٹی شہر میں بڑی حقانیت اور للہیت کے جذبے کے ساتھ کیا۔

حاجی ملا وارث کی بے پناہ دینی خدمات کی یاد میں محلہ "وارث پورہ" آج بھی زندہ اور پائندہ ہے ؎

نام نیکو رفتگان ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

ملا عبدالوارث نے مولانا محمد ابراہیم سے اپنی ابتدائی مذہبی تعلیم کی تکمیل کی۔ ان کے برادر خورد حافظ عبدالرحیم نے قرآن کی تعلیم و تدریس میں ایک مثال قائم کی۔ حافظ عبدالرحیم اور ان کے برادر بزرگ حاجی ملا عبدالوارث اپنے اساتذہ حافظ محمد شکر اللہ اور حافظ قاری محمد عبداللہ کی دینی و تعلیمی میراث کے صحیح معنوں میں وارث اور حقدار تھے، انہیں کی سنت پر چلتے ہوئے علوم دینیہ کی اشاعت اور طالبانِ علم کی مذہبی تربیت کا فریضہ انتہائی دیانت اور بے غرضی کے ساتھ اپنی ذاتی کوششوں سے اس طرح انجام دیا کہ ہر گھر تعلیم کی روشنی

سے منور ہو گیا۔ حاجی ملا کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحیم کی مساعی جمیلہ ناقابل
فراموش ہیں بنکری کے پیشے کے تانے بانے میں اُلجھے رہنے کے باوجود انہوں نے شہر کے
ہر محلے سے طلبہ کی ایک کثیر تعداد کو ناظرہ کی تعلیم دی، ابتدائی دینی تعلیم کے خواہشمند طلبہ کی
بھتات تھی لیکن حافظ عبدالرحیم حفظِ قرآن کی ترغیب دیتے تھے جس کے نتیجے میں حفاظ کرام
کی ایک بڑی تعداد کامٹی میں پیدا ہوئی اور بھیونڈی پانی پت اور ٹانڈہ کی طرح کامٹی حاملین قرآن
کا شہر بن گیا۔ حافظ صاحب چالیس سال کی عمر میں عین عالم شباب میں ۱۹۱۵ء میں پلیگ
کی وبا کی نذر ہو گئے۔ ان کے شاگردوں میں بیشتر اپنی علمی اور ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں
کے باعث اپنے وقتوں کی ممتاز ہستیاں بنیں اور بڑا نام کمایا۔ ان حفاظ کرام اور علمائے
عظام کے اسمائے گرامی اسطرح ہیں۔
حافظ عبدالرحیم مفسطر (متوفی ۱۹۶۴ء) حافظ محمد بشیر پیش امام مسجد داروغہ (متوفی
۱۹۶۹ء)، حافظ محمد سراج الدین، حافظ محی الدین ایک واسطے سے حافظ عبدالرحیم سے
تلمذ کا شرف رکھتے تھے۔

حافظ محمد سراج الدین

حافظ عبدالرحیم کے آخری شاگرد تھے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۷۷ء تک جب ان کی عمر ۸۰ کے قریب
تھی درس و تدریس کا سلسلہ انہوں نے جاری رکھا۔ ان کے بے شمار شاگردوں میں الحاج
حافظ محی الدین صدر مدرس مدرسہ سراج المومنین اپنی فضیلت علمی اور فقہی معلومات میں حاجی
حافظ عبدالوارث کی طرح یکتائے زمانہ تھے۔ آپ مسجد وارث پورہ کے پچیس سال تک امام رہے۔
حافظ محمد ابراہیم خلیل اور ان کے بھائی حافظ مولا بخش نے محلہ وارث پورہ میں
اپنے طور پر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا۔ آپ حافظ محمد شکر اللہ کے مایۂ ناز
شاگرد تھے۔ علوم متداولہ میں دستگاہ رکھتے تھے، آپ ایک زبردست قوت حافظہ کے مالک
تھے اور بے شمار احادیث آپ کو ازبر تھیں ان کے تبحر علمی کا یہ عالم تھا کہ کہتے پڑھتے جاتے
تھے اور عربی و فارسی کی ادق کتابوں کا درس زبانی شاگردوں کو دیتے جاتے تھے ۱۹۰۴ء
کے طاعون کی وبائے عامہ کی ستم ظریفی نے حافظ محمد ابراہیم خلیل کو بھی نہیں بخشا۔
حافظ محمد اسحٰق ڈاگھر محلہ وارث پورہ کے قدیم مردم

علاقے میں طریقت، سلوک اور اس کے فکر و عمل کا پہلا مرکز بنا۔ ان کے یہاں کی روحانی کیفیتوں سے معمور تصوف و علم و عرفان کی مجلسوں میں صوفی عبدالحکیم اور مولانا مفتی محمد ابراہیم بنارسی (۱۳۰۳-۱۲۸۶) بھی شریک رہا کرتے تھے آپ مسجد داروغہ کے امام بھی تھے بنکاری کی مشغولیتوں کے باوجود اپنے مکان پر اپنے استاد قاری حافظ محمد اللہ کی طرح تعلیم قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کے سواد اعظم میں ایک نیا فکری اور علمی انقلاب رونما ہو رہا تھا۔ حافظ محمد اسحاق کے ذہن کے جھروکے بھی اسی سمت کھلتے جا رہے تھے کہ قضا کا زہرناک جھکڑ آیا اور حافظ محمد اسحاق کی کتاب زندگی اور دفتر اعمال کو بند کر دیا۔

حافظ محمد اسحاق (متوفی ۱۹۳۲) کی رحلت کے بعد ان کے کثیر تلامذہ ادھر ادھر بکھر گئے۔ حافظ محمد یعقوب کو جوہر طبعی دکھانے کا موقع ملا، بڑے پرجوش دیندار مسلمان تھے، میاں جی شاہ محمد بھی برسوں محلہ وارث پورہ میں اپنے مکان پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا اور بے شمار تشنگان علم نے ان کے سرچشمۂ فیض سے اپنی پیاس بجھائی خاص کر بچیوں کو نہ صرف زیور تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ منہاج شریعت پر ان کی تربیت کی، بڑے نیک سیرت و پاکیزہ انسان تھے ان کی پر اثر شخصیت نے طالبان علم پر گہرے دینی اثرات مرتب کئے میاں جی کے اس مدرسہ کے قیام، نگرانی اور کفالت سیٹھ حاجی سردار عبدالرحمٰن کی علم دوستی اور دینی کی مرہون منت رہی انہیں کے اشد سفارش سے اس مدرسہ کی مالی کفالت نواب نیاز احمد خانصاحب اور کھولاپور کے ایک خیر پسند متوسل کرتے رہے جس سے میاں جی کو معاشی دشواریوں سے نجات ملی اور مالی آسودگی نصیب ہوئی۔

حفاظ کرام بڑی تعداد میں مسجدوں میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے اور کامتی کے مسلمان محلوں میں ذاتی طور پر اپنے مکانوں یا مسجدوں اور ان سے ملحقہ مدرسوں میں قرآن کی تعلیم بھی دیتے تھے اور بہت سارے ایسے بھی تھے جو معاشی دشواریوں کے سبب کرگھا بھی چلاتے تھے۔ حافظ محمد عبداللہ (نیا بازار) اور حافظ محمد سعید سے کئی نسلوں نے فیض حاصل کیا پیش امام محمد اسمٰعیل (م ۱۹۷۱) حافظ عبدالرشید بنارسی پیش امام محمد عبداللہ۔ میاں جی صفی اللہ (م ۱۹۲۶) محلہ لنگڑہ گنج، ان کے لڑکے پیش امام محمد عثمان (م ۱۹۷۲)، منشی فقیر محمد ناظم (م ۱۹۷۳)، حافظ یار محمد انور (متوفی ۱۹۷۲) جو اپنے عہد کے سب سے نمایاں

اور صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کے مالک تھے۔ میاںجی امام الدین جن کی ذات گرامی دینی علوم کا سرچشمہ تھی اور جو ستر سال تک مجاہدانہ شان سے سرگرم عمل رہے —— یہ سارے بزرگانِ دین کامٹی کی دینی تعلیم کی تاریخ کے زریں ابواب بن گئے ہیں، خصوصاً موخرالذکر میاںجی کی عظیم ہستی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی تخلیق اسی مقصد کے لیے کی تھی۔

میاںجی امام الدین کا تعلق مومن برادری کی اس پہلی نسل سے تھا جو غدر کے ہنگامہ خیز دور میں کامٹی آکر آباد ہوئی تھی۔

ملا عبدالوارث کے صاحبزادے مُلّا محمد سعید بڑے دردمند انسان تھے۔ مسجد وارث پورہ کے متولی تھے ان کے رشتے خدمتین صلۂ رحمی کا بڑا پُرخلوص جذبہ رکھتے تھے۔ تبلیغی جماعت کے اسیر منظر تھے۔

<u>حافظ محمد داؤد سردار (متوفی ۱۹۳۵ء)</u>

کامٹی میں برادری کی دوسری نسل میں بڑی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان میں حافظ محمد داؤد ان ارکان اربعہ میں شامل تھے جو برادری کے اعلیٰ ستون تھے۔ منشی محمد سعید (م ۱۹۳۰) حاجی سردار عبدالرحمٰن سیٹھ (م ۱۹۲۹)، حاجی مُلّا عبدالوارث (م ۱۹۴۲) اور حافظ محمد داؤد۔ حافظ جی مومن برادری کے سردار تھے اپنے وقت کے صاحب علم تھے، فہم و فراست میں بے نظیر تھے۔ سلیم الطبع، مہمان نواز اور بااخلاق بزرگ تھے، وضعداری میں مستعلیق، میل جول میں خلیق اور علم و فضل میں لائق شخص تھے، علمی و دینی و تعلیمی کاموں سے گہرا شغف رکھتے تھے، مدرسہ سراج المومنین کے بانیوں میں سے تھے، حاجی جمال الدین داؤدی (متوفی ۱۹۷۹) ان کے بیٹے تھے ان کے صاحبزادگان میں یونس جمال مرحوم اور سیٹھ عبدالرشید معروف ہیں عبدالحفیظ اور ان کے صاحبزادے عارف عبدالباری کامٹی کے مشہور شاعر ہیں۔

حافظ محمد داؤد کی عظیم شخصیت کے بارے میں کامٹی کے بزرگ عالم اور ادیب محمد ظہیر وارثی کامٹی کی مختصر تاریخ میں یوں رقمطراز ہیں۔

"ان کے بے نظیر فہم و تدبر، علم پر گہری نظر اور پُرتاثیر طرز کلام اور ذوق مجلس آرائی نے انہیں وقت کی عزت و منزلت کی اونچی مسند پر بٹھا دیا تھا جس پر وہ خوش قسمتی سے عمر بھر متمکن رہے" اپنی ان خصوصیات کے علاوہ معاشی حیثیت سے اپنی کاروباری سرگرمیوں

کی وجہ سے دنیاوی جاہ و ثروت میں بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے اپنی گوناگوں
مصروفیات کے باوجود اپنے مکان پر مدتوں دینی تعلیم کا مدرسہ بھی جاری رکھا جس
کی معلّمی کے فرائض وہ خود انجام دیتے“

حافظ محمد داؤد کا مکان مرجع خلائق تھا اور ان کی نشست گاہ ایک علمی بارگاہ تھی جس کی
علمی و دینی فضا شبانہ روز علمی مذاکرات، مواعظ حسنہ اور اخلاقیات کے درس و افادیت سے معمور
رہتی اور روحانیت کی تجلیات سے منور رہتی تھی۔ ان میں اہل علم و فضل اور صاحب بصیرت
بزرگ حضرات شریک رہتے، یہاں کے علمی و دینی مذاکرات سے بہت سارے نونہالانِ علم
کی ذہنی نشوونما ہوئی۔“ اسی خانوادۂ علمی سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے محمد جمیل داؤدی ہیں
جو حافظ قرآن ہیں، نور جہاں بنت محمد خورشید جمال داؤدی نے بھی ناظرہ ختم کیا تھا۔

حافظ یار محمد، مئو کے حافظ خاندان کے جد اعلیٰ تھے۔ ان کے لڑکے حافظ محمد بخش اور پوتے محمد
سعید بھی حافظ قرآن تھے، حاجی حافظ محمد سعید نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ اخلاص و
للّٰہیت کے ساتھ ایک طرح پورے محلے کے بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کا فریضہ نہایت تندہی
اور جانفشانی کے ساتھ انجام دیا، ان کا مکان حافظ محمد عبداللہ کی طرح نصف صدی سے زائد
عرصہ تک تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ [illegible] حافظ محمد سعید
حافظ محمد شکر اللہ کے بعد برسوں نیا بازار کی بڑی مسجد کے امام بھی رہے اور پھر حافظ محمد یعقوب
کو جو ان کے شاگرد رشید رہ چکے تھے ۱۹۴۸ء میں ان ذمہ داریوں کو ان کے سپرد کر کے
راج نانڈگاؤں منتقل ہو گئے۔ حافظ محمد سعید ۵۰ سال کی عمر میں کامٹی میں ۱۹۶۰ء میں انتقال کیا۔

حافظ جی کے پانچ بیٹے تھے: حافظ محمد نذیر، حافظ محمد ظہیر، حافظ محمد بشیر، ریاض الرحمٰن
شمس اور محفوظ الرحمٰن۔ بڑے لڑکے حافظ محمد نذیر فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے؛
ریاض الرحمٰن شاعر تھے اور ان کی عربی و فارسی میں قابلیت مسلّم تھی، حافظ محمد نذیر شاعرانہ
طبیعت کے مالک تھے لیکن ان کی شعر گوئی کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ زبان و فن پر گہری نظر
رکھتے تھے ان کی سخن فہمی کے سبھی قائل تھے۔

حافظ محمد رحمت کے جد اعلیٰ اعظم گڑھ سے غدر کے فتنہ پرور دور میں تلاشِ معاش میں
کامٹی آئے، ان کے صاحبزادے محمد مختار رحمت اختر، کامٹی کے ادبی حلقے میں بہت معروف
ہیں، ایک خوش فکر شاعر ہیں، دانشور، اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد اور ادیب کی حیثیت سے

بھی اقلیم سخن میں اعلیٰ منصب رکھتے ہیں۔

حافظ محمد محی الدین کو کامٹی شہر کا ابوالحفاظ قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا انہوں نے سب سے زیادہ حفاظ کو "قرآنی کہ درسیہ داری" کا اعزاز دیا، برسوں مسجد وارث پورہ کی امامت فرمائی، حامل حدیث تھے، فقہ حنفی پر گہری نظر تھی، شرعی مسائل کے سلسلے میں مستفتیان دور دور سے رجوع کرتے تھے۔

برادری کا مہاجر طبقہ کئی نسلیں گذر جانے کے بعد بھی اپنے اسلاف کی روایات اور وطنیت کی شناخت کو قائم رکھے ہوئے ہے مگر سب سے زیادہ اس کا دائمی ٹھوس اور اٹوٹ ثبوت صنعت پارچہ بافی سے ملتا ہے جو انسانی تاریخ میں بے نظیر ہے جس کے تانے بانے ہزاروں بار اُلجھے لیکن ٹوٹے نہیں۔

مومن برادری کے ہزار ہا خاندان کارواں در کارواں کامٹی آئے یہاں کی آبادی کا ایک نیا اور موثر حصہ بنے اور معاشی طور پر خود کفیل رہے "مدراسی آبادی کی ضرورت کے لئے پگڑی اور رومال اور لنگی کی بنکری سے اس نو وارد برادری نے اپنے آبائی پیشے کا آغاز کیا جو ان کے ذریعہ معاش کا سب سے اہم اور کامیاب وسیلہ بنا۔" ان کی صورت اور سیرت۔ اسلام کی خالص اور بے میل سادہ طریق زندگی کا بہترین نمونہ تھی انہیں خصوصیات کی بنا پر وہ یہاں مومن کہلائے۔ یہ اپنے ساتھ اپنے دین و مذہب اور اس کے علم و تہذیب کی دولت بھی لائے تھے جب ہی ان کے اثرات رونما ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کے ماحول کو اپنے سادہ اسلامی رنگ میں رنگ دیا جن کا فیض و اثر آج بھی الحمد للہ باقی و جاری ہے۔[1]

مدراسی رجمنٹ کے فوجیوں کے علاوہ یہاں دکنی عملہ بھی تھا اور کرناٹک کے کوشٹی اور سالی بنکر بھی آباد تھے۔ ان کی ایک بڑی خاصی تعداد اچپور میں بھی تھی جہاں کے غریب کوشٹی بنکروں نے اپنی قوم کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لئے جگہ جگہ ہائی اسکول کو کالج کے درجے تک ۱۹۶۲ء میں پہنچا دیا تھا۔ لیکن کامٹی کی مومن برادری اس زمانے تک تعلیم کے معاملے میں بہت پہلے پیچھے تھی۔ جب ہر دو قوم کا صنعتی انقلاب آیا تو برادری میں بھی ایک تعمیری فکری و ذہنی

[1] مدرسہ سراج المومنین وارث پورہ کامٹی کی پانچ سالہ رپورٹ ۱۹۷۳-۱۹۷۷ء میں کامٹی کی مختصر تاریخ۔ مرتبہ محمد ظہیر وارثی ناظم اعزازی ص ۱

انقلاب آیا اور صحتمندانہ رجحانات پیدا ہوئے۔ آج سے چوبیس سال پہلے انفرادی طور پر پچاس ساٹھ لوم جمع ہوگئی تھی جو مندرجہ ذیل حضرات نے لگائے تھے:

حاجی عبدالحمید (اسمٰعیل پورہ) اسی محلے کے محمد مختار سیٹھ، محمد رسول سیٹھ، محمد مظہرالرب سیٹھ اور مسعود الحفیظ۔ وارث پورہ میں خلیل احمد بی۔ اے اور مختار احمد۔ حافظ عبدالعزیز (ملکہ گنج)، اسی محلے کے جمال احمد انصاری، نیا بازار کے حاجی محمد ایوب اور انہیں کے ہمنام جی ایس روڈ کے محمد ایوب اور حاجی محمد صابر پاور لوم لگانے والوں میں سے تھے۔

صنعتِ پارچہ بافی کے لوازمات کے سلسلے میں اہم کڑی سوت کی فراہمی تھی جس کے بغیر نہ تانا بانا تیار ہوتا اور نہ آڑاپائی یا بجانا بچھتا، کامٹی میں سوت کے تاجروں کی کئی دکانیں تھیں غیر از برادری کے تاجر بھی یہی دھندا کرتے تھے۔ سیٹھ حاجی عبداللہ اور ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالرحمٰن سوت کے بڑے تاجر تھے جمعہ بازار میں گودام یا دکان تھی۔ کپڑوں کی ایک دکان بھی گجری بازار میں تھی، محمد صابر اور حاجی محمد ایوب ولد حاجی سلیم اللہ (برادران) نیا بازار میں سوت کا دھندا کرتے تھے۔ حاجی دین محمد (وارث پورہ) سیٹھ کلیم اللہ انصاری (ملکہ گنج)، حاجی عبدالغفور (اسمٰعیل پورہ) سوت کے بڑے تاجروں میں شمار ہوتے تھے۔ میمن قوم کے یوسف سیٹھ جو ناگپور کے تھے سوت کے تھوک فروش تھے، بعض تاجر 'یارن مرچنٹ' کے نام سے مشہور تھے۔ حاجی محی الدین سیٹھ محمد ادریس (وارث پورہ) سیٹھ علی محمد (جی ایس روڈ) سیٹھ عبداللہ شبرتی وغیرہ یارن مرچنٹ تھے۔

بزاز، کپڑے کے تاجر یا کلاتھ مرچنٹ اور ساڑی کے مشہور تاجروں میں بھی مومن برادری کے افراد بڑے نمایاں تھے، منشی محمد خلیل ولد حاجی محمد اسمٰعیل (نیا بازار) حاجی عبدالحئی (اسمٰعیل پورہ) محمد شفیع (ملکہ گنج)، محمد نذیر استاد (بھولی لائن)، محمد کبیر (نیا بازار) اور محمد مختار دلّالی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ نصیر الدین حاجی حفیظ اللہ کپڑے والے (اسمٰعیل پورہ)، سیٹھ عبدالرؤف کلاتھ مرچنٹ، سیٹھ عبدالحمید عظیم کپڑے والے (وارث پورہ)، سیٹھ عبدالحفیظ سیٹھ ولی اللہ کلاتھ مرچنٹ، عبداللطیف کلاتھ مرچنٹ (گجری بازار)، عبدالرحیم کپڑے والے (بھوپ نہ اولی)، سیٹھ حفیظ الرحمٰن مالک ولی ٹریڈنگ (گجری بازار) میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر بزازی کرتے تھے، کپڑے کی اور دیگر اشیاء کی دکان سعیدی شاپ اور مختار احسن کی حمیدیہ ٹیکسٹائلز بھی مشہور دکانیں

تھیں۔ حاجی عبداللہ اور حاجی عبدالرحیم (بنّی) مل کے کپڑوں کے بڑے تاجر اور معزز ہستیوں میں سے تھے۔

ناگپور کے سیٹھ سراج الدین کا رنگ کارخانہ (تکیہ معصوم شاہ اور دیوان شاہ) پر تھا۔ حاجی سیٹھ دین محمد، سیٹھ علی محمد (وارث پورہ) اور سیٹھ خیر البشر کا رنگ کا کارخانہ (وارث پورہ) میں شہرت کی سُرخی لئے ہوا تھا۔

برادری کی جماعتی روایات کا سب سے شاندار پہلو امداد باہمی، اشتراک تعاون اور ہمدردی ہے۔ پورے ہندوستان کے مومنوں میں یہ جذبہ کارفرما ہے۔ ہر صنعتی مرکز میں اور برادری کی بستی میں جہاں پارچہ بافی ہوتی ہے دیورس کوآپریٹیو سوسائٹیاں سرگرم عمل ہیں۔ کامٹی میں قوم کے غریب بنکروں کی مالی اعانت کرنے اور انہیں برسرِ روزگار بنانے کے لئے ہمدردانِ قوم نے بڑی جدوجہد کی ہے۔ ۱۹۷۰ء تک دو سو مکانوں کی بنکر کالونی اسمٰعیل پورہ بستی سے متصل زمین پر آباد کی گئی چونکہ اس کالونی کے بہت سارے پیچیدہ مسائل ڈاکٹر اے۔ یو۔ شیخ کمشنر ناگپور ڈویژن کی وساطت، مدد اور رسوخ سے حل ہوئے تھے اسی لئے یہ کالونی انہیں کے نام سے موسوم ہوئی۔ نصیر نگر، ناگپور میں بھی انصاری حضرات کافی تعداد میں بسے ہوئے ہیں۔

کامٹی کی تاریخ میں عبدالستار فاروقی کا نام مدتوں تابندہ اور تابناک رہیگا، آپ نے دیگر معزز ہستیوں کے تعاون سے ۱۹۳۲ء میں بنکر سوسائٹی کے قیام کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ان میں یہ حضرات شامل تھے۔ ظہیر فاروقی، بابو عبدالرحیم، حاجی فیض الرحمٰن، ایس محی الدین (ممبئی سٹور)، عبدالغنی ابن عیدو سرکار، سیٹھ حاجی عبدالغفور اور حافظ عبدالعزیز، حاجی محمد ابراہیم اور ان کے ساتھیوں نے غریب بنکروں کو روزگار دلانے کے لئے حسب ذیل سوسائٹیاں قائم کیں جو اپنے اپنے دائرہ عمل میں سرگرم کار رہیں؛ ان کے حصہ دار (شیئر ہولڈرس) ہی اصل میں ان سوسائٹیوں کے ممبر تھے۔

(۱) کامٹی ویورس سوسائٹی (صدر عبدالستار فاروقی) (۲) فرینڈس سوسائٹی لمیٹڈ (صدر بابو عبدالرحیم) (۳) وارث پورہ سوسائٹی (صدر خلیل احمد بی۔ اے) (۴) اسمٰعیل پورہ ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی (صدر محمد حنیف) اور نیشنل انصار کوآپریٹیو سوسائٹی (صدر عبدالستار انصاری)۔ فیض الرحمان انصاری بھی وارث پورہ سوسائٹی کے ۵ سال تک صدر رہ چکے ہیں آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وارث پورہ سوسائٹی کا کامٹی میں پہلا نمبر

آنے پرائے سٹیلڈ ملی تھی۔ آپ سی پی ٹائپ رائٹر کمپنی کے مالک تھے۔ کامٹی کی برادری میں ان کا خاندان بڑا معزز خیال کیا جاتا ہے۔

عبدالستار فاروقی کا تعلق بُنکر برادری سے تھا لہٰذا اس پسماندہ طبقے کی مالی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بُنکروں کی ایک یونین بھی قائم کر کے اس کے ذریعے حکومت سے کئی مراعات حاصل کیں۔ ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ شیخ کالونی جو بُنکروں کے لیے حکومت کے گرانقدر عطیہ سے بنائی گئی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ آپ ودربھ سنٹرل ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کے ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے تھے۔ فرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کے بھی صدر رہ چکے تھے۔

ظہیر وارثی کی ذاتِ گرامی مسلمانانِ کامٹی کے لئے عموماً اور مومن برادری کے لیے خصوصاً باعثِ تحسین و برکات اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ معاشرہ کے ہر شعبۂ زندگی میں ان کی بے لوث خدمات اور تہذیبی کارناموں کے نقوشِ دوام ثبت ہے حکٔ ثبت است بر جریدۂ عالم دوام۔ بُنکر برادری کے فرد ہیں، اسی لئے ان کی فلاح و بہبودی کے لئے سینہ سپر رہے اور پیش پیش رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی (سیکریٹری ۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۰ء)، فرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی (صدر ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء) اور کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی یونین کے سیکریٹری (۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۰ء) رہ چکے ہیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں صوبائی حکومت نے انھیں ۱۹۵۳ء میں ودربھ پراونشیل کوآپریٹیو سوسائٹی کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا وہ اس عہدے پر ۱۹۶۰ء تک فائز رہے۔ پھر ۱۹۶۱ء میں مہاراشٹر پردیش حکومت نے انھیں ہینڈ لوم بورڈ کا ممبر نامزد کیا اور ۱۹۶۷ء تک آپ اپنی خدمات پوری دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔

ناگپور کی مومن برادری میں بھی بڑے فعال اور سرگرم سماجی خدام تھے، عباد اللہ کے صاحبزادے عبدالقادر جو فیض انصاری کے بھائی ہیں ناگپور میں بُنکر برادری کے لیے رفاہی اداروں کے ذریعے بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں، وہ اچھے منتظم اور سیاسی مدبر ہیں، انصار ڈائنگ کوآپریٹیو سوسائٹی ناگپور کے طویل عرصے تک صدر رہ چکے ہیں، ان کے دور میں مذکورہ سوسائٹی نے بڑی ترقی کی، انصار نگر ہاؤسنگ سوسائٹی کا منصوبہ بھی انہیں کی جدوجہد اور مساعیٔ حسنہ کا مرہونِ منت ہے۔ محمد یوسف سوز خفرائی ۱۹۵۸ء میں وارث پورہ ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی کے سیکریٹری مقرر کیے گئے تھے یہ منصب آج بھی ان کے پاس

ہے (۱۹۸۲)۔
مشہور شاعر عتیق اللہ عادل کئی برسوں تک کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے رکن رہے۔ فیض اللہ فیض بھی فرینڈس کنزیومرس کوآپریٹیو اسٹورس کے بانیوں میں سے تھے اور ۱۹۴۱ تا ۱۹۴۶ اس ادارے کے صدر رہے۔
کامٹی کی مومن برادری کا مزدور طبقہ عموماً بنکاری کا پیشہ کرتا ہے، کچھ بیڑی سازی کے کارخانوں میں مزدوری کرتے ہیں، کارخانہ دار عموماً اپنا کپڑا بزازوں کے ہاتھ بیچتے ہیں اور کچھ مومن حضرات کی ساڑی کی دکانیں بھی ہیں کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹیڈ عمدہ اسٹیپل لنگی کی تیاری پر دوبار سونے کے تمغے پا چکی تھی۔ یہاں ہر قسم کی ساڑیاں، نئے ڈیزائن کی چادریں چھوٹے بڑے تولیے اور ملبوسات کے پارچے گاز کلاتھ، بینڈیج کلاتھ بنائے جاتے تھے ۱۹۶۰ء میں جب اس کے صدر عبدالستار فاروقی اور آنریری سیکریٹری حاجی عبدالمتین تھے، سوسائٹی مذکورہ ادرج کمال پر تھی۔ اسی طرح فرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی بھی ہینڈ لوم اور پاور لوم پر بُنے ہوئے کپڑے، ساڑیاں، نفیس دھوتیاں اور دیگر اقسام کے کپڑے تیار کرتی تھی، ۱۹۷۰ء میں محمد نجم انصاری اس کے آنریری سیکریٹری تھے۔ اخوت (ہفتہ وار) کے اڈیٹر وکیل عارف کے مطابق ۱۹۷۶ء میں ہینڈ لوم پر تیار شدہ کپڑوں کے کل مہاراشٹر مقابلے میں پہلا انعام مل چکا ہے۔

پارچہ بافی کی صنعت اور کپڑا، سوت وغیرہ کا بازار سمندر کی لہروں کی طرح اتار چڑھاؤ کا نقشہ پیش کرتا رہا ہے فی زمانہ حکومت کی پالیسی بھی اثر انداز ہوجاتی ہے اور ایک صدی قبل تو یہ صنعت مہاجنوں اور ساہوکاروں کے رحم و کرم پر زندگی گذار رہی تھی، وبا، سیلاب، قحط اور دیگر تکوینی حوادث بھی بافندگی کے تسنے بانوں کو زیر کسوت کر پھینک دیتے تھے زرق و برق صنعت کی چھری آڑ بانی پر بھی چل جاتی تھی۔ ۱۸۹۶ء میں کامٹی میں قحط سالی نے دمشق کے قحط کی یاد دہرادی تھی کہ "یاران فراموش کردند عشق" کے نازک مرحلے گذرنے لگے تھے، اس کال نے مومن بنکروں کو بدحالی اور آشفتہ حالی اور صنعت کو پامال کردیا تھا۔ بیکاری ختم کرنے کے لیے سرکاری سڑکوں کی بنائی وسیع پیمانے پر جاری کی گئی، فاقہ کشوں کو مہینوں سرکار کی طرف سے کھچڑی تقسیم کی جاتی رہی، بھکمری سے بچنے کے لیے مومن برادری کی ایک بڑی تعداد سڑکوں پر گٹی پھوڑنے کے کام پر مجبور

بھوکی جنون کا یہ عالم ہی دوسرا تھا سنگ اُٹھاتے وقت سر یاد نہیں آتا تھا خالی پیٹ یاد آتا تھا،
لیکن کب تک جب کام کاج ختم ہوا تو اناج بھی ختم ہو گیا سوکھے کے بھوکوں نے کامٹی کا اناج
بازار لوٹ لیا ــــ یہ سال کامٹی کی تاریخ میں "سیاہ سال" کے نام سے مشہور ہوا۔

طاعون کی وبا ۱۹۰۴ء میں پھیلی، طاعونی عفریت نے بیس ہزار کے قریب انسانوں
کو لقمۂ اجل بنایا۔ اور یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا، کامٹی کی آبادی کم ہوتی گئی اور شہر خوشحال
کی آبادی بڑھتی گئی۔ برادری کی چند عظیم ہستیاں بھی کوچ کر گئیں۔ حافظ حاجی شکر اللہ کا پورا
گھرانہ طاعون کی وبا کی نذر ہو گیا۔

کامٹی میں پارچہ بافی اور مومن برادری کے عروج و زوال کی داستان دیگر مومن بستیوں
سے مختلف نہیں، اس تناظر میں ہر بستی کا خاکہ اُبھرا ہے اور خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔

کامٹی فوجی چھاؤنی بھی عسکری نظام زندگی عام شہری ومعاشی زندگی کے تقابلے میں کچھ زیادہ
ہی کس بل رکھتی ہے، فوجیوں کے معمولات، عادات اور مصروفیات بھی عام نہج سے ہٹ
کر رہتی تھیں، محنت و جانفشانی، ورزش اور جانفشانی، دوڑ اور گھڑ سواری ــــ اس کے
بعد راحت کے لمحے جب نصیب ہوتے تو دو دو سے پھر یک گی زبانِ پرخیال "دریے گزہ"
بیخودی کا حال ہوتا، مئے سے غرض نشاط نہ سہی، سگار نوشی، تب کو نوشی تو لوازمات میں
سے تھی۔ وسطی ہند کے عام باشندے بیڑی نوشی کرتے ہیں اس سے کہ یہاں بیڑی
کے پتوں اور تمباکو کی فراہمی کی فراوانی تھی شہری اقبال سنگھ بیڑی والے آرمی سنٹر پر تھے،
بڈھا چھاپ بیڑی جوان پیتے تھے۔ مہاراشٹر بیڑی ادیوگ، کامٹی بیڑی، پیک مزدور کو پریشر
سوسائٹی لمیٹیڈ کے علاوہ ایک مارواڑی سیٹھ کی سنجیو بیڑی بھی نمبر ایک بیڑی تھی۔ حاجی
عبداللہ بیڑی مرچنٹ کو مسلمان بیڑی سازوں میں اولیت کا فخر حاصل تھا۔

برادری کے مشہور تاجر حافظ دین محمد بیڑی سازی میں بڑی شہرت رکھتے تھے، ان کی
بیڑی نے تو میدان مار لیا تھا، نمبر ایک اور گلنار چھاپ بیڑی کھولا پورا مرادلی اور سارے
برار میں بیڑیوں کی "سرتاج" مانی جاتی تھی، جب اس کاروبار نے دھوئیں کے بادل سے
"دھن" برستا ہوا دیکھا تو برادری اور دیگر جماعتوں نے بھی بیڑی سازی کا بیڑا اٹھا لیا،
راکٹ چھاپ بیڑی حاجی محمد اسرائیل کے کارخانے کی بنی ہوئی بڑی سرعت سے مقبول
ہوئی، باکی بیڑی کے مقابلے میں نیاز احمد کی کرکٹ بیڑی میدان میں اتر آئی، حاجی محمد

اسماعیل نگر چھاپ بیڑی کے نگراں تھے، سیٹھ عبداللہ در تمباکو مرچنٹ تھے لیکن سیٹھ حاجی
عبدالغفار تمباکو والے (دگجری بازار) نے اس کاروبار میں بیحد ترقی کی۔ سیٹھ عبدالرشید صدیقی
باکی بیڑی والے بڑے مخیر اور متمول شخص تھے۔ مذہبی اور تعلیمی اداروں کی بڑی فراخدلی اور
انشراح کے ساتھ مالی استعانت کرتے تھے۔ نیاز علی اینڈ سنز کی تلوار چھاپ بیڑی بہت
چلتی تھی۔

کامٹی کے معزز تاجر محمد یعقوب منزل سیٹھ نے جو حاجی سردار عبدالرحمٰن کے بھائی تھے
چرم فروشی اور چرسہ کے کاروبار میں بیحد دولت کمائی تھی ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے
کامٹی کے معروف شاعر احقر (۱۸۹۵ - ۱۹۵۰) کو چرم فروشی کا کاروبار ترکے میں ملا ساری
زندگی خوشحالی میں بسر کی۔

اسی شہر کے بزرگ ظہیر وارثی کے دادا محمد احمد چمڑے کے کامیاب تاجر تھے، حاجی عبدالعزیز
اس پیشہ میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مشہور تاجر حاجی سیٹھ عبدالکریم کے لڑکے محمد اسحاق
(۱۹۰۰ - ۱۹۶۱) بیڑی اور چمڑے کے کامیاب تاجر تھے کامٹی کے رئیسوں میں سے تھے۔

صنعت: زندگی نے ساری ہی برادری کو تانے بانے میں الجھا کر نہیں رکھا تھا، کچھ جدت
پسند حضرات بھی تھے اور کچھ ایجاد پسند تجار، جنہوں نے دوسرے دھندوں میں بھی قسمت
آزمائی کی۔ محمد حنیف جیسے کمپنی کے مالک تھے۔ نصیر الدین حاجی عظیم اللہ کپڑے والے
[illegible] ڈرگ ہاؤس کے مالک تھے۔ حبیب الرحمٰن صدیقی، محمد صدیق، بوسیٹھ، محمد ظہیر الحسن
نانی اور [illegible] محمد بھی ہوٹلوں کے مالک اور مہتمم تھے۔

[illegible] برادری بیکری کے دھندے میں تخصیص رکھتی ہے۔ کامٹی میں بیکری
کے [illegible] دھندا کرتے تھے ان میں عبدالرشید، محمد مشتاق دگجری بازار، نیاز احمد
[illegible] محمد رفیق، محمد عثمان بیکری والے بڑے کامیاب بیوپاری حضرات تھے۔ کوئلہ
[illegible] سیٹھوں کی ساکھ قائم تھی، برادری کے کچھ افراد بھی اس
[illegible] سے منسلک تھے۔ بیوپار [illegible] ٹال والے، فضل الرحمٰن محمد یعقوب کوئلہ ٹال، سیٹھ محمد
[illegible] ٹال [illegible] سیٹھ محمد [illegible] ٹال والے، محمد اقبال عبدالمجید کوئلہ ٹال، سیٹھ ہاشم اور
[illegible] سیٹھ محمد [illegible] شیخ عبداللہ ناگپوری آرا مشین والے تھے، حاجی عبدالحق (دادا
[illegible] کے بیٹے اور کھپریل (کھپریل) کے بیوپاری تھے سیٹھ محمد یعقوب

اور سیٹھ عبدالغفور کرانہ مرچنٹ تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر برادری تاجروں کی تھی۔

روحانیت کے تاجدار

برادری میں پیرانِ طریقت اور خدا رسیدہ بزرگوں کے بھی نام ملتے ہیں لیکن "شاہ" کی عزت کی گدڑی میں یہ 'لعل' نظر نہیں آتے، اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے برادری کے ایک طبقہ کو ہمیشہ سے عقیدت و ارادت رہی ہے۔ کامٹی کے روحانی تاجدار سلطانِ صوبہ بابا عبداللہ شاہ قادریؒ (متوفی ۱۸۷۸ء) تو شاہی کے قدوم میمنت لزوم سے یہ سارا صوبہ اقلیمِ روحانیت بن گیا تھا اور کامٹی اس کا مرکز تھا۔ آپ کا نام ولی محمد تھا۔ عبادت و ریاضت، ذکر الٰہی اور تزکیۂ نفس سے ولایت کا درجہ ملا، شانِ عبودیت نے عبداللہ بنا دیا آپ کی ذاتِ بابرکات سے اکتسابِ روحانی کرنے والوں میں حضرت بابا تاج الدین تاج اولیاءؒ، حضرت سید مسکین شاہ، حضرت غلام محمد شاہ قابلِ ذکر ہیں۔

تعلیمی سرگرمیاں

مومن برادری کو جب ہی آسودگی نصیب ہوئی تو چند بزرگانِ دین نے دینی علوم کی اشاعت و تحصیل کے لئے پورے مذہبی جوش و خروش سے کام کر کے اپنے گھروں میں نجی طور پر مکتب جاری کر دیئے اور فی سبیل اللہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا لیکن انگریزی حکومت کی نئی تہذیب و ثقافت کی مانگیں کچھ اور تھیں۔ مدرسہ میں جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی سے ذہن و دل میں روشنی پھیل رہی تھی اور مومن مسلمانوں کا معاشرہ اسی روشنی میں پروان چڑھ رہا تھا — باہر کی دنیا سے بے خبری نے مومن برادری کو پسماندہ بنا دیا تھا، جدید تعلیم کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے اثرات سارے ملک میں پہنچے تو برار کا علاقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ یہاں تعلیم کا رواج ہوا اور اردو ذریعۂ تعلیم کے جس قدر اسکول اور کالج اس علاقے میں قائم ہوئے اس کی نظیر مشکل سے دوسری ریاستوں میں ملے گی۔

مدرسہ سراج المومنین کی بنیاد ۱۹۱۴ء میں ڈالی گئی اس کی تاسیس کی سعادت ابا میان وارث پورہ محلے کے حصے میں آئی، چنانچہ اس وقت کے اکابرینِ قوم سردار حاجی سیٹھ

عبدالرحمٰن، حاجی ملّا عبدالوارث، حافظ محمد داؤد، سرپنچ منشی محمد سعید، عیدو سردار، سیٹھ الٰہی بخش، حاجی عبداللہ بیڑی مرچنٹ، منشی عبدالغفور اور جناب لعل محمد اس کے بانی بنے،
سنہ ۱۹۱۷ء میں اس مدرسہ کا تعلیمی افتتاح اس وقت کے سب سے زیادہ واجب التعظیم مذہبی اور علمی شخصیت حاجی ملّا عبدالوارث کے مبارک ہاتھوں ہوا۔

اس زمانے سے لے کر سنہ ۱۹۸۶ء تک مدرسہ کے عہدہ داران و اراکین مجلس منتظمہ کے اسمائے گرامی مدرسہ سراج المومنین کی تعلیمی تاریخ کے روشن اوراق بن گئے ہیں۔

سنہ ۱۹۷۳ء تا سنہ ۱۹۷۷ء: حافظ محی الدین (صدر)، حاجی عبدالکریم متولی (نائب صدر) محمد ظہیر وارثی (ناظم) محمد یحییٰ محمد اسمٰعیل عظیم (نائب ناظم) اراکین کے اسمائے گرامی یہ ہیں: محمد حنیف منظر (متوفی ۱۹۷۶)، ماسٹر حمید جمالی، محمد یوسف کمسر پنچ، محمد سلیمان سلیم، یونس جمال داؤدی، سرور محمد حسن، نجم الدین حاجی سیٹھ علیم الدین۔

سنہ ۱۹۷۲ء تا سنہ ۱۹۸۳ء: محمد سلیمان سلیم (صدر)، حاجی سیٹھ انیس الدین (نائب صدر)، محمد ظہیر وارثی (ناظم) محمد یحییٰ محمد اسماعیل عظیم (نائب ناظم) اراکین: محمد یوسف سرپنچ، سیٹھ عبدالرشید داؤدی، انیس الدین آغائی، سراج الدین صدیقی، محمد ظہیر احسن آنانی، نصرت کمال اور ریاض احمد عبدالحفیظ۔

سنہ ۱۹۸۳ء تا سنہ ۱۹۸۶ء: سیٹھ حاجی انیس الدین (صدر) سیٹھ عبدالرشید جمال داؤدی (نائب صدر)، محمد ظہیر وارثی (ناظم)، محمد یحییٰ محمد اسماعیل عظیم (نائب ناظم)، اراکین: سرپنچ محمد یوسف، انیس الدین آغائی، محمد سراج الدین صدیقی، نصرت کمال انصاری، ریاض احمد عبدالحفیظ، محمد ظہیر احسن آنانی، ابو جمیل احمد حمیدی۔

حضرت محمد ابو بکر (متوفی ۱۹۷۷) مدرسہ سراج المومنین کے مسلسل اکیس (۲۱) سال (۱۹۵۲ تا سنہ ۱۹۷۳ء) ناظم اعزازی رہے اور انتہائی خلوص سے فرائض ادا کرتے رہے۔

مدرسۃ المسلمین: ایم ایم ربانی ہائی اسکول و کالج:

مدرسۃ المسلمین سنہ ۱۸۹۵ء میں قائم ہوا تھا جس کی بنیاد کامٹی کے چند اکابر قوم و ملت کی رہین منت ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں سر شیخ حسین ربانی (۱۸۷۹ء-۱۹۳۷ء) کے ہاتھوں اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ انہوں نے سنہ ۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء میں ایک عالیشان عمارت تعمیر کر کے اپنے عزم بلند کا ثبوت دیا

اور علم کا یہ مینارۂ نور دور دور تک اجالا پھیلانے لگا' ابتدا میں یہ دینی مدرسہ تھا مگر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا کالج کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا ہے'' اس ادارے کی تعمیر و ترقی میں ماسٹر ربانی کے علاوہ کامٹی کی ممتاز ہستیاں بھی بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتی رہیں۔ عبدالستار فاروقی ماسٹر محمد سیفی اللہ عدلی، ماسٹر نور محمد، ماسٹر شیخ حسین'' الحاج محمد اسماعیل محمد صغیر، حاجی عبدالرحمٰن' محمد یوسف کلام، بابو عبدالقیوم، خان بہادر میر نیاز علی۔ الحاج خواجہ میاں پٹیل' ڈاکٹر عبدالرحمٰن احمدی، محمد ممتاز، عبدالغنی ٹھیکیدار، زینب بائی، حاجی عبدالجبار ٹھیکیدار، عبدالخالق ریٹائرڈ تحصیلدار، حاجی اسماعیل مینیجر، حاجی مولا شریف، منشی فیض اللہ فیض، بابو عبدالرحیم اور اس تعلیمی ادارے کے ارباب حل و عقد میں پرنسپل عبدالحفیظ انصاری اور نائب پرنسپل الحاج عبدالمتین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ سراج الدین سراج جو رشتے میں عبدالستار فاروقی کے چچا تھے کامٹی میں جدید تعلیم کو عام کرنے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ان کی کوششیں لائق تحسین ہیں۔ جمیل عرشی نے اسناد کے بیت ادا کی تاریخ کہا۔ ربانی ہائی اسکول کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد ربانی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔

برادری کی تعلیمی و علمی ہستیاں

منشی محمد سعید کامٹوی اور ان کے چند معاصرین وقت اور حالات کی مانگ اور رنگ سے کما حقہٗ واقف تھے۔ مغربی سمت سے آنے والی آوازوں سے ان کے گوش شناسا تھے اور فرقت میں جدید تعلیم کے پھیلتے ہوئے اجالے کو بھی دیکھ رہے تھے۔ مدرسہ سراج المومنین کے ان بانیان نے ابتدا میں اردو کی تعلیم کی داغ بیل ڈالی' جب یہ مدرسہ پھلنے پھولنے لگا تو مدرسۃ المسلمین جو برسوں سے بے چراغ بے رونق دیدۂ عبرت نگاہ بنا ہوا تھا اسی کی روشنی کے صدقے سے پھر منور بن گیا۔ پرائمری اسکول کے درجے سے بڑھ کر ربانی جونیئر کالج بن گیا۔ اس کی آبیاری میں مومن برادری کے ممتاز افراد کا بھی نمایاں حصہ ہے پرنسپل عبدالحفیظ انصاری کے حسنِ کارکردگی سے اس تعلیمی ادارے کو چار چاند لگ گئے' اور چاروں کھونٹ اس کی شہرت پھیل گئی۔ خان بہادر حاجی میر نیاز علی، غنی مرحوم عبدالحق سیٹھ، کلیم اللہ انصاری سیٹھ، حاجی محمد ایوب سیٹھ، حاجی محمد صدیق سیٹھ، حاجی محمد صابر سیٹھ کے علاوہ حاجی جوزف پروپرائٹر جوزف اینڈ کمپنی۔ ناگپور اور کامٹی کے یہ سارے

متمول، مخیر اور مخلص حضرات کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ منارۂ نور بن گیا ہے۔ حاجی عبدالمتین
نائب پرنسپل، محمد علیم الدین، حمید جمالی، منظور احمد، عبدالقادر قریشی، مولوی عبدالحق
معروفی، سید نصیر الدین عظیمی، عبدالحلیم ثانی، محمد یعقوب انصاری، ڈاکٹر محمد یوسف انصاری،
شوکت علی، نور محمد، محمد حفظ الرحمٰن، ظہیر عمر اور محمد سعید اختر، محمد ظہیر الحسن انصاری، اشتیاق
احمد انصاری وغیرہم جیسے قابل، لائق اور مخلص اساتذہ اس ادارے کی گرانقدر خدمات کی ہیں۔

موجودہ ربانی کالج نہ صرف اخلاق و محبت کی درس گاہ ہے بلکہ کھیل اور ورزش کی
تربیت گاہ بھی ہے۔ وائس پرنسپل الحاج عبدالمتین نے تجربات کی روشنی میں اسپورٹس
کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا تھا جس کے نتیجے میں ماسٹر شوکت علی اور ڈاکٹر محمد یوسف انصاری
(مرحوم)، ظہیر انصاری اور دیگر صاحبان کی کوچنگ سے ربانی اسکول فٹ بال ٹیم کی کھیل
کے میدان میں جولانیاں بڑھ گئیں۔ علاقہ ودربھ کے پہلے اولمپک فٹ بال کھلاڑی کا اعزاز
ربانی اسکول کے مایۂ ناز فرزند کپتان مشتاق احمد نے حاصل کیا جو ایک لمبے عرصے تک محمڈن
اسپورٹنگ کلکتہ کا نام اپنے کھیل کے شاندار مظاہروں سے اونچا کرتے رہے۔ بین الاقوامی شہرت
کے ملک کے سارے کھلاڑی ہیں جو ربانی ہائی اسکول کے پروردہ ہیں: محمد علی، صلاح الدین، محمد
ابراہیم پہلوان، مختار احمد انصاری، نذیر بیگ گارڈ، محمد صابر، عبدالحفیظ، ظہیر حسن، محمد یوسف،
قمر حنیف، عبدالحمید منگا۔ ان میں شہرۂ آفاق کھلاڑی عبدالستار انصاری کا نام سب سے
زیادہ فروزاں ہے۔

ربانی ہائی اسکول کے علمی آغوش میں تربیت پا کر کئی نسلیں زندگی کے ہر شعبہ میں بہار دکھا
چکی ہیں اور ہندوستان گیر شہرت کی حامل شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جن میں ملک کے مشہور
معالج قلب ڈاکٹر محمد خلیل اللہ کا نام سر فہرست ہے۔ ایشیا کے ممتاز ماہر دل کے ڈاکٹروں
میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کی صف میں ڈاکٹر مصباح الحسن انصاری (ایم بی بی ایس
ڈی پی ڈی)، میڈیکل آفیسر متو ہسپتل ناگپور، ڈاکٹر زاہدہ انصاری شتری (ڈی سی ایچ۔ ایم ڈی)
ریڈر شعبہ امراض نسواں گورنمنٹ میڈیکل کالج ناگپور، ڈاکٹر عشرت جاوید انصاری (ایم بی
بی ایس)، ڈاکٹر محسن کمال انصاری (ایم۔ ڈی نیورو سرجن)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری (ڈی ایم پی
مرحوم)، ڈاکٹر مطیع شفیق جمال، ڈاکٹر شمیم، ڈاکٹر زبیر آغائی، ڈاکٹر رضی الدین معروفی، ڈاکٹر
خلیل الرحمٰن معروفی وغیرہ نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر انیس خورشید (ایم ایل ایس امریکہ) کامٹی کی مشہور شخصیت خورشید حق کے جو مسجد وارث پورہ اور دیگر تعلیمی اداروں سے متعلق تھے) بیٹے ہیں۔ آپ کا شمار پاکستان کی ممتاز علمی، ادبی اور تعلیمی شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ آپ فن کتابداری میں ماہر ہیں، امریکہ یونیورسٹی کے شعبۂ لائبریری سائنس کے چیرمین اور پروفیسر رہ چکے ہیں۔ (۱۹۸۶)۔

کامٹی کا یہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جو مسلمانوں کے لئے سرچشمۂ علم و عمل ہے۔ ادب کے شعبہ میں یہاں کے تربیت یافتہ طلبہ و طالبات نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر عرفان عبدالرب نے اردو اور فارسی میں ایم اے کیا، گولڈ میڈل حاصل کئے۔ آپ صاحب تصنیف ہیں۔ نعمت خان عالی: شخصیت، فن اور کارنامے آپ کا تحقیقی مقالہ بڑا جاندار ہے۔ آپ کامٹی کی مشہور دینی و علمی ہستی حاجی ملا عبدالوارث کے نواسے ہیں۔ عسرت دادبار میں بچپن بیتا دادی کی شفقت، برادر نسبتی محمد سلیمان ابن ملا محمد سعید کی اعانت اور دیگر نیز حضرات کی حوصلہ افزائی۔ زندگی کی جراحتوں کا مداوا اور مرہم بن گئی۔ ڈاکٹر عبدالرب عرفان کسب معاش کی مشقت کے ساتھ ساتھ تحصیلِ علم کے لیے بھی جد و جہد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے محنت کا ثمرہ علم کی دولت اور تعلیمی و علمی منصب کی صورت دیا۔ دربھنگہ مہاودیالیہ ارادتی میں شعبۂ فارسی کے صدر رہے۔ ۱۹۷۸ء میں ناگپور یونیورسٹی کے فارسی عربی بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین منتخب کئے گئے۔

ڈاکٹر مختار احمد رحمت اللہ۔ مدحت الاختر: اشتر لڈھو کے حافظ محمد رحمت کے بیٹے ہیں۔ ہائی اسکول سے فارغ ہو کر ناگپور مہاودیالیہ سے ایم۔ اے کیا اور اب وہیں لیکچرر ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ نظیری نیشاپوری: حیات اور فن پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تھا۔ آپ کا مجموعۂ کلام مناظروں میں روز و شب جو آپ نے اپنے برادر بزرگ ہدایت اللہ انصاری کے نام معنون کیا ہے (۱۹۸۰) آپ کے شعری رویہ کا آئینہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مدحت الاختر اور ڈاکٹر عبدالرب عرفان ربانی ہائی اسکول کے دو ایسے ہونہار اور ہونہار طالب علم ہیں جن کے ادبی و تعلیمی کارنامے کامٹی کی تاریخ کے دو اہم باب بن چکے ہیں، ان کے علمی فیضان نے کئی نسلوں کو سیراب کیا ہے۔ دور جدید کے اردو و فارسی کے اساتذہ ادبا اور شعراء جو موجودہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں انہیں کے سرچشمۂ علم و فضل سے مستفیض ہوئے ہیں۔

پروفیسر عبدالرب عرفان اردو اور فارسی کے نکتہ شناس محقق اور اردو ادب کے رمز

شناس شاعر اور ادیب ہیں، تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں، آپ زندہ احساس کے ایسے حسّاس اور ذہین شاعر ہیں جن کے کلام میں قدمار کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور عصری آگہی اور نئے رجحانات کی گونج بھی صدائے بازگشت بن جاتی ہے۔

گذشتہ پچیس برسوں سے اس تعلیمی درسگاہ کے سرچشمۂ حیات سے سینکڑوں جاہ و حشم کے سکندر اور علمی و ادبی سفر کے خضرِ راہ پیدا ہوئے ہیں۔

جمال کا جمیل خاندان

ماسٹر حمید جمال کا گھرانہ علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کے جملہ جمالیات کا آئینہ دار ہے۔ حمید جمال کے صاحبزادگان میں ظہیر الظفر (ایم ایس سی) پرودال کالج میں ریاضی کے ایک قابل استاد ہزاروں طالبعلموں کی مشکل گتھیاں سلجھا چکے ہیں اور ناخنِ تدبیر سے رشتۂ فکر کی گرہیں کھولی ہیں۔

ڈاکٹر رشید الظفر جمال فارسی جیسی شہد آگیں زبان سے لذتِ کام و دہن اٹھا کر علم الادویات کی چاشنی میں ڈوب گئے ہیں، فارسی کے ماہرین میں شمار ہوتے ہیں، تین سال بیرونی کی نحرانی ذفت میں جمالِ فن دکھا کر اب ہمدرد کالج آف فارمیسی میں ڈین کے اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہیں، آپ برادری کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے فارموکولوجی میں ڈاکٹریٹ کیا ہے، شعر و ادب کا ذوق رکھتے ہیں اور دو کتابیں زیرِ طبع ہیں۔

ظہیر بعد جن خورشید ان کے چھوٹے بھائی لائبریری سائنس کے اسکالر ہیں، سعودی عرب اور پاکستان میں "کتب داری" کی خدمت گزاری کر کے لوٹے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر رشید جمال ایسے مصوّر ہیں کہ "نقش کو اس کے مصوّر پہ بھی کیا کیا ناز ہیں"۔ پرودال کالج کامٹی میں شعبۂ اردو سے منسلک ہیں، ادب میں تنقیدی بصیرت حاصل ہے، آپ نے شبلی نعمانی کی سیرت نگاری پر ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔

سلیم الظفر ڈاکٹر ارشد جمال کے چھوٹے بھائی ہیں ضلع ناگپور کے معروف آرکیٹکٹ ہیں۔

ماسٹر حمید جمال کے پوتے تفضل جمال علم الادویات میں ایم فارم ہیں اور فارمیسی میں تحقیق کر رہے ہیں، کالج آف فارمیسی پوسد میں لیکچرر ہیں، ان کے دوسرے بھائی یوسف جمال کمپیوٹر سائنس میں ایم ایس سی کر کے اب دلی میں کمپیوٹر پروگرام کے فرائض ادا کر رہے ہیں۔

عبدالقادر اخگر کا سرگرم خاندان

اہلِ کمال اور صاحب علم و سخن کا گھرانہ ہے۔ ان کے صاحبزادگان میں عبدالکریم انصاری پیشۂ طب و حکمت سے وابستہ ہیں، باغ و بہار شخصیت ہیں۔ مذہبی اور سماجی خدمات انجام دیتے ہیں، نہایت مخلص شخصیت ہیں، مصباح الرحمٰن ان کے صاحبزادے مشہور ڈاکٹر ہیں، چھوٹے صاحبزادے نے سائنس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نخش قادری جدید اردو شعراء میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں اور اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں، اسی طرح اخگر کے دوسرے بیٹے منشی محمد مختار مرحوم کے صاحبزادے عشرت انصاری بھی مشہور ڈاکٹر ہیں، ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر زاہدہ انصاری ہیں، عبدالحلیم ثانی پیشۂ تدریس سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے ہیں۔ عبدالحلیم ثانی کی اہلیہ ڈاکٹر زرینہ شفق قادری ہیں۔ طلحہ حسین، عبدالحلیم ثانی ادب و شعر کا بڑا ستھرا اور لطیف ذوق رکھتے ہیں۔ طلبہ کو آپ سے بڑی عقیدت ہے۔ مشتاق احمد نقش قادری، ممتاز احمد قادری اور عبدالکریم انصاری بھی تذکرے کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد یوسف انصاری کامٹی میں برادری کے پہلے پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں، جنہوں نے ایک تاریخی موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی، ڈاکٹر محمد یاس قدوسی نے "صوبۂ خاندیش مغلیہ دور میں" کے عنوان پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی، ڈاکٹر محمد یسین قدوسی ربانی ہائی اسکول کے پہلے طالب علم ہیں، جنہوں نے تاریخ میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔

جن اساتذہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے ان کے اسمائے گرامی خاص طور سے یہ ہیں۔

خلیق الزماں، ڈاکٹر عظمت اللہ، ڈاکٹر محمد ناظر رشیدی، عبدالرب عرفان، رشید جمال، عزت الاختر، رشید الظفر جمال، طاہرہ بانو، عبدالرحیم نشتر، جاوید احمد سعیدی، یاس قدوسی، محمد یسین قدوسی، منیرہ اختر رشیدی، خالدہ نگار، ڈاکٹر جاوید سعیدی نی اے ل چندر پور میں صدر معلم ہیں، ان کے لڑکے امراؤتی بورڈ کے ہائی اسکول امتحان میں بڑے شاندار طریقے پر کامیاب ہوئے ہیں

برادری میں ایم۔ اے کرنے والوں کی لمبی قطار ہے۔ ماسٹر محمد ایوب ثاقب، محمد ظفر احمد انصاری (معاشیات) نسیم انصاری، شاہینہ، شہناز، رشید الظفر وغیرہ۔

محمد عبدالحفیظ انصاری (ولادت ۱۹۱۸) (ایم۔ اے۔ ڈی پی ٹی)

سیٹھ حاجی عبدالواحد کے بڑے ہونہار اور لائق بیٹے محمد عبدالحفیظ انصاری کامٹی کے سر سید احمد ہیں۔ "اراکین بزمِ ناب کامٹی نے چھٹواں سالانہ مشاعرہ میں اراکین کی جانب سے محمد عبدالحفیظ انصاری پرنسپل ربانی ہائر سیکنڈری اسکول کامٹی کی دیرینہ تعلیمی و ادبی خدمات کے پیشِ نظر معمارِ قوم کا اعزاز بخشا۔ ربانی جونیئر کالج کے سابق پرنسپل محمد عبدالحفیظ انصاری تعلیمی سرگرمیوں کے قطب الاقطاب ہیں اور مینارۂ علم جس کی روشنی میں مسلمانانِ کامٹی کے نوجوان ہر سال ایک کثیر تعداد میں علم و ادب سے مزین ہو کر راہِ زندگی پر گامزن ہوتے ہیں، وہیں قوم کی بیٹیاں خدیجہ بائی گرلز ہائی اسکول سے زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہو کر حیاتِ نو کی تعمیر میں مصروف ہیں" (مشعلِ حیات، ناگپور ۲۵ فروری ۱۹۸۱ء)

محمد عبدالحفیظ انصاری کا شمار ودربھ کے ممتاز ماہرینِ تعلیم میں ہوتا ہے۔ آپ کی شخصیت شہر کامٹی میں ہر دلعزیز تصور کی جاتی ہے۔ ان کی جگہ منظور احمد ربانی اسکول اور جونیئر کالج کے پرنسپل ہیں۔

مومن سیاسی مدبرین اور سماجی خدام

کامٹی میں ۱۸۶۶-۶۷ء میں میونسپلٹی قائم ہوئی۔ کنٹونمنٹ بورڈ کا پہلا الیکشن ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ اس میں مومن برادری کے سرپنچ منشی محمد سعید اور سردار سیٹھ عبدالرحمن ممبر ہوئے جو اس زمانے میں ایک بڑا شہری اعزاز تھا۔ جب ۱۹۲۶ء میں کامٹی میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو منشی سعید اس کے ممبر مقرر ہوئے۔ محمد فیض اللہ فیض جو کامٹی کی ادبی اور سماجی سرگرمیوں کے روحِ رواں تھے کامٹی میونسپل کمیٹی کے چار مرتبہ (۱۹۳۱ء تا ۱۹۵۲ء) ممبر منتخب ہوئے اور دو سال (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء) اس کمیٹی کے نائب صدر رہے۔
محمد جمیل منشی بھی میونسپل کمیٹی کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ محمد رستم اختر (۱۸۹۵ء — ۱۹۵۰ء) جو برادری کے رئیس محمد یعقوب منزل سیٹھ کے لڑکے تھے سماجی اور سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ کئی مرتبہ کامٹی کے میونسپل کمیٹی کے کونسلر منتخب ہوئے اور "فخرِ قوم" کے قومی اعزازی خطاب سے نوازے گئے۔ اپنے تایا زاد بھائی اختر کی طرح محمد

عمر انصاری اطہر بھی کامٹی میونسپل کمیٹی کے کونسلر تھے۔

کامٹی میں چونکہ مومن برادری تعدادی شمار میں سب سے زیادہ ہیں اسی لئے میونسپلٹی پر چھائے ہوئے ہیں، ۱۹۳۲ء میں برادری کے ایک ممتاز فرد حاجی بیڑی کے تاجر سیٹھ عبدالرشید صدیقی پہلے وائس پریزیڈنٹ بنے ان کی روایت ابھی تک قائم ہے۔ میونسپل کاؤنسلروں میں جمال احمد انصاری، ظہیر آغائی (وارث پورہ)، نیاز احمد (وارث پورہ) اور محمود احمد (گجری بازار) کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

سیاسی میدان کے شہسوار اور بساطِ سیاست کے مہرے مومن برادری کی بستی میں کثیر تعداد میں ملیں گے لیکن مخلص اور بے لوث خدامِ قوم انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ آجکل کی بات ہے آج سے ستّر سال پہلے عالم کچھ اور تھا۔ جذبۂ آزادی کی موجیں غلامی کے حصاروں سے ٹکرا رہی تھیں اور خلافت کی تحریک سے انگریزی حکومت کی وسیع و پختہ بھری عمارت میں بھونچال آنے لگا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۰ء میں ناگپور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس بیرسٹر ... کی صدارت میں ہوا۔ جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کا جھنڈا کامٹی اور ناگپور میں بلند ہونے لگا اور ملک کی آزادی اور ملت کی بقا کا جذبہ مسلمانوں کے سینوں میں موجزن ہو گیا۔ برادری کے کئی بزرگ جن سفینۂ سیاست کے ناخدا بن گئے اور ملی کار خیر مخصوص کر کے مضطرب بن گئے۔ حافظ عبدالرحیم منتظر ایک نیک سیرت، پاک باطن اور مکارم اخلاق کے حامل مہذب مرتبہ انسان تھے سیاسی لحاظ سے مسلم لیگ کے زبردست حامی اور سرگرم کارکن بن گئے۔ لیگ کے جلسوں میں سیاسی نظمیں حب الوطنی کے جذبات سے سرشار نظمیں پڑھا کرتے تھے اور ان کے ذریعے مسلم عوام کو دعوتِ عمل دیا کرتے تھے۔

نصرت کمال انصاری میونسپل کاؤنسلر ہیں ایک فعال سماجی کارکن ہیں آپ حافظ عبدالستار انصاری کے صاحبزادے اور عبدالحفیظ انصاری کے بھتیجے ہیں۔ ان کے برادرِ خورد منت کمال انصاری برادری کے پہلے پولس انسپکٹر تھے عین عالمِ شباب میں انتقال کر گئے۔

ہے پیکرِ خیال جہاں سے بڑھا ہوا — نظروں میں کارزار کا نقشہ کھنچا ہوا

فتح و ظفر کا مالک و وارث بنا ہوا — مسلم ہے زیرِ دامنِ خنجر رہا ہوا

رکھتا ہے آگے تیر کا سینہ تنا ہوا

کانگریس اور خلافت تحریک نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ترکِ موالات کا سلسلہ شروع کیا تو سرفروشی کی تمنا ہر دل میں مچلنے لگی، رشتۂ فکر آزادی کی گرہیں کھلنے لگیں تو محبانِ وطن اور مجاہدین پابند سلاسل ہونے لگے۔ کامٹی میں اسی زمانے میں خلافت کمیٹی بنی، عبدالستار فاروقی جو آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں بحیثیت والنٹیر شریک ہوئے تھے اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ سیاسی میدان میں عملی حصہ لینے کی بنا پر تحصیل علم سے محروم رہ گئے، لیکن کچھ دنوں بعد کانگریس سے دل کھٹا ہوا تو پلٹے اور مسلم لیگ سے دل ملا لیا، سنہ ۱۹۴۶ء میں اسی کے پلیٹ فارم سے ایم۔ ایل۔ اے بنے، لیکن جب آزادی کا پرچم لہرانے لگا اور مسلم لیگ والے نئے ملک چلے گئے اور صرف جھنڈا چھوڑ گئے تو انہوں نے بھی پارٹی کا ساتھ چھوڑ دیا، واپس لوٹے اور پھر کانگریس کے علمبردار بن گئے۔ اور آخیر وقت تک اس کے ساتھ رہے۔ تقسیم ملک سے پہلے عبدالستار فاروقی الفاروق ہفتہ وار نکالتے تھے پہلے مسلم لیگ کی موافقت کرتا رہا، آزادی کے بعد کانگریس کا ترجمان بن گیا۔ فاروقی صاحب سنہ ۱۹۳۲ء میں لاہور میں ہونے والے مومن کانفرنس کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے تھے اور مومن برادری کامٹی کی نمائندگی کی۔

فیض انصاری کے بھائی عبدالقادر جو ناگپور میں مقیم تھے ہمیشہ کانگریس کے ساتھ رہے، سیاسی میدان میں ان کی حیثیت مقدم تھی، ہر دلعزیزی عام تھی دو مرتبہ انہیں خدمات کے سبب ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد ۱۹۴۱ء تک ناگپور میونسپل کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے۔

آزادی سے پہلے ظہیر فاروقی مسلم لیگ کا دم بھرتے تھے تقسیم ملک کے بعد بھی اس سے کٹ گئے۔ ظہیر فاروقی کو مسلم لیگ کی کونسل کی ممبری بھی حاصل تھی وہ سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۴ء تا سنہ ۱۹۴۶ء ناگپور مسلم لیگ شاخ ناگپور کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں صوبائی جمعیۃ علماء کے سکریٹری مقرر ہوئے اور جمعیت کی مرکزی کونسل میں لے گئے۔

مزدور تحریک تو اس صنعتی شہر میں جہاں مزدوروں کی کثرت تھی کچھ فروغ مزدور ملا تھا شعرا اور ادیبوں میں بھی ترقی پسند رجحانات کے عنصر پیدا ہوئے، اشتراکی خیالات کے عنکبوتی جالے ذہنوں کو لپیٹنے لگے تھے، محمد فیض اللہ کے بیٹے یونس فیضی (متوفی ۱۹۷۵ء)۔ اور ان کے چھوٹے بھائی شمیم فیضی آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے، اردو کے کامیاب صحافی بن کر "عصر جدید" ادارۂ حیات سے نسبت رکھتے تھے۔ اب مستقلاً دلی میں قیام ہے۔

محمد شریف ایڈووکیٹ زمانے سے پریکٹس کر رہے ہیں، میونسپل کاؤنسلرس میں عصمت کمال، نصرت کمال، صالحہ، درمقبول احمد ظہیر وارثی کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔

کامٹی کے فٹ بال کھلاڑی اور پہلوان

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۱ء تک دس سال کامٹی کے فٹ بال کھلاڑی میدان پر چھائے رہے، قمرالدین جو محمد یعقوب منزل سیٹھ کے لڑکے تھے انوار، اسلام فٹ بال کلب کے سورج چاند تھے۔ انگریزی ٹیم کا مقابلہ بھی کر چکے تھے، کئی انعامات جیت چکے تھے، ربانی فٹ بال ٹیم کو بھی ملکی سطح پر شہرت حاصل تھی، کھلاڑی کل ہند شہرت کے مالک تھے محمڈن اسپورٹنگ اور موہن بگان کلکتہ کے میچوں میں حصہ لیتے رہے مشتاق احمد کپتان صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ حاصل کر چکے تھے آپ محمڈن فٹ بال ٹیم کی طرف سے کھیلتے تھے، صلاح الدین بھی اسی ٹیم کے کھلاڑی تھے اور کپتان رہے۔ ویسٹ بنگال ٹیم کی سرکاری طور پر ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھاتے رہے، مختار محمد انصاری کل ہند کھلاڑیوں میں بحیثیت [illegible] رہے محمد علی کا بھی نام اونچا رہا۔

عبدالستار انصاری وہ ربانی فٹ بال ٹیم کے کپتان تھے اور بہترین کھلاڑی ہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں مختلف اداروں میں نمائندگی دی گئی ہے ان کی شہرت بڑی طویل ہے۔ فٹ بال کھیل کے تعلق سے آپ کی شہرت چاروں اطراف میں پھیل چکی ہے۔ اسپورٹس کی مدد پذیرائی کرتے ہیں اس مقصد کے لئے ربانی اسپورٹس سینٹر کے نام سے کامٹی کا پہلا اسپورٹس مرکز ان کی رہنمائی میں چل رہا ہے۔ کامٹی میں ۱۹۷۰ء تک سات فٹ بال کی ٹیمیں تھیں۔

اقبال اسپورٹس کلب، انصار اسپورٹنگ کلب، غنچہ، اسلام وغیرہ بہار دکھاتے رہے۔ تب انصاری ہندوستان کی طرف سے ہانگ کانگ ورلڈ کے مقابلے میں داخل آئے تھے۔

کامٹی کے پہلوانوں میں مجید نہدی، سردار محمد سلیمان پہلوان (وارث پورہ)، محمد اشفاق پہلوان محمد صابر پہلوان، محمد ابراہیم پہلوان، دلاور پہلوان (برتن والے)، محمد مقبول عبدالمجید پہلوان (وارث پورہ) محمد یعقوب پہلوان (دین چوک)، محمد اسلم پہلوان (مرحوم) بھولی کرشن وغیرہ مشہور تھے

آج کا کامٹی شہر

مزدوروں کا یہ شہر، پاور لوم کارخانوں کا چھتے پلاٹ شہر کی صنعتی سانس تانوں بانوں کے

ٹوٹ جانے سے آہستہ آہستہ اُکھڑ رہی ہے، دیگر سوسائٹیاں بھی اُجڑ رہی ہیں، حکومتِ مہاراشٹر کے تحت چلنے والے "مہامنڈل" کو اب تب لگ چکا ہے اس سے وابستہ بُنکر برادری امید و بیم کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ سرکاری نظام میں جب ذاتی مفاد پرستوں کی ہوس کا زنگ لگ جاتا ہے، رشوت کی دیمک جب تجارت و صنعت کی عمارتوں میں لگ جاتی ہے تو سارا انتظام کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اس مایوس کن صورت حال کا برادری کا کمزور طبقہ نہ تو استقامت سے مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ صنعت کے اُلجھے ہوئے تانوں بانوں کو سلجھا سکتا ہے نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ کارگاہوں کو بند کر کے کچھ تاجر دکانوں کے دروازے کھول رہے ہیں اور دوسرے پیشوں میں آگے بڑھ کر حصہ لینے لگے ہیں، کامٹی کا بنکری بازار جہاں پہلے دور دورے ہوتے تھے اب تقریباً ویران پڑا ہے پھر بھی بہت صنعتکار بہرحال موجود ہیں جو بنکاری کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ناگپور کی انصاری برادری

ہر شہر اور ہر بستی کی وجہ تسمیہ ہوتی ہے اس میں تاریخ اور جغرافیہ دونوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ ناگپور نام کے اوصاف پر کئی شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے:

بچکے اگر تو ڈس سے جاؤ گے اے نذیر
یہ در کوئی شہر نہیں ناگپور ہے (نذیر بنارسی)

ناگپوری شہسواروں سے لڑو گے کیا ظریف
جب یہاں کے سنتروں نے دانت کھٹے کر دیے (ظریف جبلپوری)

اور ناطق گلاؤٹھوی جو ناگپور اور کامٹی کے شعراء کے استاد ٹھہرے اپنی اقلیم سخن کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔

ملکِ سخن ہر اہلِ سخن کو ہوا نصیب
ناطق ترے نصیب میں یہ ناگپور تھا

ناگپور وسطی ہند کے علاقے میں جنگلوں کے حصاروں میں گھرا ہوا اور فطری ندیوں کے روپہلی نگینوں سے جڑا ہوا ایک قدیم شہر ہے، ایک زمانے میں اس بستی کے چاروں طرف خود رو جھاڑیوں اور ناگ پھنی کے باڑوں کا گھیرا تھا شاید یہی ناگ پھنی۔ اس کی وجہ تسمیہ ہو، یہاں گونڈوں کی حکومت تھی پھر اس صنمکدے میں دینِ اسلام کی کرن پھوٹی، مغلوں کے زمانے

میں یہاں کا حکمراں ان کا باجگذار بن گیا اور دیوگڑھ کے ایک شہزادے کا بخت بلند جو آزردہ پہلا مسلمان سلطان بن گیا، بخت بلند شاہ مغلوں کی تہذیب و ثقافت کا دلدادہ اور پروردہ تھا، دینِ اسلام کی اعلیٰ قدروں کا قدر دان تھا اسی لیے مسلمان بن گیا اس نے بلا تفریق مذہب و ملت اپنی حکومت میں لوگوں کو عہدے دیے، محنت کش طبقہ اور زراعت پیشہ افراد کی سرپرستی کی جس کے سبب گونڈوانہ میں جفاکش اور محنت کش طبقہ باہر سے آکر آباد ہونے لگا، صنعت و حرفت اور زراعت میں ترقی ہونے لگی، بخت بلند شاہ کے زمانے میں جدید ناگپور ایک نئے تعمیری ڈھانچے میں ڈھلنے لگا، شہر کو آراستہ اور سنوارا گیا، سڑکوں کا جال بچھایا گیا، اس کا حال بدلا، محلوں کی تقسیم ہوئی اور دیوگڑھ اسلام گڑھ بن گیا، اس نے یہاں ایک موتی مسجد بنوائی اور اس طرح مسلمان آباد کاروں کی تعداد بڑھنے لگی۔

اس کے جانشین بیٹے چاند سلطان (متوفی ۱۷۳۵ء) نے ناگپور کے حسن کو چار چاند لگا دیے، باغات، عمارات اور تالابوں نے شہر کو ایک نیا روپ عطا کیا، پھر سیاسی حالات نے پلٹا کھایا، بھونسلوں کا تسلط مہاراشٹر سے کراڑیسہ تک پھیل گیا، رگھوجی اول (۱۶۹۵ء۔ ۱۷۵۵ء) ایک دور اندیش، غیر متعصب اور رعایا پرور حکمراں تھا، جس نے مغربی مہاراشٹر مرہٹے اور برہمن خاندانوں کو لا کر بسانا شروع کر دیا اور کافی تعداد میں کوشٹی (بنکروں) کو لا کر صنعت پارچہ بافی کو فروغ دیا، ۱۷۹۹ء میں ریاست میسور کے زوال کے بعد مسلمان پناہ گزینوں نے ناگپور میں چھاؤنی ڈال دی، اس نو وارد قافلے میں اہل علم اور اہل ہنر تھے اور صوفیائے کرام کی آمد کا ایک سلسلہ بندھ گیا، ان میں شعراء حضرات بھی تھے جن کے دم قدم سے محفل شعر و سخن سجنے لگی اور غدر کے قہرمانی دور کے بعد جب یوپی کے مہاجر افسری حضرات آکر بسنے لگے تو ہر طرف علم و ادب اور شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا اور گھروں کا ذوق لطیف ہونے لگا، قدماء میں عبد العلی عادل ناگپوری، غلام رسول غمگین، فیض محمد فیض، سید عباس علی شہرت، عثمان خان غافل، غلام عبد القادر رفعت زلفی، غلام دستگیر مشرق، نجیب خان عاصی اور وحشی ناگپوری اس دور کے بلند پایہ شعراء گذرے ہیں۔[1]

---

[1] تاریخ ناگپور، ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل۔ مومن پورہ ناگپور ۱۹۸۳ء۔

انصاری مہاجرین

۱۸۵۷ء میں ناگپور میں بھی مقامی زمینداروں اور جاگیرداروں نے علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن یہ علم سرنگوں کر دیا گیا اور باغیوں کے سر قلم کر دئے گئے۔ سیتا بلڈی کے قلعے میں بغاوت دفن کر دی گئی اور انگریزی استعماریت کا عفریت بیدار ہو گیا۔ اس سے تین سال قبل ناگپور کا رگھوجی ثالث کے فوت ہونے کے بعد ۱۳ مارچ ۱۸۵۴ء کو انگریزی حکومت سے الحاق ہو چکا تھا۔

شیخ انصاری نوربافوں کی سب سے بڑی تعداد اعظم گڈھ ضلع کے قصبات سے آکر ناگپور میں آباد ہو گئی تھی۔ کامٹی کی طرح یہاں بھی کرگھوں کی کارگاہیں قائم ہو گئیں اور برادری کی عبادت گاہیں اور درسگاہیں بھی تعمیر ہونے لگیں۔ آج ناگپور میں مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۳ لاکھ ہے جس میں مومن انصاری برادری کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے۔ برادری میں سیاسی مدبرین، اکابر سیاست، علمائے کرام، حفاظ، قرّاء، وکلاء، اساتذہ و شیوخ اور رؤسا در صنعت کاروں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔

شیخ انصاری نوربافوں کی سب سے بڑی تعداد ناگپور کے سواد میں آباد ہوئی۔ مہاجرین سب سے پہلے موضع تیساپوری کے حوالی میں وردی پہاڑیوں کے دامن میں آکر آباد ہوئے کیونکہ یہاں شکستہ حال قدیم مزارات کا شہر خموشاں آباد تھا اور جو زبانِ حال سے کہہ رہا تھا ؎

اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

— لیکن جب کرگھوں کے شور نے شہر خموشاں کے پُراسرار سناٹے کو توڑ دیا، مزارات کے تکیوں سے پرے جن میں دیوان شاہ کا تکیہ، معصوم شاہ کا تکیہ، محبوب شاہ کا تکیہ وغیرہ شامل تھے۔ مومن پورہ کی بستی بس گئی۔ کارگاہوں کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں کے مینارے بلند ہوئے درگاہوں سے متصل مکتبوں میں علم کے چراغ روشن ہونے لگے لیکن ابتدا میں میاں جی اور منشی حضرت نے سینے ہی گھاس پھوس اور سفالی پوش گھروں میں کرگھے چلاتے ہوئے درس قرآن دینے لگے۔ اطراف کے مواضعات کے قدیم باشندوں کے لیے سالی اور کوشٹی بنکروں کی طرح مومن نوربافوں نے بھی ۹ گزی اور ۶ گزی ساڑیاں بُننا شروع کر دیں، کسانوں نے روئی مہیا کی جاتی تھی اور پھر چرخے کے مال کی گردش تیز ہو جاتی۔ ہاتھوں سے رنگائی کی جاتی

اور میدانوں میں آڑا بازی کرتے اور "بھانجا" پھیلاتے۔ برادری ہمیشہ پابند صوم و صلوٰۃ رہی ہے، یہاں کی مسجدوں کی تعمیر میں اس نے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ جامع مسجد، چھوٹی مسجد (اہلحدیث) اور امان اللہ سیٹھ کی مسجد آج بھی بارونق رہتی ہے۔

جب یہاں ملیں قائم ہونے لگیں تو ہینڈ لوم کی پارچہ بافی پر معاشی طور پر بڑا برا اثر پڑا۔ بنکر۔ مزدور بن گیا، پاور لوم کی رفتار تیز ہو گئی تاتا ٹیکسٹائل (امپریس مل)، سیٹھ کستور چند ڈاگا کے ماڈل مل نے پارچہ بافی کی صنعت کو بجید فروغ دیا، اور بنکروں کو کام دیا۔ ناگپوری ساڑیاں۔ کھن۔ لنگی، چادر جیسی مصنوعات سے بازار چمک اٹھا۔ اور بنکر برادری کی قسمت چمک اٹھی، تعلیمی درسگاہوں کی بنیادیں پڑنے لگیں، ادبی فضا قائم ہوئی تو مسلم لائبریری وجود میں آئی۔ محمد علی سرائے مہمانوں کے لیے، نزش راہ بن گئی۔ عیدگاہ اور قبرستان کے قیام نے موت و زیست، انبساط و غم کی تفریق پیدا کر دی۔

۱۹۴۸ء میں حیدرآباد دکن کی طرف سے بیسویں صدی کے حیا بنانے آکر انیسویں صدی کے تارکین وطن کی بستیوں میں بسنے لگے، جب صنعت کو فروغ ہوا تو تلاشِ معاش میں نو واردانِ بساط ہوائے گل؟ سے رونق بڑھتی گئی یا خنظم گدھ، پرتاب گدھ، فیض آباد، منڈہ اور جونپور ضلعوں کے "ملکی انصاری" تھے۔ مومن پورہ کے جوار میں سیفی نگر۔۔ اور انصاریوں کی بستی انصار نگر بس گئی۔ اس کے بعد سے ہر جماعت کے مدرسے بھی وجود میں آنے لگے، مدرسۂ اسلامیہ، مدرسہ دارالعلوم یعقوبیہ، مدرسہ قرآنیہ۔ یعقوب لائبریری اور دیگر ادارے اردو کی بقا و تحفظ کے امین بن گئے۔

تعلیمی اداروں میں اسلامیہ ہائی اسکول، جونیر کالج، مجیدیہ گرلس ہائی اسکول، ڈاکٹر ذاکر حسین اردو جونیر کالج آف ایجوکیشن، قمر ہائی اسکول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اساتذہ و طالبانِ علم کا ہجوم بڑھا تو علم و ادب کے علم بھی لہرانے لگے، شعراء نے عروسِ سخن کی شائستگی کے لیے منت پذیر شانہ بنے اور آسمانِ ادب و صحافت کو تابندگی بخشنے والے اردو کے صحافیوں و ادیبوں کی کہکشاں جگمگانے لگی، مومن پورہ میں شاعروں کی تعداد لگ بھگ سو کے قریب ہے اس میں انصاریوں کی تعداد کثیر ہے اور بیشتر بلند پایہ شہرت کے مالک ہیں۔

---

[1] مومن پورہ: تاریخ و جغرافیہ۔ جلیل ساز۔ نیا اردو سماچار ناگپور۔ جولائی۔

ناگپور کی برادری کی ممتاز ہستیاں

ناگپور میونسپل کارپوریشن کا قیام ۱۹۵۲ء میں عمل میں آیا، برادری کے سیاسی اکابر جو شہری خدمات کا ولولہ اور جذبہ رکھتے تھے ان میں سے جو انتخاب لڑکر کارپوریشن کے کاؤنسلر منتخب ہوئے ان میں چند ممتاز حضرات یہ ہیں۔

حاجی عبدالمجید لیڈر، حاجی جنید عالم، محمد یعقوب القمر، حاجی عبدالبشیر، جلیل ساز، سیم احمد لیڈر، عباس علی حیدری، عبداللطیف انصاری، حمید پنڈت، جلیل گھنگھٹے قومی دلی سیاست کے مدبرین ان تمام جماعتوں میں ملیں گے جو جو چولا بدل کر یا تو نئی پارٹی تشکیل کر لیتی ہیں، یا بساطِ سیاست پر مات کھاکر دوسری بازی کھیلنے لگتی ہیں۔ ملا سلامت اللہ انصاری ریاستی بھارتیہ جنتا پارٹی کے نائب صدر رہ چکے ہیں، نظام الدین انصاری ریاستی لوک جنتا دل کے سیکریٹری ہیں۔

سماجی خدام عموماً سیاست سے بلا رہ کر عوامی خدمت کرتے ہیں، سردار نثار احمد مہاراشٹر اسٹیٹ ہینڈلوم کارپوریشن کے ڈائریکٹر ہیں۔ دینی خدمت انجام دینے والے عموماً درگاہوں اور مسجدوں سے متعلق اوقاف کے رکن رہتے ہیں، یعقوب القمر (مرحوم) اور سلیم احمد لیڈر (مرحوم) بابا تاج الدین ٹرسٹ کے چیئرمین رہ چکے ہیں سردار شیر محمد سیٹھ مرکزی مسلم قبرستان کمیٹی کے صدر رہیں۔

نصرت کمال انصاری، کامٹی میونسپل کمیٹی کے رکن اور سماجی ورکر ہیں، سیاست کے بازیگر انہیں اپنے سازشی جال میں پھنسانے کی ناکام کوششیں کرتے رہے لیکن ع آزاکہ حساب پاک است از محاسبہ چہ۔

جلیل ساز

اہل حدیث کے سرگرم اور فعال رکن ہیں شاعری میں ناموری حاصل ہے، سماجی خدمات میں شہرت اور برادری کی فلاح و بہبود کے لئے بڑے اعلیٰ جذبات رکھتے ہیں۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کے سابق جنرل سیکریٹری ہیں، سابق کونسلر اور ریاستی اردو اکادمی کے رکن

لہ ان تمام معلومات کے لئے راقم مسعود عمر گیر (پندرہ روزہ) ناگپور کے مدیر امین زریق انصاری اور مرشد اختر انصاری کا شکر گزار ہے

رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ڈی ایڈ کالج کے سیکریٹری اور مجیدیہ گرلز ہائی اسکول کے صدر ہیں، جلیل ساز کی شخصیت ہمہ گیر اوصاف کی حامل ہے، جامعہ محمدیہ منصورہ کے بھی رکن تھے اور متعدد سرکاری کمیٹیوں پر نامزد ہو کر مختلف جہتوں میں خدمت انجام دیتے رہے ہیں، اخبارات اور رسائل میں مضامین اور کلام شائع ہوتے رہتے ہیں۔

فروغ نقاش:

شاہنامۂ اسلام کے حفیظ جالندھری کی شنوی کا کینواس وسیع تھا اس کی دینی و علمی ہیت مسلم ہے، مسدس حالی اسلامی مسلمانوں کے معاشرتی تہذیبی اور دینی المیہ کا شکوہ ہے در اس زمانے کی تصویر درد ہے، فروغ نقاش کے 'شاہنامۂ ہند' کا عنوان بتلاتا ہے کوئی اور نقشہ ہوگا جو وہ گذشتہ ۳۵ سالوں سے مرتب کر رہے ہیں جس کے پانچ حصے مکمل ہو چکے ہیں، ملک کے تمام بڑے اخبارات میں آپ کے تعلق سے مضامین شائع ہو چکے ہیں آپ کی ہمت واقعی داد طلب ہے جو وطن کے لئے اتنا بڑا تہذیبی کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں جو اللہ کرے سر ہو جائے، ہمیں تو یہ نصیحت زیادہ بہتر لگتی ہے۔

غم دنیا درازی دارد ہر چہ گیرید مختصر گیرید

شاہد کبیر

برصغیر ہند و پاک میں جدید لب و لہجہ کے شعراء کی آوازیں بھی نئی روایتوں سے بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہیں، شاہد کبیر کی آواز ان آوازوں میں سے پہچانی جا سکتی ہے — کبھی مشہور گلوکارہ لتا منگیشکر کی دلنواز غزل گائیکی میں اور کبھی پڑوسی ملک کے کسی مطرب خوش آہنگ کی لے اور دھن میں۔

نوشین جہاں بنت سلیمان اختر انصاری

برادری کی خواتین میں شاعرات کا فقدان نہیں رہا اور نہ ناولوں اور افسانہ نگار خواتین بھی فرضی ناموں کے پردے میں مستور مل جاتی ہیں، ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والی قابل طالبات بھی یونیورسٹیوں میں جلوہ فگن رہتی ہیں لیکن سرکاری عہدوں کے مقابلے کے امتحانات میں اگر کوئی مومن۔ انصاری خاتون کامیاب ہو کر سرکار کی انتظامیہ کی اعلیٰ عہدہ دار بن جائے تو یقیناً برادری کے لئے یہ باعث فخر و مباہات ہے۔ ناگپور کی نوشین جہاں آئی۔ اے۔ ایس غالباً ساری مومن برادری میں پہلی "رضیہ سلطانہ" اور "چاند بی بی" ہیں جو سہ

آج نوشین جہانِ خوش تدبیر — ہو گئیں فضلِ حق سے با توقیر
بھائی ستّو کو صد مبارک باد — خوابِ عادل جہاں کی یہ تعبیر
ان کے درجات اور اونچے ہوں — ہو بلندی بفضلِ ربِّ قدیر

وکیل نجیب

بچوں کے لئے پرانے لکھنے والوں میں محمد شفیع نیّر کا نام آج تک منور ہے، قدما میں محمد اسماعیل میرٹھی، حالی پانی پتی اور علامہ اقبال لاہوری کی نظمیں ایک زمانے تک اسکول کے بچوں اور بچیوں کو ازبر تھیں، بچوں کے لئے لکھنے والوں کا قحط الرجال رہا ہے اور یہ معصوم ادب یتیم اور مظلوم بن کر رہ گیا ہے اگر اس روضۃ الاطفال کی آبیاری ہو تو طرز دانم جو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔ وکیل نجیب کا دم غنیمت ہے بچوں کے ادب میں ملک کے ادبی حلقوں میں ان کا نام ضمانت ہے اس بات کی کہ ابھی نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے، ان کی دو کتابیں ترقی اردو بیورو حکومتِ ہند، ایک کتاب دہلی اردو اکادمی اور ایک کتاب حکومت اتر پردیش کی فخر الدین کمیٹی کے توسط سے منظرِ عام پر آچکی ہے۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

بڑے محنتی اور قابل ادیب ہیں، درجن سے اوپر تصانیف منظرِ عام پر آچکی ہیں، ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر، حال ہی میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ناگپور میں اردو۔ آمد، بقا اور شاعری کا آغاز و ارتقاء ۱۹۰۰ تک۔ تاریخ اردوئے ہند کا ایک اہم باب ہے۔ مصنف کی دیگر اہم تصانیف یہ ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا سفر، بیانِ میرٹھی حیات و شاعری، دستِ کوہکن (شعری مجموعہ)، کامٹی کی ادبی تاریخ اور تاریخ ناگپور۔ "ناگپور میں اردو" دراصل ڈاکٹر موصوف کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے (۱۹۷۶)، آپ بڑی صلاحیتوں کے مالک اور اوصافِ حمیدہ کے حامل شخص ہیں، شریف الطبع، وضعدار، سادگی پسند اور مہذب انسان ہیں۔

نثار اختر انصاری

دورِ جدید کے نوجوان اور مخلص صحافی نثار اختر انصاری جو ہمہ گیر پندرہ روزہ کے مدیر ہیں بڑی ہمہ گیر صفات کی حامل شخصیت ہیں، حکومت مہاراشٹر کی جانب سے ترقیاتی تحریرات انعامی مقابلہ میں اردو زبان کے سلسلے میں انعام پا چکے ہیں اور غالباً ریاست کے پہلے صحافی ہیں جو اس اعزاز سے نوازے گئے ہیں، اسی طرح مہاراشٹر اردو اکادمی صحافتی بورڈ پر یہ دوسری ایوارڈ دی گئی

دیگر انعامات حاصل کر چکے ہیں۔
ہمہ گیر کے علاوہ ناگپور کے کئی اور جرائد ورسائل "ادھر نکلے ادھر ڈوبے" کے مقدر کی علامتیں بن چکے ہیں، جمیل افسر پندرہ روزہ "مشعلِ حیات" امین الدین دوماہی "قرطاس" اور کلیم یزدانی سہ ماہی "ہم" کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال چکے ہیں۔
ملکی و ریاستی سطح پر معروف شعراء و قلمکاروں کا بڑا مجمع ہے، ایوارڈ اور انعام پانے والے ادیبوں کا بھی ایک خاصہ حصہ موجود ہے۔
شارق جمال انصاری اصغر جمیل، ضیاء انصاری، سالم ناگپوری، امیر اللہ عنبر، غلام رسول اشرف، شریف احمد شریف، رجب عمر، جمیل افسر، انصاری حمید، اختر اعظمی، جملو انصاری لطیف یاور، سیکش ناگپوری، ناظم انصاری، سردار ناصر، محفوظ اثر، الحق، انیس، کلیم، شارق جمال، عاصم وغیرہم سے ایوان ادب میں بڑی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔
رجب عمر خوش فکر شاعر ہیں آل انڈیا ریڈیو ناگپور سے وابستہ ہیں اردو پروگرام "آبشار" کے عنوان سے بڑے حسن و خوبی سے ترتیب دے کر نشر کرتے ہیں۔
مہاراشٹر اردو اکادمی سے انعام یافتہ برادری کے افراد کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں۔
عبدالحلیم۔ مرتبہ دیوانِ ناطق، مرحوم ناظم انصاری۔ مجموعۂ کلام۔ گوبھی کے پھول۔ شاہد کبیر مجموعۂ کلام مٹی کا مکان، ڈاکٹر شرف الدین ساحل۔ کامٹی کی ادبی تاریخ۔ وکیل نجیب جنگل کی امانت اور مہربان جن۔ یوب انصاری اور طاہر انصاری کو کتب میں انعامات سے نوازا گیا ہے جبکہ رفیق انصاری اور نثار اختر کو صحافتی خدمات کے سلسلہ میں انعامات ملے ہیں۔ اردو کی ہمہ گیر خدمت کا صلہ 'خضر حیات' کو ایوارڈ کی صورت میں مل چکا ہے۔
غیر اردو داں حضرات میں اردو کی ترویج کا گرانقدر کام خضر حیات کر رہے ہیں ان کے بھائی اظہر حیات اعلیٰ تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں، ادبی ذوق کے حامل ہیں اور مشہور مزاح نگار ہیں۔

الحاج محمد سلیم احمد لیڈر (۱۹۲۷-۱۹۸۹ء)

مومن برادری کا یہ قومی کردار تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ کوئی ایسی بستی نہ ملیگی جہاں اس کے مایۂ ناز فرزندوں میں صاحب سیف و قلم نہ پیدا ہوئے ہوں، سیاسی میدان کے شہسوار،

علوم اسلامیہ کے اکابر، سماجی خدمات کے خدام، اور برادری کے زعمائے قوم۔ ان کے ذکر کے لئے سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ـــــ ناگپور کی عظیم شخصیت الحاج محمد سلیم احمد لیڈر کی لذیذ حکایت ـــ دراز تر کہنے کے بعد بھی عالم یہی رہیگا کہ ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔

ناگپور کے ایک بنکر خاندان کے چشم و چراغ تھے والد بزرگوار حاجی محمد غلام رسول سیٹھ نے خود اپنی سماجی خدمات کے چراغ روشن کر رکھے تھے، کئی اداروں نے ان کی سرپرستی میں شہر میں اُجالا پھیلا رکھا تھا ان میں ینگ مسلم فٹ بال ٹیم بھی جس کے آپ صدر تھے۔

والد محترم کے زیر سایہ تربیت پائی۔ انہیں کے اوصاف حسنہ سے کسب فیض کیا اور خود بھی فیضانِ عام بن گئے، سماجی خدمت کا جذبہ میراث میں ملا تھا ابھی پندرہ سال ہی کے تھے ان کے کانوں میں "بھارت چھوڑ دو" کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی، پڑھائی چھوڑ چکے تھے اور اب سیاست سے ناطہ جوڑا تو ناگپور کے مشہور وطن پرستوں کے حلقے میں پہنچ گئے، گلکن لال باگڑی اور بھولا سنگھ نائک کی رہنمائی میں قومی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کیا، اس زمانے میں مینیجر شاہ اواری، برج لال بیا بانی، حاجی مجید لیڈر، پونم چند راکا، مولانا ناطق، منشی عبدالقادر، ٹی جی دیشمکھ، منشی اکبر، رکھب چند شراس علاقے کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے اور مجاہدین آزادی کی فہرست میں شامل تھے ـــ محمد سلیم احمد بھی لیڈر بن گئے۔ اور شہر کے ایک بے لوث مخلص اور سرگرم سماجی خادم۔ اور مومن برادری کے لئے، ایک درد مند دل رکھنے والے مومن سیٹھ۔

بنکر برادری انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور نہ ان کی خدمت کو گلدستۂ طاقِ نسیاں، بلکہ تاریخ کا ایک جگمگاتا عنوان بن کر محمد سلیم احمد برسوں یادوں کی محفل سجاتے رہیں گے مومن پورہ جامع مسجد کے ٹرسٹی ہونے کی حیثیت سے انہوں نے مسجد کی تعمیر اور توسیع میں حصہ لیا آج یہ مسجد وسطی ہند کی تاج المساجد کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ بارہ برس تک میونسپل کارپوریشن کے ممبر رہے۔ شہر کے مختلف محلوں کے باشندوں کے لئے فلاحی امور انجام دیتے رہے، بوریہ پورہ، سیفی نگر، ڈوبی نگر، پرانا بوریہ پورہ، بسوڑ محلہ، گارڈ لائن اور انصار نگر کے بسنے والے محمد سلیم احمد لیڈر کی شاندار سماجی خدمات کے آج تک گن گاتے ہیں، آپ کو پیار سے چاچا، لیڈر صاحب، استاد کہتے تھے۔

۱۹۷۲ء میں عام انتخابات کے وقت کانگریس میں شامل ہوئے۔ مومن بنکر بازار کمیٹی کے رکن ہونے کے ناطے اور خود اسی برادری کے ایک فرد ہونے کے تعلق سے آپ نے

برادری کو عام سطح سے اٹھاکر تعلیم، صنعت اور معاشرہ میں بڑا اونچا مقام دلایا، انصار نگر میں بنکروں کو آباد کرنے میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ کھیل کود کے میدان میں نوجوانوں کو آگے بڑھایا، مہاراشٹر اسپورٹس کلب اور فرینڈس فٹ بال کلب کی بنیاد ڈال کر آپ نے دلوں کو جیت لیا اور شہرت کا میدان مار لیا ــــ حکومت نے بھی انہیں اسپیشل ایگزیکیٹیو میجسٹریٹ کے اعزاز سے نوازا اور ۱۹۸۲ء میں بابا تاج الدین ٹرسٹ کا چیرمین مقرر کیا جہاں انہوں نے درگاہ شریف، علاقہ تاج آباد، مہمان سرا اور دیگر تعمیری کام انجام دیے، دور بعد قومی ایکتا کے نائب صدر بن کر دلوں کو جوڑتے رہے اور ہر قسم کی فرقہ دارانہ سطح سے اونچا اٹھ کر خلقِ خدا کی خدمت کرتے کرتے اللہ کے گھر پہنچے ــــ اور پھر اللہ کو بہت پیارے لگے تو اس کے یہ مہمانِ عزیز اللہ تک پہنچ گئے۔ الحاج محمد سلیم احمد کی ساری زندگی کی نیکیوں اور اعمالِ صالحہ کا سب سے عظیم صلہ واجب العطایا نے یہ دیا کہ مناسکِ حج کی ادائیگی کے بعد منیٰ میں محرم کی حالت میں ۵ار جولائی ۱۹۸۹ء بمطابق ۱۰ر ذی الحجہ ۱۴۰۹ھ کو اپنے احرام کو کفن بنا کر آخرت کے سفر کے لئے رحلت فرما گئے اور جنت المعلیٰ (مکہ معظمہ) میں سپردِ خاک کئے گئے۔ گویا پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

پسماندگان میں ایک بڑا کنبہ تین بیٹے حاجی محمد عبداللہ دستگیر سلیم لیڈر، اور صغیر احمد ایک دختر اور ہزاروں چاہنے والوں کو چھوڑا۔ [۱]

ناگپور کے نامور فٹ بال کھلاڑی۔ انصاری حضرات

ناگپور، کامٹی، بمبئی اور کلکتہ کھیل کود کے میدان کے سنگِ میل ہیں۔ برادری کے افراد خصوصاً ہر جگہ میدان جیتتے ہیں اور فتحیاب ہوکر شہرت کے آسمان پر تابندہ ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ عالمی کپ فٹبال ٹورنامنٹ میں عبدالخالق نے ہندستانی ٹیم کی بحسن وخوبی نمائندگی کی اس سے پہلے لیئق کپتان اور عابد انصاری برسوں نیشنل سپورٹنگ میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ مرحوم ہاشم کپتان نے سنٹرل ریلوے ٹرافی کے سابق مدھیہ پردیش اور بعد میں

---

[۱] یہ تمام معلومات ناگپور کے 'ہمہ گیر' کے مدیر اعلیٰ اور نامور شخصیت نثار اختر انصاری کے مطبوعہ مضمون 'ایک ہمہ گیر شخصیت: حاجی سلیم احمد لیڈر' نیا اردو سماچار نومبر سے لی گئی ہیں۔

مہاراشٹر اسٹیٹ ٹیم کی کپتانی کی تھی۔

برادری اور دیگر جماعتوں کے اکھاڑوں میں ملنگ شاہ استاد کا اکھاڑہ اور رحمن استاد کا اکھاڑہ مشہور ہے، داجی بار رسالدار کا اکھاڑہ اور نور خان کا اکھاڑہ بہت قدیم ہیں۔

برادری کے محلّے

محلوں کی تقسیم و تخصیص اسلامی تمدن و شہریت اور مدنی و معاشرتی زندگی کا روایتی پہلو رہا ہے، ناگپور کے پہلے مسلم حکمران بخت بلند شاہ نے مغلیہ حکومت کے دورِ انحطاط میں اسلامی تمدن و تہذیب کی شکستہ دیواروں کا اُڑتا ہوا رنگ و روغن ہی دیکھا تھا لیکن ان کے نقوش مرتسم اور گہرے ہو چکے تھے اس نے جدید ناگپور کی بنیاد ڈالی، شہر کو متعدد محلوں میں تقسیم کیا۔ مومن برادری کی بستیاں جب ناگپور میں بسنے لگیں تو مومن پورہ، سب سے پہلے آباد ہوا اور یہی برادری کا مرکز ہے اس کے علاوہ ٹیکا، جمعدار پورہ، لشکر باغ، ٹبنکر کالونی، حسن باغ، پیلی ندی، کندن لال گپتا نگر، فاروق نگر پرانی اور نئی بستیاں ہیں جن میں برادری کے افراد متمکن ہیں۔

چھبیسواں باب

کامٹی کی بزمِ شعر و سخن

کامٹی میں مسلمانوں کی آمد انگریزی فوج کے ساتھ ہوئی، ان فوجیوں کا تعلق جنوبی ہند کے مدراس، کرناٹک اور دکن کے علاقوں سے تھا۔ ان کی مادری زبان دکھنی تھی۔ پھر ۱۸۵۷ء کے شورش انگیز زمانے میں دیار پورب کے پُر آشوب شہروں کے شوریدہ سر و آشفتہ حال شیخ نفس حضرات آئے، اُن میں نورباقوں کی کثرت تھی مگر علماء کرام، حفاظ عظام کے علاوہ ایک دانشور طبقہ بھی ان تارکینِ وطن کی بھیڑ میں موجود تھا، یہ اربابِ ذوق تھے جو میر و غالب کے ناموں سے آشنا تھے اور جن کا سلسلہ تلمذ آتش، مصحفی تک پہنچتا تھا۔ کامٹی اور ناگپور کے علاقے میں اردو شاعری کا خمیر انہیں زباندانوں کے لسانی ڈھانچے میں اٹھا۔ ان کے کلام میں دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی سے اٹھتی ہوئی آوازوں کی گونج سنائی دیتی رہی، ان کے پاس انہیں مکاتبِ فکر کی ادبی میراث اور روایات تھیں اور فصاحت و بلاغت کے نمونوں، شعری معنویت، تشبیہات و استعارات اور ابلاغ و ترسیل کی جمع پونجی تھی۔

کامٹی میں شاعری کی تاریخ کے ابتدائی دور میں محمد غوث مدراسی کا نام ملتا ہے۔ ورود بھی کامٹی کے پہلے شاعر منشی محمد سعید ولد عبداللہ موسوی کے نام کے ساتھ۔ ان کا بھی نام استاد کی حیثیت سے آتا ہے انیسویں صدی کے اواخر میں شمالی ہند سے نکلنے والے گلدستوں جیسے میرٹھ کے جلوۂ یار اور دہلی کا سفینۂ نجات نمایاں تھے۔ کامٹی کے چند شعراء کی غزلیں جو ماہانہ مصرعِ طرح پر کہی جاتی تھیں۔ چھپنے لگی تھیں۔ سعید کامٹوی نے شعر و سخن کی تحریک کو آگے بڑھایا، خود اُستادی کے درجے تک پہنچے اور تلامذہ کا ایک حلقہ ان کے ارد گرد بنا تو یہاں کی بزمِ شعر و سخن میں عبدالقادر اخگر، عبدالرحمٰن اخضر، مولانا یار محمد، حافظ محمد عبداللہ، محمد یحییٰ برق، مولانا اعجاز، حافظ عبدالشکور قلزم، حافظ خلیل، محمد عبدالرحمٰن انور، عبدالشکور شریف (سردار پنچ)، منشی محمد فیض اللہ فیض، محمد سراج الدین سراج، عبدالمجید آغا، منشی محمد اسحاق، محمد رستم احقر، مولانا عبدالرشید، منشی ابوبکر شہرت، محمد عبدالرحیم جوہر،

عبدالرحمٰن رحمٰن (پولس ہیڈ کانسٹبل)، محمد بشیر نادان، محمد یحییٰ، محمد اسماعیل راقم، کیفی اسماعیلی، بیدل، محمد یکانو، محمد ابراہیم حراق، حافظ محمد خلیل، محمد عمر آتش، محمد حبیب اللہ انور — اور دوسرے شعرا کی جلائی ہوئی شمعوں سے اجالا پھیلنے لگا۔ ان میں سے بیشتر شعرا کے استاذ محمد سعید برق، اخگر اور مولانا ناطق گلاؤٹھوی تھے۔ سعید غالباً پہلے شاعر تھے جنہوں نے (۱۳۰۹/۱۸۹۰) میں اپنی نعتوں کا مجموعہ "فروغ جاوید" شائع کروایا، بعد کو حافظ عبدالشکور تلازم نے کامٹی کے چند شعرا کے علاوہ اس وقت کے مشہور نعت گو شعرا کی منتخب نعتوں کا ایک مجموعہ 'جامِ کوثر' کے عنوان سے ترتیب دے کر ۱۹۰۶ میں چھپوایا، اس میں کامٹی کے شعرا میں مولانا حافظ محمد خلیل، منشی محمد سعید کامٹوی، اخگر، رشید، حافظ محمد ابراہیم، محمد سلیمان افتر، محمد صدیق، محمد عبدالرحمٰن انور، محمد فیض اللہ فیض، اسحاق، محمد سراج الدین اطہر، محمد عبدالحفیظ آتش اور عبدالرحمٰن احقر کا نعتیہ کلام شامل ہے۔ اس کتاب کا تاریخی نام نوید پیغمبر (۱۳۲۴) ہے۔ متوسط دور کے شعرا میں محمد طالب الدین طالب (متوفی ۱۹۳۲)، ڈاکٹر عبدالرب عرفان، شاطر حکیمی، حکیم عزیز قدوسی، مولانا رحمٰن راہی، ریاض الرحمٰن شمس، اثر کریمی، نظر رشیدی، ڈاکٹر ایم یونس افسر، پروفیسر حت الاختر، خوش قادری، خلیل انجم، تابش حسیبی، صدیق ہیڈ صاحب وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ نئی پود میں قمر اسرار، آفتاب عزمی، اقبال اشہر، عارف جمالی، قیصر داوری، حق فیاضی، عبدالرحیم نشتر، اشفاق انجمی، وکیل احمد عارف، منظور شاکر، ثروت جمال احمد جمال، اسلم صابری، شریف روش، ہارون رشید عادل اور نصرت ولی، حفیظ حارث، آفتاب عزمی، کاظم علی کاظم، رجب علی سہیل، عبدالغفار رب، غیور جعفری، عبدالباری عارف، روش جعفری، شفق حیدری، ظہیر حیدری آج بھی رونق محفل بنے ہوئے ہیں۔

کامٹی میں شاعری کے تین دور مقرر کیے جاسکتے ہیں جو محمد غوث مدراسی کے زمانے (۱۸۸۰) سے لے کر جدید دور تک کو محیط ہے۔

ڈاکٹر ارشد جمال (لیکچرار ایس کے پوروال کالج کامٹی) نے خ۔ زماں انصاری کے مجموعہ کلام "سنے مکان کا بوجھ" (۱۹۸۵) میں "شناخت نامہ" کے معنی خیز عنوان سے جو تقریظ لکھی ہے اس میں کامٹی کی ادبی فضا کا احاطہ کرتے ہوئے تمہیداً اٹھائی ہے:

"تقریباً سو سال سے کامٹی کی فضا ادبی رہی ہے۔ اب تک متعدد شعرا کو صاحب دیوان

ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ یہ شعری ذوق پشت در پشت منتقل ہوتا رہا ہے۔ اچھے ادبی ذوق اور مشاعروں میں اعلیٰ پائے کے کلام کی مناسب و دو پذیرائی کے باعث کامٹی کے صاحبِ ذوق حضرات، نیز آل انڈیا مشاعرے ہندوستان گیر شہرت رکھتے ہیں پچھلے سو برسوں میں کامٹی میں شاعروں کی ایک کے بعد یک کئی جماعتیں نسلاً بعد نسل گزر چکی ہیں، فی زمانہ ایک نسل بوڑھی ہو چکی ہے تو دوسری نوجوان شعراء کی نسل ابھر رہی ہے۔ یہ نئی پیڑھی یونی ورسٹی کی سند یافتہ ہے لہٰذا صرف شعری دنیا ہی سے واقف نہیں ، ممکن ہے کلاسیکل شاعری سے زیادہ واقفیت نہ رکھتی ہو، فصاحت و بلاغت کے اصولوں سے بھی کلی طور پر آشنا نہ ہو، لیکن محض الفاظ کے الٹ پھیر سے شعر کہنے اور مشکل یا سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کو بھی فن نہیں سمجھتی۔ بلکہ ہم عصر دنیاوی علوم کے بیش تر میلانات کی جانکاری رکھتی ہے۔ عصری ترقیوں سے زیادہ اس سے پیدا شدہ نتائج اور کوتاہیوں سے آگاہ ہے اور نئی راہوں کو اختیار کرنے کے جوش میں نئے لسانی ڈھانچے وضع کرنے سے جھجکتی ہے نہ ہی لسانی شکست و ریخت سے گریزاں ہے۔..........

.......یہ نئی نسل آسودہ حالی، سائنسی ترقیوں ، آسائشوں اور سہولتوں کے باوجود ذات کے خلاء میں محبوس، خوف اور دہشت کے جنگل میں ہراساں، ناامیدی اور وہم میں گھری ہوئی ایٹمی جنگ کے خوف سے لرزاں اور "دھوپ کے خالی گلاس" کے کرب میں مبتلا ہے۔"

ارشد جمالی کا شعری ارتقاء کا یہ جائزہ اردو کی پوری شاعری کے رجحانات اور روایت کو سمیٹے ہوئے اور شاعری کے مختلف ادوار پر حاوی ہے۔ اس ادبی و تنقیدی تناظر میں ہم نے کامٹی کے اہل علم و ادب کی تصانیف سے استفادہ کرتے ہوئے وہاں کے ممتاز شعراء کے خدوخال ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

کامٹی کے مومن شعراء کرام

<u>سعید۔ محمد سعید ولد محمد عبداللہ</u> (متوفی ۱۹۳۰)

کامٹی میں شعر و ادب کی فضا باندھنے والے پہلے شاعر اور استاد منشی محمد سعید تھے۔ منشی محمد

غوث مدراسی سے اصلاح سخن لی، پھر حاجی تجمل حسین جلال پوری سے مشورۂ سخن کرتے رہے اور مختلف ادبی پرچوں میں چھپتے بھی رہے۔ ان کے دو دیوان فروغ جاوید اور ارمغان جدید چھپ چکے ہیں۔ دبستان لکھنوی سے متاثر تھے اسی لیے غزلیں بڑی تیکھی ہیں، اور جب ایمان وآگہی کا جذبہ جوش میں آجاتا تو عشق رسولؐ اور حقائق ومعارف کی نکتہ آفرینیوں سے ان کا مذہبی کلام معمور وسرشار ہو جاتا ہے۔ نمونۂ کلام:

ہائے لکھنا تھا کچھ احوال تمنائے وصال — بھر دیا شکوۂ اغیار سے سارا کاغذ

کیوں تڑپ کر جان دیدی صبر کرنا تھا تجھے — چار دن کے بعد اے بلبل بہار آنے کو تھی

باقی ہے وہی شرم وحیا آج بھی ان کی — ہیں دور کھڑے مجمع محشر سے نکل کر

محمد یحییٰ برقؔ: (۱۸۶۵-۱۹۲۶)

ان کا شمار کامٹی کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے، درویش صفت اور صاحب طریقت انسان تھے، پابند صوم وصلوٰۃ تھے، میلاد خوانی سے لگاؤ تھا اور بڑا اچھا داؤدی لحن تھا اصناف سخن میں مذہبی کلام نعت، مرثیہ اور سلام کا سرمایہ چھوڑا جو تلف ہو گیا۔ نمونۂ کلام:

رہیں تم کو مبارک حور وغلماں حضرت زاہد — مجھے دیدار ہو جائے شفیع روز محشر کا

ہیں گدا تو ہوں ولیکن اس در دولت کا ہوں — ہفت کشور کا خزانہ جس کے آگے خاک تھا

حافظ محمد ابراہیم خلیلؔ (وفات ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۲ء)

نام کی مناسبت سے تخلص موزوں تھا، متداول علوم میں دستگاہ حاصل تھی، عربی وفارسی زبانوں پر عبور تھا۔ مدرسہ اسلامیہ کامٹی میں مدرّس تھے لیکن کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔ ۱۹۰۲ء میں طاعون کے عفریت نے نگل لیا۔ آپ کے پوتے حافظ محمد اشرف ناگپور میں مقیم تھے (۱۹۸۲ء)

حافظ عبدالشکور قلزمؔ (متوفی ۱۹۰۷)

قلزم۔ مئو کے حاجی الٰہی بخش (متوفی ۱۹۲۶) کے حقیقی بھتیجے تھے، قلزم علم وادب میں محمد ابراہیم خلیل کے شاگرد تھے۔ کلام پر مذہبی رنگ غالب رہا، عین عالم شباب (۱۹۰۷ء) میں طاعون کے وبائی سیلاب نے قلزم کے سفینۂ حیات کو ڈبو دیا۔ نمونۂ کلام:

ارادہ ہے یہ مدت سے مرے طبع مظہر کا — کوئی مضمون تازہ ہو رقم نعت پیمبر کا

گر پڑے وندھے زمیں پر عُزّیٰ ولات ومنات — جب بجا ڈنکا عرب میں احمد مختار کا

پیچ و خم قلزم مقدر کا مرے جسا تا رہا ۔۔۔ جب ہوا نظارہ زلفِ سیدِ ابرار کا

عبدالرشید رشید

ابوالاعجاز لقب تھا اور سعید کے شاگرد تھے "مرغوب القلوب" کے نام سے ایک تصنیف یادگار ہے۔ محمد فیض اللہ فیض آپ کے داماد تھے۔ نمونۂ کلام

جلوہ روئے پیمبر جب نمایاں ہو گیا ۔۔۔ ماہ ششدر ہو گیا، خورشید حیراں ہو گیا

کیوں نہ اک عالم کہے پھر حافظِ قرآں رشید ۔۔۔ میں ثناخواں ہوں نبی کے مصحفِ رخسار کا

عبدالقادر اختگر (۱۸۷۸ء-۱۹۶۰ء)

اختگر۔ منشی سعید ابن سردار محمد عبداللہ کے چچازاد بھائی یعنی عبدالوارث کے اکلوتے بیٹے تھے حافظ محمد شکراللہ سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی اور فارسی و عربی میں دستگاہِ کامل حاصل کی۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور راہِ طریقت کے سالک تھے مولانا سید فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا سید احمد دہلوی سے بیعت تھے۔ مومن برادری کے بڑے انصاف پسند سردار تھے۔ بیٹوں میں منشی محمد مختار، عبدالکریم انصاری، عبدالحلیم ثانی، مشتاق احمد قلش قادری اور ممتاز احمد قادری بقیدِ حیات ہیں۔ (۱۹۸۲ء)۔ نمونۂ کلام:

ہم لاجوابِ عشق ہیں، وہ لاجوابِ حسن ۔۔۔ ان کا جواب ہے نہ ہمارا جواب ہے

جنوں کے جوش میں نکلے تھے گھر سے ۔۔۔ اِدھر سے ہم چلے، پتھر اُدھر سے

کافی ہے مرے قتل کو ابرو کا اشارہ ۔۔۔ گر ہاتھ میں اس شوخ کے تلوار نہیں ہے

عبدالرحمٰن اخضر (۱۸۸۵ء-۱۹۶۶ء)

حافظ محمد شکراللہ کے تلمیذ تھے، وائل عمر میں رند مشرب رہے، رہینِ ستمہائے روزگار رہے لیکن خدا کے خیال سے غافل کبھی نہیں رہے، شاعری کے ابتدائی دور میں حافظ محمد ابراہیم کے شاگرد رہے پھر منشی سعید کاکوری کے روبرو زانوئے تلمذ تہہ کیا، نمونۂ کلام:

عمر بھر صحتِ بیمار کا رونا ہی رہا ۔۔۔ کچھ بنائے نہ بنی تم سے مسیحا ہو کر

ہو گیا اور ہی کچھ بزمِ جہاں کا نقشہ ۔۔۔ کر دیا درہم و برہم تری انگڑائی نے

دل لیتے ہی رہتے ہیں یہی شغل ہے ان کا ۔۔۔ انداز سے، غمزے سے، کبھی ناز و ادا سے

حافظ محمد عبداللہ (۱۸۷۸ء-۱۹۶۲ء)

اردو فارسی کی تعلیم اور حفظِ قرآن کے لئے، حافظ محمد شکراللہ کے رہینِ منت ہیں، فارغ

ہونے کے بعد ذاتی مکان میں مکتب قائم کرکے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، دعا، تعویذ اور عملیات میں بھی ہر دلعزیزی حاصل تھی، زاہد و عابد شب زندہ دار تھے اور واجب التعظیم، شاعری میں مجدد السنۂ شرقیہ مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی (متوفی ۱۹۲۲) سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ شاعری کا دبدبہ ان کے کلام کی سنگلاخ زمینوں اور مشکل پسندی سے ظاہر ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام:

بن گیا دُرِّ عدن آنسو ٹپک کر آنکھ سے — برگِ گل پر گر کے گوہر قطرۂ شبنم ہوا
زلفِ شمیم کھل گئی کس رشکِ ماہ کی — پھیلی ہے بوئے مشک نسیمِ سحر سے آج

محمد اسحٰق ۔ اسحٰق (۱۸۸۰ - ۱۹۶۱) اور محمد صدیق صدیق (متوفی ۱۹۰۸)

مشہور تاجر حاجی سیٹھ عبدالکریم (متوفی ۱۹۲۲ء) کے دو رئیس زادے بیٹے محمد صدیق اور محمد اسحٰق دونوں ہی شاعری کرتے تھے، راہِ طریقت میں مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے۔ محمد اسحٰق ثروتمند اور مخیر شخص تھے شاعر نواز تھے اور انسان دوست، زاہد دل اور فیاض انسان تھے۔ کامٹی کے نوجوانوں میں ذہنی و فکری بیداری پیدا کرنے کے لئے، کامٹی کے ایوانِ سخن کے اہم ستون منشی محمد سعید نے محفلِ نقشِ سخن کے نام سے جو انجمن بنائی تھی اس کی اعانت محمد اسحٰق بڑے انشراح سے کرتے تھے اپنی ذاتی کوٹھی 'پیلی حویلی' اس انجمن کو وقف کر دیا تھا۔ منشی سعید سے مشورۂ سخن سے کرتے تھے نمونۂ کلام:

احمدِ مرسلؐ کا میں جب سے ثناخواں ہوگیا — خلق میں مشہور میرا نام ذی شاں ہوگیا
حمایت پہ مرے شفیع الوریٰ ہیں — مجھے روزِ محشر کا کھٹکا نہیں ہے
غلامِ پیمبر ہوں اسحٰق میں بھی — سکندر سے کم میرا رتبہ نہیں

محمد بکا نو بیدل (۱۸۸۲ - ۱۹۶۲)

والد الٰہی بخش مؤ کے تھے، برق کے بھائی تھے، پابند شریعت تھے اور نیک کردار عامل تھے ذریعۂ معاش رخت سازی پیشہ تھا۔

مجھ تشنہ کام عشق کی حسرت نہ پوچھیے — اس تیغ آبدار سے طالب ہوں آپ کا
کاش دہ دیتے ہرا میں دل کی ساری حسرتیں — میرے خط کا نامہ بر لے کر جواب آیا تو کیا

محمد فیض اللہ فیض (۱۸۸۰ - ۱۹۵۴)

بڑی علمی ادبی شخصیت کے مالک تھے، مخلص سماجی خادم اور سیاسی رہنما ہونے کے سبب

عوام آپ سے بڑا فیض اٹھاتے تھے۔ اس خاندان میں ہمیشہ شعر و سخن کا چرچا رہا ہے اور ادبی محفلوں کے انعقاد اور سماجی و تہذیبی خدمات انجام دینے میں یہ کنبہ ہمیشہ ہراول دستہ بنا رہا۔ نعت گوئی اور غزل سرائی سے گہرا شغف رکھتے تھے یک نعت کے چند اشعار یہ ہیں۔

لکھ رہا ہوں وصف کوئے سید دیندار کا
ہو رہا ہوں مستحق میں خلد کے گلزار کا

حشر میں ہم عاصیوں کی پھر نہ ہو کیوں کر نجات
ہاتھ میں اپنے ہے دامن احمد مختار کا

وصف دندان شہ ہر دو جہاں کے فیض سے
ہو گیا ہر شعر میں عالم دُرِ شہوار کا

سراج الدین سراج (متوفی ۱۹۲۱)

سراج علمی دنیا کے مہر درخشاں تھے، ادبی محفلوں کے روشن چراغ تھے اور تعلیمی حلقے کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ جوانی کے عالم میں سدھارے اور بڑی شتابی سے فارغ ہوئے ورنہ دنیا میں ان کے لائق بہت کام تھے، قومی اور سماجی خدمت کی لگن تھی سہ

رونا تو اسی کا ہے نہیں باغ جہاں میں
اک دن بھی نہ جوبن سے سراج اپنے کیے دیدہ

غیر دکھلاتے نہ اس طرح بدل کر آنکھیں
آپ کی مجھ پہ اگر چشم عنایت ہوتی

محمد عبدالرحیم جوہر (متوفی ۱۹۲۰)

ابھی شاعری کے جوہر بھی نہ کھلے تھے کہ ۳۵ سال کی عمر میں تپ دق کے مرض نے آنکھیں بند کر دیں، وکیل احمد جوہر اولاد نرینہ میں یادگار رہے۔ سہ

وہ بیٹھ گئے وصل میں کیوں روٹھ کے مجھ سے
ان سے تو کبھی کی کوئی تکرار نہیں ہے

اس بت غارت گر دین نے مجھے
دور رکھا حلقۂ اسلام سے

آغا عبدالمجید (۱۸۸۸ - ۱۹۵۲)

غزل گوئی ان کی شاعری کا مطمح رہا، منشی سعید کاسٹوی کے رشید تلامذۂ سخن میں سے تھے،

نمونۂ کلام سہ فراق روئے روشن میں جو گھبراتا ہے دل میرا
فلک پر جلوۂ خورشید رخشاں دیکھ لیتا ہوں

ہو گیا مہمان وہ خورشید رُو
دن نکل آیا مرے گھر شام سے

محمد ابراہیم خلیل (۱۸۷۸ - ۱۹۵۳)

اسی نام اور تخلص کے ایک اور شاعر جو استاد تسلیم کے جاتے تھے کاسٹی میں گذرے ہیں (وفات ۱۹۰۴)۔ محمد ابراہیم خلیل کے والد جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے حافظ محمد شکر اللہ

متداول علوم کی تحصیل کی، مشورۂ سخن برقؔ، اخگرؔ اور مولانا ناطقؔ سے لیتے رہے۔ تجارت کے سلسلے میں رنگون برما میں مقیم رہے کاسٹی آئے تو پارچہ بافی اختیار کی۔ اولادِ صلبی میں ایک بیٹا منظر الحق اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں ؎

دل آزاری بھی اس کی باعثِ تسکینِ خاطر ہے — ہمیں منظور ہے یہ بھی طریقہ دلنوازی کا
پہلو میں تھا ابھی، ابھی پہلو سے دور ہے — زحمتکش شب یہ حال دلِ ناصبور ہے

محمد حنیف۔ حنیفؔ (م ۱۹۶۹)

مومن برادری کے سردار محمد اسماعیل محمد عظیم کے لڑکے تھے، امامت کرتے تھے اور مشقِ سخن شوقؔ مالیگانوی سے اصلاحِ کلام کا رابطہ قائم تھا۔ دو بیٹے وکیل احمد (متوفی ۱۹۷۵) محمد خورشید قیبلہ، حنیفؔ کی یادگار رہے۔

حالت کو مری دیکھ کے اب کہتے ہیں وہ بھی — مجنوں کی طرح یہ بھی ہے دیوانہ کسی کا
یہی تو مونس و ہمدم رہا شبِ فرقت — جُدا پھر آپ کا دل سے خیال ہو کیونکر

نقیرؔ محمد ناظم (۱۸۹۰ - ۱۹۷۲)

منشی امان اللہ ٹانڈوی فیض آباری کے لڑکے تھے۔ متداول علوم کاسٹی کے بزرگ حافظ صفی اللہ میاں جی جار اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے جید عالم تھے، سے دسترس حاصل کرکے اپنے ہی گھر میں مکتب کھول لیا، ان کی ذاتِ والا گرامی علوم دینیہ کی تحصیل کا سرچشمہ رہی ہے، سلوک و طریقت کی طرف رجحان زیادہ تھا، حضرت شاہ غلام محمد کے مرید تھے عملاً اور غالباً پیری و مریدی سے بھی بڑا لگاؤ تھا، آبائی پیشہ بافتگی تھا اور یہی مستقل ذریعۂ معاش تھا، صلبی اولاد میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں بقیدِ حیات ہیں (۱۹۸۲ء): جمال احمد، جلیل احمد، کمال احمد اور عقیل احمد۔ پہلے بیدلؔ کاسٹوی کے شاگرد رہے لیکن سیماب آسا صلاحیت کچھ اور وسعت کی طلبگار تھی۔ اس عہد کے استادِ عام سیمابؔ اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے ؎

رکھ قدم اس جا جہاں وحشی کوئی پہنچا نہ ہو — ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر
ہر سانس کے پردے میں تو خود بول رہا ہے — یہ سرمدؔ و منصورؔ کی آواز نہیں ہے

جنونِ عشق کی تکمیل ہونے والی ہے
ملی ہیں قیس کے دامن کی دھجیاں مجھ کو

محمد ابوبکر شہرت (۱۸۹۲ - ۱۹۷۷)

مئو کے پارچہ باف خاندان سے تعلق تھا، شاعری سے ارتباط خاطر تھا، شریعت مطہرہ کے پابند تھے تصوف وسلوک سے گہرا لگاؤ تھا اور اس میں اپنے نانا کے مرید تھے، کامٹی کے ادبی، علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے روح رواں رہے، انجمن ضیاءالاسلام آپ کے وجود سے سنورہی، اصلاح الانصار کامٹی کے مصلح تھے اور انوارالاسلام کامٹی کے روشن اور تابناک رُکن رہے۔ شاعری نے کئی مرحلے طے کئے اور کئی مقام سے گذرے، گوہر تخلص تھا تو حافظ محمد عبداللہ ناکے تلمذ کے سلکِ گہر سے منسلک رہے، جب شہرت حاصل ہوئی تو اردو کے شہیر استاد مولانا ناطق کے زیر تربیت رہ کر شہرت تخلص اختیار کرلیا۔ نمونۂ کلام سے

دادرِ حشر سے شکوہ جو جفا کا کرتا	اور بھی ایک قیامت میں قیامت ہوتی
رکھتی ہیں ہمیں مست و بدمست نگاہیں	گردش میں رہا کرتا ہے پیمانہ کسی کا
ترکِ وفا ہمیں سہی، وفا تو ہے انھیں	صاف نہیں نہیں سہی لب پہ اگر مگر تو ہے

محمد رستم احقر (۱۸۹۵ - ۱۹۵۰)

احقر تخلص تھا لیکن عالی رتبہ شخصیتوں کے ہمسر، معاصر اور "فخر قوم" تھے۔ شہر کے متمول و مخیر تاجر محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ کے صاحبزادے تھے، فٹ بال کے مشہور کھلاڑی قمرالدین کے بھائی تھے۔ کامٹی میں برادری کے خاندانوں میں یہ گھرانا "خانہ ہمہ آفتاب" کی طرح روشن رہا ان کے زمانے میں ادبی اور شعری جلسے ان کی شرکت کے بغیر نامکمل رہتے کیونکہ یہ ہی سکریٹری مقرر کئے جاتے تھے، منشی سعید سے شاگردی کی سعادت حاصل کرکے مولانا ناطق کے عروج سخن سے اور ناطق بن گئے جلوۂ یار، خلافت، مدینہ، الفاروق اور شاعر میں شائع ہوتے رہے۔ بڑے خوش گو غزل سرا شاعر تھے۔ نمونۂ کلام:

قیس کے ساتھ گئی رونقِ صحرا احقر	زندہ ہوتا تو یہ اس طرح نہ ویران ہوتا
بتا کر عشق پروانوں نے رسوا کردیا اس کو	اسی سے شمعِ محفل دل جلی معلوم ہوتی ہے
حیاتِ جاودانی ہے، فنا ہونا محبت میں	نہیں تو موت ہی میں زندگی معلوم ہوتی ہے

یار محمد انور (۱۹۰۰ - ۱۹۷۲)

حاجی شیخ امیر فیض آبادی کے چار بیٹوں میں سے بڑے صاحبزادے مولوی حل محمد (م ۱۹۵۵) صوفی، منشی، مرید اور پیر سید غلام کبریا سے بیعت تھے اور جب طریقت میں

مرشدیت کی منزل ملی تو لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا شروع کی، مولانا انور نے حافظ صفی اللہ سے چودہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کر لیا، فارسی منشی محمد اسحٰق سے پڑھی۔ تمام عمر صوم و صلوٰۃ میں بسر ہوئی اور پارچہ بافی کرتے گذری، عشرۂ محرم میں ان کی شاعری شباب پر رہتی اس لیے کہ جذبۂ ماتم گساری بھی اوج پر رہتا۔ سلام لکھتے اور پڑھتے اور مرثیہ گوئی میں کربلائی بن جاتے، منشی محمد سعید کامٹوی کی شاگردی سے ترقی کر کے، جانے استاد، کر خالی نہ رکھا نہ رہی مسند از وہ بن گئے، تلامذہ کی ایک کثیر تعداد نے انور شاعر و استاد سے اکتساب فن سخن کیا۔ تجلیات انور مختصر مطبوعہ مجموعہ ہے (۱۷۱۱)۔ قادر الکلام شاعر تھے۔ پختگی فن اور قدرت زبان قدمار کے طرز سخن کی طرح ان کے شعر سے عیاں ہے۔ نمونۂ کلام تجلیات انور سے لیا گیا ہے ؎

خلق مجھ سے ملنے کو دور دور سے آئی — تیری رہگذر کا جب میں نے کچھ پتا پایا

محسوس یوں ہوا کہ رگ جاں کٹ گئی — تنکا کوئی ہوا جو مرے آشیاں سے دور

ہونے دیئے بے نقاب انہیں بزم ناز میں — لے بے خودی ابھی سے نہ کر بے خبر مجھے

اشک سب اشک ہوا کرتے ہیں لے دیدۂ تر — ان کے دامن پہ جو گرتا ہے گہر ہوتا ہے

محمد عمر انصاری اطہر (۱۹۰۱-۱۹۵۴)

کامٹی کے رئیس، برادری کے ستون اور خادم قوم حاجی سردار عبد الرحمٰن کے سات بیٹوں میں سے محمد عمر انصاری اطہر کامٹی کی ادبی، علمی و صحافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب علم اور اہل زبان میں سے تھے اردو فارسی، عربی اور انگریزی روانی سے بولتے تھے اور ان زبانوں میں تقریر بھی کرتے تھے۔ ایسا کمال بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے صرف یہ مثال برادری کے جید عالم بخت زبان عبد المجید حریری بنارسی کی شخصیت میں ملتی ہے۔ کامیاب نثر نگار اور بہترین غزل گو تھے۔ محمد عمر انصاری پہلے شخص تھے جنہوں نے اردو صحافت کا بیج بویا، ماہنامہ "دُرِ نجف" مصدر صحافت کا پہلا گوہر آبدار تھا پھر سہ روزہ جمہور نکالا جس نے مطلع جمہور کا آفتاب زمانے کی پیشنگوئی کی۔ ان کی ایک بیٹی جمیلہ بیگم جو ناگپور کے رئیس نقی محمد کی زوجہ تھیں اپنے چچا زاد بھائی اظہار الحق ابن محمد رستم سے بیاہی۔

دوسرے بیٹے کا نام جمیل احمد محمد عمر انصاری ہے۔ نمونۂ کلام ؎

جذبۂ شوق سزاوار لذت آزار ہے — قدر صحرائے جنوں، خانۂ زنجیر ہے

لذتِ عرضِ تمنا ہے دعا سے مقصود — آپ سن لیجیے، مطلب کہے دیتے ہیں
بہت ہی پھوٹ کر روتے ہیں میرے پاؤں کے چھالے — الجھا دیکھ لیتے ہیں وہ جب کانٹوں کو دامن سے

محمد عمر انصاری اطہر ایسے پاکیزہ اور مقدس ناموں والی شخصیت جو مولانا کہلائی ـــــ "در خراباتِ مغاں نورِ خدا" دیکھتے رہے، ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

محمد صفی اللہ عادل (۱۹۰۱-۱۹۸۱)

آپ کی پرورش آپ کے چچا علیم اللہ نے کی، حافظ محمد شکر اللہ کی شاگردہ ملانی کلثوم بی سے ناظرہ مکمل کیا اور اپنے مطالعہ کو اتنا وسیع بنایا کہ علم و ادب کے شیدائی بن گئے، شریف النفس اور نیک طبع انسان تھے، کامٹی کے ربانی ہائی اسکول کی تاحیات خدمت کی، شعری اور ادبی ماحول کے روحِ رواں رہے اور انجمن ضیاء الاسلام نیا بازار کامٹی کے سرگرم رکن رہے۔ یہ ادارہ علمی حیثیت کا حامل ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس کی عظیم لائبریری بیحد مفید ہے، عادل منشی سعید کے سب سے آخری شاگرد تھے "غزل" کی مشاطگی کرتے کرتے جی بھر گیا تو قومی و ملی اور تاریخی موضوعات پر نظمیں کہنے میں جی لگنے لگا۔ بعض نظمیں مثلاً ہجرت اور ہندوستان، پیکرِ انصاف، مزدور اور سرمایہ دار بیحد مقبول ہوئیں۔

حافظ عبدالرحیم مضطر (متوفی ۱۹۶۳)

آپ کے والد محمد اسمٰعیل (م ۱۹۲۰) جامع مسجد، گجری بازار کامٹی میں مؤذن تھے، حافظ عبدالرحیم مضطر والد کے بعد جانشین بنے، مدرسۂ سراج المومنین میں مدرس رہے بعد میں ۱۹۲۵ء میں ربانی ہائی اسکول کے شعبۂ دینیات سے منسلک ہوگئے، سیاسی طور پر بیگی تھے۔ مولانا انور کے شاگرد تھے، مجاہدانہ اور قومی و ملی عنوانات پر نظمیں کہتے تھے۔ غزل کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج کیے جاتے ہیں:

سنا ہے عرصۂ محشر میں خلقت شرمسار آئی — وہیں لینے بلائیں رحمتِ پروردگار آئی
اسیرانِ قفس ہم میں ہمیں کیا واسطہ اس سے — نشیمن پہ گری بجلی کہ گلشن میں بہار آئی
آلِ زندگی مضطر ہوا روشن پسِ مُردن — مری فردِ عمل جب سامنے آئینہ دار آئی

محمد حنیف منظر (۱۹۰۷-۱۹۷۶)

شیخ عیدو (ساکنہ فیض آباد) کے بیٹے نصیر الدین (م ۱۹۴۹) جو سوت کے تاجر تھے

انہیں کے پندرہ لڑکے اور لڑکیوں میں محمد حنیف منظر نظر آتے تھے، مولانا انور سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ اللہ نے لحن داؤدی عطا کیا تھا ترنم سے پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ نمونۂ کلام

جو سفر سے نہ آج تک لوٹا — اس مسافر کی یاد آئی ہے

کہیں طوفان بن کر میری ہستی کو نہ لے ڈوبے — الٰہی خیر چشم شوق پُرنم ہوتی جاتی ہے

ساقی نگہ مست اگر اپنی اٹھا دے — میخانے میں چلتا ہوا پیمانہ ٹھہر جائے

محمد عثمان ناظر (۱۹۱۹ - ۱۹۷۵)

ان کے والد کا نام عبد الرؤف اور دادا کا نام منشی عبد الغفور تھا، ربانی پائی اسکول کامٹی میں مدرسی کے فرائض ادا کرنے کے بعد بقیہ زندگی آبائی پیشے بنکری کر کے گذار دی۔ غزلیں اور نظمیں دونوں کہتے تھے۔

نیاز احمد نیاز انجم (۱۹۲۷ - ۱۹۵۹)

"نیاز انجم" کی جوانمرگی پر "خوش درخشید ولے کوکب مستعجل بود" کا مصرعہ صادق آتا ہے، عباد اللہ والد کا نام تھا، عبد القادر اخگر مومن برادری کے سردار کے نواسے تھے اسی واسطے سے ننہالی رشتہ منشی سعید ابن سردار محمد عبد اللہ تک پہنچتا ہے۔ عربی فارسی مولانا محمد عمر انصاری اطہر اور منشی نور الحسن صادق سے پڑھی۔ مولانا اطہر کی تحریک سے شعر کہنا شروع کیا اور انہیں ہی استاد تسلیم کیا۔

کس درجہ مکمل ہے ترا حسن ستمگر — جس رنگ میں دیکھا تجھے اس رنگ میں پایا

ہم سے پوچھو کہ قیامت کا گزرنا کیا ہے — ہم نے جھیلی ہے مصیبت شب تنہائی کی

عصر حاضر کے سخنوران

پچھلے صفحات میں کامٹی کی ادبی تاریخ کے سفر میں ان شعرائے کرام کا اجمالی ذکر گذر چکا جو اب آخرت کے مسافر بن گئے ہیں" بہت آگے گئے باقی جو ہے تیار بیٹھے ہیں" مگر یہی لوگ مغتنمات زمانہ میں سے ہیں ان کا دم باقی رہے کیونکہ اردو زبان و ادب کی بقا رکے لئے یہی مسیحا، ضامن، امین اور محافظ ہیں خدا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ'

کامٹی کے ادیبوں اور دانشوروں کے مؤرخ اور ترجمان ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے متوفی شعراء میں سے جن کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند ایسے ہیں جن کے ادبی آثار کا

پتہ بسیار تلاش و تحقیق کے بعد بھی "آبِ حیوان درونِ تاریکیست" کے مصداق کسی خضرِ راہ کو بھی نہیں ملا، محمد عبدالرحمٰن انور، عبدالشکور شریف، عبدالرحمٰن رحمٰن، محمد بشیر نادان، محمد یحییٰ یحییٰ، محمد اسمٰعیل راقم، محمد عمر آتش، عبدالباری ارمان، محمد اسد اللہ راحت، شیخ کریم بخش عادل، قادر شریف، دین محمد ارمان، محمد عبدالحفیظ آتش اور محمد حبیب اللہ انور وغیرہم پردۂ گمنامی میں محجوب ہیں۔ ڈاکٹر ساحل نے کامٹی کی اردو شاعری کے سو سالہ عرصۂ حیات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔

"ادبی و فنی لحاظ سے کامٹی کے نمائندہ شاعروں کا کلام بہت جاندار تر و تازہ دلکش اور موثر ہے۔ سعید اور ان کے تلامذہ کے یہاں خارجی مضامین کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا لطف اور فنی پختگی بھی نظر آتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان شعرا کا کلام دبستانِ لکھنؤ کی خوشہ چینی کرتا ہے" [1]

عصرِ حاضر میں اس ادبی سفر میں کئی موڑ آئے ہیں اور کئی سنگِ میل۔ تقسیمِ ہند کے بعد ادبی رجحانات میں نئے نئے شگوفے پھوٹے ہیں، ابلاغ و ترسیل کے نئے انداز پیدا ہوئے ہیں لسانی ڈھانچے میں تبدیلیاں بھی ہوئی ہیں اور زبان کی شکست و ریخت بھی ہوئی ہے، ایمائیت کے نئے تیکھے اشارے اور بیان کی نئی نزاکتیں پیدا ہوئی ہیں، جن شعراء نے نیا لب و لہجہ اختیار کیا اور اردو شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ان میں سوز خضرائی (ولادت ۱۹۱۴ء)، نظر رشیدی (ولادت ۱۹۲۸ء)، مدحت الاختر (ولادت ۱۹۳۵ء) اور ان کے ہم عصر خلیق ارب رخ زماں انصاری (ولادت ۱۹۴۵ء) کامٹی کے قصرِ ادب کے چار اہم ستون اور شاعری کے عناصرِ اربع ہیں۔

محمد یوسف سوز خضرائی (ولادت ۱۹۱۴ء)

محمد حنیف منظر کے حقیقی بھائی اور اسفر کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ ٹیچری کرتے رہے، ٹیوشن دیتے رہے اور اپنی تدریسی صلاحیتوں کی داد پاتے رہے لیکن۔ صلے کی تمنا نہ ستائش کی پرواہ، شاعری میں معتقدِ میر ہیں یا نہیں لیکن غالب کے اندازِ بیاں کے معترف ضرور ہیں، اقبال پرستی کے جرم کا اقبال بھی کرتے ہیں اور فیض کی شاعری سے اکتسابِ فیض کا نہیں لذتِ شاعری کا دعویٰ

---

[1] کامٹی کی ادبی تاریخ۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل۔ ص ۱۵۵

ضرور ہے، ان تینوں اقانیم ثلاثہ کی نئی دفکری مرعوبیت نے سوز کی شاعری کو نیا سوز اور زبان و بیان کی تنگی کو نیا ساز دیا ہے، ان کی شاعری میں نفسیاتی کیفیت کا ارتعاش بھی ہے، حزن و یاسیت کا دباؤ اور ٹکراؤ اور رجائیت کا بلند آہنگ بھی سنائی دیتا ہے۔ کچھ تو ترقی پسندی کی دین ہے اور باقی ذاتی وجدان اسی لئے تغزل کی رومانیت اور عاشقانہ نکات کے پہلو بھی ملتے ہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنوں میں کائنات کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ ان تمام اوصافِ سخن نے سوز کی شاعری کو شعوری طور پر ایک نیا پن دے دیا ہے۔

کلیوں سے رات کچھ بات کہہ رہی تھی مگر
جب آفتاب نے لوٹا تو اڑ گئی شبنم

دل کی دھڑکن سمجھ ہی سکتی ہے
جو اشارا تری نگاہ میں ہے

ڈھونڈھتی ہے جو زندگی آرام
زندگی بھر اداس رہتی ہے

جو کھٹکتا ہے سب کی آنکھوں میں
گل کے پہلو میں مسکراتا ہے

جان لیتا ہے زمانہ تم کو میرے نام سے
میری رسوائی کے پردے میں تمہارا نام ہے

محمد شبلی بیڈھب (ولادت ۱۹۴۰)

محمد صدیق اختر بیڈھب کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، اپنے والد عبدالقدوس (متوفی ۱۹۲۷) کے کلوتے بیٹے ہیں، محمد شبلی اس خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس میں عبدالرحمٰن سردار آپ کے دادا، ان کے بھائی محمد یعقوب منزل سیٹھ اور ان کے صاحبزادے محمد رستم اختر اور قمر الدین فٹبال کے کیپٹن اور عبدالرحمٰن سردار کے صاحبزادے مولانا محمد ابراہیم انصاری اور محمد شبلی کے والد عبدالقدوس یہ سارے اجالوں کے سفیر تھے۔ اپنے چچا مولانا محمد عمر اطہر انصاری کے ساتھ رہکر صحافتی زندگی گذارتے رہے اور مختلف اوقات میں سہ روزہ جمہور کامٹی، الفاروق کامٹی، خلافت بمبئی، انقلاب بمبئی اور الجمعیۃ دہلی کے نامہ نگار رہے۔ کامٹی کی ہر ادبی، سیاسی اور سماجی تحریک میں شامل رہے۔ حزن قریشی کے شاگرد ہیں جب سنجیدہ شعر کہتے تھے تو اختر بن کر چکے اور اب طنز و مزاح نے بیڈھب بنا دیا ہے

اتفاقاتِ لذتِ کام و دہن کو کیا کہوں
اب اُسے کھوڑا نہیں مرغِ مسلّم چاہیے

ہچکیاں لینے لگی ہے زندگی
ٹیکس کی بھرمار سے ہم دب گئے

مٹی کے مول ہوگئی بیڈھب یہ زندگی
سستا مگر اناج ابھی تک نہ ہو سکا

بڑھتے بڑھتے اتنی مہنگائی بڑھی
کھاتے کھاتے پیٹ کا غم کھا گیا

نام مٹ جائے نہ دنیا سے وفاداری کا
ہر طرف گرم ہے بازار ریاکاری کا

محمد انیس الدین آغائی (۱۳۴۰ھ)

نسلاً انصاری ہیں، ایرانی تخلص 'آغائی' سے ذہن ایران و توران کی طرف جاتا جب کہ آپ کے دادا محمد اسمٰعیل مئو کے مومن تھے، ریاض الرحمٰن تاریخی نام ہے (۱۳۴۰ھ) - اور اس تاریخی نام کی گھٹی کی برکت سے آپ کی شاعری تاریخ گوئی میں محدود ہو کر گھٹ کر رہ گئی، حالات کی مناسبت سے تاریخی قطعات کہتے ہیں ان کے نکالے ہوئے تاریخی مادے سلیس اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ مفتی کفایت اللہ، سید سلیمان ندوی (۱۹۵۳) علامہ عبداللہ یوسف علی (۱۳۷۳)، مولانا حسین احمد مدنی (۱۹۵۷) اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸) کے قطعات تاریخ وفات انہیں اوصاف سے متصف ہیں۔

خلیل الرحمٰن کیفی اسمٰعیلی (ولادت ۱۹۲۲)

ان کی عرفیت 'اسماعیلی' سے اشتباہ ضرور ہوتا ہے لیکن ظاہر و باطن سے مومن ہیں، پردادا شیخ کوتوارو، دادا نور محمد (متوفی ۱۹۲۳) اور والد اسماعیل (م ۱۹۷۱) مئو کے مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، والد مسجد اسمٰعیل پورہ کاسیؒ کے امام تھے اور حق خدمت یا معاوضہ اپنی دینی خدمات کا کبھی نہیں مانگا، کاسیؒ کی متدین اور معزز شخصیت تھے۔ کیفی اسماعیلی نوجوانی کے رومان انگیز زمانے سے شاعری سے محبت کرتے تھے۔ نمونۂ کلام

رہے گرم عمل جو لوگ تعمیر گلستاں میں
انہی کا آشیاں پھونکا گیا فصل بہاراں میں

مگر دور یہ اک ظلم ہی ہوتا نہیں کیفی
اس دور میں مظلوم کو ملتی ہے سزا بھی

مجرم ہو کوئی اور سزا پائے کوئی اور
انصاف کی یہ کم نگہی یاد رہے گی

عبدالعزیز عزیز قدوسی (ولادت ۱۹۲۵)

حافظ محمد نذیر (۱۹۲۳) سے فارسی میں دستگاہ حاصل کی، انھی کی رہنمائی میں شاعری کا سفر شروع کیا، تاریخ گوئی میں کمال حاصل ہے، طبیب حاذق ہیں اور یہی وسیلۂ معاش ہے۔ شاعری کے لئے زبردست مشق و مزاولت کرتے تھے، تاریخ گوئی جیسے دماغ سوز فن پر بھی عبور حاصل کیا۔ شاعری کے شوق میں گھر سے فرار ہو کر مالیگاؤں تک پہنچ گئے تھے۔

میں سمجھتا ہوں مری دیوانگی کامل نہیں
مجھ کو پتھر مارنے والوں میں تم شامل نہیں

جو ترے نام سے پھینکے گئے مجھ پر پتھر
میرے نزدیک ہیں وہ پھول سے بڑھ کر پتھر

آ آ کے پلٹ جاتی ہے بالیں سے اجل کیوں
شاید کوئی مصروف دعا میرے لئے ہے

عزیز قدسی کے ہم عصر شعراء ہیں: خلیل الرحمٰن کیفی اسماعیلی، محمد سعید اعجاز، مولانا عبدالرحمٰن راہی، ریاض الرحمٰن شمس، نظر رشیدی، اثر کریمی، عبدالغفار راغب اور انیس آغائی۔

عبدالباری اثر کریمی (۱۹۲۵)

منشی محمد اسحٰق کے بیٹے ہیں، اردو فارسی میں کافی استعداد رکھتے ہیں، شاعری ورثے میں ملی ہے، مشورۂ سخن عزیز قدسی اور شاطر حکیمی سے کیا ہے، غزل کے رسیا ہیں اور ڈوب کر کہتے ہیں اسی لئے کلام میں معنویت کی گہرائی ہے شاعری کے جدید رجحانات کی طرف بھی مائل ہیں۔ نمونۂ کلام:

کتنے خوشیوں کے سفینے ہو گئے ہیں لاپتہ
غم وہ بحر بیکراں ہے جس کا اندازہ نہیں

آواز دے کے اس کو جگاتا میں کس طرح
سویا تھا کچھ وہ ایسے کہ بیدار سا لگا

کسی کا اور بھی چہرہ ہے شاید میرے چہرے پر
نہ جانے آئینہ تکتا ہے کیوں مجھ کو تحیر سے

عبدالجلیل۔ جلیل عرشی (ولادت ۱۹۲۶)

کامٹی کی مشہور بیڑی فرم کے مالک حافظ دین محمد کے لڑکے اور عبدالرشید صدیقی (م ۱۹۷۳) کے بھائی تھے۔ یہ دونوں بھائی کاروباری مصروفیات کے باوجود والد محترم کی طرح سماجی، ادبی اور تعلیمی خدمات کے لئے مشہور رہے، انہوں نے خیال اور الفاروق کو مالی تعاون دیا، علمی انجمنوں اور تعلیمی درسگاہوں کی سرپرستی کی۔ جلیل عرشی نے بہت اعلیٰ اساتذہ کے ہی تعاون کی خاطر قائم کیا، کامٹی میں ہونے والے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں عرشی ہی صدر کی حیثیت سے مدعو کئے جاتے تھے۔ اپنے استاد حافظ انور کے بیحد قدرداں تھے ان کے مجموعۂ کلام تجلیات انور کا ایک بصیرت افروز مقدمہ عرشی کا خراج عقیدت ہے عرشی نے ستارے اور سیارے کے عنوان سے نثر میں ایک کتاب لکھی ہے۔ روایتی شاعری ہونے کے باوجود درد کی گہرائی ہے اور واردات قلبی کی پرچھائیاں ڈولتی نظر آتی ہیں سہ

ساتھی تھے سب اچھے کہ کسی نے بھی نہ پوچھا
ہم لٹ کے چلے آپ کی جب رہگذر سے

وہ غم نہیں قبول، دل غم پسند کو
یارب وہ غم جو حاصلِ کون و مکاں نہ ہو

اپنے کیے میں نے نکالے ہیں کچھ اس قدر عیب
غیروں سے مجھ کو کوئی شکایت نہیں رہی

عبدالرحمن راہی (ولادت ۱۹۲۷)

عبدالرحمن کے والد حاجی عبدالرحیم کا شمار کامٹی کے بزرگانِ دین میں ہوتا ہے، بڑے متقی اور دیندار بزرگ تھے، مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ صوفی جان سے بیعت تھے جنہوں نے حاجی عبدالرحیم کو مسندِ خلافت عطا کی۔ راہی نے راہِ طریقت سے ہٹ کر سراسر دینی اور مذہبی علوم کی تحصیل کی تکمیل کی سنہ ۱۹۴۳ء میں ناگپور یونیورسٹی سے مولوی فاضل کی سند لی۔ طالبعلمی کے زمانے سے شعرگوئی کر رہے ہیں۔ کلام پر شاطر حکیمی اور مولانا انور سے اصلاح لی۔ قادرالکلام ہیں اسی لئے زبان و بیان میں پختگی ہے ؎

رہ گئے اہلِ خرد کرتے ہی تشریحِ وفا
اہلِ دل، جاں دے کے مفہومِ وفا سمجھا گئے

معلوم ہیں ہمیں بھی قفس کی حقیقتیں
کچھ سوچ کر ہی ہم بھی تہہِ دام آ گئے

فریبِ جستجو ہے یہ کہ ہے تکمیلِ نظارہ
نگاہِ شوق جس جانب اٹھی تم ہی نظر آئے

بکھرے ہیں مرے چاروں طرف سنگ گزر سے
میں تنہا ہی گھیرے ہیں، کہ کانچ کا گھر ہوں

پل پل میں بٹی صدیوں کی تاریخ ہوں پڑھ لو
دیکھو مجھے، بیتے ہوئے لمحوں کا سفر ہوں

خورشید احمد۔ تابش حلیمی (ولادت ۱۹۴۷)

والد کا نام سراج الدین احمد انصاری تھا، دادا عبدالحلیم جو حافظِ قرآن تھے اور ادبی و سیاسی شخصیت کے حامل تھے۔ حلیمی، تخلص کا باعث ہے، التہاب ذوقِ شعری نے تابش بنا دیا، ناگپور مہاودیالیہ سے سنہ ۱۹۶۶ء میں بی۔ایڈ اور سنہ ۱۹۷۲ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، فی الحال انجمن ہائی اسکول ناگپور میں درس و تدریس میں مصروف ہیں، موسیقی سے دلچسپی ہے — شاعری اور موسیقی یک جان دو قالب اور لازم و ملزوم ہیں، کلام میں نغمگی اور آہنگ سنائی دیتا ہے ؎

رعنائیِ خیال کا ساماں ہو گیا
احسان تم نے کر دیا رہ کر حجاب میں

اس کا مزا بھی ہے صد نازشِ آئینِ حیات
جس کا ماتم تری زلفوں کو پریشاں کر دے

وہ اسی راہ سے گذریں گے یقیناً تابش — رونق راہگزر دیکھ کے بڑھی جاتی ہے

محمد نظیر رشیدی (ولادت ۱۹۲۸)

علم و ادب کا ذوق وہبی تھا، حکیم عزیز قدوسی سے فارسی اور مولانا محمد عمر اطہر انصاری سے عربی پڑھی اور علم میں بصیرت پیدا کی، لیکن زندگی کی خوشیوں کو مفلسی اور تنگدستی کی نظر لگ گئی، ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی میں کلرکی، میونسپل اردو پرائمری اسکول میں مدرسی کی لیکن اقتصادی بدحالی بحال رہی، یاسیت اور محزونیت غبار خاطر بن گئی تو کلام میں گرمیٔ بیان اور جذبات کی شدت پیدا ہوئی اور نئے لب و لہجہ نے محمد نظیر رشیدی کی شاعری کو نیا آہنگ عطا کیا۔

خدا کو چشم تصور سے ماورا نہ کہو — بہت قریب سے اکثر دکھائی دیتا ہے

کوئی بتلائے کہ صحرا سے اب کہاں جاؤں — یہاں سے بھی تو مرا گھر دکھائی دیتا ہے

بے خودی میں جی رہا ہے آدمی — ہوش آجائے تو دنیا چھوڑ دے

ستم تو یہ ہے کہ دونوں ہیں برق کی زد میں — اب اپنی فکر کروں میں کہ آشیانے کی

مانا کہ معتبر ہیں جنوں کی حکایتیں — اپنا تو ہوش میں بھی گریباں پھٹا رہا

نظیر رشیدی اردو اور فارسی میں دسترس رکھتے تھے، عربی زبان سے بھی کما حقہٗ واقف تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بڑے بڑے نقادوں نے کیا ہے، نگار میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا نظریات کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہو کر ارباب نظر میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

ریاض الرحمٰن شمس (ولادت ۱۹۲۸)

حافظوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ریاض الرحمٰن ابن حافظ حاجی محمد سعید ابن حافظ محمد بخش ابن یار محمد سوئی تک تاریخ کو شجرہ حفظ ہے۔ پانچ بھائیوں میں سے بھی ریاض الرحمٰن اور محفوظ الرحمٰن کو چھوڑ کر بقیہ تین بھائی بھی حافظ قرآن تھے عربی و فارسی کی استعداد اعلیٰ ہے اسی لئے کلام بھی بلند پایہ ہے۔ نثر نگاری کی بھی مزاولت کرتے ہیں افسانے اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ کامٹی کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر اس طرف طبیعت مائل ہوئی، ترقی سماجی اور انقلابی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں، زبان میں حلاوت اور بیان میں لطافت ہے۔ نظمیں زیادہ کہتے ہیں۔

محمد یونس افسر (ولادت ۱۹۳۱)

حکیم عزیز قدوسی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ایلوپیتھک طریقے پر ڈاکٹری کرتے ہیں، اکثر اخبارات و رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے بڑے زود گو شاعر ہیں۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں ؂

تجھ سے قریب رہ کے تجھے دیکھتا رہا / ہم سے تو خوش نصیب ترا آئینہ رہا

جلووں کے کچھ آثار ہیں چلمن سے نمایاں / یہ دیکھ رہا ہوں کہ کوئی دیکھ رہا ہے

نامکمل ہے ابھی شاید مری رودادِ غم / پھر نگاہِ ناز ہے مائل بہ احساں دیکھنا

محمد سعید اعجاز (ولادت ۱۹۳۲)

مذہبی علوم کی تحصیل کی تکمیل کی۔ حفظ و ناظرہ کی قرآنی تعلیم کے سلسلے میں حافظ محمد حفظ الرحمٰن اور الحاج محمد عثمان سے استفادہ کیا، جامعہ عربیہ اسلامیہ ناگپور سے قرأت کی سند لی اور درسِ نظامی کا تکملہ کیا، مولوی عالم کی سند ناگپور یونیورسٹی سے حاصل کی اور جامعہ کی تقریبِ دستار بندی میں دستارِ فضیلت سے سرفرازی لی۔ طریقت میں سید امام علی مجددی نقشبندی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ بڑے پُر زور بیان خطیب ہیں، خوش گفتار، وضعدار اور ملنسار شخص ہیں اور خورد ان سے مل کر خوش ہوتا ہے بزرگ ان سے محبت فرماتے ہیں۔ خوش لحانی اور مخصوص ترنم سے غزل سرائی کرتے ہیں اور مشاعروں میں سراہے جاتے ہیں اور کامیابی کا سہرا گلے میں پڑتا ہے۔ تدبر کے کلام سے متاثر ہیں نغمگی اور تغزل۔ اور اس پر ترنم۔ عمر رفتہ کو آواز دو باتوں میں ساز دے دیتا ہے۔

وہ ہنس کے پوچھ رہے ہیں سبب تباہی کا / خوشا سوال! جو اپنی جگہ جواب بھی ہے

فرصت نہ تھی مسائلِ دوراں کے ذکر کی / اپنی جگہ میں آپ ہی اک مسئلہ رہا

تہمتِ دید کا الزام ہے مجھ پر بیجا / میں نے دیکھا ہے تجھے لوگوں کی دیکھا دیکھی

اک تیری تمنا نے کچھ ایسا نوازا ہے / مانگی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرب عرفان (ولادت ۱۹۳۴)

والد حکیم حاجی شمس الدین نے تاریخی نام "صغیر احمد" تجویز کیا تھا، لیکن ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات دیکھ کر ان کے نانا جی ملا عبدالوارث جو کامٹی کے علمائے عظام میں بڑا بلند مرتبہ رکھتے ہیں ان کا نام جو عین دینی آگہی اور آدابِ سامی کے مطابق ہے "رب کا بندہ"

"عبدالرب" رکھا، ننہالی کے مذہبی و علمی خانوادے کے زیر سایہ عبدالرب پروان چڑھ کر "عرفان"
بن کر فیضانِ عام بن گئے۔ دورانِ تعلیم امتحانات میں بڑے امتیازات اور اعزازات حاصل
کرتے رہے اور یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں بڑے سے بڑا منصب اور اعزاز نصیب ہوا۔

طالبعلمی کے زمانے میں جب آپ آٹھویں جماعت کے طالبعلم تھے شاعری سے لذت آشنا
ہوئے در پھر استادی کے لیے شاطر حکیمی سے شناسائی پیدا کی اور طبع آزمائی کرنے لگے،
شعری تخلیقات موقر جریدوں کی زینت بنتی رہیں، نثر نگاری میں اشہبِ قلم نے تاریخ
و تبصرہ اور ادب میں بڑی جولانیاں دکھائی ہیں عہد اکبری کے ملک الکلام فیضی فیاضی:
احوال و آثار آپ کی تحقیق کا ماحصل ہے۔ اردو ڈراما اندر سبھا سے انار کلی تک — منظر
عام پر دکھانے کی منتظر ہے۔

عرفان کی شاعری سے روایتی اقدار کا شعور جھلکتا ہے، عصری آگہی، نئے رجحانات
سے واقفیت اور زبان پر قدرت اور معنویت کی تہ داریاں۔ آپ کے کلام کے شعری
محاسن ہیں۔ نمونۂ کلام:

مایوس، نامراد، پریشاں سا لگے	اس شہر میں تو ہر کوئی عرفان سا لگے
اس درجہ التفات کو ترسا ہوا ہوں میں	وہ بات کرے کوئی تو احسان سا لگے
زلفِ جاناں کی تمنا میں ہم اربابِ جنوں	بڑھتے بڑھتے رسن و دار تک آپہنچے ہیں
ہم نفس ہو تو بیاباں بھی نہیں شہر سے کم	جب نہ ہو ساتھ کوئی شہر بھی ویرانہ لگے
احباب کیا سمجھ کے مجھے دیکھنے لگے	نام آگیا کسی کا جو دورانِ گفتگو

مشتاق احمد خلش قادری (ولادت ۱۹۲۵ء)

منشی عبدالقادر راخگر کے بیٹے ہیں۔ شاعری کا شوق ورثے میں پایا لیکن خود والد بزرگوار نے
انگر بہت برسے بیٹے کے ذوقِ شاعری کی چنگاری کو بجھانا چاہا، مگر وہ شعر گوئی کے التہابِ
عشق کو نہ بجھا سکے اور مشتاق احمد خلش بن گئے۔ جمالیت پرست تھے مزاج لڑکپن سے
عاشقانہ تھا لیکن بوالہوس کی طرح حسن پرستی کو شعار نہیں بلکہ اشعار بنایا۔ اسی سے
جدت بھی ہے اور روایاتِ شعری کی پاسداری بھی، قلبی واردات اور ماحول کے موثر
محرکات سے نظر بچا کر نہیں بلکہ نظر ملا کر شعر کہتے ہیں اسی لیے کلام میں معنوی بصیرت بھی
ملتی ہے اور بیان میں جسارت۔

تک رہا ہے جو خشک آنکھوں سے
میرا دامن بھگو نہ دے وہ بھی

خشک ہوئے آنکھوں کے چشمے ہونٹوں سے مسکان گئی
شہر میں آتی دھول اڑی سب چہروں کی پہچان گئی

سمٹا رہا وجود میں ہنگامِ گفتگو
خاموش ہو گیا تو فضا میں بکھر گیا

میں جس کے واسطے زمانے سے دور رہا
مرے قریب سے آ کر گزر گیا وہ بھی

خلیل احمد۔ خلیل انجم (ولادت ۱۹۳۸)

نیاز انجم مرحوم کے چھوٹے بھائی شعر گوئی کا معیاری ذوق رکھتے ہیں، شاطر حکیمی کے ارشد تلامذہ کے حلقے میں شامل ہیں۔

انداز تکلم میں خنجر کی روانی ہے
پہچان لو قاتل کو ہم نام نہیں لیں گے

شہر کے دانشوروں میں تھا ہمارا بھی شمار
ہاں مگر اس دور کو گزرے ہوئے عرصہ ہوا

محمد مختار وحدت الاختر (ولادت ۱۹۲۵)

فارسی اور عربی سے مرکب نام کی مثال اختر الایمان میں ملتی ہے۔ والد کا نام حافظ رحمت سید تھا۔ اعلیٰ امتیازات سے امتحانات میں شاندار کامیابیاں حاصل کیں، کئی تمغے انعام میں ملے، فارسی اور اردو میں کئی اعلیٰ ڈگریاں لیں اور سب سے اعلیٰ ترین سند ڈاکٹریٹ کی حاصل کی۔ اپنے شعری مجموعے "نغموں میں روز و شب" (مطبوعہ ۱۹۸۰) کے "پیش لفظ" میں لکھتے ہیں:

> "میرا سن پیدائش ۱۹۲۵ء ہے اور کلام کی باقاعدہ اشاعت کا سلسلہ ۱۹۶۵ء سے جاری ہے۔ ہمارے شعری ادب میں ۱۹۶۰ء کے بعد کا عرصہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ ایک طرف ترقی پسند ادبی تحریک مختلف وجوہ کی بنا پر انحطاط پذیر تھی اور دوسری طرف جدیدیت کا ادبی رجحان تیزی کے ساتھ ترقی اور مقبولیت کے مرحلے طے کر رہا تھا۔ اس صورت میں توانا ادبی رجحان سے میرا متاثر ہونا فطری تھا"

اردو کے مشہور شاعر اور جدید ممتاز صحافی فضیل جعفری نے "وحدت الاختر کا شعری رویہ" کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف رویوں کی پہچان دلائی ہے۔ "وحدت اپنی عصری حسیت اور معاشرتی آگہی کا اظہار روایتی طور پر یعنی ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے حساس شخص کی حیثیت سے کرتے ہیں جس کے لیے غیر شعوری سطح پر زندگی، سماج اور ماحول سب کچھ اس کی اپنی داخلی شخصیت کا حصہ ہیں۔ وحدت کی شاعری میں ہم عصر زندگی سے تعلق رکھنے والی بد نظمی، بے ترتیبی اور بے کیفی کی جو تصویریں بکھری نظر آتی

ہیں وہ شاعر کی داخلی زندگی نیز اس کی داخلی وخارجی تحریکات کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں" نمونہ کلام:

ہاتھ میں بچوں کے پتھر ہے نہ بولنے میں شورش ۔۔۔ کیوں ہوا شہر وفا سنسان میں سب جانتا ہوں
اس نئے شہر میں ایسے بھی کئی چہرے ہیں ۔۔۔ جو مجھے گم شدہ شہروں کی خبر دیتے ہیں
جس کو دیکھا وہی چہرہ ترا چہرہ نکلا ۔۔۔ اجنبی شہر میں کیا طرفہ تماشا نکلا
جس طرف دیکھیے صحرا نظر آتا ہے مجھے ۔۔۔ ان گنت صدیوں کا بن باس ڈراتا ہے مجھے
مت کسی کا خواب بھی ریتی کا ڈھیر تھا ۔۔۔ سو بار میں نے اس کو سمیٹا بکھر گیا
بچے تو ہنستے کھیلتے واپس ہوئے مگر ۔۔۔ جو ریت کے گھروندے تھے لہروں میں بہہ گئے
نظر اٹھائی تو ہر چیز میں دکھائی دیا ۔۔۔ وہ شخص آج سے پہلے جو میرے گھر میں نہ تھا

خلیق الزماں ۔ زماں ۔ خ زماں انصاری (ولادت ۱۹۴۵)

ٹوٹے پھوٹے ناموں والی یہ شخصیت مستحکم ارادوں کی مالک اور خود اعتمادی کا سنگین پیکر ہے، کامٹی کے محلے نیا بازار میں محمد بشیر جو ادبی ذوق کے مالک تھے خلیق الزماں پیدا ہوئے، نام کی مناسبت سے بجید خلیق ہیں، اردو اور فارسی میں نستعلیق اور شاعری میں نئی ہیت کے خالق ہیں۔ خ۔ زماں انصاری کی شخصیت بڑی پُراسرار اور پُرفسوں ہے" اوپر سے سجا سنورا جسم اندر سے ٹوٹا پھوٹا، زخموں سے چُور اور نڈھال ہو اور ایسے بھی۔ اسی لیے اس کی شاعری جذبات کی شدومد، احساس کی شدت اور تیرو نشتر کے انبار سے مملو ہے۔ اس کے دل کا درد، الفاظ میں ڈھل کر زیادہ کناں نظر آتا ہے۔ قاری اپنے جذبات میں ہلچل محسوس کرتا ہے اور شاعر کے دل کا درد اپنی رگ و پے میں سماتا محسوس کرتا ہے"

—— ارشد جمال کا یہ نفسیاتی تجزیہ، شاعر کی داخلی حیثیت اور شخصیت کی شناخت کرا جاتا ہے۔ خ۔ زماں اگر درد کا شاعر ہے تو اس 'درد کے شجر' کے ڈھلتے لمس انگیز سائے میں قاری ذہنی وفکری سکون، اور آسودگی بھی حاصل کرتا ہے —— یہ ہمارا تاثر ہے اس لیے کہ ہم نے موجودہ تاریخ کی تصنیف کے دوران کارگہ شعر وسخن و علم و عمل" میں جہاں ادبی ملنے جانے کو پرکھا ہے اور ان کا کلام پڑھا ہے وہاں خاص طور سے مالیگاؤں کے ابن صدیقی کامٹی کے مدحت الاختر، ڈاکٹر عبد الرب عرفان اور کامٹی ہی کے اکیڈیک آفیسر۔ ڈپارٹمنٹ آف نارتھ ینگو یجیز۔ نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کھڑک واسلہ پونہ کے خ۔ زماں انصاری

کے نے "سکان کا ببول" بھی بالاستیعاب پڑھا ہے۔ خ۔ زماں انصاری کا شاعرانہ فن بڑی حد تک "تجریدی آرٹ" ہے جس کے پس منظر میں استعاراتی معنوں اور تشبیہی علامتوں میں پٹا ہوا درد کا جنگل ہے۔ اور درد کے پیڑ ہیں۔ درختوں پر سناٹا ہے، ببول کی جھاڑیاں ہیں اور آتا جاتا موسم ہے ؎

جنگل کی خاموشی کا بدن پھر مہک اٹھا ۔۔۔ ہاتھوں میں وہ درخت کے موسم تھما گیا

ہم ہی ایسے ہیں کہ سایہ نہ شجر رکھتے ہیں ۔۔۔ لوگ تپتے ہوئے صحرا کا جگر رکھتے ہیں

سبز موسم میں رہیں درد کی شاخیں اونچی ۔۔۔ سب موسم ہی درخت اپنا ثمر رکھتے ہیں

دستِ لذت نہ کوئی شاخِ ثمر تک پہنچا ۔۔۔ میں بھرا پیڑ تھا وہ رہ کے ٹپکنے والا

ہر شاخ کاٹ دی گئی ماضی کے پیڑ کی ۔۔۔ کونپل کے ساتھ وقت نے دھوکا بہت کیا

سورج کا زہر جیسے ہواؤں میں آگیا ۔۔۔ موسم کے رنگ و روپ کو ہر شاخ رو گئی

موسم درد کے ہر پل میں سماجاتا ہوں ۔۔۔ وقت کی روح کے زنداں میں سزا پاتا ہوں

<u>عبدالباری عارف</u> (ولادت ۱۹۵۲)

'خانوادہ وادوی' کے خاتم سلیمانی۔ عبدالباری عارف بدرگاہ ادب میں تازہ وارد ہوئے ہیں، شعرگوئی کا آغاز <u>۱۹۶۹ء</u> میں ہوا، چونکہ اتنی کم عمری میں وہ بہت عمدہ اور دلکش شعر کہتے ہیں اس سے "قیاس کن گلستانِ من بہار مرا۔" نمونۂ کلام :

چہرے بدل گئے ہیں کہ میں ہی بدل گیا ۔۔۔ اپنے ہی شہر میں نہ ملا آشنا مجھے

ہوتی نہیں ہے گرم ہوا یونہی بے سبب ۔۔۔ کوئی علاقہ شہر کا جلتا نہ ہو کہیں

سورج چڑھا تو ہر کوئی تعظیم کو جھکا ۔۔۔ عارف کھڑا ہے تن کے تماشا نہ ہو کہیں

ادب اور صحافت کے نمائندے

نثری ادب کے سفر کا آغاز تاریخی اعتبار سے عموماً شاعری کے پس پا ہوتا ہے، کامٹی میں شاعری کے اوائل کا زمانہ محمد غوث مدراسی کے عہد سے تعلق کے ساتھ تعین کیا جاسکتا ہے جبکہ نثری ادب کی تخلیقات کے آثار صوفی عبدالحکیم اور محمد طالب الدین طالب کی باقیات سے ملتے ہیں اور یہ بیسویں صدی کے اوائل کا زمانہ ہے۔

<u>۱۹۳۵ء</u> میں جب کامٹی کے آسمان پر ــــ روزنہ جمہور کا ستارہ نمودار ہوا، ماہنامہ

دُرِ سخن آب و تاب سے منظرِ عام پر آیا اور ہفتہ وار الفاروق نے قارئین کو پکارا تو تاریخ صحافت کا پہلا عنوان جگمگایا، کامٹی کی ادبی فضا میں یک ارتعاش پیدا ہوا، نئے فنکاروں کے قلم کو جنبش ہوئی نئے اور پرانے شاعروں کو ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں میسر ہوئیں اور ادبی تخلیقات میں گرانقدر اضافہ ہوا، نثر نگاروں میں مولانا محمد عمر اطہر انصاری، محمد ظہیر وارثی، حمید جلال، فیض انصاری، بڑے آب و تاب سے چمکے، مقالہ نگاروں اور محققین میں محمد یوسف انصاری، نظیر رشیدی، ارشد جمال، عبدالرب عرفان، مدحت الاختر، جاوید احمد سعیدی، زرینہ ثانی اور صحافیوں میں عبدالستار فاروقی، مولانا عمر اطہر انصاری، ظہیر افروز، وکیل عارف، شمیم فیضی، نصیر عظیمی، انیس پرواز وغیرہ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

فیض اللہ فیض کے صاحبزادے شمیم فیض صحافت و ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں، انگریزی اخبار ہتوادا کے ایڈیٹر ہیں کامٹی سے اپنا ذاتی اردو ہفت روزہ "امنگ" نکالا ہے کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں فی الحال ہفتہ وار جسارت دہلی سے منسلک ہیں، خصوصی نامہ نگار کی حیثیت سے منگولیا اور ماسکو کا سفر کر چکے ہیں۔

عبدالستار فاروقی (ولادت ۱۹۰۵ - ۱۹۷۷)

کامٹی کے ممتاز مشاہیر میں آپ کا نام سب سے زیادہ تابندہ اور روشن ہے، سیاست کے میدان کے شہسوار، ادب کے شناور اور صحافت کے ابوالبشر تھے۔ ۱۹۳۵ء میں الفاروق کا اجراء کیا جو برسوں تک وسطی ہند کے قارئین کا واحد ترجمان بنا رہا۔ آپ ایک کامیاب نثر نگار اور افسانہ نویس بھی تھے اور تحقیق، تنقید اور مشرقی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے ان سے آپ کی ادبی و تحقیقی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی ہیں، تین انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

سماجی، سیاسی، ادبی، صحافتی اور علمی و تحقیقی خدمات ساری زندگی انجام دیتے رہے اور مسجد برادری اور قوم و ملت کی دعائیں لیتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں رہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے

ع عمر بھر بھی شام اپنی سحر کر گیا

اولاد میں تین بیٹے جمیل الرحمٰن، جلیل الرحمٰن اور فضل الرحمٰن اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑے۔

فیض انصاری (۱۹۲۰ - ۱۹۷۱)

"خیال" وسطِ ہند کے بہترین ماہنامے کے ساتھ فیض انصاری کا ذہنوں میں صرف خیال ہی نہیں رہ گیا بلکہ ان کی ادبی و علمی و صحافتی کارناموں کی یادیں بھی تازہ ہیں، آپ جاوادشد

کے بیٹے تھے اور جلیل عرشی کے چچا، ناگپور اور کامٹی کی ادبی و صحافتی پیشروی میں فیض انصاری کا خیال اور بچوں کا ماہنامہ عزیز سرچشمۂ فیض بنا رہا، اردو زبان و ادب کی خدمت کا خیال ان کا مطمح نظر اور نصب العین تھا، کل ہند اردو مصنفین کنونشن ناگپور ان کا ایک تہذیبی کارنامہ ہے جو سنہ ۱۹۶۰ء میں انجمن ہائی اسکول ناگپور میں منعقد کیا گیا۔ اردو کی بقا اور ترویج کے لئے جو کچھ فیض انصاری نے کیا اس کا فیض آج تک لوگوں کو پہنچ رہا ہے۔

حمید جمال (۱۹۱۸ء-۱۹۸۰ء)

شجرۂ خاندان دیکھیے تو نونہالانِ علم و ادب کو لہلہاتے پائیں گے، دادا محمد رستم خاندان کے جدِ اعلیٰ تھے، عبداللہ، عبدالوارث، محمد اسماعیل اور حافظ محمد جمال الدین برادری کے ممتاز افراد تھے سرداروں کا خاندان تھا، حافظ محمد جمال اور حمید جمال کے والد تھے اور سعید اور اصغر کے چچا تھے۔ گویا سارا گھرانا شہرت سے گھرا ہوا تھا۔

ناگپور یونیورسٹی کے ایم۔اے (اردو) تھے، ٹیچرس ٹریننگ کا ڈپلوما جبلپور سے سنہ ۱۹۳۶ء میں لیا تھا اور ادیب فاضل کی سند ۱۹۳۰ میں حاصل کی۔ ربانی ہائی اسکول میں سنہ ۱۹۰۱ء تک اردو فارسی اور انگریزی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور تمام قرطاسِ ادب پر چھاتے رہے۔ حمید جمال چند افسانے لکھ کر طویل مقالے لکھنے لگے تھے، ہلکے پھلکے مضامین بھی مقامی پرچوں میں شائع ہوتے تھے، ایک ناولٹ "عالم پناہ" اور اردو شاعری کا ارتقاء پر ایک طویل مقالہ بھی لکھا ہے۔ آپ انتہائی صاف و شستہ زبان لکھتے تھے۔ نظریاتی اعتبار سے اشتراکی اور مارکسی تھے۔ آزاد خیال مسلمان تھے۔ ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی، ڈاکٹر خلیق الزماں انصاری وغیرہ کی ذہنی نشو و نما میں حسین جمال کے جمال و جلال کا پرتو ہے۔

محمد ظہیر وارثی

محمد ظہیر وارثی علمی و ادبی اور دینی "سلسلۃ الذھب" کی آخری کڑی ہیں، تصوف کا انسلاک "وارثی" سے عیاں ہے، سلسلۂ طریقت میں قاضی عبدالواسع وارثی (متوفی ۱۹۵۵ء) کے مرید ہیں۔ لیکن کامٹی اور ناگپور کی برادری کے اہل علم و ذوق آپ کی علمی فضیلت اور سماجی و علمی و سیاسی خدمات کے مرید ہیں۔ اردو اور فارسی زبانوں کے آپ عالم ہیں، شعر و ادب کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں، تصوف و سلوک و طریقت کے مرشد کامل ہیں اور دیگر علوم و فنون پر بھی دسترس حاصل ہے اس کی نظیر کامٹی میں مشکل سے ملیگی، آپ کی بیش بہا ادبی شمار

خدمات میں انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری کی ترقی بھی ہے جس کے آپ ۱۹۳۶ء میں صدر منتخب کئے گئے تھے۔ ربانی ہائی اسکول کامٹی کے اساتذہ کے نمائندے رہے، بنکر برادری کی کوآپریٹیو سوسائیٹوں کے صدر اور سیکریٹری کی حیثیتوں سے مختلف اوقات میں منسلک رہکر کام کرتے رہے۔ آپ ایک مخلص، بے لوث، ملنسار، وضعدار اور مہمان نواز انسان ہیں۔ مدرسہ سراج المومنین کے "سورج" کو نصف النہار تک پہنچانے والے آپ ہی ہیں یعنی اہل علم و ادب اور ارباب ذوق کی چشم بینا کے لیے " واسطۂ عقد نجوم " ہیں۔

محمد ظہیر وارثی کی ادبی تخلیقات میں مطبوعہ مضامین کے علاوہ مسجد وارث پورہ کامٹی کی تاریخ، کامٹی کی مختصر تاریخ اور کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تاریخ بھی شامل ہیں۔

محمد نورالحسن صادق بھی اچھے نثر نگار ہیں۔ ایک مختصر کتابچہ انہوں نے مومن برادری کے چودھری نظام" کی اصلاح کے بارے میں بڑے ناصحانہ انداز میں (سنہ ۱۹۳۷ء) میں چھپوائی تھی۔ ریاض الرحمٰن شمس اچھے تنقید نگار اور افسانہ نگار ہیں، تبسم شفائی طنز نگار کی حیثیت سے ابھر رہے تھے کہ عنفوان شباب ہی میں سدھار گئے، عثمان ناگر، نبیل ارمان، صدیق اختر انصاری، اظہار فاروقی، محمد حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر نظیر رشیدی کے علاوہ ڈھیر سارے نثر نگار ابھرے چھپے اور بہتیرے اللہ کو پیارے ہوئے اور بہت سارے ہم میں موجود ہیں اور قلم کی روشنائی سے فکری و ذہنی روشنی پھیلا رہے ہیں، یہ سارے آزادی کے بعد کے قلمکار ہیں۔

خورشید قدر (ایم۔ اے) فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور صاحب ذوق ہیں، سبک ہندی اور شیوۂ تسلیم و رضا۔ دو مضامین چھپ چکے ہیں۔

محمد حفظ الرحمٰن (ولادت ۱۹۳۹ء) ادبی و سماجی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں، تعلیمی موضوعات پر کئی مضامین سپرد قلم کر چکے ہیں، بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں بزم غالب کامٹی کی سب سے روشن شمع ہیں۔

نظیر رشیدی (ولادت ۱۹۴۷ء) بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں اور ادبی موضوعات پر کئی مضامین شائع کر چکے ہیں۔ اہل ادب و ذوق کے حلقے میں شامل ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد سے نثر نگاروں کی نئی نسل کی تازہ فصل کھڑی ہو گئی ان نونہالان چمن علم و ادب میں خاص طور سے یہ حضرات نمایاں رہے:

نبیل انجم، خلش قادری، مقبول وارثی، ڈاکٹر محمد یسٰین قدسی، قیصر واحدی، حفیظ

وارث، مقبول وارثی، غازی شباب احمد، شکیل شاہجہاں، سلیم سایانی، اقبال احمد ناصر، حبیب الرحمٰن فاروقی، محمد رفیق اے۔ ایس، محمد شریف روشن، سہیل اختر انصاری صدیقی اور اتیاک خالق۔

مذہبی ادب کا اردو میں ایک اعلیٰ منفرد اور مخصوص مقام ہے، دینی تخلیقات جن میں شہزدان، کربلا کے واقعات، تاریخی وقائع اور تاریخی افسانے اور ناول وغیرہ شامل ہیں عموماً مذہبی اور نیم مذہبی کردار کے حامل ہیں، خطبات کی حیثیت مختلف ہے تفسیر بھی تفرد رکھتی ہے۔ حافظ محمد یعقوب دمشقی۔ ۱۹۷۰) امام مسجد نیا بازار کاسٹی کا کارنامہ درسِ قرآن کی اشاعت ہے۔ وہ نثر نگاری پر کامل دسترس رکھتے تھے، جدید خطبات جو مذہبی تہواروں اور تقریبات پر مبنی ہیں مذہبی کتابوں کی شکل میں شائع ہوئی تھیں۔

حکیم عزیز قدسی (ولادت ۱۹۲۵)۔ شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی کرتے تھے نثر کی میں ایسی کامل دستگاہ حاصل کی تھی کہ مالیگاؤں کے ایک معمر شخص حکیم عبدالرحمٰن ایک تجربہ کار طبیب نے بھی ان سے فارسی پڑھی حکیم صاحب نے عزیز قدسی کو طبابت کی تعلیم دے کر حکیم بنا دیا اور حکمت میں بھی عزیز قدسی نے وہ حذاقت حاصل کی کہ ان کی شہرت مالیگاؤں تک پہنچ گئی جہاں کے منشی حکیم لعل محمد (م ۱۹۶۸) نے انہیں اپنا خاص ہنر سکھایا اور سند عطا کی۔

شاعری کے ساتھ ساتھ دین سے بڑا لگاؤ تھا، عبداللطیف پیش امام (بڑی مسجد نیا بازار) کی فرمائش پر عزیز قدسی نے حالات حاضرہ کی مناسبت سے قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں خطبات لکھے ہیں، "نوائے تذکیر" (۱۹۷۳ء) یعنی گلدستۂ خطبات نامہ (۱۹۷۷ء) کے عنوان سے یہ خطبے ابھی تک مسودے کی شکل میں موجود ہیں ارمغانِ عزیز آپ کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں اکرم دھولیری کی بصیرت افروز تقریظ شامل ہے۔

اخبارات ورسائل

اردو زبان کی بقا اور ادبی ماحول اور فضا پیدا کرنے کے لیے تہذیبی و ثقافتی ادارے اور تقریبات ناگزیر ہیں، مشاعرے اور مذاکرے علمی و ادبی معیار کو بلند رکھتے اور دوسروں کے خیالات و افکار سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

کامٹی میں صحافت کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں مولانا محمد اطہر انصاری نے سہ روزہ جمہور اور ماہنامہ

دُرِ سخن کے اجراء سے پڑی، عبدالستار فاروقی نے اسی سال ہفتہ وار الفاروق نکالا جو تقریباً تین دہائیوں تک وسطی ہند کا واحد ترجمان رہا، ۱۹۵۶ء میں فیض انصاری نے ماہنامہ خیال کا اجراء کیا یہ ایک ادبی اور معیاری اردو رسالہ تھا، ظہیر افروز نے ۱۹۶۶ میں ہفتہ وار تاج نکالا۔ لیکن ظہیر افروز کے انتقال (۷ رجون ۱۹۷۴) کے کچھ دن بعد تاج بھی تاراج ہوگیا ظہیر افروز کے صاحبزادے مظفر سعید افروز نے احیاء اجراء کیا لیکن اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا' شمیم فیضی اور مدیر معاون مقبول وارثی نے ۱۹۷۰ء میں بڑی امنگوں کے ساتھ ایک سیاسی پندرہ روزہ اخبار "اُمنگ" نکالا' لیکن مالی مشکلات نے امنگوں کا خاتمہ کردیا۔

اخوت ہفتہ وار کا یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو اجراء ہوا وکیل عارف مدیر ہیں' اس میں سیاسی' سماجی' ادبی اور تعلیمی خبروں اور مضامین کے علاوہ شعروشاعری کی بھی اشاعت ہوتی ہے۔ وکیل عارف اردو زبان وادب اور صحافت کے مخلص اور بے لوث خادم ہیں' شعرگوئی کے فن میں بھی طاق ہیں کئی رسائل اور جرائد کی ادارت کا تجربہ رکھتے ہیں۔

نیا اردو سماچار: سال بھر سے ناگپور سے اردو کا پہلا روزنامہ اخبار نیا اردو سماچار ایس کیو زماں کی ادارت میں پابندی سے شائع ہورہا ہے' اس کے نظم ونسق اور طباعت واشاعت کے ذمہ دار حضرات میں برادری کے باصلاحیت افراد شامل ہیں جن میں حفظ الرحمٰن کی علمی وصحافتی شخصیت بیحد نمایاں ہے' پسِ پردہ خدمت کرتے رہتے ہیں لیکن تاڑنے والی نظریں پہچان جاتی ہیں کہ اس پردۂ زنگاری کا معشوق کون ہے' آپ اردو اور ہندی پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اعلیٰ علمی وادبی ذوق رکھتے ہیں' مذہب سے بھی شغف ہے' ربانی جونیئر کالج میں لیکچرر ہیں' کامٹی کی ادبی سرگرمیوں کے روحِ رواں ہیں بڑے عمدہ خطاط اور تزئین کار ہیں۔

ایس کیو زماں کا نام نیا اردو سماچار سے جڑا ہوا ہے یہ اور بات کہ ہماری برادری کی بستیوں' محلوں اور آس پاس میں دوسری برادریوں کے ممتاز افراد ایسے قریب نظر آتے ہیں کہ 'من تو شدم تو من شدی' کا منظر نظر آتا ہے۔ ایسے مخلص لوگ اور ممتاز شخصیتوں سے برادری کو ہمیشہ مفاد پہنچا ہے۔ ایس کیو زماں ناگپور اور کامٹی کی جانی پہچانی شخصیت ہیں' کوئلہ کی کان کے مزدوروں کے رہنما ہیں' انہیں کی جدوجہد سے برادری کے مزدور طبقہ کے ایک خاصی

تعداد کو کانوں میں ملازمت ملی ہے اس سلسلے میں ان کی مساعیٔ حسنہ قابلِ داد ہے، آج سینکڑوں مومن۔ انصاری نوجوان کنہان کی کوئلہ کی کانوں کے تکنیکی، دفتری اور غیر تکنیکی اسامیوں میں ملازم ہیں، زماں کے علمی وادبی کارناموں کا رُخ اور بھی زیادہ تابندہ اور درخشاں ہے، کامٹی اور ناگپور میں ان کی ادبی وعلمی سرگرمیوں سے بڑا اشاعرانہ ماحول اور ادبی فضا قائم ہوتی ہے۔ بزمِ غالب کے زیرِ اہتمام شاندار آل انڈیا مشاعرے ہر سال ان دونوں شہروں میں ہفتوں تک میرزا غالب کا دبستان کھولے رکھتے ہیں، مہاراشٹر میں اردو بحیثیت سرکاری زبان' کے موضوع پر کل ہند سیمینار کا انعقاد، ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی کتاب "کانٹوں کی زبان" کا دلی میں پُر وقار اور عظیم الشان اجرا اور سب سے بڑھ کر علاقہ، ودربھ کے پہلا اردو اخبار اردو سماچار کا اجراء — یہ سارے ایس کیو زماں کے ثقافتی اور تہذیبی کارنامے ہیں، ایس کیو زماں کا ساتھ دینے والوں میں برادری کے حفظ الرحمٰن کا ذکر گذر چکا ہے، وکیل احمد انصاری، رفعت انصاری، جمیل حمیدی بھی بڑے معاون اور مددگار لوگ ہیں۔

ادبی وتعلیمی اداروں میں محفل نقشِ سخن کو قدامت حاصل ہے، ابتدائی دور کے شعرا منشی محمد سعید کامٹوی، عبدالقادر راحگر، ناظم اور فیض اللہ فیض میر منشی کی سرپرستی میں انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اس کا قیام عمل میں آیا، محمد اسحٰق اسحٰق نے اس فعال اور متحرک محفل کے لیے اپنی 'پیلی حویلی' وقف کر دی تھی۔ اس کے زیرِ اہتمام ایک لائبریری قائم کی گئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں کامٹی میں پلیگ کی وبا نے ہزاروں انسانوں کو لقمۂ اجل بنا کر "مرگ انبوہ جشنے دارد" کا نظارہ درمیاں میں رکھا تو یہ محفل بھی پرانے نقوش یادگار چھوڑ کر اجڑ گئی۔

سنہ ۱۹۷۰ء تک انجمن ضیاء الاسلام پبلک لائبریری کامٹی کے صدر الحاج عبدالمتین نائب پرنسپل ربانی ہائی اسکول، نائب صدر ماسٹر محمد صفی اللہ عادل اور سیکریٹری ماسٹر محمد سعید اختر بی۔ اے تھے۔ یہ انجمن عبدالستار فاروقی، مولانا محمد عمر انصاری، حاجی محمد اسمٰعیل ٹیچر، محمد ابوبکر شہرت، ماسٹر نور محمد، محمد صفی اللہ عادل، محمد صغیر حاجی عبدالوہاب، محمد خورشید حق اور حاجی محی الدین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

آزاد لائبریری کے صدر عبدالحفیظ انصاری (ہاکی بیڑی) اور سیکریٹری اقبال سعید تھے۔ محمد الیاس سنہ ۱۹۵۲ء میں اس کے سیکریٹری بنے دیگر اراکین میں مولانا اعجاز، محمد نذیر،

سراج الدین حافظ عبدالعزیز، محمد اسمٰعیل پہلوان، ملا اسرار الحق عبدالحق، نیاز پٹیل کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔

محمد خورشید حق نے انجمن انوار الاسلام کے نام سے ایک نئی تنظیم بنائی تھی اس کی نگرانی میں ایک شبینہ مدرسہ جاری ہوا اور ایک لائبریری بھی قائم کی گئی ایک فٹ بال کلب انوار الاسلام بھی اسی کے زیر اہتمام قائم کیا گیا۔ انجمن غنچۂ اسلام کا قیام ۱۹۲۲ء میں عبدالقادر راجگر، عبدالغفور پٹیل (مالک بزم حاجی وزیر محمد)، سیٹھ حاجی عبدالغفور، محمد ممتاز، محمد سجاد اور محمد اکبر صوفی کی کوششوں سے عمل میں آیا، ایک لائبریری بھی قائم کی گئی تھی۔ انجمن غنچۂ اسلام کے قیام سے کامٹی کے ادبی ماحول میں بہار آگئی۔

انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری ۱۹۲۶ء میں قائم کی گئی، محمد ظہیر وارثی اس انجمن کے صدر مقرر ہوئے اور ماسٹر عبدالحفیظ انصاری ناظم اعلیٰ تھے، انجمن کے اراکین نے نوجوانوں میں شعری، ادبی اور علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے شعبۂ ادب کی تشکیل کی۔ موجودہ زمانے (۱۹۸۲) میں یہ انجمن عبدالرب عرفان، محمد حفظ الرحمٰن اور محمد اسمٰعیل سراج الدین کی سرپرستی اور نگرانی میں ترقی کر رہی ہے اور اس کی لائبریری میں نادر و نایاب کتابوں کے علاوہ نئی مطبوعات کے ذخائر جمع ہوتے جا رہے ہیں۔

بزم غالب کا قیام ۱۹۶۷ء میں عمل میں آیا، بانیان میں یعقوب یزدانی اور ڈاکٹر نذیر رشیدی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بزم اس علاقے میں علم و ادب کے فروغ کے لئے ہمیشہ سے کوشاں ہے اور اس کے زیر اہتمام ہونے والے سالانہ مشاعرے کامٹی کی ادبی تاریخ کے سفر کے سنگ میل ہیں، مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ایک دار الکتابت بھی چلا رہی ہے اس کے عہدہ داروں میں چند ممتاز نام یہ ہیں: ڈاکٹر محمد یوسف انصاری، ڈاکٹر محمد نذیر رشیدی، محمد جمیل حمیدی، رئیس احمد انصاری، محمد حفظ الرحمٰن، رئیس احمد رسول، عبدالباری (میونسپل کاؤنسلر) ڈاکٹر رحمت الاختر، عباس صادق، کاظم علی۔ مشاعروں سے متعلق یہ افراد بڑے سرگرم و فعال رہتے ہیں: محمد ظہیر الحسن، مبین الرحمٰن انصاری، محمد الطاف، الطاف الرحیم، ریاض احمد حفیظ، نیاز احمد ظفر الٰہی، معین الدین انصاری، نشاط اختر انصاری، عبدالغفار انصاری، محمد یونس انصاری، محمد اقبال وغیرہم۔

۱۹۸۲ء تک بزم غالب کے زیر اہتمام سات عظیم الشان کل ہند مشاعرے ہوئے۔

کامٹی کے غریب الدیار مومن حضرات

تلاشِ یار میں چاہنے والا کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل جاتا ہے، تلاشِ معاش میں مجبور انسان بلند ہمتی کے پتوار سنبھالے اپنا سفینۂ حیات لے کر اجنبی کناروں پر لنگر انداز ہو جاتا ہے اور جب خیر الرازقین رزق کا وسیلہ پیدا کر دیتا ہے تو وہ ساقر و استغنا۔ سفر کر دے بیازی یادگے سے کا فاصلہ حاصل کر لیتا ہے یہ بلند ہمت اور حوصلہ مند افراد جن کا وطنی تعلق کامٹی سے ہے چاروں طرف تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں بمبئی میں محمد ایوب ایر انڈیا میں ملازم ہیں، محمد احفاظ ولد ماسٹر محمد احسان مہاراشٹر الیکٹرک سٹی بورڈ میں ڈپٹی انجینیر کے عہدے پر ہیں، حکومت کی طرف سے کینیڈا اور امریکہ جا چکے ہیں، عبد الغفار انصاری، محمد اقبال اور ریاض الرحمٰن ایکسائز انسپکٹرس ہیں۔ ممتاز انجم حکومت کے آڈٹ محکمہ میں افسر ہیں مسعود الحفیظ بیمہ کمپنی میں ایکزیکیٹیو افسر ہیں بڑے روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخصیت ہیں، ان کی سماجی خدمات کے صلے میں انہیں حکومت نے اسپیشل ایکزیکیوٹیو مجسٹریٹ کے اعزاز سے نوازا ہے۔

ستائیسواں باب

برہانپور کی انصاری برادری

زہے مقام مقدس کہ اولیار خیز ست
کند سپہر طوافِ فضائے برہانپور
(غلام علی آزاد بلگرامی)

تغلق عہد حکومت کے صوفی بزرگ برہان الدین غریب چشتی کے نام پر بسائی ہوئی بستی میں جب روحانیت کی سلطنت قائم ہو گئی تو نصیر خان فاروقی کے عہد سے لے کر مغلوں کے زمانۂ زوال تک اعاظم علمار، اکابر فضلا، محدثین کرام اور صوفیائے عظام کے قدوم میمنت لزوم سے یہ غریب بستی میراث اسلام کے متاع عزیز سے مالا مال ہوتی رہی۔ مختلف صوفی سلسلوں نے یہاں روحانی مراکز قائم کئے خانقاہیں آباد ہوئیں، مسجدیں، یک صف میں کھڑی ہو گئیں اور دینی درسگاہیں علم و فنون کے چراغوں سے روشن ہو گئیں ـــــ اور ان کے ساتھ ساتھ یہاں بہترین پارچوں کی صنعتی کارگاہیں بھی قائم ہو گئیں۔

صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں جب محفل سماع منعقد ہونے لگی تو موسیقی کی آوازان کی سرپرستی میں اور بلند ہو گئی۔ دکن اور مالوا کی سرزمین موسیقی کے علم و عمل کی تخت گاہ بن گئی تھی اور جب بادشاہوں کی سرپرستی حاصل ہوئی تو سارا دکن زمزمہ زار بن گیا ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری اس اقلیم کا جگت گرو تھا اُسی نے بیجاپور کے مضافات میں نورسپور کی بستی بسائی تھی اور اس طرح گھر گھر میں وجد و سماع کا چراغ روشن کر دیا تھا۔ برہانپور کے حوالی میں ایک بستی زین آباد کے نام سے بس گئی تھی اسی زین آباد کی رہنے والی ایک ہوش ربا ملکۂ نغمہ زیرِ لغنیہ تھی جو زین آباد کے نام سے سارے میں گونجنے لگی تھی اسی کے نغمۂ حسن و دلربائی کی تیر افگنیوں نے شہزادہ اورنگ زیب کو گھائل کر دیا تھا۔ اس معاشقہ کی داستان صاحب مآثر الامرار شاہنواز خان نے بڑے دلکش انداز میں سنائی ہے[1]۔ برہانپور کی نغمہ و سرود سے

---

[1] غبار خاطر۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ ۲۹۵۔ ۲۹۹

معمور فضا میں ایک زمانے تک مطربانِ خوش آہنگ اور مغنیانِ زمزمہ ساز کے رقص و سرود کے ہنگاموں سے "بزرہاڑی" کے کوچے رہروانِ شوق "تماشائی نیرنگِ تمنا" بنے رہے۔ زین آباد حضرت زین الدین شیرازی کے نام پر بسا تھا (سنہ ۸۰۱ھ)۔ برہانپور میں حضرت زبیر بن عوام کی اولاد و احفاد کی کثیر تعداد تھی۔

صنعتِ پارچہ بافی

شاہجہاں نے سنہ ۱۰۳۹ھ/۱۶۲۹ء میں برہانپور کو 'دارالسرور' کا خطاب دیا، اسی کے عہدِ حکومت میں مشہور سیاح ٹے ورنئے دو مرتبہ (سنہ ۱۶۴۱ء اور سنہ ۱۶۵۶ء) میں برہانپور آیا جب یہاں کی تجارت کے تانے بانے سارے ممالکِ اسلامی تک پھیلے ہوئے تھے یہاں سے آبِ رواں، عمدہ قسم کا ململ اور اطلس بھیجا جاتا تھا جو ان ملکوں میں نقاب، پلنگ پوش اور رومال بنانے کے کام آتا تھا، ریشمی کپڑے اور زربفت کی نہایت نفیس بافندگی ہوتی تھی تانے بانے میں سونے اور چاندی کے تار بُنے جاتے تھے، ریشمی کپڑوں پر نہایت اعلیٰ قسم کی گلکاری کی جاتی تھی، ریشمی پارچے اور زربفت کی قیمتی اوڑھنیاں ایران اور ترکی بھیجی جاتی تھیں، رقعاتِ عالمگیری کے فاضل مقدمہ نگار پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے کہ برہانپور میں شاہجہاں، جہاں آرا اور اورنگ زیب کے جیتیات اور پارچہ بافی کے شاہی کارخانے یہیں قائم تھے اور یہ صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی۔ ریشمی کپڑے اور زربفت کے مسلمان بُنکر جو دہلی سے آکر آباد ہوئے تھے ایک الگ محلہ میں سکونت پذیر تھے غالباً یہ مومن پورہ تھا۔

انگریزوں کے عہدِ تسلط میں ان کا بھی ایک کارخانہ تھا، یہاں پر سورت کے ملک التجار، ویرجی بوہرہ کی آڑھت کی دوکان تھی، ویرجی کے تمول کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر یوروپی فرمیں اس کی مقروض تھیں۔[1]

اطالوی سیاح نکولاؤ منوچی جو ہندستان آکر دارا شکوہ کی فوج میں شامل ہو گیا تھا اپنے سفرنامے میں برہانپور کی صنعتِ بافندگی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہاں متنوع و رنگ برنگ کے

---

[1] ماہنامہ پیامِ تعلیم، شمارہ اگست سنہ ۱۹۶۵ء ص ۴۲-۴۶۔ اور دیکھیے نجابت و شرافت یا لباسِ تقویٰ۔ ص ۱۸۰-۱۸۳

کپڑے خصوصاً سرخ و سفید عورتوں کے دوپٹے اور نقاب بنانے کا کپڑا بہت نفیس اور عمدہ تیار ہوتا ہے" چھپا ہوا کپڑا بھی تیار کیا جاتا تھا۔ ارمنی سوداگر جو یہاں رہتے تھے اس کی تجارت کرتے تھے اور دساور کی منڈیوں میں برآمد کرتے تھے۔

برہانپور کی صنعت پارچہ بافی سے متعلق مشہور عالم دین علامہ مناظر احسن گیلانی اپنی گرانقدر تصنیف "تذکرۂ شاہ ولی اللہ" میں یوں رقمطراز ہیں:

"ہندستان کا مشہور تجارتی شہر "برہان پور" جو مغلوں کے عہد میں گویا "لنکاشائر" یا "مانچسٹر" ہونے کی حیثیت صنعت پارچہ بافی میں رکھتا تھا اور اسی تعلق سے یورپی تاجروں کی آمد و رفت کا یہ آماجگاہ بنا ہوا تھا"

برہانپور سے وسطی ہند خصوصاً مالوہ میں اگائی جانے والی کپاس بحیرۂ احمر کے کنارے آباد بندرگاہوں کو بھیجی جاتی تھی، زین آباد کاغذ سازی کے لئے مشہور تھا۔ برہانپور میں مختلف النوع پارچے بنے جاتے تھے مشروع جو پگڑی کے کام آتا تھا نیز ریشمی پارچہ جات اور معیاری قسم کا ململ بھی بنایا جاتا تھا، یہاں کے کارخانوں میں تیار شدہ ململ سلاطین عہد، شاہزادگان سلطنت اور بیگمات حرم کے ملبوسات کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

برہانپور کی صنعتی ترقی میں برادری کا حصہ[1]

غدر کے ہنگامہ پرور زمانے میں جب شیخ انصاری حضرات اور نوربافوں کو ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا تو جن بستیوں میں صنعت بافندگی کی کارگاہیں تھیں وہی ان کی پناہ گاہیں بن گئیں، جن مقامات سے مہاجر خاندان یہاں آکر بس گئے تھے ان کے نام اس طرح ہیں:

مبارک پور، غازی پور، خیرآباد (محمد آباد گوہنہ)، شیخ پور، مکیان، جمال پور، بھیلم پور، گوپی پور، مہاراج گنج، مئو ناتھ، بنارس، سنگرپور، کوپاگنج کی سرایا، بارہ بنکی، کان پور، فرخ آباد وغیرہ۔

جب یہ اپنے مسکنوں سے نکلے تو مسکینوں سے بھی زیادہ بدتر حالت تھی۔ بقول غالب ؎

---

[1] اس حصے کے لئے راقم عزیزی محمد ایوب انصاری برہانپوری (مقیم بمبئی) کا شکرگزار ہے جنھوں نے نادر مصادر اور تحریری معلومات فراہم کرکے بڑی مدد کی ہے۔

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی　　　لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

شوریدگی کے ہاتھ سے سر وبالِ دوش تھا، پیراہن تیار کرنے والے جنکروں کی جیب میں اک تار بھی نہ تھا، لیکن مشکلیں اتنی پڑیں کہ ان اہلِ حرفہ اور اہلِ ہنر کے لیے آسان ہو گئیں! کشاکشِ ہستی سے فرصت ملنے میں پچاس برس گذر گئے۔ برسوں کی سکونت کے بعد ان کے دلوں کو سکینت نصیب ہوئی تو صنعت میں برکت پیدا ہوئی اب یہاں ندی کے کپڑے، ساڑیاں، الاچے، پھڑکی، پتامبر، کھنڈالہ وغیرہ کی بُنائی نذروں پر ہونے لگی اور کرگھوں کی نئی قسمیں ایجاد ہونے لگیں لیکن ڈھوٹے ہاتھ سے پھینکے جاتے تھے کچھ برسوں بعد سرکار کی جانب سے ایک تربیتی کیمپ کھولا گیا اور اس میں ترمیم شدہ آسانی سے پیداوار دینے اور مال بنانے والے ہینڈ لوم کی نمائش کی گئی اور اس کے چلانے کے طریقوں کی تربیت دی جانے لگی اس طرح تکنیکی ہنر میں تبدیلی اور ترقی ہونے لگی۔

۱۹۰۵ء میں ریلوے اسٹیشن سے متصل لال باغ میں تاپتی مل کا قیام عمل میں آیا اور جو بنکر بمبئی اور دیگر صنعتی مراکز میں جہاں ملیں تھیں۔ پاور لوم چلانے کا تجربہ رکھتے تھے، ان کے لیے یہ مل نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی، دوسروں کی بھی تربیت دی جانے لگی اور اس طرح صنعت کے ساتھ برادری کی پیش رفتی نے قدم جمالیے۔

برہانپور بلدیہ کے ایک عہدہ دار سید بشارت علی نے جو بوہرہ جماعت کے فرد تھے پارچہ بافی کے فروغ میں بڑی دلچسپی دکھلائی انہوں نے ۳۲-۱۹۳۱ء میں برادری کے تین ممتاز صنعتکاروں کو بیس بیس لوم کے حساب سے ساٹھ لوم تقسیم کیے یہ امین سیٹھ (مالیگاؤں والے)، عبداللہ بھائی سرودری اور امانت اللہ سیٹھ تھے۔ سید صاحب نے اکبری سرائے میں بافندگی کی تربیت دینے کے لیے ایک اسکول قائم کیا۔ [۱]

امین سیٹھ نے جو ڈائمنڈ فیکٹری سکیسر کے حاجی عبدالخالق اور محمد یسین کے بھائی تھے برہانپور میں کارخانہ قائم کرکے بڑی ترقی کی اور شہر کے سب سے ممتاز اور کامیاب تاجروں میں شمار ہونے لگے، ان کے بعد خاندان کے کچھ افراد مالیگاؤں چلے گئے۔ امین سیٹھ تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن تھے۔

---

[۱] شبیر حکیم، حیات کی حکایت ص ۳۷۵

صنعت کی یہ برق آسا سُرعتی ترقی دیکھ کر ۱۹۳۴ء میں بمبئی کی ایک فرم کوہ نور ریڈرس نے بجلی رسانی کے لئے اسٹیشن اور آبادی کے درمیانی راستے پر ایک بجلی گھر قائم کیا مگر کاروباری نقطۂ نظر سے اسے صارفین کی ایک معتدبہ تعداد کی ضرورت تھی۔ فرم کے ارباب عقد وکشاد نے شہر کے ذی حیثیت اور کاروباری ذہن رکھنے والے ہوشمند اور دوراندیش تاجروں اور صنعتکاروں کو پاور لگانے کی ترغیب دی، چنانچہ مولوی امانت اللہ پہلے شخص تھے جنہوں نے پاور لوم لگایا بعد میں ماسٹر عبدالغفور، شاہ محمد سیٹھ، حاجی محمد یعقوب انصاری دستوارہ اور برادری کے دوسرے ذی ہوش حضرات نے بھی کوہ نور ریڈرس سے کسب نور کرنا شروع کردیا اور پاور لوم کے کارخانوں کی منور فضائیں شور وغلغلہ سے معمور ہونے لگیں اور صنعت کے اُجالے کا سفر ایک نئی سمت شروع ہو گیا۔

—— پھر دوسری جنگ عظیم نے ساری دنیا کے انسانوں کو لپیٹ میں لے لیا، صنعت پارچہ بانی کے تار و پود اُکھڑنے لگے، سوت دھاگے وغیرہ کی دستیابی میں دشواری کی گرہیں پڑنے لگیں لیکن جلد ہی تانے بانے سلجھنے لگے اس سے پہلے ڈبل کئے ہوئے سوت سے تانے بانے بنئے جاتے تھے اس کے بدلے کانجی (کلف) والے سوت سے تانے بنانے کا نیا طریقہ ڈھونڈھ لیا گیا اس طرح پھر سے پاور لوم کی صنعت میں قوت نُمو پیدا ہو گئی۔ جنگ کے مابعدی ثرات بہر حال یکسر زائل نہیں ہوئے، مہنگائی کے مسایوں کی قلت نے سوت کی دستیابی پر زد ڈالا پھر بھی بدقت کام چلتا رہا تا وقتیکہ حکومت نے سوت کی فراہمی اور تقسیم پر کنٹرول لگا دیا اور کوٹہ کی شکل میں ضرورت کے اعتبار سے جو مال ملتا وہ بھی ناکافی ہوتا تھا۔

اس صنعت کا ہمیشہ سے یہ مقدر رہ چکا ہے کہ اس میں فراوانی اور افراط کی باڑھ آئیگی تو خوشحالی کی لہریں لہرانے لگیں گی اور جب کساد بازاری کا دورہ پڑے گا تو مالی بحران اور تجارتی ہنگامے یکسر سرد پڑ جائیں گے، حکومت کی وقتاً فوقتاً پالیسیاں بھی صنعت کے انجر پنجر کو ڈھیلی کرتی رہتی ہیں۔

۱۹۵۶ء کے بعد سرکار کی جانب سے رنگین ساڑی پاور لوم پر بنانے کی پابندی عائد کردی گئی اور اس کی بُنائی کی تخصیص ہینڈ لوم کے لئے کردی گئی جس کی وجہ سے پاور لوم پر پارچہ بافی کی استقامت اور استقرار کے بخیے اُدھڑنے لگے، نوربافوں کا طبقہ ذہنی اور مالی طور پر پریشان ہو گیا، کچھ لوگوں نے ملوں سے تانے فراہم کرکے بغیر رنگ کے دگرے (کورے کپڑے) لوم پر بنانے

گئے پھر بھی تہی دامن رہے، اسی دوران کچھ دانشمند صنعتکاروں نے ایک بڑا تعمیری قدم اٹھایا، بھیونڈی کے مشہور تاجر سیٹھ محمد ایوب پنجابی اور شاہ محمد سلامت فرم برہانپور کے عبدالرحمٰن سیٹھ نے تقریباً دو سو پچاس لوم ملوں سے کورے تھان تپنے کی مہم پر شروع کیا اور اسطرح بُنکروں کو روزگار فراہم ہونے لگا اور کاروباری ذہن رکھنے والے صنعتکاروں نے ایک نئی سمت دریافت کرلی۔ اور ۱۹۶۲-۶۱ء کے درمیان اسی راستے پر کافی کارخانہ داروں نے صنعتی سفر شروع کر دیا۔ سیٹھ محمد ایوب پنجابی، سیٹھ عبدالرحمٰن سلامت، سیٹھ محمد امین اور حاجی خدابخش شاہ محمد فرم کے مالک نے شراکت میں ایک سائزنگ مشین کی بنیاد ڈالی اور ملوں سے تپنے کی مہم لینے کی بجائے خود کفیل بن گئے، پھر امین اللہ سیٹھ نے سائزنگ شروع کی اور اس طرح آہستہ آہستہ صنعت کو ہر میدان میں فروغ ملنے لگا اور اس کے بعد دوسرے لوازمات مثلاً کلینڈرنگ، بلیچنگ وغیرہ کے پلانٹ بھی ڈالے جانے لگے۔ جانفشانی رنگ لائی اور صنعت کا رنگ و روغن نکھرنے لگا اور برادری خوشحال اور مالا مال ہوتی گئی اور اب صنعت کا خاصہ وسیع میدان برادری کے تاجروں اور صنعتکاروں کا جولانگاہ بن گیا ہے۔ مزید ترقی دینے میں سرکار کی امداد باہمی اسکیم کے تحت قرضہ جات کا اجراء بڑی حد تک امدادی طور پر ممد و معاون ثابت ہوا۔ فی الحال برادری کے پاس تقریباً بیس ہزار لوم، چھبیس سائزنگ مشینیں، چار کلینڈرز، چار بلیچنگ پلانٹس ہیں۔ اس کی وجہ حکومت کے ترقیاتی منصوبے اور معاشی و صنعتی و تجارتی اصلاحات کے پروگرام بھی ہیں۔ ابتداء میں صرف تین کوآپریٹو سوسائٹیاں تھیں۔ سینکڑوں سوسائٹیاں امداد باہمی کا پروگرام لے کر چل رہی ہیں۔

برادری کا تاجر طبقہ اور ممتاز تجار

کاروبار کے سلسلے میں برادری کے تجار مالیگاؤں، بھیونڈی اور بمبئی کا سفر کرتے تھے، خام مال اور دیگر لوازمات جن کا تعلق سائزنگ، رنگائی اور بُنائی سے تھا ان کی فراہمی بمبئی کی منڈیوں اور مارکیٹوں سے ہوتی تھی اسطرح ان شہروں کی برادری سے بھی ان کی رشتہ داریاں ہونے لگیں کفاءت کا مسئلہ برادری میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، ان تاجروں میں یہ حضرات بڑے فعال تھے : ولی محمد سوداگر، حاجی سیٹھ خان محمد شیخ، خدابخش عاشق، حاجی الٰہی بخش، عبدالستار مفطر، حبیب اللہ شرر، حبیب اللہ حافظ عزیز اللہ، حاجی فضل شاہ محمد سیٹھ، محمد حنیف سیٹھ انصاری، وارث علی، پیر محمد سوداگر، رضوان اللہ اسعد اللہ، محمد بشیر عبدالغفور، محمد اسماعیل محمد اصغر۔

پاور لوم کارخانوں کے ساتھ ساتھ سائزنگ کے بھی پلانٹس لگنے لگے تھے، ان میں انصاری سائزنگ ورکس کو عبدالحق انصاری نے بڑی وسعت دی، اس کے علاوہ انصاری سائزنگ ملس۔ محمد ابراہیم انصاری اور محمد عالم انصاری کی روشن سائزنگ ملیس بھی پاورلوم کے کارخانہ داروں کو "بیم" بنا کر دیتے تھے، اس سلسلہ میں اور بھی نام ملتے ہیں مثلاً سپر سائزنگ مل (لوہار منڈی)، ہندستان سائزنگ مل (انڈسٹریل اسٹیٹ)، اپسرا سائزنگ (جمال پورہ)، وغیرہ روشن سائزنگ ملس (کھنڈوہ روڈ) کپاس کے اچھے سوت سے سائز ڈبیم بنا کر دیتا تھا۔

برادری کے کچھ، جو بیڑی کی صنعت میں بھی معروف تھے۔ اکرام اللہ انصاری کی مشہور بیڑی زم زم دُبھائی بیڑی نمبر ۵ بہت دور دور تک فروش کی جاتی تھی۔ لوم اور دیگر مشینوں کے لوازمات کی دوکانیں بھی عموماً برادری کے افراد کی ملکیت میں تھیں۔ جہانگیر مل اسٹور کے مالک رشید احمد انصاری تھے۔ دی سنار پاور لوم بُنکر سہکاری سنستھا کیادت (دمن پورہ) پاور لوم پر تیار کئے ہوئے کوری دھوتی اور رنگین کپڑوں کی بہت بڑی دوکان تھی رشید احمد انصاری اس کے سیکریٹری اور شیخ ذکی احمد مینیجر تھے۔ عبدالرحمن روڈ ٹرانسپورٹ کمپنی (ستوارہ) برادری کے فرد کی ملکیت میں تھی، اقبال اینڈ برادرس، انعام الحق حاجی عبدالحق انصاری بھی تاجر اور دکاندار ہیں۔

سیٹھ محمد امین عبدالحمید: مالیگاؤں کا خاندان ہے اور اس تعلق سے ذکر آچکا ہے، برہانپور میں دوکانداری تھی، سوت کا بڑا کاروبار تھا، پاور لوم کا کارخانہ تھا، کاروبار کی ترقی میں آپ کے صاحبزادے محمد مصطفیٰ سیٹھ (مرحوم) کا زیادہ حصہ تھا، امین سیٹھ کے چھوٹے صاحبزادے یارون سیٹھ اسمبلی کے رکن تھے، خورشید احمد صاحبزادے ہیں، برہانپور کے سید بشارت علی نے جو ساٹھ لوم ۱۹۳۱ء میں تین صنعتکاروں میں تقسیم کئے تھے ان میں سے ۲۰ لوم امین سیٹھ نے لئے تھے۔ اور ۲۰ لوم امانت اللہ سیٹھ نے لگائے تھے۔

شاہ محمد سلامت سیٹھ برادری کے متمول اور مخیر شخص تھے، سوت کی دکان تھی، مصنوعات میں ساڑی کی ایک خاص دوکان بھی چلاتے تھے، بڑے کامیاب صنعتکار تھے۔ عقیل سیٹھ ان کے صاحبزادے بھی آبائی صنعت و تجارت کرتے ہیں۔

رحمت اللہ پہلوان ایک مشہور ویونگ ماسٹر تھے۔ حکومت نے جب ٹریننگ سنٹر قائم کیا تو آپ ہی کے ذمے تربیت دینے کا کام سپرد ہوا تھا۔

سیٹھ عبدالصمد عبدالکریم: نیا محلہ میں پاور لوم کا کارخانہ تھا، برادری کی مشاہیر ہستیوں

میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

حاجی حفیظ اللہ خان محمد: صنعتکار تھے پاور لوم کا کارخانہ تھا ساڑی بازار میں دکان تھی۔ مذہبی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

بابو سیٹھ سوت والے: برادری کے سوت کے تاجروں میں بڑے مانے جاتے تھے۔

عبدالرشید ماموں آبائی پیشہ ترک کرکے گھڑی سازی اور گراموفون کا کاروبار کرتے تھے۔

خورشید حسن ابن منو میاں: برادری کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے الیکٹرانکس کے میدان میں برق کی طرح ترقی کی، دادر بمبئی میں ریڈیو اور الیکٹرک کی دکان تھی، فلم اور سینما سے متعلق تمام لوازمات کا کاروبار تھا اور اس میں ٹھیکے بھی لیتے تھے بڑودہ اور گجرات کے دیگر شہروں تک کاروبار پھیلا ہوا تھا، برہانپور میں بھی دکان تھی۔

سیٹھ عبدالحق اور نورالحق سیٹھ: برادری کے بڑے پرانے دولت مندوں میں سے تھے، صنعت پارچہ بافی میں بھی مقدم تھے، آکولہ اور برار تک پاور لوم کے کارخانے تھے ان علاقوں میں رنگین ساڑیوں کی تجارت میں آپ کی ساکھ قائم تھی، ہندستانی مسجد کے عرصے تک متولی رہے۔

حاجی مولوی امانت اللہ سیٹھ: جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، لوم کا کارخانہ ڈالا اور صنعت کو بیحد فروغ دیا، مدرسہ فیض العلوم آپ کے والد بزرگوار کی یادگار ہیں آپ ہی نے قائم کیا، صدقہ دہرا میں لیا جاتا تھا، آپ کے صاحبزادے حاجی اکرام اللہ سیٹھ، حاجی امداد اللہ سیٹھ اور میاں سیٹھ نے بھی کاروبار میں بڑی ترقیاں کیں۔

سیٹھ عباد اللہ حاجی امداد اللہ: مل اسٹور کی دوکان تھی، پاور لوم کا کارخانہ تھا، کاروبار میں بڑی ترقی کی، نیشنل ہائی اسکول کے خیر خواہوں اور معاونین میں سے تھے۔

سیٹھ حاجی محمد عابد محمد صادق: ہندستان سائزنگ مل کے مالک ہیں، بڑے اونچے صنعتکار ہیں، پاور لوم کے کارخانے کے بھی مالک ہیں۔

مختار دانش ابن نبھی: انصاری سائزنگ اور کیلنڈر مل کے مالکان میں سے ہیں، شاعری سے شغف رکھتے ہیں، دانش تخلص کرتے ہیں۔

ممتاز حسین حاجی مقبول حسین: اپنے والد حاجی مقبول حسین اور دادا حاجی ولی محمد کی طرح کپڑے کی بزازی کرتے ہیں، سوداگری کے ساتھ پاور لوم کا کارخانہ بھی قائم کر رکھا ہے، سائزنگ مل کے بھی مالک ہیں۔

محمد امین شاہ محمد اور حاجی عاقل شاہ محمد: صنعت پارچہ بافی کو فروغ دینے والے بزرگوں میں سے ہیں، پاور لوم کا کارخانہ ہے، سائزنگ مشین اور بلیچنگ پلانٹ کے مالک ہیں۔

حاجی محمد عالم شیخ عبدو روشن سائزنگ کے مالک ہیں، پاور لوم کا بھی کارخانہ ہے، سیاسی اور سماجی کاموں میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔

منظور احمد ابن سلیم ماموں (دگبو سیٹھ): پاور لوم فیڈریشن کے سیکریٹری ہیں، کوآپریٹیو سوسائٹی کے بھی نگراں ہیں، سائزنگ اور پاور لوم کارخانے کے مالک ہیں۔

محمد حنیف حاجی محمد یعقوب انصاری: صنعتکاروں کے قدیم خاندان سے تعلق رکھتے تھے، صنعت پارچہ بافی کو فروغ دینے میں محمد حنیف سیٹھ کا بڑا عمل دخل تھا۔ برار اور مہاراشٹر تک ساڑی کا کاروبار پھیلا ہوا تھا، بڑے اعلیٰ پیمانے پر تجارت کرتے تھے، دوسرے کاروبار بھی احسن طریقے پر کرتے تھے۔ آپ کے صاحبزادوں میں اختر الحسن انصاری جو سارا کاروبار سنبھالتے تھے مارچ ۱۹۹۳ء میں سخت علالت کے بعد چل بسے۔ چھوٹے صاحبزادے محمد ایوب محمد حنیف انصاری برسوں سے پنجابی برادران کی فرم سے متعلق ہیں ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ محمد حنیف کی دوستداری کا سلسلہ بھیونڈی تک پہنچا تھا۔ راقم کے برادر بزرگ مرحوم ذاکر حسین مومن (کلو سیٹھ) بہنوئی عبدالمجید انصاری، ایوب پنجابی، محمد یوسف (جھوہان باوڑی) اور دیگر تاجر حضرات آپ کے احباب میں سے تھے۔

برہانپوری انصاریوں کی جماعتی روایات

انیسویں صدی میں برطانوی حکومت کی ضلعی رپورٹوں اور گزیٹیرس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیار پوربیا کے علاوہ سارے ترپردیش میں بہت ساری بدعتیں اور مشرکانہ امور رائج تھے، غازی میاں کی بارات ہر سال مختلف شہروں سے 'میدنی' کی صورت میں پھیرایا جاتی تھی؛ شادی بیاہ کے رسوم درواج میں گو مصلحین کی اصلاحی اور تبلیغی جدوجہد سے بہت ساری تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن جاہل اور گنوار طبقہ اور خصوصاً دیہاتوں کے جلاہوں میں کل بدعۃ ضلالۃ کا پیغام نہیں پہنچا تھا حالانکہ حامی سنت اور ماحی بدعت مصلحین برادری میں کم نہ تھے۔

برہانپور کی برادری کے سارے خاندان بلا استثناء سنی دیوبند کے تھے اور وہ اپنے ساتھ روایات

کا زادِ راہ بھی لائے تھے لہٰذا ایک طویل مدّت تک فرسودہ روایات اور رسوم کی گٹھری لادے چلتے رہے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں برہانپور میں مومن برادری کی جب جماعتی تنظیم ہوئی تو اس کے منشور میں چند دستورات اور ضوابط بھی شامل کئے گئے۔ یہ منشور پرانے رسم و رواج کے انسداد، استخراج و استنساخ میں بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوا۔ "چونکہ اب تک یو پی کے مختلف اضلاع کی رسوم اور رواج شادی بیاہ میں برتے جاتے ہیں ان کو ختم کر کے شہر کی پوری برادری میں ایک ہی قسم کی رسوم و رواج برتے جائیں" —— اور یہ قسم وہی پرانی قسم تھی لیکن پھر بھی بڑی بنیادی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور بڑی حد تک ان رسومات میں سدھار بھی مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہوتا گیا۔

رسومِ شادی:

منگنی: "گھر دھنی منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے مدعو عزیز و اقارب کی شربت وغیرہ سے تواضع کریں۔"

بارات: (الف) مقررہ تاریخ پر دن میں ۱۰ بجے یا بعد نماز ظہر و عصر بارات نکلی جائے۔

(ب) بارات میں افراد کی تعداد کی کوئی قید نہیں۔ مگر لڑکے والے کے گھر جب بارات پہنچے تو بعد نکاح دولہا کے ساتھ پانچ افراد ہوں۔

(ج) کفایت شعاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے بارات سادہ طرز پر نکالی جائے (گھوڑا، جبہ سہرا ہو) دولہے کے گلے میں صرف پھولوں کا ہار ہو۔

(د) راستے میں پیسے لٹانے یا میلاد پڑھنے والوں کو پیسہ دینے پر پابندی عائد کی جاتی ہے اور پٹاخے یا کسی قسم کا دھماکہ نہ کریں۔

نیوتا: (الف) دولہے کے گھر بارات یا ولیمہ کے روز اور دلہن کے گھر عقد کے روز نیوتا یا نقدی دینے لینے کی رسم نہ لے جایا جائے۔

(ب) نیوتا کے ساتھ صرف گھر کے افراد ہوں۔

(ج) نیوتا لیجانے کے لئے وہی لوگ مجاز ہونگے جن کا نیوتا واپس نہ ہونے والا ہو۔

(د) نیوتا میں پورا جوڑا بھی لے جایا جاسکتا ہے۔

(ر) کسی فرد کو بحیثیت دوست یا محلہ دار کے کپڑے لیجانے کا حق نہیں ہے۔

شیرنی: داماد اگر سسرال شیرنی لے کر آئے تو صرف گھر کے افراد بغیر باجے اور پڑھتے ہوئے شریک ہوں۔

ختنہ: شادی کے ساتھ اگر بچے کی ختنہ بھی ہو تو عزیز و اقارب بچے کے لئے کپڑا نہ لیجائیں۔

نمائش: شادی میں دلہن کے لئے کسی خاص کپڑے کی نمائش نہ ہو۔

ڈالی: ڈال میں صرف ۲ جوڑے کپڑے، سہاگ پوڑا، ۵ ۲ پان، سوا کلو چاول، سوا کلو گڑ، دو کپی تیل، سوا کلو دہی، سوا پاؤ ناڑا، سوا کلو مٹھائی، ۵ ۲ گرام کتھا، ۵۰ گرام سپاری،

یہ چیزیں ٹوکری یا خوان میں رکھ کر بھیجی جائیں، پٹاری استعمال نہ کی جائے۔

صافہ بندی: دولھا کی صافہ بندی کی رسم ادا کرنے میں حقدار کو گیارہ روپے ادا کئے جائیں اور کئی ہوں تو یہی رقم وہ آپس میں بانٹ لیں۔

دولھا دلہن کی رخصتی: اس رخصتی میں نمائش سے پرہیز کیا جائے اور نہایت سادگی سے رخصتی عمل میں آئے۔

پانی پینے کی رسم: دلہن کے والد یا بزرگ اپنے نئے داماد کے گھر پانی پینا چاہیں تو صرف اپنے کنبے کے افراد کے ساتھ یہ رسم ادا کریں داماد کی طرف سے پانچ روپے اور والدہ ڈھائی روپے عطا کرے۔

گوتا: دولھا کا سسرال جا کر دلہن کو اپنے گھر لانا [یہ ایک طرح سے دلہن کی ثانوی رخصت تھی] اس موقع پر عزیز و اقارب یا مستورات کوئی رقم کوئی برتن نہ دیں۔

بدھاوا: کسی قسم کا بدھاوا (صافہ وغیرہ) دیے جانے کی رسم جو عام ہوتی جارہی تھی اسے غیر ضروری سمجھ کر بند کرتی ہے۔

درمیانی کا صافہ: درمیانی [اگوا] کو طرفین میں سے کوئی صافہ نہ باندھے اور درمیانی یہ پیشکش قبول نہ کرے۔

غمی: میت کے موقع پر میت کے گھر صرف اس کے رشتہ دار کھانا [بھاتی] لے جائیں اور میت کے گھر والے کسی غیر شخص کو نہ بلائیں۔

جماعتی تنظیم نے اس قسم کی غیر ضروری رسموں کو ختم کر دیا پھر بھی یہ ساری رسمیں مقامی و قدیم روایات کی حامل تھیں، لیکن بعض ایسے رسوم جو دینی و انسانی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے قبیح تھے وہ بند کر دئے گئے۔ مثلاً دولھے کو گھوڑے پر شب گشت، آتشبازی، باجے گاجے یا میلاد پڑھتے ہوئے تمام تر نمائشی جلوہ آفرینیوں کی جلو میں دلہن کے گھر لے جاتے تھے، دلہن کی سہیلیاں اور اور چاول پھینکا کرتی تھیں جو کہ باراتی ان دلربا ادا بیلوں پر بجائے گھڑ دوڑ کے کنکریاں پھینکے

تھے، ایک رسم تھی "اُتّودا" کھلنے کی جو ایک انتہائی تخریبی رسم تھی جس میں دشمنی نکلنے والے کھانا اور ہڈیاں وغیرہ کھنڈروں یا پوکھری میں پھینک دیتے تھے تاکہ داعی کی رسوائی ہو، بیچارے داعی کو نہ تو کسی شکایت کا حق تھا اور نہ گلہ کا یارا۔ مرتا کیا نہ کرتا اب سہہ جاتا، پھر دھوم دھام سے رتجگا منائی جاتی بڑی دھما چوکڑی ہوتی اور الھڑ لڑکیاں ایسے اخلاق سوز گیت گانے کہ بڑی بوڑھی عورتیں "توبہ" کہہ کر دو چار صلواتیں سنا کر اپنی جوانی کے دنوں کی یادوں میں کھو جاتیں، گلگلے پکا کر فجر کی نماز کے وقت محلہ کی مسجد کے طاق کو بھر دیا جاتا اور عورتیں اپنی دانست میں دامن میں ثواب بٹور کر لے آتیں۔ شب گشت کے بعد باراتی دلہن والوں کے ہاں رات بسر کرتے، دوسرے روز چاشت کے وقت نکاح خوانی ہوتی۔ لڑکی والے مہمانوں کی ضیافت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے عصر کے بعد دلہن وداع ہوتی تھی، وہ حضرات رقص و سرود کو انتہائے انبساط و اظہار شادمانی سمجھتے تھے شب عروسی میں طوائفوں کی محفل سجاتے تھے یا قوالیوں کا پروگرام کرتے تھے، دوسرے دن ولیمہ ہوتا۔ شب زفاف کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے۔

نکاح کی دینی و دنیاوی اور ازدواجی و عائلی زندگی کے اعتبار سے بڑی اہمیت ہے، نکاح کرنے سے دین و دنیا کی درستگی ہوتی ہے اور ہزاروں برائیوں اور فواحش سے انسان محفوظ رہتا ہے، ایمان قائم رہتا ہے، خدا اور رسول ؐ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے مگر یہ سب باتیں شریعت کے مطابق نکاح کرنے سے حاصل ہوتی ہیں لیکن بعض لوگ شادی بیاہ میں بہت سی غیر شرعی امور انجام دیتے ہیں ان میں بعض شرک و کفر، فسق و فجور اور بعض حرام باتیں بھی ہوتی۔

جماعتی نظام کا قیام اور اصلاحات:

ان تمام خرافات اور بڑی حد تک بدعات کے انسداد کی خاطر بسا بور میں مومنوں کی سب سے پہلی جماعتی تنظیم کا قیام محلہ لوہار منڈی میں عمل میں آیا۔ صوفی عبدالاحد اس کے سردار مقرر ہوئے، اس کے بعد محلہ قلعہ میں صوفی صاحب کے برادر خورد محمد واصل سردار بنائے گئے ان کے انتقال (۱۳۱۸ھ) کے بعد ان کے خلف اکبر حاجی محمد پہلوان ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ دوسرے محلوں میں بھی اسی نہج پر علاحدہ علاحدہ جماعتیں قائم ہونے لگیں، ستوارہ محلہ کی جماعت بھی اسی زمانے میں قائم ہوئی۔ بارہ بنکی اور فرخ آباد کے تارکین وطن نے 'چار چٹائی' کے نام سے اپنی علاحدہ جماعت بنالی۔ یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا پھر ذی اثر حضرات کی زندگی

کی کڑیاں ٹوٹنے لگیں تو سلسلہ بھی ٹوٹ گیا، شیرازہ بکھرنے لگا اور جماعتی انتشار دردمندانِ قوم
اور تعلیم یافتہ افراد کے لیے پراگندہ طبعی کا باعث بن گیا، پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں
کو، ایک مشکل کام تھا چنانچہ دور اندیش اور ہوشمند افرادِ قوم نے باہمی مشورہ سے طے کیا کہ
ان بکھری ہوئی معطل جماعتوں کی شیرازہ بندی کی جائے اور اس طرح جمہوری طریقے پر جماعت
بندی کی جائے کہ ہر محلہ کی جماعت کی نمائندگی ہو اور ایک ہی جماعتی نظام کے تحت ساری برادری
منظم ہو جائے۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پورے شہر کو آٹھ حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا:
(۱) نیا محلہ (۲) سنوارہ (۳) بنت پورہ (۴) حریر پورہ (۵) مومن پورہ (۶) دیار منڈی
بشمول سندھی پورہ (۷) خرادی بازار بشمول قصبہ (۸) بیری میدان بشمول صحت کنواں۔

مندرجہ بالا حلقوں سے پنچ اور سرپنچ کا انتخاب کیا گیا، ایک اعزازی خزانچی اور ایک
اعزازی سیکریٹری کا تقرر کیا گیا۔ لہٰذا صدیق اکبر کو سیکریٹری اور حاجی عبدالحق کو خازن منتخب کیا گیا
اسی طرح دوسرے چناؤ میں حاجی عبدالقدیر عباس کو خازن اور جناب محمد اسمٰعیل فہمی کو سیکریٹری
بنایا گیا، سنہ ۱۹۴۲ء میں تیسرا چناؤ عمل میں آیا۔ حاجی عبدالحق کو خازن اور نعمت انصاری کو سیکریٹری
منتخب کیا گیا۔ محمد نذیر آتش بھی سیکریٹری رہ چکے ہیں۔

بیسویں صدی کے اول نصف میں جن مقتدر سردار حضرات نے برادری کی اور اپنے
حلقے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں سے یہ بحد نمایاں اور ممتاز تھے:

صوفی عبدالواحد سردار، پہلوان واصل سردار، جان محمد سردار، عبداللہ سردار، قدرت اللہ
سردار، غریب سردار، ڈھوڑا سردار، عنایت اللہ سردار، امان اللہ سردار، رمضان سردار، حمید اللہ
سردار، غلام محمد سردار، بہادر منشی سردار، صدیق سردار، عباد اللہ سردار، سلامت اللہ سردار،
دین محمد سردار، عبداللہ بنارسی جو الحاج سیٹھ محمد یعقوب انصاری کے سسرالی عزیز تھے چوراسی
کے سرپنچ اور سردار تھے۔ جو بھی برادری میں اپنا بڑا اثر رکھتے تھے۔

ہر وہ مسئلہ جو جماعت سے یا براہِ راست برادری سے عمومی طور پر تعلق رکھتا تھا اور جس سے
سارے شہر کا بالواسطہ یا براہِ راست تعلق ہوتا تھا پنچایت میں طے کیا جاتا تھا۔ اور اگر یہ
معاملہ پنچایت میں بھی نہ طے پاتا تو شہر کے سارے سرداران کی پنچایت جو چوراسی نام سے
موسوم تھی طلب کی جاتی تھی۔ بعض حالات میں اگر معاملات طے نہ پاتے تو کئی روز تک
بغیر تعطیل کے چوراسی جمی بیٹھی رہتی۔

برادری کی جماعت کے تعمیری کارنامے

مہاجرین انصار کو ہر اس بستی میں جہاں یہ آباد ہوئے دو مسئلے فوری طور پر حل طلب رہے ایک تو عبادت گاہ اور دوسرے درسگاہ کا قیام۔ چونکہ برادری کے دینی اوصاف میں سب سے بنیادی صفت پابندئ نماز تھی اسی لئے برہانپور میں بھی انہوں نے سب سے پہلے اپنی ایک ہندوستانی مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، ہر گھر پر اس وقت کے حساب سے چند آنے کا چندہ لاگو کیا گیا۔ قوم کے نوجوانوں نے حوصلوں سے کام لیا، جانفشانی اور تندہی سے اس دینی منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا موجودہ سبزی منڈی سے متصل ایک پرانی مسجد کے کھنڈر پر ایک نئی عبادت گاہ تعمیر ہو گئی تو اس کا نام ہندستانی مسجد رکھا گیا۔ مولوی منشی محمد داؤد اس کے امام مقرر ہوئے دلانکہ حق مولوی فیض اللہ کا تھا لیکن مسجد نامکمل ہی تھی کہ موت کا بلاوا آگیا۔

برادری کے میانجی، منشی اور حافظ حضرات کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں یا کارگاہوں میں فارسی اور عربی کی تعلیم دیتے تھے۔ اور لوجہ للہ بلا معاوضہ یہ عظیم دینی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں کچھ ذی شعور ہمدردانِ قوم نے مدرسہ خیر الاسلام قائم کر کے قوم کی ایک اشد ضرورت کو پورا کر دیا۔ جماعت کے اولین سرداروں کے عہد میں ہندستانی مسجد اور مدرسہ خیر الاسلام کی تعمیر صرف مومن جماعت کے چندے سے ہوئی۔ مدرسہ خیر الاسلام ابتدا میں لوہار منڈی اور چندر کلاں کے نلکے پر قائم ہوا بعد میں اہل خیر کی مالی اعانت سے ہندستانی مسجد سے متصل ایک عمارت اسی مقصد کے لیے تعمیر کی گئی۔ جن حضرات خیر نے اس کی اساس اور تعمیر میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

مولوی امانت اللہ، منشی علیم اللہ خلیق، عبدالصمد ٹھیکیدار، منشی محمد داؤد، محمد حشمت اللہ ریاضی، ماسٹر عبدالغفور، غلام مرتضیٰ ناظم، سیٹھ عبدالحق، سیٹھ حبیب اللہ، حافظ عزیز ستار اور محمد اسمٰعیل سیٹھ لوہے والے۔

اس کے بعد کئی اور مکاتب و مدارس علم و عرفان کے چراغوں سے منور ہو گئے، سنورہ مسجد سے ملحق نور الاسلام مدرسہ کو منور کرنے والے بزرگان دین تھے مولوی امانت اللہ، سیٹھ حاجی محمد یعقوب انصاری، میانجی عبدالستار اور دیگر معاونین حضرات۔ شہر کے بزرگ عالم دین مولانا غلام احمد افغانی جو مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے وہ نور الاسلام مدرسے میں درس

دینے آتے تھے بعد میں مولوی عبدالعزیز اور محسن صاحب ناظرہ پڑھاتے رہے۔ مولانا غلام محمد اخنانی ایک انتہائی قابل شخصیت کے مالک تھے اور برادری میں ان کے شاگردوں کی ایک خاصی تعداد ان کے لئے ثواب جاریہ کا وسیلہ بنی ہوئی ہے۔

جامعہ اشرفیہ اظہار العلوم (دوہار منڈی برہانپور)

برہانپور کی مشہور صوفی ہستی پیر طریقت الحاج عبدالغفور بخش اللہ شاہ اشرفی کے حلقۂ ارادت کے مریدین میں سے حاجی حفیظ اللہ سیٹھ نے حضرت پیر کی ایماء پر انہیں کے مکان سے متصل ایک قطعہ زمین کو خرید کر اپنی مالی اعانت سے اس عظیم جامعہ کی عمارت تعمیر کرائی۔ اس سے پہلے پیر صاحب کی خانقاہ میں درس و افادہ کی مسند بچھ چکی تھی جس میں مولانا محمد صدیق خیرآبادی سے بڑی رونق تھی۔ جامعہ کا سنگ بنیاد ۱۳۶۶ھ میں حضرت شاہ ابوالمحامد محدث اعظم ہند کچھوچھوی کے دست مبارک سے رکھا گیا، جب تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو اول مولانا غلام ربانی پھر مولوی عبدالتواب درس دیتے تھے رفتہ رفتہ طلبہ و درجات کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مولانا طبیب الدین اشرفی کے دور تعلیم تک عالمیت کا پہلا گروہ فارغ ہوا۔ فی الحال جامعہ میں حفظ و قرأت، تجوید، حدیث اور فقہ کے شعبہ جات بحسن و خوبی چل رہے ہیں، ہر سال فارغین طلبہ کی کامل دستگاہ حاصل ہونے پر دستار بندی کی تقریب منعقد کی جاتی ہے، مقامی اور بیرونی طلبہ کے علاوہ بیرون ہند سے بھی طلبہ کی بڑی تعداد سند فراغت حاصل کرتی ہے، برادری کے پیر طریقت بخش اللہ شاہ اشرفی کی مساعیٔ حسنہ جو اخیر عمر تک محرک رہی اس تعلیمی ادارے کو نصیب رہی اور باعث خیر و برکت بنی رہی۔ فی الحال ایک روضۃ الاطفال (موتی سری) کا اجراء سمنانی نرسری کے نام سے ہوا ہے۔ اس دارالعلوم میں فارسی و عربی ادب، علم معانی، علم بیان، علم بدیع، منطق، فلسفہ، فقہ، تفسیر اور حدیث کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام ہے۔ طلبہ کے قیام و طعام و تعلیم کا مفت انتظام ہے۔

مدرسہ فیض العلوم حمید پورہ برہانپور

برادری کی بزرگ دینی شخصیت مولوی امانت اللہ کے اخیر عمر میں مالیگاؤں کے عبدالمجید تمانی اور مولوی محمد شان نیز مقامی برادری کے حضرات نے انہیں توجہ دلائی کہ ان کے والد مولوی فیض اللہ نے دینی و علمی میدان میں جو شاندار خدمات انجام دی ہیں ان کے صدقات جاریہ کی بقا کے لئے ایک منبع علم و عرفان کی بنیاد ڈالی جائے تاکہ ان کی علمی عبقریت اور جلالت کی شان

برقرار رہے چنانچہ مولوی امانت اللہ نے بھی تجارت کی شُستی کھول دی اور ۱۳۸۲ھ میں مدرسہ فیض العلوم کھول دیا، ایک عمارت محلہ حمید پورہ میں ہے۔

مدرسہ اہلسنت غوثیہ حبیبیہ (مومن پورہ برہانپور)

برادری کے وہ افراد جو مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھے ان میں دینی جذبہ دیکھ کر حضرت نے ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالنے کی طرف توجہ دلائی، ان کے انتقال ۱۹۸۲ء کے بعد ہی یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ حاجی حفیظ اللہ سیٹھ کے دولتکدہ واقع مومن پورہ میں مدرسہ شروع کیا گیا۔ فی الوقت ڈیڑھ سو کے قریب طلبہ درس نظامی میں حفظ و قرآت، ناظرہ اور علم الحساب کے شعبوں میں زیر تعلیم ہیں، مدرسہ کی عمارت کے لیے، بیرون شہر ایک قطعہ اراضی خریدا جا چکا ہے اور تعمیری کام کا ابتدائی مرحلہ طے ہو چکا ہے۔

جامعۃ الطاہرات

طالبات کی دینی تعلیم کا مسئلہ بعض شہروں میں پیش پا افتادہ بن چکا تھا لیکن تعلیم نسواں کے حامی افراد نے پیشقدمی کر کے ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے جامعۃ الطاہرات کی بنیاد ڈالی، الحاج شوکت اللہ ابن بشیر ماموں کے مکان پر مولانا عبدالحق مہتمم و صدر مدرسہ جامعۃ الصالحات (مالیگاؤں) کے دست مبارک سے یکم جولائی ۱۹۸۶ء کو قائم کیا گیا، پانچ درجات تک تعلیم ہوتی ہے نیز اور طالبات دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی، ہندی اور اردو کتابت بھی سیکھ رہی ہیں، نیز خیاطی اور سینے پرونے اور خانگی امور کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

دارالقضاۃ

مسلمانوں کو اپنی معاشرتی زندگی میں معاملات اور معقودات سے ہمیشہ واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ معاشرت اور مناکحت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، خاندانی نظام اور سارے رشتوں کی بنیاد نکاح پر ہے اور زیادہ تر تنازعات و مسائل ازدواجی زندگی اور وراثت سے متعلق پیدا ہوتے ہیں۔ ۸ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو برہانپور میں دارالقضاۃ کا قیام عمل میں آیا اور اب تک تقریباً چار سو سے زائد مقدمات نکاح، طلاق اور خلع سے متعلق فیصل ہو چکے ہیں علاوہ ان کے تین سو پچاس ۳۵۰ فتاوے بھی صادر کیے جا چکے ہیں اس طرح اس پُرفتن دور میں دارالقضاۃ کا وجود ایک شرعی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔

دارالسرور برہانپور کے ایک بلند پایہ عالم قاضی نصیرالدین تھے، شہنشاہ جہانگیر اور بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

انصار ایجوکیشن سوسائٹی اور نیشنل ہائی اسکول

برادری نے اپنی ہر بستی میں مکاتب، مدارس اور تعلیمی ادارے قائم کر کے اپنے طلبہ وطالبات کو خود کفیل بنا دیا ہے لیکن جدید تعلیم اور عصری فنی تربیت کی طرف دھیان کم دیا گیا، انصار ایجوکیشن سوسائٹی کا قیام اسی لائحہ عمل اور عصری تعلیم کے لئے عمل میں آیا۔ اس کے صدر برادری کے بزرگ استاد ریاضی اور سیکریٹری ایڈوکیٹ حشمت اللہ انصاری مقرر ہوئے برادری میں دوسرے بزرگ محمد قاسم لطافت (عرف منو میاں) کی رہنمائی میں نوجوان طبقہ نے نیشنل اردو ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی، طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہر سال ہوتا رہتا ہے آٹھ سو کے قریب زیر تعلیم ہیں، اسکول کی تاسیس اور ترقی میں محمد نذیر اثر انصاری، عزیز الرحمٰن ابن ماسٹر عبدالغفور (مرحوم) اور مظفر حسین ضیاء انصاری (مرحوم) ایڈوکیٹ سراج انصاری، ولی اللہ انصاری، شاہ محمد انصاری وغیرہم کی مساعی جمیلہ کا بڑا دخل رہا ہے۔ رفیع اللہ سیٹھ (مرحوم) (دوجہان بیڑی فیکٹری)، امین اللہ رمضان سیٹھ، عباداللہ سیٹھ (مرحوم) حاجی ظہیر الحق ابن تیمی، ظفر پرویز وغیرہ بڑی خوش اسلوبی سے سوسائٹی اور ہائی اسکول کا نظام چلاتے رہے۔ بہت سے گئے باقی جو ہیں خدمت کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

اساطین علم وفن

دارالسرور برہانپور کے نوابغ اور نادرہ روزگار اہل علم رہے جو یا تو یہیں پیدا ہوئے یا یہیں بود وباش رکھتے تھے شیخ علی متقی بن حسام الدین (۱۵۰۷۔ ۱۴۸۰ء) کا خاندان جونپور کا تھا لیکن شیخ برہانپور میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں امراء و سلاطین کے حاشیہ نشین رہے لیکن جاذبۂ الٰہی کے صدقے، جاہ وحشم ٹھکرا کر شیخ عبدالحکیم بن شیخ باجن برہانپوری کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان سے سلسلۂ چشتیہ میں خرقۂ خلافت پایا۔ شیخ علی متقی نے سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کی ہیں ان کی کنز العمال دنیا بھر میں مشہور ہے۔ حضرت شیخ طاہر محدث، ان کے بھتیجے حضرت شیخ عیسیٰ جند اللہ، حضرت شیخ عثمان، حضرت محمد ابن فضل اللہ، حضرت مولانا نصیرالدین عرف جنید اللہ وغیرہ کے اسماء گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو

نے علوم دینیہ میں اہم تصانیف چھوڑی ہیں۔ شیخ عبدالوہاب متقی ایک زبردست محدث تھے۔ حضرت شیخ طیب نے حدیث شریف کی شرحیں لکھی ہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اُستاد اور پیر و مرشد حضرت عبدالوہاب متقی برہانپوری تھے۔

برہانپور میں فاروقی اور مغلیہ حکمرانوں نے کئی دینی درسگاہیں قائم کی تھیں۔[1] ملکہ رقیہ بیگم نے جو برہانپور کے حکمراں ہمایوں عادل شاہ کی ملکہ اور گجرات کے بادشاہ مظفر شاہ کی شہزادی تھی محلہ اتوارہ میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کرائی تھی جو بی بی کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد سے متعلقہ مکتب میں علوم دینیہ کی تعلیم دی جاتی تھی، عہد عالمگیر کے مشہور عالم دین مولانا عبدالعظیم شرح عین العلم کا درس دیتے تھے۔

محلہ بدھوارہ کی مسجد کے مدرسے میں سید شاہ امام محمد عربی کا درس دیتے تھے، ریاست حیدرآباد کے نواب ناصر جنگ نے مدد معاش کے طور پر ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جاگیر مدرسے کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی۔ جب مرہٹوں نے یہ جاگیر ضبط کر لی تو نواب بھوپال نے دو سو روپئے ماہوار کا امدادی وظیفہ جاری کر دیا تھا۔

محلہ سندھی پورہ لوہار منڈی کے علاقے میں حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ کے مدرسے میں اعلیٰ تعلیم کے درجہ تک تعلیم ہوتی تھی جس میں بیرون ملک سے طلبہ غرض تحصیل تعلیم آتے تھے۔ اس میں معقولات و منقولات کی کتابیں درس میں شامل تھیں۔ حضرت شیخ جنداللہ برہانپور کے موتی عالم اور عربی نحو کے زبردست ماہر اور معلم تھے، ان کی کتاب "تتمیم شرح مائۃ عامل" کو ہندستان کی بہترین کتاب تسلیم کیا گیا تھا، آپ کی بہترین تصنیف "تفسیر انوار الاسرار" ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کو بھی برہانپور کے اس پیر کامل سے واسطہ بہ واسطہ روحانی فیض پہنچا تھا۔

محلہ راستی پورہ میں حضرت لشکر محمد عارف باللہ کی صاحبزادی حضرت بی راستی ایک قابل معلم تھیں، ان کے درس میں بڑے عالمانہ نکات بیان ہوتے تھے، ایک مرتبہ عبدالرحیم خانخاناں جو خود ایک زبردست شاعر، منتظم اور دوست دار اہل علم و فضل تھا راستی بی کے درس میں شامل ہوا تھا۔

---

[1] مولوی معین الدین - گہوارۂ علم جادالسرور مرکز روحانیت برہانپور

برہانپور کی دینی درسگاہوں کے فارغ التحصیل علمائے وقت کی علمی عبقریت کا یہ عالم تھا کہ ان میں سے بعض کو شاہان وقت اور شاہزادگان عالی تبار کے اتالیق اور استاد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ شہزادہ اعظم ابن عالمگیر کے اتالیق ملا شیخ قطب برہانپوری اور خود شہنشاہ عالمگیر کے استاد مولانا عبداللطیف قوی برہانپوری تھے۔ اس دارالسرور برہانپور کے جید عالم ملا شیخ نظام برہانپوری تھے جن کی علمی عبقریت کا معترف شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی تدوین و تالیف کے وقت جید علماء کی انتخابی "مجلس ادارت" کے صدر شیخ نظام برہانپوری تھے اس کتاب کی ترتیب پر دو لاکھ روپے خرچ کئے گئے تھے۔

پیرانِ طریقت

پیر روشن ضمیر حضرت شاہ سعد اللہ میاںؒ

چشتیہ اور نقشبندیہ سلسلوں کی برکتوں میں ایک چاند گوندھا ہوا تھا اور ایک کہکشاں سجی ہوئی تھی۔ حضرت بہاءالدین باجن برہان الدین غریب کے جانشین تھے، سلسلۂ چشتیہ سے منسلک بڑے پائے کے اہل خلف پیدا ہوئے ہیں، نقشبندی کے طریقۂ عالیہ کو مومن برادری کے تعلیم یافتہ طبقہ میں بجید فروغ ملا لیکن سلسلۂ چشتیہ کی مشیخت و ارادت کی مسندیں ہر شہر میں قائم تھیں سلسلۂ قادریہ کو بڑی دیر کے بعد فروغ ملا۔

حضرت شاہ سعد اللہ میاں ابن حاجی سالار بخش کی ولادت موضع منڈوارہ ضلع بارہ بنکی میں ۱۲۹۰ھ میں ایک انصاری گھرانے میں ہوئی، سترہ سال کے عنفوان شباب میں پہلے مالیگاؤں میں جا کر بسے پھر اپنے برادر بزرگ شیخ شبراتی کے ہمراہ برہانپور تشریف لے آئے، شہر کے ایک دین پرور شخص عبدالستار کے یہاں مقیم رہے اس کے بعد اڈہ کی مسجد سے متصل چھوٹے خان باڑی ساز کے مکان میں سکونت پذیر ہوئے۔

حضرت شاہ سعد اللہ ایام طفولیت ہی سے مجاہدہ و ریاضت کے عادی بن چکے تھے، اذکار و وظائف اور تہجد و نوافل کا بڑا اہتمام کرتے تھے، والدہ بزرگوار کی تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام دیا، ۱۳۱۳ھ میں جب حافظ محی الدین چوکھنڈی ضلع بارہ بنکی سے برہانپور تشریف لائے تو آپ نے سلسلۂ عالیہ قادریہ شطاریہ میں ان کے دست مبارک پر بیعت کی، اپنے مرید ارادتمند کا مجاہدہ اور ریاضت دیکھ کر حضرت نے ۱۳۲۰ھ میں

خلافت واجازت سے نوازا اور شرف سجادگی سے سرفراز فرمایا۔ بہت جلد شاہ صاحب کے مریدین کا حلقہ کان پور، بمبئی، احمد آباد، گجرات، کھمبایت، دھولیہ، مالیگاؤں، بھوپور، اجین، اندور، کیشوراؤ پاٹن، دولت آباد، بان بہار وغیرہ مقامات تک پھیل گیا اور اس طرح فیضان روحانی وعرفانی ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ مطابق اپریل ۱۹۳۴ء تک تادم مرگ جاری وساری رہا۔ حضرت شاہ نظام الدین بھکاری کے آستانہ سے تھوڑے فاصلے پر آپ کا شاندار مقبرہ مرجع خلائق ہے، اسی سے متصل خانقاہ اور مسجد ہے۔

حضرت محمد یوسف شاہ المعروف مسعود شاہ مدنی (ولادت ۱۸۹۶)

اچولی ضلع بارہ بنکی کے انصاری گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ لڑکپن میں والد کے ساتھ بسلسلۂ معاش کانپور گئے اور وکٹوریہ ملز میں بنکر مزدور بن گئے۔ پندرہ سال کانپور میں رہے پھر اپنے بھائی احمد صاحب کوتوال کے پاس اندور گئے اور حکم چند ٹیکسٹائل مز میں مزدوری کرتے رہے۔ عبادت وریاضت کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ اکل حلال اور زہد وتقویٰ پر سختی سے کاربند تھے، انہیں اوصاف جمیلہ کی بنا پر ان کے بڑے بھائی احمد صاحب کوتوال اور ان کے دوست نظیر ماسٹر نے انہیں شیخ شاہ سعداللہ میاں برہانپوری کے حلقۂ ارادت میں شامل کرادیا، شیخ کی توجہ نے فوراً جاذبۂ صادقہ کو ایک نئی توانائی عطا کی اور ان کے مجاہدہ وریاضت کا یہ عالم ہوا کہ ع "آفت نرسد گوشۂ تنہائی را" کے مصداق وہ عزلت گزیں ہو گئے، کبھی نکل کر دور جنگل کی لی اور کبھی مسجد کے حجرے میں معتکف ہو جاتے۔ پیرومرشد نے جب مرید کامل کا یہ مقام اور درجہ دیکھا تو ۱۳۵۲ھ میں آپ کو منصب سجادگی عطا کی۔ آپ مدنی شاہ کے نسبت مشہور ہوئے اپنے دادا پیر محی الدین کے آستانے سے متصل ایک مدرسہ مدنی شاہ قائم کیا، پیرومرشد کا مقبرہ بھی آپ ہی نے تعمیر کرایا تھا۔

پیر حاجی عبدالغفور بخش اللہ شاہ اشرفی (۱۳۰۹-۱۴۱۴/۱۸۹۶-۱۹۹۵)

پیر صاحب کے آباواجداد مہاراج گنج یوپی سے ترک وطن کر کے آئے تھے، آپ کے والد حاجی الٰہی بخش اور بڑے ابا خدا بخش عاشق کپڑے کی سوداگری کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے حافظ محمود سے قرآن کا ناظرہ پڑھا لیکن طبیعت ادھر نہ لگی تو سنت رسول کی ادائیگی میں اپنے استاد کی بکریاں چرانے لگے اور قدیم مزارات اور خانقاہوں کے کھنڈروں کے سائے میں بیٹھ کر ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتے اور ذکر الٰہی قرب خداوندی اور محبت الٰہی کا باعث ہے۔

چودہ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ حج بیت اللہ سے مشرف ہو کر لوٹے اور پھر اگلے سال اعلیٰ حضرت الشیخ شاہ علی حسین اشرفی الجیلانی کچھوچھوی سے سلسلۂ قادریہ چشتیہ اشرفیہ نقشبندیہ میں بیعت ہوئے اور کچھ عرصے کچھوچھہ شریف کی خانقاہ میں اذکار و وظائف اور سخت مجاہدہ کرنے کے بعد خلافت و اجازت سے مالا مال ہو کر لوٹے اور مسند رشد و ہدایت پر رونق افروز ہوئے۔ شیخ ابو المقصود الحاج حضرت شاہ عبد الغفور بخش اللہ اشرفی کی علم نوازی کا سب سے بڑا ثبوت شہر برہانپور کی وہ عظیم الشان درسگاہ ہے جو جامعہ اشرفیہ اظہار العلوم کے نام سے مشہور ہے جس کے بانی و سرپرست آپ ہی تھے آپ نے اسے سنہ ۱۳۶۶ھ میں قائم کیا۔

شاہ صاحب کے مریدین کا حلقۂ ارادت لداخ، افریقہ اور سعودی عرب تک پھیلا ہوا ہے۔ آپ سخی، خلیق اور بیحد ملنسار انسان تھے۔ غریبوں کے ہمدرد تھے اور حاجتمندوں کی حاجت روائی میں بڑی سخاوت اور انشراح سے کام لیتے تھے، بہار اشرفی لوہار منڈی دروازہ سے باہر مسجد سے ملحق آپ کا مقبرہ ہے۔

برہانپور کی برادری کی ممتاز علمی، ادبی، فنی اور صنعتی ہستیاں

روایت ہے کہ کسی زمانے میں بیرون حصار برہانپور محلہ شیخ پورہ میں سات سو حفاظ قرآن تھے، برادری کی یہ روایت رہی ہے جتنے حفاظ اس میں پیدا ہوئے ہیں آج تک اس کی نظیر نہیں مل سکی۔ حفاظ کرام اور علمائے عظام برادری میں ہر دور اور ہر بستی میں پیدا ہوتے رہے ہیں، برہانپور کے ممتاز حفاظ کرام کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

حافظ نور محمد، حافظ خدا بخش، حافظ عبد الغفور، حافظ پیر محمد، حافظ محمد الیاس، حافظ امیر علی، حافظ علی احمد، حافظ نثار احمد، حافظ عزیز اللہ۔

حافظ نور محمد ولد میاں جی کلو:

نقشبندیہ کے طریقۂ عالیہ کے قطب ارشاد خواجہ سید ہاشم کشمی برہانپوری ہزاروں مریدین صادقین کے محور تھے۔ حافظ جی سب سے زیادہ دیرینہ سال اور عمر بزرگ تھے جو خواجہ صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہو سکے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے سختی سے پابند تھے اور بدعات سئیہ سے سخت نفور تھا۔ آپ جہانگیر گنج ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے اور برہانپور میں متوطن رہنے کے بعد سنہ ۱۳۵۶ میں تقریباً ایک سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حافظ خدا بخش اور حافظ عبد الغفور آپ کے دونوں صاحبزادے اور آپ کے پوتے حافظ علی احمد اور مشار احمد غرضکہ پورا خاندان حامل قرآن تھا اور یہ سعادت غالباً آپ کے خاندان کا امتیازی نشان ہے کہ تمام اولاد نرینہ پابند صوم و صلوٰۃ ہے۔ حافظ نور محمد سلف صالحین کی یادگار رہے۔

حافظ مولوی محمد فیض اللہ ابن میاں جی عبد اللہ

ضلع اعظم گڈھ سے ترک وطن کر کے دار سرور اور گہوارۂ علم برہانپور میں آکر بس گئے۔ یہاں کی برادری میں منشی اور میاں جی جو عموماً فارسی زبان میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور مراست و خط و کتابت کی خدمات بہم پہنچاتے تھے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ مولوی فیض اللہ نے محمد علی پنجابی سے جو ریاست حیدر آباد کی طرف سے جاگیرات کے محصول کی وصولیابی کے گماشتے تھے عربی و فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی اور خود استاد کے درجہ تک پہنچ گئے۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی منشی داؤد اور منشی علیم اللہ خیالی قابل ذکر ہیں۔ مولوی صاحب کا انتقال تقریباً چالیس سال کی عمر میں ہوا تدفین حضرت نذیر میاں کے احاطے سے متصل عیدگاہ قبرستان میں ہوئی۔

مولوی منشی محمد داؤد (متوفی ۱۹۵۰ء)

حافظ عنایت اللہ خیر آباد (محمد آباد گہنہ) سے غدر کے پُر آشوب زمانے میں بمبئی جانے کی نیت سے نکلے لیکن برہانپور میں کچھ ہم وطن اور کچھ شناسا دوستوں کے اصرار پر وہیں بس گئے۔ منشی محمد داؤد نے مولوی فیض اللہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کر لی اور خود مسند درس و تدریس پر جلوہ افروز ہو گئے اور شاگردوں کا حلقہ وسیع ہوتا چلا گیا جس میں مولوی امانت اللہ، مولوی احمد اللہ، مولوی قدرت، محمد قاسم لطافت، محمد حشمت اللہ ربانی، حمید اللہ جگر، مولانا محمد اسحاق حبیب اللہ سیٹھ، محمد اسمٰعیل نبی حبیب اللہ شرر، عبد القادر جاوید، محمد صدیق ذکی انصاری، ظہور حسین رمتی اور ڈھیر سارے ذی شعور اور ذی علم لوگ شامل تھے جنہوں نے منشی محمد داؤد سے کسب فیض کیا۔ درس و تدریس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ دن میں کرگھے پر کام کرتے تھے اور طلبہ کو درس دیتے رہتے — یہ طریقہ برادری کے میاں جی، منشی اور حافظ حضرات کا بڑا اپنا اور روایتی تھا، سلف کا یہ ایک مثالی کردار تھا۔ دستکار اہل شرف کا یہ علمی کمال جس میں کسب حلال کے ساتھ ساتھ فکر آں بھی دامن گیر رہتا تھا اب ہماری تاریخ کا ایک گم گشتہ باب بن کر رہ گیا ہے۔

منشی صاحب ایک ولی صفت انسان تھے۔ سو سال کی عمر پائی، تدفین حیدر پورہ قبرستان مسجد کے احاطہ میں ہوئی۔

منشی محمد فضل حسین صابر (ولادت ۱۳۰۱)

آپ کے والد مولوی شیخ فضل اللہ غازی پور سے بسلسلۂ معاش کانپور آئے یہیں محمد فضل حسین تولد ہوئے۔ پھر بچپن میں والد موصوف کے ساتھ برہانپور آکر بس گئے، حوالی شہر میں شاہ پور نامی ایک قصبہ میں شیخ فضل اللہ مسجد کے امام مقرر ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد اردو اور فارسی میں فخر الدین حاذق کے زیر تربیت کافی استعداد پیدا کرلی، فن شاعری سے دلچسپی اور شعر گوئی کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے اور اچھا خاصہ کلام تخلیق کرلیا کچھ حصہ قدیم اردو ادبی رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا رہا۔ فن تاریخ گوئی کے ماہر تھے خوشنویسی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے سنگ مرمر پر کتبہ لکھنے میں خاص مہارت حاصل تھی، آپ میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔ خواجہ احمد حسین شاہ امروہوی سے نقشبندی سلسلہ میں شرف بیعت حاصل تھا۔ فن شاعری میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ کے شاگرد اطراف برہانپور میں پھیلے ہوئے تھے۔ کثیر الاحباب اور مجلسی شخص تھے، بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کے سبب جان محفل تھے، مشاہیر اساتذہ سے فیض صحبت حاصل تھی، ۱۹۶۲ء میں انتقال ہوا حیدر پورہ قبرستان مسجد کے احاطے میں دفن ہوئے۔

منشی عنایت اللہ برہانپوری

علوم قرآنی میں کافی استعداد رکھتے تھے، بڑے خوش الحان قاری تھے علم تجوید میں بھی ماہر تھے میلاد شریف کی مجالس میں نعتیہ کلام بڑے سوز وگداز سے پڑھتے تھے۔ کئی مکاتب میں درس قرآن کے لیے جاتے تھے۔ شاعری سے بھی تعلق تھا لیکن نعتیہ قصائد اور منقبت میں تخصیص کرتے تھے۔

ہدایت اللہ عرف حکیم بابو: (ولادت ۱۳۱۲ھ)

سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ سے منسلک تھے۔ برہانپور کے اطراف میں خاندیس، برار اور جنوبی ہند تک مریدوں کی تعلیم و تبلیغ کے لیے جاتے تھے۔ عملیات اور تعویذات میں دسترس رکھتے تھے، درویشانہ وضع قطع اور مجذوبانہ حالت میں رہتے تھے اسی لیے حکیم بابو کو لوگ "بابا" تسلیم کرتے تھے۔

سیٹھ محمد ابراہیم سیٹھ الٰہی بخش (ولادت ۱۳۲۲ھ)

آپ میونسپلٹی کمیٹی برہانپور کے کامیاب اور ہر دلعزیز ممبر تھے۔ حضرت خواجہ سید ہاشم کے بڑے معتقد تھے اور ان کے عرس پر غرباء و مساکین اور زائرین کو کھانا کھلاتے تھے، ہر کارِ خیر میں پیش پیش رہتے۔ سیرت کمیٹی برہانپور کے خازن اور نائب صدر تھے۔

حاجی منشی محمد علیم اللہ ہلالی (ولادت ۱۲۹۲ھ)

آپ عابد و زاہد، مجاہد، مرتاض اور صلح کل بزرگ تھے۔ فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، ذکر الٰہی میں شبانہ روز مشغول رہتے، تصوف کے کئی منازل طے کر چکے تھے۔ آپ سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ پیر طریقت سے خلافت بھی ملی تھی حضرت علی حسین میاں ساکن کچھوچھہ شریف سے بھی آپ کو بیعت و خلافت حاصل تھی لیکن آپ مریدگی سے کنارہ کش تھے۔

سیٹھ حاجی محمد یعقوب ولد سیٹھ نور محمد انصاری (ولادت ۱۳۰۵ھ)

مبارکپور اعظم گڈھ کی مردم خیز سرزمین میں نور محمد انصاری کا خاندان تجارت اور سخاوت میں نوز علی نور تھا، بڑے کریم النفس اور سخی داتا تھے، حاجی محمد یعقوب انصاری بمبئی میں پیدا ہوئے، برہانپور میں بسے۔ یہیں ایک شاندار دینی زندگی گذار کر پیوند خاک ہوئے جیونڈی تک ان کی قربت داری، دوستی اور حسن سلوک کے تانے بانے پھیلے ہوئے تھے، پارچہ بافی کی صنعتی روایت کو انہوں نے اور ان کے بعد ان کے صاحبزادوں اور پوتوں نے بڑی حد تک برقرار رکھا۔ سنوارہ دروازہ کی مسجد کی تولیت آپ کے سپرد تھی محلے کے نادار خاندانوں کی مالی استعانت اور کفالت کرتے تھے۔ اہل برادری اور اہل خیر کے مالی تعاون سے اور نیز خود اپنے جیب خاص سے ایک مدرسہ مذکورہ مسجد کے متصل نہایت پختہ تعمیر کرا کے علم دین کا چراغ روشن کیا، مولانا مولوی غلام احمد امام مسجد اس مدرسہ نور الاسلام کے معلم اور استاد تھے۔

آپ کے صاحبزادگان میں محمد یوسف ریاضت اور محمد صدیق ذکی بڑے خوش فکر شاعر تھے۔ محمد حنیف اور محمد یونس تاجر اور کارخانہ دار تھے۔

مدرسین و معلمین:

غلام مرتضیٰ ناظم مدرسہ خیر الاسلام میں مدرس تھے، بڑے قابل استاد تھے، شعری ذوق رکھتے تھے اور ناظم تخلص تھا، پرائمری ٹیچروں میں ولی اللہ نور محمد انصاری، اقبال جعفری، محمد اختر محمد

اسماعیل سیٹھ اور محمد ایوب محمد اسماعیل سیٹھ کے اسماء گرامی خاص ہیں۔ عبدالحفیظ نقشبندی (بی۔ اے) ابتدا میں کچھ برسوں مالیگاؤں میں مدرس رہے بعد میں حکیمیہ کارونیشن ہائی اسکول برہانپور میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر نیشنل ہائی اسکول سے وابستہ ہو گئے۔

سعید اختر محمد عاقل (ایم اے بی ایڈ) نیشنل ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

برکت اللہ عنایت اللہ ایم اے ہیں اور محمد یونس یٰسین مقادم بھی یہی ڈگری رکھتے ہیں لیکن آبائی پیشہ میں مصروف ہیں۔

عزیز اللہ حاجی حفیظ اللہ انصاری (بی اے بی ایڈ) اردو ہائی اسکول میں مدرس ہیں اور تقریباً دو دہائی سے درس و تدریس میں مشغول ہیں۔

ڈاکٹر محمد عثمان (پی ایچ ڈی) سیوا سدن کالج میں لیکچرار ہیں۔

محمد حنیف ندوی فیض العلوم میں درس دے رہے ہیں اور مفتی محمد علی محمد ایوب دیوبندی بھی اسی مدرسہ میں مسند درس و افادہ پر رونق افروز ہیں اور دارالقضاۃ سے متعلق امور انجام دیتے ہیں۔

مولانا مختار قاسمی: دیوبند سے فارغ ہیں، آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے عربی میں ایم۔ اے کیا ہے ۔ اور آر، آر، ایم پی کی سند پریاگ یونیورسٹی الہ آباد سے لی ہے، طبیہ کالج برہانپور میں لیکچرر تھے۔ حکمت و طبابت بھی کرتے ہیں اور مسجد خانقاہ کے خطیب ہیں۔

پیرزادہ عبدالرشید اشرفی: ناظم اعلیٰ مدرسہ اشرفیہ اظہار العلوم برہانپور کے عہدہ پر سرفراز ہیں، درس بھی دیتے ہیں، آپ جامعہ عربیہ ناگپور کے فارغ ہیں۔

نصرت اللہ ہدایت اللہ ایم ایس سی کر کے نیشنل ہائی اسکول میں مدرسی کر رہے ہیں، ذوالفقار ظفر عباس ایم۔ اے ہیں اور مالیگاؤں میں مقیم ہیں، عزت اللہ شوکت ایم۔ اے۔ بی ایڈ ہیں اور درس و تدریس پیشہ ہے۔ مشتاق احمد حمید اللہ سردار مقامی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔

مظہر الحق عبدالرؤف انصاری (بی ایس سی بی ایڈ): برہانپور میں کچھ عرصہ مدرس رہے بلڈانہ میں تقریباً پندرہ سال سے پڑھا رہے ہیں۔

ماسٹر کلیم اللہ ابن خیال: برہانپور میں مدرس تھے اس کے بعد کو آپریٹیو سوسائٹی سے منسلک رہے عرصے سے پاکستان میں مقیم ہیں، بچوں نے کاروباری سلسلہ قائم کر رکھا ہے اب مستقل طور پر بس گئے ہیں۔

انصاری سیاسی مدبرین

مومن برادری کا دانشور اور علمی طبقہ ہمیشہ سے جنگِ آزادی کا ہراول دستہ بنا رہا، کانگریس کی خلافتی تحریک میں اس طبقے نے بڑی سرفروشی دکھلائی تھی آج بھی اس پارٹی میں اور جمعیۃ العلماء میں مومن برادری کے اکابرین پیش پیش نظر آتے ہیں۔ مومن کانفرنس نے بھی اس کے قیام کے اولین دور سے لے کر آج تک کانگریس کا ساتھ دیا ہے۔ برہانپور میں برادری کے ممتاز اکابر سیاست یہ لوگ تھے:

عبدالصمد ٹھیکیدار: برادری کے سن رسیدہ اور تجربہ کار سیاستداں تھے خلافت تحریک اور کانگریس پارٹی کے سرگرم رکن تھے، ان کی ٹھیکیداری میں ۱۹۱۲ء میں رابرٹسن ہائی اسکول، اردو ہائی اسکول اور سرکاری اسپتال کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔

محمد قاسم لطافت عرف منو میاں کانگریس کے دیرینہ رکن اور اپنے وقت میں اس کے صدر بھی رہ چکے تھے ۱۹۲۹ء میں مومن کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت کی تھی، سوت رنگائی کا کارخانہ تھا۔ برادری کے لیے، ایک سیاسی رہنما، معاشرہ کے لیے مشعل اور عوام کے لیے سماجی خادم کی حیثیت کے حامل تھے۔

ماسٹر عبدالغفور پاورلوم کی صنعت کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں، کانگریس کے فعال رکن تھے۔

محمد یعقوب شیخ وزیر ہارون: سماجی اور سیاسی ورکر تھے، کانگریس کے سرگرم رکن تھے، ہوب کے نام سے مشہور تھے۔ آبا و اجداد شیخ پور کے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن انصاری: اس نام کی کئی سیاسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں، مولانا کا آبائی وطن تھا پہلے سوشلسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ سوشلزم تو خوب بن کر رہ گیا پارٹی پارہ پارہ ہو گئی لیکن حفظ الرحمٰن انصاری کی لال ٹوپی ہنوز سربلند دکھائی دیتی ہے سیاسی سرگرمیوں کے روح رواں ہیں اور برادری کے کاموں کی سربراہی اور تنظیم آپ ہی کے سپرد رہتی ہے پارچہ بافی میں بھی سرخروئی حاصل ہے۔

سیٹھ محمد امین حاجی عبدالحمید: مالیگاؤں سے تعلق تھا، برہانپور سے تعلق خاطر تھا۔ کٹر کانگریسی تھے اور کانگریسی امیدواروں کے لیے، الیکشن میں پیش پیش رہتے تھے۔

محمد ابراہیم ممبر: تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگی تھے، میونسپل کمیٹی کے الیکشن اسی پارٹی سے

رٹے تھے، دیورس سوسائٹی کے صدر رہے۔

نور محمد صدر: تقسیم ہند سے پہلے مسلم لیگ کے سرگرم رکن اور برہانپور شاخ کے صدر تھے۔ نور محمد صدر مشاہیر برہانپور میں سے تھے اور برادری کی بڑی ممتاز شخصیت تھے۔

سیٹھ احمد ولد ابراہیم (ممبر): میونسپل کمیٹی برہانپور کے پہلے ڈپٹی میئر تھے، کم عمری میں انتقال ہوا۔

محمد اسماعیل ہاشمی ابن محمد ابراہیم (ممبر): موجودہ مسلم لیگ سے منسلک ہیں۔ سیاسی سرگرمیوں میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیتے ہیں۔

چراغ الحق سلامت اللہ سردار: کانگریس کے بے لوث اور مخلص سرگرم ممبر ہیں۔ برادری کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور بہی خواہ ہیں۔

سماجی ستون

عبدالرحیم ضیاء انصاری: مزدور تحریک کے رہنما تھے "تانگہ یونین" بیڑی مزدور یونین کے لیڈر تھے، سماجی ورکر ہونے کے سبب مقبول اور ہردلعزیز لیڈر تھے۔

مظفر حسین ضیاء انصاری: برادری کے تعلیمی اور سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے تھے اور اصلاحی اداروں سے متعلق تھے۔

ظفر پرویز علی احمد انصاری: اشتراکی خیالات کے حامل اور کمیونزم کی طرف مائل تھے۔ انصار ایجوکیشن سوسائٹی کے سرگرم رکن تھے۔

عزیز الرحمٰن ابن ماسٹر عبدالغفور: تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے انصار ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکریٹری رہ چکے تھے۔

حاجی عبدالحق انصاری: مدھیہ پردیش پاورلوم فیڈریشن کے ڈائریکٹر تھے، انصار مومن جماعت کے سردار اور جماعت کے خازن بھی رہ چکے تھے۔ برہانپور نگر پالیکا کے نائب صدر ہونے کا شرف حاصل تھا، کانگریس (آئی) پارٹی کے اہم رکن رہ چکے تھے۔

محمد یعقوب صادق: مشہور ومعروف اور ہردلعزیز سماجی کارکن اور کانگریس (آئی) کے رہنما ہیں، محلہ بیری میدان سے کئی بار منتخب ہو چکے۔ نگر نگم کے کارپوریٹر تھے آپ ڈپٹی میئر بھی رہ چکے ہیں، فیض العلوم کے بارہ سال سے ناظم اعلیٰ تھے۔

عبدالرب محمود الحسن (بی کام) انجمن ترقی اردو کے نائب صدر تھے، مدرسہ فیض العلوم

اور سیرت کمیٹی سے وابستہ ہیں، مسلم پرسنل لاء بورڈ شاخ برہانپور کے رکن تھے، کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں۔ اسمبلی الیکشن بھی لڑ چکے ہیں۔

محمد ہارون ابن محمد امین انصاری سیٹھ (سابق ایم ایل اے) : ۱۹۸۰ء میں کانگریس پارٹی سے ایم۔ ایل۔ اے کے انتخاب میں کامیاب ہوئے۔ شہری خدمات میں ایک نمایاں کردار ادا کرتے رہے اور کئی تاریخ ساز فلاحی کام انجام دئے، بُنکر جماعت کے لئے کئی نمایاں کارنامے سرانجام دئے، ۱۹۸۵ء میں آل انڈیا مومن کانفرنس مدھیہ پردیش کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے۔

منظور حسین انصاری : محلہ حیدرپورہ برہانپور کے ہردلعزیز سماجی ورکر ہیں، کانگریس (آئی) کے سرگرم رکن ہیں اور نگر نگم کی رکنیت حاصل ہے۔ قومی خدمات انجام دینے میں پیش پیش رہتے ہیں۔

محمد حشمت اللہ انصاری (ایڈوکیٹ) : ہمیشہ کانگریس کے مخلص سرگرم رکن رہے۔ شہر کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، انصار ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر اور سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

کامریڈ محمد داؤد ابن غلام محمد سردار : کمیونسٹ پارٹی کی باقیات میں سے ہیں، برادری کے سماجی، سیاسی اور اصلاحی پروگراموں اور امور میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں۔

کامریڈ شبیر احمد مرحوم : کمیونسٹ پارٹی سے متعلق تھے، سماجی خدمات انجام دیتے تھے۔

معین اختر ابن مولانا حفظ الرحمٰن انصاری : وقف بورڈ بھوپال کے ممبر ہیں، شہر کے اوقاف کے تعلق سے آپ کی کارکردگی تحسین طلب ہے۔

رسول بخش سیکریٹری : کوآپریٹیو سوسائٹیوں سے منسلک ہیں، پکے کانگریسی ہیں برادری کے لئے ایک دردمند دل رکھنے والے فرد ہیں۔ فلاحی و سماجی خدمت میں پیش قدمی کرتے ہیں۔

نعیم اختر، میونسپل کاؤنسلر : سماجی ورکر ہیں، میونسپل کمیٹی کے ممبر ہیں اور پبلک کی خدمت کر رہے ہیں۔

محمد حسن چھوٹے سیٹھ : آپ ڈپٹی میئر رہ چکے ہیں، ایک کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں۔

صدیق اکبر سعداللہ : برادری کے بہت سے سماجی اور سیاسی امور سے منسلک رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔

شفیق الرب الحسن : تعلیمی اور صنعتی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

حفاظت حسین ابن صابر: بڑے اچھے خطاط ہیں، والد بزرگوار سے کتبہ نویسی کا فن وراثت میں ملا ہے، کوآپریٹیو سوسائٹی سے ایک عرصہ تک منسلک رہے۔

مشتاق احمد نور محمد صدر: امداد باہمی اور کوآپریٹیو سوسائٹی کے کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان اداروں سے منسلک ہیں۔

مرحوم محمد نذیر انصاری ابن خلیل احمد: اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں راقم کے معاصر تھے۔ جوناگڑھ کے بہار الدین کالج کو چھوڑ کر آئے تھے۔ برادری کے پہلے ایم۔ اے تھے۔ صنعت پارچہ بافی سے تا عمر منسلک رہے۔

حاجی اسیر مکی برہانپوری (بمبئی): بمبئی میں اکسائز ڈپارٹمنٹ میں مختلف عہدوں پر سرفراز رہ کر ملازمت سے سبکدوش ہو کر واپس اپنے وطن میں مقیم ہیں۔

مولوی بدرالدین: جماعت اسلامی شاخ برہانپور کے بانی ہیں۔ کامیاب صنعتکار رہے۔

محمد نذیر آتش انصاری: کھدر پوش کانگریسی ہیں، انصار ایجوکیشن سوسائٹی کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں، سیاسی امور میں بھی نمایاں طور سے منسلک ہیں۔

مولوی ظہیر حسین رتنی: آپ کے والد ڈاکٹر عبدالرحیم اپنے وقت کی مشہور شخصیت تھے۔ مولوی رتنی، فارسی اور عربی زبانوں میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اہل تشیع میں سے تھے لیکن نسبت پارچہ بافی سے تعلق رکھتے تھے رتنی تخلص سے آپ کی شاعری کی طرف نسبت اور رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ ریاضی صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ کوآپریٹیو سوسائٹی کے عرصہ تک سیکریٹری رہے۔

حاجی امین اللہ ابن مولوی امانت اللہ (میاں سیٹھ): برادری کے معزز اور متمول روساء شہر میں سے ہیں سماجی، سیاسی، تعلیمی اور دینی کاموں میں نمایاں حصہ لیتے ہیں، انصار ایجوکیشن سوسائٹی نیشنل ہائی اسکول اور مدرسہ فیض العلوم سے منسلک رہ کر احسن طریقے پر خدمت کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دولت بھی دی ہے اور صدقات و خیرات کا جذبہ دینی بھی عطا فرمایا ہے۔ محدث جلیل ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے آپ ہی کے اہتمام سے مولانا مرحوم کی دستکار اہل شرف: تذکرہ نساجین چھپی ہے اب برہانپور کے مشہور شاعر جاوید انصاری مرحوم کی تاریخ برہانپور شائع کرا رہے ہیں۔

حشمت اللہ حاجی حفیظ اللہ انصاری: ۱۹۵۷ء میں اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری

سے بی۔ایس۔سی کیا، راقم کے لیکچر رشپ کے آخری زمانے کے طالب علم تھے۔ بحد خلیق، یار باش، اور زندہ دل نوجوان ہے، پانچ سال مولانا آزاد ہائی اسکول میں پڑھانے کے بعد اچکلوا اردو ہائی اسکول جلگاؤں میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کے عہدے سے ۱۹۹۲ء میں سبکدوش ہوکر اب اپنے وطن میں انصاری اردو پریس قائم کیا ہے۔ نیشنل ہائی اسکول کے امور سے دلچسپی لیتے ہیں۔

برادری کے وکلاء

وکیل ہماری معاشرتی نظام زندگی کا قانونی مشیر اور رہبر ہوتا ہے۔ کبھی حکم اور کبھی ثالث بن کر منصف بن جاتا ہے اور کبھی قانونی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے خود اپنے موکل کے لئے عقدہ لاینحل بن جاتا ہے۔

محمد حشمت اللہ انصاری: بڑے عرصے سے پریکٹس کر رہے ہیں، بڑے کامیاب وکیل ہیں۔

سراج احمد ابن پیر محمد انصاری: تقریباً پچیس سال سے پریکٹس کر رہے ہیں، تعلیمی اور سماجی اداروں سے متعلق ہیں، برادری کے کاموں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

محمد خلیل ابن مولانا حفیظ الرحمٰن انصاری: برادری کے پہلے ایل ایل ایم ہیں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے یہ امتحان پاس کیا، شہر کے سماجی امور اور فلاحی اداروں سے منسلک ہیں، اوقاف کے معاملات میں سرکار کی طرف سے تقرر ہوا ہے۔

عبدالرحیم کاردار: حاجی عبدالقادر کے صاحبزادے ہیں کافی عرصے سے وکالت کا پیشہ کر رہے ہیں اور کامیاب وکیل ہیں۔

برکت اللہ حاجی حفیظ اللہ انصاری (بی اے بی ایڈ ایل ایل بی): شہر کے ایک کامیاب وکیل ہیں، برادری کی خدمت اور صنعت کو ترقی دینے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

سلیم اللہ رفیع اللہ (دو بھائی بیڑی)، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروردہ ہیں، کاروبار سے بھی برابر دلچسپی رکھتے ہیں۔

عبید اللہ مطیع اللہ انصاری: برادری کے نوجوان اور ابھرتے ہوئے وکیل ہیں۔

ڈاکٹر حضرات

ڈاکٹر اقبال احمد انصاری (ایم بی بی ایس): ادبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، بڑے

کامیاب ڈاکٹر ہیں، اسماعیل یوسف کالج کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۳ء سے نیویارک (امریکہ) میں میتھوڈسٹ ہاسپٹل میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

محمد اقبال نذیر انصاری: برہانپور طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس پاس کرکے برسوں سے اپنا دواخانہ چلا رہے ہیں کچھ مدت طبیہ کالج میں لیکچرر بھی رہے۔

محمد مظہر محمد یونس: نیا محلہ میں مطب ہے، پولٹری فارم بھی چلاتے ہیں۔

محمد کلیم ابن عزیز (ممبر) (بی یو ایم ایس)۔ طبیہ کالج برہانپور سے سند لے کر اپنے محلہ میں مطب چلاتے ہیں۔

ممتاز احمد ارشد احمد: آپ بھی طبیہ کالج کے فارغ ہیں، پریکٹس کر رہے ہیں۔

مس نسیم اختر شبیر کار یڈ اور خالدہ بن محمد ایوب انصاری: یہ دونوں خواتین طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس کرکے امراض نسواں کے علاج کے لئے اپنا اپنا مطب چلا رہی ہیں۔

مقبول حسین مظفر حسین انصاری: جانوروں کے (ویٹیزی) ڈاکٹر ہیں برادری کے واحد ڈاکٹر ہیں جو اس علاج میں تفرد رکھتے ہیں۔

برہانپور میں حکیم امان اللہ (لوہار منڈی)، حکیم محمد شفیع (چنبیلی کنواں) حکیم چراغ (جراح) (مومن پورہ) حکیم عباد اللہ عاقل (جراح) (مومن پورہ)، ڈاکٹر عبدالرحیم ابن لالو سیٹھ (حریر پورہ) ڈاکٹر حکیم اللہ حیرت ابن خیالی (مومن پورہ) وغیرہ بڑے مقبول حکیموں کے نام ہیں۔

برہانپور کے انصاری سخن سرایان

قدیم اردو کا قافلہ اردوئے معلی کے پڑاؤ سے نکلا اور سلاطین دکن کی چھاؤنی میں پہنچا تو اس کے رنگ وروپ میں تبدیلی آگئی دکنی اردو پر مہاراشٹری پراکرت کا سایہ پڑنے لگا، روزمرہ کی بولی بھی کہیں خاندیشی اور کہیں حیدرآبادی کا روپ دھارن کرلیا، اہل علم اور مہذب طبقہ جو شمالی ہند سے آکر آباد ہو گیا تھا، ٹکسالی زبان میں کلام کرتا تھا اور لکھتا تھا۔ اردو کے تدرقامت کا عالم وہی رہا کہ

بہر طرزی کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

دکن کی نغمہ بار فضا میں جہاں خانقاہوں میں سماع کی وجد آفریں قوالیاں، نعتیں اور صوفیانہ غزلیں گونجتی تھیں اور سلاطین و امراء کی شبستان طرب ونشاط سے مطربان خوش آہنگ

کی موسیقی کے سُر اٹھتے تھے۔ وہاں ایسے زود رس گوش ماحول میں اردو شاعری کا ارتقاء ہوا تو ساری شاعری غنائیت اور نغمگی سے بھر پور اور سرشار ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی اولین شاعری میں پازیبوں کی جھنک، گھنگھروؤں کی چھنک اور لَے اور سُر کی مٹھاس بھری ہوئی ہے۔ موسیقی کو عروج اسی خطے میں ہوا، جونپور کے شرقی بادشاہوں نے ہندستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا، اسی عہد میں خیال عام طور پر مقبول ہوا، دکن کے بہمنی، پھر نظام شاہی، قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلاطین کا ذوق و شوق شعر و موسیقی میں تسکین پانے لگا، ظہوری اپنے مربّی ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی کا جگت گورو کہتا ہے، محمد قلی قطب شاہ کی دکنی شاعری میں بھاگ متی کے ناچتے قدموں کے گھنگھروؤں کی جھنکار سنائی دیتی ہے، مالوہ کے باز بہادر کو روپ متی کے عشق نے ہندی کا شاعر بنا دیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو جلوے ہیں اور ایک ہی سرگم کے دو سُر، شعر جب نغمہ بن جاتا ہے اور نغمہ جب بے حرف و بے لفظ شعر — تو دونوں سننے والوں کے بربطِ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں اور مسرت و انبساط، یا غم و اندوہ کے جذبات و احساسات پیدا ہوتے ہیں، موسیقی کا فن تو الحان اور لَے کے اجزا کو وزن اور تناسب کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے، اسی طرح شاعر بھی الفاظ و معانی کے اجزا کو حسنِ ترکیب کے ساتھ باہم جوڑ دیتا ہے ؎ تو حنا بستی و من معنیٔ رنگیں بستم۔

یہی وہ معانی ہیں جو موسیقی کے سُروں میں ڈھل جائیں یا شعر میں گھل جائیں تو غالب کے "صریرِ خامہ کا نوائے سروش" بن جاتے ہیں، امیر خسرو کے مجتہدانہ اختراعات میں نمود کیے ہیں قول، ترانہ، سوہلہ، سازگری وغیرہ انہیں کی اختراعات ہیں، برہانپور، پونہ، مالوہ، اندور، اُجین اور کامٹی کے شعرا کا کلام ملاحظہ فرمائیں تو غنائیت اور نغمگی سے بھرپور اور معانی سے معمور پائیں گے۔

برہانپور کے انصاری شعراء

قدیم اردو (ہندوی) کی ایک اولین جھلک شیخ سعدی دکنی کے اس شعر میں ملتی ہے۔

سعدی غزل انگیختہ، شیر و شکر آمیختہ
دُر ریختہ دُر ریختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

یہ برہانپور آباد ہونے سے قبل اس کے مضافات میں سکونت پذیر تھے۔ اور جب یہ

تاریخی شہر دار السرور برہانپور بہار، مدینہ باجن جن کی ملفوظات 'خزائنِ رحمت' کے نام سے مشہور ہے۔ اردو میں صوفیانہ اشعار کے اولین شعرا میں شمار ہونے لگے۔

باجن جب لگ ہے دم — تب لگ رہے قدم

یہ نقش کیا کس سے ملتی ہے — جب ملتی ہے تب جھلتی ہے

شاہ سعد اللہ گلشن برہانپور کی اردو شاعری کے ابو الشعرا ہیں ولی دکنی اور دہلی میں خواجہ ناصر عندلیب آپ کے شاگرد تھے۔ اسی سلسلے سے جڑے ہوئے مشاہیر شعرا کی ایک بڑی کھیپ اردو شاعری کی بقاء کی ضامن بن گئی ہے، خواجہ میر درد، شاہ نصیر، ذوق، حکیم مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر، مولوی محمد حسین آزاد، حضرت داغ، نوح ناروی اور علامہ اقبال جیسے نامور شعرا آسمان ادب کے ستارے بن گئے۔ صائب تبریزی جب برہانپور آئے تو یہاں کے فارسی شعراء کے کمال ادب کی مدح میں ایک ادبی قصیدہ لکھا جس میں برہانپور کو کھرے کھوٹے کی کسوٹی 'دار العیار' قرار دیا ہے۔

منشی محمد علیم اللہ خیالی (ولادت ۱۸۶۹ء)

برہانپور کے جاوید نصاری کی تصنیف "سلکِ گہر" شعرائے کرام کے احوال و کوائف اور ان کے منتخب کلام کا "شعری بار" ہے یہ وسطی ہند کے شعر و ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے، اس شہر کے آسمانِ سخن کا سب سے روشن ستارہ منشی محمد علیم اللہ خیالی کی شخصیت ہے۔ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے تذکرۂ علمائے مبارکپور میں ان کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ان کا تذکرہ 'خم خانۂ جاوید' مصنفہ لالہ سری رام دہلوی نے بھی صراحت سے کیا ہے (دیکھئے باب کارگہ شعر و سخن و علم و عمل)۔

۱۹۰۳ء میں استاد نے دورۂ برہانپور کے وقت اپنا جانشین مقرر کیا۔ تحت اللفظ میں بڑے دلکش انداز میں مشاعروں میں کلام سناتے تھے، ایک کل ہند مشاعرہ کے مصرعۂ طرح پر گرہ لگائی تو آپ کی برجستہ گوئی مسلم ہو گئی۔ مصرع طرح یہ تھا "زندگی کا مزہ گناہ میں ہے۔" آپ نے برجستہ گرہ لگائی ؎

کوئی رحمت میں کہہ گیا ہوگا — زندگی کا مزہ گناہ میں ہے

له راہِ ادب جولائی ۱۹۸۵ء۔ مضمون ڈاکٹر تنویر احمد علوی (صدر شعبۂ اردو جامعہ کالج جامعہ ملیہ دہلی)

شاگردوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا، ہلالی، فہمی، شرر، حیرت، نافل، فلسفی، ذکی، ریاضت، ناظر، مضطر اور شوکت ارشد تلامذہ تھے۔ آپ کے برادر خورد حضرت ریاضی آپ کے جانشین بنے، مقامی شاگردوں کے علاوہ خاندیس، برار اور وسط ہند میں جبلپور، ناگپور، کامٹی، بمبئی اور جالنہ تک شاگردوں کی بڑی تعداد موجود تھی، تحریک خلافت سے بھی وابستہ رہے۔ سیاسی اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ "دورِ جدید" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں رحلت فرمائی۔ حمید پورہ قبرستان کی مسجد کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ حضرت ریاضی نے قطعہ تاریخ کہی ؎

گسستہ قضا رشتۂ زندگی	کسی را کہ او دُر مضمون بسفت
بمن دل شکستہ بہنگام فکر	چنین یادِ دارم کہ ہاتف بگفت
ریاضی بہ ریافت سالِ وفات	کسی کہ مزارِ خیالی بجست

۱۳۷۲ھ

ڈاکٹر حکیم اللہ حیرت اور کلیم اللہ خیالی آپ کے صاحبزادے تھے۔

منشی علیم اللہ کا ایک شعر ہے ؎

آہ صہبائے تمدن کا جہاں کل دور تھا
اب وہاں ٹوٹے ہوئے ملتے ہیں پیمانے بہت

منشی صاحب کانگریس اور خلافت تحریک کے سرگرم رکن تھے۔

محمد حشمت اللہ ریاضی (۱۸۹۰ء-۱۹۷۰ء)

مبارک پور آبائی وطن تھا۔ گھرانے میں علم و فضل اور شعر و سخن کا چراغ روشن تھا۔ بڑے بھائی منشی محمد علیم اللہ خیالی کے زیر سایہ قرآنی تعلیم اور اردو فارسی میں استعداد حاصل کی۔ لیکن جب برادر معظم چند معاشی وجوہ کے سبب کھنڈوہ چلے گئے تو بقیہ تعلیم کی تکمیل مولوی محمد منشی داؤد کے پاس ہوئی۔ شعر گوئی کے لئے طبع موزوں تھی، ماحول بھی شعری ذوق سے معمور تھا، ۱۹۰۹ء تک مڈل اسکول میں پڑھتے رہے پھر بوہرہ حضرات کے قائم کردہ قادریہ پرائمری اسکول اور سیفی بوہرہ پرائمری اسکول میں مدد مدرس کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ۱۹۱۹ء کے جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد ہندوستان میں جنگ آزادی کا جذبہ اور ولولہ پھر عود کر آیا۔ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس، تحریک خلافت اور مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی ہوئے ان میں برہانپور کی نمائندہ جماعتیں بھی شریک رہیں اور ایک جماعت کے نمائندہ رکن ریاضی صاحب تھے۔ جب ترکِ موالات کی تجویز پاس ہوئی تو انھوں نے سرکاری ملازمت کو ترک کر دیا لیکن کمانے کے لئے روزگار کی تلاش میں کھنڈوہ چلے گئے۔

تصنیف و تالیف کا شوق تھا، اسی لگن میں منشی سطیع اللہ راشد کی معیت و اشتراک میں تاریخ برہانپور مرتب کرتے رہے، کام تکمیل تک پہنچا لیکن ہنوز زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اقلیم شاعری کے بادشاہ تھے، ارشد تلامذہ صف باندھے کھڑے رہتے، فہمی، فاتق، رضی، جاوید، شرر، اثر، نعمت انصاری، ڈاکٹر شیخ فرید، ماسٹر عبدالعزیز ٹھیکیدار (بی۔ اے) آپ کے مخصوص شاگردوں میں سے تھے، حلقۂ تلمذ مالیگاؤں تک پہنچا ہوا تھا، شاعری کے علاوہ ان کے تلامذہ فارسی میں بھی ان سے استفادہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں بڑے بھائی خیالی کے انتقال کے بعد استاد حاذق اور ایک دوسرے بزرگ استاد راغب نے آپ کو برادرِ معظم کا جانشین قرار دیا۔ ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا اور اسی قبرستان میں دفن ہوئے جہاں اُن سے پہلے شہر کے نامور شعراء اور مشاہیر علماء سپردِ خاک ہوئے تھے۔ آپ کے جانشین حضرت فاتق نے تاریخ وفات کہی۔

حق مغفرت کرے کہ ریاضی پاکباز
عالم تھے بے مثال تو شاعر تھے بے بدل

گفتار کے بھی نیک تھے کردار کے بھی نیک
انسانیت کے دین کا مظہر تھا ہر عمل

خوددار طبع پختہ دل و مستقل مزاج
صائب ہر ایک رائے تھی ہر فیصلہ اٹل

فاتق سرِ مزار میں حاضر تھا ایک دن
تھی فکر ہو وفات کی تاریخ برمحل

یہ کہہ کے میرے پاس سے عبرت گذر گئی
زیرِ زمیں وہی ہے جو رفعت نشاں تھا کل

۱۹۷۶

محمد حشمت اللہ ریاضی خود اپنے بارے میں فرما چکے ہیں ؎

ہر سکوت ہے موقوف گفتگو سب کا
میں چپ ہوا تو زمانہ ہوا ہے ہم آواز

ریاضی مرض تمنا نہ کر سکے ان سے
کھلے جو لب تو مری گھٹ کے رہ گئی آواز

منشی محمد اسماعیل فہمی (۱۹۰۴-۱۹۷۳)

آپ کے جدِ امجد شیخ سبحانی غدر کے رستاخیز زمانے میں ضلع اعظم گڈھ سے ہجرت کر کے دار السرور برہانپور آ گئے۔ فہمی صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ خیر الاسلام میں ہوئی فارسی علامہ احمد افغانی اور مولوی منشی محمد داؤد سے پڑھی۔ حضرت خیالی اور حضرت ریاضی سے شعر و سخن میں کسبِ فیض کیا اور شاعری کے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے، تحت میں بڑی دلکش آواز میں پڑھتے تھے۔ برادری کی بہبود کا خاص خیال رکھتے تھے اور جماعتی نظام کی اصلاحات کے پروگراموں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے۔ شہر کی سیاست میں بھی سرگرم رہتے تھے۔ کٹر کانگریسی تھے۔

کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ریاضِ دانش اور نیرنگِ دانش۔ نثر نگاری میں بھی ملکہ حاصل تھا آثارِ رحیمی کا ترجمہ اردو میں کیا لیکن طباعت کے آثار آج تک دکھائی نہیں دیئے دفن وہیں ہوئے یعنی حمید پورہ قبرستان کی مسجد کے احاطے میں جہاں کی خاک زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ نمونۂ کلام سے

دو جگہ نہیں کر بھی تم اپنی بزمِ خاص میں — بندہ اے اللہ والو یہ بھی ہے اللہ کا

حق بھی قانون سے مجبور ہوا جاتا ہے — حلقۂ گردنِ منصور ہوا جاتا ہے

حرف معنی خیز ہے نہیں سکوت مستقل — منتظر شہر خموشاں ہے کسی آواز کا

حبیب اللہ شررؔ

آپ کے دادا مہاراج گنج سے نقلِ مکانی کرکے برہانپور میں آکر بس گئے جہاں ۱۸۹۰ء میں حبیب اللہ شرر پیدا ہوئے مولوی منشی محمد داؤد صاحب نے جن متعدد نسلوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا ان میں سے شرر شاعری کا شعلہ بن کر چمکے آپ کو خیالی صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل تھا، سوداگری پیشہ تھا اور شاعری کا شغف تھا، ۱۹۶۲ء میں انتقال کیا۔ نمونۂ کلام:

میں انسان کا ظلم انسانیت پر نہیں دیکھ سکتا مگر دیکھتا ہوں

نئی روشنی کے یہ تاریک منظر نہیں دیکھ سکتا مگر دیکھتا ہوں

شررؔ دورِ حاضر کے پیغام بدلے غرض مندیوں نے فقط نام بدلے

غرض کا تماشہ غرض ہر جگہ پر نہیں دیکھ سکتا مگر دیکھتا ہوں

حضرت حمید اللہ خلیق برہانپوری (۱۹۰۶-۱۹۸۷ء)

بھدوہی ضلع وارانسی آبائی وطن تھا، مڈل اسکول تک تعلیم پائی، آبائی پیشہ ذریعۂ معاش تھا، بتیس سال کی عمر میں شعر و سخن کا ذوق جوان ہوا استاد راغب ہاشمی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا، شمشاد لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ خلیق برہانپوری تخلص کے تئیں ہی سے نہیں طبیعت کے لحاظ سے بھی اسم بامسمیٰ تھے، خلیق اور منکسر مزاج شخص تھے۔ لباس و وضع قطع سے بھی سادگی ٹپکتی تھی۔ بیرونی مشاعروں میں مدعو کیے جاتے تھے۔ شاگردوں میں گوہر (بمبئی) میر، مقیم محمود درانی اور شفیق راز کے علاوہ قیصر انصاری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

فاضل ابن محمد ابراہیم

۱۹۱۱ء میں برہانپور میں پیدا ہوئے، تعلیم معمولی تھی حضرت ریاضی سے فارسی پڑھی،

صنعت پارچہ بافی وسیلۂ معاش تھا شاعری کا شوق تھا۔ حضرت ریاضی کے شاگرد بنے اور پھر جانشین۔ فاضل صاحب انتہائی منکسر المزاج، سادہ لوح، نرم گو اور وضعدار انسان تھے آپ کے شاگرد اختر واصف آپ کے جانشین بنے۔ خواجہ عثمان ہارونی کے فارسی کلام سے متاثر تھے۔ شاگردوں میں اختر واصف، سراج انصاری، ایڈوکیٹ عزیز انصاری (ٹی وی پروگرام آفیسر) کے علاوہ علاقہ کوکن، بھیونڈی اور اندور میں فاضل صاحب کے تلامذہ موجود ہیں انتقال ۱۴۱۲ھ ۱۹۹۱ء میں ہوا۔ ان کا ایک شعر بطور تبرک پیش ہے ؎

اب کہیں جا کے مرے جسم نے راحت پائی ۔۔۔ روح نکلی کہ کھٹکتا ہوا کانٹا نکلا

<u>اختر واصف انصاری</u>

مختلف کوآپریٹیو سوسائٹیوں میں محاسب اور منیجر رہ چکے ہیں، گذشتہ پینتیس برسوں سے مشاعروں کو رونق بخش رہے ہیں۔ استاد فاضل کے شاگرد رشید تھے۔

<u>نعمت اللہ انصاری</u>

پیشہ بنکاری، ورادبی شغل شاعری کا ہے، اردو اور فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے ہیں اور قادر الکلام شاعر ہیں، انصار مومن جماعت (۱۹۸۵) کے سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں میں بھی یہی عہدہ سنبھالے رہے۔ ادبی سوسائٹی کے بھی سیکریٹری تھے۔

<u>عبدالکریم اختر راشدی</u>

برسوں تک بھیونڈی میں رہے۔ وطن والوں کی ناقدری نے اہالیانِ بھیونڈی کو توفیق دی کہ اختر صاحب کی شخصیت کو چمکا دیا اور ان کے کمال دفن کی صحیح طور پر قدر شناسی کی۔ فارسی میں دسترس رکھتے تھے اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، فی البدیہہ یا تہ بہ بیت میں کمال حاصل تھا، انتخاب کلام کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، گنجِ شائگاں اور نقد سودا ان کے کلام کے قیمتی خزانے ہیں، علامہ راشد برہانپوری کے ارشد تلمیذ اور جانشین تھے۔ نمونۂ کلام:

یہ بھی ہے پاکر رہتے نہیں بے ہنر خموش ۔۔۔ یہ بھی ہے سچ کہ اہل ہنر بولتے نہیں
پیاس سے سوکھے ہوئے ہونٹ بھی تر کر نہ سکے ۔۔۔ ہم تو سمجھے تھے کہ دل آپ کا دریا ہوگا
آئینگے پسِ مرگ مرے چاہنے والے ۔۔۔ پوچھیں گے کہ سامانِ کفن ہے کہ نہیں ہے

—— آخری شعر حسب حال تھا، عسرت اور تنگدستی میں جان دی۔ دی ہوئی اسّی کی تھی۔

علامہ راشد برہانپوری استاد اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اور مؤرخ بھی "تاریخ برہانپور" کے مصنف ہیں۔
شہر برہانپور کے کچھ اور انصاری شعراء کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔
اختر وارثی، باقی اشرفی، جمیل اصغر، ڈاکٹر حیرت، خالد نعیمی، ذکی انصاری، ریاضت انصاری، سراج انصاری، عبدالسبحان حاتم اشرفی، شمیم اشرفی، عزت اللہ خادم، عبدالستار مضطر، عاصم وارثی، طوفان، قیصر، لطافت، مجاز آشنا، معصوم، غلام مرتضیٰ ناظم، منظور حسین تقی نصرتی، مختار امیدی، نعیم اختر خادمی، نذیر آزاد اور یعقوب صادق، قیصر انصاری حضرت خلیق برہانپوری کے شاگرد اور جانشین ہیں۔ غلام حسین شمیم کپڑے کی سوداگری کرتے تھے ارباب ذوق کے صف میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ بہتیرے شاگرد تھے اور برادری میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔
برہانپور کے شعراء میں سے جو حضرات فارسی میں بھی شعر کہتے تھے ان کے نام اس طرح ہیں:
شیخ فضل حسین صابر، ریاضی، فہمی، رشتی، حبیب اللہ شرر، عزت اللہ خادم اشرفی، اختر رشدی، حیرت انصاری، محمد صدیق ذکی انصاری، عبدالقادر جاوید انصاری، محمد فاضل فاضل، عبدالرحمٰن ملک، منظور حسین تقی انصاری، غلام حسین شمیم اشرفی برہانپوری، عبدالعظیم خالد انصاری، محمد نذیر اثر برہانپوری، نعمت اللہ برہانپوری، مختار حسن دانش برہانپوری۔
مشاعروں کی ترویج سے پہلے برہانپور میں میلاد خوانی، سلام خوانی، نعت خوانی، مرثیہ خوانی اور مجلس مسالمہ کا دور دورہ تھا، ماہ محرم میں عزاداری ہوتی تھی، در مرثیہ ماتم کا ہمنوا ہوتا تھا، ربیع الاول میں عید میلاد النبیؐ منائی جاتی اور مولود یا میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی تھیں۔ ایسا ہی اور دوسری تقریبات میں بھی حضرات بڑے سرگرم رہتے۔ مختلف استادان کی اپنی اپنی ٹولی ہوتی۔ برادری کی خاص شخصیت جو اس فن میلاد خوانی میں اپنا منفرد مقام رکھتی تھی ان کے خاص استاد صلاحی تھے۔ ان کے صاحبزادگان اور بعد کی نسل میں یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہ گھرانہ جالپور سے ترک وطن کرکے برہانپور میں سکونت پذیر ہوا۔ اس خاندان کے افراد میں سے اسماعیل استاد نہ صرف برہانپور میں بلکہ خاندیش، برار، مالوہ، کھنڈوہ اور دیگر علاقوں میں بڑے مقبول اور ہر دلعزیز میلاد خوان تھے۔
برہانپور کی برادری میں فی الحال سب سے معمر بزرگ حاجی محمد اسحاق کی شخصیت ہے تقریباً ایک سو پانچ سال کی طویل عمر ہے، لیکن واہب عطایا نے ان کی بینائی، یادداشت، ہوش و حواس یہاں تک چلنا اور پھرنا حتیٰ کہ گھر پر روزانہ جنازہ غرضکہ سارے جسمانی مشاغل کو صحتمندی

کے ساتھ قائم اور برقرار رکھا ہے۔ آپ کے آباء و اجداد جلالپور سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے، پابند صوم و صلوٰۃ ہیں، طبیعت میں بشاشت ہے اور خوش مزاجی بڑھاپے کا منہ چڑھاتی ہے۔ لوک گیت کے بارے میں ان کی معلومات قابلِ رشک ہے، ان میں "بچرا" ایک قسم کا عوامی یا لوک گیت لوہاری کی برادری میں بہت مقبول تھا۔ غازی میاں کی میدنی کے ساتھ یہ گیت عام طور سے سنائی دیتا ہے، اس میں نعتیہ، منقبت اور مدحیہ گیت جو عموماً پوربی زبان میں ہوتے ہیں ڈھول کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ برہانپور میں چھیدی استاد پنجے راگ یا بچرا گانے میں ماہر ہیں ان کے علاوہ برساتی خلیفہ، قادر خلیفہ، مان خلیفہ، رحمان استاد بھی پنجے راگ گانے میں اپنی مثال آپ تھے۔

اکھاڑوں کے خلیفہ یا اُستاد حضرات

جماعتی روایت کے باب میں اکھاڑوں کا ذکر موجود ہے۔ برہانپور میں سارے اکھاڑے برادری کے استادوں کی دین تھے نامور استادوں اور پہلوانوں میں استاد جان محمد پہلوان، رحمٰن استاد، مکھیدن استاد، ڈبرا استاد، رمضان اُستاد، نصراللہ اُستاد، اسحاق استاد، شیخ محمد پہلوان، اکبر اُستاد (پیر محمد چودھری) اور استاد سراج الحق کے اسماء گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخرالذکر اُستاد اکھاڑہ حیدری کے سرپرست رہ چکے ہیں، انصار برادری کا یہ اکھاڑہ استاد شیخ دلدار شیخ نھو کے اکھاڑے کے نام سے مشہور ہے۔

ساکنانِ کوچۂ دلدار

اگلے وقتوں کی بات ہے اور یہ بات تنی پرانی بھی نہیں۔ جب اہلِ ثروت و تمول کی تعیش زنی کا زمانہ تھا، صنعتی مرکزیں ... دولت کی فراوانی ہوئی تو ان شہروں میں سے برہانپور انسانی دار سرور بن گیا جہاں اہلِ طرب و رقص کا ایک محلہ بورواڑی آباد تھا و آج بھی اس کا رہی نشتہ ... مقدر آباد نہیں یہاں پہلے امیر، منصبدار، جاگیردار اور زمیندار لوگ مرغوب جسموں و ... گزشتہ ... میں پناہیں ڈھونڈتے آتے تھے۔ پھر پسماندہ طبقہ کے اندور، بمبئی، بھیونڈی اور مالیگاؤں کے مومن نت دولتیے اور شعرا بھی کوٹھوں پر آنے لگے۔ یہاں کی ساری فضا انبساط و سرور سے معمور مستی اور نغمہ و سرود کی ترنم ریز حریری سرسراہٹیں سرگوشیاں ارتی تھیں۔ گھنگھروؤں کی کھنک سے دلوں میں کسک پیدا ہوتی، نشہ و نغمہ و رقص سے

ساری فضا مخمور، کیف انگیز اور رقص کُناں بن جاتی۔ سیماب صفت رقاصاؤں اور لالہ رُخانِ پری پیکر اور ماہ پاروں کے ' جلوہ زاروں ' میں یہ لوگ اپنے تفکرات کو جام و مینا میں ڈبو دیتے ' جوشِ قدح سے بزم چراغاں ہو جاتا تو ہر ایک گل و لالہ پر خیال دوڑنے لگتا اور ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں تصویریں بنانے لگتی۔

—— پھر رات کی امنگیں دم توڑنے لگتیں، کیف آگیں اور خواب شکن شب گزیدہ آنے لگتی ' انسان کی روح پرور اور ایمان افروز آواز بلند ہوتی تو شب زادوں کے نغمہ و سرود کے سارے سُر سناٹے میں دم توڑ دیتے ' اور بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کافور ہونے لگتیں ' لذتِ خوابِ سحر زندگی کی تلخ کامیوں میں پھر بدل جاتی ' تعیش کوش زندگی کا نظارہ عاقبت اور آخرت کے تصورات کو اندھا آئینہ بنا دیتا اور یہ لوگ رقص و سرود کی گردش میں روحانی اقدار کے محور سے بہت دور جا پڑتے ' ان کی زندگیاں جام و مینا میں اس درجہ ڈوب چکی تھیں کہ ان کے دلوں سے ایمان و آگہی کا سارا عطر نکل چکا تھا۔ پھر زندگی کی مقصدیت بے معنی ہو کر ان کی نظروں کے سامنے ننگی کھڑی ہو جاتی —— اور پھر شاید انہیں اپنی اخلاقی عریانیت سے حجاب آنے لگتا ' ان نودولتیے صنعتکاروں میں بہت سارے ایسے تھے جنہوں نے ' داشتہ آید بکار ' کے مصداق طوائفوں کو گھروں میں ڈال لیا تھا اور کچھ ہوشمندوں نے نکاح کر کے گھر بسا لیا تھا۔ ان کی اولاد کی کئی نسلیں بڑا بھرم اور باوقار زندگی بسر کرتی رہیں ' انہوں نے اس قسم کے ' ذلّت نفرت کو ' نئی تعلیم دلائی اور آج یہ ایک پاکیزہ سماجی زندگی گذار رہے ہیں۔ اب اخلاقی قدریں بدل گئی ہیں دینی تعلیم نے ہمارے سیٹھوں کی قلب ماہیت کردی ہے اور بہت ساروں نے غفور و رحیم سے رجوع کر لیا ہے مگر ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

اٹھائیسواں باب

جنوبی ہند، دکن اور خاندیش کی مومن انصاری برادری

ظہور اسلام کے بعد عرب مسلمان ملبار کے ساحلی علاقے میں کیرالا تک عارضی طور پر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے اور کچھ یہیں کے ہو رہے، مؤخر الذکر خطہ میں چند قبروں کی انتہائی قدامت سے یہ کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ بنو امیہ کے زمانے میں عرب مہاجرین کے سفینے ان ساحلی علاقوں پر لنگر انداز ہونے لگے تو ان کی نسلیں ریگ زار ساحل کی طرح پھیلنے لگیں۔ انگریزوں نے جب اس خطے میں پہلی مردم شماری کرائی تو ان عرب نژاد اور مخلوط النسل مسلمانوں کی تقسیم اس طرح ہوئی:

پہلی قسم: مہاجرین یا مہاجرین کی نسل کے لوگ، دوسری قسم: مہاجرین کی اولاد ہندو عورتوں کے بطن سے اور تیسری قسم: خالص ہندو نژاد جو مسلمان ہو گئے۔ پہلی جماعت کے لوگ تمام بڑے بڑے شہروں میں جیسے کہ مدراس، بنگلور، میسور، ویلور، مچھلی پٹم اور حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں، ان میں ان لوگوں کی باقیات صالحات بھی موجود ہیں جو چودھویں صدی کے اختتام پر شمال کی طرف سے آ کر دکن پر حملہ آور ہوئے اور بتدریج حصہ اس علاقے کا فتح کر لیا۔ یہ لوگ عام باشندوں سے زیادہ خلا ملا نہیں رکھتے فارسی اور عربی بولتے ہیں اور اردو بھی استعمال کرتے ہیں۔ دوسری جماعت کے لوگوں کی نسبت یہ روایت ہے کہ آٹھویں صدی میں حجاج بن یوسف گورنر عراق کی انتقامی کارروائیوں سے بچنے "تنگ آمد بجنگ آمد" کے یہ لوگ "پائے مرا لنگ نیست، ملک خدا تنگ نیست" پر عمل کر کے ہندوستان کے ساحل پر لنگر انداز ہوئے اور اس کنارے سے مشرق میں پھیل گئے۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری اپنی کتاب "تاریخ امینوں داہہ" (حصہ دوم ص ۳۹-۴۰) میں "تاریخ دنیائے اسلام" کے مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"اس روایت سے ... دراصل عربوں کی نسل میں سے ہیں، عرب سوداگروں کا ہندوستان سے ... شکستہ ہو گیا تھا تو وہ اس ملک میں آباد ہونے پر مجبور ہو گئے

چونکہ یہ لوگ اصل باشندوں کی زبان نہیں سمجھتے تھے ان کے سوالات کے جواب میں
لبیک کہتے تھے۔ اس واسطے ان کو "لبیہ" کا نام دیا گیا اب وہ تامل زبان بولتے ہیں جس
سے ثابت ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے تامل عورتوں سے شادی کر لی تھی۔ مگر ان کا رسم الخط
جداگانہ ہے جس کو عربی تامل رسم الخط میں لکھتے ہیں یہ لوگ اجڈ اور ناتعلیم یافتہ ہیں
مگر دستکاری اور تجارت میں ماہر ہیں۔ چمڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ ان کی تعداد
چار لاکھ چار ہزار سات سو تراسی ہے [۱۴-۹۱۲] اور اس قوم کے دیگر شاخوں
[کلنگامم] کی تعداد ستاسی ہزار آٹھ سو تہتر نفوس کی ہے۔ اس نسل کی دوسری قوم
پارچہ بافی کرتی ہے اور لبیہ لوگوں سے رشتے ناتے نہیں کرتی۔" [1]

مدراس میں جو مسلمان عرصۂ دراز سے بود و باش رکھتے ہیں وہ نسلی طور پر الگ الگ
برادریوں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں عام دکھنی اور "لبے" ہیں۔ دکھنی سے مراد وہ
مسلمان جو عالمگیر کی فتح جنوبی ہند کے بعد حیدرآباد اور بیجاپور جیسے دکھنی علاقوں سے
وہاں جاکر آباد ہو گئے اور "لبے" سے مراد وہ مسلمان جن کے آباء و اجداد وہیں کے
رہنے والے تھے اور عربوں کے اثر سے مسلمان ہو گئے۔ دکھنی عام طور پر حنفی مذہب
کے پیرو ہوتے ہیں اور لبے شافعی مذہب کے۔ کیرالا اور مدراس میں اہلحدیث کی بھی
نمایاں تعداد ہے۔ ولاڈ نور میں کلیات الانصار کی بنیاد ۱۹۶۴ء میں جماعت
"انصار اللہ" نے ڈالی اس کے فارغ شدہ طلبہ انصاری کہلاتے ہیں۔ یہیں پر
مدرسۃ المجاہدین کے نام پر سارے کیرالا میں دینی مدارس و مکاتب پھیلے ہوئے ہیں۔
تامل ناڈو (مدراس) میں جامعہ دار السلام عمرآباد کا قیام ۱۹۲۴ء میں عمل میں آیا
اس کے مؤسس الحاج کاکا عمر صاحب ہیں۔ جامعہ دار السلام میں جن اہم شخصیتوں
نے تدریس کے فرائض انجام دئے ہیں ان میں مئو، مبارکپور اور اعظم گڈھ کے مومن
علماء اور شیوخ کی بڑی تعداد ہے مولانا محمد شفیع مئوی، مولانا نعمان مئوی جو ۱۹۲۱ء
میں جامعہ دار السلام عمرآباد تشریف لائے اس وقت سے ۱۹۵۰ء تک نہایت ہی

---

[1] تاریخ امزال ص۳۹-۴۰ بحوالہ تاریخ دنیائے اسلام سنہ ۱۹۵۶ء اور
تاریخ مومن انصار۔ ج ۲ ص۱۱ - ۲۲-

کامیاب اور احسن طریقہ سے درس دیتے رہے آپ کے بھائی مولینا ابوالقاسم قدسی نے بھی غالباً دو سال یہاں درس دیا۔

دکن کی مومن برادری

غدر کے پُر خطر دور میں یو۔ پی کے مومن انصاری خاندان یہاں پر آکر بس گئے تھے ان میں سے زیادہ تر خاندان اپنے آبائی پیشہ سے ناتا توڑ کر دوسرے پیشوں سے متعلق ہو گئے تھے، شولاپور، بمبئی، پونہ، ستارا اور سب سے زیادہ ان کی تعداد احمد نگر میں تھی، بیجاپور اور کرناٹک میں دھارواڑ میں بھی کئی مومن خاندان آباد تھے ان سبھوں کا ذکر ان اضلاع کی گزیٹیرس میں موجود ہے، احمد نگر اور بیجاپور میں عہد سلاطین سے انصاری خاندان آباد تھے جن کا آبائی پیشہ صنعت پارچہ بافی تھا، یہ اپنے آپ کو کسی خاص عرفیت سے منسوب نہیں کرتے تھے، اس کے برعکس مہاراشٹر کے اضلاع میں بسنے والے اپنے آپ کو مومن لکھتے اور کہلاتے تھے[1] ان میں سانگلی، میرج اور کولہاپور کے مومن بھی تھے۔

قدیم جماعتی روایات کے آثار ان میں مفقود تھے، نہ پوربی بولی یاد تھی اور نہ آبائی پیشہ، دکن کے چند مومن خاندانوں میں سے موسیٰ عظیم الدین مومن ڈی۔ ڈی۔ آرکیٹکٹ۔ اے آئی ٹی ٹی، کا نام بمبئی میں بیحد ممتاز ہے، آپ اسلاح المساجد کے خاص آرکیٹکٹ ہیں۔

حیدرآباد کے انصاریوں کا کہنا ہے کہ ان کے اسلاف میں پارچہ بافی کی صنعت کا کوئی ذکر نہیں ملتا غالباً یہ وہ انصاری حضرات ہیں جن کے پاس شجرۂ نسب نہ ہو، بہر حال یہاں کے انصاری حضرات نے نظام کے زیر سایہ بڑی ترقی کی تھی اور بہت سارے ایسے بھی ہیں جو خود کسی کے محتاج کرم نہیں رہتے بلکہ اپنی ہمت سے آگے بڑھتے ہیں۔

ڈاکٹر شریف النساء انصاری بڑی قابل خاتون ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی صدر ہیں، پدم شری کا خطاب اور توصیفی سند یا اعزاز جمہوریہ ہند سے حاصل کیا، آپ کی فارسی کی تعلیم تہران میں ہوئی۔

وہ انصاری حضرات جو تجارت میں ہیں ان میں حیدرآباد کے چارمینار اسٹیل لمیٹیڈ کے ڈائرکٹر اے۔ اے۔ انصاری اے ی انصاری اور اے۔ اے انصاری حضرات قابل ذکر ہیں۔

---

[1] گزیٹیرس بمبئی، احمد نگر جلد، ص ۲۳۳، پونہ جلد ۱۱۹، جزء ۱ ص ۵۰۱-۵۰۲، ستارا، جلد ۱۹ ص ۱۳۲، شولاپور جلد ۲۰ ص ۲۰۶، دھارواڑ جلد ۲۲ ص ۲۴۲، بیجاپور، جلد ۲۳ ص ۲۹۹

اورنگ آباد

پرانا شہر نیا نام جو اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ مغل کے طویل قیامِ دکن کی یادگار ہے۔ یہی احمد نگر نظام شاہی سلطنت کا ایک گمنام قصبہ تھا مگر قدیم زمانے سے اپنی پراچین گپھاؤں کے سبب بڑی شہرت رکھتا تھا۔ یہاں کی صنعتِ بافندگی کی قدامت کا تانا بانا اجنتا اور ایلورا کی صنم تراشی اور نقاشی کے خطوط اور پیراہنوں سے ملتا ہے جو اُس یُگ کے فنی منصب، جمالیات اور انسانی عزائم اور حوصلہ مندیوں کے مظہر ہیں اور یہ ستواہن دور (۲۷ ق م تا سنہ ۳ عیسوی) کی تہذیبی یادگاریں ہیں۔ چترکاری نے اجنتا کے غاروں کو نگارخانہ چین بنا دیا تھا۔

احمد نگر کی نظام شاہی حکومت میں اورنگ آباد کو ملک عنبر کی سرپرستی حاصل ہوئی، صنعت پارچہ بافی میں ہمرو جامدانی کی بُنائی کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ مغلوں کے دورِ تسلط میں "حمیرا" کی صناعی پر اور گہرا رنگ چڑھ گیا، ہمرو، ہمرو شال اور مشروع دوشالے پشمینہ سازی کے کرشمے بن گئے، ان کے صناعوں میں مومن جُلاہے بھی تھے جن کے کچھ خاندان نظام شاہی دور میں آکر بس گئے تھے اور غدر کے بعد کچھ اور مہاجر خاندان بسلسلۂ معاش آکر آباد ہو گئے۔ فی الحال برادری کی کل آبادی تقریباً ۲۵ ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔ نواب پورہ اور مومن پورہ محلوں میں نوربافوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے جو دستی کرگھوں پر بُنکاری کرتے آئے ہیں، تقریباً پانچسو کے قریب پاور لوم ہیں جن پر ہمرو شال اور مشروع دوشالے تیار کئے جاتے ہیں نقاشی اور گلکاری یا بوٹہ داری ہینڈ لوم اور پاور لوم پر جیکارڈ مشینوں کے ذریعے عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہاں کی مصنوعات بڑے اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں، آزادیٔ ہند سے قبل جب انگریزوں کی حکومت کے انجر پنجر ڈھیلے پڑنے شروع ہو گئے تھے معاشی بحران اور صنعتی انحطاط نے اقتصادی حالات کو بھی دگرگوں کر دیا تھا، بُنکر طبقے اس دورِ ابتلا میں کرگھوں اور کارگاہوں سے ہاتھ روک کر دوسرے کاروباروں میں ہاتھ ڈال دیا کچھ بیڑی ساز بن گئے اور کچھ گوالے بن کر دودھ کی فراہمی میں جُٹ گئے، اب نہ انفرادی کی فرصت

باقی رہی اور نہ ان تبدیل شدہ حالات میں کوئی مومن اپنی شناخت برقرار رکھنے کا متمنی رہا۔ ہندوستان میں جہاں معاش و اقتصاد کے وسائل کا فقدان رہا وہاں کبھی عرفیت اور پیشوں کی کمی نہیں رہی اور نہ حلیہ بدلنے میں دیر لگتی ہے انقلاب شخصیت میں بھی آسکتا ہے اور شناخت میں بھی لہٰذا کچھ سید بن کر دیکھی شان کے ہو گئے اور کچھ خان بن کر آن بان سے رہنے لگی۔ کاغذی پورہ محلہ میں پیشے کی تبدیلی کے ساتھ سوداگر بن گئے، پہلے یہ دستکار اہلِ شرف ہر چہ بافت تھے کاغذ کی دستکاری نے سوداگری کا کاغذی پیرہن پہنا دیا۔

برادری کا وہ طبقہ جس میں مخیر اور دور اندیش صنعتکار اور تعلیم یافتہ دانشور موجود ہیں برادری کے سربرآوردہ پُر خلوص جذبات رکھتے ہیں۔ مومن کانفرنس کی ایک شاخ سنہ ۱۹۸۰ء میں قائم ہوئی جو مومن۔ انصاری برادری کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ چند مشاہیر صنعتکاروں نے شراکت میں اورنگ آباد سلک مل کی بنیاد سنہ ۱۹۶۲ء میں ڈالی (۱) جناب حمید علی شاہ (۲) مجید خانصاحب (۳) رحمٰن خانصاحب اور (۴) محمد یعقوب محمد یوسف مومن۔ اس صنعتی ادارے نے اورنگ آباد سلک ملز ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام اپنے پیر و مرشد معین اللہ شاہ صاحب کے نام ہی سارا گرامی پر معین العلوم سکول کی تاسیس کی، اس کا ذریعۂ تعلیم اردو اور مرہٹی ہے غریب اور نادار طلبہ و طالبات کی مالی اعانت کی جاتی ہے۔ سکول کے سارے اخراجات حاجی یعقوب سیٹھ کے اہلِ خاندان پورا کرتے ہیں۔ اب یہ ادارہ ہائی سکول کے درجے تک پہنچ گیا ہے چونکہ اس میں اردو اور مرہٹی ہر دو میڈیم بذریعۂ تعلیم کی سہولت ہے اسی لئے اس سے ہر قوم کے طلبہ و طالبات فیض پا رہے ہیں۔ اس طرح یہ درسگاہ تعلیم کے میدان میں تنزدر کھتی ہے۔

اورنگ آباد کا ممتاز مومن خاندان

ولی محمد کا وطنیت کا آبائی رشتہ یو۔ پی سے تھا، ان کے تین صاحبزادے تھے نور محمد، محمد یعقوب اور بشیر، یہ تینوں عینی بھائی تھے، عبدالحئی ماسٹر ان تینوں کے اخیافی برادر تھے یعنی ماں جائی بھائی۔ عبدالحئی ماسٹر اورنگ آباد سے نقل وطن کر کے بھیونڈی آئے اور لگ بھگ اسی زمانے میں محمد یعقوب سیٹھ کے فرزند عبدالمجید بھی یہاں آن کر بس گئے اور اچھا کپڑا ڈنڈے کی بنیاد ڈالی، لحاظ محمد یعقوب سیٹھ کے ایک فرزند محمد نذیر اورنگ آباد میں کاروبار کرتے

ہیں۔ نصیر احمد جو پتو سیٹھ کے نام سے بھیونڈی کے سماجی، صنعتی اور تعلیمی حلقوں میں مشہور ہیں عبدالمجید کے فرزند ارجمند ہیں ان کا ذکر باب: بھیونڈی کی مومن برادری کے سیاسی، صنعتی تعلیمی اور سماجی مشاہیر میں آرہا ہے۔ پتو سیٹھ اپنے خانوادے کی صنعتی اور تجارتی روایت کے امین اور 'انجنا کمپاؤنڈ' کے نگراں ہیں۔

نور محمد، یعقوب، بشیر (ابناء ولی محمد) اور عبدالحیٔ ابن ولی محمد نے پارچہ بافی کی صنعت، مشینوں کی کاریگری اور تکنیکی ایجادات میں ایسی ندرتیں اور جدتیں پیدا کی تھیں کہ انگلستان کے ماہرین بھی حیران اور ششدر رہ جاتے۔ یعقوب پیڈل لوم بناتے تھے اور نور محمد اور بشیر مقادم بھی اس کی کاریگری میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے، ان برادران کے بنائے ہوئے لوم برما اور ایران میں درآمد کیے جاتے تھے۔ ایران میں ان کی مانگ اس قدر بڑھی کہ نور محمد مقادم کو آزمودگار انجینئر کو اس لوم کے انتصاب اور کارسازی کے طریقے سکھلانے کے لیے کارخانہ داروں کی درخواست پر ایران جانا پڑا، ان ماہر برادرن نے اپنے پیڈل لوم پر جیکارڈ مشین لگایا، انگلستان کی اصل مشین میں ترمیم کی اور اسے دوہرے سلنڈر کا بنایا اس سے اس کی کارکردگی میں اضافہ پیدا ہو گیا، اس اختراع پسندی اور ندرت کا نظارہ کرنے کے لیے انگلستان سے کمپنی کا ایک ماہر بنفس نفیس آیا اور معائنہ کرنے کے بعد اس نے چاروں صناع بھائیوں کی اس جدت، اختراع اور تکنیکی حکمت کی تحسین کی۔ ۱۹۳۲ء میں یعقوب سیٹھ بھیمڑی سے اورنگ آباد منتقل ہو گئے وہیں نواب برادری کی شراکت میں ۱۹۳۶ء میں انہوں نے پارچہ بافی کو بڑے پیمانے پر شروع کیا، انہوں نے اپنے پیڈل لوم میں ہمرو اور مشروع مصنوعات کے لیے چار مزید پٹیاں جوڑ دیں اس طرح لوم پر نقشی دار نفیس اور دلش انگیز کپڑا تیار ہونے لگا، یہ روایت ان کے فرزند نذیر مقادم (متوفی ۱۹۷۸ء) نے زندہ رکھی جو ہمرو کی گلکاری سے مزین دلکش چادریں تیار کرتے تھے جو مغربی ممالک میں بھی برآمد کی جاتی ہیں۔

یہ خاندان تجارت اور صنعت میں نہ صرف اختراع پسند واقع ہوا ہے بلکہ مہم جو بھی ہے دوسری جنگ عظیم کے دوران جب مسافرت پُرخطر تھی نور محمد مقادم کو ایران اور برما کے سفر کی دھن سمائی، انہیں ایک مشین کی طرح لکڑے کے صندوق میں بند کر کے برآمد "مال" کی طرح ایران اور برما لیجایا گیا، لیکن اس 'مال' کا آل یہ نکلا کہ نور محمد ماسٹر جیسی

کے طلسم خانے سے غائب ہو گئے، یا پھر لاپتہ۔ دو سال تک ان کا نام و نشان نہ ملا، ایصالِ ثواب کے لئے، تیجہ سے لے کر برسی تک قرآن خوانی کی رسمیں کی گئیں اور ان کی زندگی کا فاتحہ پڑھ لیا گیا۔ مگر ایک دن معجزاتی طور پر نور محمد ایک زندہ ہستی بن کر اہلِ خانہ کی نظروں کے سامنے چمکنے لگے۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

خاندیش

ست پڑا کا کوہستانی سلسلہ ہمارے سے لے کر اجنتا اور ایلورا کی پراچین گپھاؤں تک پھیلا ہوا ہے، خاندیش بھی اس کی سرمئی رنگت کی کہستانی زلف میں اسیر ہے یہ "خان لوگوں" کا دیار ہے اور "خان" کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک جماعت اصل خانوں کی ہے جو افغانستان کے قبائلی خان ہیں ان کے جرگے اور خیل ہیں، دوسرے خان بھائی نومسلم ہیں جو بہمنی اور دکنی حکمرانوں کی سرپرستی میں خان بن گئے، اور ان کے لشکر میں مختلف فوجی عہدوں پر سرفراز رہے، بعض تو شاہی خطاب سے "خان" بن گئے، یا پھر کوئی وجہ تھی کہ خان بولے گئے اور یہی عرفیت استعمال ہونے لگی اور یہ "خان" لقب اتنا عام ہوا کہ بے خانماں اور بے سروسامان بھی خان بن گیا۔

دھولیہ

پانجرا ندی کے دوآبے میں یہ شہر صدیوں کی دھول میں اٹا ہوا تھی کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل بن کر نمایاں ہے۔ غدر کے ہنگامہ خیز زمانے میں جب شمالی ہند کا سہاگ اجڑ گیا تو جنوبی اور مغربی ہند کی بستیوں کی مانگ بھر گئی، ان میں دھولیہ کا شہر بھی تھا جس کا دیوپور کا علاقہ اسلام آباد بن گیا اور مرتی ناما کا علاقہ "مغلائی" کرگھوں کی آوازوں سے جاگ اٹھا، دھولیہ پیٹھ میں کپڑوں کی تجارت چمک اٹھی۔

تاریخ مومن۔ انصار کے مصنف ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان "خاندیس کے انصاریوں کے حالات" میں دھولیہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "حضرات قوم انصار"

لہ مولانا عبدالسلام مبارکپوری تحت امنزل وجہت ۲ ۔ صفحہ ۹۴۔ ۹۵

مالیگاؤں (جنوبی ہند) سے آکر آباد ہوئے ہیں؟ ــــ جو یقیناً ایک تاریخی تسامح ہے جبکہ یہاں کے سارے قدیم انصاری خاندان اتر پردیش سے آکر آباد ہوئے تھے، خواجہ محمد یحییٰ کا علمی خانوادہ آج بھی دھولیہ میں ممتاز ہے، خواجہ صاحب (ولادت ۱۸۷۲) بڑے متقی، متمول اور مخیر بزرگ گزرے ہیں صوفی منش تھے، غریبوں اور بیکسوں کے حاجت روا اور ہمدرد شخص تھے۔ نیلی چھت کے نیچے رہنے والوں کے لئے کئی بستیاں بسائیں، آزاد نگر، فردوس نگر، مولوی گنج وغیرہ بستیوں میں ان کی یادوں کے گنجینے دفن ہیں۔ خواجہ صاحب کا آبائی پیشہ بنکاری تھا۔

آپ کے صاحبزادے آثر یحییٰ مجاہد آزادی تھے، قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی لگاؤ تھا مولانا آزاد کی سیاسی ڈائری کا اشتہار مدتوں ان کے "بینڈ بیگ" پر لکھا ہوا، ان کی علمی و سیاسی مصروفیات کا معتن بتا رہا۔ ان کے صاحبزادے مختار احسن بڑے خوش فکر شاعر ہیں۔ اسی طرح دھولیہ کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر عبدالکریم عبدالرؤف اکرم انصاری دھولیوی کے آباء و اجداد بسلسلۂ تجارت گونڈہ ضلع پرتاب گڑھ سے آکر بس گئے ٹانڈہ کے مہاجر خاندانوں میں عصر حاضر کے بیحد ہونہار سال شعراء پیدا ہوئے ہیں۔ سراج انصاری، زاہد دھولیوی اور محمد صدیق ضیاء انصاری کے آباء و اجداد کا وطن لکھنؤ تھا۔ اس شہر میں اعظم گڑھ اور شہر الہ آباد کے اضلاع کے مہاجر خاندانوں کی بڑی قلیل تعداد آباد تھی۔

شہادہ

بعض حضرات کو شہادہ کو شادہ بولنا اور لکھنا شہد آگیں لگتا ہے یوں بھی شہادہ قصبہ کے سادہ لوح باشندوں میں بڑی مٹھاس ہے شاید اس کی اصل وجہ سادگی اور پرکاری ہے، صلح زندگی پر حلاوت ہے لیکن پسماندگی کی لعنت اور مضحوک الی لی کی تلخ بیاں یہاں کی زندگی کا المیہ ہے معاشی حالت کے سدھار کی رفتار یہاں کے لوگوں کی طرح سست رو ہے، مردم شماری کیجئے تو مومن برادری کے افراد کی کثرت ملیگی تعلیم یافتہ افراد اور دانشوروں کی تلاش کریں گے تو حسرت نہ نکلیگی۔ پروفیسر احمد انصاری غالباً اس صدی کی دوسری نصف کے اوائل کے پہلے اعلیٰ تعلیم یافتہ انصاری ہیں، نام تو نشاط شاہدی

کا بھی غروب ہو چکا، لیکن اب موجودہ حالات کے تیور بتلا رہے ہیں کہ ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ معاشرہ تشکیل پا رہا ہے جو اپنے جلو میں معاشی، سماجی اور دینی برکات بطور سوغات لا رہا ہے۔ سیاسی بصیرت کی یہاں کی برادری کے لوگوں میں کمی نہ تھی مجاہدین آزادی کا شمار نہیں جنہوں نے ہمیشہ کانگریس کی قومی اور حب الوطنی سے معمور تحریکوں کا ساتھ دیا۔

پھولپور (الہ آباد) بنارس اور اعظم گڈھ کے مہاجر خاندانوں کی یہاں کئی نسلیں گذر چکی ہیں جو غدر کے دور ابتلا میں ترکِ وطن کر کے آ گئے تھے، حاجی عثمان اور کلو جھگڑ کے خاندان کے باقیات صالحات بھی موجود ہیں، ان میں بہت سارے سردار خاندان تھے، الحاج عبدالجبار (عرف بدھو) سردار، الحاج قطب سردار، نتھو سردار، نتھو بدل انصاری۔ مدار میاں جی حسن سردار، حسین سردار، رسول سردار، عبدالکریم سردار، سکندر عبدالکریم سردار، شبیر احمد انصاری، منیر احمد انصاری، عبدالقدیر انصاری اور ایسے درجنوں انصاری حضرات شاہدہ بستی کے ممتاز افراد ہیں اور کچھ شہر غریباں کے باسی بن چکے ہیں۔

اگلے وقتوں کے یادگار زمانہ لوگوں کی سنائی ہوئی داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے اجداد اپنے وطن، لوٹ میں بڑے جاہ و حشم اور شان و شوکت سے زندگی گذارتے تھے، عظمت گڈھ کے تحصیلدار کی کوٹھی کے آگے ہاتھی جھومتے تھے، عباد اللہ انصاری عالم بزرگ تھے، بہاء الدین ان کے صاحبزادے تھے، شاہی مسجد کی امامت اس خانوادہ علمی میں برسوں قائم رہی۔ شاہدہ گاؤں میں تبلیغ دینا اور ایک پوری نسل کو قرآن کی تعلیم و تدریس اسی خانوادے کی رہین منت ہے۔ عبدالقدیر بہاء الدین انصاری اسی خاندان کے مقتدر فرد تھے۔

پارچہ بافی ہاتھ ماگ پر ہوتی تھی، دھولیہ، ایولہ اور مالیگاؤں کی منڈیوں میں مال جاتا تھا لیکن شاہدہ کی صنعت نے کوئی خاص ترقی نہیں کی، اس کی وجہ مالی اعانت کا فقدان کچے سوت کی شکل فراہمی اور مال کی سست نکاسی تھی۔ قوم کے بنکروں نے امداد باہمی کے اصولوں پر بنکر کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی (۱۹۴۶ء) اس کے خاص اراکین یہ مومن افراد ہیں: محی الدین عبدالغفور انصاری، جمال الدین شاہ محمد انصاری، ایوب محمد انصاری، رسول سکندر انصاری، عثمان منی حاجی قطب سردار، محمد یوسف بشیر انصاری، جعفر نتھو محمد، محمد حنیف جھگڑو اور صغیر بہاء الدین انصاری۔ معصری

بشارت انصاری اس تحریک کے روحِ رواں اور بنیادی رکن تھے۔

تعلیم یافتہ افراد کی کمی ہونے کے باوجود کچھ ایسے باشعور اور دردمندان قوم پیدا ہوئے جنہوں نے برادری کی تعلیمی پسماندگی کا کرب شدت سے محسوس کیا، قاری محمد ایوب (مرحوم)، ایس اختر اور پروفیسر احمد عبدالقدیر انصاری نے بڑی جدوجہد کے بعد نیشنل ہائی اسکول شہادہ کی بنیاد ڈالی اور آج یہ تعلیمی ادارہ قوم کے طلبہ وطالبات کے لیے سرچشمۂ فیضان علم بنا ہوا ہے۔

شاہدہ علمی، تعلیمی اور ادبی سفر میں اتنا تیز رفتار نہیں رہا ہے پھر بھی رہروانِ شوق میں چند مانوس چہرے نظر آتے ہیں جن سے یادوں کی بھولی بسری گلیوں میں بھیڑ ہو جاتی ہے۔ نشاط ملیم کا مالیگاؤں اور بھیمڑی کی ادبی تاریخ کا ایک اہم باب بن چکا ہے۔ وہ مالیگاؤں میں رہے لیکن بمبئی اور بھیمڑی تک ان کے مداحان اور ارادتمندان موجود تھے جنہوں نے ان کی یادگار میں کئی لائبریریاں قائم کر رکھی ہیں، ادبی حلقے انور شہادوی، قادر شہادوی، فردوس شہادوی اور علیم شہادوی کے اسمارِ گرامی سے بخوبی مانوس ہیں، پروفیسر احمد انصاری حالانکہ مراٹھی ذریعۂ تعلیم سے ثانوی کا امتحان کامیاب کیا لیکن اسماعیل یوسف کالج کے ادبی ماحول میں ان کی صلاحیتیں ایسی نکھریں کہ وہ اردو، انگریزی اور فارسی میں زبان اور قلم چلانے لگے اور نیک کامیاب معلّم اور مقرر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

علیم شہادوی کے والد حاجی عثمان گر اپنے ہونہار صاحبزادے کو کوئی اعلیٰ تعلیم نہ دلا سکے لیکن کچھ تو ماحول کا اثر تھا اور کچھ خداداد صلاحیتوں کا تقاضا کہ علیم ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے خاندیش کے ادبی حلقے میں جانے پہچانے بن گئے، پروفیسر احمد انصاری ان کے مختصر مجموعۂ کلام "خاکِ آرزو" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

"علیم صاحب کی شاعری "سوزِ غم" "رنجِ دام" اور درد و کرب کی شاعری ہے۔ ان کی شاعری نغمات کا سوز ہی سوز ہے، عشرت کا ساز نہ بن سکی، جب ماحول کی دہکتی ہوئی آگ میں پگھل کر ان کی شاعری کندن بنی اور کندن بن کر نکھری ہے۔ اس سے عیش رات کی خنک چاندنی اور شبنم کے قطروں کی ٹھنڈک کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی ..... علیم صاحب نے یاس و ناامیدی کے اندھیروں میں "شمعِ آرزو" جلانے کے خواب بھی دیکھے ہیں۔"

نمونۂ کلام سے

اے انقلابِ زمانہ نہ دے فریب مجھے — میں کیا کروں گا مسرت کی زندگی لے کر
جلا رہا ہوں میں کہ شمعِ آرزو دل میں — بجھے بجھے سے ستاروں کی روشنی لے کر

دھولیہ کے انصاری شعرار کرام

انصاری برادری کے آباد ہو جانے کے بعد یہاں کی ادبی و علمی فضا معانی و الفاظ کی "نوائے سروش" سے معمور ہو گئی، شعرا کے کلام کے گلدستہ ہائے سخن مہکنے لگ گئے اور روز سارے شہر کی محفلوں اور اربابِ ذوق کی انجمنوں میں بہار آگئی، ادبی ادارے قائم ہونے لگے حافظ قمر الادب، انجمنستانِ حافظ، بزمِ حافظ، بزمِ ادب، بزمِ انجم، معیارِ ادب، انجمن فروغِ ادب، انجمن حافظ ضیاء الادب، انجمن ترقی پسند مصنفین، ادارۂ انوارِ اردو، انجمن فروغِ اردو وغیرہ کی شعری و ادبی سرگرمیاں مدتوں تک قائم رہیں اور دور دور تک یہاں کے ایوانِ ادب کے روشن چراغوں کی روشنی سے بیاول، مصطفیٰ آباد (چوپڑہ) دھرن گاؤں، امنڈول، پارولہ، نذر آباد، شہادہ، شیرپور تک کی شعری فضا منور ہو گئی۔
قدیم اساتذہ میں مثلاً حافظ عبد الشکور (نابینا حافظ) دھولیوی، حنیف دھولیوی، عارج دھولیوی، اطہر جلگانوی، افسر مصطفیٰ آبادی، دلشاد دھولیوی، محمد علی جلیس دھولیوی، انور شہادوی (شاہدوی)، خاور شاہدوی، فردوس شاہدوی، حکیم امنڈولی، ماہر انصاری صمصام، عبد الرحمٰن عبد، عازم اور غریب انصاری جیسے قادر الکلام اور کہنہ مشق شعرار کا ایک دبستانِ شعری خاندیش میں کھل گیا، ان میں سے بہت سارے شمالی ہند کے مشاہیر شعرا سے اصلاحِ سخن لیتے رہتے، نوح ناروی، ناطق گلاوٹھوی، جلیل مانکپوری، شمشاد لکھنوی، داغ، سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ سارے خاندیش میں پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں کے استاد شعرار میں غریب دھولیوی، حافظ دھولیوی اور حنیف دھولیوی کے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی۔ مشاعرے بھی بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے، ۱۹۲۹ء میں نوح ناروی کی صدارت میں جس میں انجم فوقی بدایونی اور ان کے شاگرد محشر انجمی بھی شریک تھے ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔
خاندیش کے بہت سارے شعرار صاحبِ دیوان ہیں، رسائل اور انتخابِ کلام کے

گلدستے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں، 'تبسم' اور 'البدر' حافظ دھولیوی، عبدالحیٔ باطن اور عزیب انصاری کی ادبی کاوشوں سے اور اشتراکِ عمل سے جاری رہا، ایک پرچہ 'شاہین' بھی نکلتا تھا، عزیب دھولیوی نے ماہنامہ الحافظ اور حنیف انصاری نے اثر انصاری کی ادارت میں ماہنامہ طوفان جاری کرکے ادبی حلقوں میں ہلچل مچادی تھی، لیکن بہت سارے ماہنامے گردشِ ماہ و سال میں کھو گئے، صاحبِ دیوان شعراء میں نیر جلگانوی، اختر امیری، ایم ن بیا دلی اور عبدالرحمٰن عبد کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت حافظ دھولیوی کے ارشد تلامذہ کے 'سلاموں' کا مجموعہ "شہیدوں کا دکھڑا" ماتم برپا کرچکا ہے، اسی موضوع اور جدید صنفِ سخن پر عازم دھولیوی کا آئینہ سلام 'معرفت' منظرِ عام پر آچکا ہے۔ 'پنجۂ سخن' ماہر انصاری کے قوتِ سخن پر دلالت کرتا ہے۔ برادری کے پہلے بیرسٹر رمضان احسان بجائے خود ایک خوش فکر شاعر تھے اپنے ماموں ماہر القادری کی غزلوں اور نظموں کو تفکرات کا نام دے کر اور چھپوا کر اردو ادب پر احسان کیا ہے، ابھرتے ہوئے ادیبوں میں نورانی نور اور شبیر اقبال قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے خاندیش کی علمی و ادبی روایات اور تاریخ کے "منتشر خاکے" کو یکجا کرکے اس خطے کی ایک دلکش تصویر بنائی ہے۔ اس سے پہلے انجم فوقی بدایونی 'رازِ کہکشاں' اور 'سلکِ پروین' مرتب کرچکے ہیں جن میں دھولیہ کے شعراء کے کلام کو پرو دیا ہے۔ 'منتشر خاکے' میں سے ہم چند ممتاز انصاری شعراء کے کلام و بیان کے خطوط واضح کرنے کی کوشش کررہے ہیں:

ڈاکٹر پروفیسر افتخار احمد فخر دھولیوی (ولادت ۱۹۲۴ء): جل گاؤں کالج میں درس و تدریس کا چراغ مدتوں جلائے بیٹھے رہے اور جس کی روشنی سے طب کی کئی پیڑھیاں کسبِ نور کرتی رہیں، ۱۹۷۳ء میں آپ کو پونہ یونیورسٹی نے سیماب اور دبستانِ سیماب، مقالہ پر ڈاکٹریٹ کی اعلا ڈگری عطا کی، زود قلم ہیں اور زورِ قلم کا یہ کرشمہ ہے کہ نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں، اچھے شاعر ہیں اور کلام میں روایتی شاعری کے عناصر غالب ہیں ؎

منصور کی طرح بڑے اتقان سے کہو — حق ہے اگر تو دار پہ بھی شان سے کہو
ہر دم کسی کی یاد میں آنکھیں ہیں اشکبار — پھر کیوں نہ میری شاخِ تمنا ہری نہ ہو

غلام رسول اظہر انصاری (ولادت ۱۹۲۱ء): انگریزی کی مشہور نظم "ہم سات ہیں" کے مقابلے میں یہ صرف چھ بھائی ہیں ان میں سے اظہر، ظفر اور شرف فنِ شاعری کے

شرفیاب ہیں، اظہر انصاری کو زمانۂ طالبعلمی سے شعر و شاعری کا شوق تھا، ابوالبیان حنیف دھولیوی کے قلمِ اصلاح نے نکھار پیدا کر دیا ؎

ایک پل بھی نہیں قرار میں ہم — اے جنوں ہیں یہ کس بہار میں ہم

مجھے اب فکرِ ایں و آں کہاں ہے — کہ میرا سر ہے ان کا آستاں ہے

عبدالکریم عبدالرؤف اکرم انصاری (ولادت ۱۹۲۴ء) : ارضِ دھولیہ ان کا مسقط الراس ہے اور ان کا شاعرانہ مقام اس خطہ کے ادبی سلک گہر میں "واسطۃ العقد" کا ہے، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں، فارسی اور عربی علوم پر دسترس تھی انہیں کے صدقے زبان و بیان شاعری پر واری ہے اور بھاری ہے، اکرم دھولیوی کا کلام بلاغت نظام فنی محاسن سے معمور ہے، سلاستِ زبان، رفعتِ افکار اور ندرتِ خیال ان کی شاعری کی تین فنی علامتیں ہیں۔ "نقوشِ جاوداں" مجموعۂ کلام ہے جس میں کوثر چاندپوری جیسے ادیب، شاعر اور نقاد بزرگ کی "پیش گفتار"، مہاراشٹر کے بزرگ شاعر ابن تابش کی تقریظ اور مہو چھاؤنی کے منان صدیقی کا ایک طویل تعارف شامل ہے، اسی لئے مزید حاشیہ آرائی کی گنجائش باقی نہیں رہتی، "نمونۂ کلام" پیش کرنا وقت طلب امر ہے اس لئے کہ حظ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست۔ ہم کوثر چاندپوری کے انتخاب کی داد دیتے ہیں اور یہ داد طلب چند شعر انہیں کے انتخابات میں سے ہم منتخب کر رہے ہیں۔

ے کرا نگڑائی اٹھا کون سر میخانہ — رک گئے دور چھلکتے ہوئے پیالوں کے

کیسی منزل وہ تو کوسوں دور پیچھے رہ گئی — میں کہاں تک جذبۂ وارفتگی میں آ گیا

کس شان سے ہمارا نشیمن جلا ہے آج — اتنا کبھی چمن میں اجالا ہوا نہ تھا

عبدالوہاب عبدالغفار سردار انجم انصاری (ولادت ۱۹۳۴ء)، حنیف دھولیوی کے شاگرد ہیں بعد میں اکرم دھولیوی سے مشورۂ سخن لینے لگے فارسی اور عربی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں ان زبانوں کا اثر کلام بلاغت نظام پر بھی پڑا ہے، وہ کلام پاک کا ترجمہ اٹھ درس دیتے ہیں، مولانا محمد عثمان مبارکپوری سے حدیث و تفسیر کا درس لیا ہے، فن عروض میں مہارتِ تامہ حاصل ہے۔ نمونۂ کلام ؎

وقت کے تیور عذابِ وقت سے خالی نہیں — شہر ہیں آباد لیکن زندگی ویران ہے

لازم ہے اپنے دل کا بھی اک بار جائزہ — ہم ان کی ہی شکایتیں ہر بار کیا کریں

نام عبدالمنان پرواز (اسلام آبادی) دھولیوی (انصاری) (ولادت ۱۹۳۶): حضرت عباس حنیفی دھولیوی سے مشورۂ شعر و سخن لیتے ہیں۔ اور ان کے ارشد تلامذہ میں آپ کا شمار ہوتا ہے ادارۂ انوار کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں آپ کی نظامت سے جان پڑتی ہے سہ

کس سے کہئے غم دل ترے شہر میں　　ہیں مسیحا بھی قاتل ترے شہر میں
تیری زلفوں کے مانند پر پیچ ہیں　　زندگی کے مسائل ترے شہر میں

عبدالرزاق انور (انصاری) (ولادت ۱۹۳۱) تاجر خاندان کے فرد ہیں، عطر فروشی آبائی تجارت ہے، مشک بیز غزلیں کہتے ہیں بہت سی علمی و ادبی انجمنوں کے روح رواں ہیں انجمن فروغ اردو اور اردو فرینڈس سرکل [اردو دوستی کا ثبوت انگریزی کے ذریعہ] سے وابستہ ہیں۔ کل ہند مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں، اچھا پڑھتے ہیں، اکرم دھولیوی کے نزدیک انور کا کلام بہت وقیع ہے[1]۔

قرین مصلحت تھا بزم میں بیگانہ وش رہنا　　نہ تم کہتے بے خبر ان سے نہ کہتے وہ بے خبر ہم سے
نہ بجھ پائیں گے وہ میری جگر کے داغ ہوں گے　　جن چراغوں سے اندھیروں کو جلا ملتی ہے

ابوالبیان حنیف انصاری (ولادت ۱۹۰۶) : اساتذہ میں شمار ہوتا ہے حلقۂ تلامذہ آپ کی شہرت کی طرح دور دور تک پھیلا ہوا ہے، والد بزرگوار عبدالرشید خود ایک صوفی منش بزرگ انسان تھے، صوفیانہ حال و قال کا رنگ آپ پر بھی چڑھا ہوا تھا، حافظ عبدالشکور حافظ جیسے جید عالم اور ماہر شاعر سے عربی و فارسی کی تعلیم پائی اور ان کے حلقۂ تلامذہ میں ممتاز رہے، استاد کی محبت میں ایک انجمن "انجمن تلامذۂ حافظ" کے نام سے تشکیل دی۔ تانے بانے سے جڑے ہوئے تھے یہی ذریعۂ معاش ٹھہرا۔ ارشد تلامذہ میں سے جو مشہور ہوئے ان کے نام ہیں۔ آثر انصاری، عباس انصاری، کلیم دھولیوی، اکرم دھولیوی، سہیل، اطہر اور شرف قدر دانانِ سخن نے آپ کو ابوالبیان کے خطاب سے نوازا ہے "شبستانِ غم" اور "جھکتے سائے"۔۔۔ ابھی تک خود ان کے ہی شعر کے مصداق سہ

امید کرم کیا! تغافل کے ہاتھوں　　ستم ہی جو ہوں تو بڑی مہربانی ۔۔۔ کسی طابع و ناشر

---

[1] نقوش جاوداں، اکرم دھولیوی، دھولیہ ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء۔ ص ۳۲

کے محتاجِ کرم ہیں۔

ذرا اے ذوقِ نظارہ خبر لے — تجلّی گاہ سے پردہ اٹھا کیا

نہیں معلوم کہ رات کہاں تھی دن بھر — صبح کی نکلی ہوئی شام کو گھر آئی ہے

شفیق رازؔ یزدانی (ولادت ۱۹۳۰ء): والد بزرگوار منشی محمد صدیق عاشق دھولیہ کے کہنہ مشق شاعر اور ادیب تھے، ان کے چھوٹے بھائی سعید عقابؔ مشہور شاعر، ادیب اور صحافی ہیں۔ خود رازؔ کی شاعرانہ صلاحیت راز نہیں بلکہ ایک آشکارا حقیقت ہے۔ جوان اشعار سے عیاں ہے سے

چاک دامانِ گل سے بہاروں کو فروغ — جس سے صحرا کو ہے رونق وہ ہے وحشت میری

سن کر بھی تم پلٹ کے نہ دیکھو یہ اور بات — لیکن یہ کیا کہ میں آواز بھی نہ دوں

مایوس اسقدر ہوں نویدِ نشاط سے — وہ ملتفت بھی ہو تو مجھے برہمی لگے

شمس الدین زاہد ابن وجیہہ اللہ فیض آبادی، انصاری: (ولادت ۱۹۲۲ء):

کئی سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے ہیں، لیکن عسرت اور تنگدستی نے قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ پھر بھی حوصلہ کی بلندی دیکھیے، سے

اٹھ اور اوج ثریا پہ جگمگا زاہد — یہ خاکساری و احساسِ کمتری کب تک

مکاں کیا لامکاں کے عکس ہیں چشمِ تصور میں — مری تخئیل کے جوہر ہیں بہتر سازِ جم سے

سراج انصاری (ولادت ۱۹۲۸ء): اکرم دھولیوی کے شاگرد ہیں، نہایت مشاق اور پُرگو شاعر ہیں، شاعری کی ہر صنف پر قادر ہیں، چونکہ گھر کا ماحول شعری و ادبی سرگرمیوں سے معمور تھا آپ کا فطری ذوقِ شعر گوئی کی خوب نشو ونما ہوئی اور اچھا شعر کہنے لگے، حضرت حنیف دھولیوی سے بھی کسبِ فیض کیا ہے۔

آج مائل بہ کرم ہیں وہ تغافل کے عوض — ہونے والا ہے رفو چاکِ گریباں کس کا

جدھر بھی عالمِ وحشت میں گذرا تیرا دیوانہ — قدم لینے کو ویرانوں پہ ویرانے چلے آئے

محمد شعبان ابن ابواللیث چودھری (انصاری) (ولادت ۱۹۴۰ء): جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل پاس کیا ہے، شعری ذوق اور حلقۂ ارباب ذوق کی صحبتوں نے فن کو نکھار دیا۔ گو شاعروں میں شرکت سے احتراز کرتے ہیں لیکن خود اپنی ذات سے انجمن ہیں، زبان و اسلوب کا خیال رکھتے ہیں۔

نمونۂ کلام سہ رفتہ رفتہ جزوِ ہستی بن گیا — اب تمہارا غم تمہارا غم نہیں ہے

سہمے ہوئے چہروں سے یہ محسوس ہوا ہے — اخلاص و محبت کا یہاں کال پڑا ہے

ڈاکٹر شفیق طاہرؔ (ولادت ۱۹۲۸ء): میٹرک کے بعد آر۔ ایم۔ پی بن کر طبابت کرنے لگے، آپ کا شفاخانہ اپنی مسیحائی کے سبب مرجعِ خلائق بن گیا ہے جہاں جراحتِ دل کی مرہم ہی نہیں دلداری بھی ہوتی ہے اور انسانی ہمدردی بھی ملتی ہے، حضرت غریب کے شاگرد ہیں، ترقی پسند تحریک سے متاثر ہیں فنونِ لطیفہ سے بڑی دلچسپی ہے موسیقی کے دلدادہ ہیں اور اسٹیج پر ڈراموں میں کردار نگاری کا ملکہ حاصل ہے۔ پاکیزہ کلام اور اثر آفریں بیان شاعری کے اوصاف ہیں سہ

بہاروں کی اگر یوں ہوگی رسوائی تو کیا ہوگا — جنوں کی داستاں پھولوں نے دہرائی تو کیا ہوگا

دئے بجھا کے چلو رہروانِ راہِ وفا — سوادِ غم میں اجالوں کا کچھ سوال نہیں

ڈاکٹر موصوف کے کلام میں حد درجہ غنائیت اور شعریت پائی جاتی ہے، ترنم بھی دلنشیں ہے اور اچھوتی تاثیر کے ساتھ مرصع غزلیں کہتے ہیں یہ سار جمالیاتی ذوق فنونِ لطیفہ کے شوق کا نتیجہ ہے۔

محمد صدیق ضیاءؔ انصاری (ولادت ۱۹۲۵ء): انجم فوقی بدایونی جو عرصہ تک دھولیہ میں مقیم ہے، جدید شعراء کے لئے مغتنماتِ زمانہ میں سے تھے انہیں کی صحبتِ فیض [illegible] نے ضیاءؔ انصاری کی شاعری کو تابندگی بخشی، ترقی پسند تحریک نے ایک نیا لہجہ و رنگ عطا کیا، ضیاء انصاری اچھے مقرر ہیں سہ

قدم قدم پہ سجائے گئے ہیں دار و رسن — یہ اہتمام ہے ہم سرکشوں کے سر کے لئے

دیکھو ہمارے حال پہ لوگو! ہنسو نہ تم — ہم پر بھی ہنسنے والے دعا کو ترس گئے

عبدالجبار عاجزؔ پرتابگڈھی (ولادت ۱۹۴۰ء): رنگون در پرتابگڈھ سے مراجعت کی تو دھولیہ میں مستقل آباد ہو گئے، مزدور تحریک سے وابستہ رہے، کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم ساتھی ہیں، زنداں میں بھی حق گوئی کی زبان کھلی رہی سہ میں ترجمانِ حق ہوں بھلا مجھ کو کیا غرض — دنیا کو میری بات بھلی یا بری لگے۔ کچلے ہوئے طبقے کے لئے بڑا دردمند دل رکھتے ہیں سہ

غم کا جھونکا تو مرے گھر کی طرف سے گذرا — اترا اترا ہے ترے شہر کا چہرہ، کیسے

بخشی ہے غم نے درد کی کھیتی ہری بھری | لو آج ہم بھی صاحب جاگیر بن گئے

محمد عباس ابن ابراہیم انصاری (ولادت ۱۹۱۹) آپ کے بھائی محمد ایوب صابر نے آپ کی پرورش کی، مقامی پرائمری اسکول میں مدرس رہے، گھر کی ادبی فضا اور شہر کی شعری فضا نے آپ کے ذوقِ شعری کی نشو ونما کی اور حنیف دھولیوی کی نظر کرم نے فیضان بخشا آپ کا کلام متعدد رسائل وجرائد میں شائع ہوتا ہے۔

غرور ناز و تغافل شکیب و عجز و نیاز | وہ حسن کا ہے طریقہ، یہ عاشقی کا چلن
غم کونین بے مانگے ملا ہے | مرے ذوقِ طلب کا پوچھنا کیا

مولانا عظیم اللہ مومن عاصی: دینی فکر وخیال کے حامل بزرگ شاعر ہیں۔ غزل، نعت اور منقبت پر یکساں عبور رکھتے ہیں، ایک مجموعہ چھپ چکا ہے پہلے عاصی تخلص کرتے تھے لیکن چونکہ مومن باصفا ہیں اسی لئے کچھ تقوی کی مناسبت سے استاد اکرم دھولیوی نے انہیں عاصی سے مومن بنا دیا۔

سعید احمد عدم (ولادت ۱۹۲۱): بچپن سے مزاج شاعرانہ تھا، کچھ گھریلو ماحول نے جلتی پر آگ کا کام کیا، دھولیہ کے کہنہ مشق شاعر ظفر نے دیکھا کہ ”ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں ہے“ ـــ تو التہاب شعر گوئی کی آگ بھر دی۔ انجمن فروغ ادب سے وابستہ ہیں۔

سکوں کی آرزو اس وقت شاید ہو سکے پیدا | پریشانی گراں گذرےگی جب قلب پریشاں کو
عاجز ہے عقل و دانش، ہر سمت ہے اندھیرا | اک دل جلے تو سب کچھ آجائے روشنی میں

سعید احمد عقاب (ولادت ۱۹۲۷)۔ شہر کے نامور شاعر منشی محمد صدیق عاشق کے صاحبزادے ہیں، فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری کے نواسے اور شفیق راز یزدانی کے چھوٹے بھائی ہیں یعنی جب ہوش سنبھالا تو شعر وسخن کی روایات نوشتۂ دیوار بنی ہوئی نظر آنے لگیں، شاعر بن کر ابھرے تو شہرت کے آسمان پر پہنچے، ادب کا قلم ہاتھ میں لیا تو کئی رسائل وجرائد کے قرطاس روشن ہو گئے، سیاست کے میدان میں کودے تو یکہ تاز شہسوار بن گئے، بڑے کامیاب مقرر ہیں، مالیگاؤں کی ادبی وعلمی فضا میں اکیس برس تک سانس لیتے رہے پھر تازہ دم ہو کر وطن لوٹے ہیں اور وہاں کی ادبی وعلمی سرگرمیوں کے روحِ رواں بن گئے ہیں، چھوٹی بحر کے کوزے میں بڑی بات کا دریا بند کر دیتے ہیں۔

کیسے جذبات کے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں | بات بے ربط بھی رہتی ہے تو کہہ جاتے ہیں

موت کا جب خیال آتا ہے — زندگی میں سکون پاتا ہوں

نازک بدن گلاب سا — بالکل ترے شباب سا

یوں تو نہیں وہ آفتاب — لگتا ہے آفتاب سا

علیم اختر علیم (ولادت ۱۹۳۴): دھولیہ کے کہنہ مشق شاعر محمد موسیٰ کلیم کے صاحبزادے ہیں، شاعری آبائی میراث ہے، والد سے علم وفن کے رموز حاصل کئے اور غزل لکھنے لگے آپ کے صاحبزادے نعیم بھی شاعری کی نعمت سے نوازے گئے ہیں ؎

صرف اتنا یاد ہے انہیں دیکھا تھا ایکبار — پھر اس کے بعد آنکھ سے تاب نظر گئی

کہیں کچھ دیکھنے کا ان کو آیا ہے شعور — ورنہ اہل نظر میری نظر دیکھا کئے

مولانا عبدالوہاب حامد انصاری: موسیٰ کلیم کے چھوٹے بھائی ہیں نعت لکھتے ہیں، جب پڑھتے ہیں تو سماں بندھ جاتا ہے۔

کلیم محمد موسیٰ ابن روشن ضمیر (ولادت ۱۹۱۰) موسیٰ کی مناسبت سے تخلص کلیم رکھا تصوف سے دلی لگاؤ تھا والد بھی "روشن ضمیر" تھے۔ دھولیہ کے استاد شاعر غریب سے اصلاح لی پھر حنیف دھولیوی کی طرف مائل ہوئے۔ علم و ادب کی شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ کچھ دنوں سوتیلے باپ حاجی امام الدین کے زیر سایہ بھیونڈی میں رہے لیکن پہنچے وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اللہ سمیع و بصیر نے لحن داؤدی سے نوازا تھا، سوز بھری آواز میں جب نعتیہ کلام پڑھتے تھے تو تصورات میں عشق رسالت مآب کے گلہائے عقیدت کھلنے لگتے تھے ؎

طور پر کیا اٹھے نگاہِ کلیم — اب تو نظروں میں ہیں خد و خال

وہ تو یہ کہو ہم کو آسرا جنوں کا تھا — ورنہ کون سی آفت عشق میں نہ پیش آئی

یہ زمانے کی کجروی کیا ہے — آدمی کیا تھا آدمی کیا ہے

محمد نورانی نور (ولادت ۱۹۳۰): غزلیں اور نظمیں لکھتے ہیں، اشتراکی خیالات نے شاعری کو نیا موڑ دے دیا، 'عوامی زندگی' نام سے سنہ ۱۹۷۰ء میں پرچہ نکالا پھر ہفت روزہ 'یورش' کا اپنے رفقائے کار ضیا انصاری اور شبیر اقبال کی باہمی معاونت سے اجرا کیا ؎

خیر اب باقی نہیں زنجیر کی — دے کے انگڑائی وہ دیوانہ اٹھا

بچ کر نکلے جب طوفاں سے — ساحل بھی بیگانے نکلے

ہدی نعمانی (ولادت ۱۹۲۲ء): حضرت غریب دھولیوی کے تلمیذ ہیں انہیں سے فارسی پڑھی اور شاعری میں قادر الکلامی حاصل کی۔

ان کے ہاتھے پہ سینکڑوں بل ہیں | آگئی دل میں برہمی کب سے
آپ اور مجھ سے التماس کریں | بات کیلئے یہ بے بسی کب سے

خاندیش کے انصاری شعرا کا تذکرہ "سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے" کا تقاضی ہے۔ "منتشر خاکے" کے فاضل مرتبین نے "حروف تہجی کے حساب سے دور متقدمین، متوسطین و متاخرین شعرائے دھولیہ کی ایک نامکمل مگر جامع فہرست دی ہے جس میں ایکسو ستانوے ۱۹۷ شعرا حضرات کے اسمار گرامی ملتے ہیں۔

پونہ کی ادبی سرگرمیاں

تعلیم کا مرکز پونہ بڑا معتدل موسمی مزاج رکھتا ہے، فیضی جب احمد نگر کی سفارت پر دکن آیا تو اپنی مکتوبات میں جو لطیفۂ فیاضی میں شامل ہیں دکن کی آب و ہوا کے اعتدال کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس کی ہوائے اعتدال ہوائے شیراز کی یاد تازہ کر دیتی ہے جرائے گل تو فرزندم تر بوئے کسی داری۔ اورنگ زیب جب دکن آیا تو یہاں کی خوشگوار ہوا سے اس کی طبع خشک کو بھی ترکے بغیر نہ رہی۔ وہ برسات کا موسم احمد نگر یا پونہ میں گذارتا تھا جیسا کہ خوافی خاں لکھتا ہے۔ اس نے پونہ کا نام محی نگر رکھا تھا، مگر اس نام کو حیاتِ جاوداں نہ مل سکی، انگریزوں کے عہد سے یہ فوجی کیمپ رہا ہے اور اسی "اردو گاہ" کے سبب 'اردو' کو فروغ ملا، فوجیوں میں اہل سیف کے ساتھ اہل قلم نہ ہوں لیکن اہل ذوق ضرور موجود رہتے ہیں، مشاعروں کے انعقاد سے تسکین کو ہم نہ رو میں جو ذوقِ نظر ملے — کی شکایت دور ہو جاتی تھی اور مشاعرہ۔ ادبی دنگل کی طرح پونہ کی ادبی و شعری روایات کا حصہ بن گیا جس میں مرہٹی اور اردو اور پنجابی کے شعرا حصہ لیتے تھے۔ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے شعرا بھی پونہ میں اکٹھا ہونے لگے تو یہاں سے شعر و شاعری کی گونج بلند ہونے لگی۔ متور، وحشی، خاکؔ پونوی، شاد پونوی، موج قریشی، سلیم پونوی[۱] وغیرہ

---

[۱] پونے میں اردو شعر و شاعری کی گونج۔ امین تابش۔ قومی راج مئی ۱۹۷۶ء

کے اسمائے گرامی سے کان آشنا ہو گئے۔ مرحوم یہاں کے ادبی دنگلوں کے بانی تھے۔

سلیم اللہ پونوی (۱۸۹۸-۱۹۵۲) مالیگاؤں کے شعرا پر بڑے متاثر تھے، طالب مالیگانوی کو استاد تسلیم کر لیا اور مشقِ سخن کے بعد خود ان کو استادی کا مرتبہ حاصل ہو گیا دکن کا یہ حصہ سلیم پونوی اور ان کے شاگردوں کی ادبی سرگرمیوں سے معمور ہو گیا اور پونہ مرکزِ علم و ادب کی حیثیت اختیار کر گیا، ان کے تلامذہ میں یہ نام ملتے ہیں نیر سلیمی پونوی، شوق پونوی، نثار پونوی، حبیب پونوی، حنیف ساغر اور منشی عبدالباقی باقی جو سلیم صاحب کے بھتیجے تھے۔ حلقۂ تلامذہ بھیونڈی تک پھیلا ہوا تھا، سلیم پونوی کا مجموعۂ کلام "ساغرِ دمینا" کے نام سے "خمخانۂ ادب" میں برسوں تک بلا کشانِ شعر و سخن کی تشنگی بجھاتا رہا، نمونۂ کلام:

ارمانوں میں ہوا ہے جنوں، الٰہی خیر | اپنا مکان خانہ بدوشوں کا گھر نہ ہو
زنداں میں بھی لے پہنچی خبر آتشِ گل کی | کم آگ لگانے میں نہیں بادِ صبا بھی

حنیف ساغر: سلیم کے بڑے قابل شاگرد تھے اور صحیح جانشین ثابت ہوئے نئے عہد کی نئی آواز بن کر ایوانِ ادب میں گونجتے رہے، امین تابش اپنے مضمون "پونے میں اردو شعر و شاعری کی گونج" میں رقمطراز ہیں:

"حنیف ساغر نے بہت ہی محتاط انداز میں اپنی شاعری کو نیا موڑ اور ایک نئی سمت دی ہے جس میں جدید رویّہ بھی ہے اور کلاسیکل شاعری کی رسلاہٹ کا تجربہ بھی۔ حنیف ساغر کی آواز میں آواز ملانے والوں میں زاہد کمال، سلام فرزدی اور دمال خمر کے نام آتے ہیں۔ یہ شعرا آج کے جرائد "کتاب" (لکھنؤ)، "شب خون" (الہ آباد) اور "شاعر" (بمبئی) میں چھپ رہے ہیں۔"

حنیف ساغر کی شاعری میں 'جدیدیت' کا عنصر بھی موجود ہے اور جدید لب و لہجہ ان کی شاعری کی معنویت اور ایمائیت پر ابہام کا مہین خول چڑھا دیتا ہے۔

میں اپنی ہی تصویر کو یوں دیکھ رہا ہوں | جیسے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی سے ملا ہوں
میں صبح کا تارا ہوں مری عمر ہی کتنی | لیکن میں اندھیروں کو کفن دے کے چلا ہوں

۔۔۔ نئے لب و لہجہ اور نئے رجحانات نے کہنہ مشق شاعروں کو بھی اس نئی جہت سے روشناس کر دیا، نظرت سرمدی، حکیم رازی، سحر جلگانوی، نشتر اکبر آبادی جو برسوں پونہ میں مقیم رہے، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

حکیم رازی ادیب اشرفی کا تعلق مالیگاؤں سے تھا انہوں نے اپنے محترم استاد دادِ ادب

مالیگانوی کے مرنے کے بعد ان کی نظموں کا انتخاب "چراغ رہگذر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ خود بھی بڑے خوش فکر شاعر ہیں ؎

تو بھی زلفیں سمیٹ لے اپنی | دیکھ سورج نکل رہا ہے ابھی

نشتر اکبرآبادی اور فطرت سرمدی بھی نئے لہجوں اور نئی روایتوں کے شاعر تھے، دوسرے شعراء میں ڈاکٹر امانت، عزیز نقری، عکسی برنی، ابراہیم فیض۔

پروفیسر دستگیر شہاب (۱۹۱۵ - ۱۹۸۹) واڈیا کالج پونہ میں برسوں تک اردو فارسی کے استاد رہ کر خدمات انجام دیتے رہے، وہ پونہ یونیورسٹی کے اردو فارسی کے شعبے کے صدر بھی تھے، ادبی و شعری سرگرمیاں تادم مرگ جاری رہیں۔ ۱۹۸۳ء میں انھوں نے عمر خیام کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ "بادۂ خیام" کے نام سے شائع کر کے ایک منظوم ترجمہ نگار شاعر کی حیثیت سے اپنی بہترین صلاحیتوں کا ثبوت فراہم کیا، پروفیسر موصوف "تیاتیا" کے عالم تھے انھوں نے اسرار خودی (اردو تضمین ترجمہ) ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع کیا اور اسی مہینے جب ان کی یہ آخری اولاد معنوی منظر عام پر آئی وہ خود دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کی تصانیف میں دو شہروں کی کہانی اور بھٹور سنگیت کار بھی شامل ہیں، آپ کے "شہابی" شاگردوں میں، ایولہ آپ کے وطن کے زیڈ عابد شہابی سب سے زیادہ مشہور ہیں پروفیسر شہاب ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

سوچتیں ہیں سب یہ ماہ و سال کی | یہ زمانہ ہے میرا چہرہ نہیں
آجکل انسان وہ انسان ہے | دوش پر جس کے کوئی چہرہ نہیں

نیر سیلی کو سلیم پوزی کی جانشینی کا شرف حاصل ہے اپنے تخلص کو بڑی خوبیوں سے مقطع میں برتتے ہیں ؎

پڑ گئی ماند سحر اور ہوئی شام اداس | سن کے بربادیٔ نیر کو دو عالم روئے
مرے دل کا ہر داغ سورج ہے نیر | مرے آگے تاروں کی تنویر کیا ہے

پونہ سے کئی ادبی رسائل بھی نکلتے تھے، عزیز نقری نے ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ "دلی" نکالا جس نے چار ادبی کرامتوں کے ظہور کے بعد پردہ کر لیا، سحر جلگانوی نے ۱۹۶۵ء میں ہفتہ وار اخبار "کاتب" کا اجرا کیا اور پھر اس کا قلم بھی چار برس کے بعد تھک گیا۔
پونہ ایک زمانے میں ترقی پسند مصنفین اور مہاراشٹرا کی شعراء و ادباء کا مرجع تھا،

یہاں ادبی دنگل اور شاندار مشاعرے ہوتے تھے اور کانفرنسیں ہوتی تھیں چنانچہ ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کا سالانہ اجلاس یہاں بڑے تزک و احتشام سے منعقد ہوا تھا آنریبل سر ابراہیم جعفر کے زیر اہتمام دیوان بہادر ریاست جوناگڑھ کی صدارت میں یہ تاریخی جلسہ انعقاد پذیر ہوا جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، سر علی محمد خان دہلوی، سر حسین شہید سہروردی، بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو جیسی بلند پایہ ہستیاں موجود تھیں۔

— اور اب یہاں ادبی سناٹا چھایا رہتا ہے، کبھی کبھار کسی ابھرتے ہوئے گمنام شاعر کی آواز سے خاموشی گنگنا اٹھتی ہے، یا کسی خاتون افسانہ نگار کے جیسی خورشید نگہت جن کے افسانے بیسویں صدی وغیرہ میں مہک اٹھتے ہیں — اور کبھی ڈاکٹر ش۔ زماں انصاری کی آواز جو نیشنل ڈیفینس اکیڈمی دکھڑک واسلہ پونہ) میں اکیڈیمک آفیسر رہ چکے ہیں۔ بڑی دلنواز شعر و نغمہ میں ڈوب کر ساری فضا پر چھا جاتی ہے۔

الفاظ کی لاشوں کا تعفن ہے فضا میں — معنی کی ہواؤں میں دھواں ڈول رہا ہے

کیا کہتے ہو رستہ ابھی موسم نہیں گل کا — سناٹا درختوں پہ ابھی بول رہا ہے

اُنتیسواں باب

مالیگاؤں کی انصاری برادری

درود فصلِ بہاراں کا فیض ہے کہ حفیظ
مثالِ خُلد مرا شہر بھی لگے ہے مجھے (حفیظ مالیگانوی)

گرنا ندی اور موسم ندی کے سنگم کے دونوں کناروں کا دوآبہ بڑا زرخیز تھا اور جب یہ آباد ہوا تو مردم خیز بن گیا۔ ایک طرف بلندی پر سمکیسر (سنگمیشور) کا گاؤں تھا اور دوسرے کنارے پر وسیع اور کھلے میدان میں لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے زمردیں حصاروں سے گھرا ہوا مالی واڑی کا قریہ تھا، سمٹا سمٹا اور مختصر سا گاؤں جس سے پرے پتھریلا میدانی علاقہ تھا اور اطراف میں سُرمئی رنگت کی پہاڑیاں پہرہ دے رہی تھیں۔

مالی واڑی کی بستی بڑھی تو مالیگاؤں نام پایا، شمالی ہند کو مغربی ہند اور دکن سے ملانے والی شاہراہ پر یہ عام گذرگاہ تھی، یہاں سے مغلوں کے منصبداروں کے لشکر بھی گذرتے تھے اور مرہٹہ سرداروں کے فوجی دستے بھی ان میں بیجاپور کے رگ ویدی برہمن گھرانے کا ایک نوجوان نارو شنکر بھی تھا جسے باجی راؤ پیشوا نے "رو شنکر راجہ بہادر" بنا دیا اور "موتی والا" کے خطاب سے نوازا اور محمد عزالدین غازی بادشاہ عالمگیر ثانی نے فرمانِ جاگیر دے کر ۱۹ گاؤں کا جاگیردار بنا دیا ان میں مالیگاؤں شامل تھا۔

یہ عہد مغلیہ کے زوال کی شام تھی جس کی دُھندلی شفق آفتِ سیاست پر سُرخ ہوتی جا رہی تھی۔ نارو شنکر نے مالیگاؤں کو اپنا مستقر بنایا اور حفظ ما تقدم کے طور پر ایک قلعہ سنہ ۱۷۴۰ء میں بنوانا شروع کیا کیونکہ اس کی دور اندیشی نے اس ڈوبتی شام میں گردے ہوئے لوگوں کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بیس سال بعد قلعہ مکمل ہوا اور سمکیسر کی بستی نے باہیں پھیلا کر مزدوروں، معماروں، سنگتراشوں اور ملازموں کو اپنی گود میں بسا لیا۔

قلعہ کا حفاظتی دستہ عرب تنخواہ دار سپاہیوں پر مشتمل تھا ان میں کچھ مصری فوجی بھی تھے لیکن بیشتر حصہ حضرموت اور عیدروس قبیلوں کے لشکریوں کا تھا جو سورت اور بھڑوچ سے آئے

تھے جہاں ان کے آبا و اجداد مظفر شاہی حکومت کی فوج میں تنخواہ دار (یا بھاڑے کے) سپاہی کی حیثیت سے ملازم تھے[1] یہ بڑے بہادر، جرّی اور وفادار تھے لیکن بشرطِ استواری و رنہ ان کی سرکشی سے سینکڑوں سر اعتدار کے کٹ جاتے، ۱۸۱۸ء میں انگریزی فوج ان فوجیوں کی سرکوبی اور قلعہ کو سر کرنے کے لئے سر اٹھائے چلے آئے اور سبھوں کو سرنگوں کر دیا ــ چونکہ مالیگاؤں جغرافیائی اعتبار سے انتہائی اہم فوجی گذرگاہ آگرہ روڈ پر واقع ہے انگریزی فوج نے دور ایک وسیع میدان میں چھاؤنی ڈال دی، عرب خاندانوں اور راجہ کے اہلکاروں اور عملداروں نے بھی ڈیرے ڈال دیئے اور اس طرح ۱۸۲۷ء میں سقوطِ سمکیسر کے دس سال بعد مالیگاؤں میں چند ہزار نفوس نو سو مکانات میں آباد ہو گئے اور شہر کے قریب دکانیں چمک اٹھیں ــ صنعتِ پارچہ بافی مقامی سالی، کوشٹی اور مرہٹہ بنکروں کے ہاتھوں میں تھی۔ دیارِ پورب اور بنگال کے مسلم بنکر ابھی تک اپنی اپنی کارگاہوں میں وہیں آڑا پائی چھیدائے بُننے بننے میں مصروف تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا زوال شروع ہو چکا تھا۔

مالیگاؤں اور سمکیسر میں مرہٹہ اور عرب کثیر تعداد میں آباد تھے، سمکیسر قلعہ کے حفاظتی دستہ میں روہیلہ سپاہی شامل تھے جن کا ایک محلہ آباد تھا یہ قلعہ کی چوکیداری کرتے تھے، جب انگریزوں نے ۱۸۱۸ء میں قلعہ فتح کیا تو یہ دستہ برخاست کر دیا گیا۔ اورنگ آباد اور دولت آباد کے مسلم خاندان بھی بسلسلۂ ملازمت آباد تھے۔

عربوں میں سید محمد ادریس (عیدروس) کو گوپال راؤ راجہ بہادر نے ۱۷۹۰ء میں زمین انعام میں دی تھی۔ یہاں انہوں نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو سلیت میاں کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی اسی نام سے قبرستان بھی مشہور ہوا، ایک دوسرے عرب سید علی کرمانی کا مزار بھی ہے۔ ملازمت ختم ہونے کے بعد کئی عرب بجائے سورت اور گجرات لوٹنے یا اپنے آبائی وطن حضرموت جانے کے مالیگاؤں میں آباد ہو گئے جن کی اولاد "مولدین" ابھی بھی مالیگاؤں میں "سنادیہ عرب" کے اندر پیدا ہوئے باقی ہیں، یہ عموماً جمعداری کرتے تھے اور اسی نسبت سے موسوم تھے۔ محمود بن حسن جمعدار نے بھی اپنی انعامی زمین پر ایک مسجد بنوائی اور سرائے تعمیر کی یہ "مسجد غریبیہ" بھی اول الذکر مسجد کی طرح قدیم ترین ہے۔ دکھنی مسلمانوں کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کے

---

[1] مرآتِ احمدی (فارسی) حصہ ۲ ۔ ص ۴۳

زمانے میں یہاں کچھ کچھی اور میمن بھی بسلسلۂ تجارت آکر آباد ہوگئے تھے، سکمیسر میں ایک قدیم جامع مسجد تھی جس کے امام ایک دکنی مسلمان محبوب خان تھے جنہوں نے اردو کے عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کی تین ہفتوں کے قریب میزبانی کی تھی۔ ابراہیم خان روہیلہ آگرہ سے مغلیہ حکومت کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر اسی سکمیسر میں آباد تھا، اس علاقے میں زیادہ تر فوجی اور سپہ گری پیشہ والے آباد تھے۔ گرنا اور موسم ندی کے سنگم پر ایک نامعلوم پیر بھیکن شاہ کا مزار ہے جہاں عہد رفتہ میں عرس ہوا کرتا تھا، بھیکن شاہ اسی عرب عیدروس کے یٰسین میاں تکیہ میں رہتے تھے راجہ گوپال راؤ بھی اس درویش کے معتقد تھے یہی شاید پیر صاحب کی سب سے بڑی کرامت تھی، چڑھاوے شروع ہوگئے اور زائرین کی تعداد بڑھتی گئی اور ہر سال عرس کا رجحان بڑھتا گیا۔ یٰسین میاں کے قبرستان میں ایک عرب رحیم شاہ کا بھی مزار ہے، ان قدیم یادگاروں کے علاوہ بھاؤ میاں کی مسجد (سنہ ۱۸۲۹ء) بھی قدیم ہے۔ عیدگاہ کی تعمیر ایک عرب جمعدار دلاور خان نے سنہ ۱۸۱۶ء میں کی اور وہیں مدفون بھی ہے۔ [1]

مہاجرین انصار کی مالیگاؤں میں آمد

مومن۔ انصاری برادری کی ہجرت کی ایک مسلّمہ تاریخ، واقعہ اور حقیقت ہے۔ لیکن اس مفروضہ میں چند نکات بحث طلب ہیں عموماً سنہ ۱۸۵۷ء کا پُرآشوب زمانہ اور بنگال کی خشک سالی کا سنہ ۱۸۶۴ء کا دور۔ ہجرت کے نقطۂ آغاز قرار دیے جاتے ہیں۔ یہ صحیح بھی ہے لیکن کلکتہ، بمبئی، مدراس، حیدرآباد، سورت اور دیگر نوابیوں اور رجواڑوں میں انصاری ماہر دستکاروں کے وجود کے ثبوت ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی فیکٹریوں کے ریکارڈز میں ملتے ہیں [2] جو اس دور سے قبل کے ہیں۔ مالوہ کی مہارانی اہلیا بائی ہولکر (۱۷۶۵-۱۷۹۵) نے اپنی راجدھانی مہیشور میں دستکاروں کی بستی بسائی تھی۔ مالیگاؤں میں بھی مقامی بنکروں نے بافندگی کو عروج پر پہنچا دیا تھا یہاں تک کہ یہیں سے کپڑوں کے تھان عرب فوجیوں کے حفاظتی دستے کے ساتھ باہر بھیجے جاتے تھے۔ پنڈاری لٹیروں نے سارے خاندیش میں برپا

---

[1] پیشوا دفتر (پونہ)، حوالہ: ۱/۹

سے لے کر مالیگاؤں تک لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مالیگاؤں کے ایک روزنامچے میں جو ذیقعدہ ۱۲۳۳ھ کو پیشوا کے حضور بھیجا گیا تھا یہ خبر دی گئی تھی کہ مالیگاؤں قلعہ پر کرناٹکی باغی لنگایا جمعدار نے اپنے دستے کے ساتھ شبخون مارا، جس کا مقابلہ گوپال راؤ راجہ بہادر کے عرب اور کچھ مصری فوجیوں نے دلیری سے کیا۔ راجہ بہادر نے کسی وجہ سے سلطان جمعدار عرب کو اس کے دستے کے فوجیوں کے ساتھ برطرف کر دیا۔ پنڈاروں کے تمام مالیگاؤں سے بولکر کی فوج کو فراہم کیے جاتے تھے۔

مہاجرین انصار جب یہاں پہنچے تو قلعہ کی بلند برجیوں نے ان کے قدم روک لیے اور دور سکمیہ چندن واڑی اور مالی واڑی سے کرگھوں کے اٹھتے ہوئے شور سے ان کے کانوں میں رس ٹپکنے لگا اور دور دور تک میدانوں میں پھیلے ہوئے آڑ اپائی کے تانے بانوں نے ان کے خوابوں کو جنم دینا شروع کر دیا۔ اور یہی ان کی مستقل سکونت کی تعبیر بن گئیں۔

یہاں چند سال پہلے سے ٹانڈہ (اجودھیا) کا مہاجر انگنو سیٹھ کا خاندان آباد ہو چکا تھا۔ انگنو سیٹھ ہنومان گڑھی کے جہاد سے منہ پھیر کر بھاگے تھے۔

مہاجر علمی خانوادے

مشرقی اضلاع سے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے پیدل چلتے ہوئے منزل بہ منزل قافلہ در قافلہ آتے رہے اور آباد ہوتے گئے۔ ان میں صناع، دستکار اور بنکر ہی نہیں حفاظ، علماء دین، تاجر اور فقیر سب ہی تھے جو چند ممتاز خاندان سکمیہ میں آباد ہوئے ان میں حافظ مرزا کے والد کا گھرانہ تھا جو ضلع پرتاب گڑھ کے قصبہ لال گنج سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ مولانا محمد اسحق مستقیم جو ایک عظیم علمی محسن تھے آپ کے بھانجے تھے منشی عظیم اللہ مدنی کے والدین بھی دیوریہ سے ترک وطن کر کے آئے اور قلعہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہیں مولوی عبدالرحیم کوثر کے والدین بھی تھے اور ۱۸۹۲ء میں یہ پیدا ہوئے۔ سکمیہ میں منشی عبدالوہاب صاحب کا گھرانہ آباد تھا اور دوسرا منشی خانوادہ منشی ولی اللہ ثاقب کا تھا، ان کے گھر کے افراد ایک تباہ شدہ بے خانماں قافلے کے ساتھ مالیگاؤں آئے اور محلہ سکمیہ میں پناہ لی، منشی ولی اللہ ثاقب کے ساتھ ان کے چھوٹے بھائی صفی اللہ صفی بھی تھے۔ یہ گھرانہ سیونت ضلع الہ آباد کا تھا۔ ایک تیسرا منشی خاندان مدار اللہ مدعا کا تھا جب یہ والدین کے ساتھ آئے تو صرف تین سال کے تھے، یہ قافلہ بھی ۱۸۵۷ء

کے ہنگامہ خیز دنوں میں نقلِ مکانی کرکے سمکیر میں آباد ہوا تھا۔

یوپی سے سینکڑوں خاندان ترکِ وطن کرکے اس طرح آباد ہوتے گئے اور مالیگاؤں کے مختلف جگہوں میں بس گئے، جن کے دم قدم سے کئی نئے محلے آباد ہو گئے۔ منشی عبدالکریم خادم مئو اعظم گڑھ میں ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے اور نیا پورہ میں بود و باش اختیار کی، اسی محلہ میں منشی محمد شعبان (ولادت ۱۸۷۰ء) کے والدین آکر بس گئے۔ مئو ہی سے منشی الٰہی بخش تسلیم کا علمی خانوادہ ہجرت کرکے آیا اور "بدر کا باڑہ" میں بس گئے۔ اسی بدر کا باڑہ میں مولانا عبدالرحمٰن آثر کے والد عنایت حاجی اعظم گڑھ سے آکر سکونت پذیر ہوئے۔ ایک باڑہ آزاد نگر مصری خان کا باڑہ ہے۔ مبارک پور سے ایک منشی خاندان جو عباد اللہ صفدر کا تھا یہاں آباد ہوا۔ یہیں آٹھ سال بعد ۱۸۷۵ء میں تولد ہوئے۔ منشی محمد جوہر (ولادت ۱۸۸۲) کا ممتاز مجاہد خاندان مظفر نگر سے چل کر آیا اور نیا پورہ محلہ میں بس گیا۔ سلطان پور سے محمد ابراہیم خلیق کے والدین آکر پہلے بمبئی میں جا بسے پھر مالیگاؤں قسمت آزمائی کے لئے آئے اور جونا جھٹی میں بس گئے۔ بدر کا باڑہ میں حکیم عبدالحمید فاروق کا علمی خاندان آباد تھا، ملا عبدالرحمٰن حکیم جی کے والد تھے۔ مولوی محمد یحییٰ انور کا گھرانہ یوپی سے آکر جونا جھٹی میں پناہ گزیں ہوا۔ اسلام پورہ کے نئے محلے میں یوپی کا منشی خاندان عبدالغفور خنداں کا آباد تھا۔ آپ جب یوپی اپنے وطن سے نکلے تو دس بارہ سال کے تھے۔ یہ سارے خاندان علمی و ادبی فضیلت رکھتے تھے اور عموماً منشی، عرفیت سے معروف تھے جو ان کی اردو اور فارسی میں دستگاہ اور فضیلت کا اعتراف تھا۔

اعظم گڑھ کا پورا ضلع علم و فضل اور دانش و ادب کا گہوارہ تھا، اور سارے قریات و قصبات علوم دینیات کے مرکز تھے۔ یہیں کے معروف قصبہ "پورہ معروف" سے مولانا عبداللہ کا علمی خانوادہ ہجرت کرکے مالیگاؤں گیا۔ قصبہ معروف پورہ وہ زرخیز بستی ہے جہاں مولانا محمد علی انصاری جو دینی علمی مکتب فکر کے ترجمان تھے پیدا ہوئے۔ یہیں مالیگاؤں شہر کے ارض یتیم بہتری شخصیت اور نابغہ روزگار ہستی مولانا عبداللہ ولد شیخ محمد تولد ہوئے۔ مولانا نے اس شہر میں ایک عظیم درسگاہ بیت العلوم کی بنیاد ڈالی۔ جو سرچشمہ فضل و دانش کا سرچشمہ تھا بلکہ شعر و ادب کا سوتا بھی یہیں سے پھوٹا۔

مولانا محمد یوسف عزیز جو مومن برادری کے مایۂ ناز فرزند تھے مئو ناتھ بھنجن سے تعلق رکھتے تھے۔ علمائے دین اور شعرائے کرام میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا عبدالحمید نعمانی جو

معہد ملت کے بانی ہے۔ مردم خیز خطۂ مبارک پور سے آبائی تعلق رکھتے تھے جہاں سے مولانا کے دادا خانہ ویرانی اور بے سروسامانی کی حالت میں نکل کر مالیگاؤں پہنچے تھے۔ مولانا کے والد حاجی عظیم اللہ پیارے حاجی کے نام سے مشہور تھے۔

حضرت مولانا عثمان بانی جامعۃ الصالحات کے دادا عباد اللہ یو۔پی بارہ بنکی ضلع کے مردم خیز قصبہ سعادت گنج سے پیدل چل کر بمبئی آئے، یہاں ایک مل میں مزدوری کی۔ پھر چھوٹی بہن کو کاندھے پر لادے مومنوں کی بستی سمکیر پہنچے یہاں بارہ بنکی ضلع کے کئی خاندان آباد ہو چکے تھے، ان کے صاحبزادے مولانا محمد عثمان اپنے وقت کے علمائے ربانی اور فضلائے حقانی میں سے تھے عربی اور دینیات میں جامعۃ الصالحات خانہ لیش میں غالباً پہلا مدرسۂ نسواں ہے۔ یہ خاندان ابھی تک علمی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

ڈیرہ بابو گنج الہ آباد میں منشی مدار بخش کا دینی و علمی خاندان آباد تھا، اسی خاندان میں مالیگاؤں کے مشہور قاری اور مفتی محمد حسین پیدا ہوئے، ان کی بیوہ والدہ اپنے بھائی نبو پہلوان کے یہاں مالیگاؤں چلی آئیں جو نیا پورہ میں رحمانی مسجد کے پاس رہتے تھے۔

شہر مالیگاؤں کے پہلے مؤرخ ابوالعید مولوی محمد عبدالمجید وحید شرقی کے والد بزرگوار مولانا حافظ قاری محمد نصراللہ جو حافظ بابو کے نام سے مشہور تھے اعظم گڈھ سے آئے تھے، والدہ ولید پور کی تھیں۔ حافظ بابو نے بھوپال اور رانڈیر میں رہ کر علم دین کیا، مدرسہ نظامیہ بمبئی میں چار برس تک درس میں مصروف رہے جامع مسجد قدیم کے ... تھے۔ آپ کا انتقال ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء میں ہوا، مولانا شبیر احمد مولانا عبدالمجید وحید اشرفی کے عم بزرگوار تھے۔

ملا مولانا دین محمد بڑے متقی اور پرہیز گار تھے، مولوی عبدالسلام (متوفی ۱۳۲۱ھ) قدیم کی مسجد میں وعظ کرتے تھے، مسجد میں بارش پر نماز جنازہ کی بابت ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۳ء میں جو فساد ہوا تھا اس میں مولوی عبدالسلام اور مولانا محمد اسمٰعیل کے موعظ حسنہ کا جو مابہ النزاع رہا بڑا اثر تھا۔ ملا عبدالرحمٰن امام مسجد تکیہ تھے (متوفی ۲۴ ...ھ) مولوی محمد اسحٰق (م ۱۳۴۶ مطابق ۱۹۲۸ء) سمکیر میں رہتے تھے (دراج بس) کے صدیقی خاندان کے پہلے بزرگ منشی محمد سلیمان لال گنج سے مالیگاؤں آئے تھے فارسی اور عربی کے جید عالم تھے بڑے مترنم نعت خواں اور میلادی تھے گلستان و بوستان کے اشعار بڑی روانی سے پڑھتے تھے۔

مالیگاؤں کی علمی، دینی اور ادبی ہستیاں

مولٰینا عبداللہ (متوفی ۷ ؍مارچ ۱۹۰۰ء)

شہر مالیگاؤں علم و ادب، فضل و دانش اور صنعت و سیاست کا گہوارہ ہے۔ یہ زندہ دل انصاریوں اور شب زندہ دار مومنوں کا بیدار شہر ہے۔ یہ علمائے کرام کی آماجگاہ ہے اور اہل عرفان و معرفت کا گوشۂ عافیت، مولویوں کا ملجا اور شاعروں کا مرجع ہے یہاں مولانا عزیز مولانا نعمانی، مولانا وحید، مولوی کوثر، مولوی مداح، مولوی مجید، مولانا لبیب النوری، مولانا رازی اور مولوی محمد یحیٰی اختر جیسے عظیم المرتبت اہل علم و ادب پیدا ہوئے ہیں۔

اس شہر علم و فضل کے بانی ایک مرد خدا آگاہ، صاحب عزیمت بزرگ اور ردائے دین علم و عرفان مولٰینا عبداللہ تھے ام المدارس بیت العلوم کے مؤسس جس کے بنیادی ارکان میں مولٰینا کے نام کے ساتھ حکیم محمد اسماعیل (بڑے حکیم جی) قیام سردار اور خانصاحب حاجی محمد عثمان بھی نمایاں ہیں۔ مولٰینا نے علوم دینی کا جو پودا لگایا تھا اس کی آبیاری ان کے اولین شاگرد مولانا شاہ محمد اسحٰق مقصد نے بڑی جانفشانی کے ساتھ کی۔

مولانا محمد اسحٰق مقصد (۱۲۶۶-۱۳۴۶)

شہر مالیگاؤں کے عظیم علمی محسن، حریت کے پاسبان، مجاہد آزادی، صوفی باصفا اور شاعر خوش ادا تھے۔ مولٰینا عبداللہ نے آپ کو بیت العلوم میں اپنا جانشین قرار دیا، رجال سازی کا یہ سلسلہ مولانا محمد اسحاق نے آگے بڑھایا، منتہی طلبہ کی ایک خاصی تعداد درس نظامیہ میں فاتحۂ فراغت پڑھ کر اور فن تجوید و قرأت میں درجۂ تکمیل تک پہنچی تو ۱۳۴۲ھ مطابق ۱۹۲۷ء کو ایک عظیم الشان جلسۂ دستار فضیلت مشہور مفسر قرآن مولانا شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں منعقد کیا گیا جس میں فارغ التحصیل طلبہ کو دستار فضیلت اور سند قراءت دی گئی۔

مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا قاری محمد عثمان، مولانا قاری جمال الدین بیب، مولانا قاری محمد حسین اشرفی (مفتی کبار اشرفی)، مولانا محمد یوسف عزیز (استاد الشعراء) مولانا حافظ ثناء اللہ۔ مولانا محمد صادق۔ مولانا حافظ خدا بخش، مولوی محمد یوسف خرد، مولوی حافظ دین محمد اور مولوی حافظ عبدالحق۔

اس عظیم الشان جلسہ میں جن سات قرّا عظام کو نامور قاری مولانا محب الدین الٰہ آبادی کے دست مبارک سے سند دی گئی ان کے اسمار گرامی یہ ہیں مولانا محمد عثمان، مولانا جمال الدین مولانا قاری محمد حسن (اسلام پورہ) قاری عبدالستار، مولانا قاری محمد ثوبان، ماسٹر عبدالرحمٰن اور جمیل دھرن گانوی۔

مولانا عبدالحمید نعمانی (وفات ۱۹۸۳)

مولانا عبدالحمید نعمانی مجاہد آزادی تھے۔ خوابوں کی تعبیر معہد ملت کی بنیاد میں ڈھونڈھی اور اسی بنیاد پر مولانا کی قدر اور شخصیت ایک منارۂ نور کی طرح ایستادہ ہے۔ مالیگاؤں میں آپ کے کارناموں نے آپ کو آج تک یاد رکھا ہے وہ ہیں: دارالادب۔ ینگ مسلم کلب۔ انسداد بدعات: بھیکن شاہ کے عرس پر پابندی۔ طوائفوں کا اخراج۔ بیداری پرچہ و پریس کا اجرار۔ قلعہ چھاپ پکا رنگ کمپنی۔ اخبار اجمل بمبئی کی ادارت۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشریات۔ عربی تراجم۔ معہد ملت کا قیام اور فارغ التحصیل طلبائے ملی کا جامعہ ازہر مصر میں اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی سیاسی تربیت۔ انجمن ترقی اردو ہند کی خدمت۔ معہد ملت کے چند فارغ التحصیل طلبا ازہر سے سند لے کر آئے ہیں ان کے نام یہ ہیں: عبدالحمید ازہری (مالیگاؤں) نذیر احمد انصاری ازہری (مالیگاؤں) حافظ عبدالخالق ازہری (شولاپور) مختار احمد انصاری ازہری (مالیگاؤں) (بحرین قونصل خانہ) مولانا عبدالحمید ازہری۔

بیروت کے مشہور اہل قلم استاد جمیل بیہم کی کتاب المرأۃ فی التاریخ والشرائع کا ترجمہ کیا اور فلسفۃ الخلافت العثمانیۃ کے بہت سے اجزار کو اردو جامہ میں پیش کیا۔ تاج آفرینش آپ کی پہلی تصنیف ہے۔

مولانا قاری محمد عثمان (۱۹۱۰-۱۹۸۴)

بانی جامعۃ الصالحات مولانا قاری محمد عثمان کے علم و فضل، زہد و ورع اور تقویٰ کی بہت ساری مثالیں تاریخ کو یاد ہیں۔ مدرسہ ملت رسول جو اب معہد ملت کے نام سے عالمی شہرت کا حامل ہے اس کی تاسیس و قیام میں مولانا کا بھی وافر حصہ تھا، مولانا خود فاضل دیوبند تھے، عربی زبان و ادب پر بڑا عبور حاصل تھا زبان کی تبدیلیاں، لسانی خصوصیات

اور محاورات کے علاوہ صرف ونحو پر آپ کو قدرت حاصل تھی، انگنو سیٹھ کی مسجد کے پیش امام تھے اور ہر ہفتہ بڑا البصیرت افروز بیان دیتے تھے۔ مولانا عثمان اپنی جرأت، بیباکی اور حقانیت کے اوصاف کے سبب علمائے حق کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے، وہ صرف عالم دین اور کٹھ ملا نہ تھے ان کا علمی مرتبہ تفقہ فی الدین اور تقویٰ ان کے کردار کی عظمت کے ثبوت ہیں۔ ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔

مولانا قاری جمال الدین لبیب (ولادت ۱۳۲۶ھ)

ایک شعلہ بیان خطیب اور قادر الکلام شاعر تھے، ابتداءً کچھ روز اپنے والد محترم حافظ فیض اللہ سے جو مالیگاؤں کی بزرگ ترین ہستی تھے ناظرہ قرآن کی تعلیم حاصل کی پھر دس سال کی عمر میں اُم المدارس مدرسہ بیت العلوم کے گہوارۂ علم میں قرآن و تجوید کی تحصیل کی، اس خطہ کے سب سے قدیم استاذ فارسی مولانا محمد یوسف عزیز سے فارسی ادب کی تاریخ پڑھی، بیت العلوم سے دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد ۱۳۴۸ھ میں گجرات کی مشہور درسگاہ مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل میں مزید تحصیل علم کے لیے سفر کیا جہاں اکابر علماء کا پورا قافلہ موجود تھا۔ مولانا نے ان قافلہ سالاران علم سے زادراہ فضل و دانش حاصل کیا اور جب مالیگاؤں لوٹے تو سارے راستے اسی شہر میں سمٹ گئے۔ انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی۔

مولانا مفتی قاری محمد حسین اشرفی

آپ نے بیت العلوم سے فاتحۂ فراغت کے بعد مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد سے تجوید و قرأت کی تعلیم حاصل کی آپ کے اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن مکی، قاری محب الدین احمد اور قاری نعیم الدین جیسے ممتاز قرّاء اور علماء رہے تھے، دوبارہ اسی مدرسہ سبحانیہ میں داخل ہو کر قرأت سبعہ یعنی قرآن کو ساتوں لہجوں میں پڑھنے کا علم حاصل کیا۔ اسی مدرسے سے قاری عبدالرزاق اور مولانا قاری زین محمد تجوید و ترتیل کی تکمیل کر کے لوٹے تھے۔

مولانا مفتی قاری محمد حسین اشرفی علم الفرائض یعنی علم میراث میں تفرد رکھتے تھے اس دور میں بیت العلوم کے فتووں کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ قاری محمد حسین نے مفید الطالبین نامی کتاب بھی مبتدیان فن تجوید کے لیے مرتب کی نیز تحفۃ

الاطفال کی شرح مفید الاقوال کے نام سے شائع کی۔ قرأتِ سبع پر اردو میں اولین کتاب
تیسیر الطبع فی اجزاءِ السبع تصنیف کی جو دو جلدوں میں شائع ہو کر مختلف مدارس
میں داخلِ نصاب ہے۔ ساتھ ہی علم الفرائض پر ایک جامع کتاب سراج الوارثین سلیس
اردو میں تصنیف کی جو عوام کے لیے انتہائی مفید اور کار آمد ہے۔ ترکہ، میراث اور طلاق کے
مسائل میں قاری صاحب کے فتوے مستند اور مطلق قرار دیئے جاتے تھے۔

آپ کے شاگردوں کی تعداد کثیر ہے۔ مسجد قصاب باڑہ کے قریب ایک عظیم الشان جلسے
میں قاری شمس الضحیٰ، قاری محمد بشیر، قاری محمد ہارون، قاری محمد امین، حافظ قاری محمد
سعید، قاری عبدالرشید، قاری محمد صدیق، حافظ قاری محمد صابر، قاری عبدالاحد، قاری عبدالمجید
قاری محمد نذیر تابش، قاری عبدالخالق وغیرہ کو دستارِ فضیلت اور سندِ فراغت سے نوازا گیا۔
رجال سازی کا یہ سلسلہ بڑھتا گیا۔ مولوی قاری شمس الضحیٰ نے محمد الیاس، محمد ہارون، قاری
محمد حسن متادم اور محمد غفران کی تربیت کی، قاری محمد عمر خود قاری صاحب سے سندِ فراغت لے
کر مدنی مسجد میں تجوید کے مدرس بن گئے۔ قاری محمد حسن متادم شاہی مسجد میں قرأت کی تعلیم
میں مشغول ہو گئے اور حافظ قاری محمد سعید بھی اس فن کو فروغ دے رہے ہیں۔

مولانا محمد یوسف عزیز

برادری کے مایۂ ناز فرزند تھے اور اس کے لیے ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ ذی استعداد
ندوی کے جید عالم، مدرسہ بیت العلوم کے فارغ تھے اور دستارِ فضیلت سے نوازے گئے
تھے، تمام اہلِ علم کے استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ مجاہدِ آزادی تھے قومی اور ملی تحریکات
کے روحِ رواں رہے۔

مولانا حافظ ثناء اللہ

مالیگاؤں میں محرم کے ادبی دنگل کے ساتھ 'ذکرِ شہادتین' کی مجلسیں بھی منعقد

۱؎ ناشر مؤلف نقوش، حفیظ مالیگانوی ان چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں: (۱) مفید الاطفال (۲) مفید الاقوال
فی شرح تحفۃ الاطفال (۳) مفید الوارثین اور (۴) تسہیل الطبع فی اجزاء السبع ص ۹۶۔ دیکھیے ابوالوں کے
سفیر۔ مولانا مفتی قاری محمد حسین از اطہر الحجری ص ۹۸۔ ۹۹

کی جاتی تھیں اور جن میں حافظ ثناء اللہ ایک کامیاب ذاکر کی حیثیت سے بلائے جاتے تھے۔ شعلہ بیان خطیب تھے قبرستان کی مسجد کے پیش امام تھے۔ بمبئی میں بھی محرم کے وعظ کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔

مولانا خدا بخش: حافظ ثناء اللہ کے ساتھی تھے اور محرم کی مجالس میں ایک انداز گل افشانی گفتار سے سامعین متاثر ہوتے، یادگار زمانہ لوگوں میں سے تھے اور عوام میں بڑے مقبول تھے۔

مولانا محمد صادق - عالم تھے اور صوفی یعنی صاحب حال وقال بزرگ تھے۔ پیری مریدی کا سلسلہ بھی قائم تھا اور مسند درس و تدریس پر بھی جلوہ فگن تھے۔ مشہور عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید تھے اور خلیفہ بھی۔

مولوی محمد یوسف خورد: مبلغ دین تھے۔ دینداری کی زندگی بسر کرتے رہے اور ایک مدت تک مدرسہ اسلامیہ بڑا قبرستان میں جس کے بانی مولانا جمال الدین لبیب تھے نائب صدر مدرس کی حیثیت سے تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ بڑے متقی بزرگ تھے۔

مولوی حافظ دین محمد: درس و افادہ اور رشد و ہدایت کے ایک روشن چراغ نے جس کی روشنی پھیلتی بڑھتی گئی، اشاعت دین کے لئے دلوں میں اجالا پھیلاتے رہے مدرسہ شبینہ اور خانگی مدرسہ کے ذریعے علم و فضل کی میراث تقسیم کرتے رہے بہت سے حافظ پیدا کئے جن میں حافظ عبدالرزاق اور حافظ عبدالکریم آپ کے مشہور شاگرد تھے۔ اول الذکر نے مدرسہ سبحانیہ الہ آباد سے سند تجوید و قراۃ سبعہ حاصل کی تھی۔

مولوی حافظ عبدالحق: مولینا اسحاق کے ان شاگردوں میں سے آخری ہی تھے جنہیں دستار فضیلت سے نوازا گیا تھا، علوم دینیہ کی نشر و اشاعت میں مصروف رہے اور قومی ملی امور میں حصہ لیتے تھے۔ گہوارہ حال نورانی مسجد کے امام و خطیب رہے۔ بڑے جامع اوصاف [illegible] تھے۔

مولوی محمد عبدالمجید وحید اشرفی نعمانی (ولادت ۱۳۰۲/۱۸۸۵)

شہر مالیگاؤں کے مورخ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے اعظم گڑھ کے علمی خانوادے اور صوفی گھرانے سے تعلق تھا۔ شہر کے متمول گھرانوں سے رشتہ داری تھی، حاجی سیٹھ عبدالرحیم سوت فروش آپ کے بہنوئی تھے انہوں نے ہی مولانا موصوف کے فتاوی کو جمع

کر کے فتاویٰ مجیدیہ کے نام سے شائع کروایا تھا، مولانا کی تعویذات پر "مجربات مجید" ایک دوسری تصنیف ہے جس کو سیٹھ عبدالرشید نے طبع کروایا تھا۔ دیگر تصانیف بھی منشی عبدالجبار پہلوان اور حافظ محمد اسحاق بک سیلر کے مالی تعاون سے شائع ہوئیں۔

آپ تلہ محلہ کی مسجد میں تقریباً ۳۰ برس تک امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، مدرسہ چشمۂ کوثر جاری کیا اور مدرسہ عین العلوم (بیباغ) میں طالبات کو عربی اور علوم دین کی تعلیم دیتے رہے۔

مولوی محمد عبدالمجید وحید نعمانی اشرفی کے معاصرین میں مندرجہ ذیل علمائے دین تھے۔ مولوی عبدالقادر لبقر عیدی۔ مولوی محمد شفیع حسرت، مولوی محمد حسن، مولانا عبدالستار اعظمی، مولوی عبدالمجید فیض اللہ، مشہور ادیب لطیف جعفری کے تایا مولوی سید محمد یحییٰ نور (۱۸۸۶-۱۹۴۲)۔ مولانا کوثر۔ مولوی مداح۔ مولانا رازی۔

مولوی عبدالرحیم کوثر: مدرسہ بیت العلوم کی علمی فضا اور شاعرانہ ماحول میں جن علمائے کبار نے شہرت و عظمت حاصل کی ان میں مولوی عبدالرحیم کوثر (۱۸۹۲-۱۹۲۹) اپنی خصوصیات شاعری اور دانش و علم کے اعتبار سے طرۂ امتیاز رکھتے ہیں۔

(ملا) مولانا عبدالرحمٰن آثر (۱۸۸۳-۱۹۱۷) کا شمار مالیگاؤں کی عظیم ہستیوں میں کیا جاتا ہے، مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کے سند یافتہ عالم دین تھے۔ ایک زبردست خطیب اور پُراثر واعظ بھی تھے۔ ان کے مواعظ حسنہ کا یہ اثر ہوتا تھا کہ لوگ نادم اور پشیمان ہو کر تائب ہو جاتے اور رجوع الی اللہ کرتے تھے۔ آپ کے وعظ میں جم غفیر ہوتا۔ دور دور سے لوگ سننے کی غرض سے آتے رجوع خلق کا ایک روح پرور نظارہ دیکھنے میں آتا۔ آواز بھی ایسی وسعت گیر اور بلند بانگ کہ اس کی تاثیر ذہنوں کو مسخر کر لیتی اور دلوں کو گھیر لیتی۔ مولانا کو وعظ و تذکیر کے علاوہ حکمت سے بڑی دلچسپی تھی۔

مولوی عبدالمجید مجید (۱۸۷۰-۱۹۳۳)

مدرسہ بیت العلوم کی علمی تاریخ سے وابستہ تین ہمنام "اقانیم ثلاثہ" ہیں پہلے مولوی عبدالمجید مجید ہیں، دوسرے مولوی عبدالمجید مولانا عبدالحمید نعمانی کے برادر بزرگ ہیں اور تیسرے عبدالمجید وحید مورخ تاریخ شہر مالیگاؤں ہیں جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

مولوی عبدالمجید برادر مولانا عبدالحمید نعمانی بیت العلوم کے زمرۂ اساتذہ میں نہایت ممتاز تھے۔ علم دین کی اشاعت و تبلیغ میں ہمیشہ سرگرم کار رہے۔ مولوی عبدالمجید مجید کے والد غلام محمد متوطن مئو اعظم گڈھ غدر کی طوائف الملوکی میں بحران و انتشار کا شکار ہو کر مالیگاؤں آئے اور بدرکا باڑہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ جب بیت العلوم میں طلبہ کا رجوعہ بڑھا تو منتقل ہو کر مسجد عزیمو دگر بید ھے یا پورہ میں آکر قائم ہوا۔ مولانا عبداللہ صدر مدرس تھے عبداللطیف سیکریٹری اور مولوی عبدالمجید مجید مدرسہ کے کارپردازوں میں شامل ہو گئے۔

مدرسہ بیت العلوم کی تاریخ میں عروج و زوال کی کئی داستانیں ملتی ہیں، کساد بازاری کا زمانہ آتا تو مدرسہ بھی مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ صدقات، چرم قربانی اور مالی اعانت جمع کرنے کے لیے مولوی صاحب کشکول لیے آگے رہتے۔

وہ ایک فعال سماجی کارپرداز بھی تھے تیس سال تک رکن بلدیہ رہے۔ عوام کے خلوص و محبت کے صلہ میں آپ نے فلاح و بہبود اور رفاہ عامہ کے امور انجام دئے اور سماجی خدمات کیں۔

مولوی صاحب محرم کے عشرہ میں ذاکر مجلس بن جاتے، گھر کے پاس خوبصورت شامیانہ لگا کر بدر کے باڑے کو ماتم کا باڑہ بنا دیتے عاشر الشہادتین شروع کرنے سے پہلے خطبہ دیتے اور واقعات کرب کے بیان میں ایسا ڈوب جاتے کہ جہاں اشک فشانی اور رقت قلب کا رنگ مرعد آ جاتا خود بھی اشک فشاں ہو جاتے اور اس قدر بلند آواز سے پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ "مجلسِ عزا" کا منظر نظر آ جاتا۔

آپ کی اولاد میں مولوی عبدالرزاق اور سیٹھ عبدالسمیع نے خاندانی روایات کو قائم رکھا، مولوی عبدالرزاق خود اپنی ذات سے انجمن ہی نہیں تھے شہر کی ڈھیر ساری انجمنوں کے صدر تھے۔ سیاست میں ان کا ایک زمانہ تھا، میونسپلٹی کے نہ صرف ممبر رہے بلکہ سترہ سال تک صدر رہے، فلاح و بہبود کے بہتیرے کام سر انجام دئے۔

مولوی صاحب کے دوسرے صاحبزادے سیٹھ عبدالسمیع خاموش طبیعت کے ہیں ہنگاموں سے دور اپنے کاروباری زندگی میں مصروف ہیں اور سیاست میں نہ دلچسپی لیتے ہیں اور نہ اس سے مطلب رکھتے ہیں ؎ ما ہارا چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت

حضرت مولانا عبدالقادر دیوبندی

ابتدائی تعلیم مالیگاؤں کی قدیم درسگاہ بیت العلوم میں پائی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، ہندوستان کی جامعات میں اسے ازہر ہند کا درجہ حاصل ہے، یہاں مشاہیر اساتذہ کا مرجع تھا، بعد از تکمیل تعلیم شہر لوٹے تو سیاست اور ثقافت نے قدم پکڑ لئے، جمعیۃ العلماء مالیگاؤں کے صدر بنے اور قوم و ملت کی خدمت کرتے رہے، ساتھ ہی درس و افادہ کے مسند نشین بھی رہے، مولانا ایک متبحر عالم اور حافظ قرآن تھے، بیرون شہر کے مدارس کو بھی فیض پہنچاتے رہے۔ مدرسہ بیت العلوم اور دارالعلوم محمدیہ میں آخر وقت تک درس حدیث دیتے رہے۔

حضرت مولانا محمد سلیمان شمسی

ایک جلیل القدر عالم دین تھے مدرسہ بیت العلوم میں عرصۂ دراز تک درس حدیث دیتے رہے، آپ کو شیخ الحدیث ہونے کا شرف حاصل تھا، اہالیان شہر کی دینی رہنمائی کرتے رہے۔ شہر کی مرکزی مسجد نورانی مسجد میں قبل از نمازِ جمعہ (جیسا کہ عام طور پر روایت بن گئی ہے) بیان دیتے رہے کچھ دنوں دارالعلوم محمدیہ میں درس حدیث دیتے رہے، فی الحال مولانا موصوف اکل کنوں کے مدرسہ میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حضرت مولانا محمد حنیف ملی

بانی معہد ملت مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب کے اولین شاگردوں میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مولانا ہی کے ایماء پر علوم دینیہ کی مزید تعلیم کے لئے دیوبند تشریف لے گئے۔ لوٹے تو مسند درس و افادہ کو رونق بخشی، بڑی محنت سے درس حدیث دیتے رہے اور آج بھی شیخ الحدیث کے عہدہ پر سرفراز ہیں اور اہالیان شہر کی دینی و ملی رہنمائی فرماتے رہے ہیں، تراجم کا کام کرکے اردو داں طبقہ کو دینی و علمی کتب سے روشناس کرایا ہے، ماہنامہ العدل کے مدیر مسئول ہیں، ملی کونسل بہار شتر کے صدر ہیں اور بہت سی سیاسی اور دینی تنظیموں کے قائد ہیں۔ آپ کے مضامین بڑی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالاحد ازہری

مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب کے زیر نگرانی تعلیم پائی اور سند فراغ حاصل کیا، دیوبند گئے اور پھر ازہر یونیورسٹی میں جا کر تکمیل تعلیم کی۔ آپ کی نظر فقہ و تفسیر پر بڑی گہری ہے، تعمق اور دقت رسی کے ساتھ ان کتابوں کا درس دیتے ہیں، مولانا نعمانی نے جب دارالقضاء قائم کیا تو مولانا عبدالاحد کو خانقاہ مونگیر میں علم الافتاء کے درس کے لئے بھیجا۔ اب گزشتہ کئی دہائیوں سے شرعی عدالت میں منصب

قضاۃ پر فائز ہیں۔ مولانا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی ہیں۔

حضرت مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی

ام المدارس مدرسہ بیت العلوم میں عرصۂ دراز سے صدر المدرسین ہیں اور شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز ہیں، مولانا ایک جید عالم دین ہیں، اسلامی تاریخ کی بصیرت رکھتے ہیں عربی و فارسی میں دستگاہ کامل حاصل ہے نت نئے مضامین کے انبار لگاتے ہیں ان کا ہر درس قابلِ سماعت ہوتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالباری قاسمی

مولانا جمال الدین لبیب کے شاگرد رشید ہیں، مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ گذشتہ کئی برسوں سے شیخ الحدیث کی مسند کو زینت بخش رہے ہیں، جمعیۃ العلماء کے نائب صدر ہیں، شہر کی سماجی اور اصلاحی تحریکوں کے علمبردار ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد اسماعیل

ڈابھیل کے مشہور مدرسے سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے دار العلوم دیوبند سے فاتحۂ فراغت پڑھی۔ علم حدیث اور فتویٰ نویسی پر عبور کامل حاصل کیا۔ دار العلوم محمدیہ میں گذشتہ تین برسوں سے شیخ الحدیث ہیں اور ساتھ ہی دار الافتاء کے نگراں بھی ہیں، شہر کی جامع مسجد کے پیش امام ہیں اور جمعیۃ العلماء کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ اصلاحی اور دینی تحریکات کے ہراول دستے کے سالار ہیں۔

حضرت مولانا محمد ادریس عقیل قاسمی

معہد ملت کے مہد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر بر مِلی" کی طرح دیوبند گئے لوٹے تو ادرِ علمی کی خدمت میں لگ گئے، معہد ملت کے صدر المدرسین اور ناظم تعلیمات ہیں، عربی ادب پر قدرت رکھتے ہیں، قرأت میں سبعہ عشرہ پر عبور رکھتے ہیں۔ شہر کی ایک فعال دینی تنظیم اصلاح المسلمین کے روحِ رواں ہیں، شہر کی دینی اور سماجی تنظیمات اور تعلیمی تحریکات میں پیش پیش رہتے ہیں۔

حضرت مولانا حافظ جاوید احمد ملی

معہد ملت سے سندِ فراغ حاصل کر کے حفظ، قرأت اور عالمیت کا نصاب مکمل کیا اب اسی مدرسے میں تفسیر اور حدیث کی کتابیں پڑھا رہے ہیں شہر کے خوش الحان قاریوں میں شمار ہوتے ہیں، عربی سے اردو میں ترجمہ کرتے ہیں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں، بڑے بیباک نقاد واقع ہوئے ہیں۔ نورانی مسجد میں مسلسل ۲۴ سال سے تراویح پڑھا رہے ہیں اور گذشتہ دس برسوں سے امامت بھی کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا عبدالحمید ازہری

معہد ملت سے نکلے تو دارالعلوم دیوبند میں تکمیل تعلیم کی مزید اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ ازہر مصر تشریف لے گئے جہاں آپ کے ساتھیوں میں نذیر احمد ازہری (امارت متحدہ کونسل بمبئی)، حافظ عبدالحی ازہری (شولاپور) موجود تھے، واپسی کے بعد مادر علمی کی کئی برسوں تک خدمت کرتے رہے، عربی پر قدرت حاصل ہے اور انگریزی پر دسترس، عربی کے ادیب ہیں اور شہنشاہِ خطابت ہیں۔ لیکن حوصلے وسعتوں کے طلبگار تھے امریکن کمپنی سعودی عرب میں گذشتہ بیس برسوں سے ملازم ہیں۔

قاری عبدالصمد فیضی قرأت پر مکمل عبور رکھتے ہیں، عرب کے لہجہ میں بڑی خوش الحانی سے کلام پاک کی قرأت کرتے ہیں، علم قرأت کا سبق بھی دیتے ہیں۔ آپ نے تجوید پر یک کتاب تصنیف کی ہے۔

مفتی سراج احمد ملی: معہد ملت میں ابتدائی تعلیم پائی پھر خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں فتویٰ نویسی پر مکمل عبور حاصل کیا، وہاں اکابر علماء کی صحبت میسر تھی، مادر علمی معہد ملت میں کئی برسوں سے اس اہم منصب کو سنبھالے ہوئے ہیں، مالیگاؤں کے مشہور قاری محمد حسین اشرفی نے خوش ہو کر سند بھی عطا کی، اشرفی صاحب خود بہت بڑے مفتی تھے، مفتی سراج احمد کی فقہ پر بھی بڑی گہری نظر ہے۔

قاری مختار احمد ملی: قاری غلام رسول کے شاگردوں میں سے ہیں، خوش الحان قاری اور جید حافظ قرآن ہیں، کل ہند قرأت مقابلہ میں اوّل آئے تھے جمعیۃ القراء کے مدیح رواں ہیں، بڑی خوش اسلوبی سے دینی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مادر علمی میں دس برس سے شعبۂ تجوید و قرأت میں استاذ ہیں۔

قاری متین۔ قاری عبدالصمد کے صاحبزادے ہیں اور قرأت میں بہترین عصری انداز کے قاری ہیں اور انعام یافتہ ہیں۔

قاری شمس الضحیٰ۔ دینی تعلیمات مولانا محمد عثمان سے حاصل کی اس کے بعد مدرسہ فرقانیہ کی بنیاد ڈالی جہاں بچوں اور بچیوں کو تجوید کی تعلیم دی جاتی ہے آپ کے ساتھ قاری محمد طاہر اور قاری محمد حسن (حال امام شاہی مسجد سیٹین میاں کا تکیہ) بھی مسند درس و تدریس کو زینت بخش رہے ہیں۔

مولانا عبدالغنی سلفی: آپ برسوں سے مالیگاؤں میں دینی خدمت انجام دے رہے ہیں اور دینی اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں، بڑے حق پرست اور حق گو ہیں۔

مولانا عبداللطیف آسی

علم الحدیث پر عبور رکھتے ہیں، بڑے زبردست مقرر ہیں اور ادب نواز شخص ہیں، آپ جماعت اسلامی سے منسلک ہیں۔ علمی مسائل حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

جامعۃ الہدیٰ کے بانیوں میں سے ہیں۔ نظامت کا انداز بڑا انوکھا ہے۔

حفاظ و شیوخ خاندان

مالیگاؤں کے مہاجر خاندانوں میں منشی حضرات، حفاظ کرام اور شیوخ کی بڑی تعداد تھی، بعض خاندانوں کو پیشۂ آبا ر بافندگی کے ساتھ ساتھ درس و تدریس قرآن سے بے انتہا رغبت تھی۔ حافظ صاحبان بچوں کو اپنی کارگاہوں میں بٹھا کر کھٹے پر بیٹھتے ہوئے رضا کارانہ طور پر ناظرہ کی تعلیم دیتے تھے، جو حفظ کرنا چاہتے تھے وہ بڑی محنت اور جانفشانی سے حفظ قرآن کی تکمیل کرتے۔ اکثر محلوں کی مساجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے حفاظ کرام اور میانجی و منشی حضرات بچوں کو پارچہ بافی کا ہنر بھی اپنے ہی گھروں کے کرگھوں پر سکھا دیتے اس طرح دین کے ساتھ دنیا میں خود کفالت کا طریقہ بھی سکھا دیا کرتے تھے اور اکل حلال کا راستہ دکھا دیتے تھے۔

محلہ سنگمیشور میں حافظ مراد (۱۸۶۰-۱۹۲۸) نے سب سے پہلے مدرسۂ شبینہ جاری کیا جہاں ناظرہ کی تعلیم کا آغاز ہوا، اسی مدرسہ میں مالیگاؤں کی عظیم علمی و ادبی ہستی اور صوفی شاعر مولانا محمد اسحٰق مقصد (۱۲۹۶-۱۳۶۴ھ) نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ حافظ مراد فن تجوید و قرأت میں ید طولیٰ اور لحن داؤدی رکھتے تھے آپ کی آواز بڑی دلکش اور پُر اثر تھی اور ایسے والہانہ انداز میں قرأت کرتے کہ سننے والا مسحور ہو جاتا اور سورۃ الانفال کی ان آیات کا نقشہ کھنچ جاتا "سچے اہل ایمان وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے" (سورۃ الانفال: ۲)

محلہ اسلام پورہ میں حافظ محمد اسماعیل قرآن کی تعلیم دیتے تھے، سنگمیشور میں منشی مدار اللہ مرحوم کے پڑوس میں حافظ محمد حنیف برادر ولی محمد پہلوان تھے جو ۱۹۲۱ء کے ہنگامہ سے قبل اسد میورہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

حافظ محمد اصاب جو مشہور حافظ قرآن محمد غفران کے والد تھے محلہ مرتی بالا میں مسند درس و افادہ پہ رونق افروز تھے، محلہ نیا پورہ میں حافظ غریب اللہ حافظ

عبدالشکور نے درس و تدریس کا چراغ روشن کر رکھا تھا، محلہ قصہ میں حافظ عبدالرشید، حافظ عبدالغنی، حافظ شمس الحق اور مہنگو منشی کلام پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ مولوی عبدالسلام بیلباغ کی جوبلی مسجد میں امامت کے فرائض انجام دیتے تھے اور بچوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ آپ مولانا محمد اسحٰق مقصد کے معاصرین میں سے تھے۔ مولوی عبدالسلام کے شاگردوں میں مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا عبدالمجید وحید اشرفی، مولانا محمد ایوب (چرخہ مولوی)، مولانا محمد الیاس (دنیا پورہ)، مولانا محمد عثمان، مولانا قاری محمد حسین اشرفی، مولانا جمال الدین لبیب، مولانا محمد شفیع، حافظ مدار بخش، مولانا عبدالحق رازی وغیرہم قابل ذکر ہیں جو آسمانِ علم و فضل و دانش کے درخشندہ ستارے بن کر اس خطہ میں انوارِ روحانی بکھیرتے رہے۔ مولانا عبدالسلام (متوفی ۱۳۴۸ھ) کا آبائی وطن اعظم گڑھ تھا، جونا بھٹی میں سکونت اختیار کی، پیشہ درس و تدریس تھا اور گرگے پر بُنا تنا ذریعہ معاش تھا۔ آپ وحید الزماں پہلوان (شکاری) کے والد تھے اور مشہور صحافی حمید اختر کے نانا تھے[۱]

مولوی محمد ثوبان کو بیت العلوم کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد میں حفظِ قرآن کی سند عطا کی گئی تھی۔ اپنے مادرِ علمی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ بیت العلوم کے علاوہ چراغ علوم کے شبینہ مدرسے میں بھی حفظ قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ عیدین کی نمازوں کی امامت بھی آپ کے ذمہ تھی، ان کی امامت میں نماز پڑھنے والوں کا بیان ہے کہ رکوع و سجود اور قیام و قعود میں اعتدال ارکان کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کے لحن میں بڑی دلکشی تھی۔ مالیگاؤں میں مولوی ثوبان واحد شخص تھے جو رمضان کے آخری عشرہ کا مکمل اعتکاف کرتے تھے اولاد و احفاد میں عزیز الرحمٰن، محمود الرحمٰن، نفیس الرحمٰن اور حفیظ الرحمٰن جواطہر الخیری کے نام سے ایک معروف خوشنویس اور شاعر ہیں۔ مولوی ثوبان کی علمی و فنی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ارشد تلامذہ میں حافظ محمد سعید، حافظ یٰسین، حافظ عبدالرزاق، حافظ تصدق حسین، حافظ مقبول احمد، حافظ نثار احمد و حافظ مشتاق احمد (فرزندانِ جانباز) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔[۲]

---

[۱] راقم کو یہاں دو ہمنام مولوی عبدالسلام حضرات کے بارے میں اشتباہ ہو گیا ہے، مالیگاؤں کے اہل علم اصلاح فرمادیں۔
[۲] مولوی ثوبان، از اسحٰق خضر، پرنسپل تہذیب ہائی اسکول، مالیگاؤں۔ اجالوں کے سفیر ص ۱۱۶ - ۱۱۹

مالیگاؤں کے مشہور حافظ عبدالرحمن عوام میں بڑے حافظ جی کہلاتے تھے، آپ برادری کے نہ تھے بلکہ پرتاپ گڈھ (ضلع الٰہ آباد) کے مضافات میں بھدری نام کی ایک چھوٹی سی ریاست کے راجپوت والی کے صاحبزادے تھے۔ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو ایسے حامی قرآن بن گئے کہ حفظ و قرأت کی تعلیم میں "بڑے حافظ جی" بن گئے۔ آپ کے والد رحمت اللہ مالیگاؤں آکر بس گئے تھے۔ حافظ محمد اسماعیل (اسلام پورہ)، حافظ عبدالشکور (نیاپورہ)، حافظ امان اللہ، حافظ عبدالغفور، حافظ امیر محمد (موتی تالاب)، حافظ عبدالرشید (موتی پورہ) اور مولوی عبداسلام (قلعہ) وغیرہ بھی قرآنی علوم کے اس سرچشمہ سے سیراب ہوئے تھے۔

حافظ محمد اسماعیل بڑے حافظ جی کے شاگرد اول تھے آپ نے اسلام پورہ کی گلی نمبر ۹ میں ایک قطعۂ زمین خرید کر مدرسہ فیض العلوم جاری کیا (۱۳۲۸ء) حافظ جی نے اپنے چاروں بیٹوں کو حافظِ قرآن بنایا جن کے نام یہ ہیں: حافظ سمیع اللہ، حافظ محمد صادق، حافظ محمد صدیق، حافظ محمد۔

حافظ محمد اسماعیل کے ایک شاگرد حافظ محمد رمضان پونہ کی مسجد میں امامت کرتے رہے۔ آپ مدرسہ حنفیہ سنیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حافظ محمد بھی تاعمر جونی مسجد اسلام پورہ کے امام رہے۔ آپ فقہی مسائل سے کافی شغف رکھتے ہیں۔ بڑے حافظ جی کے شاگرد حافظ مدار بخش نے نہایت صغر سنی یعنی بارہ سال کی عمر میں حفظِ قرآن کی تکمیل کی، جامع مسجد میں مدرسہ تعلیم القرآن (۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء) میں حافظ صاحب ناظرہ اور حفظ کی تعلیم دیتے رہے۔ بحیثیت امام و خطیب جامع مسجد امامت کے فرائض ادا کرتے رہے مگر حق المحنت کے نام سے کبھی کوئی معاوضہ یا نذر نہیں لیا بلکہ ہینڈ لوم پر ساڑی بنتے تھے اور اسی کی آمدنی پر گذر بسر کرتے تھے۔ (م ۱۳۸۶/۱۹۶۶ء)

حافظ محمد الیاس (موتی تالاب) اور حافظ سعید احمد (اسلام پورہ) بڑے خوش الحان حافظ تھے۔

حافظ مدار بخش کے جملہ شاگردوں کا شمار تو دشوار ہے البتہ چند ممتاز حفاظ کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

حافظ ماسٹر عبدالسلام حاجی مراد (متوفی ۱۹۷۱ء) اسلام پورہ کے پرائمری اسکول میں مدرس تھے مدرسہ تعلیم القرآن سے فارغ ہونے والے سب سے پہلے حافظِ قرآن تھے۔

حافظ عبدالرشید نور محمد (متوفی ۱۹۸۳) محلہ قلعہ میں سکونت تھی اور اسی محلے کی جھونپڑے کی مسجد کے امام رہے پچاس سال سے زیادہ عرصے تک تراویح پڑھائی۔

حافظ عبدالخالق وزیر (متوفی ۱۹۹۱) محلہ اسلام پورہ میں سکونت پذیر تھے۔ ۱۹۲۵ء میں تیرہ سال کی عمر میں حفظ قرآن مکمل کیا پونہ تراویح پڑھانے جاتے تھے۔

حافظ عبدالغنی عبدالشکور (متوفی ۱۹۸۵) پونہ سے نقل مکانی کر کے ٹکیر میں بس گئے، پونہ کی ایک مسجد کے امام تھے، ایوت محل اور نظام آباد میں بھی ختم قرآن کا معمول رہا۔

حافظ عبدالشکور نبی بخش (متوفی ۱۹۹۰) محلہ نیا پورہ میں رحمانی مسجد کے امام تھے چالیس سال تک اسی مسجد میں چالیس مرتبہ تراویح میں ختم قرآن کیا، آپ کے زیر نگرانی اسی مسجد میں شبینہ مدرسہ بھی جاری رہا۔

حافظ عبدالخالق مولوی عبدالحمید (ڈائمنڈ ل والے) (متوفی ۱۹۵۹) بوارگلی میں رہتے تھے، حفظ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۸ء میں میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ آپ جامع مسجد کے متولی تھے اور باثروت خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود خاکساری اور خدمت خلق کا جذبہ رکھتے تھے۔

حافظ محبوب علی محمد ہاشم ٹکیر کی مسجد میں پچاس برس تک تراویح کی امامت کی۔ ۱۳۶۶ھ میں اسی مسجد میں ایک مدرسہ تعلیم القرآن کے نام سے جاری کیا۔

حافظ عبداللطیف حافظ عبدالوہاب (متوفی ۱۹۸۳) اسلام پورہ میں سکونت رکھتے تھے، کاروبار کرتے تھے لیکن پھر سولہ سال بعد کنارہ کش ہو کر حافظ مدرجتی ان کے استاد نے ملا بارطہ کی مسجد میں تراویح کی امامت کی ذمہ داری سونپی۔ گیارہ برس اسی مسجد میں تراویح کی امامت کی، اس سلسلے میں چاندوڑ، ایوت، نظام آباد، شولاپور اور نندربار بھی جاتے رہے۔

حافظ عثمان غنی حاجی عبدالسبحان (متوفی ۱۹۸۱) محلہ قلعہ میں بود و باش تھی پہلی تراویح کی امامت قلعہ کی جھونپڑے کی مسجد میں کی۔ اسی مسجد کے امام بھی مقرر ہوگئے۔

حافظ عبدالجبار بقر عیدی حافظ (متوفی ۱۹۸۲) نیا پورہ میں رہائش تھی۔

منماڑ میں قصاب باڑہ کی مسجد میں امام اور مدرسہ شبینہ مدرسہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔

حافظ عزیز الرحمٰن حافظ محمد اسماعیل (متوفی ۱۹۷۷ء) بیل باغ میں رہائش پذیر تھے، تمام عمر تراویح میں ختم قرآن کا شرف حاصل رہا، مالیگاؤں میں آپ نے مسجد خانقاہ برکاتیہ اور انصاری مسجد میں تراویح کی امامت کی۔ لاسن گاؤں، منماڑ، چاندور بھی اسی سلسلے میں ہر سال جاتے رہے، انصاری مسجد مالیگاؤں کے امام مقرر ہوئے۔

حافظ شبیر احمد ابن شاہ محمد (عرف موتی حافظ) (متوفی ۱۹۸۱)۔ محلہ قلعہ کے رہنے والے تھے صرف ایک سال کے عرصہ میں حفظ قرآن مکمل کیا، انتقال نوجوانی کے عالم میں ہوا۔

حافظ دستگیر (۱۸۹۵-۱۹۷۳) کے والد عبد اللہ ضلع بارہ بنکی میں مسولی کے متوطن تھے۔ بسلسلۂ معاش مالیگاؤں آئے اور ذریعۂ معاش پارچہ بافی تھا، بڑے محنتی اور جفاکش تھے ساڑیاں بننے میں اس قدر ریاض کرتے کہ کوئی ان کا ہاتھ نہ پکڑ سکتا تھا۔ اوراد و وظائف میں بھی بڑی ریاضت کرتے تھے اکھاڑے کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ حافظ دستگیر کے بیٹے تجمل حسین نے بھی حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی اور والد کی جانشینی کرتے رہے ان کے بیٹے عبد العزیز اور ایک پوتے ریاض احمد بھی حافظ قرآن ہو کر اس خانوادۂ حفاظ کو بقعۂ نور بنا دیا۔

حافظ محمد غفران (۱۹۱۰-۱۹۸۰) بڑے حافظ جی کے صاحبزادے امیر احمد کے لڑکے تھے آپ نے حافظ نذیر محمد سے حفظ قرآن کی تکمیل کی قصاب باڑہ مسجد میں امامت کرتے رہے۔ آواز بڑی دلکش تھی اور قراءت بڑی دلنشین تھی۔

حافظ نذیر محمد ضلع الہ آباد کے قصبہ سونیت میں پیدا ہوئے۔ غدر کے پُر آشوب دور میں مالیگاؤں آکر ان کا خاندان بس گیا در بُننے کا کام شروع کیا، گھر پر بچوں کو قرآن پڑھاتے۔ مولانا برکت علی کے خاص مریدوں سے تھے اور آپ پر بڑی نوازش کرتے رموز و اسرار تصوف سے آگاہ کیا اور اذکار و وظائف کی تعلیم دی۔

مالیگاؤں کی بزرگ ترین ہستی حافظ فیض اللہ کی تھی، ان کے صاحبزادے مولانا جمال الدین لبیب تھے۔

حافظ ثناء اللہ ذاکر جیسی محترم کے رخ کے حافظ عبد السلام والد کی روایتوں کے امین

بنے رہے۔

حکیم حافظ عبدالرؤف: غدر کے ہنگامہ میں ترک وطن کرکے آئے پہلے سٹانہ میں پناہ لی، مولوی محمد بخش (مداح رسول ﷺ) کے حقیقی ماموں تھے۔ آپ کے دو بڑے بھائی بھی حافظ قرآن تھے۔ جب مالیگاؤں مدرسہ دارالعلوم میں مدرس دوم مقرر ہوئے تو انصار روڈ پر انصار لائبریری کے قریب یک شبینہ مدرسہ جاری کیا جس میں ناظرہ، حافظہ اردو اور فارسی کی مفت تعلیم دیتے رہے۔ مصلح دین تھے اور بدعت کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ آپ مولانا برکت علی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ حافظ دین محمد خوش الحان قاری بھی تھے نصاب باڑہ کی مسجد میں برسوں امامت کی ہے۔
حافظ عزیب اللہ، حافظ عبدالشکور اور حافظ قاری دین محمد اپنے گھروں میں ناظرہ کی تعلیم دیتے تھے اور اپنے کرگھے پر پارچہ بافی بھی کرتے تھے۔

حافظ عبدالرحمٰن (بمبئی والے) کا خاندان نواب گنج ضلع بارہ بنکی کا تھا ولادت بمبئی میں ہوئی، عمر مالیگاؤں میں بسر کی، ہاتھ لوم پر ساڑی بنتے تھے اور لوگوں کو سوت دے کر مزدوری پر ساڑی تیار کر لیتے تھے اور اس طرح رزق حلال کسب کرکے زندگی بسر کی۔ قرآن پڑھنے والوں کی بڑی تعداد آتی تھی۔ آپ کے شاگردوں میں حافظ محمد عبداللہ اور [illegible] حافظ نہایت ممتاز تھے بڑے عبادت گذار اور شب زندہ دار تھے۔ مستجاب الدعوات تھے، حافظ عبدالحق آپ کے داماد تھے۔ ۱۳۳۲ھ میں وصال ہوا اور منشی جی بابا کے پڑوس میں مقبرہ بنا اور پھر بمبئی والے حافظ عبدالرحمٰن کا عرس بھی ہونے لگا اور صندل سوم پر جہاں آپ کی رہائش گاہ تھی اٹھنے لگا۔

حافظ عبدالکریم: حافظ عبدالرحمٰن کے بھائی تھے۔ آپ بھی ذاکر و عابد شب زندہ دار تھے۔ اپنے وقت کے متقی، عامل و کامل بزرگ تھے۔ صائم الدہر تھے۔ آپ بھی مستجاب الدعوات تھے، بزرگان دین اور اولیاء کرام کے بڑے معتقد تھے، آپ کا مزار بھی بڑے بھائی کے مقبرے کے بغل میں ہے اور انہیں کے ساتھ آپ کا عرس بھی بھرتا ہے، شب میں میلاد شریف اور دوسرے روز قرآن خوانی اور بھنڈارہ پکا کر تقسیم کیا جاتا ہے۔

الحاج حافظ محمد عبداللہ (بمبئی والے) آبائی وطن نواب گنج ضلع بارہ بنکی تھا، بمبئی میں پیدا ہوئے، حافظ عبدالرحمٰن کے پاس حفظ قرآن کیا اور رشتہ میں بھی تھے بمبئی میں منگلی کندری کی مسجد میں ۲۵ سال تک تراویح کی امامت کرتے رہے اور خدمت

قرآن کا کوئی معاوضہ نہیں لیا، جب مالیگاؤں آئے تو دوست محمد حاجی کی مسجد میں تراویح پڑھاتے اور عمر کے آخر میں تراویح پیپا کی مسجد اسلام پورہ میں پڑھاتی۔ رزق حلال حاصل کرنے کے پابند تھے، ہاتھ ماگ پر ساڑی بنتے اور بیچ کر گزارہ کرتے، آپ بھی ذکر واذکار اور عبادتِ الٰہی میں پوری پوری رات گزار دیتے تھے۔ آپ (متوفی ۱۳۸۲ مطابق ۱۹۶۲) کا مزار بھی حافظ عبدالرحمٰن کے مقبرے کے باہر مشرق میں واقع ہے۔

حافظ محمد اسحاق (سوت والے) اسلامپورہ کے تاجر تھے، مولانا برکت علی کے مرید خاص تھے۔ کامیاب تاجر ہونے کے ساتھ دینی امور میں دلچسپی لیتے تھے۔

حافظ محمد صابر (عرف کالو سیٹھ، نیا پورہ) بڑے کامیاب تاجر اور صنعتکار تھے۔ دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ مسجد اور مدرسہ کے لیے مالی اعانت بڑے انشراح اور فراخدلی سے کرتے تھے۔ ہر سال چکھواڑہ میں تراویح پڑھاتے۔

مداحانِ رسول اکرمؐ

فارسی اور اردو شاعری میں حمد و منقبت اور نعتِ رسولؐ بذاتہٖ ایک صنف سخن ہے۔ مالیگاؤں میں محمد الیاس برکتی، مولوی محمد یونس اور الطاف سلطانپوری۔ یہ تینوں مداحانِ رسولؐ تھے جن کے عشقِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے اشعار نہ صرف مجالس و محافل میں والہانہ اور فرطِ محبت سے پڑھے جاتے تھے بلکہ خانقاہوں میں طریقت کی مجلسیں بھی منقبت و نعت رسول اکرمؐ سے گونجا کرتی تھیں۔

عبدالرحیم اور ان کے سسرالی عزیز مؤ کوپا (ضلع اعظم گڑھ) سے غدر کے پرآشوب زمانے میں ترکِ وطن کر کے مالیگاؤں سے قریب شاتہ میں آباد ہو گئے۔ محمد الیاس تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن تھے اور عبدالرحیم کے دوسرے صاحبزادے مولوی محمد یونس مدرسہ حنفیہ سنیہ کے فارغ تھے، چھوٹے صاحبزادے محمد حنیف نیز تبلیغی جماعت سے وابستہ تھے اور بڑے خیال رکھتے تھے۔ محمد الیاس مشتاق برکتی اور مولوی محمد یونس ہمیشہ شاعروں میں مداحِ رسولؐ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ دونوں شہر کے مشہور استاد شاعر امیر قریشی (امیر خان امیرؔ) (۱۸۴۰ - ۱۹۲۹) کے جو مالیگاؤں کے پہلے عوامی شاعر تھے، شاگرد تھے۔ انہیں ان ہی کی انجمن میلاد سے وابستہ تھے۔ مولوی محمد

یونس بزم سخن (اسلام پورہ) کے صدر تھے۔

عشرہ محرم میں خوش شاہد پورہ (خوش آمد پورہ) کا اشرفیہ چوک بھی خانوادۂ رحیمی کے ان دو بلبلانِ ہمنوا و خوش نوا کی زمزمہ پردازی سے گونجتا رہتا، جہاں مجلس وعظ میں دونوں بھائی محمد الیاس مشتاق اور مولوی محمد یونس احترام اور عقیدت سے بلائے جاتے تھے۔ روزانہ رات میں مجلس وعظ چوک میں منعقد کی جاتی، سامعین کا جم غفیر ہوتا، بڑے بھائی محمد الیاس عناصر الشہادتین کا نثری حصہ پڑھتے اور منظوم حصہ مولوی محمد یونس اپنے مخصوص ترنم سے سناتے اور لوگ وجد میں آجاتے۔

مولوی محمد یونس برسوں بعد گجرات منتقل ہو گئے "عزت لے لی جو وطن سے نکل گیا" اور وہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ محمد ایوب آپ کے صاحبزادے تقریر و خطابت کے میدان کے ایسے یکہ تاز شہسوار نکلے کہ سارا گجرات ان کی شہرت سے گونجنے لگا۔ مولوی محمد یونس کے دو صاحبزادے انگلستان میں بود و باش اختیار کر چکے ہیں ان کے ساتھ محمد الیاس مشتاق کے بھی دو صاحبزادے وہیں بس گئے ہیں اور تبلیغ دین، درس و تدریس اور امامت و خطابت کی روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، محمد الیاس مشتاق برکتی کے ایک پوتے حافظ مولوی جمیل احمد ایک بہت بڑے کتب خانہ کے مالک ہیں جو علوم دینیہ کا خزانہ ہے، مولوی محمد یونس کا ایک پوتا حافظ محمد ارشد ہے جو محمد الیاس کا نواسہ بھی ہے کسب علم کر رہا ہے۔

منشی محمد حنیف کی اولاد بھی پھلی پھولی اور یہ گھرانہ بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے ان کے ایک نواسے نے جو مولانا غلام رسول مکی کے فرزند ہیں عالمی مقابلۂ قرأت میں اول نمبر دہ کرشہ فیصل ایوارڈ حاصل کر کے خاندان کے نام کو چار چاند لگا دیے۔

مالیگاؤں میں محفل میلاد اور میلادی دنگل بھی ہوا کرتے تھے اس زمانے کے میلاد خوانوں میں منشی محمد شعبان، عبدالخالق میلادی، منشی محمد بشیر بڑے مشہور میلاد خواں تھے۔ دگر میاں واصف، منشی شررا اور امیر خان امیر قریشی میلادی شاعر تھے، حنیف ڈرائیور کی آواز بڑی دلکش تھی۔ قاری عبدالرشید میلاد خواں (اسلام پورہ) بڑی مقبولیت رکھتے تھے۔

حکیموں کے خاندان

مالیگاؤں کے مہاجر خاندانوں میں طبابت اور حکمت کا آبائی پیشہ رکھنے والے شیخ نور بادشاہ تھے، یہ طبابت بھی کرتے تھے، حافظ، مدرس بھی ہوتا تھا اور معلم بھی اور حکیم عالم دین ہوتا تھا۔
حکیم محمد اسماعیل (متوفی ۱۳۱۷) شہر کے پہلے باصلاحیت حکیم تھے اور بڑے حکیم کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے، آپ نے بدر کا باڑہ بسایا یہیں مطب کھولا اور طبابت کا سلسلہ پشتوں تک جوڑا، آپ کے صاحبزادے حکیم محمد حسن جو معذور تھے بڑے کامیاب حکیم ثابت ہوئے یہی نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں فعال رہے۔ آپ کے دولتکدہ میں عمائدین شہر، مدبرین سیاست اور اکابرین کی نشستیں ہوتی تھیں۔ حکیم صاحب خود اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔

حکیم محمد حسن کے صاحبزادے چراغ حسن حکیم (۱۹۰۶-۱۹۸۳) خاندانی روایات کے امین اور مطب پر ... رہے، آپ کی صاحبزادی عائشہ حکیم پہلی خاتون گریجویٹ اور ایم۔ این۔ اے تھیں، چھوٹی صاحبزادی ڈاکٹر شکیلہ سید ہیں۔ محفوظ الحق مطب میں بیٹھتے ہیں اور اس طرح بڑے حکیم صاحب کی آبائی روایت کا سلسلہ قائم ہے۔ حکیم صاحب کے بعد بدر کے باڑے کی ساری روشنی گم ہوگئی۔ حکیم محمد صابر جو حکیم بابو کے نام سے مشہور ہوئے بڑے نبض شناس حکیم تھے اور بجد خلیق انسان تھے، ساڑی کی آڑھت کا کام کرتے تھے ور طبابت۔ بابو حکیم کے صاحبزادے عبدالرحیم حکیم تھے جو مالیگاؤں کے مشاہیر میں سے ہیں اور ممتاز ہستیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، سیاست کے میدان کے شہسوار تھے، آپ کے صاحبزادے نذیر احمد کاروبار میں ہیں اور شبیر حکیم ایک سیاسی مبصر، مورخ اور صاحب علم و کتاب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

حکیم عبدالمجید جو طبیب حکیم احسان بھیا کے نام سے زیادہ معروف ہیں مجاہد آزادی اور خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔

حکیم حاجی محمد عبدالجبار طبیب حاذق تھے مطب بھی چلاتے تھے اور سوت کی دکان بھی تھی۔
اسی طرح حکیم حاذق، منشی جان محمد نے اپنے مکان میں مطب کھول رکھا تھا، یہ بھی بڑے نبض شناس حکیم تھے۔ مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی، بدر کے باڑے میں مولوی

عبدالرحمٰن آثر کی دواؤں کی دکان تھی اور جوہر چوک (ٹنکار محلہ) میں مطب کرتے تھے، دہلی سے طبابت سیکھ کر آئے تھے۔ رحمانی فارمیسی کے نام سے وہ دواخانہ آپ کے صاحبزادے حکیم عبدالکریم چلاتے رہے۔

حکیم امین الدین کا گھرانہ ٹانڈہ میں رواداری، خلوص اور شرافت کے لئے مثالی نمونہ تھا، یہی سارے اوصاف ڈاکٹر محمود انصاری ان کے صاحبزادے میں موجود تھے جن کا موتی پورہ میں دواخانہ تھا، مریضوں کی مسیحائی کرتے تھے، حاجتمندوں کی حاجت روائی، ناداروں کا مفت علاج کرتے اور مطب سے مفت دوا دیتے۔ ان کی مسیحائی اور غریب پروری کی شہرت بھیونڈی تک تھی، ان کے گھرانے کے سعادتمند لوگوں نے غریب نوازی کی اس شاندار روایت کو زندہ رکھا ہے۔

حکیم حافظ عبدالرؤف کو حکمت سے بڑا لگاؤ تھا ایک دوا کی دکان کھول رکھی تھی جسے مولوی شاہ محمد چلاتے تھے۔

حکیم عبدالحمید فاروقی پہلے سند یافتہ حکیم تھے جو مسیح الملک حکیم اجمل خان کے شاگرد تھے۔ بدر کا باڑہ اسی 'فاروقی' خاندان سے آباد اور علم پروری میں مشہور تھا حکیم صاحب کے والد ملا دین محمد کی بڑی عزت تھی۔ محمد علی فاروقی اے۔ ٹی۔ بی۔ اسکول کے مشہور ٹیچر تھے بڑے خلیق اور ملنسار شخص تھے۔ ڈاکٹر محمد فاروقی (ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی) (م ۱۹۱۴-۱۹۸۰ء) مالیگاؤں کے اولین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ احمد آباد کالج میں شعبہ فارسی کے صدر تھے اور غالباً مالیگاؤں کے پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے فارسی ادبیات میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ آپ کا تحقیقی مقالہ عہد شاہجہانی کے مشہور منشی اور شاعر چندر بھان برہمن پر تھا۔ ادیب مالیگانوی نے "نازشِ چمن" کے عنوان سے جو نظم ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر لکھی ہے اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

دل و دماغ ہزاروں کے جس نے چمکائے
سپہرِ علم کی وہ اک کرن تھا فاروقی

حکیم حاجی بابو عبداللہ رئیس مالیگاؤں حضرت مسلم مالیگانوی کے خالِ محترم تھے ان کی ذات مستجمع الصفات تھی۔

بیرونی اطبا اور علماء میں حکیم مولانا اسد اللہ گوپا گنجی (۱۳۴۰/۱۹۹۲ء) اور مولوی حکیم

شمس الدین گوری گرباگنجی مالیگاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ مؤخرالذکر نے تو مالیگاؤں میں اپنا مطب قائم کرلیا، وہیں مستقل رہ گئے اور پیوند خاک ہوئے آپ کو مولوی گدی کہا جاتا تھا۔

سردار خاندان

سرداری برادری کی پنچایتی روایت کی اور قبائلی زندگی کی علامت ہے، برادری کی ہر بستی، ہر محلہ اور ہر جماعت کا ایک سردار ضرور ہوتا ہے۔ یہ ہماری جماعتی روایت بھی رہی ہے۔ مالیگاؤں میں بہت سارے سرداروں کے نام ملتے ہیں ان میں سے کئی خاندانوں کے نوجوان ۱۹۲۱ء کی خلافتی تحریک اور خلافتی فساد کے سلسلہ میں گرفتار ہو کر جیل بھی گئے۔ ان میں محمد شفیع میکو سردار (۲ سال)، محمد اسحاق کرامت سردار (کمال) (۳ سال) عبدالمجید (عبدالغفور) محمد سردار (۳ سال)، عبدالرحمٰن جگو سردار (۳ سال) شامل تھے۔

پرانے سرداروں میں ان کے نام ملتے ہیں۔ حاجی قیوم سردار (متوفی ۱۳۳۲ھ)، وزیر سردار (م ۱۹۲۸ء)، بدھو سردار (م ۱۳۳۹ھ)۔

ان کے علاوہ منشی محمد عبدالغفور سردار، الحاج بقرعیدی سردار، حبیب سردار، عبدالغفار سردار، الحاج سیٹھ عبدالخالق پدن سردار (مہد ملت) (۱۹۰۴-۱۹۸۴) مشہور صنعتکار تھے اور بھی سردار اسحٰق سردار، مدارن میاںجی سردار، منیر سردار وغیرہ تعلیمی، سیاسی اور سماجی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ قیام کا باڑہ قیام سردار کے نام سے آباد تھا۔

مالیگاؤں کے پہلوان

برادری کی کسرتی اور ورزشی روایات کو مالیگاؤں کے مہاجر پہلوان خاندانوں نے زندہ رکھا اور اس کثرت سے یہاں پہلوان پیدا ہوئے کہ ایران و توران کے رستم و اسفندیار کو لوگ بھلا بیٹھے۔ یہی نہیں یہ صرف اکھاڑے کے پہلوان ہی نہیں میدان جہاد کے غازی بھی تھے۔ مالیگاؤں کی جنگ آزادی کی تاریخ میں دو بھائی (غفور و چندی) اور شکور جنہیں خلافتی فساد کے موقع پر گرفتار کر کے پھانسی دی گئی تھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، کرم اللہ پہلوان

کے اکھاڑے کے چیلے مردانہ وار اس موقع پر باہر آکر ڈٹ گئے تھے۔ خوشو پہلوان کا خاندان
مشہور تھا، بشیر پہلوان قلعہ کی مشہور شخصیتوں میں سے تھے۔ مالیگاؤں
کی مشہور دینی و علمی ہستی بانیٔ بیت العلوم مولانا عبد اللہ کو فنِ کشتی سے بیحد شغف تھا۔
یہ مولانا کی خاندانی خصوصیت تھی۔ مالیگاؤں کے قلعہ تکیہ میں بشیر پہلوان کا خاندان آباد
تھا۔ مولانا مفتی قاری محمد حسین اشرفی کے ماموں نبو پہلوان نیا پورہ میں رحمانی مسجد کے
قریب رہتے تھے آپ ہی نے قاری صاحب کی پرورش کی تھی۔ اعظم گڑھ کے مولوی
عبد السلام (متوفی ۱۳۳۴ء) کے فرزند وحید الزماں بڑے نامی پہلوان تھے۔ منشی محمد عبد الجبار
پہلوان ساکن قلعہ پہلوانی بھی کرتے تھے اور شاعری بھی بڑا پاکیزہ ادبی ذوق رکھتے تھے انہوں
نے ہی مولوی محمد عبد المجید وحید نعمانی اشرفی کی کتاب "عورتوں کے مکر" کو بنگلور کے مسلم
پریس سے چھپوائی تھی۔ مدرسہ بیت العلوم کے مدرس مولوی عبد السلام کے والد عبد الرزاق
جمعہ جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے فنِ کشتی میں بڑے ماہر تھے۔ حاجی عبد القادر پہلوان مومن
تھی کے مدرسہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ مشہور شاعر سہیل مالیگانوی کو پہلوانی کا بڑا
چسکا تھا اسی طرح مولانا محمد یوسف عزیز ولد دائم کو بھی اس فن سے بڑی دلچسپی تھی۔ بیل
باغ کے یعقوب استاد بھی مجاہد آزادی تھے۔ پہلوان عبد الجبار (نیا پورہ) جو ریوا کے تھے
بڑے بڑے دنگلوں میں اترتے تھے۔ نیا پورہ کے مشہور صدیقی خاندان میں محمد صدیق
پہلوان کا نام نمایاں ہے۔ ایک جوان پہلوان جو اکثر ہیمٹری آیا کرتے تھے مالیگاؤں کے
فساد میں مارے گئے، رمضان تھے۔

شمس الضحیٰ پہلوان نیا پورہ میں رہتے تھے۔ اپنے زمانے کے استاد تھے، انہوں نے
بے شمار شاگرد تیار کئے تھے ہر ایک پہلوانی کے داؤ پیچ میں یکتا تھا۔

محمد حنیف پہلوان نیا پورہ میں رہتے تھے، مسلم لیگ کے سرگرم ورکر تھے سوت کے
تاجر بھی تھے۔

حلیم استاد ایک نامور پہلوان تھے ان کے نام سے حلیم پہلوان کا اکھاڑہ آج بھی مالیگاؤں
میں مشہور ہے، انھوں نے اپنے زمانے میں ہند و پاک کے مشہور پہلوان گاما کو چیلنج کیا تھا
لیکن مقابلہ نہ ہو سکا۔ حلیم پہلوان کے خاندان میں یہ روایت آج بھی قائم ہے ان کے پوتے
مشتاق جلیل پہلوان ضلع کیسری رہ چکے ہیں۔

عبدالمجید پہلوان عرف مچھر پہلوان۔ آپ مالیگاؤں کی مومن برادری کے ایک منفرد پہلوان تھے پستہ قد ہونے کے سبب اور ان کے فن کی انفرادیت کی بناء پر انھیں مچھر پہلوان کہتے تھے مگر کشتی لڑنے میں بڑے مشاق تھے۔

ورزش گاہیں

اکھاڑے کا وجود مسلم معاشرہ کے ہر دور میں طاقت و قوت کے مظاہرہ کی علامت تھا مالیگاؤں میں جنیم استاد کا کھاڑہ، کریم اللہ استاد کا اکھاڑہ، خدابخش استاد اکھاڑہ کے علاوہ سلام جمنازیم اور اسلام جمنازیم بھی موجود ہیں۔

اسلام جمنازیم

اس کے بانی سیٹھ عبدالروف (جنتا ساڑی نمبرا) ہیں، آپ کو تجارت وصنعت کے ساتھ ساتھ ورزش اور پہلوانی کا بھی شوق ہے، ان کے لڑکے ماسٹر افتخار احمد بڑے مشاق پہلوان ہیں قومی و ریاستی سطح پر کئی مرتبہ "باڈی بلڈرز" کے مقابلہ میں اوّل آئے ہیں، افتخار احمد اور مشتاق احمد۔ عبدالرؤف کے دونوں فرزندوں نے اپنی کوششوں سے اس جمنازیم کو ایک مثالی ورزش گاہ بنایا ہے جس کی مثال صرف ایران میں ملتی ہے، شہر کے متعدد معزز شہریوں نے اپنا دستِ تعاون بڑھایا ہے اس طرح اس جمنازیم میں تمام جدید آلات، ویٹ لفٹنگ اور باڈی بلڈنگ کے مہیا کئے گئے ہیں، جوڈو اور کراٹے کے ہنر بھی سکھائے جاتے ہیں۔

عبدالعزیز کلو اسٹیڈیم

سیٹھ عبدالعزیز کلو پہلوان نے اس اسٹیڈیم کو تعمیر کرایا تھا، وہ ایک کامیاب صنعتکار ہونے کے علاوہ بہترین پہلوان بھی تھے۔ بیرون ملک سے پہلوانوں کو بلا کر دنگل کرواتے تھے۔ سیاسی اور سماجی دو رہی تھے شہر کی جو خدمات کیں اس کے صلے میں ان کے نام سے میونسپلٹی نے ایک بڑا اسٹیڈیم تعمیر کروایا جس میں آج بھی پہلوانوں کے عالیشان دنگل ہوا کرتے ہیں۔

تاجسر نہ ندان[۱]

برادری کی ہجرت اور دستکاری کی تاریخ اجودھیا اور ہتوبن گڑھی کے خونچکاں واقعات

---

[۱] یہ سب حصہ ... ... حفیظ مالیگانوی۔ تاریخ شہر مالیگاؤں۔ مرحوم محمد عبدالمجید وحید اشرفی، مالیگاؤں کے سیزنڈ [illegible] ... ... (۱۹۹۲ء)۔ ابراہیم وطن۔ شبیر حکیم (۱۹۸۸ء) اور دیگر معاصرت استفادہ کیا ہے اس کا اعتراف کیا جارہا ہے۔ حوالہ کے پیش نظر موں کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔ جہاں ضروری ہے وہاں حوالہ دے دیا گیا ہے اور مشاہیر کے بارے میں معلومات سراسر ہیئت کتب پر مبنی ہیں لیکن دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

(۱۸۵۴/ ۱۲۷۱) سے وابستہ ہے اور پہلے مہاجر انگنو سیٹھ اور ظہور حاجی کے خاندانوں سے شروع ہوتی ہے۔ انگنو سیٹھ نے ایک باغیچہ میں اپنا ذاتی محلہ آباد کیا اور تین مسجدیں بطور کفارہ تعمیر کرائیں۔ شہر مالیگاؤں کے پہلے مومن صاحب جائداد و زمین تھے یعنی جاگیردار۔ ان کی جائداد ان کی اولاد کے تصرف میں رہی، انگنو سیٹھ کا انتقال ۱۳۲۸ مطابق ۱۹۱۰ء کو ہوا اور خود اپنی حیات میں بنائی ہوئی قبر میں مدفون ہوئے۔

اسی جہاد سے مفرور ایک شہسوار خدابخش شاہ محمد نے موضع بھنجن میں پناہ لی، ان کے صاحبزادے عبدالمجید سیٹھ مالیگاؤں آئے، ان کے بھائی عبدالغفور سیٹھ تھے، سوت اور ریشم کے کاروبار میں الجھے اور ایک بہت بڑے کنبہ کے جد اعلیٰ بنے۔

حاجی سیٹھ عبدالرحیم اور سیٹھ عبدالعظیم چچازاد بھائی تھے۔ ساڑی اور سوت کی تجارت میں ساجھے داری تھی۔ محلہ چار باڑی کے مکانات کو انہوں نے اور دوسرے مومنوں نے خرید کر آباد کیا، دونوں بھائیوں نے اشتراک تعاون سے ایک پختہ مسجد بنوائی۔ حاجی سیٹھ عبدالرحیم مؤرخ تاریخ شہر مالیگاؤں مولوی عبدالمجید اشرفی کے بہنوئی تھے۔ سیٹھ محمد عبدالعظیم رکن بلدیہ تھے۔ ایک اور سیٹھ۔ عبدالرشید تھے مولانا موصوف کے مداح جنہوں نے مولانا کی مجربات مجیدیہ کو چھپوا کر عوام کو تعویذ گنڈے کی تاثیرات کا تجربہ کرنے کا موقع دیا۔

عبدالمجید[1] اور عبدالحمید ناموں کی کئی ممتاز شخصیتیں مالیگاؤں میں پیدا ہوئیں۔ ایک سیٹھ[2] عبدالمجید سیٹھ عبدالغفور کے بھائی تھے۔ مولوی عبدالمجید کے صاحبزادے مولوی عبدالرزاق تھے۔ حاجی عبدالحمید کے فرزندوں میں شوکت عزیز سیاسی اور سماجی افق پر چمکے، بلدیہ کے نائب صدر رہ چکے ہیں، مولوی سیٹھ عبدالمجید تاریخ شہر مالیگاؤں کے بیان کے مطابق اس قبرستان اور عرس کے ذمہ داروں میں سے تھے جو ۱۳۳۶ مطابق ۱۹۱۸ کے کالا بخار کی وبا میں شہر خموشاں بنا۔

مدو سیٹھ جن کی مسجد مشہور ہے اور جس میں ۱۹۶۲ء سے مدرسہ خیابان العلوم و سلام پورہ قائم ہے۔ مالیگاؤں کے مشہور حافظ محمد اسمٰعیل کے صاحبزادے حافظ محمد صدیق نے عرصہ دراز تک اسی مسجد میں امامت کی۔ مدو سیٹھ نے دو مسجدیں بنوائی تھیں جو نئی مسجد حاجی دوست محمد کی مسجد کے جوار میں تھی۔

---

[1] تاریخ شہر مالیگاؤں۔ ص۱۱۔ راقم کو مختلف ناموں کی مماثلت سے کہیں کہیں اشتباہ ہوگیا ہے، اہل علم سے درخواست ہے کہ تصحیح فرمادیں اور اصلاح کر دیں۔

موتی پورہ کے جوار میں حاجی عنایت سیٹھ رہتے تھے۔ اسی کے شمال مغرب (البیان) گوشہ میں نیظر سیٹھ کی شاندار حویلی تھی۔ حضرت مسلم مالیگانوی کے جدِّ امجد غدر کے ہنگاموں میں مئوناتھ بھنجن سے مہاجرین کے نکلے، ان کے بیٹے الٰہی بخش دیسی کرگھوں پر تیار کی ہوئی ساڑیوں کی تجارت کرتے تھے۔

پوار گلی انجمن میں دو بھائی عبدالغفار اور عبدالستار آباد تھے جن کے آباء و اجداد مئوناتھ بھنجن سے ترکِ وطن کر کے آئے تھے۔ عبدالغفار کے تین فرزند تھے۔ عبداللہ جو عرف عام میں منیجر یا ماما کے نام سے مشہور تھے۔ دوسرے عبدالکریم اور تیسرے بیٹے عبدالرحیم تھے۔ عبدالکریم کے صاحبزادے الحاج محمد خلیل سیٹھ تھے جو ایک غیور، ہمدردِ قوم اور مخلص شخص تھے جود و سخاوت میں آپ کا کوئی ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ جامعہ محمدیہ منصورہ کے قیام میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ سوت اور رنگین ساڑیوں کی تجارت اور سائزنگ کی صنعت میں انہوں نے بڑی ترقی کی اور شہر کے ممتاز صنعتکار بن گئے۔ محمد خلیل سیٹھ عالی مزاج اور سیرت و کردار میں عدیم المثال تھے۔

> خدمتِ دین و شریعت اک مقدس کام تھا
> اس کے ہر آغاز کا پاکیزہ تر انجام تھا
> (ادیب مالیگانوی)

الحاج محمد خلیل عبدالکریم سیٹھ نے علم دوستی اور دینداری کا جو چراغ روشن کر رکھا تھا اس کے میت اور محافظ ان کی اولاد ہے۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر سعید احمد فیضی مالیگاؤں کے کامیاب جراح و سرجن ہیں، اور نور ہسپتال کے سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر سعید احمد فیضی معاشرہ کے نبض شناس بھی ہیں۔ شہر کی تعلیمی، سماجی اور ملی سرگرمیوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ سیٹھ محمد خلیل اولاد کے معاملے میں بھی بڑے خوش قسمت تھے۔ آپ کے صاحبزادے سیٹھ عبدالرشید، محمد رفیع اور شکیل احمد بڑے کامیاب صنعتکار ہیں۔ انہوں نے بڑی خوش اسلوبی اور خوبی سے میراث پدری کو سنبھالا ہی نہیں بلکہ دن دونی رات چوگنی ترقی بھی دی ہے اور ان کی محنت، دوراندیشی اور دیانتداری کا سبب ہے کہ آج سیٹھ محمد خلیل خاندان کا نام درخشاں اور تابندہ ہے۔ خلیل سیٹھ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ان کی اولاد بھی شہر کی دینی و تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ سیٹھ عبدالرشید جامعہ محمدیہ منصورہ کے خازن ہیں۔ خلیل سیٹھ نے صدقاتِ جاریہ کے لئے بڑے بڑے کام کئے ہیں، ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک اولاد چھوڑ کر گئے ہیں جنہوں نے ثوابِ جاریہ کی خاطر والد کے نام سے سیٹھ محمد خلیل اسکول کی بنیاد رکھی ہے جس سے شہر کے گردش نگر محلہ کی تعلیمی زندگی میں ایک سنہری دور

کا آغاز ہوا تھا ــــــــــ فیضی عبدالودود جو ڈاکٹری کرتے تھے راقم کے ساتھ اسماعیل یوسف کالج میں ہم درس تھے۔ علیگڑھ میں بھی ہمارے دورانِ ملازمت میں ملتے رہتے تھے۔ فیضی خلیل احمد سیٹھ کے دادا عبدالستار تھے۔ عبداللطیف حاجی، عبدالوکیل اور عبدالجبار حاجی اسی فیضی خاندان سے اٹھے اور صنعت و تجارت میں فیضیاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض پہنچاتے رہے ہیں۔ رئیس احمد ولد حاجی عبدالرحمٰن (متوفی ۵ رمئی ۱۹۹۳ء) جامعہ محمدیہ کے فاؤنڈر ٹرسٹی حاجی عبدالرحمٰن کے بڑے صاحبزادے اور محمد خلیل سیٹھ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ رئیس احمد فیضی ناظم جمعیۃ اہلحدیث مالیگاؤں تھے۔ یہ گھرانہ مسلک اہلحدیث سے تمسک رکھتا ہے۔

سیٹھ امیر انجمن ہدایت اسلام کے بانی تھے، پرانے امیر تھے۔ حاجی دوست محمد بزاز تھے مؤ ناتھ بھنجن کے "پچر بھیا" احسام، پیرن، دھندا اور جین کی تجارت میں چاروں اور دھوم تھی، ایک حصہ مالیگاؤں میں پھیلا پھولا! خدا بخش اور ان کے صاحبزادے کامیاب تاجروں میں شمار ہوتے ہیں۔

بیلباغ میں حاجی محمد سلیمان کا خاندان پھلا پھولا، سوت اور ریشم ـ بہت بڑے تاجر تھے اور اپنے وقت کے متمول ترین "سیٹھوں" میں شمار ہوتے تھے۔

محمد سلیمان گیا کے صاحبزادے محمد یوسف سیٹھ تھے۔ ایک دوسرے صاحبزادے محمد اسحاق تھے جو صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتے تھے۔ محمد اسحاق ایل۔ٹی۔ایم تھے اور جید قابل شخص تھے صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین سے ایوارڈ ملا تھا، جب "جمیع احباب شکستہ مالیگاؤں" نے انجمن تعلیم مسلمانان مالیگاؤں کی بنیاد (۵ ردسمبر ۱۹۲۳ء) کو بمبئی میں ڈالی تو محمد اسحاق بھی بنیادی ارکان میں شامل تھے۔ محمد یوسف سیٹھ کے صاحبزادے ڈاکٹر الطاف شہر کے ماہر معالج دندان ہیں۔

عبدالرزاق کوکب اپنے وقت کے بیحد مخلص اور بے لوث سیاسی رہنما تھے، ان کے والد حاجی محمد صدیق اور دادا اللہ بخش دلال موضع گہنہ تحصیل محمد آباد ضلع فیض آباد سے تعلق وطنیت رکھتے تھے۔ اللہ بخش پہلے ایولہ میں تجارت کرتے رہے پھر مالیگاؤں آکر بمبئی سے سوت کے کاروبار میں الجھ گئے اور کما کر سنور گئے۔

سمکیر کے قرب وجوار میں محمد عمر فتح محمد نے آبائی پیشہ ترک کرکے بیڑی کا کارخانہ ڈال دیا

اور ایک بڑی دکان ٹوپی اور جوتے کی ڈال دی، ان کے دونوں بیٹے سیٹھ محمد ایوب اور محمد چراغ بڑے مخلص اور مخیر خدام قوم ہیں، حاجی چراغ احمد، مولانا محمد اسحاق بانی اسکول سمکیسر کے سرگرم رکن ہیں،

محمود شکاری اور محمد صادق شکاری برادری سے تعلق رکھتے تھے اور فن شکاریات میں مہارت کے سبب نشانۂ شہرت بن گئے۔ صادق شکاری خلافتی تحریک کے مشہور مجاہد منشی شعبان کے گروپ میں تھے جس میں مدار سیٹھ، لال محمد، رمضان نائب، حیات علی اور مولانا بخش بھی شامل تھے۔

محمد یوسف آگاڑی سیٹھ بھی ایک کامیاب صنعتکار تھے بڑے دنوں سے صنعت پارچہ بافی ان کے یہاں تھی جب وہ ہاتھ کرگھے کے کارخانہ دار تھے ان کے دو صاحبزادے عبدالواحد اور عبدالمجید بھی آبائی صنعت سے وابستہ ہیں۔

سمکیسر کے علاقے میں اسحاق اسرائیل سیٹھ کا دبدبہ قائم تھا، آپ ہمالیہ ساڑی فیکٹری کے مالک اور اس علاقہ میں پاور لوم صنعت کے اولین بانیوں میں سے تھے، بھیونڈی کے تاجروں سے بھی آپ کا لین دین تھا۔ حافظ اسحاق سیٹھ کے گھرانے میں سوت کی رنگائی کا کاروبار آج بھی چل رہا ہے ان کے صاحبزادے یوسف اور حنیف سیٹھ آبائی روایت پر قائم ہیں۔

سمکیسر کی قدیم بستی میں ماسٹر عبدالمجید عبدالستار سیاست اور صنعت دونوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ان کے دو بھتیجوں عبدالخالق اور حاجی عبدالملک نے تجارت میں سرخروئی حاصل کی

سمکیسر کے علاقہ میں تاجن سیٹھ بھی آباد تھے بڑے دیندار شخص تھے ان کے صاحبزادے عبدالمجید ماسٹر تھے اور تاجن سیٹھ کے بھائی حاجی خیر اللہ تھے، بڑے بارسوخ اور مستحکم ذی شخصیت کے مالک تھے.

[illegible] کے والدین غدر کے ہنگاموں میں ترک وطن کر کے سورت (دادا آبادی) کے [illegible] پورہ میں آکر آباد ہو گئے۔ آپ کے صاحبزادے عبدالرزاق رزاق سیٹھ چلبے شخص تھے، انہوں نے اپنے گھر میں چار پاور لوم لگا کر انجن سے چلانے کا تجربہ کیا تھا یہ سنہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ صنعت بافندگی میں بیحد ترقی کی، ہینڈ لوم کی باگ ڈور چھوڑ کر پاور لوم کی عنان تھام لی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک نئے صنعتی دور کا آغاز ہوا جو بڑی حد تک رزاق سیٹھ کی رہین منت تھا جنہوں نے شہر کی صنعتی زندگی کو نئی سمت کی

نشاندہی کی۔

نیا پورہ میں ختو پہلوان نے پاور روم لگا کر اڑوس پڑوس کے کارخانہ داروں کو حیرت کر دیا۔

دولت اللہ اور نعمت اللہ حضرات سردار نگر کے اہالیان کے لئے "جناب اللہ ایک مخلص، مخیر اور بے لوث "انصار اللہ" ہی سے ہیں۔ سیٹھ دولت اللہ نے مالیگاؤں میں شرٹنگ اور سوٹنگ کے کپڑوں کی بُنائی میں پیشقدمی کی اور آگے بڑھ گئے۔

محمد یونس نحوی راقم کی طالبعلمی کے زمانے میں اسماعیل یوسف کالج میں ہم سے سینئر تھے، بڑے بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں، ہندی اور اردو کا آمیختہ کرکے ریختہ قسم کی زبان سے ہماری زبانیں بند کر دیتے تھے بڑے اوصافِ حمیدہ کی حامل شخصیت ہیں ایجوکیشن آفیسر بھی رہ چکے ہیں، میونسپل کونسلر بھی تھے۔ تعلیم سے بیحد دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں چراغ تلے اندھیرا نہیں بلکہ اُجالا ہی اُجالا ہے اس کے تمام ہی زیورِ تعلیم سے منور ہیں، امجد نحوی (بی۔ای) سول انجینئر ہیں، ارشد نحوی ایل۔ ایس۔ سی۔ یس ٹیک، ہیں، اشرف نحوی (ایم۔ایس۔سی) ہیں، ان کے بھائی مظفر نحوی وکالت بھی کرتے ہیں اور کامیاب صنعتکار بھی ہیں، سیاسی لیڈر کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں وہ کونسلر بھی رہ چکے ہیں، یونس نحوی جو راقم کے ہم درس تھے اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

محمد صدیق فارانی۔ دینی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروفِ عمل رہتے ہیں بڑے کامیاب صنعتکار بھی ہیں۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید فارانی اور ڈاکٹر سعید فارانی ایم۔ ایس۔ فاران ہوسپٹل میں اپنی بے لوث خدمات کے سبب مریضوں کے لئے مسیحا سے کم نہیں ہیں۔ ان کے بھائی محمد بشیر فارانی عرصے تک بمبئی میں ڈرائنگ ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ راقم سے ذہنی شناسائی تھی یہ اس گروپ میں تھے جب بمبئی میں شیخ عثمان، سالک انصاری اور محمد حاذق وغیرہ جیسے تعلیمی کارکنان مالیگاؤں کی تعلیمی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے، محمد بشیر فارانی مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کے سیکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر اقبال فارانی (ڈی۔ سی۔ ای۔ ایچ) شہر کے کامیاب معالج ہیں۔

محمد اسحٰق زردا لے بڑا سنہرا دل رکھتے ہیں، مخیر و مخلص انسان ہیں، کئی عصری اور دینی تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں، غریب پرور شخص ہیں اور برادری کے لئے بڑا دردمند دل رکھتے ہیں، شہری مسائل کو حل کرنے کے لئے پیش پیش رہتے ہیں، ان کا ذری دھاگے کے بیوپار کا سلسلہ سورت، بھیونڈی،

دھولیہ اور برہانپور تک پھیلا ہوا ہے۔

محمد عمر گلشن معادم رنگین ساڑی کی صنعت کے کامیاب تاجر ہیں۔ دیگر تاجروں کی طرح آپ بھی تعلیمی، سیاسی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کے بھائی سیٹھ محمد صابر مرحوم ایک مخلص اور بے لوث دینی خادم تھے صابر مرحوم کے صاحبزادے رئیس احمد اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے چیئرمین ہیں، تعلیم کے میدان میں ان کی بیش بہا خدمات ہیں۔

سیٹھ محمد یوسف خاموش قسم کے سماجی ورکر ہیں اور بے حد فعال ہیں صاحبزادے ڈاکٹر اقبال انصاری ریڈیولوجسٹ ہیں۔

شیخ عبدالودود سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، ان کی خدمات کی یادگار میں شیخ عبدالودود پرائمری اسکول اے ٹی ٹی ہائی اسکول میں قائم کیا گیا ہے۔ ان کے دو صاحبزادے ڈاکٹر طبیب شیخ اور رفیق شیخ (ایم۔ ڈی) بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

بدر کے بارے میں ڈاکٹر سلیم صدیقی کا خاندان 'بدر منیر' بنا ہوا ہے، نہایت تعلیم یافتہ خاندان ہے۔ صنعت پارچہ بافی میں بھی گوئے سبقت لے گئے ہیں، ان کے لڑکے خالد عمر صدیقی، ڈاکٹر طارق، کامران اور نجیب، محمد سفید کپڑوں کی صنعت میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں، سلیم سائزنگ بھی کامیابی سے چل رہی ہے، خالد عمر صدیقی انتہائی سنجیدہ اور مخلص انسان ہیں تعلیمی، دینی اور سماجی خدمات میں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں، فی الحال بیت العلوم اور فارسی کالج کے رکن خاص ہیں۔

سیٹھ عبدالمجید چمڑے والے کا خاندان بڑا کثیر العیال ہے، سیٹھ صاحب جس کی کفالت نہایت عمدگی سے کر رہے ہیں، معروف عمل رہتے ہیں اور علمی دائرہ بڑا وسیع ہے، سماجی اور تعلیمی خدمات کے علاوہ کئی دینی اور عصری اداروں کی کفالت بھی کرتے ہیں، رنگین ساڑی اور سفید کپڑوں کی تجارت اور یوسف سائزنگ سے بازار گرم رکھتے ہیں۔

سیٹھ عبدالرحیم چمڑے والے انتہائی سنجیدہ اور ٹھوس قسم کے انسان ہیں، تعلیم سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں، سوسن ڈرس اسکول کے بانی ہیں، اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ طبی تعلیم سے سنوار رہے ہیں، ان کے چھوٹے بھائی محمد ابراہیم سفید کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں اور سائزنگ کے کاروبار میں بھی معروف ہیں، خود محمد ابراہیم سیٹھ ایم کام کی اعلیٰ ڈگری رکھتے ہیں اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے فعال رکنِ انجمن ہیں۔

حاجی نورالہدیٰ (مرحوم) اور محمد یوسف مولابخش بڑے فعال سماجی ورکر رہے تھے، نوجیون ساڑی کو نیا جیون دیا جو کامیابی سے چلتی رہی ان کے لڑکے محمد سلیم نورالہدیٰ (مرحوم) بھی سماجی کارکن تھے اور بڑے کامیاب صنعتکار بھی تھے۔ ظہیر احمد محمد یوسف بڑے محنتی اور سلجھے ہوئے نوجوان ہیں، سماجی امور سے دلچسپی لیتے ہیں۔

خانصاحب حاجی عبدالرحیم کا خاندان کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے، سیاست، صنعت، ادب، تعلیم حکمت وطبابت اور وکالت وتجارت کی ایک طویل قافیہ پیمائی سے مستجمع یہ خاندان، مثنوی گلزار مالیگاؤں، ہے۔ نذیر حکیم تاجر ہیں اور شبیر احمد حکیم ادیب اور مورخ ہیں تجارت وصنعت پارچہ بافی آبائی پیشہ ہے۔ برف بنانے کا کارخانہ بھی قائم کر رکھا ہے، ظہیر احمد مجید خوش مزاج انسان ہیں، کامیاب صنعتکار بھی ہیں

سیٹھ عبدالرشید حاجی احمد

اہل البر والاحسان کے اس زمرے میں عبدالرشید حاجی احمد ایک نمایاں اور امتیازی مرتبت رکھتے ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے رکن کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں مقبول ہیں ان کی تہہ دار شخصیت میں کئی اور جلوے نمایاں ہیں، ادبی حلقوں میں بڑے معتبر تسلیم کئے جاتے ہیں اس لئے کہ آپ شعراء و ادباء کی مالی اعانت فرماتے ہیں۔ مریضوں کو طبی امداد پہنچاتے ہیں۔ دیگر ثقافتی اور تہذیبی اداروں کی اعانت کرنا، خوشخطی کے مراکز کی معاونت کرنا، تعلیمی درسگاہوں کو ٹائپ رائٹر (اردو) خرید کر دینا، ڈرامہ نویسی کا اہتمام کرنا اور اردو ادب کے فروغ کے لئے مجلسوں کا انعقاد کرنا عبدالرشید حاجی احمد کی پہلودار شخصیت کے جگمگاتے جلوے ہیں حرف بسیار شیوہ ہاست سخن را کہ تمام نیست۔

آپ سیٹھ احمد لوہے والے کے صاحبزادے ہیں جو خود بھی ایک راست دینی ذہن رکھتے تھے، آپ کی رنگین ساڑی کی آڑھت کی دوکان تھی۔

محمد حنیف شوال اسلام پورہ کی ایک معزز اور مخیر شخصیت ہیں، تعلیم یافتہ ہیں اور اہلِ علم کے قدردان دوراندیش صنعتکار ہیں، اور عوام کے مخلص اور بے لوث خادم ہیں۔

محمد اسماعیل بیڑی والا خاندان ـــــ شہر میں انتہائی ہر دلعزیز اور قابلِ احترام گھرانہ ہے، بیڑی کی صنعت وتجارت پر اجارہ داری قائم ہے۔

سیٹھ محمد مصطفیٰ، سیٹھ سلطان احمد، سیٹھ عبدالاحد، سیٹھ عفران احمد اور ان کے ماتحت تاجر

حضرات بہت سارے شعبوں اور اداروں سے وابستہ رہ کر تعلیمی، سماجی اور سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں اس کے ساتھ ہی مالیگاؤں اسپننگ مل اجنتا کوآپریٹیو بینک وغیرہ جیسے باہمی تعاونی وامدادی اداروں سے منسلک رہ کر عوام وخواص کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

محمد اسحاق سوت والے (اسلام پورہ) میں ایک غریب پرور، مخیر اور دیندار شخص تھے ان کے بڑے صاحبزادے یوسف وکیل ہیں، آپ پونہ میں زیر تعلیم تھے، محمد حنیف سیٹھ کاروبار کے سلسلے میں بھیونڈی اور بمبئی آتے جاتے رہتے ہیں، بھیونڈی کے مشہور مخیر اور متمول شخص محمد حسن خلیل (نالہ سیٹھ) سے آپ کے بڑے گہرے تعلقات ہیں، مشہور علمی ودینی ادارہ معہد ملت کے ٹرسٹی ہیں، سماجی ورکر ہیں۔ چھوٹے لڑکے محمد مصطفیٰ یزدانی آنکھوں کے ماہر معالج ہیں۔

سیٹھ حبیب اللہ بھی محمد اسحاق سیٹھ کے معاصرین میں سے تھے، انہیں کی طرح آپ بھی سوت کا کاروبار کرتے تھے، بڑے مخیر شخص تھے کئی اداروں کی مالی اعانت کرتے تھے، ان کے بڑے لڑکے سیٹھ شکیل احمد کا شمار محسنین ادب میں ہوتا تھا، ادب وشاعری سے بیحد لگاؤ تھا، اردو زبان کی بقا کے ضامن ایسے ہی محسن ادب ہوتے ہیں۔

سیٹھ محمد ہارون، ماسٹر حافظ محمد یعقوب کے لڑکے تھے اور نوبہار ساڑی پر یہار لاتے کی ذمہ داری آپ کی محنت اور لگن پر تھی۔ بیحد رحم دل شخص تھے، درد مند دل رکھتے تھے، ان کے بھائی محمد اقبال کو صنعت پارچہ بافی میں اقبال مندی حاصل ہے۔ آپ سماجی کاموں سے بیحد دلچسپی رکھتے ہیں۔

سیٹھ عبدالعزیز اشرفی سمکیسر کے کارخانہ داروں میں شمار ہوتے تھے، خیر وخیرات کے لیے بڑا دل رکھتے تھے، انکے لڑکے حاجی ظہیر احمد خال اور سرگرم تعلیمی خادم ہیں آپ ایک کامیاب صنعتکار بھی ہیں۔

حاجی سعد اللہ بھی سمکیسر کے کامیاب تاجروں میں سے تھے، دیندار شخص تھے ان کے لڑکے ماسٹر انصاری محمد لطیف (ایم۔ اے) اے ٹی ٹی ہائی اسکول سے وابستہ ہیں، مولانا اسحاق ہائی اسکول کے فعال رکن ہیں۔

حاجی سیٹھ محمد صابر عبدالستار (۱۹۰۷ - ۱۹۸۱) بڑے فراخدل واقع ہوئے تھے صابر ستار ڈونگ ہال آپ کے نام اور نیکنامی کی یادگار ہے، سیٹھ محمد صابر نے مولانا عبدالحمید نعمانی کی پریس ڈالنے میں بڑی مدد کی تھی صابر سیٹھ مولانا کے نہ صرف دیرینہ ساتھی تھے بلکہ ہم مشرب

اور سیاسی دوست بھی تھے۔ اسی پریس کے قائم ہونے کے بعد مولانا کا پرچہ "بیداری" چلتا رہا۔ مولانا نعمانی بھی صابر سیٹھ کے بڑے قدرداں تھے۔ جب بھی پریس پر کوئی افتاد پڑی صابر سیٹھ آگے بڑھے، کہا کرتے تھے "مولانا آپ کے پاس علم ہے اور میرے پاس دولتِ زر ہے۔

محمد صابر سیٹھ ایم۔ ایل۔ اے تھے۔ آپ کے بارے میں ادیب مالیگانوی نے لکھا ہے۔

رگوں میں اس کی رواں تھا صداقتوں کا لہو
وہ اہلِ درد کی تابندگی کے ساتھ رہا

<u>ہارون بی۔ اے</u> صابر سیٹھ کے ہونہار صاحبزادے ہیں، مشہور اشتراکی رہنما ہیں مالیگاؤں کے سیاسی مدبرین میں آپ کا نام سرِ فہرست ہے، بڑے بیباک واقع ہوئے ہیں، نہ کبھی جاہ کی چاہ کی اور نہ اقتدار کی ہوس، آپ کی جولانیاں صرف سیاست تک محدود نہیں رہی بلکہ تعلیمی، سماجی اور ثقافتی میدانوں کے بھی آپ یکۂ تاز شہسوار ہیں، تعلیم سے رغبت ہے اسی لئے اپنی صاحبزادیوں کو اعلیٰ طبی تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ ڈاکٹر عزرانہ (ایم۔ ایس۔ ای این ٹی) کان، ناک اور حلق کے امراض کی ماہر ڈاکٹر ہیں، بھیونڈی کے ڈاکٹر عبدالسلام انصاری کی بیگم ہیں، ڈاکٹر رضیہ ایں۔ سی۔ ای۔ ایچ ڈاکٹر ہیں اور روحی پیتھولوجسٹ کی حیثیت سے روحی لیباریٹری، ہوم سائنس اور پیتھولوجی کی کلاسیز بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔

صابر سیٹھ کے دوسرے صاحبزادے سیٹھ جلال احمد ایک کامیاب تاجر، مخلص سماجی ورکر اور ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے باذوق شخص ہیں۔

الحاج عبدالخالق پٹن سردار رہنمائے ملت ہیں اور ان کی قیادت میں برادری نے سماجی و صنعتی طور پر بڑی ترقی کی ہے میدانِ سیاست کے شہسوار ہیں اور دین کے صراطِ مستقیم کے سالک، خلوص و بے لوثی سے ہر جہت میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ان کے فرزند حاجی عبدالعزیز نے سنتِ پدری کو برقرار رکھا ہے اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔ حاجی صاحب کے بھتیجے غلام ربانی سردار بھی خادمِ قوم ہیں۔ معہدِ ملت میں مسندِ درس و افادہ کو رونق بخش رہے ہیں فارسی کالج کو بھی آپ کی خدمات سے فیض پہنچ رہا ہے۔ عبدالخالق پٹن سردار۔ مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی مرکزی کمیٹی کے ممبر تھے۔ یہ خانوادہ صنعتی اعتبار سے بھی مالیگاؤں شہر میں ممتاز ہے۔

صنعتِ پارچہ بافی میں قدامت کی منہاج چھوڑ کر ندرت کی نئی نہج پر چلنے والے ماہرین

اور صنعتکاران کی کمی مالیگاؤں میں کبھی نہیں رہی۔ کچھ 'حسنِ اختراع' کی جلوہ آفرینی تھی اور
کچھ جدت پسندی کا نیا چلن کہ ناگ چھاپ ساڑی چل نکلی جس کی کامیابی کا سہرا محمد مصطفیٰ عبدالمجید
سیٹھ ناگ چھاپ والے کے سر ہے۔ سیٹھ خلیل احمد عبدالکریم (فیفی) کی طرح آپ بھی شہر کے
کامیاب ترین صنعتکاروں میں شمار ہوتے تھے۔ عبدالمجید سیٹھ محمد علی روڈ پر دریائی ہوٹل کے مالک
تھے۔ محمد مرتضیٰ والد کے نقشِ قدم پر چل کر بندی چھاپ پاٹل ساڑی بنا کر کامیاب تاجر بنے۔ انکے
صاحبزادے سیٹھ عبداللطیف، مختار احمد اور اشفاق احمد بھی بڑے کامیاب تاجروں میں شمار ہوتے
ہیں، ان کے بڑے لڑکے مرحوم عبدالمجید ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے، بڑے سنجیدہ اور نفیس نوجوان تھے۔

سیٹھ محمد مصطفیٰ ناگ (چھاپ) کے صاحبزادے شفیق احمد ایک کامیاب تاجر ہیں اور اپنی سماجی
کارکردگی کے سبب شہر میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

مصطفیٰ سیٹھ کے عم زاد بھائی حاجی شمس الضحیٰ (حفیظ سائزنگ) نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں
کو بروئے کار لاکر صنعتی و فنی امور میں بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں اور سفید کپڑوں کی بنائی میں
ایک منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ سفید کپڑوں کا گروپ اور حفیظ سائزنگ بڑی کامیابیوں سے ہمکنار
ہے، کثیر العیال شخص ہیں، حاجی عبدالقدوس، عبدالقیوم، عبدالودود، اور راشد احمد آپ کے صاحبزادے
ہیں جو خاندان کے بجا طور پر فخر اور مونس ہیں۔

نیا پورہ میں صدیقی خاندان اپنی دینداری، ادبی و علمی و سماجی سرگرمیوں کے سبب بڑی
شہرت رکھتا ہے۔ تجارت میں گرمیٔ بازار نے ساکھ قائم کر دی ہے۔ یہ خانوادہ اسلاف کی
دینی و ملی روایات کا امین ہے جس میں منشی محمد سلیمان، محمد صدیق پہلوان اور حاجی محمد
یٰسین جیسی قد آور شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں سماجی و صنعتی اقدار کا حامل یہ خاندان شہر کے ممتاز
گھرانوں میں شمار ہوتا ہے۔ حاجی غلام رسول کی بے پناہ محنت و مشقت سے صنعتی ترقی ہوئی
اور مالی خوشحالی کو استحکام پہنچا، رنگین ساڑیوں کی بنکاری میں بھی غلام رسول کی خصوصیت
نے بڑا گہرا رنگ بھر دیا تھا انہوں نے رنگین ساڑیوں کی زندگی میں رنگائی، بنائی اور کانجی
کے استعمال میں کامیاب تجربے کئے جن سے شہر کے صنعتکاروں کو بھی فیض پہنچا۔ اس "خانۂ
ہمہ آفتاب" کے درخشاں ستاروں نے سپہر ادب کو بھی جگمگا دیا ہے۔ امین صدیقی اور
مصطفیٰ صدیقی اسلامی ذہن و فکر رکھتے ہیں، بڑے پاکیزہ اشعار کہتے ہیں حیات کے ساتھ
اس خاندان کی حکایت میں حکمت کا بھی پہلو نمایاں ہے۔ ڈاکٹر غلام حیدر حکمت و تجارت

کے نبض شناس ہیں زراعت اور باغبانی کے شوق نے اور شعری ذوق نے آپ کی شخصیت کو پُربہار بنا دیا۔

مرحوم حاجی غلام رسول ولد محمد امین صدیقی کے صاحبزادوں نے 'راج بنس' کے کاروبار کو بڑی خوش سلیقگی سے سنبھالے رکھا ہے اور اسے کامیابی کے راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ حاجی نہال احمد، حاجی عبیدالرحمن اور خالد احمد صدیقی کی سعیٔ پیہم اور مسلسل جد و جہد سے بی۔ آر۔ صدیقی سائزنگ چلا رہے ہیں، حاجی محمد یسین اس خاندان کے باقیات صالحات میں سے ہیں، متقی اور دیندار شخص ہیں انہیں کی محنتوں، دعاؤں اور ایثار و قربانی کا نتیجہ ہے کہ صدیقی خاندان کو شہرت، استحکام اور توانائی حاصل ہوئی ہے، حاجی محمد یسین کثیر الاولاد ہیں ڈاکٹر سہیل احمد صنعتکار بھی ہیں اور پریکٹس بھی کر رہے ہیں، ڈاکٹر رفیق احمد صدیقی برادری کے پہلے ڈاکٹر ہیں جو آنکھوں کے ماہر معالج ہیں، آپ بلدیہ کے صحت عامہ کے چیف آفیسر ہیں، شفیق احمد، خورشید احمد، غلام محمد اور محمد اسحاق اپنے اپنے صنعتی شعبے کے ذمہ دار نگراں ہیں اور بڑی کامیابی سے اسے چلا رہے ہیں یہ راج ہنس رنگین ساڑی، ایگل فیبرکس اور سلیمانی سائزنگ ان بھائیوں کی متفقہ کوششوں، محنت اور لگن سے بڑی کامیابیوں سے ہمکنار ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی ان سات بھائیوں میں ایک منفرد ادبی، ثقافتی اور تہذیبی مقام رکھتے ہیں، اس پوری روایتی غزل کے مسلسل تغزل ہیں ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی ایک بجد فعال، سماجی، ادبی اور ثقافتی ورکر ہیں، تعلیمی اور ادبی محفلوں اور جلسوں کے ناظم اور روح رواں ہیں۔

سیٹھ عبدالعزیز (نیا پورہ) 'بلیو برڈ' کی علامت کے ساتھ شہرت کے آسمان پر پرواز کر رہے ہیں، نہایت سلجھے ہوئے صنعتکار ہیں، رنگین ساڑی کی صنعت میں آپ کے مال 'بلیو برڈ' کا نام ایک معتبر نام ہے۔ یہ خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس کا تعلیمی سفر ڈاکٹر شیخ سیم سے شروع ہوا ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابراہیم شیخ بمبئی سے ایم۔ ایس کرنے کے بعد انگلستان میں جا کر بس گئے، سیٹھ عبدالعزیز کے ہونہار بڑے لڑکے ڈاکٹر شیخ عبداللطیف نے بھی جے جے ہسپتال بمبئی سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد امریکہ چلے گئے وہاں انہوں نے ایم۔ ایس کی ڈگری حاصل کی اور کامیابی کے ساتھ پریکٹس کر رہے ہیں۔ دوسرے صاحبزادوں رئیس احمد، نہال احمد، نیاز احمد، جمیل احمد اور افتخار احمد نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ لیکن کاروبار کے تانے بانے میں الجھ کر کامیاب تاجر بن گئے ہیں اور رنگین ساڑی اور سفید کپڑوں کے کامیاب تاجر ہیں۔ سیٹھ عبدالعزیز

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی مقامی کمیٹی کے رکن تھے۔

حاجی عبدالرحمٰن (۶۲ نمبر) کا نام مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی مقامی کمیٹی میں نظر آتا ہے، تعلیم کے فروغ کے ساتھ حاجی صاحب سماجی و دینی امور سے دلبستگی رکھتے ہیں، نیا پورہ کی ہر دلعزیز اور قابلِ احترام ہستی ہیں اور منتخبات زمانہ میں شمار ہوتے ہیں اور یادگارِ زمانہ افراد میں سے ہیں انتہائی مخلص اور بے لوث سماجی خادم ہیں۔ مخیر اور متمول ہیں۔ تبلیغی جماعت مالیگاؤں مرکز کے روحِ رواں ہیں۔

عزیز الرحمٰن ـــ حاجی عبدالرحمٰن کے برادر خورد بھی ایک بے لوث خادم قوم ہیں۔ مالیگاؤں اسپننگ مل کے ڈائرکٹر ہیں۔ حاجی عبدالرحمٰن اور ان کے بھائی حبیب الرحمٰن اور لڑکوں کے ساتھ "رحمانی گروپ" کے تحت سفید کپڑا بناتے ہیں رحمانی سائزنگ بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔

ڈائمنڈ مل والا خاندان بھی بڑا مشہور رہا، اسی گھرانے میں حافظ عبدالغنی و مولوی عبدالمجید پیدا ہوئے۔ محمد امین محمد عثمان اور محمد یٰسین سیٹھ تینوں ڈائمنڈ مل کے بانیان میں سے تھے۔ مصطفیٰ سیٹھ تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن تھے۔ برہانپور تک تجارت کے تانے بانے پھیلے ہوئے تھے اور وہاں کے ممتاز تجار میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

حاجی محمد عثمان ڈائمنڈ والے کے بھی دو لعل و گہر۔ ایک فرزند ڈاکٹر سلیم آصف اور دختر ڈاکٹر آصفہ پروین (ایم۔ڈی) کے بھی جوہر شناس قدردان مالیگاؤں میں موجود ہیں، خود حاجی صاحب پارچہ بافی کے بازار کے بڑے جوہر شناس تاجر اور صنعتکار ہیں۔ ان کے دوسرے لڑکے جمیل احمد، ظہیر احمد اور شکیل احمد کامیاب تاجر ہیں۔

سیٹھ محمد حنیف (یونیورسل سائزنگ) کے مالک کو صنعت و تجارت سے جتنا لگاؤ تھا اس سے زیادہ دین سے شغف تھا، جماعت اسلامی کے فعال رکن تھے۔ اُن کے بڑے لڑکے حاجی عبدالرحمٰن بھی سنتِ پدری پر چل کر دینی اور سماجی خدمت انجام دے رہے ہیں خاص طور سے مالیگاؤں کے عازمین حج بیت اللہ اور زائرین کرام کے لیے بڑی محنت کرتے ہیں ضلعی سطح پر حج کمیٹی کے سیکریٹری بھی ہیں۔

اس خاندان میں عبدالرحمٰن الحاج محمد حنیف اور ان کے والد محمد نذیر سیٹھ کامیاب تجار میں شمار ہوتے ہیں۔

حاجی عبیدالرحمٰن جہد پیہم کے پیکر ہیں، ایک طرف پارچہ بافی کا تانا بانا تھامے رکھتے ہیں اور دوسری طرف کھیتوں کی آبیاری بھی کرتے ہیں، پولٹری فارم بھی چلاتے ہیں اور کاشتکاری سے بھی شغف رکھتے ہیں، ایثار و قربانی و بکر سارے خاندان کی کفالت کرتے ہیں، حاجی عبیدالرحمٰن ایم۔ایس۔سی (علیگ) ہیں۔

ان کے بھائی حاجی عبدالرحیم تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن ہیں اور یونیورسل سائزنگ بحسن و خوبی چلا رہے ہیں، ان کے دیگر بھائیوں میں عبدالغفار، نعیم الرحمٰن اور شفیق احمد بڑے کامیاب تاجر ہیں۔

محمد صادق میاجی بڑے صادق دینی خادم اور دیندار صنعتکار تھے۔ معہد ملت کے بانیوں میں ان کا نام صدقۂ جاریہ کا وسیلہ بنا ہوا ہے اپنی دینی خدمات اور حسنِ عمل کے وسیلے سے وہ عنداللہ ماجور تو ضرور ہوں گے لیکن اللہ تبارک تعالیٰ نے ان کے صاحبزادے نہال احمد کو مال و دولت سے نہال کر دیا ہے آپ ایک کامیاب صنعتکار ہیں۔

سیٹھ عبدالعزیز کلو کا خاندان سماجی و صنعتی لحاظ سے ممتاز ہے۔ حاجی محمد یوسف اور عبدالقیوم (جدیہ کے رکن) بڑے کامیاب تاجر ہیں۔

سیٹھ عبدالحمید (نورنگ ساڑی) ایک کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں مخلص بھی ہیں اور مخیر بھی سماجی اور تعلیمی امور سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے بھائی حاجی عبدالرشید اور سیٹھ عبدالعزیز پارچہ بافی کی صنعت کے کامیاب صنعتکار ہیں۔

سیٹھ حاجی محمد مصطفیٰ بخشی ـــ ایک دیندار اور مخیر صنعتکار تھے، کئی سائزنگ ایک ساتھ "ایم۔ بی سائزنگ" کے نام سے چلاتے تھے۔ بڑے سخی دل تھے، کلیۃ الطاہرات۔ مدرسۂ نسواں کے لئے زمین آپ ہی نے عطا کی تھی اور تادم حیات اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے ان کے لڑکے فضل الرحمٰن اور عبدالرؤف کامیاب تاجر ہیں۔

سیٹھ محمد اسحاق منشی نے بھی آبائی پیشہ پارچہ بافی میں بڑی ترقی کی، کامیاب صنعتکار تھے، دین سے لگاؤ تھا، نورانی مسجد کے ٹرسٹی تھے انہیں کی یاد میں اسحاق منشی ٹاؤن ہال نیا پورہ میں تعمیر کیا گیا ہے، ان کے لڑکے سنتِ پدری کی تقلید میں باپ کی طرح مخیر ہیں اور دیندار شخصیت کے حامل ہیں۔

حاجی لقمانی سیٹھ نیا پورہ میں نیک نامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، دینی اور سماجی امور سے دلچسپی

دلچسپی لیتے ہیں، قبرستان کی مسجد اور مدرسہ اسلامیہ کے ٹرسٹی ہیں۔ نیک اولاد واہب العطایا نے عطا کی ہے۔ حاجی محمد مصطفیٰ بقاتی، شمس الضحیٰ، محمد فتح تینوں بیٹے بھی باپ کے نقش قدم پر چل کر سماجی، دینی اور سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

حاجی عبدالعزیز بمبئی سیٹھ بڑے سرگرم اور سلجھے ہوئے سماجی کارکن ہیں اور بڑے کامیاب صنعتکار ہیں، ماسٹر سائزنگ کی بنیاد ڈالی، مالیگاؤں ہائی اسکول اور انجمن ہدایت اسلام کے بانیان میں سے ہیں، آپ کے صاحبزادے سیٹھ یونس احمد ان اداروں کے فعال رکن ہیں، آپ اچھے اور کامیاب تاجر بھی ہیں۔

نذیر سیٹھ، محمد الیاس بعج والے، ڈاؤن خاندان، حاجی محمد ہندوستان والا، محمد اسحاق کابلی، حاجی عبدالرحمن میاں محمد سردار، محمد الیاس سیٹھ یہ سارے لوگ نیاپورہ کے بااثر، مخیر اور کامیاب صنعتکاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

سیٹھ محمد فاروق مقادم (دلال الملی پاٹل)۔ خود ایک ماہر دستکار بھی ہیں اور مشہور صنعتکار بھی ہیں، رنگین ساڑی کی بُنائی اور رنگائی میں ان کا ہاتھ کوئی پکڑ نہیں سکتا، بحیثیت سماجی اور سیاسی کارکن کے، میونسپل کاؤنسلر کے رکن بن کر سماجی و شہری خدمات کر رہے ہیں۔

محلہ قلعہ کی مشہور شخصیت سیٹھ عبدالمالک رنگین ساڑی کی آڑھت کی دکان چلاتے تھے، سیاسی و سماجی لحاظ سے سرگرم عمل رہے ان کے لڑکے ڈاکٹر مصطفیٰ اور ڈاکٹر عمران طبی خدمات انجام دے رہے ہیں، بیحد مخلص انسان ہیں۔

سیٹھ عبدالرؤف (جنتا ساڑی نمبرا) کے بنانے والے محلہ قلعہ کی ایک مشہور شخصیت ہیں، اسلام جمنا ز کے بانی ہیں، ان کے لڑکے مختار احمد نے صنعت میں کافی نام کمایا ہے، ورزش کے میدان کے پہلوان اور "باڈی بلڈر" ہیں، مشتاق احمد کامیاب صنعتکار ہیں۔

محمد مصطفیٰ لالہ سیٹھ، قلعہ کے مشاہیر صنعتکاروں میں سے ہیں، سماجی کام بھی انجام دیتے ہیں اور سیاست میں بھی دخل رکھتے ہیں، ان کے صاحبزادے ایڈوکیٹ شکیل احمد ایک سرگرم تعلیمی اور دینی ورکر ہیں، وکالت میں بھی کامیابی کے ساتھ پریکٹس کر رہے ہیں۔

محمد اسحاق (بی ٹی) محلہ رسول پورہ کے تعلیم یافتہ صنعتکار تھے، تعلیمی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ تادم حیات اے ٹی ٹی ہائی اسکول کی خدمت بجالاتے رہے، ان کے صاحبزادوں میں اشفاق احمد ایم۔ کام ہیں۔

سیٹھ شمس الضحیٰ (دیونی ٹیسائزنگ) کے مالک ہیں، ساتھ میں سفید کپڑوں کی تجارت بھی کرتے ہیں، دردمند دل رکھتے ہیں اور خیر و خیرات میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

حاجی محمد ابراہیم (کلر والے) اسلام پورہ کے مشہور تاجر ہیں، سماجی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، ان کے بڑے لڑکے سیٹھ عبدالعزیز بڑے ہر دلعزیز ہیں خوش مزاج بھی ہیں دردمند دل بھی رکھتے ہیں، میونسپل کاؤنسلر کی حیثیت سے شہری و سماجی خدمات بجالا رہے ہیں، ان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر عبدالمجید مریضوں کے ہر دلعزیز 'مسیحا' ہیں، خلیل احمد اور سلیم احمد بھی سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، کھیل کود سے خصوصی دلچسپی لیتے ہیں۔

سیٹھ عبدالاحد برف والے اسلام پورہ کے پرانے صنعتکاروں میں سے تھے، دیندار شخصیت کے حامل تھے، مسجد ملت کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، حاجی عبداللطیف برف والے بڑی گرمجوشی سے دینی اور سماجی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔

محمد اسحاق آزاد کے لڑکے سیٹھ خالد انصاری بڑے سرگرم صنعتی ورکر ہیں، اسپننگ مل کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں، ایک دوراندیش صنعتکار بھی ہیں، مالیگاؤں کی پاور لوم صنعت کے عروج و زوال پر گہری بصیرت رکھتے ہیں، کئی اداروں کے رکن ہیں جن میں مالیگاؤں پاور لوم ایسوسی ایشن، الیکشن کمیٹی مالیگاؤں، مسلم تنظیم اور جمعیۃ العلماء قابل ذکر ہیں۔

اسرار اعظمی مقامی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن اور رہنما ہیں، روشن سائزنگ کے مالک ہیں بڑے کامیاب تاجر ہیں۔ ادبی و شعری سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

سیٹھ نہال احمد قادری ایک مخلص انسان ہیں، سیاست میں دخل رکھتے ہیں دینی کاموں میں مصروف عمل رہتے ہیں، تانا بانا بھی سکھاتے ہیں اور کامیاب صنعتکار شمار ہوتے ہیں، کئی تعلیمی اور سماجی اداروں کے رکن ہیں سفید کپڑوں کی صنعت کے کاروبار کے تار و پود بمبئی تک پھیلے ہوئے ہیں۔

شہر کے صنعت کار، تاجر اور دوکاندار حضرات بھی تعلیمی مدرسے بڑی گہری وابستگی رکھتے ہیں اور دینی کاموں سے دلبستگی رکھتے ہیں۔ ابن دل ہیں اور بڑے دلدار واقع ہوئے ہیں، سیٹھ محمد مصطفیٰ، سیٹھ عبدالاحد، سیٹھ عفران احمد اور ان کے مماثل تاجر حضرات بہت سارے شعبوں اور اداروں سے وابستہ رہ کر تعلیمی، سماجی اور سیاسی خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے ساتھ ہی مالیگاؤں اسپننگ مل، جنتا کوآپریٹیو بینک وغیرہ جیسے باہمی تعاونی

وامدادی اداروں سے منسلک رہ کر عوام وخواص کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔
کئی دینی درسگاہیں اور عصری تعلیم گاہیں ان جیسے مخیر اور متمول اور باشعور افراد کے
وسیلے سے چل رہی ہیں، بہت سارے حضرات اپنا دائرۂ عمل اپنے محلے تک محدود رکھے
ہوئے ہیں، یہ طبقہ معاشرہ کا جوہر ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو مسیحائی بھی کرتے ہیں اور
رہنمائی بھی جراحتِ دل کا مداوا کرتے ہیں اور دردمندی اور بے لاگ محبت وخدمت کا دعویٰ
بھی کرتے ہیں۔ تبرکاً چند اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

سیٹھ عبدالرحیم چمڑے والے، سیٹھ شمس الضحیٰ (یونی ٹی سائزنگ) سیٹھ علاء الدین
ماسٹر، حیدری ماسٹر، عبدالعزیز کلر، سیٹھ محمد حنیف سوت والے۔ ظہیر احمد (نوجیون
ساڑی ہو سرچیک)، سیٹھ عبدالحمید، سید عارف، عبدالخالق بی۔ اے۔ سیٹھ عبدالعزیز
(سنگیشور) سیٹھ ریاض احمد (سنٹرل نیا)۔ جمیل احمد کراتی۔ صدیق شفیق احمد خورشید
احمد صدیقی اور غلام محمد (نیوراج ہنس ساڑی)۔ محمد ابراہیم چمڑے والے۔ فضل الرحمٰن
(ایم۔جی سائزنگ)، سیٹھ ریاض احمد ملاّ۔ عبدالرحیم (یونیورسل سائزنگ)۔ یونیورسل
سائزنگ کے عبید انصاری مالیگاؤں ایجوکیشن سوسائٹی کی مقامی کمیٹی مالیگاؤں کے
ممبر تھے۔ سیٹھ عبدالحمید چمڑے والے، سیٹھ عبدالحمید (نورنگ ساڑی)۔ خورشید احمد
صدیقی (نورنگ ساڑی) سیٹھ عبدالعزیز (بلیو برڈ) سیٹھ حاجی غلام رسول (راج ہنس
ساڑی) سیٹھ عبدالخالق پدن سردار، سیٹھ حاجی عبدالرحمٰن (۴۲ نمبر) سیٹھ محمد حنیف
(سوت والے) اور سیٹھ عبدالعزیز بجی ـــ ان تمام حضرات کا تعاون مذکورہ بالا تعلیمی
سماجی اور دینی اداروں سے مستقل رہا ہے۔ ناموں کی فہرست بے حد طویل ہے لیکن پھر بھی ممتاز
افراد کا ذکر بے حد ضروری ہے کہ یہی لوگ ہیں جو دامے، درمے، قدمے اور سخنے۔ ان تمام
اداروں کی اعانت فرماتے ہیں جن سے ایک 'معاشرہ' کی تشکیل وتکمیل ہوتی ہے:

مولانا محمد انیس رفیع مقادم سیٹھ محمد الیاس (الیاس سائزنگ)۔ سیٹھ محمد اسحاق کابلی،
سیٹھ محمد حسین نور، سیٹھ محمد امین ہندوستان والا، محمد سلیمان منسٹر سیٹھ، محمد اسحاق یحییٰ زبیر،
سیٹھ جمال الدین اسٹیل، سیٹھ محمد اقبال (خوشامد پورہ)، سیٹھ محمد اقبال (رسول پورہ) سیٹھ
اشفاق (مسلم لیگ) سیٹھ ظہیر احمد (بٹن والے) نہال احمد وکیل (یونینی سائزنگ)، نہال احمد
(ناگ چھاپ)، سیٹھ عتیق احمد صدیقی (منزل ہوٹل)، محمد رمضان ٹیلر ماسٹر، شبیر سیٹھ،

سیٹھ اخلاق احمد، مسعود رمضان، سیٹھ عبدالستار، ماسٹر شریف احمد، محمد ایوب محمد یوسف
کلو، شبیر احمد مالو۔ سیٹھ لتے ملک سیٹھ۔

مالیگاؤں کی صنعت پارچہ بافی

خاندیش اور دکن میں صنعت بافندگی کی تاریخ بہت قدیم ہے، پیشوا دفتر کے دستاویزات
اور پرتگیزی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے فیکٹری ریکارڈ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ پارچہ بافی مل
داڑی اور دیگر قصبوں اور قریوں میں ہوتی تھی، سرکاری گزیٹیر کے مطابق مالیگاؤں میں
۱۸۰۳ء میں ۱۴۴۱ کرگھے تھے، ان پر کام کرنے والے ۷۷۰ مسلمان بنکر تھے، دو سال قبل
پچاس خاندان صرف سفید جوڑ ریئے (دریاں) بننے والے تھے لیکن یہ ہندو تھے، چاندوڑ
میں بیس کرگھے کام کرتے تھے جبکہ ناسک میں ۲۴۴ کرگھوں پر ہندو بنکر کام کرتے تھے۔ یولہ،
چاندوڑ، ناسک ڈنڈوری اور سنر میں بھی کرگھے اور انصاری بنکر موجود تھے۔

مہاجرین خاندانوں میں باستثنائے چند بافندگی ہوتی تھی، بعض گھروں میں عورتیں
بھی کرگھا چلا لیتی تھیں ورنہ عموماً یہ نری نرا (نلی) بھرتی تھیں اور تانی تنتی تھیں،
انیسویں صدی کے اواخر تک تنائی کر کے ایک عورت روزانہ آٹھ سے سولہ پیسے کما لیتی
تھی۔ بنکر کو ساڑی کی مزدوری چار سے چھ آنے ملا کرتی تھی۔ پگڑی کی (جو کئی گزوں کا
ایک طاقہ ہوتا تھا) چھ سے آٹھ روپیہ مزدوری ملتی تھی وسط چار سے آٹھ آنے یومیہ
تھا۔ بارش میں اور کساد بازاری میں یہ شرح بھی گھٹ جاتی۔ دو آنے وسط مزدوری
تھا، سیلاب، طاعون اور دیگر تکوینی حوادث کے دور ابتلا میں غریب بنکر خستہ تن بھوکوں
مرتا تھا ۱۸۹۵ء کی طاعونی وبا میں " نری نرا کی ایک پولا بھرائی نصف (۱/۲) پیسہ
چھدام تھے اور تانی کی ایک پولا کی تنائی سوا ڈیڑھ (پیسے تھی)۔ چھ سوت ساڑی کے آڑا کی
بنائی دو پونے دو روپیہ تھی۔ وہ ساڑیاں جو ۱۹۱۴ء کے جنگ عظیم کے وقت پانچ چھ روپے
کی فروخت ہوتی تھیں خشک سالی کے زمانے میں بمشکل پندرہ سولہ یا سترہ آنے کو بکتی
تھیں وہ بھی بڑی منت وسماجت سے گاہک لیتے تھے۔ مالیگاؤں میں ساڑی بازار کو
سپائی بازار کہتے تھے، آج سے ستر سال پہلے سپائی بازار کا نقشہ یہ تھا:

"روزانہ دن کو چار بجے سے ساڑی بازار کی بہت بڑی گندری بھرتی ہے لیکن جمعہ

کے دن صبح سے گیارہ بجے تک رہتی ہے اس کو ساڑی بازار بھی کہتے ہیں اور سپلی
بزار کے نام سے بھی مشہور ہے..... شہر مالیگاؤں میں جب یہ ساڑی بازار ہے
یقیناً کسی اور جگہ ہندوستان میں نہیں بھرتا ہوگا یہاں روزانہ کئی ہزار تھان ساڑی
کے تیار ہوتے ہیں (تا) اور تخمیناً روزانہ کل فروخت بھی ہو جاتے ہیں یہاں ساڑی
کا بہت بڑا بیوپار ہے۔ بہت دور دور سے گاہک آتے ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں
ہزاروں روپے کی ساڑیاں خرید لیتے ہیں، خدا کے فضل سے یہاں کے باشندے
مسلمانوں اور ہندوؤں میں بہت بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار اچھے مضبوط اور
ہیں..... اب چار پانچ برس سے جبکہ سے ہلکا اور گھٹیا اور بھاری سے بھاری
بڑھیا قیمت کے بہت ہی اعلیٰ درجے کے باریک سوت کے تھان تیار ہونے لگے
ہیں، فی تھان یعنی یک ساڑی قیمت دو روپیہ سے لیکر ۲۵-۳۰ روپیہ تک ہے
تین گز کی آدھا آنہ، ریشمی کناری کی چار آنہ، پنچی کی آٹھ آنہ، پتی کی دو آنہ چھوٹ
ساہوکار لیتے ہیں عرصہ ہوا چند روز تک ساڑی کے کچے پکے کی گز بڑھتی آخر
سنہ ۱۳۲۴ھ مطابق سنہ ۱۹۰۶ء سے پکے سوت کی ساڑی پر بھی ن شیر سنگھ کے
نام کا چھاپہ لگنے لگا پھر ساہوکار ان سکے یعنی چھاپ کو مقبول نہ کرکے کچی پکی
لیتے رہے مگر بہت سے ساہوکار بغیر سکہ نہیں لیتے تھے فدفتی فساد کے بعد
سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق سنہ ۱۹۲۱ء سے وہ چھاپہ اٹھ گیا۔"

ساڑیوں کی اور بھی قسمیں تھیں تین گزی چار گزی۔ مرہٹہ عورتیں عموماً نوگزی اور چھ
گزی ساڑیاں باندھتی تھیں انہیں مہیشوری لگڑی یا دل کہتے تھے، ڈیڑھ انچ کناری
کی زمین ساڑیاں کرگھوں پر بڑی تعداد میں بنائی جاتی تھیں، جب پاور لوم شروع ہوئے تو کناری
میں زری کی جگہ مصنوعی ریشم کے زرد رنگ کے تار استعمال کیے جانے لگے ان کے دام بھی کم
تھے۔ اس سے زیادہ چوڑی کناری کی ساڑیاں بھی، مالیگاؤں میں بنی جاتی تھیں۔ سکیسر میں
قدیم زمانے سے ہاتھ کھڈی پر صافے اور پگڑیاں بنی جاتی تھیں۔

مسلمان آڑھتیے ساہوکاروں کے مقابلے میں کم تھے۔ کریم بخش اور بابو حکیم شراکت میں
ساڑی آڑھت کا دھندا کرتے تھے اور بیل گاڑی سے اطراف کے قریوں میں ہفتے کے
بازاروں میں اپنا مال فروخت کرنے کے لیے جاتے تھے۔ پاور لوم لگنے لگے تو اور دیگر صنعتی

مراکز کی طرح مالیگاؤں میں بھی صنعتی انقلاب نے اپنا قدم رکھا، گورنر بمبئی ۱۰/ مئی ۱۹۲۶ء
کو جب مالیگاؤں آئے تو موٹر اڈے کے پاس اسلام پورہ میں منشی عبدالکریم موٹر والے کے
خاص مکان میں جاکر ساڑی بننے کا سانچہ یعنی شٹل (ہینڈ لوم) موٹر سے اتر کر معائنہ کیا۔
یہ شٹل مالیگاؤں میں ۱۹۱۵ء / ۱۳۳۳ھ سے شروع ہوا تھا۔ اسلام پورہ میں رہنے والے
عبدالرزاق حافظ فقیر محمد پہلے فرد تھے جنہوں نے اپنے گھر میں چار پاور لوم لگا کر انجن سے چلانے
کا تجربہ کیا تھا۔ ۱۹۳۰ء کی بات ہے ان کے مل کی ہر طرف مانگ تھی۔ مہاجر تاجروں میں سیٹھ
عبدالغفور اس وقت کے سب سے بڑے نیشنل مل (۳۳) لوم کے کارخانہ دار تھے جس میں
ان کی اور محمد حاجی کی شرکت تھی۔ صنعتی انقلاب کے دور میں پاور لوم لگنے سے شہر میں
خوشحالی کا دور دورہ ہوگیا۔ ۱۹۸۵ء میں چار لاکھ پچیس ہزار پاور لوم تھے۔ ناگ چھاپ،
منڈی چھاپ، راج ہنس اور بہت سارے چھاپوں کی پاتی ساڑیاں بازار میں آگئیں، رنگ ساز
اور ملیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ان اونچی اونچی چمنیوں سے جن سے دھوئیں
کے بادل اٹھتے تھے اب دھن برسنے لگا۔ کاریگروں، ماسٹروں، مقدموں اور جابروں کی
مانگ بڑھ گئی۔

تجارت اور صنعت کے ساتھ برادری کے وہ افراد جو فنی استعداد اور تکنیکی صلاحیتیں رکھتے
تھے انہوں نے صنعت کے تعلق سے ڈیزائن، نقش و نگار اور بننے تننے کے آلات و اوزار
میں جدتیں پیدا کیں اور نئی چیزیں ایجاد کیں۔ مالیگاؤں کے مشہور صنعتکار کی لطف ڈبی لک
بیرونی ڈابی مشین سے کہیں بہتر تھی۔ مشہور تعلیمی، سماجی و صنعتی شخصیت صادق انصاری،
و نگراں انصار پیٹنگ ہاؤس کی انصار ڈابی کو ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۶۶ء تک کے ملوں نے
صنعتی مراکز میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ مالیگاؤں کی ایک دوسری مشہور ڈبی سخر ڈابی
سردار نگر میں بنائی جاتی تھی جو اپنے موجد اور کاریگر کے نام سے مشہور تھی۔ حاجی محمد پیٹی والے
بھی مشہور کاریگر تھے۔ اقبال ڈابی حافظ عبدالکریم کے یہاں بنتی تھی۔

الحاج ماسٹر محمد حسین منشی (ولادت ۱۹۲۵)

مالیگاؤں کے عبدالشکور منشی جو فارسی اور عربی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے یوپی کے رہنے
والے تھے آپ کے بیٹے محمد حسین منشی نے مشہور ٹیکنیکل اور فنی ادارے وی جے ٹی آئی سے

ایل۔ ٹی۔ ایم کا ڈپلوما حاصل کیا۔ ایک ماہر ٹیکنیشین ہونے کے ناطے مختلف ٹیکسٹائل ملوں میں اسپننگ، سٹر، فیکٹری منیجر اور مینجنگ ڈائرکٹر کے عہدوں پر مامور رہے۔ بھوپال کی نیو بھوپال ل سے لے کر دور دراز ہریانہ اور پنجاب تک کے گیسوئے بافندگی سنوارتے رہے، اب بکدوش ہوکر عروسِ ادب کی مشاطگی کر رہے ہیں اور غم غلط۔ اپنا نہیں شاید دوسروں کا کرنے کی نیت سے اسی عنوان پر طنز و مزاح کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اور جب قارئین حضرات نے سراہنا شروع کر دیا تو "محاورے اور چٹخارے" کے نام سے ایک دوسری تخلیق پیش کرنے جارہے ہیں، دو صاحبزادے ہیں سعید اختر اور ڈاکٹر شوکت پرویز ——— اور دونوں سعادت مند ہیں۔ آپ کی اہلیہ رابعہ خاتون مالیگاؤں کے کسی وقت کے سب سے زیادہ دولت مند تاجر حاجی محمد سلیمان کی صاحبزادی ہیں۔ منشی صاحب دیندار اور متقی انسان ہیں اور بڑے باذوق اور بامذاق انسان ہیں۔

اسطاف ڈابی کی کارکردگی کے پیش نظر مولانا عبدالحمید نعمانی نے "دی بمبئی کرانیکل کمپنی" کو لکھا کہ وہ اسطاف ڈابی کی سفارش حکومت سے کر دے، کمپنی نے مولانا کی درخواست پر اگست ۱۹۳۹ء کو اپنی سفارشات اس وقت کے وزیر صنعت الیس کے پاٹل کو روانہ کر دی تھیں۔ [1]

مولانا موصوف نے جکر برادری کو خود کفیل بنانے کے لئے اور غلط کاری سے بچانے کے لئے پکا رنگ ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی تاکہ مالیگاؤں میں تیار ہونے والی ساڑیوں کی قیمت اور طلب میں اضافہ ہو، کپڑوں کی رنگائی کے لئے کچا رنگ استعمال کیا جاتا تھا اور گنبکر فروخت کرنے کے وقت غلط بیانی، فریب دہی اور دروغ گوئی سے کام لیتا تھا، ساہوکار اور آڑھتیے بھی کچے رنگ کی ساڑیوں کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ منہ مانگا دام نہ ملتا اور محنت کام میں آتی پھر فریب، کذب اور غلط بیانی اسلامی نقطہ نظر سے تجارت کی ترقی اور اس کی برکت کے لئے مضر ہے اور اس طرح معاملہ باطل قرار دیا جاتا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی نے پکا رنگ کمپنی قائم کی تو ساڑیوں پر رنگ آیا اور بیوپار پر بھی رنگ چڑھا، دھوکہ اور فریب دہی کی تجارت سے نجات پاکر اپنی معاشی ساکھ بنانے میں

---

[1] اجالوں کے سفیر۔ مولانا عبدالحمید نعمانی از مولانا محمد حنیف ملی ص ۶۲، ۷۷

برادری اور محنت کرنے لگی، قلعہ کمپنی نے نہ صرف معیارِ معیشت کو بلند کر دیا بلکہ ٹیکسٹائل پالیسی سے پورے طور پر فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی فراہم کئے وہ تمام سہولتیں اور رعایتیں جو حکومت کی طرف سے حاصل تھیں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لئے مولانا موصوف نے حکامِ بالا یہاں تک کہ وزراء سے بھی بات چیت کی اور ان سے تبادلۂ خیال کیا، مرکزی حکومت کے پاس وفود بھیجے، یادداشت (میمورنڈم) ارسال کیا ۱۹۳۵ء میں مولانا نے ریاستی اور مرکزی حکومتوں کو یادداشت پیش کی تھی۔ ڈیورس سوسائٹی قائم ہوئی تو مولانا نے اس میں عملاً حصہ لیا اور سرمایہ دار مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ بینڈلوم کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالنے میں خانصاحب عبدالرحیم نے نمایاں حصہ لیا تھا۔

مالیگاؤں کی صنعتِ پارچہ بافی کو ترقی دینے کے لئے قلعہ چھاپ پکا رنگ کمپنی کے قیام میں مولانا محمد عثمان نے قائدانہ رول ادا کیا۔ اس کے قیام سے ایک طرف تو بنکر برادری میں امداد باہمی (کوآپریٹیو) سوسائٹی قائم کرنے کا خیال ابھر کر آیا اور دوسری طرف کچے رنگ کا خیال بیوپاریوں کے ذہنوں سے اتر گیا اور رنگین سوتی ساڑیوں کو وہ فروغ ہوا جس سے ایک صنعتکار نہال ہو گئے۔ قلعہ چھاپ پکا رنگ کمپنی آج بھی موجود ہے جس کی اپنی ایک بلڈنگ ہے اور بہت بڑا قطعۂ اراضی ہے جس پر شاپنگ سینٹر موجود ہے اور کچھ جدید تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ایک منصوبہ مومن برادری ہال تعمیر کرنے کا بھی زیرِ غور تھا۔[1]

مالیگاؤں میں کوآپریٹیو سوسائٹی یا امداد باہمی تحریک کا آغاز قلعہ کمپنی کے قیام عمل سے ہوا۔

رنگائی کا کام بڑا منفعت بخش تھا۔ منشی دار اللہ دعا بینڈ لوم کا سوت بیچنے کے ساتھ رنگائی کا بھی کام کرتے تھے۔ یہ انتہائی فائدہ بخش ثابت ہوا کچھ دنوں بعد آپ نے بینڈ لوم کا ایک کارخانہ قائم کر لیا اور سمکیسر کے علاوہ مالیگاؤں کے مزدور بنکر بھی بننے جایا کرتے تھے۔

جب مالیگاؤں میں آل انڈیا جمعیۃ المومنین کی بنیاد پڑی تو مالیگاؤں میں بھی جمعیۃ کی شاخ قائم ہوئی ایک مومن اسٹور بھی کھولا گیا جس میں مومن برادری کے ہاتھوں بُنے ہوئے کپڑے برائے فروخت رکھے گئے۔

---

[1] اجالوں کے سفیر مولانا عبدالحمید نعمانی از: مولانا محمد حنیف ملی ص ۲۶، ۷۷

قصبہ کی قدیم یادگاریں

عہدِ وسطیٰ میں اسلامی ممالک کے شہروں کے محلے معاشرتی، صنعتی اور تجارتی کردار کے حامل ہوتے تھے۔ بغداد میں ایک محلہ کا نام دار القطن تھا یہاں سوتی کپڑوں کے کارخانے تھے۔ ایک دوسرا محلہ دار القز تھا جہاں ریشمی کپڑوں کی کارگاہیں تھیں۔ ہندوستان میں مومن بستیوں کے محلّوں کے نام بھی صنعت اور مقتدر ہستیوں اور بزرگوں سے وابستگی کی بنا پر رکھے جاتے تھے۔ پانی پت میں انصار محلہ، جائس میں محلہ انصار، نگینہ اور بمبئی میں مومن پورہ اور مبارک پور میں تمام محلے کسی نہ کسی مسلم شخصیت کے نام پر ہیں، ہر محلے سے جو مخصوص آوازیں فضا میں گونجتی ہیں وہی شناخت بن جاتی ہیں۔

مالیگاؤں کا محلہ سنگمیشور سب سے قدیم تھا یہاں راجہ بہادر کی عرب سپاہ رہتی تھی۔ اسی لیے دینِ اسلام کا چرچا تھا، تارکینِ وطن نے سب سے پہلے اسی علاقہ میں توطن اختیار کیا، سید محمد ادریس عرب نے ۱۷۹۰ء میں راجہ بہادر گوپال راؤ کی عطا کردہ زمین پر یٰسین میاں کی مسجد بنائی، قبرستان بھی اسی نام سے مشہور رہا، تکیہ یٰسین میاں آباد رہا، مسجد عزیز محمود بن حسن جمعدار نے دو سال بعد تعمیر کرائی۔

"نانڈرہ (اجودھیا) کے انگنو سیٹھ نے خود اپنا محلہ بسایا اور تین مسجدیں بنوائیں۔ انگنو سیٹھ کی مسجد ۱۲۹۰/۱۸۷۰ء میں تعمیر ہوئی،" اسی سال موتی مسجد بھی بنی، بھاؤ میاں کی مسجد تین سال قبل تعمیر ہو چکی تھی اور تین سال بعد (۱۲۹۱/ ۱۸۷۳ء) میں بیلباغ کی مسجد آباد ہوئی محلہ قصاب باڑہ راجہ نارو شنکر کے عہد سے آباد تھا، محلہ موتی تالاب ۱۳۱۴ھ میں آباد ہونا شروع ہوا۔ دو دو میاں کا کھیت ۱۳۰۲/۱۸۸۵ء میں محرم کی گردش کے موقعہ پر فساد کے سبب جہاں کلو نام کے مسلمان کو پھانسی دی گئی تھی مشہور ہوا۔ فقیر واڑہ ۱۳۲۲ھ میں بسا اور محلہ رسول پورہ ۱۳۳۰ھ/ ۱۹۱۲ء میں وجود میں آیا۔ محلہ سالار واڑہ، بیلباغ اور موتی پورہ قدیم محلے تھے خوش آمد (خوشامد پورہ) بھی اسی سال سے باشندوں کو خوش آمدید کہنے لگا، شہر کے کنارے حضرت مولانا برکت علی (۱۲۷۰ھ-۱۳۴۵ھ) کے مریدین نے برکت پورہ بسایا یہیں خانقاہ برکتیہ موجب برکات بنی۔ ان تمام محلوں میں بدر کا باڑہ بڑے حکیم محمد اسماعیل کا بسایا ہوا بڑا مردم خیز ثابت ہوا، ادیب مالیگانوی نے چراغ کشتہ کے عنوان سے مالیگاؤں کے ممتاز و مشہور رئیس حکیم چراغ حسن کی وفات پر جو نوحہ لکھا ہے اس

ہیں اس گلزار محلہ کے سورج اور چاند کی طرح نور افشاں اصحاب کا ذکر کیا ہے اس میں بابو حکیم۔ حسن (حکیم) شوق۔ عبدالرزاق۔ خانصاحب۔ عبدالودود ۔ مولوی عبدالمجید، حکیم فاروق سلیم احمد صدیقی (ڈاکٹر)۔ حضرت مسلم برکتی۔ ماسٹر برکات۔ ماسٹر رحمٰن چراغ سیٹھ کے نام گنوائے گئے ہیں۔ سمکیسر کا ماحول بھی بڑا شاعرانہ اور امیرانہ تھا درجنوں شاعر اور سیٹھ آباد تھے، حافظ مراد کے دم قدم سے بڑی رونق رہتی تھی۔

قدیم قبرستانوں میں یسٰین میاں کا قبرستان عرب گورستان مست علی شاہ اور کالو شاہ کے قبرستان قلعہ میں راجہ بہادر کے زمانے سے 'شہر خموشاں' کے خاموش شاہد بنے ہوئے ہیں، رحیم شاہ کا تکیہ، لعل شاہ کا تکیہ، تکیہ یسٰین میاں، معصوم علی شاہ کی خانقاہ (۱۳۴۲ھ) خانقاہ اشرفی چشتی۔ خانقاہ شاہ الٰہی بخش (متوفی ۱۳۲۷ھ)۔ بی جان کی کٹی اور خانقاہ برکتیہ مختلف صوفی سلسلوں کے مریدین کی آماجگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ تکیوں میں عموماً فقرار مداریہ اور فقرائے رفاعیہ کے گروہ رہتے تھے۔ کرم سید شاہ کا مزار (۱۳۱۴) میں عقیدتمندوں سے گلزار رہتا تھا، چاند شاہ ولی قلعہ کے اندر دفن تھے بھیکن شاہ کے مزار پر بڑی دھوم دھام سے عرس ہوتا تھا اس عرس کے بانی، مالیگاؤں کے پہلے عوامی شاعر امیر خاں امیر قریشی کے ایک شاگرد شیخ عبدالجبار انسر (۱۹۳۰۔ ۹۶۷) تھے ساری مسجدیں آباد تھیں اور ہر بڑی مسجد میں ایک کنواں تھا۔ سیٹھ محمد اسحٰق سوت فروش نے رفاہ عالم کے لیے (۱۳۴۴/۱۹۲۵) میں ایک باؤلی کھدوائی تھی۔ بشیر خاں کا محل راجہ بہادر کے دور کی یادگار ہے۔

مولانا عاصم بہاری اپنی اصلاحی تحریک اور مومن تنظیم کے سلسلے میں کئی بار مالیگاؤں آئے اور اسے "مومن برادری کی جنت" کی مثال دی۔ آپ کہتے تھے "میری تمنا ہے کہ مومنوں کی ہر بستی مالیگاؤں بن جائے" [۱]

ضلع ناسک میں انصاری بستیاں

سرکاری رپورٹ کے مطابق (۱۸۸۳ء) پارچہ بافی کی صنعت ایولہ، ناسک، چاندوڑ،

---

[۱] اشفاق انجم مسلمانوں کے درمیان ذات پات کی لعنت ص ۹۱ بحوالہ علی حسین عاصم بہاری ۱۹۸۲ء

ڈنڈوری اور سنّر میں موجود تھی جہاں سالی، کھتری، مرہٹہ اور کوشٹی بنکروں کے ساتھ مسلم نورباف بھی بننے تننے کا کام کرتے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں ایولہ میں دو ہزار کرگھے تھے اور بنکر سارے مسلمان تھے جن میں نو سو انصاری حضرات تھے اور گیارہ بنارس کے کاریگر تھے جو غدر کے بعد یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ بنارسی مسلمان بنگال کے قحط ۱۸۶۳-۶۴ء کے بحرانی دور میں ترکِ وطن کر کے آئے تھے۔ ان خاندانوں میں سوائے اعظم گڑھ کے مہاجر خاندان پہلوان الٰہی بخش بندوق والا بہت ممتاز تھا، ان کی جفاکشی کا یہ عالم تھا کہ مالیگاؤں سے ایولہ تک پیدل آتے جاتے تھے۔ الٰہی بخش پہلوان کے تین بیٹے تھے۔ حمید (عبدالحمید) رشید (عبدالرشید) اور عبدالواحد۔ عبدالواحد کے صاحبزادے عبدالحیٔ محوی تعلیم یافتہ تھے اور حکومت مہاراشٹر میں ڈپٹی رجسٹرار کے عہدے تک پہنچے آپ کے تینوں صاحبزادے ہادی، جد اور خالد ممتاز عہدوں پر ہیں۔ بیٹی نیوفر مشہور وکیل سعید اختر کی بیوی ہیں اور درشہوار انڈین ایئر لائنس میں ایئر ہوسٹس ہیں۔ محوی صاحب مالیگاؤں کے مشہور رئیس اور حکیم چراغ حسن سیٹھ کے بہنوئی تھے۔ پہلوان الٰہی بخش بمبئی سے سوت کا لین دین کرتے تھے۔

رحمت اللہ غازی رئیس ایولہ تھے۔ انہوں نے مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں داخلہ لیا تھا، ان کے ساتھ بدرکاماڑہ کے مولانا عبدالرحمن آزر بھی تھے۔ قاری صاحب کو پہلوانی کا شوق تھا لیکن فنِ کشتی نے ایسا پچھاڑا کہ مدرسہ چھوڑ بیٹھے۔ ایولہ ریشم کی بنائی کا مرکز تھا۔ بیشتر گجراتی بنکر تھے لیکن یہاں ریشم کی صنعت بانڈگی پر اجارہ داروں کا قبضہ تھا۔ ۱۹۲۵ء میں ریشم بُننے کے لئے نئی مشینیں لگیں تو چند برسوں بعد اجارہ داری ختم ہو گئی۔ مالیگاؤں کی طرح ایولہ کی پگڑیاں خاص طور سے مشہور تھیں جو خاندیش اور بمبئی برآمد کی جاتی تھیں۔ زر اور ریشم کی پگڑیاں بھی بنتی تھیں۔

تیسواں باب

مالیگاؤں کا سیاسی دنگل

سایۂ دامنِ شمشیر میں پلنے والا شہر مالیگاؤں جنوبی ہند میں مومن مہاجرین اور مجاہدین کا مرکزی شہر تھا، یہاں کے مردانِ ہمت میدانِ عمل کے مجاہد تھے، اور تاریخ کے ہنگامہ خیز موقعوں پر دادِ شجاعت دے چکے تھے، مالیگاؤں ابتداء ہی سے انگریز دشمنی کے جذبہ سے سرشار تھا، یہاں کی انصاری برادری نے ہمیشہ اپنی تشخیص اور تہذیبی وجود کی برتری منوائی ہے، علم و دانش، شعر و ادب اور یہاں تک کہ صنعت میں بھی یہ شہر جنوبی ہند کے اور شہروں سے بالا اور افضل ہے۔ یہ شہر "دنگلوں" کا شہر ہے، محرم میں یہاں شعری دنگل ہوتے تھے اور تحریکِ خلافت، ترکِ موالات غرضکہ تحریکِ آزادی کے تاریخی سفر میں مالیگاؤں جنگِ آزادی کا ایک مضبوط اور مستحکم محاذ بنا رہا۔

مظلومین سمرنا (ترکی) کے لئے انگورہ فنڈ جمع کرنے میں یہ شہر پیش پیش رہا۔ انسدادِ مے نوشی اور امتناعِ شراب کی تحریک میں جھوم کر آگے بڑھے تو فساد ہو گیا، ایک پولیس کانسٹبل جامِ مرگ پینا پڑا، ملک و قوم نے حریت پسند اور محبانِ وطن کو پکارا تو مجاہدینِ مالیگاؤں نے برطانوی حکومت کو للکارا، آتش نمرود میں بے خطر کود کر سنتِ براہیمی کو زندہ رکھا اور مال و متاع کی قربانی دے کر سنتِ اسماعیل میں نئی جان ڈال دی۔ زنداں میں پابند سلاسل ہو کر "یوسف دار" زلیخائے آزادی کی زلفوں کو سنوارتے رہے

عشق نے کچھ کئے گریباں چاک
اس نے گیسو بھی کچھ سنوارے ہیں

انسدادِ مے نوشی کے سبب میکدوں کے در بند ہو گئے، ابوابِ رحمت کھل گئے، اور مسجدیں پُر رونق بن گئیں، تحریکِ خلافت کے پس منظر میں دین ابھر رہا تھا مگر دار و رسن کی آزمائش کا زمانہ بھی قریب تھا۔

مالیگاؤں کے سربلند مجاہدوں نے ان سیاسی و ملی تحریکات میں مذہبی عناصر کو سمو دیا،

نماز کی پابندی اور تبلیغ، خلافت کمیٹی کے مرکز یتیم خانے میں مولوی محمد اسحٰق کی صدارت میں امداد الاسلام کا قیام، قومی عدالت کا قیام اور پھر تیغ و کفن باندھے ہوئے میدان عمل میں نعرہ لگاتے ہوئے کود پڑنا ـــــ یہ ان جیالوں کے کارنامے تھے۔

خلافت کمیٹی قائم ہوئی صدر حکیم عبد المجید عرف احسان بھیا تھے، منشی شعبان بھکاری جو سب سے زیادہ فعال اور سرگرم مجاہد تھے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے، محمد حسن احسن، اسسٹنٹ اور پروپگنڈہ سکریٹری، محمد منشی جوہر، والنیٹر کور کے سیکریٹری اور اراکین یہ لوگ مقرر ہوئے: مولانا عبد العزیز عزیز، حکیم فاروق، عبد الرزاق کوکب، منشی خنداں، منشی بیدل قدرت اسٹر سوز، امیر احمد گھڑی ساز، امجد، محمد صادق غریب، چاند صاحب، محمد علی فوجدار۔

خلافت کمیٹی کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ پنجار گلی میں عبد الستار کی دکان اس تحریک کا مرکز تھی۔ محلہ موتی تالاب میں بچوں کے جلسے ہوتے تھے جنہیں حریت کی نورانی تحریریں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان جلسوں کا انتظام الحاج عبد العزیز بھکو اور حافظ محمد غفران کرتے تھے۔ اس مہم کے دستے کے سالار بھی منشی شعبان بھکاری تھے۔ مالیگاؤں کی سب سے عظیم روحانی شخصیت اور شیخ طریقت مولانا محمد اسحٰق مقصد کے انفاس بابرکات نے مسلمانوں کے سینوں میں نور حریت بھر دیا اور جہاد کا شعلہ فروزاں کر دیا، سبزی بازار کے عظیم الشان تاریخی جلسہ میں انہوں نے پیشنگوئی کی۔

انگریزوں کا جنازہ اٹھ چکا ہے، عنقریب تجہیز و تکفین بھی ہو جائیگی۔ یہ قوم گریٹ برٹش سے نہیں ہے وطن آزاد ہوگا ہمیں اللہ کے بھروسے جنگِ آزادی کو تیز کرنا۔

ہے فتح و نصرت ... تمہارے قدم چومیگی۔[1] اس تقریر کا ہر جملہ طوفان بردوش، زلزلہ خیز اور حشر بداماں تھا۔

اس تقریر نے ایوان شاہی میں زلزلہ ڈال دیا، شہر میں بھی تفریق شروع ہو گئی، بیت العلوم سے متعلق افراد بھی میدان میں آگے آئے لیکن انجمن ہدایت الاسلام جس کے کارپردازوں میں امیر سیٹھ اور ان کے ہمنوا تھے اس تحریک کے کٹر مخالف تھے یہ اُٹ والے کہلائے جاتے تھے اسلام پورہ انگریز مخالف تحریکوں کا مرکز تھا بدر کے باڑے والے بھی مخالفین میں سے تھے۔ ان میں

---

[1] ایشیا خاندیش میں جنگِ آزادی تحریر کردہ محمد حسن احسن مالیگانوی۔ انصار پبلشنگ ہاؤس نیا پورہ مالیگاؤں ص ۲۹۵

یہ چند لوگ 'غیر جانب' یعنی میانہ رَو تھے۔

انگریزوں کے خلاف پورا ہندستان اٹھ کھڑا ہوا تھا، انگریزی مال کا بائیکاٹ زوروں پر تھا ایسے میں ترقیٔ سخن مالیگاؤں کو طرحی مشاعرے کی سوجھی قافیہ تھا جمن کے، سوال کے۔

حضرت حسن احسن نے جو غزل پڑھی اس میں ایک مصرعہ تھا ؎ ہم منتظر ابھی سے ہیں تازہ ٹپال کے۔ حضرت محمد ابراہیم خلیل (۱۸۷۰ - ۱۹۲۸) نے فوراً ٹوکا کہ ٹپال انگریزی لفظ ہے نکال دیجیے کیونکہ انہیں انگریزوں کی طرح ان کے الفاظ سے بھی نفرت تھی۔[1]

اسی دوران نیا پورہ چوک میں ۲۵ راپریل ۱۹۲۱ء کو مشہور خلافتی رہنما مولانا ہارون محمد کا پُر اثر وعظ ہوا، لاٹھی لیجانے کے لیے امتناعی حکم تھا لاٹھی والے والنٹیرس کو پولس دستے نے گرفتار کرکے مقدمہ دائر کردیا اور عدالت نے ساٹھ ساٹھ روپے جرمانے کی سزا دی، ایک تو اقتصادی بدحالی دوسرے دام و درم ان کے پاس کہاں؟ عدالت میں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا، اسی پر صورت حال موقوف نہ رہی 'میزان عدل کا توازن بگڑا' ادھر مجرموں کا ذہنی توازن۔ شعلہ بھڑکا اور شہر کو آگ نے لپیٹ میں لے لیا۔ ٹیلی فون کے تاروں کو کاٹا گیا، چوراہوں کی قندیلیں چور چور کردی گئیں ایک ہنگامہ مچ گیا، 'الٹے والے' الٹے پیر بھاگ کھڑے ہوئے امیر سیٹھ، حمید سیٹھ، غفور سیٹھ، بھو سیٹھ، یوسف دگومیاں جو دبکے تھے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلے، اس خلافتی فساد میں مرشد سیٹھ کی سوت کی دکان جل کر راکھ بن گئی۔ جو بےگناہ پولس کی گولیوں کا نشانہ بنے ان کو بڑے عزّ و اکرام سے بڑے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ تین دنوں تک مجاہدین کا شہر پر تسلّط رہا۔ سید سلیمان شاہ کا 'سلیمانی دربار' تین دن تک بھرتا رہا۔ منشی شعبان وزیر بھی تھے اور نقیب بھی، الٹے والوں کو لوٹنے کا پروگرام بنایا جاتا اور امیر سیٹھ کے رنگ کی دکان اور غفور سیٹھ کی سوت کی دوکان لوٹ لی گئی، سلیمان سمن کا گھر بھی نہیں بچا۔ شورش اور بدامنی کا دور رہا۔ پھر فوج آگئی تو ان کے ظلم و ستم کا بازار گرم ہوگیا۔ خلافتی بھاگ کھڑے ہوئے اور شورش پسندوں کے ساتھ بےگناہ بھی پکڑے جانے لگے۔ سلیم ہیڈ ماسٹر دھولیہ میں پکڑے گئے اور تین برس کی سزا ہوئی۔ دہلی کے مولوی عزیز الرحمٰن دھر لیے گئے، اور وہ بھی تین

---

[1] نقوش ۱۰۹-۱۱۰

برس جیل میں رہے، مولوی جان محمد زنانہ لباس پہن کر اندور فرار ہو گئے۔ دار و گیر کا سلسلہ دار و رسن تک دراز ہو گیا ع این رشتہ با نگشت نہ پیچی کہ دراز است، یہ چند جملوں کی داستان نہیں پوری جنگ آزادی کے تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہے۔[1]

مقدمہ آٹھ دس ماہ تک چلتا رہا۔ مولانا محمد اسحٰق مقیقد کو سبزی بازار کے جلسے میں شعلہ انگیز تقریر کرنے کی وجہ سے پولس انہیں پھانسنے کی فکر میں تھی جب برسر عدالت سیشن کورٹ کے جج نے انہیں شناخت کرنے کے لیے جھوٹے گواہ کو بلایا تو اس نے بجائے مولانا کے ولی محمد پہلوان (یک چشم) کو کھڑا کر دیا اور مولانا بفضل خداوندی بری کر دیئے گئے۔ عقیدتمندوں نے اسے مولانا اسحٰق کی زندہ کرامت سے تعبیر کیا۔ بانو شاہ، شیخو میاں، عبدالمجید احسان صدر خلافت کمیٹی کی سزاؤں میں اپیل پر تخفیف ہوئی۔ عمر قید کی سزا پانے والوں میں نو ۹ اشخاص تھے۔ بابو امام بخش گڑاکو والے (بابے اللہ دیا بابو) الٰہ دین، محمد حسن دال والے، محمد یوسف سندھو (سدھو) امین نور محمد مولانا، محمد ایوب بھیکو، حاجی سلامت اللہ نادر، عبدالواحد محمد حاجی اور نتھو دین محمد کو عدن بھیج دیا گیا اور کچھ مجرموں کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ سات سال سے لے کر تین سال تک سزا پانے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ منشی شعبان تو بالیگاؤں کی جنگ آزادی کی تاریخ کا جگمگاتا عنوان بن گئے ہیں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اُن کے علاوہ محمد سلیمان شاہ صاحب "سلیمانی دربار" والے، اسرائیل رکھو، بدھو چونا بھٹی والا (بدھو فریدن) کو سزائے موت ہوئی۔ غفور اور شکور دونوں مفرور بھائی گرفتار ہوئے، غفور (چندی) کو پھانسی ہوئی۔ طبیب حکیم کو کالا پانی کی سزا ہوئی جو تخفیف ہو گئی۔ کرم اللہ استاد کے اکھاڑے کے کئی پہلوان دھر لیے گئے۔ بیل باغ میں محمد ایوب استاد بھی پکڑے گئے۔[2] محمد حسین حاجی مدد سیٹھ کو تین سال کی سزا ہوئی تھانہ جیل میں جاں بحق ہو گئے۔ عبداللہ خلیفہ خدا بخش بھی عیسیٰ پور (ناگپور جیل) میں انتقال کر گئے۔[3]

---

[1] مالیگاؤں میں جنگ آزادی ص ۱۳ نقوش ۔ ۹۰ ۔ ۹ تاریخ شہر مالیگاؤں ص ۱۰۱ اور ماہنامہ وطن ص ۱۴۰ ۔ ۱۵۱ [2] ایضاً [3]

مالیگاؤں کے شہیدانِ وطن

محمد سلیمان شاہ

سلیمان شاہ ولد روزن شاہ مومن ۱۸۸۰ء یا ۱۸۸۲ء میں اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان مومن برادری میں بہت ممتاز تھا اور شاہ نام سے مشہور رہا۔ یہ ایک علمی اور صوفی خاندان تھا۔ آٹھویں جماعت تک تعلیم پانے کے بعد آپ نے ہوٹل کھول لیا۔ اس زمانے میں مالیگاؤں میں سات بھائیوں کے نام سے ایک ہوٹل ۱۹۱۶ء میں تکیہ سیٹھ کی مسجد کے سامنے واقع تھی اسے منشی مدار اللہ مدعا جو سکیر میں رہتے تھے کھولا تھا۔ ہوٹل کو پہلے لوڑنگ کہا جاتا تھا یا چائے خانہ۔ مالیگاؤں کے چائے خانوں کے نام اس طرح تھے۔ خورشید الاسلام۔ فرحت محل۔ مقبول عام۔ اتحادیہ۔ اختر ہند ہوٹل، ہمدرد ہوٹل، دریائی ہوٹل وغیرہ مگر سلیمان ہوٹل کو خلافت تحریک کے زمانہ میں شہرت بھی ملی اور عظمت بھی۔ سلیمان شاہ خلافت تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے۔ ان کی سرکردگی میں شراب بندی کی مہم چلائی گئی۔ شراب کی ایک دوکان پر پکیٹنگ (دھرنا) کے وقت ہنگامہ ہوا جس میں پولس کا ایک سپاہی ہلاک ہو گیا۔ سلیمان شاہ "پولس جنات" کی قید میں چلے گئے۔ آپ کے ساتھ اسرائیل اللہ رکھا کو بھی پکڑ لیا گیا ان دونوں کو ۶ر جولائی ۱۹۲۲ء کو یرودا جیل میں پھانسی دی گئی۔

سلیمان شاہ کے سات لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ سرکار نے تمام جائداد مع ہوٹل ضبط کر کے خاندان کو تباہ کر دیا۔ یہ خانماں برباد قبیلہ دھولیہ منتقل ہو گیا جہاں ان کے رشتہ دار تھے۔ آپ کے ایک صاحبزادے غلام صوفی سلیمان شاہ عیسیٰ بلڈنگ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۸ میں سکونت پذیر تھے۔ پونہ میں رجب کے مہینہ میں آپ کی یادِ شہادت میں ایک عرس لگتا ہے۔

اسرائیل اللہ رکھا

جنگِ آزادی کے شہید اللہ رکھا ۱۸۹۲ء میں مالیگاؤں میں پیدا ہوئے ان کا

خاندان غریب تھا، ایک کارخانہ میں ملازمت کرتے تھے۔ بڑے شعلہ بیان مقرر تھے۔ خلافت کمیٹی کے رہبروں میں سے تھے اس لئے پولس کی نظروں میں پہلے ہی سے چڑھے ہوئے تھے پولس انسپکٹر کے قتل کے الزام میں دھر لئے گئے اور عدالت نے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا دی۔

محمد عبدالغفور خان ۱۸۸۶ء میں محمد شکور مومن کے گھر پیدا ہوئے۔ کرگھے پر کپڑا بنتے تھے اور اکھاڑے میں پہلوانی کرتے تھے، خلافت تحریک کے میدان میں اتر کر آزادی کے لئے زور آزمائی کرنے لگے، آپ بھی انسداد شراب نوشی کے موقعہ پر پکٹنگ کے فساد میں پکڑے گئے۔ پھانسی کی سزا ہوئی اور ۸ جنوری ۱۹۲۳ء کو یرودا جیل میں تختۂ دار پر چڑھ گئے۔

تحریک خلافت مالیگاؤں میں

خلافت تحریک کے ہنگامہ خیز ایام میں مالیگاؤں کی قوم پرست ہستیاں بڑی سرگرم تھیں۔ ان میں سے محمد حسن احسن مالیگانوی نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا، آپ مولانا محمد یوسف عزیز کے شاگرد تھے۔ کانگریس سے وابستہ رہے اور اس کی ملکی و قومی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ کے معاصرین جن کے بارے میں آپ نے مالیگاؤں میں جنگ آزادی کی تاریخ لکھی ہے سارے مجاہدین آزادی تھے۔

منشی عبدالغفور خاں (۱۸۷۵ - ۱۹۶۹)۔ مزاج بڑا سپاہیانہ تھا دالدیت یو۔پی کے رہنے والے تھے۔

قدرت اللہ سوز۔ احمد استاد۔ اسحق سردار۔ محمد حنیف شورش۔ مدارن میاںجی سردار، شاہ سلیمان (بادشاہ) زاہد سیٹھ، محمد حسن دال والے، محمد حسین ابن متو سیٹھ منیر سردار، عبدالعزیز جلکو سیٹھ، محمد صادق پاگل، امیر احمد گھڑی ساز۔ ناطق صاحب، محمد جوہر منشی۔ منشی شعبان۔ شیخ میاں۔ مصری خاں۔ محبوب خاں جانباز صاحب۔ احمد علی نوجوان ریم۔ مولانا محمد عثمان۔ عبدالرزاق کوکب، سلیمان بیدل، زین العابدین، عبدالخالق وغیرہ کی خدمات کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔

منشی محمد جوہر (۱۸۹۲-۱۹۲۵) یو۔پی کے تھے نیا پورہ میں سکونت تھی۔ خلافتی

فسادِ ۱۹۲۱ء میں گرفتار ہوئے اور عدالت نے آپ کو نہ صرف تین سال کی سخت سزا دی بلکہ سرکاری ملازمت سے بھی برطرف کر دیا۔ منشی صاحب پوسٹمین تھے اور خلافت کمیٹی کے والنٹیر کور کے سیکریٹری بھی تھے تحریکِ آزادی نے ایسا سرفروشانہ جذبہ پیدا کیا کہ ذریعۂ معاش کی پروا کئے بغیر آپ اسی کے ہو رہے۔

تحریکِ خلافت وقت کی للکار اور دلوں کی پکار بن کر قوم پرور اور وطن دوست مسلمانوں کے دل بیتاب میں موجزن ہو گئی اسلام پورہ مالیگاؤں کا مشہور یتیم خانہ سرگرمیوں کا مرکز بنا شعرائے کرام کی طرف سے حکیم احسان اور منشی شعبان نمائندگی کر رہے تھے اور علمائے عظام کی نمائندگی مولانا محمد اسحٰق جیسے شیخِ طریقت اور مجاہدِ آزادی کر رہے تھے

> "مولانا نے تحریکِ آزادی میں شامل ہو کر انگریزی حکومت کے خلاف تحریری و تقریری جہاد فرما کر اس زمانہ کی یاد تازہ کر دی جب رئیس الامرا سید احمد شہید اور مولانا محمد اسماعیل شہید کی سی عظیم المرتبت ہستیاں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کر کے مصروفِ جہاد تھیں" مولانا اسحٰق نہ صرف مجلسِ خلافت میں شرکت فرماتے بلکہ اس کے جلسوں میں ایک خطیبِ شعلہ بیان کی حیثیت سے تقریر کرتے تھے[1]

محمد ابراہیم خلیل (۱۸۷۰ - ۱۹۳۸) سلطان پور کے تھے اور بڑے وطن دوست اور انگریزوں کے دشمن اور انگریزوں کی طرح ان کی انگریزی زبان سے بھی نفرت تھی۔[2]

مولوی عبدالمجید مجید (۱۸۷۰ - ۱۹۳۴) سیاسی افق پر اس وقت ابھرے جب ملک میں تحریکوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ سیاسی بل چل میں کانگریس پارٹی طوفان تیز ثابت ہو رہی تھی میونسپلٹی کے انتخابات میں مولوی صاحب نیا پورہ کے حلقے سے عوام کی خدمت کے لیے کامیاب ہو کر پہنچے۔ عوام چونکہ ان کی خدمات سے آگاہ تھے اور احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے اسی لیے مسلسل تین[3] سال تک منتخب ہو کر اس عوامی ادارہ کے ممبر رہے اور رفاہِ عام کے کام کرتے رہے۔

مولوی محمد ایوب (چرخہ) نے تحریکِ خلافت کے زمانے میں ترکِ موالات اور عدمِ تعاون کا اعلان ہوا تو انہوں نے اور ان کی اہلیہ نے سرکاری اسکول کی ملازمت سے استعفا

---

[1] نقوش ص ۸۹ - ۹۰ [2] ایضاً ص ۱۰۹

دیگر سیاست سے ناطہ جوڑ لیا۔ بعد میں حکومت کی طرف سے معافی مانگنے والوں کو ملازمت پر واپس
لینے کے اعلان کے باوجود دونوں نے اس طرف رجوع نہیں کیا۔ [1]

آزادی کی طرف۔ مالیگاؤں کا قدم

تحریک خلافت کا سلسلہ ۱۹۴۲ء کے "ہندستان چھوڑ دو" تک پہنچ گیا، سارے ملک میں غلغلۂ آزادی بلند ہوگیا۔ ۱۹۳۷ء سے ملکی سیاست سراسر کانگریس کے ہاتھوں میں آگئی۔ مومن کانفرنس نے اس سال انتخابات میں کانگریس کے پرچم تلے کام کیا اور مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ ۱۹۴۶ء میں جب کرپس مشن ہندستان آیا مومن کانفرنس کے رہنما عبدالقیوم انصاری اور جناب رفیع الدین احمد (صدر جمعیت المومنین الہ آباد) نے ۸ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو پنڈت نہرو کی موجودگی میں آنند بھون میں مشن سے ملاقات کی اور بتلایا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی نہیں مسلمانوں کی بھی جماعت ہے اس ملک کے پانچ کروڑ مومن بھی کانگریس کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کرپس نے ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کو مومن کانفرنس کی تحریک اور مشترکہ تحریک آزادی میں ان کے حصہ لینے کے بارے میں بتایا، کرپس نے جب جواہر لال نہرو سے مسلم رہنماؤں کے بارے میں جاننا چاہا تو انہوں نے مومن جماعت کے رہنماؤں کا ذکر کیا۔ اسی سال سے مومن کانفرنس ۱۹۳۹ء تک کانگریس کے ساتھ قدم ملا کر کام کرتی رہی۔ برطانوی ہاؤس آف کامنز میں مومن کانفرنس اور جنگِ آزادی میں مومن مجاہدین کی سرگرمیوں کا تذکرہ ہوا۔ "بھارت چھوڑ دو" کے نعروں میں مومن برادری کی اجتماعی آواز بھی گونجنے لگی۔ [2]

ان آوازوں میں، مالیگاؤں کے مومن مجاہدین کے نعروں کی بھی صدائے بازگشت سنائی دیتی رہی۔ دار و رسن کی آزمائش کا سلسلہ ٹوٹا تھا اور نہ مجاہدین آزادی کے حوصلوں کی کمندوں میں ۲۲-۱۹۲۱ء کے آزمائش دار و رسن کے بعد بل آیا تھا بقول ادیب مالیگانوی

> فرطِ غم سے کفِ افسوس نہ مل مالیگاؤں
> تھام لے ہاتھ سے دامانِ عمل مالیگاؤں

---

[1] اجالوں کے سفیر ص۱۲۶

[2] کانگریس صد سالہ جشن زیر اہتمام آل انڈیا مومن کانفرنس ۲-۴ دسمبر ۱۹۸۵ء ص۱۵

کاش اس عہدِ سعادت کی ہو تجدید اب   یعنی ہو مرکزِ ہنگامِ عمل مالیگاؤں

ہنگامِ عمل کا بازار گرم ہوتا گیا سیاسی مدبرین کے ساتھ سیاست کے سوداگروں کے مفادات کی دکانیں چمک اٹھیں اور نئے جال لے کر پرانے کھلاڑی شکار کھیلنے لگے، لیکن مخلص، بے لوث اور حریت پسند آزادی کے پاسبانوں کی کمی بھی نہ تھی جنہیں نہ سیاسی داؤ پیچ آتے تھے اور نہ ہتھکنڈے۔

مولانا محمد یوسف عزیز نے اپنی وطنی شاعری میں قومی و ملی اور خاص طور سے مومن برادری کے لیے مخلص جذبات کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا، مومن کانفرنس کے اجلاس میں ان کی نظمیں جو پڑھی گئیں وہ موضوع کے اعتبار سے عربی شرفاء کے تفاخر بالنسب پر گہری چوٹ تھی۔

گڑھی یاروں نے کیا کیا داستانِ ذلت و خواری
نہ رکھا احترامِ حضرت ایوب انصاری رض
ہوا ہے ناز کو فخر آبائی شرافت پر
نہ سمجھا زندگی خود منحصر ہے اہلِ حرفت پر [1]

شہر کے ممتاز وکیل مولوی شیخ عبدالعزیز عبداللطیف (ایم۔ ایل۔ سی) کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ نے دو مرتبہ مومن کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی۔ دسمبر ۱۹۲۶ کو ہالیڈے پارک کلکتہ میں اور اکتوبر ۱۹۳۶ء کو حلیم ہائی اسکول کانپور میں۔ مؤخر الذکر جلسہ میں اپنے صدارتی خطبہ میں انہوں نے سیاست کو مومن کانفرنس تحریک کا نصب العین قرار نہ دیتے ہوئے اسے سماجی اور رفاہی تحریک سے تعبیر کیا، اپنی اقتصادی حالت کو کامیاب بنانے کے لیے تمام انجمنوں سے تعاون کرنے کو وہ ضروری سمجھتے تھے اور ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرنے پر زور دیتے تھے۔

مولانا عبدالحمید نعمانی قومی و ملی اور سیاسی تحریکات سے وابستہ تھے۔ بمبئی میں مولانا شوکت علی کے مشہور اخبار روزنامہ خلافت کے کالم نویس تھے۔ بعض سیاسی مصلحتوں

---

[1] اجالوں کے سفیر۔ مولانا محمد یوسف عزیز صاحب۔ از شبیر حکیم ص ۳۶۔ یہ نظمیں دسمبر ۱۹۲۶ منعقدہ کلکتہ اور اکتوبر ۱۹۳۱ء منعقدہ دہلی کے جلسوں میں پڑھی گئی تھیں۔

کی بنا پر مولانا نعمانی اپنے رفیقِ محترم معین الدین حارث کے ساتھ خلافت سے علیحدگی اختیار کر کے اجمل کی مجلس ادارت میں شامل ہو گئے اور اس روزنامے سے متعلق ہو کر انہوں نے استقلال کے ساتھ زبان و صحافت اور ملک و ادب کی عظیم خدمات انجام دیں۔[1]

مولینا محمد عثمان کا علمی خانوادہ اہل صفا و حق سے تعلق رکھتا ہے۔ بڑا مردم خیز خاندان ہے۔ مولینا عثمان قوم پرور مسلمانوں کے زمرے میں مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے صوبائی صدر رہ چکے تھے اور سیاسی ہنگاموں کے صبر آزما دور میں بھی پائے استقلال و استقامت میں لرزش پیدا نہ ہونے دی۔

آزادی کے متصلاً سال میں حیدر آباد میں پولس ایکشن کا بڑا دردناک واقعہ رو پذیر ہوا۔ دکن کے مسلمانوں پر قیامتِ صغریٰ ٹوٹی۔ قبرستانوں میں گنجہائے شہیداں آباد ہو گئے۔ منماڑ کا ریلوے اسٹیشن مہاجرین کی چھاؤنی بن گیا تھا جس میں بے خانماں اور بے ننگ و نام لٹے ہوئے قافلے تھے جو بڑے بے آبرو ہو کر گھروں سے نکلے تھے۔ اس قیامت خیز ہنگامہ نے مولینا محمد عثمان کو جس طرح تڑپایا اس کا اندازہ ان کے ایک شاگرد اور ساتھی عبدالمجید سرور نے چوالیس سال بعد جو لکھا ہے اس سے ہوتا ہے۔ مولینا جمعیۃ علمائے ہند مالیگاؤں کا ایک تحقیقاتی وفد لے کر لاشوں کے شہر میں گئے تھے۔[2]

مولانا مرد حق آگاہ تھے۔ عالم با عمل تھے اور حق گو۔ انہیں حافظ علی بہادر خان جیسے محب الوطن، مجاہد، بیباک صحافی اور قوم پرست رہنما کی دوستی میسر تھی۔ مولانا ان کے روزنامے سے وابستہ تھے۔ مولانا جمعیۃ علماء کے صوبائی صدر رہ چکے تھے اور علمائے دیوبند کے اس گروہ کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جس نے مالیگاؤں کی تاریخ میں تعاونِ باہمی (کوآپریٹیو) کی تحریک کا آغاز کیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ جامعات الصالحات کی بنیاد ہے جس نے مسلم خواتین میں جذبۂ اسلامی اور حصول علم دین کی آرزو پیدا کر دی تھی۔ برادری کے لئے بڑا دردمند دل رکھتے تھے دیوبند میں دوران تحصیل تعلیم مفتی محمد شفیع

---

[1] اجالوں کے سفیر۔ ص ۴۷ ۔ نقوش ص ۹۴

[2] اجالوں کے سفیر حضرت مولینا محمد عثمان (بانی جامعۃ الصالحات مالیگاؤں) از عبدالمجید سرور ایڈیٹر سرور نامہ مالیگاؤں ص ۹۷ ۔ ۱۰۰ ۔

دیوبندی کی دل آزار کتاب غایۃ النسب کے خلاف آپ نے جو تحریری، تقریری اور علمی طور پر جہاد کیا وہ ایک تحریک میں تبدیل ہو گیا تھا۔

حافظ محمد اسمٰعیل کے صاحبزادے حافظ محمد صدیق جو مدرسہ حنفیہ سنیہ کے بانیوں میں سے تھے مسلم لیگ کے سربراہ رہ چکے تھے۔

حافظ محمد غفران (۱۹۱۰۔۱۹۸۰) کا زمیندارانہ (ٹھاکرانہ) خاندان مومن برادری میں خلط ملط ہو گیا۔ سیاسی معاملات میں آپ پکے قوم پرست (نیشنلسٹ) تھے۔ مسلک میں علمائے دیوبند کا تتبع کرتے تھے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری کے سیاسی افکار سے متاثر تھے اور مالیگاؤں میں مجلس احرار قائم کرنے میں انہوں نے کلیدی رول ادا کیا تھا۔

عبدالرزاق کوکب شہر کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔ خورشید احمد ابن منشی شعبان فریڈم فائٹرس انجمن کے سیکریٹری تھے۔

مالیگاؤں کی سیاسی دنیا میں گروہی عصبیت کا بڑا غلبہ تھا، میونسپلٹی کے انتخابات میں یہ جذبہ بڑی حد تک کارفرما رہا تھا، یہاں پر انتخابات ہر شہر کی طرح بڑے ہنگامہ خیز ہوتے تھے ایسا ہی ایک الیکشن وہ بھی تھا جب مسلم لیگ کے امیدوار شہر کے ممتاز متمول زمیندار خانصاحب عبدالرحیم حکیم تھے جن کے مقابلے میں کانگریس کے نامزد امیدوار مولوی عبدالرزاق ابن مولوی عبدالمجید تھے۔ اس افتراق نے مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج قائم کر دی تھی۔ یہاں تک کہ ایولہ میں قوم پرست مسلمانوں کے لئے پانی پر بھی پہرہ بٹھا کر کربلا کی یاد تازہ کر دی گئی، منماڑ میں بھی یہی کربلائی منظر نظر آتا تھا یہاں نیشنلسٹوں پر وحشیانہ حملہ ہوا جس میں مولوی حکیم شمس الدین زخمی ہوئے نساری ٹرک میں ٹھکو ہوٹل کے پاس مولانا کا خون آلودہ کرتا لٹکا کر دشمنوں کو للکارا گیا۔[1]

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

"مولوی عبدالرزاق نے جتنی شہرت و عظمت حاصل کی دوسرے کے حصے میں نہ

---

[1] اجالوں کے سفیر۔ حضرت مولانا محمد عثمان مدنی جامعۃ الصالحات مالیگاؤں (از: عبدالمجید سرور ایڈیٹر سرور ٹائمز مالیگاؤں ص ۶۷۔ ۷۰-۷۱

آپ وہ صحیح معنوں میں علم و عمل کے اعتبار سے مولوی عبدالمجید صاحب کا نمونہ تھے۔ قوم و ملت کے بڑے ہی خواہ، ہمدرد اور معاون تھے طبعاً خوددار تھے۔ اپنے والد مولوی عبدالمجید کی طرح نیاپورہ وارڈ سے نہ صرف ممبر ہی منتخب کیے جاتے بلکہ میونسپلٹی کے سترہ سال تک صدر بھی رہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولوی عبدالرزاق چوتھائی صدی سے بھی زائد عرصہ تک مالیگاؤں کی سیاست پر تسلّط جمائے رکھا کسی پارٹی کو پنپنے کا موقع نہیں دیا، ہمیشہ خانصاحب عبدالرحیم کے مدمقابل کی حیثیت سے صف آرا ہو کر اپنی کامرانیوں کا پرچم لہراتے رہے آپ کے دور میں یہاں صرف دو پارٹیاں تھیں: (۱) رزاق پارٹی اور (۲) رحیم پارٹی۔ دیکھا گیا کہ مقبولیت اور کارکردگی کی بنا پر رزاق پارٹی کے امیدوار زیادہ تعداد میں کامیاب ہوئے جس کی وجہ سے میونسپلٹی کی صدارت آپ ہی کے ہاتھ رہی۔ جب تک زندہ رہے یہاں کے الیکشنوں کی بہار قائم رہی۔ آپ کے زمانۂ صدارت میں شہر میں رفاہ عامہ کے متعدد ایسے کام ہوئے ہیں جو ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتے رہیں گے۔"[1]

خانصاحب عبدالرحیم حکیم (۱۸۶۶ء - ۱۹۸۲) نہ صرف بلدیہ کے پہلے مومن صدر منتخب ہوئے بلکہ مسلسل دو بار ضلع ناسک کے مسلمانوں کی نمائندگی کی اور ایم۔ ایل۔ اے چنے گئے، شہر کی صنعتی ترقیوں میں ان کا بھی حصہ ہے۔ اسپننگ مل کا خواب سب سے پہلے آپ نے دیکھا تھا۔ اینگلو اردو ہائی اسکول سے ہٹ کر مالیگاؤں ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی اور نئی عمارت کی تعمیر کے لیے ۲۵ ہزار کا گرانقدر عطیہ دیا" جو دوستی میں اور سیاسی و سماجی و صنعتی مسائل کے حل کرنے میں بے نظیر تھے۔ ایک کامیاب صنعتکار تھے۔"[2]

سب کی نظروں میں وہ مکرم تھے
شہر کے اک رئیس اعظم تھے (ادیب مالیگانوی)

مالیگاؤں میں اسلام پورہ کی سیاسی شخصیتوں میں محمد صدیق ماسٹر، عابد انصاری کامریڈ شفیق انصاری (کمیونسٹ پارٹی اور اب جنتا دل) محمد اسحاق آزاد مالیگانوی جو سیاسی زندگی میں انتہا پسند لیڈر تھے اور میونسپلٹی کے صدر رہے اور بہتیرے اور

---

[1] نقوش ص ۱۲۲ - ۱۲۳

[2] ماہرائے وطن ص ۳۱ - ۱۳۲

بھی تھے جن سے سپہر سیاست تابندہ رہا۔

میونسپلٹی کے ممبران میں یہ حضرات بڑے ممتاز رہے، حاجی عبدالمجید احسن سیٹھ، محمد صدیق مبارک، مولوی عبدالمجید، عبدالرحمٰن محمد صدیق، عبدالمجید حاجی عبدالشکور، محمد عمر رمضان عبدالغفور قادری، محمد حنیف حاجی احمد، پیر محمد عابد، زینب مرد کل۔ محمد اسحاق وغیرہم۔

بیسویں صدی کے اول نصف کے سیاسی مدبرین اور دانشوروں کی نسل ختم ہوتی جا رہی ہے دوسرے نصف کی آٹھویں دہائی میں بڑے بڑے شاعر، تاجر، دانشور اور سیاسی مدبر چل بسے۔ سب سے زیادہ موتیں اسی دہائی میں ہوئیں۔

بساطِ سیاست پر اب نئے مہرے آگے بڑھ رہے تھے، ان میں نہال احمد انصاری سیاسی اُفق پر برسوں تابندہ ستارے بنے رہے، وزیر بھی بنے اور زندگی بھی، تندیں بھی کیں اور مخالفتیں بھی سہیں۔ لیکن یہ اپنی راہ میں ثابت قدم رہے اور والد بزرگوار مولینا محمد عثمان کی سنت پر عمل پیرا رہے۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے عظیم کارنامے سرانجام دیتے رہے۔ آپ مزدور تحریک کے روح رواں ہیں۔

ہارون احمد انصاری بھی ایم۔ ایل۔ اے تھے کانگریس سے وابستگی رہی۔ جے۔ اے۔ ٹی گرلز ہائی اسکول کے بانی ہیں۔

امیر اللہ نشاط شاہدی (۱۹۲۱ء - ۱۹۸۴ء) خاندیش کے شاہدہ گاؤں کے تھے وہ اور غالباً سب سے اول ترقی پسند شاعر تھے جو تیر کی طرح شتابی سے فارغ ہوئے وہ بڑے بڑے کام سرانجام دیتے لیکن کوکب مستعجل کی طرح اُبھرے وہ "خوش درخشید" بڑی تابندگی دکھلائی اور جلد ہی ڈوب گئے۔

صبح حسین کا چاہنے والا نشاط تھا　　ذہنوں کی تیرگی میں اُجالا نشاط تھا
اس کے قلم نے چاند ستارے لٹا دیئے　　سوزِ غمِ حیات کو پالا نشاط تھا
(ادیب مالیگانوی)

نام کے ساتھ تخلص بھی بامسمیٰ نہ تھا، غم ہائے روزگار نے اور کشاکش زمانہ نے فرصت نہ دی اور خود ہی اپنے لیے پیشنگوئی کر دی تھی۔

یاد میری سنبھال کر رکھنا　　میرا کیا میں رہا نہ رہا

نشاط کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہ تھے لیکن ترقی پسند تحریک اور مزدور پارٹی سے

بڑی وابستگی رکھتے ہیں وہ اپنے شہر مالیگاؤں کے جہاں ستوطن تھے مخدوم محی الدین بن گئے تھے، شعبان جامعی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروردہ ہیں، علمی، ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی ان کے دم قدم سے بڑی چہل پہل رہتی ہے۔

بیرسٹر عبدالمجید سالک انصاری ایک شریف الطبع انسان تھے ان کی سادگی اور دیانتداری کو نام نہاد حوصلوں نے دھوکا دے دیا اور انہیں قانون کی گرفت میں دے دیا، اس نظام زندگی کی الجھنوں نے ان کے گیسوئے حیات کو پراگندہ کر دیا اور زیادہ دنوں تک جینے نہ دیا۔ سالک صاحب کی طرح اور بھی ذہین افراد جیسے نشاط شاہدوی تھے اپنے عہد کے معاشرے کے پُرکار اور ریاکار ادارے (اسٹیبلشمنٹ) کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے اور نہ اس کا حصہ بن سکے —— یوں بھی یہ لوگ جیتے تو قنوطیت اور یاسیت کے شکار رہتے، خوابوں کو بُننے والے خود خراب بن جاتے ہیں، جھوٹی امیدوں اور یقین کے چراغ عصری آگہی کے جھونکوں سے بجھ جاتے ہیں تو ایسے لوگ ہمیشہ کے لئے سو جاتے ہیں۔ اشتراکیت نے ایک ایسے ہی نظام زندگی کا خواب بُنا تھا ؎

کشتوں کا تیری چشم سیہ مست کا مزار   ہوگا خراب بھی تو خرابات ہو دیگا

اس خرابات کے پیرانِ مغاں میں شبیر حکیم کا بھی نام شامل تھا۔ بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ 'ماجرائے وطن' اور حیاکت کی حکایت سُنا چکے ہیں — "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے"۔

کامریڈ ہارون بی۔ اے کا نام اشتراکیت کی تاریخ میں بڑی سرخی لئے ہوئے ہے، اب جبکہ اس نظریۂ نظام زندگی کے غبارے میں سوراخ ہو گیا ہے اور سارے عزائم اور خواب ہوا میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ ہارون پھر بھی کامریڈ ہی کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ مبارک ہفت روزہ اخبار نکالتے ہیں۔

منشی ولی اللہ ثاقب کے صاحبزادے ریاض احمد ریاض کمیونسٹ پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ شوکت عزیز بھی کسی زمانے میں بڑے اشتراکی تھے۔ عبدالمجید بر پہلے لال باؤٹا والے تھے پھر پرجا سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوئے اور اب ظریف لتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے، 'جنتا دل' کا جھنڈا اٹھا لیا ہے۔ آپ نشاط شاہدوی کے بھانجے ہیں۔

خواتین سیاسی میدان میں کم ہی نظر آتی ہیں۔ مالیگاؤں کی سیاسی اور تعلیمی تاریخ

کا باب عائشہ حکیم کے ذکر کے بغیر نامکمل رہیگا۔ آپ حکیم چراغ حسن کی صاحبزادی تھیں اور پہلی ایم۔ایں۔اے خاتون۔ ۱۹۹۲ء میں ڈکیتی کے ایک سانحے میں ہلاک ہوگئیں۔
اہم شخصیتوں میں مولوی یحییٰ زبیرؔ ان کے بیٹے عبد لباری اور عبدالجبار (جماعت اسلامی) کا شمار ہوتا ہے۔ مولانا عبدالقادر صدر جمعیۃ علمائے ہند شاخ مالیگاؤں ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔

سیٹھ شبیر احمد حاجی غلام رسول (ایم۔ایل۔سی)

مالیگاؤں کی سیاسی تاریخ سیٹھ شبیر احمد (ایم ایل سی) کے ذکر کے بغیر نامکمل رہ جائیگی اس لئے کہ آپ کا شمار سیاسی مشاہیر اور عمائدین شہر میں ہوتا ہے۔ ایک عرصے کانگریس پارٹی مالیگاؤں کے علمبردار بنے رہے، کئی مرتبہ صدر بلدیہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا، عوام کی خدمت اور شہریوں کی حفظان صحت کے ایسے مواقع ہاتھ آئے تو وہ رائیگاں نہیں گئے، اور نہ اندرونی سیاسی خلفشار کا شکار ہوئے بلکہ انہوں نے شہر سدھار کے اعلیٰ منصوبے بنائے، شاپنگ سینٹر، منگل بازار کے علاوہ تعمیرات کا ایک سلسلہ شروع کیا، سردار ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے بانی ہیں اور اس کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے کہ پری پرائمری سے لے کر جونیئر کالج، بی۔ایڈ کالج اور ڈی ایڈ تک کی تعلیم کو محیط کئے ہوئے ہے۔ مالیگاؤں اسپننگ مل کی بقا و ترقی کی ضمانت شبیر سیٹھ کی کارکردگی ہے، بڑی خوش اسلوبی سے مل کے تار و پود سلجھا رہے ہیں۔
محمد امین عشرت ایک ماہر تعلیم، سماجی ورکر اور سیاسی رہنما تھے۔ جے۔اے۔ٹی گرلز ہائی اسکول کے بانیان میں سے تھے اور بنیادی ممبر تھے۔
احمد نسیم مینا نگری سیاسی رہنما ہیں، شاعری بھی سیاسی پہلو کی آئینہ دار ہے۔

نہال احمد مولوی محمد عثمان

غریبوں اور مزدوروں کی بستی ہو یا اہل جاہ و ثروت کی نفیس آبادی ہو ہر جگہ نہال احمد کا نام بڑی محبت سے لیا جاتا ہے، آپ ایک مستحکم مدبر سیاست ہیں، آپ کی عظیم خدمات کو شہر اور دیگر قصبات کے باشندے کبھی فراموش نہیں کر سکتے، ان کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت

نے سیاست کو نیا رنگ عطا کیا ہے، شہر کے تعلیمی اداروں کے روحِ رواں ہیں، معاشرتی اور سماجی اداروں کی رگِ جاں ہیں انہوں نے اپنے جلوؤں سے کئی سیاسی چاند ابھارے ہیں۔ خود اس وقت سیاست کے بدر کامل ہیں۔

ہارون انصاری

ہارون انصاری کو "بابائے سیاست" کا خطاب عوام الناس نے عطا کیا ہے سب سے پرانے خدمت گذار اور خادم قوم ہیں، میونسپلٹی کے انتخاب میں کئی بار کامیابیوں نے قدم چومے اور ہاتھوں نے شہر کی وہ خدمات انجام دی ہیں جو آج بھی یادگار ہیں۔ ایک صاف ستھرے نظام کی بنیاد ڈالی، شہر مالیگاؤں کو انصاری ہارون پر فخر ہے اور خود انصاری صاحب کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ لوگوں کے کام تو آئے۔

ہارون بی۔ اے

بعض حضرات بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بھی اپنی ڈگریوں کے سبب اتنے روشناس نہیں ہوتے جتنے کہ بھیونڈی کے خدام محمد مومن بی۔ اے، جلگاؤں کے محمد حنیف بی۔ اے اور مالیگاؤں کے ہارون بی۔ اے معروف ہیں۔ طالبعلمی کے زمانے سے ذرا اور بیباک تھے، مالیگاؤں میں اشتراکیت کی تحریک کو آپ کی ذات سے بڑا فائدہ پہنچا۔ آج بھی جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے وہ "کامریڈ" ہی ہیں لیکن ہمیں یقین ہے کہ ساری زندگی "انقلاب" کا نعرہ لگانے والے بہت جلد ایک "ذہنی انقلاب" سے دوچار ہوں گے۔

ہارون بی۔ اے کے علاوہ بہت سارے دیگر افراد بھی ہیں شفیق انصاری، عباس علی بری والے اپنے اپنے طور پر سیاسی تدبرات کرتے رہے ہیں۔

شہر مالیگاؤں میں مسلم لیگ کی نمائندگی کرنے والوں میں شیخ اللہ کا ذکر ضروری ہے جو مخلص رہنما ہیں۔

سیاست کی بازیگری ہمیشہ سے جاری ہے، بساطِ سیاست پر پرانے مہرے مارے جاتے ہیں تو نئے مہرے آگے بڑھتے ہیں لیکن ان میں پُرخلوص اور جیالے قسم کے مدبرین بھی پائے جاتے ہیں، ہندوستان کی جنگِ آزادی میں لڑنے والوں کا ذکر اسی باب کے شروع میں ہو چکا ہے۔ برادری کی یہ جماعتی روایت رہی ہے کہ اس نے تدبرِ قرآن کے ساتھ تدبرِ سیاست بھی کیا ہے۔ جمعیۃ العلماء ہند میں سب سے زیادہ برادری کے اہلِ علم موجود رہے ہیں ـــــ یہ روایت مالیگاؤں میں بڑی سُرخی لئے ہوئے ہے۔ محمد اسحاق آزاد انصاری، ہارون انصاری، مولوی عبدالرزاق، خانصاحب عبدالرحیم حکیم اور بہت سارے اور بھی نام آتے ہیں جن سے "سپہرِ سیاست" جگمگا رہا ہے۔

اکتیسواں باب

مالیگاؤں کی دینی درسگاہیں، تعلیم گاہیں، ثقافتی ادارے اور علمی و تعلیمی مشاہیر

مومن۔ انصاری مہاجرین کی آمد سے پہلے قصبہ مالیگاؤں میں نہ کسی مدرسہ میں علم کا چراغ روشن تھا اور نہ کسی خانقاہ میں معرفت کی قندیل فروزاں تھی۔ تاریکیٔ وطن میں نشانی میانجی، عالم، حافظ، مفتی اور مولوی حضرات علم و فضل کی مشعلیں جلائے اس بے نور بستی میں آئے پہلے شبینہ مدرسے قائم ہوئے پھر درسگاہیں بنیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سارا خطہ بقعۂ نور بن گیا اور روشنی کا مینارہ۔

سب سے قدیم اُمّ المدارس بیت العلوم (۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۶ء) ہے جسے اس بستی کے علم و فضل کے بانی مولانا عبداللہ نے قائم کیا یہ عبداللہ نگر میں واقع ہے۔ محلہ بیلباغ میں (۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۱۰ء) میں مدرسہ عین العلوم کی بنیاد پڑی، محلہ قلعہ میں مدرسہ چشمۂ کوثر تنگیا کے بارے میں تشنگان علم کو سیراب کرنے لگا۔ مدرسہ بحر العلوم ۱۹۱۱ء میں بند ہوا پھر کھل گیا تو علوم کے دروازے کھلنے لگے۔ محلہ قلعہ میں مولانا عبدالمجید وحید اشرفی نے (۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۲ء) میں چشمۂ بقا جاری کیا۔

آج سے چھ دہائی قبل برادری کے ایک مؤرخ ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ دارا بن ڈینپوری نے تاریخ مومن۔ انصار میں مالیگاؤں کے بارے میں لکھا ہے:

> "لوگ عموماً غریب مگر خوش حال تھے غربت وہ عجب زرش منظر نہ تھی۔ مگر علمی تھی تو درس و تدریس کی۔ نہ ہی تھی تو علمی مجالس کی۔۔۔۔ اس زبردست ضرورت کو کثیر ہمدردان قوم نے محسوس کیا مگر اس راہ میں جس قابل قدر ہستی نے پیشقدمی کی وہ مولانا مولوی عبداللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی تھی۔ انہوں نے ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں اردو فارسی اور عربی کی تعلیم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک قابل فخر

مدرسہ کی بنیاد ڈالی جو آج بھی مدرسہ بیت العلوم کے معزز نام سے زبان زد خاص و عام ہے۔[۱]

اس مدرسہ کی بنیاد پڑتے ہی طالبانِ علم و تشنگانِ دانش "اس چشمۂ روحانی" سے فیضیاب ہونے لگے اور اس منارۂ نور سے مالیگاؤں کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھا، مزدوروں اور محنت کشوں کی مصروفیات کے پیش نظر منتظمین مدرسہ بیت العلوم نے ۱۳۲۷ھ مطابق ۱۹۰۹ء میں ایک شبینہ مدرسہ کی بنیاد اردو فارسی کی تعلیم کی غرض سے ڈالی جس کا نام چراغ العلوم ہے۔ اس کے بعد متعدد شبینہ مدارس جاری ہو گئے مثلاً انجمن ہدایت الاسلام، معین العلوم، فیض العلوم وغیرہ ہر سال جلسے ہوتے تھے اور دور دور سے اہل علم و فضل و اہل دل حضرات تشریف لاتے تھے۔[۲]

مؤرخ موصوف نے "شل ہینڈ لوم" (پاور لوم) کے قائم ہونے کے بعد جو صنعتی انقلاب آنے لگا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب اقتصادی حالت درست ہونے لگی اور خوشحالی بڑھنے لگی تو علمی جوش سرد پڑنے لگا، علمی مجلسیں خالی نظر آنے لگیں اور لوگوں نے اپنے ہونہار خردسال بچوں کو بھی پارچہ بافی میں لگا دیا جس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس اور درسگاہیں خالی نظر آنے لگیں۔ مؤرخ موصوف اسے مالیگاؤں کے انصاریوں کی زندگی کا تیسرا دور کہتے ہیں۔ اور یہی موجودہ دور تھا (۱۹۳۰ء) جس کی اصلاح کے لیے چند ہمدردانِ قوم کوشاں ہیں۔[۳]

<u>قرآن العلوم</u>: سکیسر میں حاجی ولی محمد میاں جی، بہرانجی شاہ، حافظ مراد اور رفقاء نے ۱۳۲۳ھ میں قائم کیا، تعلیم القرآن (سکیسر) کے بانیان تھے: حافظ محبوب علی، مولانا عبدالرحیم قاسمی ابن عبدالمجید۔

<u>دارالعلوم حنفیہ سنیہ اسلام پورہ</u>: ۱۹۲۶ء میں قائم کیا گیا، بانیان مدرسہ میں ناصر الدین اور حافظ محمد صدیق کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

<u>مدرسہ اہلسنت ضیاء العلوم (قائم شدہ ۱۹۲۲ء)</u>: کے بانیان تھے: محمد حسن حاجی محمد رمضان کپڑے والے، حاجی دوست محمد، حاجی دین محمد، حاجی عبدالرشید منشی گوہر علی۔

---

[۱] تاریخ مومن انصار، حصہ ۲، ص ۲۲۱
[۲] ایضاً ص ۲۲۱
[۳] ایضاً ص ۲۲۴-۲۵

مدرسہ اشرفیہ برکاتیہ نجم العلوم (ٹرسٹ جامعہ اہلسنت نجم العلوم۔ اسلام پورہ) ۱۹۲۱ء
میں قائم ہوا۔ حاجی عبدالحلیم، الحاج بقر عیدی سردار اور حافظ عبدالمجید۔

ریاض العلوم انگوسیٹھ کی مسجد موتی پورہ میں ۱۹۵۰ء میں حاجی محمد بشارت سیٹھ، حاجی
محمد اسحٰق ڈوڈمن اور حاجی محمد عمر کی مساعی جمیلہ سے قائم ہوا۔

مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء میں مولانا جمال الدین بلیب (ولادت
۱۳۲۶ھ) نے اپنے استاد مولانا شاہ محمد اسحٰق کی یادگار کے طور پر قائم کیا، اس یادگار مدرسے
کے بانیان تھے۔ حضرت مولانا جمال الدین بلیب (انوری) حاجی عبدالغفور عبداللہ، حاجی
عبدالقادر پہلوان، حکیم محمد سلیم اور حاجی محمد بقاتی سیٹھ۔

دارالعلوم اہلسنت اشرفیہ خوش آمد پورہ میں ۱۹۵۱ء میں قائم کیا گیا۔ بانیان مدرسہ
تھے: مولانا سید شاہ محمد مختار اشرف، سجادہ نشین خانقاہ اشرفیہ کچھوچھہ فیض آباد۔ محدث
اعظم کچھوچھوی، ملا محمد حنیف، لیگا نوی۔ مولانا محمد یونس۔ حافظ محمد صدیق۔ نذیر احمد اشرفی
چونا بھٹی۔

مدرسہ حافظ العلوم (مینارہ مسجد) قائم شدہ ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۹۵۲ء، نیا پورہ گلی
نمبر ۲ میں حاجی محمد مصطفیٰ بقاتی، ماسٹر محمد مرتضیٰ، عبدالحمید نور تنگ اور نصیر الدین ننگی کی
کوششوں سے جاری ہوا۔

مدرسہ فرقانیہ اطفال اور بنات کے لیے مدنی مسجد مدنی ہال نیا پورہ میں جن حضرات
نے قائم کیا ان کے نام اس طرح ہیں: الحاج مولانا شمس الضحیٰ، الحاج قاری محمد عمر،
فدا قلیط عبدالخالق، حافظ عبداللطیف، قاری محمد حسین اشرفی۔ یہ ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا۔

مدرسہ اہلسنت تجوید القرآن ۱۹۶۷ء میں قائم ہوا۔ اسلام پورہ دفتر نصر روڈ پر
واقع ہے، حافظ تجمل حسین دستگیر رضوی، ملا محمد نذیر عبداللہ اور محمد کرم مہدی حسن
اس کے بانیوں میں سے تھے۔

مدرسہ مصباح العلوم مدرسیٹھ کی مسجد اسلام پورہ۔ قائم شدہ ۱۹۶۲ء بانیان،
محمد حنیف اور قاری محمد یونس۔

مدرسہ اہلسنت سراج العلوم (نہال نگر) قائم شدہ ۱۹۷۱ء۔ بانیان: کیپٹن عبدالرشید
عبدالکریم۔ حاجی عبدالغنی شیخ دلال اور شبیر احمد محمد صدیق۔

مدرسہ نورالاسلام (مسجد نور، جعفر نگر) کو ۱۹۷۰ء میں حبیب سردار، قاری محمد احمد اور حاجی محمد ہارون کپڑے والے نے قائم کیا، ناظرہ کی تعلیم کے علاوہ تجوید و قراءت کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دار العلوم محمدیہ کمہار واڑہ تدوائی روڈ پر ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا، مدرسہ کا دار الافتا بھی ہے۔ عالم، قاری اور حافظ کی سند دی جاتی ہے، حاجی عبدالرحمٰن حاجی محمد نذیر، حاجی محمد سعید، حاجی عبدالغفار سردار اور انصاری حاجی ماسٹر عبدالحمید عبدالستار بانیان مدرسہ ہیں۔

جامعۃ الہدیٰ۔ گولڈن نگر میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ۱۹۷۹ء سے بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ بانیان میں یہ حضرات ہیں: مولانا عبدالرشید عثمانی حقی مولانا عبداللطیف آسی۔ مولانا محمد نذیر ایوبی۔ اعجاز احمد انصاری۔ محمد ایوب صدیقی، عبدالرشیخ۔ انیس احمد دری، عبدالستار، نور محمد محمد لقمان، لطیف عزیز۔ مولانا عبدالرشید محمود اور محمد مصطفیٰ ماسٹر۔

مدرسہ تعلیم الاسلام نیاپورہ گلی ۵ ایجی سردار کا کنواں، بانی مدرسہ خدیجہ زوجہ محمد امین حاجی ہیں جنہوں نے اسے طالبات کے لیے ۱۹۸۰ء میں قائم کیا۔ مدرسوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور دینی علوم سے شغف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ طالبات کے لیے، خصوصاً بہت ساری درسگاہیں قائم ہو چکی ہیں جن میں یہ چند ممتاز ہیں اور دینی و علمی اہمیت کی حامل ہیں۔

دار العلوم عربیہ حنفیہ سنیہ

مالیگاؤں شہر میں بریلوی مکتب فکر و خیال کا یہ پہلا مدرسہ ہے۔ مالیگاؤں میں مولانا حشمت علی اور مولانا مشتاق احمد کے مواعظ حسنہ نے کچھ اختلافی مسائل کو مابہ النزاع بنا دیا اور امت مسلمہ کے بیچ بریلوی اور دیوبندی مسلک فکر کی گہری خلیج پیدا ہو گئی۔ بیت العلوم کے فارغین موخر الذکر مکتب فکر کے تھے ان کی رہنمائی دار العلوم دیوبند کے فارغ مولانا محمد تقی (۱۹۰۳-۱۹۶۱) صدر مدرس بیت العلوم کر رہے تھے۔ مخالف جماعت کے چند مخلص حضرات جن میں حاجی ولی اللہ خدا بخش، نائب اور میونسپل کونسلر محمد حسن رمضان اور نصیر الدین جیسے بزرگان دین شامل تھے آگے بڑھے اور دوست محمد حاجی کی مسجد میں دار العلوم عربیہ حنفیہ سنیہ کی بنیاد مستحکم ہوئی جس کے صدر مدرس مولانا محمد صدیق مقرر ہوئے جو قصبہ

خیرآباد ضلع اعظم گڈھ کے متوطن تھے۔

اعانتِ مدرسہ کے لئے چندہ کی فراہمی کا باقاعدہ جلوس مقتدر اراکین، مدرسین اور رؤسائے شہر پر مشتمل نکلتا تھا۔ طلبا خوش الحانی سے نظم گاتے ہوئے گشت کرتے سے

مسلم خفتہ اٹھ اب خدا کے لئے ‌ ‌ ‌ ‌ فکر کر ستیہ مدرسہ کے لئے

جیسا کہ راقم نے اہالیانِ بیگاؤں کی زندہ دلی، ندرتِ فکر اور جدت طرازی کی بارہا مدح سرائی کی ہے اس کے استدلال میں نیلام کا یہ واقعہ بھی "رقم ایجاد" سے کم نہیں۔ اُجالوں کے سفر میں جو ہماری معلومات کا سب سے اہم ماخذ ہے ذتں مرتب نے لکھا ہے:

"صدق نیت میں خود اعتمادی روز افزوں ہوتی گئی اور اہلیانِ محلہ و شہر نے چشم سر سے وہ جذباتی لمحہ بھی دیکھا جب مرحوم حافظ محمد صدیق صاحب (مدرس درجہ حفظ) نے اپنے لختِ جگر (مسمی منظور احمد) کو اعانت کی مد میں مدرسہ کو دے دیا جسے ایک مجلس وعظ میں نیلام کیا گیا۔"[1]

—اور اس متاعِ عزیز و گرانمایہ "یوسف" کے خریدار بنے منشی محمد قاسم جنہوں نے خرید کر حافظ صاحب کو واپس کر دیا اور نیلامی کی رقم مدرسہ کو ادا کی گئی۔ ایسے دو بھی دوسرے قافلہ سالاران تھے جنہوں نے ساری جائداد، نقد رقم اور زیورات اور مکانات مدرسہ کے نام وقف کر دیا تھا۔ ایسے ہی تھے جناب حمید ٹیچر کے بھائی عبداللطیف سقف۔ برکت پورہ میں موجودہ عمارت کی زمین محمد حسن رمضان اور عبدالغفور بھاؤ بندیہ کے ممبران کی کوششوں سے ملی تھی۔

انجمن دارالفلاح یتیم خانہ کی بنیاد پندرہ برس قبل ڈالی گئی تھی جس کے پرخلوص چیرمین الحاج محمد سعید سیٹھ ہیں، جنہوں نے اپنی ذاتی نگرانی میں بڑی جد و جہد کے صرفہ سے اور اپنے ساتھی اراکین اور اہل خیر حضرات کی مالی اعانت سے ایک شاندار عمارت تعمیر کرائی ہے۔ یتیم بچوں کو ناظرہ کی تعلیم دی جاتی ہے طالبات کو سلائی وغیرہ بھی سکھائی جاتی ہے۔

مدرسہ ضیاء القرآن خاص نابینا طالبانِ علم کے لئے جاری کیا گیا جو انگنو سیٹھ کا ملا، نیا پورہ میں واقع ہے، معلم اور متعلم ہر ایک نابینا ہے اور اس خصوصیت کے حامل

---

[1] اجالوں کے سفر۔ ڈاکٹر مختار ایجوکیشنل اینڈ سوشیل ویلفیر سوسائٹی۔ ستمبر ۱۹۹۳ء۔ ص ۲۹۔

مدرسہ کے بانی حافظ مدار بخش تھے، صاحب خیر افراد جنہوں نے اس کے قیام میں کما حقہ مدد کی یہ لوگ تھے: نیا پورہ کے خلیل احمد ابن عیدو۔ داؤد سیٹھ۔ محمد حسین محمد یوسف۔ عبد الرؤف عبد الرشید، عباس سیٹھ پونہ والے، نثار احمد، حافظ محمد یوسف اور دیگر اہل خیر حضرات تھے۔

معہد ملت

اس بین الاقوامی شہرت کی حامل درسگاہ معہد ملت مولانا عبد الحمید نعمانی کی مساعی جمیلہ کی رہین منت ہے اور ان کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ہے۔ ان کے رفقائے دیرینہ میں جنہوں نے اشتراکِ تعاون کیا ان کے اسمِ گرامی یہ ہیں: مولانا محمد عثمان، مولانا محمد شفیع، مولانا عبد القادر اور مولانا عبد الحق۔ ان اکابر دین کے علاوہ تاجر طبقہ کا مالی تعاون بھی شامل رہا، سیٹھ عبد الخالق، الف عباسیہ مل، سیٹھ عبد الواحد مالک تاج فیکٹری، حاجی محمد اسحٰق عبد الشکور، سیٹھ عبد الخالق سردار، حاجی محمد اسحٰق حبیب اللہ، منشی محمد حنیف اور میاں جی صادق صاحب نے معہد ملت کی بنیاد (۱۳۷۲ھ/۱۹۵۳ء) کو استحکام پہنچایا۔

اسی سے ملحق اور زیر اہتمام ایک ادارہ امتحانات دینیات کا قیام ۱۹۶۵ء میں عمل میں آیا، یہ اپنے قسم کا واحد ادارہ ہے جس کے مراسلاتی نصاب سے ہزاروں طالبات مستفید ہو رہی ہیں، دار التالیف و الترجمہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ فارغین اور ان کی تصنیفی سرگرمیوں کو بڑھانے اور صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

مولانا نعمانی کی بڑی خواہش تھی کہ مسلم خاندانوں کے تنازعات کو عدالت سے باہر فیصل کرنے کے لیے ایک دار القضاء قائم کیا جائے۔ بہار و اڑیسہ کے امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی کی دعوت پر جب ۱۹۷۰ء میں معہد ملت کے سالانہ جلسۂ اسناد میں تشریف لائے تھے تو ان کی سفارش پر مولانا عبد الاحد ازہری کو قضا کی تربیت کے لیے پٹنہ بھیجا گیا اور جب وہ اس کی تربیت مکمل کر کے لوٹے تو امارت شرعیہ کی ہدایت پر دار القضاء کے قیام کی ابتدائی کارگزاریوں کا آغاز ہوا۔

معہد ملت نے تعلیم و تدریس کے مراکز اطراف و اکناف میں قائم کر کے اشاعتِ دین و علم کا ایک بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہے: مدرسہ مفتاح العلوم (کوپر گاؤں)، مدرسہ فیض العلوم (دبہ باپور)، مدرسہ انوار العلوم (ملگاؤں)، مدرسہ معراج العلوم (جنگرلی)،

دارالعلوم (احمد نگر)، مدرسہ مدینۃ العلوم (جام کھیڑ، احمد نگر)، مدرسہ مفتاح العلوم (جام کھیڑ، اورنگ آباد)، مدرسہ انوار العلوم (اورنگ آباد)، مدرسہ زینۃ العلوم (آشٹی ضلع پربھنی)، مدرسہ ریاض العلوم (شیوگاؤں ضلع احمد نگر)، مدرسہ دارالعلوم روشن خان (پربھنی) وغیرہ۔

معہد ملت کے نصاب کے مطابق اور اسی کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ مولانا محمد ادریس ملی ناظم تعلیمات معہد ملت ہیں۔ مولانا محمد حنیف ملی شیخ الحدیث ہیں مولانا نعیر ملی اسد کو پیارے ہو چکے ہیں۔

الجامعۃ المحمدیۃ المنصورۃ

الحاج خلیل سیٹھ نے مالیگاؤں کی آبادی سے باہر ایک وسیع قطعہ اراضی الجامعۃ المحمدیہ کے لیے وقف کر دیا، عرب تجار کی مالی اعانت سے اور مولانا مختار احمد ندوی کے شبانہ روز دوڑ دھوپ کے نتیجے میں "منصورہ" کی بنیاد پڑی اور اس طرح جامعۂ محمدیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کمپلیکس میں مدرسہ عائشہ صدیقہ اور ایک عالیشان مسجد موجود ہے، جامعہ میں عالمیت، فضیلت کے علاوہ حفظ قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ایک پندرہ روزہ اخبار صوت الحق شائع ہوتا ہے، دارالافتاء بھی قائم ہے اور ایک مجلس علمی۔ ان کے علاوہ اور کئی شعبہ جات ہیں مثلاً شعبہ ریاضت، شعبہ امداد باہمی اور طبی خدمات۔

اسی ادارے کے قریب اور اسی کے زیر اہتمام محمدیہ طبیہ کالج قائم ہے، جو ۱۹۹۰ء میں قائم ہوا، مدرسہ کی شاخیں بمبئی، بنگلور، ناگپور اور اکوٹ میں ہیں۔

مدرسہ جامعۃ الصالحات (قائم شدہ ۱۹۶۸ء)

اس خطہ کا یہ پہلا علمی گہوارہ ہے جس میں طالبات کی دینی تعلیم و تربیت بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہے، یہ ایک بنیادی ضرورت ہے اس لیے کہ یہی دنیا و آخرت کی نجات کی ضامن ہے۔ مولانا محمد عثمان ایک جید عالم، ایک خوش الحان قاری اور حافظ قرآن تھے اور چاہتے تھے کہ قوم کی بچیوں میں دینی علوم سے رغبت پیدا ہو جائے۔ انہوں نے اپنی ایک بھتیجی ناہید جہاں اور لڑکی عابدہ نسرین کو گھر پر عربی کی تعلیم دینی شروع کی، — پھر جب یہ مژدۂ جانفزا اطراف میں پھیلا تو

انگنو سیٹھ کی مسجد کا ایک کمرے کا دروازہ اور بچیوں کے لیے کھل گیا۔ ایک سنی پر دو شخص آگے بڑھے یہ اسحٰق عبداللہ تھے انہوں نے ایک افتادہ قطعۂ اراضی وقف کر دی اور جس پر جامعۃ الصالحات کی شاندار عمارت کھڑی ہو گئی مولانا محمد عثمان کے ساتھ، مولانا محمد الیاس اور مولانا محمد ایوب نے نہایت جانفشانی سے رشد و افادہ اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا عبدالحق بھی بانیان مدرسہ میں سے تھے۔

کلیۃ الطاہرات

تبلیغی جماعت کی اس درسگاہ کی تاسیس ۱۹۶۴ء میں بدست مبارک محدث جلیل امیر الہند حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی عمل میں آئی۔ الحاج محمد مصطفیٰ بخشی نے ایک بڑا قطعۂ اراضی عمارت کی تعمیر کے لیے عطا فرمایا۔ جب بیرونی طالبات کلیہ میں آنے لگیں تو ان کی رہائش اور خورد و نوش کے تعلق سے تمام اخراجات اور ذمہ داریاں بخشی صاحب نے اپنے سر لے لیں اور اس درسگاہ کی مزید ترویج و ترقی کے لیے عملاً حصہ لیتے رہے۔ اس درسگاہ کے ارباب حل و عقد سب کے سب جماعت کی فکر کے حامل ہیں اور اکابرین جماعت کی تائید و تعاون حاصل ہے کلیہ کی معلمات اور اونچی جماعتوں کی طالبات شہر کے مختلف حصوں میں جا کر مستورات کا اجتماع کرتی ہیں۔ طالبات کو مستند عالمہ بنانے کے ساتھ انہیں دین کی داعیہ اور مبلغہ بھی بنایا جاتا ہے۔

بانیانِ مدرسہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: الحاج محمد مصطفیٰ بخشی۔ مولانا محمد امین الدین نذیر۔ غلام رسول محمد صدیق۔ محمد سعید عبدالغفار سردار۔ عبدالحمید محمد حنیف اور عبدالرحمٰن نذیر احمد۔

مدرسہ عائشہ صدیقہ۔ الجامعۃ المحمدیۃ المنصورہ کا ایک جز ہے اور اسی احاطہ میں واقع ہے۔ بانیان مدرسہ ہیں۔ الحاج محمد خلیل عبدالکریم اور الشیخ مولانا مختار احمد ندوی۔ طالبات کو مسلک اہل حدیث کی رو سے کتاب و سنت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ناظمۃ الزہرا مئوناتھ بھنجن کی شاخ ہے۔

تعلیم البنات۔ سلیمانی مسجد نیا پورہ دادا میاں کے کھیت میں ۱۹۶۹ء سے قائم ہے اس میں طالبات کو تعلیم قرآن کے ساتھ قرأت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے ریاض

احمد حافظ، نور محمد حاجی، سید حمید اور محمد یسٰین بانیانِ مدرسہ نے ۱۹۷۹ء میں قائم کیا۔

الجامعۃ الزہرا البنت اظہار العلوم ۱۹۸۳ء میں تعلیم نسواں کے لئے قائم کیا گیا۔ بانیان مدرسہ میں علامہ مولانا مفتی محمد زین الدین اشرفی چشتی قادری، ماسٹر قاری محمد یونس محمد بشیر اور حاجی محمد اسحٰق شاہ صاحب کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ انگلش سلائی کلاس، کشیدہ کاری اور تعلیم بالغان کے شعبے بھی مدرسہ کے تحت چل رہے ہیں۔

مدرسہ تربیت النسار بیادگار محمد یوسف جگن سنگمیسر میں قائم کیا گیا۔ بانیان مدرسہ یہ ہیں: مولانا عبدالرحیم قاسمی، خالد حسین، ریاض مقادم، عبدالحمید چاند لما، دینیات کا کورس تین درجہ میں پڑھایا جاتا ہے۔

جامعۃ الطیبات کے بانیوں میں یہ ممتاز اہلِ علم شامل ہیں: نہال احمد قاری محمد حسین۔ عبدالحمید ازہری۔ محمد شریف حافظ عبدالشکور۔ اقبال احمد اور سوری محمد عمر فاروق۔ قائم شدہ ۱۹۹۰ء

مدرسہ نقشبندیہ برکتیہ برائے طالبات ۱۹۵۹ء سے جاری ہے۔ صوفی محمد علی نقشبندی مجددی برکتی، صوفی محمد صدیق علی نقشبندی مجددی برکتی اور خادمان خانقاہ نقشبندیہ برکتیہ مالیگاؤں کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ یہی حضرات بانیٔ مدرسہ ہیں۔

احیاء العلوم ندی کے کنارے جھوپڑپٹی میں ۱۹۶۰ء میں قائم ہوا، طالبات کو ناظرہ اور قرأت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بانیان بھی مستورات ہیں: سائرہ جبیں، رحیمہ خاتون، سائرہ خاتون اور عائشہ خاتون۔

مدرسہ رابعہ بصری عائشہ نگر جھوپڑپٹی میں ۱۹۸۶ء سے طلباء وطالبات کے لئے قائم ہے بانیان مدرسہ یہ ہیں: محمد ادریس حاجی محمد بشیر، محمد اسرائیل محمد اسماعیل، ریاض احمد محمد یونس۔ ایک شاخ مدرسہ اسلام آباد میں بھی ہے۔ حاجی بشیر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے ماتحت اسکولی بچوں کو کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ ناظرہ قرآن کی تعلیم دی جاتی ہے۔

ادارۂ جمعیۃ العلماء مالیگاؤں

یہ ادارہ ایک طویل عرصے سے اہالیانِ شہر مالیگاؤں کے دینی اور سماجی مسائل کو حل کرنے کی حتی الامکان کوشش کرتا رہا ہے، جذبۂ ایثار اور مخلص دیندار بزرگ ہستیوں کا وجود اس ادارے کی نجابت اور تسلسلات کی ضمانت بن گیا ہے ان میں مولانا عبدالقادر کی قد آور

شخصیت بحید نمایاں۔ انہوں نے ایثار و قربانی کی ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ بعد میں حاجی محمد مصطفیٰ اسیٹھ، مولانا عبدالباری، مولانا مفتی محمد اسمٰعیل، مولانا عبدالقیوم، مولانا سراج احمد، عبدالخالق نار غلیظ، غفران متقادم، عبدالصمد انصاری اور احسان الرحیم بزرگانِ دین نے بڑی جانفشانی، جگر تابی اور خلوص سے اس ادارے کو زندہ رکھا، بیشمار نوجوانانِ ملت اس فلاحی ادارے سے وابستہ ہیں اور اپنی پُرخلوص خدمات سے اہالیان شہر کو مستفیض کر رہے ہیں، اسی ادارے کے زیر اہتمام مختلف صنعتوں اور ملازمتوں کے شعبوں میں امیدواروں کی رہنمائی کے لیے انفارمیشن سینٹر قائم کیا گیا ہے جس کے روح رواں پروفیسر عبدالمجید صدیقی اور ان کے معاون اساتذہ کرام ہیں، شہر کے غریب اور پسماندہ بستیوں میں طبی سہولت فراہم کرنے کے لیے "الجمعیۃ ایجوکیشن اور میڈیکل ویلفیر سوسائٹی" بھی تشکیل دی گئی ہے جس کے زیر اہتمام "مولانا عبدالقادر فری کلینک" چلائی جارہی ہے۔ اس سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی بڑی تندہی اور دلجمعی سے شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن (بمبئی برانچ آفس) مالیگاؤں جس کا ذکر جزائر بمبئی کے تعلق سے آگے آرہا ہے ایک فعال تعلیمی ادارہ ہے جس کا دائرۂ عمل بمبئی سے لے کر شہر مالیگاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ طبی، تعلیمی اور سماجی میدانِ عمل میں اس کے فعال اراکین سرگرم رہتے ہیں۔ ربانی سردار برانچ آفس کے صدر ہیں۔ مالیگاؤں کی مشہور شخصیت جو ہر میدان کے ہراول دستے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی۔ اس کے نائب صدر ہیں۔ ماسٹر شفیق احمد، ماسٹر اقبال احمد، اقبال صدیقی اور یوسف جمال اس فعال ادارے کے بڑے فعال اراکین ہیں۔

مدارس:

اے ٹی ٹی ہائی اسکول اور جونیئر کالج مالیگاؤں

اہل علم جو لے بزرگ کر ۱۹۲۷ء میں خانصاحب سیٹھ عبدالرحیم نے جو اپنے وقتوں کے بڑے مشہور سیاسی اور سماجی ورکر تھے اینگلو اردو ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی تھی یہ ہائی سکول

اس وقت میونسپلٹی کا دست نگر تھا پھر ارباب حل و کشاد نے ہاتھ بڑھا کر ۲ جنوری ۱۹۵۴ء کو اسے انجمن ترقی تعلیم کے حوالے کر دیا اور اس کا نام اے ٹی ٹی ہائی اسکول رکھ دیا، مگر یہ پھلتا ہی رہا اس کی آبیاری کرنے والوں میں کیپٹن محمد علی علیم، سیٹھ عبدالودود، شمس الہدیٰ وکیل، سیٹھ محمد اسحاق عبداللہ، عبدالرحمٰن ماسٹر اور دیگر اہلِ علم حضرات کی جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم سے یہ پودا پروان چڑھتا گیا اور شہر میں اس کی حیثیت "ام المدارس" کی ہوگئی۔ بعد میں ڈاکٹر محمد حسین کے زیر نگرانی اسکول کی نئی عمارت تعمیر ہوئی، کیپٹن محمد علی علیم آج بھی اسکول کی ترقی و تعمیر کے لئے کوشاں ہیں۔

۱۹۸۵ء میں انجمن کے زیرِ اہتمام شیخ عبدالودود پرائمری اینڈ پری پرائمری اسکول کا اجراء عمل میں آیا، شہر کا یہ قدیم اسکول۔ جدید تعلیمی پروگراموں کو بڑے احسن طریقہ پر ترتیب دیتا ہے، اس کا تعلیمی معیار اتنا بلند ہے کہ شہر کے تعلیم یافتہ افراد کے معتدبہ حصے نے اسی دردِ علمی کی آغوشِ تربیت میں تکمیل تعلیم کی ہے۔

اس کی تعلیمی ترقی میں جن بانغ نظر حضرات کا حصہ ہے ان میں سابق ہیڈ ماسٹر خورشید احمد مرزا کا نام قابل ذکر ہے، موجودہ پرنسپل امان اللہ خان کی جد و جہد سے یہ تعلیمی ادارہ "مینارۂ نورِ علم" بن گیا ہے اور دور دور تک اس کا اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔

جمہور ہائی اسکول۔ جونیئر کالج، اور جمہور ٹیکنیکل ہائی اسکول مالیگاؤں

جمہور کلب کے مخلص اراکین نے اس ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی، یہ تیسرا ہائی اسکول تھا جس میں ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ جمہور کلب کے اراکین میں بالخصوص چراغ احمد (مرحوم)، محمد ڈھنگے حنیف خان محمد۔ اختر حسین انصاری۔ غلام رسول محمد اسحاق۔ جوہر سیٹھ، محمد عمر چشمہ والے جیسے مخلص اور پرجوش لوگ تھے جنہوں نے فنڈ جمع کرنے کے لئے جمہور کلب کے نام سے تعلیمی امدادی پروگرام کئے۔ نادار طلبہ و طالبات کو بیاضیں اور کتابیں تقسیم کرنے لگے۔ پھر آگے بڑھے اور جمہور ہائی اسکول کی نیو ڈالی، دو کمروں میں اسکول قائم ہوا پھر اہل علم حضرات کی مالی استعانت سے عمارت میں اضافہ ہونے لگا اور جب مالیگاؤں کے سیاسی رہنما اور مخلص، ورکنگ لیڈر نہال احمد مولوی محمد عثمان نے جمہور ہائی اسکول کی باگ ڈور سنبھالی تو یہ ادارہ اپنی تعلیمی جولانیاں دکھانے لگا۔ جمہور ٹیکنیکل ہائی اسکول کا اجراء ہوا جس میں استادانِ ہنرمندی کے کئی شعبہ جات میں طلبہ کی تربیت کر کے انہیں خود کفیل بنانے میں مصروفِ عمل رہتے ہیں۔

تہذیب ہائی اسکول

شہر مالیگاؤں کا یہ چوتھا ہائی اسکول ہے، مومن برادری کی روز افزوں آبادی کو دیکھ کر کچھ اہل درد حضرات کو تنگیٔ داماں کا احساس ہوا کہ کچھ اور چاہیے وسعت — ان لوگوں میں یہ حضرات شامل تھے: محمد یٰسین نشاطی، محمد اسحاق خضر اور محمد حسین عبدالغنی شکاری مالیگاؤں کے مخیر اور متمول اور غنی دل سیٹھ خلیل نے اس اسکول کے لئے جگہ عنایت فرمائی اور سرمایہ بھی فراہم کیا اور اس طرح تہذیب ہائی اسکول کے کھل جانے سے ایک 'باب علم' اور کھل گیا، اسکول کے موجودہ پرنسپل محمد اسحاق خضر نہ صرف ایک تجربہ کار استاد ہیں بلکہ شعر و ادب میں اپنا ایک ممتاز مقام بھی رکھتے ہیں۔

جے۔ اے۔ ٹی گرلس ہائی اسکول

مخلوط تعلیم کے نقصانات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جبکہ شریعت بھی مانع ہے موجودہ ہائی اسکولوں میں تعلیم کی تکمیل ہونے تک طالبات کی اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند ہوجاتے ظاہر ہے یہ الگ ایک نقصانِ عظیم تھا، شہر کے چند مخلص افراد کو اس طرح کی ذہین اور مستحق طالبات کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے ہارون انصاری شہر کے بزرگ رہنمائے قوم تھے، مرحوم محمد آمین عشرت نے ان کا ساتھ دیا اور اسمٰعیل بیڑی فرم کے مالک محمد مصطفیٰ سیٹھ نے تعاون کیا اور ان کی اجتماعی جدوجہد سے جے۔ اے۔ ٹی ہائی اسکول جاری ہوا، اسکول کی توسیع و ترقی کے لئے محمد آمین عشرت ہمیشہ کوشاں رہے اور خود طالبات کے سرپرستوں سے مل کر ان کی بچیوں کو اس اسکول میں داخل کرانے پر زور دیتے تھے اور ان کی محنت کا صلہ یہ ملا کہ آج یہ ہائی اسکول شہر کی بچیوں کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا، سینکڑوں کی تعداد میں تکمیل کرکے طالبات زندگی کے ہر شعبہ میں مصروف عمل ہیں اور کامیاب و کامران ہیں، اسی اسکول کے زیر اہتمام جونیئر کالج کا اجرا بھی عمل میں آیا ہے۔

سردار جونیئر کالج آف ایجوکیشن

شہر مالیگاؤں کے مخلص رہنما حاجی شبیر احمد حاجی غلام رسول نے ریٹی زن ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی ان کے ذہن رسا میں ایک تعلیمی کامپلیکس (Complex) کا تصور تھا، چنانچہ ان کی مخلصانہ سرگرمیوں اور جدوجہد سے ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا اور آج شہر میں سردار پری پرائمری، سردار پرائمری اور سردار ہائی اسکول اور سردار جونیئر کالج آف ایجوکیشن

کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس عظیم منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے شہر کے مخلص ڈاکٹر منظور حسن ایوبی نے بڑی کوششیں کی ہیں، آپ ہی ان تمام اداروں کے روحِ رواں ہیں، آج شہر کے اردو داں طبقہ کے ہزاروں نونہالان چمن سے اس کامپلیکس میں بڑی بہار رہتی ہے ڈاکٹر منظور حسن ایوبی کے اس تعلیمی قافلے میں دوسرے مخلص افراد بھی سرگرم سفر ہیں جن کے نام ہیں۔ ڈاکٹر آصف سلیم، رشید سیٹھ ایرلے والے، عبدالمالک سیٹھ (گٹکھے والے) ارشید انترے اور خیال انصاری۔

تعلیمی جائزہ

علم و دانش کی قلمرو میں اہل قلم اپنی تحریروں سے ذہنوں اور دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں ان کی تحریر ایک طرز نگارش سے زیادہ طرز حیات سے عبارت ہوتی ہے۔ دماغ سوختگانِ مدارس علم کا نورانی چراغ جلا کر عرفان و رشد و ہدایت کی روشنی بکھیرتے ہیں۔ علم میراث انبیاء علیہما السلام ہے اور علماء نبیوں کے وارث ہیں، ان العلماء ورثة الانبیاء حضور اکرم صلعم نے فرمایا۔

"اللہ اور اس کے فرشتے اور زمین و آسمان والے، یہاں تک چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں

اور مچھلیاں تک لوگوں کو علم خیر دینے والے معلم پر درود بھیجتی ہیں" (دارمی)

زندگی کی کشاکش میں کامیابی کا دار و مدار تمام تر عمدہ ملکات، دینی اوصاف اور اخلاق حسنہ پر ہوتا ہے، صحتمند دینی ماحول اور ستھری تعلیم و تربیت سے نو عمروں اور نوجوانوں میں ملکات پیدا ہو سکتے ہیں، برادری کی معاشرتی پسماندگی کا ایک بڑا سبب تعلیم کا فقدان تھا۔ اور ایسے مدارس جن کا نصب العین اعلیٰ اقدار و روایات کا حامل ہو آج سے ایک صدی قبل منصوبوں اور ارادوں کی گٹھریوں میں بند تھے۔

مالیگاؤں میں انجمن معین الطلباء کا قیام عصری تعلیم کے فروغ کے لیے بے حد معین و مددگار ثابت ہوا، اس کے معاونین میں مالیگاؤں کی ممتاز ہستیاں تھیں، نا خدا صاحب عبدالرحیم جو ایک ہوشمند، باثر اور دور اندیش شخص تھے اور برادری کے بے حد مخیر اور متمول فرد تھے انہوں نے مالیگاؤں ہائی اسکول کا پہلا بنیادی پتھر رکھا، اس کی نئی عمارت کی تعمیر کے لیے، انہوں نے اس زمانے میں پچیس ہزار کا گرانقدر عطیہ عنایت فرمایا، عائشہ حکیم جو برادری کی پہلی گریجویٹ خواتین میں سے تھیں اس کی پرنسپل مقرر ہوئیں۔ ڈاکٹر ہر محمد حمانی مالیگاؤں ہائی اسکول

دنیا پورہ) کے معاونین اور اراکین میں سے تھے ان کی دعوت پر راقم ۲ر جنوری ۱۹۵۹ء کو اسکول کے سالانہ پروگرام میں اپنے رشتہ کے چچا بزرگ حاجی عبدالشکور حاجی ولی محمد سیٹھ کے ساتھ شرکت کی تھی (دعوت نامہ مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۵۸ء)۔ اس جلسہ میں شہر کی ساری ممتاز ہستیاں شامل تھیں۔

اس کے بعد مالیگاؤں میں اسکولوں اور ہائی اسکولوں کی قطاریں لگ گئیں اور آج مالیگاؤں کا شہر گہوارۂ علم بن گیا ہے۔

خداوندانِ مکتب:

تعمیر اخلاق کے ستون ابتدائی تعلیم کے مدرسین ہوتے ہیں، یک وقت تھا کہ شرفائے کرام کا معتدبہ حصہ میونسپل اور پرائمری اسکولوں میں درس و تدریس دیتا تھا اب شاید یہ صورتِ حال باقی نہیں رہی۔ ان اساتذہ کا بڑا احترام کیا جاتا ہے انہیں 'حضرت' کے محترم لقب سے یاد کیا جاتا ہے، حضرت محمد صدیق مسلم مالیگانوی، حضرت ادیب مالیگانوی، حضرت شوق مالیگانوی حضرت اوج مالیگانوی وغیرہ پرائمری اسکولوں میں پڑھاتے تھے انہیں ماسٹر بھی کہتے تھے جیسے ماسٹر نذیر احمد، ماسٹر عبدالرحمٰن ذوق، ماسٹر محمد احسن مالیگانوی، ماسٹر ابوالبرکات وغیرہم۔

بمبئی اور دیگر شہروں میں جہاں کا تاجر طبقہ اپنے ذاتی مصارف سے مدرسے اور اسکول چلاتا تھا اساتذہ کی قدرشناسی سے یکسر محترز رہتا مبادا یہ ٹوٹا ہوا آئینہ بہ کامل نہ بن جائے اور ان کے مزعومہ فتخار کو گہن نہ لگ جائے، انہیں یہ اپنے علم کے مقابلے میں مزاحفات تصور کرتے تھے بلکہ بعض تو انہیں اپنا کاسہ لیس اور حاشیہ بردار سمجھتے تھے۔ آج سے لگ بھگ یک صدی قبل (۱۹۰۵/۱۲۱۹) میں بمبئی کے کچھ رؤسائے شہر کا یہی حال تھا۔ خان بہادر منشی غلام محمد نوراپنی اسلام بمبئی کے 'مؤسس اساس' تھے ان کے بارے میں ان کے جانشین صاحبزادے منشی عبدالکریم المتخلص بہ مُدرّس سے اس وقت کے علم دوست غریب پرور اور متمول رئیس شہر محمد حسن مقبہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا تھا "تمہارے والد کیا مکتب میں بچے پڑھایا کرتے تھے" ان کے والد کو مسجد میں بچے پڑھاتے ہوئے دیکھ کر بھی یہی پوچھا تھا، منشی عبدالکریم لکھتے ہیں۔

* ایسے شخص کو منشی محمد حسن مقبہ نے برد یکھا تو [اپنی اونچی مسند سے] ایسا دیکھا کہ

ایک غریب مُلّا جس طرح مسجد کے منارے پر اور بچوں کی روودواسنے کی نیس پر بچی گذر ان کرتا ہو۔" [1]

منشی عبدالکریم کو محمد حسن متبہٌ تخلص امتن کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا انہوں نے نصیحتاً چند شعر لکھ دیے:

خواہی کہ دوستدار تو گردد جوان و پیر　　چون نخل پُر ثمر بتواضع خمیدہ باش
خاکساران جہان را بحقارت منگر　　تو چہ دانی کہ درین گرد سواری باشد

— جاہ و منصب و اقتدار کے بلند مینارے سے نیچے دیکھنے والے بونے شخص قدآور شخصیتوں کی شناخت نہیں کر سکتے، مگر ہمارے مولینا عبدالحمید نعمانی اور ان کے جیسے درجنوں علمائے کرام پرائمری اسکولوں کے مدرسین کو وہی تعظیم و تکریم دیتے تھے جس کے وہ خود مستحق ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ امارت سوکھی ہوئی گھاس اور خاشاک ہے اور مرد فقیر اسکے لیے "آگ" ہے۔ مولینا موصوف نے پرائمری اردو اسکول کے اساتذہ سے اسلامی تعلیم و تربیت کے موضوع پر مشورہ کر کے طے کیا کہ میونسپلٹی سے باقاعدہ دینی تعلیم کو لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ مولانا کے توجہ دلانے پر اصلاح المسلمین اور جمعیۃ العلماء مالیگاؤں کی کوششوں سے دینی تعلیم اسکولوں کے کورس میں داخل کر دی گئی۔ قومی، سیاسی اور تعلیمی تحریکات میں علمائے دین اور اکابرات کی شرکت سے سیدھا راستہ مل جاتا ہے۔

مالیگاؤں کی تعلیم گاہوں کو بڑے ماہرین تعلیم کی خدمات حاصل رہی ہیں۔ خورشید حسن مرزا، اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، عائشہ حکیم پرنسپل مالیگاؤں ہائی اسکول کے عہد میں اس تعلیمی ادارے نے بڑی ترقی کی۔ محمد علی فاروقی اے ٹی ٹی ہائی اسکول کے مشہور استاد تھے آپ حکیم عبدالحمید فاروقی کے صاحبزادے ہیں۔ سلیم اللہ حضرت جمہور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں، پرنسپل اسحاق خضر انصاری نے تہذیب ہائی اسکول کو ترقی کے راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ ذکیہ شریف نے بھی اپنے تعلیمی ادارے کو بڑے خلوص سے پروان چڑھایا، انصاری سعید احمد

---

[1] مضمون تعلیم و تجارت المعروف بہ مہر درخشاں کوکن۔ منشی عبدالکریم المعروف بہ مدرس۔ گلزار حسینی (۱۳۱۹ھ/ ۱۹۵۱ء)۔ بمبئی ص ۱۶-۱۸، ۲۲-۲۳

شیخ عثمان ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ ایوب صدیقی دھولیہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔
ذاتی طور پر نہایت محنت، خلوص اور لگن سے طالبانِ علم کو فیض پہنچانے والے اساتذہ ہیں:
سید المظفر فاروقی۔ فیروز بادشاہ۔ محمد مصطفےٰ انصاری، مختار یونس، امان اللہ خان، یعقوب
خان، اقبال قریشی، یعقوب انصاری، احتشام خان، محمد مختار محمد یوسف، محمد مستقیم، لیق احمد،
محمد ابراہیم، خورشید احمد، سید المظفر فاروقی پیشہ ورانہ رہنمائی (کاؤنسلر و کیشنل گائیڈینس)
میں ایک ماہر پیشہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ بھیونڈی میں آپ کو مدعو کرتے رہتے ہیں۔
بختیار سعید ٹیچر اور آرٹسٹ ہیں، البیان کے مدیر سلیم احمد صدیقی کے بھائی سعید البیان ایک
قابل استاد ہیں۔ طباعت کا بھی تجربہ رکھتے ہیں۔ بعض گھرانوں کے سارے افراد درس و تدریس
سے منسلک ہیں، خانوادہ یوسفی، علمی و تعلیمی و ادبی سرگرمیوں کے سبب مصر کے بازار کی
طرح "ہر جنسِ گرانمایہ" اور متاعِ عزیز سے مالا مال ہے۔ لائبریری، پریس، کتب خانہ کے علاوہ
تعلیمی درسگاہوں میں بھی بڑا عمل دخل ہے۔ یہ فہرست اساتذہ بہر حال نامکمل ہے۔
ابتدائی تعلیم کے اساتذہ میں اوپر 'حضرت' اور 'ماسٹر' ــــــ حضرات کا ذکر گذر چکا ہے،
فاروقی شمس الضحیٰ نہایت مخلص، محنتی اور درد مند دل رکھنے والے استاد ہیں، ایک بیحد
قابل اور محنتی ٹیچر ہونے کے سبب امتحان کے نتائج بڑے شاندار نکلتے ہیں ریاستی ایوارڈ سے
نوازے گئے ہیں، آپ فاروقی محمد زین العرب، ستانی کے فرزند ہیں جو مالیگاؤں میں پہلی سلائی
والی آپا کی حیثیت سے محکہ تعلیم سے وابستہ تھیں، مستورات کی ایک بڑی تعداد کو سلائی کڑھائی
اور دیگر امور خانہ داری کی تربیت دیکر سلیقہ وار بنا دیا۔
جو وظیفہ حسن خدمت پا چکے ہیں مگر اب بھی یادگار زمانہ لوگ ہیں ان میں خورشید خلیقی، رفیع الدین،
یعقوب صدیقی، شیخ بندے علی، محمد الیاس محمد یعقوب، محمد مصطفےٰ انصاری اور رسول خان بڑے
مشہور اساتذہ ہیں۔
تذہ زاراں بساطِ ہوائے گل، کے جھکنے والے ستارے یہ رہ گئے ہیں: محمد یوسف حافظ، امان
اللہ خان، ریاض احمد یونس، صالح ابن تابش، سراج دلدار، خورشید احمد برکتی، مرغوب الحسن،
سلطان عبد الخالق، فاروقی عبد الرحیم، محمد حنیف عبد الصمد، عبد الرشید انصاری، زین العابدین،
سلیم شہزادہ، تبسیر احمد، عثمان غنی۔ ان سارے اساتذہ میں کچھ وہ نام بھی شامل کر دیے گئے
ہیں جو برادری کے ان افراد کی طرح مستحق تحسین ہیں جن کے ساتھ یہ بھی علم کی روشنی پھیلا

رہے ہیں۔ شعبان جامعی صدر مدرس کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے ہیں آپ برسوں تک بال بھارتی کے مشیر رہے۔

رحمانی پرائمری ٹیچرس ہاؤسنگ کالونی

بعض شہروں کی مومن کوآپریٹیو سوسائٹیز امداد باہمی اور اشتراک تعاون کے دائرۂ عمل اور تحدید سے باہر نکل کر کچھ ایسے مسائل حاضرہ کو حل کرنے کا منصوبہ بناتی ہیں جو بعض حالتوں میں ناگزیر بن جاتی ہیں۔ مثلاً جماعت خانہ کی تعمیر، سوسائٹی کی عمارتیں، دکانیں، مومن برادری ہال وغیرہ۔ مالیگاؤں میں قلعہ چھاپ بچارنگ کمپنی نے اس ضمن میں بڑے تعمیری کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ پرائمری اساتذہ نے بنا کسی مالی استعانت اور قرض کے اپنی مدد آپ کے اصولوں پر ایک تاریخی کام سرانجام دیا ہے وہ ہے رحمانی ہاؤسنگ کالونی کی تعمیر کا منصوبہ۔ اس کے خاص پروموٹر فاروقی عبدالرحیم ہیں اور سیکریٹری شبیر ہاشمی۔

کالج کے اساتذہ

کالجوں کے اساتذہ علمی فضیلت کے سبب اعلیٰ مرتبہ رکھتے ہیں، اس قبیلے سے محقق، مورخ، سائنسداں، ادیب اور شعراء نکلتے ہیں، بعض نہایت لائق پروفیسر ہوتے ہیں لیکن بہت کم مکار ہوتے ہیں، نصابی کتابوں کی تالیف عام ہے لیکن ٹھوس اور جامع تحقیقی کام کا نادر نمونہ خال ہی ہوتا ہے، سب سے پہلے ڈاکٹریٹ کرنے والے مالیگاؤں کے ڈاکٹر محمد فاروقی تھے جنہوں نے عہد شاہجہانی کے منشی اور شاعر چندر بھان برہمن پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا، ڈاکٹر اشفاق انجم اردو زبان کے دائرے میں رہ کر ٹھوس تحقیقی کام کر رہے ہیں، ان کے مقالے اور مضامین بھی موقر جرائد میں شائع ہوتے ہیں، نذیر انصاری فارسی کے بڑے لائق اور ذہین استاد تھے، ایم۔ ایس۔ جی کالج کے پرنسپل عبدالحفیظ انصاری کی خدمات اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں ناقابل فراموش ہیں۔ تعلیمی شعور کے فروغ میں آپ کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ پروفیسر عبدالمجید منظر صدیقی بھی مقالے لکھتے ہیں۔ (پروفیسر نذیر انصاری کا انتقال ۱۶ جنوری ۹۴ء کو پونہ میں دورۂ قلب سے ہوا۔

اردو لائبریری

علم و ادب کے سرمائے اور میراث کی نگہداری اور حفاظت کتب خانوں سے ہوتی ہے، تہذیب و ثقافت کے یہی خزینے ہیں جن سے طالبانِ علم اپنے دامن میں معانی و مطالب اور عرفان و افکار کے جواہر پاروں کو سمیٹ لیتے ہیں۔ ہر شہر کے باشندوں کے ذوق و شوق کا اندازہ اُس شہر کی لائبریریوں کے شمار سے کیا جاتا ہے، مالیگاؤں میں علم و ادب کا پہلا خزانہ اردو لائبریری کی شکل میں جمع کیا گیا سنہ ۱۹۰۳ء میں اس کی بنیاد ڈالی گئی اولین دور کے سرگرم ارکان تھے محمود میاں منشی جان محمد حکیم پاپامیاں، دادا میاں، دگو میاں، منشی عبدالغفور خنداں، ڈاکٹر عبداللہ خاں، مولوی عبدالمجید عبدالرحیم دشمکھ وغیرہ۔ اس لائبریری کے ابتدائی زمانے سے لے کر اب تک مندرجہ ذیل حضرات کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ رہے ہیں: شیخ ابراہیم (بی۔ اے۔ ایس بی) تھے۔ ٹرسٹیوں میں تو منشی میر محمود، بلدار خان، مولوی عبدالمجید اور منشی جان محمد حکیم تھے۔ عہدہ داران میں مولوی عبدالحمید خدابخش (صدر)، محبوب خان (سیکریٹری)، غلام احمد واصف (صدر ۱۹۲۴)، نائب صدر مصری خان، چیئرمین مولانا محمد یوسف عزیز، سیکریٹری سیٹھ ملا طاہر علی نور علی، جوائنٹ سیکریٹری محمد صدیق مسلم و طیب حکیم شرکا رہیں عبداللہ درکیکا بھائی، عبدالرحیم بابو حکیم، منشی قدرت اللہ سوز، منشی عبدالغفور خنداں اور عبدالحمید فاروق حکیم، مولانا یوسف عزیز اس ادارے سے تقریباً پچیس سال وابستہ رہے سنہ ۱۹۶۰ء میں ان کے رفیق کار جناب عبدالرحیم حکیم (خانصاحب) صدر اردو لائبریری اور محمد صدیق مسلم نے نئی عمارت تعمیر کرائی۔ نئے ممبروں میں، مسٹر عبدالحیٔ، محمد صادق، محمد حسن حکیم، منشی عبدالرزاق کوکب، ایرب منصفی، نذر حسین طیب علی احمد خان سلطان خان قابل ذکر ہیں۔ عقیل رحمانی نائب صدر نعیم احمد سیٹھ نذر انجی کے عہدے پر رہ چکے ہیں شبیر احمد حکیم سنہ ۱۹۵۶ء میں اس کے سیکریٹری تھے، موجودہ صدر خالد عمر صدیقی، سیکریٹری شبیر احمد حکیم اور ٹرسٹیوں میں سعید الظفر فاروقی شکیل احمد محمد رمضان بھائی اور اقبال احمد عبدالمالک شامل ہیں، لائبریرین کلیم احمد، فروغ انصاری اور محمد انور ہیں۔

اسکس لائبریری کا قیام ہند و سوویت کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام سنہ ۱۹۶۶ء میں عمل میں آیا علمی، ادبی، سماجی اور تہذیبی پروگرام منعقد ہوتے ہیں، ممبران عموماً اشتراکی خیالات کے رنگ

ہیں، فاروق مقادم، کامریڈ اسرار اعظمی اور مرحوم شکیل سیٹھ صاحب بھی سرگرم رہ کین تھے بنیادی ممبران ہیں: ہارون بی۔ اے، ابوالحسن انصاری، عبدالمجید نذیری، شوکت عزیز، ہارون حسین نگراں عثمان غنی ہیں۔

انصار لائبریری کے بانیان الحاج ہارون احمد انصاری، محمد یوسف حبیب اللہ، محمد عباس محمد حسن اور عبدالغفار سلطان ہیں۔

فیضان نذیر اسلامی لائبریری کے بانیان کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا سید محمد فاروق میاں چشتی، الحاج حاجی محمد ناظم انصاری، ماسٹر حیدر علی حافظ محمد اور قاری محمد یونس۔

نشاط لائبریری امیر اللہ نشاط شاہدوی کی یادوں کی نشاۃ ثانیہ کا نونہال ادب ہے۔ عبدالرشید پیام، محمد اسحق دلاور، محمد اسماعیل سکندر، کامریڈ محمد اسماعیل عبدالغفور۔

دارالمطالعہ جماعت اسلامی کو قائم کرنے والے حضرات یہ ہیں: عبدالماجد عبدالغنی (موتی تالاب) محمد ایوب صدیقی اور محمد حنیف مقادم اور حاجی محمد یٰسین گھنٹو۔

نیشنل لائبریری جو سکھیر میں قائم ہے اس کی تاسیس کے ذمہ دار حضرات یہ ہیں:۔ بدرالدجیٰ افتخار احمد۔ محمد سلیمان محمد ہارون۔ محمد ایوب میرالدین۔ محمد ابراہیم عبدالعزیز۔

مسلک اہلحدیث کی لائبریریاں المکتبۃ العامۃ للجامعۃ المحمدیۃ اور دارالمطالعہ محمدیہ ہیں۔ مؤخرالذکر کے بانیوں میں سیٹھ محمد خلیل حاجی عبدالکریم اور محمد عمر مقادم کھجے والے کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

ادیب لائبریری کو ایڈوکیٹ مختار احمد سیٹھ میاں، نہال انصاری محمد اسحق اور اقبال احمد محمد ایوب نے قائم کیا تھا، عید ملن کے پروگرام بھی ہوتے تھے۔

اشرفیہ لائبریری کے مؤسسین ہیں۔ ڈاکٹر پیر محمد ربانی۔ قاری محمد مبین محمد عمر، محمد صدیق ماسٹر اور عارف حسین محمد حسین قادری۔

یوسفی لائبریری برائے اطفال: ساجدہ انجم۔ ڈاکٹر افتخار احمد۔ شرجیل فیصل۔ قیس فیصل اور ثنا آفرین جیسے نونہالان چمن علم قابل آفرین اور تحسین ہیں جنہوں نے ایک نئی کرن قائم کی ہے۔

تہذیب الاخلاق لائبریری: سرسید احمد خان کے مقتدر جریدے کی یاد دلاتی ہے، انصاری صدیقی، خلیقی عبدالباری، انصاری کال، عبدالجبار (کانڈی والے) اور محمد حسین محمد یونس اس کے بانیان ہیں۔

عبدالعزیز کلو لائبریری کی تأسیس ان لوگوں کے ہاتھوں ہوئی: عبدالقیوم حافظ محمد ایوب، محمد حنیف محمد صادق، انصاری محمد حنیف عبدالصمد، محمد ایوب سبط اللہ اور شبیر احمد عبدالعزیز کلو۔ ان لائبریریوں کے علاوہ کالجوں اور ہائی اسکولوں میں درسی اور غیر درسی کتب کے ذخائر موجود ہیں۔ قومی لائبریری (خوشامد پورہ) اور انصار لائبریری (اسلام پورہ) میں کتابوں کے شاندار ذخائر ہیں۔ ان تمام لائبریریوں سے ہزاروں کی تعداد میں قارئین استفادہ کرتے ہیں۔

طباعت واشاعت اور کتب فروشی

شہر میں نہ کاتبوں اور خطاطوں کا فقدان ہے اور نہ معیاری چھاپہ خانوں کی کمی، نورانی پریس جس کے نگراں اقبال احمد صدیقی ہیں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اہم مطابع ہیں۔ عوامی پریس، سردار پریس، ہُدیٰ پریس وغیرہ۔ کتب فروشوں میں شعبان جامعی کا سورہ بکڈپو بہت مقبول ہے، ایم یوسف انصاری کا اطفال بکڈپو بچوں کا محبوب بکڈپو ہے، دینی کتابوں کے لیے، الفلاح، الھدیٰ اور مکتبۂ عزیزیہ مقبول عام کتب فروش ہیں۔

مالیگاؤں کے مومن مسیحا

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن بمبئی اور برانچ آفس مالیگاؤں کے زیر اہتمام ۵ اگست ۱۹۹۰ء کے منعقدہ جلسۂ تقسیم انعامات کی صدارتی تقریر میں ہم نے اس حقیقت کا اظہار کیا تھا، مالیگاؤں میں مریضوں سے زیادہ ڈاکٹروں کی بھیڑ نظر آتی ہے ــــ مگر یہ بھیڑ دستِ قضا سے چھٹتی بھی جاتی ہے پرانے مسیحا اعجازِ مسیحائی دکھا کر اٹھتے جاتے ہیں نئے حکیم اور ڈاکٹر دعا اور دوا کرتے ہوئے مریضوں کو اللہ شافی کی یہ آیت سناتے ہیں: وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ یَشۡفِیۡنِ ڈ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے: (شعراء: ۸۰)

ڈاکٹر محمد سلیم صدیقی (ایم بی بی ایس)

ڈاکٹر مرحوم کی شہرت کا سورج اوج پر تھا ــــ اور خورشید نوزاں کے برابر نہ ہوا تھا کہ دستِ قضا نے مرِ مختشب کی طرح انہیں نہیں چھوڑا، آپ انجمن تعلیم مسلمانانِ مالیگاؤں کے اولین ممبروں میں سے تھے۔ اس انجمن کی بنیاد ۱۹۲۲ء میں ڈالی گئی تھی۔ آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر طارق صدیقی آپ کے جانشین ہیں۔ خالد عمر صدیقی ایک مخلص سماجی ورکر ہیں

بیت العلوم مدرسہ کے چیف ٹرسٹی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ محمد سلیم (ایم بی بی ایس)

حافظ عبدالرحمٰن (بڑے حافظ جی) کے لڑکے عبدالغفور کے نواسے اور حافظ محمد رمضان کے پوتے ہیں، مالیگاؤں کے پہلے ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہیں، آپ کے زمانہ طالبعلمی میں عبٹ ہاسٹل (جے جے میڈیکل کالج) میں مذکورہ بالا انجمن کی میٹنگیں ہوتی تھیں۔ انتہائی کامیاب پریکٹس ہے اور تشخیص امراض میں ماہر ہیں۔ مالیگاؤں میونسپلٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر خلیل احمد انصاری (ایم بی بی ایس)

مالیگاؤں کے اولین دور کے ڈاکٹروں میں سے ہیں راقم کے معاصر اور دوست تھے، عرصہ تک سماجی خدمات انجام دیتے رہے مالیگاؤں بلدیہ کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ بنکر طبقہ کے بہبود اور صنعتی ترقی کے لئے ان کے مساعی جمیلہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر مسعود خلیل انصاری بھی ساتھ ہی میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر پیر محمد رحمانی (ایم بی بی ایس)

ڈاکٹر خلیل کے معاصرین میں سے ہیں، زمانہ طالبعلمی ہی سے بیحد فعال تھے انجمن تعلیم مسلمانان مالیگاؤں کے شورتی میٹنگوں میں شریک رہتے تھے۔ تعلیمی امور سے بیحد دلچسپی رکھتے ہیں مالیگاؤں ہائی اسکول (نراپورہ) کی بنیاد کے اولین دور میں اس کے محرک تھے۔

ڈاکٹر رحمانی تقریباً بیس سال سے ہومیوپیتھی طریقہ علاج کو اپنائے ہوئے ہیں اس تعلق سے کئی عالمی کانفرنسوں سے خطاب کر چکے ہیں اور یونان تک جا چکے ہیں۔ ان کے دو لڑکے بھی تعلیم پوری ہی میں ڈاکٹر بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید رحمانی (ایف سی پی ایس) بمبئی میں پریکٹس کرتے ہیں۔ مالیگاؤں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر ہیں۔ ڈاکٹر عرفان رحمانی مالیگاؤں میں مطب چلاتے ہیں۔ ڈاکٹر پیر محمد رحمانی صاحب بیحد شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج انسان ہیں اور اپنی ذات سے خود انجمن ہیں۔

ڈاکٹر محمود انصاری (مرحوم)

ان کا ذکر آچکا ہے۔ لیکن چونکہ مالیگاؤں کے مشاہیر ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کی نیکیوں کے اتنے چرچے ہیں کہ یہ اپنی نیکنامی اور نیکیوں کے سبب لائق ذکر مکرر ہیں۔ غریب پرور انسان تھے، اطراف کے دیہاتوں کے مریضوں کے مسیحا تھے، مذہبی انسان تھے۔ ان کے

چھوٹے بھائی محمد عمر انصاری فارمیسی میں ڈگری لے کر امریکہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ڈاکٹر محمود کے دو صاحبزادے مسعود اور مسلم بھی امریکہ کے باسی بن چکے ہیں۔ ڈاکٹر محمود انصاری کی طبی، سماجی اور تعلیمی خدمات تاریخ مالیگاؤں کا ایک زریں باب ہے۔ آپ معین الطلبا کے چیئرمین بھی رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال انصاری (ایم بی بی ایس) ریڈیولوجی کا کورس کر کے مالیگاؤں میں ایکسرے کلینک چلا رہے ہیں۔ آپ سیٹھ محمد یوسف کے صاحبزادے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسمٰعیل انصاری: بمبئی کے جے جے ہسپتال سے ' ای این ٹی ' کے سرجن بن کر نکلے، مالیگاؤں کے ایک بہترین سرجن تسلیم کئے جاتے ہیں۔ میڈیکو سوشیل ڈپارٹمنٹ کے تحت طبی خدمات انجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر رفیق شیخ (ایم بی بی ایس) پونہ سے فارغ التحصیل ہو کر ریڈیولوجی میں تخصیص حاصل کر کے مالیگاؤں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر صفیہ شیخ ماہر امراضِ نسواں ہیں۔ میاں بیوی کی پریکٹس زوروں پر چل رہی ہے۔

ڈاکٹر سعید فارانی: بمبئی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر کے بعد میں سرجری کی خصوصی سند لی، ایک بڑا ذاتی ہسپتال فاران ہاسپٹل کے نام سے قائم کیا ہے۔ بڑے بھائی ڈاکٹر جاوید فارانی بھی مالیگاؤں ہی میں پریکٹس کر رہے ہیں، چچازاد بھائی ڈاکٹر اقبال فارانی بھی شہر ہی کے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ انصاری: حافظ اسحٰق سوت والے کے فرزند ارجمند ہیں۔ ایم بی بی ایس کے بعد ڈی او ایم ایس کی ڈگری لی، امراضِ چشم کے ایک ماہر ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر الطاف احمد انصاری: محمد یوسف سیٹھ کے صاحبزادے اور محمد اسحاق (ایل ٹی ایم) کے بھائی ہیں۔ شہر کے بہترین معالج دنداں ہیں۔

ڈاکٹر سراج انصاری نے بھیونڈی کے مومن ویلفیئر سوسائٹی کی مالی امداد کو فراموش نہیں کیا ہے اور اب تک اس کی وقتاً فوقتاً مالی امداد کرتے ہیں۔ سائن ہسپتال سے ایم بی بی ایس کیا ہے اور مالیگاؤں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر فردوس جمشید: نام سے ایرانی اساطیر اور فارسی زبان کی حلاوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مالیگاؤں کے پہلے ایل سی ای ایچ ڈاکٹر تھے لیکن جوانمرگی نے رشتۂ حیات منقطع کر دیا۔ آپ

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کے فعال رکن تھے۔

ڈاکٹر فاروق احمد انصاری: بمبئی سے طب کی تعلیم مکمل کرکے مالیگاؤں میں مطب چلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد انصاری: مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کے زیر اہتمام میڈیکو سوشیل ڈپارٹمنٹ میں دوسرے ڈاکٹروں کے ساتھ آپ بھی مالیگاؤں کے مریضوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد مالیگاؤں میں طبی ریاضت کر رہے ہیں اور سیاسی میدان کے شہسوار نہال احمد انصاری سابق وزیر مہاراشٹر کے داماد ہیں۔

ڈاکٹر منظور حسن ایوبی: بمبئی سے طب کی تعلیم کی تکمیل کی، مالیگاؤں میں مسیحائی کر رہے ہیں، سیاست میں رہنمائی اور پونے یونیورسٹی کے سینیٹ کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ آپ بھی میڈیکو سوشل ڈپارٹمنٹ سے متعلق رہ کر مالیگاؤں کے مریضوں کی طبی خدمات کرتے رہے ہیں۔ سردار ایجوکیشن سوسائٹی جس کے بانی آپ کے خسر سیٹھ شبیر احمد (ایم ایل سی) ہیں اس کے چیئرمین ہیں۔ جناح لیگ کے بھی چیئرمین ہیں۔ مخلص سماجی ورکر ہیں۔

ڈاکٹر انصاری عبدالغفار- نائر ہسپتال بمبئی سے ایم بی بی ایس کیا، مالیگاؤں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ ہندوستان والا: (ایم بی بی ایس) پونہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ڈی۔ اے کیا، طبی خدمات بمبئی میں انجام دیتے رہے۔ مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی مجلس منتظمہ (۱۹۸۰-۱۹۷۹) کے رکن تھے۔ اور اب ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر شکیلہ سید: مالیگاؤں کی پہلی ایم بی بی ایس خاتون ڈاکٹر ہیں۔ مشہور حکیم چراغ حسن سیٹھ کی صاحبزادی ہیں۔ آپ کے شوہر ڈاکٹر یسین علی سید بھی مشہور سرجن ہیں۔

ڈاکٹر آصفہ شیخ (ایم۔ ڈی) نسار ہاسپٹل چلا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سعید احمد فیضی (ایم۔ ایس): مالیگاؤں کے مشہور تاجر اور مخیر الحاج سیٹھ خلیل احمد کے فرزند ہیں۔ "نور ہسپتال" قائم کرکے اپنے مریضوں کو وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائی ہیں جن کے لئے انہیں مالیگاؤں سے باہر جانا پڑتا تھا، آپ کا خاندان مسلک اہلحدیث کا پیرو ہے۔ ڈاکٹر سعید جامعہ محمدیہ طبیہ کالج (منصورہ) سے بھی دلچسپی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسین انصاری (مرحوم):

راقم کے ساتھ اسماعیل یوسف کالج میں زیر تعلیم تھے، ڈاکٹری کرنے کے بعد مالیگاؤں کے ڈی۔

ہی ہسپتال سے منسلک ہوگئے۔ بیحد مخلص انسان تھے اور دردمند۔ لوگوں کو آپ کو بیحد فیض پہنچتا رہا لیکن یہ سرچشمۂ فیضان بہت جلد موت کے ہاتھوں خشک ہوگیا۔

ڈاکٹر عبدالماجد (ایم بی بی ایس) اپنے علاقے کے کامیاب اور مقبول ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔

الحاج ڈاکٹر غلام حیدر صدیقی:

مالیگاؤں کے تاجر، علمی و ادبی خانوادے کے فرد ہیں، ایم بی بی ایس کے امتحان میں گولڈ میڈل سے سونے کا تمغہ حاصل کیا، خود بھی سونے جیسا دل رکھتے ہیں اور غضب کی ذہانت کے مالک ہیں اور صداقت کے حامل، شعری ذوق رکھتے ہیں اور الفاظ و معانی کی نبض پر گرفت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی اچھا کہہ لیتے ہیں۔ بیحد ملنسار اور دردمند ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد صدیقی

صدیقی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، اس خاندان میں صنعت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کا چراغ بھی روشن رہا ہے، ڈاکٹر سہیل احمد صدیقی طبابت کے ساتھ کاشتکاری سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ کامیاب معالج ہیں۔

ڈاکٹر رفیق احمد صدیقی (ایم بی بی ایس۔ ایم ایس)

برادری میں پہلے معالج امراض چشم ہیں۔ بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں، میونسپل کاؤنسل میں ہیلتھ آفیسر رہے ہیں اور شہر کی حفظان صحت کے نگراں ہیں ان کا دائرۂ عمل چالیس گاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی (ایم بی بی ایس)

اسی صدیقی خاندان کے "ہمہ آفتاب" کی ایک شوخ کرن ہیں اور اپنی ذات سے کئی انجمنوں کو منور کر رکھا ہے، ادبی و تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ تجارتی سرگرمیوں کا بازار بھی گرم کر رکھا ہے۔ ادبی و شعری ذوق خاندانی میراث ہے۔ مالیگاؤں کے جلسوں اور تقاریب کے روح رواں ہیں، تقریر بھی کرتے ہیں اور نظامت بھی خوب کرتے ہیں۔ میڈیکو سوشل ڈپارٹمنٹ (مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن) کا قیام اور اہتمام کا سہرا آپ کے سر ہے۔ راقم سے قرابت داری ہے، بیحد مخلص، فعال اور ہمدرد انسان ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء شیخ (ایم بی بی ایس)

ڈاکٹر شیخ محمد سلیم کے صاحبزادے ہیں، مدینہ منورہ میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں، شیخ زاہد احمد مجھولے جسٹ ہیں آپ بھی سعودی عرب میں رہائش پذیر ہیں ڈاکٹر شیخ محمد سلیم کے دو صاحبزادے

ڈاکٹر عابد انصاری اور ڈاکٹر خالد شیخ ایل سی ای ایچ ہیں۔

ڈاکٹر ارشد انصاری (ڈی وی ڈی) بڑی اچھی پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال (ڈی۔ اے) اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر مصطفیٰ یزدانی (ڈی۔ او۔ ایم۔ ایس) بڑے مقبول ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر احمد انصاری: بمبئی کے سائن ہسپتال سے ایم بی بی ایس کیا، مالیگاؤں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر مختار الحسن انصاری، ڈاکٹر محمود انصاری کے فرزند ہیں، ڈینٹسٹری کرکے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا اور مالیگاؤں میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر سیمہ [illegible] اور ڈاکٹر آصف یوسف (ایم۔ ڈی) حاجی محمد عثمان ڈھنڈو والے کے چشم و چراغ ہیں [illegible] بھائی بہن اعلیٰ طبی سند و تعلیم حاصل کرکے مریضوں کی مسیحائی کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر سیمہ [illegible] سردار ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے خازن ہیں اس کے علاوہ جنتا بنک [illegible] ورسٹی [illegible] ایسوسی ایشن کے [illegible] نائب [illegible] ہیں۔

[illegible] [illegible] تک مشہور ہیں۔ یہ دو باغ ہیں تو ان کا طوطی بول رہا ہے [illegible] سماجی لحاظ سے [illegible] بھائی [illegible] ہیں محمد صدیق درانی کے دو لڑکے ڈاکٹر [illegible] اور ڈاکٹر سعید [illegible] ایم ایس مقبول مسیحاؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ بشیر درانی کے صاحبزادے ڈاکٹر [illegible] درانی بھی کامیابی کے ساتھ پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر افتخار انصاری (ایل سی ای ایچ)

محلہ [illegible] کے کامیاب معالج ہیں۔ سماجی حیثیت سے ایک فعال ورکر ہیں، تہذیب ہائی اسکول کے رکن انجمن ہیں، ڈرامہ نویس ہیں اور ادبی شوق بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر جلال الدین (بی یو ایم ایس)

سرگرم اور فعال سماجی کارکن ہیں، شاہ محمود دواخانہ ہیں آپ کا مجرد فیضانِ کرم کا باعث ہے غریب اور مستحق مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر احتشام دانش (بی۔ ڈی۔ ایس) بڑے قابل معالج دندان ہیں، انتہائی مخلص شخص ہیں، سماجی اور تعلیمی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر عتیق دانش ایل سی ای ایچ ہیں لیکن کامیاب پریکٹس کرتے ہیں۔

مالیگاؤں میں ڈاکٹروں کی کثیر تعداد بی۔ یو۔ ایم۔ ایس اور ایل سی ای ایچ کی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سند یافتہ ہیں:

ڈاکٹر سلام سلطانی، ڈاکٹر خورشید صدیقی، ڈاکٹر ریاض احمد انصاری، ڈاکٹر مزمل ہاشمی، ڈاکٹر سعید انصاری (برادر ڈاکٹر خلیل احمد انصاری)، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، ڈاکٹر انیس رحمانی، ڈاکٹر لیاقت انصاری، ڈاکٹر مشتاق احمد انصاری یہ سارے علی گڑھ کے بی یو ایم ایس ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد یوسفی بھی اسی یونیورسٹی سے بی یو ایم ایس کرنے کے بعد برہانپور کے میڈیکل کالج میں پرنسپل رہ چکے ہیں۔ پھر پونہ میں بی۔ یو۔ ایم۔ ایس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

ڈاکٹر عبدالحمید ملک، ڈاکٹر عبدالغفار، ڈاکٹر جلال الدین، ڈاکٹر احتشام دانش، ڈاکٹر فاروق۔ ہر ایک اپنے اپنے علاقے کے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

بمبئی طبیہ کالج کے فارغ طلبہ وطالبات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر عتیق احمد انصاری، ڈاکٹر ابوالعرفان، ڈاکٹر خورشید عالم (لیکچرر پونہ کالج) اور ڈاکٹر ساجدہ انصاری، ڈاکٹر عشرت انصاری اور ڈاکٹر سعیدہ انصاری (ممتا ہاسپٹل) امراض نسواں کی تشخیص میں ملکہ رکھتی ہیں۔

بمبئی سے ایل سی ای ایچ (ہومیوپیتھی) میں طبی سند لینے والوں کی صفوں میں یہ ممتاز [illegible] نظر آتے ہیں:۔ ڈاکٹر افتخار احمد، ڈاکٹر اقبال فارانی، ڈاکٹر عبدالرشید صدیقی، [illegible] ڈاکٹر عبدالحمید انصاری، ڈاکٹر عمران انصاری، ڈاکٹر عتیق دانش، ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر عزیز انصاری، ڈاکٹر عبدالمالک، ڈاکٹر جاوید فارانی، ڈاکٹر شفیق احمد انصاری، ڈاکٹر طیبہ انصاری اور ڈاکٹر رضیہ انصاری (دختر اور زوجہ [illegible])۔

[illegible] کے ڈاکٹروں میں بی۔ ڈی ایس کی ڈگری لینے والے حضرات یہ ہیں۔

ڈاکٹر [illegible] انصاری اور ڈاکٹر احتشام دانش، ڈاکٹر عبدالحمید ملک، ڈاکٹر [illegible]۔ [illegible] مشہور سماجی ورکر کے صاحبزادے ڈاکٹر ظہیر شیخ اور ڈاکٹر رفیق شیخ (ایم۔ ڈی) وغیرہ اہالیانِ شہر کی طبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ادریس انصاری۔ ڈاکٹر [illegible] ہاشمی۔ ڈاکٹر سہیل صدیقی۔ مرحوم ڈاکٹر جمشید فردوسی۔ ڈاکٹر رفیق صدیقی ڈاکٹر سعید فیضی۔ ڈاکٹر منظور ایوبی۔ ڈاکٹر سلیم آصف مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی مقامی کمیٹی کے ممبر تھے۔

غیر برادری میں کئی کامیاب ڈاکٹر طبی خدمات انجام دے رہے ہیں ان میں ڈاکٹر محسن الدین شیخ (ایم بی بی ایس)، ڈاکٹر اقبال خان (ایم بی بی ایس)، ڈاکٹر عبداللطیف خان (ایل سی ای ایچ) اور ڈاکٹر مصطفیٰ چودھری (بی یو ایم ایس) نمایاں اور ممتاز حضرات ہیں۔

ع وطن سے دور بھی اجنبی دیار بھی

مالیگاؤں کی برادری بڑی فعال اور مہم جو ہے، اقبال کے اس شعر کے مصداق سہ

نفس ذری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے   قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

— طاقت پرواز رکھنے والوں کے لئے نہ انگلستان دور ہے اور نہ امریکہ۔ ایک پوری کھیپ ان ملکوں میں بسی ہوئی ہے۔ ممتاز ڈاکٹروں میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا اسم گرامی سب سے پہلے آتا ہے۔ آپ نے بمبئی کے جے جے ہسپتال سے پیتھولوجی میں ایم۔ ڈی کیا اور آج امریکہ میں سی شعبۂ تشخیص امراض کے ڈائرکٹر ہیں۔ ڈاکٹر محمد عمر بھی امریکہ میں طبی شعبے سے ملحق ہیں۔ امریکہ میں ڈاکٹر مختار احمد (ایم بی بی ایس) بھی بود و باش رکھتے ہیں آپ مالیگاؤں کے مشہور ادیب بشیر ادیب کے صاحبزادے ہیں۔

نیا پورہ کے سیٹھ عبدالعزیز (ڈلیوری) کے دو شاہین ڈاکٹر [illegible] لطیف شیخ (ایم۔ ایس) اور ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم (ایم۔ ایس) اپنی طاقت پرواز سے ایک نے امریکہ میں بحیثیت جنرل سرجن نشیمن بنالیا ہے اور دوسرے یعنی ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم نے [illegible] میں بسیرا کر لیا ہے۔ امریکہ جیسے سائنسی علوم و فنون میں ترقی یافتہ ملک میں ذرنا کیور میڈیکل اسکول سفر آبادی (مدنپورہ) کی طالبہ کا اپنی خداداد صلاحیتوں سے ایک اعلیٰ مقام بنالینا بذات خود ایک سائنسی و علمی معجزہ ہے۔ اگتپوری (ضلع ناسک) کے ایک [illegible] شریف انصاری گھرانے کی شمیم انصاری نے رام نارائن روئیا کالج سے بی۔ ایس۔ سی [illegible] کرنے کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے میتھمیٹیکل سائنس (علم ریاضی) میں ایم۔ ایس کیا اور [illegible] امیدواروں میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ پھر اسی علم سے متعلق شاخ "پروٹین" میں [illegible] شروع کی، اپنے شفیق اور ہمدرد استاد کی سفارش پر وظیفہ یاب ہو کر کیلی فورنیا (لاس اینجلز امریکہ) میں طالبعلم بن کر دس برسوں تک تحقیق کا سلسلہ قائم رکھ کر پرڈیو یونیورسٹی (انڈیانا پولس امریکہ) میں ڈاکٹریٹ کرنے والوں میں اوّل آئیں اور آج ڈاکٹر شمیم انصاری (ایم ایس سی پی ایچ ڈی)

علم الریاضی کی ایک قابل ترین شخصیت بن گئی ہیں اور سائنسی حلقے میں ایک اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔

دیگر شعبوں سے متعلق افراد خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں بھی موجود ہیں" عبدالحمید ازہری ریاض میں ایک ممتاز عہدے پر سرفراز ہیں۔ مولانا غلام رسول بھی سعودی عرب میں دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

وکلائے عدالت

مولوی شیخ عبدالعزیز ایڈوکیٹ (سابق ایم۔ ایل۔ سی) اس علاقے کے نامور وکیل، مومن کانفرنس کے رہنما اور سیاسی لیڈر تھے۔ ان کی شہرت ہندستان گیر تھی۔ شیخ محمد حسین جو بھیونڈی تک اُستاد وکیل کے نام سے مشہور تھے جج کی کرسی کو رونق بخشنے کے بعد پونہ کو رونق بخشی وہیں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ شیخ محمد حسین وکیل حکیم عبدالحمید فاروق (۱۸۷۶۔ ۱۹۴۲) کے صاحبزادے تھے۔ بڑے رائق اور قابلِ احترام شخص تھے۔

شمس الضحیٰ وکیل بھی برادری کے وکیلوں میں اولیت کا شرف رکھتے تھے بڑے کامیاب قانون داں تھے شہر کی مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔

شیخ شمس الہدیٰ آپ کے بیٹے نے قانون کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جج کے عہدے پر سرفراز تھے۔ لیکن مسند سے زیادہ وکالت پسند تھی اسی لیے پریکٹس شروع کی اور کامیاب وکیل بن گئے۔" ایڈوکیٹ شمس الہدیٰ اسکول بورڈ مالیگاؤں کے چیرمین بھی ہیں۔ حاجی شبیر احمد سیٹھ کے رفیق خاص ہیں، بڑے مخلص سیاسی تعلیمی اور سماجی ورکر ہیں۔ اسپننگ مل مالیگاؤں کے ڈائرکٹر شیخ عثمان ہائی اسکول کے چیرمین ہیں۔ شہر کی تعلیمی، صنعتی اور سماجی ترقیوں میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

یوسف الضحیٰ (مرحوم) ایک انتہائی مخلص اور سادہ مزاج انسان تھے۔ کم آمیز کم سخن انکم ٹیکس کے کامیاب وکیل تھے زندگی کا حساب جلدی جلدی بیباق کر کے روزِ حساب کے لیے دنیا چھوڑ گئے۔

مظفر عمری: مالیگاؤں کے کامیاب وکیلوں میں شمار ہوتا ہے۔

نہال احمد انصاری: نوجوان نسل کے کامیاب وکیل ہیں۔ انکم ٹیکس کے مشہور

وکیل ہیں۔ مشہور تعلیمی ورکر ہیں۔

جلیل احمد انصاری: اسی نسل کے ہیں اور کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں۔

جمیل احمد رحمانی: انکم ٹیکس کے وکیل ہیں اور کامیابی کی راہوں پر گامزن ہیں۔

نثار احمد رحمانی: انکم ٹیکس کے وکیل ہیں اور ڈاکٹر پیر محمد رحمانی کے بھائی ہیں۔

عبدالصمد انصاری: نوجوان وکیل ہیں۔

مسعود احمد انصاری: انکم ٹیکس کے وکیل ہیں۔ سینیٹری انسپکٹر مالیگاؤں بلدیہ صادق انصاری کے صاحبزادے ہیں۔

نیاز احمد لودھی: محمد امین عشرت مشہور سماجی ورکر کے صاحبزادے ہیں اور کامیاب وکیل بن کر ابھر رہے ہیں۔

انصاری شکیل احمد اور انصاری لئیق احمد، انصاری تحسین احمد، انصاری محمد یوسف، انصاری سلیم احمد اور انصاری انفال احمد سارے انصاری برادری کے نوجوان وکیل ہیں اور اہالیانِ شہر کو اپنی خدمات سے مستفیض کر رہے ہیں۔ وکلاء کی انجمن بھی تشکیل دی گئی ہے، شہر کے ہنگامی حالات میں ان کے قانونی مشورے اور رہنمائی بڑی مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

بتیسواں باب

مالیگاؤں۔ برادری کا گہوارۂ علم و دانش اور اقلیمِ سخن

قدامت کے لحاظ سے مالیگاؤں ایک جوان اور تہذیبی قدروقامت کے لحاظ سے ایک ذی شان شہر ہے اور یہ مسنصب برادری کی دین ہے۔ غدر کے پرآشوب دور میں مہاجرین پراگندہ روزی پراگندہ دل کی حالت میں آئے اور ڈیرا ڈال دیا، جگر لخت لخت کو جمع کیا جگر کاوی کی اور خاطر جمع ہوئے تو غمِ دنیا سے فرصت سر اٹھانے کی پائی۔ پھر پودا، بانی، تانی، رنگائی کی صنعت ہی کے ساتھ ساتھ علم و فن کی کمائی بھی کرنے لگے۔ تانا بانا سلجھانے لگے اور عروسِ سخن کے گیسوئے معانی کی مشاطگی کرنے لگے۔ میر و مومن اور ذوق و غالب کے کلام سے ان کے کان آشنا تھے اور انہیں بتلایا بھی گیا ہوگا کہ تیس سال پہلے شمالی ہند کے ایک عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب یہاں سمکیر میں اکیس روز تک ٹھہرے تھے جب وہ سنہ ۱۸۲۹ء میں پنشن کی بازیافت کی مہم میں سرکار بہادر کے سنگِ آستاں پر سر پھوڑ کر ناکام و نامراد دہلی لوٹے تھے اور پھر نظام حیدرآباد کی چوکھٹ پر اور بمبئی کے گورنر سرجان مالکم کے آستانے پر جبہ فرسائی کے لیے پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے، لیگاؤں آئے تو گویا ان کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے یہاں ایک دبستانِ شاعری کھل گیا اور سینکڑوں شاعروں کو شعر گوئی کی سعادت اور غزل سرائی کی طاقت نصیب ہوئی ــ بہرحال فنِ شاعری تو ایک وہبی استعداد اور صلاحیت ہے، اور یہ آخرالعلوم ہے اس زمانے میں یہاں کے سارے اردو داں باشندے دکن اور کچھ شمالی ہند کے تھے مومنوں کا پتہ نہ تھا۔

یہی زمانہ ہوگا کہ شعر و سخن کا چرچا عام ہوا ہوگا دکن کے باشندے کچھ ایسے بدمذاق بھی نہ تھے کہ اپنے اجداد کی زبانی صوفیائے کرام کا کلام نہ سنا ہوگا، ملا محمد نصرتی (متوفی ۱۶۸۴) کی مثنوی گلشنِ عشق سے گھیپی نہ کی ہو ــ مالیگاؤں سے قریب اورنگ آباد میں "بابائے ریختہ" اور آدم اردو، شمس الدین ولی اللہ دکنی کا طوطی

سترہویں صدی سے بول رہا تھا جس کی گونج مالیگاؤں میں بھی سنائی دیتی رہی۔ سراج الدین
سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۳-۱۷۶۳ء) نے ایوانِ سخن میں جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی
یہاں تک پہنچ چکی تھی اور جب شمالی ہند اور یوپی کے دبستانوں کے مستفیضان یہاں آباد ہوئے،
تو عروسِ شاعری کے خدوخال ابھرنے لگے، اس کے رخساروں پر تشبیہات و استعارات
کا غازہ ملا گیا، شعری صنعتوں سے آراستہ کیا گیا اور حجلۂ عروسی میں بٹھا دیا گیا۔ ادبی دنگل
شروع ہو گئے۔ یہ دنگل محرم کے مہینے میں عام تھے، اور مالیگاؤں میں چار مقامات پر ہوتے
تھے (۱) اکھن سیٹھ شمشاد تنبولی (سپائی بازار) (۲) قمر تنبولی۔ (اقبال روڈ چراغ العلوم (کذا)
کے پاس) (۳) تاجن سیٹھ (بیلباغ) اور کیمپ (لشکر)۔ یہ دنگل ایک طرح سے شعری
مقابلے تھے اور فی البدیہہ شعر کہنے کا امتحان ہوتا تھا۔ حفیظ مالیگانوی بیان کرتے ہیں۔

> "دستور یہ تھا کہ کسی بھی شاہراہ پر آمنے سامنے تخت پر بیٹھ کر کوئی فرش عماں بار موہم
> اور طبلے کر کسی شاعر کے یا خود اپنے شعر امام عالی مقام (حسین علیہ السلام) کی شان
> میں جب شروع کرتا تو اسی زمین اور اسی بحر میں دوسری طرف سے اس کا جواب دیا جاتا۔"

ایک دوسرے کو زچ کرنے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں اشعار پڑھے جاتے تاکہ باہمی
مسابقت میں برتری حاصل کریں، شعری دنگلوں کا طریقہ یہ تھا کہ کسی شاہراہ پر ایک شامیانہ
لگایا جاتا اور قندیلوں سے اسے بقعۂ نور بنا دیا جاتا۔ اور پھر قوال اور شعرا اپنے زمرہ کے ساتھ
آمنے سامنے تخت پر بیٹھ جاتے اور سوال و جواب کا سلسلہ آخرِ شب تک جاری رہتا ۔۔۔ اور
جب خمخانۂ ادب میں ڈھلے ہوئے بادۂ شبانہ کی سرمستیاں زائل ہونے لگتیں اور نشہ ٹوٹنے
لگتا تو یارانِ محفل یہ کہہ کر اٹھتے، بس کہ لذتِ خوابِ سحر گئی۔ تحسین و آفرین کے مقابلے
بٹور کر رخصت ہو جاتے جیتنے والے کو ایک ریشمی صافہ اور زرِ نقد انعام دیا جاتا۔

یہ شعری دنگل عرب الجاہلیہ میں عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں ہونے والے
محفل مشاعرہ کی یاد دلاتے ہیں، مجنّہ باہمی مسابقت اور ہمسری جتانے کے لیے شعرا بہت
پہلے سے اور بڑا ریاض کر کے تیاری کرتے تھے، معلقات کی بنیاد انہیں میلوں کے
مشاعروں پر پڑی تھی۔

محفل میلاد بھی اسی طرح کا ایک فی البدیہہ نعتیہ اور مذہبی شاعری کا دنگل ہوا کرتا تھا،
مالیگاؤں کے پہلے نعت گو شاعر منشی محمد شعبان (۱۸۷۰-۱۹۲۹ء) تھے۔ دادا میاں عطا

(۱۸۶۴-۱۹۶۴) منشی جی کے بڑے چہیتے شاگرد تھے۔

رنگارنگ بزم آرائیاں

مالیگاؤں میں بزم شعر و سخن کی محفلیں سب سے پہلے قدیم مدرسہ بیت العلوم میں سجتی تھیں یہیں سے باقاعدہ مشاعروں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا عبداللہ ان محفلوں کے بزم آرا اور بزم افروز ہوا کرتے تھے۔ آپ اصلاح شعر بھی کرتے تھے' ان مشاعروں میں دورِ اول کے تمام متقدمین شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ ملا مولانا عبدالرحمن اثر (۱۸۸۳ء — ۱۹۱۷) ان مشاعروں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے۔ شعر و سخن کی ان محفلوں کے سبب مبتدی شعرا کی فکری و ذہنی تربیت ہونے لگی، شعر فہمی اور ذوقِ شعری کا ملکہ پیدا ہونے لگا اور جب شعری مذاق عام ہوا تو بر سر عام مشاعرے ہونے لگے غالباً ۱۹۰۹ء میں مالیگاؤں کا پہلا عظیم الشان مشاعرہ گہوارہ مسجد (نورانی) کے پاس مولانا عبدالرحمن اثر کی صدارت میں منعقد ہوا، اس سے دو سال پہلے بندھو تھیٹریکل کمپنی کے ہال میں جو طرحی مشاعرہ ہوا اس کی صدارت آپ ہی نے فرمائی تھی مصرعہ طرح تھا ؎ شکایتیں دل سے ہو رہی ہیں مزے محبت کے آرہے ہیں۔

۱۳۳۱ھ میں راڈیا دواخانہ مالیگاؤں کے اسسٹنٹ سرجن ڈاکٹر شمس الدین محمدی کو جب بمقام گودھرا سول سرجن کے عہدے پر ترقی ملی تو ان کے اعزاز میں ایک تہنیتی والوداعی جلسہ اور مشاعرہ ترتیب دیا گیا اس مشاعرے کا مصرعہ طرح تھا ؎ ہم کبھی جھوٹ نہ بولیں گے مسلماں ہو کر۔

اس مشاعرے میں مالیگاؤں کے بہت سے شاعروں نے اپنا کلام سنایا، مولانا عزیز اور مولانا عبدالرحمن اثر کے کلام کو سب سے زیادہ داد و تحسین ملی تھی۔ ڈاکٹر محمدی کو بھی شاعری کا ذوق تھا اور شاکر تخلص کرتے تھے۔

وقت کی لہروں کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا چرچا چڑھتا رہا اور بڑے خوش فکر اور قادر الکلام شاعروں کی کہکشاں سپہر ادب پر جگمگانے لگی اور "ہزار انجم" دکنے لگے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ ماہانہ، ہفتہ واری اور ریڈیائی مشاعروں کے ساتھ ساتھ نئی نئی انجمنیں بننے لگیں اور محفلیں سجنے لگیں۔ حضرت عارج مالیگانوی نے جو بمبئی کے ماہانہ رسالہ

ترقی سخن کے طرحی مشاعروں میں چھپتے تھے اسی نام سے ایک ادبی انجمن کی بنا رڈالی، اسی کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک طرحی مشاعرہ ہونے لگا، ترقی سخن کے یہ مشاعرے چونابھٹی میں معزی خان کے محل پر ہر ماہ ہوتے تھے جن میں محمد ابراہیم خلیل (۱۸۷۰-۱۹۲۸) اور نیاپورہ اور اسلام پورہ کے شعراء نے جن میں حضرت ادیب، حافظ عبدالستار بینا منشی ولی اللہ ثاقب (۱۸۷۴-۱۹۲۹) عبدالکریم استاد اور وقار حیدری پیش پیش تھے بزم سخن کی بنیاد ڈالی۔ ثاقب صاحب اس کے صدر تھے۔ ادیب مالیگانوی نے کچھ دنوں بعد اختلاف کی بنا پر بزم سخن سے علاحدگی اختیار کرلی ایک دوسری ادبی انجمن قصرالادب کی داغ بیل ڈالی۔

سنہ ۱۹۰۳ء میں اردو لائبریری کے قیام کے بعد یہاں بھی ادبی محفلیں سجنے لگیں اور مشاعرے منعقد ہونے لگے، جن میں مولانا عبدالرحمن آرزو، منشی محمد جوہر، منشی محمد اسمٰعیل شرر، منشی امیر احمد، محمد صدیق ناطق اور مولانا محمد یوسف عزیز وغیرہ شریک ہوا کرتے تھے مولانا کا رشد تلامذہ میں شوق، تسلیم، اوج، احسن، کوثر، وقار، سہیل انصاری اور نصیر کے اسمار گرامی قابل ذکر ہیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں مولانا کے تلامذہ نے ایک ادبی ادارہ بزم عزیزی کے نام سے قائم کیا اور شعر و ادب کا ایک گلدستہ بہار کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ مدرسہ بیت العلوم کے فارغ التحصیل طلبہ اور چند شعراء کے تعاون سے نکالا گیا تھا۔ محمد ابراہیم خلیل کے مفید مشوروں سے رسالۂ بہار کی بہار آفریں عروج پر آگئی۔ اور دور دور تک اس کی مہک پھیلتی گئی۔ مولانا یوسف نے مالیگاؤں کے قصر ادب اور ایوان سخن میں جو شمعیں روشن کیں ان کا اجالا برسوں تک ضوفشانی کرتا رہا اور سینکڑوں شاعر کسب نور کرتے رہے۔ بیرونی شعراء کی آمد و رفت اور مشاعروں میں ان کی شرکت نے استادی و شاگردی کے سلسلے کو فروغ دیا۔ تجمل جلال پوری کے شاگردوں میں منشی نبی بخش تسلیم اور منشی عبدالکریم خادم بہت ممتاز تھے، یکتا مرزاپوری اور ملک کے مشاہیر شعراء مثلاً علامہ محوی لکھنوی، نوح ناروی، احسان دانش، روش صدیقی، ماہر القادری، ساغر نظامی ادیب سہارنپوری، شعری بھوپالی وغیرہ یہاں کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے، اصلاح کلام مراسلت کے ذریعے کی جاتی تھی۔

سخنورانِ مالیگاؤں

اس شہر کی ادبی تاریخ تارکینِ وطن کی آمد سے شروع ہوتی ہے

۱۸۹۰ء سے[1] یہاں شعر و ادب کے بکھرے ہوئے موتی مرجان ملتے ہیں، علم و ادب کے مخزن خزانوں میں منشی عبدالکریم خادم (۱۸۳۰ - ۱۹۱۰) کے دیوان کا پتہ چلتا ہے، مئو اعظم گڑھ آبائی وطن اور جائے پیدائش تھی۔

منشی عبدالکریم خادم

عربی فارسی اور اردو کے عالم تھے اسی لئے منشی کہلاتے تھے۔ بمبئی میں مطبع کریمی میں ملازم تھے۔ یہیں مشہور استاد شاعر حضرت تجمل جلال پوری بھی منشی کے عہدے پر سرفراز تھے جمالِ ہمنشیں کا یہ اثر ہوا کہ خادم صاحب تجمل جلال پوری کے حسنِ اصلاح کے گرویدہ ہو کر شاگرد بن گئے۔ تجمل جلالپوری نے نسخۂ ہلالِ عید، جس کا دوسرا تاریخی نام تھا "مجموعۂ نجم الضیاء جدید" کے انتخابی مجموعہ میں جو دس جلدوں پر مشتمل تھا اپنے شاگردوں کا منتخب کلام شامل کیا ہے۔ بمبئی کے ادبی گلدستوں میں مثلاً "ترقی سخن" اور "تصویر یار" میں خادم کا طرحی کلام شائع ہوتا تھا۔ خادم کا لہجہ روایتی شاعری سے الگ تھا اور منفرد حیثیت رکھتا تھا، ابتذال اور رکاکت سے مضمون ومبرا تھا لیکن عشق و محبت کے پاکیزہ جذبات سے یکسر معریٰ نہ تھا۔

وہ وقتِ نزع جو بیٹھے ہیں میری بالیں پر　　کھڑی ہے دور ادب سے قضا نہیں آتی

منشی خادم مالیگاؤں کے پہلے استاد شاعر ہیں اور مندرجہ ذیل ممتاز شعراء کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ منشی عبدالوہاب طالب۔ منشی ولی اللہ ثاقب اور منشی عبدالغفور خنداں۔ منشی خادم کے وارثین میں ہفت روزہ "ڈسپلن" کے مالک و مدیر محمد امین نور ادبی رشتے میں آپ کے پوتے ہیں۔ منصور مقادم اور امین چودھری آپ کے وارثین میں سے ہیں۔

منشی عبدالغفور خنداں (۱۸۴۵ء - ۱۹۲۹)

آبائی وطن و جائے پیدائش یو۔پی ہے۔ غدر کے ہنگاموں نے دربدر کیا، مالیگاؤں دوسرا وطن بنا۔ پارچہ بافی کا فن ذریعہ معاش بنا اور مالیگاؤں ہی مدفن بنا۔ کلام بڑا زوردار ہوتا تھا اور بڑے جوش و خروش سے مشاعروں میں پڑھتے تھے، جب غزل چھیڑتے تو عمر رفتہ کو گویا

---

[1] ہم نے اس حصے کے لئے "حفیظ، ہنگاری" کے نقوش اور اداروں کے سفر کے علاوہ دیگر مراجع سے رجوع کیا ہے۔ نقوش رکن دسمبر ۱۹۶۲ء میں محترم امین ... صاحب کا مضمون، مالیگاؤں کی شعری و ادبی خدمات بھی پیشِ نظر رہے۔

آواز دیتے۔ ایک ایک حرف کی پرجوش ادائیگی، لہجہ کا اتار چڑھاؤ، اشعار کی خوبصورتی، گرجدار آواز اور ڈرامائی انداز" سے سماں بندھ جاتا۔ آخری عمر میں عسرت و ناداری نے گوشہ نشین بنا دیا پھر محبان ادب کو احساس ہوا، جشنِ خنداں منایا گیا اور ان کی کفالت کے لیے کیسہ زر عطا کیا گیا، ادیب مالیگانوی نے ایک معرکۃ الآرا نظم سنائی جو یادگار ثابت ہوئی۔ طویل عمر پائی مگر یاسیت و قنوطیت، عسرت و نکبت کے بوجھ سے کمند عمر ٹوٹتی چلی گئی تھی اک موج تھی سراب کی آئی گذر گئی۔ آپ کے ممتاز شاگردوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں: محمد حسین سالک محمد ابراہیم شاد، گوہر علی ضمن، محمد یٰسین خورشید، حافظ غلام دستگیر دستگیر، شمس الضحیٰ شمس اور بدر الدجیٰ غضبان۔ مؤخر الذکر دونوں آپ کے صاحبزادے تھے۔ منشی خنداں تجمل جلال پوری کے شاگرد اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں ان کے مرید تھے۔

منشی امداد اللہ مدعا

۱۸۹۵ء میں یو۔پی سے آئے سمکیسر میں بس گئے، سوت اور اس کی رنگائی کا کاروبار شروع کیا پھر ہینڈ لوم کا ایک کارخانہ قائم کر لیا اور مزدوروں کے سیٹھ بن گئے دولت جمع نہ کی بلکہ انشراح سے لٹاتے رہے، ۱۹۱۶ء میں سات بھائیوں کے نام سے "ٹورنگ" (ہوٹل) کھولی جو عوام و خواص کی آماجگاہ اور شہر کے تمام شعراء کا مرکز شعر و ادب بن گئی۔ مدعا صاحب کے استاد حافظ مراد، ثاقب، طالب اور دوسرے سخنوران شہر چائے نوشی کرتے اور شعر گوئی فرماتے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح حافظ کی زبان میں یہ شعر پڑھتے ؎

درین زمانہ رفیقی کہ خالی از خلل است

صراحی مئے ناب و سفینۂ غزل ست (حافظ شیرازی)

منشی مدعا تحریک خلافت سے وابستہ تھے، حفیظ مالیگانوی ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حضرت مدعا کے کلام میں روانی، سادگی اور عشقیہ واردات ہی نہیں رنگِ تغزل کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں، خاص بات یہ ہے کہ اکثر اشعار سہل ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں" [1]

---

[1] نقوش ص ۱۳۹

آپ عموماً مختصر بحروں میں اور آسان زمینوں میں غزلیں کہتے تھے، رسائل میں کلام چھپتا تھا جن میں افتخار سخن (مالیگاؤں)، تصویر یار اور رسالۂ بہار مالیگاؤں کے نام ملتے ہیں۔ چند اشعار مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمائیں ؎

هم ترا نام لیا کرتے ہیں ‏ درد کی اپنی دوا کرتے ہیں
دیر یا کعبے میں کہیے تو سہی ‏ کس جگہ آپ رہا کرتے ہیں

منشی الٰہی بخش تسلیم (۱۸۷۶-۱۹۰۴)

مؤ اعظم گڈھ سے آئے، مدرسہ بیت العلوم میں مولانا عبداللہ کے زیر تربیت و تعلیم رہے، عالم بن کر نکلے شاعر بن کر شہرت حاصل کی

تجمل جلالپوری کے شاگرد تھے 'افتخارِ سخن' مالیگاؤں میں باقاعدگی سے آپ کا کلام چھپتا تھا اور چند اشعار کا انتخاب یہ ہے ؎

بے نقاب اک روز آ کر یہ تماشہ کیجیے ‏ حسنِ یوسف کو سرِ بازار رسوا کیجیے
بارہا دیکھا ہے ہم نے غیر سے ملتے ہو ‏ آپ کھاتے ہیں قسم سو بار کھایا کیجیے
جب تک میں شادماں تھا تو گھیرے تھے آشنا ‏ اب غم میں ہوں تو کوئی مرا ہمنشیں نہیں

حافظ محمد مراد (۱۸۶۰-۱۹۲۸)

حافظ جی بڑے جامع اوصاف تھے شعر و سخن، سماع و موسیقی، تجوید و قرأت، امامت و خطابت، ہونگ ہر فن میں حاذق تھے اور کیا نہیں آتا تھا۔ ان کا کلام رسالہ 'خورشید (میرٹھ)'، جلوۂ یار (میرٹھ) اور بمبئی کے موقر اور مقبول رسالہ ترقی سخن میں شائع ہوتا تھا۔ شعر و موسیقی لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی حقیقت کے دو مختلف جلوے ہیں۔ فنون لطیفہ میں موسیقی ایک بہترین فن ہے۔ اسی طرح کی شاعری ایک فنِ لطیف ہے۔ جب دونوں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو سرگم اور شعر "مجمع البحرین" بن کر احساسات اور جذبات میں طوفان اٹھاتے ہیں خو تو حنا بستی در سن معنی رنگین بستم

حافظ مراد کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا اور ملکمیر کی شعری فضا جہاں درجن بھر سے

زیادہ شاعر مشقِ سخن کرتے تھے آپ کے دم قدم سے لالہ زارِ سخن بنی ہوئی تھی آپ کے زمرۂ ارشد تلامذہ میں یہ نام ملتے ہیں: مولانا شاہ محمد اسحق مقصد، منشی مدار اللہ مدعا، محمد سلیمان رونق، محمد عمر نادل، محمد عمر جذب، منشی قدرت اللہ سوز اور حافظ عبد الستار بینا۔ آپ کے پوتے مشتاق حسین جو حافظ احمد اللہ کے لڑکے ہیں، شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے اور مشاعروں میں اپنا کلام سناتے تھے۔

مولانا محمد اسحق مقصد (۱۲۹۶-۱۳۴۶)

مولانا کی پہلو دار شخصیت کا ایک اہم وصف ان کا فن و ذوقِ شعر گوئی ہے۔ حافظ مراد اپنے پھوپھا سے اصلاح لیتے تھے، مبادیاتِ شعر اور علم عروض سے واقفیت تھی۔ صنائع و بدائع پر قدرت تھی، رسالہ ترقی سخن (بمبئی)، گلدستہ مدراس اور معیار سخن میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ صرف ایک شاگرد مولوی محمد اسماعیل بشر کا پتہ چلتا ہے اور چند اشعار کا، کلام پر تصوف کا اثر غالب تھا۔

منشی محمد شعبان (۱۸۷۰-۱۹۲۹)

"لیگاؤں کے سب سے پہلے نعت گو شاعر تھے" آپ کا مذہبی کلام حالی کے اسلامی اثر کا پیش خیمہ تھا، خود بھی دیندار تھے اور سلف صالحین کا نمونہ عموماً محفلِ میلاد میں آپ ہی کا نعتیہ کلام پڑھا جاتا تھا، اس عہد کے میلاد خوانوں میں ان کے ہم نام شعبان اور ان کے لڑکے عبد الحنان میلادی، منشی محمد بشیر بشیر وغیرہ بڑے مشہور تھے۔ ان کا میلادی کلام، ایک خاص صنفِ سخن کی مثال تھا مثال کے طور پر ٹیپ کا بند "ہے محفلِ میلاد" ملاحظہ فرمائیں۔

اے مومنو ہم وصفِ نبی کرتے ہیں ارشاد ـــ ہے محفلِ میلاد
جو لوگ یہاں پر ہیں رہیں خرم و دلشاد ـــ ہے محفلِ میلاد

منشی شعبان محرم کے دنگوں کے لئے مرثیہ بھی لکھتے تھے، آپ کا مجموعۂ کلام آپ کے شاگرد حکیم عبد المجید احسان کے پاس محفوظ تھا۔ دوسرے شاگرد تھے منشی محمد زادان اور منشی خرمان۔

منشی محمد ابراہیم خلیل (۱۸۷۰ - ۱۹۲۶ء)

سلطانپور سے ان کا خاندان ہجرت کر کے آیا تھا۔ اپنے نام ابراہیم کی پیغمبرانہ نسبت سے خلیل تخلص اپنایا، اس وقت کے جلیل القدر شاعر نظامی جبلپوری کے شاگرد بنے، گو خود بھی مداحوں اور شعراء کرام کے مرجع تھے، مولانا محمد یوسف سے تعلقات بڑے گہرے تھے، مسائل علمیہ شاعرانہ نکات اور ادبی موشگافیوں کی گرہیں اپنے ناخن علم و دانش سے ایسی آسانی سے کھولتے کہ مولانا یوسف بھی قائل ہو جاتے۔ علمی اعتبار سے اور شعری فن و منصب کے لحاظ سے محمد ابراہیم خلیل کا مرتبہ معاصرین میں بڑا بلند تھا، شہرت بھی دور دور تک تھی ۱۹۱۲ء میں ہجرت کر کے ایگاؤں آئے محلہ اسلام پورہ کے ایک کان میں ہینڈلوم چلاتے تھے۔ رسالہ بہار میں خزان خلیل کے عنوان سے آپ کی ایک خوبصورت غزل چھپی تھی جس کا ایک چھپتا ہوا شعر یہ تھا سہ

میں نے جو کہا دیکھیے حالِ دلِ بیتاب ۔۔۔ منہ پھیر کے ظالم نے کہا دیکھ رہے ہیں

سی طرح غزل کے اس شعر میں مرزا قتیل دہلوی کا رنگ جھلکتا ہے۔

خونِ قتیل بہ سر دپا را بدست خویش ۔۔۔ مالیدہ آں نگار و حنا را بہانہ ساخت

خلیل: سے خوں ل کے مرا ہاتھ میں دھوتے ہیں رگڑ کر ۔۔۔ وہ پختگی رنگِ حنا دیکھ رہے ہیں

محمد ابراہیم خلیل مصری خان کے محل (چونا بھٹی) میں ہونے والے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت فرماتے اور اپنا کلام سناتے تھے۔

> "۔۔ ت سادے موضوعوں، رنگوں اور سرد و گرم ہواؤں سے ہوتی ہوئی حضرت خلیل کی شاعری اس مقام تک پہنچ گئی جہاں مروجہ شاعری کے اسالیب دم بخود نظر آتے تھے۔" [1]

مولوی عبدالمجید مجید (۱۸۸۵ - ۱۹۵۹ء)

آپ کا ذکر ہو چکا ہے، روایتی اسلوب اور لہجہ تھا، لیکن کلام ندرت اور تازہ بتازہ نو بہ نو مضامین سے یکسر تہی دامن نہ تھا، بیت العلوم کی شعری مجلسوں نے ذوق کو ابھارا اور مشاعروں کی صدارت نے آپ کو بھی استادی کا منصب دے دیا۔

---

[1] نقوش، ص ۱۱۰

منشی عظیم اللہ مدّاح (۱۸۷۰-۱۹۳۰)

مولانا عبداللہ کے ارشد تلامذہ میں منشی عظیم اللہ مدّاح کا نام بجد نمایاں تھا، انہیں کے زیر تربیت شعر و ادب اور علم و فن میں ترقی حاصل کی۔ ذہن مذہبی تھا اور فکر دینی، نعتیہ کلام کہتے تھے، خیالات کی بلند پروازی، پاکیزگی مضامین اور محبوبِ خدا سے عشق حقیقی کا دلگداز اظہار، سوز و گداز اور اضطرابِ پیہم سے آپ کا کلام معمور اور سرشار ہے، ترقی سخن کی محفلوں میں بھی طرحی کلام پڑھتے تھے۔

حسینانِ جہاں میں وہ نظر آیا حسیں ہم کو   جسے کہتے پڑا محبوب رب العالمیں ہم کو

منشی عبدالوہاب طالب (۱۸۷۲-۱۹۳۲)

منشی طالب کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی اور شاعری پُربہار تھی۔ فنِ شاعری کے ہر پہلو کا درک رکھتے تھے خصوصاً علم عروض پر گہری نظر تھی معائب و محاسن شعری پر جو عالمانہ بحثیں ان کے وقت میں مختلف گلدستوں میں شائع ہوتی تھیں ان کے نتیجے میں عارج مالیگانوی نے معیارِ سخن کا اجرار کیا اور حضرت طالب کو انتخابِ سخن جاری کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ آپ حضرت خادم کے شاگرد تھے خود طالب کا بھی ایک حلقۂ تلامذہ تھا جن میں محمد اسماعیل اختر (اسلام پورہ)، نجیب اللہ ہنر (قلعہ)، نذیر احمد باہر (دستگیر)، محمد حسین عادل (اسلام پورہ)، ناصر صاحب (دیلیاغ) اور محمد انور (قلعہ) کے اسمارگرامی قابل ذکر ہیں۔ شاگردی کا حلقہ بھیونڈی تک پھیلا ہوا تھا جہاں منشی محمد ایوب صابر، منشی عبدالرشید رشید اور دیگر شعرا آپ سے بذریعۂ مراسلت یا بمبئی جاکر استفادہ کرتے تھے طالب کی شاعری پر قدما کا رنگ چڑھا ہوا ہے

اگر تو مائل رفتار دم بھر فتنہ پرور ہو   یقیں ہے کل کے بدلے آج ہی شورِ محشر ہو

آپ کے ایک صاحبزادے افتخار احمد بھی شاعر تھے۔ طالب صاحب بینڈلوم کے رتھ بھر کرتے تھے بس یہی وسیلۂ معاش تھا، بمبئی میں انتقال کیا، وہ وہیں دفن ہوئے۔

منشی ولی اللہ ثاقب (۱۸۷۴-۱۹۳۹)

ولی اللہ ثاقب اور ان کے بھائی صفی اللہ صفی والدین کے ساتھ سیونت (الہ آباد) سے

آکر سکیسر میں بس گئے، حضرت خادم کی صحبتوں میں رہ کر ذوق شعری میں نکھار آیا، بزم سخن
اسلام پورہ کے صدر تھے اور آپ کے وقت میں انجمن کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، ان
کے دور میں حضرت ریب اور حضرت وقار حیدری قابل ذکر ہیں۔ حضرت ثاقب سے استفادہ
کرنے والوں میں یہ حضرات نمایاں تھے، محمد اسماعیل رفیق، عبدالخالق خلیق، تاج خان
جمیل، عبدالخالق برق، محمد صدیق جانباز اور رمضان اسیر۔ ثاقب صاحب کے صاحبزادے ریاض
احمد رہ حق کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں ترنم سے سیاسی نظمیں پڑھ کرتے تھے۔

منشی عباد اللہ صفدر (۱۸۷۵-۱۹۳۶)

بڑے سخن فہم و سخن شناس شاعر اور شاعر دوست شخص تھے، فارسی میں بھی شعر گوئی
کرتے تھے، ارباب ذوق میں بڑے محترم تھے۔ آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے خوش الحانی
سے اذان دیکر اذان دینے کا وجد آفریں طریقہ بتلایا، جب سے مالیگاؤں کی مسجدوں میں اذان
کا اور ترحیم کا رواج ہوگیا[1]۔ آپ کا آبائی وطن مبارک پور تھا، جب غدر کے بعد واپس آئے تو
مصری خان کے باڑہ میں فروکش ہوئے یہیں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی اس دور کے استاد
شاعر محمد امیر تیر کی شاگردی اختیار کی، عاشقانہ اشعار کے علاوہ آپ نے عارفانہ اور حکیمانہ
اشعار بھی لکھے ہیں۔ عبداللطیف لطیف نام کے ایک گمنام شاعر آپ کے شاگرد تھے۔
آپ کے فرزندوں میں محمد نذیر عرف بابے حضرت اور ماسٹر زین العابدین عابد اور پوتے
ماسٹر شبیر نے منشی صاحب کے خانوادہ کے نام کو روشن رکھا ہے۔ نمونہ کلام:

دشت وحشت سے جو خبر مغیلاں نے لیا ‏ ‏ ‏ ‏ ایک باقی جو کہیں تار گریباں دیکھا

حکیم عبدالحمید فاروقی (۱۸۷۶-۱۹۴۲)

مالیگاؤں کے مشہور فاروقی خاندان کے بانی اور جد اعلیٰ تھے، مدرسہ بیت العلوم کے شاعروں
میں شرکت کرتے تھے اور قومی و ملی بیداری اور پاکیزہ جذبات ابھارنے والے اشعار کہتے تھے،

---

[1] سحری کی اذان سے پہلے مختلف کلمات اور دعائیں ایک خاص لحن میں دہرائے جاتے ہیں اسے ترحیم کہتے ہیں۔ اذان دینے
کی یہ رسم پچھلے ساڑھے چار سو برس سے جاری تھی۔ ملا علی قاری نے اسے بدع و محدثات میں شمار کیا تھا۔

غزل گوئی سے حذر فرماتے تھے، مسدس حالی سے لگاؤ تھا قوم کے لئے جو درد اور کسک رکھتے تھے ان کا اظہار شاعری میں کرتے تھے۔ ایک عرصے تک کامٹی میں مقیم رہے۔

مسلمان غفلت میں جب تک رہیں گے ہمیشہ ستم ہائے دنیا سہیں گے
ہر اک حال میں حق کے شاہد بنو مسلمان ہو تو مجاہد بنو

مولانا عبداللہ کامل

مولانا عبداللہ ابن لعل محمد، پورہ معروف کے باشندے تھے، آپ کا احسانِ عظیم یہ ہے کہ سب سے پہلا 'بابِ علم' آپ ہی نے اس شہر میں کھولا۔ مولانا موصوف عربی و فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، آپ کی ذات بابرکات سے مالیگاؤں میں عروسِ سخن نے آنکھیں کھولیں اور بولنا سیکھا۔

منشی محمد جوہر (۱۸۸۲ - ۱۹۳۵)

تحریک خلافت کے سرگرم مجاہدین میں منشی جوہر پیش پیش رہے تھے۔ عدالت نے آپ کو تین سال کی قید با مشقت دی تھی اور سرکاری ملازمت سے برطرف کر دیا تھا آپ اس وقت پوسٹمین تھے۔ والد ماجد کا نام لعل محمد تھا اور آبائی وطن ضلع اعظم گڈھ تھا۔ رشتہ میں حضرت قمر کے برادر بزرگ تھے۔ جذبۂ جہاد، آزادی سے سرشار تھے اسی لئے، قومی نظمیں کہتے تھے، میلاد شریف میں آپ کا نعتیہ کلام بھی پڑھا جاتا تھا، اس صنفِ سخن میں آپ کے اسلوب کو تفرد حاصل تھا۔ نمونۂ کلام:

خدا نے چاہا تو اک دن یہ کام کر لیں گے جو بادشاہ ہیں ان کو غلام کر لیں گے
خلافت میں جو کوشش صاحب ایمان کرتے ہیں جنت الفردوس کا سامان کرتے ہیں

مولانا عبدالرحمٰن اثر (۱۸۸۲ - ۱۹۰۷)

مولانا اور مُلّا اثر۔ مالیگاؤں کی با اثر شخصیتوں میں سے تھے، وعظ و تذکیر، طبابت و حکمت، شاعری و ادب۔ ہر فن میں طاق تھے۔ مالیگاؤں میں پہلا عظیم الشان مشاعرہ جو ۱۹۰۹ء میں

نورانی مسجد کے پاس ہوا تھا آپ ہی کی صدارت میں ہوا تھا، اکثر مشاعروں کی صدارت کا شرف آپ ہی کو ملتا تھا، مدرسہ بیت العلوم کے اولین مشاعروں میں آپ کی شرکت سے جان پڑ جاتی تھی۔ نمونۂ کلام:

ماہ کامل کا نکلنا ابر سے آیا نظر | چہرۂ انور سے جب وہ زلف سرکانے لگے
چمن دہر میں گل کوئی کھلا چاہتا ہے | شوق فشاں ہو مرا پھر دیدۂ تر ہوتا ہے

مولوی عبدالرحیم کوثر (۱۸۹۲-۱۹۳۹)

مدرسہ بیت العلوم کی علمی فضا اور شاعرانہ ماحول میں پرورش ہوئی، شاعری کا رجحان زمانۂ طالبعلمی میں پیدا ہوا، بیت العلوم کے مشاعروں نے جلا بخشی، نعتیں اور غزلیں خوب کہتے تھے۔ دبستان لکھنؤ سے متأثر تھے۔

مکاں کے ساتھ مکیں پر بھی آفت آتی ہے | جو دل پسا ہے تو حسرت بھی پس گئی ہوگی

دورِ اول کے شعرائے کرام کے معاصرین میں اور بہت سارے سخنوران کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔

حکیم عبدالمجید احسان (طیب بھیا) (متوفی ۲۰ دسمبر ۱۹۴۴ء): تحریک خلافت کے سرگرم رکن تھے۔ اور خلافت کمیٹی کے صدر رہے۔ آپ کو خلافتی فساد کے مقدمہ میں حبس دوام جبور دریائے شور کی سزا ملی تھی مگر جو اپیل پر منسوخ ہوگئی۔ محرم کے دنگل میں آپ اپنے استاد منشی شعبان کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر مقابلۂ شاعری میں حصہ لیتے تھے۔ آپ کے ایک اور ساتھی شاعر داؤد خان بھی تھے۔ احسان بڑے قادر الکلام شاعر تھے انہوں نے "دوہے" بھی لکھے ہیں۔

جبار نشتر (۱۸۶۴-۱۹۲۷) بھیکن شاہ کے عرس کے بانی تھے۔

منشی محمد شعبان تحسین (شہید وطن) (۱۸۹۹-۱۹۲۲) جذبۂ آزادی سے سرشار تھے۔ ور جذبۂ حریت سے معمور شعر کہتے تھے ؎

مٹا سکیں تو مٹائیں ہمیں جب ان والے | ہمالیہ کی بلندی پہ ہے نشاں میرا

تختۂ دار پہ بھی آپ نے شاعری کا دامن نہیں چھوڑا۔

منشی عبدالحق خلیق (۱۸۹۲-۱۹۵۸) منشی ولی اللہ ثاقب کے شاگرد تھے، مالیگاؤں اپنے وطن سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے ؎

بارگاہِ ایزدی میں یہ دعا گو ہے خلیق | ہم کو رکھ خوشحال سبحاں شہر مالیگاؤں میں

مولانا محمد یوسف عزیز (۱۸۹۱ - ۱۹۵۷)

اہل حرفہ کے تعلق سے موضوعاتی نظمیں کہتے تھے، شاعر بے بدل تسلیم کئے جاتے تھے، عربی و فارسی کے جید عالم تھے اسی لیے شاعری کی زبان میں پختگی بسی ہوئی تھی، استاد الشعراء کا درجہ رکھتے تھے، مشاعروں کی جان تھے اور سوداگرانِ سخن کے لئے متاعِ عزیز۔ انہی کی یاد میں بزمِ عزیزی کی بنا پڑی آپ صحت الفاظ اور بلاغتِ زبان کا بڑا خیال رکھتے تھے اس سلسلے میں کئی معرکے بھی سر کئے، چونکہ بڑی علمیت و ادبیت کے حامل تھے اسی لیے شاعری و زبان کے فن و نکات سے سخنورانِ مالیگاؤں کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ بڑے رومان انگیز شعر کہتے تھے مجموعۂ کلام متاعِ عزیز منظور احمد نے مرتب کیا۔

آکے کمبخت حیا ہو گئی خلوت میں مخل — کوئی ارمان شبِ وصل نکلنے نہ دیا
ٹھوکریں کھا کے گری راہ میں آخر بے ہوش — انکی چالوں نے قیامت کو بھی چلنے نہ دیا

کہیں یہ وعدۂ فردا نہ ہو بڑے غلط یا رب — ملا دے صبحِ محشر سے ہماری شامِ ہجراں کو

محمد ابراہیم عارج (۱۸۴۴-۱۹۵۴) برادرج مالیگانوی کے استاد تھے ڈپٹی انسپکٹر ہو کر دھولیہ چلے گئے تھے۔ ابراہیم خلیق، مسلم، شوق، سہیل، کوثر، احسن اور قمر کے زمرہ میں سے تھے۔

سیٹھ محمد عمر فاروق (۱۸۷۰-۱۹۳۶)۔ عمر کے نام کی مناسبت سے فاروق تخلص کرتے تھے آپ کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے سہ

آہ کے ہمراہ نکلا ہے مرے دل کا بخار — موسمِ گرما کی گرد تشنہ ساون میں بھی دیکھ

لطیف اٹاوی (۱۸۹۰-۱۹۶۵)۔ اٹاوہ کے تھے مالیگاؤں میں آکر بسلسلۂ معاش بس گئے۔

لطیف اچھا نہیں تقدیر پر الزام رکھ دینا — وہ ہارا جس نے راحت کے لیے تدبیر کم کر دی

مولانا عبدالمجید وحید (۱۸۸۵-۱۹۵۹) تاریخ ولادت اور وفات سے اندازہ ہوتا ہے یہ وہ مولوی عبدالمجید وحید مورخ تاریخ شہر مالیگانوی نہیں بلکہ کوئی دوسرے صاحب تھے صرف ایک شعر دستیاب ہوا ہے سہ

ہے کوئی زمزمۂ پردازِ گلستانِ نبی؟ — ہم بھی اب گوش برآواز چلے آتے ہیں

دورِ متوسطین میں جن شعراء کے نام ملتے ہیں ان میں عبدالوہاب غالب، ولی اللہ ثاقب، قدرت اللہ سوز، مولانا عبدالحمید نیرتی حامد، مولانا عبدالحق راتی، عبداللطیف لطیف، محمد حسن آس، محمد بشیر نظر، محمد صدیق مسلم، صدیق حسن شوق، عبدالغفور سہیل بخاری، آزاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے دور کے سخنورانِ شہر مالیگاؤں

حضرت حفیظ مالیگانوی نے نقوش میں مالیگاؤں کی ابتدائی تاریخ شعر و ادب کا جو جامع خاکہ کھینچا ہے اور پہلے دور کے قدیم شعرار کا جو تذکرہ لکھا ہے وہ ان کی تحقیقی کد و کاوش اور سعی و شمول پر مبنی ہے گو یہ حرفِ آخر نہیں پھر بھی حرفِ اول ضرور ہے۔ غالباً سب سے پہلے "زخم مرہم" کے نام سے ایک تذکرۂ شعرائے مالیگاؤں حافظ غلام رسول خوشنویس نے مرتب کیا تھا۔ اختر مالیگانوی اور کلیم شاہدوی نے بھی دو تذکرے مرتب کیے تھے شہ کار ہمنشیں (۱۹۵۵) اور جمال ہمنشیں (۱۹۵۹)۔

خلافتی تحریک سے دربستہ اور اس کے بعد تقسیم ہند تک کے شعرار کی ایک بڑی کھیپ ہجوم عاشقاں کی، سند اللہ آئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ "ہر بوالہوس نے شعر پرستی شعار کی"۔ اس غوغا میں 'حدیث سرِ دلبراں' کی آواز دب گئی لیکن خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری ـــ وہی "پر نہیں" طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے'، خلافتی فساد کے بعد جن شعرار کے نام ابھرے ان میں عبدالرزاق کوکب، منشی سلیمان بیدل، قدرت اللہ سوز، محمد حنیف شورش، ناطق صاحب، محمد حسن احسن، محمد عمر جوش، محمد صادق غریب، زین العابدین عابد، خلیق، توفی، بنرہ۔

آزادی ہند کے بعد جن شعرار کو شہرت ملی ان کا سرسری جائزہ لیا جا رہا ہے۔

حضرت محمد حسن احسن مالیگاؤں کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر تھے اور احسن الکلام تسلیم کیے جاتے تھے تحریک جنگ آزادی کے سرگرم مجاہد تھے اور خلافتی فساد کے خونیں واقعات کے داستان گر بھی ہیں، آپ کی تصنیف مالیگاؤں میں جنگ آزادی (مطبوعہ ۱۹۶۷) ـــ تاریخ آزادی ہند کا ایک جگمگاتا باب ہے۔

سہیل مالیگانوی: چونا بھٹی میں رہتے تھے، والد دین محمد موضع بدھنا ضلع سیت پور ـــــــــ (یوپی) سے ترک وطن کرکے آئے تھے، طبابت اور پہلوانی کا شوق تھا، فارسی کے دلدادہ تھے رباعیات کہتے تھے اور اس صنف سخن میں دو مجموعے یادگار چھوڑے

لہ نقوش ۔ حفیظ مالیگانوی صفحہ "اظہار"

ہیں، کلام میں پختگی، زبان میں سلاست اور بیان میں ندرت تھی۔

اردو شاعری میں اس مشکل صنفِ سخن کی شائستگی کرنے والے خال خال ملتے ہیں پھر بھی یگانہ چنگیزی، امجد حیدرآبادی، فراق گورکھپوری، جاں نثار اختر اور جوش کے نام لیے جا سکتے ہیں، مگر سہیل مالیگانوی جنوبی ہند کے 'عمر خیام' تھے متنوع موضوعات پر رباعیات کا مجموعہ سفینہ شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ 'درد و داغ' رباعیات کا دوسرا مجموعہ بھی اردو اکادمی کے تعاون سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ اسے اطہر عزیزی محمد اسحاق خضر، امین صدیقی اور شبیر ہاشمی کی معاونت سے شائع کیا گیا تھا۔ مہاراشٹر کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر حضرت امین تابش نے سہیل مالیگانوی کے اس فن پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔[1]

شوق مالیگانوی (۱۸۹۸-۱۹۷۱) صدیق حسن نام تھا، مولانا محمد یوسف عزیز کے شاگرد تھے۔ خود ان کے شاگردوں کا حلقہ کامٹی (ناگپور) تک پھیلا ہوا تھا، محمد حنیف حنیف (کامٹی) آپ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔[2] شوق بڑے خوش فکر شاعر تھے اور بڑی خوبصورت غزلیں کہتے تھے جن میں حضرت داغ دہلوی کا گہرا رنگ جھلکتا تھا۔ تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا، دیندار اور متقی شخص تھے۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ادیب مالیگانوی آپ کے دوستوں میں تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے "پاسبانِ ادب" کے عنوان سے ان کی موت پر جو نظم کہی ہے اس میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

علم و فن ایسا کہ جس کا شہر میں ثانی نہیں — سب سے اونچا پرچمِ عز و وقارِ شوق ہے
ہے کہاں اوروں میں وہ خود بینی و خود آگہی — ہم نشینوں میں جو درجہ افتخارِ شوق ہے

ادیب مالیگانوی

نیا پورہ کے پرانے باشندوں میں سے تھے، پرائمری اسکول کے مدرس تھے اور اسی زمرۂ مدرسین سے سینکڑوں شعراء کا تعلق رہا ہے، تعلیمی سطح پر عموماً ان کو وہ درجہ نہیں دیا جاتا جو ایک

---

[1] ماہنامہ معیارِ ادب لکھنؤ مارچ ۱۹۸۶ء "سہیل مالیگانوی" امین تابش صفحہ ۲۳ - ۲۹

[2] کامٹی کی ادبی تاریخ - ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل - صفحہ ۵۸

اتالیق کو دیا جانا چاہیے، اصل بانی تربیت تو یہی ابتدائی درجوں کا معلم ہوتا ہے، اب چاہے وہ یوسف بن حجاج کی طرح اسکول ماسٹری کی چھڑی چھوڑ کر فاتح سپاہی کی تلوار اٹھائے، یا قلم اٹھائے اور اقلیم سخن کا تاجدار بن جائے، ادیب بھی اپنے وقت کے قلمرو سخن کے سلطان تھے۔ ساٹھ برسوں تک شعر و سخن کی محفلوں کو اپنی شمع شاعری و سخنوری سے روشن رکھا، ہر صنف سخن میں جولانی طبع کے جوہر دکھلائے ہیں، آپ کی غزلوں کا مجموعہ "تبسم" اور قطعات "ستارے" کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں، شاگردوں نے بعد از مرگ "چراغ رہگذر" کے نام سے آپ کی نظموں کا انتخاب چھاپا ہے (۱۹۸۷)۔ بعض ممتاز تلامذہ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ہارون اوج ادیبی، حکیم ماذی ادیبی اشرفی۔ ڈاکٹر اشفاق انجم، احمد نسیم مینانگری، عزیز ادیبی اور نہال ادیبی انصاری۔ آپ کے مداحین نے ادیب لائبریری آپ کی یادگار میں قائم کی ہے ایولہ کے عبدالقدیر آپ کے استاد تھے۔

محمد صدیق مسلم مالیگانوی (۱۹۰۱-۱۹۷۵)

والد بزرگوار الٰہی بخش   قصبہ مؤناتھ بھنجن (ضلع اعظم گڈھ) کے تھے، حضرت مسلم کے جدامجد غدر کے بعد ترکِ وطن کر کے مالیگاؤں آئے اور پارچہ بافی کا آبائی پیشہ اختیار کیا، دیسی رنگوں پر تیار کی ہوئی ساڑیوں کی تجارت کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰ء میں طاعون کے عفریت نے سارے گھر کو نگل لیا، غریب والدہ نے محنت و مزدوری کر کے پالا پوسا، ننہیال کا گھرانہ شہر کا مشہور حکیم خاندان تھا جس میں قبلہ باز حکیم اور حکیم محمد حسن حکیم محمد اسماعیل خاص شخصیت کے مالک تھے انہی کی نگرانی میں تربیت ہوئی، سنہ ۱۹۱۸ء میں مقامی اردو اسکول میں مدرس مقرر ہوئے، فارسی و عربی کی تعلیم مولانا محمد یوسف عزیز اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی سنہ ۱۹۲۱ء میں دو سال کی تدریسی تربیت کے بعد اردو ٹریننگ کالج سے فارغ ہو کر مالیگاؤں آئے تو یہاں شعراء کا جمگھٹا موجود تھا، شوق، احسن، کوثر، قمر، اوج، اکبر علی امین، شمس مینری وغیرہ کی صحبتوں اور محفلوں میں مسلم کا ذوق شعری نکھرنے لگا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں اردو لائبریری قائم ہوئی تو سنہ ۱۹۲۴ء میں مسلم صاحب اس کے جوائنٹ سیکریٹری مقرر کیے گئے، اور پھر کچھ عرصے بعد اس کے سیکریٹری بنائے گئے۔ آپ کا مجموعۂ کلام "نوائے انجم" کے نام سے سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مسلم مالیگانوی کی شاعری میں معنویت کے ساتھ ساتھ موزونیت اور مقصدیت بھی ہے خود

ادب کی بدلتی ہوئی قدروں کے متعلق ان کا نظریہ یہ تھا۔

"نہ ترقی پسند شاعری زمانے کا ساتھ دے سکتی ہے اور نہ قدیم روایتی شاعری میں وہ لذت رنگینی ہے بلکہ ان دونوں کے حسین امتزاج سے جو شاعری جنم لے رہی ہے وہی زیادہ پائدار اور مضبوط ہوگی، غزل گوئی کا میں حامی ہوں، یہ ہمارا علمی وادبی ورثہ ہے۔"

نازاں مالیگانوی

بزرگ اور کہنہ مشق شاعر تھے، آپ نے ایک ناول بھی لکھا تھا، برسوں تک اردو لائبریری کے سیکریٹری رہے، بزمِ عزیزی کے روحِ رواں تھے۔

ترقی پسند شاعری کی جب پُو پھوٹی اور "شب گزیدہ سحر" ـــ وہ سحر تو نہ تھی کہ جس کی آرزو لے کر چلے تھے یار کہ مل جائیگی کہیں نہ کہیں ـــ تو اس "سحر" کی کھوج میں ہندوستان کے اشتراکی شعراء ہر طرف پھیل گئے، مالیگاؤں میں حفیظ، عتیق اور نشاط شاہدوی اسی نئے ادبی رجحان کے ترجمان تھے۔

محمد حنیف حفیظ مالیگانوی (ولادت ۱۹۲۱): فتح پور آبائی وطن تھا، والد عبدالکریم مالیگاؤں کے باسی تھے یہیں حفیظ مالیگانوی نے مدرسہ بیت العلوم سے اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں دسترس حاصل کی۔ شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی کئی تصانیف کے مالک ہیں۔ دھڑکنیں (ناول) قوس قزح (قطعات) اور آبگینہ (مجموعۂ کلام) نقوش (تذکرۂ شعرائے مالیگاؤں) اور دیگر مطبوعات منظر عام پر آچکی ہیں۔

امیر اللہ نشاط شاہدوی (۱۹۲۱-۱۹۴۸)

قصبہ شاہدہ کی شہرت نشاط کی مرہونِ منت ہے، ترقی پسند شعراء کے میرِ کارواں تھے سپہرِ ادب پر بڑی تیزی سے نمودار ہوئے اور روشنی لٹاتے ہوئے موت کے ظلمت کدہ میں غائب ہو گئے "خوش درخشید ولی کوکب مستعجل بود"، آپ کا مجموعۂ کلام "امرِ بیل" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں آپ کے بھانجے بھیونڈی کے محمد خلیل اسماعیل نے راقم اور سرِ

سالک انصاری کی کوششوں سے چھپا تھا، اس میں نشاط شاہدوی کا خود نوشت تعارف بھی شامل ہے۔

"غربت و افلاس کے سائے میں پرورش پائی، انگریزی یا بجریہ جماعت تک اپنے ہی وطن میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد مالیگاؤں چلا آیا اور دو سال یہیں پڑھتا رہا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا، حالات ناسازگار ہونے کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کرسکا فکرِ معاش نے آدبایا کچھ روز رنگریزی کے سمن زاروں میں بھٹکتا رہا، پھر بمبئی میں ملازمت اختیار کرلی..... مجھے زمانہ طالبعلمی ہی سے شاعری کا شوق تھا چنانچہ مالیگاؤں میں قیام کے دوران میں غزلیں اور نظمیں کہتا رہا، ابتدائی کلام حضرت وقار حیدری کو دکھایا، مجھے ان کی اصلاح بہت پسند ہے اور انہیں کو استاد مانتا ہوں۔"

(ماخوذ از زخم و مرہم، قلمی نسخہ، نشاط شاہدوی ۱۵ جولائی ۱۹۶۸ء)

نشاط نے جدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، قنوطیت رہاسیت کا داخلی احساس افلاس نے پیدا کردیا تھا، ان کا نغمہ دبی ہوئی ٹیسوں کی کراہ ہے، انہوں نے بڑی پیاری نظمیں کہی ہیں ترقی پسند تحریک کی مقصدیت ور معروضیت کا اثر ہر شعر سے نمایاں ہے اور ان کی آواز اور ان کا لہجہ فیض اور ساحر کے کلام سے ہم آہنگ ہو کر سنائی دیتا ہے۔

سخنورانِ عصرِ حاضر

مالیگاؤں میں جس طرح افراطِ زر کا پھیلاؤ ہے اسی طرح شعراء کی بھی بہتات ہے۔ محفلوں، مجلسوں اور مشاعروں میں تو شاعری کی شمعیں فروزاں رہتی ہی ہیں لیکن ندی کے کنارے اور خصوصاً ہوٹلوں میں چائے کے دور کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی دور چلتا رہتا ہے اور یہ روایت بڑی قدیم تھی۔ منشی مدار اللہ مدعا (۱۸۵۴ - ۱۹۲۴) کے سات بھائیوں کے نام سے مالیگاؤں کی پہلی ہوٹل تھی جسے ٹورنگ کہتے تھے اور جو مرو سیٹھ کی مسجد کے سامنے واقع تھی شہر کے تمام شعراء جمع ہوتے تھے، چائے کے بعد ادبی محفلیں سجتی تھیں اسی طرح ہوٹل تھوڑی دیر کے لئے مجلسِ مشاعرہ میں تبدیل ہو جاتی ——— پھر محمد علی روڈ اور قدوائی روڈ پر ہوٹلوں کی قطاریں لگ گئیں اور ادبی محفلیں بٹ گئیں اور کچھ عرصے بعد مالیگاؤں کی ادبی فضا شعروں کے نغموں سے اس طرح گونجنے لگی جس طرح ابراہیم

عادلشاہ دوم (۱۶۵۶-۱۶۷۳) موسیقی کے جگت گرو کے عہد میں بیجاپور کے مضافات میں آباد نورسپور۔ مطربان خوشنوا اور خوش آہنگ کے نغموں سے سرگم کے سروں کے ساگر میں ڈوبا رہتا تھا۔

آج جب نوک قلم مالیگاؤں کے شعرائے کرام کا طومار کھولنے کی کوشش کر رہی ہے تو معاصرین شعراء کے بیسیوں نام یادِ رفتگاں بن چکے ہیں۔ کامل صدیقی (۱۹۱۵-۱۹۸۰) تاباں مقدم (۱۹۱۵-۱۹۷۳) محمد بشیر اختر (متوفی ۱۹۸۴) اور نہ جانے کتنے ہی یادگارِ زمانہ سخنور حضرات شہر خموشاں کے باسی بن گئے ہیں خدا ای خاکِ تیرہ گوہر را نگہدار۔

شاعروں کی ایک مختصر فہرست (بڑی حد تک نامکمل) درج ذیل ہے :

آزادؔ، اسیرؔ، استادؔ، افسرؔ، اکبرؔ، امین تابشؔ، ثاقبؔ، بیدلؔ، یوسف تشنہؔ، جانبازؔ، حسن دانش، حبیبؔ، ماسٹر عبدالحی شادؔ، جمیل سدیؔ، حسن وسیمؔ، رفیقؔ، عقیل رحمانی، عبدالرشید باسمؔ، ضیاؔر، منظورؔ، سکندرؔ، عبدؔ، تابشؔ، محمد عمر قدسیؔ، یونسؔ، انورؔ، محمد اسماعیل شررؔ، شمسؔ، خورشیدؔ، رعناؔ، مظفر غازیؔ، وفا حامیؔ، ستار سبحانی، عابد انصاری اصلاحی، نظر بابا، جاوید انصاری، مجید کوثرؔ، عزیز ادیبؔ، نہال ادیب انصاری۔

شعرائے کرام کی ایک نمایاں تعداد کے کلام کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، عتیق احمد عتیق کا کلام 'نور فردا' ادبی شعری شوعیں بکھیر چکا ہے۔ قمر مالیگانوی نے قطعات میں تفرد حاصل کیا ہے، سادہ اور سلیس زبان استعمال کرتے تھے، بزم آرزو نے اپنے اراکین شعراء کا انتخاب کلام 'گنج رواں' کے نام سے شائع کر کے گنجینۂ ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ اس میں عتیق احمد عتیق، نسیم، سلطان سبحانی، رزق عادل، دربید عارف کے کلام شامل ہیں، عقیل رحمانی نے گلبانگِ حرم اور نوائے بحر۔ نعتیہ کلام کے دو مجموعے طبع کرا کے اسلامی ادب کے روحانی سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔

پرانے شعراء کے احوال و کوائف پر مشتمل کئی تذکرے حنیف مالیگاوری کے نقوش (۱۹۰۹) سے پہلے نکل چکے ہیں، رازِ کہکشاں (۱۹۴۵) سلکِ پروین مرتبہ حضرت انجم فوقی بدیونی (۱۹۴۶)، شہکارِ ہمنشیں (۱۹۵۴) اور جبل ہمنشیں (۱۹۵۹) مرتبہ اختر مالیگانوی، اجالے (۱۹۵۸) مرتبہ اراکین ہندوستان لائبریری، مالیگاؤں اور شعلۂ احساس (۱۹۷۰) جناب ممتاز ادیب مالیگانوی کے تذکرے مالیگاؤں کی تاریخ ادب اردو کے مختلف ابواب

ہیں، حضرت مسلم مالیگانوی کا اجمالی تذکرہ ایک مقالے کی شکل میں اردو ٹائمز بمبئی میں چھپا تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے درمیان کئی گلدستے اور رسائل شائع ہوئے تھے۔ افتخارِ سخن (۱۹۲۳ء)، تاجدار مالیگاؤں (۱۹۲۴ء)، معیارِ سخن (۱۹۲۴ء) اور رسالہ بہار (۱۹۲۳ء)۔

مالیگاؤں میں بڑے پایے اور ہندوستان گیر شہرت کے حامل شعراء گذرے ہیں اور ایک بڑی تعداد ان کی بھی ہے جو مہاراشٹر کے ادبی حلقوں میں مثلاً پونہ، بھیونڈی، بمبئی، برہانپور، دھولیہ، جلگاؤں اور اورنگ آباد تک جانے پہچانے جاتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کی شہرت شہری حدود کو بھی پار نہیں کر سکی اور کچھ ادبی صلاحیتوں کے فقدان اور افکار و خیالات کی تنگدستی کے سبب کارگاہِ سخن میں خام مال بناتے ہیں، یوں اب نہ تو استاد شعراء کا وہ قدیم روایتی طمطراق بھی باقی رہ گیا ہے اور نہ شعری روایات و اقدار کا پاس اور وضعداری کا بھرم رہ گیا ہے کالج کے پروردہ شعراء مزعومہ ادعائیت کے افتخار میں 'لافِ دانش' کی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں، ابلاغ و ترسیل کے بہاؤ میں معانی و افکار خار و خس کی طرح بہہ جاتے ہیں، پورا کلام کھنگال ڈالیے نہ گہر ہاتھ آئے اور نہ صدف، لیکن یہ ایک سطحی رائے ہے اور جو شعراء فنِ شاعری سے واقف ہیں، قدماء کے کلام کی معنی آفرینیوں کا علم رکھتے ہیں وہ مستثنیٰ ہیں۔

مالیگاؤں کے قصرِ ادب کے مسند نشینوں میں بڑے پایے کے شاعر رونق افروز ہیں، اور جن کا فنی منصب استادی کے درجہ تک پہنچتا ہے۔

حفیظ الرحمن اطہر الخیری: مولوی ثنا اللہ کے صاحبزادے ہیں۔ جامع اوصاف شخصیت کے حامل بزرگ شاعر ہیں، استادی کا درجہ حاصل ہے۔ صحافت میں بڑا دبنگ قلم چلاتے ہیں، حالات حاضرہ پر ان کے نوکِ قلم سے نکلے ہوئے تبصرے معاشرتی اور سیاسی ناسوروں پر نشتر زنی کا کام کرتے ہیں۔ جرأت اور تبصرہ کے مرد ہیں۔ خوشنویس بھی ہیں۔

عبدالمجید سرور: شاعروں کے زمرے میں بیحد نمایاں شخصیت ہیں، ادیبوں کے حلقے میں روشناس ہیں اور صحافیوں میں مقبول ہیں۔ کئی اخبارات سے منسلک رہ چکے ہیں، اسلامی طرزِ فکر کے نقیب اور اسلامی ادب کے حامی ہیں۔ اسلوب نگارش میں شستگی ہے اور افکار و خیالات میں پاکیزگی اور تطہیر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اور یہ وہ مُشک ہے جو "خود بوید" حضرت مولانا محمد عثمان (بانی جامعۃ الصالحات مالیگاؤں) کے شاگرد رشید تھے،

عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں، سرور شائز کے مرید ہیں۔

ابن صدیقی: نئے دور کے شعراء میں اسلامی ذہن وفکر سے معمور ایک طبقہ ابھرا ہے جو روحانی افادیت کا علمبردار اور مذہبی افکار کا ترجمان ہے۔ ابن صدیقی ان مبتدین شعراء کی اول صف میں محراب و منبر کے روبرو جذبۂ عبودیت سے سرشار بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا رہتے ہیں۔

تو واحد و صمد ہے ہمیں بھی اکائی دے — ہم ہیں انا کی قید میں ہم کو رہائی دے
ان کی نگاہ میں تو سمندر بھی کچھ نہیں — مجھ کو تو بوند بوند سمندر دکھائی دے
عالم پناہی سے مجھے نسبت نہیں ہے کچھ — میں خود کو جان لوں مجھے اتنی رسائی دے

ابن صدیقی کا ذہنی رویہ اور فکری رسائی ــ بلکہ سارا کردار مذہب پسندانہ واقع ہوا ہے اسی لیے ہر شعر میں "صبغتہ اللہ" کا حسین رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ خود شناسی، انکساری، عجز و فروتنی سے پیدا ہوتی ہے اور ابن صدیقی کے ذکر و فکر میں خداشناسی کے انکھوے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔

جسے ڈھونڈا مکان و لامکاں میں — چھپا بیٹھا ہے وہ میرے ہی اندر

الفاظ کا چناؤ، بندشِ الفاظ (ڈکشن)، استعارات اور تشبیہات کی تعداد میں کے ساتھ ابن صدیقی کی شاعری اذان کی آواز کی طرح بلند ہوتی ہوئی دینی فضا سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ اور خدائے قدوس کی کبریائی اور سطوت و جبروت کی تسبیح و تہلیل سنائی دیتی ہے، ان کا ہر شعر اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہوا فرشتہ بن جاتا ہے "توحید" کا سارا جوہر دو سطر ان اشعار میں منتقل ہو گیا ہے سادگی اور پاکیزگی کے ساتھ ربِ قدیر کی ثنا و ستائش اس طرح کی جاتی ہے ؎

ساری تعریفیں ہیں اس کی رب ہے جو سارے عالم کا
جو ہے رحیم و رحمٰن، مالکِ روزِ جزا، سب سے اعلیٰ
تیری عبادت کرتے ہیں ہم، تیرے ہی در پر دست کشا
نیک ہدایت دے اے مالک، ہم کو سیدھی راہ چلا
ان کی راہ ہمارا رستہ جن پر تیرے ہوئے انعام
تیرا غضب ہے جن پر مالک، ان کی راہ سے ہمیں بچا

— ابن صدیقی کے صحیفۂ کلام "نامن" کی یہ تمہیدی غزل — سورۃ الفاتحہ کی تفسیر ہے۔

غلام مصطفیٰ آثر صدیقی۔

اسی "خانوادۂ صدیقی" میں حاجی غلام رسول پیدا ہوئے جو حقیقت پسندانہ روایتی اور شعور کی تہذیب کی علامت تھے اور انہیں صدیقی برادران میں حاجی محمد یٰسین کا نام بھی نمایاں ہے جنہوں نے "لمحہ لمحہ ڈھونڈ میں گم ہوتی ہوئی زندگی کو" زندگی" کرنے کے ہنرمندانہ اظہار کو سلیقہ بخشا — یہی سلیقہ اور شعور پورے گھرانے کے افراد میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ڈاکٹر غلام حیدر صدیقی باذوق اور خوش فکر شاعر ہیں، مصطفیٰ آثر صدیقی جامع اوصافِ حمیدہ ہیں ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں، اور بڑے کے زمرے میں شمار ہوتا ہے مشاعروں کے کامیاب ناظم ہیں، خداداد صلاحیتوں کے مالک ہیں اسی لئے خدا کے صادق بندے ہیں عشق رسول ؐ سے سرشار ہیں سیرت طیبہؐ پر مضامین، تقاریر در مقالے لکھتے ہیں جو مقبولیت کی سند حاصل کرتے ہیں۔ آثر صاحب کی بڑی بااثر شخصیت ہے۔

نمونۂ کلام:

دل نشترِ ایام سے ہلکان بہت ہے
اس زخمی پرندے میں مگر جان بہت ہے
ہر روز نئی کونپلیں دیتی ہیں یہ پیغام
اس رُت میں تری زلف پریشان بہت ہے
مجھ گم رہ منزل پہ نہ ہنس وسعتِ صحرا
جھولی میں ابھی جینے کا سامان بہت ہے

ڈاکٹر غلام حیدر صدیقی

شاعر کی حیثیت سے اتنے مشہور نہیں ہیں شہرت کے لئے اور بھی اوصافِ حمیدہ ان میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ہیں لیکن کبھی کبھی شعر بھی کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔ بے حد مخلص انسان ہیں۔ کم گو اور کم سخن ہیں اسی لئے کلام عام نہیں ہے۔

حاتم سے قرابت داری ہے۔

صدیقی خاندان کے اک نیم ملاشہ میں سے ہیں۔

محمد اسحٰق خضر:

تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں کے پرنسپل ہیں، بھیونڈی کے کچھ شعراء کے خضر راہ سخن بھی ہیں، خوش فکر شاعر ہیں اور انبساط انگیز اور سرور و شادمانی لٹانے والے مزاح نگار جن کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا انتخاب "پہلی غلطی" جب شائع ہوا تو قارئین کرام اور مداحین عظام کو اس بات کا احساس ہوا کہ حضرت خضر نے اپنی "پہلی غلطی" کو اتنے دنوں پوشیدہ رکھ کر بڑی ادبی غلطی کی ہے کیونکہ یہ تصنیف عم غلط ثابت ہوئی۔ اور اسے اہلِ ادب و اہلِ ذوق نے دل سے سراہا ہے۔ محمد اسحٰق خضر انصاری ایک سلجھے ہوئے نقاد اور تقریظ نگار بھی ہیں۔

ریاض احمد ریاض:

صدر مدرس کی حیثیت سے سبکدوش ہو کر رنج گرانباری تنہائی کے سبب گوشہ نشین ہو گئے ہیں لیکن شعر گوئی کی ریاضت جاری ہے اپنے زمانے کے کرکٹ کے میدان کے تیندولکر تھے۔

ڈاکٹر اشفاق انجم:

مالیگاؤں کے حضرت مولانا محمد عثمان کے علمی و تعلیمی خانوادے کے انجم ہیں، جو شعر و سخن کے آسمان پر جگمگا رہے ہیں اور درس و تدریس کی مسند پر جلوہ افروز ہیں۔ شاعر ہیں اور "تاریخ شعرائے مالیگاؤں" پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مقالہ نگار بھی ہیں اور محقق بھی۔ ان کا شعری مجموعہ "سایہ سایہ دھوپ" شہرے میں آب لا پھیلا رہا ہے۔ آپ ایک سلجھے ہوئے نقاد بھی ہیں اور سلوک و طریقت کے سالک باخبر بھی ہیں۔

الیاس صدیقی:

مالیگاؤں میں جڑواں (توام) تخلیقی صلاحیتوں کے حامل افراد کی کمی نہیں، ہر شاعر یا نقاد ہوتا ہے یا ادیب، ہر ادیب صحافی ہوتا ہے یا افسانہ نگار، اور طنز نگار، ہر ناول نگار افسانہ نگار بھی ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر محقق مؤرخ بھی ہو جبکہ ہر مؤرخ۔ محقق ہوتا ہے اور چند ایسے ہوتے ہیں جو ادیب و شاعر بھی ہوتے ہیں اور بڑے پائے کے مؤرخ الیاس صدیقی پہلے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، طنز و مزاح نگار ہیں اور مشاعروں کے خوش آواز اور دلکش لہجہ والے ناظم، سماجی امور سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

<u>شبیر آصف:</u>

جدید رجحانات کے حامل نئے لب و لہجہ کے شاعر ہیں اور صاحبِ کلام ہیں آپ کا مجموعۂ کلام "سپی کے حوالے" شائع ہو چکا ہے جسے مہاراشٹر اردو اکادمی نے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔

<u>رامش مالیگانوی:</u>

ایک بہت اچھے ترقی پسند شاعر ہیں، کلام میں سمندر جیسی گہری معنویت ملتی ہے، مجموعۂ کلام "سیپ، سمندر، موتی" نے دامنِ ادب کو بھر دیا ہے۔

<u>اسمٰعیل راز:</u> آپ بھی ترقی پسند شاعر ہیں، بڑی خوبصورت ننھی مُنّی نظمیں کہتے ہیں جن میں کچی کلیوں کی مہکار بسی ہوئی رہتی ہے، قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور مشاعروں میں ہاتھوں ہاتھ لے جاتے ہیں، اپنے کلام سے سامعین پر اور گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

<u>عبدالسلام اطہر:</u> جدید لب و لہجے کے شاعر تھے، ابلاغ و ترسیل میں نیا پن ہے اور تازہ بہ تازہ بہ تازہ مضامین کے انبار لگا دیتے ہیں۔ مجموعۂ کلام 'انا البحر' شائع ہو چکا ہے وہ خود بحرِ قضا میں غرق ہو چکے ہیں تپ دق کے موذی مرض نے بہت جلد زندگی کا قرض اتار دیا۔

<u>مقیم اثر باولی:</u> خاندیش کے ہیں، درس و تدریس پیشہ ہے، شاعری کا شغل تسکینِ ذوق کا ذریعہ ہے، خوش فکر شاعر ہیں، دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "لَا تَقْنَطُوْا" (الزمر: ۵۳) اور نغمۂ سنگ۔

<u>ہارون فراز:</u> نوجوان ادب میں نئی گونجتی ہوئی آواز ہے جس کے لب و لہجہ میں تازہ پن اور نیا پن ہے، اردو میں پی۔ایچ۔ڈی کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔

<u>عزیز ادیبی:</u> حضرت ادیب مالیگانوی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'آتشِ پنہاں' اور 'لہجہ'۔

<u>نجمی ابن جاوید:</u> بزرگ شاعر جاوید انصاری کے فرزند ہیں، شعری ذوق اور شاعری وراثت میں ملی ہے، کشاکشِ روزگار اور آلامِ زمانہ کی تلخ کامیوں نے کلام میں آشفتگی مگر پختگی پیدا کر دی ہے۔ پھر بھی انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ نے ان کے افکار و خیالات میں قنوطیت اور شخصیت میں شکستگی پیدا نہیں ہونے دی ہے۔ بلکہ ان کے لب و

لہجے میں اثر آفرینی ہے، مشاعروں میں یہی انداز کلام سامعین کو متاثر کرتا ہے۔

ظہیر ابن قدسی: مشہور و معروف مزاحیہ شاعر محمد عمر قدسی کے فرزند ارجمند ہیں، شاعری اور مزاح نگاری آبائی میراث ہے اور سامعین کو تبسم زیر لب اور قہقہہ زار بنانے کی ضامن ہے۔ اسی لئے سرور و انبساط پھیلانے کے لئے دور دور سے مشاعروں میں بلائے جاتے ہیں۔ ظہیر ابن قدسی کی شاعری زعفران زار ہے۔

مختار یوسفی: پاکستان کے مشتاق یوسفی کی تقلید میں ہم قافیہ بنے ہیں، ان کی طرح طنز سے بھرپور قلم چلانے کے خواہشمند ہیں۔ مگر شاعری میں طنزیہ اور مزاحیہ لفظیات، خیالات و تعلّلات کی جو بہتات ہوتی ہے وہ مختار یوسفی کی شناخت کو انفرادیت عطا کرتی ہے، سامعین ان کے کلام کے گرویدہ ہیں۔

عبدالستار ظفر: نئی نسل نئے لب و لہجہ کے نوجوان شاعر ہیں۔ نرم زبان اور قلبی واردات سے بھرپور شاعری میں بھی ایک نیا انداز فکر اور روّیہ پیدا کر لیا ہے۔ اسی لئے انفرادیت کے حامل ہیں۔

فاروق عشرت: آپ بھی ایک کامیاب ناظم مشاعرہ ہیں اور خود بھی اپنی شاعری اور انداز شعر گوئی کی سحر آفرینی سے سامعین کو مسحور کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری انقلاب انگیز خیالات سے بھرپور ہے اور دبنگ لہجہ مرعوب کن ہے۔

ارشد نظر: نئی پود کے ابھرتے ہوئے شاعر ہیں، برگِ درخشاں آپ کے مطبوعہ کلام کا نام ہے۔

رفیع احمد: شاعری اور نثر میں طنزیہ انداز بیان یکساں شناخت رکھتا ہے، یہ ان کی صلاحیتوں کا کمال ہے، بچوں کے بھی شاعر ہیں، 'گلدان' اسی قبیل کی نظموں کا گلدستہ ہے، تعمیر و کسب علم کی حمایت میں ایک کتاب بھی قلمبند کر چکے ہیں۔

احمد نسیم مینا نگری: قادر الکلام شاعر اور کہنہ مشق ادیب ہیں، صحافت میں بھی پختہ شعور رکھتے تھے، سیاسی رہنما کی حیثیت سے مشہور تھے ان کے کلام کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ شعورِ حیات اور خاک رنگ نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔

سید عارف: 'حجاز' پرچے کے مدیر ہیں، نیا لب و لہجہ ان کی شاعری کو دوسروں سے ممیز کرتا ہے۔ جدید رجحانات کے نمائندہ شاعر ہیں مجموعۂ کلام "دھوپ کا آخری ٹکڑا" شائع ہو چکا ہے۔

مالیگاؤں کے محبانِ ادب

اردو زبان سے پیار کرنے والوں کا وجود اس کی بقار کا ضامن ہے۔ مالیگاؤں کے مخزود متمول حضرات میں سے شکیل سیٹھ اور صادق انصاری (مرحومین) محبان ادب کی صف میں تھے سیٹھ ریاض احمد، فاروقی عبدالرحیم، خورشید احمد صدیقی، جلال صابر ستار، مولانا محمد ہارون (مالیگاؤں پرنٹنگ پریس) وغیرہ اردو کے فروغ کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اردو شاعری کے کچھ ایسے محافظ اور سرمایۂ اسلاف کے امین بھی موجود ہیں جنھوں نے سرمایۂ ادب کو دستِ زمانہ سے محفوظ کر رکھا ہے۔ مسٹر محمد امین، ندرت انقلابی، منشی سکندر، بشیر ادیب اور محمد صدیق خورشید کے اسمار گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

مشاعروں کے انعقاد میں اربابِ ذوق بڑی سرگرمیاں دکھلاتے ہیں۔ کامیابی کا انحصار شعرار حضرات اور سامعین کی شرکت پر ہے لیکن مشاعرے کی دلکش نظامت بذاتِ خود اس کی کامیابی کی ضمانت ہے شعر فہمی، بذلہ سنجی، برجستگی اور موزوں اشعار کا برمحل استعمال یہ سارے ضروری اوصاف ہیں۔ باذوق ناظموں میں جو چند ممتاز افراد ہیں وہ یہ ہیں: غلام مصطفیٰ اثر صدیقی، ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی، الیاس صدیقی، فاروق عشرت اور شبیر ہاشمی۔ عثمان غنی (اسکس) ادبی تقریبات کے ناظم ہیں، ڈراموں سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

مالیگاؤں میں صاحب تصنیف افراد کی کمی نہیں ہے، شعری مجموعے، ناول، افسانوں کی کتابیں اور علمی ودینی مطبوعات کا ذکر علمائے کرام کے تذکروں میں ہو چکا ہے جن میں مولوی محمد عبدالمجید وحید اشرفی اور مولانا عبدالحمید نعمانی اور مولانا مفتی قاری محمد حسین اشرفی کی تصانیف بڑی اہمیت رکھتی ہیں، برہانپور کے پیر طریقت حاجی عبدالغفور بخش اللہ شاہ صاحب اشرفی نے آپ کو حسن اللہ کا خطاب دیا تھا، قاری صاحب نے مولوی معین الدین ندوی برہانپوری کی کتاب گہوارۂ علم دار السرور مرکز روحانیت کی طباعت واشاعت میں بھرپور مدد کی تھی ان کے علاوہ مالیگاؤں شہر کے مشہور صنعت کار سیٹھ محمد یوسف محمد حسن، الحاج سیٹھ صوفی محمد عثمان اور ان کے احباب ڈاکٹر محمود انصاری، سیٹھ نہال احمد نے بھی اعانت فرمائی تھی۔ محمد امین عشرت (مالیگاؤں) اس کتاب کی اشاعت کے خاص محرک تھے۔

رمضان فیضی خوشنویس اور رنگین نگار ہیں۔ آپ کی خوبی یہ ہے کہ شہر کی اموات کا ریکارڈ رکھتے ہیں حکیم عبدالکریم بلیا نا کی دلنواز شخصیت ہی شائستہ ادبی ذوق کے حامل قابل التعظیم بزرگ ہیں

افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شُد:

—— افسانوں کی ایسی کئی کتابیں، مالیگاؤں کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے قلم حکایت رقم سے نکل چکی ہیں۔ بعض "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق قصۂ طولانی ہیں اور بعض "بہ حرفی می توان گفتن تمنای جہانی را — من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانی را" — کے زمرے میں شامل ہیں۔

تذکرہ نویسوں کی روایت کے مطابق ڈاکٹر محمد فاروقی اور ستار سبحانی افسانہ نگاروں کے پیشرو حضرات ہیں۔

__سلطان سبحانی:__

مقبول و مشہور افسانہ نگار ہیں، کردار نگاری میں بڑی مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اب تک افسانوں کے چار مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ 'اجنبی نگاہیں' 'راستے بھی چلتے ہیں' 'میرا کھویا ہوا ہاتھ' قابلِ ذکر ہیں۔ 'شاعری کا مجموعہ' 'سکہ بند' (طنزیہ) 'دکانِ شاعری' بھی شائع ہو چکے ہیں۔ راہِ صحافت میں اپنے ادبی نشانات مرتسم کر چکے ہیں ان کی ادارت میں نکلنے والے جرائد "نشانات" اور "ہم زبان" بڑے ناطق پرچے ہیں۔

__عرفان عارف:__ اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں ان کا مقام ہے۔ "شہر کا خواب" اور "صدیوں کے بعد کے لوگ" افسانوں کے مجموعوں نے قارئین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

__احمد عثمانی:__ کئی افسانوں کے خالق اور دو مجموعوں کے مالک ہیں۔ 'اپنے آپ کا قیدی' اور 'رات کا منظر' ان کے نام ہیں، متحرک اور فعال سماجی خادم بھی ہیں۔

__مجید انور:__ صاحبِ تصنیف ہیں، افسانہ طرازی سے سحر طرازی کا کام لیتے ہیں "سرخ رووں والے" افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

__سجاد عزیز:__ ماہنامہ "جواز" سے منسلک رہے۔ ایک ذہین افسانہ نگار ہیں۔

__شبیر ہاشمی:__ بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں، مبصر و نقاد کی حیثیت سے یک منفرد مقام رکھتے ہیں، افسانہ نگاری کے علاوہ تبصرے بھی لکھتے ہیں، مشاعروں کے ایک ناظم کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں بڑے صاحبِ ذوق ہیں۔

__خیال انصاری:__ افسانہ نگار ہیں اور ایک مجموعہ "اجالوں کا کرب" شائع ہو چکا ہے۔ بچوں

کے لیے' ایک ہفت روزہ اخبار "خیر اندیش" بڑی باقاعدگی سے نکالتے ہیں۔

ضیا بیدار: ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ایک شعری مجموعے "رقصِ جام" کی مقبولیت کا دور آج بھی چل رہا ہے۔

حمید اختر: جاسوسی ناولوں کے خالق ہیں۔ 'نازاں' نام کا ناول نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

غلام محمد زیدی: کے دو ناول زینب اور منزل' مالیگاؤں کی تاریخِ ناول نویسی کے دو سنگِ میل ہیں۔

مختار یونس: طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں بڑا شگفتہ انداز اختیار کرتے ہیں' خاکے بھی بڑے بھرپور لکھتے ہیں جن کے خطوط سے ان کی ادبیت، ذہانت اور صلاحیت کا شلث بنتا ہے' مالیگاؤں ہائی اسکول کے ایک لائق اور فائق استاد ہیں، ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل میں بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

شبیر احمد حکیم: ادبی صلاحیتوں کے لحاظ سے صنفِ سخن کے کئی خانوں میں بٹے ہوئے ہیں' ان کی کتاب "شوخیاں" (نثری طنز و مزاح) بڑی مقبول ثابت ہوئی تھی' 'ماجرائے وطن اور حیاکت کی حکایت' کے بھی مصنف ہیں۔ مالیگاؤں میں ابھی اہلِ قلم کی کہکشاں جگمگا رہی ہے۔ بزرگوں میں اطہر الحجری اور عبدالمجید سرور کے لکھنے کی عمر زیادہ ہے' لطیف جعفری' لطیف عزیز ادیبوں کی صفِ اول میں ہیں۔ عبدالمجید مظہر صدیقی' ڈاکٹر اشفاق انجم اور محمد اسحاق خضر انصاری درس و افادہ کے مسند نشین بھی ہیں اور ایوانِ ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔

سماعے دین کا اسلوبِ نگارش ان کی طرزِ حیات سے عبارت ہے' مرحوم نصیر علی عزیزی کے قابلِ ترجمہ تھے' مولانا عبدالحمد ازہری' مولانا محمد حنیف ملی' مولانا محفوظ الرحمٰن اور مولانا محمد ادریس ملی کی ادبی شان مونوینہ طرزِ فکر کی دین ہے۔

اسحٰق ایوبی ایک محقق' ادیب اور شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے حکومت ہند کے انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے بہترین خدمات انجام دی تھیں' حیدرآباد میں انتقال ہوا۔

صحافت میں مالیگاؤں نے بمبئی' ناگپور اور یو۔ پی کے دیگر شہروں سے بڑھ کر ترقی کی ہے اور بڑی دسی کے افراد کی تعداد کثیر صحافت سے ہمیشہ سے وابستہ رہی ہے۔ دانش ور اہلِ قلم اور جلیل القدر ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جن کے اشہبِ قلم نے سیاست کے

میدان میں بڑی جولانیاں دکھائی ہیں، عصرِ رواں کے سماجی حالات اور مسائلِ حاضرہ پر مردِ فقیر کی طرح حرفِ برہنہ کی شمشیر بھی چلائی ہیں، معاشرہ کے جسم پر پھیلتے ہوئے ناسوروں کی نشترزنی کی ہے۔ شعروادب کی لیلائے سخن کو تبصروں اور تقریظوں سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھولی ہیں۔ اور قاری اور مصنف کے درمیان رشتے استوار کئے ہیں۔

مولانا عبدالحمید نعمانی صحافتی تاریخ کی اُن شاندار روایات کے امین اور ترجمان تھے جو ان کے معاصرین مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا محمد حسین محوی صدیقی، مولانا حافظ علی بہادر خان، معین الدین حارث اور مولانا محمد یوسف انصاری مبارکپوری نے قائم کی تھیں۔ انہوں نے مالیگاؤں سے ایک ہفت روزہ اخبار ۱۹۳۵ء میں جاری کیا اور دوسرے سال سیٹھ محمد صابر عبدالستار کے مشورے اور ہمت افزائی سے بیداری پریس کی بنیاد ڈالی۔ مالیگاؤں میں اخبار بینی بڑھ گئی تصنیف و تالیف کا شہر خامہ زلفِ سروش بن گیا۔ پریسوں کی کھڑکھڑاہٹ پاور لوموں کے شور میں مدغم ہو گئی۔ مالیگاؤں کی صحافتی بیداری اسی بیداری کی سحر انگیزی کا کرشمہ ہے جس کے سبب کئی اخبارات جرائد و رسائل نے گہوارۂ صحافت میں آنکھیں کھولی ہیں۔

ادبی و علمی رسائل و جرائد:

البیان کا اجرا نومبر ۱۹۷۰ء میں ہوا، مولانا عبدالحمید نعمانی نے نام دیا، سلیم احمد محمد ابراہیم صدیقی نے بولنا سکھایا اور مالیگاؤں کے علمائے دین اور اکابرِ ملت نے پروان چڑھایا۔ جن میں مولانا اسرار الحق، مولانا محمد الیاس، مولانا محمد حنیف ملی، مولانا عبدالاحد ازہری، مولانا نصیر احمدی، عبدالرشید عثمانی، مولانا فرید ایوبی، مولانا حافظ جاوید ملی کے اسمائے گرامی ممتاز ہیں۔ اخبار کے خصوصی معاونین عبدالرشید محمد امین اور محمد نورانی درگاہی تھے۔

نیرِ نو: ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۵ء تک مژدۂ جانفزا سناتا رہا۔ عصری ادبی جریدہ جو اولیت کا شرف رکھتا تھا چند وجوہ کے سبب خاموش ہو گیا۔ مدیران تھے غلام مصطفیٰ اثر صدیقی اور شبیر ہاشمی۔

نشانات: ترقی پسند رجحانات کی نشاندہی کرنے والا یہ معیاری رسالہ سلطان سبحانی (افسانہ نگار) اور سید عارف (شاعر اور صحافی) کی ادارت و ملکیت میں شائع ہوتا رہا ہے۔

نئے نشانات: سلطان سبحانی کی ادارت میں نیا پن لے کر نکلتا ہے۔

جواز: سید عارف مدیر ہیں معاونین کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں: سجاد عزیز، نشاط انور، مجید انور، احمد عثمانی اور سلیم شہزاد۔ اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

روایت : سلیم شہزاد اچھا لکھنے والوں میں سے ہیں، تقریظ نگار بھی ہیں، شاعر بھی اور روایت
کے مدیر بھی ہیں، سلطان شاہد آپ کے معاون ہیں۔

ہم زبان : بہت سارے ادیب ہیں جو سلطان سبحانی کے ہمنوا ہیں جیسے حفیظ مالیگانوی
عرفان عارف، شبیر ہاشمی، عتیق احمد عتیق، اکبر مرزا۔

توازن : کے مدیر عتیق احمد عتیق ہیں۔

اردو اسٹیج : نام سے نوعیت ظاہر ہے۔ مدیر محمد ہارون اور معاون مخلص مسعود ہیں۔

ان رسائل و جرائد میں بہتوں کو کمسنی اور کم عمری ہی میں زمانے کی نظر کھا گئی۔ اس سے پہلے
بھی ڈھیر سارے ڈھیر ہو گئے یا اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہے ہیں۔

شہرہ (ہفتہ وار) مدیر حمید اختر، تنویر (ہفتہ وار) مدیر مجید سرور۔ زبانِ خلق (روزنامہ)
ایڈیٹر عبد الخالق خطیب انصاری۔ پیوپلس ڈیلی (لطیف جعفری کے اشتراک سے جاری رہا)
اردو کومک : مدیر یوسف انصاری۔ جلیس (ماہنامہ) مدیر : رائے حبیب الرحمن۔

کچھ ابھی تک تازہ دم ہیں ان میں 'جواز'، اور 'توازن' میزانِ صحافت پر یکساں چلے پر ہیں۔

کچھ گلدستے نسیاں بن کر یادوں میں اب تک جھلک رہے ہیں۔ ہفت روزہ ڈسپلن جس
کے مدیر ملک محمد امین نور الہدیٰ تھے جو مالیگاؤں کے ابو الشعرا خادم مالیگانوی کے پوتے ہیں۔
محمد عمر جوش، عالم جوش جنوں میں 'شورش' (ہفتہ وار) نکالتے تھے۔ عبد المجید سرور کا دیکھی
'تنویر' بھی روشنی کھو بیٹھا ہے۔

اخبارات :

شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد بھی دوسرے شہروں کے مقابلے میں مالیگاؤں میں کچھ زیادہ
ہی نظر آتی ہے۔ یہ اور بات کہ کچھ اخبارات کے وجود کی خبر کچھ دنوں بعد پرانی خبر بن جاتی ہے۔

عوامی آواز : ہفت روزہ سیاسی آرگن ہے۔ پچھلی تین دہائیوں سے بڑی باقاعدگی کے ساتھ
عوام کی آواز بنا ہوا ہے۔ اس کے مدیر مشہور سیاسی رہنما نہال احمد (ایم ایل اے) ہیں۔

بیباک : اس کے مدیر کمیونسٹ پارٹی کے ساتھی ہارون بی۔ اے ہیں جو بڑے فعال اور سرگرم
سیاسی رہنما ہیں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے رکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

شاہین : مدیر شکیل احمد ہیں۔ یہ مالیگاؤں اور دھولیہ سے بیک وقت آسمانِ صحافت پر
پرواز کرتا ہے۔

سٹی زن ٹائمز: عوامی آواز کا ہمنوا، بڑی بیباکی سے کانگریس کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ مشہور کانگریسی رہنما شبیر احمد حاجی غلام رسول (ایم ایل سی) اس کے مدیر ہیں۔

تبصرہ: مشہور ادیب اور صحافی اطہر الخیری اس کے مبصر ہیں اور مدیر۔

نشانِ افق: مدیر شبیر علی روشن علی ہیں۔

ڈسپلن: مرحوم محمد امین چودھری کا اخبار ہے۔

اُفق: (ہفت روزہ) سات دنوں کے بعد اُفقِ صحافت پر نمودار ہوتا ہے۔ اقبال قریشی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔

شوق: کامریڈ اشفاق احمد بڑے شوق سے نکالتے ہیں اور قارئین شوق سے پڑھتے ہیں۔

شاہنامہ: اورنگ آباد اور مالیگاؤں سے بیک وقت طلوع ہوتا ہے، مالیگاؤں میں اس کے مدیر ڈاکٹر ریاض احمد ہیں۔

ان اخبارات کے علاوہ کئی اور بھی ہیں جن میں کچھ جلی سرخیاں [illegible] ہوئے ہیں اور کچھ خفی، سلسبیل، سرور ٹائمز، نعمانی ٹائمز، نمود، معیارِ زندگی اور جرأت [illegible] اخبارات جواب خاموش ہو چکے ہیں ان میں نوائے مشرق، ہم سب، مطلع، شورش اور اک [illegible] مدیر۔

خیر اندیش: بچوں کا اخبار خیر اندیش ہفتہ ہفتہ نکلتا ہے اس کے مدیر خیال انصاری ہیں۔

آوازِ مالیگاؤں: مدیر تجربہ کار صحافی اور ادیب عبدالمجید سرور تھے فی الحال اس پر خموشی کا قفل لگ گیا ہے۔ شبیر احمد حاجی غلام رسول مالک اور طابع تھے۔

اہلِ ہُنر

مالیگاؤں خطاطی، تزئین کاری اور نقاشی کے ماہرین کے [illegible] اور شوقی تحریر سے شہر نگاراں اور نگارخانہ بنا ہوا ہے۔ مولوی ثوبان کی شخصیت [illegible] سب سے زیادہ جاذب نظر تھی وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے خطاطی اور کتابت کی باقاعدہ تربیت حاصل کی۔ مولانا عبدالحمید نعمانی نے ایک خوشنویس کی حیثیت سے انہیں اجل پرنٹ میں بھیجا تھا اُن کے معاصرین میں ماسٹر ابوالبرکات اور ماسٹر صدیق حسن شوق جیسے خوشنویس بھی تھے۔ آپ کے صاحبزادے حفیظ الرحمٰن جو اطہر الخیری کے نام سے معروف ہیں ایک خوش فکر شاعر، کہنہ مشق استاد اور تجربہ کار خوشنویس ہیں اطہر الخیری کے لڑکوں میں احمد امین ایک مانے ہوئے کاتب اور

تزئین کار ہیں۔ مولوی ثوبان درس و تدریس اور امامت کے فرائض منصبی میں اتنے محو ہوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہی۔

مولوی ثوبان ہی کے زمانے میں ابو البرکات اور حاجی غلام رسول حسن رقم بھی تھے، شوق تعلیم کا ذوق تھا، ذوق غالب رہا، ادھر ابوالبرکات پر موت غالب آگئی جبکہ اُن کا فن عروج پر تھا، حاجی غلام رسول حسن رقم کا شوق خطاطی جنوں کی حد تک تھا، انہوں نے اپنے فن کو بانٹا نہیں بلکہ شاگردوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں سکھلایا اور حق المعاوضہ سے اپنا ہاتھ خالی رکھا ان کے تربیت یافتہ شاگرد آج بھی خطاطی، تزئین کاری، طغرا نویسی غرضکہ تمام جملہ فنون میں دسترس رکھتے ہیں۔ حاجی غلام رسول حسن رقم کے ہاتھوں سے کاتب تقدیر نے زندگی کا قلم چھین لیا مگر ان کے شاگردوں نے ان کے فن کو زندہ رکھا ہے۔

مولوی ثوبان کے صاحبزادے حفیظ الرحمٰن اطہر الحجری نے خوش نویسی میں زبردست کمال پیدا کیا، اطہر الحجری نے شہر کے بے شمار اخبارات و رسائل کی کتابت کی ہے، آپ کا فن شہر میں مستند ہے، ان کے ہمعصروں میں غیاث الرحمٰن نے فنِ خطاطی میں کمال پیدا کیا ہے، ان کے ساتھ کے لوگوں میں محمد یوسف تشنہ کمال فن میں طاق ہیں، آپ نے بھی بیشمار اخبارات و رسائل کی کتابت کی ہے، یوسف رحمانی ایک بہترین خطاط اور آرٹسٹ ہیں ان کے بنائے سائن بورڈ نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ 'انداز گل افشانیٔ تحریر' کس کا ہے۔ ان کے چچا زاد بھائی عبدالرشید رحمانی مالیگاؤں کے پہلے سند یافتہ ڈرائنگ ٹیچر ہیں، ان دونوں حضرات کے بیشمار شاگرد شہر میں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں، رمضان پینٹر اور نثار پینٹر بڑے خوبصورت سائن بورڈ بناتے ہیں، رمضان پینٹر کی پینٹنگ بے نظیر ہے۔

احمد حنیف۔ حسن رقم غلام رسول کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اسکرین پرنٹنگ، خطاطی اور تزئین کاری میں اس وقت انہیں کا ہی سکہ چل رہا ہے، خاندیش سے بمبئی تک کی کتابوں کے سرورق انہیں کے بنائے ہوئے رہتے ہیں، شہر میں آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسکرین پر گوناگوں رنگوں کو چھاپنے کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ آپ کے بنائے ہوئے ٹائیٹل دیکھ کر داد و تحسین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔

عبدالرزاق سردار بھی حسن رقم کے شاگرد ہیں طغرہ نویسی میں آپ کا فن عروج پر ہے، ان کے علاوہ الطاف احمد، عبدالرحمٰن رہبر، جمال ہاشم، یوسف جمال، احمد امین اطہر، احمد سعید اطہر، اکبر مرزا، گل ایوبی، جمیل ماسٹر عارف القلم، اقبال احمد، آصف سبحانی، سراج دلدار جیسے مایۂ ناز کاتبین شہر میں موجود ہیں اور کتابت و خطاطی کا بلند معیار قائم کئے ہوئے ہیں۔

آرٹسٹوں میں مختیار سعید باقاعدہ سند یافتہ فنکار ہیں، یوسف رحمانی، خورشید درخشاں، جمال آرٹ، غلام رسول پرنٹر، محمد حسین عبدالسمیع، شاہد عبدالرشید رحمانی وغیرہ بڑے ممتاز آرٹسٹ ہیں، عبدالرشید ماسٹر جے جے اسکول آف آرٹ بمبئی کے تربیت یافتہ ہیں۔

عبدالخالق ماسٹر بھی اسی مرتبے کے فنکار ہیں۔ یہ دونوں مولوی عبدالرحمٰن کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔

فنِ موسیقی اور مالیگاؤں

موسیقی کی حرمتِ شرعی کے تاروں کو مضرابِ شریعت سے چھیڑا جائے تو دلدادگانِ موسیقی کے 'جرق' دمنڈلی، یا طائفہ میں موسیقی کا ماتم شروع ہو جائے گا اور اگر اس میں شرعی رخصت کی گنجائش ڈھونڈھی جائے تو اربابِ عمائم، حاملینِ علوم کتاب و سنت اور صاحبانِ نظر و اجتہاد فی الدین کے حلقے سے آوازۂ تکفیر چھڑ جانے کا خطرہ ہے۔

بہتر تو یہی ہے کہ ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جائے اور دامن بچا کر امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا دامن پکڑ لیا جائے جنہیں نوجوانی سے فنِ موسیقی کے مطالعہ اور مشق کا بھی شوق رہ چکا ہے اور اس "خانماں خراب شوق" نے نجانے کتنی گلیوں کی خاک چھنوائی تھی، فرماتے ہیں:

"اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا ذہنی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے، حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہائے سدِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی

البتہ تقنین کا باب تشریع سے ہے۔ تقنین کا میدان نہایت وسیع ہے، ہر چیز جو سوء
استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، تقنیناً روکی جا سکتی ہے، لیکن اس سے تشریع
کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔" [1]

مولانا موصوف خود اپنا دامن بچا کر آگے نکل گئے اور اس مبحث کو چھیڑا نہیں بلکہ مومن کا یہ شعر لکھ کر گویا رخصت کا جواز لے لیا۔

مومن آ کیشِ محبت میں کہ سب کچھ ہے روا　　حسرتِ حرمتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

—— اور مزامیر پر ہی شریعت کی سخت ضرب پڑی ہے [2]، موسیقی کی زمزمہ پردازی اور مغنیانِ خوش نوا کی سحر آفرینیوں نے ہی اسے شرع میں 'ملاہی' یعنی محرمات شرعیہ میں داخل کر دیا ہے، اسلامی نظامِ حکومت میں محتسب [3] اور قاضی کی سختیاں نہ ہوتیں تو ہر بارگاہ اور دربار 'بوستان' تھا۔ ہر کاشانہ اور ہر آستانہ غالب کے ان اشعار کا نقشہ بن جاتا ؂

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی　　مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ　　یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

عرب و ایران میں علمِ موسیقی میں ایسے ایسے باکمالانِ فن پیدا ہوئے ہیں کہ جن کے حسنِ تقسیم اور دقتِ ترتیب نے نفسِ فن کی دقیقہ سنجیوں کو ریاضی کی گتھیاں بنا دی ہیں، موسیقی کا مزاج درحقیقت ترکیبی واقع ہوا ہے اسی لئے موسیقی کا سارا معاملہ مفرد اصوات (آواز) اور الحان (سُر) کی تالیف سے وجود پذیر ہوتا ہے اور ہندستان کے موسیقاروں اور باکمال ماہرینِ فن نے اس معاملہ کو جن گہرائیوں تک پہنچایا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ فلسفۂ اسلام نے بھی فنِ موسیقی پر موسیقی کو ریاضی کی شاخ ثابت کر کے بڑی عالمانہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں ابوالفرج علی الاصفہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی کتاب الاغانی اور حمد بن محمد بن

---

[1] غبارِ خاطر، ابوالکلام آزاد۔ ساہتیہ اکادمی۔ نئی دہلی ۱۹۶۷۔ مکتوب نمبر ۲۴ صفحہ ۲۵۰

[2] موسیقی کی حرمت شرعیہ کے بارے میں دیکھئے، فتاویٰ رحیمیہ ج ۲ ص ۳۲۲، مشکوٰۃ، باب البکاء والخوف، بیہقی، شعب۔ غایۃ الاوطار اردو ترجمہ درمختار ج ۴ صفحہ ۲۴۷

[3] محتسب اور قاضی اور موسیقی پر پابندیوں کے بارے میں دیکھئے معالم القربۃ۔ ابن الاخوۃ — انگریزی ترجمہ اور ابن تیمیہ الحسبۃ فی الاسلام

عبداللہ الاندلسی (متوفی ۳۲۸ھ) کی العقد الفرید کی گونج چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ابونصر فارابی نے موسیقی کے ساز قانون پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ رسائل اخوان الصفا میں فیثا غورث کو نظریۂ موسیقی کا بانی کہا گیا ہے جس نے اسے ریاضی کی شاخ کہا ہے، اخلاق جلالی اور اخلاق محسنی وغیرہ کتب اخلاق میں یہی نظریہ بیان کیا گیا ہے، اور موسیقی سیاست مدن اور تدبیر منزل کی طرح اخلاقیات کا ایک باب بن گئی ہے۔ فلاسفۂ اسلام میں الکندی، ابن رشد (م ۱۱۹۸ء) الرازی (۸۵۰-۹۲۳ء)، ابن سینا (م ۱۰۳۷ء) اور الفارابی نے جو خود ایک "نے نواز" تھا موسیقی کو نوازا ہے۔ امام غزالی (م ۱۱۱۱ء) نے سماع کا دفاع کر کے موسیقی کے آہنگ کو تیز تر کر دیا[1] اور صوفیائے کرام کی خانقاہوں کو سماع و وجد و حال سے نغمہ بار بنا دیا۔

بنو امیہ کے عہد میں حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً و تعظیماً میں بازنطینی اور ایرانی مغنیہ کنیزوں (قیان) کا ہجوم زمزمہ پرداز تھا، جمیلہ (۷۲۰ء) حبابہ اور سلامہ بڑی خوش گلو مغنیائیں تھیں، خلفائے عباسی میں سے الواثق (۸۴۲-۴۷ء)، المنتصر (۸۶۱-۲ء)، المعتز (۸۶۶-۹ء) اور المعتمد (۸۷۰-۹۲ء) نہ صرف موسیقاروں کے سرپرست تھے بلکہ خود بھی مطرب خوشنوا تھے۔ ہارون الرشید کا بھائی ابراہیم ابن المہدی استاد باکمال تھا، اس کا شاگرد مخارق (م ۸۴۵ء) جو ہارون کے دربار کا عظیم فنکار تھا بچپن میں اپنے باپ قصاب کی دکان پر گاہکوں کو پکارا کرتا تھا۔ اس کی پاٹ دار آواز سن کر ایک مغنیہ نے اسے موسیقی کی تعلیم دی اور وہ اپنے زمانے کا باکمال موسیقار بن گیا۔ ایک شام اس نے جب وجد میں آکر گنگنانا شروع کیا اور دجلہ کی طرف روانہ ہوا تو دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں مشعلیں جگنوؤں کی طرح ٹمٹمانے لگیں یہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھیں جو اس باکمال مطرب کا گانا سننے کے شوق میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے، ابراہیم الموصلی اور اس کا بیٹا اسحاق الموصلی اپنے فن میں یگانۂ روزگار۔

ہندوستان میں موسیقی کی تاریخ بڑی قدیم ہے، لیکن مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں اس کا آہنگ بلند ہو گیا، ملتان، اجودھن، گوڑ، دہلی اور اجمیر کی صوفی خانقاہوں میں وقت کے بڑے بڑے باکمال حاضر ہوتے تھے اور "برکت و قبولیت" کے لئے اپنا اپنا جوہر کمال پیش کرتے تھے، جونپور، مانڈو، بیجاپور، آگرہ، برہانپور، گولکنڈہ، وربار کی سرزمین موسیقی کے

---

[1] احیاء علوم الدین ج ۲ ص ۲۳۸

علم و عمل کی آماجگاہ بن گئی تھی، اس عہد کے مقدس علمائے عظام گو موسیقی کے اشتغال سے دامن کش رہے لیکن فن کے ماہر اور نکتہ شناس تھے، ملا عبدالقادر بدایونی، ملا عبدالسلام لاہوری، مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر درد فن موسیقی کے ایسے باکمال اُستاد تھے کہ وقت کے بڑے بڑے کلاونت کی گائکی کو ان کی ایک ہلکی سی جنبش۔ استھائی کو الاپ میں بدل دیتی تھی۔ مشہور عالمگیری امیر فقیر اللہ سیف خان کی کتاب راگ درپن۔ آج بھی ہندستانی موسیقی کے دقیقہ سنج فن کا آئینہ بنی ہوئی ہے۔ اس آئینے میں مالیگاؤں کی انصاری برادری کے ذوق موسیقی کا عکس دیکھتے وقت غالب کے یہ دو شعر ضرور گنگنانے پڑیں گے ؎

ہر ذرہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم | لعوب ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
سازِ زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن | نہ سر و برگ ستایش نہ دماغ نفریں

فیمس میوزک سینٹر مالیگاؤں

دن بھر کرگھے پر ضرب مارنے کے بعد مومن عارف کو یک گونہ بیخودی کی ضرورت پڑتی تھی، ذوق شعری بزم غزل کا گیسو سنوارتی اور ذوقِ نغمہ ساز اٹھا لیتی، موسیقی اور شاعری ایک ہی حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ دونوں میں حسنِ ترکیب اور تناسب کی مہارت درکار ہے جذبات کا دھارا شعر و معنی میں بہے یا نغمہ و ترنم میں ڈوب جائے۔ بات ایک ہی ہے ایسے ہی کچھ باذوق حضرات مالیگاؤں میں "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے"۔ کی تلاش میں ایک دوسرے کو مل گئے۔ نور محمد طاجی، عبداللطیف قوال، بہادر قوال، محمد یعقوب بینڈ ماسٹر، قمر مالیگانوی (دھن بنانے والے) عبدالستار سبحانی (ستار نواز) محمد عمر ماسٹر (برادر خورد جمیل مالیگانوی)، محمد سلیم باجے والے وغیرہ باذوق حضرات ہم آہنگ ہو گئے، موسیقی کی محفلیں گرم ہونے لگیں اور فن موسیقی پر مباحثے اور مذاکرات سے اس فن اور علم کا چرچا عام ہو گیا، مگر یہ ... تھے۔ ... کے ایک ریڈیو مسلم ہوٹل میں حاجی غلام رسول حسین رکھے ریکارڈ ... جو ایک مجوبہ بن گیا، کلاسیکی موسیقاروں کی بندشیں تو عموماً گراموفون سے سنائی دیتی تھیں، یہ نوجوان جو گنے چنے تو تھے بکھرے ہوئے سُروں کی طرح اکٹھا ہوئے تو سرگرم ہو گئے سلامت اللہ، یوسف رحمانی، رمضان بھائی، اسرائیل مقادم، محی الدین عبدالرحمن، محمد حسن، نذیر ... یہ چند ہستیاں ہیں فیمس میوزک کلب کے بنیادی رکن تھے نغمہ کی

برادری کا مالیگاؤں میں یہ پہلا سنگیت اور موسیقی کا ادارہ تھا اس کے ممبران سازِ سنگیت اور گائکی کے فن سے واقف تھے۔ بینجو (چپارا) ساز بجانے والے ماہرین میں یوسف رحمانی، رمضان بھائی، عبدالرزاق سردار بڑے نمایاں تھے، گانا بھی گاتے تھے لیکن رمضان بھائی کی آواز میں جو نغمگی پہلے تھی وہ اب بھی ہے، آواز میں سوز ہے اور فن میں مہارت حاصل ہے جب وہ غزل چھیڑتے ہیں تو لوگ عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں، لے اور دھن کا ملا جلا سنگم سرگم کا سمندر بن جاتا ہے، دل میں احساس کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں، جذبات کی لہروں میں ہیجان برپا ہو جاتا ہے، طبیعت میں خود رفتگی اور محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ یہ سحر آفرینی رمضان بھائی کے فن کا کمال ہے۔ انہوں نے غزل کی گائیکی کا ایک نرالا انداز پیدا کیا ہے، اس میں راگوں کے سُر بھی ڈھلتے ہیں اور غزل سرائی کی ادائیں بھی اٹھکھیلیاں کرتی ہیں رمضان بھائی کی خدمات تعلیمی اداروں کے لئے وقف ہو چکی ہیں، بچوں کے لئے گیتوں اور نظموں کی دھنیں بناتے ہیں جو معصوم جذبات سے معمور اور سرشار ہوتی ہیں، ان کی بنائی ہوئی غزلوں اور حمد و نعت و منقبت کی دھنیں سن کر لوگ سر دھنتے ہیں۔

فینس میوزک سینٹر کے دوسرے فنکار نذیر حکیم ہیں جنہوں نے باقاعدہ یہ علم سیکھا ہے اور اس فن میں ماہر دستگاہ حاصل کی ہے، آگرہ کے ڈاکٹر وحشی سے انہوں نے راگ اور راگنیوں کی معلومات حاصل کی ہیں، ڈاکٹر موصوف خود معارف النغمات کے مصنف راجہ محمد نواب علی خان تعلقدار اکبر پور کے شاگرد ہیں، موصوف ہندستانی موسیقی کے ماہر اور سرپرست تھے بھاتکھنڈے یونیورسٹی لکھنؤ کی تشکیل میں راجہ صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ کلب میں نذیر حکیم کی حیثیت ایک گرو یا استاد کی ہے۔ یوسف رحمانی ایک ماہر خطاط بھی ہیں اور موسیقار بھی۔

۱۹۵۰ء کے بعد کلب کے ایک ممبر ریاض علی اکبر علی پہلے سنگیت کے گریجویٹ بنے۔ برادری کے آپ پہلے فرد ہیں جنہیں یہ شرف اور اعزاز حاصل ہوا، آپ موسیقی کی دھنیں بھی بناتے ہیں اور اچھا گاتے ہیں، سنگیت وشارد کا امتحان پاس کرنے والوں میں رمضان بھائی اور نذیر حکیم بھی ہیں۔ فینس کلب کے دیگر ممبران جو محفلِ نغمہ و سرود کی جان ہیں ان میں یوسف رحمانی اور عبدالرحمٰن کے اسمائے گرامی خاص ہیں۔ حاجی چراغ احمد طبلہ نواز تھے۔ سنگیت کی محفلیں سجتی رہیں۔۔ اور وقت کی لہروں

ساتھ نئے موسیقار اور نوازندے کلب سے وابستہ رہے لیکن ۱۹۶۹ء کے سیلاب میں کلب کا سارا اثاثہ بہہ گیا — اور نغمہ و سرود سرد پڑ گیا، محفل اجڑ گئی، پھر ایک بار کچھ اور نئے اور پرانے اہل ذوق طرب و نغمہ ہم آہنگ اور جمع ہوئے اور میونسپلٹی سے جگہ حاصل کر کے فیمس میوزک سینٹر کا دوبارہ اجراء کیا ان میں احمد حنیف مشہور آرٹسٹ اور اسکرین پرنٹر، نذیر حکیم، یوسف رحمانی اور بالخصوص رمضان بھائی پیش پیش تھے۔

دوسرے ادارے بھی فیمس میوزک سینٹر کی آواز سے آواز ملا کر چل رہے ہیں اور بہت سارے ماہرین فن بھی نمودار ہو رہے ہیں، عبدالرزاق سردار، کرم اللہ ملو، حیدر بھائی، شبیر احمد صدیقی (مرحوم) وغیرہ دلدادگان موسیقی ہیں، ان موسیقاروں کے علاوہ نئی نسل کے فنکاروں میں شاہد اختر کا نام سب سے زیادہ بلند آہنگ ہے آپ نے ابتدائی تربیت رمضان بھائی سے حاصل کی بعد میں کرانہ گھرانہ کے استاد پدم شری فیاض احمد خان صاحب کی شاگردی اختیار کی۔ شاہد اختر ایک ابھرتے ہوئے گائک ہیں آپ مالیگاؤں کے مشہور تاجر اسحاق سوت والے کے نواسے ہیں۔

احمد حنیف آجکل فیمس میوزک سینٹر کے سیکریٹری اور روح رواں ہیں۔ [1]

---

[1] اصول النغمات الآصفیہ۔ عہد آصف الدولہ کی فن موسیقی پر شاہکار کتاب تھی۔ ہندوستانی موسیقی پر آج تک ایسی مفید معلوماتی اور علمی و فنی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں ٹھمری زیادہ مقبول ہوئی، اس کے ساتھ ہی پوربی بولی کا آہنگ بھی بلند ہو گیا۔

ادارہ: سمجھتے ہیں ہم نے ان شعراء اور ادباء کا بھی ذکر کر دیا ہے جو برادری کے نہیں ہیں لیکن ان کی ادبی خدمات کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ادب و زبان کی بقا اور ترویج و اشاعت میں ان افراد کا بھی بڑا حصہ ہے۔

تینتیسواں باب

جزائر بمبئی کی ہندستانی۔ انصاری برادری

سترھویں صدی کے جزائر بمبئی میں پرتگیزی نوآبادیاتی نظام کی سیاہ رات دم توڑ رہی تھی، دولتِ انگلیسیہ کا وہ خیرہ کن سورج طلوع ہو رہا تھا جو صدیوں تک غروب نہیں ہونے پایا، اس کی پَو پھوٹی تو بمبئی کے خوابوں کے جزیرے جاگ اٹھے، ۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے چارلس دوم سے جہیز کے جزیرے کو پٹے پر لے لیا، تجارتی کمپنی کا تجربہ نیا تھا مگر نتیجہ بڑا خوشگوار نکلا، معاشی حالت تیزی سے بدلنے لگی اس کے ساتھ بکھرے ہوئے جزیروں کی جغرافیائی ہیئت بھی تبدیل ہونے لگی، اقتصادی خوشحالی کا دور شروع ہوا اور نئے آبادکاروں کا سلسلہ بندھ گیا، دور دور سے لوگ تلاشِ معاش میں آنے لگے اور جزائر بمبئی کے تیس لاکھ درختوں کے مرطوب سایوں میں سمٹنے اور پھیلنے لگے، ڈاکٹر جون فرائر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ۱۶۷۵ء میں یہاں کے مضرِ صحت اور "انگریز کُش" آب و ہوا میں ساٹھ ہزار انسان آباد تھے، تھانہ اور چیول دھیموں سے قدیم سکونت کا تانا بانا توڑ کر سوتی اور ریشمی کپڑوں کے بُنکر یہاں بسنے لگے، سات جزیروں کے 'بنات النعش' جگمگ میں سہاگ کی اس نشانی "عروس البلاد" بمبئی کے کجلائے چہرے سے چلمن ہٹتی جا رہی تھی۔

ڈاکٹر جون فرائر کا سفرِ کوکن[1]

"اپریل ۱۶۷۵ء کی ایک گرم مرطوب دوپہر میں ڈاکٹر جون فرائر کا بارہ چپوؤں والا بجرا، دبان کھولے ٹانا و تھانہ کی طرف روانہ ہوا، رات کے پچھلے پہر پرتگیزی تھانہ کی نیچی بندرگاہ میں ان کا بجرا لنگر انداز ہوا، فرنگی عملداری کے اس صنعتی قصبے پر سیب دری کی

---

[1] ڈاکٹر جون فرائر کا سفرنامہ (انگریزی) ج ا ص ۱۳۲ یہ سارا بیان مختلف مصادر پر مبنی ہے اور زیادہ تر راقم کی تصنیف تاریخ کوکن سے نقل کیا گیا ہے ص ۳۹۳، ص ۴۰۰

سرمئی چوٹیوں پر شیوا جی کے دیو پیکر قلعے تاروں کی چھاؤں میں دھندلے خوابوں کی طرح
دکھائی پڑتے تھے ــ اور ڈاکٹر فریئر کے تصور کے "فانوس خیال" میں تھانہ کے ململ کی
پرچھائیاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگیں ..... !!

• دو سو برس پہلے یہ محمود بیگڑا کی گجراتی سلطنت کی آخری اقلیم کا صدر مقام تھا۔ اس شہر
کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ ماربوسا سیاح اسے تانہ مینبو لکھ کر اس کے نام میں ممبئی اور
مہائم کو بھی مدغم کر دیا تھا۔ گو دابھول اور چول کی تجارتی رونق کے آگے "بندرگاہوں کے
بادشاہوں" کی اس قدیم بندرگاہ کی بحری تجارت ماند پڑ گئی تھی مگر اس کی مسلم بستی میں بڑی
رونق رہتی تھی۔ یہاں نوائطیوں کی بنائی ہوئی عربی طرز تعمیر کی شاہکار مسجدیں تھیں۔
بہجت انگیز بوستانوں میں بہاروں نے چھاؤنیاں ڈال دی تھیں۔ لیکن بحری تجارتی راستوں
پر قزاقوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے اور تھانہ کی قدیم صنعت پارچہ بافی کے تانے بانے
ٹوٹ چکے تھے۔ جب دسمبر ۱۵۳۴ء کے معاہدے کی رو سے اس قصبے کی انتظامی باگ ڈور
پرتگالیوں کے ہاتھوں میں آئی تو چرخے کی مال اور چرخیاں دوبارہ گردش کرنے
لگیں۔ اور زردوزی کے زرتار کارچوب اور ململ کے بارہ سو ۱۲۰۰ کرگھوں کے تار و پود سلجھنے
لگے جو فرنگیوں اور گجراتیوں کی لوٹ کھسوٹ کے سبب باشندوں کے بھاگ جانے سے
بند پڑے تھے۔"

• سولہویں صدی کا تانا بانا ٹوٹنے سے پہلے تک اونی، سوتی اور ریشمی پارچہ جات اور رنگین
ملبوسات کی تجارت بدیسی منڈیوں میں اپنا رنگ جما چکی تھی اور مقامی مہین ریشمی کپڑے
"ٹیسیا" کی مانگ تھانہ کے چاول کی طرح پرتگال میں سب سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اس کپڑے کی یہ خاص
قسم کا تھا رو ازہ (تھانہ) کے عیسائی بنکر (ترباز) تیار کرتے تھے جب کہ راولڑی (دمن)
میں مقیم بوانسلی نور باف اور ان کے ساتھ گجرات کے نو مسلم دانتی[۱] قبیلے نے کارچوبی اور

---

[۱] آج کل اس فرقے کی شناخت شہر کی بھیونڈی میں واقع اور واجہ مستعمل ہے جبکہ مہائم اور باندرہ میں "دُبجہ
دبلیاں"، [illegible] ہیں۔ بھیونڈی کی ایک فارسی دستاویز میں آنجا اور انجا لکھا ہے (۱۸۱۱ھ) دیکھیے
مومن محی الدین، تذکرۂ حضرت دیوان شاہ صاحب (بھیونڈی) ص ۲۳۔ میمن قوم میں داکجہ ــ اور وجارہ قسم
کے القاب ملتے ہیں۔ [illegible] کی رو سے 'واجہ' گجرات کی ایک نو مسلم قوم تھی۔

زرتار پٹکے اور روپہلی تاسعف کی کامدانی میں اپنے آبا و اجداد کی طرح بے حد نفیس چیزیں پیدا کرلی تھیں، رنگین چوکڑیہ تہہ بھیونڈی اور تھانہ میں بُنا جاتا تھا جو صرف ڈاز تک 'پتری' کے نام سے مشہور رہا ہے (ڈ غالباً یہ رنگریزیتہ) برقع جس پر تصویریں کشیدہ کی جاتی تھیں، رومال، ٹوپیہ اور چادر کا بگڑا ہوا اور مخفف نام ہو تاقرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نام کے واضح قبیلہ کا یہی پیشہ تھا، ململ کی بافندگی اور زردوزی اس علاقے میں کچھ کم قدیم صنعت نہ تھی، جیسا کہ ۱۴۲۲-۲۳ء کی جنگوں میں سلطانِ گجرات کی فوجوں کے ہاتھ آئے مالِ غنیمت میں اس قسم کے پارچہ جات کی موجودگی سے ثبوت ملتا ہے۔

عرب ممالک کے دبابزاد اور پرتگال کے مال بردار جہازوں کو تھانہ کے ریشمی اور سوتی کپڑوں کے تھانوں سے لدا پھندا دیکھ کر ڈاکٹر جون فریئر کا تصور ماضی کی بھول بھلیوں سے نکل کر 'حال' کی سیدھی ڈگر پر نکل آیا اور اسے ضرور تعجب ہوا ہوگا جب اس نے سنا ہوگا کہ ان کپڑوں کی تجارت بدیسی منڈیوں میں مسلسل چار سو برس سے اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے تھی ——

ڈاکٹر جون فریئر کا بجرا الہاس ندی پر تیرتا ہوا آگے بڑھتا رہا ——

۱۶۵۷ء

"صدیوں برس کا طویل سفر طے کرکے رواں دواں وقت کی ایک ہزار چھ سو ستاون ویں منزل پر کلیان کا تھکا ماندہ اور اداس شہر لاوارث بچے کی طرح سہما ہوا بہتی ہوئی ندی کے کنارے سستا رہا تھا، دکن کے سیاسی جمود کی طرح سارے پرگنے پہ سرمائی کہرا چھایا ہوا تھا جس کی کہلائی چلمنوں سے قدیم مسجدوں کے کالے اور سفید مینار اور گنبد سرمئی چادروں میں ٹھٹھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ شمال مغرب کے سیلاب دن میں کالی ندی کا اپنا عکس دیکھتے ہوئے صرف چودہ سال گذرے تھے۔ آخری برسات کے پانی سے بھری ہوئی ندی میں دور دور تک زنانتی بجرے اور کوکن بندرگاہوں کی بادبانی کشتیاں اور ڈونگیاں ڈول رہی تھیں۔ بندر کے ناگین گھاٹ پر سیدی خان کے ماندھلی اور حبشی غلام اسباب تجارت کی باربرداری میں مشغول تھے۔ ان میں اورنگ اور جزائر ہمیشہ کے نمکساروں کا نمک تھا۔ اتھرلی دھیبڑی کے نواحی جنگلوں کی عمارتی لکڑیاں تھیں جس کے بیوپار نے زنانتی تاجروں کو اقتصادی استقامت بخش دی تھی۔ پرتگیزی تھانہ کے کاتھاواڑی دورایونی محنتوں میں بٹ گئے" ارمیسیا "ہیپی رکی

کپڑوں کے تھان تھے اور زرتار پٹکوں کے لچھے اور بادلے کی روپہلی آنٹیاں تھیں۔ آدھے دن کے راستے پر واقع کلیان کی تجارتی منڈی اسلام آباد۔ بھیونڈی کے ساگی اور کھتری بنکروں کے بنے ہوئے گاڑھے کے گٹھے تھے اور ان سب سے زیادہ نمایاں دکن کے نفیس اور پرتکلف پارچہ جات تھے۔ —— اب ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کا زمانہ تھا۔!!!

سارا ملک انگریزوں کے استبداد اور استعماریت کے بوجھ سے سیاسی طور پر اپاہج بن چکا تھا، بدیسی معیشت کی بیساکھیاں لے کر اُجڑے ہوئے صنعتکار کھڑے ہو گئے، بدیسی سرمایہ بندرگاہوں کے ذریعہ ملک میں داخل ہونے لگا، نئی نئی صنعتیں قائم ہونے لگیں، پرتگیزوں کے نوآبادیاتی نظام میں پروان چڑھنے والی جاگیرداری معیشت آہستہ آہستہ تجارتی معیشت (فنانشیل اکونومی) کے دھاروں میں بہنے لگی، اس نئی معاشیات نے سماجی حالات کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔

ہجرتِ انصاریان

انیسویں صدی جسے "سیاہ صدی" کہنا چاہیے بڑے خونچکاں حادثات، المناک واقعات، اندوہگیں سانحات، دلخراش [illegible] سے بھری پڑی ہے، مغلوں کے شاندار دور کا دفتر پڑھ لیا گیا تھا، مرہٹوں کی ریڑھ ٹوٹ چکی تھی، سلطنتِ خدادادِ میسور کا جنازہ تیار ہو چکا تھا، اور انگریزی تسلط اور استبدادی [illegible] بڑی دھوم دھام سے بنگال سے بمبئی تک بڑھتے جا رہی تھی، امتِ مسلمہ کی قوت کی مرکزیت [illegible] منتشر رہے [illegible]، صرف زوال ہی زوال تھا۔

۱۸۵۷ء کے بعد اس خطہ کی معیشت و صنعت کے تار و پود بکھر گئے، کرگھوں کا دم اکھڑ گیا، [illegible] کی گردش تھم گئی اور ۱۸۶۰ء تک "درم و پیسے بر سر راہ" تھا و نوربافوں کے لیے بس [illegible] ان پر عجب وقت آن پڑا تھا، مجاہدینِ آزادی کی املاک بحق سرکار ضبط اور [illegible] خوف و دہشت کی سنگینوں کے سائے میں زندگی سہمی سہمی گذر رہی تھی اور [illegible] "قحط اور بھکمری کے خوفناک دانتوں کو زیر سے نگل جانے کو کھڑے تھے [illegible] فرقہ وارانہ فسادات تباہی اور ہلاکت کا ننگا ناچ ناچتے

[illegible] صفحہ ۳۰۶

رہتے تھے۔ الٰہ آباد میں دس ہزار کرگھوں میں سے چار ہزار کی سانس چل رہی تھی، ٹانڈہ میں ۱۱۲۵ کرگھوں میں سے ۱۸۸۰-۸۱ء تک ۸۷۵ کام کر رہے تھے، نیپال کو یہاں سے لاکھوں روپوں کی لاگت کا مال بھیجا جاتا تھا۔ جونپور میں ۱۸۶۰ء کے مسلسل قحط کے سبب ۳۰۱۲ باقہ لگ میں سے ۱۹۸۶ کے لگ بھگ تانوں بانوں سے جڑے ہوئے تھے، بنارس، مئو، مبارک پور، ٹانڈہ اور جائس کے گرہستوں اور کارخانہ داروں کے تجارتی تعلقات شاہانِ اودھ، نوابوں اور راجاؤں سے تھے نیپال کے راجہ اور حیدر آباد نظام کے توشہ خانوں میں انہیں کے کرگھوں پر بُنے ہوئے کپڑوں کے ملبوسات موجود رہتے تھے۔

پہلی جنگ آزادی کا نتیجہ بڑا مایوس کُن اور ہمت شکن تھا، حال بے حال اور یکسر غیر اطمینان بخش اور مستقبل ایک خواب پریشاں بن گیا تھا، انگریزوں کی استبدادیت کا مقابلہ ایک خوب اور خیال بن گیا تھا، ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک دار و رسن کی آزمائش ایک اذیت مسلسل تھی۔ لکھنؤ کے جلاہے تلاش معاش میں باہر نکل گئے، غازی پور کے نوربافوں نے ماریشس سے تانا بانا جوڑ لیا، ۲۹ ہزار کے لگ بھگ یہاں سے دوسرے شہروں میں جا کر بس گئے، بنارس سے بیس ہزار، جونپور سے سترہ ہزار اعظم گڈھ اور بلیا سے ۲۵ ہزار بنکر اور مزدور ہجرت کر گئے، الٰہ آباد کے غریب بنکر معاشی بحران کے بھنور میں پھنس کر ڈوب گئے، پرگنوں میں جہاں کرگھے غدر کے ہنگاموں میں بند ہو گئے تھے وہاں یہ دل چلے ٹھہر نہ سکے نکل پڑے، ہجرت کے اسباب میں خدمت کا جذبہ بھی تھا، اعظم گڈھ کے انصاری حضرات عدن، حجاز، ملائشیا، انڈونیشیا اور سنگاپور میں جا کر بس گئے اور بڑی تعداد نے برہانپور، دھولیہ، مالیگاؤں، بھیونڈی، بمبئی اور حیدرآباد وغیرہ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی، ان میں شعراء، ادباء، علماء و فضلاء اور حفاظ پیدا ہوئے۔ آج بھی مشرقی جنوبی ایشیا میں سنگاپور، فیجی آئی لینڈ اور فلپائن وغیرہ میں پرانے پرکھوں کی اولاد موجود ہے[1]، جو جونپور اور اعظم گڈھ سے ہجرت کر کے ان شہروں اور ملکوں میں بس گئی تھی۔ ویسٹ انڈیز اور افریقہ کے صوبوں میں بھی انیسویں صدی کے مہاجر انصاریوں کے خاندان موجود ہیں، مسلمان کے لئے "ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدای ماست۔" اسی لئے اس کو ایک تنگنائے میں زندگی بسر کرنے کا سبق نہیں دیا گیا ہے جبکہ آفاق کی

---

[1] ڈاکٹر محمد انصاری (ماہم) کے بیان کے مطابق اعظم گڈھ کے انصاری مہاجرین کی اولاد آج بھی سنگاپور وغیرہ شہروں میں موجود ہیں۔ ان کی رشتہ داری بھی انہیں سے ہے۔

ساری پہنائیاں اور کائنات کی بیکراں وسعتیں اس کی منتظر رہتی ہیں' حب الوطنی اور حب الٰہی کے درمیان فرقِ مراتب کی ایک باریک لکیر ضرور کھینچی ہوئی ملیگی حب الوطنی سے افضل حُبّ الٰہی اور خدا کی بندگی ہے جہاں بھی مومن اس کا بندہ بن کر رہ سکتا ہے وہاں چلا جائے اور خدا کی بندگی کرتا رہے[1] وطن سے دور سہی' بیکسی کی موت سہی سہ

ماراد یار غیر میں مجھکو وطن سے دور
رکھلی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

انصاری۔مومن برادری کی مہاجرت کا سلسلہ ۱۸۵۷ء کے زمانے سے متعین کیا جاتا ہے جو تاریخی حقائق کی روشنی میں بہت دیر بعد کا ہے جب کہ یہ سلسلہ وقفہ وقفہ سے انیسویں صدی کی پہلی دہائی سے شروع ہو چکا تھا اور کئی ادوار پر محیط تھا' اسباب دعلل بھی متنوع تھے' تکوینی حوادث میں طاعون' بھکری اور کال' پھر معاشی بحران اور سیاسی ہیجان' تلاشِ معاش اور ستم ہائے روزگار نیز خدا کے خیال سے برادری خانی نہیں رہی' غدر کے ہنگاموں کا پُرآشوب زمانہ ہجرت کی تاریخ ایک اہم موڑ اور سنگِ میل تھا اور ۱۸۶۲ء-۶۲ء کے بعد کا دورِ مصائب وابتلا کا عبوری دور تھا۔ کرگھے ٹوٹے تو باشنگی کی قبر کے برگے بن گئے' گھر بار لُٹا تو لٹیروں کے گھر آباد ہو گئے' وطن چھوٹا تو بے وطنی نے بڑھ کر قدم لیے' گاؤں کا گاؤں نکل پڑا' قافلہ در قافلہ بنتا گیا' کچھ دور تک بیل گاڑیوں نے بوجھ کو سہارا' کبھی شتربانوں کے حُدی کے تیز تر نغموں نے محملوں کی گراں رفتاری کو مہمیز دی' پیادہ پا سفر کی کئی منزلیں ماریں' کچھ راستے میں جاں بحق ہوئے' دررِاہ آخرت کے مسافر بن گئے' شمالی ہند کو مغربی ہند سے ملانے والی شاہراہ "آگرہ روڈ" رگِ جاں بن گئی' فرہاد کی طرح چٹانوں کو تراشا' مجنوں کی مانند سنگِ گراں سے سر پھوٹا اور ہاتھ پیر زخمی کیے' پتھر کوٹا' جگر کو پیٹا' بد نصیبی کو روئے اور سڑک کے سخت فرش پر سوئے' بچے چلتے چلتے تھک جاتے تو ٹوکریوں میں اٹھا لیتے ــــ پہلی منزل آئی یہ جبلپور تھا ــــ یہاں زمانۂ قدیم سے مومن بُنکر آباد تھے۔

جبلپور ــــ آگرہ اور کانپور کے کچھ خاندان یہیں بس گئے' اور ان کی اولاد پھلی پھولی۔

---

[1] یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ (العنکبوت: ۵۶)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو' میری زمین وسیع ہے' پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ"

جھانسی — میں بھی حضرات انصار آگرہ، کانپور اور دہلی سے ہجرت کر کے آئے اور بس گئے، لیکن پارچہ بافی کے آبائی پیشہ کو ترک کر کے دوسری صنعتوں کی طرف راغب ہو گئے۔[1]

— ہوشنگ آباد اور بھوپال میں نوابوں کے زمانے سے مومن انصاری برادری کے کئی کنبے آباد تھے — اور ان میں بڑے پلیے کے ماہر کاریگر موجود تھے جنہیں امراء و بیگمات کی سرپرستی حاصل تھی، جہاں آگنج اور اعظم گڑھ کے قافلوں کا ایک ٹکڑا اسی سمت چل پڑا، ماہر کاریگروں کی ہوشنگ آباد اور بھوپال میں بڑی گرمجوشی سے پذیرائی کی گئی۔

انصاری مہاجرین ۱۸۵۷ء کے بعد وقفہ وقفہ سے مہاجرت کر کے دیار پورب اور مغربی اضلاع سے آکر بمبئی اور اطراف و اکناف میں آباد ہو گئے قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نہ صرف اس اہم تجارتی شہر سے واقف تھے بلکہ جس طرح انصاری تجار نیپال، حیدرآباد اور کلکتہ سے کاروبار کے سلسلے میں آمدورفت رکھتے تھے اسی طرح بمبئی اور دیگر مضافاتی صنعتی مراکز کا بھی سفر کرتے ہونگے ان کے وطن کے لوگ کچھ یہاں بسلسلۂ معاش آباد بھی ضرور ہونگے اور ان شہروں اور قصبوں کی تجارتی اور صنعتی اہمیت کا اندازہ بھی ضرور رکھتے ہوں گے اور خصوصاً اس حقیقت کا ان کو ضرور علم ہوگا کہ ناگپور اور برہانپور کے تاریخی شہروں میں مسلمانوں کی غالب آبادیاں ہیں۔ مغلیہ کے عہد سے ناگپور پر بخت بلند شاہ کی حکمرانی کا دور شروع ہوا، اور برہانپور کی بنیاد ہی مسلمان صوفیائے کرام کے ہاتھوں پڑی تھی اور یہاں صنعتِ پارچہ بافی عہدِ مغلیہ میں عروج پر تھی، مالیگاؤں اتنا قدیم نہ تھا لیکن یہاں دکنی مسلمانوں اور عربوں کی کثیر آبادی تھی اور بافندگی کی صنعت کو یہاں پر فروغ حاصل تھا۔ ۱۸۱۴ء / ۱۲۳۴ھ میں یہاں پنڈاریوں نے کپڑوں کی منڈی کو کئی بار لوٹا تھا۔ بھیمڑی کی قدیم بستی تو عہدِ عتیق سے اپنا تانا بانا جوڑے ہوئے تھی، صنعت بافندگی کے تار و پود بہت پرانے ہو چکے تھے، یہاں مسلمان بنکروں کی غالب آبادی تھی — اور بمبئی یہاں تو ملیں قائم ہو چکی تھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی بمبئی جزائر کو شاد و آباد رکھنے کے لئے اطراف و اکناف کے باشندوں کو ترغیب دے کر بلانے لگی، چیول اور بھیمڑی کے بنکروں کو یہاں لا کر بسایا گیا، ۱۸۵۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم ہوتے ہی بیرونی تجارتی کمپنیوں نے بھی فیکٹریاں کھول لیں

---

[1] تاریخ مومن۔ انصار ج ۲ ص ۴۵-۴۶

اور بمبئی کی بندرگاہ سے پارچہ جات کے علاوہ روئی دساور بھیجی جانے لگی۔ انگلستان میں سوت کاتنے اور کپڑے بننے کے، تو بنائی کی مشینیں ایجاد ہو چکی تھیں، مالوہ، گجرات اور وسطی ہند کے شہروں سے روئی کی گانٹھیں بمبئی کی بندرگاہ سے برآمد کی جانے لگیں کاٹن گرین جو پہلے بمبئی گرین تھا روئی کی گانٹھوں سے بھرا رہنے لگا۔ ۱۸۷۵ء میں دس لاکھ سے زائد روئی کی گانٹھیں دساور بھیجی جانے لگیں ان میں مانچسٹر سر فہرست تھا۔

صنعت پارچہ بافی کو فروغ حاصل ہوا ۱۸۵۴ء میں کپڑے کی پہلی مل قائم ہوئی بیس سال کے اندر پندرہ سوتی ملیں چلنے لگیں جن میں روزانہ گیارہ ہزار مزدور بیٹھے تنے بانا کرتے تھے، سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق شہر میں ہندو مسلم جولاہوں کی تعداد ۱۷۴۲ تک تھی جو ہاتھ کرگھوں پر کام کرتے تھے۔

ملوں کے ناموں سے مزدوروں کے مزاج، ذہنیت اور رائے کا اظہار ہوتا ہے وہ ہر ایک مل کو انہیں علامتوں سے یاد کرتے تھے، اسٹار آف انڈیا مل کو 'کھٹارا مل' نام دیا تھا کیونکہ اس کی مشینوں کا شور کھٹارا گاڑی کی "چرخ چوں" کی طرح کانوں کو پھاڑتا تھا، لونیج مل کو 'بین چینی جی گرنی' یا جنگی گرنی کہتے تھے گھوڑوں کے طویلے کے پاس ہانگ کانگ مل کو 'طبیلے جی گرنی' کہتے تھے۔ اسی طرح ملوں کے مختلف نام دیئے گئے تھے۔ بمبئی کی بندرگاہ سے ململ، اطلس، کیلیکو، لٹھا، سوتی اور ریشمی کپڑوں کی تھانیں دساور بھیجی جاتی تھیں۔

صنعت پارچہ بافی کے فروغ کے چرچے، ملوں کے قیام کی خبریں، پارسی اور انگریز تاجروں اور مل مالکوں کی مراعات و ترغیبات کی باتیں شمالی ہند کے "صنعتی و معاشی سناٹے" میں گونجنے لگیں۔

انصاری مہاجرین جزائر بمبئی میں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد ہی سے جزائر بمبئی میں مومن مُبشکر خاندان آباد تھے، سنہ ۱۸۲۴ء میں جب مشرقی صوبہ یعنی دیار پورب میں طاعون کی وبا پھیلی تو اعظم گڑھ، بنارس اور فیض آباد، ٹانڈہ کے نوربف بھی ہجرت کرکے آ گئے، برادری کی پہلی بستی ڈونگری کا علاقہ تھا۔ یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ اسی پہاڑی علاقہ نے بھی اسی عہد میں ایران کے مہاجرین تجار کی پذیرائی کی تھی اور وہ یہیں سب سے پہلے

[1] آباد ہوئے یہیں قریب مغل مسجد کے سامنے میدان میں انصاری مہاجرین نے اپنی کھڈیاں لگائیں اور اسی مناسبت سے یہ کھڈی کی باڑی بن گئی جو بگڑ کر کھڈے کی باڑی بن گئی، پیر ولین ڈیٹھان واڑی تک ہاتھ کرگھوں کا تانا بانا پھیلا ہوا تھا، اس کے بعد جب بمبئی میں پارچہ بافی کی صنعت کو فروغ ملا تو یوپی سے انصاری بنکر قسمت آزمائی کے لئے آتے رہے، اور آباد ہوتے رہے، اور جب غدر کے ہنگاموں کے بعد سب سے بڑا "سفر خروج" ہو تو جزائر بمبئی میں مختلف جگہوں پر ان کے قافلوں نے ڈیرے جما دیے۔

مدنپورہ کے میدانی علاقہ میں ان کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی یہیں بیچ میں ایک تالاب تھا جس کا پانی روایت بتلاتی ہے کہ گدلا ہونے کے سبب کالا تھا، یہی 'کالا پانی' کا علاقہ بن گیا۔ دوسرا پڑاؤ ـ اگری پاڑہ میں تھا، پھر مرور زمانہ اور وقت کے پھیلاؤ کے ساتھ شیخ انصاری حضرات ڈنکن روڈ، ریپن روڈ، بلاسس روڈ، فارس روڈ، سنگی کندوری، عرب گلی، تیلی محلہ، جے جے ہسپتال اور کھڈے کی باڑی تک پھیل گئے، کماٹی پورہ میں اصطبل اسٹریٹ میں چند خاندان آباد تھے، ان گنجان بستیوں سے کرگھوں کا شور اٹھنے لگا اور مور لینڈ روڈ سے لے کر باب اللہ ٹینک روڈ تک گونجنے لگا، بھایکلہ انگریزوں کے زمانہ میں بڑا نفیس علاقہ تھا، اس کے مغربی حصہ میں کلب بیک روڈ میں اور مشرقی شمالی حصہ میں کیبر روڈ تک سرکاری عمارتیں تھیں ان میں ایک مہمان سرا تھا جس میں بیرونی ممالک کے سفراء کو ٹھہرایا جاتا تھا، اسی جگہ ۲۹ مئی ۱۹۰۲ء کو ایرانی سفیر خلیل خان کی اس کے محافظی دستہ اور انگریز سپاہیوں کی جھڑپ میں گولی لگنے سے موت واقع ہو گئی تھی۔ [2]

انیسویں صدی کی آخری دہائی تک شہر بمبئی میں شمالی اور وسطی ہند کے مہاجرین انصاریوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہو چکی تھی کہ ہر ایک جگہ کے ہم وطنوں نے اپنے وطن کی نسبت سے اپنی الگ جماعت بنالی تھی۔ اس زمانہ میں مندرجہ ذیل جگہوں کے مہاجرین انصار بمبئی میں بسے ہوئے تھے۔

---

[1] بمبئی کا عروج۔ (انگریزی) ایس۔ ایم۔ ایڈورڈز (بمبئی ۱۹۰۲) صفحہ ۶۲-۶۳ و، دیکھئے راقم کا انگریزی مقالہ ایرانی مسلم آبادی اور جماعت، انسائیکلوپیڈیا آف ایرانیکا، کولمبیا یونیورسٹی نیویارک، جلد چہارم جزء ۳، ۳۲۶-۳۲۹۔

[2] دیکھئے راقم کی تازہ انگریزی تصنیف (۱۹۹۲- غیر مطبوعہ) "عہد وسطیٰ کے کوکن کی مسلم جماعتیں" (انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی) صفحہ ۳۵

ٹانڈہ، پھولپور (الٰہ آباد) مئو ناتھ بھنجن، مئو قاضی طیب (الٰہ آباد)، بھدوہی، مراد آباد، غازی پور، بہادر گنج، نظام آباد، بنارس، بھارت گنج، سرائے میر (مبارک پور)، کوپاگنج، ورسڑا، جونپور، زاب گنج (بارہ بنکی)، اگیارہ گاؤں، ریوان، منگبرہ، اندور، فرخ آباد، علی پور، مچھلی شہر، جوتیہ کوٹ، جہانگیر گنج، دوست پورہ، گونڈہ اور ان کے علاوہ مختلف شہروں مثلاً شاہجہانپور، لکھنؤ اور جلال پور وغیرہ کے باشندے بھی آمد و رفت رکھتے تھے۔[1]

ان تمام اضلاع، قصبات اور قریات کے جو ممتاز افراد آباد ہو چکے تھے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: محمد حسن سردار، محمد یوسف بن منشی پیر محمد، منشی پیر محمد، صدیق سردار (حسینی باغ) عبدالرحمن اطلس والا، عبدالرحمن فیتے والا، مولانا عبدالرحیم فیتے والا، نادر سیٹھ، سردار حبیب اللہ میاںجی، اسماعیل محلّہ دار، خدا بخش میاںجی، حبیب اللہ سیٹھ، الٰہی سیٹھ، جعفر سیٹھ، رجب سیٹھ (والد محمد عمر) منشی بچی، سدھو مہتو، بکّی مہتو، کریم بخش فرخ آبادی، رحیم سیٹھ بن رسول سیٹھ، بکّی حاجی وغیرہ

ان انصار حضرات میں اور ان کے خاندانوں میں بڑے معزز اور قابلِ احترام علماء، فضلاء، ادبا، شعراء، حفاظ کرام اور تجار تھے، کماٹی پورہ میں مومن برادری کے "محسنِ قوم واجب التعظیم، فخرِ اعیان داماثل فاضل عدیم النظیر مولانا مولوی ابو احمد دین محمد آبادی تھے جو برادری کی پہلی دینی درسگاہ مدرسہ غوث العلوم کے بانی تھے، اس مدرسہ میں عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم دی جاتی تھی، برادری کے طلبہ یہیں سے فارغ ہو کر دینی شعور اور روحانی دولت سے مالا مال ہو کر نکلے، مولوی فتح محمد عالم دین تھے، ان کے تلامذہ میں بڑے پایہ کے عالم و فاضل نکلے ہیں، مدرسہ غوث العلوم کی برکات و فیوض سے اس کے فارغ التحصیل طلبہ بڑے بڑے مناصب پر سرفراز ہوئے، کماٹی پورہ میں مولوی فتح محمد نے یک یادگار مطبع رحیمی پریس قائم کیا جو آج بھی اللہ کی رحمت سے چل رہا ہے اس کے نگراں عبدالغفار انصاری ہیں، اس یادگار پریس سے ضروری دینی کتابچے اور رسائل شائع ہوتے ہیں،

---

[1] ذخیرۂ عاقبت بینی توشۂ آخرت ۱۳۴۳ھ حسب فرمائش جناب محمد حسن سردار صاحب و منشی پیر محمد و کل جماعت پھولپور۔ مطبع نامی گرامی بمبئی)

اسماعیل محلدار کے صاحبزادے ادریس محلّدار انصاری برادری کے سربرآوردہ حضرات میں سے تھے، دینی درسگاہ کے قیام کا خیال سب سے پہلے آپ کو آیا اور بابو حکیم نے جو برادری کے مشہور حاذق طبیب تھے آپ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا، حکیم صاحب کا دواخانہ "فیضِ عالم" تھا، غریبوں کو مفت دوا دیتے تھے۔

تعلیم یافتہ افراد میں پیر محمد آرزو الہ آبادی اور مولوی محمد اسماعیل، منشی محمد مقبول حسین، حکیم محمد محمود عالم سہسرامی، منشی عبدالرشید، منشی پیر محمد، قاری محمد حسین، منشی عبدالصمد، حافظ عبدالعلیم، منشی محمد معروف، منشی محمد یحییٰ اسحاق، محمد عمر محمود، عبدالرحمٰن کامل وغیرہ معروف تھے۔ کھنڈے کی باڑی کے صدیق سردار کے صاحبزادے حبیب اللہ ذکی ایک مشہور خطاط تھے وران کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی تھی، ذکی خطاط کے فنِ خطاطی اور نقاشی کے نمونوں میں چاول کے دانے پر لکھی ہوئی ایک پوری قرآنی سورۃ تھی، یہ فنی منصب بہت کم فنکاروں کو نصیب تھا، حسینی باغ کے صدیق سردار چوراسی جماعت کے سردار تھے اور پھولپوری (الہ آبادی) جماعت سے تعلق رکھتے تھے منشی پیر محمد کی اولاد کی باقیات میں الیاس انصاری ہم میں موجود ہیں، یہ خاندان محمد یونس صابون والا کے نام سے بھیونڈی تک مشہور تھا جہاں ان کی رشتہ داریاں تھیں، بھیونڈی کے بزرگوں میں سے جناب احمد فرزند الیاس انصاری کے ماموں ہیں اور دوسری رشتہ داری عبداشکور سردار اور ہیرا خفیظ سردار (بنگال پورہ) کے گھرانے سے ہے۔

رجب سیٹھ رنپورہ کے متمول رئیسوں میں شمار ہوتے تھے، آپ کے صاحبزادے عمر رجب کی شہرت ایک سیاسی اور صنعتی شخصیت کی حیثیت سے پوری برادری اور مسلم قوم میں پھیلی ہوئی تھی۔

خلافت تحریک میں جب گھرانے نے بڑی سرفروشی دکھلائی وہ الفت نائکن کا خاندان تھا، خلافتی نام پڑ گیا، الفت نائکن مل میں خواتین کے کھاتے کی "مقدم" یا "نائکن" تھیں۔ محمد حسن سردار کا پھولپوری سردار خاندان کماٹی پورہ میں آباد تھا، وہیں ان کے بڑے یوسف سردار رہا کرتے تھے، ناہم کی قدیم بستی میں اعظم گڈھ کے مہاجرین انصار بس گئے تھے، یہاں وانجہ واڑی میں ونجہ بنکروں کی بڑی تعداد آباد تھی تقریباً ایک صدی تک بقر عیدی سیٹھ کے اعظمی خاندان میں بانسنگی ہوتی رہی، بقر عیدی سیٹھ کا شمار وانجہ واڑی کی محترم شخصیتوں میں ہوتا تھا، اس محلے کے مسلم باشندوں اور خاص کر برادری کی اصلاح کے لئے انہوں نے بڑے تعمیری کارنامے انجام دئے۔ آپ کے نواسے ڈاکٹر محمود احمد انصاری باقیات صالحات میں سے ہیں، اعظم گڈھ کے سردار دھنا سے سیٹھ اور دانیال دلال بھی کوپاسے آکر بمبئی میں آباد تھے۔

برادری کی معاشی جدوجہد

جزائر بمبئی کی اقتصادی تاریخ میں برادری کی صنعتی ترقی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، ایک ایسے اجنبی شہر میں جہاں پہلے ہی سے چپلون، بھیونڈی، تھانہ اور اطراف واکناف کے بنکروں کا معاشی غلبہ تھا، اور ملوں کے کھلنے کے بعد مرہٹہ مزدوروں کی اکثریت ہوگئی تھی وہاں انصاری نوربافوں کو جس جدوجہد کے ساتھ روزی کمانا پڑی وہ ان کے قومی کردار کا روایتی پہلو تھا، یہی نہیں چند برسوں میں انہوں نے اپنی اپنی بستیوں میں کارگاہیں بھی قائم کرلیں منشی محمد اسحاق کا سلک کا کارخانہ تھا، عبدالرحمٰن اطلس والا نے خاندانی روایات کے پیش نظر اطلس بننے کا کارخانہ قائم کیا، بہت پہلے سے اطلس کے کرگھے صرف برہانپور میں کام کررہے تھے، امجد وزیر سیٹھ جن کا تعلق گونڈہ سے تھا ٹرکش تولیہ بناتے تھے، تقسیم ہند کے بعد امجد سیٹھ کراچی منتقل ہوگئے محمد یوسف عثمان سیٹھ کا کارخانہ مومن پورہ میں موسیٰ قلعدار اسٹریٹ میں تھا، آپ کی کارگاہ میں بھی ٹرکش ٹاول بنایا جاتا تھا، عبدالشکور سیٹھ کا تعلق بارہ بنکی سے تھا آپ نے سب سے پہلے 'جیکارڈ' کی چادر بننے کا کام شروع کیا اور اس میں اجارہ داری قائم کرلی، ان کے صاحبزادے محمد عثمان نے کاروبار کو وسعت دی ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن عثمانیہ بیکری چلا رہے ہیں، مدنپورہ کی برادری میں یہ خاندان بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، فیت والا خاندان نے بھی آبائی صنعت میں بڑی نمایاں ترقی کی تھی۔ ماہم میں بقرعیدی سیٹھ مشرقی جزائر ہند کی عیسائی مستورات کیلئے ساڑی بناتے تھے۔

کپڑے کی تجارت میں عبدالغفار ساڑی مرچنٹ، عبدالعزیز کپڑے والے اور دیگر افراد مشہور تھے، عیسیٰ سیٹھ نے بھی کاروبار میں بڑی ترقی کی یوسف سردار نے گھیلا بائی اسٹریٹ پر پن کا جنا ہوا، ایک [illegible] کھول لیا تھا اور کالا صابن کا کارخانہ ڈالا اور چاندی کے تار کھینچنے کی مشین قائم کی۔

برادری کے کچھ "ایجاد پسند" حضرات نے آبائی صنعت کو ترک کرکے دوسری صنعتوں کی طرف دھیان دیا تھا، کھنڈے کی باڑی کی برادری میں متنوع تجارت وصنعت کو فروغ ملا یہاں پتنگ سازی، بالٹی بنانا اور چٹائی بننے کا کام عام تھا، اسحٰق انصاری بالٹی والے اور اسماعیل بالٹی والے اس صنعت میں بڑے کامیاب تاجر ثابت ہوئے، عبداللطیف پتنگ سازی کی نسبت سے پتنگ والے بن گئے، ٹانڈہ کا بار خاندان [illegible] کا کاروبار کرتا تھا۔

محمد حسن کا سردار خاندان

آپ کا خاندان غدر کے پُرفتن زمانے میں پھولپور (الٰہ آباد) سے ہجرت کرکے آیا اور کماٹی پورہ کو آماجگاہ بنایا۔ اُس وقت یہ سارا علاقہ ویران پڑا ہوا تھا۔ آپ نے ایک ہندو ساہوکار ڈنشکر راؤ پوپلا) کی سلجھے داری میں گودگانی دار دافف پیسہ دمڑی) کی شرح پر یہ سارا علاقہ خرید لیا اور سو مزدور لگا کر اونچی نیچی ٹیکریوں کو سطح بنایا۔ اتنا کمایا کہ خوشحال گھرانہ اور شہر کے رؤسا میں شمار ہونے لگا۔ چار گھوڑوں کی ٹرام کی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے آپ نے کمپنی کے ایک لاکھ روپے کے حصص (شیئرز) خریدے اور ڈائرکٹر کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ ان کے انتقال پر ممبئی کی ٹرامیں بند رہیں۔

محمد حسن سردار کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے محمد یوسف پھولپور جماعت کے سردار چُنے گئے۔ محمد یوسف سردار بڑے موحد قسم کے انسان تھے۔ آپ نے گھیلا بائی اسٹریٹ پر (موجودہ خیرالاسلام ہائی اسکول کے سامنے) بٹن کا بنا ہوا ایک ہوٹل کھول لیا۔ غریبوں کو مفت ناشتہ ملنے لگا۔ محمد یوسف سردار کے کئی لڑکے تھے اور آپ نے دو لڑکیوں خاتون اور حشمت بی کی پرورش اپنے سایۂ عاطفت میں کی۔ آپ کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ کورٹ میں مقدمہ جانے کے بعد مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو پہلے محمد یوسف سردار کے پاس بھیج دیا جاتا پھر جج اپنا فیصلہ سناتا۔

ممبئی میں فارس روڈ پر چرنا بھٹی مل جب جاری ہوئی تو شنکر برادری کے افراد جوق در جوق کام کے سلسلے میں آنے لگے۔ منگلی کنڈوری (کماٹی پورہ) کے افراد بھی تھے ان میں محمد یوسف سردار کے صاحبزادے عبدالکریم اور عبدالرحیم بھی تھے جو محمد حنیف مل میں ماسٹر کے عہدے پر پہنچے۔ محمد یوسف سردار کے صاحبزادے عبدالقادر نے ۳۰ سال تک شاہد مدنی ٹیکنیکل اسکول میں نرسنگ ڈیپارٹمنٹ میں بطور انسٹرکٹر خدمات انجام دیں۔ ہزاروں نوجوانوں کو ہنرمند بنایا۔ ان (اسکول) کے قیام کے سلسلے میں حسینی باغ کے محمد ابراہیم، عبدالقادر خوشحال کے ساتھ مومن پورہ اور دیگر علاقوں کی مومن برادری کے افراد کے ساتھ خاص دلچسپی تھی۔ مسلم سرکلاٹی پورہ کے مولوی محمد حسین ویونگ ڈپارٹمنٹ کے انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ عبدالقادر سردار سبکدوش ہونے کے بعد جب نہیں پڑھ رہے تھے پھاؤ ویڈنٹ فنڈ کے پیش کئے گئے تو انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اسے اسکول فنڈ میں ڈال دیجئے۔

محمد یوسف سردار کو ۱۹۱۶ء میں پرنس آف ویلز نے ایک عمدہ شال پیش کی تھی آپ کے ساتھ محمد حق بی بھی تھے جو ہندوستان بھر کے مفت سفر کا پروانہ عطا کیا اور ہر جگہ کے ڈاک بنگلے میں مفت ٹھہرنے کا حکم جاری کیا۔ محمد یوسف سردار کے بھتیجے محمد صدیق سردار کو جبرا بڑودہ نے ایک کنیز شہربانو بی دو روتن کی بیڑی عطا کی جسے سردار نے منکوحہ بنا لیا جو شیعہ تھی اور با وفا تھی۔ دوسرے بھتیجے عبدالرشید سردار آکر رہیں بقرعیدی سیٹھ اور ان کے صاحبزادے عبدالغفور قریشی کی ساجھے داری میں گوشت کا دھندا شروع کیا۔ عبدالحمید انصاری (انقلاب) سلام خریدار دی عابد گلریز دسگرپٹ باغ فخرالدین سیٹھ قیم کے بیوپاری محمد صدیق سیٹھ شاہ جہاں کے مالک عبدالمجید سیٹھ، کامریڈ محمد صدیق بخشی اور سعید الخیر وغیرہ یارانِ مجلس تھے۔ محمد حنیف انصاری (قہر) ہیڈ جیونڈی محمد حسن سردار کے لڑکے محمد یوسف سردار کے نواسے ہیں۔

باری خاندان

بمبئی میں انیسویں صدی کے پہلی نصف سے آباد تھا، عبدالباری اللہ بخش راناکے صاحبزادے تھے جو ٹانڈہ سے بسلسلۂ کاروبار بمبئی آتے جاتے تھے، اور ہنومان گڑھی کے خونچکاں واقعہ کے بعد اللہ بخش اور سردار حافظ عبداللہ کے خاندان ہجرت کرکے آئے اور یہیں آباد ہوگئے، اللہ بخش راجپوتانہ کے نومسلم تھے اور جواہر فروش تھے، جے پور محلہ گھاٹ دروازہ کی مومن برادری جو لشکر شاہی سے رشتہ جوڑتی ہے پارچہ فروشی کی جگہ جواہر فروشی کرتی تھی خوشحال برادری تھی، نومسلم سورج بنسی راجپوتوں کی ایک بڑی تعداد اعظم گڑھ اور اجودھیا میں آباد تھی، اللہ بخش کی ٹانڈہ (اکبرپور) میں ایک انصاری خاندان میں رشتہ داری تھی۔

بمبئی میں عبدالباری نے جواہر فروشی کا دھندا چھوڑ کر ہوٹل کھول لیا، ان کے اکلوتے صاحبزادے محمد روشن بڑے روشن خیال تھے اور آزاد مشرب بڑے بڑے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا اور انگریزوں سے دوستی تھی، کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانے لگے، انہوں نے پشمینہ کا کاروبار شروع کیا، تجارت چمک اٹھی اور انگریز تاجروں سے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے، ڈھیر ساری دولت کمائی بڑی جائداد بنالی، اپنے نام پر روشن بلڈنگ مستان تالاب کے سامنے تعمیر کرائی اور اپنے رئیس زادہ اکلوتے فرزند سراج احمد باری کے لئے ٹیمکر محلہ میں سراج منزل بنوائی، کلوہ (تھانہ) میں بنگلہ اور اراضی خریدی۔ مگر جب کارگو جہاز کا کاروبار شروع کیا تو خسارہ کے بھنور میں ایسے پھنسے کہ سارا اثاثہ ڈوب گیا بچا کھچا کاروبار صاحبزادے کو سونپ کر آپ نے تصوف، بھگتی اور وحدانیت کا تقابلی مطالعہ شروع کردیا لکھتے بھی رہے مراسلات کے ذریعے بیرونی علماء سے رابطۂ علم و افادہ قائم رکھا، مکان (پرنس بلڈنگ) پر پونہ کے عقائد و سرفراز تھا کے صوفی بزرگ نوری شاہ بابا اور محلہ کے پروفیسر رضا وغیرہ کے ساتھ مجلس مذاکرات جمتی تھی۔ ماورائے ادراک اور مابعد الطبیعاتی فلسفیانہ گتھیوں نے ایسا الجھایا کہ سیدھے راستے سے بھٹک گئے، کبھی بھگتی مارگ پر قدم بڑھایا تو کانہری گپھاؤں میں بھکشوؤں کی طرح عزلت گزینی اختیار کرلی اور کبھی بحرِ تصوف میں ایسے ڈوبے کہ تھانہ کے نوری شاہ بابا کے مرید صحبت خاص بن بیٹھے۔

محمد روشن کی بہن لکھنؤ کے وکیل ظفرالحسن سے بیاہی ہوئی تھی انہیں کے چھوٹے بھائی

احمد حسن سے ۱۹۳۵ء میں سراج الدین احمد باری کی منجھلی لڑکی قمر النساء کا نکاح ہوا، اور سب سے بڑی بیٹی مہر النساء کا نکاح ۱۹۴۳ء میں ایک پنجابی نوجوان عبد الحمید سے کیا گیا، اسی سال سراج احمد کی بیٹی ملقیس جہاں عبد الحمید پنجابی کے منہ بولے بھائی محمد رفیع سے کر دیا گیا، غیر کفو میں شادی کی یہ پہلی مثال تھی "بڑے گھر" کی لڑکیوں کا اس طرح روزگار کی تلاش میں دو پنجابی نوجوانوں سے نیلی ڈاکٹر قریشی کی سفارش پر بغیر پنچایت کی مرضی اور مشوروں کے بیاہ کر دینے سے رشتہ داروں نے بڑا احتجاج کیا، یہ دونوں نوجوان بڑے محنتی ثابت ہوئے، محمد رفیع بھائی کہلے کر منوّرہ میں اپنی کھولی سے پیدل اندھیری اسٹوڈیو جاتے، تاکہ فلم میں لگنے کا چانس مل جائے۔ نصیب نے یاوری کی، خداداد صلاحیت نے کامیابی عطا کی اور بھرپور محنت، لگن اور دیانتداری کے سبب ترقی اور مقبولیت کے اوج پر پہنچے اور فلمی دنیا کے مقبول ترین پلے بیک سنگر بن کر چمکے، محمد روشن سیٹھ نے اپنے بیٹے سراج احمد کی ایک بیٹی بدر النساء کو بہت پہلے منوّرہ کے اپنے ایک رشتہ دار محمد حسین انصاری سے بیاہ دیا تھا، محمد روشن سیٹھ کا انتقال ۱۹۴۳ء میں ہوا، اور ان کے اکلوتے صاحبزادے سراج احمد دسمبر ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے۔

سراج الدین احمد باری رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے، ایک کار تھی اور دو گھوڑوں کی ٹمٹم جو اس زمانہ میں تموّل اور رئیسانہ شان و شوکت کی علامت تھی، پھر نصیب کا بنجارہ سب لاد کر لے گیا اور سارا ٹھاٹ پڑا رہ گیا۔ جب سارا ہاتھ سے جاتا رہا تو لکھنؤ کے پھوپھا ذکی ظفر حسن کی دوسری بیگم (راجہ سرہی کی بیوہ رانی) کی جائداد کی جو گرانٹ روڈ پر چکلہ دروڑی میں تھی دیکھ بھال کرنے لگے پھر بھی طمطراق کا وہی عالم تھا اسی جائداد کے حساب کتاب کے سلسلے میں لکھنؤ جا رہے تھے۔ فرسٹ کلاس کے درجہ میں اس زمانے میں صرف انگریز سفر کرتے تھے یا دولتمند رئیسانہ ٹھاٹ باٹ اور عادتیں دیکھ کر ایک مسافر نے جو تعاقب کر رہا تھا دھوکے سے کچھ ایسا کھلا دیا کہ یہ بیہوش ہو گئے جب ہوش آیا تو سامانِ سفر کے ساتھ یادداشت بھی کھو بیٹھے، لکھنؤ کے عزیز جو منتظر رہا تھے مہینے بھر راستہ دیکھتے رہے، کانپور کے ہسپتال میں پتہ ملا، ساری زندگی دوڑ کی بھول بھلیوں میں گذر گئی نہ اچھے دن لوٹ کے آئے اور نہ یادداشت واپس آئی۔

سراج الدین احمد کے چار بیٹے تھے۔ منیر الدین احمد باری، ظہیر الدین احمد باری (دونوں فوت ہو چکے ہیں) نصیر الدین احمد باری (انگلستان میں بود و باش رکھتے ہیں) اور امیر الدین احمد باری۔ سراج الدین احمد کی سب سے چھوٹی دختر نوشابہ باری ۱۹۶۲ء میں ہماری نصف بہتر بن گئیں۔

ادیب مالیگانوی نے مرحوم برسٹر سالک انصاری کی فرمائش پر "نقشِ حیات" کے عنوان سے جو سہرا لکھا تھا اس کا آخری شعر تھا ؎

کلی کلی چمنِ زندگی کی پیاری ہے　　بہشت دیدۂ مومن، جمالِ باری ہے

یہ شعر جو مجازی معنویت کا حامل تھا ہمارے روحانی سفر کی آخری منزل بن گیا ہے اور اب ہم صحیح معنوں میں 'جمالِ باری' تعالیٰ کے لئے آخرت کے سفر کی تیاری کر رہے ہیں اور غالب کا یہ شعر پیشِ نظر ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

ڈاکٹر حافظ محمد حبیب اللہ ارمان داناپوری نے اپنی تصنیف تاریخ مومن - انصار میں بمبئی کی انصاری برادری کے بارے میں لکھا ہے (سنہ ۱۹۲۰ء)

"یہ ہندستان کا بہت بڑا شہر ہے اور بھیونڈی اس سے تھوڑے فاصلہ پر آباد ہے۔ بمبئی بھیونڈی، ایولا وغیرہ میں حضرات شیخ انصاری اس کثرت سے آباد ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ یہاں یہ لوگ اگرچہ آج تک ہندستان کے دوسرے مقامات سے آکر آباد ہوتے گئے، مثلاً پنجاب، گجرات، دہلی، صوبۂ بہار و اودھ وغیرہ، گو بیشتر حضرات اولاد یونس ذی نم انصاری سے ہیں لیکن عرب سے بھی برابر آتے رہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے ...... یہ بہت بڑا تجارتی شہر ہے یہاں کپڑا بُننے کے کارخانے بہت ہیں، اکثر لوگ تو نوکری پیشہ ہیں لیکن بہت زیادہ تر مختلف اقسام کی تجارتیں کرتے ہیں جس وجہ سے بڑے بڑے دولتمند ہیں یہاں کے لوگوں میں سیٹھ محمد روشن، سیٹھ عبدالکریم، سیٹھ عبداللہ، سیٹھ عبدالعزیز، حافظ نقیب الدین، منشی محمد کامل وغیرہم مشہور لوگ ہیں۔ یہاں کے دولتمندوں کی طرز معاشرت و تمدنیات نہایت اعلیٰ ہے کیونکہ ملک عرب کی تہذیب بہت زیادہ ہے اور انہیں سے اب تک میل جول ان کا زیادہ ہے۔ دینی جوش، اسلامی پابندی خوب ہے۔ خصوصاً جمعہ کے دن ہر محلہ کی مسجد بروز جمعہ انہیں سے بھری ہوتی ہے اور سچی وقت اور اسلامی صدر کی یاد دلاتی ہے، نہایت خلیق و مہمان نواز لوگ ہیں۔ آنجمن جمعیۃ المومنین قائم کر کے چند حضرات نے قومی خدمت نہایت اچھی کی ہے اور قابل مبارکباد ہیں۔"

جن حضرات کا اوپر ذکر ہوا ہے ان کی اولاد، در باقیاتِ صالحات موجود ہیں۔ سیٹھ محمد

روشن کے ذکر پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ سیٹھ عبداللہ غالباً سردار حافظ عبداللہ ہوں گے جو عبدالباری کے ساتھ ٹانڈہ سے ہجرت کر کے آئے تھے اور دو ٹانکی کے قریب سکونت پذیر تھے، حافظ نقیب الدین دتی (لوچن) کے مشہور تاجر سراج الدین دتی والے کے بڑے بھائی تھے جو تیلی محلہ میں رہتے تھے۔

فیت والا خاندان

غدر کے پُر آشوب زمانہ میں اعظم گڈھ سے جو قبیلے ترک وطن کر کے بمبئی آئے ان میں فیت والا خانوادہ علمی و دینی حیثیت سے سب سے زیادہ نامور تھا یہ جہانا گنج کا خاندان تھا اس کا خاص پیشہ لیس LACE یا کلابتون اور ازار بند بنانا تھا۔ اس خانوادہ کے جدِّ اعلیٰ محمد دانیال تھے ان کے صاحبزادے خان محمد جہانا گنج کے ایک متمول تاجر اور برادری کے ممتاز فرد تھے، جب بمبئی آئے تو ابراہیم ان کے بیٹے نے آبائی صنعت کا آغاز کیا۔ ان کے دو بڑے عبدالرحیم اور عبدالرحمن بڑے مشہور ہوئے، یہ دونوں بھائی صاحبِ علم، علم دوست اور اہلحدیث تحریک کے فعال رکن تھے۔ مولانا عبدالرحیم ابراہیم فیت والا صاحبِ قلم بھی تھے، ان کی ایک تدوین کردہ کتاب احکام الشرعیۃ المطہرۃ۔ قبور اور مزارات کے رد میں جو مضامین اخبارات و رسائل میں نکلے تھے ان پر مشتمل ہے۔

عبدالرحمن فیت والا بھی بڑے فعال اور پُر جوش اہلحدیث تھے ان کا سینہ جوشِ عمل اور جذبۂ دینی سے ہمیشہ سرشار رہتا تھا، کرلا میونسپلٹی کے صدر رہ چکے تھے اور رؤسائے شہر اور عمائدین و اکابرین ملت میں بڑا اعلیٰ مقام رکھتے تھے، مرگھے، مقبہ، تور، کھٹکھٹے اور دوسرے خاندانوں سے بڑے گہرے تعلقات تھے ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۲۵ھ کو بمقام شہر بمبئی جو شیعہ سنی مناظرہ ہوا اس کی روداد کو جسے مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے دایم۔ اے نے قلمبند کیا تھا آپ نے صرفِ کثیر سے شائع کر دیا تھا اس میں "فریقین کی لفظ بلفظ تقریریں، اہلِ حق کا فیصلہ، سنی عالم صاحب کا قرآن مجید سے حضرات خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ثابت کرنا اور یہ کہ بغیر ان کے خلافت کے ماننے کے قرآن پر ایمان ممکن نہیں اس کے جواب میں شیعہ عالم صاحب (ملا باقر فیض آبادی) کا عاجز ہو کر دفع الوقتی کرنا" تمام تفصیلات درج ہیں۔ یہ مناظرہ بدرالدین عبداللہ قور کے مکان واقع چھاپچھ محلہ میں منعقد ہوا تھا، اہل سنت کی طرف سے مولانا مولوی محمد عبدالشکور مدیر النجم، لکھنؤ نے قیادت کی، اسمائے گرامی شرکائے جلسہ از جانب اہل سنت والجماعت یہ تھے:

قاضی محمد حسن مرگے، حضرت محمد صالح لونڈے، سید غلام محمد رفاعی، مولوی محمد یوسف کھٹکھٹے (ایم۔ اے)، مولوی عبد المنعم صاحب حافظ خطیب[1] جامع مسجد، مولوی قاضی تلیاتی صدر مدرس مدرسہ جامع مسجد بمبئی اور سیٹھ عبد الرحمٰن ابن سیٹھ ابراہیم صاحب فیت والے ساکن کورلا ضلع تھانہ۔

فیت والا خاندان متمول اور مخیر تھا، خیر کے کاموں میں بڑے سخی دل واقع ہوئے تھے کرلا میں فیت والا مسجد اسی خاندان کا صدقہ جاریہ ہے۔ ان کی جائداد ساری بمبئی میں دوٹانکی، بھائی کلہ، الفنسٹن روڈ، فارس روڈ، چور بازار، ملنڈ اور گرلا تک پھیلی ہوئی تھی، عبد الرحمٰن سیٹھ کے بڑے لڑکے ابراہیم فیت والا کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ آپ نے علوم دین کا اور قانون کا گہرا مطالعہ کیا تھا، عبد الرحمٰن کے چھوٹے لڑکے عبد الخالق الفنسٹن روڈ پر ہی کے وارڈ سے میونسپلٹی کے نمائندہ تھے۔ ان کے صاحبزادوں میں عبد الحیٔ اور عبد القیوم بھی جمعیۃ اہلحدیث کے سرگرم رکن ہیں، حج کمیٹی سے بھی وابستہ ہیں، عبد الرحمٰن سیٹھ کے پوتے یعنی ابراہیم سیٹھ کے صاحبزادے اسمٰعیل اور اسحاق فیت والا خاندان کے جائداد مملوکہ کے نگراں ہیں، فیت والا کمپاؤنڈ اور فیت والا مسجد (کرلا) اسی خاندان کی یادگاریں ہیں، محمد اسحاق فیت والا نے فارسی میں ایم۔ اے کیا ہے۔ عبد الملک فیت والا کو کتابوں کا بڑا شوق تھا۔

جان محمد میاں جی نور محمد کا صوفی خانوادہ

۱۸۵۷ء کے پر آشوب زمانہ میں جان محمد میاں جی نور محمد کا صوفی خاندان بنارس سے ہجرت کر کے آکر بمبئی میں آباد ہو گیا تھا۔ میاں جی کا لقب عموماً ایسے فارسی دانوں کو دیا جاتا تھا جو فارسی کی اعلیٰ تعلیم دیتے تھے۔ میاں جی نور محمد اسی صفت سے متصف تھے۔ میاں جی کے صاحبزادے جان محمد جامع اوصاف تھے۔ طریقۂ مجددیہ سے منسلک تھے اور مجاہدہ و ریاضت نے انہیں ولی صفت بنا دیا تھا۔ طریقہ مجددیہ کے بانی عہد اکبری و جہانگیری کے مشہور نقشبندی صوفی خواجہ احمد فاروقی (۱۵۶۳ء-۱۶۲۴ء) شیخ سرہندی "تیوصیت" کے سبب اور الحاد و بدعت کے قاطع ہونے کی وجہ سے مجدد الف ثانی کے نام سے مشہور ہوئے، یہ وحدت الشہود کے نظریے کے قائل تھے۔ ہندوستان میں سلسلۂ نقشبندیہ کے سب سے بڑے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہ تھے جن کے مرید ہی

[1] بمبئی کا مناظرہ [illegible] ۱۲۳۵ھ

خواجہ احمد فاروقی سرہندی تھے۔ اسی طریقہ میں 'حبسِ دم' (سانس روک کے رکھنے کی قوت) کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ جان محمد کبھی کبھی اس طرح اس عالم میں پہنچ جاتے کہ نبض ساکت ہو جاتی اور کچھ گھنٹوں کے بعد ان میں پھر جان آجاتی۔ جان محمد کے مریدین کرلا، ماہم، مزگاؤں، بھیمڑی وغیرہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

پیری مریدی کے سلسلے کے ساتھ ساتھ وہ آبائی پیشہ بنکری کے تانے بانے سے بھی جڑے ہوئے تھے، کھڈی پر ریشمی کپڑا بنتے تھے اور اسی کی آمدنی سے کنبہ کے افراد کے علاوہ یتیم بچوں کی کفالت کرتے تھے، کسی مرید سے کوئی نذرانہ قبول نہ کرتے بلکہ مریدین کو ہدایت دیتے کہ اکلِ حرام سے بچیں، مریدین جن میں غریب مل مزدوروں کی اکثریت ہوتی تھی صحبت سے اکتسابِ فیض کے لیے صبح ہی سے حاضرِ خدمت ہو جاتے دن بھر رشد و ہدایت کا سلسلہ چلتا رہتا اور لنگر چلتا رہتا تھا۔

کریم اللہ جان محمد میاںجی کے واحد بیٹے تھے، بچپن میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا، کسی نے مشورہ دیا کہ چنے کا ایک دانہ شراب میں بھگو کر کھلا دیں شفا ہو جائیگی، جان محمد اس قرآنی ارشاد سے واقف ضرور تھے "فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ" (اور اگر کوئی مجبور ہو جائے لیکن نہ تو نافرمانی کرے اور نہ حد سے باہر نکل جائے" (الانعام: ۱۴۶) اور برملا کہا، میرا اکلوتا بیٹا مر جائے مجھے پروا نہیں لیکن حرام سے اس اضطرار میں بھی پرہیز کرونگا۔

ان کے کسی مریدِ خاص نے ان کی تاریخِ وفات لکھی تھی ؎

جان محمد میاں جی نور محمد کے بر	یادِ مولا میں رہا کرتے تھے ہر شام و سحر
تھا مجدد یہ طریقہ صوفیانہ آپ کا	رہنمائے دینِ برحق مرحبا صد مرحبا
تھی محبت آل و اصحابِ رسولِ پاک سے	لو لگائے رہتے تھے ہر دم شہِ لولاک سے
گیارہویں رمضان کی شنبہ کا دن وقتِ سحر	جانبِ جنت سدھارے دارِ فانی چھوڑ کر
لکھ سنِ ہجری اے قلم! سر کرکے خم	بے خبر تھے وہ سواکتالیس تو بھی کر رقم

۱۲۴۱ھ

یہ قطعۂ تاریخِ رحلت جان محمد کے بعد ان کے لڑکے کریم اللہ اور پھر ان کی وفات کے بعد آج بھی ان کے پوتے محمد ابراہیم انصاری (بی کام) کے گھر کی دیوار پر شیشے کی فریم میں مُرقعِ ہدایت بنا ہوا آویزاں ہے۔ جان محمد بابا کی قبر کرلا چونا بھٹی میں ایک پہاڑی پر واقع قبرستان میں ہے۔

کریم اللہ جان محمد کا انتقال عین جوانی کے عالم میں جبلپور میں ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ ل ہیکر سے ماہر بمبئی میں وہ پہلے فرد تھے جنہوں نے ۱۹۳۳ء میں مدنپورہ کے ساڑی بازار میں چارلوم لگایا تھا' ان کا ہاتھ ماگ کا کارخانہ موجود تھا' وہ بڑے قابل منتظم تھے اور دیانتدار تاجر۔ برادری کے لیے دردمند دل رکھتے تھے' عمر نے وفا نہ کی۔ پدر نتواند پسر تمام کند ۔۔۔ ان کے صاحبزادے محمد ابراہیم انصاری (بی کام) نے باپ کے خوابوں کی تعبیر پالی ۔۔۔ اور بڑے کارخانہ دار بن گئے ڈیڑھ (۱½) نمبر اور دو نمبر کاؤنٹ کا کمبل سب سے پہلے کریم اللہ جان محمد کے ہینڈ لوم پر بنایا گیا تھا اسی کی نقل اور دیکھا دیکھی میں برسہا برس تک بمبئی اور دوسرے صنعتی مراکز میں ایسا ہی بنتا رہا۔

الحاج امجد علی وزیر علی شطرنجی والے

پارچہ بافی میں ایک خاص قسم کی بنکری کرگھے پر شطرنجی یا دری کی ہوتی تھی جس کے کرگھے عام ساخت سے مختلف اور بڑے ہوتے تھے۔ امجد علی وزیر علی ضلع گونڈہ (یوپی) کے رہنے والے تھے کریم اللہ کے سسرالی عزیز جان محمد میاں جی کے مریدانِ خاص میں سے تھے۔ بڑے متقی اور مخیر انسان تھے' بڑے انشراح سے جود و سخاوت کرتے اور سنتِ رسول پر عمل کرتے۔ زمانہ' جنگ میں پاور لوم کے کپڑوں پر قیمت کا کنٹرول آگیا تھا' بجاد آنے رشوت دے کر ایک روپیہ فی گز قیمت بڑھائی جا سکتی تھی لیکن امجد علی پرہیزگار اور دیندار شخص تھے حرام کی کمائی سے سخت اجتناب کرتے تھے۔

امجد سیٹھ کے کارخانے کرلا اور مدنپورہ میں تھے۔ ٹرکش تولیہ کے علاوہ ان کے کارخانے میں بنے گئے تاج محل چھاپ کی جیکارڈ چادریں بڑی مشہور تھیں' امجد وزیر ویونگ ملز ان کے کارخانے کا نام تھا' تقسیمِ ہند کے بعد کراچی منتقل ہو گئے' اور یہاں کی ساری جائداد کسٹوڈین نے ضبط کر لی' کراچی میں نوران ٹیکسٹائل ملز کے نام سے دوبارہ کاروبار شروع کیا اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہاں بھی اپنے فیضِ کرم سے نوازا لیکن نقلِ مکانی بہت جلد نقلِ جاودانی بن گئی مئی ۱۹۴۹ء میں ان کے انتقال کی خبر پاکستان ریڈیو نے نشر کی۔ ان کے صاحبزادے عبدالاحد کم عمر تھے جب امجد سیٹھ کا انتقال ہوا' حالات نے کاروبار کا تیا پانچا کر دیا' یہ بیچارے درویش طبیعت کے ٹھہرے اللھم تجعلنی فتیمہ بن قتنی۔ قناعت کوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں' ایک صاحبزادی ریحانہ

بھیونڈی کے محمد خلیل خوشحالی سے بیاہی ہوئی ہیں۔

ماہرین صنعت بافندگی

عہد وسطیٰ میں مسلم سلاطین کے سرکاری کارخانے، بیوتات اور ان کے ذاتی توشہ خانے ہوتے تھے، شاہی ملبوسات (ثیاب ملوکیہ) تیار کرنے کے لئے جو اعلیٰ صنعتی کارگاہیں ہوتی تھیں انھیں دارالطراز کہتے تھے۔ دارالطراز کے نگراں اور معتمد کو صاحب الطراز کہتے تھے۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں بمبئی میں جب ملیں قائم ہوئیں تو کلوں یا مشینوں کی دیکھ بھال، مرمت اور تعمیر کے لئے مل مالکان کو ماہر کاریگران کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ بُنائی کے شعبے کے لئے بافندگی کے ماہرین کی بڑی مانگ تھی، ڈیزائن، گلکاری، برتہ داری اور نقش و نگار کے تجربہ کار استادوں کی تلاش رہتی تھی۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری تاریخ المنوال والملہ بمبئی کے بارے میں لکھتے ہیں (سنہ ۱۹۱۲ء)

"یہ ایک مشہور شہر ہے اور بھیونڈی اس سے تھوڑے فاصلہ پر آباد ہے۔ بمبئی، بھیونڈی، بورا وغیرہ میں حضرات شیخ نوربافان اس کثرت سے آباد ہیں جن کا شمار بھی مشکل ہے۔ بڑے بڑے دولتمند تاجر ہیں جو غربا ہیں وہ صنعت پارچہ بافی کا پیشہ کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ صنعت پارچہ بافی میں بڑے بڑے صناع ہیں سنہ ۱۳۱۵ ہجری میں شیخ رحمت اللہ صاحب بنارسی داؤد ساسون (ڈیوڈ ساسون) کی کمپنی کے ریشمی کارخانہ میں ہزار روپیہ مشاہرہ کی جگہ پر صرف گل بوٹے بننے کے لئے متعین تھے لیکن ان کو پانسو مشاہرہ ملتا تھا کیونکہ یہ تھا کہ یہ یورپین نہ تھے"[2]

ملوں اور کارخانوں کے مختلف شعبہ جات تھے سب سے اہم ویونگ یعنی بُننے کا شعبہ ہوتا تھا اس پورے کھاتے کا نگراں ماسٹر یا ویونگ ماسٹر ہوتا تھا اس کے ہاتھ کے نیچے ہیڈ جابر اور جابر ہوتے تھے، مشینوں اور کلوں کی چال، رفتار اور انجن کے ڈھیل جکڑ کی صورت میں مقادم کو مقدم سمجھا جاتا تھا۔ ماسٹر عموماً ایک تجربہ کار، ماہر اور بیشتر صورتوں میں سند یافتہ شخص ہوتا تھا۔

---

[1] مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ تاریخ المنوال و بنا حصہ دوم ص ۹

[2] ایضاً ص ۷۰

برادری میں ٹیکسٹائل انڈسٹری کے ہر شعبہ میں ماہرین موجود تھے، چند نامور افراد کا ذکر یہاں ناگزیر ہے۔

عبدالغفور ماسٹر

۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء کے درمیانی عرصہ میں عبدالغفور ماسٹر کا بڑا شہرہ تھا جب وہ فاضل بھائی گروپ کی دو ملوں کے ویونگ ماسٹر تھے، کمپنی نے انہیں ٹیکسٹائل انڈسٹری کے معائنہ کی غرض سے مانچسٹر بھیجا تھا، کمپنی کی طرف سے ایک موٹر کار دی گئی تھی جو یقیناً ایک بہت بڑا اعزاز تھا وہ خود اپنی موٹر سائیکل پر آتے جاتے تھے، فاضل بھائی گروپ کے تحلیل ہونے کے بعد ماسٹر صاحب نے اپنی وفاداری اور نمکخواری کا یہ ثبوت دیا کہ اونچی سے اونچی تنخواہ پر کہیں اور نوکری کرنا گوارا نہ کیا اور کرلا میں عزلت گزین ہو گئے لیکن تقسیم ہند کے بعد کراچی چلے گئے جہاں ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ ان کا انتقال ہو گیا

محمد اسماعیل مقادم

حاجی محمد اسمٰعیل جان محمد میانجی (کرلا) کے خاص مریدوں میں سے تھے، اور صحبتِ خاص حاصل تھی، پرہلاد مل میں مقادم تھے، وہاں کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ۱۹۴۵ء میں اپنا ہینڈ لوم کا کارخانہ قائم کیا اور چاندی کا تھوک بیوپار کرتے لگے، بچوں کی پرورش اور خاندان کی کفالت کو عبادت تصور کرتے تھے، سخی دل اور ہمدرد انسان تھے مزاج میں سادگی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا کی، ۸۰ سال کی عمر میں رحلت کی، ۱۹۴۷ء میں فساد کے بعد کرلا سے مدنپورہ منتقل ہو گئے تھے۔

مقادم

مجاہدین آزادی میں مل مزدوروں کے علاوہ مقادموں کے نام بھی ملتے ہیں جن میں غلام حسین انصاری مقادم، وارث علی مقادم، سعید اللہ مقادم اور چودھری غلام رسول مقادم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، منظور الحق اعظمی ٹریڈ مارک جیکارڈ کے فن میں ماہر اور اسی شعبہ میں اسسٹنٹ جابر تھے آپ نیشنل ملک آرٹ سلک مزدادر میں ملازم تھے جغرافیہ کی کتابوں کا پ کو بڑا

شوق ہے اور اس کا ایک اچھا ذخیرہ آپ کے پاس موجود ہے، ان کے علاوہ حسین مقادم اور حاجی الیاس بھی اپنے فن کے ماہر تھے، حاجی صاحب بھی جہاں آزادی تھے اور ہندستان ملز میں ہیڈ جابر تھے۔ محی الدین سرشار جو عبدالغفار انصاری، ملک رحیمی پریس کے بھائی تھے جیکارڈ پر ڈیزائننگ کے بڑے ماہر تھے، بڑی مسجد مدنپورہ کے پاس عبدالمجید انصاری صنعت کا بہترین کام جانتے تھے۔ عرب گلی میں جان محمد ٹیکسٹائل کے ماسٹر تھے، محمد عمر ماسٹر ہیڈ جابر کے عہدہ پر تھے۔ کماٹی پورہ میں محمد یوسف جیکارڈ کی ڈیزائننگ میں تفرد رکھتے تھے۔ عبدالستار ماسٹر بڑے اچھے ڈیزائنر تھے۔

ذخیرۂ عاقبت یعنی توشۂ آخرت (۱۳۲۲ھ) جو ہندستانی مسجد (بائیکلہ اسٹیشن) کی روداد ہے اس میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام ملتے ہیں جو کسی نہ کسی مل سے تعلق رکھتے تھے: چھوٹو میل ریشم پالی کھاتا (پریل)، عبدالرحیم سیاہجی، حافظ امان اللہ، ملا جمن اور سردار خدا بخش۔ سندرداس مل دلال چمپی) کے ماسٹر دوست محمد، آدم جی پیربھائی مل (تاڑدیو) کے محمد عظیم مقادم اور بندو مقادم سکنہ گونڈا۔

انصاری بزازان و تجار

بعض کارخانہ دار اپنی مصنوعات کے علاوہ دوسرے کارخانوں کی متنوع ہر چیزوں کی تجارت کرتے تھے، ساڑی بازار (مدنپورہ) میں ساڑیوں کی تجارت ہوتی تھی، رحیمی پریس کے نزدیک جان محمد ساڑی والے مشہور تھے، عبدالغفار ساڑی مرچنٹ انجمن خیر الاسلام کے قدیم بانیوں میں سے تھے، عبدالعزیز کپڑے والے مدنپورہ میں مشہور تھے، اور کریم بلڈنگ کے مالک عبدالکریم سیٹھ دولت مند تاجر تھے محمد روشن سیٹھ (دیلی محلہ اور جے جے ہسپتال) کا پشمینہ کا کاروبار تھا، وہ انگلستان برآمد کرتے تھے۔

ع کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

ایک ایسے اجنبی شہر میں جہاں کھونٹ کھونٹ کے لوگ تھے ہر بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی تھیں، جہاں انگریزوں کا دبدبہ تھا اور خوشحال کوکنی قوم کا ملی اور سماجی غلبہ تھا اور جہاں میمن سیٹھوں کا بڑا رتبہ تھا ـــ وہاں یہ کارگاہ سے عبادتگاہ تک کے مسافران غریب الوطن ان سے آگے کیا جاتے، ہر قدم پر قدغن ہر لفظ پر تنبیہ اور ہر عمل پر احتساب، بعض مسجدوں میں یہ جاتے

ہو رہے ڈرتے تھے مبادا سجدہ کرنے والی جبینوں پر تیوری نہ چڑھ جائے کہ پوربیا حنفی، شافعیوں
کی بستی میں کیوں چلا آیا؟ رمضان میں وتر کی نماز میں فصل اور وصل کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا شافعی
مذہب میں وتر کی تین رکعتیں ہیں اور ان کے نزدیک افضل یہ ہے کہ پہلے دو رکعت پڑھتے ہیں
اور بعد اس کے فصل کر کے ایک رکعت اور پڑھتے ہیں، حنفی مذہب میں فصل نہیں بلکہ 'وصل'
ہے اور یہ تراویح بعد الگ جماعت کر کے وتر پڑھتے تھے[1] شادی بیاہ کے معاملات میں بھی
کوکنی حضرت مداخلت ہی نہیں دباؤ ڈال کر شافعی قاضی سے نکاح پڑھواتے تھے، اس پر طرّہ یہ
کہ ڈھول تاشہ بھی بجواتے تھے۔[2]

اذیت پسند نوجوان اور آوارہ لڑکے سادہ لوح جلاہوں کا مذاق اڑاتے اور ہنسی ٹھٹھول
کرتے یہ بیچارے خود کیا پسند کرتے جبکہ ان 'سراپا ناز' زجرانوں کا ڈھول دھپا شیوہ بن گیا تھا،
بمبیا زبان میں اسے 'دھتّو' مارنا کہتے ہیں، تلفّظ کا مذاق الگ اڑایا جاتا[3] اور ان "پوربیاؤں" کو بگاڑ
کر 'پور — بیا' سے "بھیا" کہہ کر پکارنے لگے۔ یہ سارا تماشا دیکھ کر بیچاری عورتیں اذیت رساں
جماعت اور گروہ کو کوسنے دیتیں اور ہر پیغمبر کے دور میں اس قوم کی جو حالت تھی اس کا نقشہ ان
کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔

مرے کو ماریں شاہ مدار — یہ شاہ مدار پارسی قوم سے تھے جو (جے جے ہسپتال کے پاس)
باب اسٹڈ ٹینک کے سامنے میدان میں جلاہوں کا پھیلا ہوا "بھا بجا" یا "آڑا" (آڑا پانی) توڑ کر
پھینک دیتے تانے ہوئے رنگین سوتوں کی قوس قزح دیکھ کر ان کی بگھیوں اور ٹمٹموں کے گھوڑے
بدک جاتے تو پھر گھوڑوں کا شور سناٹے میں رخنہ اندازی کرتا۔

اس نادر اذیت، اذیت، تضحیک اور استہزا کا 'داں' ایک خامشی تھی سب کے جواب
میں 'تانا بانا' تھا لیکن ان کے حوصلوں کی کمندیں ٹوٹی نہیں ہاں، تنا ضرور تھا سہ

قافلے میں غیر فریادِ درا کچھ بھی نہیں
اک متاعِ دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں (اقبالؒ)

---

[1] رمضان کی وتر کا رسالہ ۔۔ مدرسہ محمدیہ جامع مسجد (بمبئی ۱۳۹۲)

[2] بمبئی گزیٹیئر، ق۔ ر۔ ن ۔۔ ۱۲۶ (بمبئی ۱۸۹۰ء)

[3] سیف النقیہ علی محق الوہابیہ مطبع دت پرساد بمبئی - ۱۳۰۰-۱۲۹۹) ص ۵ - ۱۵

ستم رسیدہ برادری نے "ستم ایجاد بندوں" کا ہر ظلم سہا، لیکن کسی اخلاقی گراوٹ کا ثبوت نہیں دیا۔ ایسا ایک وقت مرہم بن کر آیا کہ ان کے زخم مندمل ہو گئے۔ شہر کے سنجیدہ اور ثقہ حضرات اور عمائدین کا اعتبار حاصل ہوا اور ان میں سے ایک ہوشمند طبقے نے برادری کی پہلو دار شخصیت اور مثبت کردار کی جلوہ نمائیاں دیکھ کر آنکھیں جھکائیں اور برادری آنکھ سے آنکھ ملانے کے لائق ہو گئی ——— ساری سوئیاں آہستہ آہستہ نکل گئیں صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں —— اعلیٰ تعلیم کے فقدان کی کسک اور معاشرتی خرابیوں کی چبھن برادری کے باشعور افراد کو محسوس ہونے لگی تھی۔

برادری کی بنا کردہ مسجدیں

تاریخ کی روشنی میں یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ برادری کے ساتھ پہلے پہل مقامی مسلم جماعتوں کا سلوک ان کے پردیسی ہونے کے سبب بڑا نارو تھا، وروہابیوں کے ساتھ خصوصاً نہیں بڑی خصومت تھی مولویوں کا رویہ منتقمانہ اور جارحانہ تھا، برادری میں اہلحدیث کی تعداد کافی تھی مگر ان کی اپنی کوئی مسجد نہ تھی اور نہ تو احناف کی کوئی بڑی مسجد ابھی تک منصہ شہود پر آئی تھی یا ہلامیں تعمیر ہوئی تھی۔

"ہیکلا اسٹیشن کے سامنے (جو علاوہ مسافرت غریب الوطن کے ترسنی جگہ کے مسلمانوں کا ایک آباد محلہ ہے)" شاہراہ پر تعمیر مسجد کے لئے پھولپور جماعت (الہٰ آباد) کے سربرآوردہ افراد نے محمد حسن سردار اور منشی پیر محمد کی رہنمائی میں چندہ اٹھایا، مبلغ نو ہزار روپیہ اور اوپر جس کے جگہ خریدی گئی اور توکلاً علی اللہ باقی روپیوں سے بنا بھی ڈالدی، لیکن کمی سرمایہ کے سبب تعمیر کھٹائی میں پڑ گئی "مولانا مولوی ابو احمد دین محمد (وقاہ اللہ عن شر حاسد اذا حسد) نے سورتی محلہ میں جلسہ مدرسہ غوث العلوم کے ضمن میں مسجد کے لئے تحریک چندہ کی سلسلہ جنبانی فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً بائیس ۲۲ عـہ روپے دو آنے جمع ہوئے۔ مولانا قوم کے محسن واجب التعظیم در مخزن ایمان دانش فاضل عدیم النظیر تسلیم کئے جاتے تھے اور مسجد کی تعمیر میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔[1] یہ ہندوستانی مسجد تھی۔

"عالی جناب معلی القاب علم دوست فیاض اجل قاضی عبد الکریم صاحب (تاجر کتب بمبئی) نے

---

[1] ذخیرۂ عاقبت یعنی توشۂ آخرت - ص ۱۱

دو سو روپے نقد مرحمت فرمائے"... اور جناب میر منشی ابراہیم صاحب مقبہ اور عبد الرحمٰن صاحب مقبہ نے (جو بمبئی کے علم دوست شرفار اور روسا میں سے ہیں) دو سو فیٹ پتھر کی کھان کی (سلیں) جنکی قیمت سو روپیہ ہوتی ہے اور اسی روپیہ کا چونا اور ریتی مسجد کے لئے عنایت فرمائیں"

ان کے علاوہ چندہ کی فراہمی کے لئے ہر جگہ کوششیں جاری تھیں احمد سیٹھ ابن موسیٰ نے جا بجا مسجد کے لئے چندے کھولے تھے، سکلی تالاب کے دکاندار حاجی یوسف، حاجی احمد، نادر سیٹھ، سلیمان سیٹھ، محمد یوسف بن منشی پیر محمد، مانک جی بکر قصاب، محمد صادق — یہ لوگ روزانہ ایک آنہ مسجد کے لئے عنایت فرماتے تھے، مگر آفرین ہے ان معماروں (کاریگروں) کی علو ہمتی پر "جو پانچ چھ آنے اجرت کے اس وقت حاصل کرتے ہیں جبکہ سر کا پسینہ پاؤں تک پہونچ چکتا ہے" مگر اپنی گاڑھی کمائی میں سے مسجد کے لئے روزانہ ایک پیسہ دیتے ہیں"[1]

ہندستانی مسجد کی تعمیر کی اس روداد میں بھیمڑی کے سربرآوردگان قوم کی مالی امداد کی سراہنا کی گئی ہے "جنہوں نے دامے درمے قدمے مسجد کی مدد میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی علی الخصوص جناب پیر محمد سردار صاحب [بنگال پورہ] وجناب بکس سردار صاحب (غالباً خدا بخش سردار والد عبد الحمید سردار نالبارہ] وصاحبدین میاںجی صاحب [عمر صاحبدین کے والد، کوٹر گیٹ اور یوسف جاڑیا کے والد] وجناب مدار سردار صاحب [؟] وجناب حسین بن بُڑّلی صاحب [اسلام آباد غلام محمد مومن بی. اے کے دادا] جناب حاجی لالو صاحب [خانصاحب حاجی عبد الصمد اور حاجی عبد الشکور کے دادا] وجناب نقیر محمد سیٹھ صاحب [محمد ایوب و عبد الرؤف پنجابی کے والد] وجناب میاںجی نبی بخش صاحب [چہر ملا، داجہ محمد کے والد]"[2]

ان اسمائے گرامی کے بعد آگے جو عبارت ہے اس سے اندازہ ہوتا کہ ہر دور میں دینی طور پر باشعور اور عقیدت مندوں سے معمور مسلمان اپنے سلاف کے ذکر میں خود اپنی فرزدتی اور ان کی فضیلت کو بڑھ چڑھ کر بیان کرتے تھے "یادگار و افلاس اور محکومیت کے اسلام کے اگلے مبارک دینداروں کی رگِ حمیت کا ورثہ ہے جو نہ کچھ ہم بدنام کنندۂ نکونامی چند اہل اسلام میں ضرور باقی ہے"[3] اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ لوگ جو اپنے بال بچوں اور گھر کے کاروبار کو چھوڑ کر محض خدا کے

---

[1] [illegible]

[2] ایضاً [3] ایضاً

لئے کوششیں کر رہے ہیں[۱] اور تکلیفیں اٹھا رہے ہیں خصوصاً سردار محمد حسن، سردار حبیب اللہ میاںجی، رحیم سیٹھ بن رسول سیٹھ، ملا جان محمد، حبیب اللہ سیٹھ، الٰہی سیٹھ، جعفر سیٹھ، خدا بخش میاںجی، رجب سیٹھ، اسمٰعیل محلہ دار، منشی بچی، اسدھو بہتو، بکبی مہتو، کریم بخش فرخ آبادی، منشی عبدالکریم[۲] ان کے علاوہ تقریباً ہر جماعت کے انصاریوں نے دل کھول کر تعمیر مسجد کے فنڈ میں چندہ دیا تھا، اس فہرست میں ہر جماعت کے سردار کا نام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اسمائے چندہ دہندگان سے ۱۳۲۴ھ ہجری کے زمانے میں آباد برادری کی تعداد اور ان کی سرگرمیوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہم نے باب برادری کی جماعتی روایات میں تفصیل سے ان ساری جماعتوں اور ان کے سرداروں کے نام دیئے ہیں، کچھ اور ناموں کو پڑھ کر بیان وضاحت طلب بن جاتا ہے مثلاً:۔

کوپا اعظم گڈھ گوپال گنج نا کے اہل جماعت میں سردار دھنا سے کا نام ملتا ہے، یہ عرفیت مبارکپور میں بھی عام تھی، دھنا سیٹھ، دھنا اور گرہست کے القاب صاحب مال و ثروت کے لئے استعمال ہوتے تھے، دھنا سے — دھنا سیٹھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے[۱] اہل جماعت موناتھ بھنجن سے فقط سردار نور محمد کا نام ملتا ہے، اسی طرح سرائے میر، مگہر، رسڑا، چریاکوٹ، جہانا گنج، گوندہ، درست پور، جلال پور کے علاقے سے بھی فقط ایک ہی نام کا اندراج ہے۔

تعمیر مسجد کے لئے مستورات نے بھی دل کھول کر چندہ دیا تھا، ایک ضعیفہ نے "باوجود قوت لایموت میسر نہ ہونے کے ایک ہنسلی اور ایک دیگچی مسجد کو دی جس کی قیمت چوبیس روپئے آئی"، یہ بڑھیا بیوہ عورت زوجہ مولا بخش تھی، اس کے علاوہ بیوہ سکینہ زوجہ خدا بخش، بیوہ ضعیفہ حنیفہ بی، ضعیفہ نصیبن زوجہ جھلّی، ججی بوبی اور ججن سکینہ بی، نور بی بنت ابراہیم بوبائی، کالی بائی اور بیگم بی صاحبہ نے بھی نقد چندہ دیا تھا۔ اس مسجد کے ٹرسٹیوں میں محمد حسن سردار، پیر محمد یوسف پیر محمد اور الحاج منشی محمد یحییٰ اسحاق اور ان کے بعد ان کے صاحبزادے الحاج منشی محمد یوسف محمد یحییٰ وغیرہ شامل تھے۔

جامع مسجد اہلحدیث مومن پورہ، بمبئی ۱۱

کالا پانی کے تالاب کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد جماعت اہلحدیث کے اولین بزرگوں نے تعمیر کی تھی، اصحاب جود و سخا نے جگہ کی قلت کے پیش نظر توسیع کا بیڑا اٹھایا اور حسب ضرورت وقت کے ساتھ ساتھ مسجد کی توسیع ہوتی رہی اور یہ جامع مسجد اہلحدیث مومن پورہ کے نام سے مشہور

ہوگئی اور اسی مسلک اہلحدیث کا مرکز بن گئی، اس بڑی مسجد سے جو امام اور خطیب وابستہ رہے ان کے نام یہ ہیں: مولانا ابوجعفر، مولوی احمد، مولوی محمد صدیقی، مولانا عبدالمعبود، مولانا محمد داؤد راز اور مولانا مختار احمد ندوی جو سنہ ۱۹۶۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۸۲ء تک امامت و خطابت کرتے رہے اور اشاعت دین اور کتاب و سنت کی ترویج کے لئے کوشاں رہے۔ ان کے بعد قاری نجم الحسن نیفی سنہ ۱۹۹۰ء تک امام و خطیب رہے۔

اہلحدیث کی ایک دوسری مسجد گھیلابائی اسٹریٹ پر بھی تھی جو اس کے بانیان کی نسبت سے بنگالی مسجد کہلاتی تھی۔ سنہ ۱۸۶۰-۶۲ء کے دوران قحطِ بنگال کے سبب بہت سارے مہاجرین تلاشِ معاش میں بمبئی اور دیگر قصبوں اور قریوں میں آباد ہوگئے تھے بھیونڈی میں بھی ایک محلہ بنگالی پورہ انہیں کی یاد دلاتا ہے۔ بنگالی مسجد کی تعمیرِ نو اور توسیع جو سنہ ۱۹۸۳ء سے سنہ ۱۹۸۶ء کے دوران ہوئی مولانا مختار احمد ندوی کی مساعیٔ جمیلہ کی رہینِ منت ہے اس مسجد میں بھیونڈی کے مشہور و نامور خطیب، عالم، مبلغِ دین اور مصلحِ ملت مولانا عبدالصمد ندوی سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۶ء تک بڑا پُر مغز، عالمانہ اور دلنشیں خطبہ دیتے رہے۔

ان دونوں مسجدوں کے ٹرسٹیان تمام امور انتظامیہ کے ذمہ دار ہیں، جامع مسجد اہلحدیث مومن پورہ کے ٹرسٹیوں میں بچو بھائی بچو علی سب سے زیادہ سرگرم تھے اور مالی تعاون دل کھول کر کرتے رہے۔ ان کے بھائی محمد ایت بچو علی بنگالی مسجد کے برسوں ٹرسٹی رہے، ان مسجدوں کے علاوہ تبیل مسجد، عرب مسجد، جونی مسجد اور مدنپورہ کی بڑی مسجد کی بنا اور تعمیر میں برادری کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ حاجی رب اللہ غازی (متوفی سنہ ۱۹۶۶ء) مسجد اہلحدیث اور جمعیۃ کے ٹرسٹیوں میں سے تھے اور امیر جماعت بھی رہے۔ شاہ محمد ناظر جو انتظامی امور کے ناظر تھے تاحیات اس مسجد سے وابستہ رہے۔

بمبئی میں جلاہوں کا طاعونی بلوہ (۹ مارچ سنہ ۱۸۹۸ء)

مومن مہاجرین بائیکلہ اسٹیشن کے جو علاوہ مسافران غریب الوطن کے اترنے کی جگہ کے مسلمانوں کا ایک آباد محلہ ہے[1] اور مدنپورہ کے علاقے میں مورلینڈ روڈ، ڈنکن روڈ، بلاسس روڈ، باب اللہ

[1] [illegible] ۱۳۳۲ھ ۔ جب [illegible] جناب محمد حسن [illegible] منشی [illegible] جماعت [illegible]
[2] [illegible] ماتم کے [illegible] تھے۔

ٹینک روڈ اور رپن کراس روڈ تک بکھرے ہوئے تھے، کرلا میں اسٹیشن کے پاس اعظم گڑھ کے علاقے کے انصاری نورباف آباد تھے۔ کھپریل کی پوشش والے یک منزلہ یا بیٹھے مکانات کی تنگ و تاریک 'کھولیوں' میں یہ کثیر العیال قلیل المال جلاہے جی رہے تھے۔ کچھ کھڈیوں پر بُننے تننے کا کام کرتے اور ڈھیر سارے رنگ کے کپڑا ملوں میں جو انیسویں صدی کے نصف آخر تک ان علاقوں میں قائم ہو چکی تھیں مزدوری کرتے تھے، یہ نہ حفظانِ صحت کے طریقوں سے واقف تھے اور نہ بدیسی طریقۂ علاج سے مانوس تھے۔ ان کے وطن میں کئی بار طاعون پھیل چکا تھا مبارک پور میں ۱۸۹۶ء میں اور اس کے دوسرے سال طاعون کی ہلاکت خیزیوں نے آبادیوں کو ویرانہ بنادیا تھا۔[1]

ان بیچارے بنکروں کی دیہی زندگی میں شہروں کا طور طریقہ کہاں سے آتا۔ یہ شرعی احکام سے کماحقہ واقف تھے کہ وبا کے وقت وبازدہ جگہ سے فرار حرمت میں داخل ہے، مریض کی جانکنی یا سکرات کی نازک گھڑی میں اس کے بالین تلقین کرتے رہنے کی فضیلت سے آگاہ تھے۔ پھر بھلا ان سے یہ کب دیکھا جاتا کہ حفظانِ صحت کا عملہ آکر دم توڑتے ہوئے مریض کو زبردستی اٹھا کر قرنطینہ لے جائے، رپن کراس روڈ پر ایسا ہی ایک واقعہ وقوع پذیر ہوا۔ جلاہوں نے مزاحمت کی، پولس کی کمک آئی تو اس پر پتھراؤ کیا گیا۔ دستور نام کا پارسی پریذیڈنسی مجسٹریٹ جائے وقوع پر پہنچ گیا اور معاملہ کی نزاکت دیکھتے ہوئے اس نے گولی چلانے کا حکم دیا ایک پتھر لگنے سے وہ خود زخمی ہو چکا تھا۔ طاعون کی وبا کی طرح بلوہ بلاسس روڈ، ڈنکن روڈ، باب اسٹریٹ ٹینک روڈ، فاکلینڈ روڈ، فارس روڈ تک (جہاں ہندو ہولی منا رہے تھے اور ناؤ نوش میں مشغول تھے) پھیل گیا اور پھر وہاں سے پریل تک کا علاقہ متاثر ہو گیا بلوائیوں نے طاعون زدہ مریضوں کے قرنطینے کو بھی آگ لگانے کی کوشش کی۔ ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء میں پہلے پہل بمبئی سے طاعون شروع ہوا اور ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۷ء میں مالیگاؤں میں بھی طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔

حکام وقت کی رائے ان 'ہندستانیوں' کے بارے میں پہلے ہی سے خراب تھی۔ گزیٹیر میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے" یہ بلوہ مسلم طبقہ کے سب سے زیادہ جاہل اور متعصب (جذباتی) فرقہ

---

[1] مولانا قاضی اطہر مبارک پوری تذکرۂ علمائے مبارک پور ص۲۲

سے پھوٹا۔[1] اس بلوے اور دو بار میں سینکڑوں انصاریوں کی جانیں تلف ہوئیں، طاعون کے عفریت کا شکار بھی ہنے اور پولس کی گولیوں کا نشانہ بھی، مگر اس حادثے کے بعد برادری کی تاریخ نے ایک نیا موڑ لے لیا، ان میں اب مالی استقامت اور خوشحالی بھی آگئی تھی گو یہ چند خاندانوں تک محدود تھی، اب یہ مومن۔ انصاری سہما سہما سادہ لوح جلاہا نہ تھا بلکہ اس کے عزائم میں بڑی پختگی، ہمت، مردانگی اور عمل میں وہی وارفتگی اور سرفروشانہ جذبہ پیدا ہو چکا تھا جو اس کے پرکھوں کی روایت تھی۔ یہ اپنے کرگھوں پر صاف کا کپڑا اور ساڑیاں بُنتے تھے اور ملوں میں مزدوری بھی۔ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق بمبئی میں سات ہزار جلاہے تھے۔ مدنپورہ اور اطراف کے علاقوں میں جہاں ملیں قائم تھیں ان کی گنجان بستیاں تھیں۔ انہیں میں سب سے پہلے مزدور تحریک کا لال باوٹا لہرایا، کانگریس کا جھنڈا اونچا ہوا، مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم نمودار ہوا، پھر خلافت کمیٹی بنی اور برادری کے مجاہدین آزادی سرفروشی کی تمنا دل میں لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

---

[1] گزیٹیر بمبئی کے ہندو [illegible] شہر [illegible] ۲ حصہ دوم ص ۱۹۵ اور دیکھیے مرزا علی خان "شورش بمبئی" ۱۸۹۲ء کے ساتھ بمبئی کے ہندو مسلمان کے [illegible] بیت [illegible] لائبریری نمبر ۱۰۷۷)

چونتیسواں باب

بمبئی کے انصاری مشاہیر، سیاسی، سماجی اور تعلیمی شخصیتیں

مغلیہ حکومت کے دورِ انحطاط میں مسلم معاشرہ جس جانگسل اور جانکنی کی حالت سے دوچار تھا اس سے علماء کا باشعور طبقہ بے خبر نہ تھا، شاہ ولی اللہ کے خانوادے اور مکتب فکر نے بڑے بڑے مسیحا پیدا کئے، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی مرتبہ "لو اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر" ہزاروں بے کفن میتوں کی بے زبانی نے کہا "جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا"— وہابی تحریک نے درماندگی ملت کے درماں کے لئے، جہاد کا جو نسخہ تجویز کیا تھا وہ کارگر ثابت تو ہوا لیکن اس کے لئے عمر چاہیے "کہ گوارا ہو نیش عشق"، ادھر اغیار فرنگیوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ زہر بھر دیا کہ وہابی اشتمالی ہیں اور یہ تحریک ایک تسلطانی طاقت ہے انگریزوں نے اس جماعت کو مٹانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا، یہ جماعت حلقہ دار و رسن کی آزمائشوں سے گذری، مجاہدین کو مجرم قرار دے کر حبسِ دوام بعبور دریائے شور (کالے پانی) کی سزائیں دی گئیں انہیں کے خلاف علماءِ سُو نے فتووں کے طومار لکھوا کر کفر و الحاد کا الزام لگایا۔ ولیم ہنٹر اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میں لکھتا ہے:

> "ہر مسلمان مولوی جس کی مسجد، خانقاہ سے متعلقہ ایک درجن، بیگھ زمین تھی وہ بھی وہابیوں کے خلاف چلانے لگا اور پچاس سال تک اسی کام میں مصروف رہا"۔

جزیرۂ بمبئی کے دور افتادہ مسلمان اس "وہابی اشتمالیت" کی خبریں سن کر دہشت زدہ ہو گئے اور یہاں کے اخباروں نے اس کا عنوان رکھ دیا وہابی دہشت اور دشمنی

پونہ اور احمد نگر وہابی تحریک کے گڑھ بن چکے تھے۔ مولانا نورالہدیٰ احمد نگری جو سید احمد شہید اور مولوی شاہ اسمٰعیل شہید کی طرح بڑے سرفروش مجاہد تھے سہارنپور سے دل برداشتہ ہو کر احمد نگر میں آ گئے یہاں تبلیغ و دعوت عزیمت کا سلسلہ شروع کیا اور ان کی جد و جہد سے یہاں کے لوگوں میں بڑا ذہنی و فکری انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ واقعۂ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) کے بعد بھی مجاہدین کی جھڑپیں انگریزوں سے ہوتی رہتی تھیں پٹنہ تحریک کا مرکز بن چکا تھا، شمالی ہند اور بہار سے جو خبریں مغربی

ہند میں پہنچتی تھیں ان سے اندازہ یہ لگایا جاتا کہ وہابی تحریک کی دہشت گردی نے اسے ایک اشتعالی علامت بنا دی ہے اور لوگوں میں ان سے خوف پھیل گیا تھا۔ بمبئی کے انگریزی اخبار اسے "وہابی دہشت" کہتے تھے۔ اسی زمانے میں بمبئی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات مثلاً خلاصۃ الاخبار اور مجمع الاخبار نے بھی وہابیوں کے خلاف ایک زبردست محاذ بنا لیا تھا، ان کے بارے میں ہندوستان بھر سے خبریں چھاپتے تھے کہ کس طرح "ان لوگوں نے حیدر آباد میں فساد کیا، فرخ آباد میں حضرت سید احمد صاحب کی تصویر لائے اور ٹونک میں بڑا فتنہ کیا، بمبئی کے تاجر اور دیگر زائرین جو حرمین شریفین میں مقیم تھے وہابی فرقے پر جو کچھ وہاں بیت رہی تھی اس کا کچا چٹھا لکھ کر بمبئی بھیجا کرتے تھے" وہابی فرقے کی جڑ کٹ گئی تھی، اٹھارویں ماہ جمادی الثانی ۱۲۶۵ھ کو وہابی مولویوں کی رہائی ہوئی اور انہیں مکہ معظمہ سے شہر بدر کیا گیا، جدہ سے یہ لوگ حاجی اسماعیل زکریا کے جہاز "درگیں" پر سوار ہو کر ستائیسویں رجب کو روانہ ہوئے، ۳ شعبان المعظم کو بندر معمورہ بمبئی میں آپہنچے"۔[1]

ادھر بمبئی میں ان کے مخالفین بھی ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگے تھے، ایک خط (اردو فارسی) میں کسی "مخلص دیندار" کا مجمع الاخبار میں چھپا تھا جس میں ان کے "عمل بالحدیث" کے دعوے کا بطلان کیا گیا:

> "ظاہر ہو وے کہ تاریخ ۹ ماہ شوال ۱۲۶۴ھ ہجریہ جمعرات کے دن مولوی عبدالحلیم صاحب کی مسجد سے مولوی لوگ [جن میں جھیڑی کے مولوی سیمن بھی تھے] گھوڑ بندر [بمبئی سے قریب ایک قصبہ] کے تعزیے کی زیارت کے واسطے تشریف لے گئے اور اچھی طرح با وضو ہو کر اس جنس زیور پر داخل ہوئے پھر اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے واسطے اور شرک و بدعت چھوڑنے کے واسطے ان لوگوں کا وعظ و نصیحت کرنا عوام لوگوں [کفار] کو کیا فائدہ دیگا"۔[2]

---

[1] جن وہابیوں کو مدینہ سے ... [illegible] ... شہر بدر کیا گیا ان کے نام یہ ہیں، مولوی عبداللطیف لکھنوی، مفتی مولوی عبدالرحمٰن بخاری، مولوی محمد ... [illegible]، مفتی محمد مراد بنگالی، مولوی محمود علی بریلوی اور مولوی یک چشم، تحفۂ محمدیہ ص۲۰۰، اور ... [illegible] ... ص ...

[2] تحفۂ محمدیہ ص۵۶

اسی سلسلے میں 'مخلص دیندار' نے اپنے مذکورہ بالا خط میں یہ اطلاع بھی دی تھی کہ مولوی عبدالحلیم کے چھاپہ خانے میں جو قرآن چھپا تھا اس کے کچھ اوراق ردّی میں ایک بنئے نے خرید لئے تھے اور ان میں سوکھی گیلی جنس باندھ کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ اس 'مخلص دیندار' نے جب یہ بے حرمتی دیکھی تو کلام شریف کے ورقوں کو دگنی قیمت میں خرید لیا۔" ؎۱

۱۸۵۷ء کا غدر اور بمبئی

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شمالی ہند میں 'بغاوت' پھوٹ پڑی، وہاں کی وحشتناک خبروں سے باشندگانِ بمبئی میں اور بھی خوف و ہراس پھیل گیا، وہ غدر کے ہنگاموں میں دہابیوں کو سب سے زیادہ ہنگامہ آرا سمجھتے تھے ان میں جولاہوں کی بھی بڑی تعداد تھی "وہابی دہشت" اتنی بڑھ گئی کہ بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن نے فوج کے کمانڈر بریگیڈیر جنرل جے۔ ایم۔ شرٹ کو خبردار کر دیا، ادھر پولیس کا دستہ ایک نہایت قابل مخلوط النسل آفیسر چارلس فورجیٹ سپرنٹنڈنٹ پولس کے زیر نگرانی مستعد ہو گیا، سماج دشمن عناصر پر پہلے ہی قابو پا لیا گیا، اور خود فورجیٹ بھی مسلمان محلوں میں بھیس بدل کر گشت لگانے لگا اس کے کئی سربرآوردہ مسلم دوست تھے جن میں قاضی شہر بھی تھے، اس نے اپنے خفیہ جاسوس فوج میں چھوڑ رکھے تھے اور خود اس کے معتمد ایک وہابی مولوی محمد یوسف [؟] صوبیدار محمد علی کانی پائی جی، بازار اور دیگر اڈوں پر جا کر، افواہیں سنتے، خبریں معلوم کرتے اور اندازہ لگاتے کہ عوام کا رجحان کس طرف ہے۔

مسلمان فوجیوں کے انگریزوں کے قتل عام کی خبروں سے 'وہابی دہشت' اور بڑھ گئی، اسی اثناء میں پونہ کیمپ بازار کی مسجد کے ایک [وہابی] مولوی کو گرفتار کر لیا گیا تھا جو انگریزوں کے قتل عام کا منصوبہ بنا رہا تھا، ادھر بقر عید تو خیریت سے گذر گئی لیکن اس سے پہلے جو دہشتناک خبریں قتل و غارت گری کی پھیلی ہوئی تھیں اس نے باشندگانِ بمبئی کی نیندیں حرام کر دی تھیں اور دہشت زدہ لوگ پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے، اب محرم میں خدشہ تھا کیونکہ اس مہینے میں شیعہ اور سنی فرقوں کے درمیان بڑا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا، فورجیٹ نے دونوں فرقوں کے سربرآوردہ اور معزز عمائدین کو ناخدا محمد علی روگھے کے مکان پر بلایا اور پانچسو کے مجمع کو

؎۱ تحفہ محمدیہ صفحہ ۵۶

خطاب کرتے ہوئے اس نے اتفاق و اتحاد، قوم کی سالمیت اور برطانوی راج کی برکات کے بارے میں اردو میں تقریر کی، جنرل برڈ وڈ نے فورجیٹ کی تائید کی اور سامعین میں سے ایک نہایت ممتاز بزرگ بھائی میاں طیب جی نے حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور امن برقرار رکھنے کا عہد کیا۔

فورجیٹ کو مسلمانوں کی طرف سے اطمینان تھا لیکن فوجیوں میں بے چینی اور اضطراب کا عالم دیکھ کر وہ ان پر کڑی نگرانی رکھنے لگا، پھر اس کے وفادار جاسوس صوبیدار محمد بودھن نے فورجیٹ کو گنگا پرساد نام کے ایک شخص کے بارے میں بتلایا جس کے سوناپور میں واقع کوٹھڑی میں ہر رات فوج کے کچھ سپاہی جمع ہو کر سازش کرتے تھے اور بغاوت کا منصوبہ بناتے تھے تاکہ وہ پونہ جا کر نارائن راؤ باجی پت پردھان کا جو بادشاہ دہلی کی طرف سے بحیثیت وزیر کولہاپور پر قبضہ کا اعلان کر چکے تھے ساتھ دے کر بغاوت میں شامل ہو جائیں، فورجیٹ نے عینی شاہد کے طور پر فوج کے میجر بیرو کو لے کر گنگا پرساد کی کوٹھڑی پر خفیہ تفتیش کے لئے گھیرا ڈال دیا، ان کا منصوبہ دیوالی کے تہوار پر لوٹ مار اور غارت گری کا تھا فوج کے دو سپاہی کھل کر سامنے آئے۔

۱۳ اکتوبر کو ڈرل حوالدار سید حسین جو "مرین بٹالین" سے تعلق رکھتا تھا اور دسویں رجمنٹ کے پرائیویٹ منگل گدی کو فوجی عدالت (کورٹ مارشل) نے سزا سنائی کہ دونوں کو غداری کے الزام میں توپ دم کر دیا جائے، اور شہر میں غوغا مچ گیا کہ ان دونوں کے پرزے اڑ جائیں گے اور تماشا دیکھنے کے لئے شہریوں کا اتنا بڑا اژدہام اسپلینیڈ کے میدان میں امڈ آیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، دونوں مجرموں کو دو توپوں کے دہانوں سے جکڑ کر باندھ دیا گیا شاہی توجانے کے کیپٹن بولٹن نے ٹھیک مقررہ وقت پر حکم دیا "فائر"! ــ اور زور دار دھماکا ہوا ان کے چیتھڑے اڑ گئے اور سارے میدان میں سرخ پھول کھل گئے نوآبادیاتی عفریت پہلی جنگ آزادی کے بعد ہر جگہ اسی طرح چنگھاڑتا رہا ــ اور ہزاروں میدان خون کی سرخی سے لالہ زار بنتے رہے!!

جزیرہ بمبئی کے اکابر سیاست:

پہلی جنگ آزادی کی شکست خوردگی تاریخ کا بہت بڑا المیہ بن گیا جس کے ردعمل کے طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کے سیاسی طور سے باشعور طبقہ کو مسلم تنظیم اور سیاسی قیادت

کی ضرورت کا شدید احساس ہوا تاکہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے آگے بڑھ سکیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۹۸ء تک مسلم قیادت سر سید احمد خان کے ہاتھوں میں تھی۔ سر سید انگریز پرست تھے اور مسلمانوں کی "وفاداری بشرط استواری" کو اصل ایمان تصور کرتے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ فرنگی تسلط کو اب دوام حاصل ہو چکا ہے اور مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم مسلم معاشرہ کی بقا اور ترقی کی ضمانت دے سکتی ہے۔ سر سید احمد خان کو ہندستانی مسلمانوں کا ترکی حکومت سے اظہار ہمدردی بھی شاق گذرتا تھا وہ اسے حکومت سے وفاداری کے منافی سمجھتے تھے، خلیفۂ ترکی نہ ہندستانی مسلمانوں کی سربراہی کا مجاز تھا اور نہ شیخ الاسلام کے فتوؤں کا مسلمانوں کے مذہبی و معاشرتی مسائل سے تعلق تھا اور نہ ان کا اطلاق ہوتا تھا، ان کی رائے میں یہ منصب مذہبی نہ تھا بلکہ سرکاری تھا اسی لئے جب شیخ الاسلام کو برخاست کر دیا گیا تو انہیں اپنی رائے کی تائید حاصل ہو گئی، مسلمان ہونے کے ناطے مسلم ترکی حکومت سے ہمدردی ایک مذہبی جذبہ تھا لیکن اس طرح انگریزوں سے وفاداری کے رشتے میں گرہیں پڑنے کا خدشہ تھا، سر سید احمد خان جلال الدین افغانی (۱۸۳۹ء۔۱۸۹۷ء) کی تحریک اتحاد عالم اسلامی کے سخت خلاف تھے جب کہ انگریزی حکومت اس تحریک کی حمایت کر رہی تھی۔ یہ دراصل ایک سیاسی چال تھی۔ کیونکہ وسطی ایشیا اور جنوبی مشرقی ایشیا کے نقشے پر کئی مسلم سلطنتیں سبز نشان دکھلانے لگی تھیں اور برطانیہ روس کے خلاف ان اسلامی ممالک کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنی جارحانہ کارروائیوں کو تیز کرنے کے درپے تھا۔

جب ۱۸۷۶ء۔۷۷ء میں روس نے ترکی پر حملہ کیا تو انجمن اسلام نے بمبئی کی جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ کیا کیونکہ مسلمانوں کو خدشہ تھا کہ کہیں انگریزی حکومت اپنی پالیسی تبدیل کر کے روس سے نہ جا ملے ناخدا محمد علی روگھے نے "ٹائمز آف انڈیا" میں اس جلسے کی روداد چھپوائی۔

> "یہ انجمن اس زمانے میں کہ جبکہ دکھنا کوئی دوسرا بغیر اسلامی [illegible] تھا اب جامع مسجد میں کل فرقۂ اسلام کا ایک جلسۂ عام قرار دے کے آمادہ [illegible] میں [illegible] کی [illegible] یادداشت کی تجویز ٹھہرائی۔ اس جلسۂ عام میں [illegible] سب سے صدر کیا گیا لہٰذا سے آپ کے ناظرین کو واضح ہو گا کہ یہ یادداشت صرف انجمن کی طرف سے نہ تھی بلکہ تمام جمہور اسلام بمبئی کی جانب سے" [1]

---

[1] انجمن اسلام بمبئی۔ ترجمہ خط انگریزی مرسلہ [illegible] جناب ناخدا محمد علی روگھے موسوم صاحب ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا [illegible]

ٹائمز آف انڈیا نے جو اس سے پہلے مسلمانوں کے بے بضاعت وجود اور قومی شناخت کا شاکی تھا، چار ہزار کوکنی، خوجہ، عرب اور بوہرہ حاضرین کے کثیر جم غفیر کو دیکھ کر ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۷ء کے اپنے اخبار کے اداریے میں بڑی جلی سُرخی سے اعتراف کیا کہ "مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کا دن آج برپا ہوگیا" کلکتہ میں امیر علی نے ۱۸۷۷ء میں ایک مسلم مرکزی قومی مجلس کی بنیاد ڈال کر مسلمانوں میں سیاسی اور قومی شعور کا پہلا پودا بویا۔

— اور جب انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں انجمن اسلام کے سربرآوردہ بانیان بدرالدین طیب جی اور محمد علی روگھے آگے بڑھے تو ان کے مخالفین بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ کانگریس کی مخالفت میں سب سے پہلا اسلامی جلسہ قیصر باغ لکھنؤ میں ۲۷ مئی ۱۸۸۹ء کو منشی محمد امتیاز علی وکیل عدالت عالیہ لکھنؤ کی صدارت میں ہوا۔ اس میں آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کے ۱۱ اپریل (۱۸۸۹ء) والی لیکچر کی تردید میں اور نیشنل کانگریس کی مخالفت میں تقریریں ہوئیں اور انگریزی حکومت کی برکات کو سراہا گیا:

"ہمارے مسلمانوں کے گروہ کو کسی ایسی نیشنل کانگریس (میں) شرکت کی ضرورت نہیں جس کا آجکل ذکر ہو رہا ہے، سب مسلمان یک قادر مطلق کو معبود ماننے والے ایک رسول برحق کی پیروی کرنے والے اپنے ہی توحید کے اعتقاد سے ایک ہو رہے ہیں۔"

"ہندوستان میں جب سے انگریزوں نے دخل پایا ہے . . . امن پھیلانے میں انگریزوں نے جس درجے کی کامیابی حاصل کی ویسا امن نہ کبھی ہندوؤں کے وقت میں تھا نہ مسلمانوں کے عہد میں، مرتب کرنا سڑک، ڈاک، ریلوے اور تار برقی کا عام طور پر جاری کرنا، وسائل تجارت کا کھولنا، قطاع الطریق اور دختر کشی کا انسداد اور ہر اقسام کے انتظامات واسطے آسائش رعایا کے تہیہ ہوئی۔ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا کہ بیچ قیام امن و آسائش رعایا انتظام برٹش گورنمنٹ کا ہندوستان میں جب کسی سلطنت کا نہیں۔"

"جس جلسے میں یہ تقریر (اسپیچ) دی گئی وہ جلسہ انجمن دار السلام کی جانب سے تھا جس میں ہزار سے زیادہ مسلمان ہر طبقے کے شریک تھے۔ آخر میں باتفاق سب نے نہایت جوش سے کہا کہ ہم لوگ نیشنل کانگریس کے مخالف ہیں اور ۲۰ اپریل والے جلسے کی تقریر سے جو کانگریس کی تائید اور حمایت میں تھی بیزاری ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تحریر اس زمانے میں یا پچ کروڑ بسنے والے ہندوستانی مسلمانوں کی ترجمانی کرتی ہے اس تقریر

> میں سیاسی بیداری کی ایک اٹھتی ہوئی لہر دکھائی دیتی ہے اور مذہبی رجحان کی موج ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک عام خیال یہ بھی تھا کہ گو مسلمان انگریزی تعلیم میں کسی دوسری قوم سے پیچھے ہوں مگر دل و دماغ، قوت انتظامی، عزیمت، وسعت خیالات و دوراندیشی میں کسی قوم سے کم نہیں۔"[1]

اس کی صدائے بازگشت کچھ مہینوں بعد بمبئی میں سنائی دی۔ شہر کے مشہور مغل (ایرانی) تاجر "جناب حشمت مآب آقا عبدالحسین شیرازی امین التجار" کے دولت خانے پر ۲۵ر دسمبر بروز چہارشنبہ ۱۸۸۹ء کو ایک مجلس منعقد ہوئی۔ دو ہزار مسلمانوں کا مجمع تھا۔ مولوی قاضی محمد اسماعیل نہرتی نے تقریر بیان فرمائی۔ یہ جلسہ انجمن ارباب صفا کے اہتمام سے ہوا تھا۔ قاضی نہرتی نے بڑے بلیغ الفاظ میں قیصرۂ ہندوستان و ملکۂ معظمہ انگلستان جناب کوئن وکٹوریہ اعطاہا اللہ ملکاً کبیراً" کی مدح و ستائش کی:

شد از فیض اورتختۂ بوستان   زلندن زمین تا بہ ہندوستان

اپنی تقریر میں قاضی نہرتی نے بدرالدین طیب جی، حامد علی خان، آنریبل ہمایوں جاہ اور رحمت سیانی کا ذکر کیا جو کانگریس میں شامل ہو کر امت مسلمہ کی صفوں سے نکل گئے تھے۔ یہ نااتفاقی کی دلیل تھی جبکہ یہ لازم بھی نہیں کہ "امورات عقلیہ میں ہم ایک دوسرے کی رائے کی بلا استدلال و حجت پیروی کریں اور خواہ مخواہ مقلد بنیں۔ یہ بات دیانت کے خلاف ہے اور سفاہت و دنائت مزاج پہ دال ہے، البتہ اس طرح کا اتفاق رذیل قوموں میں مثلاً کنجڑے، بھٹیارے وغیرہ رذیل پیشہ والوں میں جاری ہے اور انکو قوت فکریہ اتنی حاصل نہیں۔"[2]

اس سیاسی تحریک کی مخالفت کرنے والے مسلمان دانشور اور علماء دراصل پہلے ہی جیسے ہزاروں مسلمانوں کے احساس پسپائی کی ذہنی نمائندگی کرتے نظر آتے تھے جنہوں نے مایوس ہو کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا یہ سمجھتے ہوئے کہ پرانے دن لوٹ کر نہیں آئینگے۔ پرانا نظام

---

[1] اسپیچ منشی محمد امتیاز علی وکیل عدالت عالیہ لکھنؤ ۲۰ مئی ۱۸۸۸ء کے اسلامی جلسے میں بمقام قیصرباغ لکھنؤ میں دی۔ انوری پریس لکھنؤ گردہ گنج۔

[2] اسپیچ نوسفت نیشنل کانگریس تردید آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ، صفحہ ۔ ۵

مرتکب ہے اور اس کے احیاء کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، منفعل مزاج علمائے دین "دعائے قنوت نازلہ" میں ذہنی پناہ ڈھونڈھ رہے تھے ہاتھوں میں تلوار کی جگہ تسبیح تھی میدان کی جگہ حجرۂ تنہائی، تاجر طبقہ کے پیش نظر تمول، مفاد اور سماجی اقتدار تھا وہ اپنے انگریز آقاؤں کی خوشامد، ان کی دعوتوں اور بال ڈانسوں میں اپنے مقصد کی گردش دیکھتے تھے۔ کسی بھی قوم کی سیاسی غلامی اتنی مہلک نہیں ہوتی جتنی ہلاکت انگیز ذہنی غلامی اور فکری مرعوبیت ہوتی ہے، یہ فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت آزادی کے بعد بھی قائم رہی تو اس قوم کے حوصلوں اور ہمتوں کا خدا حافظ ہے۔

مسلمانوں کا انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا، قاضی حیدری کا فتویٰ یہ تھا کہ "خاص بانیان کانگریس کی تقریر اور کارروائی اہل اسلام کو شمول مجلس سے مخالفت و مخالفت شرعی کرتی ہے" بمبئی کے خوجہ سیٹھ علی محمد بھیم جی نے جو مجلس کانگریس کے مہتمم اور معاون تھے اور مسلمانوں کو اپنی پارٹی میں شمولیت کی ترغیب دیتے پھرتے تھے ایک ضخیم رسالہ بطور فتویٰ کے علمائے دین سے لکھوا کر مطبع صحافی لاہور سے "نصرۃ الابرار" کے نام سے شائع کر دیا تھا جس کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ "جس مجلس (پارٹی) میں کافر شامل ہو دیں اس میں اہل اسلام کو شامل ہونا شرعاً درست ہے اور اگر نیچری اور مرتد جس مجلس میں شامل ہو دیں تو اس میں اہل اسلام کا شامل ہونا ممنوع و غیر جائز ہے اور شامل ہونے والا آثم اور گنہگار ہوگا، اجتناب و احتراز ایسی مجلس سے لازم ہے۔"[1]

اس مسئلہ پر کئی رسالے بھی شائع ہوئے۔ محمد سلام اللہ خان نے "رہنما" نامی رد و مذکرہ شائع کر دیا [illegible] اس میں نیشنل کانگریس کی مخالفت میں ــــ اور انجام اس کا کیا، نتیجہ اس کا کیا کام ہے [illegible] بتایا گیا ہے[2]

[illegible] اس کشاکش اور کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا باشعور طبقہ کانگریس کے جھنڈے تلے آزادی کی جنگ میں شامل ہو گیا، ان میں مومن برادری کی ایک بڑی کھیپ اس زمانے میں داخل ہو گئی [illegible] خلافت تحریک کی بنیاد پڑی۔ تحریک خلافت ملک کی آزادی کی اجتماعی تحریک

---

[1] اسپیچ مخالفت نیشنل کانگریس ص۱۱۔۱۲

[2] رہنما محمد سلام اللہ خان کریمی لائبریری بمبئی نمبر ۱۴۸۸

سے کانگریس ابھری تھی جو ہندو مسلم اتحاد کی علامت بن گئی تھی۔

تحریکِ خلافت اور برادری

علی برادران خلافت تحریک کے بانی تھے، مولانا محمد علی نے اپنی دلی تمنا کا اظہار یوں کیا:

"درسنت ابراہیمی پر عمل کر کے خلافت کے راستے پر میں اپنے آپ کو اپنی بیٹیوں کو اپنی بوڑھی ماں کو قربان کرنا چاہتا ہوں"

یہ محض ایک جذباتی نعرہ نہ تھا بلکہ ایک تڑپتی ہوئی تمنا تھی۔ اسلام کی بقا کے لئے ان کا نظریہ تھا کہ ترکی خلافت کو زندہ رکھنا چاہئے تاکہ یہ ایک موثر عالمگیر مذہبی تنظیم کے قالب میں ڈھل جائے۔ ترکی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں خلیفہ محمد ششم کو معزول کر کے سلطان عبدالمجید کو مسندِ خلافت پر ان کا جانشین بنا دیا، اور سارے اختیارات چھین لئے۔ خلافت گو مذہبی علامت بن کر رہ گئی تھی مگر جس تقدس اور احترام کی حامل تھی اور تاریخی روایات و اقدار کی امین تھی اسے نہ مصطفیٰ کمال پاشا کی مغرب زدہ ذہنیت سمجھ سکتی تھی اور نہ اس کی قومی پارلیمان یا قانونی مجلس جس نے، عہدِ وسطیٰ کے اس رسولی دگٹی کو سلطنت کے جسم سے نکال پھینکا۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو مجلس نے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور چند بنیادی شرعی احکام کے سوا پوری شریعت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن افسوس کہ ہندوستانی مسلمان برسوں مصطفیٰ کمال کی شخصیت کا مداح بنا رہا۔

خلافت تحریک اس طرح بے معنی بن کر رہ گئی تھی اور یادوں کی بیساکھی اور ماضی کی روایات کا سہارا لے کر کب تک مسلمان خلافت کا تابوت لے کر چلتا رہتا۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ملت کے مستقبل کے رہنما علامہ محمد اقبالؒ اور محمد علی جناحؒ نے خلافت کے خاتمے پر نہ نوحہ کیا اور نہ آنسو بہائے۔ شاعرِ مشرق نے "دریوزۂ خلافت" لکھ کر اپنا مطمعِ نظر ظاہر کر دیا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے	تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟	خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے	مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

— اور پھر "خضرِ راہ" میں راستہ دکھلاتے ہوئے فرماتے ہیں

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار	لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

مذہبی جذبات اور قومی بیداری کی یہ لہر سیاسی امواج بحر میں ڈوب گئی، ہزاروں مسلمان خلافت تحریک کے بہاؤ میں قوم کا سفینۂ حیات لے کر چلے اور کانگریس کے ساتھ جدوجہد آزادی میں شریک ہو کر ساحل مراد تک پہنچے۔ خلافت والے جمعیۃ العلماء کی صفوں میں آگئے، یہ سارے اکابر دین تھے۔ کچھ خلافت کی عبا پہنے کانگریس کے کھدر پہنے۔ کل ہند خلافت کمیٹی کا قیام مولانا عبدالباری اور خلیق الزماں کی کوششوں سے لکھنؤ میں عمل میں آیا، علی برادران جب جیل سے رہا ہوئے تو خلافت کمیٹی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اور اس کا مرکزی دفتر بمبئی میں خلافت ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔ خلافت کمیٹی کے پہلے صدر بمبئی کی میمن قوم کے ایک ممتاز تاجر میاں جی چھوٹانی مقرر ہوئے۔ خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام خلافت روزنامہ کا اجراء ہوا جس سے اردو کے مشہور صحافی، ادیب اور علماء برسوں وابستہ رہے۔ مالیگاؤں کے مولانا عبدالحمید نعمانی عربی خبروں کے مترجم اور کالم نویس کی حیثیت سے اخبار اور تحریک دونوں سے وابستہ رہے۔ مولانا نے خلافت ہی سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا خبروں پر تبصرے بھی کئے اور کبھی کبھی اداریے بھی لکھے، مسائل حاضرہ پر آپ کے تبصرے بڑی سیاسی گہرائی رکھتے تھے۔ برادری کی ہی دوسری ممتاز ہستی مولوی محمد یوسف حاجی کریم بخش انصاری مبارک پوری جو برہانپور اور بھیونڈی سے بھی تعلق خاطر رکھتے تھے مولانا شوکت علی کے زمانے میں خلافت اخبار سے منسلک تھے۔ رئیس احمد جعفری کے ساتھ اخبار کے نائب مدیر بھی رہے بعد میں اپنا اخبار ترجمان پرنسس بلڈنگ بمبئی سے نکالا۔

کانگریس کے کھدر کی تحریک اور خلافت تحریک میں برادری کی خواتین کو ایک قدر مشترک ملی جو ان کے جذبات کی علامت بھی تھی وہ تھا چرخہ اور چرخے پر سوت کاتنا، جب علی برادران کی والدہ "بی اماں" خود اپنے دونوں نونہالوں کے ساتھ جدوجہد آزادی میں شریک ہو گئیں تو چاروں طرف ان کا نعرہ گونجنے لگا،

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

— اور ت کے ساتھ سینکڑوں، نہیں میدان سیاست میں کود پڑیں اور ان کے ساتھ ان کے ہزاروں بیٹے، ہزاروں محمد علی ساتھ تھے، مدنپورہ اور بائیکلہ علاقوں کی خواتین میں بھی جوش و ولولہ کی کیفیت پیدا ہو گئی، مورلینڈ روڈ (ٹھنڈی سڑک) پر الفت نائکن کے گھر میں مستورات کا جمگھٹا ہونے لگا یہاں علی برادران کی "بی اماں" اپنی کھلی ہوئی چھت کی لمبی بیوک کار میں آتیں اور مجمع کو خطاب کرتیں اور پھر الفت نائکن کو لے کر گلی گلی جا کر عورتوں کے مجمع میں

تقریریں کرتیں، اُلفت نائکن سرمانک جی پٹیٹ ملز تاردیو میں 'اسپنڈ رز' (کانڈی مشین) پر کام کرنے والی مزدور عورتوں کی مقادمین۔ یعنی نائکن تھیں۔ آپ بی، امّاں کی بڑی چہیتی سہیلی تھیں۔

مجلس احرار کی سرگرمیوں نے بھی برادری میں بیداری کی لہر دوڑادی تھی، حافظ علی بہادر خان نے کھیلاباڑی اسٹریٹ میں مجلس کا دفتر قائم کیا تھا، اس کے رضاکاروں میں جنہیں سُرخ پوش کہا جاتا تھا برادری کے متعدد جوان شامل تھے ان میں سے کئی بزرگ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ یہ مجلس انڈین نیشنل کانگریس کی پروردہ تھی جس کی قیادت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان اور شورش کاشمیری کررہے تھے، عبدالحمید انصاری (مالک و مدیر روزنامہ انقلاب) بھی ان سرخپوشوں میں شامل تھے۔

دہلی میں آل انڈیا کانفرنس کے جلسہ میں شرکت کے لئے مجلس احرار کے اراکین بمبئی سے دہلی تک بس سے سفر کر کے گئے تھے، اس گروہ میں عابد علی جعفر بھائی، محمد یٰسین نوری، برایٹ لا اور دیگر اکابرین شہر شامل تھے۔ اثنائے سفر میں متعدد جگہوں پر مسلم لیگیوں نے ان کی بس کو روکا، پتھراؤ کیا اور مانع سفر رہے لیکن قافلہ آگے بڑھتا ہوا دہلی پہنچا جہاں پنڈت جواہر لال نہرو نے سرخپوش قافلہ کا شاندار استقبال کیا اس موقع کی کھینچی گئی تصویریں آج بھی متعدد اراکین کے گھروں کی دیواروں پر آویزاں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ؎

تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں
تیرے فتراک میں کوئی کبھی نخچیر بھی تھا (غالب)

بمبئی کے انصاری مجاہدین آزادی

حاجی باب اللہ غازی

حاجی صاحب فیض آباد سے دس برس کی عمر میں بمبئی آکر آباد ہو گئے اور بہت جلد اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب اپنے علاقہ مومن پورہ (کالا پانی) میں مقبول ہو گئے، صداقت اور جسارت کے اوصاف کے حامل تھے، مجاہدین آزادی میں طاہر انصاری، عابد علی، دستگیر اور وارث علی مقادم کے ساتھ شریک ہو کر تحریک آزادی کے مجاہد بن گئے اور غازی کہلائے۔ مجلس احرار کے صدر بنے اور مشاہیر ملک و قوم کی نظروں اور آرزوؤں کا مرکز بن گئے، مولانا احمد حسین مدنی

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر مشاہیر علمائے کرام کی میزبانی کا شرف حاصل رہا۔ عملی طور پر کانگریسی تھے اسلئے کھدر پوش تھے اور اس کے پرچم تلے منعقدہ جلسوں میں شریک رہتے اور جلوسوں کی قیادت کرتے آدم عادل اور نصرت عباسی جیسی معروف شخصیتوں سے ملاقاتیں رہتیں اور ان کے ساتھ ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے لئے ہمہ تن آمادہ ومصروف رہتے تھے مدنپورہ میں نصرت اللہ عباسی، وارث مقادم اور جبار سیٹھ کے اشتراک تعاون سے ویورس سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ عامل بالسنہ اور اہلحدیث تھے۔

نصرت اللہ عباسی

بڑی تند آور سیاسی اور سماجی شخصیت تھی، مومن کانفرنس کے لیڈر تھے، صنعت پارچہ بافی کو فروغ دینے کے لئے آپ نے بڑی جدوجہد کی تھی، امداد باہمی اور اشتراک تعاون جس نے برادری کو کوآپریٹو سوسائٹی کا تصور دیا اس کے آپ بڑے حامی اور اس تحریک کے روح رواں تھے۔ قوم کے ہمدرد اور ملک کے مخلص رہنما تھے۔ آپ کی بیش بہا خدمات کے اعتراف میں انصار ہال کی تعمیر کی گئی جو آپ کے نام سے منسوب ہے۔

عبدالجلیل احمد انصاری

(۱۹۲۷ء-۱۹۷۳ء) عبدالجلیل مدنپورہ کے ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا چچا نے پرورش کی صفرابادی میونسپل اردو اسکول اور مدنپورہ سنٹرل اردو اسکول تک تعلیم حاصل کی، انجمن اسلام میں داخلہ لیا لیکن عسرت وغربت نے علم کا دروازہ بند کر دیا اور مایوسی نے سیاست کا میدان کھول دیا، ۱۹۴۰ء میں جب سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں آپ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگئے۔ نوجوان پارٹی (تیسری کھیلا بائی اسٹریٹ) مدنپورہ کو آپ کی قیادت حاصل ہوگئی آپ اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں بمبئی سٹی ویورس کارپوریشن قائم ہوئی تو اس کے بھی سیکریٹری نامزد کئے گئے اور بنیادی رکن بن کر بنکروں برادری کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں ریلوے ہڑتال میں شریک ہوئے تو دو ماہ کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔ عبدالجلیل اخوان الصفا کے بھی رکن تھے۔

کامریڈ عبدالجلیل کے ذہن رسا میں سب سے پہلے ایک کالج کے قیام کا خیال ابھرا کیونکہ اس

علاقہ میں کوئی کالج نہ تھا۔ انہوں نے عملی قدم اٹھایا، لوگوں نے ساتھ دیا، کارواں بنتا گیا اور سنہ ۱۹۶۹ء
میں منزلِ مقصود مِل گئی، خواب کی تعبیر پوری ہو گئی لیکن خواب دیکھنے والے کا نام ایک خواب
بن کر رہ گیا، ہوتا یہی ہے جب بھیڑ لگ جاتی ہے تو موقع پرست حضرات جھپٹ کر ہراول دستے
کو پیچھے ڈھکیل دیتے ہیں۔ انجمن خیر الاسلام کے آپ رُکن تھے۔

عبدالجلیل کے بعد آپ کی بیوہ مہر النساء اس انجمن کی مجلس منتظمہ کی رُکن مقرر ہوئیں۔
عبدالجلیل انصاری اپنے معاصر عبدالرحمٰن حسن انصاری کی طرح فٹ بال کے بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔
کانگریس، خلافت تحریک، مسلم لیگ اور اشتراکی جماعتوں کے جب رنگ برنگی عَلم لہرانے لگے
تو ساری برادری علمبرداری میں پیش پیش رہی، کانگریس کے جھنڈے تلے ہمیں سب سے بڑی
بھیڑ دکھائی دیتی ہے اور مجاہدینِ آزادی کی کئی صفیں آراستہ نظر آتی ہیں۔

الحاج منشی محمد یوسف محمد یحییٰ

۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۲۳ء کو منشی محمد یحییٰ کے گھر کے چشم و چراغ بن کر آئے، بچپن خوشی
میں گذرا، انجمن ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری میں
بی۔ اے کے درجہ تک پہنچے۔ یہ مادرِ علمی اس زمانے میں واحد گہوارۂ علم تھا جس میں مغربی
ہند کے شہروں اور قصبوں سے طالبانِ علم فیض اٹھانے کے لئے آتے تھے، ہزاروں مسلم طلبہ و
طالبات اس سرچشمۂ علم و دانش سے سیراب ہو کر نکلے ہیں لیکن وقت کے پھیلتے بڑھتے گرداب
میں کھو گئے، جو سطح سے اونچا ابھرے وہ جانے پہچانے "لوگ" بن گئے، کچھ سفینۂ قوم
کے ناخدا بن گئے اور کچھ ساحلِ مراد پہ پہنچ کر آگے بڑھ گئے۔

منشی محمد یوسف تعلیم نامکمل چھوڑ کر کالج سے نکلے اور "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک میں شامل
ہو گئے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں متحدہ آزاد پارٹی کے صدر بنے، انگریز دشمن تھے لیکن انگریزی زبان سیکھنے
کی موافقت میں تھے۔ آزاد پارٹی کے زیرِ اہتمام انگریزی کلاس کھولی اور خود لیکچر دینے لگے۔ بمبئی
ہینڈلوم ویورس ایسوسی ایشن مذکورہ کے بنیان گذاروں میں آپ کا نام سرِ فہرست ہے۔ مہاراشٹر
پاور لوم ایسوسی ایشن کے آپ سنہ ۱۹۶۴-۶۵ء تک صدر رہے۔ انجمن مفید الیتامیٰ اور ہندوستانی
مسجد بائیکلہ سے وابستہ رہے۔ انجمن خیر الاسلام کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے۔ پونہ کالج کی
کمیٹی سے بھی وابستہ تھے۔

منشی جی صاحب علم اور صاحب قلم تھے۔ انجمن اسلام کے ترجمان رسالہ "بصیرتِ نو" میں آپ کے مضامین بڑے فکر انگیز ہوتے تھے اسی طرح ہر جمعہ کو مسجد جمیل مدنپورہ میں آپ کا وعظ بڑا ایمان افروز ہوتا تھا۔ برادری کے بہی خواہ، قوم کے ہمدرد اور بنکروں کے زبردست حامی تھے۔

منشی صاحب کھیل کے میدان کے بھی بڑے اچھے کھلاڑی تھے۔

عبدالرحمٰن حسن انصاری چکّی والے (ولادت ۱۹۲۷ء)

عبدالرحمٰن حسن انصاری "مسلم فریڈم فائٹرس ایسوسی ایشن" کے فعال رکن تھے، ۱۹۳۶ء میں انجمن خیرالاسلام کے ٹرسٹی مقرر ہوئے آزاد پارٹی مدنپورہ کا جب قیام عمل میں آیا تو یہ اپنی سیاسی خدمت کی بنا پر اس کے صدر بنائے گئے۔ اس کے علاوہ آپ ینگ مسلم ایسوسی ایشن سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں۔ ٹریننگ کالج کرلا کے علاوہ پونہ کالج کی کمیٹی کی رکنیت بھی آپ کو حاصل ہے۔ ایک ماہر فٹ بال کھلاڑی کی حیثیت سے آپ نے فٹ بال ٹورنامنٹوں میں حصہ لیا ہے اور بمبئی ٹیم کی طرف سے ۱۹۴۹ء میں آگرہ اور دہلی کے میچوں میں اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا ہے۔ عبدالرحمٰن انصاری کی صاحبزادی شہربانو شریف ایم۔ اے مہاراشٹر کالج میں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔

نور محمد مومن (ولادت ۱۹۲۴ء)

انیسویں صدی کے اواخر میں یوپی کے مشرقی اضلاع سے جو بنکر خاندان مہاجرت کرکے مغربی ہند میں سکونت پذیر ہوئے ان میں نور محمد مومن کا گھرانا بھی تھا ان کے اجداد بنارس سے ترکِ وطن کرکے سورت آئے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم ہوئی بمبئی میں صنعت پارچہ بافی کو سورت سے زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ نور محمد مومن اوائل جوانی ہی سے آزادی وطن کے لئے بڑا مخلص جذبہ رکھتے تھے اور گرم رکھنے کے لئے سماجی اور سیاسی

مدنپورہ کی مومن برادری کے جن افراد جو انجمن خیرالاسلام اور مفید الیتامیٰ کے خدمت گزار تھے ان کے بارے میں تمام معلومات پروفیسر مسز نجمہ پروین خورشید (شعبۂ عربی مہاراشٹر کالج) کی گرانقدر انگریزی تصنیف و تحقیق مقالہ "خیرالاسلام کا پہلا مرحلہ دینی تعلیم کی ترقی میں" (بمبئی ۱۹۹۳ء) سے لی گئی ہیں۔

آسمانوں پر پرواز کرنے لگ گئے آزاد پارٹی مدنپورہ کے سیکریٹری رہے اور اس کی ایک اور شاخ آزاد پارٹی ویلفیر سینٹر کے نائب صدر کی حیثیت سے محلہ، برادری اور عوام کی خدمت کرتے رہے ملک کی آزادی کی جدوجہد نے انہیں "فریڈم فائٹر" بنا دیا اسی کے ایسوسی ایشن کے فعال رکن تھے۔ ۱۹۵۶ء سے انجمن اسلام کے ممبر رہے اور مختلف کمیٹیوں میں شامل تھے، برادری کی مختلف تنظیموں اور امداد باہمی کے اداروں سے منسلک رہے۔ مدنپورہ ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کے فعال رکن تھے۔

محمد عمر رجب۔ ایم۔ ایل۔ اے

مسلم لیگ بھی مدنپورہ کی برادری میں بڑی مقبول تھی۔ بلکہ ایک زمانہ میں اس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہاں محمد عمر رجب اس جماعت کے سربراہ اور نہایت ممتاز لیگی تھے۔ اس کے ساتھ ہی جمعیۃ المومنین کے نہایت سرگرم رکن تھے۔ بھیونڈی کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور اپنی تقریروں میں برادری کی فلاح و بہبود کے لئے اہم تجاویز پیش کرتے۔ برادری کے پہلے فرد تھے جن کی بین الاقوامی حیثیت کو دیکھتے ہوئے آپ کو عالمی مزدور کانفرنس جنیوا (آسٹریا) میں ہندوستان کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ محمد عمر رجب کارپوریٹر بھی تھے اور اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے تھے۔ بھیونڈی میں جب ۱۹۳۲ء میں جمعیۃ المومنین کی بنیاد پڑی تو آپ کو خاص طور سے مدعو کیا گیا تھا۔

آپ کے صاحبزادے محمد ابراہیم عمر رجب بھی سیاست سے گہری دلچسپی لیتے ہیں اور آبائی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اسی جماعت سے نسبت رکھتے ہیں جس کی خدمت والد بزرگوار کرتے رہے۔ مدنپورہ مسلم لیگ کے ایک دوسرے اہم قائد سیٹھ حبیب اللہ بخش انصاری تھے۔

سیٹھ حبیب اللہ بخش انصاری

بارہ بنکی ضلع کے کنتور قریہ میں ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے جہاں سے آپ کے والدین ترک وطن کر کے مدنپورہ آئے اور آبائی پیشہ کو وسیلۂ معاش بنا لیا۔ عسرت و ادبار کی گردش نے چھوٹے بچے حبیب اللہ کو بھی چرخہ کاتنے پر مجبور کر دیا۔ تقادر سے دس پس آکر والدین کی کفالت کے لئے وہ چرخہ چلاتے، سولہ سال کی امنگوں بھری عمر میں مل مزدور بن گئے فرصت کے اوقات میں بمبئی

ویورس سوسائٹی میں کام کرتے تھے تاکہ گذر بسر ہو سکے، آپ کی دیانتداری اور خلوص نیت سے متاثر ہو کر ارباب بست و کشاد نے ۱۹۶۰ء میں آپ کو اس کا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ ۱۹۶۸-۶۹ء میں ویورس کارپوریشن کی مجلس عاملہ کے رکن بنائے گئے۔ ۱۹۶۱ء میں انصار ایجوکیشن سوسائٹی کی رکنیت ملی، اخوان الصفا تعلیمی کمیٹی مدنپورہ کے صدر مقرر ہوئے۔

سیاسی میدان میں بھی آپ نے اپنی سرگرمیوں کا علم بلند رکھا۔ مہاراشٹر مسلم لیگ بمبئی کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ انجمن خیر الاسلام کے ٹرسٹی بنائے گئے اور اس کے زیر اہتمام چلنے والے ہائی اسکولوں کی کمیٹیوں کے ممبر بنائے گئے، پونہ کالج کی تعلیمی کمیٹی اور تعمیر کمیٹی کے بھی رکن تھے۔

سیٹھ حبیب اللہ ایک دیندار، دیانتدار اور مخلص ہستی ہیں، فسادات کے موقع پر محلے کے سربرآوردہ اشخاص کے ساتھ آپ بھی راحت کے کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتے ہیں۔

عبدالحمید انصاری (جے پی) مدیر و مالک انقلاب بمبئی

ان کے والد نظام الدین بارہ بنکی سے ہجرت کر کے بمبئی آئے، بچپن ہی میں انصاری صاحب یتیم ہو گئے بڑے بھائی عبدالرحمٰن اور ادریس مرحوم نے انہیں جزیرہ نما روہ سیلوا کے یتیم خانے میں ڈال دیا، عبدالحمید انصاری ایک جہد مسلسل کا نام ہے، جب یتیم خانے سے فارغ التحصیل ہو کر کھلی فضا میں آئے تو پر پرواز میں کچھ طاقت پیدا ہوئی، ثقہ حضرات کی معیت اور زعمائے شہر کی صحبت نصیب ہوئی تو رہنماؤں کی قیادت میں سیاسی و معاشی میدان میں آگے بڑھے۔ حافظ علی بہادر خان، شورش کشمیری، عطاء اللہ شاہ بخاری، بیرسٹر ظہور احمد الہ آبادی، معین الدین حارث، عبدالحمید نعمانی اور علی برادران سے تعلقات استوار ہوئے پہلے سرخ پوش بنے پھر سرپوش اور خدمت کی سند حاصل ہوئی تو جمعیۃ العلماء کی مسند پر رونق افروز ہو گئے، بلال احمد میں حافظ علی بہادر خان کے ساتھ شامل ہو کر سپہر صحافت پر چمکنے لگے اور بہت جلد جدوکامل بن کر سید بھائی عبدالقادر کی شرکت میں انقلاب کا اجرا کیا، تارڈیوے ٹیکر محلہ آئے اور پھر تارڈیو روڈ جبہ بھنڈر کے کمپاؤنڈ میں پہنچے، سلامت خیرآبادی، عبداللہ ناصر، ن۔م۔ شیخ، انجم انصاری اور ظ۔ انصاری جیسے دانشوروں کا تعاون تحریر ملا تو انقلاب تاریخ صحافت کا جگمگاتا عنوان بن گیا۔

عبدالمجید انصاری قوم کے لئے بڑا درد مند دل رکھتے تھے، شاعر بھی تھے اور اسیر تخلص فرماتے تھے، آپ کے سارے لڑکے صحافتی کاروبار میں ماہر تھے، بڑے صاحبزادے خالد انصاری نے مڈ۔ ڈے شام نامہ نکال کر صحافتی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، اب ان کے صاحبزادے طارق انصاری مڈ۔ ڈے پبلیکیشنز کے ڈائرکٹر ہیں۔ فضیل جعفری مشہور شاعر اور ادیب نے جب سے انقلاب کی ادارت سنبھالی ہے، اس میں ایک انقلاب آگیا ہے۔ آپ کے اداریے بڑے فکر انگیز ہوتے ہیں اور ادبی شان کے حامل ہوتے ہیں، سیاسی شعور اور قومی و ملی جذبوں سے سرشار رہتے ہیں، ہر اداریہ جلی حروف میں لکھا ہوا قوم کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ فضیل جعفری صاحب نے اردو صحافت کی شاندار روایات کو جو مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں نے قائم کی تھیں از سر نو زندہ کر دیا۔

الحاج محمد عمر محمود (ایم۔ اے)

جمعیۃ المومنین بمبئی کے سیکریٹری تھے۔ آپ کی صدارت میں اکتوبر ۱۹۳۲ء کو بھیونڈی میں جمعیۃ المومنین کا بنیادی جلسہ ہوا تھا، اس سلسلے میں آپ کا بھیونڈی آنا جانا ہوتا تھا غالباً آپ کے کچھ رشتہ دار یہاں آباد تھے۔ منشی محمد یٰسین محمود جو جمعیۃ المومنین بھیونڈی کے خازن تھے قرائن سے لگتا ہے آپ کے عزیز تھے، محمد عمر محمود میونسپل اردو اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ برادری کے ممتاز افراد نے جب انجمن خیر الاسلام کی بنیاد ڈالی تو آپ اس کی ترقی اور وسعت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ محمد عمر بڑے اچھے مقرر تھے۔

انصاری سیاسی مدبّرین اور مجاہدینِ آزادی

مدنپورہ میں چونکہ مل مزدوروں کی غالب آبادی تھی اس لئے یہاں کمیونسٹ پارٹی اور دیگر مزدور یونینوں کے جھنڈے لہراتے تھے ان میں سب سے نمایاں لال باوٹا تھا، پارٹی کے ایک سرگرم ساتھی کا نام ہی عبدالمجید باوٹا پڑ گیا تھا۔ یہ مزدوروں کے بڑے ہمدرد تھے سماجی ورکر تھے۔ ۱۹۵۷ء میں جب انجمن خیر الاسلام کے لئے بلڈنگ فنڈ کمیٹی تشکیل دی گئی تو آپ کو اس کا صدر منتخب کیا گیا محمد امین جے پی سیکریٹری اور دوسرے سیکریٹری عبدالغنی اطلس والا تھے۔ الحاج منشی محمد یحییٰ، محمد صدیق سردار اور الحاج محمد عثمان سیٹھ اراکین تھے کالا پانی کے محمد صدیق عبدالقدوس انصاری کمیونسٹ پارٹی کے سب سے سرگرم ممبر تھے مزدوروں اور محلہ والوں کی خدمت کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا تمام

مشہور ساتھیوں کے ساتھ رابطہ قائم تھا اور ماسکو کی زیارت بھی کر آئے تھے آپ کی خدمات کے پیش نظر محمد صدیق انصاری مارگ بمبئی نمبر ۱۱ آپ کے نام سے منسوب ہے یہ عجیب حقیقت ہے کہ کالا پانی میں جہاں محمد صدیق کا گھرانہ ہی نہیں کثیر تعداد اہلحدیث کی تھی وہاں عوامی ادارہ اشتراکیوں کا مرکز تھا، اور یہیں اہلحدیث کی بڑی مسجد کتاب و سنت کی تعلیم کا مرکز تھی، مومن پورہ میں یہ تضاد عام تھا یہاں دو انتہاپسند مخالف جماعتیں اہلحدیث اور کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ افراد ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے باوجود اختلاف عقائد خانگی تنازعات کا عدم وجود تھا مثال کے طور پر محلہ اور مسجد اہلحدیث کے بزرگ اور متقی ناظر — شاہ محمد ناظر کا گھرانہ اہلحدیث مسلک پر تھا جبکہ ان کے سوتیلے بیٹے محمد صدیق کٹر اشتراکی تھے۔ مومن پورہ میں پہلے ایک تالاب تھا جس کا پانی گدلا ہونے کے سبب کالا نظر آتا تھا، اشتراکیوں نے محلہ کالا پانی کو سرخ بنا دیا اور اہلحدیث نے مصفا کر دیا۔

اشتراکی تحریک سے کامریڈ ابوبکر بخشی، کامریڈ محمد صدیق بخشی، کامریڈ مقصود انصاری، کامریڈ شاہد، کامریڈ عبدالجبار اور کامریڈ عبدالجلیل انصاری وابستہ تھے اور بڑے مشہور رہنماؤں میں ان سبھوں کا شمار ہوتا تھا۔ نورالدین انصاری خاص سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے تھے کامریڈ منشی محی الدین کاؤنسلر تھے، مسجد جمیل کے ٹرسٹی اور صدر تھے۔

مسلم لیگ کا زور مدنپورہ میں تھا جہاں اس سے وابستہ عمر رجب مشہور کارپوریٹر اور مومن کانفرنس کے ہمدرد رہنما بڑے نمایاں تھے اب ان کے صاحبزادے اسی پارٹی کے سربراہ ہیں، یسین انصاری (جونی مسجد) بڑے سرگرم لیگی تھے۔

ڈاکٹر شیخ محمد حاجی محمد رمضان اے وارڈ مسلم لیگ کے صدر تھے اور کاؤنسلر تھے، کئی اداروں سے وابستہ تھے، تیلی محلہ کی مسجد کے ٹرسٹی تھے آپ نے ایک خیراتی ادارہ 'بھائی اللہ بندی' کے نام سے قائم کیا تھا اس ادارے کے زیر اہتمام یتیم سنی لڑکیوں کی مالی مدد کی جاتی تھی اور رہائش کی جاتی تھی۔

مسلم کانفرنس سے ہمدردی رکھنے والے سیاسی حضرات عموماً کانگریسی یا لیگی بھی ہوتے تھے۔ مشتاق شیخ سعید انجینیر برادری کے قائد اور جمعیۃ المومنین کے روح رواں تھے۔ آل انڈیا مومن کانفرنس کے سیکریٹری تھے، کئی تعلیمی اداروں سے وابستہ رہ کر خدمات انجام دیتے تھے، برادری کے پہلے مشہور انجینیر تھے، آپ کی رشتہ داری کا تانا بانا مشہور لیڈر

اور سابق وزیر عبدالقیوم انصاری سے لے کر پٹنہ میں عبدالرحیم مشہور طوطا والے حکیم تک پہنچتا ہے۔ الفت ناگکن جو خلافتی تحریک میں والدۂ علی برادران کے ساتھ سرگرم رہتی تھیں وہ بھی آپ کی رشتہ دار تھیں۔ منشی عبدالباقی منروا مووی ٹون کے کہانی نویس آپ کے رشتہ کے بھائی تھے۔ آپ کے صاحبزادے مبین نار کالج میں لیکچرر ہیں اور صاحبزادی شاکرہ بھی نرسنگ کے شعبہ سے متعلق ہیں۔

محمد احمد سیٹھ سائیکل والے جو احمد سیٹھ خلافتی کے نام سے مشہور تھے الفت ناگکن کے بڑے بیٹے تھے۔ یہ سارا گھرانہ "خلافتی" تھا۔ اسی خاندان سے تعلق رکھنے والوں میں عبدالستار (فینسی ڈیزائنز) عبدالعزیز باوا (فاکلینڈ روڈ)، لنگڑا باقر اور ملبوس حسن وادا کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں یہ سارے سیاسی مبصر جینئس تھے۔

انصاری شعراء کی ایک بڑی جماعت کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھی، محمد عمر فاروق مالیگانوی مجاہد آزادی تھے، محمد مصطفیٰ شاد، اصغر مرزاپوری، محی الدین سرشار، عبدالرحمٰن کامل وغیرہ سیاسی نظمیں کہہ کر قلم سے لڑتے تھے۔

متوسط طبقہ کے افراد اور محنت کش عوام تحریک آزادی میں پیش پیش تھے، حسینی باغ (مدنپورہ) کے کیپٹن لطیف سیاسی میدان کے کھلاڑی تھے۔ مدنپورہ کے ابراہیم گولا مجاہد آزادی تھے۔ حسینی باغ ہی کے صدیق سردار جو اسی جماعت کے بھی سردار تھے محب وطن تھے، انجمن خیرالاسلام کی بلڈنگ کے ممبر تھے مزدور طبقہ سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی کی فہرست بڑی طویل ہے۔ محمد یعقوب انصاری، محمود انصاری، عبدالمجید انصاری خنجر، سعید احمد انصاری عبداللہ انصاری، محمد حنیف جناب علی آبادی۔ اسماعیل حسنو (مقادم)، سعید احمد جلی ایوبی (تم بھیمڑی)، حفیظ اللہ (مدنپورہ)، سعداللہ مقادم، محمد حسین الیکٹرک والے، غلام حسین انصاری مقادم، محمد بشیر انصاری، ولی شمس الدین بنارسی، بشیر پینٹر، محمد یونس منیم عبدالمجید لیڈر ناگپوری، ولی محمد گاجر وغیرہ۔

منظور الحق اعظمی (ولادت مارچ ١٩١٦) نہ صرف مجاہد آزادی ہیں بلکہ ان کو مطالعۂ کتب بینی اور کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے، بڑی گہری سیاسی بصیرت رکھتے ہیں حاجی الیاس ماسٹر (ململ ملز) میں ہیڈ جابر تھے، پراویڈنٹ فنڈ کٹوانے اور لینے کے سخت مخالف تھے اس نے کہ جمع شدہ رقم پر جو سود چڑھتا رہتا ہے وہی رقم آدھی ہو کر پنشن کی ماہانہ قسط بن جاتی ہے۔ یہ

آدابِ خود آگاہی ہر کوئی نہیں جانتا ہے

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی (اقبالؔ)

کھنڈے کی باڑی میں برادری کی بڑی آبادی تھی، یہاں منشی غلام رسول (بی۔ اے) جو برادری کے پہلے گریجویٹ تھے ایک باشعور سیاسی ممبر تھے ان کے صاحبزادے ڈاکٹر محمد بشیر (ایم بی بی ایس) اور دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر صلاح الدین برادری کے اولین ڈاکٹروں میں سے ہیں' ان میں سے مؤخرالذکر بغرضِ تعلیم گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اسی علاقے کے وارث علی مقادم، منشی محمد حنیف، سعید انصاری، محمد یعقوب زردوز اور محمد ابراہیم بابا قابلِ ذکر ہستیاں ہیں۔ عبدالرحیم انصاری سرگرم مجاہدِ آزادی تھے۔

مرب گلی میں طاہر انصاری اور ان کے صاحبزادے طیب انصاری کانگریسی لیڈر اور جمعیۃ العلماء کے ممبر تھے۔

محمد امین محمد ادریس (جے پی) کئی اداروں سے وابستہ تھے' انجمن خیر الاسلام بلڈنگ فنڈ کے ممبر تھے' امین، ماہی، رنیورہ کے کارپوریٹر تھے۔

ہارون خوشتر ناسک کی مومن برادری کے فرد تھے، صحافتی ادب سے لگاؤ رکھتے تھے انقلاب کے ہفت سالوں تک رپورٹر رہے آپ کی بیوہ عابدہ خوشتر ہیں۔ ہارون خوشتر کا نام مجاہدینِ آزادی میں سرِفہرست ہے۔

فٹ بال کے کوچ اور کھلاڑی محمد ابراہیم شاہ محمد اور غلام رسول، بلال انصاری، چودھری غلام رسول مقدم مجاہدینِ آزادی کی صفوں میں تھے۔

بیرونِ بمبئی کے سیاسی اکابر خلافت تحریک کے زمانہ میں بمبئی آکر بس گئے تھے ان میں دھولیہ سے اثر بندلی انصاری، لیگاؤں کے مولانا محمد یحییٰ زبیر، مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا محمد یوسف انصاری، مبارک پوری، وغیرہ تھے۔ مولانا محمد یحییٰ زبیر نے ۱۹۵۲ء میں راقم کے لئے بمبئی یونیورسٹی کی سرکریم بھائی ابراہیم فیلوشپ اعلیٰ تعلیم برائے لندن کی منظوری کیلئے بڑی دوڑ دھوپ کی تھی۔ مولانا جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے بیحد فعال اور مخلص خادم تھے۔ آپ کے صاحبزادے عبد الجبار مالیگاؤں کی جماعت اسلامی کے فعال رکن تھے۔

۱۹۴۶ء میں جنگی جہازوں کے بیڑے جب ہڑتال کی اور بغاوت ہوئی تو انگریزی سرکار

کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی اور انہیں اپنا سفینہ تسلط بھنور میں پھنستا نظر آنے لگا،
بمبئی میں ایک ہنگامہ رستاخیز پیدا ہو گیا، پولس بے گناہوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے لگی۔
برادری کے کئی معصوم افراد بھی قربانگاہ پر چڑھا دیئے گئے، ان کی بستیوں میں جو لوگ
تاریک راہوں میں مارے گئے ان کے نام یہ ہیں۔ صدیق محمد (کماٹی پورہ) عبداسلی ولد
دین محمد (ناگپاڑہ) مولابخش ولد عبدالعزیز (کماٹی پورہ)۔

بمبئی کی برادری کی تعلیمی خدمات

غدر کے ہنگاموں کے بعد اور پھر وقفہ وقفہ سے مہاجرین انصار کے قبیلے بمبئی میں آباد ہوتے
گئے تو سب سے پہلے انہیں اپنی دینی ضروریات کے لئے عبادت گاہ اور درسگاہ قائم کرنے کا
خیال تڑپانے لگا، دستور اور رواج کے مطابق گھروں میں بچوں اور بچیوں کو تجوید و ناظرہ کی
تعلیم دی جاتی رہی، مہاجرین میں حفاظ کرام کی نہ تو کمی تھی اور میاں جی تو گھر کا ہر بزرگ ہوتا ہی تھا
شہر میں مقامی مسلمانوں نے جو مدرسے قائم کر رکھے تھے وہ برادری کی بستیوں سے دور تھے۔ نواب
مسجد اسٹریٹ (محمد علی روڈ) پر مدرسہ محمدیہ جاری تھا جو جامع مسجد ٹرسٹ کے زیر اہتمام تھا،
مدرسہ ہاشمیہ زکریا مسجد اسٹریٹ پر قائم تھا اور دادامقبہ کا مدرسہ ۱۹۳۴ء سے نل بازار میں
سرچشمہ فیضان بنا ہوا تھا، اس مدرسہ میں کوکنی، دکھنی طلبہ کے علاوہ سلیمانی بوہرہ طالبانِ علم
بھی قرآن کی تعلیم کے لئے جاتے تھے مشہور سلیمانی بیرسٹر بدرالدین طیب جی اور ان کے بھائی
قمرالدین طیب جی اسی مدرسے کے طالبعلم رہ چکے تھے۔ مدرسہ غوث العلوم کماٹی پورہ میں قائم
تھا۔ مولوی دین محمد اسکے بانیوں میں سے تھے ان کے دو رٹک تھے عبداللہ اور مولوی عبدالرحمن
برادری کا پہلا مدرسہ بابو حکیم اور محمد ادریس محلے دار نے قائم کیا جس میں ایک مہاجر مومن نے
درس دینا شروع کیا تھا، یہ مدرسہ بابو حکیم کے مطب کے برابر تھا۔ محمد ادریس محلے دار اور حکیم
جی کے جذبۂ دینی سے علم قرآن کا پہلا دروازہ اس بستی میں کھلا۔ گھیلا بائی اسٹریٹ کا مدرسہ
دراصل اسی ابتدائی بنیاد پر کھڑا کیا گیا پہلا مدرسہ تھا یہی مدرسہ انجمن خیر الاسلام کا مستقبل
بنا۔ یہ مدرسہ جو رحیم سیٹھ کی چال دوسری گھیلا بائی اسٹریٹ میں شروع ہوا ترقی کر کے بعد
ایک منظم ادارہ بن گیا، اس کے مہتمم برادری کے پیر محمد آرزو اور مولوی محمد امین تھے۔ ابتدائی
مدرسین یہ تھے۔ قاری محمد حسین، شاہ سراج الدین قاری، منشی عبدالصمد، حافظ عبدالحلیم،

منشی محمد معروف اور پیر محمد آرزو الہ آبادی ۔ مدرسہ کی مجلس انتظامیہ کے اراکین اور عہدہ داران یہ حضرات تھے۔

منشی محمد مقبول حسین، حکیم محمد محمود عالم سہسرامی، منشی عبدالرشید، منشی پیر محمد آرزو الہ آبادی عبدالغفار رساڑی پریسیڈنٹ صدر مقرر ہوئے۔ مجلس کے دیگر اراکین کے نام یہ ہیں، عثمان غنی قاری محمد حسین، منشی عبدالصمد، منشی عبدالشکور، حاجی پیر محمد مقادم، غلام رسول عرف چھیدا، محمد یسٰین ماما، محمد حسین ڈرائیور، عبدالغفور، عبدالخالق اور محمد یوسف۔

ابتدا میں قاعدہ بغدادی اور پھر ناظرہ اور حفظ تک تعلیم دی جاتی تھی ان کے علاوہ دینیات یا تعلیم الاسلام کا درس دیا جاتا تھا محمد عمر محمود جو میونسپل اردو پرائمری اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور مدنپورہ کے ممتاز سماجی اور سیاسی تھے محمد عمر رجب مدرسے میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ جب جگہ کی تنگی ہوئی تو نئی عمارت کی تعمیر کے لئے کوششیں کی جانے لگیں، منشی اسرار الحق انصاری منشی محمد اسحٰق وغیرہ پیش پیش رہے چندہ کمیٹی کے خازن الحاج منشی محمد یحییٰ اسحاق مقرر ہوئے۔ اولین ٹرسٹیوں میں علاقہ کی متمول اور مخیر بزرگ عبدالرحمٰن اطلس والا بھی شامل تھے۔

سنہ ۱۹۲۷ء میں انجمن خیرالاسلام کا عظیم تعلیمی ادارہ وجود میں آیا جس کے اولین معماران برادری کے اکابر تھے پھر برادری کے علاوہ دوسری جماعتوں کے ممتاز افراد کے تعاون کے طلبگار بن گئے جس کا اثر آہستہ آہستہ غالب ہونے لگا، انجمن خیرالاسلام کے زیر اہتمام مختلف اسکول، ہائی اسکول، ہوسٹل، کالج، یتیم خانے، ہسپتال، طبی مراکز غرضکہ ایک طویل سلسلہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے چل نکلا۔ چندہ جمع کرنے میں برادری کے لوگ ہی سب سے زیادہ گرمجوشی دکھاتے تھے۔

مومن پورہ میں دینیات کے کئی مدرسے تھے۔ ان میں احسن المدارس اور ضیاء العلوم کے نام روشن ہیں۔ مدنپورہ اور مومن پورہ کے سرگرم اراکین مختلف اداروں سے وابستہ رہ کر دینی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر محمد عمر مومن (بابو حکیم)، بشیر انصاری، عبداللطیف سائیکل والے، عبدالعزیز ماسٹر، ظہیر انصاری (پونہ کالج کمیٹی کے ممبر) محمد یوسف منشی، رمضان علی برق حاجی پیر محمد منشی محمد مقبول حسین، حاجی سخاوت علی، منشی اختر حسین (ابو بھائی)، منشی انوار الٰہی، عبداللہ انصاری، حاجی محمد شفیع، یوسف تاباں، ہارون خورشید، عبدالعزیز ماسٹر، عبدالستار شفیع، عبدالحق انصاری (ایم۔ اے) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

آج ہزاروں افراد بلا استثنار قوم اور برادری انجمن خیر الاسلام اور انجمن مفید الیتامٰی جیسے فلاحی اداروں سے فیضیاب ہو چکے ہیں۔ ان میں محمد شفیع انصاری (بی۔ ایس۔ سی)، محمد نذیر انصاری (ایم۔ ایس۔ سی علیگ)، غلام رسول انصاری (سول انجینیر) صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، تاج محمد عبد الغنی وغیرہ جو یتیم خانے کے پروردہ ہیں بحمد للہ آج اس قابل بن گئے ہیں کہ دوسرے یتیموں کی حاجت روائی کر رہے ہیں۔

جمعیۃ اہلحدیث کی تعلیمی و دینی سرگرمیاں

مومن پورہ کے علاقے میں پہلا اردو ذریعۂ تعلیم اسکول جمعیۃ اہلحدیث ایجوکیشنل سوسائٹی نے قائم کیا جس کی بنیاد سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈالی گئی اس کے چیرمین مشہور عربی تاجر محمد علی بجاش تھے صدر مولانا مختار احمد ندوی۔ سیکریٹری شرف الدین حکیم۔ نائب سکریٹری عبد العزیز انصاری، خازن بچو بھائی بچو علی اور دوسرے ٹرسٹیان عبد الحق کوڑا اور حاجی محمد اسحق سیٹھ تھے۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام سنہ ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا سنہ ۱۹۷۶ء میں اہلحدیث منزل تعمیر ہونے کے بعد اسکول کو اس چھ منزلہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا، برادری کے ایک قابل اور تجربہ کار فرد عبد المنان اعظمی اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ عبد المنان اعظمی نے بعد میں مستعفی ہو کر مضافاتی بستی گوونڈی میں ریاض الاسلام کے نام سے اپنا ایک الگ اسکول قائم کر لیا۔

مومن پورہ میں اہلحدیث بڑے فعال تھے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں جب مولانا مختار احمد ندوی نقلِ مکانی کر کے یہاں آباد ہو گئے تو جمعیۃ اہلحدیث کی سرگرمیوں میں جان پڑ گئی، ان کے ہمراہ اور تعاون کرنے والوں میں عبد العزیز، محمد ابراہیم انصاری، عبد الحمید ہاجی، حبیب اللہ غازی، رشید ناصر، سعید ناصر، عبد الاحد، مولانا عبد الحیٔ انصاری اور بزرگوں میں شاہ محمد ناظر، مولانا عبد الحیٔ وغیرہ کے اسمارِ گرامی قابلِ ذکر ہیں اور انہیں حضرات کی مشترکہ مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ کئی دینی تعلیمی اور فلاحی ادارے قائم ہوئے۔ ان میں جامعۂ منصورہ مالیگاؤں، مدرسہ ضیاء العلوم، جامعۂ رحمانیہ کاندیولی، بیت المال وغیرہ شامل ہیں۔

برادری کی تعلیمی، سماجی اور ادبی شخصیتیں

عبدالرحمٰن کامل (ایم۔اے۔قابل ہندی)

اگست ۱۹۱۷ء میں بمبئی میں ایک انصاری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انجمن اسلام بوری بندر سے میٹرک کرنے کے بعد اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری سے ۱۹۴۲ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ ان کی ذہنی و فکری صلاحیتوں کی نشوونما ایک صحت مند ماحول میں ہوئی گو ان کو ان کی علمی استعداد اور ذہنی رجحان کے مطابق ملازمت نہیں ملی پھر بھی انہوں نے بائکن انسٹی ٹیوٹ میں ملازم رہتے ہوئے بھی ۱۹۴۵ء میں ایم۔اے کر لیا۔

اس زمانے میں مذہبی تعلیم کے لئے محلے کے سربرآوردہ لوگ کسی انجمن یا محفل کی بنیاد ڈالتے تھے جس میں بچوں اور بچیوں کو قرآن کے ناظرہ اور تجوید کی تعلیم دی جاتی تھی، یہی محفل رات میں ارباب ذوق کی بزم بن جاتی تھی آپ نے مدنپورہ میں ۱۹۳۲ء میں محفل شوکت قائم کی اور ایک لائبریری بنادی اور انگریزی سکھانے کا انتظام کر دیا۔ ۱۹۳۶ء میں آپ اس کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ عبدالرحمٰن کامل آل انڈیا مومن کانفرنس کے فعال رکن تھے۔

۱۹۵۵ء میں آپ نے انجمن خیر الاسلام کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ انجمن کی حالت اس وقت ناگفتہ بہ تھی۔ آپ کی سعی رائیگاں نہیں گئی بلکہ سعی مشکور ثابت ہوئی، سماجی بہبود بچوں کی تربیت اور تعلیم کے لئے ٹھوس اور تعمیری اقدام کرتے رہے ان خدمات کے سلسلے میں آپ کو ۱۹۵۶ء میں انجمن خیر الاسلام کا جنرل سیکریٹری مقرر کیا گیا ایک سال بعد اس کے نائب صدر و ٹرسٹی بن گئے اور لڑکے اور لڑکیوں کے لئے دو ہائی اسکولوں کا قیام عمل میں آیا تو اسکول کمیٹی کے ۱۹۵۷ء میں پہلے چیرمین منتخب ہوئے۔ مومن۔ انصاری برادری کی فلاح کے لئے ان کے دل میں بڑے مخلص جذبات تھے انصار ایجوکیشن سوسائٹی مدنپورہ کے بنیادی رکن بنے اور ۱۹۶۶ء میں جنرل سیکریٹری کے عہدے پر آپ کا انتخاب ہوا۔ ہندوستانی پرچار سبھا میں ہندی کے ٹیچر تھے اور آل انڈیا پاورلوم اونرس فیڈریشن بمبئی کے صدر ہونے کا شرف حاصل تھا۔

آپ نے مہاراشٹر پاورلوم ویورس ایسوسی ایشن (مورلینڈ روڈ، پٹنی چال) قائم کی غرض کہ ہر میدان میں کامل صاحب آگے آگے رہے "تاریخ مومن۔ انصار میں ایک منشی محمد کامل کا ذکر ملتا ہے۔ (سنہ ۱۹۱۳ء)

الحاج منشی محمد یحییٰ اسحاق (۱۸۹۹ء-۱۹۶۷ء)

منشی جی کو رزاق کریم نے دین و دنیا۔ دونوں کی نعمتوں سے نوازا تھا ناز و نعم میں پلے لیکن اپنی پسماندہ برادری کی حالتِ زار پر ہمیشہ متفکر رہتے۔ اٹھائیس سال کے ہوئے تو حوصلوں نے مہمیز لگائی اور سماجی میدان کے شہسوار بن گئے، بڑے دیندار تھے اور دین کے محافظ۔ بھیونڈی جماعت (اعظم گڈھ) کے ممتاز معمارانِ قوم محمد حسن سرزار، منشی ...، محمد اور ... فرد جماعت کے تعاون سے اسٹیشن بائی کلہ کے سامنے ڈیزل روڈ پر جو ... سنہ ۱۳۲۲ھ تعمیر ہوئی اس کے آپ ... مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۶۶ء تک اس کے بنیادی رکن کی حیثیت سے برادری کی بہبود و فلاح اور ہاتھ ماگھ کی صنعت کو فروغ دینے کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔

پارچہ بافی کی صنعت آبائی پیشہ تھا۔ انجمن ہائی اسکول (بوری بندر) میں تعلیم ادھوری چھوڑ کر آپ نے سلک ہینڈ لوم کارخانہ سنبھال لیا۔ آپ کے صنعتی اور ... تجربات سے بمبئی ہینڈلوم ویورس ایسوسی ایشن کو کافی فائدہ پہنچا آپ اس کے صدر رہے۔ تجرباتی ... نے ایک عملی قدم اٹھایا اور آپ نے مومن پورہ کو آپریٹیو جنرل اسٹورس لمیٹڈ بمبئی نمبر ۱۱ کی بنیاد ڈالی جو امداد باہمی کی تاریخ میں ایک نیا باب تھا سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء تک اس کے بنیادی رکن رہے اور سنہ ۱۹۶۵-۶۷ء تک صدر کے عہدہ پر سرفراز رہے۔

برادری نے اپنے علاقہ میں دو اہم انجمنوں کی بنیاد ڈالی تھی، انجمن ... اور ... اوّل الذکر ادارہ کے آپ سنہ ۱۹۳۹ء تا سنہ ۱۹۵۴ء خازن رہے ... عاملہ کے اہم رکن تھے اور آخر عمر تک اس سے وابستہ رہے۔

الحاج عبد الغنی اطلس والا

مبارک پور (اعظم گڈھ) سے یہ نامور خاندان ترک وطن کر کے آیا، عبد الرحمن اطلس والا نے آبائی پیشہ اختیار کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے محنت میں برکت عطا فرمائی، صنعت میں ترقی کی

تمول کے ساتھ خیر و خیرات کی روایات قائم ہوئیں، انجمن خیر الاسلام کی خدمت کی اور معہد الیتمیٰ کے فعال رکن کی حیثیت سے یتیموں کی پرورش میں حصہ لیا، عبدالرحمٰن اطلس والا کئی کمیٹیوں کے رکن رہے۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے الحاج عبدالغنی اطلس والا نے آبائی کارناموں اور روایات میں چار چاند لگا دیئے، انجمن خیر الاسلام اور معہد الیتمیٰ سے منسلک رہ کر تعلیمی دینی اور سماجی خدمات انجام دیتے رہے، آپ اسم بامسمیٰ ہیں۔

صنعت و تجارت میں آپ کو نہ صرف تمول میں بلکہ اس کے فروغ و توسیع سے متعلق مختلف اداروں کے انتظامیہ اور مجلس مشاورت میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ وشوا بھارتی اسپننگ اینڈ ویونگ کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹیڈ کے ڈائرکٹر ہیں، بیت المال کوآپریٹیو کریڈٹ سوسائٹی کے چیرمین، ٹیپولیس سروسیز فورم، انجمن فلاح الاسلام اور تنظیم فروغ تعلیم کے صدر ہیں، آل انڈیا کونسل آف اکونک اپ لفٹ منٹ (کل ہند مجلس اقتصادیات برائے ترقی مسلمانان) کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

الحاج عبدالغنی اطلس والا ایجوکیشن اینڈ ویلفیر ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری ہیں، آئیڈیل اکاڈمی ٹرسٹ کے رکن ہیں، ادارہ دعوت القرآن کی مجلس عاملہ کے معزز رکن ہیں، کھیل سے دلچسپی کے سبب نوجوانوں نے بمبئی مسلم اسپورٹس کلب کی صدارت کا اعزاز آپ کو دیا ہے، برادری میں آپ کا وجود ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

بمبئی کے تعلیمی، سماجی، دینی اور سیاسی ادارے جن سے برادری کا تعلق تھا

آزاد پارٹی۔ تیسری گھیلا بائی اسٹریٹ، اخوان الصفا۔ مستری چال، مدنپورہ، انصار تعلیمی کمیٹی۔ مدنپورہ، اصلاح کمیٹی۔ عرب گلی، ڈنی روڈ، چکل پاڑہ، فارس روڈ، انجمن تنظیم المسلمین۔ بلو رنگاری چال، ساتھی اسٹریٹ بمبئی ۸، انجمن پیغام حق۔ ورلی بمبئی، انجمن افضال بمبیری، حسینی باغ، مدنپورہ، انجمن خدام حق۔ ناگری پاڑہ، بمبئی ۱۱، حلقہ احباب۔ عرب مسجد بمبئی ۸، دھورے چال کمیٹی۔ جیراج بھائی اسٹریٹ بمبئی ۸، نوجوان پارٹی۔ تیسری گھیلا بائی اسٹریٹ، ویلفیر سینٹر۔ مدنپورہ، انصاری ویلفیر سوسائٹی۔ مدنپورہ، آئیڈیل اکاڈمی ٹرسٹ، انجمن فلاح المسلمین، بزم احباب۔ مدنپورہ، تنظیم فروغ تعلیم، ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن۔ ناگری پاڑہ بمبئی ۱۱

پینتیسواں باب

بمبئی کی انصاری برادری کی تعلیمی، علمی، سماجی، ورزشی اور ادبی روایات

انجمن خیر الاسلام اور مفید الیتامیٰ جیسے عظیم تعلیمی ادارے برادری کے تعلیمی شعور اور علمی جدوجہد کی مرہون منت ہیں، اول الذکر انجمن کی ساخت، شناخت اور مزاج تک بدل گیا ہے اور اب اس پر ایک نئی چھاپ ہے شاید برادری کی غفلت یا پھر دست قبضی کا نتیجہ جس نے یہ کہہ کر دلجوئی کر دی ع ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے؟

غریب، نادار اور بے بضاعت بچوں کی مدد کے لئے برادری نے ہر علاقہ میں انجمن، سوسائٹی یا تنظیم قائم کر لی تھی۔

مستری چال مدنپورہ میں اخوان الصفا کا قیام عمل اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔ عبد المجید انصاری نے علاقے کے سربرآوردہ افراد کے اشتراک تعاون سے اخوان الصفا کے ذریعے تعلیمی خدمات انجام دیں۔ نوجوان پارٹی (تیسری گھیلابائی اسٹریٹ مدنپورہ) کے سیکریٹری تھے۔

انصار ایجوکیشن سوسائٹی اور انصار تعلیمی کمیٹی اسی نہج پر چلتی رہیں، اول الذکر سے حبیب اللہ بخش انصاری اور عبد الرحمٰن کامل (ایم۔ اے قبل، ہندی) وابستہ تھے۔ مؤخر الذکر اس کے بنیاد گذاروں میں سے تھے۔ محفل شوکت مدنپورہ قائم کر کے کامل صاحب نے ۱۹۳۲ء میں انگریزی کلاس کا اجرا کیا اور ایک لائبریری قائم کی۔ ۱۹۳۶ء میں اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔

انجمنوں کی بہتات تھی کچھ دینی اور کچھ قومی مسائل کے فوری حل کے لئے؛ ضرورتوں کے سبب عمل میں آتی تھیں، انجمن تنظیم المسلمین (بدلو رنگاری چال ... اسٹریٹ بمبئی ۹) انجمن پیغام حق (ورلی بمبئی)، انجمن انفعال پھیری (حسینی ... مدنپورہ)، انجمن خدام خلق (ڈاگری پاڑہ، بمبئی ۱۱) اور انجمن فلاح المسلمین کے ناموں سے ان کے اغراض و مقاصد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ بہر صورت ہر انجمن ایک فلاحی ادارہ تھا بعض تنظیموں کی وجہ تسمیہ بڑی واضح تھی۔ ویلفیر سینٹر (مدنپورہ)، اصلاح کمیٹی (عرب گلی پاپٹی روڈ، چکلہ پاڑہ، فارس روڈ) اور تنظیم فروغ تعلیم۔ کھیل کود اور ڈنڈ خانہ، کھیلوں کے لئے بھی محفلیں قائم

تھیں اور کچھ نوجوانوں کی وقت گذاری اور مشاغل کے لئے وقف تھیں مگر مقصد بہر حال صحت مندانہ اور تعمیری تھا، نوجوان پارٹی (تیسری گھیلا بائی اسٹریٹ)، انصاری ویلفیئر سوسائٹی (مدنپورہ) اور حلقۂ احباب کے بنیادی مقاصد متنوع ہوتے ہوئے بھی ان میں یکسانیت کی حد تک فلاح و بہبود کا عنصر غالب رہا، آئیڈیل اکاڈیمی ٹرسٹ تعلیم و ادب کے تحفظ و اشاعت کا دعویدار ہے ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن (آگری پاڑہ) میں برادری کے ممبر بھی شامل تھے۔ آزاد پارٹی مدنپورہ کے سیکریٹری عبدالرحمٰن حسن انصاری (چکی والے) نے اس تنظیم کو جو سیاسی نوعیت کی حامل تھی بہت مقبول بنایا، آپ ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن کے ممبر اور یونٹی پریزن آگری پاڑہ کے مؤسسین میں سے تھے۔ تنظیم فروغ تعلیم کے صدر الحاج غنی اطلس دالابیں، انجمن فلاح الاسلام کی صدارت کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہے۔ اور آئیڈیل اکاڈیمی ٹرسٹ کے رکن ہیں، نور محمد مومن آزاد پارٹی ویلفیئر سینٹر کے نائب صدر تھے۔

انصاری ویلفیئر سوسائٹی ۱۹۵۰ء میں قائم ہوئی تھی، اس کا مقصد برادری کے طلبہ و طالبات کا ایس۔ بی۔ سی سرٹیفکٹ حاصل کرنے میں حتی المقدور مدد کرنا ہے، اس کے فعال اراکین اور وہ افراد جو اس سوسائٹی سے دلچسپی لیتے ہیں ان کے نام اس طرح ہیں: انصاری محمد یوسف ثانی (صدر) پروفیسر جمیل کامل (نائب صدر) انصاری محمد پرویز (نائب سیکریٹری)، نایاب انصاری (نائب سیکریٹری)، انصاری محمد حسن منشی (خازن)، منیر احمد انصاری، فتح محمد انصاری، محمد ہارون انصاری، انصاری محمد رئیس، عبدالعزیز انصاری، شمیم انصاری محمد یونس عامر انصاری، مخدوم حسن انصاری اور محمد امین انصاری میونسپل کاؤنسلر بھی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔

مومن پورہ تعلیمی کمیٹی

نادار و غریب طلبہ دعا بات مالی وسائل کے فقدان کے سبب تعلیم کی برکتوں سے محروم رہ جاتے تھے، ہر خطے کا یہی عالم تھا، مدنپورہ اور آگری پاڑہ کے علاقوں میں لمبی لمبی چالیں بذات خود اور بستیوں کی مثال تھیں، کس کی حاجت روا کرے کوئی کا عالم تھا، ۱۹۴۳ء میں مولانا مہدی اور محمد اسمعیل انصاری کی کوششوں سے مومن پورہ تعلیمی کمیٹی کی بنیاد پڑی، محمد نفیس انصاری مومن پورہ کے بڑے فعال، ہوشمند اور حوصلہ مند شخص تھے تعلیم

سے رغبت بھی خود بھی بہرہ ور تھے اور تمنا تھی کہ برادری کا ہر فرد تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو جائے، اس کمیٹی کے بنیادی اراکین یہ تھے: مولانا عبدالحق، محمد حنیف خمار، عبدالرحیم شیخ عبداللہ ناصر اور شاہ محمد ناظر۔

اس کمیٹی کی آمدنی کا ذریعہ بہت محدود تھا صرف چرم قربانی سے اتنا فنڈ جمع کر لیتے کہ درسی کتابیں اور بیاضیں خرید کر مستحق طالبان علم میں تقسیم کر دیتے، فیس بھی ادا کر دی جاتی، ایک لائبریری بھی اسی کے زیر اہتمام قائم کی گئی جو ہر سال ایک تقریری اور تحریری مقابلہ کا انعقاد کرتی ہے امتیازی طور پر کامیاب طلبہ وطالبات کو نقد انعام سے نوازا جاتا ہے۔ کمیٹی کے فعال اراکین میں محمود چائے والا (صدر) عبدالاحد عبدالحیؔ (سیکریٹری) محمد طارق، شبیر احمد، ریاض احمد اور عبدالرحمٰن کے اسمار گرامی قابل ذکر ہیں۔

عوامی ادارہ (مومن پورہ، محمد صدیق انصاری مارگ بمبئی ۱۱)

اشتراکیت کا مرکز، ادب کا مرجع اور تعلیمی ودرسی سرگرمیوں کا منبع تھا، اس ادارے کی بنیاد میں کمیونسٹ پارٹی کا سب سے بڑا حصہ تھا ۱۹۵۲ء میں مومن پورہ کے مزدور علاقے میں مومن افراد نے اس عظیم ادارے کو قائم کیا بنیاں گذاروں کی بڑی تعداد اب اس دنیا میں نہیں رہی ان کے اسمار گرامی یادوں میں تازہ ہیں۔ محمد اسحاق ملّا، محمد صدیق بیبیرؔ، محمد صدیق حبّا، محمد آمین قدرت، محمد فاروق وغیرہ، عبدالمجید پنک، عبدالمجید ماسٹر، محمد امین مکانڈہ اور دیگر شرکت ساتھیوں نے اپنے تعمیری منصوبہ کو اینٹ اور پتھر کا پیراہن پہنایا، ایک منزلہ عمارت مع یک ہال تعمیر کرا کے سرخروئی حاصل کی، ہال میں ایک لائبریری قائم کی گئی جس کے ریڈنگ روم میں ہندی، مراٹھی، انگریزی اور اردو کے مختلف روزنامے اور ہفتہ وار اخبارات آتے ہیں جن کی تعداد چار درجن کے لگ بھگ ہے، بچوں کے لیے ایک ننھا منا سا شعبۂ اطفال کھولا گیا ہے جس میں ایک ہزار کے قریب کہانیوں کی کتابیں موجود ہیں، قارئین کی تعداد سینکڑوں تک پہنچی ہے اردو کی آٹھ ہزار کتابیں جمع ہیں ان میں نادر اور نایاب کتابیں بھی ہیں اعلیٰ تعلیم کے طلبہ کے لئے درسی کتابوں کا ایک ذخیرہ موجود ہے، لائبریری کے ممبران کی تعداد تیرہ سو کے قریب ہے مختلف معیاری اور ادبی رسائل اور جرائد مستقل منگائے جاتے ہیں۔

پہلے منزلے پر خواتین کے لئے سلائی کلاس کا اجرا کیا گیا ہے۔ ٹی۔ بی کے مریضوں کی

سہولت کے لئے عوامی ادارہ کے زیر اہتمام ایک ٹی۔ بی سینٹر قائم کیا گیا ہے، نیز مستحق لوگوں میں عینک کی مفت تقسیم کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ کالج کے طلبہ کو مفت درسی کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ہال کو امتحان کی تیاری کے لئے کھول دیا جاتا ہے، سلائی کلاس میں تقریباً دو سو لڑکیوں کو سلائی اور کشیدہ کاری کے علاوہ مہندی اور فیبرک پینٹنگ، (کپڑے پر نقش نگاری) کی تربیت دی جاتی ہے۔

عوامی ادارے کا کلچرل دستہ عوامی اور انقلابی گیتوں کی دھنیں بنا کر عوامی جلسوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے، ادبی، تہذیبی اور سیاسی پروگراموں کا انعقاد کر کے ادارہ صحتمند رجحانات کو فروغ دیتا ہے۔ عوامی ادارہ ایک جمہوری ادارہ ہے اور کسی فرد کی ملکیت نہیں ہے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (اقبالؒ)

مالیگاؤں سے —
تازہ واردانِ بساطِ ہوائے گل

عروس البلاد بمبئی کا رنگ و روغن بیسویں صدی کے آغاز سے اور نکھرنے لگا، تجارت کے گیسو دراز ہوئے تو ایران اور یورپ بھی اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے، صنعت و حرفت نے مرفہ الحالی کا غازہ مَل دیا، اہلِ حرفہ، اہلِ ہنر اور تجارت پیشہ لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ علمی درسگاہوں کے دروازے کھلے تو کالجوں میں طالبانِ علم کے ٹھٹ لگ گئے ان میں، مالیگاؤں، دھولیہ، بھیونڈی، برہانپور اور دیگر علاقوں سے برادری کے نوجوان طلبہ شامل تھے جو کالج کے ہوسٹلوں میں رہتے تھے یا مدنپورہ، بائی کلہ میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ قیام کر لیتے تھے، مالیگاؤں سے برادری کے متعدد خاندان یہاں برسوں سے آباد تھے کچھ ۱۹۰۵ء کے سیلاب زدہ تھے اور کچھ دو سال بعد کے طاعون اور باڑھ کی لہروں سے بمبئی کے کنارے آلگے تھے۔ ان کی یہاں کارگاہیں تھیں اور کھولیاں، گذشتہ ۱۹۴۲ء کے زمانے سے سیاست کی لہروں، معاشی بحران کے تھپیڑوں اور تلاشِ معاش کے بھونچال نے بمبئی میں مہاجرین مالیگاؤں کی بہت بڑی بستی بسادی تھی، مگر اب تک یہ سارے بکھرے ہوئے تھے کچھ سنجیدہ اور [illegible] احباب مالیگاؤں ساکنہ بمبئی نے انہیں تسبیح کے دانوں کی

طرح پروناچاہا، سب سے پہلا قدم مالیگاؤں کے ایک فعال جوان محمد اسمٰعیل انصاری نے اٹھایا انہوں نے ۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو بمبئی میں رہنے والے مالیگاؤں کے تعلیم یافتہ حضرات کا ایک مشورتی جلسہ اپنے دولتکدے پر منعقد کیا جس میں مالیگاؤں کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک "انجمن تعلیم مسلمانان مالیگاؤں" (مالیگاؤں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی) کی بنا ڈالی گئی اس بنیادی جلسہ میں اور اس کے بعد ہونے والی ابتدائی کارروائیوں سے متعلق جلسوں میں جو افراد شریک رہے ان کے نام اس طرح ہیں:

شیخ محمد حسن بی۔ اے، ڈاکٹر شیخ محمد سلیم، محمد سلیم صدیقی، ماسٹر محمد سلیمان انصاری، شیخ محمد عثمان، چراغ احمد، محمد صدیق فارانی، محمد صادق (بابو حاجی)، حکیم محمد ایوب، محمد صدیق، عبدالرشید (رحمانی) محمد یعقوب (انصاری) محمد اسحٰق (ایل ٹی ایم) محمد یحییٰ زبیر، محمد حسن نوری، شمس الضحیٰ انصاری، محمد حنیف شورش، غلام صوفی شاہ، پیر محمد رحمانی محمد صابر مومن، عبدالعزیز عظیم الدین، محمد صابر سیٹھ، عبدالحمید انصاری، عبدالعزیز۔

انجمن تعلیم مسلمانانِ مالیگاؤں

انجمن کی میٹنگیں وقت ضرورت کبھی اسماعیل انصاری کی مسجد بلڈنگ میں، کبھی سیمنٹ کی چال ۳ پہلا منزلہ کمرہ نمبر ۔ میں اور اکثر ڈاکٹر محمد سلیم کے کمرہ واقع بھٹ باسٹل گرانٹ میڈیکل کالج میں ہوتی رہیں کچھ میٹنگیں مومن پورہ میں مدرسہ احسن المدارس میں منعقد ہوئیں۔ محمد صدیق فارانی کے کمرہ واقع ناگپاڑہ پر بھی ممبران مجلس منتظمہ ملتے رہے۔ لیگاؤں سے دعو حضرات بھی دور دراز کا سفر کرکے آتے رہے اور جلسوں میں شریک ہو کر ہر ممکن تعاون پیش کرتے رہے ان میں عبدالستار سبحانی، عبدالرحیم عشرت، شیخ شمس الضحیٰ بی۔ اے۔ (آنرز)، محمد بشیر فارانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

انجمن چند برسوں کی قلیل مدت میں مستحکم اور فعال بن گئی، مجلس منتظمہ کے اراکین اور عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آنے لگا، ہر سال جلسۂ عام منعقد کیا جانے لگا اور کالجوں اسکولوں اور مدرسوں کے حاجتمند طلبہ کو وظائف دئے جانے لگے۔ رائے دہندگان کی فہرست میں ناموں کا اضافہ ہوتا رہا اور ۱۹۲۶ء تک مجلس منتظمہ میں کچھ نئے لوگ بھی شامل کر لئے گئے: محمد عظیم اللہ انصاری، بیگم محمد یحییٰ زبیر، بیگم خیر النساء فارانی، عبدالمجید سالک

دبیرسٹر، محمد اسحاق ایلی ایم۔ اے، عبدالجلیل محمد یوسف، محمد حنیف انصاری، محمد یونس
نحوی، محمد حسن شیخ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی، محمد یوسف پہلوان، نظر بابا مالیگانوی، نذیر
احمد خان صاحب اے۔ بی حکیم، محمد اسحاق انصاری (ڈی ٹی سی)، محمد یونس بشارتی، سراج
احمد، سلیم احمد۔

مالیگاؤں میں بھی انجمن تعلیم مسلمانان جلسے کرتی تھی، ایک جلسہ منعقدہ ۹ مئی سنہ ۱۹۴۴ء
کو جو میونسپل کمپاؤنڈ میں ہوا اس میں مولانا جمال الدین، سید ظفر عابد، مولانا محمد عثمان،
محمد حسین شیخ سب جج، عبدالرزاق اور خانصاحب عبدالرحیم ایم۔ این۔ اے نے بھی شرکت
کی تھی۔ انجمن کے دائمی اراکین میں حاجی عثمان غنی رحیم اللہ رئیس بھیمڑی قابلِ ذکر
ہیں۔ (سنہ ۱۹۵۷ء)

مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن بمبئی

سنہ ۱۹۴۴ء میں مالیگاؤں کے جن دوراندیش اور علم دوست، جمیع احباب مالیگاؤں، مسکنہ
بمبئی، نے تعلیمی انجمن کی داغ بیل بمبئی میں ڈالی تھی اور جسے سنہ ۱۹۵۴ء میں "دی مالیگاؤں
سوسائٹی آف ایجوکیشن بمبئی" کا نام دیا گیا وہ آج بھی زندہ اور فعال ہے۔ وہ نیک، مخیر،
دوراندیش اور قابلِ تعریف افراد جو اس تعلیمی ادارہ کی تاسیس کے بنیادی ستون تھے
مندرجہ ذیل ہیں۔

محمد عثمان شیخ، شیخ محمد حسن، محمد اسماعیل انصاری اور محمد یحییٰ زبیر

سنہ ۱۹۴۴ء میں جب سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی تو مالیگاؤں میں ایک علمی سناٹا چھایا ہوا
تھا، شہر صنعتی بحران سے گذر رہا تھا، معاشی حالت دگرگوں تھی اور تعلیمی میدان —
خالی پڑا تھا۔ شہر میں صرف ہائی سکول تک تعلیم کا انتظام تھا اس لئے اعلیٰ تعلیم حاصل
کرنے کے لئے طلبہ بمبئی، پونہ اور جونا گڑھ جاتے تھے وہ طلبہ جو بمبئی آتے تھے ان کو مالی
مشکلات اور رہائشی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان مشکلات و مصائب کے پیش نظر
سوسائٹی کی بنیاد جن اغراض و مقاصد کی بنا پر رکھی گئی، غریب ذہین طلبہ کو
اسکالرشپ دی جاتی تھی بڑی مشکل اور جدوجہد سے چندہ مالیگاؤں بھیمڑی اور بمبئی سے
اکٹھا کیا جاتا تھا، مستقل [illegible] آمدنی کا ذریعہ پیدا کرنے کے لئے اور طلبہ کی رہائش کا

مسئلہ حل کرنے کے لیے سوسائٹی نے 'مارواڑی چال' نامی بلڈنگ ۱۹۵۱ء میں ۵۵ ہزار روپے میں خرید لی۔ یہ بلڈنگ مُکتی فوج کے سامنے، عرب مسجد کے جوار میں، مرچوڑہ میں واقع ہے ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۴ء تک یعنی سولہ سالہ طویل عرصہ سوسائٹی کا ایک دورِ ابتلا تھا، پھر حالات نے مساعدت کی اور نئے لوگ آگے بڑھے، بشیر فارانی، اے۔ اے۔ رضوی، عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی کی قیادت میں بہت سارے جوشیلے اور محنتی طلبہ نے سوسائٹی کے مردہ جسم میں تازہ روحِ عمل پھونکی۔

اپریل ۱۹۷۸ء سے سوسائٹی کے سنہری دور کا آغاز ہوا، مجلسِ منتظمہ دسمبر ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۰ء میں بڑے باعزم نوجوان شامل ہوئے۔ اعزازی سیکریٹری۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل انصاری (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) صدر انجمن، فضل الرحمٰن انصاری، نائب صدر و انچارج میڈیکل سوشل ڈپارٹمنٹ، ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) انچارج شعبۂ خبر و نشریات، ڈاکٹر جاوید رحمانی (ایل۔ سی۔ ای۔ ایچ) اور ممبرانِ انجمن تھے: یٰسین دربکاں (بی۔ ایس۔ سی) ڈاکٹر عبدالحمید انصاری (ایل۔ سی۔ ای۔ ایچ) ڈاکٹر احتشام دانش (بی۔ ڈی۔ ایس) عبدالخالق فارقلیط، نذیر ازہری (ایم۔ لٹ) ڈاکٹر مصطفیٰ ہندوستانوالا (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس)

سوسائٹی کے دیگر کارنامے

سوسائٹی کے نوجوان اراکین نے دائرۂ عمل کو تعلیمی حدود سے باہر طبی اور سماجی امور تک بڑھا دیا ہے، ڈاکٹر نذیر صدیقی نے جو سوسائٹی کے انتہائی سرگرم رکن ہیں ڈاکٹر ہونے کے ناطے مالیگاؤں سے برائے علاج بمبئی آنے والے مریضوں کی بے پناہ دشواریوں کے پیشِ نظر اپنی رہنمائی میں ایک میڈیکو سوشل ڈپارٹمنٹ کی بنیاد ڈالی۔ نتیجتاً چند ہی مہینوں میں اس شعبہ نے اپنی اعلیٰ خدمات سے زبردست مقبولیت حاصل کر لی اور مالیگاؤں سے آنے والے بیشمار مریضوں کو مالی اعانت اور مقامی ڈاکٹروں کے تعاون سے بے انتہا فائدہ ہونے لگا، اس طبی خدمت میں ڈاکٹر اسماعیل انصاری، ڈاکٹر ریاض انصاری، ڈاکٹر مصطفیٰ ہندوستان والا، ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی، ڈاکٹر عبدالحمید انصاری، ڈاکٹر شمس طیبہ انصاری، ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی، ڈاکٹر جاوید رحمانی اور ڈاکٹر احتشام دانش

اپنے متعلقہ ہسپتالوں میں مالیگاؤں کے مریضوں کو طبی سہولتیں پہنچاتے رہے۔ ڈاکٹر منظور ایوبی، ڈاکٹر مزمل ہاشمی،
عبدالمتین انصاری بی۔ اے، ہارون درگاہی (بی۔ اے) ظفر اللہ انصاری (بی۔ اے) اور محمد سعید بھی میڈیکو سوشیل ڈپارٹمنٹ کے تحت کئی مریضوں کو طبی اور مالی امداد بہم پہنچاتے رہے اور ان کی نگرانی کرتے رہے۔

سوسائٹی کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک مقامی ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں مالیگاؤں کے سربرآوردہ تاجر، سماجی ورکر اور دیگر اکابرین شامل تھے: سیٹھ عبدالخالق پٹن سردار، سیٹھ حاجی عبدالرحمٰن (۶۲ نمبر) سیٹھ حاجی غلام رسول (راج ہنس ساڑی) خورشید احمد صدیقی (دیو راج ہنس ساڑی)، سیٹھ عبدالمجید چمڑے والے، سیٹھ عبدالحمید (تورنگ ساڑی)، سیٹھ عبدالعزیز (بلیو برڈ) عبدالرحمٰن انصاری (یونیورسل سائزنگ)، احمد نسیم مینا نگری، ڈاکٹر پیر محمد رحمانی، ڈاکٹر غلام حیدر صدیقی، ڈاکٹر مزمل ہاشمی، ڈاکٹر جمشید فردوسی، ڈاکٹر سہیل صدیقی، ڈاکٹر رفیق صدیقی، ڈاکٹر سعید فیضی، ڈاکٹر ادریس انصاری، ڈاکٹر منظور ایوبی، ڈاکٹر سلیم آصف، بشیر فردانی، ہارون بی۔ اے، سیٹھ محمد حنیف سوت والے، سیٹھ عبدالعزیز بھی — ان تمام حضرات کا تعاون سوسائٹی کو ہمیشہ حاصل رہا ہے۔

مالیگاؤں میں علمی و تعمیری کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک سب کمیٹی کی بھی تشکیل عمل میں لائی گئی اس کے ممبران یہ تھے: انصاری شفیق احمد (بی۔ ایس سی)، انصاری اقبال احمد (ایم۔ اے)، انصاری رئیس احمد، انصاری شکیل احمد۔

سوسائٹی مختلف النوع تقریبات کا انعقاد کرتی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنے لوگوں کی قربت حاصل رہے اور اس کی سرگرمیوں سے عوام باخبر رہیں، مہمانانِ خصوصی کو مدعو کیا جاتا اور مالیگاؤں کے ممتاز شہریوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی، نذیر ازہری، فضل الرحمٰن انجینئر، بھیونڈی کے ایڈوکیٹ سیس مومن، عبدالمجید سالک بیرسٹر، ڈاکٹر ریاض اختر کتاب والا، عبدالخالق پٹن سردار سیٹھ امین مسرت، بشیر فردانی، ہارون انصاری سابق ایم۔ ایل۔ اے، ہارون بی۔ اے، منشی صاحب، عبدالستار انعامدار، ابوبکر بخشی، عبدالرحمٰن (رکن جماعت اسلامی) عبدالمجید سرور، رشید مشتاق وغیرہم نے مختلف پروگراموں کو رونق بخشی۔

شہر بمبئی میں بھی ایک مقامی ورکنگ کمیٹی جو طلبہ اور اساتذہ پر مشتمل تھی تشکیل دی گئی:

اس میں انیس احمد انصاری (بی۔ اے) شفیق احمد انصاری (بی۔ اے)، عبدالرشید بی۔ ایس۔ سی، شفیق احمد (بی۔ ایس۔ سی) اور محمد صابر انصاری (ایم۔ اے بی۔ ایڈ) کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، بمبئی کے فعال سماجی ورکرس اور میونسپل کاؤنسلرس کا تعاون بھی سوسائٹی کو ہمیشہ حاصل رہا، ان کی ایک مشاورتی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی تھی جس میں ابوبکر بخشی، نور محمد انصاری، محمد حسین مومن اور شمیم طارق نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

سوسائٹی کی اس پچاس سالہ زندگی میں اس کے اوّلین بانیوں میں سے کئی پیوند خاک ہوگئے لیکن ان کے وجود میں جو گلوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اس سے آج بھی ان کی یادیں تر و تازہ ہیں، سوسائٹی کی تاریخ میں یہ یادگار زمانہ لوگ جگمگاتے ہوئے عنوان بن گئے ہیں۔

الحاج محمد اسماعیل انصاری (سنہ ۱۹۱۹ء - سنہ ۱۹۷۴ء)

طالبعلم بن کر مالیگاؤں سے بمبئی آئے، انجمن اسلام سے فارغ ہوکر مشہور ٹکنیکل ادارہ وی۔ جے۔ ٹی۔ آئی (ماٹنگا) میں داخلہ لیا، غریب الوطنی میں ان پر جو بیتی اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے "جمیع احباب مالیگاؤں مُقیم بمبئی" کے تعاون اور مشورہ سے انجمن تعلیم مسلمانان مالیگاؤں، کی تشکیل کا بنیادی پتھر رکھا اور اپنے دعوت نامہ میں یہ لکھا (مورخہ ۴ دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء)

> "ہمارے شہر کے نوجوان جنہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے وہ پیسوں کی تنگی کی وجہ سے بڑی مجبوری اور پریشانی کی حالت میں تحصیل علم کا زمانہ گذارتے ہیں اور اس کا احساس سب سے زیادہ بمبئی میں رہنے والوں کو ہوتا ہے۔"

— فی الحقیقت وہ زمانہ بڑی آزمائش کا تھا، آمدنی کے ذرائع محدود تھے اور روپیوں کی اتنی کمی تھی کہ ان کے گھر پر پہلا چندہ برائے اخراجات جب ہوا تو کسی نے آٹھ آنے، کسی نے ایک روپیہ دیا، محمد یحییٰ زبیر نے مبلغ ۵ روپے اور خود اسماعیل انصاری نے دس روپیے عنایت فرمایا۔ [1]

اپنے دعوت نامہ میں انہوں نے یہ نوٹ لکھی تھا: خدا کے فضل و کرم سے خاکسار کے یہاں

---

[1] راقم پروفیسر بشیر احمد شیخ عثمان کا شکر گذار ہے جنہوں نے مالیگاؤں ایجوکیشن سوسائٹی ۱۲ مسجد سٹریٹ مورلینڈ روڈ بمبئی ۱۱ کا سب سے پرانا اور ابتدائی فائل مطالعہ کے لیے دیا۔

لڑکا ڈاکٹر مختار احمد انصاری تولد ہوا ہے، اس کی خوشی میں جلسہ شروع ہونے سے پہلے مٹھائی اور چائے وغیرہ کی دعوت بھی قبول فرماکر شکر گذار فرمائیں۔

الحاج محمد اسمٰعیل انصاری بڑے مخلص سماجی کارکن تھے، حج کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے حجاج کرام کی آپ نے جو خدمات انجام دی تھیں اس کے صلہ میں حج کمیٹی نے آپ کو ۱۹۵۷ء میں اعزازی طور پر حج بیت اللہ کا موقع عطا کیا، کاروبار کی نوعیت کچھ عجیب تھی پاورلوم سے لے کر ڈابی اور بھنگار تک کا دھندا کرتے تھے اور اس سلسلے میں تیلی محلہ کے حاجی سراج الدین وکی والے سے بڑے گہرے تعلقات تھے، راقم کے برادر بزرگ ذاکر حسین کلو سیٹھ، بھوتی عبدالمجید انصاری اور محمد ایوب پنجابی سے گہرے مراسم تھے۔

آپ کے ایک صاحبزادے نہال احمد انصاری (ولادت ۱۹۵۶) ایم۔اے بنک آف انڈیا میں ملازم ہیں، بے حد مخلص اور بے لوث جوان ہیں، ممتاز انصاری یونین بنک آف انڈیا میں افسر ہیں اور افتخار احمد انصاری سول انجینیر ہیں، آپ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی بھی ہیں۔

مالیگاؤں کے محمد سلیمان گپّا کے صاحبزادے محمد اسحاق (ایل۔ٹی۔ایم) جو اولین کمیٹی کے ممبر تھے بڑے قابل استاد تھے صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ٹیکسٹائل کے شعبہ میں پڑھاتے تھے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا تھا۔

محمد عثمان شیخ (۱۹۱۷-۱۹۶۴ء)

شریف الطبع تھے اور سنجیدہ اور پُر وقار شخصیت کے مالک تھے، ابتدائی تعلیم نوہ سیوہ جزیرے میں حاصل کی، ۱۹۳۶ء میں میونسپل ہائی اسکول مالیگاؤں سے میٹرک کیا، تلاش معاش میں بمبئی آئے اور سنٹرل ریلوے واڑی بندر میں کلرکی کرتے رہے۔ پانچ سال بعد کمر ہمت باندھی اور سڈنہم کالج سے ۱۹۴۲ء میں اکاؤنٹنسی اور سیکریٹریز پریکٹس میں ڈپلوما حاصل کیا، چند برس بعد بمبئی میونسپل کارپوریشن میں اکاؤنٹنٹ کی نوکری کرلی اور زندگی بسر کرلی۔

پارچہ بافی اور بنکر برادری سے گہرا لگاؤ تھا، ان سے متعلق مختلف فلاحی اداروں کے فعال رکن تھے، مومن پورہ کے احسن المدارس کی برسوں احسن طریقے پر خدمت بجا لاتے رہے۔ مومن پورہ کو آپریٹیو جنرل اسٹورس کے جس کے اراکین میں الحاج منشی

محمد یحییٰ محمد اسحاق (۱۹۴۵-۱۹۴۶ء) بھی تھے۔ شیخ محمد عثمان بھی بعد میں رکن بنے۔ مالیگاؤں سوسائٹی آف ایجوکیشن کی اساس شیخ عثمان جیسے مخلص بانیوں کے سبب پائدار اور مستحکم ہے۔ بنی عرب مسجد ٹرسٹ کی مجلس عاملہ کے سیکریٹری کی حیثیت سے آپ تادم مرگ خدا کے اس گھر کی خدمت بجالاتے رہے، مسجد کی توسیع بھی آپ ہی کی مرہون منت ہے۔

شیخ محمد عثمان بھائیوں اور اولاد کی طرف سے بڑے خوش نصیب تھے، موتی تالاب کے حاجی عبدالکریم کی صاحبزادی سے بیاہ ہوا تھا۔ سعید (ولادت ۱۹۴۸ء) الیکٹریکل انجینیر ہیں۔ رشید احمد (ولادت ۱۹۵۰ء) نے آئی آئی ٹی (کانپور) سے ایم۔ ایس۔ سی (کیمسٹری) اور امریکہ کی ایم آئی ٹی بوسٹن یونیورسٹی سے مولیکیولر بایولوجی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے کچھ برسوں متعلق رہنے کے بعد اب اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بوسٹن (امریکہ) میں پبلک ہیلتھ انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہیں اور شادی کر کے وہیں بس گئے ہیں، دوسری صاحبزادی زبیدہ (۱۹۵۲ء) مالیگاؤں کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی بیگم بن کر ان کے ساتھ امریکہ میں ہیں ڈاکٹر مختار احمد انصاری پیتھولوجی لیبارٹری کے ڈائرکٹر ہیں۔

صغیر احمد (ولادت ۱۹۵۴ء) نے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی اور ڈی ایچ ای کیا ہے، مہاراشٹر کالج میں لیکچرر ہیں اور مالیگاؤں ایجوکیشن سوسائٹی کے سرگرم سیکریٹری اور فعال رکن رہ چکے ہیں۔

شیخ صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے فضل الرحمٰن جہاز پر ریڈیو آفیسر ہیں۔

شیخ محمد عثمان کے بھائی لقمان (ولادت ۱۹۲۹ء) نے سدنہم کالج سے بی۔ کام (۱۹۵۰ء میں) کرنے کے بعد بی۔ اے کیا۔ آپ کی شادی مالیگاؤں کے مشہور شاعر حضرت مسلم مالیگانوی کی صاحبزادی زاہدہ سے ہوئی ہے۔ صاحبزادے نعیم نے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد انڈسٹریل کیمسٹری میں ڈپلوما حاصل کیا۔ عارف بی۔ ایس۔ سی (فزکس) کرنے کے بعد ایئرانڈیا میں ملازم ہو گئے۔

ڈاکٹر غفران شیخ صاحب کے دوسرے بھائی ہیں بھیونڈی میں کچھ برسوں پریکٹس کرنے کے بعد ۱۹۶۳ میں ملٹری میں بھرتی ہو گئے اور ۱۹۹۰ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے سبکدوش ہو کر پونہ میں بس گئے، ۲ سال آرڈیننس فیکٹری میں رہے اور اب یونانی میڈیکل کالج میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے اور ساتھ ہی ساتھ تصنیف و

تالیف کا بھی کام کر رہے ہیں ایس۔ایس۔سی کے نصاب کے لیے فزیالوجی۔ہائیجین پر ایک ٹیکسٹ بک لکھ رہے ہیں اور اردو اکادمی کے مالی تعاون سے اردو میں میتھولوجی پر ایک معلوماتی کتاب شائع کر چکے ہیں، اردو انگلش ہائی اسکول ٹرسٹ پونہ کے زیر اہتمام ایک طبی لغت مرتب کر رہے ہیں۔آپ کی بڑی صاحبزادی فرزانہ نے اہم کام کیا ہے، شکیل میکانیکل انجینیر ہیں اور نبیل بی۔ای کمپوٹر کرنے کے بعد انڈین ایئرفورس میں پائلٹ آفیسر ہیں۔

شیخ محمد عثمان کے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحمٰن انجمن خیرالاسلام نالاسوپارہ میں پڑھا رہے ہیں، اہالیانِ مالیگاؤں نے شیخ محمد عثمان کی یاد میں ایک ہائی اسکول قائم کیا ہے جو انہیں کے نام سے چل رہا ہے۔

غریب الوطن اہلِ مکتب ــــ بمبئی میں

"احباب مالیگاؤں سنگت بمبئی" کی سالانہ جمیلہ ہے جب انجمن تعلیم مسلمانان مالیگاؤں کا قیام عمل میں آیا تو اعلیٰ تعلیم کے لئے طالبانِ علم بمبئی آکر کالجوں میں داخلہ لینے لگے، مضافات بمبئی میں جوگیشوری میں اسماعیل یوسف کالج بیسویں صدی کے اول نصف میں قوم کا واحد علمی مرکز تھا جہاں دور دور سے تشنگانِ علم اس چشمے سے فیضیاب ہونے کے لئے آتے تھے، اس علمی درسگاہ سے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق فارغ التحصیل طلبہ نکلے ہیں، کچھ بساطِ سیاست کے فرزین د وزیر بن گئے، کچھ اور تھے جنہوں نے مسندِ درس و افادہ کو رونق بخشی، کچھ بیرسٹر اور وکیل بن کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے، ڈاکٹروں کی صفیں آراستہ ہو گئیں ــــ اور کچھ وقت کے پھیلتے بڑھتے گرداب میں کھو گئے ــــ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو کر رہ گئے۔

"ینگ درس، بھیونڈی، برہانپور اور دھولیہ کے انصاری طلبہ کا ایک گٹ بنا رہتا تھا ہم سے پہلے اور ہمارے ساتھ میں اور پھر نئی نسلوں کے طلبہ کے جمِ غفیر میں سے کتنے چہرے ابھر رہے ہیں اور کتنے سنئے بن کر گذر رہے ہیں۔یادوں کا سفر جاری ہے اور اس کے مسافر یہ لوگ ہیں، مالیگاؤں سے ڈاکٹر پیر محمد رحمانی، بیرسٹر عبدالمجید سالک انصاری، نذیر حکیم، شبیر احمد حکیم، محمد یونس نحوی، بشارتی، ہارون انجینیر، مصطفیٰ انصاری (دلال) ڈاکٹر خلیل انصاری، خلیل نحوی۔

——پھر مالیگاؤں کی نئی نسل کی نئی فصل بمبئی میں لہلہانے لگی، علم کے ان خوشہ چینوں میں یہ لوگ تھے، شوکت عزیز، ہارون بی۔ اے، اور پھر ان کے پیچھے اس بساطِ گل کے یہ تازہ واردان آئے۔ عبدالحفیظ انصاری، ایوب صدیقی، پروفیسر نذیر انصاری، عبدالجبار عیسیٰ زبیر، ڈاکٹر محمد حسین (مرحوم)، اس حلقہ سے تعلق رکھنے والے بھیونڈی کے یوسف حسن تھے۔

دارالسرور برہانپور سے نذیر انصاری، حشمت اللہ انصاری اور ڈاکٹر اقبال انصاری سرور وانبساط بکھیر کر چلے گئے، شاہدہ سے نشاط شاہدوی کی یاد دلانے کے لیے پروفیسر احمد انصاری آئے اور بھیونڈی سے محمد حسن محمد خلیل مومن (لالہ سیٹھ)، محمد حسن بھوپالی، عبدالقیوم حافظ عبدالقدوس اور ڈاکٹر عبدالرؤف مومن اس مادرِ علمیہ کی گود میں آئے، یوسف حسن، ایوب مومن، محمد حسن محمد خلیل اور محمد حسن بھوپالی کرکٹ کے مشہور کھلاڑی تھے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا —— پھر ہم نے سنا کہ بھیونڈی کے طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی ہے، اس میں نامؔ مومن (ایڈوکیٹ)، حفیظ الرحمٰن، منصور محمد حنیف انصاری وغیرہ شامل تھے، بلال احمد مومن مالیگاؤں کے لیسین درگاہی کے معاصر تھے، ڈاکٹر عتیق انصاری (سرجن) نے بھی انٹر سائنس یہیں سے کیا۔

مالیگاؤں کے جو خاندان برسوں سے بمبئی میں آباد ہیں دونوں شہروں کے بیچ پل کا کام دیتے ہیں، رشتہ داری کا تانا بانا بکھرا ہوا ہے، بہت سارے بسلسلۂ ملازمت عارضی سکونت رکھتے ہیں اور کچھ تاجرانہ تعلقات کے سبب آمد و رفت رکھتے ہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کا ذکر گذر چکا ہے لیکن تاریخ بیرسٹر عبدالمجید سالک انصاری کے خیال سے غافل نہیں ہے:

مالیگاؤں کے ممتاز افراد۔ عروس البلاد بمبئی میں

مالیگاؤں کے انصاری خاندان اور افراد جو بمبئی میں مستقل سکونت رکھتے ہیں ایک طرف تو اپنے وطن مالوف کے "خانہ زادِ زلف" ہیں اور دوسری طرف "نیرنگیٔ ہائے بمبئی" کے "گرفتارِ وفا" ہیں، ان میں اساتذہ، ڈاکٹرس، وکلاء، تجار اور دیگر شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے "مالیگاؤں" حضرات ہیں۔

بیرسٹر عبد المجید سالک انصاری (۱۹۲۵-۱۹۸۵) :

شریف الطبع اور مرنجان مرنج تھے، ایثار و قربانی کے جذبہ سے سرشار تھے اور ملک و قوم کی خدمت کے لیے کمربستہ رہتے تھے، چونکہ مخلص اور بے لوث تھے اور قانون کی ٹکسال کے کھرے سکے تھے اس لیے موجودہ نظامِ زندگی میں چل نہ سکے، مقدمے لڑتے تھے مگر دل جیتتے تھے، سنہ ۱۹۵۲ء میں لندن سے بیرسٹری کر کے آئے تو اشتراکی خیالات میں اور زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ ذوقِ شعری رکھتے تھے اور آخر عمر میں چند طنزیہ نظمیں بھی کہی تھیں۔ ان کے صاحبزادوں میں نشاط انور ادبی مزاج رکھتے ہیں اور رشید انور کاروباری قسم کے جوانمرد ہیں، ان کی بیٹی عائشہ اپنے شوہر زبیر احمد کے ساتھ وکالت کر رہی ہیں، برادری کی ایڈوکیٹ خواتین میں تفرد رکھتی ہیں اور نہایت ممتاز ہیں۔

ڈاکٹر ریاض احمد صدیقی (ایچ۔سی۔ای۔ایچ)

مذکورہ کے کامیاب ڈاکٹر ہیں، بمبئی میں رہتے ہیں، مالیگاؤں کی نبض ہاتھ میں رکھتے ہیں، مالیگاؤں ایجوکیشن سوسائٹی کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، آپ کے دوست یسٰین درگاہی سائنس اور ریاضی کے ماہر اور تجربہ کار استاد ہیں ہاشمیہ ہائی اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ مذکورہ بالا سوسائٹی کی مجلس منتظمہ کے رکن رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر پیر محمد رحمانی کے صاحبزادے جاوید رحمانی (ایل سی ای ایچ) بھارواہا سپٹل (آرون پاڑہ) کے میڈیکل افسر ہیں، خود ان کی اپنی ڈسپنسری بھی ہے اور ایک کامیاب ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ایک فعال اور سرگرم خادمِ قوم بھی ہیں۔ فی الحال مالیگاؤں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر ہیں۔

ڈاکٹر سردار انصاری (ایم۔ڈی پیتھولوجی) اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر طلعت نسرین انصاری (ایم۔ڈی پیتھولوجی) جے جے ہسپتال میں طبی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ ناگپاڑہ کے مریضوں کے لئے بھی اپنی لیبوریٹری کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ساحل شیخ (ایم۔بی۔بی۔ایس) طبی سیمنٹ کی چال میں مطب کرتے ہیں، ڈاکٹر ظفر ہاشمی اور ڈاکٹر ناہید انصاری دونوں میاں بیوی ساتراستہ بنس روڈ پر پریکٹس

کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مسعود انصاری (ایم بی بی ایس) مالیگاؤں کے مشہور جمعیت علمائی اور کانگریسی رہنما مولانا یحییٰ زبیر کے پوتے ہیں، مدنپورہ میں جھولا میدان کے سامنے ان کی ڈسپنسری ہے، بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں اور خاندانی روایات کے امین اور حامل ہیں۔

ڈاکٹر شہاب دانش (بدر کا باڑہ مالیگاؤں) ایک ماہر معالج دنداں (ڈینٹسٹ) ہیں۔

ڈاکٹر فاروق انصاری (ایل سی ای ایچ) خاص امراض کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین انصاری جو مالیگاؤں کالج کے پرنسپل عبدالحفیظ انصاری کے بھائی ہیں جو مونگی (اندھیری) میں غریب مریضوں کی مسیحائی کرتے ہیں۔

شبیر وکیل کے صاحبزادے خالد شیخ (ایل۔سی۔ای۔ایچ) بھارت نگر باندرہ میں پریکٹس کرتے ہیں۔

وکلاء کی بڑی تعداد مالیگاؤں میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے بمبئی میں نسبتاً مالیگاؤں کے مؤکل زیادہ آتے ہیں لیکن وکیل کم ہیں، ان میں سب سے ممتاز سعید اختر (بی ایس سی ایل ایل بی) ہیں مالیگاؤں کے مشہور شکسٹائل ماسٹر محمد حسین منشی کے بڑے صاحبزادے ہیں بڑے معتبر، باسوخ اور کامیاب وکیل ہیں عمائدین شہر سے بڑے گہرے مراسم ہیں، سماجی امور میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں آپ نوٹری بھی ہیں یہ بات قابل ذکر ہے کہ سعید اختر وکالت کرنے سے پہلے حکومت کے انفورسمنٹ برانچ میں افسر تھے لیکن خود ان کی افتاد طبع اور مزاج اور کچھ ان کے والد کی دینداری اور تقویٰ نے انہیں استعفا دینے پر مجبور کر دیا، آپ کی بیگم نیلوفر (محوی) بھی بی۔اے۔بی ایڈ۔ ایل ایل بی ہیں انجمن گرلز ہائی اسکول باندرہ میں برسوں سے پڑھا رہی ہیں۔

منشی محمد حسین ماسٹر کے چھوٹے صاحبزادے شوکت اختر (ایم۔ڈی۔ایس) اورل سرجن تقریباً دس برس سعودیہ میں معالج دنداں رہے۔

خواتین وکلا میں غالباً عائشہ بیگم زبیر احمد تفرد رکھتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی عدالت میں موجود رہتے ہیں۔

اشفاق انصاری قلعہ کورٹ میں وکالت کرتے ہیں۔

آج سے تیس ۳۰ سال قبل بمبئی کے مدارس میں مالیگاؤں کے بڑے قابل اساتذہ درس و تدریس کا سلسلہ قائم کئے ہوئے تھے، اب مالیگاؤں میں ہی اتنی کثیر تعداد میں اسکول قائم ہوگئے ہیں کہ اچھے

اساتذہ کی تلاش و جستجو رہتی ہے۔ پھر بھی چند ماہر اور تجربہ کار ٹیچر بمبئی ہی کو ترجیح دیتے ہیں ان میں لطیفہ درگاہی بحیثیت ایک قابل ٹیچر کے تعلیمی دنیا میں جانی پہچانی ہستی ہیں، ہاشمیہ ہائی اسکول میں ریاضی اور سائنس پڑھاتے ہیں مالیگاؤں کے تعلق سے سماجی امور سرانجام دیتے ہیں۔ مالیگاؤں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر ہیں اور عرصے سے اسی کی مجلس منتظمہ سے وابستہ ہیں۔ بڑے ہنس مکھ خلیق انسان ہیں اور عامل بالحدیث شخصیت ہیں، مہاراشٹر کالج کے پروفیسر صغیر احمد شیخ جن کا ذکر گذر چکا ہے اسی سوسائٹی کے حسب سابق سیکریٹری ہیں۔ اور آج کل پیشہ ورانہ رہنمائی (ووکیشنل گائڈنس) کے رہنما بھی ہیں۔

اسلم محمود انصاری کارپوریشن میں ہیڈ افیسر ہیں، عثمان شیخ کے بعد غالباً آپ دوسرے مالیگانوی ہیں جو کارپوریشن میں ایک اعلیٰ عہدہ پر سرفراز ہوئے ہیں۔

فضل الرحمٰن (بی۔ ای علیگ) لارسن اینڈ ٹوبرو (ایل ٹی) جیسی مشہور کمپنی میں ڈویژنل مینیجر ہیں۔ سوسائٹی مذکور کے آپ سابق صدر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز انصاری مالیگاؤں ہی میں نہیں غالباً مہاراشٹر بھر میں مومن برادری کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے تعلیم و تدریس (ایجوکیشن) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک ایک ماہر تعلیم استاد ہیں، پریل کے کالج میں پڑھاتے ہیں لیکن مالیگاؤں والوں کے لئے چشمۂ فیض ہیں ان کی رہنمائی میں مالیگاؤں میں تعلیم کا بڑا فروغ ہوا ہے۔

عرب قونصل خانوں میں مالیگاؤں کے عربی داں انصاریوں کا بڑا دبدبہ اور تسلط ہے اور معہد ملت مالیگاؤں کی عظیم درسگاہ کے لئے یہ قابل افتخار و مباہات ہے کہ اکثر ملّی ہیں، ان میں سے ممتاز ہستیاں یہ ہیں:

نظیر احمد ازہری (ملّی)

معہد ملت کے اولین فارغ التحصیل "ملیوں" میں سے ہیں، جامعہ ازہر قاہرہ سے فاتحہ فراغ پڑھ کر الجزائر میں برسر روزگار ہو گئے اب ایک عرصہ سے الامارۃ المتحدہ (یو اے ای) کے قونصل خانہ میں ایک ذمہ دار عہدہ پر سرفراز ہیں، عربوں سے دوستی اور اپنے رسوخ کے ذریعہ مالیگاؤں کے تعلیمی اداروں کی مالی مدد کرتے رہتے ہیں اور خصوصاً اپنی مادر علمی کی خدمت کے لئے ہمیشہ مستعد اور فعال رہتے ہیں۔

عتیق الرحمٰن انصاری جو نظیر ازہری کے برادر نسبتی ہیں اسی قونصل میں محاسب ہیں، معہد ملت کے یادو، ظفر اللہ انصاری، مفتی نظام الدین اور مختار احمد ندوی مالیگانوی عرب متحدہ ممالک قونصل کے بڑے ذمہ دار عہدہ داران ہیں۔

المملکۃ العربیۃ السعودیۃ کے قونصل میں مالیگاؤں کے عربی دانوں کی موجودگی سے مالیگاؤں کے زائرین و حجاج کرام کو ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جن سے عموماً دوسرے لوگ دوچار ہوتے ہیں ان میں حافظ عبد القدوس انصاری ملی دیوبندی کی ہستی ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آپ بحد خلیق اور مددگار شخص ہیں، ان کے بھائی احمد اللہ انصاری، مصطفیٰ انصاری اور رفیق انصاری بھی بڑے مدد معاون ہیں۔ رفیق انصاری ایک مخلص اور بحد ملنسار انسان ہیں۔

مختار احمد ازہری بحرین کے قونصل میں ایک مدت سے کام کر رہے ہیں، مولانا عبد الکریم بھی ان کے ساتھ ہیں۔

متین انصاری عراق کے قونصل میں جمے ہوئے ہیں ان کے ساتھ حافظ شمس الضحیٰ بھی ہیں۔

مالیگاؤں کی ممتاز خواتین

بمبئی میں تعلیم کے سلسلہ میں مالیگاؤں کی خواتین کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہی ہے۔ حافظ عفران کے بھائی صدیق (نانا) کی صاحبزادی خالدہ مختار انصاری نے بی۔ اے کرنے کے بعد امریکہ میں پاتھولوجی کا کورس کر کے طبی خدمت کر رہی ہیں۔

بیگم نیلوفر سعید اختر پہلی مسلم خاتون ہیں جنہوں نے انٹر یونیورسٹی کے ٹیبل ٹینس مقابلے میں آل انڈیا چیمپین شپ کا ٹائٹل جیتا اور کل ہند سطح پر نمائندگی بھی کی ہے اس کے علاوہ اسپورٹس میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ ان کی چھوٹی بہن درشہوار مسلسل دو سال تک انٹر ایئر لائن چیمپین رہی ہیں۔

خاندیش کے ممتاز افراد

دھولیہ کے حبیب اللہ انصاری بھی پولس محکمہ کے اعلیٰ افسر ہیں اور بمبئی میں تعینات ہیں۔

مختار احسن انصاری بھی اسی محکمہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہیں آپ کا ذکر بحیثیت شاعر آچکا ہے۔

پروفیسر احمد انصاری (ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی)

خاندیش میں 'خان' ہی نہیں بڑے پایے کے انصاری بھی پیدا ہوئے ہیں، شاہدہ کی دو ممتاز انصاری ہستیاں بڑی معروف ہیں، ایک امیر اللہ نشاط شاہدوی ہیں جن کی یاد میں مالیگاؤں اور بھیونڈی میں نشاط لائبریریاں قائم ہیں۔ دوسرے احمد انصاری ہیں جو ۱۹۵۲ء میں اسماعیل یوسف کالج میں طالبعلم بن کر آئے، بی۔اے اور ایم۔اے (فارسی) میں فرسٹ کلاس لائے، گولڈ میڈل حاصل کئے، انگریزی اور قانون کی ڈگریاں حاصل کیں، عدالت کی بجائے یونیورسٹی کے اساتذہ کے حقوق کے لئے وکالت شروع کی، مہاراشٹر کالج میں فارسی کے لیکچرر رہے، حوصلوں اور ولولوں کی بیکرانیاں وسعتوں کی طلبگار تھیں بمبئی یونیورسٹی میں ریڈر بنے اور اب صدر شعبۂ فارسی کی مسند پر جلوہ فگن ہیں، بڑے مرد افگن واقع ہوئے ہیں، اس لئے کہ جا بجا تعلیمی اداروں میں ریشہ دوانیوں اور سیاسی چالبازیوں کے خلاف لڑتے ہیں، اساتذہ کے حقوق کی پاسبانی کرتے ہیں، موقع پرستوں کے لئے شمشیر برہنہ ہیں اور جعلسازوں اور سازشیوں کے خلاف حرف برہنہ دنیا کا تعاقب کرنے والے عباد الدنیا کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن افسوس یہ پکڑے میں نہیں آتے کیونکہ یہ لوگ تو وہ ہیں جو آخرت سے بہت دور جا پڑے ہیں مگر ایک دن اللہ کی گرفت میں ضرور آئیں گے۔ احمد انصاری صحیح معنوں میں 'نحن انصار اللہ' کی جماعت میں ہیں، صلۂ رحمی کرنے والوں میں ہم نے ان سے بڑھ کر کسی کو نہیں پایا، اس قرآنی حکم پر "وبالوالدین احسانا و بذی القربیٰ" پر سختی سے عمل کر کے انصاری صاحب نے ایثار و قربانی کی ایک نادر مثال قائم کی ہے۔ اپنے شاگردوں کے لئے ایک شفیق استاد ہی نہیں ایک ہمدرد اور مالی امداد کرنے والے دوست بھی ہیں۔

آپ کی بیگم جمیلہ انصاری (بی۔اے۔بی ایڈ) میونسپل اسکول (عمر رجب روڈ) میں بمبئی میں صدر مدرسہ تھیں حال ہی میں سبکدوش ہوئی ہیں، آپ کو بھی فارسی ادب سے بیحد لگاؤ ہے۔

ایوب محمد حنیف انصاری (برہانپوری)

ایوب انصاری برہانپور کے ایک مخیر اور متمول تاجر محمد حنیف بن یعقوب بن نور محمد کے خاندان کی

یادگار ہیں، یونس ان کے تیا ہے، بھیونڈی کے ممتاز پنجابی برادران فرم سے برسوں سے وابستہ ہیں، کپڑے کے کاروبار کا بڑا پرانا تجربہ ہے، بڑا پاکیزہ ادبی ذوق ہے، علمی کتابوں کا شوق ہے، تصوف سے لگاؤ ہے، برہانپور کے پیر طریقت حضرت حاجی عبدالغفور بخش اللہ شاہ صاحب اشرفی آپ سے بڑی محبت کرتے تھے، گہوارۂ علم دارالسرور، مرکز روحانیت برہانپور کے ایوب انصاری صحیح معنوں میں نمائندہ ہیں۔

یوپی کے ساکنان بمبئی

اتر پردیش کو ہندستان کا دماغ کہا جاتا ہے، یہاں اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کی حامل ہستیاں پیدا ہوئی ہیں، سرکاری محکموں میں برادری کی ممتاز شخصیتیں اعلیٰ عہدوں پر سرفراز ہیں۔

وحید الحسن (ولادت ۱۹۴۱)

بلال پور (ٹانڈہ) کے مردم خیز شہر سے تعلق رکھتے ہیں، تعلیم یافتہ گھرانے کے اپنا فرزند ہیں، بمبئی میں انکم ٹیکس کمشنر ہیں، بیحد خلیق اور ملنسار شخص ہیں، آپ کانپور کے مشہور رئیس سخاوت دین کے صاحبزادے بدر الزماں کے ہم زلف ہیں، آپ کی بیگم انجم حسن بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔

مئوناتھ بھنجن کے امتیاز احمد انصاری کسٹم آفیسر ہیں۔

رحمی انور اور مولوی انیس سعودی عرب قونصل میں اور منظر الحق انصاری قطر قونصل میں ملازم ہیں۔

ڈاکٹر محمود احمد انصاری

غدر کے زمانے میں اعظم گڑھ کی پھولپور جماعت کے جو لوگ آ کر بامبے میں بس گئے تھے ان میں بقر عیدی سیٹھ نے ہنکاری میں بڑی ترقی کی، اکیلے کاروبار سنبھالتے تھے دابجہ واڑی میں ان کا کارخانہ تھا جس میں جنوبی مشرقی جزائر ہند کی عیسائی مستورات کے لیے ساڑیاں تیار کی جاتی

تھیں۔ جب ڈاکٹر محمود انصاری نے ننہال اور پھولپور میں ددھیال میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی اور شبلی کالج اور پھر الٰہ آباد یونانی میڈیکل کالج سے طب کی ڈگری حاصل کی تو نانا کی محبت میں مجبور ہو کر واجہ واڑی بام میں آکر سکونت پذیر ہو گئے اور نانا کے انتقال کے بعد طبابت اور حیاکت دونوں کو سنبھال رکھا لیکن جب پاور لوم کا زمانہ آیا تو بنکروں کے ہاتھ کٹ گئے، ڈاکٹر موصوف نے تانا بانا چھوڑ کر ڈسپنسری ڈال لی اور بہت جلد ایک ڈاکٹر اور ایک مخلص خادم قوم کی حیثیت سے سارے علاقہ میں مقبولیت حاصل کر لی اور اپنا ایک منفرد مقام بنالیا۔

آپ کے کچھ انصاری رشتہ دار غدر کے پُرآشوب زمانے میں سنگاپور جا کر آباد ہو گئے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے تجارت میں فروغ دیا اور اولاد میں برکت دی، غریب الوطنی میں بھی وطن کو فراموش نہیں کیا بلکہ یادوں کو سینے سے لگائے رکھا اور رشتہ داروں سے دل لگا رکھا، حمید اللہ انصاری جو وہیں سنگاپور میں دفن ہیں بڑے کامیاب تاجر تھے آپ کے چھوٹے بیٹے انعام اللہ انصاری سے ڈاکٹر محمود انصاری کی بیٹی بیاہی ہوئی ہیں۔ ہندوستان آتے جاتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے دیندار اور مخلص انسان ہیں۔ اور قوم کے لئے بڑا درد مند دل رکھتے ہیں۔ الحاج بقرعیدی سیٹھ بھیونڈی ویلفیر سوسائٹی (مدنپورہ) کے بانیوں میں سے تھے۔

عتیق انصاری (۲۹ مارچ ۱۹۳۹ء)

دانشور اور فنکار ہیں حلیہ سے اور کلیہ سے شاعر لگتے ہیں، بجنور میں پیدا ہوئے، مدرسہ عربیہ قاسمیہ نگینہ (بجنور) سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا، دہلی میں ابتدائی تعلیم ہوئی، بمبئی سے مہاراشٹرا اسٹیٹ ہائر آرٹ میں کمرشیل آرٹ میں ڈپلوما حاصل کیا (سنہ ۱۹۶۵ء) پھر سر جے جے اسکول آف آرٹس سے لیتھوگرافی، فوٹوگرافی اور اسی سے متعلق مختلف فنون حاصل کئے۔ فوٹوگرافی میں آپ کو بڑی مہارت حاصل ہے۔ خطاطی میں آپ نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے، انقلاب میں خوشنویسوں کے نگراں رہے، عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی رسم الخط میں آپ کی خطاطی نے بڑی جدت طرازیاں پیدا کی ہیں، اردو اکادمی مہاراشٹرا اسٹیٹ نے آپ کے فن کی قدر دانی کے طور پر ایوارڈ عطا کیا ہے آپ کے لڑکے صاحبزادے پرویز انصاری نے بی۔ ایس۔ سی کمپیوٹر گرافک ڈیزائننگ کیا ہے

عتیق انصاری ایک مخلص، مرنجان مرنج قسم کے خاموش طبع انسان ہیں۔

بیرونِ شہر سے جو انصاری حضرات اپنی کمپنیوں سے تبادلہ ہو کر آئے ہیں ان میں بہار کے محمد شفیع انصاری انڈین آئل کارپوریشن لمیٹیڈ میں ٹرمنل مینیجر ہیں۔

جونپور کے عبدالرشید انصاری اسی کارپوریشن میں ڈپٹی مینیجر (شپنگ) ہیں۔

یوپی کے منشی عبدالعزیز انصاری، منشی ٹرانسپورٹ (محمد علی روڈ) ایک معزز، قابلِ احترام اور ذی علم انسان تھے، ادب و علم سے لگاؤ تھا، بڑے مخیر تھے، خلافت کمیٹی ہاؤس کے ٹرسٹی رہ چکے تھے۔ لکھنؤ کے حیات محمد انصاری مہاراشٹر مومن کانفرنس کے صدر رہ چکے ہیں اور ابھی تک بڑے سرگرم رکن ہیں کانگریس صد سالہ جشن زیرِ اہتمام آل انڈیا مومن کانفرنس ۱۹۸۵ء کی کمیٹی پر آپ رکن کی حیثیت سے نامزد کئے گئے تھے۔

محمد حنیف انصاری جو فی الحال سانتا کروز (جوہو) میں مہلی کو پیڑولیم بنس) میں یک ذمہ دار عہدہ دار ہیں اس سے پہلے ہوائی فوج میں تھے۔

بجنور کے انصاری حضرات بیکری کے کاروبار میں ایک خاص حیثیت کے حامل ہیں بیکری کا دھندا ان کے لئے مخصوص ہو گیا ہے لادی پاؤ، بروں پاؤ اور کھرا بسکٹ ان کی خاص بیکری ہیں، بمبئی میں لگ بھگ انتالیس ۳۹ کے قریب بیکریاں ہیں۔ بیکری کے کاروبار کی پرانی یک تاریخ ہے۔

آزادئ ہند کے بعد جب سیاست کا بٹوارہ سب نا کر بیٹھنے لگا تو انگریزوں نے پنجاب بیکری جو شہر میں سب سے بڑی بیکری تھی اپنے یک پرانے اور وفادار ملازم محمد آباد کے حسین بخش کے نصیب کھول دئے، بیکری کے ملازم عموماً ایک دوسرے کی سفارش اور وسیلے سے بجنور سے آتے تھے ان میں یعقوب انصاری کے دادا بھی تھے۔

یعقوب (انصاری) بیکری والے

بجنور کے دیہات محمد آباد کے ایک معزز انصاری گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں، ۱۹۶۰ میں یوسف کالج جوگیشوری سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مہلی دھارواڑ سے میکانیکل انجینیرنگ میں بی۔ ای کی ڈگری لی، انڈھیری (ایسٹ) میں ربر کی فیکٹری قائم کی اور بڑی بڑی کمپنیوں کو جن میں کراس کرس نہایت نمایاں ہیں اس کی مصنوعات کے بڑے خریدار ہیں، بیکری کا دھندا آبائی پیشہ ٹھہرا آپ کے دادا حاجی جمال الدین پنجاب بیکری سے نکلے تو خود اپنا دھندا شروع کر دیا،

دادر اور بیجر محلہ میں ڈائمنڈ بیکری کے نام سے کاروبار شروع کیا، دیانتداری اور محنت
نے برکت دی اور آج یعقوب انصاری ممبئی بیکری ایسوسی ایشن کے وائس پریزیڈنٹ بن
گئے ہیں۔ آپ کی اہلیہ زیب النساء بیکری والا۔ فاروق عمر بائی اسکول کے گرلز سیکشن کی
ہیڈ مسٹریس ہیں۔

بیکری کے کاروبار میں بجنوری کے شریف اور صغیر برادران نے کوالٹی نام سے بیکری
ڈال کر بڑی شہرت حاصل کی ہے، باندرہ اسٹیشن کے قریب قمرالدین انصاری بیکری والے بھی
بجنور کے ہیں غرضکہ 'بجنوریان' کی ایک بڑی تعداد بمبئی میں آباد ہے، کچھ کرافورڈ مارکیٹ میں
گوشت کی زراہی کا دھندہ کرتے ہیں، اور کچھ فروٹ والے ہیں۔ ان میں سہارنپور کے میوہ فروش بھی
ہیں۔ مستان تالاب کے پاس جوتا بنانے والوں میں بجنوری کاریگروں کی بڑی تعداد ہے۔ بجنوری
بیکری والوں کی روایت ہے کہ وہ ایرانی ہوٹلوں کے مالکان کی طرح اپنے رشتہ داروں کو کاروبار
میں شامل کر لیتے ہیں۔

ممبئی کے علاوہ بجنوری انصاری حضرات کی بیکریاں پونے، بڑودہ، ناسک وغیرہ میں بھی ہیں،
بمبیری پوتہ میں عبد منان انصاری کی ملنسار بیکری ایک مثال ہے۔

بمبئی بنگالی پورہ کے مولانا عبدالوحید انصاری بجنوری جمعیۃ العلماء کے سرگرم رکن ہے، بجنوری
علماء و حفاظ کرام رمضان کے مبارک مہینے میں تراویح پڑھانے کے لئے بڑی تعداد میں ممبئی
تشریف لاتے ہیں، پانی پت، ٹانڈہ کے بعد حفاظ کی سب سے بڑی تعداد غالباً بجنور کے علاقے میں
ہی ہے۔ شیر کوٹ قصبہ (بجنور) کے انوار احمد کے گھر اور سسرال میں اسّی سے زیادہ حافظ موجود
ہیں ان میں تین صاحبزادے حافظ یوسف، حافظ الیاس اور حافظ محمد عباس ممبئی میں
درس قرآن دیتے ہیں اور تراویح پڑھاتے ہیں۔

اسلامی ممالک کی تاریخ و جغرافیہ پر نظر ڈال کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہر شہر ایک خاص صنعت و حرفت میں
شہرت رکھتا تھا۔ مصر کے قرطبہ میں ایک لاکھ بتیس ہزار ریشم باف و بزاز رہتے تھے، شام
میں حلب آئینہ سازی کی صنعت کا آئینہ دار تھا، دمشق میں شمشیر سازی کے کارخانے تھے اسی
طرح ہندوستان میں بھی شہروں کی صنعتی تخصیص تھی، علیگڑھ کے تالے، میرٹھ کی قینچی اور مراد آباد
کے نقشیں ظروف بنانے والے عموماً انصاری حضرات تھے، آج سے ساٹھ پینسٹھ برس پہلے
مراد آباد میں ساٹھ ہزار کے قریب شیخ انصار آباد تھے اور انواع و اقسام کی صنعت و حرفت

میں مشغول تھے، یہیں کے پان دان، لوٹے گلاس غرضکہ ہر طرح کے برتن دور دور تک اور نہایت مشہور ہیں" [کذا]

کامٹی میں برادری کی شہرت فٹ بال کے ماہر کھلاڑیوں کی بین الاقوامی شہرت کا صدقہ ہے ملازمت کے سلسلے میں ناگپور اور کامٹی کے چند ممتاز افراد بمبئی اور مضافات میں بسے ہوئے ہیں۔

محمد ایوب انصاری (ولادت ۱۹۵۲)

بمبئی یونیورسٹی سے بی۔ اے (آنرز) کے بعد عربی میں ایم اے کا سلسلہ جاری رکھنے فی الحال ایر انڈیا کے کمپیوٹر اینڈ کمیونی کیشن سروسز سے وابستہ ہیں۔ ادبی و علمی ذوق بڑا پاکیزہ ہے اور خود بھی بڑے پاکیزہ نفس ہیں، ادب کا بڑا گہرا مطالعہ ہے، شاعر دوست ہیں اور خود شعر نواز کامٹی اور بمبئی کے ادبی حلقوں میں روشناس ہیں۔ بمبئی میں طویل رہائش کے دوران اردو ادب عالیہ کے سیکریٹری رہے، یوم اقبال کے سالانہ مشاعروں کے انعقاد کا سہرا محمد ایوب کے سر بندھا ہے، ادبی نشستوں کا انعقاد بھی آپ ہی کی کوششوں سے ہوتا رہا ہے۔ اب تھانہ ضلع کے مغربی حصے میں نالا سوپارہ کے قدیم تاریخی شہر میں منتقل ہو گئے ہیں، کادری سوسائٹی کے رکن ہیں اور چیئرمین رہ چکے ہیں، اڑوس پڑوس کی دیگر سوسائٹیوں کی سماجی و ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، نالا سوپارہ میں ذولسانی شعری و ادبی نشستوں کا اہتمام اور انعقاد محمد ایوب کی مسرانہ کوششوں سے ہوتا رہتا ہے۔ نجیب، خلیق اور منکسر شخص ہیں۔

بمبئی کے انصاریوں کا ذکر حاجی عبدالشکور انصاری (بیکری والے) کے بغیر نامکمل رہ جائیگا۔ آپ انصاری برادری کے بہت فعال اور سرگرم دینی و ملی شخصیت ہیں۔

سنہ ۱۹۷۷ء میں انصاری پروگریسیو ایسوسی ایشن کے صدر رہے تھے، سیکریٹری ڈاکٹر محمود انصاری تھے۔ اسی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا جس میں مشہور نیورولوجسٹ ڈاکٹر ارشاد علی کوچہ لکھنؤ کی انصاری برادری کے بہت ممتاز فرد ہیں، دھولیہ کے اے انصاری اور ظ انصاری کو ان کی شاندار خدمات کے اعتراف میں تحفے دیئے گئے تھے۔ ڈاکٹر محمود احمد انصاری کو بھی ان کی عوامی خدمات کے سلسلے میں میڈل سے نوازا گیا تھا۔ اسی زمانے میں مختار احسن انصاری بھی بہام کی ادبی محفلوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

بمبئی کی انصاری برادری کی موجودہ نسل

برادری کی آج کی نسل اس سائنسی دور میں اور دوڑ میں بہت آگے نکل چکی ہے، سیاسی شعور، تعلیمی ترقی اور باہمی مسابقت کے جذبے نے برادری کا منصب بڑھا دیا، پسماندگی کی جگہ پیشرفتی نے لے لی ہے، احساس کمتری کی رگ دب گئی ہے، غیرت کی رگ پھڑک اٹھی ہے رگ و پے میں نیا لہو دوڑنے لگا ہے۔ آج کوئی ایسا میدان نہیں بچا ہے جس میں تعلیم یافتہ افراد کی قطاریں نہ لگی ہوں، شہر کی میمن، خوجہ، بوہرہ اور کوکنی جماعتوں کے مقابل ہر جگہ کا مومن چاہے مالیگاؤں کا ہو یا بھیونڈی، ناگپور اور برہانپور کا انصاری تہذیبی سفر میں ان کے ساتھ قدم ملاتا ہوا رواں دواں ہے۔

بمبئی میں برادری کی قدیم بستیوں میں ایک فعال اور باشعور طبقہ ابھر رہا ہے۔ اس میں مہاراشٹر کالج کے پروفیسر جمیل کامل، محمود پرویز انصاری، نایاب انصاری، مخدوم حسن انصاری، ہارون انصاری، منشی محمد حسن انصاری، محمد یوسف ثانی انصاری، منیر احمد انصاری، فتح محمد انصاری، عبدالحمید انصاری، محمد رئیس انصاری، عبدالعزیز انصاری، شمیم انصاری، محمد یونس عالم انصاری وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر جمیل کامل مشہور علمی و تعلیمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی عبدالرحمٰن کامل کے پوتے ہیں اور مہاراشٹر کالج میں اردو کے لیکچرر ہیں، شمیم انصاری (ولادت ۱۹۵۲ء) صحافت اور علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں ان کی سماجی خدمات کا دائرہ عمل کوسہ ممبرا میں اردو ہائی اسکول کی تاسیس تک پہنچتا ہے۔ ۱۹۷۵ء سے رحمانی اسکول بھیونڈی میں درس و تدریس دیتے ہیں، پولیس ایکشن کمیٹی کے نائب صدر ہیں۔ فٹ بال کے اچھے کھلاڑی ہیں۔

مذکورہ بالا ہم مزاج نوجوانوں نے ۱۹۸۰ء میں انصاری ویلفیر سوسائٹی قائم کی، "انصاری مرکز" کے نام سے ایک اخبار کا اجرا بھی کیا جو برادری کے نوجوانوں کے نئے وقت کی پکار تھا لیکن یہ نعرہ گونجا نہیں اور خاموش ہو گیا ورنہ برادری کے طلبہ و طالبات کی رہنمائی، او۔بی۔سی کا مسئلہ اور دیگر تعلیمی امور سے کماحقہ واقفیت ہوتی رہتی۔ اس جوان طبقہ کو مدنپورہ کے ممتاز افراد مثلاً محمد امین انصاری میونسپل کاؤنسلر، الحاج غنی الفلس والے، محمد ابراہیم رجب وغیرہ کی رہنمائی حاصل ہے۔

نور محمد انصاری اس علاقے کے بڑے پرانے سماجی درکردہ چکے ہیں۔

زمرۂ اساتذہ میں بھی برادری کے سینکڑوں افراد ہیں جنہوں نے میونسپل اور پرائیویٹ اسکولوں میں درس و تدریس کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔

گریجویٹ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بھی کمی نہیں کچھ خلیج کے ملکوں میں مقیم ہیں، ہارون رشید انصاری (دہنپورہ) (ایم اے بی ایڈ) بڑے اچھے قلمکار ہیں صحافت سے بھی دلچسپی ہے اور خلیق و ملنسار انصاری ہیں، ان کے بھائی منیر انصاری اور ظہیر انصاری فٹ بال کے کھلاڑی ہیں، غلام حسین انصاری کاتب کے صاحبزادے زاہد انصاری بھیونڈی میں پڑھاتے ہیں فٹ بال اور اسپورٹس میں اپنے کالج میں بڑا نام کمایا۔ فٹ بال کے بین الاقوامی شہرت کے حامل کھلاڑیوں کا تذکرہ آگے آرہا ہے

اسی علاقہ میں انجمن مفید المسلمین کے صدر ابراہیم رجب بڑے حوصلہ مند شخص ہیں، انجمن کی ایک شاخ میرا روڈ میں بھی قائم ہے جہاں وہ قوم کے لئے ایک فلاحی ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

محمد حسن انصاری مدنپورہ کے پہلے آرکیٹکٹ ہیں جنہوں نے کانٹی نینٹل اسٹائل کی عمارتوں کی تعمیر اور " درون خانہ آراستگی " (انٹیریر ڈیکوریشن) میں بڑا نام کمایا ہے اپنے والد مرحوم محمد اسماعیل مقادم کی طرح جذبۂ جود و سخا سے معمور ہیں حالیہ فسادات میں دہیسر سے لے کر دھاراوی تک کے فساد زدگان کی انہوں نے دامے درمے سخنے اور قدمے بھی مدد کی۔ دو لڑکے منصور احمد اور تنویر احمد انجینیرنگ کورس میں زیر تعلیم ہیں محمد حسن انصاری مشہور رہنما مقادم محمد اسماعیل کے صاحبزادے ہیں۔ دکن کی مومن برادری جو عہد بہمنی اور سلاطین دکن میں بس گئی تھی طرز معاشرت اور تہذیبی و ثقافتی اثرات کے سبب اپنا آبائی پیشہ ہی نہیں حسب و نسب ہی بھول بیٹھے ہیں، چرخا نامہ اور دیگر متعلقہ نظمیں ان کے ماضی سے حال کا تانا بانا جوڑ دیتی ہیں، ستارا، کولہاپور، میرج، سانگلی، گلبرگہ اور جنوبی ہند کے مختلف شہروں میں صرف ان کی مومن عرفیت باقیات میں سے رہ گئی ہے۔

موسیٰ معظیم الدین مومن (جی۔ ڈی۔ آرکیٹکٹ۔ اے آئی آئی ٹی) ستارا سے نقل وطن کر کے بمبئی میں آکر آباد ہو گئے ہیں، آپ ایک نامور ماہر تعمیرات اور شہری منصوبہ آبادکاری کے صلاح کار ہیں، اہلحدیث مسلک کے تعلق سے اصلاح المساجد کے زیر اہتمام ہندوستان بھر میں تعمیر نو، مرمت اور تجدید کاری کا جو سلسلہ چل رہا ہے آپ اس سے متعلق ہیں اور اپنے فن تعمیر کے کئی شاہکار اور

نمونے وجود میں لائے ہیں۔

دینی علوم اور عربی زبان کی نشر و اشاعت میں مولانا مختار احمد ندوی کا تحقیقاتی ادارہ دار السلفیہ بیحد مفید کام انجام دے رہا ہے، آپ کے صاحبزادے اسلم مختار انصاری مشہور بھاودے پریس کے طابع و مالک ہیں، دینی کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ دار المعارف میں موجود رہتا ہے کتب فروشی کا یہ ادارہ اکرم مختار انصاری کے زیر نگرانی ہے آپ نے جامعۃ الاسلامیہ مدینہ منورہ کے فارغ ہیں آپ کے چھوٹے بھائی ارشد مختار "البلاغ" ماہنامہ کے مدیر التحریر ہیں۔

بمبئی کے انصاری حضرات میں بہت سارے مدبرین حکومت ہند کے محکموں اور وزارتوں میں ملازم رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں عبدالرحیم انصاری ہندوستانی سفارت خانے سے متعلق تھے، امریکہ اور انگلستان میں بھی ہمارے افراد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ یونیسکو میں بھی انصاری حضرات رہ کر بین الاقوامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

انصاری خواتین نے اشاعت تعلیم میں بڑے شاندار کارنامے انجام دئے ہیں، میونسپل اسکولوں اور گرلز اسکولوں کی معلمات میں ایک بڑی تعداد برادری کی خواتین کی ہے۔ مدنپورہ کے مشہور سیاسی رہنما باب اللہ غازی کی صاحبزادی جنت النساء سرسوتی اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ کھنڈے کی باڑی میں طاہرہ انصاری جو اب مسز قریشی ہیں اور بھیونڈی میں رئیس ہائی اسکول گرلز سیکشن کی پرنسپل ہیں اس سے پہلے انجمن خیر الاسلام اردو اسکول دکر دلی میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔

پروفیسر عابدہ خورشتر (ولادت ۱۹۴۴) ایک تعلیمی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کی والدہ خاتون بی اور خالہ بابرہ بی معلمات تھیں، والد منشی حمید اللہ اردو فارسی اور گجراتی زبانوں پر بڑی قدرت رکھتے تھے، پروفیسر عابدہ خورشتر نے صوفیہ کالج سے بی۔ اے کیا، سینٹ زیویرس انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن سے ڈپلوما حاصل کیا، ملیگڑھ سے بی۔ ایڈ کیا، بمبئی یونیورسٹی سے عربی زبان اور بعد علوم اسلامی میں ایم۔ اے کیا، آپ کا ایم۔ ایڈ کا مقالہ "انجمن اسلام کا پرائمری ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے فروغ میں حصہ" بڑا پر مغز اور پر از معلومات اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدنپورہ کی برادری کا اس انجمن کی ترقی میں کتنا بڑا حصہ ہے۔

کامریڈ ابوبکر بخشی کی صاحبزادی شہناز بخشی نے فارسی میں ایم اے اور پھر بی ایڈ کیا اور اب اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ کرلا کی شہناز بیگم نے ایم۔ اے فارسی میں گولڈ میڈل حاصل

کیا تھا۔

اسی محلہ کی زہرہ سردار جو ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ گئی ہیں برادری کی اولین خاتون ہیں جو غیر ممالک کی درسگاہوں میں تعلیم دیتی رہیں، فی الحال لندن میں ہیں۔ مگر موجودہ تعلیم یافتہ خواتین میں فوزیہ نہال احمد انصاری پہلی خاتون ہیں جنہوں نے بمبئی یونیورسٹی سے ہندی میں ایم۔ فل کیا ہے۔ فوزیہ انصاری مؤ ناتھ بھنجن میں ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئیں، چار سال کی عمر میں کلام پاک کا ناظرہ ختم کیا، پڑھائی سے ہمیشہ سے دلچسپی رہی۔ لیکن معاشرتی پابندیاں عناں گیر رہیں، ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں کامیاب کرنے کے بعد صوفیہ کالج بمبئی سے فرسٹ کلاس میں بی۔ اے کیا اور یونیورسٹی کے کامیاب طلب و طالبات میں تیسری پوزیشن حاصل ہوئی۔ ایم۔ اے۔ بی ایڈ کرنے کے بعد اب ۱۹۸۵ء سے کاسموپولیٹن کالج میں ہندی کی لیکچرر ہیں۔ تعلیم نسواں سے آپ کے خیالات اور ارادے بڑے بلند ہیں۔

مشہور کامریڈ محمد صدیق انصاری کی صاحبزادی ڈاکٹر عفت انصاری اور ان کے شوہر ڈاکٹر شکیل انصاری علاقے کی معروف ہستیاں ہیں، ڈاکٹر شکیل اہل حدیث کے طبی شعبہ تشخیص امراض (پیتھولوجی) کے نگراں ہیں اور بڑی سرگرمی سے مریضوں کی خدمت کرتے ہیں۔

عبد الجلیل انصاری جو قطر قونصل میں ملازم ہیں۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے سند فراغت لے کر آئے ہیں۔ عامل بالحدیث ہیں۔

مدنپورہ علاقہ میں 'حلقۂ احباب' ایک فعال سماجی ادارہ ہے۔ اس سے متعلق بڑے سرگرم سماجی خدام ہیں جن میں مولانا نذیر انصاری (ادیبگاہ)، فتح محمد انصاری اور شیخین انصاری (چھوٹی مسجد) وغیرہ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔ فتح محمد انصاری ایک اچھے مقرر بھی ہیں۔

برادری میں بی۔ اے، بی۔ ایس سی، بی۔ ایڈ اور ایم۔ اے ڈگری ہولڈروں کی ایک بڑی تعداد مدنپورہ اور اطراف کی بستیوں میں موجود ہے جن کا ذکر قدرے طوالت ہے۔

مدنپورہ کے شعیب انصاری نے کمپیوٹر سائنس میں انجینیرنگ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کی کمپنی انہیں ایک ماہر کمپیوٹر انجینیر کی حیثیت سے پیرس، آسٹریلیا، بنکاک، یوروپ کے دیگر ممالک میں نامزد کرتی رہتی ہے۔ آپ ایک سنجیدہ مہذب اور خاموش مزاج نوجوان ہیں۔

مدنپورہ کے علاوہ کُرلا میں بھی برادری کی بڑی تعداد غدر کے زمانے سے آباد ہے۔ اس میں بڑے ممتاز خاندان تھے آج ان کی نسلیں پروان چڑھ گئی ہیں ان میں بڑے ممتاز افراد پیدا ہوئے ہیں ان میں، اساتذہ، تعلیم یافتہ، ڈاکٹرس اور وکلا رہیں، شعرائے کرام بھی موجود ہیں۔ مساۃ امین وکیل رحلت کر گئے۔ شکیل احمد انصاری کامیاب وکیل ہیں، فیت والا خاندان کی علمی و ادبی میراث کے محافظ اسحٰق ابراہیم فیت والا ڈیم۔ اے اور ان کے بھائی اسمٰعیل ہیں۔

بمبئی کی برادری کی ورزشی اور کھیل کود کی روایات

انصاریوں کا سو پشت سے پیشہ آبا سپہ گری تو نہ تھا، ذریعۂ عزت تو جہاد اور حریت کی جد و جہد تھی۔ زیادہ تر دیش کے میدانی علاقے کے رہنے والے تھے اسی لئے میدانوں سے علاقہ مند تھے جہاں ان کے تانے بانوں کا 'مانجا' چلتا تھا اور فرصت کے اوقات میں یہ کھیل کود کرتے تھے، کسی بھی قسم کے کھیل کا تصور آج سے ڈیڑھ سو برس قبل کی برادری کے متعلق کرنا تخییل کی کرشمہ سازی ہوگی۔ دوڑ، بنوٹ، شمشیر بازی، پٹا بازی اور کُشتی کا شوق عام تھا، کامٹی، مدنپورہ اور مومن پورہ بمبئی میں جوانوں کا پسندیدہ کھیل فٹ بال تو یہاں کی روایت بن گئی تھی۔

بمبئی میں مدنپورہ کے سدتے مومن میدان میں حاجی باب اللہ غازی نے ایک اکھاڑے کی بنیاد ڈالی تھی۔ یہ خود فن کشتی اور بنوٹ، لکڑی گھمانے کے فن کے ماہر تھے، تندرست و سڈول [illegible] تھے، [illegible] میں آپ کے ڈھیر سارے شاگرد تھے، [illegible] [illegible] سلیم، [illegible] اور [illegible] جب کبھی کُشتی کے مقابلے [illegible] بمبئی [illegible] کے [illegible] میں ورزش کیا کرتے تھے اور [illegible] ایک [illegible] تھے اور ان سے اجازت لے کر میدان میں آتے تھے۔ جنرل [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے دلچسپی [illegible]

بحقدار رسید کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں، ہمت افزائی بھی ہوتی ہے اور خود ادارہ اپنا
وقار قائم کر لیتا ہے، ینگ بوائز کے مشہور کھلاڑیوں کو ایسے سنہری موقع ملتے رہے مگر ٹیم کی
صفوں میں انتشار پھیلتا گیا، محمد طاہر انصاری اسٹیٹ بنک میں ملازم ہو گئے لیکن اپنی ٹیم
کی کوچنگ کرتے رہے۔

۱۹۷۷ء میں ینگ بوائز کا الحاق مومن پورہ اسپورٹس کلب سے ہو گیا، اسماعیل شعلے
کچھ دنوں صدر رہے، پھر عبد اللہ ناصر صدارت پر فائز ہوئے اور کچھ عرصے تک ان کے صاحبزادے
رشید ناصر بھی ان کے جانشین بنے رہے، عبد الستار نائب صدر رہے اور نور دار عبد الخالق
نائب سیکریٹری تھے حاجی علی جی خازن کا عہدہ سنبھالے رہے۔ اسحٰق تاجر اور زکریا بابا مجلس
منتظمہ کے نامزد ممبر تھے، پہلی زمانوں میں محلے کے سربرآوردہ حضرات پیش پیش رہتے تھے
مثلاً امین بابا، صدیق حبیب اور کونسلر نور محمد انصاری، عبد الواحد کئی مجلس منتظمہ کے سیکریٹری
رہے اور انہیں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ ینگ بوائز انتشار، گروپ بندی اور سیاست
کا شکار نہیں ہوئی اور جب ایسے ناگزیر حالات پیدا ہوئے تو عبد الواحد نے اسپورٹسمین
اسپرٹ" یعنی نیک کھلاڑی کے جذبۂ معقولیت پسندی سے کام لے کر خوش طبعی کا
مظاہرہ کیا، ان کی خدمات بہر حال فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

نئی نسل کے نوجوان کھلاڑیوں میں جونیئر اور سینیئر نیشنل کھلاڑی ہونے کا اعزاز غالباً ہر
ڈیڈ کو حاصل ہے۔ عقیل احمد (کامریڈ مقصود انصاری کے صاحبزادے) اور ان کے بھائی جمیل
احمد نے ملک سے باہر بھی اپنے فن کا حسن و خوبی مظاہرہ کیا ہے، یوسف انصاری کو قومی کھلاڑی
ہونے کا اعزاز ملا جنہیں ہندوستانی ٹیم کی قیادت کرنے کا شرف بھی ملا ہے۔ ان کے بھائی
نعیم انصاری جونیئر اور سینیئر نیشنل کھلاڑی بن گئے ہیں۔ اختر حسین، پیر محمد انصاری، محمد صغیر
انصاری، [illegible] انصاری، فرید محمد انصاری، ایاز انصاری اور عاقل محمد امین انصاری جونیئر
نیشنل کھلاڑیوں نے بمبئی یونیورسٹی کی نمائندگی کی ہے، ریاض الدین نظام الدین (انجم)
انصاری یونیورسٹی ٹیم کے ساتھ اگرتلہ کے نیشنل مقابلے میں شریک تھے۔ کامل محمد امین انصاری
(امین بابا)، صدیق انصاری، حامد انصاری، ایاز انصاری، سلیم انصاری، ظہیر انصاری
اور اختر انصاری کو جونیئر نیشنل کھلاڑی ہونے کا اعزاز و شرف حاصل ہے، منیر بشیر
انصاری، ظہیر بشیر انصاری اور زاہد غلام حسین (کاتب) انصاری بھی فٹ بال کے اچھے

کھلاڑی تھے۔ ان کے علاوہ بہت سارے کھلاڑی جو مختلف بنکوں اور کمپنیوں سے وابستہ ہیں اور ان کی طرف سے کھیلتے ہیں ان میں منتخب احمد اسماعیل انصاری (موہن پورہ)، صابر انصاری۔ سعید احمد انصاری (شاہ محمد ناظر کے داماد) کے نام آتے ہیں۔

تربیت دینے والے "کوچ" حضرات میں حسین کے علاوہ برادری سے خیر النساء (داماد عبد ستار ناصر) اور لطیف کیپٹن (مدنپورہ) وغیرہ کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں۔

ہمارے نامور کھلاڑی

انصاری محمد حسین فیض محمد

فٹ بال کھیل کی باقاعدہ اور رسمی ابتدا روبی۔ یم۔ سی۔ اے گراؤنڈ سے ہوئی یہی اب محمد حسین فیض محمد انصاری (فٹ بال کوچ) کی شاندار خدمات کی یادگار ہیں انہیں ... م سے محمد حسین میموریل پلے گراؤنڈ کہلاتا ہے۔ محمد حسین نے انجمن اسلام احمد سیلر ہائی اسکول سے ایس۔ ایس۔ سی پاس کیا انہوں نے فرسٹ کلاس فٹ بال کھیلنے کی ابتدا رشید الیون سے کی ... برسوں تک اسی ڈویژن میں کھیلتے رہے۔ فٹ بال کھیل میں مہارت حاصل کرنے کے بعد مدنپورہ کے نوجوانوں میں اس کھیل میں بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر آپ نے پٹیالہ سے فٹ بال کوچنگ کورس ... سی۔ آئی پاس کیا اور اسطرح ایک باقاعدہ تربیت یافتہ اور باوصف فٹ بال کے کوچ بن گئے۔ اور کوچنگ کی باقاعدہ ابتدا انڈین جونیئر فٹ بال ٹیم سے کی جس نے ورلڈ جونیئر فٹ بال ٹورنامنٹ کوالالمپور (ملائشیا) میں حصہ لیا تھا آپ اس کے کوچ مقرر ہوئے تھے ا ... ٹیم نے کھیل کا شاندار مظاہرہ کیا تھا۔ بمبئی کی مفت لال گروپ ٹیم کے کوچ بنے اور ... سپورٹس کلب کی فٹ بال ٹیم کے کوچ مقرر ہوئے۔ محمد حسین کوچ کھیل کے ... تجربہ کھلاڑی ... اور استاد تھے۔ تنظیم اور مستقل مزاج، استقامت اور جدوجہد ... کے زیر تربیت ... میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ انہوں نے مشہور ٹیموں کو کوچ کیا جن میں محمڈن سپورٹنگ ایسٹ بنگال اور موہن بگان کلکتہ کی ٹیمیں شامل ہیں۔ ان تینوں مور ٹیموں نے آل انڈیا ... ڈورس کپ جیتا ہے۔

انصاری محمد ابراہیم شاہ محمد (ولادت ۶ جولائی ۱۹۲۱ء)

بمبئی میں پیدا ہوئے والد مرحوم میونسپل اسکول کے ٹیچر تھے۔ محلہ کے داؤدی ۔ایم۔سی۔اے گراؤنڈ سے فٹ بال کھیلنے کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۵ء تک فرسٹ کلاس فٹ بال بمبئی مسلم (ٹیم) کی طرف سے اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ بڑے اچھے اتھلیٹکس (یعنی مجموعی کھیلوں کے ماہر کھلاڑی) رہے تھے، اور فٹ بال کے ساتھ اس شعبہ میں بھی کوچنگ کا کورس کیا اور اعزازی کوچ اور استاد کی حیثیت سے انجمن اسلام ہائی اسکول کی فٹ بال اور اتھلیٹکس ٹیموں کو کوچ کرتے رہے۔ انصاری محمد ابراہیم اپنے وقت کے باسکٹ بال، والی بال اور ہاکی کے زبردست کھلاڑی رہ چکے ہیں گویا ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا۔ کھیلوں کی تنظیم کے بڑے اچھے ناظم اور نگراں ہیں اور آج بھی فعال اور سرگرم رہتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء تا ۱۹۸۲ء انجمن اسلام اکبر پیر بھائی کالج کے اسپورٹس ڈائرکٹر رہے ان کے زمانہ میں کالج ٹیم نے ہاکی میں چیمپین شپ جیتی اور فٹ بال میں ٹورنامنٹ کی سطح پر آئی، اتھلیٹکس میں جونیر کالج ٹیم نے لگاتار تین سال تک چیمپین شپ جیتی ۱۹۸۲ء کے ایشیاڈ دہلی میں بطور فٹ بال آفیسر شامل ہوئے تین سال تک انٹر مسلم اسکول اتھلیٹکس میں چیمپین رہے اور یہ فخر آپ کو ہی حاصل ہے [illegible] اسی مدت تین سال تک لگاتار بمبئی میں پینٹاگولر فٹ بال ٹورنامنٹ میں مسلم ٹیموں کی نمائندگی کی۔ انصاری شاہ محمد بحیثیت مخلص، نیک خو اور دیندار شخص ہیں۔

[illegible]قیل احمد سراج احمد انصاری (ولادت ۲ جون ۱۹۶۲ء)

[illegible] بمبئی میں پیدا ہوئے اور کمسنی ہی میں عظیم کھلاڑی بن کر شہرت [illegible] ٹیم کی طرف سے محمد حسین میموریل شیلڈ گراؤنڈ (داؤدی ایم [illegible] اسلام سے ایس۔ ایس۔ سی کیا۔ [illegible] کلب سے [illegible] ترقی کر کے ہندوستان گیر مشہور ٹیموں جیسے محمڈن اسپورٹنگ [illegible] کی نمائندگی کی۔ فی الحال ایسٹ بنگال کے لئے کھیل رہے [illegible] بال ٹورنامنٹ میں ملک کے کپتان کی حیثیت سے نمائندگی [illegible] چیمپین شپ کی نمائندگی کی دی ہے۔ تین سال تک آپ نے

۹۳-۱۹۹۲ء میں عقیل احمد انصاری نے پری اولمپک ٹورنامنٹ میں مہاراشٹر ٹیم کی نمائندگی کی۔ لبنان اور کوریا میں شامل ہو کر اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اسی سال ہندستانی ٹیم کی جو اکیس سال کی عمر کے کھلاڑیوں پر مشتمل تھی آپ نے نمائندگی کی۔ فی الحال وہ ایسٹ بنگال کلکتہ کے لیے کھیل رہے ہیں۔

انصاری محمد یوسف محمد یعقوب

آبائی وطن گونڈہ ہے بمبئی کی پیدائش ہے انجمن خیر الاسلام مدنپورہ سے ایس۔ ایس۔ سی کیا۔ محمد حسین میموریل کے گراؤنڈ پر کھیلتے رہے۔ بہترین گول کیپر ہیں اور اسی وصف کی بنا پر مہاراشٹر اسٹیٹ کے کیپٹن کی حیثیت سے نیشنل چیمپئن شپ میں نمائندگی کی۔ [illegible] ٹیم سے فرسٹ کلاس فٹ بال کھلاڑی بن کر ابھرے۔ جدازاں اور کے مزید [illegible] میں کھیلتے رہے فی الحال ایئر انڈیا کے لیے کھیل رہے ہیں۔ ۹۳-۱۹۹۲ء میں ہندستانی ٹیم میں شامل [illegible] بہترین گول کیپر ہونے کا فخر حاصل کیا اسی طرح اپنے شاندار کھیلوں [illegible] اوپن ٹ بال [illegible] پری ورلڈ کپ فٹ بال میں کرتے رہے۔

انصاری خادم حسین

بمبئی میں پیدا ہوئے انجمن اسلام احمد سیلر ہائی اسکول میں تعلیم پائی اور سب سے پہلے [illegible] نیشنل چیمپئن شپ میں مہاراشٹر کی نمائندگی کی۔ فٹ بال کھیل کے کوچ کا کورس بھی کیا ہے۔ اور ٹاٹا سے وابستہ ہیں اور فرسٹ کلاس فٹ بال کھیلوں میں نمائندگی کرتے ہیں۔ آپ انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے کیپٹن کی حیثیت سے آل انڈیا اسکولز فٹ بال ٹورنامنٹ میں کھیل چکے ہیں ٹورنامنٹ کی کامیاب ٹیموں اور کھلاڑیوں کو ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق [illegible] جمہوریۂ ہند) کے ہاتھوں انعامات دیے گئے تھے۔

انصاری عزیز الرحمٰن

بمبئی کے ہیں اور انجمن اسلام احمد سیلر ہائی اسکول سے تعلیم حاصل کی اور ویسٹرن ریلوے کی فرسٹ کلاس ڈویژن ٹیم کی طرف سے کھیلتے ہیں اور بہترین "اسکورر" ہیں۔ نیشنل

چیمپین شپ میں آل انڈیا ریویز ٹیم کی نمائندگی کی۔ بیحد ملنسار اور مخلص جوان ہیں اور اسلامی ذہن رکھتے ہیں اور دیندار شخص ہیں۔

مومن پورہ اور مدنپورہ کی ممتاز ٹیمیں اور کھلاڑی حضرات

ینگ بوائز اور فٹبال کلب کو بمبئی کے وسطی علاقہ مومن پورہ کی قدیم ترین فٹبال ٹیمیں ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ فٹ بال ٹیم کے بنیادی کھلاڑی محمد ابراہیم محمد سلیم انصاری نے مومن پورہ کی "ابراہیم الیون" ٹیم کی تشکیل کی اسے ینگ بوائز اور پھر مومن پورہ اسپورٹس میں ضم کر دیا گیا، ینگ لیبرز ویلفیر اور بمبئی مسلمز بھی قدیم ترین فٹبال ٹیموں میں بڑی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن یا تو بعد میں یہ ٹیمیں طویل عرصے کے لئے کھیل کے میدان سے غائب رہیں یا پھر ان کے حوصلوں اور ولولوں کی کمندیں کمزور پڑ گئی تھیں اس کے برخلاف ینگ بوائز کامیابیوں کی جلو میں پیش رفتی کرتی گئی اور اپنے وجود کا شدید احساس دلاتی رہی۔ اور نوجوان کھلاڑیوں کی تربیت کر کے انہیں اس قابل بناتی رہی کہ مشہور فرمیں اور کمپنیاں ایسے ماہر کھلاڑیوں کی متلاشی رہنے لگیں، اس میں کھلاڑیوں کی خداداد ورزشی صلاحیتوں کے ساتھ پوری ٹیم کی مجموعی تنظیم و تربیت اور کوچ کی جانفشانی اور لگن و دور [illegible] رہتا ہے جس کی عقابی نظریں ان شاہین بچوں کو پرکھ لیتی ہیں کہ ان میں کون ہے جو قصر سلطانی کے گنبد پر نشیمن بنائیگا اور کون ہے جو سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بسیرا کریگا۔ کلب کے استحکام و استقامت اور کارکردگی کا انحصار ہر اس فرد کی صلاحیت، ذہانت اور محنت پر ہوتا ہے جس میں اسپورٹسمین اسپرٹ اور ٹیم ورک کا جذبہ موجود رہتا ہے [illegible] ینگ بوائز [illegible] اسپورٹس کلب، بمبئی مسلمز اور ٹیپو سلطان کے کھلاڑی [illegible] کے علاوہ بیرونی ملک تک قائم رہی ہے، بمبئی کے فٹ بال [illegible] بڑی تقویت یہاں کی بڑی کمپنیوں اور بینکوں کی سرپرستی سے ملتی ہے [illegible] کرتی رہی ہے۔ ینگ بوائز نے بمبئی کے علاوہ بھی ریاست [illegible] میں نام پیدا کیا ہے۔ بینک آف بڑودہ کے کھلاڑی صغیر احمد اور اسٹیٹ [illegible] ہیں۔

[illegible] بھی اور [illegible] نے [illegible] پر نقوش [illegible] سے انداز ہوتا ہے [illegible] برادری

کے جوان کھلاڑیوں نے ہی اپنی محنت اور شاندار مظاہروں سے فٹ بال اور دیگر کھیلوں کو وہ ترقی اور شہرت عطا کی ہے جس کی مثال صرف کلکتہ اور کامٹی کے کھلاڑیوں میں ملتی ہے۔ انصاری عبدالحمید (اڑچا) اسی ینگ برائز کی ایک کھوج تھے اور اپنی مثال آپ تھے ان کی فٹ بال کھیل کی ٹیکنیک یا داؤ پیچ کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ آپ نے ٹاپ اسکورر بننے کا اعزاز حاصل کیا ۱۹۸۷ء میں انہوں نے ینگ برائز کی نمائندگی کرتے ہوئے بمبئی ڈسٹرکٹ لیگ چیمپین شپ میں سب سے زیادہ گول بنانے کا ریکارڈ قائم کیا تھا جو آج تک برقرار ہے۔

انصاری کھلاڑیوں کی فہرست ہر سال "تازہ بہ تازہ نو بہ نو" شہسواروں سے اک فوج کی مثال بنتی جا رہی ہے۔ کچھ کھلاڑی "یادِ رفتگاں" کے دھندلکے میں ڈوبتے جا رہے ہیں اور بہت سارے ایسے ہیں جو اُفقِ شہرت پر نمودار ہو کر تابندگی دکھلا رہے ہیں۔ انصاری عبدالحمید محمد یعقوب، انصاری عبدالرشید عبداللطیف، انصاری عبدالرشید محمد شفیع، انصاری عارف عبدالرشید عبداللطیف، یوسف جمال عبدالحمید انصاری اور توصیف جمال عبدالحمید انصاری فٹ بال کے میدان کے یکہ تاز کھلاڑیوں میں بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اور انہیں نیشنل کھلاڑی ہونے کا اعزاز و شرف حاصل ہے۔ عارف عبدالرشید موہن بگان کلکتہ کی ٹیم کے کھلاڑی ہیں۔

توصیف جمال:

توصیف جمال کے حسین و جمیل کھیل کے مظاہرے کی توصیف تعریف کی طلبگار ہے۔ بچپن ہی سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گل گلستانِ من بہار مرا۔ ۱۹۸۶ء میں انہوں نے ایک جونیئر کھلاڑی کی حیثیت سے ینگ برائز کی نمائندگی کی۔ جو اس وقت بمبئی ڈسٹرکٹ فٹبال کے ڈھانچے میں فرسٹ ڈویژن کا منصب رکھتی تھی، لیگ میچوں اور ناک آؤٹ ٹورنامنٹوں میں ان کی یادگار کارکردگی اور عظیم الشان مظاہرے فٹبال کے شیدائیوں کا دل موہ لیتے تھے۔ ٹیم کے ہم اسکور حاصل کرنے والے کھلاڑی بن کر ابھرے۔ نیشنل ٹورنامنٹ میں توصیف جمال نے اپنے کھیل کا شاندار جلوہ دکھلایا تو ٹاٹا فٹبال اکاڈمی کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں اور ان کی نظروں میں یہ سما گئے اور اس طرح ٹی ایف اے کے منظورِ نظر بن گئے۔ زیرِ تربیت

ناروے، فرانس اور ڈنمارک جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں انہیں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا جن میں اس ماہر اور ہونہار کھلاڑی نے مقابل ٹیموں کو یہ بتلا دیا کہ ہنر بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے سنہ ۱۹۹۰ء میں ٹاٹا فٹبال اکاڈیمی نے انگلستان کا دورہ کیا ان میچوں میں بھی توصیف اقبال کا کمال عروج پر رہا انہوں نے ۱۱۲ ابسم گول داغے۔ ان کے شاندار مظاہرے ان کے روشن اور تابناک مستقبل کی ضمانت ہیں۔

ادبی روایات اور انصاری شعرا کرام

اردو کی تخم ریزی شمالی ہند میں ہوئی، امیر خسرو کی ہندوی سے لے کر جان صاحب کی ریختی، سلاطینِ دکن کی دکھنی اردو اور مغربی ہند کی گوجری غرضیکہ ہر طرز کا لسانی جامہ پہن کر اردو زبان جب جزیرۂ بمبئی پہنچی تو اس کے قدردانوں کا وہی عالم تھا فرق صرف اتنا تھا کہ شمالی ہند کی ٹکسالی زبان بولنے والے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کی سند دکھا کر یہاں کی مروجہ بولی کو "بمبیا اردو" کہتے تھے۔

پندرھویں صدی کے دوسرے نصف میں جب سلاطینِ دکن کے مختلف ادوار میں دابھول (مصطفیٰ آباد) اور چیول (صیمور) کی بندرگاہوں پر ایرانی مہاجرین لنگر انداز ہونے لگے تو فارسی زبان کانوں میں حلاوت گھولنے لگی۔ یہاں کی مہاراشٹری پراکرت میں فارسی [illegible] ہونے لگی اور دلی اور دکن کی ترقی یافتہ اردو کے خمیر سے ایک لسانی ڈھانچہ تیار [illegible] دکھنی اردو کی شکل میں رائج ہوگئی۔ یہی بمبئی کی زبان تھی اور اولین تحریری [illegible] میں دکھنی اردو کا اثر غالب رہا۔ تلفظات اور لہجہ میں بھی امتیازی فرق [illegible] حضرات جن کے خاندانوں کی کئی پیڑھیاں بمبئی، بھیونڈی، [illegible] گاؤں [illegible] (مجمع) اور 'ق' کا تلفظ برابر ادا نہ کرسکتے تھے اسی لیے بمبئی [illegible] بخاری (بخاری)، ساپھئی (شافعی) تلفظات کا [illegible] (بجھ [illegible]) اور قرشت کو 'ٹ' کی جگہ رعایت دیتے تھے، سرک [illegible] میں یہ لفظی استقامت نظر آتے، کوکنی مصنفین کی بعض

شعری تخلیقات "مجالس" کے عنوان سے مثنوی صنف سخن میں تھیں، قاسم نہری نے جو راے گڑھ کے مہاڑ تعلقہ کے مشہور علمی خانوادے "نہری" کے جدِّ اعلیٰ تھے، سیرۃ النبویؐ پر "مرد س المجالس" (۱۲۰۹/۹۴-۱۷۹۴) لکھی جو اب تک منظرِ عام پر آنے والی اولین تخلیقات میں سے ہے جہاں سے بمبئی کی اردو ادب کی تاریخ شروع ہوتی ہے، نہری خاندان کا اردو کے نثری ادب میں بڑا وافر حصّہ ہے۔"

غزل گوئی ہمیشہ سے سب سے مقبول صنفِ سخن رہی ہے اس کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ اس میں روایت کی پابندی نہایت آسان ہے غزل اکثر ایک ہی گنبد کی صدا کی طرح سنائی دیتی ہے، بمبئی کی ادبی فضا میں سب سے پہلے علیم اللہ غزل گو کی آواز اُبھری اس کی صدائے بازگشت تبسم شریف، دلکش سلیمی اور نصرت کے کلام میں سنائی دیتی ہے، نہ کوئی نیا لہجہ ہے اور نہ کوئی نئی آواز۔ خیالات کی زمین جب بنجر بن جاتی ہے تو اس سنگلاخ زمین میں نہ قافیے بوئے جاسکتے ہیں اور نہ ردیف اُگائے جاسکتے ہیں، اور واردات بھی شعری حیثیت کو اثر انداز نہ کرسکے تو غزل گویا ہے گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے' بن جاتی ہے۔ اس آئینے میں سارے چہرے ایک جیسے لگتے ہیں۔ ان اولین شعرا میں سے کتنے انفرادی تھے ان کی شناخت مشکل ہے۔

بمبئی میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مطابع، اخبارات، رسائل و گلدستوں کا بڑا حصہ ہے۔ گلدستے غالباً بمبئی کے گلستانِ ادب کی گُلکاری ہے، بڑی ندرت کا حامل ہے یہ ایک طرح سے مطبوعہ طرحی مشاعرہ تھا، ہر ماہ ایک مصرعۂ طرح گلدستے میں اعلان کیا جاتا جس پر شعرائے کرام طبع آزمائی کرکے اپنی 'غزل' کا تحفہ گلفروش کو بھیجتے [illegible] کمیٹی ان غزلوں کا انتخاب کرتی، منتخب شدہ غزلیں شائع کردی جاتیں [illegible] اور مالیگاؤں کے سخنوران بھی اس "پھول والوں کی سیر" میں [illegible] کی ایجاد پسند طبیعت نے بمبئی گلدستوں کو رواج دیا، اس [illegible] مالیگاؤں بھی پیش پیش رہتے تھے۔ ان گلدستی مشاعروں [illegible] بھی ہوتے تھے۔

تحریکِ خلافت کے بعد اردو صحافت کو بمبئی میں بڑی تحریک ملی [illegible] سرگرمیاں تیز ہوگئیں، "خلافت" اخبار کو بڑے قد آور صحافیوں کی خدمات حاصل تھیں، عبدالحمید

انصاری تو ایک مدت تک اس کے "مدیر درونِ خانہ" بنے رہے، بدر جلالی، مولانا عبدالحمید نعمانی، مولانا محمد یوسف انصاری مبارک پوری (شکنہ بھیونڈی) اور رئیس احمد جعفری مسندِ خلافت پر جلوہ فگن رہے۔ حافظ علی بہادر خان کا اخبار ہلال، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال (کلکتہ) کے ہم وزن برابر نہ ہوا تھا پھر بھی "مہِ نخشب" کی طرح دستِ قضا سے محفوظ رہا، حامد الانصاری غازی جو پہلے مشہور اخبار مدینہ (بجنور) کی مجلس ادارت میں تیس ۳۰ سال رہے اور پھر الجمعیۃ کے مدیر تھے، جمعیۃ العلماء کے سیکریٹری کی حیثیت سے سیاسی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے، مولانا ابوالکلام کے والد مولوی خیرالدین بھی بمبئی میں آکر آباد ہو گئے تھے اور اکثر بھیونڈی آنا جانا ہوتا تھا، شعراء میں شمالی ہند کے تجمل حسین جلالپوری، میراں آبادی، نذیر انصاری، آرزو لکھنوی، محشر امروہوی اور ان کے علاوہ منشی فصاحت ماسٹر، غنی محمود آبادی، بابائے سخن نظر یگانوی، بابا فرید میٹھوری وغیرہ مشاعروں کی جان بن گئے۔

بمبئی کے مشاعرے

بمبئی کی صنعتی و تجارتی ترقی کے ساتھ شمالی ہند سے قسمت آزمائی کرنے والوں کا ایک سیلاب امڈ آیا، ان میں صاحب قلم بھی تھے اور اہل علم و ادب بھی جنہوں نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس عروس البلاد کی سرزمین کو نوازا اور اس کی مشاطگی کی۔ ڈپٹی نذیر احمد کو تو بمبئی پر تہذیب کا سایہ نظر آتا رہا لیکن مولوی عبدالحق کا تاثر کچھ اور تھا سہ تو شا بمبئی تجربہ اردو کا سایہ — مجھے جیسا سنتے تھے ویسا ہی پایا۔ شبلی نعمانی تو دل تھام لیتے تھے اور [illegible] بمبئی کی [illegible] متاع کہنہ و نو زاد کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے "ع" کنارِ آب، رچپاٹی، وگلگشت اپولو بندر [illegible] گرمی ہنگامہ بمبئی" دیکھ کر بڑے بڑے ہم وزن فلک سوداگر "نرگس مست" [illegible] اور سوالیاں مول لینے کے لیے آتے تھے "جلوہ تیز نگاہی بمبئی" دیکھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال بھی جنوں نواز بن گئے سہ

عالمِ جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے، دیوانہ بنوں یا نہ بنوں؟

— [illegible] شاگردی کی [illegible] استقبالیہ مشاعرے بھی ہوتے تھے اور شعر و سخن کی محفلیں سجتی تھیں۔ قدیم روایت کے مطابق ہر مشاعرہ میں بڑا تکلف برتا جاتا، شاعر کے آگے شمع دان، پیچوان، خاصدان اور اگالدان — کا سارا خاندانِ تکلفات حاضرِ خدمت

رہتا، کسی استاد کا دیوان کھولا جاتا، پہلی غزل کا مطلع مصرعہ طرحہ قرار دیا جاتا، پھر گھنٹہ بھر کی مہلت دی جاتی، وقتِ معینہ کے بعد شاعر کو اس کے تخلص سے ابجد کے حساب سے غزل سرائی کی دعوت دی جاتی۔

"اس وقت مشاعرے تہذیب و شائستگی کے دائرے اور علمی و ادبی پاکیزگی کی فضا میں منعقد ہوتے تھے۔ شعراء اپنی حرکات و سکنات، انداز کلام اور نشست و برخاست میں متانت اور انکساری کا ثبوت دیتے تھے اور سامعین ادب و احترام کے خیال سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے۔ اس وقت مشاعرے کی ایک ادبی اور تہذیبی حیثیت تھی....."

"بمبئی میں وہ بزمیں تھیں جو باقاعدہ مشاعرے منعقد کرتی تھیں بزم خیال اور بزم جیلانی، یہ دونوں بزمیں ماضی کی ادبی بزمیں تھیں ورنہ ایک شاید کو بمبئی میں یہ خوش بات نظر آئے گی کہ یہاں ہر گلی کوچے میں ایسے سائن بورڈ نظر آئیں گے۔ بزم صداقت، انجمن ترقی، انجمن انصار، حیدری وغیرہ ایسی سینکڑوں انجمنیں۔ در اصل یہ انجمنیں ایک مذہبی ضرورت کو پورا کرتی تھیں۔ لوگ یہاں اٹھتے بیٹھتے میلاد کی محفلیں منعقد ہوتیں، بچے قرآن پڑھتے، مذہبی تعلیم ہوتی، مرور زمانہ کے ساتھ ان انجمنوں کے کام کی نوعیت بدلتی گئی، شعر و..... مشاعرے عموماً ایسی ہی انجمنوں میں ہوتے، کبھی کسی ہال میں، باغ میں یا کسی کے گھر پر، عموماً طرحی مشاعرے ہوتے تھے، مصرعہ طرح کا اعلان پوسٹروں، اخبارات میں اعلامیے کی شکل میں ہو جاتا تھا، شعراء کے نام دعوت نامے بھی جاری کیے جاتے تھے"...... [1]

"مشاعرے کے آداب میں سے یہ بھی تھا کہ شاعر جب شعر پڑھتا تو دوسرے شعراء اور سامعین میں سے بعض باذوق برگ مصرعہ اٹھاتے، اچھے شعر پر "واہ واہ"، "ارشاد" اور "مکرر ارشاد" کی تحسینی آوازیں اٹھتیں۔ شاعر جھک جھک کر سلام کرتا، شعراء کے نام کا اعلان کیا جاتا اور مختصر تعارف پیش کیا جاتا۔ نظامت صدر مشاعرہ کی ذمہ داری تھی۔"

---

[1] بمبئی کے شاعر اور مشاعرے۔ لوگ بدل گئے وقت بدل گیا، محسن نصیری، مطبوعہ کراچی روزنامہ جنگ۔ دوشنبہ ۲۷ر نومبر ۱۹۷۸ء۔

بمبئی کا پہلا مشاعرہ ۱۸۷۸ء میں سلطان عبدالحمید اول کی جوبلی کی سنہری تقریب کے موقع پر منعقد ہوا تھا، مدنپورہ میں ۲ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو ایک بڑے دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا تھا جس میں خوش فکر اور خوشگو شعراء نے غزلیں سنائی تھیں، ڈیڑھ دو سو کا مجمع تھا، ۶ اکتوبر ۱۸۹۷ء کو جس دن اردو کے ایک نئے اخبار "مقبول عام" کا اجراء ہوا اس میں اس مشاعرہ کی روداد شائع ہوئی تھی اور دس بارہ شعراء کے کلام کا انتخاب بھی شامل تھا۔

۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی سخن کے زیر اہتمام مخدوم علی مہائمی کے عرس کے موقع پر بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا، ڈونگری میں شیخ مصری کی درگاہ پر ہر سال مشاعرہ اور محرم میں مسالمہ منعقد کیا جاتا تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بیرونی شعراء کی بمبئی میں آمد سے یہاں کی محفل سخن میں نئی جان پڑ گئی، بعض فلموں میں قسمت آزمائی کے لئے آ گئے تھے، مختلف اردو داں علاقوں میں انجمنیں اور ادارے قائم ہو گئے، مدنپورہ میں بزم خیال، بابا فرید سطوت اودی کے ارشد تلامذہ کی قائم کردہ بزم اردو، بابائے سخن نظر مالیگانوی کے مداحین کی تشکیل شدہ انجمن ترقی شعر و ادب ریاض ادب (عرب گلی) اور کمٹی پورہ میں بزم منیر الادب منیر الہ آبادی کے شاگردوں نے قائم کی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں اولین ادبی مجلس بزم خیال قائم ہوئی، اور ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔

بیرونی شعراء مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کئے جاتے جنہیں ارباب سخن نذرانہ پیش [illegible] تے تھے، بعض اس معاملہ میں پیشہ ور بن گئے تھے اور ادب میں بھی سوداگری کرنے لگے۔

[illegible] اردو کے متاخرین شعراء میں سے کوئی ہی بچا ہوگا جس نے "آشوبگاہ بمبئی" میں [illegible] اور بتان آذری اور دلبران شاہد و [illegible] کا نظارہ نہ کیا ہوگا۔ الطاف حسین [illegible] ۱۹۰۵ء میں ایک جلسہ میں شرکت کے سلسلہ میں بمبئی آئے۔ حسرت موہانی، جگر مرادآبادی [illegible] آبادی، نوح ناروی مشاعروں میں بلائے جاتے تھے، جناب [illegible] [illegible] آپ [illegible] لوگی عثمان گیر بھی [illegible] ۱۹۲۹ء میں [illegible]

[illegible]

[illegible] تربیت شدہ [illegible]

[illegible] یہاں رہ [illegible] صاحب سے [illegible] میں [illegible] رہے تھے۔ جناب [illegible]

پہنچے اور وہاں کی جامع مسجد ہمکیسر کے مسافر خانے میں قیام فرما ہوئے، امام جامع مسجد محبوب خان نے حق میزبانی ادا کیا۔ چند دنوں بعد تقریباً تین میل دور کیمپ میں جان ملکم صاحب سے گرجا گھر واقع کیمپ کے بنگلے میں ملاقات ہوئی۔ مرزا صاحب نے مالیگاؤں میں اکیس[۲۱] روز قیام فرمایا۔ آثار قدیمہ کے کاغذات میں مرزا کا بگڑا ہوا نام "دلی نواسی۔ ساول [ا احمد اللہ] خان اسد [اسد پہلے کا تخلص] مرقوم ہے۔

مرزا صاحب ہمکیسر میں ابراہیم خان روہیلہ کے بھی مہمان رہے، قلعہ کی سیر کی اور جان ملکم صاحب کے ساتھ چاندوڑ بھی گئے جہاں انگریزی سرکار کا دفتر تھا۔ شاید مرزا اسد اللہ خان [اسد] کے قدوم میمنت لزوم کی برکت ہے کہ ؎

"بزم مالیگاؤں" میں اشعار کا دفتر کھلا دیکھیو یہ در گنجینۂ گوہر کھلا

انصاری شعرائے بمبئی

اساتذہ عموماً فن شعر گوئی سے کما حقہ واقف ہوتے تھے، فن عروض، صنائع و بدائع، معاملہ بندی اور اصناف سخن کا گہرا علم رکھتے تھے اور زبان پر قدرت رکھتے تھے، لیکن چند شاعر ایسے بھی تھے جو بوالہوس کی طرح حسن پرستی شعار کئے بیٹھے تھے، بمبئی کے کہنہ مشق استاد بابا نظر مالیگاؤنوی اور بابا فرید احمد منھواردی جیسوں کے بھی استاد تجمل حسین جلالی پوری تھے جو اپنے عہد کے استاد الشعراء تسلیم کئے جاتے تھے، مدنپورہ میں برادری کے درمیان رہتے تھے۔ بابا نظر بھی یہیں رہتے تھے، تہمد (لنگی) کا کاروبار تھا، خود بھی لنگی، کرتا اور صدری میں رہتے تھے شانوں پر انگوچھا اور اسی سادگی کے ساتھ مشاعرے میں شریک ہوتے تھے اور نظروں کے مرکز اور تحسین کے لائق بن جاتے تھے، بابا فرید احمد بھی استاذ الشعراء کا درجہ رکھتے تھے، کلام صوفیانہ رنگ زیادہ معمور رہتا تھا۔ منصور فریدی انہیں کے صاحبزادے تھے، شاعری میں کمال حاصل کیا، حقیقتاً وہ غالب کے اس شعر کی تفسیر بن گئے ؎

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے

خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

---

[۲۱] ہفت روزہ ہوائی، ۲۰ اپریل ۱۹۶۹ء، ص ۶، ۲۵

مسطلی ہی میں غروب ہوگئے۔

منیرؔ الہ آبادی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے ان کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے، منیری استاد کی طرف اشارت نسبت ہے، ارشد تلامذہ میں عبداللطیف جلالؔ بنارسی کا نام نمایاں ہے، قادر الکلام شاعر تھے اور استاد کے کلام کے قوس قزحی رنگوں کا عکس آپ کی تخلیقات میں بھی جھلکتا تھا۔ حکیم محمد یعقوب الہ آبادی بھی منیرؔ الہ آبادی سے اصلاح لیتے تھے، میونسپل اردو مدرسہ میں صدر معلم تھے، کہانی اور ڈرامے لکھنے کا بھی شوق تھا۔

محمد مصطفیٰ شادؔ منیری، اسکول میں مدرس تھے، آگری پاڑہ (مدنپورہ) میں مقیم تھے، روایتی شاعر تھے۔

محی الدین سرشارؔ منیری مل میں ملازم تھے، جیکارڈ اور ڈیزائننگ میں ماہر تھے، رحیمی پریس کے مالکان میں سے تھے، عبدالغفار انصاری کے بڑے بھائی تھے اور کماٹی پورہ میں مسکن تھا۔

عبدالمجید انصاری خنجرؔ بھی منیرؔ الہ آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے میدانِ سیاست کے مجاہد اور ہمیشہ "خنجر آزما" رہتے تھے، مل میں متعادم تھے۔

منیرؔ الہ آبادی کے سب سے مشہور شاگرد اصغرؔ مرزاپوری تھے، محمد اصغر نام تھا مشی فتح محمد کتبہ کے صاحبزادے تھے جو خود فارسی کے عالم اور میدان سخن کے یکتا شہسوار تھے اور برہنہ بیر کہلاتے تھے، مدنپورہ میونسپل اردو اسکول میں صدر مدرس تھے، یکتا کے شاگردوں میں آغا حشرؔ کاشمیری کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اصغرؔ مرزاپوری مشاعروں کے بڑے کامیاب شاعر تھے، کلام سنانے کا انداز سب سے انداز دیگر تھا، پرجوش لہجے میں شعر پڑھتے تھے اور سامعین پرجوشی سے داد سخن دیتے تھے۔ اصغرؔ مرزاپوری مجاہد آزادی تھے۔ سیاسی جلسوں کا افتتاح انہی کی قومی نظم سے ہوتا تھا۔ اصغرؔ کا انتخاب کلام "رقص روح" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد [illegible] آبادی بھی منیری تھے، اردو اسکول میں صدر مدرس رہے، شاعری پر استاد منیرؔ الہ آبادی کی چھاپ پڑی تھی۔

محمد [illegible] منیرؔ الہ آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ جنگ آزادی کے مجاہدین میں [illegible] کے جنرل سیکریٹری تھے۔

کامل علی [illegible] خوش فکر اور کہنہ مشق شاعر تھے۔

محمد یونس بشیر عرب مسجد کے پاس رہتے تھے، مجاہد آزادی تھے اور سخن طراز تھے۔

مجاہدینِ آزادی میں شعراء حضرات بڑی تعداد میں شامل تھے جن میں ... بیشمار سبھی صاحبِ قلم تو تھے ان سے تو بہتر تھے جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان مخلص مجاہدین میں عبد اللہ شاطر انصاری لکھنوی کا نام ممتاز تھا، غلام رسول بلال انصاری بھی روحِ بلالی رکھتے تھے، مجاہد آزادی تھے اور شاعر تھے۔ محمد انصاری رجب کمانی پورہ کے گمنام شاعر تھے۔ ولی محمد بنارسی انجمنِ مجاہدین کے سرگرم رکن اور پُرجوش شاعر تھے، منشی واصل لکھنوی بلال انصاری کے دادا بزرگ شاعر تھے مدنپورہ میں رہتے تھے اختر علی کانپوری (کھانڈ اسٹریٹ)، عازم سبارکپوری (ڈنکن روڈ) اور عاشق علی کانپوری شاعروں میں پڑھا کرتے تھے، عازم مل مزدور تھے، عاصم اشرفی گھیلا بائی اسٹریٹ میں رہتے تھے تصوف سے لگاؤ تھا، سلسلۂ اشرفیہ سے بیعت تھے، غنی میلادی محمود آبادی میلاد خواں اور نعت گو شاعر تھے خود اپنا کلام میلادوں میں پڑھتے تھے، مدنپورہ میں بودوباش رکھتے تھے، غمگین منظور حسین بھدوہی کے رہنے والے تھے، غم انگیز شعر کہتے تو غمگین بن جاتے اور جب انبساط و شادمانی سے مسرور ہو جاتے تو لطافت سے کبھی تخلص فرماتے۔ مجاہد آزادی تھے، نادم اشرفی عاصم اشرفی کے پیر بھائی اور بابا فرید کے شاگرد تھے۔

علاء الدین صابر پوربی بولی کے واحد مزاح گو شاعر تھے سیاسی رنگ میں ڈوبے ہوئے پھڑکتے ہوئے شعر کہتے، گھیلا بائی اسٹریٹ پر رہتے تھے اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میدان کے حصاروں میں 'مانجھے' کا 'مانجھا' پھیلا کر پتنگوں کی کاٹ کا علاج کرتے تھے۔ پتنگ بازوں میں ان کا مانجھا اور مشاعرہ بازوں میں ان کی پوربی شاعری کی تیز کاٹ مشہور تھی۔

صادق نظامی سکھلاجی اسٹریٹ میں سکونت پذیر تھے، شاعر تھے اور قوالیاں لکھتے تھے برادری کے قوال یوسف آزاد ان کی ہی قوالیاں گاتے تھے، کہانی نویس بھی تھے۔

پرواز اعظمی کا نام محمد حسن انصاری تھا، محمود درانی کے شاگرد تھے مدنپورہ میں رہتے تھے، ان کا شعری مجموعہ نقشِ قدم کے نام سے ۱۹۷۶ء میں مولانا ضیاء الدین بخاری (شہید) کے مطبع عکاظ نے شائع کیا ہے۔

محمد اسحاق انصاری صحافی و شاعر تھے، جنجیرہ پریس کے مالک تھے روزنامہ انقلاب میں گجراتی سے اردو میں مترجم کی حیثیت سے ملازم رہے۔

نور محمد شیخ جمن۔م۔ شیخ کے نام سے مشہور ہوئے انصاری برادری سے تھے۔ میونسپل لائبریری میں ناظم کتب خانہ تھے، مقالات لکھتے تھے اور شعر کہتے تھے روزنامہ انقلاب سے وابستہ تھے اور انگریزی خواندہ تھے۔

افسر، جوہر اور سرور: ہم قافیہ، ہم برادر، شاعری میں قافیہ پیمائی کرتے کاروبار میں ہم ردیف تھے زردوزی کرتے اور شعر و سخن کے گل بوٹے تراشتے، تلمیحات و استعارات کے روپہلی تاروں سے روایتی شاعری کا پیرہن تیار کرتے تھے مگر دونوں فنون میں مشاق اور تجربہ کار تھے سرور کو استادی کی سروری حاصل تھی، قلم اور سوئی تیز چلاتے تھے زودگو تھے، حسینی باغ منپورہ میں باغ و بہار بن کر رہے اور مشاعروں میں نکہتیں لٹا کر خزاں دیدہ بن گئے۔ ان کی شاعری میں گلوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

سلامت خیرآبادی، انقلاب نے ہی مشہور نہیں کیا ان کے قطعات نے بھی انہیں شہرت اور ناموری عطا کی، اعظم گڈھ کے خیرآباد سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے وطن کی وضعداری کو نبھاتے رہے، ذوقِ شعری شستہ، قد پستہ، بدن نحیف و نزار لیکن شاعری پختہ تھی اُجلے من کے تھے اُجلے کپڑے زیب تن کرتے، انقلاب کی پرانی مجلس ادارت سے جڑا جڑ گئی انہیں کے دم سے پُر رونق رہی۔

عبداللہ ناصر اودھ پنچ (دورِ ثانی) کے ظریف شعراء میں ایک ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ اودھ پنچ بھی انہیں سراہتے تھے "سرپنچ" "بنجو چون" "دہلی پنچ" "پنجاب پنچ" "لاہور پنچ" "علیگڑھ پنچ" "انکشاف" اور شیرازہ وغیرہ جیسا اور کچھ معنی خیز ناموں والے اردو کے ظریف اخبارات و رسائل میں ان کا مزاحیہ کلام شائع ہوتا تھا "اودھ پنچ" سے لے کر انقلاب بمبئی تک ان کا زعفران زار پھیلا ہوا تھا۔ اودھ پنچ کے معاصرین میں ظریف لکھنوی، شہباز بلند پرواز، الست شاہ پوری، سرکوب فتح پوری، اصغر شاہ پوری، ریش جردلی، ہوش جردلی، مقر بمبئی وغیرہ کے اسماء گرامی سند ہیں۔

عبداللہ ناصر نے ۱۹۰۲ء-۱۹۲۵ء بیس سال کی کمسن عمر سے ظریفانہ اشعار لکھنا شروع کیا تھا، و عنفوانِ شباب ہی سے اودھ پنچ میں ان کا مسکراتا ہوا کلام نظر آنے لگا تھا میونسپل اسکول میں صدر مدرس تھے۔ احمد جمال پاشا نے 'کلام ناصر' (مطبوعہ سنہ ندارد) کے مقدمہ میں لکھا ہے۔

"عبداللہ ناصر کے موضوعات میں ہمیں نصف صدی کے قدیم اور جدید موضوعات کی رنگا رنگی، تہذیبی اور سماجی شکست و ریخت، بدلتی ہوئی دنیا اور حالات و واقعات میں گہری مقصدیت کی چھاپ ملیگی۔"

"ان کے بزاحیہ قطعات جن میں وقتی اور ہنگامی کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے ان کا ہماری سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔"

عبداللہ ناصر کے صاحبزادے رشید ناصر اور سعید ناصر اہلحدیث کے سرگرم رکن ہیں۔

شیخ عبدالستار راز ایوبی (متوفی ۱۳۸۷/۱۹۶۷) عبداللہ ناصر کے چھوٹے بھائی تھے اور انجمن اسلام کراہائی اسکول کے مقبول، ہردلعزیز اور شفیق استاد تھے طلبہ نے جشنِ راز منا کر آپ کی سی سالہ خدمات کے اعتراف میں ہدیۂ سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ راز ایوبی بڑے جامع اوصاف معلم تھے، طلبہ میں مصوری کا ذوق پیدا کیا آپ خود ایک باکمال مصور تھے مانی و بہزاد کے رتبہ کو نہ پہنچ سکے لیکن نقش کو اس کے مصور پہ بھی کیا کیا ناز ہیں، جو تصویر کھینچ دی وہ نقش فریادی بن گئی، شاعری میں محمود اسرائیلی سے اصلاح سخن لیتے تھے۔ استادی و شاگردی کا روایتی تصور غریب دھولیوی اور راز ایوبی کے مابین نہ تھا پھر بھی حضرت غریب دھولیوی کی اسدحت پسند خاطر تھی۔

راز ایوبی کی ادبی سرگرمیوں کی تاریخ کی تمہید ۱۹۲۵ء کی اولین ادبی مجلس بزم خیال بمبئی کے قائم ہونے کے بعد ہوئی۔ راز ایوبی کا طرز بیان غزل کا مخصوص کلاسیکی انداز ہے، ان کے عروس غزل کو تشبیہات و استعارات کے سولہ سنگھار کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ہر غزل جنت نظر سے زیادہ فردوس گوش ہے اس لیے کہ ان کے نفس و دست زبان میں ابھرتے ہوئے احساس کی نغمگی سنائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں خیالات کے حسین زاویے جلوے بولتے گنگناتے دکھائی دیتے ہیں، ان کی رحلت پر جمہ رو، تی، ظاہر بنبر گانوی اور شاہ محمد ناظر نے قلم کو سرنگوں کرکے "لختی قلم را بداو جگر یا نم" کہہ کر آنسو ٹپکائے ہیں۔ ان کا کلام شکستہ سبو کے نام سے ان کے صاحبزادے شبیر احمد بی۔ اے نے شائع کیا ہے۔ راز ایوبی کی ایک صاحبزادی ثریا بھیونڈی کے حق زبر عبدالشکور حاجی لعل محمد کے صاحبزادے ضیاء احمد سے بیاہی ہوئی ہیں راز کا گھرانہ اہلحدیث تھا اور قیت والا خاندان سے قریبی رشتہ داری تھی۔

شاہ محمد ناظر مومن پورہ اہلحدیث کی بڑی مسجد کے ناظر تھے اسی تعلق سے ناظر تخلص فرماتے تھے، روحانیت کا رنگ گہرا تھا اور ایمان افروز اشعار کہتے تھے، راز الہ آبادی کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے سہ دل سر بسر تھا داغ ابھی کل کی بات ہے

روشن تھا یہ چراغ ابھی کل کی بات ہے

اس پر شاہ محمد ناظر نے تضمین لکھ کر حق تعریف ادا کیا ہے سہ

صیاد کی اور اہل چمن کی وہ ساز باز
نیرنگیٔ زمانہ تری عمر ہو دراز
ناظر بھلا دیا وہ ستم ہائے جاں گداز
مدت ہوئی پر آج بھی ایسا لگے ہے راز

تقسیم باغ در باغ ابھی کل کی بات ہے

امیر امیدی برہانپوری کا نام محمد رمضان ہے، آپ کے دادا حافظ عبدالشکور انصاری دارالورود برہانپور کے مشاہیر حفاظ کرام میں شمار ہوتے تھے اور والد حکیم نور محمد طبیب حاذق تھے، عربی تعلیم حافظ محمد یسٰین اور مولانا عزت اللہ قادم برہانپوری سے خاص کی فارسی مولانا محسن انصاری سے پڑھی، شاعری میں استاد الشعرا امید برہانپوری سے اصلاح لیتے رہے اور امیدی کی عرفیت یا نسبت کی وجہ یہی ہے، امیر کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ معتقد میر ہیں اسی لئے بے بہرہ نہیں رہے کو غزل میں یاروں نے بہت زور مارا پھر بھی میر کا انداز ہی کو نصیب نہ ہوا پھر بھی یہ کیا خوش نصیبی کم ہے کہ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے عروس غزل کی زلف گرہ گیر کے اسیر تو رہے، امیر برہانپوری کے عروس غزل کے حجلۂ عروسی کے دریچے اس سمت کھلتے ہیں جس طرف سے میرزا تیغ کے چمنستان ادب سے نکہت بیز ہوائیں آتی ہیں، آپ کے مجموعۂ کلام کا عنوان "عروس غزل" ہے۔

[illegible] الدین انجم انصاری (ولادت ۱۹۲۶ء) کو شروع ہی سے ادب و صحافت سے لگاؤ [illegible] انقلاب میں الف انق کے نام سے بچوں کا صفحہ مرتب کیا کرتے تھے، اردو [illegible] اخبار سے ایک دہلی سہ علمی و ادبی سنخہ کی ادارت کرتے رہے، آکاش کا جرید اور کچھ دنوں تک ایک ہفت روزہ فلمی رسالہ "ریحانہ" حمید اختر بایگانوی کے اشتراک سے نکالتے رہے، پھر خلیل احمد شیخ کے روزنامہ "آشکارا" کی ادارت سنبھالی، جماعت اسلامی کے ہفت روزہ ترجمان "طلوع" کے مطلع صحافت پر انجم بن کر چمکے، اصغر علی عابدی کے معاون رہے۔

شاعری کے رجحان اور اُسلوب میں تبدیلیاں نہیں آئیں لیکن اساتذہ میں خوب سے خوب
تر کی تلاش جاری رہی تاآں نوٹی منیر الٰہ آبادی کے اصلاحِ سخن پر آپ کا کلام "گلستان"
کو لکھنؤ کے کہنہ مشق شاعر عمر انصاری ترتیب دے رہے ہیں" دیکھیں کب تک یہ
"بنات النعشِ سخن" شب کے پردے میں نہاں رہتی ہے۔
آپ کے والد چودھری غلام رسول انصاری خیرآباد (سیتاپور) کے تھے جو ایک
زمانے میں تجارت کا مرکز تھا۔
عبدالرحمٰن عثمان محسن انصاری (ولادت ۱۹۲۲ء) نے موضع رموپور (ضلع [illegible])
میں اردو، فارسی اور قرآن کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، بمبئی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے
بعد دوسری عالمی جنگ میں "انٹیلیجنس کور" میں جونیئر افسر مقرر ہوئے، ریلوے کمرشیل
ڈپارٹمنٹ کی ملازمت سے ۱۹۸۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ شاعری کے علاوہ نثر نگار بھی
ہیں، نعتیہ کلام کا مجموعہ ارمغانِ حرم کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ لہو
رگِ جاں کے عنوان سے منظرِ عام پر آچکا ہے۔ آپ کے مضامین ہندو پاکستان کے مقتدر
اور موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔
آپ کے بھائی امیر محمد عثمان انصاری بھی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔
ظفر گورکھپوری محمود درانی کے شاگرد تھے اور اپنے محبوب استاد کے کوچہ میں گم
رہتے ہیں، کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
محمد یٰسین منظر مشہور ممتاز تاجر بدو سیٹھ کے نواسے ہیں، بدو نگاری اسٹریٹ (بمبئی)
انہیں کے نام سے موسوم ہے، منظر ایک اچھے اور خوش فکر شاعر ہیں۔
سعید انجینئر کا خاندان علمی و ادبی فضیلت کا حامل تھا اسی سے وابستہ [illegible]
اور پروفیسر عصمت جاوید ہیں۔
منشی عبدالباقی باقی: پونہ میں رہتے تھے جو ادبی اور شعری سرگرمیوں کا مرکز تھا، یہاں
محرم میں مالیگاؤں، شاہدہ اور دیگر شہروں کی طرح ادبی دنگل ہوتے تھے سلیم لطف سلیم حیرا
پونہ میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے آپ کے شاگردوں میں خود آپ کے بھتیجے منشی صاحب تھے
جو منور لوہری کی طرح پونہ چھوڑ کر بمبئی میں آ کر بس گئے اور منروا موویٹون میں کہانی نویس کی
حیثیت سے لکھنے لکھانے پر مامور ہو گئے۔ مرنجان مرنج قسم کے ادیب و شاعر تھے فارسی اور اردو

سے منسلک تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر عصمت اللہ جاوید: آپ کے فرزند جامع اوصاف ہیں، تعلیم و تدریس کے میدان میں اتنے آگے پہنچے کہ اورنگ آباد گورنمنٹ کالج میں صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے اور شولاپور میں کالج کے پرنسپل بنے۔ اچھے شاعر ہیں، اچھے نثر نگار، اچھے نقاد اور اچھے انسان، شاعری میں پختگی ہے، نثر میں منفرد اسلوب رکھتے ہیں اور تنقید و تبصرہ میں توازن، ان کے ادبی مضامین نیاز فتحپوری کے ادبی مجلہ مرحوم "نگار" میں شائع ہوتے تھے۔ آجکل بھی ادبی سرگرمیوں میں مصروف دکھائی پڑتے ہیں، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "فکر پیما" کو اتر پردیش سرکار سے انعام ملا ہے۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات اور نئی اردو قواعد منظر عام پر آچکی ہے۔ موصوف کو جدید لسانیات پر عبور حاصل ہے اور اسی میں ڈاکٹریٹ ملی ہے۔

امین تابش (ولادت ۱۹۲۱): مہاراشٹر میں عصر حاضر کے موجودہ شعراء میں غالباً سب سے بزرگ، کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں اور بیک وقت آپ کو مالیگاؤں اور بمبئی کے شاعروں کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ آپ سے ہر شاعر آشنا ہے اور اپنا حق جتاتا ہے۔ وطنیت مالیگاؤں کی تھی جہاں سے آپ کے والد حافظ محمد اسحاق خلافتی فساد اور دار و گیر کی آفتوں سے گھبرا کر ۱۹۲۲ء میں بمبئی آئے اور یہاں توطن اختیار کر لیا، حالانکہ حافظ صاحب بھی ایک خاموش خلافتی تھے، امین تابش ادبی صلاحیتوں کے مالک ہیں بیک وقت شاعر بھی ہیں، مضمون نگار بھی اور افسانہ نگار بھی ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات کے علاوہ نثر میں تنقیدی اور تقریظی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، تراجم اور ریڈیائی مضامین اور کتابوں پر تبصرے بھی آپ کا تخلیقی سرمایہ ہیں۔ آپ کی ادبی شخصیت کا جاذب نظر پہلو آپ کی عصری ادبی رجحانات سے آگہی اور سرگرمیوں سے باخبری ہے آپ کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ گو آپ مشاعروں میں کم نظر آتے ہیں لیکن "اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشین دل" کے مصداق ہر شاعر سے قریب نظر آتے ہے اور اسکا کلام آپ کے زیر مطالعہ مطالعہ کی گہرائی نے قدما کے کلام کا آپ پر گہرا اثر ڈالا ہے لطافت اور گہرائی نے جدید رجحانات، لہجہ اور ابلاغ و ترسیل کی نئی قوتوں کو محیط کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ سخن گوئی میں منفرد رکھتے ہیں اور ایک علاحدہ مقام۔

ہم نے تو نکالی ہیں الگ فکر کی راہیں ممکن نہیں ٹکرائیں خیالات کسی سے (امین تابش)

آپ بے حد مخلص انسان ہیں۔

شمیم طارق

بنارس کے تازہ واردان کہ "بساطِ ہوائے گل" میں آپ کا شمار ہوتا ہے، مولانا شیخ محمد علی حزیں گیلانی بنارسی (۱۱۰۳ھ - ۱۱۸۰ء) کے اس شہر میں جہاں "برہمن پسر لچھمن و رام" دکھائی دیتا ہے۔ شمیم صاحب بن باس لے کر بمبئی کے باسی بن گئے، پھر بھی اپنے والوں سے رابطہ، خاطر رکھتے ہیں جس کا ثبوت آپ کا وہ تعزیتی مضمون ہے جو آپ نے مولانا اسحٰق ندوی بنارسی (۱۳۲۸ھ - ۱۴۰۶ء) کی وفات حسرت آیات پر لکھا ہے،

بڑے اچھے شاعر ہیں، مقرر اور مقالہ نگار، اردو بلٹز سے وابستہ ہیں۔ اپنے آپ کو غریب شہر تصور کرتے ہیں اور ایسا لگتا ہے بمبئی والوں سے زیادہ خوش نہیں ہیں جیسا کہ ان کے اس شعر سے یہ تاثر ملتا ہے ؎

روح بیتاب ہے چہروں کا تاثر پڑھ کر
یعنی بے گھر ہوا میں شہر میں اک گھر لے کر

مختار احسن انصاری

دھولیہ کی مشہور شخصیت اثر یحییٰ انصاری کے فرزند دلبند ہیں اور اسی تعلق سے آپ کا ذکر دھولیہ کے مشاہیر میں ہونا چاہیے تھا لیکن ہم میں بعض ایسی مقبول اور مقتدر ہستیاں موجود ہیں کہ ہر شخص ان پر اپنا حق جتلاتا ہے، مختار احسن محکمۂ پولس میں ایک اعلیٰ عہدے پر سرفراز ہیں لیکن خود زلیخائے سخن کے اسیر اور قیدِ بند شاعری ہیں۔ اور شاعری جنون کی حد تک ہے ؎

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

دھولیہ کے مشہور استاد شاعر اکرم دھولیوی سے فارسی پڑھی اور دسترس حاصل کی انہیں سے اصلاح لیتے رہے، شاعری کے نئے رجحانات سے متاثر ہیں اس لئے لہجے میں بھی نیا پن ہے کبھی کبھی رومان انگیز شعر بھی کہہ ڈالتے ہیں ؎

صدیاں سمٹ کے سوختہ آنکھوں میں بس گئیں
وہ دے رہے تھے اذنِ ملاقات آخری

انجم رومانی

نام ہی میں بڑی شعریت ہے لیکن آپ کے کئی اور نام بھی ہیں۔ الف۔ بے۔ میم کے حروفِ مقطعات کے "نام" سے آپ مزاحیہ کالم لکھتے ہیں، کبھی دستارِ فضیلت سر پر رکھ کر 'علامہ بے نام' بن کر ناموری حاصل کرتے ہیں اور جب مرزائیت سے مرعوب ہوتے ہیں اور تقویٰ غالب آتا ہے تو 'مرزا متقی' کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ انجم رومانی کے اس بہروپ پر فارسی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

بہر طرزی کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

صحافت سے پچھلے ۳۴ برسوں سے وابستہ ہیں، اور عرصے سے اردو ٹائمز کی مجلس ادارت سے منسلک ہیں، نام اور تخلص کی مناسبت سے رومان انگیز شعر بھی کہتے ہیں اور نئے مضامین بھی باندھتے ہیں، والد محمد حسن محلہ دار بارہ بنکی سے ستر سال کی عمر میں ترکِ وطن کر کے آئے تھے، آبائی پیشہ جو سو پشت سے چلا آرہا تھا وہی ذریعۂ رزق تھا۔ محلہ دار ہونے کی حیثیت سے مذکورہ پنچایت کے سربراہ تھے اور برادری کے مسائل سلجھانے اور مقدموں کا فیصلہ کرنے کا اختیار تھا۔ انجم رومانی کا مجموعۂ کلام منظرِ ادب پر جلد ہی جلوہ گر ہوگا۔

بمبئی میں برادری کی نئی نسل میں ابھرتے ہوئے ادیبوں شاعروں اور مضمون نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔

چھتیسواں باب

اسلام آباد۔ بھیمڑی کا تاریخی سفر

مغربی ہند میں عرب ساگر کے ساحلی علاقے میں کوکن کا سرسبز و شاداب خطّہ سہیادری کے کوہستانی سلسلے کے درمیان سنجان سے گوآ تک پھیلا ہوا تھا، اس کی جغرافیائی سرحدیں گھٹتی بڑھتی رہیں، تاریخ کی کارفرمائی زمانوں کو سمیٹ لیتی ہے اور سیاست کی فرمانروائی زمینوں کو بانٹ دیتی ہے، جغرافیہ تاریخ نہیں بناتا لیکن تاریخ جغرافیہ بنا دیتی ہے۔

اس زرخیز خطّہ میں زمردیں پہاڑوں سے گھری ہوئی جھلملاتی جھیلوں کے نقرئی آبگینے ہیں، کوہساروں سے نکلی ہوئی ندیاں ہیں جو کناروں پر بساطِ گل بچھاتی ہوئی کہیں کھاڑیوں سے سنگم بناتی ہیں اور کہیں سرمئی پربتوں سے گر کر نغمۂ سرمدی کا سرگم سناتی ہیں اور دھیرے دھیرے قبا کی طرح کٹے پھٹے ساحلوں سے الجھتی بیکراں سمندر میں جل پریوں کی طرح گم ہو جاتی ہیں۔ یہی ندیاں کوکن کے سدا بہار حسن اور شادابی کی آبرو بن گئی ہیں۔

——— ایسی ہی ایک ندی بنڈا کا ذکر یسوع مسیح کے ڈیڑھ سو سال بعد یونانی جیوگرافر بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں کیا ہے، بھیمڑی کی کاموری ندی اسی بنڈا کھاڑی ندی میں گم ہو جاتی ہے اسی کے کنارے ڈونگا نام کی معمولی بندرگاہ آج بھی موجود ہے کاموری ندی اور ڈونگا بندر کے ذریعہ بھیمڑی کا رابطہ سمندری ساحل کی قدیم بندرگاہوں سے عہد قدیم سے قائم رہا ہے جب اس کا پاٹ موجودہ عرض سے کہیں زیادہ تھا تو "بھرتی" کے وقت اس میں ۲۰ ٹن تک وزن کے بادبانی جہاز "بھاگ بندر" میں لنگر انداز ہو سکتے تھے[۱] کاموری کا آبی سلسلہ دیترنا سے تھا جسے مہابھارت میں بھارت ورش کی چار پوتر ندیوں میں شمار کیا گیا ہے دیترنا کے دہانے پہ سوپارہ (شرپارک) کا قدیم شہر آباد تھا، کلیانہ (کلیان) اور ستری، ستھانک (تھانہ) کی قدیم بندرگاہوں کی عظمتِ رفتہ کا عکس آج بھی اسی ندی کے پانی میں جھلک رہا ہے جس کے کنارے

---

[۱] تھانہ گزیٹیر، حصہ قابل دید مقامات (۲۶-۲۵)

آباد یہ دونوں قدیم بستیاں کسی زمانہ میں عرب، مصر، بابل، نینوا، یونان اور خلیج فارس کے شہروں سے تجارتی رشتوں سے منسلک تھیں۔ بھیمڑی کی بستی قبل از مسیح سے ان قدیم راستوں کی گذرگاہ بھی جو کوکن اور دکن کو ملاتے تھے۔ خلجی سلطنت کی سرحدیں جب پرلے تمام تھانہ اور کوکن تک پھیلیں تو بھیمڑی بھی دور نہ رہی۔ یہی آگرہ روڈ تھا جو غریب الوطن انصاریان کی ہجرت کا شہ رگ بن گیا۔

گو مسلمانوں نے سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں تھانہ میں قدم رکھا مگر ان کی نوآبادیوں کا حال نویں اور دسویں صدی عیسوی کے عرب سیاحوں جغرافیہ نویسوں کے بیانات میں ملتا ہے[1] مسلم عرب قبیلے تجارتی سلسلے اور کسبِ معیشت کی غرض سے سوپارہ، چیول (صیمور)، کلیان، تھانہ اور بھیمڑی میں بسنے لگے اور ایک مخلوط النسل قوم جو نوائطی کہلائی سارے کوکن میں پھیل گئی۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے کشف الانساب میں انھیں نایطی لکھا ہے۔ تاریخ النوائط[2] میں نائطوں کو موجودہ کوکنی مسلمانوں کے مورثین اعلیٰ سے تعبیر کیا گیا ہے[3] دکن اور کوکن کے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام میں سینکڑوں نوائتی افراد کے نام ملتے ہیں۔ بھیمڑی میں سید شاہ حسین قادری الحسنی والحسینی الجیلانی سلاطینِ دکن کے عہد میں ملکوکن کے دیوان مقرر ہوئے۔ حکومت کے آئینِ ملازمت کی رو سے آپ کو نقد تنخواہ کے عوض قصبہ اسلام آباد بھیمڑی میں گوری پاڑہ گاؤں کی جاگیر عطا ہوئی۔

قصبہ اسلام آباد بھیمڑی کے محلّے اور گھرانے:

سات قدرتی تالابوں کے روپہلی نگینوں سے جڑا ہوا اسلام آباد بھیمڑی کا قدیم قصبہ انیسویں صدی کی منزل پہ پہنچ گیا تھا۔ بھونڈی کو اگر بطلیموس کی بنڈامری کا مشتق تسلیم کر لیا جائے تو یہی قصبہ اس سے قبل بھی آباد تھا جو سوپارہ سے قریب تھا۔ بھیم واڑی اور بھیستان اگر بھیم دیو یا بھیم دیو سے منسوب سمجھ لیا جائے تو یہ بھی غلط نہ ہوگا مگر یہ بہت دیر کی بات ہے۔ فرانسیسی سیاح

---

[1] مومن محی الدین: تعارف کوکن پر ایک باب "کوکن نے دین کی دہلیز پر ۱۹۰۰ء" اور نقشِ کوکن مارچ ۱۹۶۶ء "گئے وقتوں کی بات" ص ۸

[2] مومن محی الدین، تذکرۂ حضرت پیران شاہ صاحب (بھیمڑی) ۱۹۶۵ء، ص ۹

ٹرے ورنے بونڈی لکھتا ہے، پرتگیزوں کے نیکرٹی ریکارڈز میں بونڈی ملتا ہے۔ شاہ عالم کا اطالوی
حکیم اور سیاح نکولائی منوچی جو خود بھیونڈی میں چند دن مقیم رہا اور کاپنے کے دستکاروں کے فنِ
نجاری کی تعریف کرتا ہے پرتگیز مورخین کی تقلید میں بونڈی لکھتا ہے یہی فارسی میں اضافے کے ساتھ
'بھونڈی' بن گیا۔ ۱۷۵۰ء کے ایک جرمن جغرافیہ میں بھیونڈی، ببری اور بھیونڈی کے تلفظات ملتے ہیں'
فارسی میں بھیونڈی عرف اسلام آباد مقبول رہا۔ یوپی میں ہماری برادری کے بزرگان دین اسے بھیونڈی
ہی کے نام سے یاد کرتے تھے۔[1]

مسلم آبادی کا مرکز محلہ سوداگراں تھا، اور اسی سے ملحق دوسری شاہراہ پر محلہ نالاں تھا
جہاں خاندان سادات یعنی دیوان شاہ بابا کی اولاد آباد تھی، یہاں ایک عمارت تھی جسے حویلی کلاں
اور بعد میں دیوان منزل کہنے لگے۔ قصبہ میں فرنگی طرز تعمیر کا واحد نمونہ بڑی کلاں تھی اسے "ٹوپے
دار" حویلی کہتے تھے اس لیے کہ اس کی چھت کلاہی شکل کی تھی۔ اسی محلہ میں محمد مانگ، نخرو،
محمود جی جنبلے، حسن محمد دبا اور کچھ واجہ بنکر بھی آباد تھے ان میں ہر سال عرس آتا اور محمد متری کے ان
دار گھرانے تھے۔[2] خانوادۂ سادات کی پھیلی ہوئی جائداد چیچلہ مارک تک تھی کئی نوائطی گھرانے بستے
تھی، پیلہ، جمعدار اور چودھری خاندانوں کے گھراں کے اردگرد تھے۔ بھونڈی لب چیچلہ مارک کے
اردگرد بھی نوائطی آباد تھے، ان میں کھاری، نگری، بھیاگی، ٹھیکر، بربرہ، ...، سونے،
مہاتے، سہاپے، دبا، دبہ، ناخواہ، خطیب، نزریل اور عاقل گھرانوں کے نام ملتے ہیں۔
واجہ قبیلوں میں متری، گوریکر، سرحد، دانڈرکر کے وجود سے اندازہ ہوتا ہے کہ صنعت پارچہ بافی کے
تانے بانے بھیونڈی سے لے کر بیتیں، ہرنیج، قلعہ اور مہائم، نذرونک پھیلے ہوئے تھے[3]
نوائط تجارت پیشہ تھے، عمارتی لکڑیوں کی تجارت میں یہ اپنی ساکھ کے ستون گاڑ چکے تھے مینکر
کے نام سے نمک کی موروثی تجارت کی وضاحت عیاں ہے۔ پٹیل اور کھوت بندوبست اراضی سے
تعلق رکھتے تھے پیلہ گھرانے میں عہدۂ قضات وراثتاً چلا آرہا تھا۔ مذہبی پیشوائی کا علمبردار، قصبہ
کا خطیب جو ٹوالہ کے خطیب اور کلیان کے جوقور گھرانوں کا رشتہ دار تھا۔ عیدین کے موقعوں

---

[1] تاریخ کوکن ص ۳۸۵، ۲۵۰
[2] مولانا عبدالسلام مبارک پوری۔ کتاب النوائط (۱۹۱۲ء) حصہ دوم ص ۲
[3] مومن محی الدین تذکرہ حضرت دیوان شاہ صاحب (بھیونڈی) ص ۲۱ - ۲۵

پرتاضی شہر کے ساتھ جلوس کی شکل میں عیدگاہ تک جاتا تھا جو کاموری ندی کے قریب واقع تھی، اسی سے قریب محلہ 'ناخدایان' میں مسلم ملاح (تانڈیل۔ سارنگ۔ کچھی) بستے تھے۔ کل آبادی دس ہزار سے کم تھی اس میں ہندو اکثریت تھی۔

اس دیندار قصبہ پر ہمیشہ علم و فضل کی برکتیں نازل ہوتی رہیں اور یہاں اوامر و نواہی کا سدا چرچا رہتا تھا، اس کی دینی مرکزیت کا یہ عالم تھا کہ عرصۂ دراز تک (خصوصاً شافعی جماعت میں) بوقتِ نکاح مہر باندھتے وقت 'چالیس تولہ سونا بوزن اسلام آباد بھیمڑی' بولا جاتا تھا۔ مہر معجل و مؤجل' باندھنے کا یہ طریقہ خطۂ کوکن کے علاوہ گلشن آباد (ناسک) تک رائج تھا۔ بھیمڑی کو باب المکہ کی حیثیت بھی حاصل تھی کیونکہ خاندیس اور دکن سے عازمین حج بھیمڑی ہوکر ہی بندر مبارک سورت جاتے تھے ـــــ اور اسی ارادے اور نیت سے ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ لہ آباد' جونپور، بنارس اور اعظم گڈھ کے انصاری نوربافوں کے کئی قبیلے بھیمڑی آئے ـــــ!!

مہاجر برادری کے کارواں ـ قصبہ اسلام آباد بھیمڑی میں

کس ندانست کہ منزل گہ معشوق کجاست
این قدر ہست کہ بانگِ جرسی می آید (حافظ شیرازی)

ـــــ مگر مہاجر انصاریوں کا قافلہ اتر پردیش، بہار اور بنگال سے نکلا ایک لٹا ہوا کارواں تھا جس میں نہ حدی خوان تھے اور نہ زاد و جرس تھی اور بغیر زاد و دراسب کچھ تھا بے سروسامانی تھی، 'متاعِ دیدہ تر' تھا، بچوں کی چیخیں تھیں، عورتوں کی سسکیاں تھیں اور ضعیف مردوں کی آہیں تھیں سب نکل پڑے تھے مگر منزل کا پتہ کسی کو نہ تھا۔

۱۸۵۰ء میں دلید پور اعظم گڈھ سے ایک کارواں تارکینِ وطن کا پہلی محرم کو مغربی ہند کی سمت روانہ ہوا، جب یہ بھیمڑی کے مضافاتی قریہ پڈگھا میں پہنچا تو یہاں دوسرے سال کے محرم میں ڈھول پٹ رہے تھے اور شربت کی سبیل جاری تھی۔ بھیمڑی تک پیدل سفر کرنے میں اس قافلۂ مہاجرین کو پورا ایک سال لگ گیا تھا۔

اس کارواں میں محمد عالم تھے اور ان کے ساتھ ان کے صاحبزادے عبد القادر جو ۱۸۳۵ء میں دلید پور میں پیدا ہوئے تھے اور بھیمڑی آئے تو ۱۸ سال کے نوجوان تھے۔ یہ محمد عمر مُنّن کے دادا تھے پھر اور قافلے آئے، سنگرامپور، جونپور، جعدی اور بنارس کے مہاجر خاندان یہ سارے درگاہ روڈ

کے کھلے میدان میں پڑاؤ ڈال کر بس گئے، ان میں حافظ قاسو سردار کا گھرانہ بھی تھا، اور خدا بخش سردار کا خاندان بھی تھا۔ مہاجرین کا تانتا ٹوٹا [1] نہیں۔

۱۸۶۴ء کے بنگال اور یوپی کے قحط کے دوران معاشی بحران آیا، الٰہ آباد کے جلاہوں پر تو پچھلے چھ سات برسوں سے تباہی آئی تھی، پھولپور کے بردہ پورہ جماعت کے جلاہے سرداروں کی قیادت میں نکلے، اکبر گنج، دیوان گنج، حسام گنج کے انسانی خزانے خالی ہو گئے، پھولپور کی باغ دیہا شخصیتوں سے بھیرٹی میں بنگال پورہ محلہ میں بہار آ گئی، جو آج تک بنگال کے قحط اور بنگالی مہاجرین کی یاد دلاتا ہے ان میں ایک بنگالی مولوی بھی تھے جو مسجد اسلام آباد سے متعلق مدرسہ کے مدرس اول بن گئے، اس محلہ میں اور اس کے ارد گرد کی بستیوں میں پھولپوری جماعت کی گنجان آبادی پھیل گئی، پیر محمد سردار، مدار سردار، بکس سوار، صاحب دین میاں جی، میاں جی الٰہی بخش، حسین بخ بڑلی، فقیر محمد سیٹھ اور حاجی لالو سیٹھ چند برسوں میں اتنے ثروت مند بن گئے کہ ان کی سخاوت کے چرچے بائیکلا اور مدنپورہ میں بسی ہوئی برادری میں ہونے لگے۔ دوسرے محلوں میں بھی اسی طرح پھولپوری جماعت اور بعد ہی جماعت سے متعلق افراد کے علاوہ وقت کی بیروں کے ساتھ دیگر قریوں اور قصبوں سے مہاجرین یہاں آ کر لنگر انداز ہوئے، اعظم گڑھ کے نہانا گنج، خیرآباد، ولید پور، بھیرائی، سگوی، مہاراج گنج اور مبارک پور کے تارکین وطن کی تعداد کم تھی۔ الٰہ آباد، جونپور اور پرتاب گڑھ کے لوگ زیادہ تھے۔

جہاں تک روزگار کا تعلق تھا، یہ سارے ماہر کاریگر تھے دانجہ کارخانہ داروں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، ویسے جب یہ مہاجرین یہاں آئے تو ان کا ارادہ حج بیت اللہ کا تھا، جن کے پاس پونجی تھی انہوں نے کارگاہیں قائم کر لیں جب استطاعت نصیب ہوئی تو حج بیت اللہ بھی نصیب ہوا، جو تہی دست تھے انہوں نے کرگھوں کی باگ ڈور ہاتھوں میں لے لی۔

کرگھے اور کارگاہیں

۱۸۹۴ء کے گزیٹیر میں برادری یا جلاہوں کے بارے میں بڑی تفصیلات ملتی ہیں، یہ بڑے محنتی، ایماندار، سنجیدہ طبیعت والے اور کفایت شعار تھے، چند برسوں ہی میں کئی لوگوں نے اپنے

---

[1] ذخیرۂ عافیت یعنی توشۂ آخرت۔

کارخانے قائم کر لیے جن میں دو ہاتھ مانگ سے لے کر درجن بھر کی تعداد رہتی تھی خود ان کے گاؤں کے بنکر انہیں چلاتے تھے، ہر بنکر دو یا تین دن میں ایک 'مانگ' یا 'بھانج' بُن لیتا تھا اس میں دو سے لے کر تین ساڑیاں، یا بیس تولیے، یا دس لنگیاں نکلتی تھیں ایک بھانج (مانگ) کی بُنائی آٹھ آنے سے لے کر ڈیڑھ روپیہ تھی، ساڑیاں سوتی ہوتی تھیں ان میں سلک کی کناری بھی ہوتی تھی۔ رومال بھی تیار کئے جاتے تھے اور سوسی (دھاریدار چھینٹ) کا کپڑا بھی بُنا جاتا تھا جو عورتوں کے ازار میں کام آتا تھا۔ تاجر اپنی کارگاہوں کی مصنوعات کو مقامی پارچہ فروش جو عموماً بنیے اور مارواڑی ہوتے تھے ان کے ہاتھوں فروخت کرتے تھے، جو کبھی کبھی بیعانہ دے کر اپنا مال تیار کرواتے تھے یا پھر گجری میں خرید کر رقم ادا کر دیتے تھے، غریب بنکر بازار میں اپنے بُنے ہوئے پارچے بیچتا تھا۔

سوتی مصنوعات کا بازار بھاؤ اس زمانے میں یہ تھا:

ساڑی (جسے تاہبر کہتے تھے) : قیمت دو روپے سے دس روپے تک

تولیہ (انگوچھا) : قیمت ۴ آنے

لنگی : آٹھ آنے سے لے کر ایک روپیہ

سوسی (چھینٹ) (دھاریدار) : ایک تھان کی قیمت ۲ روپوں سے چار روپوں تک تھی۔[1]

یہاں منتری نام سے رنگین چوکڑ یہ تہمد بھی بنایا جاتا تھا جسے عموماً واجد بنکر تیار کرتے تھے۔

۱۹۵۳ء میں بمبئی سے تھانہ تک ٹرین شروع ہونے کے بعد بھیونڈی سے جزیرۂ بمبئی تک مواصلات میں سہولت پیدا ہو گئی پھر بھی یہاں کے باشندوں کو اباس ندی پار کر کے بالکم گھوڑ بندر کے پاس کاشی میرا یا پھر چکر کاٹ کر مجگاؤں جانا پڑتا تھا۔ برادری کے اکثر سیٹھ تیار شدہ مال لے جا کر بمبئی کے بازاروں میں فروخت کرتے اور ہفتوں مدنپورہ یا بائیکلہ میں اپنے بھائی بندوں کے یہاں قیام کرتے اس طرح برادری میں آپسی تعلقات استوار رہے اور رشتہ داریاں قائم ہوتی رہیں۔

کفو پرستی سے عمل کرتے دور دراز کی برادری میں لڑکی دیتے لیکن غیر برادری میں چاہے کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو رشتہ نہ کرتے یہی بنگال کے جولاہوں کا بھی دستور تھا۔

---

[1] مہاراشٹر بمبئی گزیٹیئر سیریز ۳ تھانہ ڈسٹرکٹ ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۵

عقائد کے لحاظ سے بھیوڑی کی برادری میں اکثریت وہابی مسلک کے غیر مقلدین کی تھی انہیں عام طور پر "لمبا جابی" یا "لمبا بڑے" کہا جاتا تھا۔ شافعی کوکنی مسلمانوں کو ان کے عقائد سے بڑی چڑ تھی اور سرکاری رپورٹ کے مطابق یہ انہیں نہ اپنی مسجدوں میں گھسنے دیتے تھے اور نہ کسی تقریب میں شریک کرتے تھے[1] چونکہ ان کا بڑا اثر تھا اور یہ بڑے بارسوخ تھے اس لئے مرتا کیا نہ کرتا ان لوگوں کے دباؤ میں آکر سادہ لوح تبنکر ان کی ہر بات مان لیتا اور جب عمر بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے" پر ندامت ہوتی تو مولبی صاحب کے آنے پر جو بار تو ملک سے آتے تھے یا بمبئی سے یہ بطور کفارہ تاوان دیتے تھے اور صلوٰۃ الکفارہ کی نفلیں پڑھ لیتے تھے[2] شادی میں ڈھول تاشا بجانا انہیں سخت ناپسند تھا، مجبوراً شافعی قاضی سے نکاح پڑھوانا پڑتا اور اسی کے رجسٹر میں اندراج بھی کروانا پڑتا تھا۔[3]

اس سے اندازہ ہوگا کہ اسلاف بڑی حد تک عمل بالسنۃ سے تمسک رکھتے تھے اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ہر ادنیٰ گناہ اور غلطی کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ سے رجوع کر لیتے تھے۔ وہابی افراد علانیہ ایسی بدعات سے برأت کا اظہار کرتے تھے جس کے نتیجے میں ان پر مسجدوں کے دروازے بند کر دئے جاتے اور سماجی تعلقات انقطاع ہو جاتے، بچے کی ولادت پر نہ چھٹی کرتے در بیاہ میں نہ ابٹن لگاتے اور نہ میت پر تیجہ، دسواں یا چہلم کرتے اور نہ فاتحہ نیاز دلاتے، اسی لئے ان لوگوں کے لئے یہ مشہور تھا: "مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود"[4]

اولین نوآبادکاروں کی رہائش کا مسئلہ قصبہ کے سب سے بڑے کوکنی مسلم رئیس حاجی باقر علی فقیہ نے درگاہ کی چالیس تعمیر کرا کے حل کر دیا تھا۔ یہ درگاہ دیوان شاہ کے راستے پر ہیں۔ اس علاقے میں جونپور، بھدوہی، اعظم گڑھ اور بنارس کے ارکین وطن آباد تھے جس غربت کے عالم میں یہ غریب الدیار زندگی گذار رہے تھے اس کی طرف شیخ حمیدہ نار کرنے اپنی مثنوی سخاوت نامہ — دربیان سخی الزماں، غریب پرور، فیض گستر جناب حاجی باقر فقیہ صاحب قصبہ بھیوڑی میں اشارہ کیا ہے۔

---

[1] صوبۂ بمبئی گزیٹیر سیزدہم جز اول تھانہ د ۱۸۹۲ء ص ۲۲۵

[2] ایضاً ص ۲۲۶ [3] ایضاً

[4] صوبۂ بمبئی گزیٹیر ج ہنم جز ۲ گجرات کی آبادی۔ ص ۱۶۸ ۱۲۱

کہ کوکن جو اک شہر مشہور ہے　　　لقب بھیونڈی جس کا معروف ہے
یہ بستی میں بستے ہیں ادنیٰ غریب　　　ہے اطراف میں بمبئی کے قریب [1]

حاجی باقر علی فقیہ سارے کوکن میں اپنے تموّل، رسوخ، جود و سخاوت کے سبب شہرت رکھتے تھے ١٢٩٧-٩٨ھ میں جب یہ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں پر بمبئی کے زائرین نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی تھی اور چائے نوشی کی دعوت دی تھی جس میں محمد یوسف شہاب الدین تنگیکر، حوالدار، خوجہ چاند بھائی اور سید محی الدین باوا وغیرہ شریک تھے۔ [2]

"مسٹر باقر" جیسا کہ انگریز صاحبان انہیں یاد کرتے تھے، بڑے مہم جو واقع ہوئے تھے، کھاربانو اور پیگاؤں (بسین) میں انہوں نے ٢٩، ١١ ایکڑ نمکسار زمین کو بھرتی کرا کے چاول کی کاشت کے قابل بنایا تھا۔ اس پر چالیس ہزار روپے خرچ آئے تھے۔ [3]

قصبہ میں قدیم مسجدیں بھونڈہ تالاب کے ارد گرد بنی ہوئی تھیں، ایمانی شاہ نے جو اپنے مرشد فاضل شاہ کی درگاہ کے مجاور تھے اسی کے احاطہ میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرلی تھی (١٢٦٧ء) ایمانی شاہ کا انتقال ١٢٩١ھ میں ہوا۔ آپ فقرا مداریہ کے سرگروہ تھے۔

خاندانِ سادات (دیوان شاہ) کی تولیت میں سب سے قدیم مسجد قادریہ تھی، ایمانی شاہ کے معاصرین میں علاء الدین ڈوکلے اور علاء الدین کرٹگیہ تھے اسی کرٹگیہ خاندان کے ایک فرد امیر صاحب کرٹگیہ نے کرٹگیہ مسجد اور اس کا تالاب تعمیر کرایا تھا، ڈونگر کر (ڈوکلے) مسجد سید احمد شاہ قادری جنجیرہ کی رہینِ منت تھی، تسکر شاہ کی مسجد معمولی طرز کی تھی یہ بھی بھونڈہ تالاب کے کنارے تھی، اس کے سامنے مسجد ناصر الدین واقع تھی اور قصبہ کے نواح میں ایک نامعلوم بستی امین الدین پور میں مسجد عبد اللہ اپنے بانی کے لئے صدقۂ جاریہ بنی کھڑی تھی [4] محلہ سوداگراں میں جامع مسجد سب سے وسیع اور کشادہ تھی۔ ایک صاحب خیر سید شبہ آنے نارلہ تالاب سے گارے

---

[1] اردو مخطوطہ جامع مسجد لائبریری بمبئی

[2] یادگار یوسف محمد یوسف شہاب الدین تنگیکر بمبئی ١٣١٣ھ ص ١٠٨

[3] تھانہ گزیٹیر ج ١٣ حصہ دوم ص ٢٨٢-٢٨٣

[4] موسیٰ محی الدین، تاریخ کوکن ص ٢٦٢، ٢٥٢ اور تذکرہ حضرت دیوان شاہ صاحب (بھیونڈی) ص ٣

سے بنائے ہوئے محرابی نالہ کے ذریعہ جمعہ مسجد اور اس سے متصل دو عمارتوں میں پانی پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔ [1]

سرکاری گزیٹیر (۱۸۹۴ء) میں صرف چار بڑی مسجدوں کا ذکر ہے، جامع مسجد، ڈونگر کر، بسلہ محلہ مسجد اور کڑگیہ مسجد، ان کے علاوہ ایک میمن مسجد اور دو مومن مسجدوں کا ذکر ہے اسلام آباد کی مومن مسجد ۱۸۹۴ء سے قبل تعمیر ہوئی تھی، مسجد کے اندرونی محرابی داخلہ پر جو کتبہ لگا ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:

> سورۂ آیت الکرسی، نیچے بسم اللہ اور پھر کلمۂ طیب ۱۲۹۹ھ۔ این مسجد اسلام آباد بنا کرد جماعت بھیونڈی با اہتمام میاں جی ضیاء الدین چودھری ز ربانان بتاریخ بست ذیقعد ہفتم ماہ رمضان المبارک ۱۲۹۹ھ"

اس مستطیل مرمریں لوح کے ارد گرد فارسی میں قطعۂ تاریخ بنا درج ہے۔

ہندستانی مسجد یعنی گزیٹیر کے مطابق دوسری مومن مسجد بھی ملک جنگ کی عہد کی تعمیر کردہ ہے۔ بازارِ خورد کے ارد گرد رہنے والے برادری کے ممتاز افراد اس کے متولیان میں سے تھے۔ جان محمد خواجہ (پاؤ والے) جو غدر کے پُرآشوب زمانہ میں بھیمڑی اسٹیٹ کے اولین ٹرسٹیوں میں سے تھے ان کے بعد ان کے صاحبزادے محمد یوسف اس کے متولی مقرر ہوئے۔

برادری کے مدرسے

اسلام آباد۔ بھیمڑی میں دینی تعلیم کے ساتھ عربی اور فارسی تعلیم کے لیے کئی مدرسے عرصہ قدیم سے قائم تھے، مدرسۂ اسلامیہ قادریہ کی تولیت دیوان شاہ کے خاندانِ سادات میں برسوں سے تھی عالمگیر بادشاہ نے سید قطب الدین محمد سجادہ نشین (۱۰۶۵ - ۱۱۴۴ھ) جو حضرت دیوان شاہ کے نواسے تھے مدرسۂ اسلامیہ قادریہ کی خدمت تدریس پر زر روپیہ یومیہ پر مامور کیا تھا۔ مدرسۂ ایمانی شاہ میں برسوں تک علم و فن کا چراغ جلتا رہا۔ اس دینی درسگاہ میں دور دور سے علماء و فقہا درس و تدریس کے سلسلے میں آتے تھے، ان میں ریاست ٹونک کے ایک سابق وزیر (دیوان) صفت علی شاہ بھی تھے جن کے علمی و فنی اوصاف نے انہیں ایک عالم فقیر،

---

[1] تھانہ گزیٹیر حصہ چہارم۔ قابل دید مقامات ص ۴۹

خوشنویسی صوفی اور نستعلیق درویش بنادیا تھا، فنِ خطابت میں بے نظیر تھے مولانا ابوالکلام آزاد کے پدر بزرگوار مولوی خیرالدین اور مولانا محدث دہلوی بھی سلسلۂ درس و تدریس میں مدرسۂ ایمانی شاہ سے منسلک رہ چکے تھے[1] گزیٹیر میں ایک 'مسلمان کالج' کا ذکر ملتا ہے جو غالباً ایک اہم دینی درسگاہ ہوگی، اس میں بیس پچیس طلبہ عربی اور فارسی کی تعلیم اور دینی علوم کا درس پاتے تھے، ایک فقیہ اور ایک مولوی ماہانہ تیس روپے تنخواہ پر ملازم تھے، غریب اور نادار طلبہ کی درسگاہ کے فنڈ سے مالی اعانت کی جاتی تھی قصبہ کے کوکنی روؤسا ر تمام اخراجات کے کفیل تھے[2]۔

۱۸۶۴ء میں بھیونڈی نظام پر میونسپلٹی کے قیام کے بعد اردو، مراٹھی اور انگریزی زبانوں کے مدارس قائم ہوئے لیکن مسجدوں سے ملحقہ مخیر حضرات کے مالی تعاون سے دینی مدرسے بھی چل رہے تھے، ان میں فضل رحمانی مدرسہ ۱۹۰۵ء میں جنگال پورہ میں برادری نے قائم کیا، منشی موسیٰ رضا اس کے بانیوں میں سے تھے اور پھر کے اسکول کی مدرسی چھوڑ کر اس کے صدر مدرس ہو گئے، مدرسہ مسجد اسلام آباد کے مدرس اول مولانا بنگالی تھے۔

حالت میں، صورت بین!!

۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق قصبہ کی آبادی ۷،۰۰۵ افراد پر مشتمل تھی اس میں ۵،۰۴۳ مسلمان تھے، غالب آبادی کوکنی مسلمانوں کی تھی، ۱۸۹۴ء تک جلاہوں کی تعداد چار ہزار تک تھی، تین سو پچاس (۳۵۰) کلیان میں اور پچاس تھانہ میں آباد تھے، جب کرلا میں اسپننگ ملز اور کپڑا ملیں قائم ہوئیں تو کچھ خاندان وہاں جاکر آباد ہو گئے اور کچھ بمبئی میں بس گئے۔[3]

پنچایت کا رواج تھا، سردار اور چودھری تمام معاملات کا فیصلہ کرتے تھے، چودھریوں میں میاں جی منیرالدین اور مولا بخش ممتاز افراد تھے سرداروں میں پیر محمد سردار، یونس سردار (بنگال پورہ)، یعقوب سردار (راجہ محلہ) حافظ قاسم سردار (درگاہ روڈ) خدا بخش سردار (حمایت [illegible]

---

[1] تاریخ کوکن ص ۲۹۴ - ۲۹۵

[2] تھانہ گزیٹیر حصہ چہاردہم، قصبہ و مقامات۔ ص ۴۹

[3] صوبۂ بمبئی گزیٹیر۔ ایف ص ۱۲

عبدالرشید سردار (درگاہ روڈ)، کریم بخش سردار (قیصر باغ)، مدار سردار، بجس سردار وغیرہ اپنے اپنے محلے کی جماعت کے سردار تھے۔ پھر اسی جماعت میں سارے سردار اپنے اپنے محلے کی نمائندگی کرتے تھے۔

لباس اور گہنے

آج سے ڈیڑھ سو برس قبل ہمارے پُرکھوں کا لباس بڑا مختلف تھا اور ان کی ہیئت بھی عجیب تھی، عسرت، ناداری اور سہمی ہوئی زندگی کی پرچھائیاں ان کے گندمی رنگ، پست قامت اور نحیف و نزار بدن پر گرد لتی رہتی تھیں، سر منڈاتے تھے یا دراز گیسو جسے "پٹے" کہتے تھے رکھ لیتے تھے، داڑھی سنت کی نشانی تھی ہاتھ بھر لمبی یا بھرپور چنگی داڑھی رکھنے کا رواج عام تھا، لمبی قمیص یا کرتہ گھٹنوں سے نیچے رہتا اور ہمیشہ سفید رنگ کا ہوتا تھا، ڈھیلے یا تنگ پائنچوں کا ازار ہوتا تھا، بزرگ حضرات بیضوی شکل کی یا دو پٹی ٹوپی پہنتے تھے اور بعض کاندھے پر انگوچھا رکھ لیتے تھے۔

انگریز مؤرخین عورتوں کے ملبوسات اور زیورات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کی رنگت صاف ہوتی تھی اور آنکھیں بڑی بڑی اور کالی ہوتی تھیں لیکن مریضانہ رنگتی تھیں حالانکہ کھلی ہوا میں اپنے مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں، تانی تننا، چرخہ چلانا یہاں تک کہ کھیتے پر جھٹو کرنتی بھی تھیں، سر پہ اوڑھنی، بدن پر لمبا کرتہ ٹخنوں تک پہنچتا ہوا اور تنگ مہری کا پاجامہ عام لباس تھا، حسب استطاعت چاندی کے گہنے پہنتی تھیں گلے میں ہار رہتا تھا (منگل سوتر جو کہ کئی عورتیں پہنتی تھیں اس کا رواج نہ تھا)، کانوں میں چاندی کے آویزے لرزاں رہتے، کمر بند میں کھنکتی ہوئی نقرئی گھنٹیاں اور پیروں میں جھنکتی ہوئی پازیب۔۔۔ قدِ یارہ کا یہی عالم تھا، مگر ایسا عالم بھی نہ تھا کہ کوئی من چلا مستقر فتنۂ محشر ہوتا، اسی لئے ایسے پاکیزہ ماحول میں واردات قلبی کا واقعہ شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتا۔ اکثر خاندان کثیر العیال تھے اور شاید یہ بھی جماعتی روایت ہو، صفائی کا خیال رہتا بھی کیسے جب گرنٹہ مارٹی سے دن بھر لوٹ رہتے یوں بھی عام سپاہیان گھروں کی طرح برادری کے گھر صفائی سے محروم رہتے تھے غذا وہی تھی جو باپ دادا کھاتے آئے تھے، گیہوں کی روٹی اور دال اور دونوں وقت "بڑے کے گوشت کا سالن" ساتھ میں چٹخارے کے لئے پیاز اور اچار۔ [۱]

---

[۱] صوبہ بمبئی گزیٹیر۔ ایضاً ص ۲۲۵

گھروں میں اور آپس میں یہ پوربی بولتے، شادی بیاہ اور میت کی رسومات میں اور پنچایت میں بھی سی بولی کا استعمال ہوتا تھا گو بعض بزرگ مرہٹی سے بھی واقف تھے اور اردو تو سب ہی جانتے تھے لیکن تازہ وارد مستورات اس 'ہندستانی' زبان سے نابلد تھیں اور مرہٹے عورتیں جو دودھ دہی بیچنے کے لئے لاتی تھیں یا ایندھن کے لئے 'بھارا' (لکڑی کے گٹھے) سر پر لادے آتیں تو پلی کی عورتوں کو اظہارِ مدعا میں بڑی دقت پیش آتی تھی، کئی زبانوں کا ملغوبہ تیار کر کے وہ جو مکالماتِ فلاطونی ادا کرتیں "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" کا معاملہ بن جاتا،[1] بہرصورت معاملہ فرو ہو جاتا۔ برادری کی عورتوں میں بکریاں پالنے کی سنت عام تھی، صنعتِ پارچہ بافی کے علاوہ کچھ اور مہم جو بھی تھے جو وطن میں اپنے کھیتوں کی مٹی کی سگندھ بھلا نہ سکے وہ کھیتی باڑی بھی کرتے تھے اور بھینسوں کا طویلہ بھی رکھ لیتے تھے، کوٹر گیٹ میں نور محمد پہلوان کے والد نے شاید اس کی ابتدا کی تھی۔ یوں بھینسوں کے طویلے تو کئی مسلمانوں کے پاس تھے۔ جن کے طبور خانے بھی تھے جن میں دھان صاف کیا اور کوٹا جاتا تھا، دکانیں عموماً نرجیوں کی اور بنیوں کی تھیں۔

سناٹے کی بستی

برادری کے محلوں اور دوسرے محلوں کے بیچ فرقِ مراتب کی ایک صوتی سرحد تھی۔ یہاں کرگھوں کی کھٹ کھٹ، رفاعی فقیروں کے ضرب 'یا حق' کی طرح سنائی دیتی، محلہ سوداگراں اور محلہ حمالاں سے جھونپڑوں سے دھان کوٹنے کی دھمک کی آوازیں آتی تھیں دونوں وقت ملتے تو یا تو کرگھوں کی لکڑی اکھڑی سانسوں کے تانے بانے بکھر جاتے ــــــ جیسے رفاعی درویش ضرب لگا کر تھک گیا ہو! پھر ساڑی بیچنے کا وقت آتا، گٹھری میں بھیڑ لگ جاتی، دن بھر کی محنت چند ٹکوں میں بک جاتی اور چند سکوں میں اشیائے خوردنی خرید کر بکرتے ہی، بازار کا یا چھینٹا ناکہ پر روشنی تندوروں کی روشنی میں دودھ بیچنے والے کو کئی مسلمانوں سے دودھ خرید کر گھر لوٹ آتا۔ اور جیسے جیسے پرچھائیں کا سینہ گرم ہو جاتا عشا کی اذان جب فضا میں ڈوب جاتی تو نیلے آسمان کے بام پر فروزاں چاند اندھیارے کا جلن بجھا دیتا، مسجدوں کی کافوری شمعیں اور تنگ و تاریک گلیاروں کی اکا دکا روغنی قندیلیں گل کر دی

---

[1] ہاں میں والدہ [illegible] ربِّ ارحمهما كما ربياني صغيرا) کر الٹ سے پوچھتیں: "کاہے بائی تورا کتنا پیسہ جالا!"

جاتی، رات تنگی ہو کر چاندنی کی نقرئی پھوار میں نہانے لگتی، قصبہ کے چاروں طرف پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں اور تالاب کے کنارے کے مرغزاروں سے سبزہ کی بھینی بھینی سگندھ ہوائیں اپنے حریری دامن میں بٹورے سارے میں بکھیرتی پھرتی تھیں۔ سرداروں کے کھپریل پوش مکانوں کے آنگن میں رات کی رانی کھِل جاتی جس کی دلنواز نکہتوں میں بسی ہوئی خنک چاندنی دبے قدموں روشندانوں سے داخل ہو جاتی۔ چاروں اور بڑا لطیف اور طلسم انگیز سناٹا چھایا ہوتا تو کھلے تاریوں اور ندی کے اس پار سے سیاروں کی چیخوں سے بلوریں خاموشی کے آبگینے چھن سے ٹوٹ کر بکھر جاتے، بچوں کے رونے کی آوازوں کو سہمی ہوئی سرگوشیاں دبا دیتیں۔ سناٹا اسی طرح "رت جگا" مناتا اور جب مہاتی رات کی زلفیں پو پھٹنے پر فضا کے شانوں پر پریشان ہو جاتیں تو موذن کی مکہ اور مدینہ تک پہنچنے والی آواز سے رات کا سحر ٹوٹ جاتا۔

پھر ایک نیا دن پیدا ہوتا — محنت کا اور مزدوری کا۔ بنکر کی زندگی کا ہر لمحہ وقت کی [illegible] پر تقدیر کے تکلے کو گردش دینے لگتا۔

آج سے ایک صدی قبل قصبہ اسلام آباد بھیونڈی کا ایسا ہی رومان [illegible] در و دیوار پر نقش تھا [illegible] یادیں صرف تصور کرتی ہیں لیکن تاریخ یادوں کو ثبت کر دیتی ہے۔ [illegible] ویرانوں میں جھینگر کے سناٹے میں بہت ساری آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

بھیونڈی کے یادگارِ زمانہ لوگ

ماضی میں علوم دینی سے بے رغبتی کا ایک تاریک پہلو بھیونڈی کی برادری کی تاریخ میں [illegible] یہ باب سرے سے غائب ہے۔ آج کی باقیات صالحات بھی حفظ کر کے [illegible] ان کے پرکھوں میں یہاں چند ہی عربی داں اور فارسی داں بزرگ تھے [illegible] طور پر منشی کہلاتے تھے۔

جہاں تک تصنیف و تالیف کا تعلق ہے ۱۸۵۷ء کے زمانے [illegible] ۱۹۱۰ بیسویں صدی کے اواخر تک کسی مومن مصنف کی کتاب ہماری تحقیق اور علم میں [illegible] آتی۔ جبکہ بمبئی کے اردو اخبارات مثلاً مقبولِ عالم میں محلہ منڈپورہ میں ۲ تاریخ [illegible] "دھوم دھام مشاعرہ" میں شریک ہونے والے شعراء میں جو نام نظر آتے ہیں ممکن ہے [illegible] ذریت میں کچھ بھیونڈی کے بھی ہوں۔ دستور یہ تھا کہ شعر و سخن کا ایک گلدستہ پندرہ روزہ یا ماہوار رسالے کی شکل میں شائع ہوتا تھا، ان میں مالیگاؤں کے شعراء کا کلام بھی چھپتا تھا۔ حضرت خادم مالیگانوی کو یہ افتخار

حاصل تھا۔

بھیونڈی کے نوائط دکوکنی مسلمان) اپنے بمبئی کے "بھائی کمپیا برادر چی برادر" کے نقش قدم پر مسند درس وافادہ کو رونق بخش رہے تھے اور کئی صاحب تصنیف بھی تھے۔ فقہ شافعی پر ان کی نامی کتاب ۱۸۵۰ء میں یہیں لکھی گئی۔ نظام پورہ کی بستی میں مولانا حاجی میاں بن غلام محی الدین تالی نے "مسلم الاسلام" در فقہ مذہب حضرت امام شافعیؒ تصنیف کی، مدرسہ ڈیگھا مانی شاہ (متوفی ۱۲۶۷ھ) کے دارالافتاء سے فیض محمود کے عنوان سے ایک فتویٰ رسالہ کی شکل میں ۱۲۴۰ء میں شائع کیا گیا تھا، طابع کا نام ابوالخلیل مسلم شنزی تھا۔ اس میں کسی صدیق مومن کے طلاق اور حلالہ کے استفسار پر فتویٰ صادر کیا گیا تھا۔ اسی عہد میں بمبئی میں تو تصانیف کا ایک انبار لگا ہوا تھا اور علمائے دین کا ایک جم غفیر تھا۔

عربی و فارسی زبان دانی کی ملکیت کا اعزاز اور دینی علوم میں "عالمیت" کی سند طرۂ امتیازات فرد در ہیں لیکن عالم دین کا درجہ کچھ اور ہوتا ہے اس کا درجہ ایک داعی کا ہوتا ہے جو قلم اور زبان سے تبلیغ و دعوت الی اللہ کی خدمت سرانجام دیتا ہے، اس کا دائرۂ علم و عمل بہت وسیع ہوتا ہے، عام زبان و ادب ادبی اور لغوی ثقافت کی تحصیل تک اپنے آپ کو محدود رکھتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے فارسی دانی میں امتیاز حاصل کرنے والے کو منشی یا میاں صاحب کہتے تھے۔ بھیونڈی کے قدماء میں سے ہم چند منشیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

عبدالقادر منشی ببر علی

ان کے والد ببر علی کلکتے سے ۱۸۵۷ء کے بحرانی دور میں ہجرت کر کے بھیونڈی آئے، یوپی کے دستور کے مطابق فارسی کے عالموں کو منشی، میاں جی یا میاں صاحب کہتے تھے۔ برادری کے قدیم بزرگوں کے ناموں کے آگے یہ القاب اکثر ملتے ہیں۔ عبدالقادر منشی ۱۸۶۹ء میں بھیونڈی میں پیدا ہوئے انہوں نے مروجہ تعلیم کے مطابق عربی و فارسی میں بڑی دسترس حاصل کی، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے بڑے خوش الحان تھے اور صاعقہ بار آواز پائی تھی ایسی کہ مسجد میں تلاوت کلام پاک کرتے تو گرد گھروں کے شور میں بھی اجر کرتے لوگوں پر رعب اور خشیت الٰہی کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔

حسب رنگ کی ہیئت میں پرچون کی دکان تھی، ایک اچھے باورچی بھی تھے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر کھانا پکاتے تھے آپ کے شاگردوں میں رجب عبداللہ، عبدالرحمن صدیق سردار حنیف

عبدالرب (حنیف ماما) قابلِ ذکر تھے۔ آپ کے صاحبزادے علی احمد تھے جن کا خاندان تعمیر باغ میں آباد ہے۔

جناب محمد اسحٰق منشی (۱۸۵۷ء — ۱۹۸۰ء)

آپ کی پیدائش ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ بھیونڈی میں ہوئی۔ کچھ برس پہلے آپ کے دادا خیرآباد سے بسلسلۂ معاش بھیونڈی آئے اور نوائطوں کے محلے "محلہ سوداگران" میں مقیم ہو گئے۔ بھیونڈی کے مولانا مسعود کے لڑکے جو مولوی محمد امین کہلاتے آپ کے ہم درس تھے۔ اس مولوی خاندان کا روحانی سلسلہ حضرت دیوان شاہ سے تھا۔ منشی جی نے متداول علوم میں درک حاصل کیا۔ عربی اور فارسی زبانیں نصاب میں تھیں، گلستانِ سعدی اور بوستانِ سعدی کامل ازبر تھیں۔ آپ شاعر نہیں تھے لیکن ادب نواز ضرور تھے۔

مدرسہ معین الاسلام سوداگر محلہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ درس دینے کا انداز بڑا دلنشیں تھا۔ بات بات پر حسن کی دو دو کہاوتیں، بزرگوں کے لطائف سے شعر پڑھتے اور معانی سمجھاتے۔ آخر وقت تک منشی صاحب کی باتوں میں علموں کی خوشبو بسی رہتی تھی۔ ان کے شاگردوں میں جناب مصطفےٰ فقیہ اور ان کے برادرِ خورد منشی فقیہ صاحب، اکبر صاحب فقیہ، مٹکر والے، عباس غوری، خوشنویس قابلِ ذکر ہیں۔

دہلی سے نکلنے والے ڈائجسٹ کے مدیرِ اعلیٰ جناب عبدالوحید صدیقی نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ ان کے ابتدائی استاد محمد اسحٰق منشی تھے۔ ان کی وفات ۲۱ فروری ۱۹۸۰ء کو ۱۲۳ برس کی طویل عمر میں ہوئی۔ ان کے فرزندوں میں محمد خلیل منشی قابلِ ذکر ہیں جو گوونڈی میں رہتے ہیں۔ دوسرے صاحبزادے عبدالحق منشی کا انتقال ۱۹۵۲ء میں ہوا۔

منشی موسیٰ رضا

منشی موسیٰ رضا کے والد غازی الدین تھے۔ ۱۸۵۰ء کے [illegible] سے تھے۔ منشی جی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ مروجہ سلسلوں میں بیعت تھے لیکن فرقۂ مولویہ کے ایک پیرِ طریقت [illegible] المعروف مولوی مثنوی سے بڑی عقیدت تھی۔ انہیں کے بتلائے ہوئے ایک وظیفہ "[illegible]" موصوف اسم مسمّٰی نے "حق لطیف" کا ورد کرتے تھے۔ کل بلیات ارضی و سماوی سے حفاظت

کے لئے اسے پڑھا جاتا تھا اور گھروں میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ خاص کر طاعون، جذام، برص اور ہیضہ سے بچنے کے لئے اکسیر اعظم تھا۔ آپ فارسی کے عالم تھے اور شاعری سے شغف رکھتے تھے۔ بھیونڈی کے پتھر کی اسکول میں مدرس تھے اور پھر اسلام آباد مسجد میں فضل رحمانی مدرسہ قائم کیا، اس مدرسے میں ابتدائی تعلیم راقم نے بھی ۵ سال کی عمر میں "بیگاری" جماعت میں حاصل کی تھی، جب قاعدہ پڑھایا جاتا تھا۔ منشی صاحب خوشخط تھے اور مذکورہ بالا وظیفہ ان کے ہاتھوں کا لکھا ہوا موجود ہے۔ سلسلۂ مولویہ کے بانی مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی 'معنوی' کی طرف وظیفہ کی نسبت معنی خیز ہے۔ اس مثنوی کا جسے "ہست قرآن در زبان پہلوی" کا درجہ دیتے ہیں، پہلا شعر ہے:

بشنو از نے چون حکایت می کند   از جدائیہا شکایت می کند

یہ دراصل شکوہ ہے انسان کا۔ جو ایک چوب خشک سے نئے ہے اس سے ہر دم آواز درد آتی ہے۔ نے (بنسری) جس کا سینہ چھلنی ہو چکا ہے موسیقی سے بریز رہتا ہے اور جب اس میں نفس پھونکا جاتا ہے تو نغمہ، فردوس کا سوتہ پھوٹ پڑتا ہے، اور نفس کو بھی خدا ہی پیدا کرتا ہے۔ "صد اسمار شریفہ عرف نئے حق لطیفہ" اسی شعر کی تشریح اور تفسیر ہے۔ منشی صاحب کا تصوف میں جو رنگ اور مقام تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

منشی موسیٰ رضا نے پچاس سال کی عمر میں ۱۳۴۱ھ ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا اس وقت مشتاق احمد سوداؔ حد اللّٰہی کی عمر تین سال کی تھی۔ منشی صاحب کے دو بڑے صاحبزادوں کے اسمائے گرامی اسطرح ہیں۔ سراج احمد اور نذیر احمد۔

محمد یوسف جان محمد خواجہ (۱۹۰۴ء-۱۹۷۶ء)

ان کا شجرۂ نسب اس طرح ہے۔ محمد یوسف جان محمد، حاجی خواجہ محمد ابن حاجی برکت علی جان محمد ۱۸۵۰ء میں شہر اعظم گڈھ سے ہجرت کر کے بھیونڈی آئے اور یہیں بھسار محلہ میں بیکری کا کاروبار شروع کیا اور روٹی والے مشہور ہو گئے۔ ہندستانی مسجد کے ٹرسٹیوں میں سے تھے ان کی وفات ۱۱ رمضان ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰ مئی ۱۹۲۱ء بروز جمعہ ہوئی۔

محمد یوسف جان محمد خواجہ (ولادت ۱۹۰۴ء) اینگلو ہائی اسکول پونہ میں پڑھتے تھے بھیونڈی میں یہ پہلے مومن تھے جنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا، انگریزی، اردو اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے ہندستانی مسجد کے ٹرسٹیوں میں سے تھے۔ ان کے صاحبزادوں

ہیں اقبال احمد، عقیل احمد، آصف، اشفاق (مرحوم) اور محمد عارف ہیں۔ اقبال احمد خواجہ رفیع الدین فقیہ ہائی اسکول میں بحیثیت ایک مدرس درس و تدریس دے رہے ہیں، دیگر برادران ان کے اشتراک عمل سے خواجہ انٹرپرائزز کے نام سے پاسپورٹ، ویزا وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ بھیونڈی میں اس طرز کا یہ واحد آفس ہے۔

علی احمد عبدالقادر منشی

عبدالقادر کے بڑے صاحبزادے علی احمد اینگلو اردو ہائی اسکول (موجودہ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی) کے اول "بیچ" کے طالبعلم تھے۔ خواجہ محلہ مسجد کے ٹرسٹی تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۸۲ء میں ہوا۔ ان کے صاحبزادوں میں بلال احمد مومن (صدر مدرس صمدیہ ہائی اسکول) نے اپنے اجداد کی علمی روایات کو برقرار رکھا ہے۔

عبدالقادر منشی کے دوسرے فرزند محمود عبدالقادر منشی بقید حیات ہیں۔ عبدالقادر منشی جان محمد خواجہ کے بہنوئی تھے۔

ہر وہ داڑھی والا مسلمان جس کی دوڑ مسجد سے مکتب تک تھی مُلّا کہلاتا تھا، بنگال کی طرح کوکن میں بھی ہر قریہ اور گاؤں میں ایک مُلّا ضرور رہتا تھا، ایک مُلّا میں دو مرغیاں حلال ہو جاتی ہیں لیکن دو ملاؤں میں گاہر مرغی کا یہی حکم ہو جاتا، برادری میں بھی 'مُلّا' کے لقب سے کچھ لوگ مشہور تھے لیکن یہ خطاب تو ہر اس مسلمان کو مل جاتا جو پیش امام، فاتحہ نیاز دینے والا، غسّال اور تدفین و تکفین کے امور سر انجام دیتا۔

مُلّا اور مولانا اور مولوی میں فرق مراتب ضرور تھا، مولانا یا مولوی سند رکھتا تھا اور درس وافادہ، فنِ خطابت سے بھی واقف رہتا اور 'قال اللہ وقال الرسول' کی گردن بھی جانتا تھا۔ ان میں بھی بڑے درجات تھے۔ بہت ایسے تھے جن کے دم سے مدرسوں میں علم و عرفان کے چراغ روشن تھے، مسجدوں میں بھی رونق تھی اور وعظ کی مجلسوں میں تکبیر لگ جاتی۔ ایسے ہی تھے بھیونڈی کے چند مولوی حضرات۔

یوپی اور شمالی ہند سے انیسویں صدی کے اواخر تک علمائے کرام بھیونڈی آتے رہے ان میں وہابی مولویوں کی تعداد زیادہ تھی جن سے برادری رجوع کرتی رہتی خصوصاً کفارہ دینے کے مسئلہ اور حلالہ میں یہ مولوی حضرات بڑے متشدد واقع ہوئے تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے

بنگالی مولوی مدرس تھے اور مقامی مولوی حضرات محمد ابن مسعود، غلام محی الدین ناسلی وغیرہ کے معاصرین میں سے تھے، مولوی سلیمان انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہاں سے فراغت کا فاتحہ پڑھ کے بمبئی چلے گئے تھے، حکیم مولانا اسد اللہ برکوپا گنج کے جید عالم اور طبیب حاذق تھے بعد دنوں بھیونڈی میں رہ کر مالیگاؤں اور پھر بمبئی چلے گئے آپ کا انتقال ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں ہوا۔

مولانا یوسف، تنجرہ (حبشان جزیرہ) سے جہاں وہ برسوں سکونت پذیر رہے، نقل مکانی کر کے بھیونڈی آئے، وعظ کرتے تھے اور کافی مقبول تھے، ان کے صاحبزادے حفیظ الرحمٰن رئیس ہائی اسکول کے جونیئر کالج میں استاد ہیں۔

مولانا عبد الحمید الہ آباد میں سورات کے رہنے والے تھے، مسقط میں برسوں رہے، عربی کتابت و خوشخطی میں طاق تھے، جب بھیونڈی بنگال پورہ میں آ کر بس گئے تو قرآن کی کتابت کرنے لگے اور رئیس ہائی اسکول میں عربی پڑھانے لگ گئے، اہلحدیث سلک پر تھے، خاموش طبیعت پائی تھی۔ ایک بیٹی محلہ کے دین محمد درزی کے صاحبزادے مشتاق احمد کو اور دوسری بیٹی مالیگاؤں میں ہارون بی۔ اے مشہور سیاسی رہنما کے بھائی جلالی سے بیاہی ہوئی ہیں مولانا عبد الحمید علوم دینیہ میں دسترس رکھتے تھے افسوس لوگوں نے قدر نہیں کی۔

بھیونڈی کی بزم شعر و سخن۔ متقدمین مومن شعرائے کرام

مغربی ہند کے ان قصبوں میں جہاں برادری کی بستیاں آباد تھیں وہاں بزم شعر و سخن آباد تھی، کامٹی، ناگپور، برہانپور، دھولیہ، مالیگاؤں اور بمبئی میں انصاری شعرائے کرام کا ایک بزم قبیلہ تھا، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی ہوتی تھی۔

انیسویں صدی میں بھیونڈی کے مشاعروں کی گونج سے بمبئی کے جزیرے جاگ اٹھتے تھے، گو یہ ایک عرصہ تک علم و فضل کا گہوارہ رہا، لیکن برادری کی تاریخ میں علمائے کرام کا باب بہت مختصر ہے مگر ایوان ادب کے جھروکوں سے آتی ہوئی روشنی میں چند متقدمین شعرائے کرام کے خدوخال ابھرتے ہیں۔

۱؎ تذکرہ مشاہیر کرباگنج۔ ص ۵۳

پہلے دور میں منشی محمد الیاس آفاق، محمد ایوب صابر، نور الدین خاطر، فصاحت وارثی لکھنوی، نور محمد عابد دھولیوی، نیر، یکتا، رشید، بیتاب، ڈاکٹر حسین ذاکر، منشی نعمت اکرم وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔
فنِ شاعری میں استادی کا رتبہ عموماً اسی شاعر کو نصیب ہوتا تھا جو نہ صرف بدائع و صنائع سے واقف ہوتا تھا بلکہ فارسی میں بھی کمال کا درجہ رکھتا تھا اس قسم کے استاذ کے آگے منشی کا لقب لگایا جاتا تھا۔ بھیونڈی کے شعراء عموماً بیرونی استادوں کو اپنا کلام بغرض اصلاح بھیجا کرتے تھے۔

منشی محمد الیاس آفاق (متوفی سنہ ۱۹۵۲ء)

منشی صاحب کا تذکرہ "آئینہ" مؤلفہ عبدالملک مومن میں موجود ہے جس پر مزید حاشیہ آرائی کی گنجائش نہیں۔ یہاں پر فارسی اور اردو میں آپ کی دسترس اور زباندانی کے سلسلے میں ذکر ہو رہا ہے۔ مدرسہ انجم الاسلام میں مدرس تھے۔ بزم شعر و سخن سجاتے تھے اور شطرنج کی بساط بچھاتے تھے اور ـــــ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

خدا حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔ ہمارے برادر بزرگ ذاکر حسین ذکی ان کے قریبی دوست تھے اور بھائی صاحب کو منشی صاحب کا تلمذ حاصل تھا۔ بھی سانڈ شعر بہ لیتے تھے مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کسی کی آنکھیں امریکہ، کسی کے دانت لندن پر
مگر قسمت سے اپنے کان میں بجلی کے بٹن پر
شراب زعفرانی یار چہرے پہ آ ٹپکتی ہے
سنہری بدلیاں چھا رہی ہیں جب صحن گلشن پر

منشی آفاق صاحب کو مادۂ تاریخ نکالنے میں بھی مشق تھی۔ سہرا بھی خوب لکھتے تھے۔ ایک سہرا کے چند اشعار یہ ہیں۔

نوشاہ باندھتا ہے "رشکِ بہار" سہرا	صحن چمن میں کہہ دو گاتے ہیں "ہزار" سہرا
پنہاں لڑی لڑی میں سامانِ عیشِ عشرت	رشکِ بہشت تیرا ہے تار تار سہرا

ارباب ذوق کی یہ دُھن آپ مُغنّیہ سے بزم نشاط میں گا! بس بار بار سہرا

کیونکر نہ راس آئے؟ تاریخ کا یہ مصرعہ

ہے نصرتِ خداداد۔ آفاقِ زار سہرا!

۱۳۵۴

اُرباب ذوق، خط کشیدہ الفاظ کی معنویت اور صنعتِ لفظی کے التزام سے آفاق منشی کی مشاقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک اور سہرا جو "بتقریب عقد ثانی" برادر منشی آفاق انصاری یعنی محمد یوسف بن محمد یعقوب صاحب سردار" لکھا اس کے چند اشعار یہ ہیں:

اس سہی قد کے جو باندھا گیا سر پر سہرا | قمریاں گانے لگیں باغ میں مل کر سہرا

رُخ آئینہ نما پہ ہے پڑا۔ یوسف کے | بخت کا اپنے بنا بخت سکندر سہرا

شاد و مسرور نظر آتے علی احمد ہیں | دیکھ کر اپنے برادر کا بر آور سہرا!

دھوم اس مصرعۂ تاریخ کی آفاق میں ہے

کیا ہی مرغوب زمانہ ہے سراسر سہرا

۱۳۵۲

منشی محمد الیاس ایک مشاق غزل گو شاعر تھے۔ غالب کی غزلوں کی زمین میں کئی غزلیں کہی ہیں مثال کے طور پر یہ چند نمونے ملاحظہ فرمائیں

دل عشاق پہلو سے وہیں کھنچ کھنچ کے آنکلے

ہیں کر دستِ نازک میں وہ جس دم کہربا نکلے

اور

ہم تو چپ تے ہیں وفا کر کے | کچھ تو شرماؤ تم جفا کر کے

منشی آفاق نے طویل غزلیں کہی ہیں ایک غزل جس کا مطلع ہے

قصد ہے وصف نگاہِ ناز کی تحریر کا

دو قلم کے واسطے ٹکڑا کوئی اک تیر کا

اکیس اشعار پر مشتمل ہے ردیف میں سوائے ایک استثناء کے کوئی تکرار نہیں ہے۔ بزم بادہ شبانہ، گیسوئے لیلیٰ، زلفِ مشکیں، تصورِ جاناں، کی رنگینیوں کے ساتھ آفاق خدا اور رسول کو بھی نہیں بھولتے۔ ان کی ایک حمد کے اشعار ہیں:

ہے حمد اس خدا کی جس نے کیا ہویدا | اک لفظ کُن سے عالم اور اسکی ساری اشیا

داخل کیا جو ہم کو اُمت میں مصطفیٰؐ کی　　　　فضلِ عظیم یہ بھی ہم پہ ہے اس خدا کا

منشی آفاق کے والد یعقوب سردار تھے، آپ کے دو بھائی علی احمد اور نذیر صنعتِ پارچہ بافی سے متعلق تھے علی احمد کرگھے کی پٹی بنانے میں مشہور تھے جو ڈیزائن بنانے میں کام آتی تھی۔ علی احمد پٹی والے کے صاحبزادے مختار احمد مومن اسکول میں ٹیچر ہیں اور مومن لائبریری بنگال پورہ کے سیکریٹری ہیں۔ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ آفاق کے شاگردوں میں عبدالغنی عزیز، عبدالخالق خلیق مالیگانوی، رفیق احمد انور، منشی زین العابدین اختر (معلم اردو اسکول کلیان)، سلیمان پیکر (ٹنڈیل محلہ)، خاک جلالپوری، عبداللطیف لطفی آفاقی، ضیاء ربانی آفاقی اور محمد ذاکر (حسین مومن) ذاکر قابلِ ذکر ہیں۔ ذاکر حسین جو کلو سیٹھ کے نام سے شہر میں مشہور تھے راقم السطور کے برادرِ بزرگ تھے، انہوں نے ہی ہماری پرورش کی اور تعلیم دلائی، کلو سیٹھ بیحد خلیق اور ملنسار شخص تھے اور اپنی بذلہ سنجی کے سبب عوام میں بیحد مقبول تھے۔ صاحبِ تصنیف ان کے حق میں ہمیشہ دعائے مغفرت کرتا ہے۔

منشی محمد ایوب صابر

آپ کو منشی شوق مالیگانوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ فارسی میں درک اور قدرت حاصل تھی۔ پارچہ بافی وسیلۂ معاش تھا، آپ رکنِ بلدیہ بھی تھے۔ ایوب، م کی معنویت سے صفت صابر آپ کی طبعِ موزوں سے عبارت ہے، نعت و غزل کے علاوہ خمسہ بھی لکھتے تھے۔ تجمل جلالپوری کی غزل جس کا مطلع ہے

لاکھوں ہیں خوش جمال تو ہیں اک حسیں نہیں　　　　لیکن کسی کے حسن پہ مائل ہمیں نہیں

اس غزل پر آپ نے جو خمسہ لکھا ہے اس کا آخری بند یہ ہے:

صابر جہاں میں زندہ رہوں کس امید پہ　　　　حاصل ہوئی خوشی نہ مجھے روزِ عید پہ
موقوف میری عید ہے اس گل کی دید پہ　　　　لمحات زندگی کے بسر کس امید پہ

قسمت میں تیرا وصل جو اے مہ جبیں نہیں

محمد ایوب صابر کے صاحبزادوں میں سے محمد یعقوب صابر مومن پیشہ در فوٹوگرافر مکان اور نقاش ہیں، اسکول میں ڈرائنگ کے استاد ہیں۔ دوسرے صاحبزادے محمد ابراہیم مومن بھی ڈرائنگ کے بڑے مشہور اور ماہر ٹیچر اور ٹیوٹر ہیں۔ دونوں بھائی بیحد خلیق اور ملنسار ہیں۔

محمد ایوب صابر کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

پیچ پر پیچ تری زلف گرہ گیر میں ہے — کیا تعجب جو کوئی بلا مری تقدیر میں ہے
ایک ہی وار میں ہو جاتے ہیں صدہا سیراب — کس قدر بار جہ پر پانی تری شمشیر میں ہے

منشی نعمت اللہ اکرم (متوفی ۱۹۵۶ء)

آپ منشی اختر بریلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، کلاہ دوزی اور کلاہ سازی پیشہ تھا، عوام میں مُلّا منشی کے نام سے مشہور تھے آمدنامہ اور مقیمان تک فارسی پڑھی تھی۔ ناداری اور افلاس میں زندگی بسر کی۔ مروجہ ادبی دستور کے مطابق حمد، نعت اور غزل لکھتے تھے، حضرت علی کی منقبت میں بھی اشعار کہے ہیں۔ تصوف سے لگاؤ تھا اور کسی سلسلہ میں بیعت بھی تھی۔

جہاں میں جس قدر اس شاہ کو الفت تھی حیدر سے
مجھے بھی بس سمجھ لو اس قدر ہے عشق قنبر سے

قنبر حضرت علیؓ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ منشی نعمت اللہ قافیہ پیمائی میں خاک چھان لیتے تھے۔

مَس تک جس نے نہ کی ساقی ہوئے خانے کی خاک
قدر کیا ہو؟ اس کو مٹے کی اور پیمانے کی خاک
دیکھیے اکرم یہ حسن و عشق کی نیرنگیاں
چھانتے ہیں قیس اور فرہاد ویرانے کی خاک۔

مُلّا منشی قرآن کی تفسیر کا علم بھی رکھتے تھے آپ کے کلام میں کلام پاک کی آیتوں کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

ہے خصوصیت فنا فی[۱] مصطفےٰ کی عاشق — ہے یہ مذکور کتاب ایزد و غفار میں
ہے جلوہ ریز جلوۂ محبوب ہر جگہ — اے شیخ! آنکھ ہی تری عین الیقیں[۲] نہیں
قیامت کرے گا تو شوا آئینہ ہو گا — بحکم وانتم تشکلی[۳] تمہارا

منشی نعمت اللہ کے احباب اور ارباب ذوق ان کے مجموعۂ کلام "خزان اکرم" کو شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، واللہ اعلم یہ شرمندۂ تعبیر ہوا یا نہیں لیکن ہماری نظر سے نہیں گزرا۔

---

[۱] سورہ مریم آیت: [illegible] [۲] التکاثر: ۷ [۳] الانشقاق: ۲۳

منشی محمد اسمٰعیل شاکر

آپ منشی منیر صاحب منیر الٰہ آبادی کے تلمیذ تھے۔ غالباً الٰہ آباد کے ہی تھے اور بھیونڈی میں مقیم تھے اور قیاس غالب ہے کہ مدرس تھے۔ محزونیت اور قنوطیت طبیعت میں تھی اس لئے ایسے شعر کہتے تھے۔

کیا لطف بشر اٹھائے گا عہدِ شباب کا ـــ جب زندگی ہے اس کی نمونہ حباب کا

یہ کہہ دینا اے قاصد سنا کر داستاں میری
فقط اک دید کی خاطر ہے اب آنکھوں میں جاں میری

منشی عبدالرشید صاحب رشید

آپ مالیگاؤں کے کہنہ مشق شاعر شوق مالیگانوی کے شاگرد تھے، حضرت شوق نے فن شعر گوئی میں مولانا محمد یوسف عزیز (۱۸۹۰ء - ۱۹۵۷ء) سے فیض پایا تھا۔ یہی فیض و رفیق کا سلسلہ منشی عبدالرشید تک پہنچا۔ آپ ۱۹۱۴ء میں مالیگاؤں کے ایک غریب بُنکر خاندان میں پیدا ہوئے فکر معاش اور تلاش روزگار میں والدین جب بمبئی میں ہجرت کر کے آباد ہوئے تو آپ بہت چھوٹے تھے۔ مروجہ تعلیم حاصل کی اور متداول نصاب فارسی کی تکمیل کی، فن شاعری وہبی اور خداداد تھا عسرت و نکبت نصیب میں تھی، ساری زندگی رہین ستم ہائے روزگار رہے۔

وقت نے خوب مزے میرے ستانے کے لئے
کوئی عنواں نہ رہا باقی فسانے کے لئے
میں وہ مہمل سا ہوں اک شعر زمانے کے لئے
کہ سمجھ کر بھی نہ سمجھے کوئی جس کا مفہوم
مرے ہمدم مرے غم خوار تجھے کیا معلوم

رشید مہمل شعر نہیں بلکہ ایک مکمل دیوان تھے جس کے معنوں میں کرب کی تہہ داری اور معنی تو میں درد مند دل کی بیقراری چھپی ہوئی تھی اور اس کا علم ان کے کورٹ گیٹ محلے کے ہر نوجوان کو تھا جنہوں نے ۵ نومبر ۱۹۶۷ء کو بسلسلہ یوم رشید ایک عظیم الشان طرحی مشاعرہ منجانب بزم مصطفےٰ کمال لائبریری زیر صدارت حضرت نظر مالیگانوی منعقد کیا۔ یوم رشید کے ادبی پروگرام میں مقامی

شعرا حضرات میں یہ حضرات قابلِ ذکر ہیں۔
شبیر احمد راہیؔ ایم۔اے، بیتابؔ بھیمڑوی، زیدؔ عابد، لطفیؔ آفاقی، عرفاںؔ بھیمڑوی، محمد عمر شفیقؔ ایوب فہمی، سلیمؔ فیض آبادی، عزتؔ بھیمڑوی، عبدالقیوم نازاںؔ، ماسٹر ابراہیم صوفیؔ، امین بھارتی مفسطر اعظمی، یوسف بزمی، فلکؔ برہانپوری، اُفقؔ عرفانی، اصغرؔ جونپوری، بشیر نظرؔ مومن، خفیؔ بھیمڑوی، حسن صحرائی بھیمڑوی، غنی ذہینؔ اور روشن بھیمڑوی، ان کے علاوہ ظریف نظام پوری عبدالمجید شادابؔ، ابراہیم مدہوؔ، آغا بھیمڑوی، مشتاق احمد سہیل، مورخ صہبائی، ضیا ہانی، فیضی نظام پوری، وسیم حیدرآبادی، نہال ابوبیے، عبداللہ ہانی، شاکر ادیبی بھیمڑوی نے شرکت کی تھی۔
بیرونی شعرائے کرام یہ مہمان شعرا تھے:
صبا افغانی، اصغر مرزا پوری، شوق سالکی، عبداللہ ناصر، علامہ برقؔ، نور شفیقی، شکیب بنارسی، حسین ادیبی اعظمی، طاہر بستوی، شرر بلیاوی، ثاقبؔ اعظمی، ضمیر کاظمی، رونقؔ دہوی، شاکر جلالی، علامہ ہیجو پنچ اور علاء الدین صابر۔
مذکورہ بالا شعرا کی ایک بڑی کھیپ عالمِ بالا کو پہنچ چکی ہے ان کے نام ایسے مشاعروں کی روداد اور ان کا کلام رسائل و جرائد میں مدفون ہے۔
اس یادگار مشاعرے اور یومِ رشید کی تقریبِ سعید میں اراکین بزمِ مصطفےٰ کمال نے مندرجہ ذیل حضرات کو مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا تھا:
ڈاکٹر مومن محی الدین ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی، محمد یونس رئیس اعظم بھیمڑی، غلام رسول ہدایت اللہ، غلام محمد مومن بی۔اے (چیرمین)، محمد ایوب پنجابی، ڈاکٹر ایم۔ایچ۔مقری، غلام محمد پیر محمد مومن (جنرل اسٹور)، سکندر انصاری (میونسپل کاؤنسلر) محمد خلیل خوشحال، عبدالعلیم انصاری، ڈاکٹر غفران، عبدالملک مدہوؔ، محمد حسن مفتی کرامت (میونسپل کونسلر) عبدالغفور سید (میونسپل کونسلر)، حافظ عبدالقدوس عبدالسلام، حاجی عبدالرزاق امیر، اقبال احمد مومن (میونسپل کونسلر) محمد طیب محمد حسن، عبدالحفیظ (بزمِ مدینہ) غلام مصطفےٰ (نشاط لائبریری)
محلے کے جن نوجوانوں نے یومِ رشید کا شاندار انعقاد کیا ان کے رہنما تھے عرفات شرف (وقتیہ) اور معاونین تھے: محمد عباس اسمٰعیل، محمد ایوب نذیر، محمد بلال خلیل، محمد رمضان عمر، محمد شاد محمد یوسف، محمد اسحاق ابراہیم، محمد مشتاق یوسف، محمد صدیق طاہر، محمد اسحاق یوسف، اقبال احمد یوسف۔

بزمِ مصطفیٰ کمال نے اس موقع پر ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں منشی رشید کے کلام کا بےحد مختصر انتخاب تھا۔ اس انتخاب کا "درِ انتخاب" یہ ہے۔

مری بے کسی یہ آئی شبِ غم اداس کیوں ہے
مجھے شام ہی ملی ہے میں سحر کہاں سے لاؤں

تم سنبھالے رہو کناروں کو ڈوب جاتے ہو بے سہاروں کو

اُدھر تبسم ادھر ہیں آنسو یہ ربط بھی لطف دے رہا ہے
وہ پھول برسا رہے ہیں مجھ پر میں ان پہ موتی لٹا رہا ہوں

ٹھکر برادری کو دوسرے پیشہ ور طبقات پر جو فضیلت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ مہد سے لے کر لحد تک ستر پوشی کے لیے انسان اسی کا مرہونِ منت ہے۔ سید محمد صدیق حسن خاں نے اپنی کتاب رفو الخرقہ بشرف الحرفہ میں احادیث کی روشنی میں قوتِ حلال اور بافندگی کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے، اس کا اعادہ منشی عبدالرشید اس قطعہ میں پیش کرتے ہیں:

تن ڈھانپتا تھا دہر میں جو عیش کا رقیب کپڑے ہی بن کے مر گیا افسوس وہ غریب
قربان جاؤں وقت کے انصاف پر رشید مرنے کے بعد اس کو کفن تک نہیں نصیب

مذکورہ بالا کتابچہ میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر مومن محی الدین نے اپنے "اظہارِ خلوص" میں لکھا تھا:

"نظامِ زندگی کی مجبوریاں رشید مرحوم کو تادمِ مرگ عسرت اور مفلسی کی شکنجوں میں جکڑے رہیں، اس کا ہاتھ ہمیشہ تار و بافوں میں الجھا رہا، مگر وہ ساری زندگی اپنے اور متعلقہ افراد کے مسائلِ حیات کے تار و پود سلجھانے کی کوششیں کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ عروسِ سخن کی زلفیں بھی سنوارتا رہا، چونکہ رشید نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اسی لیے اس کی شاعری میں خلوص بھی ہے اور صداقت بھی اور یہ فن کی عظمت کی دلیل ہے چونکہ خود اس کی زندگی "مفلس کی قبا" کی طرح تھی جس میں وہ ہر گھڑی اپنے قلم کی سوئی اور آنسوؤں کے ٹانکوں سے "درد کے پیوند" لگاتا رہا اسی لیے اس کی شاعری میں خود اس کے دل کی کسک بھی موجود ہے اور انسانیت کا درد بھی۔ گو اس کے کلام میں زندگی کے منفی رجحانات بھی ملتے ہیں اور یاسیت کی سیاہی بھی گھلی ہوئی ہے۔ مگر وہ تو اپنے غم کو دوا ہی کی طرح بجا کر اس کی

پرستش کرتا ہے اور نہ زندگی سے فرار کا کوئی دروازہ ڈھونڈھتا ہے۔ اس کا دل مفلس
کے چراغ کی طرح بجھا بجھا سا رہتا تھا مگر اس میں انسانی محبت کی گرمی اور عوامی خدمت کی لگن
تھی جس کا ثبوت اس کے غیر مطبوعہ کلام اور اس کے کردار میں ملتا ہے۔ بزم محسنانِ اکالی
کے زیرِ نگرانی میں شبیر اور رشمان نعمتی کے ساتھ آپ کا نام بھی شامل ہے:
"تریاقِ خیال" جو مقامی شعرا کے انتخابِ کلام کا گلدستہ تھا اس میں منشی عبدالرشید کی تین غزلیں
شامل تھیں۔ ہر ایک کا مطلع یہ تھا۔

لہو کر دست ہے ارمان کا پہلے لہو کر دے ۔۔۔ وفا پھر شوق سے ترجل کے پانی وفا کر دے
اس کو کب پایا جب ہم نے بادۂ گلنار میں ۔۔۔ جو کہ مستی دیکھتے ہیں چشمِ مستِ یار میں
کیا کروں آپ کا دربار جو شاہانہ ہے ۔۔۔ اے شہِ حسن مری طرز فقیرانہ ہے

محمد حسین خاک جلال پوری

منشی آفاق کے زمرۂ تلامذہ میں تھے، مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ ایک غزل کا مطلع ہے:

یہ بسم اللہ اور یہ طرح ذاکر سخت مشکل ہے
ترے پہلو میں بھی دل ہے مرے پہلو میں بھی دل ہے

متقدمین میں نیر، کیتا، نورالدین ناظر اور نور محمد عاجز ذھولپوری کے علاوہ محمد اسحٰق بیتاب (۱۹۰۹
سے ۱۹۷۱ء) اور پیر محمد عقاب (ولادت ۱۹۱۰ء) کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ ان کے معاصرین
میں عبدالستار شاد، منشی راز بھی تھے ان کا کلام ضائع ہو گیا یا محفوظ نہیں رکھا گیا۔ یہی حال
متقدمین کے مشہور شاعر منشی محی الدین رسا کے کلام کا تھا۔

تریاقِ خیال واحد مجموعۂ کلام ہے جو منظرِ عام پر آیا اور محفوظ رہا۔ اسے معیارِ ادب بنا کر متقدمین
شعراء کے کلام کو پرکھا نہیں جا سکتا، لیکن چونکہ فنکار کا ادبی رجحان اور اس کا معاشرتی رویہ اس
کے طرزِ بیان سے عبارت ہوتا ہے اسی لیے ان کے ذہنی جھروکوں سے ان کے تصوراتِ حیات
کی جھلکیاں دیکھنے میں آ جاتی ہیں۔

روایتی شاعری بھی ہمارا ادبی ورثہ ہے، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ایک دو منشی شعراء کو چھوڑ کر
بیشتر شاعروں کے کلام میں آورد کی بہتات اور آمد کا راستہ مسدود نظر آتا ہے۔ شاید اس
کی وجہ وسعتِ مطالعہ کا فقدان اور مصرعِ طرح پر طبع آزمائی ہے جس کے لیے شاعر ردیف

وقافیہ کے تعاقب میں لُغت تک پہنچ جاتا ہے، تلامذہ کے کلام میں ابتذال کے دھبے بھی نظر آتے ہیں، حافظ اور کبھی کبھار مولانا رومی کی تقلید میں صوفیانہ تلمیحات کی آڑ لے کر ہمارا شاعر 'بیکدست جامِ بادہ و بیکدست زلفِ یار' کی حالت وجد میں کھلے عام اپنے ارادہ کا اظہار کر بیٹھتا ہے۔ اس عہد میں جب قدامت پسندی کی حصاریں اردگرد کھڑی تھیں، حسرت اور اداؤں کو، امنگوں اور حوصلوں کو پست کر دیتے تھے، جنسی ناآسودگی کبھی یا والہانہ جذبات کا دباؤ جس کے تحت شاعر کی نظریں محبوب کے گلبدنی پیکر کا احاطہ کر لیتی تھیں۔ تہذیب اور شائستگی کا ماحول بھی بعض دفعہ 'حدیثِ خلوتیاں' اور 'سرِّ دلبراں' کو بازاروں اور بالاخانوں کی سرگوشیاں بنا دیتا، جب دینی طریقہ پر جینے کا صحیح سلیقہ پیدا ہوتا ہے تو ممکن نہیں کہ زبان تک پاکیزہ بن جاتی ہے۔

تریاقِ خیال

"مطابق پرچہ مسرور کے جب ایا ر ۱۲۵۲ھ میں تریاقِ خیال یعنی بھیونڈی کے چند شعرائے کرام کا کلام بفرمائش اہتمام پہلوان محمد صادق بیگانی اور ثنا اللہ عبداللطیف بھیونڈی در مطبع [illegible] ممبئی نمبر [illegible] بخوبی سے چھپ کر [illegible] بھیونڈی محلہ [illegible] کو ساتھ [illegible]

[illegible]"

تریاقِ خیال کے آخری صفحہ پر دو اشتہار بھی شائع ہوئے تھے:

"آنکھوں کے تمام امراض کا نہ دوا ثرا نہایت معتبر سرمہ حالی [illegible] حکیم [illegible]

بنگالی پورہ اسٹریٹ متعلقہ بھیونڈی ضلع تھانہ سے طلب فرمائیں"

دوسرا اشتہار جو قطعات تاریخ طبع گلدستہ ہذا کے حاشیہ پر ہے

زینت تو اپنے سر کی عزیزو بڑھائیے ٹوپی نئی خریدیے ۔ جوتی دھلائیے

دنا لگایا منشی نعمت اللہ اکرم کا جو ٹوپیوں کا دھندہ کرتے تھے اشتہار تھا۔ واللہ اعلم۔

تریاقِ خیال اور دیگر کلام کے لئے راقم محمد احمد علی احمد [illegible] والے کا شکر گزار ہے۔ آپ منشی محمد ایاس آزاد کے بھتیجے ہیں۔

ارباب حکمت وفن

حکیم محمد شفیع (۱۸۶۵-۱۹۳۴) :

حکیم محمد کی پیدائش پھولپور (الہ آباد) میں ہوئی تھی۔ ان کے والد محمد شفیع اس زمانے میں ترکِ وطن کرکے بھیونڈی آئے تھے جب یہاں پھولپوری جماعت کے سربرآوردہ صاحبان اور افراد صنعت پارچہ بافی میں مالی طور پر مستحکم ہو چکے تھے۔ حکیم صاحب جب بھیونڈی آئے تو ان کا پیشہ پارچہ بافی تھا پارچہ بافندگی کے ساتھ ساتھ حکمت میں بھی دخل رکھتے تھے۔ آپ نے آنکھوں کے تمام امراض کا موثر اور آزمودہ سُرمہ بنایا تھا جو شفاء العین تھا، اور یہ سُرمہ بڑا مقبول ہوا۔ آپ کے صاحبزادے نذیر احمد بھیونڈی میں پیدا ہوئے تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن سایۂ پدری میں انہوں نے بڑی اچھی تربیت پائی تھی اور بڑے مہذب اور با اخلاق نوجوان تھے۔ ۱۹۳۰ء کے طاعون میں نذیر احمد جاں بحق ہو گئے۔ آپ کے اکلوتے صاحبزادے محمد ابراہیم نذیر مومن اس وقت صرف چھ ماہ کے تھے۔ آپ کی پرورش محلہ کی متمول اور رحم دل خاتون محترمہ زیتون محمد رمضان نے کی۔ محمد ابراہیم نذیر مومن کے بڑے صاحبزادے امتیاز احمد جو عمر رجب سیٹھ بمبئی کے نواسے ہیں اس وقت مومن ویلفیئر سوسائٹی کے ناظم اور مومن لائبریری بنگال پورہ کے سیکریٹری ہیں۔

حکیم نور محمد مومن (۱۹۰۱-۱۹۸۰)

آپ بیحد ملنسار، خاموش طبع اور مخلص شخص تھے۔ حکمت و حذاقت کے ساتھ ساتھ قرابادین سے بھی بڑی واقفیت تھی یہی وجہ تھی کہ آپ کی تیار کردہ مختلف ادویات خصوصاً ہاضمہ کا چورن اکسیر ثابت ہوئی تھیں، حق المحنت و حق المعاوضہ لینے سے گریز کرتے صرف دوائیوں کی قیمت لیتے تھے، مریضوں میں تفریق و امتیاز نہیں برتتے تھے شہر کے رئیس حاجی عبد الصمد حاجی محمد مومن اور دیگر رؤسائے شہر کے آپ معالج تھے، راقم کی والدہ ماجدہ آپ کی حکمت کی بڑی قائل تھیں۔ حکمت کے ساتھ ساتھ آپ نے تانے بانے کی نبض بھی تھام رکھی تھی آپ کے ہاتھ کرگھے کے کارخانہ کو ادبیت حاصل تھی۔ کثیر العیال تھے، عبد الحق غیرت انصاری آپ کے صاحبزادے کا شمار شعرائے متاخرین میں ہوتا ہے پروفیسر محمد رفیع انصاری حکیم صاحب کے پوتے ادب کے نبض شناس ہیں اور ادبی نکات کی حذاقت سے واقف ہیں، حکیم صاحب کا خاندان

الہ آباد ضلع کے ہنڈیا موضع میاں گنج سے تعلق رکھتا ہے، بمبئی میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء سے بھیمڑی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

حکیم محمد امین منشی (۱۸۶۵-۱۹۵۵)

پھولپور الہ آباد کے تھے پیر محمد سردار کے برادر نسبتی کے لڑکے تھے، پہلے دھولیہ میں جا کر بسے پھر ایم (بمبئی) کو مسکن بنایا اور آبائی پیشہ کو ذریعۂ معاش بنایا، بھیمڑی اور دیہاتوں کے چکر لگائے بھٹیارا بنے اور بھٹیارا منشی کہلائے پھر بھیمڑی میں مستقل رہنے لگے تو طبابت کی نبض تھام لی، عبدالمجید عبدالرحمٰن جو بانس بریلی کے تھے آپ کے داماد تھے جن کے صاحبزادے یعقوب اور محبوب نے پارچہ بافی کی باگ ڈور سنبھال لی۔ مؤخر الذکر کے لئے لوم سازی بڑی سازگار ثابت ہوئی، حکیم محمد امین منشی کی طبابت و حکمت خداداد تھی اسی لئے غضب کے نباض تھے اور تشخیص میں تخصیص رکھتے تھے، ولی صفت تھے اور بڑی ہنس مکھ طبیعت کے مالک تھے، واضع محد میں بڑی وضعداری سے نوے برس تک شاندار زندگی بسر کی، ماموں زاد بھائی عبدالرحمٰن سردار سے گاڑھی چھنتی تھی۔

محمد رمضان (دیرا) حکیم (۱۸۵۰-۱۹۳۹ء)

موضع نیا پورہ، تحصیل پھولپور (ضلع الہ آباد) میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں بھیونڈی آئے اس مدت میں پھولپوری جماعت پر بہار آ چکی تھی آپ نے دستی کرگھا کی باگ ڈور سنبھال کر اسے ذریعۂ معاش بنایا اور مریضوں کے مفت علاج کو وسیلۂ ثواب قرار دیا، بعض نسخے بڑے مجرب اور آزمودہ ثابت ہوئے جو برسوں مستعمل رہے، زخموں اور پھوڑے پھنسیوں کے لئے نیم کا مرہم بنایا، سفید دانت کے منجن اور درد شکم کے لئے چورن ایجاد کیا، اللہ شافی نے ہاتھ میں شفا دی تھی حقہ کا تمباکو جسے گڑاکو کہتے ہیں بڑی نفاست اور کمال سے بناتے تھے، حقہ گرم کر کے دوسروں کو اس سے لذت اندوز کرتے تھے۔

بہرد حکیم کا محلہ جنگال پورہ کے اسحاق غازی کے ساتھ بھائی کا رشتہ تھا، حکیم جی کے دو بیٹے سعید اور مقبول یادگار ہیں، سعید کے بیٹے عبدالرشید حبشان بی (اسلام آباد) مسجد کے جوار میں رہتے ہیں۔

محمد حسین صیب حکیم چاچا (۱۸۸۰-۱۹۶۱)

بھولے پور۔ فیض آباد سے سنہ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ کلیان کے راستے بھیونڈی آئے، واضع

مطب حبیب سیٹھ نے دستگیری کی، رستی کرگھا کی باگ ڈور سنبھالی پھر ۱۹۴۵ء میں دو دوم نصب کئے اور ترقی کر کے دو سال بعد غوری پاڑہ میں ذاتی مکان بنا کر منتقل ہو گئے اور حکمت میں نام پیدا کیا، مریضوں کے ہجوم میں امیر و غریب دونوں ہی نظر آتے تھے رمضان بو سیٹھ اور حبیب سیٹھ اور دیگر عمائدین شہر کے خاص معالج تھے، سماجی امور سے بید دلچسپی رکھتے تھے قیصر باغ (تھانہ روڈ) میں عید میلاد النبیؐ کے جلوس کے علمبرداروں میں سے تھے، صاحب ذوق تھے اور روشن فکر اور نکتہ داں بھی تھے۔ بنگال پورہ میں سونا پور قبرستان کے اردگرد چہار دیواری کی تعمیر کے سلسلے میں نوجوانوں کو جدوجہد کرتے دیکھا تو تعمیر کمیٹی کے ایک رکن یوسف حسن مومن سے کہا "یوسف میاں! کیا مردوں کے لئے اتنی محنت کر رہے ہو، مردے کہیں بھاگے جاتے ہیں؟ کام کرنا ہو تو زندوں کے لئے کرو، یہ جو آسافنڈ مشاعرے کے لئے جمع کیا ہے اس سے ایکسرے مشین لاؤ اور غریب مریضوں کی خدمت کرو"

محسن اور ناظم دو بیٹے اور تین بیٹیاں یادگار چھوڑی ہیں۔

جان محمد حکیم (متوفی ۱۹۵۵ء)

یوپی کے خانماں برباد خاندانوں کے ساتھ بھیونڈی آئے ہنومان باوڑی (کوٹر گیٹ) میں مقیم ہوئے، وضعدار شخص تھے اور بڑی وضع قطع کے مالک تھے پان کی گلوری منہ میں رہتی تھی اور عطر کا پھایا کان میں، جراحتِ دل کا پھایا رکھ کر مزاج دیسائی کرتے تھے، بڑے نبض شناس اور مردم شناس تھے اسی کے مطابق فیس وصول کرتے تھے۔

خطاط

محمد طیب انصاری

بھیونڈی میں منشی اور ربانی اصحاب عموماً خوشنویس اور خطاط ہوتے تھے۔ منشی محمد رضا (متوفی ۱۹۱۴) کے بزرگ معاصرین میں محمد ایوب انصاری خطاطی اور خوشنویسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے یہی ذریعۂ معاش تھا کتابت کر کے قاعدۂ بغدادی، پنج سورہ اور کلام پاک بہ ہدیۂ بیچ کر روزی کماتے تھے اور اس طرح خدمتِ دین بھی کرتے تھے۔ خطاطی میں مہارت اور کمال کا یہ عالم تھا کہ چاول کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھ کر بمبئی کے میوزیم میں بھیجا جو برسوں برائے نمائش وہاں موجود رہا۔ عربی زبان پر قدرت اور اس کی کتابت میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کے بنائے ہوئے طغرے بڑے دیدہ زیب ہوتے تھے یہ خود پیدل کراچی جا کر ان کی نمائش کر چکے تھے۔

محمد طیب انصاری آٹھ برس کی عمر میں غدر کے پُرآشوب دور میں قافلۂ مہاجرین کے ساتھ بھدہی (جونپور) سے آکر بھیونڈی میں پناہ گزیں ہوئے اور جامع مسجد (سوداگر محلہ) کے ایک مکان میں مقیم ہوئے (یہ مکان اب یعقوب کمپنی والوں کی ملکیت ہے) محمد طیب انصاری کی علمی میراث اور فنی روایات کے وارث ان کے صاحبزادے منشی عبدالاحد انصاری تھے جو اردو اور فارسی میں دسترس رکھتے تھے اور بڑے قابل منشی تھے، منشی جی کے صاحبزادوں میں عبدالرحیم انصاری، عبدالرحمٰن انصاری اور خلیل احمد انصاری ہیں مگر "وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی" — لیکن عبدالکریم خفی نے شاعری میں اور عبدالجلیل انصاری نے صحافت و ادب میں بڑی بات پیدا کی۔

بشیر محمد کاتب

غدر کے مارے ہوئے تھے بھیونڈی میں آئے تو نئی زندگی اور توانائی ملی، درگاہ روڈ پر واقع چرچگی چال میں فروکش ہوئے اور کتابت کا علمی اور معاشی سلسلہ شروع کیا قرآن کی کتابت کرتے تھے، آپ کے فرزند عبدالرشید (جناب) مسلم آرفینیج (صمدیہ نگر محلہ) میں آفس سیکریٹری اور نگراں ہیں۔

مجاہد آزادی عبدالصمد محمد مبین عرف کمال مومن (۱۸۹۹-۱۹۸۳)

ع سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک تیرہ گوہران، بیدار کی نگہداری کر رہی ہے ان میں کمال مومن بھی ہیں جو جنگ آزادی کے محاذ پر اوج کمال کو پہنچے، زندان میں پہنچے دو برس پابند سلاسل رہے، جب آزادی ملی تو صلہ ملا، زمین ملی اور عزت ملی، قومی یک جہتی کے سدا علمبردار رہے۔ ونجار پٹی ناکہ پر بھیونڈی کے مجاہدین آزادی کے ناموں کی تختی میں آپ کا نام بھی شامل ہے۔ عزیز وطن کی محبت میں بیاہ کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور مجرد زندگی بسر کرتے رہے زندہ منش شخص تھے۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

شہر بھیونڈی کی معمر شخصیت غلام رسول غریب کے سگے ماموں اور محمد بشیر مقدم و عبدالمجید کے چچا تھے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہی گاہی باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

سینتیسواں باب

بھیونڈی کی مومن برادری کے

سیاسی، صنعتی، تعلیمی اور سماجی مشاہیر

خدمتِ خلق کے مختلف درجات ہیں اور دائرۂ عمل الگ الگ ہے۔ اسی طرح اعمالِ صالحہ کے اجر و ثواب کی میزانیں جدا جدا ہیں۔ فقراء و مہاجرین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگے یا رسول اللہ مالدار تو بڑے بڑے اعلیٰ درجات اور ابدی نعمتیں حاصل کر گئے اس لیے کہ وہ حج بھی کرتے ہیں اور عمرہ بھی کیا کرتے ہیں اور ہم پیچھے رہ جاتے ہیں اور مقابلہ نہیں کر سکتے۔" رسول اکرمؐ نے فرمایا ہر نماز کے بعد ذکر کیا کرو سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ ذکر کرنے سے تم ان سے فائق ہو جاؤ گے لیکن جب مالداروں کو اس نعمت غیر مترقبہ کا علم ہوا تو وہ بھی صدقات و عبادات کے ساتھ ساتھ ذکر کرنے لگ گئے اور دونوں فضیلتیں حاصل کر گئے۔ فقراء پھر پیچھے رہ گئے اور صورتِ حال سے حضورؐ کو آگاہ کیا تو آپؐ نے فرمایا! "پھر یہ خدا تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عنایت کر دیتا ہے۔"

دولت اور تمول یقیناً اللہ کی نعمت اور احسان ہے۔ صنعتکار، تاجر، مالدار اور صاحب ثروت و اقتدار کے لیے نیکیاں کمانے کے ہزاروں دروازے کھلے ہیں بشرطیکہ دل بھی کھلا ہو اور ہاتھ بھی۔ خدمتِ خلق کا بہانہ چاہیے اور نیت صاف ہونی چاہیے، مسلم معاشرے میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو ہر شعبۂ حیات میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور وہ بھی محدود دائرۂ عمل میں بھی رہ کر خلقِ خدا کی خدمت بجا لاتے ہیں۔ تکوینی حوادث جیسے وبا، سیلاب، طوفان اور زلزلہ اور فرقہ وارانہ فسادات کے دہشت انگیز موقع پر میدانِ عمل میں کود پڑتے ہیں، مومن برادری کے افراد خدمتِ خلقِ خدا کے لیے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔

بعض افراد کسی خاص ادارے یا بلدیہ کے رکن کی حیثیت سے سماجی امور میں عوام کی فلاح و

بہبود کے لئے بڑی سرگرمیاں دکھلاتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کا دائرۂ عمل سب سے زیادہ وسیع ہوتا ہے جو قوم و ملک کی عوامی سطح پر اپنی خدمات بجالاتے ہیں ان کے درمیان بھی فرقِ مراتب ہے اس بزم میں انہیں ڈھونڈھنا کٹھن معاملہ ہے جو صحیح معنوں میں بے لوث، بے غرض اور مخلص ہیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد انہیں بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک حصہ ان مجاہدینِ آزادی کا ہے جن میں سے بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں اور دوسرا حصہ ان اقتدار پسندوں پر مشتمل ہے جو راج گدی پر قبضہ جمانے کے لئے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

مومن کے لئے سیاستِ ملکی اس کے ایمان کے لئے ایک آزمائش ہے اور نیک نیتی پرکھنے کی ایک کسوٹی۔ سیاست کی شاہراہ پر دو اہم موڑ آتے ہیں ایک راستہ وزارت کی منزل تک پہنچتا ہے اور دوسرا راستہ خدمت خلقت خدا کی طرف مڑتا ہے۔ سیاست ایک کھلی بساط ہے جہاں ہر قدم پر شاطرانہ چال چلنا پڑتی ہے۔ چال الٹی پڑ گئی تو بساطِ سیاست الٹ جاتی ہے اور جب الٹی ہو گئیں سب تدبیریں تو جو چال چلی جاتی ہے وہ بری چال بن جاتی ہے۔ پھر مہرا کا رخ بدل جاتا ہے اور آہنی تیغے بھی سرنگوں ہو جاتے ہیں، جب شہ پڑتی ہے تو بڑے بڑے وزیر بھی مات کھا جاتے ہیں اور شاہِ سیاست کی راہِ فرار بھی مسدود ہو جاتی ہے۔

السیاست والاحکام السلطانیہ، اسلامی علوم کا حصہ تھا، سلاطین، وزراء اور شہزادگان کی تعلیم و تربیت کے لئے نصابی کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً امام غزالی کی نصیحت الملوک نظام ملک کی سیاست نامہ اور قابوس بن وشمگیر کی قابوس نامہ۔ اخلاق محسنی اور اخلاق جلالی میں بھی علم سیاستِ مدن و ملکی پر اخلاقیت کے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اب وہ اعلیٰ سیاسی قدریں اور عظیم روایتیں اس جمہوری دور میں بے معنی، فرسودہ اور معطل ہو کر رہ گئی ہیں، آجکل سماجی خدمات کے خود نوشتہ "سپاسنامے" کو نوشتۂ دیوار بنا دیا جاتا ہے اور جو کچھ سیاستداں نہیں جانتا وہ اس کے مخلصین بتلا دیتے ہیں اور تقابل کا شجرۂ نسب ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ اس کے پرکھوں کو بھی علم نہ تھا۔ سیاست ایک دلدل ہے جو اسے عبور کر جائے وہ یکہ تاز شہسوار بن جاتا ہے۔ گرا تو خواب میں دیکھے ہوئے قارون کے خزانے کی طرح دفعتاً ہی چلا جاتا ہے۔

اس تمہید سے اندازہ ہو جائیگا کہ بہت کم ایسے بے ریا اور بے لوث لوگ ملیں گے جو یہ کہہ سکیں "نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا" اور بہت زیادہ سیاست مدار اپنا دار و مدار حصولِ اقتدار

پر رکھتے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے بھی خلائق عامہ کی خدمت کرنے والوں میں یہی فرقِ مراتب روا رکھا
جا سکتا ہے ان میں بھی دو فریق ہیں۔ اصحابِ اجور اور طالبینِ قرب۔ دونوں ہی آخرت کے لئے
عمل کرتے ہیں: پہلا فریق اجر و ثواب کی غرض سے عمل کرتا ہے۔ دوسرا فریق محض خدا تعالیٰ کے
ہاں درجہ و منزلت اور قرب حاصل کرنے کی تعمیل بجا لاتا ہے۔ ان اعمال میں اگر ریاکاری، غرور
اور خود بینی، نمائشِ دولت، نیتِ مفاد، حصولِ شہرت، سماجی مرتبت یا عزت طلبی کا شائبہ تک
ہو تو ریا جیسی موذی اور شرکیہ گناہ کے ارتکاب کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ عامل کی بے خبری اور غیر
شعوری پن کی وجہ سے بعض اعمال برباد ہو جاتے ہیں حبطِ اعمال کے متعلق آنحضرت صلعم کا ارشاد
گرامی ہے: مَنْ تَرَكَ صَلوٰةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ "جس نے عصر کی نماز نہ پڑھی
اس کے عمل ضبط ہو گئے" (بخاری و مسلم)۔ مومن کا فریضہ ہے کہ دل میں جذبۂ عمل رکھنے سے
زیادہ اس عمل کو ہر طرح محفوظ و مصئون رکھنے کی کوشش کرے۔

"ایک شخص نے رات کے اندھیرے میں کسی کو خیرات دی اتفاق سے وہ آدمی چور نکلا، صبح ہوئی
تو محلے میں چرچا ہوا۔ دوسری بار محتاج جان کر ایک عورت کو خیرات دیدی، اتفاق سے یہ عورت زانیہ
نکلی، دوسرے دن پھر لوگوں میں چرچا ہوا کہ رات فلاں شخص نے اس فاحشہ کو خیرات دی۔ رات
میں اس شخص نے خواب میں کسی کو کہتے سنا: تم خاطر جمع رکھو، ہو سکتا ہے جس چور کو تم نے
خیرات دی وہ چوری سے توبہ کر لے، یا وہ فاحشہ تمہاری خیرات پا کر بری عادت چھوڑ دے۔"[1]

اللہ تبارک و تعالیٰ نے نیکیوں کے ہزاروں راستے اور ثواب کمانے کے بیشمار طریقے بتلائے
ہیں اور مغفرت کے بھی کیا کیا سامان پیدا کئے ہیں ایک زانیہ کو باؤلی کے پاس ایک پیاسے کتے کو
دیکھ کر بڑا رحم آیا، ڈول سے پانی بھر کر اس کی پیاس بجھائی، اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔
انسان کی جنسی بھوک ستاتی رہی تو ور تاب ہی حیوان کی پیاس بجھائی تو راہِ نجات لی۔ اللہ
تعالیٰ کسی کے حسنِ عمل کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔

ہم اس دینی تناظر میں شہر کی چند ممتاز ہستیوں کا مجملاً ذکر کر رہے ہیں۔ اس حدیثِ بندۂ مومن
میں ہمارے داخلی تاثرات کا زیادہ دخل ہے پھر بھی ہم معذرت خواہ ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے
کہ دانستہ (نعوذ باللہ) یا نادانستہ ع ایسی ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

---

[1] ڈاکٹر یوسف القرضاوی، اسلام میں غریبی کا علاج ص۲۱۔ متفق علیہ۔ الترغیب والترہیب ج ۱ ص ۱۲

قومی، سماجی اور صنعتی سرگرمیاں

بھیونڈی میں مومن برادری کی سماجی اور شہری زندگی کی سرگرمیوں کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہوا، مقامی کوکنی مسلمان بمبئی کی اپنی کوکنی قوم کی طرح ہر مذہبی اور سیاسی تحریک سے روشناس رہے۔ یہ "دہابی اشتمالیت" کو فسطائی طاقت سمجھتے تھے اور ان سے گریز کرتے لیکن ان کے ساتھ ان کا رویہ رواداری کا تھا اور تعلقے باہمی کی بنیاد پر استوار تھا۔ ۱۹۱۸ء میں 'گنپتی تہوار' کے بانی لوکمانیہ تلک کے اعزاز میں بیرونِ آبادی ماموں بھانجے کے مقام پر جو جلسہ ہوا اس میں قصبہ کے ممتاز فرد علی صاحب فقیہ نے باشندوں کی جانب سے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا تھا۔

۱۹۲۰ء سے خلافت تحریک کی لہر نے بھیونڈی میں بھی سیاسی سرگرمیاں تیز کر دیں، علی برادران بھیونڈی آئے تو "جان بیٹا خلافت پہ دے دو" کا ترانہ گونجنے لگا، جامع مسجد کے سامنے ایک شاندار جلسہ ہوا، عمائدین قصبہ نے بھی تقریریں کیں، اکبر صاحب فقیہ، محمد حسین دعوا اور مصطفیٰ فقیہ کی سیاسی زندگی کا عنفوانِ شباب تھا، اس جگہ کو محمد علی چوک کہنے لگے۔

ایک سال بعد ۲۸ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اس صنعتی قصبہ میں تشریف لائے، پینتیس ہزار کی آبادی والے اس قصبہ میں برادری کی صنعت اور پیشہ سے متعلق یہ جلسہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، جلسہ کے پندرہ سولہ ہزار سے زیادہ مجمع کو امام الہند نے خطاب کرتے ہوئے تمام مسائل عصری سے روشناس کرا کے یہ فرمان صادر کیا کہ چرخے کا کاتا ہوا سوت استعمال کریں اور کھدر کو فروغ دیں، بدیشی مال کا بائیکاٹ کریں۔ ترکوں کی مدد کے لئے انگورہ فنڈ میں صاحب حیثیت کوکنی اور مومن مخیر حضرات نے گیارہ ہزار روپیہ اکٹھا کر کے چندہ دیا، ان جلسوں کا یہ اثر ہوا کہ جگہ جگہ چرخہ انجمنیں قائم ہو گئیں اور کھڈیوں پہ بدیشی کپڑوں کے الاؤ جلنے لگے۔ کانگریس کمیٹی کی بھیونڈی شاخ اور مضبوط ہو گئی اور جنگِ آزادی کا ایک مضبوط مورچہ یہاں قائم ہو گیا۔

اسی دوران کلکتہ سے جمعیۃ المومنین کی تنظیم کی شاخیں پھوٹیں اور سارے ملک میں جہاں جہاں برادری کی بستیاں تھیں برگ و بارِ شجر سایہ دار بن کر بہار دکھلانے لگیں بھیونڈی میں اس کا قیام ۱۹۳۲ء میں عمل میں آیا۔

بھیونڈی: جمعیۃ المومنین (۱۹۳۲ء – ۱۹۳۴ء)

۱۹۳۲ء میں جمعیۃ المومنین کی بنیاد پڑنے کے بعد مہوان باؤڑی میں ایک جلسۂ عام ہوا۔

محمد عمر محمود نے جو بمبئی کے اردو اسکولوں کے سپرنٹنڈنٹ تھے جلسہ کی صدارت فرمائی یہ جمعیۃ
کے سیکریٹری تھے احمد عمر رجب (مرحوم بمبئی) نے جلسہ سے خطاب کیا مومن برادری کے یہ
پہلے فرد تھے جو جنیوا (آسٹریا) عالمی مزدور کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندہ بن کر گئے، دوسال
بعد دوسرے جلسے کی صدارت مالیگاؤں کے مشہور وکیل اور خادم قوم شیخ عبدالعزیز عبداللطیف
نے کی، کرلا میونسپلٹی کے صدر، برادری کے ممتاز اور عزیز فرد عبدالرحمن فیت والا نے بھی شرکت کی۔
بھیونڈی کی جمعیۃ المومنین کی مجلس عاملہ کے عہدیداران مندرجہ ذیل افراد تھے:

محمد یعقوب جعفر۔ (میونسپل کونسلر) صدر

سیٹھ عبدالصمد حاجی نعل محمد مومن (نائب صدر بلدیہ بھیونڈی) نائب صدر

منشی عبداللطیف۔ سیکریٹری

میاں جی جیون۔ نائب سیکریٹری

منشی محمد یٰسین محمود۔ خزانچی

صدرالدین بدل سیٹھ۔ محاسب

اراکین مجلس عاملہ: محمد یوسف جان محمد خواجہ، کامریڈ عبدالغفار،
محمد سیٹھ، محمد یعقوب

اسی زمانے میں بھیونڈی میں احرار تحریک کی بنا ڈالی گئی لیکن وہ اپنی موت آپ مرگئی۔
۱۹۲۵ء میں کانگریس کے مشہور رہنما راجندر پرشاد بھیونڈی آئے، جلسہ کی صدارت قصبہ کے مشہور
صنعت کار عبدالصمد حاجی نعل محمد سیٹھ نے کی، راجیندر بابو کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء
کے پُر آشوب دور میں ترکِ موالات کی تحریک پر قصبہ میں بڑے ہنگامے ہوئے۔
اس سیاسی ہیجان اور شورش کے پس منظر میں صنعت کاروں اور متمول لوگوں کا وہ طبقہ عجب گومگو
کی حالت میں تھا اس طبقہ کا معاشی اور تجارتی مفاد برطانوی حکومت کے نظرِ کرم سے وابستہ تھا، جو تشنہ
اور عاقبت اندیش طبقہ اتنی سیاسی بصیرت رکھتا تھا کہ اس سیاسی جدوجہد کے غبار میں دھندلا دھندلا
نوشتۂ تقدیر پڑھ لے، وہ یہ نکتہ بھی نہیں بھولا تھا کہ آج کے یہ درماندہ فقیر کل کے بادشاہ بننے والے
ہیں۔ اسی سے ان کی ہمنوائی میں یہ طبقہ زبان کھلی رکھتا، مگر اس مجبوری دور میں کھلم کھلا انگریز
دشمنی مصلحت کا تقاضہ نہ تھا کہ ان کی دشمنی اچھی تھی اور نہ ان کی دوستی۔ پھر بھی حالات کہہ رہے تھے
سدا ہونے تم دوست جن کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟ — یہی دوستی نبھانے کی نظریہ تھے

جو بظاہر مفاد پرست ضرور تھا لیکن ہوشمند اور بیحد محتاط تھا حکام بالا کی دلجوئی کے سامان ڈھونڈھتا رہتا۔ مغربی تعلیم سے آراستہ اور مغربی تہذیب سے پیراستہ مسلمانوں میں ایک اور طبقہ موجود تھا۔ اس کے نمائندے اکبر صاحب دیوکر ایک کوئی زمیندار تھے، علی صاحب فقیہ انگریزوں کی وفاداری کا صلہ پا چکے تھے۔ حاجی میاں سکندر پٹیل کے خاندان کا ایک فرد اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن جا چکا تھا سیٹھ عبدالصمد حاجی لعل محمد کی دعوت پر گورنر سر راجر لمئے بھیونڈی آئے اور اسی طرح لارڈ لنلتھگو جو آگے چل کر وائسرائے ہند بنے، سیٹھ صاحب کی دعوت پر ان کے پاور لوم کارخانے کا معائنہ کرنے آئے سنہ ۱۹۲۸ء سے جس کی بنیاد پڑ چکی تھی اور یہیں سے قصبہ کی صنعتی تاریخ میں صنعتی انقلاب کے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ جب حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد سیٹھ نے ہاتھ کرگھا کے ساتھ پاور لوم پر پارچہ بننے کا آغاز کیا تو مومن برادری کی چوراسی جماعت نے پنچایت کرکے زبردست احتجاج کیا اور ۲ ہزار کے قریب بنکروں کا ایک مورچہ تھانہ کلکٹر کی آفس پر گیا اور یادداشت پیش کی۔ ان بالا حکام وقت کے شاندار استقبال اور شاہانہ ضیافت کی ہوشربا داستانیں ہم بچپن سے سنتے آرہے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۰ء کی ہیجان انگیز تحریکوں نے مومن برادری میں بھی سیاسی شعور پیدا کر دیا تھا، اور اب اس کے باشعور طبقے نے سماجی اور شہری سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا، سنہ ۱۸۸۰ء سے بھیونڈی اور نظام پور کے علاقوں سے بلدیہ کی رکنیت کے لئے انتخاب عمل میں لایا جانے لگا۔ چالیس سال تک برادری کا کوئی امیدوار چناؤ کے میدان میں نہیں اترا۔ سنہ ۱۹۲۵ء کے الیکشن میں برادری کے تین اولین امیدوار منتخب ہوئے عبدالشکور صاحب دین، عبدالرشید منشی مومن اور طبیب کریم بخش، سنہ ۱۹۲۸ء میں عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن، عبدالحق فقیر محمد مومن اور محمد یعقوب جعفر مومن بلدیہ کے منتخب رکن بنے، اسی سال عبدالصمد سیٹھ صدر بلدیہ کے عہدے پر فائز کئے گئے یہ پہلے مومن فرد تھے جو صدر چنے گئے اس سے پہلے سنہ ۱۹۲۶ء میں علی صاحب حاجی میاں فقیہ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں غلام مصطفیٰ امین صاحب خطیب اس عہدۂ جلیلہ سے سرفراز ہو چکے تھے۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے تاریخی سال تک پچھلے بیس برسوں میں مومن برادری کے کئی ممتاز افراد سیاسی میدان کے شہسوار رہے ان میں یہ حضرات تھے: سمرد مہر و مومن (سنہ ۱۹۲۱ء)۔ محمد عبدالرحیم مومن (سنہ ۱۹۳۲ء)۔ محمد قاسم حافظ سردار (سنہ ۱۹۳۶ء)۔ حاجی محمد زبیر (سنہ ۱۹۲۶ء)۔ عبدالشکور حاجی لعل محمد (سنہ ۱۹۳۷ء) غلام قاسم سبحان بجور۔ محمد ایوب عبدالحق پنجابی (سنہ ۱۹۲۰ء)۔ ابراہیم محمد شفیع مومن (سنہ ۱۹۳۰ء)۔ عبدالستار عبدالرحمٰن (سنہ ۱۹۲۳ء) عبدالحق پیر محمد سردار (سنہ ۱۹۲۴ء)

عبدالکریم حسین مومن (۱۹۴۳ء)۔ غلام محمد مومن (۱۹۴۶ء)۔ عبدالقادر عبدالرحمن انصاری (۱۹۴۶ء) عبدالحمید خدا بخش (۱۹۴۶ء)۔ محمد عمر صاحب دین (۱۹۴۶ء)۔ عبدالرؤف عبدالحق پنجابی (۱۹۴۶ء)۔ محمد یعقوب حاجی لعل محمد (۱۹۴۶ء)۔ باقر منشی عبداللطیف (۱۹۵۲ء) محمد ایوب چھیدی مومن (۱۹۵۲ء)۔ محمد عمر برادری (۱۹۵۲ء)۔ زود محمد یوسف مومن (۱۹۵۶ء) محمد عمر نصیح اللہ مومن (۱۹۶۱ء)۔ عبدالرحیم محمد یعقوب مومن (۱۹۶۱ء)۔ اقبال احمد حاجی محمد باقر مومن (۱۹۶۱ء)۔ سکندر محمد یونس انصاری (۱۹۶۱ء)۔ محمد حسن منشی کرامت مومن (۱۹۶۱ء) عبدالباری محمد یوسف مومن (۱۹۶۱ء)۔ امیر احمد محمد بشیر مومن (۱۹۶۱ء)۔

مومن خواتین نے بلدیہ کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا چنانچہ دو اولین خواتین جو منتخب ہو کر رکن بنیں وہ تھیں۔ خدیجہ محمد صدیق مومن (۱۹۴۰ء، ۱۹۴۳ء اور ۱۹۶۱ء) اور حفیظہ بیگم پیر محمد (۱۹۴۶ء)۔ اس کے بعد حلیمہ محمد حسین مومن ۱۹۵۲ء میں اور کلثوم شریف ۱۹۵۷ء میں بلدیہ میں چن کر آئیں۔ محمد قاسم سردار ۱۹۵۲ء میں اور ۱۹۶۲ء میں غلام محمد مومن نائب صدر منتخب ہوئے۔

صنعتی اور سیاسی مشاہیر

خانصاحب حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن

۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور میں الہ آباد کی مومن برادری کی معیشت کے تانے بانے انگریزوں کی منتقمانہ کارروائیوں سے تباہ و برباد ہو گئے۔ پرگنہ چائل کے باغی مولوی لیاقت علی کا غدر میں ساتھ دینے کا نتیجہ تھا۔ جبل پور کے جو چند آبائی قرابت دار خاندان بھیونڈی آئے ان میں لعل محمد فقیر محمد جس بخش، سردار محمد حنیف میاں جی، میاں جی الٰہی بخش اور پیر محمد عبدالشکور سردار کے گھرانے شامل تھے۔

خانصاحب حاجی عبدالصمد لعل محمد کہ جنہیں عرف عام میں لالو سیٹھ کہتے تھے صاحبزادے تھے۔ آپ ذہین، ذکی الطبع، حوصلہ مند اور عاقبت اندیش تھے۔ آبائی پیشہ پارچہ بافی تھا اور بھیونڈی صنعتی مرکز۔ لیکن انہوں نے کرگھے کی پیداوار کو اپنی دوررس نظروں میں سست رفتار دیکھی وہ ایک پُرجوش خیال نوجوان تھے ان کے پرواز تخیل کی سرعت اور سیمابی صفت طبیعت کچھ

اور وسعت کی طلبگار تھی۔ وہ انگلستان کے اٹھارویں صدی کے صنعتی انقلاب اور اس کے رد عمل میں بمبئی میں پاور لوم کے کارخانوں کے قیام کے بارے میں معلومات رکھتے تھے ۱۸۵۱ء میں بمبئی میں سب سے پہلی کپڑا مل کاؤس جی نانا بھائی داور نے شروع کی تھی ۱۸۶۲ء تک تیس ملوں میں ہزاروں مزدور محنت کا کام کر رہے تھے ان میں مومن مہاجرین بھی تھے۔ جو بائی کلہ اور ناگپاڑہ کے علاقوں میں آباد تھے۔

انہوں نے ۱۹۲۸ء میں پاور لوم پر ساڑیاں بننے کا آغاز کر کے بھیمڑی کی صنعتی تاریخ میں ایک نیا باب کھولا اور برادری کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ مشیت ایزدی سے ان کی جد وجہد نے ان کے نصیب کے تالوں بازو کو ایسا سلجھایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ قصبہ کے سب سے دولت مند صنعتکار بن گئے۔ ان کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد کے تار و پود سارے ضلع میں پھیل گئے۔
بھیونڈی میں پارچہ بافی کے صنعتی انقلاب کے اصل محرک حاجی عبدالصمد سیٹھ ہی ہیں۔

امداد باہمی اور اشتراک و تعاون کا تصور سب سے پہلے خانصاحب کے ذہن رسا میں پیدا ہوا، بھیونڈی ہینڈ لوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی لمیٹیڈ (قائم شدہ ۱۹۲۰ء) ایک مہاراشٹر بھر میں سب سے پہلی سوسائٹی تھی۔ آپ تاحیات اس کے صدر رہے اور مالی امداد بھی کرتے رہے۔ یہ سوسائٹی ان کی قیادت میں اتنی مستحکم اور خود کفیل بن گئی کہ بازار پیٹھ میں پارک پر ایک بلڈنگ خریدی جو آج ان کی یادگار بن گئی ہے۔

خانصاحب وقت کے نبض شناس تھے اور سیاست کی گردش اور صنعتی رجحان پر ان کی نظر رہتی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں بلدیہ کے صدر بنے، ۱۹۲۱ء میں نائب صدر اور پھر ۱۹۲۶ء کے چناؤ کے ذریعے سے ان کے چھوٹے بھائی حاجی عبدالشکور حاجی لعل محمد دو مرتبہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۵۷ء تک مسند صدارت پر رونق افروز رہے۔ ۱۹۲۲ء میں جمعیۃ المومنین بھیونڈی شاخ کے نائب صدر مقرر ہوئے اور پھر متعدد انجمنوں اور تعلیمی اداروں کے سرپرست رہے۔

خانصاحب یادگار زمانہ لوگوں میں سے ہیں جن کی دینی، تعلیمی اور سماجی خدمات کا بیش بہا سرمایہ موجودہ نسل کا قیمتی ورثہ ہے، اور یہ ایسا نوشتۂ دیوار ہے جسے آنے والی نسلیں مدتوں پڑھتی رہیں گی، دارالعلوم صمدیہ، یتیم خانہ، خانصاحب حاجی عبدالصمد گرلز ہائی اسکول کی عمارت، میونسپل دواخانے سے ملحقہ حاجی عبدالصمد تشخیص خانہ وغیرہ کی تعمیر اور بنیاد انہیں کے جود و سخاوت کا صدقات جاریہ ہیں۔

ان کے فیض و کرم سے سینکڑوں طالب علموں نے علم کی دولت پائی اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں خود راقم السطور ان کا احسان مند ہے کہ انہیں کی مالی اعانت سے ہم نے میٹرک کیا ان احسان مندوں کے زمرے میں بہت ہی کم ہوں گے جو اتنی اخلاقی جرأت سے اس عظیم احسان کا اعتراف کریں گے جس طرح استاذی شبیر احمد انصاری نے کیا ہے:

"اگر الحاج عبدالصمد سیٹھ اور الحاج عبدالحق پنجابی مرحوم نے مالی معاونت نہ کی ہوتی تو شاید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا میرے لیے ممکن نہ ہوتا" [1]

رمضان کے بابرکت مہینے میں ان کے فیضان کرم کے دریا کا دھارا بڑھ جاتا۔ دور دراز سے فقرا، مساکین، عاملین زکوٰۃ، محلے کے غارمین (قرضدار) ابن السبیل (مسافر) وغیرہ ان کے دولت کدے پر زکوٰۃ اور چندہ کے لیے آتے تھے، غریب رشتہ دار عورتوں کو کپڑے کا جوڑا اور نقد دیتے تھے۔ دور دور کے شہروں سے بھی سفرا (عاملین) مساجد، مدارس اور یتیم خانوں کی تعمیر کے لیے چندہ لے جایا کرتے تھے، خود اپنے آبائی وطن پھولپور (الہ آباد) میں بھی حاجی عبدالصمد سیٹھ دینی امور کے لیے صدقات کی خطیر رقم بھیجا کرتے تھے، کئی فلاحی ادارے ان کی مدد سے چل رہے تھے، برادری کے عظیم ستون، شہر کے رہنما اور جمعیۃ المومنین کے سرگرم رکن تھے، بدایوں سے نکلنے والے مومن رسالہ کے مربی اور سرپرست تھے۔ عظیم شخصیتوں سے مراسم تھے۔ مایہ ناز سے مولانا عبدالحمید نعمانی، خانصاحب عبدالرحیم، چراغ حسن سیٹھ اور اکابرین دین ملنے آتے تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ تھے آخر عمر میں حدیث اور دینی کتب کا مطالعہ زیادہ کرنے لگے تھے ۱۹۵۹ء میں انتقال فرمایا۔ آپ کا جنازہ مشہور تھا۔

آپ کے اکلوتے صاحبزادے محمد یونس ۱۹۷۶ء میں ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ نسلی لحاظ سے کوئی وارث موجود نہیں رہا لیکن خانصاحب کے صدقات جاریہ کا فیضان آج تک عام ہے۔ صمد نگر، صمدیہ ہائی اسکول اور صمدیہ گرلز ہائی اسکول وغیرہ جب تک آباد رہیں گے خانصاحب حاجی عبدالصمد سیٹھ کی نیکیوں کی داستانیں آنے والی نسل کے دلوں اور ذہنوں سے محو نہ ہو پائیں گی۔

---

[1] آئینہ (تذکرہ شعرائے بھیونڈی) ملک مومن ایم۔ اے بھیونڈی ۱۹۹۱ صفحہ ۴۳

حاجی عبدالشکور حاجی لعل محمد مومن (ولادت سنہ ۱۹۱۴ء)

آپ خانصاحب کے چھوٹے بھائی ہیں۔ بحمداللہ بقید حیات ہیں، خاموش طبیعت پائی ہے اور ساری زندگی نہایت خاموشی سے ملک، قوم، برادری اور عوام کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ میونسپلٹی کے دو مرتبہ صدر بنے اور تین مرتبہ رکنیت حاصل رہی، کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر ہیں، پارچہ بافی کی صنعت سے گہری دلچسپی رہی اسی سے متعلق تمام اداروں سے وابستہ ہیں، ساڑی مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے صدر تھے، حکومت مہاراشٹر کے دکاس منڈل کے چیئرمین مقرر ہوئے اور رہانڈ بوم بھیونڈی کی دائمی رکنیت حاصل ہے۔ دیورس کوآپریٹیو سوسائٹی کی آپ نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔

مسلم آرفینج (یتیم خانہ) سمرنگر میں آپ کے اور محمد ایوب پنجابی کے تعاون سے یک وسیع قطعۂ اراضی بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی کو ملا ہوا ہے، اس پر سمدیہ دیورس ہائی اسکول کی شاندار عمارت تیار ہو چکی ہے، اسی کے روبرو عبدالشکور ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کی خوبصورت بلڈنگ نظر آتی ہے اور رابعہ گرلز اسکول کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔

آپ کے دو صاحبزادے نثار احمد اور سعید احمد کاروبار سنبھال رہے ہیں، تین صاحبزادیاں ہیں سب دوانی تعلیم یافتہ ہیں خالدہ ریاض مومن ایم۔ اے ہیں اور شہناز ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ ہیں۔

محمد یعقوب جعفر (۱۸۵۳ - ۱۹۳۸ء)

ایصالِ ثواب کے مشروع طریقے میں صدقۂ جاریہ کو بڑی فضیلت حاصل ہے، مومن اپنی حیات میں کوئی ایسا کام کر جائے کہ بعد از وفات اسکو فائدہ پہنچے ان میں مسلم کی حدیث کے مطابق ثواب جاریہ کے یہ تین کام ہیں کہ موت کے بعد بھی ثواب میت کو پہنچتا ہے۔

اذا مات الانسان انقطع عملہ الا من ثلاث صدقۃ جاریۃ
او علم ینتفع بہ او ولد صالح یدعو الہ

جب انسان مرتا ہے تو اس کا عمل بند ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے۔
صدقہ جاریہ، علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور صالح اولاد جو اس کے حق میں
دعا کرے۔

ڈپل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا، رفاہِ عامہ کے لئے بنوائے ہیں اور محمد یعقوب پل اور یعقوب روڈ جس کی تعمیر سنہ ۱۹۲۱ء میں محمد یعقوب جعفر میونسپل کونسلر نے اپنے ذاتی خرچ سے کی اسی زمرۂ صدقات میں شامل ہے۔ یعقوب پل نے نظام پورہ کی قدیم بستی کو اسلام آباد یعنی ناس بھیونڈی قصبہ سے جوڑ دیا جس کا بچھلا نالہ برسات میں کاموی ندی کے چڑھاؤ کے وقت ناقابلِ عبور بن جاتا تھا۔

بھیونڈی میں سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں جمعیۃ المومنین کی بنیاد پڑی تو آپ ہی کی کوششوں سے آپ کے محلہ ہنومان باڑی (کراؤنڈ گیٹ) میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا تھا جس کا ذکر گذشتہ ہو چکا ہے۔ آپ ہی اس کے پہلے صدر چنے گئے تھے۔ محمد یعقوب نجیب سلیم الطبع، حق پرست اور حق گو تھے۔ برادری کے خادم، محلہ کے لیڈر اور قوم کے مخلص خیر خواہ تھے۔ میونسپلٹی میں آپ کے معاصرین میں حاجی عبدالصمد، ان کے بھائی حاجی عبدالشکور، سمرو عبد مومن، محمد عبدالرحیم مومن، محمد قاسم حافظ سردار، عبدالحق فقیر محمد اور حاجی محمد زاہد شامل تھے۔ محلّے کے معاصرین بزرگ میں سلیمان علاء الدین، عبدالرحیم سعدن اور یوسف کونڈ ڈرنک قابلِ ذکر ہیں۔

محمد ایوب پنجابی (ولادت ۱۹۱۸ء)

محمد ایوب ولد عبدالحق پنجابی (مومن) کی سیاسی، تعلیمی اور سماجی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، کانگریس کے سرگرم رکن، عہدہ دار اور خادمِ قوم ہونے کے ناطے ملک کے عظیم رہنماؤں سے آپ کے تعلقات تھے۔ کانگریس صد سالہ جشن جو آل انڈیا مومن کانفرنس کے زیر اہتمام دلی میں ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا اس کی مجلس عاملہ کے آپ رکن بنائے گئے تھے۔ بھیونڈی میں مومن کانفرنس، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے بڑے بڑے رہنماؤں کی آمد پر آپ کے دولت کدے پر [illegible] ہوتے تھے۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے فسادات کے موقع پر محمد ایوب پنجابی، غلام محمد مومن، بیرسٹر ساکھر انصاری، ڈاکٹر سید پٹھان اور دیگر سربرآوردہ لوگوں کی میٹنگیں امن اقدامات کے سلسلے میں یہیں ہوتی رہیں۔ نگر ک بینک کے چیئرمین رہے، دیوان کو آپریٹو سوسائٹی کے اعلیٰ ستون تھے اور تعلیمی اداروں سے وابستہ ہے۔ راقم کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ایوب بھائی نے جو مدد کی تھی وہ ان کا عظیم احسان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا ان کو اجر عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد ایوب پنجابی ۱۹۴۰-۴۳ء اور ۱۹۵۷-۶۱ء بلدیہ کے رکن رہے آپ اسکول کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ حاجی محمد ایوب پنجابی ایک خاموش طبع سماجی خادم رہے، تعلیمی اداروں سے بھی بےحد دلچسپی لیتے رہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے عرفان محمد ایوب پنجابی نے ملک کے مشہور ٹکنیکل ادارے آئی آئی ٹی سے کیمسٹری کی اعلیٰ ڈگری لی ہے دوسرے صاحبزادے جاوید پنجابی بھی سائنس گریجویٹ ہیں۔ عرفان ایوب پنجابی بھیونڈی ریورس ایجوکیشن سوسائٹی کے خصوصی رکن ہیں (۱۹۹۳-۱۹۹۰ء)۔

عبدالرؤف پنجابی

تاریخی تسلسل برقرار رکھنے کے لیے پنجابی خاندان کے تیسرے سماجی خادم اور بے لوث عوامی خدمت گزار اور کارکن عبدالرؤف عبدالحق پنجابی کا ذکر یہاں موزوں اور مناسب ہوگا۔ آپ نے عملی طور پر کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا سوائے اس کے کہ خاندانی روایت کو برقرار رکھنے کے لیے والد عبدالحق فقیر محمد پنجابی اور برادر بزرگ محمد ایوب پنجابی کی طرح بلدیہ کے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۲ء رکن رہے لیکن تعلیمی میدان میں آپ کی گرانقدر خدمات کا اعتراف ہر شخص کو ہے، آپ مومن ویلفیئر سوسائٹی کے زمانہ صدارت میں برسوں نادار اور مستحق طلبہ کے لیے چندہ اکٹھا کرتے رہے۔ رکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ، چندہ کمیٹی، اسکول کمیٹی اور دیگر ضمنی کمیٹیوں کے فعال اور سرگرم رکن رہے قیادت کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی لیکن تجارت اور صنعت نے قائد کی بجائے کامیاب تاجر بنا دیا۔ آج بھی ۱۹۴۲-۴۳ء کا "بلیک بورڈ" بھیونڈی کے ان باشندوں کو یاد ہے جو گرانی اجناس سے غذائی مشکلات میں مبتلا تھے، یہ ایک عوامی تحریک تھی جو ترکستان میں عہد وسطیٰ کے غازیوں کی تحریک کی یاد دلاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب شہر میں ہیضہ کی وبا پھیلی تو آپ کی کوششوں سے اور بلدیہ کے تعاون سے حفیظ اللہ امانت اللہ سردار کے مکان میں ایک عارضی قرنطینہ کا قیام عمل میں آیا جس کی وجہ سے فوری علاج کے سبب سینکڑوں مریضوں کی جانیں بچ گئیں۔ آپ نے ایسی فضا میں جب مرگ انبوہ کا نظارہ درمیان میں تھا اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور مریضوں کو قرنطینہ پہنچاتے رہے۔

عبدالرؤف پنجابی کثیر العیال ہیں، اپنے صاحبزادوں کو اچھی تعلیم دلائی۔ بڑے صاحبزادے سعید احمد پنجابی اور دوسرے صاحبزادے اقبال احمد پنجابی بھیونڈی ریورس ایجوکیشن سوسائٹی

کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے سنہ ۱۹۹۰ء تا سنہ ۱۹۹۳ء۔ آپ کے چھوٹے صاحبزادے محمد عادل اختر پنجابی مشہور ٹکنیکل ادارے وی۔ جے۔ ٹی۔ آئی کے سند یافتہ انجینیر ہیں۔ سعید احمد پنجابی فنڈ کمیٹی کے چیرمین بھی تھے۔

عبد القادر عبد الرحمٰن انصاری (ولادت ۶ر جنوری سنہ ۱۹۲۱ء)

بھیونڈی نظام پور میونسپلٹی کی رکنیت اور شہری اور سماجی خدمات کے پیشِ نظر یہاں صرف "قدمار" کا ذکر ہو رہا ہے اور ان متقدمین میں انصاری صاحب کا نام جو عوام میں "قادر جناب" کے خطاب سے معروف ہیں اسی فہرست میں آتا ہے ان کے دادا مولا بخش الہ آباد سے سنہ ۱۸۵۹ء میں دیگر مہاجرین خاندانوں کے ساتھ آئے۔ آپ ہونہار طالبعلم تھے اور لائق مدرس اور استاذ کئی نسلوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا اور سنہ ۱۹۴۲ء سے لے کر سنہ ۱۹۷۶ء تک کلیان اور بھیونڈی میں ہائی اسکول بھیونڈی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ تحریکِ آزادی میں مسلم لیگ کے سبز جھنڈے تلے ان کی قومی خدمات آج بھی ذہنوں میں سرسبز ہیں، اس جماعت کے سیکریٹری بھی رہ چکے تھے، مومن ویلفیر سوسائٹی کے بانیوں میں سے ہیں۔ انکساں پاور لوم ایسوسی ایشن کے سنہ ۱۹۵۶ء سے صدر ہیں، سنہ ۱۹۴۶ء تا سنہ ۱۹۵۲ء بلدیہ کے رکن رہے۔ بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے آپ رکن تھے۔ عید میلاد النبی کمیٹی کے زیرِ اہتمام نکلنے والے سالانہ جلوس کے بانیوں میں سے ہیں۔ آپ بڑے مخلص انسان ہیں۔ شہر کے جملہ تعلیمی و سماجی امور سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

بھیونڈی کی مومن برادری کے دو ستارے:

آئے جو قِراں میں دو ستارے ٭ کہنے لگا ایک دوسرے سے

یہ وصل مدام ہو تو کیا خوب ٭ انجامِ خرام ہو تو کیا خوب

تھوڑا سا جو مہرباں فلک ہو

ہم دونوں کی ایک ہی چمک ہو ٭ (اقبالؒ)

— گویا علامہ اقبال نے "دو ستارے" نظم لکھی تھی بھیونڈی کے دو ستاروں کی تقدیر [illegible] مرحوم غلام محمد مومن بی۔ اے اور شبیر احمد انصاری سنہ ۱۹۴۲ء کے ہیجانی دور میں

جب سیاسی دھندلکا چھٹنے لگا تھا اور آزادی کی پو پھٹنے والی تھی جیونٹی کے سیاسی اُفق پر ابھرے
برادری کے یہ دو اولین گریجویٹ تھے جو جونا گڑھ کے بہاء الدین کالج سے فاتحہ فراغ پڑھ کر
قوم کی نیازمندی اور خدمت کی نذر ہو گئے یہ دو نئے شاہین تھے جو نئے ولولوں اور حوصلوں کے
شہپروں کے ساتھ عزم و ہمت کی چٹانوں پر نشیمن بنانے کے لیے پر تول رہے تھے: عملی
میدان میں دونوں نے ساتھ ساتھ قدم اٹھائے اور ساتھ ساتھ چلے، تعلیم و تدریس سے آغاز
سفر کیا، پھر سماجی اور صنعتی میدان میں امداد باہمی کے ادارے قائم کر کے اپنی خدمات کا علم
بلند کیا، سامنے سیاسی سمندر کی بیکرانیاں تھیں، دونوں کے پاس ہمتوں کی پتوار اور حوصلو
کا سفینہ تھا، مسلم لیگ کا جھنڈا سیاست کے مستول پر بلند کر کے نوجوانوں کا قافلہ لے کر
ساحل مراد کی سمت چلے، کانگریس اور خلافت تحریک کی کشتی تو بہت آگے رواں دواں تھی
اس میں بڑے جہاندیدہ شناور اور ملاح موجود تھے۔ یہ دونوں رہنما دور افتادہ پرانے مسلم لیگی
ناخداؤں کا احسان اٹھاتے رہے، عسکری تنظیم نیشنل گارڈز قائم کیا، فوجی تربیت دی جانے
لگی لیکن جب تقسیم ملک کی قینچی ہندوستان کے نقشے پر چلی تو مسلم لیگ کا نقشہ ہی بدل
گیا۔ ہندوستان کے نقشے پر ترنگا لہرانے لگا اور جمہوریت قائم ہو گئی۔ اس پار کے مسلمان اپنے
خوابوں کی سنہری تعبیر پورے کرنے لگے۔ اور وہ مسلم لیگی جو یہیں رہ گئے کچھ تو مصلحت اندیشی کی بنیاد
پر نئے خوابوں کی تعمیر کرنے لگے اور ایک معتدبہ حصہ قوم پرست بن گیا۔

ان دونوں مومن رہنماؤں اور سیاست کے رستاروں کا "انجام خرام" یہ نکلا کہ دونوں کی بزم بزم
ٹوٹ گئی، اور دونوں کی گردش کا مدار الگ ہو گیا غلام محمد مومن بی۔ اے اپنے دیرینہ ساتھی شبیر
احمد راہی ایم۔ اے سے دو اعلیٰ ڈگری انہوں نے اس دوران میں حاصل کر لی تھی کٹ کر رہے
ساتھیوں سے جڑ گئے اور سرخ جھنڈا بلند کر کے سرخرو ہو گئے پھر [illegible] بن گئے لیکن ان
سرگرمیوں کی گرم بازاری میں مومن صاحب کے کارہائے نمایاں [illegible] گی اور خدمات عظیم
کی متاع عزیز کا اندازہ لگانا ممکن ہے جن سے یہ شہر اس [illegible] کے عوام فیضیاب
ہوتے رہے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر میں "واحد متکلم" [illegible] نے جو منظوم مرثیہ لکھا تھا
وہ میرا حق شاگردی تھا، اسی سے چند اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ [1]

---

[1] یہ مضمون غیر مطبوعہ رہا اور اصل مسودہ کھو گیا تھا میرے دیرینہ دوست حاجی محمد اقبال بی ٹیر دیگاں پورہ)
نے میری درخواست پر اپنا نسخہ دے دیا ہے، ان کا شکر گزار ہوں۔

شہر بھیونڈی کا مردِ مومن۔ غلام محمد مومن بی۔ اے (۱۹ اگست ۱۹۱۹ء - ۱۳ جولائی ۱۹۸۹ء)

"دورِ غزنوی کے مشہور مورخ اور انشار پرداز خشی ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ بیہقی میں "وَفَیَاتُ الاَعیان" کے باب میں" ایک قریبی عزیز کی وفات کا نثری مرثیہ اس طرح شروع کرتا ہے "لختی قلم را بر او بگریانم"— ذرا اپنے قلم کو اس کی موت پہ رلاؤں" اس ایک جملہ میں نوحہ گر نے اپنے سارے غموں کو سمیٹ لیا"

"بھیونڈی کے تاریخی شہر کی سرزمین سے بہت سارے کامیاب انسان ذرہ اور زمین کے ذروں سے اٹھے، کچھ ابن الدنیا بن کر جیے اور ہمیشہ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا کے طلبگار بنے رہے، کچھ لوگ جو دنیا کے پرستار تھے سینت سینت کر مال اکٹھا کرتے رہے اور سورۂ التکاثر کی تفسیر بن کر رہ گئے، لیکن مرحوم غلام محمد مومن ان خاک نشینوں میں سے تھے جو اپنی محنت، لگن اور حوصلوں کے بل بوتے پر اٹھے اور مسند نشین بن گئے، اور خداداد صلاحیتوں کے شعلوں سے چمکے اور اپنی قوم کے لئے مینارۂ روشنی بن گئے کہ ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی"

"غلام محمد مومن صاحب جامع الصفات تھے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں، ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی وہ مومن برادری کے مردِ مومن تھے اور قوم کے مجاہد جو پابند سلاسل بھی رہے اور دار و رسن کی آزمائش سے بھی گذرے اور بندوق کی نال کے سامنے سینہ سپر رہے اگر طاقتِ گویائی کی معراج حق گوئی ہے تو یہ معراج مومن صاحب کو حاصل تھی، اقلیتوں کا مسئلہ ہو یا اکثریت کے مفاد کا سوال، ملکی، قومی، تعلیمی اور صنعتی مسائل ہوں یا برادری کے معاملات غرض کہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس پر مرحوم نے عوام الناس کے سامنے اور ارباب حل و عقد کے روبرو اپنی رائے اور نقطۂ نظر بے باکی سے پیش نہ کیا ہو، وہ با اصول تھے اور اصول کی جنگ لڑتے رہے۔ ہر محاذ پر چاہے دلی ہو یا ممبئی میونسپلٹی ہو یا فسادات کا مقدمہ۔ انہوں نے پارچہ بافی کی صنعت کو سلجھایا اور برادری کو سماجی پستی سے اوپر اٹھایا مدرس اور معلم کی حیثیت سے کئی نسلوں کی نصلوں کی نشوونما کی۔ درسگاہوں اور مختلف تجارتی اداروں کی تاسیس کا پہلا بنیادی پتھر رکھا اور معمارِ قوم کہلائے۔"

غلام محمد مومن صاحب ۱۹۴۶ء میں بلدیہ کے رکن بنے اور پھر بنتے چلے گئے، ۱۹۶۳ء میں نائب صدر بنے۔ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی نے ان کی بیش بہا تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ان کے نام سے غلام محمد مومن گرلز کالج قائم کیا ہے۔

شبیر احمد انصاری راہی ایم۔ اے (ولادت ۱۰ محرم ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۲ اپریل ۱۹۲۰ء)

استاد کی فضیلت اور اس کے منصب کی رتبت کا اندازہ شارع علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتا ہے جب انہوں نے ایک نوجوان کو مخاطب کر کے فرمایا:

> "تیرے تین باپ ہیں ایک وہ جس کے نطفے سے تیری پیدائش ہوئی یعنی تیرے والد دوسرے وہ جس نے تجھے اپنی بیٹی دی (سسر) اور تیسرے وہ جس نے تجھے علم و آگہی بخشی (استاد)" [1]

آج قدریں بدل گئی ہیں، استاد اور شاگرد کے بیچ وقت کے بہاؤ کے ساتھ ایک خلیج بنتی چلی جاتی ہے جس میں سیاست کا گدلا پانی مل کر اور ذاتی مفاد کا دلدل تعلقات کو کثیف بنا دیتا ہے۔ اب ہر چیز بکاؤ بن گئی ہے، تعلیم کی منڈی کے نئے تاجر اور دلال پیدا ہو گئے ہیں، عالم کی بے قدری خود اس کے اپنے والوں کے ہاتھوں ہوتی ہے اور یہ نادان لوگ یہ نہیں جانتے کہ: ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون (الزمر: ۹)

> "وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ جو علم نہیں رکھتے کیا برابر ہیں"

شبیر احمد انصاری راہی (تکلف برطرف اب انہیں شبیر جناب لکھیں گے) میرے ہی نہیں سینکڑوں طلبہ کے روحانی اور علمی باپ تھے، ان میں وہی پدرانہ شفقت تھی، سالار کی شیفتگی مجاہد جیسی وارفتگی اور بردباری سے دلبستگی کے سارے آثار اور اوصاف ان کی ذات سے عیاں تھے انہیں اوصاف کے بل بوتے پر چمکے اور جولانی [illegible] آیا تو میدان سیاست میں بڑی جولانیاں دکھلائیں، مسلم لیگ سے لگاؤ [illegible] بن کر علمی و ادبی و دینی منبر میں سرگرم رہے، شعلہ بیان مقرر ہیں اور اب تک ہزاروں جلسوں میں شرکت کر کے ان گنت الفاظ خرچ کر چکے ہیں، ہم نے شبیر صاحب کا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب ان

---

[1] ہمارے فرائض اور حقوق - حافظ نذر احمد، مسلم اکادمی لاہور ۱۹۸۱ء ص ۱۹۳

کی شہرت کا سورج اوج پر تھا اور خطابت کا سمندر موج پر۔ ایک دفعہ راہی صاحب بھٹک گئے۔ سیوا سمیتی کے نام سے پارٹی بنائی اور ایک ہی جست میں بلدیہ کی صدارت کی مسند پر جا پہنچے۔ لیکن جب اقتدار کی اونچی کرسی کے اردگرد چھوٹے آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو وہ خود توفیق کے اہل نہیں ہوتے دوسروں کو بھی محروم کر دیتے ہیں ایسے بونوں کے جھگھٹوں میں بڑے آدمی کی بڑائی بھی چھوٹی لگنے لگتی ہے۔۔ اور وہ بھی بلدیہ کی سنہری اور زرتار سیاست شبیر جناب علمی، دینی اور ادبی میدان کے شہسوار ہیں ان کا مقام کیا ہونا چاہیے یہ اہلِ بصیرت جانتے ہیں، آپ آل انڈیا مجلس مشاورت اور انجمن تحفظ ناموس صحابہؓ سے منسلک رہ چکے ہیں، آپ کا تعلق مختلف سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیموں سے ایک سرگرم رکن اور رہنما کی حیثیت سے برسوں قائم رہا۔ چونکہ رسم شبیری ادا کرنا جانتے تھے اسی لیے، فسادات کے موقع پر آپ کو زنداں میں ڈال دیا جاتا۔ اب سیاست سے دامن چھڑا لیا ہے اور دین کی حبل المتین مضبوطی سے تھام لی ہے بقول خزاں کے سے

ڈوبتے ڈوبتے رب یاد آیا — یاد آیا بھی تو کب یاد آیا

وقار غلام محمد مومن (۱۳ر جنوری ۱۹۴۶ء) (بی۔کام۔ایل۔ایل۔بی)

بھیونڈی کی سیاسی تاریخ نے جب نیا موڑ لیا تو کئی رہبران اور رہنمایان سیاست سرگرم نظر آنے لگے ان میں وقار غلام محمد مومن بڑے نمایاں تھے۔ سیاست وراثت میں ملی ہے۔ اور اے۔آر۔انتولے جیسے شاطر کھدڑی کی تربیت اور رہبری حاصل تھی۔ ان ہی کے زیر سایہ ان کی خداداد صلاحیتیں نکھر گئیں۔ انہیں کی "شہ" پاکر بساطِ سیاست میں آگے بڑھے۔ ایک الیکشن میں مخالف پارٹی کے امیدوار کو مات دی اور بھوسلے صاحب کی جاٹرنگ وزارت میں نائب وزیر بنے۔ مومن برادری کے پہلے فرد ہیں جو مسند وزارت تک پہنچے۔ جب بساطِ سیاست الٹ گئی تو جواں مرد وقار نے اپنا سیاسی وقار نہیں کھویا بلدیہ کے الیکشن میں اپنے مہرے بڑی کامیابی سے آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ کئی سماجی اداروں سے وابستہ ہیں غلام محمد مومن گرلز کالج بھیونڈی کی مجلس انتظامیہ کے رکن ہیں، ۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۴ء قانون ساز اسمبلی کے رکن تھے اور ۱۹۹۱ء کے سال سینئر وزیر تھے۔ بہ قیادت، مالیات، غذا اور آب پاشی کے محکمے آپ ہی کے پاس تھے۔

محمد ابراہیم انصاری (بی-کام) (ولادت ۱۹۳۴ء)

محمد ابراہیم انصاری کی زندگی میں کچھ ایسے تاریخی حادثات اور واقعات گذرے ہیں کہ وہ "روایت" بن گئے ہیں آج سے برسوں پہلے (۱۹۶۳ء میں) لوگ ان کے نام سے اس وقت روشناس ہوئے جب ان کے ایک مراسلہ کے جواب میں مدیر انقلاب عبدالمجید انصاری متواتر ایک سال "قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم" کے عنوان سے 'کالم' لکھتے رہے جس کا ذیلی عنوان تھا "محمد ابراہیم بی۔کام کے مراسلہ کے جواب میں"۔ یہ قصۂ درد اتنا مشہور ہوا کہ انقلاب کے قارئین کو دونوں انصاریوں سے ہمدردی ہوگئی" دراصل یہ مراسلہ نوجوان محمد ابراہیم انصاری کے دردمند دل کی عرضداشت اور سرگذشت تھی جس نے بزرگ عبدالمجید انصاری کو بھی ایسا متاثر کیا کہ انہوں نے اس کے پس منظر میں اپنا "قصۂ درد" بیان کرنا شروع کردیا کہ کس طرح قوم کا ایک یتیم لڑکا نودہ تیبوہ جزیرہ کے یتیم خانہ سے تعلیم حاصل کرکے اپنی لگن اور محنت سے خود ہی ایک خوابوں کے جزیرے کا مالک بن گیا۔ یہ روزنامہ انقلاب تھا جو آج ہندوستان کا ایک مؤثر اور مقبول اخبار ہے۔

عبدالمجید انصاری نے تو "حدیث دیگراں" کے بہانے اپنا قصۂ درد سنادیا لیکن محمد ابراہیم انصاری "سر دلبراں" کا لحاظ کر گئے، اور یہ نہیں بتلایا کہ وہ خود بھی یتیم ہوگئے جب وہ چار سال کے تھے ان کے والد کریم اللہ جان محمد کا ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوگیا، چلتا ہوا کاروبار ٹھپ پڑ گیا۔ کارخانہ فروخت کرنا پڑا، انہوں نے جوں توں کرکے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کرلی، ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر ایک جگہ ملازم ہوگئے اور رات ایک شبینہ اسکول میں پڑھنے لگے، میٹرک کیا تو حوصلہ بڑھ گیا، ایک بیرونی طالبعلم کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی سے اقتصادیات میں بی۔کام کیا اور پھر کبھی بیکار نہیں رہے۔ کچھ دنوں انکم ٹیکس کی وکالت کی لیکن مزاج اور اصولوں نے ساتھ نہیں دیا، اسی لئے صنعت پارچہ بافی کے میدان میں ڈٹ آئے۔ جد و جہد کی حد یہ تھی محنت اور لگن کی تھاہ نہ تھی ایسے ڈوب کر ابھرے کہ اعتبار تک پا گئے اور پھر محمد ابراہیم انصاری روایت بن گئے — !

۱۹۸۴ء کے فساد میں انصاری صاحب کا سرسبز و شاداب "انصاری باغ" اجڑ گیا یہاں تینتیس ۳۳ مسلم پناہ گزینوں کو بلوائیوں نے زندہ جلادیا اور یہیں پر وہ محاذ قائم ہوا جب محمد ابراہیم انصاری اور ان کے بڑے صاحبزادے اعجاز انصاری نے کئی سو مسلح بلوائیوں کا تین گھنٹے سے اوپر مجاہدوں کی طرح مقابلہ کیا، تقریباً دو ہزار کتابوں پر مشتمل ایک نادر خزانہ لوٹ لیا گیا۔ انصاری باغ اہل علم کا مرجع تھا۔

محمد ابراہیم انصاری متمول بھی ہیں اور مخیر بھی، حاجتمندوں کی بڑے انشراح سے حاجت روائی کرتے ہیں، عمائدینِ شہر میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ مختلف صنعتی، تجارتی اور تعلیمی اداروں سے متعلق ہیں۔ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی تقریباً ساٹھ برسوں سے ایک ہی ڈھرے پر چل رہی تھی لے دے کے ایک اسکول چلا رہی تھی جب آپ مجلس عاملہ کے ممبر بنے تو ایک نئی سمت کی نشاندہی کی جس کے نتیجے میں ایک ٹیکنیکل ادارہ اور ایک گرلز کالج کا قیام عمل میں آیا۔ ان دونوں اداروں کا وجود محمد ابراہیم انصاری کا رہینِ منّت ہے۔ بھیونڈی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے آپ صدر ہیں۔

حاجی محمد یونس حاجی ولی اللہ (۱۹۱۶ء۔۱۹۸۵ء)

حاجی ولی اللہ جان محمد، اعظم گڑھ کے جہاں گنج سے ہجرت کر کے ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ بھیونڈی میں آکر بس گئے تھے۔ روزگار ڈھونڈتے آئے تھے، ہاتھ کرگھے پر بُنکری کرنے لگے دیانتداری اور محنت کا پھل ملا، آہستہ آہستہ اپنا کاروبار شروع کیا اور اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور سعادتمند اولاد کی نعمت بھی ملی، جس نے مال بھی کمایا اور نام بھی کمایا اور دولتِ آخرت بھی کمائی۔ محمد یوسف، محمد ایوب، محمد اسماعیل، محمد ابراہیم اور محمد عثمان۔ محمد یونس حاجی ولی اللہ نے سب سے زیادہ نام کمایا۔ پاور لوم کے ساتھ سائزنگ بھی قائم کی۔ سلک اینڈ آرٹ سلک ایسوسی ایشن کے تاسیسی بانیوں میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کرنے کا حوصلہ بھی دیا تھا۔ مدرسہ مفتاح العلوم کی تعمیر اور ہندوستانی مسجد کی تعمیر نو میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ بنا سیر امنڈل کے اہم معاون تھے۔ امتِ مسلمہ کے تعمیری کاموں میں بڑے انشراح کے ساتھ اعانت فرماتے۔

حاجی محمد یونس سیٹھ کا سب سے تابناک کارنامہ تبلیغ دین ہے۔ آپ نے اپنی بھرپور تبلیغی جماعت کو مستحکم کیا اور اس کے ساتھ بیرونی ممالک میں اشاعتِ دین کا کارنامہ انجام دیا۔

آپ تادمِ حیات تبلیغی جماعت کے ساتھ رہے اور آج یہی جذبہ ان کے بھائیوں میں ہے خصوصاً محمد عثمان حاجی ولی اللہ اس وقت جماعت کے فعال رکن اور مبلغِ دین ہیں۔

حاجی محمد جسیم عبدالرشید سردار

عبدالرشید سردار موضع مہاراج گنج (ضلع اعظم گڑھ) کے ایک سردار خاندان کے فرد تھے۔ غالباً آپ کے والد غدر کے زمانے میں بھیونڈی تلاشِ معاش میں آئے تھے۔ عبدالرشید دستی رکھا چلاتے تھے ان کے بھائی عبدالغنی ڈرائیور تھے پہلے بھیونڈی بمبئی کی بس اور بعد میں ایس۔ ٹی کی بس چلاتے تھے۔ آپ عبدالرشید کے لڑکوں کا بڑا خیال رکھتے تھے اور ان کی تعلیم سے دلچسپی لیتے رہے۔

محمد جسیم سردار ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مزدوری کرنے لگے۔ عبدالحق پنجابی کے کارخانے میں پاورلوم چلاتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک پاورلوم خود کا نصب کیا، پھر محنت اور لگن سے لوم میں بتدریج اضافہ کرتے گئے اور ایک ایک قدم بڑھا کر ترقی کے زینے طے کرنے لگے۔ سوتی ساڑی۔ نیواڑ کی سوتی پٹی، تولیہ اور مصنوعی ریشم کے پارچے بنتے رہے اور مشینوں کی تعداد بڑھتی رہی اور پھر آپ بھی کارخانہ دار بن گئے" اور محلہ کی سربرآوردہ ہستیوں میں شمار ہونے لگے اور شہر کے عمائدین میں آپ کو ایک امتیازی مقام حاصل رہا۔

محمد جسیم سردار، جماعت کے سردار کی حیثیت سے بھی امتیازی شان رکھتے تھے، برادری کے امور سے بڑی دلچسپی لیتے تھے، باہمی تنازعات کے فیصلے بھی کئے اور سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ بمبئی کے ڈاکٹر آر۔ جی۔ پٹیل اور بھیونڈی کے دیگر ڈاکٹروں کے تعاون سے جنتا سیوا منڈل قائم کیا اس کے زیر اہتمام غریب مریضوں کو طبی سہولتیں دی جاتی تھیں، ٹی بی کے مرض کے خاص معالجین سے رجوع کیا جاتا تھا، حاجی یونس ولی اللہ، حاجی عبدالغفور مرشد، مبین ماسٹر، ابراہیم معوا اور شفیق پٹیل وغیرہ کا تعاون بھی حاصل رہا۔

محمد جسیم سردار ۲۰ برس تک دارالعلوم دیوان شاہ کے صدر رہے، پندرہ برس تک ایس۔ ٹی۔ ایم رہے۔ اہلسنت والجماعت کے بڑے ستون تھے۔ ۱۹۷۳، ۱۹۸۶ اور ۱۹۹۱ میں فریضۂ حج ادا کیا، آخری مرتبہ حج کے موقع پر راقم اور بیگم کی ملاقات حرم شریف اور جدہ میں ہوئی، بڑی محبت کا اظہار کیا۔

اس مشہور و معروف ہستی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، ناگپور میں دورۂ قلب سے ناگہانی موت ہوئی۔ تدفین بھوسار محلہ قبرستان بھیونڈی میں عمل میں آئی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے اقبال جسیم سردار مومن کانفرنس کے فعال رکن ہیں۔

نئے انصاری مُدبّرین

حاجی نظام الدین انصاری[1] اور ان کے بھائی ضیاء الدین انصاری شہر کے ممتاز تاجروں میں شمار ہوتے ہیں۔ حاجی صاحب تجارت اور سیاست کا گٹھ جوڑ بنائے رکھے ہیں اور دونوں کا درک اور تجربہ رکھتے ہیں۔ بھیونڈی شہر بلاک کانگریس کمیٹی کے صدر ہیں اور ان کی رہنمائی میں کانگریس کیا موڑ لیتی ہے یہ مستقبل ہی بتلائیگا کیونکہ حالات حاضرہ کا بحران اور سانحات کی پرچھائیاں دکھا رہی ہیں کہ خود دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

حاجی صاحب ایک حساس دل رکھتے ہیں اور مسلمانوں کے تمام فلاحی اداروں کی دل کھول کر مدد کرتے ہیں۔ آپ کے بھائی حاجی ضیاء الدین کامیاب تاجر اور دور اندیش صنعتکار ہیں آپ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر غیاث الدین نے ارازی میموریل ہسپتال قائم کیا جو ضلع بھر میں فقید المثال ہے معنی اور صوری اعتبار سے ایک مکمل شفا خانہ ہے۔

محمد رفیق انصاری شہر بلاک کانگریس کمیٹی کے نائب صدر ہیں۔ دو انصاریوں کی رہنمائی شاید سیاسی سفر کے لیے نیک فال ہے۔ انصاری وقار احمد شہر کے یوتھ کانگریس کمیٹی (آئی) کے نائب صدر ہیں۔ کانگریس کے ساتھ وابستہ کچھ اور افراد تھے لیکن وہ اتنے فعال رکن نہ تھے مثلاً خالد عبدالمجید انصاری، عبدالحمید (گاندھی) وغیرہ۔

مجتازل۔ اول بدر کرانہیں نظریت پر قائم ہے جس کے لئے یہ برسوں سے جدوجہد کر رہی ہے۔ ان مقامی مجاہدین میں جو ممتاز مومن فراد ہیں ان کے نام یہ ہیں: ایڈوکیٹ نیاز احمد مومن ایڈولیٹ مختار احمد مومن، سکندر انصاری، فاروق ذاکر حسین مومن۔ محمد سعید محمد ابراہیم مومن۔ فیاض احمد طاہر مومن۔ ہے یس انصاری (کونسلر)، مشتاق خلیل مومن۔ عبدالخالق مومن۔

مزدور اور ترقی پسند تحریک

بھیونڈی کی سماجی و سیاسی تاریخ ان یادگار زمانہ بزرگوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو

---

[1] حاجی نظام الدین اور رفیق ساجد بیت انصاری برادران کا ذکر دسواں باب اترپردیش و شمالی ہند کی انصاری برادری میں مولانا کے تحت سے ہو چکا ہے۔

اگلے وقتوں کے لوگ تھے اور جو اپنے طور پر مگر ایک خاص نظریے اور معاشی و سماجی تحریک و تنظیم کے زیرِ اثر بڑے خلوص سے خلقِ عامہ کی خدمت کرتے رہے۔ آسودگانِ خواب میں برادری کے کامریڈ بالا میاں اور کامریڈ عبدالغفار نے قوم و ملت کی آسودہ حالی کے خواب دیکھتے دیکھتے آنکھیں موند لیں۔ کامریڈ خلیل شاہجہاں پوری اپنے وقتوں کے جیالے "ساتھی" تھے، محترم بزرگ عبدالمجید فرز   انہیں لال جھنڈا والوں کے ساتھ تھے۔ "انقلاب زندہ باد" اور "مزدور زندہ باد" کے نعرے لگانے والوں کی ریاکاری اور بے حسی کا ایسا تجربہ ہوا کہ وہ تائب ہو گئے۔ (ایک واقعہ انہوں نے ہم سے بھی بیان کیا تھا۔) اپنی مسلسل جدوجہد، ایمانداری اور خلوص کے طفیل انہیں اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔ سعادت مند اولاد کی نعمت حاصل ہے، بچیاں ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پابند صوم و صلوٰۃ ہیں بڑے صاحبزادے عبدالسلام انصاری ماہر علاج سرطان ہیں اور ابوالکلام انصاری انجینیرنگ کا کارخانہ چلاتے ہیں واجہ محلے کے ایک ناخواندہ مگر بے حد فعال کامریڈ محمد یحییٰ عبدالغفور مومن ہیں۔ باقر منشی عبداللطیف جیون بھی مزدور تحریک سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔

مبین ماسٹر، کامریڈ بالا میاں اور کامریڈ عبدالغفار بھیونڈی کی مزدور تحریک کے علمبردار تھے۔ ۱۹۳۰ء میں بھیونڈی ٹیکسٹائل مزدور یونین کے نام سے تحریک کی بنیاد پڑی۔ بھیونڈی جیسے صنعتی شہر میں مزدوروں اور کارخانہ داروں کے بیچ طبقاتی کشمکش اور تناؤ کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا، عالمی تحریکیں اور معاشی تنظیمیں ہر صنعتی ملک میں قائم ہو چکی تھیں، نام مختلف تھے لیکن نظریاتی وحدانیت یکساں تھی (سوشلزم، کمیونزم اور ادب و تاریخ میں مارکسزم کے لات و ہبل تراشے گئے۔ بے دینی اور الحاد کا آسیبی سایہ ذہنوں پر چھایا رہا، پرولتاری یعنی محنت کش مزدور طبقہ پچھتر سال تک قیمتی خوابوں کا سرمایہ بڑھ کر تصور میں سرمایہ دار بن گیا تھا۔ حقیقت اور تاریخ بڑے بے رحم واقع ہوئے ہیں جنہوں نے اپنی درانتی اور ہتھوڑے کے ضرب سے اس کھوکھلے نظام کے بتوں کو شکستوں سے چور کر دیا۔ بڑے بڑے لات و ہبل منہ کے بل گر گئے ہو اللہ احد کہتے ہوئے سر بسجود ہو گئے۔ دنیا کے نقشے پر نئی اسلامی سلطنتیں سرسبز ہونے لگی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے برسوں پہلے کارل مارکس کی آرزو میں کہا تھا ؎

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر

کامریڈ انصاری اسرار احمد (ولادت ۱۵ ستمبر ۱۹۵۰ء)

لال گوپال گنج (الہ آباد) کے انصاری اسرار احمد "لال باؤٹا" پاورلوم مزدور یونین کے علمبردار ہیں، بھیونڈی میں تازہ (سنہ ۱۹۶۴ء) وارد ہیں لیکن جانے پہچانے لگتے ہیں یہ ان کی ہمہ جہت سرگرمیوں کا صلہ ہے بھیونڈی کے فساد نے آپ کو سی پی ایم کا حامی بنا دیا، سنہ ۱۹۷۰ء تا سنہ ۱۹۸۰ء ضلع کمیٹی کے سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتے رہے، لال باؤٹا یونین کے سائے تلے جوانی کے سترہ سال کاٹ دیے۔ سی آئی ٹی یو کے جنرل کونسل کے رکن بنے رہے۔ خالص مزدور اور عوامی تحریک کی سرگرمیاں ان کے ادبی اور تعلیمی مشاغل میں مانع نہیں رہیں، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے خصوصی رکن نامزد کیے گئے ہیں۔ بزم مساوات سے بھی یکساں طور پر رشتہ اخوت قائم کر رکھا ہے اور ادبی سرگرمیوں میں بڑی گرم بازاری پیدا کی ہے، مشاعروں کا انعقاد ان کی مساعی جمیلہ کا رہین منت رہتا ہے، رہین ستم ہائے روزگار رہتے ہوئے بھی برادری کے خیال سے غافل نہیں رہتے جس کی بہبود کا انہیں ہر دم خیال رہتا ہے۔ بڑا درد مند دل رکھتے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں سے ایل آئی سی سے منسلک ہیں سنہ ۱۹۹۲-۹۳ء کے گوشوارے اور میزان کے حساب سے آپ کا شمار ضلع تھانہ کے چوٹی کے ایجنٹوں میں ہوتا ہے۔ ڈویژنل سینیئر کلب کے ممبر ہیں۔

تعلیمی اور سماجی ہستیاں

محمد صدیق عبدالباری مومن بی۔اے (ولادت سنہ ۱۹۲۷ء)

بلدیہ کی رکنیت کے دائرہ عمل سے باہر رہ کر اور کسی سیاسی پارٹی سے ناوابستگی کے باوجود برادری کے اکثر افراد بڑے پیمانے پر نہ سہی ایک محدود حلقے اور محلے میں سماجی خدمات سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ تقریباً ہر محلہ میں ایسا گروہ ضرور ملیگا جو مسجد یا مدرسہ کی تعمیر اور شادی اور غمی کے موقع پر برادری کی خدمت بجا لاتا ہے۔

محمد صدیق عبدالباری مومن بہت ساری تعمیری تحریکوں کے پیشوا تھے، ان کی بیش بہا خدمات صرف محلہ کی حد تک محدود نہ تھیں بلکہ برادری کے لیے وقف تھیں، مومن ویلفیئر سوسائٹی

کے سیکریٹری کی حیثیت سے انہوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے جو جد و جہد کی ہے اس کی شہادت مومن طلبہ کی کئی نسلیں دے سکتی ہیں جو خود مومن ویلفیئر سوسائٹی کی مالی اعانت سے تکمیل تعلیم کر کے آج برسرِ روزگار ہیں۔ ان کا سب سے عظیم کارنامہ سوناپور قبرستان کے اردگرد چہار دیواری کی تعمیر ہے جو محلہ کے نوجوانوں کے تعاون سے تکمیل پایا۔ اس تعمیری خدمت میں جن نوجوانوں نے بھرپور حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی قبرستان کے بلند باب الداخلہ کی لوح میں محفوظ ہیں۔ [1]

محمد صدیق عبدالباری کا ہم نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہ ہر سماجی کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ بہت سارے امور انہیں کی قیادت اور مشورے سے انجام پاتے تھے۔ راقم ان کا بےحد ممنون ہے۔ ہمارے قیامِ انگلستان کے دوران محمد صدیق مومن متعلقہ مخیر حضرات اور رشتہ داروں سے زکوٰۃ اور مالی اعانت کی رقمیں اکٹھا کر کے ہمیں بھیجتے تھے۔ راقم اپنے بڑے بھائی یوسف ابراہیم مومن کا بھی شکر گذار ہے جو میرے وظائف کے سلسلہ میں بےحد تگ و دو کرتے تھے اور رقم بھیجا کرتے تھے۔

محمد صدیق مومن بھیونڈی ایجوکیشن سوسائٹی کی پہلی مجلس عاملہ کے صدر تھے۔ محمد صدیق مومن تنظیمی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مومن کرکٹ کلب اور مومن والی بال ٹیم کے قیام اور تنظیم میں آپ کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ مومن لائبریری بنگال پورہ جس کا قیام ۱۹۵۶ء میں عمل میں آیا۔ آپ کی مساعیٔ جمیلہ کی یادگار ہے۔ آپ اس کے بانی صدر تھے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے لحنِ داؤدی عطا فرمایا ہے۔ اسماعیل یوسف کالج جوگیشوری کے ثقافتی پروگراموں میں آپ کے سنگیت کی سرگم سے فضا نغمہ بار بن جاتی۔ سیرۃ النبیؐ (عید میلاد النبیؐ) کے جلسوں میں آپ جب پُرسوز آواز میں شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی یہ 'دعا' سناتے تو سامعین پر وجد طاری ہو جاتا:

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو	میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
صحبتِ اہلِ صفا، نور و حضور و سرور	سرخوش و پُرسوز ہے لالہ لبِ آبجو !
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق	ساتھ مرے رہ گئی، اک مری آرزو

---

[1] دیکھیے باب۔ بھیونڈی کی مومن برادری کی دینی جماعتیں، تعلیمی اور سماجی ادارے اور علمی و ادبی انجمنیں

محمد صدیق اگر اسی طرح برادری کے تعلیمی اور سماجی امور سے دلچسپی لیتے رہے تو بابائے برادری کے خطاب سے سرفراز کئے جائیں گے۔

غلام مصطفیٰ عباس مومن (۱۹۲۲ء — ۱۹۸۶ء)

آپ غلام محمد مومن کے بھائی تھے، رئیس ہائی اسکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر آبائی پیشہ پارچہ بافی میں مشغول ہو گئے لیکن تعلیم و تدریس سے آپ کی دلچسپیوں کا تانا بانا ٹوٹا نہیں۔ بزمِ دیننیر سوسائٹی کے نائب صدر کی حیثیت سے انہوں نے برادری کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کا ایک وسیع منصوبہ بنایا تھا، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے پہلے نائب صدر رہے۔

مشتاق احمد موسیٰ رضا مومن (ولادت سنہ ۱۹۲۱ء)

برسوں پہلے سے سنتے آئے ہیں کہ مُلّا کی دوڑ مسجد تک اور برسوں تک ہم اپنے بزرگوں کو اس دوڑ میں سب سے آگے دیکھتے چلے آئے ہیں مشتاق احمد مومن پہلے اس کہاوت سے ہٹ کر پہلے اور ان کی دوڑ لائبریری تک رہی پھر شرحِ صدر ہوا تو اب برسوں سے اس معمول میں فرق آ گیا ہے اب ان کی پہلی دوڑ مسجد تک ہوتی ہے اور پھر لائبریری تک۔ لائبریری میں صرف کتب بینی ان کا مشغلہ نہیں بلکہ مقامی اصطلاح میں یہ پوری لائبریری چلاتے ہیں، یہ تجربہ ان کا بہت پرانا ہے ساٹھ برس پہلے جب سنہ ۱۹۳۲ء میں اسلام آباد میں دی حشر میموریل لائبریری قائم کی گئی تھی ہم انہیں بچپن میں بھی دیکھ پاتے تھے ان کے ساتھ ان کے برادرانِ نسبتی غلام محمد مومن اور مصطفیٰ عباس مومن بھی موجود رہتے تھے۔

جب مومن لائبریری بنگال پورہ کا قیام عمل میں آیا تو یہ اس کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی پہلی مجلس عاملہ کے نائب صدر رہے۔ تعلیمی اور علمی امور سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور خود اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلائی ہے چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر نسیم حسن مومن بڑی کامیابی سے اپنا مطب چلا رہے ہیں۔ مشتاق مومن ساری زندگی محنت کرتے آئے ہیں اور لوگوں سے بے تحاشہ محبت، آپ کو ہم نے آج تک کسی سے الجھتے دیکھا ہے اور نہ نفرت کرتے پایا ہے کیونکہ آپ کی زندگی کا نصب العین یہ ہے

سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ــــ لیکن آہستہ سانس لینے سے حق گوئی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ حق پرست طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی کہ "کارگہ شیشہ گری" پر وہی لوگ پتھر ماریں جو اس میں پناہ گزین ہیں اور ہم اپنی شرافت سے مجبور ہو کر اُف تک نہ کریں شاید اس خیال سے کہ ؎

انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مشتاق مومن ایک خفیہ شاعر ہیں رسوا تخلص ہے لیکن "شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے"۔ اسی ڈر سے مشاعروں میں نہیں پڑھتے، اسی لیے عبدالملک مومن کا "آئینہ" ان کے جمال سے خالی ہے۔

سکندر محمد یونس انصاری (سردار) (ولادت ۱۹۲۳ء)

بھیونڈی نظام پور میونسپلٹی کی رکنیت کے رستے سے تو شہری اور سماجی خدمات کا موقع تو بظاہر ہر ایک کاؤنسلر کو ملتا ہے لیکن اس سے ہٹ کر سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں میں جوش و خروش سے حصہ لینا اور بات ہے اور سکندر انصاری کے لئے یہ انوکھی بات نہ تھی دوسروں کی خدمت کرنا ان کی عادتِ ثانی اور معمول بن گیا تھا۔ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۷ء بلدیہ کے رکن رہ کر شہری خدمات انجام دیں، پاور لوم فیڈریشن بھیونڈی اور بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔ مومن لائبریری کے قیام میں آپ کی جدوجہد بھی شامل ہے اس کی پہلی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ ان کے بڑے صاحبزادے عبدالسبحان انصاری والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے معاشرہ میں پہچانے جانے لگے ہیں۔ ان سے خوش آیند اور تعمیری توقعات وابستہ ہیں۔

محمد یوسف محمد حسن مومن (ولادت ۲۴ر جولائی ۱۹۲۹ء)

محمد یوسف حسن کسی ایک شخص کا نام نہیں ہے کئی شخصیتوں کی جامع الصفات ہستی کا نام ہے، ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا، مضمون نگاری، شاعری، صنعتی تجربہ کاری، امداد باہمی اور تعاونی اداروں کی تنظیم سماجی امور تعمیرات اور شہریت یا علم المدن غرضیکہ بقول غالب ؎

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اور یہ سچ ہے کہ "یوسف" ایک متاعِ عزیز ہے اور کوئی خرید نہیں سکتا۔

اسماعیل یوسف کالج کے طالبعلمی کے زمانے میں کرکٹ ٹیم کے سالارِ کارواں تھے یعنی
افتتاحی بلے باز، والی بال میں کمال حاصل تھا۔ سلک اینڈ آرٹ سلک ایسوسی ایشن کی طرف
ملازمت میں بافندگی کی صنعت کی ایسی مشاقی سے شناسائی کی کہ اس کی بگڑی اداؤں میں
لاکھوں ناز پیدا کر دیے۔ بھیونڈی پاورلوم ویورس فیڈریشن لمیٹیڈ کی مسندِ صدارت پر پندرہ
برس رونق افروز رہے۔ اس دوران بجلی کی فراہمی، پرمٹ کی دستیابی، لوم کی تجدید کاری کے لیے
مالی اعانت، لوم مالکان کو آسان شرائط پر سرمائے کی فراہمی، صنعتی ترقی کے لیے رعایتیں اور
سہولتیں بہم پہنچانا، اور ذرائع ڈھونڈھنا غرض کہ بنکر برادری کے تمام صنعتی اور تجارتی مسائل کے
تار و پود سلجھانا اور ان کا حل ڈھونڈھ نکالنا محمد یوسف مومن کی امتیازی خدمات کی ایک طویل
فہرست ہے۔

پسماندہ اور نچلی ذاتوں کے غریب باشندوں کے لیے انہوں نے ۱۹۶۶ء میں ایک جنتا
کنزیومرس کو آپریٹیو سوسائٹی قائم کی۔ اس وقت سے لے کر آج تک ان چھتیس برسوں میں یہ اس
کے صدر رہے اور ان ہی کی مساعیِ جمیلہ کے سبب مادھو نگر، شمع نگر اور ردھا سنگر ناکہ کے جھگی نشین
صارفین کو راشن کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ اسی کے صدقے میں انہیں ثوابِ جاریہ کا اجرِ عظیم
مل رہا ہوگا اور ان کے اعمالِ صالحہ کے کھاتے میں جمع ہو رہا ہوگا۔

میونسپلٹی کی قلیل مدت کی صدارت (۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء) کے دوران میں ان کی شہری و
مدنی خدمات کے بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہیے۔ عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن زچہ خانہ کی
تعمیر، نظام پورہ میں ایک نئے فائر بریگیڈ کا قیام، حفظانِ صحت کا خیال، ملازمین کا تقرر وغیرہ
امور کی انجام دہی کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی پہلی مجلس
عاملہ کے نائب سکریٹری تھے اور فی الحال اس کی اسکول کمیٹی (۱۹۹۰-۱۹۹۳) کے چیرمین ہیں۔
بھیونڈی ہینڈلوم ویورس کو آپریٹیو سوسائٹی جو اب پاورلوم ویورس کو آپریٹیو سوسائٹی کے نام سے
معروف ہے، اس کے صدر ہیں۔ آپ ۱۹۵۵ء میں مومن لائبریری کے سیکریٹری رہ چکے ہیں۔ آپ کی
خدماتِ جلیلہ میں طرۂ امتیاز مومن ویلفیئر سوسائٹی کے تعمیری پروگرام کو حاصل ہے جو آپ کی
صدارت اور رہنمائی میں شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے۔ تین درجن رہائشی فلیٹ پر مشتمل ایک شاندار
عمارت شمع نگر میں کھڑی ہو گئی ہے اور ایک مستقل آمدنی کا ذریعہ بن گئی ہے۔ لیکن اس

سے بھی عظیم تر کارنامہ "مومن جماعت خانہ" کی تعمیر اور قیام ہے۔ برادری کی مرکزیت کا دارومدار جمہوری پنچایت پر تھا اب یہ جماعتی ادارہ ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ معاشرت اور تمدن میں تبدیلیاں، مشترکہ عائلی زندگی کے تصورات کی شکست و ریختگی اور خود اپنی ہی ذات کے دخول، جیب جیسے کی چاہت نے برادری کی سالمیت کے تار و پود اکھاڑ دیے ہیں۔ مومن جماعت خانہ شاید جماعتی تنظیم اور وجود کی بقا اور جماعتی سالمیت کا ضامن اور تجدید و احیاء کا نیا سنگ میل بن جائے۔ بھیونڈی کی دھوبی سماج کے قیام عمل میں آپ کا بنیادی حصہ ہے۔

یوسف مومن کی جامع شخصیت کا ایک دشوار پہلو ان کی ادب نوازی اور ذوق شعری ہے پارچہ بافی کے تانے بانوں میں الجھے رہنے کے باوجود آپ زلیخائے سخن کے گیسو بھی سنوارتے رہتے ہیں۔ آجکل تجلیات روحانی سے کسب نور کر رہے ہیں۔

عبدالرشید محمد یوسف پنجابی

صنعت اور تجارت کی توسیع کے لئے بھیونڈی میں جو ادارے قائم ہوئے ان میں کو آپریٹیو اسپننگ ملز لمیٹیڈ کی بنیاد ایک نیک فال ثابت ہوئی۔ مرحوم عبدالرشید محمد یوسف پنجابی اس منصوبے سے برسوں متعلق رہے اور اس کے چیرمین کی حیثیت سے ابتدائی مرحلوں کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ عبدالرشید پنجابی بھیونڈی ٹیکسٹائل مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے برسوں نائب صدر رہے سنہ ۱۹۷۰ء کے فسادات میں، خود مسلمانوں کی مالی اور قانونی اعانت میں غلام محمد مومن بی۔اے کے ساتھ آپ نے بھی کافی جدوجہد کی تھی۔

محمد حسن محمد بشیر بھوپالی (ولادت ۶ مارچ سنہ ۱۹۲۶ء)

محمد حسن محمد بشیر بھوپالی برادری کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں بڑے کامیاب تاجر پیدا ہوئے مثلاً ان کے بہنوئی محمد حسن خلیل مومن۔ بی۔ ایس۔ سی (عرف چھنو بھائی سیٹھ)، شریف حسن رمضان، عبدالحفیظ حافظ محمد حسین مومن، عبدالحمید محمد یوسف پنجابی وغیرہ۔ محمد حسن بھوپالی ایک عجیب کشش اور مخلص خادم قوم و ملت ہیں اور بڑی خاموشی سے سرگرمیوں کا بازار گرم رکھتے ہیں۔ روٹری کلب کے چیرمین اور ممبر کی حیثیت سے مذہبی و رفاہی خدمت انجام دیتے رہے، ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی ہیں اسی لئے دونوں فرقوں کے باشعور حامیان

شہر آپ کا بیحد احترام کرتے ہیں۔ بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی کی زیادہ تر اعمال اس کے سیکریٹری ہیں اور ان کی رہنمائی میں صمدیہ ہائی اسکول اور پرائمری اسکول ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں۔

محمد حسن بھیجا والے ایک کامیاب تاجر اور صنعت کار ہیں ان کے کارخانے میں تیار کی ہوئی منقش لنگیاں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں آپ ایلگاؤں اور بمبئی کے مشہور اور ممتاز ماہر تعلیم شیخ عثمان کے داماد ہیں۔ آپ کے چھوٹے بھائی محمد یٰسین بھیجا والے کے دونوں صاحبزادے راشد اور ارشد بی۔یو۔ایم۔ایس کی ڈگری لے چکے ہیں۔

شریف حسن رمضان بز مومن (ولادت ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء)

آپ اپنے خاندان [illegible] صاحب مال ہیں اور کثیر العیال [illegible] کے نواسے اور داماد [illegible] برادری کی [illegible] اور سماجی سرگرمیوں [illegible] بھیونڈی نظیورس ایجوکیشن سوسائٹی کی اولین مجلس عاملہ کے رکن تھے اور اب آپ کی بیش بہا خدمات کے پیشِ نظر صدارت کے عہدے سے سرفراز کیا گیا ہے (۱۹۹۰-۱۹۹۳ء) [illegible] بنگال پورہ [illegible] تمام عمل [illegible] کے بعد سے خازن مقرر [illegible] خدمت کے گرانقدر [illegible] اور [illegible] مسجد کی از سر نو تعمیر و ترتیب [illegible] آپ کی خدمت کا [illegible] ہے [illegible] نظیر سوسائٹی میں خازن کے عہدہ پر سرفراز ہیں۔

آپ کے سب سے چھوٹے بھائی نیاز احمد رمضان مومن بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی کے جوائنٹ سیکریٹری ہیں اور دوسرے بھائی نثار احمد رمضان مومن مومن لائبریری کے موجودہ صدر ہیں اور [illegible] آرمینج کے سیکریٹری ہیں۔ آپ [illegible] ہائی اسکول کے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ذمہ دار عہدہ دار بھی تھے۔ پانچوں بھائیوں نے جن میں یوسف رمضان مومن بھی شامل ہیں اپنی والدہ مرحومہ زینت رمضان کی یادگار میں رئیس ہائی اسکول کو دینیات میں تحریری مقابلے کے لئے ایک ٹرافی عطا کی ہے۔

اقانیم ثلاثہ

بھیونڈی کی مومن برادری کے "تین اہم ستون" عبدالحفیظ حافظ محمد حسین مومن، محمد حسن محمد

خلیل مومن۔ بی۔ ایس سی آرز (عرف چھوٹا لالہ سیٹھ) اور عبدالحمید محمد یوسف پنجابی جو کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ رہے ہیں نہ تو سیاسی بازیگر ہیں اور نہ ووٹوں کے سوداگر لیکن جن کی حمایت الیکشن میں اس امیدوار کی فتح کی ضمانت بن جاتی اور مقابل امیدوار کی ضمانت ضبط ہوجانے کی نوبت آجاتی۔ عوام میں یہ "بادشاہ گر" KING MAKER کے نام سے مشہور تھے۔ یہ ان کے رسوخ اور اثر کا کرشمہ تھا کہ قول اور سخاوت کی کشش۔

عبدالحفیظ حافظ محمد حسین مومن کو اللہ تعالیٰ نے مال و عیال سے نوازا ہے۔ سارا گھرانہ حج بیت اللہ سے مشرف ہے۔ کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں سخاوت میں ہاتھ اونچا ہے اور نام بھی اونچا ہے۔ آپ کے ایک صاحبزادے اختر مومن ڈاکٹر ہیں اور بڑے لڑکے محمد علی بھیونڈی کوآپریٹیو اسپننگ ملز لمیٹیڈ (رجسٹرڈ ۲۵ راپریل ۱۹۷۲ء) کی مجلس عاملہ کے ذمہ دار رکن اور ڈائرکٹروں میں سے ہیں۔ عبدالحفیظ بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔

عبدالحمید محمد یوسف پنجابی پرانے تاجر اور صنعتکار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کے بڑے بھائی مرحوم عبدالرشید پنجابی مذکورہ بالا صنعتی ادارے کے چیرمین تھے۔ عبدالحمید پنجابی بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ کے رکن اور خازن تھے۔ انہی کے بھائی عبدالمجید پنجابی ایک کامیاب تاجر اور صنعتکار ہیں۔ آپ کے دوسرے دو بھائی نصیر پنجابی اور نذیر پنجابی آپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہیں۔ مخلص، بے لوث اور سیدھے سادے لوگ ہیں۔ راقم کو خصوصی طور سے عبدالمجید پنجابی سے بےحد قلبی لگاؤ ہے اور مقامی محاورہ میں یہ کہنا چاہیے کہ "عزیز بھی" ہے، "کوبت" اتے رہنا۔ آپ کے والد عبدالرحمٰن محمد یوسف عبدالرحمٰن پنجابی کے رشتہ دار بمبئی (ڈونگری روڈ) کے منشی عبدالباقی (منزدا مورڈیٹن) تھے، اسطرح سید احمد انجینیر بھی آپ کے رشتہ دار ہوئے۔

محمد حسن محمد خلیل مومن (بی۔ ایس سی آرز) عرف لالہ سیٹھ

(ولادت ۷ جنوری ۱۹۳۶ء)

اس ایک شخص میں تھیں دلربائیاں کیا کیا ہزار لوگ ملیں گے مگر وہ شخص کہاں!

اس کتاب کا انتساب ان احساسات اور جذبات کے دریاؤں کا ایک منہ بند کوزہ ہے جو کھل کر بہنے لگے تو الفاظ کا سیلاب لے آئے اور کھولا جائے تو ہزاروں دعاؤں کی کھیتیاں سیراب ہو کر لہلہانے لگیں۔ ہمارے دونوں کے درمیان ایک احسانی رشتہ ہے، شریک محمدی ہی تہنیت کا

جواز ہوتا تو لالہ ہمارے فرزند دلبند ہوتے یوں بھی ان کے حسن سلوک نے ہمیں اپنے 'ابتر' ہونے کا کبھی احساس نہیں ہونے دیا۔

لالہ کا تعلق 'اھل البر والاحسان' کی جماعت سے ہے، رب العالمین محسنین سے بڑی محبت کرتا ہے اس محبت کا اظہار اس نے اپنے کلام میں بار بار کیا ہے، جسے خود خدائے تعالیٰ محبوب رکھے بھلا اس کے شکر گذار بندے اپنے محسن کو کیوں نہ محبوب رکھیں گے، یہ انتساب اسی محبت کا یادگاری لوح محفوظ ہے۔

لالہ کے صدقات حسنہ اور محسنات کی برکات واعانات سے شہر کے کتنے حاجتمند اور نادار فیض پا چکے ہیں، کتنے لوگوں کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی ہے، کتنے طلبہ فارغ التحصیل ہوکر کالجوں سے نکلے ہیں اور کتنے مریض آپریشن کے بعد شفا پا چکے ہیں ان سب کے ثبوت کے لئے حج سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے۔ 'کوچۂ لالہ' میں ٹوٹے ہوئے دل بھی جوڑے جاتے ہیں اور لنگڑوں اور پاگلوں کو بھی خیرات ملتی ہے سے

دل شکست درین کوی می کنند درست
چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

لالہ کو احسان (حسن سلوک) اور سخاوت کی فضیلت اور اہمیت کا احساس اپنے زمانۂ طالبعلمی میں بڑی شدت سے ہوا جب ناداری کے سبب اتنی استطاعت نہ تھی کہ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری میں داخلہ لے سکیں، شہر کے ممتاز اور مخیر تاجر عبدالرؤف پنجابی نے تعلیم کے اخراجات اٹھائے اور انہیں کی اعانت سے لالہ بی۔ ایس۔ سی تک پڑھ سکے، اس احسان عظیم کا لالہ نے ہمیشہ کھلے بندوں اعتراف کیا ہے اور دوسرے خود غرضوں کی طرح کبھی احسان فراموشی نہیں کی، احسان کا بدلہ یہی ہے کہ اپنے محسن کے حق میں زیادہ سے زیادہ دعا کرنی چاہئے اور یہ دعا قبول بھی ہوتی ہے، افسوس آج ہمارے معاشرے میں ایسے بھی احسان فراموش ہیں جو اپنے رشتہ دار یا غیر رشتہ دار محسن کا شکریہ تو کجا اللہ تبارک و تعالیٰ کا سجدۂ شکر بھی نہیں بجالاتے، اللہ تعالیٰ ایسے کم ظرفوں کو ہدایت دے۔

لالہ برادری کے پہلے بی۔ ایس۔ سی گریجویٹ ہیں، کالج کی کرکٹ ٹیم کے شاندار بلے باز اور بولر کی حیثیت سے بڑا نام کمایا، مومن کرکٹ ٹیم کے کیپٹن رہ چکے ہیں، والی بال کے اچھے کھلاڑی ہیں، آج بھی وہ کرکٹ کے میچوں سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں اور شہر کی ٹیموں کی مدد کرتے رہتے

ہیں، لالہ سیٹھ شہر کے مختلف سماجی، تعلیمی اور تجارتی اداروں سے منسلک ہیں، بھیونڈی ٹیکسٹائل
مینوفیکچررس ایسوسی ایشن کے سرگرم ڈائرکٹر ہیں۔ سائیزنگ اور لوم سینٹر کے ایڈوائزری کمیٹی کے
رکن ہیں، ریلکو ہاؤس کے ٹرسٹی ہیں بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی اور ویورس ہائی اسکول
کے بانیان میں سے ہیں۔ لالہ سیٹھ کو تعلیم سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ اپنے محلے کے طلبہ وطالبات
سے برابر ان کی تعلیمی ترقی کی رپورٹ لیتے رہتے ہیں۔ اور بچوں سے بھی بےحد پیار رکھتے ہیں،
اکلوتے صاحبزادے ذیشان کے دو ننھے بچے عامر اور عمیر اُن کے قرۃ العیون ہیں۔
لالہ کے مذہبی افکار سے مومن کے عقائد کا بڑا ٹکراؤ ہوتا ہے ہماری تبلیغ پر لالہ بڑا دلخوش
کن شعر پڑھتے ہیں ؎

فرشتے حشر میں پوچھیں گے پارساؤں سے
گناہ کیوں نہ کیا، کیا خدا رحیم نہ تھا؟

اللہ کی رحمتِ بےکراں پر جس شخص کا اتنا پختہ یقین ہو وہ ضرور ایک دن انشاء اللہ اس
"متخیلہ بشارت" کے طفیل اصل حقیقتِ ایمان کی طرف رجوع کریگا۔

خاندانِ نجیب اللہ: ایں خانہ ہمہ آفتاب است

یو.پی کا یہ مہاجر خاندان برسوں ناسک میں رہا، جدِ اعلیٰ نجیب اللہ تھے اور ان کی اولاد اپنے ناموں
کی برکت سے پھلی پھولی، شریعت نے نام رکھنے کے آداب بھی سکھلائے ہیں، صحیح مسلم اور سنن
میں نام رکھنے کے بیان (باب الاسامی) میں جو احادیث مروی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حکمت
کا تقاضہ ہے کہ اسماء اور معانی کے درمیان تعلق اور مناسبت ہو ایسا نہ ہو کہ معنی سے نام کے ساتھ
اجنبی محض ہو، اسم مسمیٰ پر اثر کرتا ہے اور مسمیٰ حسن و قبح اور لطافت و کثافت میں اسم کا تتبع
کرتا ہے، ایسا نہ ہو کہ برعکس نہند نام زنگی کافور، نام اور کنیت کے مسنون طریقوں کے علی الرغم
بعض حضرات دینی جذبے سے ایسے مغلوب ہو جاتے ہیں کہ حرمین شریفین اور شعائرِ اسلام کے ا،
و تبرکات جیسے مساجد وغیرہ میں ان کے نام بچوں کو دے دیتے ہیں، اس گھرانے میں حتی المقدور حسب
مسنون طریقہ پر عمل کر کے نام دیئے گئے ہیں وہ بڑی حد تک اسم بامسمیٰ ہیں۔
حاجی طاہر نجیب اللہ نے برادری کی عام صنعتی روایت سے ہٹ کر نباز (پاؤروٹی) کی
بیکری شروع کی، آبائی پیشہ بھی برقرار رکھا یعنی سانچے (پاورلوم) بھی ڈالے تھے، محنت کی جیتی

سے لندن بن کر نکلے اور کامیاب تاجر بن گئے، دولت نے قدم چومے، سخاوت نے ہاتھ لمبا کر دیا، سعادت مند اولاد جو بذات خود ایک کمائی ہے نصیب میں آئی۔

فیاض احمد طاہر مومن

حاجی طاہر کے بڑے صاحبزادے ہیں، کاروبار کا تانا بانا آپ کے ہاتھوں میں ہے، دور اندیش سنجیدہ اور کم سخن ہیں۔ فیاض طبیعت پائی ہے اور اپنے نام کا پاس رکھتے ہیں اسی لئے بڑی فیاضی سے فلاحی اداروں کی مالی امداد کرتے ہیں، شہر کی مختلف تجارتی ایسوسی ایشنز میں اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں، سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے کہ ملک و ملت کا درد رکھتے ہیں، جنتا دل کے سرگرم رکن اور بھیونڈی شہر کے خازن ہیں۔

الحاج ریاض طاہر مومن (ولادت ۱۵؍جولائی سنہ ۵۲ء)

جد امجد کی طرح نجیب، والد بزرگوار کی طرح پاک و مطہر زندگی بسر کر رہے ہیں اور انہیں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے محنت اور دیانت سے کام لے کر کاروبار کو ترقی کی راہوں پر گامزن کر دیا ہے۔ مختلف سماجی، تعلیمی اور معاشی اداروں کی باگ ڈور ہاتھوں میں ہے، کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے جوائنٹ سیکریٹری ہیں، بھیونڈی بیکرس ایسوسی ایشن کے صدر ہیں، رئیس ہائی اسکول کی [illegible] کے چیئرمین اور بھیونڈی مسلم پرسنل لا کے جوائنٹ سیکریٹری، عوامی باسودی بینک کے ڈائرکٹر ہیں اور [illegible] اسپننگ ملز کے سابق ڈائرکٹر رہ چکے ہیں۔

مومن عبدالرشید طاہر (۱۵؍جون سنہ ۱۹۵۶ء)

تاریخ کا شعور سے بڑا گہرا فکری و ذہنی رشتہ ہے، تاریخ کے کسی دور کا مطالعہ کرتے ہی شعور کی پرچھائیاں واقعات، اشخاص اور جگہوں کے الجھنوں کو سلجھانے کے لئے گردش کرنے لگتی ہیں۔ ذہن کے [illegible] میں پچھلے دور کی پرچھائیاں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگتی ہیں۔ یہ شاہجہاں ہے، یہ تاج محل، یہ اورنگ زیب عالمگیر ہے اور یہ ٹیپو سلطان — پھر ان کی تہذیبی اور ثقافتی یادگاریں ذہن میں ابھرنے لگتی ہیں — اسی طرح تاریخ ہمیشہ ایسے کرداروں کو یاد کرتی رہتی ہے۔ عبدالرشید ان میں سے [illegible] کے ۱۶-۱۰-۱۹۹۰ء سے ۱۴-۱۲-۱۹۹۱ء کی مدت کے لئے ایک

"دن کا سلطان" بنے لیکن بھیونڈی نظام پر میونسپلٹی کے دورِ جن صدر بلدیہ اور اس کی ۱۲۷ سالہ
کی زندگی کے مقابلے میں عبدالرشید کی دو سالہ سلطانی اور صدارت تاریخی حیثیت کی حامل ہے اس
لئے کہ اس قلیل مدت میں انہوں نے بہت سارے تاریخی کارنامے یادگار چھوڑے ہیں' تاریخ کو
ایک گمنام قبر کے کتبے سے بھی دلچسپی ہوتی ہے' بابا صاحب امبیڈکر لائبریری کا قیام ایک صدقۂ
جاریہ ہے اس لئے کہ اس میں علم و دانش کا چراغ روشن ہے' اسپورٹس کمپلیکس میں میونسپل
اسٹیڈیم کی تعمیر' علامہ اقبال گارڈن کی گل پرچینی' دیوان شاہ کے تاریخی تالاب نصر اللہ کی
تجدید کاری' ورولی تالاب میں کشتی رانی کا اجرا' تھانہ روڈ' کلیان روڈ کی تجدید' شہر میں
پرائمری اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر اور ان کا قیام' غلام محمد مومن گرلز کالج کو دس لاکھ روپیوں
کی مالی اعانت اور مومن ویلفیر سوسائٹی کو پانچ لاکھ روپیوں کا عطیہ اور شہر کے قبرستانوں
کے تحفظ کے لئے چہار دیواری کی تعمیر اور ان میں روشنی کا انتظام ... عبدالرشید مومن کے وہ
تابناک کارنامے ہیں جن سے ان کا نام برسوں روشن رہیگا' ایڈوکیٹ عبدالرشید مومن کئی تعلیمی
اداروں سے بھی وابستہ ہیں' رئیس ہائی اسکول بھیونڈی اور بھیونڈی ویلفیر ایجوکیشن سوسائٹی
کے رکن ہیں' مہاراشٹر اسٹیٹ مومن کانفرنس کے آرگنائزنگ سیکریٹری کی حیثیت سے اس
کے مردہ جسم میں تازہ خون دوڑانے کی جدوجہد کر رہے ہیں' اس کے علاوہ بُنکر سماج
ایجوکیشن سوسائٹی اور دیگر کئی سماجی اداروں سے وابستہ رہ کر عبدالرشید مومن اقبال (کے وجو
آپ کی پسندیدہ شخصیت ہیں) اس شعر کی معنوی و عملی تفسیر کر رہے ہیں ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

محمد یٰسین مومن ایڈوکیٹ (بی۔ ایس۔ سی علیگ) (ولادت ۱۹۴۷ء)

محمد یٰسین مومن بڑی خوبیوں کے مالک ہیں' سپہر سیاست کے شاہین ہیں اور بڑی طاقتِ
پرواز رکھتے ہیں' گلستانِ ادب کے گلچیں ہیں اور قانون دانی کے طلسمی چراغ کے مالک ہیں
اسی لئے بڑے بڑے مؤکل ان کے قبضے میں ہیں' علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروردہ ہیں
جہاں سے ہم بھی تھے مگر وہاں کے نہیں یہ وہاں کے نکلے ہوئے تو ہیں' علیگڑھ کی تہذیبی و
ثقافتی روایات اور علمی اقدار کے وہ امین ہیں ہم صرف دعویدار' سفر نصیب واقع ہوئے ہیں'

جمہوریۂ اسلامی ایران کی دعوت پر ۱۹۹۱ء میں ایران گئے۔ دعوتِ شیراز کی لذت کام و دہن اور ترکانِ شیرازی کے جلوؤں سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، کئی اور اسلامی ممالک کا سفر کر چکے ہیں۔ اسپیشل ایگزیکیوٹو مجسٹریٹ ہیں، بھیونڈی اسپورٹس کلب کے چیئرمین اور امن کمیٹی کے رکن ہیں۔

سیاست میں کانگریس کے پرچم تلے خدمات سرانجام دے رہے ہیں، تھانہ ضلع کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور کل ہند قومی ایکتا کمیٹی ضلع تھانہ شاخ کے کارگزار اور مہاراشٹر پردیش قومی تنظیم کے نائب صدر ہیں، اردو اکادمی کے رکن رہے، جمعیۃ العلماء مہاراشٹر کی مجلس عاملہ کے سرگرم ممبر ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں جمعیۃ کی طرف سے گرفتار شدہ مسلمانوں کی رہائی اور مقدمات کے سلسلہ میں آپ نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے فعال رکن ہیں اور رئیس ہائی اسکول اور جونیئر کالج کی کمیٹی کے چیئرمین رہ چکے ہیں اس عظیم اور قدیم تعلیمی ادارے کی مالی استعانت کے لیے کل ہند مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔

برادری کے تعلق سے بھی صنعتی اور تعلیمی امور سے دلچسپی لیتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء تک بھیونڈی مومن کانفرنس کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پہ سرفراز رہے، ان کے چھوٹے بھائی نسیم مومن بھی ایڈوکیٹ ہیں، والد بزرگوار عبدالجلیل حاجی محمد (کوٹا پوری بھرلپور) ۱۹۴۰ء کے معاشی بحران میں بھیونڈی آئے، پارچہ بافی کے آبائی پیشہ میں ترقی کی اور محنت کی سیڑھیاں چڑھ کر کارخانے کے مالک بن گئے۔

مومن کانفرنس

برادری کی پہلی جماعتی تنظیم کی تاریخ اس تصنیف میں موجود ہے، اس کے عروج و زوال کی داستان برادری کے طبقاتی اور سیاسی شعور صنعتی ترقی کے اوج اور دولت کی موج میں بہہ گئی ہے پھر بھی اس کا زندہ جنازہ کئی شہروں کے سیاسی و تنظیمی شہر خموشاں میں رکھا ہوا ہے۔ مومن کانفرنس کے اڑسٹھ سالہ کمزور، ترات جسم میں تازہ خون دوڑانے کے لئے کئی جوانمرد آگے آئے ہیں۔

نصیر احمد (پپو سیٹھ)

اورنگ آباد کو تاریخی شہر مرکز روحانیت و تصوف تھا، لیکن اجنتا اور ایلورا کے غاروں نے بر شہرت دوام حاصل کیا ہے اس کا اثر بھیونڈی تک پہنچ گیا، یہاں بھی اجنتا کمپاؤنڈ، قدنہ روڈ

برسوں سے کارخانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ عبدالمجید اجنتا کمپاؤنڈ والے اور ان کے والد بزرگوار حاجی لیقوب سیٹھ کے ناموں سے ہمارے کان لڑکپن سے آشنا تھے جس طرح ہم تاریخ کی کتابوں میں اجنتا اور ایلورا کے بارے میں پڑھتے تھے اجنتا کمپاؤنڈ کا نام سن کر تصورات میں رنگین ساڑیوں میں ملبوس اپسرائیں دیکھتے تھے ـــ اور اب اسی گھرانے کے مشہور فرد نفیس احمد پوپ سیٹھ کو ہر جلسے اور میٹنگ میں دیکھتے ہیں۔

نفیس احمد پوپ سیٹھ ایک ابھرتی ہوئی سماجی اور تعلیمی ہستی ہے، مرکزی مومن کانفرنس (نئی دہلی) نے آپ کو سیکریٹری کا اعزاز بخشا ہے کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی اور ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے رکن خصوصی ہیں۔ ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں آپ عبدالمجید کے فرزند ارجمند ہیں۔

اقبال جسیم سردار، شاہد صدیقی (میونسپل کونسلر)، امجد مومن، رفیق احمد انصاری، ایڈوکیٹ یسین مومن اور ایڈوکیٹ عبدالرشید طاہر مومن کانفرنس کے مستحکم ستون ہیں اور انہیں معمارانِ قوم کی مساعئ جمیلہ کے نتیجے میں ایک دن برادری کی یہ جماعتی تنظیم شاندار عمارت کی صورت میں کھڑی ہو جائے گی۔

محمد طیب محمد حسن (جناب)

مدرسے سے منڈی تک پہنچنے میں جس محنت استقلال واستقامت کی ضرورت تھی بحمد للہ آپ کو میسر تھی۔ ایک کامیاب تاجر ہیں، سماجی خدمت کا جذبہ اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لینا آپ کی شخصیت کے اُجاگر پہلو ہیں، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی بھیونڈی کی مجلس عاملہ کے رکن رہے، اس کی بنیادی رکنیت کا اعزاز بھی میسر ہے۔ انجمن اسلامیہ اسلام پورہ کے صدر ہیں۔

بھیونڈی نظام پور میونسپلٹی کے اراکین کی سماجی سرگرمیاں

اراکین بلدیہ میں مومن افراد کا ایک معتدبہ حصہ منتخب ہو کر اپنے اپنے محلے یا وارڈ میں سرگرم رہتا ہے، حفظانِ صحت اور دیگر رفاہ عام کے امور کی ذمہ داری انہیں اراکین کے سر جاتی ہے، بعض اپنی رکنیت اور رسوخ کے وسیلے سے فلاح و بہبود کے بڑے اہم امور سرانجام دیتے ہیں۔

ادریس کانپوری (۱۹۸۰) اقبال احمد محمد نذیر مومن (سنہ ۱۹۸۰ء، ہفسان آلی)، ابراہیم انصاری (سنہ ۱۹۸۱ء، غیبی نگر)، اقبال احمد حنیف منشی مومن (۱۹۹۲، بنگال پورہ)، (مولانا) احمد رضا نور الحسن انصاری (سنہ ۱۹۹۲ء)، حسینہ ادریس کانپوری ۔ خدیجہ شبیر انصاری (سنہ ۱۹۹۲ء)، خیر النساء محمد عمر شفیق، خدیجہ مومن (سنہ ۱۹۸۰ء)، رفیع الزماں لالہ انصاری مرتضیٰ حسین (سنہ ۱۹۹۲ء) زیب النساء کریم مقادم (سنہ ۱۹۹۲ء) سلیم احمد محمد یعقوب مقادم (سنہ ۱۹۹۲ء)، سعید احمد ظہور انصاری (سنہ ۱۹۹۲ء)، سعید احمد محمد ابراہیم مومن (سنہ ۱۹۹۲ء ہفسان آلی)، شمس الضحیٰ عبدالغفار مومن (عطر والے)، شبیر احمد محمد یوسف (سنہ ۱۹۸۰ء)، شمس النساء محمد ادریس انصاری (سنہ ۱۹۹۲ء)، شاہد علی صدیقی (سنہ ۱۹۹۲ء)، صغیر انصاری ایڈوکیٹ (سنہ ۱۹۹۲ء) عباس احمد انصاری ، عیسیٰ اعظمی (سنہ ۱۹۶۷ء)، محمد ایوب حیدر علی انصاری (ٹرانسپورٹ والے سنہ ۱۹۹۲ء)، نثار احمد محمد حبیب ماسٹر (سنہ ۱۹۹۲ء)، یوسف ابراہیم (۱۹۶۷ء)، یعقوب مقادم (سنہ ۱۹۸۰ء) برادری کے یہ افراد بلدیہ کے رکن رہ چکے ہیں۔

یادِ رفتگاں

قدیم اراکین بلدیہ جو ہم میں موجود ہیں اور شدید تقاضائے عمری کے سبب یا دلچسپی کے فقدان کے باعث انتخاب میں حصہ نہیں لیتے یا پھر شکست خوردگی نے ان کے حوصلوں کی کمندوں کو بھی توڑ ڈالا ہو اپنے اپنے حلقے میں استطاعت اور رسوخ رکھتے ہوئے فلاح و بہبود کے کام کرتے نظر آتے ہیں خصوصاً فسادات کے موقع پر یہی "افرادِ گم گشتہ" بھر پل جل کر راحت کاری اور آبادکاری کے فرائض سرانجام دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔ کچھ لوگ عزلت نشین بن چکے ہیں اور بیرونی دوروں میں بھی رہے ہیں۔ یہ حصہ ان حضرات کے ذکر سے خالی ہے جو ابھی تک فعال ہیں یا ان کے اور بھی کارنامے ہیں۔

عبدالرحیم محمد یعقوب مومن (بی۔اے) (۱۹۶۰ تا ۱۹۶۵ء) میونسپل کمیٹی اور اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین رہے، سینٹرل کمیٹی اور میونسپل اسکول بورڈ کے رکن تھے، جیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی پہلی مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔

حاجی اقبال احمد حاجی محمد باقر مومن مومن لائبریری کی پہلی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔

عبدالسلام عبدالرزاق انصاری

الٰہ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے والد حاجی عبدالرزاق انصاری ترک وطن کرکے بھیونڈی آئے پہلے مزدور پیشہ تھے پھر محنت اور دیانتداری نے انہیں کارخانہ دار بنا دیا۔ عبدالسلام انصاری بلدیہ کے صدر رہے، آپ کو بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی رکنیت حاصل تھی۔ اس گھرانے میں تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں، ڈاکٹر اسلم محمد ایوب انصاری (ایم۔ ڈی) کا نام کافی ہے۔

نثار احمد عمر مومن

بلدیہ کے رکن تھے اور قانونی گتھیاں سلجھانے میں ذہن رسا رکھتے ہیں، انتخابات کے جلسوں میں تقریریں کرتے تھے اور اچھے اور بیباک مقرر ثابت ہوئے دیگر مشاغل کے الجھاوے گرہ گیر رہے اور بہت ساری خداداد صلاحیتیں دب کر رہ گئیں۔

صدیق نذیر مومن بنگال پورہ کے سابق ممبر بلدیہ کی حیثیت سے اہالیانِ محلہ کی خدمات کرتے رہے، اسکول بورڈ کے بھی رکن رہے، انسداد رشوت ستانی کے لئے جہاد کرتے رہے۔

فاروق ذاکر حسین مومن ۱۹۷۴ء میں منتخب ہو کر بلدیہ میں پہنچے، تعمیراتی کمیٹی کے چیرمین رہے اندرا گاندھی میموریل ہسپتال کی بنیادی کمیٹی کے چیرمین تھے۔

عبدالغفور مرشد بڑے اوصاف حمیدہ کے حامل ہیں، اب "کبھی گرفت دیا دخدار ابھانہ ساخت" پر عمل کر رہے ہیں۔ آپکے صاحبزادے مشتاق کا نیا تاجروں اور تاجر ہیں۔

مشتاق خلیل مومن (پنڈت) اولین کامرس گریجویٹ میں شمار ہوتا ہے۔ دو بار رکن بلدیہ بنے اور نائب صدر بھی رہے۔

آسودگانِ خواب کو، جن کا فضلِ الٰہی نے انتخاب کرکے آگے بڑھا دیا ان کے محلہ والے ہر انتخاب کے موقع پر انہیں یاد ضرور کرتے ہیں جنگان میں جوانمرگ شتاق احمد محمد حسین ہمدردی ری تازہ جب جو صدر بلدیہ رہے، محی الدین محمد عمر بارہ مدری اپنے والد مرحوم کے جانشین بن گئے، محمد رمضان محمد نذیر چل بسے اور محمد حنیف طاہر انصاری سعادتمند اولاد چھوڑ گئے، اور کچھ کارنامے۔ عزیز لعل محمد مومن اللہ کو پیارے ہو گئے، یہ لوگ ۱۹۶۷ء میں بلدیہ کے رکن تھے۔

بھیونڈی کا نیا انصاری تاجر طبقہ

صنعتی انقلاب کے جلو میں جب مالی خوشحالی نے بھیونڈی کو نہال کر دیا تو یو۔پی کے بدحال 'انصاری نوربان'، کارخانہ دار و تاجر طبقہ نے 'خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں' کی رخصتی دعا دے کر اس شہرِ آرزو کی طرف عنان عزیمت موڑی یہاں تجارتی سرگرمیاں اور صنعتی ہما ہمی عروج پر تھی اور خود ان کے اپنے والوں کی بھیڑ تھی جو پرانے رئیس تھے وہ ان تازہ واردان کی بھیڑ کو اپنی ترقی کی راہ کی رکاوٹ سمجھنے لگے، حریفانی اور باہمی مسابقت کی جب دوڑ شروع ہوئی تو کچھ پرانے تاجر پیش پا افتادہ رہ گئے، کچھ راہوں میں پڑے رہے مگر یہ نئے شہسوار آگے بڑھتے گئے اس لئے کہ ان کے پاس حوصلوں کی کمند تھی اور ارادوں کی باگ ڈور بھی اور سہ

گو بڑی لذت تری ہنگامہ آرائی میں ہے — اجنبیت سی مگر تیری شناسائی میں ہے

ان تمام نوواردوں کو مقامی حضرات عموماً 'ملکی' کے نام سے پکارتے تھے۔ شناسائی میں بھی اجنبیت کا پہلو تھا، "تو اگر بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں" کہ جب ہمارے اجداد غدر کے پُرآشوب و پُرفتن دور میں مغربی ہند آئے تو مقامی باشندے انہیں "ہندوستانی۔ دال کا پانی" کا طعنہ مار کے اور تحقیر کر کے پانی پانی کر دیتے تھے۔ اور آج اللہ رب العزت نے برادری کو وہ عزت و دولت عطا فرمائی ہے ہمیں چاہیے کہ 'شکر نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو' کا وظیفہ پڑھتے رہیں۔

بعض مومن اداب بھی پہلے یہی امتیاز برتتے تھے اور برادرانِ یوسف جیسا سلوک کرتے تھا اور اب جبکہ ان عزیزانِ ملک نے مصر کا بازار گرم کر دیا ہے تو یہی لوگ ان سے رشتہ جوڑنے کے متمنی رہنے لگے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۰ء کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد ایسا لگتا تھا کہ بھیونڈی کے جڑے ہوئے سہاگ کی مانگ دوبارہ نہیں بھر سکے گی لیکن غیر متوقع طور پر یہاں اتر پردیش کے ترکینِ وطن کے قافلے آنے شروع ہو گئے۔ چودہ سال بعد پھر فرقہ پرستی کا عفریت بیدار ہوا ایک مرتبہ پھر آگ اور خون کا خونیں تماشا ہوا لیکن کچھ حکومت کے اربابِ بست و کشاد کی کوششوں اور کچھ یہاں کے ہندو مسلم باشندوں کی اخوت اور بھائی چارگی کی سلسلہ جنبانیوں کا نتیجہ اور اب تک یہاں امن و آشتی کے فرشتوں کے شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دے رہی

اور ساتھ ہی میں پاور لوم کارخانوں کا شور بڑھ گیا ہے اور سائزنگ کی چمنیوں سے دھواں اڑنے
لگا ہے اور دھن برسنے لگا ہے۔ تاجروں کا نیا قافلہ اب یہاں ڈیرا جما چکا ہے اور یہ اس گم کی
شہر سے دل لگا کر دلدار بن گئے ہیں یہی لوگ ہیں جو صدقات اور خیرات کے نیک کاموں میں آگے
بڑھ کر حصہ لیتے ہیں، سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں۔ ان کی فراخ دلی نے فلاح
وبہبود کے کاموں میں بڑی وسعتیں عطا کی ہیں، مسجدیں آباد ہوئی ہیں، مدرسوں میں اجالا پھیل
گیا ہے کئی تعلیمی اداروں کی نیو ڈالی گئی اور اسی طرح کئی اسکولوں کی تاسیس عمل میں آئی۔
'اہل البر والاحسان' کے اس زمرے میں کئی نام شامل ہیں۔ بدرالدین انصاری، عبدالحمید سیٹھ،
عبدالرحیم انصاری، محمد ایوب حیدر علی انصاری ۱۹۲۳ء کے خطبۂ صدارت میں جو شیخ امین
الدین امانی (بی اے علیگ) نے جلسۂ عظیم الانصار منعقدہ قصبہ مئو ائمہ (الہ آباد) میں دیا تھا
صنعت وتجارت کی کساد بازاری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تلاش معاش میں مالیگاؤں بھیونڈی،
بمبئی وغیرہ میں ہزاروں لوگ اس قصبہ سے چلے گئے اور اس وقت تقریباً ڈیڑھ ہزار نفوس
کی آبادی موجود تھی۔

مئو ائمہ کے حاجی عبدالحکیم

مئو ائمہ (الہ آباد) کے انصاری برادران حاجی نظام الدین انصاری کے بھائی ضیاء الدین
انصاری کا ذکر کئی مرتبہ اس ضمن میں آچکا ہے۔ الحاج عبدالحکیم سیٹھ کا بھی اجمالی ذکر اتر پردیش
اور شمالی ہند کی انصاری برادری کے باب میں ہو چکا ہے، اس 'عقدِ نجوم' میں دراصل حاجی عبدالحکیم
واسطۃ العقد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی حاجی عبدالحفیظ اور برادر خورد حاجی
عبداللطیف اسی سلکِ گہر کے تابندہ وآبدار موتی ہیں۔ واہب العطایا نے جس قدر ان کو دولت
سے نوازا ہے اس سے زیادہ جود وسخاوت میں دریا دلی بخشی ہے، خیرات وصدقات کی برکات
اور فیضان مئو ائمہ تک کو محیط کئے ہوئے ہے۔ عبدالحکیم سیٹھ ہر کار خیر میں بڑے انشراح سے
حصہ لیتے ہیں مئو ائمہ ان کے آبائی وطن میں یہ انصاری برادری مومن انصار ایجوکیشن سوسائٹی
کے زیر اہتمام انصار نرسری اسکول، گرلز ہائی اسکول اور گرلز انٹر کالج اپنے ذاتی اخراجات
سے نہایت کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں، عربیہ انوار الاسلام ایک قدیم مدرسہ ہے جس میں
اردو ذریعۂ تعلیم کا ایک پرائمری اسکول بھی شروع کیا گیا ہے عبدالحکیم سیٹھ نے بھیونڈی میں

انجمن بیت الاسلام کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے جس کے ماتحت وہ عظیم الشان مسجد ہے جس کی تعمیر آپ کے لئے صدقۂ جاریہ کا وسیلہ بن گئی ہے، قاسم پورہ میں ایک شاندار مسجد بنائی ہے یہاں کا قبرستان، مسجد بیت الاسلام اور طیب مسجد کے علاوہ متوائمہ کے فلاحی ودینی ادارے یہ سارے خانوادۂ انصاری برادران کے صدقاتِ حسنہ واعمالِ صالحہ کی یادگاریں ہیں۔

'اہل البر والاحسان' کے اس زمرے میں حکیم برادران کی طرح ——

فرید انصاری اور برادران

کے اسمارِ گرامی شامل ہیں جو موضع گنگاپور ضلع پرتاپگڈھ سے وطنی تعلق رکھتے ہیں، فرید انصاری اور ان کے بھائیوں کا رزق بھیمڑی میں لکھا تھا جبکہ والد اور چچا تلاشِ معاش میں احمد آباد جاکر بس گئے تھے، لیکن مسبب الاسباب کی مشیت سے ان کی صنعتی وتجارتی ترقیات کے دروازے بھیونڈی میں کھلے اور اسی دروازے سے دولت وثروت کی دنیاوی نعمتیں داخل ہوئیں اور اسی راہ سے صدقاتِ حسنہ کی نیکیاں بھیجی چلی گئیں فرید انصاری نے کاروبار میں ہاتھ ڈالا اور مثل مشہور ہے 'مٹی پکڑے سونا ہوتا ہے'، اس مخیر گھرانے کا سنہادور شروع ہوا، ایمانداری ودیانتداری کا پھل، جود وسخاوت کا اجرا اور صدقات وخیرات کا ثمرہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں دے دیا ہے اور اس کی مثال بھی دی ہے۔

> جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُن کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں، اور خدا جس کے مال کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔ (البقرہ: ۲۶۱)

قوم وملت کی خدمت وبہبود کے لئے اور خصوصاً تعلیمی ترقی وترویج کے لئے انصاری برادران کی مساعی جمیلہ لائقِ تحسین وآفرین ہیں۔ الحمرا ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر انصار احمد انصاری ہیں جس کے زیرِ اہتمام انصاری صابیہ گرلز ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا ہے (۱۹۹۳) دوسری سوسائٹی الانصار ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے نام سے انصاری برادران نے دیگر رفقاء کے تعاون سے قائم کی ہے، اس کے صدر فرید احمد انصاری ہیں۔

ان سوسائٹیوں کے منصوبوں میں اعلیٰ تعلیم گاہوں کا سلسلہ قائم کرنا شامل ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد انصاری جو ضیا انصاری کے چھوٹے بھائی ہیں "شاہین کلینک" کے مالک ہیں ایک دواخانہ اور میڈیکل سٹور بھی آپ چلا رہے ہیں۔

الحمرا ایجوکیشن سوسائٹی کے ارباب حل و عقد نے انگریزی کی تدریس کے اہم موضوع پر ایک انتہائی بامقصد سیمینار منعقد کیا تھا اس طرح کے تعلیمی ورکشاپ سیمینار اور کانفرنسوں کی افادیت مسلّم ہے۔ ان سوسائٹیوں کے منصوبوں میں اعلیٰ تعلیم گاہوں کا ایک سلسلہ قائم کرنا شامل ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد انصاری نام کے کئی ڈاکٹر ہیں' پھولپور (الٰہ آباد) کے ڈاکٹر نثار احمد انصاری نو وارد ہیں ایک اور ڈاکٹر نثار احمد انصاری ہیں بہرحال شناخت کرنا ایک مرحلہ ہمارے لئے ہے مریضوں کے لئے نہیں۔

ایک اور تعلیمی کارنامہ ۱۹۸۶ء میں نیو ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام نیو نیشنل ایجوکیشن اسکول کا اجرا ہے۔ یہ اسکول اس غریب اور نادار بستی میں شروع ہوا جسے شانتی نگر کا نام دیا گیا ہے اور جو پچاس ہزار کے لگ بھگ نو وارد تارکین وطن کی آبادی پر مشتمل ہے جن میں یوپی کے لوگوں کی اکثریت ہے۔ جو لائی فروری کی نہ سہولتیں ہیں اور نہ بجلی کا معقول انتظام۔ اس حلقہ میں رحمت پور کی عمارت میں میونسپل اسکول قائم ہوا ہے' خواتین کے لئے سلائی اسکول بھی چل رہا ہے۔ ڈاکٹر نثار انصاری اور ارکان سوسائٹی نے شانتی نگر کے شادی ہال میں ابتدائی کلاسیں شروع کی تھیں لیکن ان کی مساعی حسنہ کا حسین پہلو یہ ہے کہ اب اسکول بڑی حد تک خود کفیل ہو گیا ہے۔ ۱۹۹۱ء کے وائل میں نونہالان اسکول نے اپنے مدرسوں اور معلمات کی سرپرستی میں ایک شاندار نمائش کا انتظام کیا تھا۔

بھیونڈی کے نئے تاجر طبقہ میں الٰہ آباد کے نور محمد انصاری جو فخر نصار ریاض الدین احمد (ایم ایل بی) کے خاندان سے ہیں بھیونڈی میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو کی لائبریری بھی رکھی ہے۔ آپ کا لوم کا کارخانہ بھی ہے۔ ریاض الدین احمد (الٰہ آباد) مومن کانفرنس اور کانگریس کے رہنماؤں میں سے تھے ان کے بڑے بھائی نظام الدین حملہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسپیکر رہ چکے تھے کانگریس اور مومن کانفرنس کے اولین صف کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔

بھیونڈی کا صنعتی جائزہ اور ماہرین دستکار

جب انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دلّی میں بجلی کا قمقمہ فروزاں ہوا تو غالب جیسے باشعور اور دانشور شاعر نے فوراً انگریزوں کی دانائی اور آئین کا قصیدہ لکھا اور صاحبانِ انگلستان را نگر — اور تین سو چراغوں والے قصبہ بھیونڈی میں جب ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ بجلی کے قمقمے روشن ہوئے تو صنعتی ماہرین اور دانش پژوہ تاجروں کے ذہنوں میں مستقبل جگمگا اٹھا اور وہ بھی آقایانِ فرنگی کی مدح سرائی کرنے لگے۔ ۱۹۲۲ء سے سورت میں بجلی کی فراہمی کے بعد آرٹ سلک کے کرگھوں میں برقی رو دوڑنے لگی۔ ۱۹۲۵ء میں بیرونی ملکوں جیسے جاپان، اٹلی وغیرہ سے مصنوعی ریشم برآمد کیا جانے لگا تو مصنوعی تانے بانے بھی سنورنے لگے۔

بھیونڈی میں بجلی کے تاروں کے تانے بانے فضاؤں میں پھیلنے لگے تو ہینڈ لوم کے تار و پود اُدھڑنے لگے، شہر کے مشہور صنعتکار حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد بڑے جہد جو واقع ہوئے تھے ولولوں سے معمور اور دردوں سے سرشار نوجوان مرد مومن تھے۔ ۱۹۲۶ء میں انہوں نے بجلی سے چلنے والا پاور لوم لگایا، گھسے پٹے فرسودہ لوم تار دیو کے پیٹرن سے ڈھائی تین روپے فی سیٹ میں خریدے اور جوڑ جوڑ کر تقریباً تین سو کے قریب لوم تیار کر کے چلانے لگے، یہ دیکھ کر شکوہ و شکایت کی زبانیں چلنے لگیں اور پاور لوم کے شور و غل میں احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ایک احتجاجی جلوس بنکروں پر مشتمل کلکٹر بہادر کو یادداشت پیش کرنے کے لیے [illegible] بھیونڈی اور جزیرہ نما تھانہ کے بیچ کھاڑی کا پل ابھی تک ایک تعمیری منصوبہ بنا ہوا تھا۔ آستانے پر پہنچے تو وفد کے دو نمائندوں الٰہی ملا اور سیٹھ طاہر [illegible] کو باریابی نصیب ہوئی۔ پاور لوم کی تنصیب پر پابندی لگانے کی مانگ کی گئی کیونکہ اس طرح ہاتھ کرگھے کے بنکروں کے ہاتھ کٹنے لگے تھے، کلکٹر نے اپنی فرنگی فراست سے کام لیتے ہوئے مشورہ دیا [illegible] وہ آپ بھی پاور لوم لگائیں پیداوار اور آمدنی میں اضافے کا یہی بہتر ذریعہ ہے۔ اور اس مشورہ کو جب تدبر و تحمل کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا تو آہستہ آہستہ سانچے بدلنے لگے [illegible] ۱۹۵۰ء تک شہر میں ہزار کے اوپر پاور لوم اور چند ہزار ہینڈ لوم کی باگ ڈور کارخانہ داروں کے ہاتھوں میں آ گئی۔

تولیہ: ۲۸-۱۹۲۷ء کے صنعتی انقلاب کے بعد پارچہ بافی کی مصنوعات میں تنوع پیدا ہوا اور نت نئے قسم کے "وان" پاور لوم پر چلانے کے تجربے کئے جانے لگے۔ بمبئی مل کے ماسٹر حبیب اللہ کی تکنیکی رہنمائی میں ایشیا ٹیکسٹائل میں ۱۹۴۶ء میں تولیہ یا ٹرکش ٹاول بنانے کا آغاز ہوا۔ اس کارخانے کے مالکان غلام محمد مومن (بی۔اے) شبیر احمد راہی اور جنید خرم تھے۔ جنید خود بھی ایک اچھے مقادم اور فنی ماہر تھے۔ احرام میں استعمال ہونے والے بڑے تولئے بھی اسی لوم پر تیار کئے گئے۔

خانصاحب حاجی عبدالصمد سیٹھ کے بھتیجے عبدالمجید عبداللہ انصاری اور ان کے بڑے بھائی مرحوم محمد نذیر عبداللہ انصاری بھی بڑے ہُنر مند تھے، تولیہ کی بُنائی میں انہوں نے بھی بڑی مُدرتیں پیدا کی تھیں لیکن خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ تولیے کی بُنائی ترک کرکے 'نیو وان' چالو کرنے کا تجربہ کرتے لگے اور اس تجارت کو فروغ نہ دے سکے۔

مصنوعی ریشم (ویسکوس)

مصنوعی ریشم (ویسکوس) کی بُنائی کا آغاز پارچہ بافی کے صنعتی سفر کا اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ ساڑیوں میں سُوت کا استعمال۔ عالم ناسوت کی بات بن گئی اب مصنوعی ریشم سے بُنی ہوئی ساڑیاں قدو قامت کی آزمائش بن گئیں اس کے لطیف لمس کا احساس سب سے پہلے رمضان بنڈوینگ فیکٹری کے کرتا دھرتا عبدالرشید مومن کو ہوا، اس جواں سال، حوصلہ مند اور ندرت پسند کارخانہ دار نے امرتسر سے ۱۹۵۰ء میں ٹوسٹنگ مشینیں لاکر پرسُوت میں بَل ڈالنے کا تجربہ شروع کیا اپنے قرابت دار کارخانہ داروں کو بھی چند مشینیں لگا دیں، تانے بانے کی فراوانی اور خود کفالت نے ہی شستگی کے گیسو دراز کر دئے اور ہزاروں لوگ اس کے اسیر بن گئے۔ اس طرح مصنوعی ریشم کی مصنوعات میں تنوع پیدا ہوا، شیفون اور دیگر قسم کے کپڑے تیار کئے جانے لگے اور پارچہ بافی کی صنعت نے بے حد نمایاں ترقی کی۔ عبدالرشید مومن پہلے صنعتکار تھے جنہوں نے سِلک کی بُنائی شروع کی۔ سب سے پہلے سُورت میں ہاتھ کرگھوں پر اصلی ریشم بُنا جاتا تھا۔

لہ ان تمام تکنیکی معلومات کے لئے راقم اپنے عزیز دوست یوسف حسن مومن کا شکر گذار ہے جنہوں نے شبیر احمد راہی اور دیگر تجربہ کار ماہرین اور تجار سے انٹرویو لے کر اور خود اپنی ٹھوس معلومات سے بھرپور ایک نوٹ تیار کیا اور اس سے استفادہ کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

بھیونڈی میں لگ بھگ ۱۹۵۶ء میں ۴۰۔۲۰ اکاؤنٹ لوم اور ۳۸/۴۲ آرٹ سلک کے پاور لوم تھے۔
عبدالرشید مومن (۱۹۲۸ء-۱۹۵۵ء) ایک فعال، مہم جو اور بجید سرگرم تاجر تھے شاید یہی تگ ودو، تلملنے بانے کا تناؤ اور کاروباری کھنچاؤ نے ان کی قضا کو کھینچ لیا، جوانمرگی نے سارے حوصلوں اور ولولوں کے تار و پود کو اجاڑ دیا، پسماندگان میں چار بجید سعادتمند بچے چھوڑے جو ماشاء اللہ جوان ہو کر کاروبار میں لگ گئے ہیں لیکن وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ عبدالحی (ولادت ۱۹۴۹ء) عبدالماجد (ولادت ۱۹۵۰ء) الطاف حسین (۱۹۵۲ء-۱۹۹۰ء) اور مسعود احمد (ولادت ۱۹۵۴ء)، افسوس کہ الطاف حسین جو والد بزرگوار کی طرح کاروبار میں سب سے زیادہ فعال اور سرگرم تھے وہ بھی عین جوانی میں داغ مفارقت دے گئے اور عزیز و اقربا زخم پڑھتے رہ گئے صدّیکا یہ راہ گزر تا جو شب تاکوئی دن اور۔

ٹافٹیا اور خاکہ

سوتی رنگین ساڑیوں کی مانگ اجڑ گئی تو ٹافٹیا اور ویسکوس کے تانوں بانوں سے نئے قسم کے نفیس کپڑوں کی بنائی شروع ہوئی جس کا سہرا خانصاحب حاجی عبدالصمد سیٹھ کے بھیجر کے سر ہے، ۱۹۵۷ء میں محمد نذیر عبداللہ انصاری نے اس بنائی کا آغاز کیا، خاکہ کپڑے میں تانوں کی پٹیاں قینچی سے کترنے کا اہم کام برادری کی عورتیں کیا کرتی تھیں اس طرح ان کو روزگار میسر ہو گیا۔

رُوبیا وائل

وائل (ویل)، ایک باریک نفیس سوتی کپڑا "ممل" کا جواب تھا جس کے تانوں بانوں کو کئی دیگر اس کا کسی پل بازار بنا دیا جاتا، مگر اس کپڑے کی تیاری دقت طلب ہے اور بڑی مہارت اور کاریگری کی ضرورت پڑتی ہے، بھیونڈی کے مشہور مخیر تاجر الحاج عبدالحفیظ حافظ محمد حسین مومن اس کپڑے کے سب سے پہلے اور بڑے کارخانہ دار ہیں، روبیا وائل بنانے والے دوسرے کارخانہ دار ہیں: عبدالحمید چاپانی، حاجی مشتاق احمد ابو محمد یٰسین چپٹی والے اور دوسرے کارخانہ دار حضرات۔

بیل بوٹے

گلہ ری دربعہ داری کا فن بنارس اور بنگال کے دستکاروں تک محدود رہا، لیکن سائنسی ترقی اور نت نئی مشینوں کی یلغار نے دستکاروں کی انگلیاں قلم کردیں اب ویسکوس کے تانوں میں ناکون کے بانے سے پٹ مشین کی باریک سوئیوں کی مدد سے بڑی کاریگری سے پھول پتے

اور بیل بوٹے میں جتے جاتے ہیں، بمبئی کے جیکارڈ ماسٹر اسماعیل انصاری جو پہ بلاد ل میں متقادم اور پیپر ماسٹر مقرر ہوئے اس فن میں طاق تھے بھیونڈی کے مرحوم عبدالرشید اور ان کے بھائی عبدالحمید پنجابی برادران نے سب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں یہ 'باغ و بہار' کپڑا بنایا جو صارفین اور تاجرین کی آنکھوں میں گلستان بن کر بہار دکھانے لگا، اس دلکش کپڑے کی مقبولیت کے پیش نظر کوڑ گیٹ کے بہار متقادم (محمد نذیر عبداللہ انصاری کے ہم زلف) کے ہنرمند فرزند ابو بکر نے بڑے پیمانے پر لپیٹ کی مشین بنائی اور ان کا کاروبار چمک اٹھا۔

رنگائی :

اس ہنر کے بارے میں آخری باب میں بڑی تفصیل سے رنگ آمیزی کی گئی ہے، بھیونڈی کے تعلق سے صرف اس قدر کہنا رنگ بھرنا ضروری ہے کہ کوڑ گیٹ کے محمد حسین نور محمد سیوٹے نے سب سے پہلے بڑے پیمانے پر سوت کی رنگائی کا کام شروع کیا اور اس میں سرخروئی حاصل کی پھر دوسرے کارخانہ داروں نے رنگ پکڑا خاص کر جب حاجی عبدالحمید سیٹھ نے ایک پورا کھاتا رنگائی کا ڈال دیا، ان کے نواسے مرحوم محمد ایوب مومن جو سائنس کے طالب علم رہ چکے تھے پڑھائی چھوڑ کر یہ کھاتہ سنبھالنے لگے اور کیمیائی تجربات کر کے پوکا رنگ دکھانے لگے۔ بلا رنگائی کی اس ہنر میں بڑا رنگ جمایا۔

بعد ازاں دوسرے کارخانہ داروں نے بھی رنگائی کا کام شروع کیا، بنگال پورہ میں محمد یٰسین سردار، ایوب ابراہیم اور اسلام پورہ میں حسن بھوپالی وغیرہ اس رنگ میں رنگ گئے اور اس 'کارخانۂ شیوہ و رنگ' میں رنگوں کی قوس قزح چھا گئی۔

دھلائی :

شہر کے قدیم تاجر اور کارخانہ دار حاجی ولی اللہ کے صاحبزادے حاجی محمد یونس غالباً شہر کے اولین شخص تھے جنہوں نے ۱۹۶۹ء میں سوتی (گرے) کپڑوں کی دھلائی اور بلیچنگ کے کام کا آغاز کیا۔ پہلے یہ ہاتھوں سے کیا جاتا تھا، پھر الیکٹرک پروسیسنگ نے دستی پروسیسنگ کا ہاتھ پکڑ لیا ۱۹۸۵ء میں اسرائیل سیٹھ اور مستقیم برادران نے بجلی سے چلنے والا پروسیسنگ قائم کیا جو صنعت پارچہ بافی کی تاریخ میں ایک نیا باب ہے۔

سائزنگ :

حاجی عبدالصمد سیٹھ صنعت پارچہ بافی کے "بابائے صنعت بافندگی" تھے، اس لیے انہوں نے

"اوائل" کی بنیاد ڈالی اور "اولیت" کا شرف حاصل کیا۔ ۱۹۳۵ء میں انہوں نے سائزنگ ڈالی، سائزنگ کی پہلی چمنی بلند ہوئی تو صنعت پارچہ بافی کو سربلندی حاصل ہوگئی، دیکھتے ہی دیکھتے سکنہ رحاجی میاں پٹیل اور عثمان غنی رحیم اللہ مومن، سائزنگ کی چمنیاں بلند کرکے صنعت کی قدآور شخصیتوں میں شامل ہوگئے، رنگین ساڑیوں کی بُنائی کے لئے عثمان غنی رحیم اللہ کی سائزنگ بیحد مفید ثابت ہوئی جو آپ نے ۱۹۴۸ء میں لگائی سنہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کانجی لگی ہوئی تانے کی بیموں کی فروخت کو فروغ ملا، عثمان غنی رحیم اللہ مومن کی یہ مُہم پسندی جب دوسرے صنعتکاروں کو پسند آئی تو سائزنگ کی سو کے لگ بھگ چمنیوں کے دھوئیں سے دھن برسنے لگا، سائزنگ کی چمنیوں نے بھیونڈی کی صنعت پارچہ بافی کو معاشی پستی سے نکال کر بڑی بلندی عطا کی ہے، کاٹن کی نوواری قدیم فیشن کی گوٹا کناری والی ساڑیوں کا رواج ختم ہوتا گیا۔

مومن صنعتی ماہرین

ارباب ہنر پیشہ، صنعتی ماہرین اور دستکار جیسے شرفاء سے نوربافوں کی یہ بستی جگمگاتی رہی ہے، بھیونڈی میں، مسٹروں، مقادموں، تزئین کاروں، مستریوں اور بیٹی والوں کی کبھی کمی نہیں رہی، پیر محمد بھٹو جو جانرگ تاجر عبدالرشید مومن کے والد تھے بڑا اعلیٰ دماغ رکھتے تھے، ایجاد پسند طبیعت کے مالک تھے کرگھے کی ساری ٹکنیک سے گہری واقفیت رکھتے تھے، سبھن، مسٹر نہ صرف مزدوروں کے ہمدرد تھے بلکہ ایک تجربہ کار ماسٹر کی حیثیت سے پارچہ بافی کے سارے امور کا علم رکھتے تھے۔

جان محمد مولابخش مستری کا ماہر خاندان

جان محمد مستری حسام گنج چھولپور (الٰہ آباد) کے رہنے والے تھے، مولابخش یو۔پی کے سلسل بجکری کے جان لیوا زمانے میں ۱۸۶۵ء میں ترکِ وطن کرکے آئے، یہی زمانہ تھا کہ سارا چھولپور اجڑ کر خزاں دیدہ بن گیا تھا اور تمام ممتاز اور سردار خاندان آگے پیچھے آ کر بھیونڈی میں بسنے لگے تھے، جان محمد کے بڑے بھائی خدادین کرگھے پر چلنے والی لکڑیوں کی پٹی بناتے تھے جن کی مدد سے ساری اور چولی کے کپڑوں کی کناریوں پر کیلا دمصنوعی ریشم، زری اور روپہلی نقشیاں اور بیل بوٹے بُنے جاتے تھے، ہاتھ کرگھے پر شش

ڈھوٹا، تراوچی پر تانوں کے دونوں "دم" کے بیچ پھینکا جاتا تھا، یہی قدیم طریقہ رائج تھا۔ اس زمانے میں ہینڈلوم دہاتھ اگ) کی طرح شٹل کھینچ کر کام نہیں ہوتا تھا۔ پاوڈری (پا رفتار) دبا کر اور جھک کر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر شٹل پھینکا جاتا تھا اس مسلسل عمل سے ہاتھ بھی لہو لہان ہو جاتا کیونکہ لوہے کا نوکیلا سرا (ماکو) جو شٹل کے دونوں کناروں پر لگا رہتا کبھی چٹک جاتا، زانوؤں پر اسی لیے دو تختے بھی باندھ لیا کرتے۔

جان محمد مستری نے پھنی والے ہتھے کے دونوں سروں پر لکڑے کی ٹپیاں بنائیں جس کے "حجرے" سے ڈھوٹا نکل کر مجذوب فقیر کی طرح دوڑتا ہوا لکڑے کی دوسری پناہ گاہ میں دم لیتا اور اس محفوظ سرعتی عمل سے بُنائی میں تیزی پیدا ہو جاتی، جان محمد کی تکنیکی مہارت سے کئی اختراعات اور ترمیمات عمل میں آئیں انہوں نے دوہری ٹپیوں کا استعمال کر کے مختلف رنگوں کے دھاگوں کی بُنائی میں کامیابی حاصل کی، انگوٹھے کی مدد سے چالو پیٹی گرا دی جاتی اور دوسری پیٹی کا شٹل علاحدہ رنگ کی کانڑی لے کر اپنی سلائی (تراوچی) پر دوڑنے لگتا، اس عمل سے کپڑوں میں چوکڑی کی بُنائی ہوتی اور کپڑا دیدہ زیب اور دلکش بن جاتا۔

جان محمد مستری کے خاندان میں محمد ایوب اور عبدالرؤف بھی پیٹی بُننے میں ماہر تھے، ان کے فرزند محمد یونس مستری کو آبائی ہنر وراثت میں ملا تھا، یہ پہلے ماہر فن تھے جنہوں نے معمولی کاٹن پاور لوم پر سادہ مخمل چلانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ۱۹۶۲ء میں جب انہوں نے پہلا نمونہ تیار کیا اس کی دُھلائی رنگائی اور فنشنگ سے مخصوص لوگوں نے انکار کر دیا مبادا یہ تجربہ کامیاب ہو کر ان کی مخملیں کاروبار پر ضرب کا پیوند نہ لگا دے۔ محمد یونس مستری کے دو صاحبزادے مشتاق احمد اور شاہد احمد کامیاب ڈاکٹر ہیں، [illegible] جان محمد مستری کے دوسرے بیٹے محمد مصطفیٰ مستری بڑے کامیاب [illegible] تھے، بے حد زندہ دل، یار باش اور دل والے [illegible] انسان تھے [illegible] [illegible] والی بال کے ماہر کھلاڑی تھے، دو بیٹے شوکت اور عارف [illegible] [illegible] ڈاکٹر ساجد مستری مشہور معالج و نذاق ہیں۔ محمد یونس [illegible] کے صاحبزادے شکیل احمد [illegible] کیمیکل فیکٹری چلا رہے ہیں، بے حد خلیق اور ملنسار نوجوان ہیں۔ مصطفیٰ مستری مرحوم کے چھوٹے [illegible] کی دکان [illegible] ہیں، جان محمد مستری کے تیسرے بیٹے صدیق مستری بھی پارچہ بافی کے کارخانہ دار ہیں اور لطیف مستری عرصے سے بڑے اعلیٰ پیمانے پر دوا فروشی کا اسٹور چلا رہے ہیں —— اس خاندان میں محمد یونس مستری کے علاوہ دوسرا کوئی ماہر فن و ہنر پیدا نہیں ہوا۔

ماسٹر عبدالحی ولی محمد

اورنگ آباد کے تعلق سے ولی محمد اور ابنائے ولی محمد کا ذکر پچھلے اوراق میں گذر چکا ہے،
عبدالحی ماسٹر کی پیدائش کالا پانی مومن پورہ میں ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں ترکِ وطن کر کے بھیونڈی
میں واجہ محلہ میں بس گئے اور دو پاور لوم لگا کر صنعتی و تجارتی زندگی کا آغاز کیا، پاور لوم کے فروغ
کا ہی زمانہ تھا، حاجی عبدالصمد سیٹھ اور عبدالحق پنجابی برادری کے یہ دونوں اختراع پسند
افراد اس سلسلے میں پہل کر چکے تھے، عبدالحی ماسٹر کے مخترع بھائیوں نے پیڈل روم پر جیکارڈ
مشین لگا کر پھول پتی اور بیل بوٹے کی نقاشی کا کامیاب تجربہ کر لیا تھا۔ عبدالحی ماسٹر نے
ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ساری کی کناری میں گلکاری کے علاوہ جانوروں اور پرندوں کا
"عجائب گھر" بنا کر بنکاری میں ایک نیا تجربہ پیدا کر دیا۔ ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ جب بیلوں
سے بھرا کپڑا رنگین بازار میں آیا تو ماسٹر موصوف بھی باوجودیکہ بمبئی کے ماہرینِ صنعت
کی رہنمائی اور مدد سے محروم رہے تو اپنی 'ایجاد بندہ' اور 'اختراع پسند' ہنر سے یہ کپڑا
تیار کر کے بازار میں لے آئے، دوسرے تاجروں کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن مصنوعی ریشم کے
رنگین کا بھاؤ منڈی میں بڑھ گیا۔

عبدالحی ماسٹر ماشاء اللہ اس وقت ۹۰ برس کے ہیں اور تندرست و توانا ہیں،
ان کے فرزندان عبداللہ، عبدالرشید اور محمد حسن اسی صنعت سے وابستہ ہیں۔۔ ماسٹر کے
بھتیجوں میں محمد یوسف محمد اسماعیل و رمضان ماسٹر بھی بڑے ہنرمند ہیں۔
عبدالحی ماسٹر کے شاگردوں میں اکبر محمد یونس سردار، محمد یونس جان محمد مستری بے حد
ممتاز و نمایاں ہیں۔

امام الدین [illegible] ماسٹر [illegible] ماسٹر

[illegible] وطن پر ناگپور [illegible] سے یہاں [illegible] آبائی پیشہ کرتا تھا یہاں سے ترکِ وطن
[illegible] کے دور ابتلا [illegible] بعد میں [illegible] حساب [illegible] تھا اور [illegible]
[illegible] شادی [illegible] ہزاروں افراد کے ساتھ ماسٹر امام الدین کو بھی
[illegible] میں ملازمت مل گئی، ہنرمندی اور فنی مہارت کے خداداد
[illegible] مقدر کے ستارے اونچے اٹھ کر ماسٹری کے عہدے
[illegible] حاجی عبدالصمد سیٹھ [illegible] ۱۹۳۲ء میں پاور لوم کی تنصیب کر کے

صنعتی تاریخ میں نیا باب قائم کر چکے تھے، انہیں اپنے نئے کارخانے کے لیے امام الدین ماسٹر سے بڑھ کر کوئی اور ہنرمند اور ماہر دستکار ڈھونڈھے سے نہیں ملا، کچھ اپنائیت کا احساس تھا اور کچھ جذبۂ قدر شناسی کا انجذاب کہ مومن پورہ میں خاندان کو چھوڑ کر امام الدین ماسٹر کچے دھاگے میں بندھے چلے آئے اور پھر اس سررشتہ میں ایسی مضبوطی اور پائیداری پیدا ہوئی کہ امام الدین ماسٹر تاحیات عبدالصمد ل کے ماسٹر، روح رواں اور استاد بن کر رہے، ان کے نت نئے ڈیزائنوں، دان اور نفیس مصنوعات نے عبدالصمد سیٹھ کا شہرہ چاروں کھونٹ پہنچا دیا "لنگر چھاپ" ہر کپڑے کی پائیداری اور مضبوطی کا ضامن بن گیا، ماسٹر موصوف نے پاور لوم پر جیکارڈ کی مدد سے شولاپوری ٹاپ کی چادریں اور سہری کے لحاف کی بنائی کی بنا ڈالی اور ان مصنوعات نے سارے ملک کی منڈیوں کو لپیٹ لیا۔

بھیونڈی میں پاور لوم کے ماہرین مقادموں کا پہلا دستہ تدی ماسٹر کی تربیت کا رہین منت ہے، ان کے شاگرد مقادموں اور ماسٹروں میں عبدالغفور مقادم، حسن مقادم، بادل مقادم، بہرامقادم، بابو مقادم، حمید مقادم، حنیف مقادم قابل ذکر ہیں، اب انہیں مقادموں کے سینکڑوں شاگرد شہر میں پاور لوم صنعت کی اعلیٰ کارکردگی کے ضامن محافظ ذات بنے ہوئے ہیں۔

تدی ماسٹر کے بڑے فرزند محمد ایوب کے صاحبزادے مومن محمد حنیف ہوائی محکمہ میں طیارہ سازی کے شعبہ میں گراؤنڈ انجینئر ہیں، دوسرے فرزند عبدالقیوم نازاں ایک عظیم المرتبت مدرس اور معروف شاعر تھے۔ نظام الدین، محمد صدیق اور شکیل پیشۂ پارچہ بافی کو ذریعۂ معاش و عزت بنائے ہوئے ہیں۔

بھیونڈی میں ہر کارخانہ دار گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد پاور لوم کی تنصیب، تعمیر و مرمت کی واقفیت ضرور رکھتا ہے ڈیزائن بنانا اور ڈابی اور کھونٹیاں گاڑنے کے فن سے واقف ضرور رہتا ہے۔ عثمان غنی عبدالرحمٰن سردار، محمد یوسف محمد ابراہیم مومن، عبدالرحمٰن (سونا) محمد نذیر، محمد بشیر، محمد صدیق پیٹی والے برادران، محمد صدیق خلیل مومن (مرحوم) علی احمد پیٹی والے اور جنید مقادم کے اسماء گرامی خاص ہیں۔ بھیونڈی کی برادری میں احمد بھیوچہ کے حبیب اللہ کپڑے والے غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے کپڑے کی دکان رکھی اور تجارت کی۔ ان کے بڑے صاحبزادے محمد کے بیٹے حاجی شکیل احمد آبائی کاروبار میں مصروف ہیں اور اجداد کی سنت پر عمل کرتے ہوئے قدیم دکان کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

بھیونڈی ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی:

امداد باہمی کے اصولوں اور اشتراک تعاونی کی بنیادوں پر مہاراشٹر میں ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی اپنی نوعیت کی منفرد سوسائٹی تھی جو ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی ہندو اور مسلم تاجروں کا یہ پہلا عملی قدم تھا جس کی قدرِ مشترک صنعت کی ترقی تھی۔ حاجی عبدالصمد لعل محمد مومن اور حاجی عبدالحق فقیر محمد پنجابی مسلم طبقہ کے نمائندے تھے۔ بھاؤ صاحب دھامنکر (سابق ممبر پارلیمان) اور بابو سیٹھ چنگے روحِ رواں تھے۔ سوسائٹی نے پارناکہ میں ایک عمارت خریدی۔ سوسائٹی نے اپنی کارکردگی کا بڑا اہم ثبوت دیا اور بہت جلد ایک عظیم سرمایہ جو تخمیناً ۴۰ ہزار روپوں کا تھا جمع کر لیا۔ لیکن یہ اندوختہ منجمد ہوتا گیا اس کے جریان کے لئے ایک گروہ چاہتا تھا کہ یہ رقم تقسیم ہو جائے، دوسرا گروہ اس اندوختہ کو کسی عوامی فلاحی کام میں خرچ کرنے کا حامی تھا۔ بہرحال فیصلہ حاجی عبدالصمد سیٹھ کی سرکردگی میں اسی گروہ کے حق میں ہوا جو عوامی فلاح و بہبود کا حامی تھا۔ اسی رقم سے مومن دیوڑ میرٹی فنڈ کی ایک عمارت بنام مومن اپارٹمنٹ کھلے پر تعمیر کی گئی۔ اس کی فاضل رقم سے سینکڑوں کے طلبہ و طالبات کو تحصیل علم کے لئے مالی امداد دی جاتی ہے۔

یہ قدیم ہینڈلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی اب بھیونڈی پاورلوم ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کے نام سے مصروفِ عمل ہے۔ اس کی موجودہ مجلس عاملہ کے اراکین یہ حضرات ہیں: یوسف حسن مومن (صدر)۔ بندو ورڈ کے چیئرمین اور دیگر ممتاز افراد میں شری ایس۔ این ڈھوبے ہیں جنہوں نے نصف صدی تک بڑی دیانتداری اور خلوص سے مینیجر کی حیثیت سے سوسائٹی کی خدمت کرتے رہے۔ ممبر ہیں۔ سکندر انصاری، ضیاء احمد، نذیر مستری، شری شاہ، یوسف ابراہیم انصاری اور شہید الزماں انصاری بھی اراکین سوسائٹی ہیں۔

بھیونڈی ٹیکسٹائل مینوفیکچررس ایسوسی ایشن (مئی ۱۹۵۰) اور

بھیونڈی کارڈ ساری مینوفیکچررس ایسوسی ایشن

شہر کا تاجر طبقہ صنعتی انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں نفسا نفسی کے عالم میں تھا۔ جب اس کی برکتیں پھیلنے لگیں تو ... کے کارخانے بھی ہر طرف قائم ہونے لگے ہندو مسلم طبقوں

کا تجارتی اور صنعتی اتحاد نقطۂ عروج پر پہنچ گیا، جس کے نتیجے میں امداد باہمی اور تعاون کی بنیادوں پر تجارتی ادارے قائم ہونے لگے، اس ایسوسی ایشن کی غرض و غایت بھی یہی تھی جس کے بانیان میں حاجی عبد الشکور حاجی لعل محمد مومن، محمد ایوب پنجابی، باپو سیٹھ گوکانی، کاکو سیٹھ گوکانی، عظیم پٹیل، موہن لال کروا، صدیق مومن، عمر ستار، نارائن لاہوتی، عبد الرشید پنجابی، پربھاکر دھامنکر، عبد الغفار، خیروانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس کے عہدہ داران، اراکین عملہ اور ممبران کی کئی نسلیں گذر چکی ہیں اب موہن لال پرشرام کروا صدر ہیں، شریف حسن رمضان نائب صدر اور دیگر اراکین یہ حضرات ہیں: وناترے کردنا، کانتی گاندھی، محمد حسن خلیل الرحمٰن، عتیق احمد طیب مومن اور عبد الحفیظ حافظ محمد حسین۔

بورڈ آف ڈائرکٹرز نے گوکل نگر میں ایک شاندار عمارت سنہ ۱۹۷۰ء میں سلکو ہاؤس کے نام سے تعمیر کی ہے۔ اسی میں سنہ ۱۹۹۱ء میں ماسیمرا پاور لوم سروس سینٹر کا آغاز ہوا اور دوسرے سال میں بی ٹی ایم ٹرسٹ نے ٹیکسٹائل لائبریری کے لیے جگہ عطا کی۔

اس ضمن میں انسانیت نوازی، رواداری، مدارات اور بقائے باہم کے اصول وحدت کا پاس رکھتے ہوئے بھیونڈی کی چند اہم غیر مسلم شخصیتوں کا سرسری ذکر ضروری ہے۔ اور وسعت قلبی کا ثبوت دینا ہے ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات معترض ہوں کہ ست تاریخ میں ان کے ذکر کا گذر کیسے ہوا اور کہہ اٹھیں "یہ کافر کہاں چلا آیا مسلمانوں کی بستی میں" لیکن ان مسلمانوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو برملا کہتے ہیں ست کا فر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست۔

پرشرام رام نارائن کروا ایک کامیاب تاجر تھے، ہینڈ لوم پر تیار ہونے والا کپڑا ساری، دھوتی، لکھن (بلاؤز پیس)، جو گجری (کپڑا بازار) میں فروخت ہوتا تھا اس کے بڑے بیوپاری تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک سو پچاس روپے فی لوم کے حساب سے ۳۴ جنری وزنی لوم انگلینڈ سے درآمد کیے، مالک نے دل بھی بڑا دیا تھا۔ برہمن آلی میں چشوا دری جو بھیونڈی والا پارسی خاندان کی ملکیت تھی خرید کر وہاں پرشرام رام نرائن (پی آر) ہائی سکول قائم کیا۔

ان کے لائق سپوت موہن لال کروا جنگ آزادی کے ایک نامور سورما ہیں جو سنہ ۱۹۴۲ء میں قید فرنگ کا ظلم و ستم سہہ چکے ہیں۔ آپ بی۔ ٹی۔ ایم ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور صدر بلدیہ بھی رہ چکے ہیں، شہر کے بہت سے سماجی و تعلیمی اداروں کی عنان ان کے ہاتھ میں ہے۔

اڑتیسواں باب

بھیونڈی کی مومن برادری کی دینی جماعتیں، تعلیمی اور سماجی ادارے اور علمی و ادبی انجمنیں

جماعت اسلامی ہند

ہندستان کے مسلمان اپنی تہذیبی اور معاشرتی خصوصیات کی بنا پر غیر مسلم باشندوں سے یقیناً ممتاز ہیں اور اپنا ایک مستقل وجود رکھتے ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت اور مذہب کے تحفظ کے امین اور ضامن ہیں، اسلام کوئی نسلی مذہب نہیں ہے بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی اور اجتماعی نظامِ حیات ہے، اسلام دنیا کے سامنے اجتماعی زندگی کا جو عملی نقشہ پیش کرتا ہے وہ عالمگیر انسانیت کی بنیادوں پر ابھرا ہے وہ قوموں اور ملکوں کے درمیان دیواریں اٹھانے کا کام نہیں بلکہ دیواریں گرانے کا کام کرتا ہے، اِنَّ الْعِبَادَ کُلُّهُمْ اِخْوَةٌ اس کا نعرہ ہے، امتِ مسلمہ کے لیے اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ایسی اصولی جماعت بن جائے جس سے ساری انسانیت کی فلاح وابستہ ہے۔ یہ ہماری میراث ہے اور خدا کی رحمت ہے جو مسلمانوں کی امانت میں ہے۔

اسلامی تاریخ میں بہت ساری تحریکات قومی اور اصولی بنیادوں کا فرق بتانے کے لیے اٹھیں پہلی باقاعدہ تحریک وہ تھی جو سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے ولی اللّٰہی افکار کی ترجمان بن کر اٹھی اور جس نے بعض اعتبار سے صحابہ کرام کی یاد تازہ کر دی۔ جماعت اسلامی دوسری منظم تحریک ہے جس کی بنیاد ۱۹۴۱ء میں ڈالی گئی۔ بھیونڈی میں اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں مگر بہت کم افراد برادری اس جماعت میں شامل ہیں، ہمدردانِ جماعت کا فقدان نہیں۔

جمعیتہ اہلحدیث

بھیونڈی کی مومن برادری میں وہابی، وہابڑے یا لامجہبی (لامذہبی) جہاں خاندانوں کی کمی نہ تھی۔ ان میں عبدالغفور میانجی (اسلام آباد) کا گھرانہ عرصہ تک 'لامجہبی' کے نام سے منفرد رہا، بیرونی مبلغین اور مولویان بھیونڈی میں وہابیت کی تبلیغ کے لیے آتے رہتے تھے، مولانا نذیر احمد بہاری مدرس ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ شرک و بدعات کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ جامع مسجد اور دو رکلے مسجد توحید پرستوں کے مرکز تھیں۔

اہلحدیث گھرانے انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، صالح محمد حافظ زاہد، عبدالغفور میانجی لامجہبی مصطفیٰ یوسف منذ، محمد حنیف طاہر انصاری، محمد حسن سمرد وغیرہ مقامی اصطلاح میں "وہابی" یا وہابڑے گھرانے تھے۔ ادھر کچھ برسوں سے اس مسلک پر چلنے والے یہ حضرات ہیں۔ مختار مصطفیٰ (محمد مستو)، سراج، عبدالحئی بشارت (عالیہ مل اسٹور)۔ محمد نعمت اللہ نقشی، علی محمد مقادم، حنیف کانی والا، ڈاکٹر محبوب حسن، محمد حسن، عبدالخالق انصاری، ڈاکٹر زجاج احمد، نصیر احمد، حنیف طاہر انصاری، ہارون چاچا، امیر اللہ، عبدالعزیز نواب اور عبدالمجید نواب کا پورا گھرانہ برسوں پہلے سے بمبئی کا ممتاز اہلحدیث گھرانہ تھا۔

قدیم نوائطوں میں اہلحدیث مسلک یا وہابی تحریک کو اتنی مقبولیت حاصل نہ تھی لیکن بیسویں صدی کے اوائل میں نرولی، مرعو اور کچھ نقیہ گھرانے اسی مسلک کے تھے ان میں سے مولانا عبدالصمد شرف الدین کا گھرانہ سب سے زیادہ نمایاں تھا، انہیں کی مساعئی جمیلہ اور تبلیغ و اشاعت سے مسلک اہلحدیث پر چلنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، اتوار ۸ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو جمعیتہ اہلحدیث مہاراشٹر کے زیر اہتمام جامع مسجد بھیونڈی میں اجلاس عام کا افتتاح کرتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے والے ہی قرآن کی نظر میں کامیاب ہیں اور یہی عاملین و حاملین قرآن حزب اللہ ہیں۔ جمعیتہ اہلحدیث ایک اصولی جماعت ہے کوئی فرقہ نہیں جو کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اس جلسہ کے مہمان خصوصی موجودہ امیر مرکزی جمعیتہ اہلحدیث ہند مولانا مختار احمد ندوی تھے۔

مولانا عبدالصمد شرف الدین جب ۱۹۴۶ء میں مع اہل و عیال ہمیشہ کے لیے بمبئی چھوڑ کر بھیونڈی میں آبسے تب سے علمی و تجارتی سلسلہ کے علاوہ تبلیغ دین کے لیے تصنیف و تالیف

وطباعت کا سلسلہ بھی قائم کرلیا۔ عیدگاہ روڈ پر الدار القیمہ کی بنیاد ڈالی یہیں سب سے پہلے جمعیت کا دفتر قائم کیا گیا۔ واجہ محلہ میں ۱۹۰۳ء تک دار المطالعہ قائم رہا۔ آج بحمد للہ مختلف علوم وفنون کی اعلیٰ اور نادر و نایاب کتابوں کا تقریباً پانچ ہزار کا ذخیرہ اس علمی خزانہ میں موجود ہے۔

جمعیت کے اغراض ومقاصد میں توحید پرستی اور تمسک بالقرآن وحدیث کو سب سے اعلیٰ وارفع مقام حاصل ہے، شرک وبدعات کی بیخ کنی اور انسداد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہیں مقاصد کے پیشِ نظر جمعیت تبلیغی اجتماعات کا انعقاد کرتی ہے، اصلاحی کتب کی نشر واشاعت کرتی ہے۔ اجلاس عام اور عام خطابات کے علاوہ ماہانہ اجتماعات ہوتے ہیں۔

جمعیت نے اصلاحی کتب کی اشاعت کے لئے ایک مکتبہ 'اتحاد' قائم کیا ہے اب تک تقریباً ۴۲ کتب اور رسائل مختلف موضوعات پر شائع کر چکی ہے۔ جمعیت رفاہی وفلاحی میدان میں بھی بجید فعال ہے، دار المطالعہ اور لائبریری کے علاوہ بیت المال قائم کیا ہے ۱۹۹۰ء میں ایمبولینس سروس بھی شروع کی تھی۔ ہنگامی حالات میں بقدر استطاعت راحت اور آبادکاری کے امور بھی سرانجام دیتی ہے۔ ساتھ ہی فری ختنہ کیمپ بھی قائم کرتی ہے۔ مختلف علاقوں میں دینی مکاتب ومدارس چلا رہی ہے۔ اقصیٰ گرلز ہائی اسکول کا قیام تعلیم نسواں کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے۔ جمعیت کا انتخاب ہر تین سال کے بعد ہوتا ہے۔

تبلیغی جماعت

میوات اور دہلی کے علاقوں سے تبلیغی جماعت کے دوروں کے پھیر سے بڑھتے بڑھتے بمبئی کو لپیٹ میں لے لیا، پھر بھیونڈی اور بیلگاؤں کے درمیان تبلیغ دین کا رابطہ قائم ہوگیا جہاں نوری مسجد اس جماعت کا مرکز تھی۔ ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران بمبئی سے ایک تبلیغی جماعت لے کر محمد حسین عمروالے براہ بھیونڈی دورہ پر آتے تھے اور پھر حاجی ولی اللہ جان محمد، حاجی محمد صابر (میا) اور محمد یوسف محمد حسن وغیرہ کے ساتھ ٹنڈیل محلہ سے گشت کرنے نکلتے ان کا مرکز شمس اساعیدانی مسجد تھی۔

ٹنڈیل محلہ کے دیرینہ ارحضرات محمد یونس ولی اللہ، محمد حسین میاں جی، عبد القادر حسن اور غلام محمد پیر محمد کی مساعی جمیلہ سے اور شبانہ روز سعی وکوشش سے اس کا دائرۂ اثر دیتے

ہوتا گیا۔ ان مرحومین کے بعد محمد عثمان ولی اللہ۔ محمد بشیر عظیم اللہ۔ واجہ محلے سے حاجی نثار احمد
حافظ محمد حسین بنگالی پورہ سے حاجی شریف حسن رمضان اور عبدالرؤف بابو (مرحوم) تبلیغی جماعت
کے بڑے فعال اور سرگرم مبلغین بن گئے۔ اب ہندستانی مسجد اس جماعت کا مرکز ہے۔ سونا پورہ
مسجد بنگالی پورہ میں مختلف جگہوں سے جماعتیں آتی ہیں۔ اس محلہ کے دیندار حضرات صدیق
عبدالرحمن سردار، جمال احمد شریف مومن، شمس الضحیٰ انصاری، صدیق جان محمد مستری، مشتاق
جمیل محمد مومن، محمد حسین عبدالمجید مومن [انصاری]، بلال احمد مومن، نثار احمد مومن،
سعید احمد مومن وغیرہم بڑی سرگرمی دکھلاتے ہیں۔

عالمگیر مبین ماسٹر (مرحوم) کے گھر میں خواتین کا اجتماع ہوتا ہے۔

تبلیغی جماعت سے وابستہ ڈاکٹروں کا بڑا طبقہ ہے، بھیونڈی کے ڈاکٹر غیاث انصاری
ڈاکٹر نیاز احمد طاہر انصاری بڑی سرگرمیاں دکھلاتے ہیں اور تبلیغی اجتماعات میں
شرکت کرتے رہتے ہیں۔

انجمن اہلسنت والجماعت، بھیونڈی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی سے ملت مسلمہ کی اونچی ہوتی ہوئی عمارت
میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں، اختلاف کی خشتِ اول اس وقت رکھی گئی جب سیدنا
فاروق اعظمؓ کی سیلاب آسا فتوحات کے نتیجے میں مدینۃ النبیؐ میں مجوسی، یہودی، عیسائی،
مزدکی اور بے دین غلاموں اور کنیزوں کی بھرمار ہو گئی۔ پھر حضرت علیؓ کے عہد میں "شیعت علیؓ"
— یعنی حضرت علیؓ کی پارٹی بنی۔ امت مسلمہ کی عمارت دو حصوں میں بٹ گئی۔ شیعیت کے
مقابل اہلسنت کی صف آراستہ ہو گئی — پھر عباسی دور میں مدینۃ النبیؐ سے دوری نے "اطیعو
اللہ واطیعوالرسول" کی گرفت بھی کسی حد تک ڈھیلی کر دی، خود اہلسنت نے زندیق ربیدہ
مذہب ساختند — چار مصلّے قائم کر دئے۔ "الفرق بین الفرق" کی بڑھتی ترقی راہوں نے دین
اسلام کی شاہراہ میں کئی جہتیں پیدا کر دیں، یہ ایک الگ سوال ہے۔ آج کونسا فرقہ
ناجی ہے اور اہل سنت والجماعت کون لوگ ہیں سب سے بڑا استفہامیہ نشان بنا ہوا ہے۔

اسی سلسلے میں مناظرے ہوتے رہے اور ایسا ہی ایک مناظرہ جون ۱۹۷۲ء میں بھیونڈی میں
علمائے دیوبند اور علمائے رضاخانی کے مابین ہوا۔ اس مناظرہ کی تفصیل کو نظر انداز کرتے

ہوئے اور کسی قسم کے تبصرے سے حذر کرتے ہوئے تاکہ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو" کے
مصداق ہم صرف ان حضرات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جو اس میں شریک رہے، اس کی پوری
تفصیل "مناظرۂ بھیمڑی: علمائے دیوبند اور علمائے رضاخانی میں معرکۃ الآرا" مباحثہ:
شرائط مناظرہ اور موضوعات مناظرہ پر عالمانہ بحث۔ مولانا عبدالسلام فاروقی اور مولانا سید
ارشاد صاحب کے ایمان افروز دلائل، قرآن و حدیث اور تاریخ و سیر کے حوالہ جات، حق و باطل
کی تاریخی معرکہ آرائی۔ مرتبہ شبیر احمد راہی ایم۔اے۔ میں ملیگی جسے انہوں نے بڑی دیانتداری
اور دقت نظری سے مرتب کرکے انجمن اہل سنت والجماعت بھیمڑی (ضلع تھانہ) کی طرف سے
چھپوایا تھا۔

انجمن اہلسنت والجماعت کے عہدہ داران واراکین کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

صدر: فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالصمد شرف الدین صاحب۔ سکریٹری۔ جناب شبیر احمد راہی
ایم۔اے۔ خازن: جناب عبدالقدوس صاحب۔

اراکین مجلس عاملہ: جناب غلام محمد مومن بی۔اے، حافظ عبدالقدوس صاحب، شریف حسن
سیٹھ صاحب، سیٹھ نظام الدین سراج الدین صاحب، سیٹھ محمد قاسم سمرو صاحب، عبدالخالق
مومن صاحب، محمد یاسین سردار صاحب، محمد عباس ٹپل صاحب، جناب راشد سکندر اولی صاحب
محمد خلیل ولی اللہ سیٹھ صاحب، جناب ابوبکر صاحب، محمد حسین میانجی صاحب، عبدالستار
میمن صاحب، عبدالکریم محمد عمر میمن صاحب، سعید احمد عطر فروش، جلیل سیٹھ صاحب بلگنج،
حاجی محمد سیٹھ صاحب، مولانا عثمان صاحب، حافظ عبدالقیوم صاحب، سیٹھ محمد اسحٰق صاحب
زرانی ہوٹل، غلام محمد صاحب جنرل اسٹورز، محمد اسلام صغیر احمد خان صاحب، محمد علی سیٹھ صاحب
قاری عبدالحفیظ صاحب، محمد صالح صاحب، محمد بشیر عظیم اللہ صاحب، سیٹھ عبدالحفیظ صاحب
سیٹھ عبدالحکیم صاحب۔

مناظرہ سے قبل شرائط مناظرہ اور موضوعات مناظرہ پر بحث اور دیگر تفاصیل کی بابت
نمائندوں کی ایک میٹنگ ۲۹ مئی ۱۹۰۳ء کو الحاج عثمان غنی رحیم اللہ سیٹھ کے مکان پر
فریقین مناظرہ کی [illegible] منعقد ہوئی۔ ارکان نمائندہ کمیٹی یہ حضرات تھے۔

جناب شبیر احمد راہی، جناب غلام محمد مومن، الحاج یونس ولی اللہ، حافظ عبدالقدوس،
[illegible] میانجی محمد حسین، جناب عبدالستار میمن، جناب محمد حلیم سردار، جناب سید محمد جیلانی،

مولانا عبدالشکور اعظمی، جناب منظور حسین بہادری، جناب اکبر سردار، جناب محمد عمر عبدالستار۔

شہر کے چند نوجوانوں اور بزرگوں کی ایک میٹنگ مختلف علماء کے مواعظ کے سلسلے میں پیدا شدہ صورتِ حال پر غور و خوض کرنے اور تبادلۂ خیال کے لیے مدرسہ مفتاح العلوم (ہندستانی مسجد) میں منعقد ہوئی۔ اس میں عبدالرؤف عبدالصمد مستری، نثار احمد، محمد اسحاق، محمد یونس، محمد یعقوب فوجدار، عبدالستار، انور مومن، محمد صدیق غالب اور شوکت احمد نے شرکت کی۔

شہر بھیونڈی (ضلع تھانہ) میں مختلف المسلک علمائے کرام کی تقاریر سے پیدا شدہ نازک صورت تشویش کا باعث بن سکتی تھی، امن و سکون برقرار رکھنے اور مذہبی نزاع سے محفوظ و مامون رہنے کے لیے اتحاد و اتفاق کی ضرورت محسوس ہوئی تو بوشاہ محمد سیٹھ کے مکان واقع بھوئی واڑہ میں ۲۹ر فروری [illegible] کو ایک مشورتی میٹنگ ہوئی اس کے داعیان شبیر احمد راہی، حاجی محمد عثمان سیٹھ، عبدالرؤف مستری اور عبدالستار احمد میمن تھے۔

مناظرے کے اسباب و علل مختلف النوع ہو سکتے ہیں لیکن اصل وجہ مولانا محمد حقانی صاحب کی بدعت اور اہل بدعت کے خلاف پی پی اور محققانہ تقریریں تھیں جن سے ایک فضا بن گئی تھی اور لوگ جوق در جوق حقانیت کی طرف آنے لگے تھے، لیکن کچھ مفاد پرست علماء نے مناظرہ کرنے کا چیلنج دیکر امن و سکون اور حقانیت کی فضا کو مکدر کر دیا۔ مناظرہ کی غیر افادیت اور خطرناک نتائج کے پیش نظر بعض مقامی اور بیرونی معزز شخصیتوں نے اسے رکوانے کی کوشش کی۔ ایک کوشش بمبئی کی بعض نمایاں شخصیتوں کے ایک وفد نے بھی کی جس کی قیادت نصرت اللہ عباسی فرما رہے تھے، محترم ضیاء الدین بخاری، محترم عبدالغنی صاحب اطلس والے، جناب محمد عثمان سیٹھ شکور مل والے، جناب نور محمد انصاری صاحب کار رپورٹر، جناب امیر حمزہ صاحب کرلے والے اور جناب اشفاق احمد صاحب انصاری اس وفد کے دیگر اراکین تھے۔ ایک اور قابل تعریف کوشش آل انڈیا مسلم پرسنل لا کنونشن کے جنرل سکریٹری جناب شیخ عبدالستار صاحب نے کی۔[1]

---

[1] مناظرۂ بھیونڈی ص ۷-۱۲

دینی درسگاہیں

مدرسہ نجم الاسلام کے علاوہ فضل رحمانی عربی مدرسہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، لے برادری نے قائم کیا تھا (۱۹۰۵ء) بنگال پورہ میں یہ واحد دینی درسگاہ تھی جہاں چوتھی جماعت تک اردو فارسی اور عربی کی تعلیم دی جاتی تھی، منشی موسیٰ رضا اس کے اصل بانیان میں سے تھے وہی اس میں درس دیتے تھے۔ یہ مدرسہ ۱۹۳۲ء تک جاری رہا۔ منشی صاحب خود اپنے وقت کے اردو اور فارسی کے عالم اور صوفی مشرب انسان تھے۔

مدرسہ مفتاح العلوم

بھیونڈی میں مدرسہ مفتاح العلوم (مارکیٹ بھوسار محلہ) کی دینی حیثیت مسلم ہے، ہماری برادری کے مشہور عالم، عالم دین قاضی اطہر مبارک پوری کی جد و جہد کی برکت تھی کہ یہ دینی درسگاہ جو چشمۂ علم و دانش ہے وجود میں آئی اپنے قائم کردہ مدرسہ سے انہیں جواب تک لگاؤ ہے اس کا اظہار انہوں نے اپنے خط (مورخہ ۶ مئی ۱۹۹۱ء مطابق ۲۰ شوال المکرم ۱۴۱۱ھ) میں کیا ہے۔ اس کے بانیان میں شہر کی ممتاز ہستیاں ہیں۔ حاجی محمد یونس ولی اللہ، حاجی عثمان غنی رحیم اللہ، حاجی مبین ماسٹر، محمد حسن منشی کرامت اور حاجی عبدالحمید سردار۔

اس مدرسہ میں ناظرہ اور حفظ کے علاوہ عالمیت کا نصاب بھی داخل تدریس ہے، طلبہ کے قیام و طعام کا معقول انتظام ہے۔ تین سو کے قریب طالبان علم اس چشمۂ علم سے فیض اٹھا رہے ہیں، یہ مدرسہ ہندستانی مسجد سے متصل ایک علاحدہ عمارت میں قائم ہے، اسی کے زیر اہتمام مدرسہ جامعۃ البنات بھی جاری ہے جس کی بنیاد ۱۹۸۶ء میں ڈالی گئی۔ جامعۃ البنات ایک چار منزلہ شاندار عمارت میں قائم ہے۔

دارالعلوم دیوان شاہ

۱۹۸۶ء میں دارالعلوم دیوان شاہ کی نئی عمارت کی بنیاد ڈالی گئی، اہل سنت والجماعت کی اس دینی درسگاہ کی فضیلت مسلم ہے، یہاں بھی حفظ، تجوید و ناظرہ کے علاوہ عالمیت تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی درسگاہ سے منسلک طلبہ کے لیے چوتھی جماعت تک کی تعلیم

کے لیے ایک مدرسہ بھی ہے اس کے بانیان میں سے چند ممتاز ہستیوں کے نام جو ہم تک پہنچے ہیں وہ یہ ہیں: عبدالغفور مرشد، حاجی جسیم سردار اور محمد باقر عبداللطیف۔

مشہور عالم دین مولانا سید حامد اشرفی صاحب کی سرپرستی اور رہنمائی میں دارالعلوم دیوان شاہ نے بیحد ترقی حاصل کی ہے۔

دینی مدارس (ناظرہ)

قرآن کی تعلیم، تجوید ناظرہ اور دینیات کی تدریس و افادہ کی غرض سے روایت کے مطابق مدرسے عموماً محلہ کی مسجد سے وابستہ ہوتے تھے، ہر محلہ میں اس قسم کے مدرسے قائم ہیں اور ان کی برکتیں سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے زیادہ تر برادری کے دیندار افراد نے قائم کئے ہیں کچھ ناظرہ مدرسوں کے نام یہ ہیں: مسلم یتیم خانہ کا دارالعلوم صمدیہ بیحد قدیم ہے اس کے ناظم عرصہ تک مولانا محمد یوسف انصاری مبارک پوری تھے۔ یہ عبدالصمد سیٹھ کی دینی یادگار ہے الجامعۃ الامجدیہ (غیبی نگر) بزم محبانِ محمدی (کھجور پورہ) بزم محمدی (کھجور پورہ) یادگار فاطمہ عربی مدرسہ (قیصر باغ) محمد شاہ محمد اسلامی عربی مدرسہ (دواجہ محمد)۔ کھوٹالہ مسجد عربی مدرسہ (کھوٹالہ) تکیہ جندی شاہ عربی مدرسہ (زیتون پورہ) شمع نگر مدرسہ (شمع نگر) کورٹ گیٹ عربی مدرسہ۔ مدرسہ اسلامیہ (سلہ پورہ مسجد عربی مدرسہ)۔ یادگار فاطمہ عربی مدرسہ (باغ پیر اسلام پورہ)۔ بلاغِ فردوس مسجد عربی مدرسہ (ایس۔ٹی ڈپو) مسجد ہری عربی مدرسہ (الرازی میموریل ہسپتال۔ نئی بکے سے پرے آگرہ روڈ) سونا پور مسجد (بنگالی پورہ) مومن لائبریری کا عربی مدرسہ، مدرسہ رضویہ وغیرہ۔ الجامعۃ الامجدیہ غیبی نگر کے زیرِ اہتمام امجدیہ ہائی اسکول کا بھی اجرا ہوا ہے۔

امدادِ باہمی کے ادارے

مومن ویورس چیریٹی فنڈ

بھیونڈی کا ایک قدیم استمدادی مالی ادارہ ہے جو امداد باہمی اور اشتراک تعاون کی بنیادوں پر استوار ہے اور ایک فلاحی و رفاہی وقف کی صورت میں کارِ خیر کر رہا ہے،

اس کے بانی شہر کے سب سے اونچے صنعت کار تھے اور اراکین ممتاز اور سربرآوردہ مومن افراد تھے: حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن، عبدالشکور حاجی لعل محمد مومن، عبدالحیٔ ولی محمد ماسٹر، عثمان غنی عبدالرحیم، محمد حسن صابدین، محمد ایوب عبدالحق پنجابی۔ محمد ایوب محمد الیاس مومن، حافظ بقر عیدی عبدالغفور، محمد حسن مداربخش۔

موجودہ اراکین 'ذوی القربہ' ہیں اور اس الوقف الخیر کی انتظامی تشکیل نے اسے ایک طرح سے بظاہر "وقف الذریۃ" بنادیا ہے لیکن یہ صرف انتظامی امور کی بنا پر ہے۔ ادارہ کے اغراض و مقاصد میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے کارِ خیر اور صدقاتِ جاریہ کا سلسلہ برابر چل رہا ہے: محمد ایوب عبدالحق پنجابی۔ مومن نثار محمد رمضان۔ مومن ریاض احمد شاہ محمد۔ مومن محمد یٰسین محمد الیاس۔ مومن محمد یوسف محمد رمضان۔ مومن اشفاق احمد ہدایت اللہ۔ مومن جمال احمد محمد شریف۔ مومن ضیاء احمد عبدالشکور۔ انصاری نثار عبدالمجید۔

عوامی امدادی فنڈ

قرض لینے اور دینے کے بارے میں شریعتِ محمدیؐ میں طریقے بتلائے گئے ہیں، یوں تو قرض بذاتِ خود ایک مصیبت ہے لیکن قرض دینا بھی ایک انسانی فریضہ ہے بشرطیکہ سود یا منفعت پرستی کا کوئی جذبہ قرض خواہ کے دل میں نہ ہو۔ شریعت نے قرضدار اور قرض خواہ پر کچھ ایسی اخلاقی اور قانونی پابندیاں لگادی ہیں جن سے دونوں کو سہولتیں ملتی ہیں۔ شارع علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ میں قرض لینا بھی تھا کبھی رہن رکھ کے اور کبھی بغیر رہن کے، ضروریاتِ زندگی بھی عاریتاً لیتے تھے اور کبھی ادھار خریدتے تھے۔

بنکر برادری کو کاروبار اور صنعت جاریہ میں سرمائے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اسلام نے سودی کاروبار مثلاً "وٹہ و دلالی" جیسی مشروط بیع اور قرض کی ممانعت کی ہے۔ قرضدار از زیورات کی ضمانت پر بلا سود قرض دیا جاتا ہے۔ اس طرح حاجتمند حضرات کسبِ فیض کررہے ہیں۔ عوامی امدادی فنڈ کے بانیان ہیں: حاجی یونس ولی اللہ۔ حاجی عثمان غنی ولی اللہ۔ حاجی شریف حسن محمد رمضان مومن اور حاجی عبدالحمید محمد یوسف پنجابی۔

یہ امدادی اور رفاہی ادارہ ہندستانی مسجد سے ملحق لبِ شاہراہِ عام پر مصروفِ عمل ہے اس کے عاملین یہ مومن حضرات ہیں: نثار احمد رمضان مومن، شمس الضحیٰ انصاری ریاض

طاہر، نثار احمد حافظ محمد حسین مومن، بلال احمد مومن؛ ضیاء احمد عبدالشکور مومن، مصطفیٰ؛ حاجی محمد یوسف ولی اللہ، حافظ محمد جمیل چھیدا، حافظ عبدالقیوم، نصیر احمد محمد یوسف پنجابی۔ غلام محمد سکندر زرلد ہے۔

الانصار ہیلتھ اینڈ ویلفیر سینٹر (تھانہ روڈ بھیونڈی)

تھانہ روڈ محلہ کے نوجوانوں نے حفظانِ الصحت، ورزش اور تعلیمی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر اس سینٹر کی بنیاد ۱۳ اپریل ۱۹۸۰ء میں ڈالی، الانصار ہیلتھ اینڈ ویلفیر سوسائٹی کے زیر اہتمام ایک ہیلتھ کلب گذشتہ دس برسوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے اس تمام عرصہ میں اراکین غریب اور نادار بچوں کی تعلیمی ضروریات بھی پوری کرتے رہے ہیں، مستحق طلبہ وطالبات میں بیاضیں تقسیم کرتے رہے، عید اور بقرعید کے موقعوں پر کوپن کے ذریعہ دودھ تقسیم کرنے کا انتظام کرتے ہیں۔

کمیٹی سے متعلق نوجوانانِ برادری قوم و ملک و ملت کی خدمت کے لیے بڑا جوش رکھتے ہیں، خصوصاً دینی تقریبات کے موقع پر "سائل اور محروم" کا بڑا خیال رکھتے ہیں، قربانی کا گوشت ہر گھر سے جمع کر کے شہر کی غریب مضافاتی بستیوں میں جا کر بانٹ دیتے ہیں، شہر کا یہ واحد فلاحی ادارہ ہے جو اپنی خوشیوں اور شادمانیوں میں غریبوں کو بھی شریک رکھتا ہے" اور ان کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ عہدیداران کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

عدنان احمد محمد یوسف انصاری (صدر)، مسعود محمد یونس مومن (نائب صدر)، سرفراز احمد شبیر احمد راہی انصاری (سیکریٹری)، محمد کاظم غلام مرتضیٰ مومن (جوائنٹ سیکریٹری) امتیاز احمد محمد حنیف طاہر انصاری (خازن) اور محمد اسمٰعیل یعقوب ناگوری (پریڈینٹ سیکریٹری)۔ اسکول کے مستحق طلبہ وطالبات کی بیاضوں سے مدد بزمِ ثقافت (بنگال پورہ بھیونڈی) بھی اپنے طور پر کرتی تھی، محمدی ہیلتھ اینڈ ویلفیر سینٹر بھوسار محلہ کے نوجوانوں نے قائم کیا ہے۔

بر مزارِ غریباں.....

گڑ سوتے ہیں خاموش، آبادی کے ہنگاموں سے دور؛ — لیکن صورت حال اب

ہنوز؏ دیگر ہے، اب آبادیوں میں شہرِ خموشاں بس گئے ہیں اور شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے سارے تصورات کے آبگینے بھیونڈی کے تعلق سے پاش پاش ہو گئے ہیں اب نہ دریائے زیبا موشی میں موج ہوا غوطہ زن رہتی ہے اور نہ شہر خموشاں کی فضا میں دور سے آنے والی آوازِ درا بلکہ پاورلوم کارخانوں کا شور و شغب بڑی نزدیک سے اٹھتا ہے۔ قبرستانوں کے اردگرد حصار بندی ایک امر ناگزیر بن گیا ہے، آج سے چالیس سال پہلے جب ”خفتگانِ خاک سے استفسار“ کیا جاتا ؏ کہ وہاں بجلی بھی ہے؟

”آہ! وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟ ــ تو اندھیرے میں صدائے پرسش ڈوب جاتی تھی۔ پھر ان لوگوں نے جن کے دل محبت کی تجلّی سے سراپا نور تھے، قدم آگے بڑھایا۔

انجمنِ تحفظ سوناپور حصار محلہ (بنیاد ۱۹۵۲ء)

کچھ دردمند دل رکھنے والے افراد عبدالرحمٰن بیڑی والے کی دکان میں اکٹھا ہوئے اور یہ طے پایا کہ لوم مالکان اور عوام سے فی کس ہم آنے چندہ جمع کیا جائے۔ دیوان شاہ کے عرس کے موقع پر انجمن کے بانیان چندہ اکٹھا کرتے تھے۔ انجمن کے بانیان نے جن کے نام درج ذیل ہیں اینٹ بنانے (خشت سازی) کا ہنر سیکھا۔

عبدالرحمٰن گھراؤ، محمد یونس اللہ والے، نصیر احمد زاہد، عثمان اصغر گھڑی والے، عبدالرحمٰن سیٹھ، بشیر، یوسف گھراؤ، صدیق پیر محمد، عبدالصمد صدیق، رفیق، یونس، پیر محمد کلو، مجید، عثمان غنی، بقری نوا، یوسف، عبدالرشید خب، محی الدین۔ یہ حضرات کھاڑی میں سے ریت نکال کر شفیع ڈرائیور کی لاری میں بلا اجرت لاتے تھے اور پھر جا دا (پزاوہ = آوا) میں اینٹیں تیار کرتے تھے تقریباً ۲۵ ہزار اینٹوں کی بھٹی لگاتے تھے، قبرستان کی چہار دیواری کا سنگِ بنیاد مولوی محمد امین ولد مولوی مسعود کے ہاتھوں رکھا گیا (انہوں نے پہلی اینٹ رکھی تھی)۔ قبرستان کے چندے کے لیے ۱۳ ردسمبر ۱۹۵۲ء کو ایک کل ہند مشاعرہ بمقام پنجابی کمپاؤنڈ بنگال پورہ میں منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت حکیم مرزا حیدر بیگ نے کی تھی۔

سوناپور قبرستان (بنگال پورہ)

قدیم شہر اسلام آباد۔ بھیونڈی کے جنوبی علاقے میں زیادہ تر دو انجمنوں کا دو نمبر، دو نمبر اور

عقار (شیخ تیلی) آباد تھے جن کے آبائی قبرستان تین براہمنوں (میکل، کانٹ اور گھلے) کے بڑائے ہوئے پشوائی کے دور کے کاپ تالاب سے پرے مختلف قطعہ ہائے اراضی میں پھیلے ہوئے تھے قبرستان کا سلسلہ دادامیاں کے کھیت سے لے کر کھجور پورہ تک چلا گیا تھا، جب انیسویں صدی کے آخری نصف میں برادری کے مہاجر خاندان بنگال پورہ کو بسا کر آباد ہو گئے تو ایک بچے کھچے قطعہ کو یہ لوگ بطور قبرستان اپنے تصرف میں لے آئے جہاں انکے آباء و اجداد مدفون ہیں۔

آمد و رفت سے قبروں کی بے حرمتی ہوتی تھی اور چوپائے غلاظت پھیلاتے تھے، قبر کو اونچی کرنا، ان پر قبے اور مسجدیں اور مزار بنانے کی حرمت حدیثوں سے ثابت ہے یہاں تک کہ ان پر کتبے لگانے کے بارے میں بھی وعید آئی ہے۔

برادری کے بزرگوں اور جوانوں کے تعاون اور مساعی سے سوناپور قبرستان (بنگال پورہ) کے اردگرد ایک پختہ چہار دیواری تعمیر کی گئی خانصاحب حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد کے ہاتھوں ۲۶ شعبان المکرم ۱۳۷۶ء مطابق ۲۹ مارچ ۱۹۵۷ء کو سنگ بنیاد رکھا گیا، باب الداخلہ پر مسنون دعائیں نقش کی گئیں اور لوحِ مرمر پر مندرجہ ذیل اشخاص کے اسمائے گرامی بطور یادگار ثبت کئے گئے ہیں:

شریف حسن رمضان (صدر)۔ صدیق عبدالباری مومن (بی۔ اے) (سیکریٹری)۔ ابوبکر اکبر علی۔ یسٰین عبدالرحمان سردار۔ غلام رسول ہدایت اللہ۔ عبدالرشید یوسف پنجابی۔ مشتاق موسیٰ رضا۔ یوسف حسن مومن۔ محمد اسحٰق محمد یوسف۔ محمد یوسف دلال۔ سکندر یونس انصاری۔ متولیان مسجد میں ان تین افراد کے نام شامل ہیں: عبدالرحمٰن پیر محمد سردار، محمد عمر حاجی شیخ علی اور محمد قاسم شیخ حسین۔

اس قبرستان کی چہار دیواری کی تعمیر کے لئے ایک یادگار تاریخی مشاعرہ کا انعقاد ۳۱ دسمبر ۱۹۵۷ء میں کیا گیا۔

تعلیمی اور سماجی ادارے

مومن ویلفیر سوسائٹی

آج سے چالیس سال پہلے برادری کی تعلیمی اور سماجی پسماندگی طبقاتی شعور رکھنے والے

دانشوروں اور تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے ایک عقدہ لاینحل بن ہوا تھا۔ یہ زمانہ برادری کی عسرت زناداری کا تھا، جب تشنگانِ علم "چشمۂ حیوان" کی تلاش میں تھے اللہ تعالیٰ نے ایک سرچشمۂ جود و کرم حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن سیٹھ کی ذات بابرکات میں پیدا کر دیا، ان سینکڑوں فیض یافتہ طالبانِ علم میں سے یہ راقم بھی ہے جس کی "فیس معاف" تھی یعنی پوری فیس سال بھر کی حاجی صاحب کی طرف سے ادا کی جاتی تھی اور صرف چار آنے گیم فیس ماہوار ذاتی طور پر ہر طالبعلم کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ لیکن راقم جب چھٹی جماعت کا سالانہ امتحان دے رہا تھا اور "اسباق الاشیاء اور حفظان الصحت" کا پرچہ لکھ رہا تھا کہ ہیڈ ماسٹر دورہ کرتے ہوئے آئے اور پوچھا "تم نے فیس بھری؟" — راقم السطور نے اپنے مربّی کا نام لیا، پرسش گیم فیس کی تھی اور معاملہ فقط مبلغ تین روپوں کا تھا تقاضہ کیا گیا، امتحان سے اٹھا دیا گیا اور اینگلو اردو بائی اسکول (تکیہ امانی شاہ) سے بنگال پورہ تک دوڑا دیا گیا، اللہ تعالیٰ اجر دے استاذی سید عبدالرحمٰن صاحب کو جنہوں نے دلاسا دیا، اس مرحومہ تنگی والے گھر (مملوکہ طاہر انصاری تھانہ روڈ) کے اوٹے پر چرخہ کات رہی تھیں، تین روپوں کے مطالبے سے چرخہ کی مال ٹوٹ گئی، گرہ میں مال کہاں تھا؟ اللہ رحم کرے عنایت پیرجی پر جو کپڑے کی بچیری کرنے کے لیے نکلے تھے، دو روپے انہوں نے قرض دیا اور ایک روپیہ اماں نے انٹی میں سے نکال کر دیا — اور اس طرح راقم چھٹی جماعت سے میٹرک تک پہنچا۔ یہ ایک ذاتی تجربہ ہے اور صداقت سے معمور جو تفردیبی رکھتا ہے اور عمومیت بھی۔

کالج کی تعلیم کے لیے متمول اور مخیر حضرات مالی استعانت کرتے اور اس طرح تین چار گریجویٹس پیدا ہو گئے۔ بیرونِ ملک انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے کا تصور ایک خواب تھا جو ہم نے سب سے پہلے دیکھا اور بمبئی یونیورسٹی کے تین سو تیرہ ما ہانہ وظیفہ پر ایک اجنبی ملک میں چار سال گذار دیئے، اس رقم کے صرف ۱۲ یا ۱۳ پاؤنڈ بنتے تھے جو آدھے مہینے کے صرف اخراجات کے لیے بھی کافی نہ پڑتے، حسبِ ضرورت صدیق عبدالباری مومن ادھر اُدھر رشتہ داروں سے مانگ کر جمع کرتے اور میرے بڑے بھائی محمد یوسف محمد ابراہیم مومن تنگ و دو کر کے ڈرافٹ بھیج دیتے۔ مالی اعانت کرنے والوں میں یہ رشتہ دار پیش پیش تھے، حاجی عبدالشکور حاجی حسن محمد مومن۔ پنجابی برادران اور عبدالرشید نجیبی اور جوانمرگ عبدالرشید مومن (اللہ تعالیٰ میرے ان تمام محسنوں کو اجر عظیم عطا فرمائے۔ آمین)۔

ان تجربات نے راقم السطور کو یہ سبق دیا کہ ہماری برادری میں ایسے دردمند اور باضمیر حضرت ہیں جو ہر طالب علم کے سفینۂ حیات کے لیے ناخدا بن سکتے ہیں، لہٰذا ان ناخداؤں کی ایک میٹنگ محمد ایوب پنجابی کے آفس واقع بنگال پورہ میں بلائی گئی، حاجی عبدالشکور حاجی لعل محمد مومن نے صدارت کی اور محمد ایوب پنجابی نے سرپرستی فرمائی۔ راقم نے مومن ویلفیر سوسائٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی اور اس طرح ۲، فروری ۱۹۶۰ء کو مومن ویلفیر سوسائٹی کی بنیاد پڑی۔ سوسائٹی کی پہلی مجلسِ منتظمہ کے اراکین اور عہدہ داران یہ تھے:

عبدالرؤف حاجی عبدالحق پنجابی (صدر)۔ مصطفیٰ اعباس مومن اور عبدالقادر عبدالرحمٰن انصاری (نائب صدر)۔ صدیق لعل محمد مومن (خازن)۔ صدیق عبدالباری مومن (بی۔ اے۔ آنرز) (سیکریٹری)۔ ڈاکٹر مومن محی الدین (ایم اے پی ایچ ڈی۔ اڈیٹر) (سیکریٹری) عبدالرحیم محمد یعقوب مومن (بی۔ اے آنرز) (جوائنٹ سیکریٹری)۔ محمد یوسف محمد حسن مومن (جوائنٹ سیکریٹری)۔

کاؤنسلر یا مشیر یہ حضرات تھے:

محمد عثمان حاجی ولی اللہ مومن۔ محمد ادریس عبدالحمید سردار۔ عالمگیر محمد مبین مومن۔ نصیر احمد زاہد مومن۔ ابوبکر اکبر علی مومن۔ عبدالحفیظ محمد حسین مومن۔ شریف حسن رمضان مومن۔ محمد حسن خلیل مومن (بی۔ ایس۔ سی آنرز)، عبدالباری محمد یوسف مومن۔ محمد اسحٰق محمد یوسف مومن، محمد یعقوب عبدالرحیم مومن اور محمد حسن محمد بشیر مومن۔

ابتدائی چند سالوں میں، بیاضیں، کتابیں اور وظائف دیے جاتے تھے بعد ازاں صرف کالج کی فیس اور ہوسٹل کا خرچ دیا جانے لگا، اللہ کے فضل و کرم سے سوسائٹی اپنے اعلیٰ اور ارفع مقاصد میں ہر لحاظ سے کامیاب رہی ہے اور ان تینتیس ۳۳ سالوں میں تقریباً ڈھائی سو طلبہ و طالبات اس کے صدقاتِ جاریہ سے فیضیاب ہو چکے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کی سندیں حاصل کی ہیں، ان میں مالیگاؤں کے ایک ڈاکٹر بھی شامل ہیں اور ایک بڑی تعداد آج برسرِ روزگار ہے۔

ادھر چند سالوں میں مومن ویلفیر سوسائٹی نے ایک بڑا مستحسن تعمیری پروگرام بنایا ہے مسلم جماعتوں میں خصوصاً میمن، بوہرہ اور خوجوں میں جماعت خانہ کا قیام ان کی مذہبی اور سماجی زندگی کا ایک جزو لاینفک بنا ہوا ہے۔ جماعت خانہ اجتماعی روایات اور جماعتی

تنظیم کا محور ہے اس قسم کی اجتماعی اور سماجی مرکزیت کا فقدان برادری میں ہمیشہ رہا ہے۔
بحمدللہ مومن ویلفیئر سوسائٹی کے ہوشمند عہدہ داران، اراکین اور برادری کے بزرگوں نے اس
کمی کو محسوس کیا، مسلم آرفینج کے ٹرسٹیوں نے جن میں عبدالشکور حاجی لعل محمد مومن، محمد
ایوب پنچ بی اور عبدالرحمٰن سردار کے اسمارِ گرامی زیب ہیں سوسائٹی کو ایک قطعۂ اراضی مومن
جماعت کو عنایت فرمایا، مشتاق مومن ڈپٹی والے جو ایک سرگرم سماجی اور تعلیمی ورکر ہیں
انہوں نے جماعت خانہ کا نقشہ بنایا مگر تعمیری کام معرض التوا میں پڑ گیا، آخر کار ۱۹۹۱ء
میں نئی مجلس عاملہ کے ممبران نے اس خاکے کو عملی جامہ پہنایا اور بحمدللہ جماعت خانہ کی عمارت
جماعتی اتحاد و جد و جہد کی علامت بن کر اور برادری کے عزائم کا مینارہ بن کر کھڑی ہو گئی ہے
اس عمارت میں ۳۶ رہائشی فلیٹس ہیں۔ نچلی منزل پر ایک شاندار ہال تعمیر کیا گیا ہے اور
اس طرح سوسائٹی خود کفیل بن گئی ہے۔ سوسائٹی کی مستقل آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے
اور اب سوسائٹی مختلف نئی جہتوں میں فلاح و بہبود کے لئے سرگرم سفر ہے ایک سنگِ میل
بیت المال کا قیام ہے تاکہ مستفیضین کی حاجت روائی کی جا سکے اور ناداروں کو مالی اعانت
دی جا سکے۔

بھیونڈی ویلفیئر سینٹر (درگاہ روڈ)

بھیونڈی ویلفیئر سینٹر کا قیام (یکم اپریل ۱۹۸۴ء) مومن برادری کے چند ہوشمند
اور فعال نوجوانوں کی مساعیٔ جمیلہ سے عمل میں آیا، شہر کے اہلِ خیر حضرات کا بھرپور
تعاون حاصل ہونے کے سبب اس فلاحی ادارے کا دائرۂ عمل وسیع ہوتا جا رہا ہے۔
سماجی، تعلیمی، طبی سرگرمیوں کے علاوہ اب اس نے کھیل کود اور ورزشی میدان میں بھی
قدم رکھا ہے۔
تعلیم کے میدان میں ایجوکیشن کمیٹی نادار طلبہ و طالبات کی نصابی کتابوں اور
کاپیوں سے مدد کرتی ہے۔ ایس۔ ایس سی اور بارہویں کلاس کے طلبہ طالبات کی
تعلیمی رہنمائی کے لئے ' ووکیشنل گائیڈنس ' کے پروگرام کرتا ہے۔ تعلیم بالغاں کے
لئے کلاس بھی جاری کئے ہیں۔ سینٹر نے ایک خیراتی تشخیص امراض کا شعبہ بھی قائم
کیا ہے، امدادی تشخیص خانہ اور میڈیکل کیمپ کے ذریعے اور مقامی ڈاکٹرس

کے تعاون سے نادار شہری جو اس صنعتی شہر کی فضائی آلودگی سے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں بحمد للہ شفا حاصل کرتے ہیں۔ بمبئی کے ماہر معالجین اور ماہرین سے سینٹر رجوع کرتا ہے۔ اس تشخیص خانے سے بہت ساری طبی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مریضوں کی فلاح و بہبود کے لیے مستقبل قریب میں ایکسرے مشین، فزیوتھراپی اور ایمبولنس سروس جاری کرنے کے منصوبے سینٹر کے منشور میں شامل ہیں۔ اس شعبہ کا نام بھیونڈی چیریٹیبل ڈائیگونسٹک سینٹر ہے۔

سماجی اور دینی امور میں بھی سینٹر نے ایک مثال قائم کی ہے۔ عید رمضان کے مبارک موقع پر مناسب قیمت پر دودھ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سودی کاروبار سے محفوظ رکھنے کے لیے سینٹر نے غیر سودی عوامی بچت اسکیم کا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔

اسپورٹس اور کھیل کے تعلق سے بھی سینٹر نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں، کئی کامیاب ٹورنامنٹ یا مقابلوں کا انعقاد کیا اور کھیل کود کے فروغ کے لیے بھیونڈی سٹی اولمپک کا منصوبہ تیار کر رہا ہے۔ اس 'منی اولمپک' میں مختلف کھیلوں کا مظاہرہ کیا جائیگا جس میں بھیونڈی کی کئی اسپورٹس ٹیمیں اور بانی اسکولوں کی ٹیمیں شرکت کریں گی۔

سینٹر کے اغراض و مقاصد جدید متنوع اور رنگا رنگ ہیں تعلیم کھیل اور سماجی خدمات کے ساتھ ساتھ اراکین اردو زبان کی بقا و فروغ سے بھی غافل نہیں ہیں، تحریری و تقریری مقابلے اور سیمینار اور ورکشاپ سمپوزیم کا انعقاد سینٹر کے آئندہ پروگراموں میں شامل ہیں، لائبریری اور ورزش خانہ (جمنازیم) کا قیام، سائنسی اور اسلامی نمائش وغیرہ کا اہتمام کرنا بھی اس فلاحی ادارے کے منشور میں ہیں۔ قوم و ملت کے لیے جو درد مندی اور کسک اس سینٹر کے نوجوان ہمدردانِ قوم محسوس کرتے ہیں وہ ایک قابلِ تحسین جذبہ ہے یتیم، مطلقہ اور بیوہ مستورات کے لیے گھریلو صنعت کا انتظام کرنا اور انہیں دستکاری اور سلائی کڑھائی کا فن و ہنر سکھا کر خود کفیل بنا دینا وقت کا تقاضہ ہی نہیں کارِ خیر اور کارِ ثواب ہے۔

الحمرا ایجوکیشن سوسائٹی اور الانصار ایجوکیشن اینڈ ویلفیر سوسائٹی

ان دونوں تعلیمی اور سماجی سوسائٹیوں کا قیام عمل حال ہی میں ہوا ہے۔ بھیونڈی کے ابھرتے ہوئے تاجروں اور متمول و مخیر تازہ وارد انصاریوں میں قوم و ملت کے لیے

جو ولولہ اور جذبہ پیدا ہوا ہے اس نے قدیم باشندوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ان دونوں تعلیمی و فلاحی اداروں کا قیام پرتاب گڑھ کے فرید احمد انصاری کا مرہون منت ہے۔ الحمرا ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر انصار احمد انصاری ہیں اور دوسری سوسائٹی کے صدر فرید احمد انصاری ہیں جنرل سیکریٹری ڈاکٹر محمود الحسن ہیں۔ انصاری صافیہ گرلز ہائی اسکول ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی

بھیونڈی میں کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی سب سے قدیم تعلیمی ادارہ ہے جس کے زیر اہتمام متعدد اسکول چل رہے ہیں۔ آج سے دو دہائی قبل آبادی کے تناسب سے اسکول کی تعداد بہت کم تھی، برادری کا ایک بھی اسکول نہ تھا، اس کا جب شدید احساس ہوا اور ضرورت محسوس ہوئی تو ۱۹۷۶ء میں بنگال پورہ کے چند سرکردہ حضرات نے "بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی" کی بنیاد ڈالی ان میں محمد صدیق عبدالباری مومن، یوسف حسن مومن، شریف حسن رمضان مومن، محمد حسن بھوپالی، مشتاق موسیٰ رضا، عبدالحفیظ حافظ محمد حسین، ڈاکٹر عبدالمنان انصاری، محمد حسن خلیل (چھپو والے) اور ایڈوکیٹ نثار کھریے صاحبان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس سوسائٹی کے زیر اہتمام جون ۱۹۷۶ء کو بنگال پورہ میں ہی "بھیونڈی دیورس ہائی اسکول" کا قیام عمل میں آیا بہت ہی قلیل عرصہ میں اس اسکول نے بھیونڈی کے تعلیمی میدان میں اپنی شناخت قائم کرلی نتیجتاً اسکول کی عمارت ناکافی ہونے لگی۔ اس لیے اسکول کی ایک نئی عمارت صمد نگر (کنیری) میں تعمیر کی گئی اب یہ اسکول اس نئی کشادہ اور تعلیمی لوازمات سے آراستہ عمارت میں خان صاحب حاجی عبدالصمد مومن مرحوم کی یاد میں "صمدیہ ہائی اسکول" کے نام سے جاری ہے۔ طلبہ اور طالبات کے لیے علیحدہ علیحدہ سیکشن قائم ہیں۔ یہ اسکول ہیڈ ماسٹر جناب بلال احمد مومن کی زیر نگرانی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ پرانی عمارت میں پرائمری سیکشن "بھیونڈی دیورس پرائمری اسکول" قائم ہو چکا ہے جس کی ہیڈ مسٹریس یاسمین رفیع انصاری صاحبہ ہیں جن کا حسنِ انتظام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر انتظام حاجی عبدالشکور ٹیکنیکل ہائی اسکول" کی عمارت تعمیر ہو چکی ہے اور تکنیکی تعلیم کا منصوبہ زیر غور ہے اس کے علاوہ اسی احاطہ میں ایک گرلز ہائی اسکول کی عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بھی عنقریب معرض وجود میں

آنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا نام رابعہ گرلز اسکول ہے۔

ہائی اسکول کی سرگرمیاں بیحد متنوع، رنگا رنگ اور گوناگوں ہیں ان میں جسمانی تعلیم، اسکول پارلیمان، مجلس مذاکرہ، بین المدارس، ڈرائنگ مقابلہ، ڈرائنگ کی تربیتی کلاسیز، بین المدارس مراٹھی تقریری مقابلہ، طلبہ کا بچت بینک، دینیات کی تعلیم، سالانہ ثقافتی پروگرام، الیکٹریکل، وائرنگ فٹنگ اور ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کے کورس شامل ہیں، موخرالذکر کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے ادبی ذوق نکھارنے اور لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے اسکول ایک سالنامہ "پرواز" کے نام سے شائع کرتا ہے۔

بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے انتظامیہ اور مجلس عاملہ میں شہر کی ممتاز ہستیاں شامل ہیں جنکی رہنمائی میں صمدیہ ہائی اسکول تمام تعلیمی، تربیتی اور تجرباتی شعبہ جات کی تکمیل و تشکیل کے بعد ایک معیاری اور فقید المثال اسکول بن گیا ہے جس کے سبب تدریسی عملہ مستحق تحسین ہے اور سب سے زیادہ لائق سپاس اسکول کے ہیڈ ماسٹر بلال احمد مومن ہیں جو ایک فعال اور بے لوث معلم اور منتظم ہیں۔

بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے 'روضۃ الاطفال' (کے جی) پرائمری اسکول کا قیام جون ۱۹۸۰ء میں عمل میں آیا، جو رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک دہائی کے اندر بہاریں دکھلانے لگا اب اسکول میں اول تا ہفتم جماعتوں کے کل ۱۲ ڈویژن جاری ہیں، مدرسہ ہٰذا کی درسی و غیر تدریسی سرگرمیاں والدین، مربیان اور سرپرستان میں بیحد مقبول ہیں، ہر سال یوم والدین، سالانہ جشن، مقابلہ نظم خوانی، مقابلہ قصہ گوئی، مقابلہ خوش خطی اور کھیل کود کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں، سالانہ جلسہ تقسیم انعامات میں ہونہار، کامیاب اور مستحق طلبہ و طالبات کو انعامات سے نوازا جاتا ہے، بچوں کی ہر لحاظ سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

مسلم فاؤنڈیشن ٹرسٹ بھیونڈی

یہ ٹرسٹ ہوا کے ایک روح پرور جھونکے کی طرح گذر گیا، اغراض و مقاصد بلند تھے لیکن طاقت پرواز نہ تھی اور جو خود اس کے بانی تھے وہ لندن پرواز کر گئے مفتی برکت اللہ ڈائرکٹر اسلامک کمپیوٹر سینٹر لندن، جو احادیث کو کمپیوٹر پر منتقل کرنے کی عظیم خدمت انجام دے

رہے ہیں اس ٹرسٹ کے بانی تھے' اس کے ایک مقامی پروگرام (منعقدہ مومن لائبریری ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۳) میں راقم السطور کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا، جس کا مقصد بھا بر مفتی صاحب کے کام اور خدمت سے مطلع کرنا تھا' مولانا حبیب اللہ (دارالقیمہ ادراب ثم لندن) مفتی صاحب کے رفیق کار ہیں اور مولانا سعید انصاری (سکنہ لندن) نے بھی اس پروگرام میں شرکت کی تھی۔ اس ٹرسٹ کے فعال اراکین میں محلہ کے سربرآوردہ افراد شامل تھے مثلاً شمس الضحیٰ انصاری (مفتی برکت اللہ کے برادر نسبتی)، جمال احمد محمد شریف مومن، محمد صدیق مستری' مشتاق احمد دین محمد مومن' اشفاق احمد ہدایت اللہ وغیرہ۔ بلال احمد عبدالرحمٰن مومن اس کے سیکریٹری تھے۔ اس ٹرسٹ کا بنیادی مقصد جدید ٹیکنولوجی کی مدد سے اسلام کی ترویج و اشاعت تھا مگر اب یہ ٹرسٹ فعال نہیں رہا۔

مسلم آرفینج : یتیم خانہ (بھیونڈی)

یہ یتیم خانہ حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن' رئیس اعظم بھیونڈی نے قائم کیا تھا' اسی سے ملحق دارالعلوم صمدیہ بھی ہے جس کے نگراں اور مدرس مبارک پور کے مولوی محمد یوسف انصاری تھے ۲۲ر جمادی الاول ۱۲۸۶ھ کو فالج میں فوت ہوئے۔ یتیم خانہ کے متنظم مومن اراکین کے اسمار گرامی حسب ذیل ہیں۔ حاجی عبدالصمد حاجی لعل محمد مومن حاجی عبدالشکور حاجی لعل محمد مومن۔ حسن صاحبدین۔ عبدالحیٰ ولی محمد ماسٹر۔ محمد ایوب عبدالحق پنجابی' مومن نثار احمد محمد رمضان' مومن ریاض احمد شاد محمد۔ مومن محمد یٰسین محمد الیاس۔ مومن یوسف محمد رمضان' مومن جمال احمد محمد شریف' مومن سعید احمد عبدالشکور اور انصاری خالد احمد عبدالمجید۔

فروغِ تعلیم بھیونڈی (تاریخ بنیاد ۱۹۷۹ء)

بھیونڈی میں تعلیم یافتہ طبقہ جو اساتذہ' ادبا اور شعرا پر مبنی ہے تعلیم کے فروغ و اشاعت کے لیے کوشاں رہا ہے۔ "انجمن فروغ تعلیم" کئی گراں قدر علمی مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی جد و جہد کرتی رہی ہے' ہر سال کل مہاراشٹر سیرۃ النبیؐ تقریری مقابلہ کا اہتمام کرتی ہے۔ اس دینی و علمی تقریب میں مالیگاؤں' ممبئی' اسوپورہ' پونہ' دھولیہ اور کوکن سے

علاقے تک کے طلبہ وطالبات حصہ لینے کے لئے آتے ہیں، دسمبر ۱۹۶۹ء میں انجمن کے زیر اہتمام مولانا محمد علی جوہر پر مضمون نویسی کے ایک کل ہند مقابلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ضلعی سطح پر رحمت عالم ﷺ انعامی مقابلہ منعقد کیا گیا، انجمن کی نگرانی میں اردو زبان اور فن خطاطی کی مفت تعلیم و تربیت دی جاتی ہے، مشاعرے اور نظم خوانی کے مقابلے بھی اسی کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں، دسویں اور بارہویں کے طلبہ کی پیشہ ورانہ رہنمائی کے لئے خاص ہدایتی لیکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل تقریبات اجرا فروغ تعلیم کے زیر اہتمام منعقد کی گئی تھیں۔

رضیہ حکیم (مومن)۔ ناول۔ شمع جلتی رہی کی رسم اجرا ۸ اپریل ۱۹۸۰ء کو بدست ڈاکٹر مومن محی الدین عمل میں آئی۔

محمد رفیع انصاری۔ خاکے۔ خمیازہ، اشتاق رضا پولنجکر کی تصنیف موم سے جڑے پنکھ، منظر کاظمی کے افسانوں کا مجموعہ بکھشن ریکھا اور عبدالملک مومن کا تذکرہ شعرائے بھیونڈی بعنوان "آئینہ"۔ انجمن فروغ تعلیم کی ثقافتی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ آخری تقریب میں راقم السطور نے صدارت کے فرائض ادا کئے تھے۔

فروغ تعلیم کی گوناگوں سرگرمیوں میں خواتین کو طبی تعلیم دی جاتی ہے یعنی فرسٹ ایڈ کا طریقہ سکھایا جاتا ہے انجمن کے فعال اراکین اور عہدہ داران میں اقبال عثمان مومن۔ ایڈوکیٹ مختار احمد حبیّ، مختار احمد پیر محمد غرقاب، عرفان مومن اور مختار علی احمد مومن شامل ہیں۔

مومن اتحاد کمیٹی اسلام پورہ (بنیاد ستمبر ۱۹۹۶ء)

مقابل روح جب جوانوں میں بیدار ہوتی ہے تو ہو گرم رکھنے کے طریقے بھی آجاتے ہیں۔ نئی نسل میں سماجی اور سیاسی شعور پروان چڑھ رہا ہے اور دین کا جذبہ پرورش پا رہا ہے۔ سماجی ضروریات جب بڑھ جاتی ہیں تو یہ جوان معاشرہ کی مدد کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ بھیونڈی میں تعلیم کا چرچا بہت ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ طالبان علم کی مالی مشکلات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، ان تمام مقاصد کے پیش نظر اسلام پورہ محلہ کے جانباز جوانوں نے جو برادری کے لیے جذبۂ محبت رکھتے ہیں ۶ ستمبر ۱۹۹۶ء کو ایک تعلیمی، سماجی اور دینی ادارہ بنام مومن اتحاد کمیٹی کی بنیاد رکھی شہر کے قومی اور تنظیمی اداروں کی درخشندہ

کہکشاں میں مومن اتحاد کمیٹی کی تابندگی نے معاشرے کے کئی پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا ہے۔ کچھ نئی باتیں سامنے آئی ہیں مثلاً شادی بیاہ کی تقریبات میں تمام لوازمات کی سہولتیں مہیا کرنے کا خیال۔ ایک نیا خیال ہی تو ہے۔ اس کمیٹی کی فلاحی، دینی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں اور منصوبوں کی فہرست بڑی طویل ہے اور بڑی پہلودار۔ دینی مدرسے کا قیام، اردو کے فروغ کے لیے لائبریری کا قیام جسے ادبی مرکزیت حاصل ہو، مستحق طلبہ وطالبات کی درسی کتابوں، بیاضوں اور دیگر ضروریات حاجت روائی کرنا، معاشرے کے بے سہارا لوگوں، حاجتمندوں اور مستضعفین کے لیے امدادی فنڈ قائم کرنا، غریبوں کے لئے طبی امداد اور علاج کی سہولتیں فراہم کرنا، اہل ذوق حضرات کے "تسکینِ ذوقِ نظر" کے لیے شعری وادبی تقریبات کا انعقاد کرنا، اعلیٰ قابلیت کے حامل طلبہ وطالبات کے لیے مفت کوچنگ کلاسوں کا اجراء کرنا، اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف دینا، خواتین کے لیے سلائی کی تعلیم کا انتظام کرنا، کھیل کود کے لئے مومن اتحاد اسپورٹس کلب کا قیام اور سب سے حوصلہ مند اور عظیم منصوبہ جس کے لیے مومن اتحاد کمیٹی کوشاں ہے وہ ایک امدادی تشخیص خانے کا قیام ہے۔ اللہ کرے یہ تمام منصوبے پورے ہو جائیں تاکہ ہم شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ان جوانوں کے لیے پڑھ سکیں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

مجلس عاملہ میں زیادہ تر محلے کے نوجوان شامل ہیں جن میں ڈاکٹر امین بھارتی جیسے تجربہ کار رہنما کی موجودگی کمیٹی کی ترقی کی ضمانت ہے۔ ان کے علاوہ یہ عہدہ داران اور اراکین شامل ہیں: سعید احمد محمد یوسف مومن، عبدالسمیع عبدالغنی انصاری، محمد ایوب محمد عباس انصاری، نثار احمد عبدالغنی مومن، سراج احمد محمد مومن، رحمت اللہ محمد حسین مومن، اقبال احمد عبدالستار انصاری، عبدالرحمٰن محمد یوسف مومن، رضوان احمد محمد حسین مومن، مشتاق احمد محمد عمر مومن، نثار احمد محمد صدیق انصاری اور زبیر احمد محمد اسحاق مومن۔

دینی مدرسے کی نو تعمیر شدہ عمارت کا افتتاح شہر کی ممتاز دینی ہستی حضرت علامہ سید حامد اشرف صاحب کے مبارک ہاتھوں ہوا۔

مومن اتحاد ہال کے افتتاح کے لیے سابق وزیر پروفیسر جاوید خان تشریف لائے تھے، مومن اتحاد سلائی کلاس کا اجرار ریاض احمد خان، سابق مدیر روزنامہ انقلاب نے کیا،

اور پہلے سووینیر کا اجراء ایڈوکیٹ عبدالرشید طاہر (سابق صدر بلدیہ) کے مبارک ہاتھوں ہوا۔ مومن اتحاد کمیٹی شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر ظروف، دیگچیاں، طشتریاں، پانی کی ٹنکیاں اور دیگر لوازمات کرائے پر دیتی ہے۔

انجمنِ اسلامیہ (اسلام پورہ)

انجمنِ اسلامیہ کے اغراض و مقاصد کی تحدید تعلیمی امور تک تھی، پھر دینی سرگرمیاں اور سماجی خدمات اس کے دائرۂ عمل میں داخل ہو گئیں۔ انجمن نادار طلبہ و طالبات میں ہر سال بیاضیں اور یونیفارم تقسیم کرتی ہے نیز ثانوی اور کالج کی سطح پر ان طالبانِ علم کی مالی مدد کرتی ہے جو چند افادی شعبہ جات میں تحصیلِ علم و تربیت کے خواہشمند ہوتے ہیں مثلاً ڈی ایڈ۔ بی ایڈ۔ ڈی فارم۔ بی یو ایم ایس۔ فشری کورس۔ نرسری ٹی وی کورس۔ انجینیرنگ موٹر میکنیک وغیرہ۔

ان تمام مخصوص شعبوں کو انجمن اسلامیہ بڑی اہمیت دیتی ہے اور اس لحاظ سے یہ فلاحی ادارہ ایک انفرادیت کا حامل ہے۔ دینی امور میں بھی اس انجمن کا تفرّد مسلّم ہے۔ حج کے موقع پر عازمینِ بیت اللہ کو مناسکِ حج کی ادائیگی کے طریقے اور معلومات بہم پہنچانا ایک قابلِ تحسین خدمت ہے۔ سنہ ۱۹۸۶ء تا سنہ ۱۹۸۷ء محمد یعقوب محمد ابراہیم سدھن کی رہائش گاہ واقع اسلام پورہ میں زائرینِ کعبہ کی رہنمائی کے لیے چار نشستوں کا انعقاد کیا گیا تھا، ان میں قدری عبدالرب شمس الدین، غلام محمد پیر محمد مومن، ڈاکٹر سعید احمد، انیس احمد بہاء الدین، شمس الضحیٰ محمد ایوب انصاری اور شریف حسن رمضان مومن نے شرکت کی تھی۔ مسائلِ حج کا کتابچہ تقسیم کیا گیا۔

انجمن کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے والے ادارے اور افراد کی ایک بڑی تعداد ہے۔ پدّم اور ٹرس ایسوسی ایشن لمیٹیڈ، مومن اتحاد کمیٹی، مدرسہ رضویہ، مدرسہ اسلامیہ وغیرہ۔ محمد یعقوب عبدالرحیم سدھن، مولانا ازاراحمد شمیم مظہری، رضوان احمد محمد یونس، ہیڈ ماسٹر صمدیہ ہائی اسکول، بلال مومن، ٹرسٹیان اسلام پورہ مسجد، عبدالحق عبدالرحمٰن، خادم وغیرہ محبانِ دین انجمن اسلامیہ کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں۔

انجمن کی بنیاد مندرجہ ذیل اراکین مجلسِ عاملہ کی مساعیٔ جمیلہ کی رہینِ منت ہے:

محمد طیب محمد حسن مومن (صدر)۔ محمد حنیف محمد اسمٰعیل (نائب صدر)۔ عبدالستار احمد میمن (خازن)۔ عبدالقادر عبدالرحمٰن انصاری (رکن) محمد جمیع خرم (رکن) ظہور احمد رحیم بخش مومن (جوائنٹ سیکریٹری) عبدالغنی عبدالشکور (رکن) حاجی برہان الدین محمد حنیف (رکن)۔

شہر کی ممتاز تعلیمی اور سماجی شخصیت محمد حسن محمد بشیر بھوپالی انجمن اسلامیہ کے سیکریٹری ہیں۔ اس انجمن سے قریبی تعلق رکھنے والے خادمانِ قوم میں فیاض احمد عبدالغنی (رکن) ایاز احمد محمد امین یادرا (رکن) اور حفیظ الرحمٰن محمد ابراہیم (رکن) کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

بُنکر سماج ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی (درگاہ روڈ)

مومن انصاری برادری کا ایک بڑا حصہ جو پست طبقہ جو عموماً مزدور بنکروں پر مشتمل ہے ابھی تک اقتصادی طور پر اتنا خود کفیل نہیں بن سکا ہے کہ اپنے بچوں کی تعلیمی ضروریات گرانی کے زمانے میں پورا کر سکے، عموماً ان گھرانوں میں جو کثیر العیال ہیں معاشی مشکلات بھی درپیش آتی ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر درگاہ روڈ کے نوجوانوں نے اپنے علاقے جو درگاہ روڈ، بھسار محلہ، اعظمی نگر اور حمال باڑہ کے محلوں پر مشتمل ہے طلبہ و طالبات کی اعانت کے لیے بنکر سماج ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی (درگاہ روڈ) کی مئی ۱۹۸۵ء میں بنیاد ڈالی۔ مجلس عاملہ کے عہدہ داران اور اراکین یہ ہیں:

عہدہ داران: عقیل اسحاق پینٹر (صدر)۔ محمد رفیع انصاری (سیکریٹری)۔ ایڈوکیٹ عبدالرشید طاہر (خازن)

اراکین: شفیق عبدالرشید مومن۔ رضوان محمد حسن سردار۔ شاہد عبدالحمید مومن۔ خادم حسین عبدالرزاق۔ شفیق احمد عبدالعزیز۔ خلیل احمد رشید۔ نیاز احمد محمد باقر مومن۔

سوسائٹی نے اب تک تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی کاپیاں، کتابیں اور یونیفارم غریب اور مستحق طلبہ کو عنایت کی ہیں۔

ممتاز ادبی و ثقافتی کارکنان

ان پچھلے چند برسوں میں ثقافتی اور تعلیمی خدمات کے میدان میں تعلیم یافتہ طبقہ کے باشعور افراد تاجر طبقہ کے دردمند حضرات، محلوں کے جوانمردان اور بلدیہ کے نئے اراکین بڑے سرگرم نظر آتے ہیں۔ نصیر احمد پیپ سیٹھ، ریاض شاہ محمد مومن، نصیر احمد غلام رسول ہدایت اللہ مومن زاہد محمد جابر، محمد یوسف عبد المجید، شبیر میانجی، عبد الرحیم محمد اسماعیل، نثار احمد محمد مبین ماسٹر وغیرہ بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کی مجلس عاملہ (۱۹۹۰-۱۹۹۳) کے رکن رہ چکے ہیں۔ وقار احمد انصاری نائب صدر بھیونڈی شہر ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی (آئی) ایک ابھرتے ہوئے سیاسی اور سماجی ورکر ہیں۔

ادبی و ثقافتی تقریبات میں ڈاکٹر ابرار احمد مومن، مشتاق احمد محمد یلین مومن (دیپٹی والے) ڈاکٹر صابر بھساولی، کامریڈ اسرار احمد انصاری وغیرہ بڑی سرگرمیاں دکھاتے ہیں، شہر کے ممتاز وکلا انیس یعقوب علاء الدین مومن، صابر مومن اور مختار احمد حسن بھی بڑے فعال ہیں اور ان تقریبات میں بڑی دلچسپی دکھلاتے ہیں۔ اساتذہ میں عرفان نذیر احمد مومن اور مختار احمد علی احمد مومن قابل ذکر ہیں، مختار احمد پیر محمد عرقاب مومن ویلفیر سوسائٹی کے رکن کی حیثیت سے تعاون کرتے ہیں، سعید محمد ابراہیم مومن (جھنڈا دل کے پاٹل) ایک مستعد اور فعال سماجی ورکر ہیں۔ سبحان سکندر انصاری صحافت اور ادب کے علاوہ سماجی کاموں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ عبد الماجد عبد الرشید مومن محلے کے ایک سرگرم نوجوان ہیں اور ہر خدمت کے لئے کمربستہ رہتے ہیں اسی طرح اسی محلہ بنگالی پورہ کے طفیل احمد ذاکر حسین (کلو سیٹھ) بھی نہایت سعادتمند سماجی خادم ہیں۔

سماجی خدام

تعلیمی ترقی، خوشحالی دینی جذبہ اور سیاسی شعور نے برادری کے نوجوانوں میں معاشرتی زندگی تبدیلیاں اور صحتمندانہ رجحانات پیدا کردیے ہیں جو کم تعلیم یافتہ ہیں وہ نوجوان بھی سماجی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں، کچھ نہیں تو شعب الایمان کے آخری شعبہ پر عمل کرکے رستے میں پڑے ہوئے کانٹے کو ہٹا دیتے ہیں" ہر محلہ کے نوجوانان شادی بیاہ کے موقع پر برات ولیمہ اور

کے موقع پر پنجابی ٹاٹ کا انتظام کرتے ہیں، بعض تنظیمیں دعوت کے لوازمات ظروف، دیگیں، پانی کی ٹنکیاں وغیرہ کرائے پر اٹھاتے ہیں اور رضاکارانہ خدمات انجام دیتے ہیں۔ بنگال پورہ، کھوشالہ، اسلام پورہ اور دیگر محلوں میں اس قسم کی کمیٹیاں اور تنظیمیں برادری کی اجتماعی تقریبات اور دیگر مواقع پر بڑی سہولتیں پہنچاتی ہیں۔[۱]

مومن کرکٹ کلب

جو اسکولوں میں پڑھتے تھے وہ کرکٹ، والی بال اور فٹ بال سے دلچسپی لیتے تھے۔ بھیونڈی میں کچھ نوجوانوں نے ۱۹۳۴ء میں انٹرنیشنل کرکٹ کلب کے نام سے ایک کرکٹ ٹیم قائم کی اس میں شکور مومن (سیٹھ) ایوب پنجابی، غلام محمد مومن، شبیر احمد انصاری، عبدالمجید عبداللہ انصاری اور عبداللہ رزاز شامل تھے، ان کے بعد نئی نسل کے جوانمردان آگے بڑھے مصطفیٰ عباس مومن، مشتاق احمد موسیٰ رضا، یوسف نیر حاجی، اسحاق یوسف (دولی)، عبدالرؤف پنجابی، یٰسین پیٹی والے اور یوسف ابراہیم انصاری تھے۔ یہ جوان بے طرح توجوانوں نے بلا اور گیند تھام لیا یہ صدیق مومن، ایوب مومن، یوسف دین محمد، غلام مصطفیٰ مستری، عبدالباری عبدالرشید، یوسف حسن مومن، یٰسین سردار، مشتاق احمد سمرو، شریف حسن رمضان حسن خلیل مومن، عبدالحفیظ حافظ محمد حسین اور سکندر انصاری وغیرہ کا گروپ تھا۔

مذکورہ بالا کھلاڑیوں میں والی بال اور ٹیبل ٹینس کے بھی کئی چیمپئن تھے، والی بال کی ٹیم میں عبدالرشید پیر محمد مومن ننھو، محمد صدیق مومن، ابوبکر اکبر علی، یوسف دین محمد، ایوب الیاس مومن، یٰسین سردار، اسحٰق یوسف (دولی) سکندر انصاری، عبدالباری عبدالرشید اور یٰسین سردار بڑے ماہرین میں سے تھے مقابلہ کے لئے یہ ٹیم مڑی سے دڑپا کیمپ میں اور قصبہ تھانہ کے بیشتر تنظیموں میں کھیلنے جاتی تھی اور فتحیاب ہو کر لوٹتی تھی۔

کرکٹ میں ایوب مومن بہترین کھلاڑی تسلیم کئے جاتے تھے۔ بیڈمنٹن اور والی بال

---

[۱] دیکھئے ضمیمہ۔ بنگال پورہ اور پڑوسی محلوں کے نوجوان کاروباری جوش دیتی اور دیگر سماجی و ثقافتی امور میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔

کے بھی چیمپین تھے۔ ضلع تھانہ کرکٹ ٹورنامنٹ میں آپ سنچری بلّے باز کی حیثیت سے مشہور تھے۔ حسن خلیل مومن (لالہ سیٹھ)، زبیر عباس مومن، مشتاق دین محمد مومن، شمس الضحیٰ اجناب، یوسف حسن مومن، شریف حسن مومن، فاروق ذاکر حسین مومن، ادریس عبدالحمید سردار، جمال احمد شریف مومن، نثار احمد حافظ محمد حسین مومن، محمد صدیق مستری، صدیق عبدالرحمٰن سردار، یوسف رمضان بتّو وغیرہ بھی اپنے اپنے دور کے ماہر بلے بازوں اور گیند بازوں میں شمار کئے جاتے تھے۔

حال کے نوجوان کھلاڑیوں میں مومن حسان مشتاق دین محمد ایک کم عمر لیکن مشّاق بلّے باز تسلیم کئے جاتے ہیں ہندستان کے کئی اہم شہروں میں اپنے شاندار کھیل کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

کرکٹ کے موجودہ کھلاڑی مومن کرکٹ کلب کے جھنڈے تلے اپنی مشق جاری رکھے ہوئے ہیں، دوسرے محلوں میں بھی کرکٹ کی ٹیمیں اور کھلاڑی تھے۔ بھیونڈی اسٹیڈیم کی تعمیر کے بعد کرکٹ کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں اور کم از کم آٹھ ٹیمیں ٹورنامنٹ میں اترنے لگی ہیں، ایوب مومن میموریل کرکٹ ٹورنامنٹ بھی ہر سال ہونے لگا ہے جس کا انعقاد بھیونڈی حلقہ کرکٹ ایسوسی ایشن کرتی ہے جو کھیل کود کے مقابلوں کو قومی یکجہتی کے فروغ کا بہترین ذریعہ قرار دیتی ہے۔ اسی طرح عمر کے لحاظ سے کرکٹ کا مقابلہ ضلعی سطح پر ہونے لگا ہے جس میں برادری کے نوجوان بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ سابق صدر بلدیہ عبدالرشید طاہر کرکٹ ایسوسی ایشن بورڈ کے نائب صدر رہ چکے ہیں۔ ناصر مومن خازن ہیں، رضوان حنیف مومن اور مشتاق انصاری دونوں جوائنٹ سیکریٹریز ہیں۔ کرکٹ کے یک روزی (ون ڈے) میچ منعقدہ ۱۱ اپریل ۱۹۹۳ء کے انعقاد میں مشتاق مومن، رضوان مومن، عبدالرشید طاہر وغیرہ نے زبردست تعاون کیا تھا۔

علمی ادارے اور ادبی تحریکیں

اردو زبان کی بقاء، ترویج و اشاعت کے لئے لائبریریوں اور ادبی انجمنوں کا قیام ایک ضمانت ہے۔ کتب خانے علم و ادب کے خزینے ہوتے ہیں اور اسلاف کے تہذیبی کارناموں کے امین۔

قصبہ اسلام آباد بھیونڈی میں کیہ امانی میں ایک شاندار کتب خانہ تھا حضرت دیوان شاد
کے سادات خاندان کا آبائی کتب خانہ مولوی محمد مسعود اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد
امین کی نگرانی میں ان کی حیات تک محفوظ رہا۔ ذاتی کتب خانوں کا شمار ممکن نہیں۔ اہل
سنت والجماعت لائبریری کا ذخیرۂ کتب سب سے قدیم ہے۔ اسلام آباد میں حشر میموریل
لائبریری سنہ ۱۹۳۲ء میں قائم کی گئی تھی اس کی سرپرستی اور نگرانی محلے کے نوجوان طلبہ
اور باذوق حضرات کرتے رہے۔ غلام محمد مومن اور ان کے معاصرین نذیر عبداللہ انصاری
عبدالمجید عبداللہ انصاری، یوسف حافظ نعمت اللہ، ذاکر حسین مومن (کلو سیٹھ)، محمد
ایوب پنجابی، عبدالستار رازؔ وغیرہ اس لائبریری کے سرپرستوں میں سے تھے۔ غلام مصطفیٰ،
محمد عباس مومن۔ مشتاق احمد موسیٰ رضا، محمد یوسف محمد ابراہیم مومن، لیسین
عبدالرزاق بیڑی والے اور عبدالرؤف پنجابی وغیرہ اس لائبریری سے استفادہ کرتے
رہے۔ تحصیلِ علم اور تلاشِ معاش کی گہما گہمی میں جب یہ سارے نوجوان منتشر ہو گئے،
اور حشر میموریل کا بُرا حشر ہوا، تو اس کا نعم البدل مومن لائبریری بنگال پورہ میں
مل گیا۔

مومن لائبریری (بنگال پورہ) (قائم شدہ سنہ ۱۹۵۶ء)

لگ بھگ ان زمانے میں جب حشر میموریل لائبریری کے سقوط کے بعد ایک تعطل جاری
تھا سنہ ۱۹۵۰ء میں اس کی کتابیں بنگال پورہ میں ایک کچے کمرے میں منتقل کردی گئیں۔
جب سنہ ۱۹۵۶ء میں مومن لائبریری کے نام سے وجود میں آئی جب اس کا رجسٹریشن ہوا، تو
محبانِ علم و ادب کی کوششوں سے ایک عمارت تعمیر کی گئی جس کا سنگِ بنیاد ۱۰ مئی
سنہ ۱۹۶۲ء کو بدست عبدالرؤف عبدالحق پنجابی رکھا گیا اور ۵ نومبر سنہ ۱۹۶۵ء کو تکمیل
تعمیر میں آئی۔ پہلی مجلس منتظمہ کے اراکین یہ تھے: محمد صدیق عبدالباری مومن (صدر)
مشتاق موسیٰ رضا (نائب صدر)، شریف حسن رمضان (خازن) یوسف حسن مومن (جنرل
سیکریٹری)، محمد یوسف زین محمد (جوائنٹ سیکریٹری)۔ اور اراکین یہ حضرات تھے: عبدالرشید یوسف پنجابی۔[1]

---

[1] موجودہ اراکین کے لیے دیکھیے ضمیمہ

غلام مصطفیٰ، جان محمد مستری، اقبال احمد حاجی محمد باقر، یٰسین عبدالرحمٰن سردار، سکندر انصاری اور عبدالرحیم محمد یعقوب بی۔ اے۔

مومن لائبریری ایک زمانے تک بڑی فعال رہی اور ادبی و ثقافتی مجلسیں بھی منعقد کرتی رہی، محلّہ کے طالبعلم مومن محی الدین محمد ابراہیم جب اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے تو ستمبر ۱۹۵۲ء میں اسی کے زیر اہتمام ایک الوداعی جلسہ منعقد کیا گیا اور جب وہ ڈاکٹر مومن محی الدین بن کر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں لوٹے مومن لائبریری نے ایک شاندار استقبالیہ جلسہ مصطفیٰ فقیہ (سابق نائب وزیر حکومت بمبئی) کی صدارت میں منعقد کیا، اس جلسہ میں مالیگاؤں کے بیرسٹر سالک انصاری اور خلافت تحریک کے مشہور مجاہد آزادی اور مسلم آرفینیج (یتیم خانہ) بھیونڈی کے ناظم مولانا محمد یوسف مبارک پوری نے تقریریں کی تھیں۔ اعزازی سیکریٹری یوسف حسن مومن چونکہ اسمٰعیل یوسف کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں ادبی اور ثقافتی پروگرام [illegible] لیتے تھے انہوں نے اسی کے تجربات کی روشنی میں بیت بازی اور نظم خوانی وغیرہ کی داغ بیل ڈالی۔ مومن لائبریری تھانہ ضلع کی واحد اردو لائبریری ہے جو رجسٹرڈ ہے اس میں فی الحال چار [illegible] کتابیں ہیں جس میں اردو کی ۲۱۰۱۰، انگریزی کی ۳۰۰، مراٹھی ۲۵۰ اور ہندی کی ڈیڑھ سو کتابیں ہیں۔

بزم مصطفیٰ کمال کورٹ گیٹ لائبریری

اس قدیم لائبریری کے بانیوں اور سرپرستوں میں کورٹ گیٹ اور اسلام پورہ کی یہ محترم ہستیاں تھیں: عبدالرشید رشید، عبدالباری جابر، حاجی محمد یعقوب [illegible] الدین، عثمان غنی، نیتر۔

راقم جب تحصیل علم کے بعد انگلستان وطن واپس آیا تو [illegible] کمال نے ایک شاندار استقبالیہ جلسہ منعقد کر کے ایک سپاسنامہ (مورخہ [illegible] ۱۹۵ [illegible]) مرحمت پیش کر کے عزت افزائی کی تھی۔ جس کا پہلا جملہ "ڈاکٹر صاحب [illegible] فرد ہیں جو آج تک تعلیمی سلسلے میں ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کرتے رہے ہیں" ایک مقرب احساس تھا جس نے انبساط و شادمانی کے تاروں کو جھنجھنا دیا" آج ایک فرد کی کامیابی ایک پسماندہ برادری کے لیے باعث فخر و مسرت بن گئی۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہ سپاسنامہ ہماری زندگی کی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے ع گاہی گاہی باز خواں ایں قصۂ پارینہ را۔ اور آج بھی یہ ہمارے حوصلوں کو بلند رکھتا ہے۔

"آپ نے یونیورسٹی کے ہر امتحان میں خصوصاً اپنے اختیاری مضمون فارسی میں ہمیشہ گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بی۔ اے میں پوری یونیورسٹی میں اول نمبر آنے پر سر کریم بھائی اسکالرشپ ملی۔ ساتھ ہی ساتھ اسمٰعیل یوسف کالج کی فیلوشپ بھی ملی۔"

"..... آپ خوش فکر شاعر ہیں۔ جناب موصوف نے سر کریم بھائی اسکالرشپ حاصل کرکے اڈنبرا یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انگلستان کی تعلیم کے دوران میں خداداد قابلیت اور ذہانت دیکھ کر طہران یونیورسٹی نے آپ کی خدمات حاصل کرنے کا فخر حاصل کیا" [ترمیم: وظیفہ دیا تھا برائے تعلیم در ادبیاتِ فارسی]

بزمِ مصطفیٰ کمال — اُجڑ گئی۔ کسی زمانے میں یہاں طلبہ کی سماجی و ثقافتی تنظیم کا دفتر تھا۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

سپاسنامے سے اقتباس دینے کا مدعا "گذارشِ احوالِ واقعی" ضرور ہے لیکن نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پروا ہے، ان اوراق میں جہاں سینکڑوں چہروں کے خدوخال ابھارے گئے ہیں خود اپنی "بے چہرگی" کی "چہرہ کشائی" بھی مقصودِ خاطر نہیں، ادعائیت کی حجت بس صرف اتنی ہے کہ "ہم سے ایک ہی فرد" کی وہ شناخت ہے جو ابھی تک برقرار ہے۔ جبکہ انگلستان اور امریکہ میں بس جانے والا ہندستانی اپنے آپ کو ہندستانی کہنے میں عار سمجھتا ہے بلکہ پانی پت، لکھنؤ اور حیدرآباد کے انصاری تو شرفا انصاری کے نام سے اپنی شناخت کرواتے ہیں کیونکہ آبائی پیشہ ذریعۂ عزت نہیں ہے۔ اور اس لیے کہ یہ علمی خانوادے ہیں۔

نشاط لائبریری

تھانہ روڈ کے نوجوانوں نے علم و ادب کی خدمت اور نئی نسل میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ایک دارالمطالعہ ۱۹۵۲ء میں قائم کیا، خلیل احمد خوشحال نے اس علمی اور ادبی مقصد کی بر آری کے لیے بڑی معاونت کی اور اپنے مکان کا ایک کمرہ لائبریری کے لیے وقف کر دیا اور انہیں کی سفارش پر اس کا نام نشاط لائبریری رکھا گیا۔ تھانہ روڈ کے نوجوانوں نے اس جواں مرگ، خوش فکر اور انقلابی شاعر کی یاد اور ادبی عظمت کے اعتراف میں یہ نام دیا تھا، اسماعیل خوشحال نے شاہدہ (ضلع دھولیہ) میں اپنے ذاتی مصارف سے ایک خلیل خوشحال ہوسٹل بھی تعمیر کرایا تھا۔

نشاط لائبریری ۱۹۵۲ء میں حسب ذیل اراکین کی جد و جہد سے قائم ہوئی تھی: محمد ہارون حاجی محمد مومن۔ غلام مصطفیٰ بابو گھڑی والے۔ عثمان رستم۔ عبدالرزاق یٰسین شیخ۔ غلام مرتضیٰ غلام نبی۔ مرتضیٰ محمد صدیق مومن۔ استاد یٰسین شیخ۔

ان تینوں قدیم لائبریریوں کا ذکر ضروری تھا، اب تقریباً ہر اسکول میں درسی و نصابی کتابوں کے ساتھ ساتھ ادبی و علمی کتابوں کے ذخیرے موجود ہیں بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام چلنے والے صمدیہ ہائی اسکول کی لائبریری بے حد شاندار ہے جس کے لائبریرین ایک محنتی اور ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان اقبال محمد حسن خیاط ہیں۔

عوامی لائبریری (اسلام پورہ) ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ۱۹۶۴ء کے بعد مرکز بنا رہا یہاں بیسیوں طرحی مشاعرے ہوتے تھے جو صبحِ ادب کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک

اشتراکیت کے نعرے کی گونج اردو ادب میں سنائی دینے لگی تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی تحریک ناطق بن گئی۔

تقسیم ہند کے بعد ادبی رجحانات کی نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں اور بھیونڈی میں سب سے پہلے ترقی پسند ادب کی تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اشتراکیت کے پودے کا

کیونکہ مارکسی محتسبوں نے ادب کی عدالت میں نظریاتی احتساب کے آرڈیننس کے تحت کئی ادیبوں پر استغاثہ دائر کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلوار اٹھانا تو خیر سے غیر ادبی فعل تھا کئی ادیبوں کے ہاتھوں سے قلم بھی چھوٹ پڑا۔" (اس کی قرار داد اور منشور کے پیش نظر حکومت نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو سیاسی جماعت قرار دے دیا)

"بہت ساری زبانوں کے لئے ڈھیر سے ادیبوں اور شاعروں کو بھیڑی جیسے صنعتی شہر میں اکٹھا دیکھ کر راتوں رات کالج کے کئی طلبا اشتراکی بن گئے۔ ان کے تصور میں سرخ سویرا کے سہانے سپنے مچلنے لگے، ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ محفلوں میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ شب انتظار کی طرح زلفیں دراز ہونے لگیں اور مذہبی فرائض کی ادائیگی صفر ہونے لگی۔ یوں بھی عام تصور یہی تھا کہ اشتراکیت دہریت کی دوسری شکل ہے۔ نام تے ہی صنمکدۂ خیال میں مادیت کے لات و ہبل سر اٹھانے لگتے تھے۔"

کانفرنس کے اختتام پر ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا جس میں راقم نے بھی اپنے ابتدائی مشق کی ایک تک بند نظم بڑے جوش سے سنائی تھی۔ اب جبکہ اشتراکیت کے سارے بت گر چکے ہیں اور پندار کا صنمکدہ ویران ہو گیا ہے ہم تو پندرہ برس قبل مقلب القلوب کے حکم اور توفیق سے تائب ہو چکے ہیں ان تمام واقعات کو دیدۂ عبرت سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ دعا مانگتے رہتے ہیں۔

"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ"

"اے پروردگار تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر دیجیو اور ہمیں اپنی ہاں سے نعمت عطا فرما تو بڑا عطا فرمانے والا ہے"

انجمن ترقی اردو ہند (شاخ بھیونڈی)

۱۹۶۰ء کے بعد انجمن ترقی اردو شاخ بھیونڈی کی سرگرمیاں کچھ رنگ پکڑنے لگی تھیں، عبدالرحیم مومن (بی۔اے) اور مصطفیٰ عباس مومن بڑے فعال اراکین تھے یک عظیم الشان جلسہ ہندستانی مسجد کے پاس اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں منعقد

کیا گیا، جس میں شہاب الدین دسنوی، مکتبہ جامعہ اردو شاخ بمبئی کے نئے منیجر شاہد علی خاں، اور کچھ بیرونی ادبا ر شعرا نے شرکت کی تھی۔ راقم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں مجلس عاملہ کے اراکین اور عہدیداران یہ حضرات تھے: فیضی نظام پوری (صدر) مومن یوسف حسن (سیکریٹری) مشتاق حمد سہیل (خازن) عبداللہ بانی (جوائنٹ سکریٹری) زبیدہ عابد، محمد عمر شفق، محمد امیر، عبدالرزاق محمد سلیم اور ظفر الاسلام ممبران تھے۔

اسی سال انجمن کے اہتمام سے راقم کی تصنیف "تذکرہ حضرت دیوان شاہ مع خاندان سادات" شائع ہوئی۔

انتالیسواں باب

بھیونڈی کی مومن برادری کی فنّی، تعلیمی اور علمی ہستیاں

قوم چند بے جان افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی، وہ ایک فعّال اور متحرک نامیاتی زندگی رکھتی ہے، کسی قوم کی ترقی اور ارتقاء کا دارومدار افرادِ قوم کی تہذیبی و ثقافتی، علمی و فنّی، اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں پر ہے، اُس قوم میں خواہشِ زیست کیا ہوگی جو خود اپنے وجود کا جواز ثابت نہ کر سکے۔ ایک زمانہ تھا کہ مومن۔ انصاری برادری پر پسماندگی کا لیبل چسپاں کر دیا گیا تھا، احساسِ کمتری کے ضیق النفس سے مومن افراد اپنی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رہ جاتے اور اپنی غفلت، کم حوصلگی اور محدود وسائل کے فقدان کے سبب تعلیمی درسگاہوں کی چوکھٹ سے آگے اندر داخل نہیں ہو پاتے تھے۔

جو امیر تھے وہ مال مست تھے جو فقیر تھے وہ حال مست تھے تعلیم سے غفلت نہ تاریخ معاف کر سکتی ہے اور نہ شریعت۔

پھر حالات تبدیل ہوتے گئے۔ صنعتی انقلاب کی برکات کے طفیل خوشحالی اور معاشی ترقی کی راہیں کھلنے لگیں، دوسری قوموں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقیوں نے برادری کے دانشور طبقہ کو تازیانۂ عبرت لگایا۔ غیرت نے مہمیز لگائی، امدادی اور فلاحی ادارے قائم ہوئے جن میں مومن ویلفیئر سوسائٹی پیش پیش رہی، غریب اور نادار طلباء امیروں کے خوش پوش بچوں کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ فنّی، صنعتی، تکنیکی، ڈاکٹری، صحافتی، انجینئرنگ، اقتصادیات اور طبابت کے شعبوں سے مومن طلبہ و طالبات کی ایک بڑی تعداد فارغ التحصیل ہو کر برسرِ روزگار ہو گئی۔ برادری نے کئی تعلیمی ادارے قائم کئے جن میں بھیونڈی دیوریس ایجوکیشن سوسائٹی جو برادری کی تعلیمی تاریخ میں ایک جگمگاتا عنوان بن گئی ہے خلقِ خدا کی خدمت کا کوئی نام اور تخصیص نہیں ہے، اجر برحق ہے پھر خدمت بجا لانے والا

اپنے شعبے اور دائرۂ عمل کے حصار میں رہ کر اخلاقی اور شرعی طور پر مکلف فرد ہے۔ اسلام کا
دینی مزاج افراط و تفریط کو پسند نہیں کرتا وہ ایک صالح، پاکیزہ اور بلند معاشرہ وجود میں لانا چاہتا
ہے۔ مثلاً وکیل اگر شریعت کے علم الفرائض کا کما حقہ استعمال کرے تو حق بحقدار رسید نتیجہ
ہوگا۔ علم الفرائض یعنی میراث کی تقسیم کے علم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے ہو سکتا ہے
کہ آنحضرتؐ نے اس علم کو نصف علم قرار دیا ہے۔ علم الفرائض وہ قواعد اور اصول ہیں جن کے
ذریعے سے میت کا ترکہ مستحقین شرعی کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لین دین کے معاملات
میں تجارت، شراکت وغیرہ کے بارے میں جو ہدایتیں دی ہیں وہ اس دنیا میں مادی حیثیت سے
مفید ہیں ہاں۔ ایک مسلمان کے لئے ان کی رعایت آخرت میں کامیابی اور فلاح کا ذریعہ ہے۔

اسلامی معاشرے کا وجود فکری و ذہنی انقلاب اور تصور حیات کی پاکیزگی پر مبنی ہے۔ اسی بنیاد
پر خاندان اور عائلی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ خاندان کا نظام اور آپس کا تعلق جتنا
پاکیزہ اور مضبوط ہوگا اتنا ہی زیادہ پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آئے گا۔ معاشرت کے تحت
احوال شخصیہ (مسلم پرسنل لاء) کے قوانین آتے ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم نکاح، طلاق،
وصیت و وراثت ہیں۔[۱] وکیل نیکی اور بدی کے دوراہے پر کھڑا رہتا ہے ایک قدم پیچھے ہٹے تو
ننگ شریعت بن جائے اور اگر ایک قدم آگے بڑھے تو انصاف کی روایت بن جائے۔

طبابت اور حکمت کا فن اور علم سنت نبویؐ ہے۔ آنحضرت صلعم کی ذات گرامی کائنات کی تمام
مخلوقات کے لئے باعث رحمت تھی۔ آپ نے تمدن و معاشرت کے جہاں اعلیٰ اصول دنیا کو بتانے
وہیں پاکیزہ اور صحت بخش زندگی کے اصول نسخے بھی عطا فرمائے۔ آپ ہر قسم کے امراض ظاہری
و باطنی کے لئے طبیب کامل تھے۔

تاریخی ثقافت اور انسانی ثقافت دونوں تاریخ بشریت کی یادیں تازہ رکھتی ہیں اور شاندار
تہذیبی روایات اور اعلیٰ انسانی اقدار کی حفاظت کرتی ہیں۔ سماجی علوم یا علوم انسانیہ جیسے
نفسیات، اجتماعیات یا عمرانیات، اقتصادیات، اخلاقیات اور تاریخ کی بڑی اہمیت ہے۔
ان سے انسانی مزاج اور معاشرے کی ذہنی کیفیات اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ اسلام اور
امت اسلامیہ کی تاریخ اپنا علاحدہ اور منفرد مقام رکھتی ہے۔ "مجھے ایک ایسا مورخ ملا جو

---

[۱] مولانا مجیب اللہ ندوی: اسلامی فقہ۔ مکتبۃ الحسنات دہلی ۱۹۸۱ ۔ حصہ دوم۔ معاشرت ۳۰۹۔ ۳۱۰

تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق میں اس شاعری کی تلاش کرتا ہے جو خدا کو پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔"
یہ انگریز مؤرخ ٹائن بی تھا۔[1]

یہ تمہید یونہی بے مقصد و بے معنی نہیں ہے ہم اس تاریخی تناظر میں یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فکری محکومیت اور ذہنی مرعوبیت نے ہم پر کون سی ملمع سازی کی ہے۔ تعلیم کی ترغیب و ترہیب دینے کے لیے طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلمٍ (ہر مسلم پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے) کی حدیث نہایت زور و شور سے سنائی جائیگی اور اُطلبوا العلم ولو کان بالصین (علم حاصل کرو وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو) اور تان ٹوٹیگی اس پر کہ بس یہی "خدا ناشناس" کیمیا اور طبیعات پڑھو اور چاند پر پہنچنے کے لیے سائنس کی کمندیں پھینکو گو "العلم" صرف دورِ حاضر کے سائنسی علوم میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ بہت ہوا تو بچپن میں ناظرہ کے بعد کلمہ سکھا دیا جاتا ہے۔ علوم قرآن، علم حدیث اور دیگر علوم شرعیہ "العلم" کے دائرے سے خارج ہیں۔[2] ان روایات کا اولین مطالبہ علم دین کی کم از کم اتنی تحصیل ہے جس کی روشنی میں ایک مومن اسلامی طریقہ پر زندگی بسر کر سکے۔

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ ہمیں سائنسدانوں کی ضرورت نہیں اور صرف عالموں کو فضیلت دیتے ہیں، اہل باطل اگر اپنی قوت بڑھانے کے لئے وہ سارے علوم سیکھتے ہیں جو تسخیر کائنات کے لئے ہیں تو اہل حق اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ حق کی سربلندی کے لئے علوم طبیعی کے فلسفہ کو خدا آشنا بھی کر دیں اور اس طرح سائنس و حکمت کو جس میں ہمارے اسلاف نے کچھ کم فضیلت حاصل نہ کی تھی "مشرف بہ اسلام" کر کے دوبارہ ان میں درک و بصیرت حاصل کریں۔

آج موجودہ نسل اور پرکھوں کے بیچ کئی پیڑھیوں کی سیڑھیاں کھڑی ہو گئی ہیں، رہن سہن، پہن، ذہن یہاں تک رنج و محن کی تعبیریں تک بدل گئی ہیں، فرق اتنا بڑا بھی نہیں جیسے تم میں حکیم ہوتے تھے اب حکیم اور ڈاکٹرس دونوں ہیں، اب وکیل ہیں پہلے مفتی اور فقیہ ہوتے تھے، ہمارے آبائی پیشہ میں اب بڑے بڑے سیٹھ ہیں پہلے بھی ہمارے اجداد میں دھنا سیٹھ

---

[1] آوازِ دوست۔ مختار مسعود ص۱۹۵۔ ۱۹۹

[2] اقتبس از محمد بلبنی۔ (مترجم) تاریخ افکار و علوم اسلامی، از علامہ راغب طباخ۔ لاہور ۱۹۶۲ء حصہ اول ص۲۰۱

جسے وعظ سے کہتے تھے۔ گرہست اور سیٹھ ہو چکے ہیں' لیکن ایک اہم امتیازی وصف اُس معاشرے اور ماحول میں تھا۔ جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ وہ ہے تقویٰ' ہم میں جو اہل الدنیا ہیں ان میں جینے کی بڑی امنگ ہوتی ہے کہ صدیوں جیتے رہیں' اہل حق کو خدا کی یاد میں جینے اور خدا کی راہ میں مرنے کا بڑا حوصلہ ہوتا ہے تاکہ مرنے کے بعد جی سکیں' دنیا کے تعاقب میں دوڑنے والے آخرت سے بہت دور جا پڑتے ہیں' نیکی اور بدی کے درمیان صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے ایک قدم پیچھے چلے جائیں تو بربادی ہے ایک قدم آگے بڑھ جائیں تو جنت کی ہوا آنے لگتی ہے۔ نیکی کو پائیدار بنانے کے لئے صرف نیکیاں کرنے کی ضرورت ہے اور یہ حقیقت ہے ہر نیک آدمی کو زندگی میں دوسرے نیک آدمی کم سے کم ملتے ہیں' شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ آج کے زمانے میں نیک آدمی ہیں ہی کم! حالانکہ نیکیاں کمانے کے ہزاروں طریقے شریعت نے بتلائے ہیں اور ہمارے معاشرے میں کوئی مستثنیٰ نہیں کیا وکیل کیا ڈاکٹر!!

وکیل ہمیشہ گرفت میں رہتا ہے کبھی شریعت کی کبھی عدالت کی گرفت میں' اس پیشے میں بڑی نزاکت ہے اور موجودہ نظام زندگی میں اسکی بڑی اہمیت ہے۔

مومن وکلاء سماج کی عدالت میں

ایڈوکیٹ انیس حاجی یعقوب مومن (بی کام - ڈی ایم - ایل ایل بی)

آج سے تیس ۳۰ سال قبل جب راقم نے طلبہ کی سماجی و ثقافتی تنظیم کی بنیاد ڈالی تو نوجوان تعلیم یافتہ افراد نے بھرپور تعاون دیا تھا ان میں کوکنی مسلم اور مومن برادری کے طلبہ شامل تھے ایڈوکیٹ انیس مومن' ایڈوکیٹ صابر مومن' ڈاکٹر پروفیسر عبدالرحمٰن مومن' عالمگیر یٰسین مومن' وقار مومن' ڈاکٹر اسرار مومن' منیر غلام رسول ہدایت اللہ مومن بڑے فعال اور سرگرم اراکین تنظیم تھے اس تنظیم کا نصب العین بڑے اعلیٰ اور ارفع اقدار کا حامل تھا اغراض و مقاصد یہ تھے۔

بھیونڈی کی روز افزوں آبادی میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ موجودہ "صنعتی معاشرے" میں ایسے ذہین اور باشعور "طالب علم دانشوروں" کی کمی نہیں ہے جو عام ذہنی سطح سے بلند ہو کر سوچتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں اور تخلیقوں میں علم و دانش کی چھپی ہوئی تجلیوں کی جلوہ نمائیاں کرتے ہیں مگر طلبہ کی اس برادری میں ہمیشہ سے کسی منظم

علمی تحریک اور سماجی و ثقافتی انجمن کا فقدان رہا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۶۷ء کو جناب ڈاکٹر مومن محی الدین صاحب کی تحریک پر اور بھیونڈی کے طلبہ کے تعاون و اشتراک سے طلبہ کی سماجی و ثقافتی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا نصب العین "ایک صالح تعلیمی و علمی فضا میں طلبہ و طالبات کی ذہنی تنظیم و تہذیب ہے" اور جس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان میں عام انسانیت کے لئے آفاق گیر ہمدردیاں پیدا کی جائیں اور اپنی قوم نیز اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے صالح جذبات کی تخلیق کی جائے تاکہ نہ صرف ان میں باہمی تعاون و اشتراکِ عمل کے جذبات پیدا ہوں بلکہ وہ مفید شہری بن کر معاشرہ کی زندگی میں نیک کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں۔"

اس تنظیم کے بانی صدر ڈاکٹر مومن محی الدین، سکریٹری وقار مومن، جوائنٹ سکریٹری شرف الدین فقیہ اور خازن انیس مومن تھے۔

اس تنظیم کے ابتدائی مراحل میں اسے شاندار کامیابی حاصل ہوئی پھر گردشِ روزگار نے اور کچھ ناسازگار حالات نے نوجوان طلبہ کو تتر بتر کر دیا۔ آج ان میں سے بہت سارے بڑے کامیاب بزنس مین، وکیل، ڈاکٹر، سیاسی رہنما اور عالم و فاضل، پروفیسر بن چکے ہیں۔ انیس مومن ان کامیاب "مومنوں" میں سے ہیں، جو قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں، سپریم کورٹ تک مقدمہ لڑنے جاتے ہیں، بھیونڈی کوآپریٹیو اسپننگ ملز لمیٹیڈ کے بورڈ کے ممبر اور غالباً قانونی مشیر ہیں۔ راقم سے بے حد خلوص برتتے ہیں اور بڑے پیار سے "ماما" کہتے ہیں۔ ہمیں یہ محبت بھرا خطاب انہیں مخلص ساتھیوں سے ملا ہے جن میں ایڈوکیٹ صابر مومن کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

ایڈوکیٹ نیاز احمد ظہور مومن

نیاز احمد نے بڑی جدوجہد سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ترقی کی منازل طے کی ہیں۔ کامیاب وکیل ہیں اور جنتا دل کے فعال اور سرگرم رہنما، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے نائب صدر ہیں (۱۹۹۰ء-۱۹۹۳ء)۔ ایڈوکیٹ نیاز احمد مومن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بے حد شریف اور مخلص سیاسی خادم ہیں اقتدار کی ہوس جاہ و منصب کی چاہ نہیں اسی سے بساطِ سیاست کے وہ کبھی مہرے نہیں بنے ؏

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

ایڈوکیٹ مختار احمد جمن مومن (بی کام - ایل ایل بی)

جنتادل کے جھنڈے تلے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ انجمن فروغ تعلیم کے صدر ہیں یہ انجمن ہر سال سیرۃ النبی پر ایک کل مہاراشٹر تقریری مقابلہ منعقد کرتی ہے۔ اس کی مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ حالیہ فسادات میں بھیونڈی ریلیف کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے فساد زدگان کی امداد کے لئے نوجوانوں کے تعاون اور اشتراک عمل سے بڑے کارنامے سرانجام دئے۔ ریلیف فنڈ میں مخیر حضرات، مصلیان مساجد اور مختلف اداروں نے بھرپور چندہ دیا۔

مومن لائبریری بنگال پورہ کی مجلس عاملہ کے نائب صدر ہیں اور مومن ویلفیر سوسائٹی کے سرگرم رکن ہیں۔ آپ انکم ٹیکس کے مقدمات میں پیروی کرتے ہیں، روٹری کلب کے ممبر ہیں۔ عرفان احمد عباس مومن پرانے تجربہ کار کامیاب وکیل ہیں۔ صغیر احمد مقبول احمد مومن رکن بلدیہ منتخب ہوئے ہیں۔ محمد کامل اسحق (سلیمان ولی بنگال پورہ) ایک خاموش نوجوان ہیں لندن سے بیرسٹری کر آئے ہیں اور پریکٹس کر رہے ہیں۔ غالباً بھیونڈی کی برادری کے پہلے بیرسٹر ہیں۔

قوم کے نباض - ڈاکٹرس

پچھلی دو دہائیوں میں بھیونڈی میں مومن - انصاری ڈاکٹروں اور اطبا کے ساتھ شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ مرض کی علت شناسی، علم امراض اور جراحی کے ماہرین اطبا، جراح اور صدف کار ڈاکٹروں کا بڑا معتبر گروہ موجود ہے، ان میں کتنے علت قوم یا برادری کی معاشرتی بیماریوں کے نباض اور معالج ہیں یہ استفہام یقیناً نیم ضمنداتہ ہوگا۔ اس سلسلے میں، مالیگاؤں کے ڈاکٹروں کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنہوں نے مالیگاؤں سوسائٹی آف فزیشن کے ذریعہ قوم مالیگاؤں سے ممبئی بغرض علاج آنے والے مریضوں کو طبی سہولتیں پہنچانے کے لئے ایک میڈیکل سروس ڈپارٹمنٹ کی بنیاد ڈالی ہے، ممبئی میں مقیم یا آباد ڈاکٹرس اور زیر تعلیم و تربیت بیڈ بیشب ان مریضوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں دراصل اب تک سینکڑوں مریضوں کو فیض پہنچا ہے ڈاکٹر نذیر احمد صدیقی اس کے بانی اور روح رواں تھے مالیگاؤں کی طرح بھیونڈی کے ڈاکٹرس بیرونی ممالک میں کم ہی ہیں۔ تلاش معاش کے لئے انسان کی ضرورتیں اسے ہجرت پر مجبور کر دیتی ہے، سفر اور ہجرت کی اس قدر حوصلہ افزائی کسی اور مذہب نے نہ کی ہوگی،

کتاب وسنت کے نصوص پر عمل کرنے والے اصحاب کرام تن بہ تقدیر نکل کھڑے ہوئے اور اللہ کی راہ میں جہاد اور علم و رزق کے حصول کے لئے ہار کے بکھرے ہوئے دانوں کی طرح کوفہ سے کردادی الکبیر تک پھیل گئے۔

بھیونڈی سے برادری کے پہلے اور غالباً واحد ڈاکٹر نیاز احمد مومن ہیں جو برسوں سے امریکہ میں کامیابی کے ساتھ پریکٹس کر رہے ہیں، ان کے معاصرین میں اور "ہم نشکشت" میں مالیگاؤں کے ڈاکٹر مختار انصاری اور برہانپور کے ڈاکٹر اقبال انصاری ہیں لیکن یہ مؤخر الذکر دونوں ڈاکٹر حضرات گو غریب الدیار رہیں لیکن وطن کے لوگوں کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ ڈاکٹر محت ... ایجوکیشن اینڈ سوشیل ویلفیر سوسائٹی اسلام پورہ مالیگاؤں، ڈاکٹر مختار انصاری کی حُب الوطنی اور قوم سے محبت اور ہمدردی کا بے مثال نمونہ اور یادگار ہے۔

ڈاکٹروں میں سند کے مطابق ان کے درجات مقرر ہیں۔ خصوصی امراض کے علاج کے لئے خصوصی ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عقیل انصاری

ایک ماہر سرجن ہیں، ابتدائی تعلیم پونہ میں بشپ ہائی اسکول سے حاصل کی، اسماعیل یوسف کالج کے بعد مہاتما گاندھی میموریل ہاسپٹل سانگلی سے سرجری (ایم۔ ایس) کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ آپ کا اپنا ہاسپٹل ہے جو انہیں کے نام سے چل رہا ہے، ڈاکٹر عقیل رشتہ دار اور غریب مریضوں کو کافی سہولتیں اور مراعات دیتے ہیں۔ آپ راقم کی بڑی بہن کے صاحبزادے ہیں۔ عبدالمجید انصاری کے دوسرے صاحبزادے شبیر احمد انصاری نے بی پونہ سے ایل سی ای ایچ کی ڈگری حاصل کی اور ان کا اپنا الگ مطب ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد مستری (بی یو ایم ایس) اور ڈاکٹر شاہد احمد محمد یونس مستری مومن

راقم کی دوسری بڑی بہن کے دو لڑکے بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔ مشتاق احمد محمد یونس مستری اور شاہد محمد یونس مستری (مومن) الگ الگ جگہوں پر پریکٹس کر رہے ہیں شہر کے متوسط اور مزدور طبقہ کی بستیوں میں بڑے مقبول ہیں، اور ان کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام عبدالمجید انصاری (ایم۔ڈی۔ڈی سی ایچ)

برادری کے پہلے خصوصی معالج امراض اطفال (چائلڈ اسپیشلسٹ) ہیں، اپنی مرحومہ والدہ کی یادگار قائم کرنے کے لئے انہیں کے نام سے "زہرہ بی" بچوں کا ہسپتال کی بنیاد ڈالی ہے۔ آپ کے والد عبدالمجید (دفتری) بڑے حوصلہ مند بزرگ ہیں انہیں کی مساعیٔ جمیلہ سے ان کے یہ ہونہار فرزند اتنے کامیاب ڈاکٹر بنے ہیں، ڈاکٹر عبدالسلام کی اہلیہ عرفانہ ای این ٹی اسپیشلسٹ ہیں اور مالیگاؤں کے مشہور سیاسی رہنما ہارون بی۔ اے کی صاحبزادی ہیں۔ محمد عبدالسلام انصاری قوم کے لئے والد بزرگوار کی طرح بڑا دردمند دل رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم محمد ایوب انصاری (ایم۔ڈی)

ایک ابھرتے ہوئے نوجوان کارڈیولوجسٹ (ماہر امراض قلب) ہیں۔ اندرا گاندھی اسپتال بھیونڈی میں سینیر میڈیکل آفیسر ہیں، حال ہی میں راحت پلی کلینک میں اپنا کنسلٹنگ روم قائم کیا ہے۔ الحاج سیٹھ عبدالرزاق (درگاہ روڈ) کے پوتے ہیں۔

ڈاکٹر غیاث انصاری

شہر کے ممتاز تاجر اور صنعتکار حاجی ضیاء الدین کے ہونہار اور حوصلہ مند فرزند ہیں، ایک شاندار ذاتی شفاخانہ بنام میموریل الرازی جنرل ہاسپٹل قائم کیا ہے جس کی وجہ سے مقامی مریضوں کو بڑی سہولتیں حاصل ہوگئی ہیں اور بڑا فیض اٹھا رہے ہیں ڈاکٹر غیاث انصاری تبلیغی جماعت سے وابستہ ہیں، پابند صوم وصلوٰۃ ہیں۔ اور خاموش پسندی کے سبب "خلوتیان" میں سے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمنان انصاری

مئو (الٰہ آباد) کے "اُجڑے دیار" کے رہنے والے تھے ترک وطن کر کے بھیونڈی میں بس گئے مگر وہاں سے تہذیب اودھ کی روایات اور ثقافتی اقدار کی باقیات کے امین ہیں جو گھروں میں اترتے ہیں دلوں میں بس جاتے ہیں، کامیاب ڈاکٹر ہیں اپنی ذات سے خود ایک انجمن ہیں حلقۂ احباب میں محمد حسن مومن (ڈالڈا سیٹھ)، عارف حنیف طاہر انصاری، محمد حسن بھوپالی حاجی محمد اسحٰق سلیمان علاء الدین، شاہد غازی، محمد یوسف حسن اور مشتاق احمد موسیٰ رضا قابل ذکر ہیں، ادب نواز ہیں اور عملی سیاست سے بے نیاز مگر باتیں سیاست ہی کی زیادہ

کرتے ہیں جیسا کہ اتر پردیش کے باسیوں کی عادت ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے خازن ہیں اور ابتدا سے رکنیت حاصل ہے۔ ادیب ماہر اور ادیب کامل کی سند رکھتے ہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر اسرار احمد غلام محمد مومن

رئیس ہائی اسکول کے زمانۂ طالبعلمی میں ڈاکٹر اسرار احمد ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے، اساتذہ کے تعاون سے "بزم ادب" قائم کی جس کا افتتاح ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کو راقم نے کیا، یہ معاون سیکریٹری تھے اور عتیق الرحمٰن (بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ) سیکریٹری کے عہدہ پر سرفراز تھے اسی بزم کے زیر اہتمام ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، ڈاکٹر اسرار احمد اس زمانے میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیتے تھے اور اس سلسلے میں "مشق تقریر" کے لیے راقم السطور سے مشورہ لیتے تھے، بموجب استحقاق انعامات بھی حاصل کیے، طلبہ کی سماجی اور ثقافتی تنظیم کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ ڈاکٹری کرنے کے بعد مطب کھولا، متازچہ خانہ اور ایک اسپتال کامیابی سے چل رہے ہیں۔

دنیاوی اعتبار سے بیحد کامیاب انسان اور پیشہ کے لحاظ سے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر راحیل بشیر انصاری (ایم ڈی)

برادری کے پہلے ایم۔ ڈی پیتھالوجسٹ ہیں۔ ''ڈرشانگ سینٹر'' (تین بتی) سینٹرل اپیتھالوجیکل سینٹر میں آپ کی لیبارٹری ہے۔ شہر میں ایسے ماہر تشخیص الامراض کی بڑی ضرورت تھی۔

ڈاکٹر ابرار احمد غلام محمد مومن

نام سے تعلق ظاہر ہے، شہر کے کامیاب معالج دنداں ہیں، طائف کے پُرفضا تاریخی شہر میں جزنقیف کے لوگوں کے کام ودہن کا معائنہ کرنے کے بعد وطن لوٹ آئے ہیں، ادھر چند برسوں سے ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں، ہم سے بڑی گرمجوشی سے ملتے ہیں یہ ان کی عادت ہے اور خلوص کا اظہار، کورکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اور بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے رکن ہیں۔

ڈاکٹر ساجد غلام مصطفیٰ مومن (مستری) (۱۹ر نومبر سنہ ۱۹۶۱ء)

غلام مصطفیٰ آپ کے والد راقم کے دوست تھے، انھوں نے ہمیشہ تعلیمی امور سے دلچسپی لی، ڈاکٹر ساجد مومن بڑے کم عمر معالج دنداں ہیں لیکن تجربہ میں پختگی ہے، سینٹ جارج ہسپتال کے شعبۂ امراض دنداں سے بی۔ ڈی۔ ایس کیا، بڑے کامیاب دنداں ساز ہیں۔

حکیم ڈاکٹر محمود حسن (ولادت سنہ ۱۹۳۲ء)

قصبہ لال گوپال گنج الٰہ آباد سے ترک وطن کر کے بھیونڈی میں آباد ہو گئے ہیں، جامع الصفات ہیں اور علم وفن میں جامع الاسناد، الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا، علیگڑھ سے ادیب کامل اور الٰہ آباد سے کامل، عالم بن کر نکلے اور فاضل طب کی سند حاصل کی، بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کی ڈگری لی، حکمت وطبابت میں کوریا سے سوجاک ایکوپنکچر کا ڈپلوما تو تحصیل علم کی تیز نے ساری سوئیں نکال دیں آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں سودہ بڑودہ یونیورسٹی کے سرٹیفکٹ نے نکال کر علم طب میں اور بصیرت دے دی، آپ کئی طریقہ ہائے علاج کے معالج ہیں، نبض شناسی کا ملکہ حاصل ہے تو حق شناسی کا جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے، سند اجازت فی التجوید بروایت حفص میں علم القرآن کی درس وتدریس کی فضیلت بھی حاصل ہے۔ ان تمام طبی اور دینی مصروفیات کے باوجود تحریر وتقریر میں قلم وزبان بھی سرگرم رہتی ہے، سماجی وتعلیمی سرگرمیوں کا بازار بھی ہمیشہ گرم رہتا ہے، مجلس عاملہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس مہاراشٹرا اسٹیٹ کے ممبر تھے، انٹرنیشنل سوجاک ایکوپنکچر ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں، تحریر کا احاطہ بڑا وسیع ہے، شاید ہی کوئی موضوع بچا ہو جس پر آپ نے خامہ فرسائی نہ کی، مضامین کا انبار اور موضوعات کی رنگا رنگی نے ادبی وعلمی، ادبی وطبی، اصلاحی وسیاسی، تحقیقی ودینی رنگوں سے آپ کی شخصیت کو قوس قزح بنا دیا ہے ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔ ہندوستان بھر کے موقر جرائد ورسائل آپ کے افکار وخیالات شائع کرتے ہیں۔ الانصار ایجوکیشن اینڈ ویلفیر سوسائٹی بھیونڈی کے جنرل سکریٹری ہیں۔

ہندوستان کی مشہور اہلحدیث شخصیت اور ناظم معہد التعلیم الاسلامی۔ دہلی اور التوعیہ مولانا عبدالحمید رحمانی نے مکتبہ اہلال سے جس کے بانی اور مدیر حکیم محمود حسن ہیں شائع ہونے

والی کتاب التوحید میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے:

"ڈاکٹر محمود حسن کی شخصیت ملت کے درد مند طبقہ کے لیے محتاج تعارف نہیں، ان کی حرکی و فعال شخصیت مسلم پرسنل لا بورڈ سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مجلس مشاورت اور ملت کے دوسرے تمام نمایاں کاموں میں رواں دواں رہتی ہے اور ملت کی فلاح و بہبود کی راہ میں یہ کبھی بھی اپنی "انا" کو آڑے نہیں آنے دیتے۔ بھیونڈی میں ان کی سماجی دعوتی اور ملی تگ و دو نے انھیں وہاں کے سارے صحیح فکر مسلمانوں کا محبوب بنا دیا ہے۔"

"دس سال قبل چند سرپھیروں کے ساتھ موصوف نے محمدیہ ایجوکیشن سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی اور ملک کے دیومالائی نصاب تعلیم سے لے کر "سیکولرازم" اور "جمہوریت" کی آڑ میں اسلام اور اس کے صحیح عقائد کے خلاف کھیلے جانے والے تمام کھیلوں سے موصوف ملت کو آگاہ کرتے چلے آرہے ہیں۔"

"اور اب ایک طرف تو انہوں نے اسلامک ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے ایک تعمیری ادارہ کی تشکیل کر کے نئی نسل کی تعلیم و تربیت کی جانب نئے جوش و ولولے کے ساتھ کام شروع کیا ہے۔"

"اور دوسری جانب "مکتبہ الہلال" قائم کر کے انھوں نے مسلمانوں کے سامنے بالخصوص اور تمام باشندگان ملک کے سامنے بالعموم اسلام کی صحیح ترجمانی پیش کرنے کا مبارک کام شروع کیا ہے جس کی پہلی کڑی یہ بنیادی کتاب ہے، اور جو "لا الٰہ الا اللہ" کی جامع تفسیر ہے۔"

محمد بن عبدالوہاب نجدی کی کتاب التوحید کے بعد سلسلۂ اشاعت کی دوسری کڑی مولانا عبدالوہاب دہلوی کی "اسرار حج" ہے۔

حکیم محمود حسن سے راقم کے مراسم علمی و ادبی نوعیت کے ہیں۔ خاموشی اور لگن سے خلوص و للٰہیت کے ساتھ ملت کی خدمت انجام دینے والے اہلحدیث میں حکیم موصوف ایک انفرادی حیثیت رکھتے ہیں، مکتبہ الہلال کا قیام ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد میں عمل میں آیا تھا جہاں سے مختصر عرصہ میں چند کتابیں اشاعت پذیر ہوئی تھیں، نامساعد حالات نے حکیم صاحب کو نقل سکونت کرنے پر مجبور کر دیا، الٰہ آباد سے صرف برادری کے تاجر اور مشکری ہی نہیں آئے ہیں ان میں حکیم صاحب جیسے

نمائندۂ ملت اور حاذقِ علم حکمت بھی آئے ہیں۔ اکیس ۲۱ سال کے تعطل کے بعد مکتب البلال کی نشاۃ ثانیہ کر کے حکیم صاحب پھر ایک علمی و تعمیری خدمت انجام دینے کے لئے سر بکف میدانِ اشاعت میں اترے ہیں تاکہ کتاب و سنت کی تعلیمات کی نشر و اشاعت ہو اور توحیدِ خالص جو تصوف اور بھگتی بدعات و خرافات نیز دوسری مشرکانہ اور غیر اسلامی مراسم اور عادات کے گرد و غبار میں سکند ہو چکا ہے دوبارہ اس کا چہرہ رحمانی و روحانی کا جلوۂ ربانی دکھا کر ضلالت و گمراہی کے ظلمت کدہ کا اندھیرا دور کر دیں۔

محبوب الحسن آپ کے برادر بزرگ بھی بھیونڈی میں اپنا مطب چلا رہے ہیں اور تمام امراض کا اپنے مخصوص یونانی مفردات سے علاج کرنے میں ماہر ہیں۔

ڈاکٹر جاوید خلیل شاہجہاں (بی ایس سی آنرز) بی یو ایم ایس (بمبئی)

طبیہ کالج بمبئی کے سند یافتہ ہیں، دورانِ طالبعلمی میں بڑے ہنگامہ خیز واقع ہوئے تھے آپ کے احتجاج، ہڑتال اور دھرنا نے بمبئی یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو طبیہ کالج کے نصاب اور طریقۂ علاج کو تسلیم کر کے اپنے سے الحاق کرنا پڑا۔ اوجہ محلہ میں مطب ہے اور کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں، بیحد مخلص انسان ہیں، راقم سے گہرے مراسم ہیں۔ سماجی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ ہومیو پیتھک، یونانی اور دیگر طریقہ ہائے علاج اور اسناد کے مقامی ڈاکٹروں کی میڈیکل ایسوسی ایشن کے آپ سیکریٹری ہیں حالیہ فسادات میں آپ نے ڈاکٹروں کے تعاون سے جو طبی امداد کا وفد تشکیل دیا تھا اس نے نہ صرف جراحت جسم کی مرہم بندی کی بلکہ جراحتِ دل کا مداوا بھی حتی المقدور کیا۔

ڈاکٹر ریحان محمد یوسف انصاری

شانتی نگر، رحمت پورہ میں پریکٹس کرتے ہیں، آرٹسٹ ہیں، کتابت سے بھی شوق ہے اور نقاشی بھی۔ آپ کے جمالیاتی ذوق نے تزئین کاری اور تجریدی آرٹ میں اور ادبی ذوق نے صحافت میں ابلاغ و ترسیل کا ایک فکری اور قلمی نظام مرتب کر لیا ہے۔ طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس اول درجہ میں پاس کیا، ۱۹۸۵ء میں انٹر میڈیکل کالجیٹ کے مقابلہ میں دوسرا انعام پایا، پینٹنگ میں ۱۹۸۶ء میں "ہر جہت مصوری" کے مقابلہ میں بمبئی یونیورسٹی سے پہلا انعام ملا اس مقابلے میں

اکیس کالجوں کے مصورین نے حصہ لیا تھا، اداکاری کا ملکہ بھی حاصل ہے ۱۹۸۶ء میں اپٹا کے ڈرامائی مقابلے میں آپ نے اپنا کردار اتنی خوش اسلوبی سے ادا کیا کہ پہلے انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔

فن خطاطی میں ڈاکٹر ریحان نے خطاط الہند فیض مجدد لاہوری اور ان کے شاگرد اسلم کرتپوری سے رہنمائی اور تربیت حاصل کی ہے۔ اخبار عالم، الفتح، صبح امید، شاہنامہ بمبئی اور صبح و شام (بھیونڈی) کی تزئین کاری اور خطاطی انہیں کے "ریحان قلم" کی فنکاری کی مرہون منت ہے، ڈاکٹر ریحان باکمال ہیں اور ان کی شخصیت بڑی پہلودار ہے۔

ڈاکٹر نیاز احمد طاہر مومن

مشہور نجیب اللہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں طاہر بیکری والے کے چھوٹے صاحبزادے ہیں بنگلور یونیورسٹی سے سند لی ہے درگاہ روڈ پر مطب چلاتے ہیں اور غریبوں کے علاج میں بڑی رعایت اور خلوص سے کام لیتے ہیں، تبلیغی جماعت کے بڑے پرجوش مبلغ ہیں۔ درگاہ روڈ پر مطب ہے۔

ڈاکٹر اختر عبدالحفیظ مومن (ایل۔سی۔ای۔ایچ): نئے ابھرتے ہوئے نوجوان ڈاکٹروں میں سے ہیں حافظ محمد حسین کے پوتے ہیں۔ سماجی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر غلام محمد محمد صدیق مومن (ایل سی ای ایچ): کامیاب پریکٹس تھی لیکن کاروبار کے تانے بانے میں ایسے الجھے ہیں کہ مریضوں سے زیادہ کاریگروں کی فکر رہتی ہے۔

ڈاکٹر رضوان احمد مومن (ایل سی ای ایچ) زیتون پورہ میں غریبوں کی بستی میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر افتخار احمد عبدالحفیظ مومن (ایل سی ای ایچ): دیوان شاہ روڈ کے تاریخی مقام پر آپ کا دواخانہ ہے۔

ڈاکٹر انیس احمد عبدالرؤف (باپو) مومن: ہومیو پیتھی طریقۂ علاج کے ماہر ڈاکٹر ہیں، ہومیو پیتھی میڈیکل کالج دگاڑ پھاٹا میں لیکچرر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری (بی۔ایس۔سی۔ایل سی ای ایچ) عیدگاہ روڈ پر تکیہ آفاق شاہ کے زیر سایہ آپ کا دواخانہ "تکیہ گاہِ مریضاں" بنا ہوا ہے۔

ڈاکٹر حسام الدین انصاری (ایل سی ای ایچ) کامیاب ڈاکٹر ہیں، سماجی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ بھیونڈی ویلفیر سینٹر کے سکریٹری ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصمد انصاری (ایل سی ای ایچ) حفیظ نگر دیوان شاہ میں آپ کی ڈسپنسری ہے، علاقے کے مریضوں کے نگراں صحت ہیں۔

ڈاکٹر خورشید عالم انصاری (ایل سی ای ایچ) تحفہ کلینک کلیان روڈ میں ڈسپنسری میں کامیاب پریکٹس ہے۔

ڈاکٹر وسیم انصاری (ایل سی ای ایچ) درگاہ روڈ پر مطب ہے، گنجان آبادی کا علاقہ ہے اور اس جگہ کئی ڈاکٹر ہیں لیکن آپ بھی ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر مختار احمد مومن بھیونڈی نظام پور میونسپلٹی کے رکن تھے، کامیاب پریکٹس کے ساتھ سماجی امور سے دلچسپی لیتے ہیں۔

ڈاکٹر ضمیر حسن مشتاق احمد مومن (بی یو ایم ایس) کامیاب معالج ہیں، تجربہ بھی رکھتے ہیں، اپنا مطب بڑی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ مشتاق احمد موسیٰ رضا کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل غلام رسول ہدایت اللہ مومن: اس پیشہ میں نئے ہیں، محنتی ڈاکٹر ہیں گھر کے روبرو دھامنہ روڈ پر مطب ہے۔

ڈاکٹر منظور احمد ابن حافظ محمد محسن انصاری (ڈی یو ایم ایس) بنگال پورہ میں رہتے ہیں، غیبی نگر میں پریکٹس کرتے ہیں۔ دیندار ہیں اور دینی کتب کا بڑا گہرا مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر قدیم جلیل مومن (بی یو ایم ایس) کرنول سے طب کی سند ملی ہے۔ اپنے محلہ درگاہ روڈ پر کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں، ایڈوکیٹ یسین مومن اور نسیم مومن کے چھوٹے بھائی ہیں۔

ڈاکٹر ریاض مومن (ڈی یو ایم ایس) اسلام پورہ میں مطب کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصمد مومن (بی یو ایم ایس) بھیونڈی کے مضافات میں رسول آباد کھاڑی پار کی نئی بستی میں دواخانہ ہے اس علاقے کے ساکنان کو بڑا فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ڈاکٹر شکیل طیب مومن بی یو ایم ایس، فرید باغ نذی ناکہ میں آپ کا دواخانہ ہے اس علاقے کے جھگی نشینوں کے لئے آپ مسیحا ہیں۔

ڈاکٹر عتیق مومن ریتال پورہ میں فیض العلوم ہے جہاں آپ کا شفاخانہ فیض عام ہے۔

ڈاکٹر سہیل احمد مومن پنجابی کمپاؤنڈ کھنڈ و پاڑہ میں آپ پریکٹس کرتے ہیں یہ مزدور

کا علاقہ ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد انصاری (بی۔یو۔ایم۔ایس)، دیتال پاڑہ میں مزدوروں کی بستی میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کامل عبدالرؤف انصاری دیتال پاڑہ میں پریکٹس کرتے ہیں۔ غریبوں اور مزدوروں کی بستی ہے۔

ڈاکٹر اصغر علی انصاری اعظمی نگر میں یوپی والوں کی بستی میں مطب چلاتے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد انصاری ساحل ہوٹل کے پاس لنگرانداز ہیں آپ کا دواخانہ یہیں ہے۔

ڈاکٹر ابوطالب انصاری (بی یو ایم ایس)، گوری پاڑہ کھجور پورہ میں محنت کشوں کی بستی میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شمس الدین انصاری: رتن ٹاکیز کے پیچھے آپ کا دواخانہ ہے۔

ڈاکٹر محمد سعید انصاری (ایف ایم پی ایس)، اجنتا ہوٹل (دھامنکر ناکہ) کی گنجان بستی میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحکیم انصاری (ڈی یو ایم ایس)، رسول آباد میں کھاڑی پار کے باشندوں کو آپ سے بیحد فیض پہنچ رہا ہے۔

ڈاکٹر نظام انصاری: نظام پورہ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالباری انصاری: دیتال پاڑہ میں آپ کا دواخانہ ہے اور پریکٹس کامیاب ہے۔

ڈاکٹر شکیل اختر انصاری: نایگاؤں کی نئی بستی میں آپ پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ضمیر الحسن انصاری: رامیشور مندر لبرٹی ہوٹل کے سامنے آپ کا شفاخانہ ہے۔

ڈاکٹر اقبال انصاری: کلیان روڈ پر پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم انصاری: گول بلڈنگ کے قریب نظام پورہ میں دواخانہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری: بال کمپاؤنڈ میں جہاں کاریگروں کی بستی ہے آپ کا شفاخانہ ہے۔

ڈاکٹر اظہار الحق انصاری (ڈی۔یو۔ایم۔ایس): نارپولی روڈ پر دیوان شاہ گراؤنڈ کے علاقے میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر امام علی انصاری: خفیہ کمپاؤنڈ میں پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ہاشم انصاری (بی یو ایم ایس)، گوری پاڑہ کی گنجان آبادی میں آپ کا مطب ہے۔

•

ڈاکٹر امتیاز احمد محمد یونس انصاری بورہ واڑہ نظام پورہ میں بڑے ممتاز ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر کلیم محمد حنیف انصاری نے مومن ہاؤس درگاہ روڈ پر اپنا مطب قائم کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر صلاح الدین انصاری، کاردلی روڈ پر طبی صلاح و مشورہ دیتے اور علاج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مختار محمد انصاری۔ رنجی رپلی ناکہ (حاجی کپ وَنٹر بھو واڑہ) میں کامیاب پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد کامل انصاری۔ ۵۸۷ قاسم پورہ، انصار محلے "نحن انصار اللہ" میں سے ہیں۔

ڈاکٹر زبیر احمد انصاری۔ تارپولی، درگاہ روڈ پر ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر شرف الدین نام منیر۔ آزاد نگر میں غوثیہ مسجد کے زیر سایہ علم طبابت کا شرف رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد یعقوب انصاری۔ گلزار نگر میں آپ کا وجود مریضوں کے لئے مسیحا سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر شوکت اصغر انصاری۔ ناگاؤں کی نئی بستی میں کامیاب پریکٹس کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالباری مومن۔ سلامت پورہ، نایگاں کے باشندوں کے لئے بیماریوں سے تحفظ دست کے ضامن ہیں۔

ڈاکٹر نثار اللہ عبدالرؤف انصاری۔ غیبی نگر کے معروف ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر ریحان نذیر احمد مومن دسی علاقے کے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر الوہاب انصاری۔ کھجور پورہ کے علاقے میں بڑے کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر عبداللہ عبیداللہ انصاری۔ ساحل ہوٹل کے روبرو مرتضیٰ کمپاؤنڈ میں لنگر انداز ہیں در مقبول معالج ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز احمد انصاری۔ درگاہ روڈ کے باسیوں کی طبی خدمت بجا لاتے ہیں۔

ڈاکٹر صالح عبدالعزیز انصاری۔ گوری پاڑہ کی گنجان بستی کے ہر دلعزیز ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر محمد سہیل مومن۔ نظمی نگر کی مہاجرین کی بستی کے مقامی ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر پرویز احمد عبدالوہاب انصاری فاطمہ بی بیان نری نگر کے علاقے میں کامیاب پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نثار احمد انصاری۔ انصاری محلہ، ناگاؤں کی نئی بستی میں مزدوروں کے خاص ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحیم مومن۔ بال کمپاؤنڈ کے بنکروں کے خاص معالج ہیں۔

ڈاکٹر شمشاد مومن گوری پاڑہ میں مزدوروں کی بستی میں کامیاب ڈاکٹری کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالستار انصاری۔ مالیگاؤں سے ہجرت کر کے بھیونڈی میں بس گئے ہیں، بچہ مخلص اور منسا ڈاکٹر ہیں۔ پھوڑے پھنسی کے ماہر معالج ہیں۔

ڈاکٹر عالمگیر محمد اکبر سردار: بنگال پورہ میں رہتے ہیں، برہانپور سے سند لے کر آئے ہیں۔
ڈاکٹر راشد حسین بھوپالی اور ڈاکٹر ارشد حسین بھوپالی: دونوں بھائیوں نے حال ہی میں پریکٹس شروع کی ہے۔ بڑے محنتی اور سعادتمند نوجوان ہیں۔

برادری کی خاتون ڈاکٹرنیاں:

ایک زمانہ تھا کہ "دائی" زچگی کراتی تھی اب زچہ خانوں میں ڈاکٹر خواتین یہی کرتی ہیں۔ برادری میں بھی کئی خاتون ڈاکٹرس ہیں غلام محمد مومن (بی۔ اے) کی صاحبزادی نزہت مومن غالباً پہلی خاتون ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر شاکرہ الیاس (بنت محمد حنیف طاہر انصاری) بھیونڈی نظام پورہ میونسپلٹی کے زیر اہتمام چلنے والے ہسپتال اندرا گاندھی میموریل ہسپتال میں میڈیکل آفیسر ہیں۔ کامبہری میں اپنا مطب بھی چلاتی ہیں۔

ڈاکٹر تبسم بنت خلیل شاہجہاں نے بیلگام سے ایل سی ای ایچ کی سند لے کر علاج نسواں کرتی ہیں، فہمیدہ محمد یوسف بھی مطب کرتی ہیں، شہناز مومن کھاڑی پار رسول آباد میں پریکٹس کرتی ہیں۔

محمد صدیق جان محمد مستری کی صاحبزادی سعیدہ نے پونہ سے ایل سی ای ایچ کیا۔ آپ اپنے شوہر ڈاکٹر انیس احمد مومن کے ساتھ پریکٹس کر رہی ہیں۔

ہومیو پیتھک طریقہ، علاج میں پریکٹس کرنے والے حسن جناب (ماما) بہت مشہور ہیں۔ اُن کے علاوہ محمد یعقوب نظر بھی آجکل بڑے مقبول ہیں۔ ڈاکٹر جعفر میر (جو کھو)، ڈاکٹر عبد الباری، ڈاکٹر طالب عبد الحیٔ اور دیگر حضرات بھی عموماً غریبوں کی بستیوں میں مطب چلاتے ہیں۔

فنِ تعمیر کے ستون

ایک زمانہ وہ تھا جب بھیونڈی کے صاحب ثروت معمار لگوا کر بڑی بڑی عمارتیں بنوا لیتے تھے، نہ انجینئر کی ضرورت محسوس کرتے اور نہ آرکیٹکٹ کے نقشے کے محتاج تھے اب نقشہ ہی بدل گیا ہے، نئے ضابطوں کی رُو سے ان دونوں ماہرین کی

جیسا کھیوں کے بغیر کوئی عمارت قانونی طور پر کھڑی نہیں ہو سکتی، فنِ تعمیر میں اعلیٰ فنی منصب پر پہنچنے والے پہلے انجینیئر شہریار ابن زیڈ عابد ہیں جو بھیونڈی نظامپورہ میونسپلٹی میں ملازم ہیں دوسرے سول انجینیئر (بی۔ ای) شاکر یوسف حسن مومن ہیں آپ بھی بلدیہ میں ملازم ہیں۔ محمد ایوب آرکیٹکٹ، شبیر احمد منشی، عالمگیر مومن وغیرہ ڈپلوما سول انجینیئر ہیں۔ عرفان محمد حسین میاں جی برادری کے پہلے آرکیٹکٹ ہیں، محمد اکرم محمد ایوب انصاری ایک ابھرتے ہوئے نوجوان آرکیٹکٹ ہیں اور فیصل محمد حنیف طاہر انصاری ابھی ابھی میدان میں آئے ہیں، عارف عبد الحمید پنجابی رائیجیا کالج آف آرکیٹکٹ باندرہ کے طالبعلم تھے۔ اقبال محمد یٰسین مومن انجینیئر نے اپنے کمال محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر صمد نگر میں کئی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرائی ہیں۔ اسلم فقیر محمد مومن ایک ابھرتے ہوئے آرکیٹکٹ ہیں۔ بڑے مہذب نوجوان ہیں۔

انجینیئرس

عادل اختر پنجابی (ولادت ۲۹ رجون ۱۹۵۹ء) ایل ٹی یم: برادری کا پہلا ہونہار نوجوان ہے جس نے مشہور ٹیکنیکل ادارہ وی۔ جے۔ ٹی۔ آئی سے ایل۔ ٹی۔ ایم (کاٹن) کا کورس کیا۔ ۹۲-۱۹۹۱ء کے کامیاب طلبہ میں سب سے زیادہ نمایاں کامیابی پر عادل اختر پنجابی کو دادا بھائی نوروجی میموریل گولڈ میڈل ملا تھا، اسپننگ کے فن میں سب سے کامیاب فنی مظاہرہ کرنے پر آپ کو پرسی ٹیکس کے ایوارڈ کا اعزاز ملا تھا۔ یہ چاندی کی شیلڈ ہے۔ امید ہے کہ آپ اپنے فن میں اور ترقی کریں گے۔

برادری کے پہلے فرد اقبال احمد زاہد نے بی۔ ایس۔ سی (ٹیک) کی ڈگری حاصل کی اب برسوں سے

برسرِ ملازمت ہیں۔

سعید محمد جسیم میکانیکل انجینئر ہیں، عرفان محمد ایوب پنجابی آئی آئی ٹی (کانپور) سے کیمسٹری میں بی ٹیک کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن ٹیکسٹائل کی صنعت سے وابستہ ہیں۔

محاسبانِ قوم

کامرس کے گریجویٹ اب شاید آرٹس کے شعبہ سے ڈگری لینے والوں کی تعداد سے بڑھ گئے ہیں مشتاق نائیل مومن (پنڈت) اور مصطفیٰ محمد نذیر انصاری اولین کامرس گریجویٹس میں سے ہیں، کمال احمد محمد شریف مومن اور ان کے معاصر مشتاق احمد عبدالرؤف مومن اس شعبہ میں ابھی تک فعال ہیں۔ مشتاق احمد نے سی۔ اے (چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ) کا کورس کر کے ادبیت کا فخر حاصل کیا، برسوں سعودی مملکت میں یہی خدمت انجام دیتے رہے۔

ہارون بقر عیدی (حافظ) بھی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور بیرون ملک میں بسلسلۂ ملازمت مقیم ہیں، آپ کے گھرانے میں تعلیم یافتہ افراد کی کمی نہیں، علم اور دین کا بڑا چرچا رہا ہے۔ آپ کی بہن جمیلہ جو بیگم نور الہدیٰ سردار ہیں، بیگم فاطمہ ہارون مومن کی طرح ایم۔ اے ہیں۔

صنعت کے صلاح کار: شریف سلیمان مومن (بی۔ اے۔ آنرز) (ڈی۔ ایل ڈبلیو)

برادری میں مرد اور خاتون بی۔ اے اور بی۔ ایس۔ سی ڈگری یافتہ گریجویٹس کی فہرست بڑی طویل ہے اور یہ قصۂ طولانی ہے جس کا سلسلہ بڑا دراز ہے لیکن چونکہ اختصار ملحوظِ خاطر ہے اس لئے ہم صرف اس واحد گریجویٹ کا ذکر کر رہے ہیں جس نے روایت سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ بنا لی ہے اور اس راہ کا وہ اب تک واحد مسافر ہے جو بڑی شاندار کامیابیوں کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔

شریف مومن بھیونڈی کے پہلے طالبعلم تھے جنہوں نے ۱۹۶۵ء میں واڈیا کالج پونہ سے اقتصادیات میں بی۔ اے (آنرز) کیا، اپنے وطن کے صنعتی انقلاب کے پیش نظر انہوں نے مزدوروں سے متعلق قانون کا ڈپلوما کورس کیا۔ مل مالکان اور مزدوروں کے مابین ایک دائمی کشمکش طبقاتی شعور کی پیداوار ہے۔ گو آپ کے پونہ کی ایک کمپنی میں ملازم ہوئے محرری کے ذریعے سے ترقی کی تو افسر کے کیبن میں پہنچے۔ بھارت سِلک انڈسٹریز میں ملازمت

کی تو آپ کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر کمپنی نے اپنا قانونی صلاح کار بنالیا پھر اتنی ترقی کی کہ خود اپنا چیمبر قائم کرلیا اور صلاح لینے والے مختلف صنعتی اداروں، کمپنیوں اور فرموں کو ایک نئی سمت کی نشان دہی ہوئی اور اب تک نثر سے زیادہ ادارے شریف مومن کے قانونی، صنعتی، انتظامی اور مصنوعات کی صادرات سے متعلق تمام امور کے لئے ان کی صلاح، تجاویز اور منصوبوں کے رہین منت بنے ہوئے ہیں ان میں گاروارے، پودار گروپ، باجاج گروپ، پاریکھ گروپ، ٹاٹا، برلا، ڈلال گروپ، شیٹی، بھنڈاری اور سیٹھ گروپ جیسی مشہور اور عظیم صنعتی کمپنیاں شامل ہیں۔

شریف مومن کا دائرۂ عمل اور صلاح و تجاویز کے حدود اتنے وسیع ہوتے جارہے ہیں کہ سوت کے تانے بانے سے لے کر رنگائی اور پارچہ بافی سے لے کر صابون سازی تک، گھریلو مصنوعات سے لے کر عمارتوں کی تعمیر تک کے لئے صنعت کاران کے مرہون منت ہیں۔

بھیونڈی کے مشہور عطر والے خاندان حاجی سلیمان کے صاحبزادے ہیں، اور اس کی مثال ہیں کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔

شریف مومن کے طالبعلمی کا زمانہ بھی بڑا شاندار تھا، کرکٹ کے ماہر کھلاڑی تھے، واڈیا کالج، مومن کرکٹ ٹیم بھیونڈی اور وی ایم سی اے کرکٹ ٹیم پونہ کی نمائندگی کر چکے ہیں اور اب جو ایک کامیاب ازدواجی زندگی گذار رہے ہیں وہ بھی ایک شریف گھرانے کا بےمثال نمونہ ہے جس طرح آپ مزدور اور مالکان کے بیچ ایک پل بنے ہوئے ہیں اسی طرح مومن برادری کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور نئی نسل کے لئے نشان راہ جو یہ اشارہ کر رہا ہے ؎

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

ہمارے فنکار: نقش پیراہن ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

فن خطاطی، تذہیب، جلد سازی و تزئین کاری عہد وسطیٰ میں مسلمانوں کے ثقافتی اور تہذیبی مناسب تھے ورثن کا شاندار حیاتی سرمایہ تھا فن خطاطی کی تاریخ میں عظیم خطاط مثلاً علی بن بلال یا قوت المستعصمی (متوفی ۱۲۹۸ء) ابن مقلہ (متوفی ۹۴۰ء) وغیرہ نے جو شاہکار نمونے یادگار چھوڑے ہیں اس نے نگارخانۂ چین کو بھی شرما دیا، فن خطاطی کا سفر کوفی سے شروع ہوا، شش قلم (اقلام ستہ) ثلث، نسخ، محقق، ریحانی، رقاع اور توقیع کی تلدد سے ہوتا ہوا بغداد، قاہرہ، اندلس اور پھر ہندوستان میں خطاطی کا سفر ختم ہوا یہاں عہد سلاطین

میں دیوانی شعبہ جات اور دارالانشاء میں غبار، طومار، تعلیق اور پھر نستعلیق طرز خطاطی کا ارتقاء ہوا۔ دیوانی، جلی اور شکستہ اور بہاری کی گلکاریاں کرتا ہوا یہ فن تزئین و آرائش کی جلوہ آفرینیوں کی جلا میں آج بھی ایران اور ترکی میں بہاریں دکھلا رہا ہے۔

مرکز علم و فن سے دور افتادہ بھیونڈی جیسے شہر میں ہمارے کچھ نوجوان اس عظیم میراث فن کی روایات کے امین بنے ہوئے ہیں عارف ایک معروف خطاط ہیں عرفان کو فن کتابت کی ملکیت سے منسوب میں فنی معرفت حاصل ہے۔ نظام الدین مومن کی کتابت اور خوشخطی کے نمونے ہفتہ وار صبح و شام میں نمودار ہوتے رہتے ہیں بلال ناظر بھی اسی ہفتہ وار پرچے سے وابستہ ہیں۔ وقار مومن نزہ خاندان (باز عبداللطیف مومن) بڑی نفیس خطاطی کرتے ہیں۔

مقصود احمد عبدالقادر انصاری (ولادت ۵ رجون ۱۹۶۵ء)

"سبزہ نورستہ" ہیں لیکن اپنے فن کی بہار کمسنی ہی میں دکھلا رہے ہیں، جونیئر کالج کے بعد ڈپلوما، فاؤنڈیشن آف ڈرائنگ اینڈ پینٹنگ میں حاصل کرکے کمرشیل آرٹسٹ بن گئے، پرنٹنگ کے علاوہ عربی کی خطاطی سے بھی واقف ہیں، چونکہ آرٹسٹ ہیں اس لئے جمالیاتی ذوق نے 'فنون لطیفہ' میں اظہار، ابلاغ اور ترسیل کے ذرائع ڈھونڈ لئے ہیں، اس کے ساتھ ہی ہمہ جہتی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں بڑے جوش و ولولہ سے حصہ لیتے ہیں۔

یعقوب علی محمد ایوب صابر مومن کمرشیل آرٹسٹ ہیں، بیرون ملک چند برس گذار چکے ہیں فی الحال اسکرین پرنٹنگ بلاک میکنگ کا کاروبار کر رہے ہیں، بجد کم آمیز اور کم سخن فنکار ہیں،

سردار عبدالمطلب محمد اکبر (یکم مارچ ۱۹۴۴ء)

آرٹ میں کمرشیل ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد دیگر متعلقہ عملیات اور فنون کا علم حاصل کیا، فوٹو گرافی، بلاک بنانا، کتابت اور اندرونی تزئین و آرائش کا کورس کیا، کچھ برسوں باہر رہے اب درس و تدریس کے سلسلہ کی تجدید کی ہے، کم آمیز ہیں اور کم سخن، اسی لئے کم ہی لوگ ان کے فن سے واقف ہیں۔

سیماب انور محمد عمر مومن: نئے فنکار ہیں، صمدیہ ہائی اسکول میں ڈرائنگ ٹیچر ہیں اورنگ آباد سے بی۔ ایف۔ اے (بیچلر آف فائن آرٹ) کی ڈگری لے کر آئے ہیں۔ بھیونڈی ونیز سینٹر کے فعال رکن ہیں۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ: ہماری معلمات

مومن خواتین محجوب رہتے ہوئے بھی نئے زمانے کے سائنسی علوم سے بے بہرہ نہیں ہیں، ہمارے درمیان گریجویٹ خواتین کی بڑی تعداد موجود ہے، ہم صرف ان خواتین کا ذکر کر رہے ہیں جو یا تو تعلیمی ادارے سے متعلق ہیں یا صنعتی، سماجی یا طبی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

نجم النسا (بیگم شمس الضحیٰ انصاری) پہلی مومن خاتون گریجویٹ ہیں، محمد ایوب پنجابی نے مالی امانت فرمائی اور راقم نے ہمت دلائی، انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور اب رفیع الدین ہائی اسکول میں سپرد ائزر ہیں۔

عفت بنت غلام محمد مومن عرصے تک اقصیٰ گرلز ہائی اسکول کی صدر مدرس تھیں۔

بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے پرائمری اسکول کا قیام جون ۱۹۸۰ء میں عمل میں آیا۔ اسکول گذشتہ ۱۸ برسوں سے انصاری یاسمین محمد رفیع کی نگرانی میں بتدریج ترقی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ مدرسہ ہٰذا کی درسی، غیر درسی سرگرمیاں بنظرِ استحسان دیکھی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اہالیانِ شہر اپنے بچوں کو اس ادارے میں داخل کرانے کو ترجیح دیتے ہیں، یاسمین انصاری (صدر مدرس) کی سرکردگی میں اسکول کی معلمات جن میں ایک معتدبہ حصہ مومن خواتین کا ہے بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی اور مومن ویلفیئر سوسائٹی کے تعمیری منصوبوں کے لئے ہر سال ایک خطیر رقم اکٹھا کرتی ہیں۔

بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ کرنے والی خواتین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، عارفہ سہیل مومن صمدیہ ہائی اسکول کی معلمہ ہیں، ان کی بہن صبا صدیق مومن صمدیہ پرائمری اسکول میں ہیں، ان کی چھوٹی بہن تبسم نے نیوٹریشن (نندوری) میں فرسٹ کلاس میں بی۔ ایس۔ سی کیا ہے اور آنکھوں کے معائنے سے متعلق بصریات (اوپٹومیٹری) میں ڈگری میں نیترا (NETRA) بمبئی سے ڈپلوما لیا ہے، اس شعبہ میں شبنم کو تفرد حاصل ہے اور یہ قابل فخر اور مسرت کی بات ہے۔

نیلوفر محمد سلام اور شاہ جہاں نثار مومن بی۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ ہیں۔ زلیخا غلام قاسم مومن

نے ایم۔ایس۔سی کیا ہے۔ شہناز محمد لیٰسین سردار بھی عرصہ ہوا بی۔ایس۔سی۔بی۔ایڈ کر چکی ہیں۔ شگفتہ ابراہیم مومن نے بھی بی۔ایس۔سی کے بعد بی۔ایڈ کا کورس کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام انصاری ولد عبدالمجید ذہین کی بہنیں بھی درس وتدریس کے سلسلے سے منسلک ہیں۔ قمرالنسا انصاری معتاد رشام ہیں "آبگینہ" مرتب کرتی ہیں۔

شہناز بنت عبدالشکور سیٹھ نے ایم۔اے۔بی۔ایڈ کرنے کے بعد رفیع الدین ہائی اسکول میں درس دیتی رہیں۔ بیحد خاموش طبع، صالحہ اور صابرہ خاتون ہیں۔ آپ کی بڑی بہن خالدہ نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔

حنیف طاہر انصاری کی صاحبزادیاں آسیہ بی۔ایس۔سی۔بی۔ایڈ ہیں۔ نسرین ایم۔اے۔بی۔ایڈ اور شبانہ بی۔اے۔بی۔ایڈ ہیں اور اسکولوں سے وابستہ تھیں۔ ردبینہ عبدالخالق انصاری بی۔ایس۔سی بی ایڈ کر کے معلمہ بن گئی ہیں۔ اور اب بیگم ڈاکٹر ریحان انصاری بھی بن گئی ہیں۔

ہوم سائنس کا کورس بھی کچھ لڑکیوں نے کیا ہے ان میں درخشاں بنت ضیاء احمد مومن اور شاہدہ ممتاز مومن (بھیونڈی والے) کے اسمارِ گرامی ممتاز ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمنان انصاری کا گھرانہ بڑا روشن خیال ہے اسی لئے ان کی دو صاحبزادیوں نے قدامت کے پردے سے نکل کر عصری تقاضوں کے زیر اثر اور اپنی صلاحیتوں کی روشنی میں ایک منفرد حیثیت اختیار کر لی ہے، بڑی صاحبزادی تحیۃ کنیت سودہ نے بمبئی یونیورسٹی سے علم حیوانیات (زوولوجی) میں فرسٹ کلاس سے ۱۹۸۸ء میں ایم۔ایس۔سی کی، بھیونڈی نظام پور نگر پالیکا کالج میں لیکچرر تھیں۔ دوسری صاحبزادی لبنیٰ انصاری نے بمبئی یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد سعودی ایئرلائنز میں ایئر ہوسٹس بن کر اڑنے لگی ہیں۔

راقم کی اکلوتی (اولاد) دختر رخشندہ بنت مومن محی الدین (جراب رخشندہ صادق) ہیں، ۱۹۷۹ء میں نرملا نکیتن (بمبئی) سے ہوم سائنس کا ڈپلوما کیا پھر ایس۔این ڈی۔ٹی پولی ٹیکنیک (سانتا کروز) سے ڈریس میکنگ اور فیشن کوآرڈینیشن کا دو سالہ ڈپلوما کورس (۱۹۸۱ء–۱۹۸۳ء) میں مکمل کیا، اس کے بعد پری پرائمری اور مونٹیسری (روضۃ الاطفال) کی تربیت حاصل کر کے گذشتہ چھ سالوں سے دو سو آو ملیفیر ایسوسی ایشن ہائی اسکول میں کے۔جی کی مقبول ترین ٹیچر بن گئی ہیں۔ ہر دلعزیزی کا (ماشاء اللہ) یہ عالم ہے کہ والدین اور سرپرست "رخشی ٹیچر" کی کلاس میں اپنے بچے، بچی کو بٹھلانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

شعری وادبی ذوق عموماً تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کی خواتین میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے لیکن "یاں شرم آپڑی ہے" کے مصداق کھل کر منظر ادب پر نہیں آتیں۔ رضیہ حکیم کی پہلی کوشش

"شمع جلتی رہی" ایک معاشرتی ناول ہے۔ مضامین لکھنے والی طالبات اور معلمات کے علاوہ باقاعدہ کسی نے سنجیدگی سے اس طرف رغبت نہیں کی ہے، شاعرات بھی ضرور موجود ہیں لیکن خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں ـــ اور سامنے آتے نہیں۔

بھاوری کی لڑکیوں میں پوشاک اور ملبوسات کی سلائی، کڑھائی اور گل دوزی کا شوق بڑھتا جا رہا ہے اور ان کے عزائم اتنے بلند ہو چکے ہیں بعض تو خود کفیل بن چکی ہیں اور یہ نہایت ہی نیک فال ہے۔ اولیت کا سہرا خورشید بیگم منصور حنیف انصاری کے سر ہے، خورشید انصاری کے تیار کیے گئے اور دیگر ملبوسات کی گرہ ٹک کی زیبائش اور نقش و نگار سے مزین رہتے ہیں اور تیار کیے جاتے ہیں جن میں جدت طرازی ہوتی ہے جو دوسروں کے تیار کردہ ملبوسات کی مانگ بڑھا جاتی ہے۔ ان کی صاحبزادی بنی منصور انصاری نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس پاس کیا اور اب فیشن ڈیزائنر کی حیثیت سے والدہ کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔

بنگال پورہ کی تین حوصلہ مند اور سگھڑ لڑکیوں نے بھی "بوتیک" ڈال دی ہے اور اس صنعت میں محنت کر رہی ہیں، ان میں عائشہ مسعود مومن، نوشابہ الطاف مومن اور عرشیہ صدیق مستری بڑی لگن اور دیدہ دلیری سے نئی نئی ڈیزائنوں کی پوشاک تیار کرتی ہیں۔

مہندی و حنابندی کا فن بہتوں کو آتا ہے اور بعض اسے باقاعدہ سیکھتی ہیں، لیکن جہاں تک زینت اور تزئین و آرائش کا تعلق ہے ہماری خواتین سنت کے دائرہ میں رہ کر عمل کرتی ہیں اور یقیناً وہ اس اسلامی حکم سے بھی واقف ہیں "زینت میں ایسا غلو کہ اللہ کی پیدا کردہ ساخت میں تغیر واقع ہو، اسلام کے نزدیک مردود ہے۔ غلو آمیز زینت کی ایک شکل جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے وہ تنمص (بال نوچنا) ہے، تنمص سے مراد موچنے سے بھووں کے بال نکال ڈالنا ہے یا اسے کمان یا خنجر کی شکل دے دی جائے۔

ہمارے اساتذہ

پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن

بھیونڈی کی مومن برادری کے مایہ ناز فرزند ہیں، ان کی خاموش پسند طبیعت، علمی اور تدریسی مصروفیات نے انہیں "ہیچ نفت نرسد گوشۂ تنہائی را" کا مالک بنا رکھا ہے۔ رئیس ہائی اسکول کے ہونہار طالب علم تھے ان کے اساتذہ ان کی عربی قابلیت کے معترف اور مداح تھے، سینٹ زیویرز کالج بمبئی سے عربیات میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور کئی انعامات سے نوازے گئے، انہیں

اوصاف کا ثمرہ تھا اور ان کی علمی قابلیت اور استعداد کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد بمبئی یونیورسٹی کے زمرۂ اساتذہ میں شامل کر لیے گئے، یونیورسٹی میں شعبۂ عمرانیات (سوشیولوجی) کے سربراہ اور بڑے قابل استاد ہیں، صاحبِ علم و قلم اور صاحبِ تصنیف ہیں ان کے تحقیقی اور علمی مقالے انگریزی اور اردو کے مقتدر جرائد اور رسائل میں شائع ہوتے ہیں، عربی اور علوم اسلامیہ کا درک رکھتے ہیں، دینی امور سے برابر دلچسپی رکھتے ہیں، آپ کی جمالیت پسندی اور نستعلیق مزاج نے آپ کو خطاطی، تذہیب اور تزئین کاری کے فنون کا دلدادہ بنا دیا ہے، آپ کا ذاتی کتبخانہ گواہی دیتا ہے کہ بقول اقبال "کتاب خواں ہیں اور صاحبِ کتاب بھی ہیں" اسلامپورہ مسجد کی تعمیرِ نو اور تزئین میں آپ کے جمالیاتی ذوق کا عکسِ جمیل نظر آتا ہے، آپ کا اس مسجد کی تعمیر میں بڑا حصہ ہے۔

ڈاکٹر عبد الرؤف حافظ عبد القدوس مومن

آپ کے والد بزرگوار حافظ عبد القدوس ہیں، [illegible] صدی کی تیسری دہائی میں جنگل پورہ کی کئی نسلوں نے قرآن پڑھا ہے۔ حافظ جی راقم کی والدہ ماجدہ کے وطنی رشتہ دار تھے، بنکر تھے اور پھر اپنی محنت اور دیانتداری سے انہوں نے کارگاہ قائم کر لی اور پھر [illegible] بھیونڈی چلے گئے لیکن قصبہ پھولپور اور محلہ جمیل آباد کو بھی اسی طرح ہمیشہ آباد رکھا، ڈاکٹر عبد [illegible] مومن عبد القیوم مومن اور عالم آپ کی سعادتمند اولاد ہیں حافظ عبد [illegible]قدوس اور ان کے بھتیجے حافظ باقر عیدی کا پورا گھرانہ تعلیم سے بہرہ ور ہے۔ اسی دینی وعلمی ماحول میں ڈاکٹر عبد الرؤف مومن کی نشو و نما ہوئی، بمبئی یونیورسٹی سے نباتات میں ڈاکٹریٹ کیا اور بھیونڈی نظام پور نگر پالیکا کالج میں صدر شعبہ ہیں، کالج کی "بزم ادب" کے پروگراموں میں بھی دلچسپی لیتے ہیں، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن کے زیر نظام چلنے والے پرائمری اسکول کی کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ ملنسار اور خلیق انسان ہیں [illegible]دی کے پہلے فرد ہیں جنہوں نے سائنس میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ اب آپ کو کالج کا [illegible] ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ڈاکٹر خالد مومن

ایم۔ ایس۔ سی کرکے حیوانات (زوولوجی) میں ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ بھیونڈی نظام پور نگر پالیکا کالج میں اسی شعبہ میں لیکچرر ہیں۔ سائنس میں انہیں ڈاکٹریٹ کرنے کا تفرد حاصل ہے۔

مومن جانِ عالم رہبر (ولادت یکم جون ۱۹۴۲ء)

۱۹۴۲ء کے پُر آشوب عہد کی یادگار ہیں۔ تعلیمی دنیا میں بھی بڑے ہنگامہ پرور رہے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری سے بی۔اے کیا، پھر تاریخ کے اوراق الٹنے کے لیے آگے بڑھے، سینٹ زیویرس کالج بمبئی پہنچے اور علم التاریخ میں ایم۔اے کی ڈگری لی اور شہزادۂ بدرمنیر کی طرح اعلیٰ تعلیم کی گل بکاؤلی کی تلاش میں مرکزِ علم پونہ پہنچے یہاں پر ایم۔اے میں اردو فارسی کے گل کھلائے پھر دوبارہ بمبئی یونیورسٹی یعنی پرانی مادرِ علمی کی گود میں گئے اور تیسری زبان یعنی انگریزی ادبیات میں تیسرا ایم۔اے کیا، ان تینوں اعلیٰ ڈگریوں کی سیڑھیاں چڑھ کر بھی آپ شاد آدم شیخ ٹیکنیکل ہائی اسکول میں ٹیچری کی مسند پر جلوہ افروز ہیں، شومیٔ قسمت کہیے یا کوتاہیٔ ہمت، رہبر صاحب ایسے بھی نہیں کہ کہہ سکیں کہ ہے سبب غالب دشمن آسماں اپنا

آپ مضامین لکھتے ہیں اور چھپتے بھی ہیں، شاعر ہیں اور اچھا کہتے ہیں۔

مومن غلام نبی

بھیونڈی نظام پور نگرپالیکا کالج میں لیکچرر ہیں، اس سے پہلے کلیان کے نیشنل جونیئر کالج آف ایجوکیشن سے وابستہ رہ چکے ہیں، علمی اور ادبی شغف رکھتے ہیں اور بزمِ علم و ادب کے صدر رہ چکے ہیں۔ آپ صاحبِ تصنیف ہیں اور زیادہ تر نصابی اور درسی کتابیں لکھی ہیں مثلاً اردو زباندانی جس میں مواد و طریقۂ تعلیم ہیں، ادری زبان کی اہمیت، زبان سیکھنے کے منازل، نصاب کا مفہوم اور وسائلِ تعلیم کے موضوعات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ اشارۂ سبق کے نمونے بھی شاملِ کتاب ہیں۔

عبدالباری غلام مصطفیٰ مومن (ولادت ۳ مارچ ۱۹۴۶ء) (ایم کام بی ایڈ ڈی سی ایم)

اہلحدیث مسلک پر چلتے ہیں اور جماعت اسلامی کا ساتھ دیتے ہیں اور عصرِ حاضر کے سائنسی دماغ یعنی کمپیوٹر سے کام لیتے ہیں، گذشتہ کئی برسوں سے مسجد قدیم (سمرو باغ درگاہ روڈ) میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں، فکری لحاظ سے سلفی ہیں ذہنی اعتبار سے تکنیکی، رئیس ہائی اسکول جونیئر کالج کے شعبۂ اقتصادیات میں لیکچرر ہیں اور شاد آدم شیخ پولی ٹیکنک میں کمپیوٹر انسٹرکٹر ہیں اور اسی کا

کلاس بھی چلاتے ہیں' اس سائنسی ایجاد پر آپ کی کتاب "کمپیوٹر اور ہم" کو اردو اکاڈمی مہاراشٹر نے انعام سے نوازا ہے' اسی فن پر دوسری اہم تصنیف "کمپیوٹر اور اس کی بیسک (بنیادی) زبان" اردو اکاڈمی مہاراشٹر کے مالی تعاون سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں شہریت پر جو نصابی کتاب مشترکہ طور پر تصنیف کی گئی اس کے تین مصنفین میں سے آپ بھی ایک ہیں' آپ کی علمی نسل محقق تعداد، انعامات، امتحانات کے شاندار نتائج اور دیگر اوصاف حمیدہ کا حساب آپ کا کمپیوٹر ہی بہتر دے سکتا ہے۔ میاں راجہ بیاں۔

مومن بلال احمد علی احمد (ولادت یکم مارچ ۱۹۵۱ء)

بلال احمد مومن کا ذکر ان کے عزیز دوست اور رفیق کار عبدالملک مومن کے ساتھ ہونا چاہئے اس لئے کہ ان دونوں میں جو قدر مشترک ہے وہ امیر خسرو دہلوی کی فارسی مثنوی "قران السعدین" کی یاد دلاتی ہے۔ دانلیت کے قلم سے ہم ان دونوں کے بارے میں خود "اپنا بیان" قارئین کرام کی عدالت میں دے چکے ہیں کہ کس طرح اس حقیر تصنیف کے تحریری سفر میں ان دونوں عزیزان گرامی نے ہمسفری کا حق ادا کیا۔

نفس الامر یہ ہے کہ ایسے مخلص اور بے لوث لوگوں کا تحفہ ہے ہمارے لئے یہ باعث فخر ہے کہ ۔۔
نئی نسلوں کے لہو میں ہے حرارت میری
میرے مرجانے پہ زندہ ہے وراثت میری

مومن بلال احمد صمدیہ ہائی اسکول کے صدر مدرس ہیں' اسکول میں طلبہ و طالبات کی مجموعی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ ہے اور بتدریج ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ بلال [illegible] سینئر بھیونڈی کی اڈوائزری (مشاورتی) کمیٹی کے رکن ہیں' پارچہ بافی [illegible] سے دلچسپی لینا تو برادری کے ہر فرد کی روایت بن گئی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی [illegible] احمد تدریسی اور انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے باوجود غیر درسی سرگرمیوں کے محرک [illegible] سیرت میلاد النبی کمیٹی کے سرگرم رکن ہیں' اور کئی سالوں سے کل ہند نعتیہ مشاعرے منعقد کرتے ہیں' علاقائی زبان مراٹھی کی لسانی اور سرکاری اہمیت کے پیش نظر اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے لئے صمدیہ ہائی اسکول اپنی نوعیت کا منفرد بین المدارس مراٹھی تقریری مقابلہ کا انعقاد کرتا ہے' گزشتہ سولہ برسوں سے یہ تقریری مقابلہ صدر مدرس بلال احمد مومن کے زیر اہتمام بڑی خوش اسلوبی

سے انجام پارہا ہے، شہر میں ادبی اور تہذیبی پروگراموں میں بلال احمد مومن کی شرکت اور اشتراک عمل و تعاون سے "روح بلالی" پیدا ہوجاتی ہے۔ طلبہ و طالبات میں ادبی ذوق، پاکیزہ جذبات اور صالح افکار و خیالات کی نموخود قافلہ سالار اور ہمسفران کی مساعی جمیلہ اور پاکیزہ کردار سے ہوتی ہے، مومن بلال احمد کا مثالی کردار اور ان جیسے اساتذہ کی صالحانہ سیرتوں نے صمدیہ ہائی اسکول کے ماحول کو پاکیزہ اور معطر بنا دیا ہے اور یہ ایک مثالی درسگاہ ہے جس کے لئے، علاوہ اساتذہ کے خود بھیونڈی ویدرس ایجوکیشن سوسائٹی قابل تحسین ہے۔ بلال احمد کے والد علی احمد، دادا عبد القادر اور پردادا منشی پیر علی علمی روایات کے حامل تھے۔

اقبال عثمان مومن (ولادت یکم جون ۱۹۵۳ء)

اقبال عثمان مومن کے دادا محمد یوسف وجہ محلہ کے سربرآوردہ اشخاص میں سے تھے اور محمد یونس سردار اور عبد الحق سردار کے بڑے دوست تھے، مہومان باورٹری کے عمر صاحبدین کے بھائی تھے۔ آپ کے چار صاحبزادے تھے، الیاس، محمد یعقوب، سلیمان اور عثمان۔ اقبال عثمان ایم۔ اے بی۔ ایڈ ہیں درس و تدریس کا سلسلہ صمدیہ ہائی اسکول سے لے کر بھیونڈی نظام پور نگر پالیکا کالج تک پھیلا ہوا ہے انجمن فروغ تعلیم کے سیکریٹری کی حیثیت سے آپ نے ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کو بےحد فروغ دیا، اسی کے زیر اہتمام سیرۃ النبیؐ کا سالانہ تقریری مقابلہ ہوتا ہے، اقبال عثمان ایک بہترین اور معلم تسلیم کئے جاتے ہیں طلبہ و طالبات کی ذہنی تربیت کے لیے مفت کوچنگ کلاسیز کا اہتمام کرتے ہیں، پیشہ ورانہ تعلیم کی رہنمائی کرنا، ایس ایس سی میں امتیازی طور پر کامیاب طالبعلموں کے لیے انعامات کی تقریب منعقد کرنا اور دیگر تعلیمی امور انجام دینا آپ کے محبوب مشاغل ہیں، ۱۹۷۲ء سے انقلاب اور اردو ٹائمز میں آپ کی کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔

اب سے گیارہ سال قبل ادبی و ثقافتی پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں، مومن لائبریری کے نائب سیکریٹری ہیں، ایک اردو انگریزی ڈکشنری مرتب کر رہے ہیں، اقبال نے ادبار کا زمانہ پایا تھا پھر محنت سے آج اقبال مند بن گئے ہیں۔

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

ہمارے ادیب اور شاعر اساتذہ

مومن مشتاق احمد صدیق (ولادت یکم مارچ ۱۹۴۴ء) ایم۔اے۔بی۔ایڈ

باندرہ جونیئر کالج میں شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اور اردو میں کئی کتابوں، افسانوں اور کہانیوں کے مصنف ہیں، انمول تحفہ (بچوں کی کہانی ہندی، اردو)، رت جگوں کا زوال؟ (افسانے سال اشاعت ۱۹۸۴)، سانپ، سفر اور صحرا (بچوں کی کہانیاں ۱۹۹۱ء)، زیر طبع یہ کتابیں ہیں:
تازہ خون میں ملی ہوئی مٹی (۱۹۹۳) ممی کب آئیں گی (بچوں کی کہانیاں)، دم گفتگو (دادا بارو شعراء سے انٹرویو) اور مسجد گہن (ناول) منظرِ عام پر آنے کی توقع ہے۔

مشتاق مومن ۱۹۷۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں کی اس پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں جس کا رشتہ نہ ماضی کی تاریخ سے ٹوٹا ہے اور نہ مستقبل سے راست جڑا ہوا ہے بلکہ یہ صرف حال کے متلاشی ہیں اور اپنے معصری معاشرے کی ذہنی نمائندگی کرتی ہے اسی لئے اس پیڑھی کے فنکاروں کی تخلیقات میں ماضی کے کربناک المیے کی تہہ داریاں بھی نظر آتی ہیں اور حال کی ناآسودگیوں کا نوحہ بھی سنائی دیتا ہے۔ یہ فنکار مستقبل کا کوئی خواب نہیں بُنتے مبادا یہ سراب ثابت ہو یا صرف خواب بن کر رہ جائے۔

مشتاق مومن کے افسانوں کے بارے میں بڑے بڑے لوگوں نے بھرپور اندازمیں اپنی رائے کیا ہے اور بجد سراہا ہے۔ ڈاکٹر رشید حسن خاں (نقاد۔نئی دہلی) پروفیسر وارث حسین علوی (نقاد احمد آباد) جیلانی بانو (مشہور ادیبہ۔حیدر آباد) باقر مہدی (نقاد۔بمبئی)، ڈاکٹر نالی جعفری (اردو پروفیسر بمبئی)، جوگندر پال (ادیب) حسن نعیم مرحوم (شاعر) اور ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی (بمبئی یونیورسٹی) جیسی شخصیتوں کے مقابلے میں اس حقیر کی رائے چنداں وقعت نہیں رکھتی پھر بھی میری رائے میں صداقت ضرور ہے یہ اور بات کہ میں نے فنکار مشتاق مومن کے فن کو قریب سے نہیں دیکھا ہے لیکن بھیونڈی کے مشتاق مومن کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

[illegible] بھیونڈی جیسے چیختے چلاتے شہر کے ہیں جہاں آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے سکوت [illegible] خاموشی کے فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور کرگھوں کی کھٹ کھٹ کے سوا [illegible]

۳۰

کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ مشتاق مومن کے ابا ہر بُنکر کی طرح صبح سویرے سے شام تک کرگھے پر ساڑی بُنتے، گھر کی عورتیں چرخہ چلاتیں، بڑے بھائی جو امرنگ محمد محسن نور سیٹھ کے یہاں باغ کی دار پین چلاتے تھے (دلی تنتے تھے) اور مشتاق محلے کے بچوں کے ساتھ اسکول سے چھوٹنے کے بعد مضافات کے کھیتوں میں غلیل لے کر چلے جاتے۔ شام میں بجری سے ابا ساڑی بیچ کر آتے تو چولہے کے سینے سے دھواں اٹھتا، میونسپلٹی کی بجلی کی قندیل کے نیچے بیٹھ کر مشتاق اپنا محبوب ساز بلبل ترنگ (بینجو) بجاتے اور وہ سُر بجاتے جس کی ترنگیں ان کی امنگیں بن گئیں۔

اس تاریخی لیکن بظاہر رومان انگیز تناظر میں بھیونڈی کے ہر مومن کی زندگی کے خطوط نظر آتے ہیں، بھیونڈی میں ۱۹۲۷ء کے بعد صنعتی انقلاب آیا جب پہلی مرتبہ ہاتھ کرگھے کی جگہ بجلی سے چلنے والے پاور لوم نے لیا، متمول کارخانہ داروں کے لئے یہ اپنی جلو میں خوشحالی لایا لیکن برادری کے غریب بُنکروں کے لئے یہ بہت قریب سے آنے والی مزدوری کی آواز تھی۔ مشتاق مومن آج بھی مومن ویلفیئر سوسائٹی بھیونڈی کی مالی استعانت کا احسان مانتے ہیں جس سے ایس۔ ایس۔ سی اور کالج تک تعلیم پائی، امنگوں اور حوصلوں نے بمبئی کی بانہوں میں پھینک دیا۔ نوکری کچھ ذریعۂ عزت نہیں تھی سو پشت سے پیشۂ آبا بافنگی تھا، ناآسودگیاں زندگی کی قبا میں پیوند لگاتی رہیں۔ پھر بھی ؎

اس شہر خرابی میں غم عشق کے مارے
زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے
(حبیب جالب)

مشتاق مومن کے افسانوں میں نہیں خطوط پر ان کے کرداروں کے خدوخال ابھرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ان کا بچپن کھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ پرانی یادوں کے تعاقب میں بہت دور چلے جاتے ہیں اور انہیں یادوں کو جوڑ جوڑ کر وہ ہر نسلے کا نقشی پیراہن تیار کرتے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ ان کی طرز حیات سے عبارت ہے یہی سب کچھ بکھرا بکھرا ان کی تخلیقات میں مرتب اور انہیں پڑھ کر ایسا لگتا ہے یہ ہماری اپنی شناخت ہے، وہ پہچان!!

گرد و غبار شہر میں پہچان کھو گئی
میں اس کو ڈھونڈتا ہوں جو میرے ہی گھر میں ہے

(خ۔ زماں انصاری)

عبدالملک سلیمان مومن (ولادت ۱۰ جون ۱۹۵۱ء) (بی ایس سی ایم اے)

عبدالملک سلیمان مومن کے تذکرے کی تمہید اٹھ چکی ہے اور تعارف بھی ہو چکا ہے لیکن اب تک ملے نہیں اس لیے کہ یہ تنہا کبھی نہیں ملینگے اور ایک جگہ نہیں مل پائینگے، محمدیہ ہائی اسکول میں پڑھاتے ہیں، ادب، سائنس، صنعت اور سیاست۔ ہر میدان میں جولانیاں دکھاتے ہیں، سائمیرا (بمبئی) سے پارچہ بافی کے لوازمات اور تکنیکی عملیات کی تعلیم حاصل کی آپ کی صلاحیتیں بے حد متنوع اور گوناگوں ہیں، پوری شخصیت قوس قزحی رنگوں میں ڈوبی ہوئی ہے، ٹمپرس ڈیموکریٹک فرنٹ کی کونسل کی رکنیت حاصل ہے تو دوسری طرف پولیس ایکشن کمیٹی میں بحیثیت جنرل سکریٹری خدمات انجام دیتے رہے۔ کانگریس کمیٹی (آئی) کی تعلیمی سیل کے جنرل سکریٹری کے عہدہ پر سرفراز رہے، مومن لائبریری (بنگال پورہ) کی مجلس عاملہ کے رکن رہے ۔۔۔ گویا عبدالملک ایک نام ہے بہت عام مگر ایک شخصیت ہے بڑی خاص!

ادب کے میدان کے یکہ تاز شہسوار ہیں بچوں کے لیے گیت نظمیں لکھتے ہیں، اسٹیج پر ڈرامہ نگار کا کردار ادا کرتے ہیں، اسکول کے زمانے ہی سے ڈرامے کا شوق تھا، اپنے قلم کی مسیحائی سے کئی کردار ابھارے، "آج کا مسیحا" آپ کا ڈرامہ روٹری کلب کے ڈرامائی مقابلہ میں اول آیا، برجستگی کا ملکہ شعر گوئی میں بھی ہے اور نثر نگاری میں بھی زمانۂ طالبعلمی میں برجستہ اور قلم برداشتہ مضمون نویسی کے بمبئی میں ہوتے والے مقابلہ میں شیلڈ حاصل کیا، خود اپنے وطن "بھیونڈی کل ۔۔۔ آج اور کل" کے زیر عنوان ان کا تحریر کردہ مضمون تمام مضامین پر سبقت لے گیا اور انعام کا مستحق ٹھہر گیا۔

تالیف و تصنیف کا قلم ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا، منچلے ادیب ہیں اور سنجیدہ فکر شاعر "عروس سخن جس کے گیسو ابھی تلک منت پذیر شانہ ہیں اس کے سامنے آئینہ لے بیٹھے تذکرہ شعرائے بھیونڈی" کی آئینہ سازی کی پھر "تانے بانے" کی تصنیف میں الجھ گئے، یہ کتاب اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہو رہی ہے۔ حوصلہ مند ادیب ہیں، آئندہ منظر عام پر آنے والی کتابیں ہیں: غنچے (بچوں کے لیے نظمیں ڈرامے) اور سائنس میں مسلمانوں کا حصہ ۔۔۔ اپنے کیمیا (کیمسٹری) اور طبیعات (فزکس) میں بی ایس سی کیا ہے۔ عبدالملک سلیمان جیسے حوصلہ مند جوانوں کے لیے شاعر مشرق نے کہا ہے:

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لیے تنگ

اس جواں سال ادیب و شاعر کی کاوشِ مسلسل کا "آئینہ — تذکرۂ شعرائے بھیونڈی" کی تقریبِ اجرا انجمن فروغِ تعلیم بھیونڈی اور اجرا کمیٹی نے یکم مئی ۱۹۹۲ء کو اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ منائی، صدارت اور اجرا کا فریضہ عالی جناب [illegible] نے انجام دیا، تاثرات بیان کرنے والوں میں شبیر راہی، مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری، عبدالسمیع بوبیرے (صبح امید)، پرنسپل محمد اسحٰق خضر مالیگانوی اور پروفیسر محمد رفیع انصاری تھے، نظامت نور الحسن نور اور اقبال عثمان مومن نے کی۔ مہمانانِ کرام میں رؤسائے شہر اور اربابِ ذوق شامل تھے۔ ایڈوکیٹ عبدالرشید طاہر، مولانا امجد رضا انصاری، ڈاکٹر محمود الحسن، محمد عمر شفیق، عبدالمجید سیٹھ، عبدالخالق فقیہ، مظہر آغا، جانِ عالم رہبر، غلام نبی مومن، نثار مبین ماسٹر، اعجاز محمود میاں مقری۔

محمد رفیع انصاری (ولادت ۱۹۵۱ء)

بھیونڈی کے حلقۂ اربابِ ذوق اور زمرۂ طلبہ و طالبات میں محمد رفیع انصاری کا نام اردو زبان کی آبرو اور ادب کی اشاعت کا ضامن ہے، حکمت و ادب کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کے دادا انور محمد حکیم ہمارے غریب خانہ پر آیا کرتے تھے والدہ محترمہ (غفرلہا) ان کی حکمت کی بڑی قائل تھیں والد عبدالخالق غیرت انصاری (۱۹۲۵ء - ۱۹۷۶ء) کا شمار شعرائے متقدمین میں ہوتا ہے، خاندانی اوصاف کے سارے عناصر محمد رفیع میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، بڑی حکمت سے ادبی جلسوں کی نظامت اور خطابت کرتے ہیں، اشعار کا دریا بہا دیتے ہیں بڑے موزوں اور چھپے ہوئے شعر پڑھتے ہیں، شعر گوئی کا ملکہ ہے جو شعر فہمی کا صدقہ ہے، ادبی ذوق کا تہذیبی ورثہ دلپذیر رنگ رکھتا ہے۔

بھیونڈی کے جوان ابھرتے ہوئے ادبی فنکاروں میں محمد رفیع انصاری کی اٹھان بڑے غضب کی ہے، مضامین اور افسانے بمبئی، دہلی اور مقامی رسائل، ہفتہ وار اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "خمیازہ" چھپ چکا ہے، ہم نے پوچھا نہیں یہ خمیازہ کس کلفت کا "بدلہ" ہے یا فارسی [illegible] جو حسن کی شوخی و عشوہ و ادا ہے سو

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

بہر حال یہ خمیازہ۔ محمد رفیع انصاری کے حسنِ قلم کی انگڑائی ہے اور ان کا فن مرکز کی طرف مائل بہ پرواز ہے، جیسا کہ اُن کی ادبی اٹھان اور علمی اڑان سے اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کو ابھی "قصر سلطانی کے گنبد" سے پرے ایوانِ ادب میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کرنا ہے، کسی کالجوں میں اردو پڑھاتے تھے لیکن ابھی تک محمد رفیع انصاری اپنے والوں کی ناقدری کی وجہ سے اپنا استحقاق اور مرتبہ حاصل نہیں کر سکے ہیں۔

محمد رفیع انصاری خوش طبع ہیں جب بھی ملتے ہیں تبسم زیرِ لب کا نظارہ درمیان میں رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کوئی موزوں شعر پڑھنے جا رہے ہیں۔ آپ کی اہلیہ یاسمین محمد رفیع صمدیہ پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔

رضیہ حکیم

ناول نگاری اردو ادب کا بڑا مشکل فن ہے، عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰-۱۹۲۶ء) سے لے کر قرۃ العین حیدر تک ناول نگاری نے ایک طویل سفر طے کیا ہے، ہر دور کا ایک فکری نظام تھا اور معاشرت بھی اور علامتی اظہار کا ایک بدلتا ہوا طریقہ بھی تھا، لیکن ہر معاشرتی ناول اپنے دور کی معاشرتی ہیئت کے خاکے میں اپنے کرداروں کے خد و خال ابھارتا رہا۔ نازلی بیگم۔ اے آر خاتون اور ڈھیر ساری ناول نگار خواتین کا ایوانِ ادب میں جمگھٹا موجود ہے۔

بھیونڈی کی اور غالباً برادری کی پہلی ناول نگار خاتون رضیہ حکیم نے اپنے ناول "شمع جلتی رہی" کا پہلا چراغ یہاں کی محفلِ ادب میں روشن کیا ہے جس کا اجرا ۸ اپریل ۱۹۹۶ء کو راقم کے ہاتھوں ہوا، چیئرمین اجرا کمیٹی شہید الزماں انصاری تھے، ڈاکٹر یونس اگاسکر مہمانِ خصوصی تھے۔

اس ناول کے کردار ہمارے ماحول سے تعلق رکھتے ہیں اور معاشرتی مسائل کے الجھاؤ میں گرفتار نظر آتے ہیں، متوسط طبقہ کے گھرانوں کے جھروکوں کو کھول کر "درونِ خانہ" کا تماشا دکھلایا جاتا ہے۔ رضیہ حکیم معلمہ ہیں، ان کی یہ پہلی کوشش ہے اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔

نورالحسن نور (ولادت ۱۹۵۵) ابن غلام مرتضیٰ طیب

کریم بخش جو نورالحسن کے دادا تھے غدر کے ہنگامے میں نقل وطن کرکے بھیونڈی آئے۔ ان کے صاحبزادے طیب سیٹھ نے بڑا نام اور مال کمایا محنت اور حوصلے کے زینے سے بام کمال پر پہنچے اور بڑی جائداد منقولہ و غیر منقولہ کے مالک بنے۔

نورالحسن نے ثروت و خوشحالی کا دور بھی دیکھا ہے اور عسرت و ادبار کا مزہ بھی چکھا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاج میں اعتدال ہے اور طبیعت میں روانی اور چہرہ نورانی ہے اسی مناسبت سے اسم با مسمیٰ ہیں یعنی "نورٌ علیٰ نور"۔ نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو، بھیونڈی دیورس ہائی اسکول میں مدرسی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اور اپنے معاصر اساتذۂ گرامی کی طرح 'زمرہ نیکوان در حلقہ سعادتمندان' میں شمار ہوتے ہیں اور بزم شعر و سخن کے کم سن شاعر اور کم گو سخن طراز ہیں۔ راقم کے اعزاز میں زیر اہتمام بھیونڈی دیورس ایجوکیشن سوسائٹی بنگال پورہ نے بتاریخ ۲۹ ستمبر ۱۹۹۱ء بروز اتوار کو جو تہنیتی جلسہ منعقد کیا تھا اس موقع پر انہوں نے ایک منظوم سپاسنامہ پڑھا تھا جس کا دعائیہ مقطع یہ ہے:

یہ سلسلہ اے نور رہے قائم و دائم
اس منفرد انعام کا آغاز مبارک

ہم اس کے مصرع اولیٰ کو ان کی شاعری کے حق میں دعا کی صورت میں لوٹا رہے ہیں۔

چالیسواں باب

بھیونڈی کی بزم شعر و سخن اور مومن شعرائے کرام

اسلام آباد بھیونڈی فارسی اور اردو زبانوں کے فروغ کے زمانۂ ابتدا سے مرکز علم و ادب رہا ہے، جب دکن میں صوفی شعراء کے وجد انگیز کلام کی گونج کوکن کی زمردیں وادیوں میں سنائی دینے لگی تو یہاں بھی نظورۂ سخن حریم ناز میں انگڑائیاں لے کر بیدار ہوگئی۔ وہ نوائطی جو فارسی اور عربی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے، حافظؔ و سعدیؔ کے بوستانوں اور گلستانوں سے گل چینی کرتے تھے اردو کی نشوونما میں بھی حصہ لینے لگے۔ بمبئی میں دکھنی اردو کے اولین شعراء کوکنی حضرات تھے، شری وردھن (جنجیرہ) کے حضرت محی الدین تاجر تیرؔ اس علاقے کے قدیم شاعر تھے جو قدیم دکنی اردو میں شعر کہتے تھے۔ "قصۂ تمیم انصاری" (۱۲۲۴/۱۸۰۹) غالباً آپ ہی کی مثنوی ہے۔ نہری، مقبہ اور مرگھے خاندانوں میں کئی شاعر پیدا ہوئے ہیں۔

بھیونڈی میں بھی برادری کے آباد ہونے سے پہلے شعر و ادب کا چرچا تھا اور جب شمالی ہند سے ترکِ وطن اور تلاشِ معاش میں مختلف شہروں سے تازہ واردان آکر بسنے لگے تو شعر و سخن کی محفلیں سجنے لگیں۔ روایت علی صاحب خطیب آزادؔ کا نام سرفہرست آتا ہے، بیرونی شعراء میں بقائیؔ بیگ، نور محمد عابدؔ دھولیوی، فصاحت رتیؔ لکھنوی، محمد حسین خاکؔ جلال پوری، عطاء الرحمٰن عطاؔ، سید ابوطاہر داؤد اور احمد عباس ناک پرتوی کے نام ملتے ہیں۔ نسیمؔ پوری، منشی محمد الیاس آفاقؔ اور ان کے تلامذہ کے معاصر تھے۔ شوقؔ نیگاری، طالبؔ ملیگانوی، منشی اخترؔ بریلوی، منیرؔ الہ آبادی اور تجمل حسین جلالپوری وغیرہ سے بھیونڈی کے شعراء نے ربط و ضبط قائم کر رکھا تھا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جب کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام اینگلو اردو ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا تو بیرونی اساتذہ جن میں ایک خاصی تعداد شمالی ہند کے باشندوں کی تھی اپنے ساتھ دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دہلی کی شعری روایت

اور معانی کی سوغات لانے لگے اس طرح بھیونڈی میں اردو شاعری کا ایک نیا خمیر اٹھا اور ایک نیا لب و لہجہ اپنایا جانے لگا۔

دور اول کے شعراء کے کچھ نمونے "مشاعرہ بزم شعر و ادب بھیونڈی" کے دو "گلدستوں"[1] میں ادارۂ تحریر (عبدالمجید شاداب، عبدالرحیم مومن، ابوبکر اکبر علی (حضرات) نے بڑی کاوش سے جمع کردیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کلام میں میر، غالب و اقبال کی پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں، ہم نے "اسلام آباد بھیونڈی کا تاریخی سفر" کے باب میں چند متقدمین شعراء کا ذکر کیا ہے متاخرین شعراء کا تذکرہ بھیونڈی کے ایک قابل اور ہونہار شاعر اور ادیب عبدالملک مومن نے ابھی حال ہی میں (اکتوبر ۱۹۹۱ء) میں مرتب کیا ہے۔ اور ان میں سے جو باقیات صالحات میں ان کا اور کچھ نئے شعراء کا تذکرہ ہمارا مدعا ہے۔

قوم کا دانشور طبقہ اپنی تہذیب و ثقافت کا ترجمان، علمبردار اور نمائندہ ہوتا ہے۔ اور یہی طبقہ ہے جو ماضی اور اسلاف کے تہذیبی و ثقافتی سرمائے اور میراث کا امین اور ضامن ہوتا ہے۔ اس طبقہ میں کئی قسم، مزاج اور ذوق کے لوگ ہوتے ہیں، اس میں علمائے حق اور حاملین علوم دین اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں، ان کا ایک منفرد وجود ہوتا ہے، دماغ سوختگانِ مدارس میں اہلِ قلم و اہلِ فن بھی ہوتے ہیں اور انہیں کے ساتھ اربابِ ذوق "ساز جمن خیال کا ساب" کئے بیٹھے رہتے ہیں ــ یہی ہمارے شعراء حضرات ہیں۔

ادب اور شعر و سخن کی بات چل نکلی ہے تو یہ بات جس کا فسانہ ذکر میں آرہا ہے بہت ناگوار خاطر ہوگی شاید سن کے کہ اس زرخیز زمین میں درہم و دینار کی خوب کاشت ہوتی ہے، شعر و سخن کا بازار گرم رہتا ہے، لیکن کتنے ہی شاعر پیدا ہوئے جن کی آوازیں گنبد بے در میں گونج کر ڈوب گئیں نہ مشاہیر شعراء کے مرقع میں ان کے نقوش ابھرے اور نہ کل ہند مشاعروں میں ان کی آوازیں سنائی دیں ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

بھیونڈی میں طرحی مشاعروں کا آغاز بمبئی کے رسالہ "ترقیٔ سخن" کے گلدستی مشاعروں کی تقلید میں ہوا اور ان مشاعروں کے علاوہ بزم سے شہر اور اربابِ ذوق شعری نشستیں

---

[1] گلدستہ بزم شعر و ادب بھیونڈی نمبر پہلا شمارہ منعقدہ ۲۵ ستمبر ۹۰۲ اور دوسرا منعقدہ ۱۲ نومبر ۱۹۰۲

بھی منعقد کرتے تھے، شادی کے موقع پر زشاہ میاں کا سہرا تشبیہات اور استعارات کی کلیوں سے گوندھا جاتا تھا اور دوست احباب مٹی بن جاتے کہ ع دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا۔ محرم کے عشرہ میں مسالمہ بھی ہوتا تھا، مقری شاہ کی درگاہ پر ۱۹۲۹ء میں ایک 'محرمی مشاعرہ' ہوا جس کا مصرعۂ طرح تھا ع کس بلا کی کاٹ تھی شبیر کی تلواروں میں۔

ایک اور مصرعۂ طرح عالم جوش جنوں میں یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام بن گیا ع

پھر گلا یا جائے رہا قیس کی زنجیر کا۔ ذاکر حسین مومن ذاکر کی گرہ حاصل مشاعرہ تھی ؎

گیسوئے لیلیٰ کی پہلے ڈالی جائے ہتھکڑی
پھر گلا یا جائے رہا قیس کی زنجیر کا

ساکنانِ قیصر باغ (تھانہ روڈ) نے ۱۹۳۵ء میں عید میلاد النبیؐ کے جلوس کا آغاز کیا اور شب میں کل ہند نعتیہ مشاعرہ منعقد کرنے کا اہتمام کرنے لگے ان سالانہ مشاعروں میں جن شعراء حضرات نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، نظر بیگانوی، مولانا مہیم دھولیوی، منظر پرتاپ گڑھی، انجم الفاری، تن نظامی، مجروح سلطان پوری، ساغر نظامی، سلامت خیرآبادی، عبد اللہ ممر منصور فریدی، طاہر بستوی، کیف بھوپالی، سجاد مدراسی، تشنہ لکھنوی، خلیق برہانپوری، خضر راشدی برہانپوری، کامل چاند پوری، مظفر شاہجہاں پوری، کامل تشنیقی جرجیوسی، سکندر علی وجد وغیرہ۔

ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے بھی ایک سال شرکت کی تھی اور سیرۃ الطیبہؐ پر تقریر کی تھی۔

بعض مشاعروں کے انعقاد کی غرض و غایت ادبی تقاضوں سے زیادہ کسی رفاہی اور فلاحی منصوبے کے لئے فنڈ اکٹھا کرنا ہوتی تھی، بھیونڈی کے بنگال پورہ میں سوناپور قبرستان کی چہار دیواری کی تعمیر کے لئے ایک یادگار تاریخی مشاعرہ ہوا تھا، اس مشاعرے میں جن ممتاز شعراء نے اپنا اپنا کلام پیش کیا ان میں سے چند ممتاز نام یہ ہیں: رئیس، متغزین جگر مرادآبادی، مخشب جارچوی، شہاب قزلباش اور نظر بیگانوی، مشاعرہ کا اہتمام محمد کے ذوق نے کیا تھا، غلام قاسم سبحان بچو کی رہنمائی میں ان کے حسن انتظام سے یہ مشاعرہ بڑا کامیاب رہا۔

پیر محمد عزتاب (ولادت ۱۹۱۰) شہر کے کہنہ مشق شعراء میں سے تھے آپ کے ساتھ محمد اسحٰق بیتاب (۱۹۰۹-۱۹۷۰) اور عبدالرشید رشید (۱۹۱۴-۱۹۹۰) کا شمار اول دور کے

شعرائے بھیونڈی میں ہوتا ہے۔ غرقاب صاحب کو شعر و سخن سے بڑی گہری وابستگی تھی ہمہ وقت بحرِ فکر میں غرق رہتے اور شعر موزوں کرتے رہتے، تلامذہ کا حلقہ بھی کبھی کبھی ساتھ رہتا تھا اور ان کے قافلہ کے سالار تھے، پیر محمد غرقاب کی عظیم ادبی خدمات کے پیش نظر ان کے تلامذہ مداحین اور احباب نے ۱۹۵۹ء میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر جشن غرقاب منایا جو بھیونڈی کی ادبی تاریخ کے سفر میں پہلا سنگ میل ثابت ہوا۔ منشی عبدالاحد طیب، منشی محمد ابراہیم مجتبیٰ، حاجی غلام قاسم اشرفی اور محمد عمر ستار کی کوششوں سے یہ جشن بیحد کامیاب رہا۔

ادارہ صبح ادب

مذکورہ جشن کے بعد ۱۹۶۰ء میں غرقاب اور ان کے ارشد تلامذہ اور ادب نواز دوستوں نے ادارہ صبح ادب کی بنیاد رکھی۔ محرکین میں حیرت مالیگانوی، ظہور الوری، محمد عمر شفق، راحم جونپوری، محمد ایوب افق، محمد حسین میرزا، زین العابدین ذرہ، عبدالحمید نقادم، محمد یونس، حاجی عبدالرب اور محمد ایوب بے پر قابلِ ذکر ہیں۔

> "ادارہ کا قیام عمل میں آتے ہی اراکین کے حوصلے بلند ہو گئے اس طرح تقریباً تین سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے صبح ادب کا یہ کارواں اپنی ابتدائی منزلیں طے کرتا ہوا خورشید سحر کی، مذاقِ ادب پر جلوہ گر ہو کر اپنی روشنی سرزمین بھیونڈی پر پھیلانے لگا۔" [1]

۱۹۶۰ء میں ادارے کو شہر کے بزرگ شاعر محمد یونس "یونس الہ آبادی" کی سرپرستی حاصل ہوئی، ابتدائی دور میں محمد عمر شفق جو ایک کہنہ مشق شاعر ہیں صدر کی حیثیت سے اور راحم جونپوری ظہور الوری اور شاکر ادیبی سیکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتے ہے ادارہ کے زیر اہتمام ادبی و امتزازی نشستیں عام طرحی و غیر طرحی مشاعرے ہوتے تھے پروفیسر مقبول حسن نیاری (ایم۔ اے) کی صدارت میں ایک مشاعرہ ہوا جس میں ڈاکٹر مرتضیٰ لکھنوی، آغا خلش کاشمیری، کیف برتابگڈھی، علامہ حاذق حیفوری، ثاقب جھانسوی، نسیم جھانسوی،

---

[1] منتخب مجموعۂ کلام۔ مرحوم محمد ایوب نہجی۔ منجانب ادارہ "صبح ادب" بھیونڈی ۸۷، اسلام پورہ بھیونڈی ضلع تھانہ ۱۹۰۲ ص ۱۲۰

ساحر انصاری اور عاقل دھولپوری نے شرکت کی۔ ۲۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو جشنِ غالب کے سلسلے میں ایک عام جلسہ و مشاعرہ آزاد میدان میں ادیب مالیگانوی کی صدارت میں منعقد ہوا اس کا افتتاح شبیر احمد راہی نے کیا۔

جشنِ جمہوریہ کے سلسلے میں ایک عام مشاعرہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء کو تاڑلی تالاب میونسپل اسکول میں منعقد ہوا جس کی صدارت کہنہ مشق شاعر آتش الہ آبادی نے کی۔ ثاقب جھانسوی کی صدارت میں ایک عام مشاعرہ "عید ملن" کے لیے کیا گیا، ایک یادگار مشاعرہ ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوا جس میں تمام شعرائے شہر نے شرکت کر کے اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیا۔ ۱۹۷۲ء میں جشنِ جمہوریہ کے سالانہ موقع پر مشاعرہ کی صدارت محمد ایوب فہمی نے کی، جاوید فریدی نے افتتاح کیا۔

صبحِ ادب کی مجلسِ عاملہ کے عہدہ داران اور اراکین میں حالات اور وقت کے پیشِ نظر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں لیکن جو پُر خلوص ادب نواز افراد تھے وہ برابر صبحِ ادب کے روشن اور تابناک پہلو بنے رہے۔ نثار احمد نثار الہ آبادی (صدر)، عبدالکریم خفی (نائب صدر) ظہیر ایورلی (جنرل سکریٹری)، ظہیر ملّا (معاون سکریٹری)۔ اراکین مجلس عاملہ کے ممتاز اسمائے گرامی اس طرح ہیں: حمید بن رشید جمیل پرتاب گڈھی، نسیم الہ آبادی، خادم بورڈوی، محمد ایوب افق، سلیم فیض آبادی، رفیق احمد قریشی، راہی عارفی، ادریس سردار، انصار الہ آبادی، محمد عمر شفق، مکیش جالنوی اور آتش الہ آبادی۔ ۱۹۷۴ء کی مجلس عاملہ میں کم و بیش یہی افراد شامل تھے۔ خمار المیزی جنرل سکریٹری تھے۔ محمد عمر شفق ادارۂ صبحِ ادب کے روحِ رواں رہے ہیں، شبیر احمد راہی کی معاونت شاملِ حال رہی ہے اور مصطفیٰ سردار پیش پیش رہے ہیں۔ مولانا ابوالمظفر حسن ندوی اور عبدالواحد کے اعزاز میں مخصوص شعری نشستیں ہوئی ہیں اور بھیونڈی کی دو محترم ہستیوں محمد اسحاق بیتاب اور الحاج غلام رسول آغا کے انتقال پر تعزیتی جلسے بھی ہوئے ادارہ صبحِ ادب طلوع ہونے کے زمانے ہی سے اپنے جنوں میں شعر و سخن کی تابناک کرنیں لیے قصبے کی ادبی فضا میں اُجالا پھیلا رہا ہے اور چند وہ شاعر جو شاید گمنامی کے اندھیرے میں بھولی بسری یاد بن کر رہ جاتے ادارۂ صبحِ ادب ان کے کلام کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کر رہا ہے، ایوب فہمی مرحوم کا منتخب مجموعۂ کلام ایک مثالی اور ثبوت ہے۔

بزمِ مسادات

بزمِ مسادات کی بنیاد ۱۹۶۶ء میں ڈالی گئی، محمد یعقوب انصاری اس بزم کے سرپرست تھے اور مرتضیٰ حسین رنگین صدر تھے، اس سے وابستہ یہ حضرات تھے عبدالرحمٰن انصاری معصوم انصاری، قمر پرتاب گڈھی، راز الہ آبادی اور آتش الہ آبادی، ۱۹۸۲ء میں مولانا حسرت موہانی اور منشی پریم چند پر کل ہند سیمینار منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے کی تھی۔ اس میں شمیم طارق اور سبھاشنی علی نے شرکت کی تھی۔ بربنی کالج کے (مرحوم) پرنسپل غلام احمد مہمانِ خصوصی تھے اسی کے زیرِ اہتمام مہاراشٹر سائز نگ کپا ؤنڈ (نظام پورہ) میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ قمر پرتاب گڈھی اور آتش الہ آبادی کا جشن منایا گیا۔ یہ دونوں حضرات تاحیات اسی بزم سے وابستہ رہے۔ اسی طرح شہر کے مشہور ترقی پسند شاعر زبیڈ عابد کی یاد میں ایک جلسہ اور مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ بزم مسادات ہر سال ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کرتی ہے۔ بزم سے دائمی وابستگی رکھنے والے یہ شعرا حضرات تھے: معصوم پرتاب گڈھی، مرتضیٰ رنگین، ایوب صابر، آتش الہ آبادی اور قمر پرتاب گڈھی۔

بزمِ شعر و ادب

اس بزم کے قیام کا مقصد تفرد رکھتا ہے، ادبی سرگرمیوں کے علاوہ بزم نے شعرا کے کلام کے تحفظ اور اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے تاکہ ان کے کلام کا منتخب گلدستہ چھاپ کر انہیں گلدستۂ طاقِ نسیاں بننے سے محفوظ رکھ سکیں، ایک شاعر کے خیال کا دوسرے شاعر کے خیال سے ٹکرانے کے امکانات ہو سکتے ہیں لیکن مختلف الخیال شعرا کا ٹکراؤ ادبی فضا میں تہلکہ ضرور مچا سکتا ہے تمام ادب نواز حضرات کو ایک مقام پر اتفاق و اتحاد و ریگانگت کی فضا میں اکٹھا کرنے کا مقصد بزم شعر و ادب کا نصب العین ہے یہی اس کی تاسیس کا بنیادی پتھر ہے جو ۲۵ رستمبر ۱۹۷۲ء کو ایک غیر طرحی مشاعرہ میں رکھا گیا جس کی صدارت شہر کے مشہور سیاست شبیر احمد راہی نے کی، شہر کے تمام شعرا اور ادب نواز حضرات نے بھرپور تعاون کیا اور مختلف الخیال شعرا نے نہ صرف شرکت کی بلکہ مکمل اشتراک

کیا۔ اس اقدام کی سراہنا شہر کے خواص و عوام نے کی اور خصوصاً سیٹھ غلام رسول ہدایت اللہ، نثار رجوالا آبادی، ڈاکٹر محمود حسین، عبدالحق مومن اور ابراہیم درعو صاحبان نے عملی تعاون بھی دیا، بزمِ شعر و ادب نے اس غیر طرحی مشاعرے میں حصہ لینے والے شعراء کی غزلیں چھاپ رہی۔

دوسرا طرحی مشاعرہ ۱۲ر نومبر ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوا ریاض خیرآبادی کا مصرعہ "زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا" دیا گیا تھا۔ اس کی روداد اور شرکت کرنے والے شعراء کی طرحی غزلیں بھی بزم نے شائع کر دیں اور اس میں شہر کے بزرگ اور قادر الکلام شاعر غلام رسول آغا (مرحوم) (ولادت ۱۸۸۹) اور بھیمڑی کے ابوالشعراء حکیم علی خطیب آزاد کے ترکات شعری بھی شامل ہیں۔ اس کے ادارۂ تحریر میں شہر کے تین مشہور شاعروں کے نام شامل ہیں: ابوبکر اکبر علی، عبدالرحیم مومن اور عبدالمجید شاداب۔

ان دونوں مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرائے کرام کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

ابوبکر اکبر علی، اختر راشدی برہانپوری، محمد ایوب اُفق، اقبال مقو، امین بھارتی، اُنس الہ آبادی، انور فاروقی، حسن صحرائی، حمید ابن رشید، خادم بوروڈوی، خمار المیتری، محمد سلیم فیض آبادی، مومن عبدالرحیم۔ خفی عبدالکریم، ذرہ زین العابدین، ذوق اعظمی، حکیم رازی ادیبی پوری، راہی شبیر احمد ایم۔ اے، رحمت الہ آبادی، روشن علی روشنی اندوری، رونق پرتاپگڈھی، عبدالقیوم نازاں، راہی عارفی، رہبر مومن جان عالم ایم۔ اے، ساحر پرتاپگڈھی، شاداب عبدالمجید، شاکر ادیبی منزدوی، شاعر گیارہ گانوی، شفق محمد عمر، ظہور ایوبی، زبیر عابد شہابی، مومن عبدالرحیم، عرفان پیر محمد، فیضی نظام پوری، عبرت انصاری، فلک عبدالرحمٰن راشدی برہانپوری، فنکار الہ آبادی، قمر الہ آبادی، قمر پرتاپگڈھی، کامل محمد یوسف، یگانوی، مطلق آفاقی، مازن پرتاپگڈھی، مضطر اعظمی، محشر مقصود احمد بارہ بنکوی، معصوم انصاری پرتاپگڈھی، مکش جالنوی، نسیم الہ آبادی، نظر محمد شبیر، محمود وسیم حیدرآبادی، ڈاکٹر ایم ایچ بشر، نثار الہ آبادی، محمد ایوب فہمی، محمد ابراہیم صوفی، حاجی عندلیب، راحت انصاری پرتاپگڈھی۔

بھیونڈی میں کئی اور ادبی انجمنیں سرگرم عمل ہیں ان میں بزم یاران ادب اور بزم تخلیق ادب کی نشستیں ہوتی رہتی ہیں اس قسم کی ایک کامیاب شعری نشست ۱۶؍ جولائی ۹۳ء کو کانپور سے آئے ہوئے مہمان شاعر ناسخ انصاری صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت شہر کے کہنہ مشق شاعر محمد عمر شفق نے کی۔ مدیر صبح و شام، عبدالجلیل انصاری نے نظامت کے فرائض انجام دیئے، افتتاح مولانا اسلم (ایم۔ اے علیگ) اور بزم تخلیق ادب کے اغراض و مقاصد سے سکریٹری محمد شاداب برہانپوری نے سامعین کو روشناس کرایا، مہمانان خصوصی تھے: منشی محبوب خان (صدر بھیونڈی مسلم لیگ) ڈاکٹر ریحان انصاری (ترتیب کار صبح و شام) نور محمد مقادم (کنویز آل انڈیا پاورلوم تحفظ کمیٹی) علیم الدین خان (صدر انجمن فروغ علم و فن)۔ اس میں شرکت کرنے والے حضرات یہ تھے۔ خالد حباب، انیس اعظمی، شبیر احمد راہی، جمیل انصاری گونڈوی، صابر گلشن آبادی، مولانا محمد اسلم کانپوری، نبی سہسرامی، ظریف انصاری راز کانپوری، ایوب آتش، ایوب شفق ناگپوری، عبدالکریم خفی، انیس اعظمی ایم۔ اے بنات، عبدالرحمٰن ثاقب برہانپوری، اکملی گیاوی، احمد سیوانی، یوسف صاحب یوسف ظہور الوی، ساز الہ آبادی، اعظم اعظمی، شکیل احمد شکیل اور اقبال اختر جگپوری۔

پوسٹ آفس ریٹرس (چیریٹیبل) ایسوسی ایشن جو کئی زبانوں کا ایک سنگم ہے ہر سال امدادی مشاعرہ منعقد کرتی ہے، ساغر اعظمی، نور جلال پوری، ملک زادہ منظور احمد، راحت اندوری، منظر بھوپالی وغیرہ شریک ہو چکے ہیں۔

بزم مدینہ کی سرگرمیاں عبدالحفیظ مومن کے دم سے تھیں۔ درگاہ روڈ پر بزم علم و فن برائے علمی، ادبی اور تعلیمی مذاکرات اور اجتماعات منعقد کرتی ہے ۱۹۸۲ء میں اراکین بزم نے صدر بزم غلام نبی مومن کی رہنمائی میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی مذہبی خدمات پر ایک سیمینار کا اہتمام کیا تھا۔ بزم یارانِ ادب کی ادبی سرگرمیاں آجکل عروج پر ہیں عبدالجلیل انصاری (مدیر صبح و شام) اس کے سرپرست اور اقبال اکبر آئل والے اس کے فعال سیکریٹری ہیں۔

کسی اعلیٰ علمی کانفرنس کے انعقاد کا علم راقم کو نہیں ہے البتہ ۱۹۸۱ء میں اقبال صدی کے سلسلے میں بھیونڈی میں بڑی شاندار تقریبات ہوئی تھیں جس میں بیرونی

مقالہ نگار اور شعراء حضرات مدعو کئے گئے تھے، پروفیسر غلام دستگیر شہاب کی سرکردگی میں پٹنہ سے ڈاکٹر سرشٹ ناتھ کنی، ان اختر اور دیگر شعراء بھیونڈی تشریف لائے تھے، عروس البلاد بمبئی سے علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، عزیز قیسی، ظ۔ انصاری اور جموں و کشمیر سے جگن ناتھ آزاد نے شرکت کی تھی۔

مرحوم شاعر زیڈ عابد شہابی ان تقریبات کے روح رواں تھے۔

ہم اور مشاعرے

ہم ان چند مشاعروں کا ذکر کر رہے ہیں جن میں راقم الحروف نے کبھی صدر اور کبھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ یوم رشید کے موقع پر کوڑگیٹ میں ۵، نومبر ۱۹۶۱ء کو جو عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔

راقم کی یادوں کے قدیم سرائے میں بچپن کی ایک یاد سب سے زیادہ تابناک ہے اور سنسنی خیز۔ جب ہم تک بھگ گیارہ۔ بارہ سال کے تھے کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں ایک مشاعرے میں جس کا انعقاد نور محمد حکیم کے مکان درگاہ روڈ سے ملحقہ ایک چبوترے پر کیا گیا تھا ہمیں بھی مدعو کیا گیا۔ اس زمانے میں ہمیں مصوری کا بڑا شوق تھا جس طرح واہب العطایا نے ہمیں بہت ساری نعمتوں سے نواز کر مکلّف بنایا ہے کہ ہم اپنی زبان ہر لحظہ "شکر نعمتہائے" اور چنداں کہ نعمت ہای او" کے ورد سے تر رکھیں، اس نے ہمیں نقاشی کی خداداد صلاحیت بھی بخشی تھی، ہماری بنائی ہوئی تصویروں کو دی مسلم پبلک لائبریری نظام پورہ میں اپنے عہد کے پہلے ترقی پسند اور روشن فکر شاعر تنظیف نظام پوری نے دیکھا تو بے حد تعریف کی، اس مشاعرے میں جنھوں نے حاضرین مشاعرہ کے سامنے ان تصویروں کی نمائش کی ہمیں "ننھا مصور" کا خطاب دیا اور روپہلی تمغے سے نوازا، یہ ہمارے بچپن کا سب سے ہیجان انگیز واقعہ تھا اور غالباً سب سے پہلا موقع ہے کہ ہم عوام کے سامنے پیش کئے گئے۔ یہ اعزاز ہماری زندگی میں ملنے والے اعزازات کی "بسم اللہ" تھی۔

سنہ ۱۹۶۱ء کا ایک شاداب مشاعرہ

بھیونڈی میں متمول خاندان دینی، علمی اور ادبی اقدار کا حامل رہا ہے، تمسک بالحدیث میں

تفرد اور اولیت رکھتا ہے۔ اسی گھرانے کے ایک بزرگ عبدالمجید شاد اب بھی شاعر اور شاعر نواز۔
شعرا اور ادبا کے قدر دان اور بڑے مخلص انسان تھے۔ ذوقِ شعری گھٹی میں پڑی ہوئی
تھی آسمانِ سخن پر کچھ دیر چمکے اور پھر ڈوب گئے" خورشید ولی کوکبِ مستقبل بود"۔

انہوں نے بھیونڈی کے چندہ شعرا کا ایک طرحی مشاعرہ یکم دسمبر ۱۹۶۱ کو منعقد کیا تھا،
ہمیں بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا گیا تھا اور ہم سے مصرعۂ طرح پر ایک "خوبصورت غزل" کہنے
کی فرمائش کی گئی تھی، مصرعِ طرح تھا "ظلمتیں کم تو ہوئیں برق کے لہرانے سے"

ان کا دعوتی رقعہ پہلی دستاویز ہے جو ہمارے شاعر ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے،
اسماعیل کالج کے زمانۂ طالبعلمی میں جب ہم آشفتہ سر تھے تو سر میں شاعری کا سودا سما گیا تھا۔
کالج کی رومان پرور فضا اور رنگین "شب و روز و ماہ و سال" میں کسی "ایک شخص" کے
تصور سے رعنائیٔ خیال" کا پیدا ہو جانا فطری عمل ہے۔ خصوصاً وہ طلبہ جو سماجی پسماندگی کے
کنویں سے نکل کر بمبئی کی رنگین باہوں میں آجاتے ہیں وہ ہر ایک سادہ و پرکار سے پیمانِ
وفا باندھ لیتے ہیں، عنفوانِ شباب کی محبتوں کے نقوش زندگی کے ساحل پر ریت کے گھروندوں
سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، یہ اس عہد کی باتیں ہیں جب آتش جوان رہتا ہے جب شاعری
کا ذوق اور شعر گوئی کا ذوق رہتا ہے وہ خود وجدان کی خاطر کسی "اس" کو روایتی محبوبہ
بنا لیتا ہے کبھی کسی سروِ رواں کے قد و گیسو میں الجھ گئے، یا کسی شمشاد قامت کے سائے
میں بیٹھ گئے، جب عشق سے طبیعت کو زیست کا مزہ ملنے لگتا ہے تو روایتی عاشق روایتی
شاعر بھی بن جاتا ہے تب غمِ جاناں کو دلہن بنا کر الفاظ و معانی کے زیورات سے سجانے لگتا ہے کبھی
رخساروں پر استعاروں کا غازہ مل دیا اور کبھی اس کی محبوب آنکھوں میں تشبیہوں کا کاجل لگا دیا۔

ہم پر بھی ایسا وقت گذر چکا ہے۔ لندن کے دورانِ قیام میں ہم نے جو غزلیں کہیں وہ
نقوش اور سویرا میں چھپی تھیں۔ واپسی کے بعد جب مسائلِ حیات سے دوچار ہوئے تو آجکل
بلٹز اور انقلاب وغیرہ کے ادبی صفحات میں ہم نظر آنے لگے ۔ لیکن جب تاریخ کے سناٹوں
میں گونجنے والی آوازوں سے ہمارے کان آشنا ہوئے تو ہم نے ترکِ ادب کر دیا۔ پھر جب
پچھلے پندرہ سولہ برسوں سے محراب و منبر سے اٹھنے والی صدائیں اور منارۂ توحید سے گونجنے
والی ندائیں ہمارے ذہن و دل کے ایمانی تاروں پر ضرب دینے لگیں تو ہم نے تلاشِ حق
میں اپنی روح کی تہوں میں اس شاعری کو پایا جو خدائے بزرگ و برتر کے حضور پیدا ہوتی ہے۔

اس تمہید کے پس منظر میں ہم اپنے اُس مقالے سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں جو ہم نے اس مشاعرے میں پڑھا تھا تاکہ اس درمیانی عرصے میں ڈاکٹر مومن — اور بندۂ مومن کے بیچ خیالات و افکار اور عقائد میں جو تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں ان کا اندازہ ہو جائے اور اردو شاعری کے رجحان اور لب و لہجہ نے کون سا نیا طرز اختیار کیا ہے اس سے گوش آشنا ہو جائیں۔ ہمارے مقالے کا عنوان تھا "شاعری کا سانچہ یا سینچے کی شاعری" —

"احباب نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اردو شاعری کی آبرو یعنی صنف غزل کے بارے میں کچھ لکھوں، جب میں نے لکھنے کے لیے "چل مرے خامہ بسم اللہ" کہہ کر قلم اٹھایا تو یکایک مشینوں کے شور و ہنگامہ میں میرا خامہ ڈوب گیا۔ آشفتگی نے طرز قلم کو یا مجبول کر دیا...... میں سوچ میں پڑ گیا کہ اگر اردو شاعری کی اس آبرو کے بارے میں کچھ نہ لکھوں تو اپنی آبرو جاتی ہے اور اگر ایسے غیر شاعرانہ ماحول میں غزل جیسی نازک اور حسین صنف پر خامہ آزمائی کروں تو اس کی آبرو خطرے میں پڑ جاتی ہے ..... مصرعۂ طرح "پر ظلمتیں کم تو ہوئیں برق کے لہرانے سے" غزل کہنے کے لیے تخلیقی تحریک اور عرفان حاصل کرنے کے لیے ارد گرد کے بام و در پر نظروں کی کمندیں پھینکیں اور تخیل کا دامن پھیلایا، شاید ذوق نظر کی تسکین کا سامان پیدا ہو جائے، اور ہر ایک گل و لالہ پر خیال دوڑایا، شاید کسی رنگین چلمن کے پیچھے آنچل کا پھاڑ، رخ روشن کی شفق اور رنگین پیراہنوں کی قوس قزح دیکھ سکوں تاکہ جب کسی جنت نظر کے نظارے سے میری نظروں میں نور بھر جائے اور دل میں شمع عرفان روشن ہو جائے تو میں پھر طبع آزمائی کر سکوں — مگر افسوس کہ نہ تو کوئی برق چمکی، اور نہ ذہن کی ظلمتیں کم ہوئیں، نہ تو رنگین پیراہن نظر آیا اور نہ چلمن رنگین ہوتی دکھائی دی۔ نظریں ذوق لمس، سلک اور شیفون کے طاقوں سے الجھ کر واپس آگئیں۔ سارنگ کی چمنیوں سے نکلتے ہوئے بل کھاتے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کو دیکھ کر نہ محبوب کی زلف شکن در شکن کی اسیری یاد آئی اور نہ الجھے ہوئے تانے بانوں کو دیکھ کر گیسوئے جاناں کے لیے کوئی تشبیہ سوجھی اور نہ تو شب فراق کی طوالت کا خیال آیا — ...."

ادب اور سماج کے گہرے رشتے اور اکتساب وجد و عرفان کے کائناتی ذرائع کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے اس مقالہ کا جزو پیش کیا۔

"جب شاعر کے حساس دل میں کائنات کی گونج سنائی دینے لگتی ہے تو اس کا ہر شعر چاہے 'ہائے گل' پکارے یا 'ہائے دل' — الف لیلیٰ کے اس خوبصورت شہزادے کا وہ قیمتی آنسو بن جاتا ہے جو اس کی آنکھوں سے نکل کر موتیوں میں ڈھل جاتا ہے اور ہماری تمنا ہے کہ ہر غزل گو شاعر الف لیلہ کا ایسا ہی خوبصورت شہزادہ بن جائے جس کی چشم بصیرت سے ایسے ہی آبدار موتی ڈھلیں جن کی تلاش اقلیم سخن کی اس حسین شہزادی — یعنی غزل کو ہے۔"

جب سماج کسی عبوری دور سے گزرتا ہے تو ادبی رجحانات، ادبی تقاضے اور شعری اقدار بھی اپنا پیمانہ بدلنے لگتے ہیں اور بہتر سے بہتر میلانات ادب میں جگہ پاتے ہیں، روایتیں اسی طرح بنتی ہیں، چراغ سے چراغ اسی طرح جلتے ہیں، ادب نئی قدروں کو لے کر آگے بڑھتا ہے، کوئی فنکار تنہا کچھ نہیں، آج کے شاعر کا رشتہ حافظ و سعدی سے ملتا ہے، غالب، اقبال اور فیض کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں آپ اور ہم تنہا اکائیاں نہیں ہیں بلکہ آگے بڑھتی ہوئی زندگی تاریخی تسلسل، ماضی اور مستقبل کے بیچ کی کڑیاں ہیں ہم سب ایک ہی کتاب زندگی کے مختلف اوراق ہیں [اور اس کتاب کے اختتام تک پہنچنے سے پہلے اس مہلت میں ہم اپنا رشتہ خدا سے قائم کرلیں] [اضافہ شدہ]

اس تاریخی مشاعرے میں مدعو شعراء حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:
ابراہیم ہوش، وجد، یقین بھارتی، ثاقب، محسن سرائی، راہی، سہیل، طارق، قائد، عبداللہ رانی، عبدالرحیم نصرت، نجمی، قیصی، متقی، نہالی اور وسیم صاحبان۔

صدارت کے لئے حضرت ظریف نظام پوری کا نام تھا، مہمانِ خصوصی ڈاکٹر مومن محی الدین تھے، مریز قیسی صاحب شرکت کے لئے بلال مدعو اور سلیم سوداگر عرف رومی (خواجہ احمد عباس کے منا نیم) کے ساتھ تشریف لائے تھے، صدارت اور نظامت انہوں نے ہی کی تھی۔

پونا سٹوڈنٹس چیریٹیبل سوسائٹی کی جانب سے اتوار ۱۰ مئی ۱۹۶۴ء کو غریب طلبہ کی امداد کے سلسلے میں ایک طرحی مشاعرہ محمد حسین میاں جی کے نئے مکان، علی باغ، نزد نواب سلک ملز کاردلی رستہ بھیمڑی میں منعقد ہوا، صدارت: ڈاکٹر مومن محی الدین۔
افتتاح: احمد ملک ایم۔ اے مصرعہ طرح تھا "آغازِ محبت میں ناداں انجام سے کیوں گھبراتا ہے"

ہمدرد کا مشاعرہ — ڈاکٹر حکیم عبدالسلام انصاری، جو ہمدرد دواخانہ (قیصر باغ تھانہ روڈ) کے مالک بھتے بڑے مستعلیق حکیم تھے "ہمدرد کی ادویات تقسیم انعامات کے سلسلے میں ایک غیر طرحی مشاعرہ ۱۲ دسمبر بروز سنیچر ۱۹۶۴ء کو زیر صدارت جناب تمنار بارہ بنکوی منعقد ہوا، افتتاح ڈاکٹر مومن محی الدین نے کیا، استقبالیہ تقریر کے لیے غلام محمد مومن بی۔ اے کو مدعو کیا گیا تھا اور تقسیم انعامات عبدالرحیم بی۔ اے (چیئرمین بھیونڈی نظام پور میونسپلٹی) کے ہاتھوں انجام پائی۔ غلام محمد مومن مالک جنرل اسٹورس (بازار پیٹھ) اس مشاعرے کے مہتمم تھے۔

بزمِ ادب رئیس ہائی اسکول کا مشاعرہ

رئیس ہائی اسکول بھیونڈی کی نو تشکیل شدہ بزمِ ادب کا افتتاح صاحب تصنیف بزانے ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کو کیا تھا، عتیق الرحمٰن (بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ) سیکریٹری اور ڈاکٹر ناصر احمد مومن جوائنٹ سیکریٹری تھے۔ اسی بزمِ ادب کے زیر اہتمام اتوار ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو ایک غیر طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ مشہور و ممتاز بیرونی شعراء حضرات نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ سکندر علی وجد نے صدارت کے فرائض انجام دیے، انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"مشاعرے تفریح کا آلہ بن گئے ہیں ہمیں ایسے مشاعروں سے احتراز کرنا چاہیے اور مقصدی مشاعروں میں شرکت کرنی چاہیے۔"

مشاعرہ کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر مومن محی الدین نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

"بھیونڈی میں دو قسم کی گرم بازاری رہتی ہے ایک کپڑے کی دوسری ادب کی۔ ان گرم بازاری میں دستکاروں کا ہاتھ ہے جو کاریگر بھی ہیں اور فنکار بھی، یہاں کے رہنے والے دن رات کے بیشتر حصے میں تانے بانے سلجھاتے رہتے ہیں اور ان سلجھے گیسوئے اردو کو سنوارنے لگتے ہیں، بھیونڈی میں بہت اچھے کہنے والے ہیں لیکن ان فنکاروں کے کلام میں یاسیت کی پرچھائیاں ڈولتی ہیں اور کرب ملتا ہے اور محرومیت اور محزونیت کا اندھیرا ہے — لیکن ان کے دلوں میں دردمندی کا امام جل رہا ہے، ہمارے درمیان ایسے شاعر بھی ہیں جو روایتی شاعری کرتے ہیں، ساتھ

چلاتے ہیں اور سانچے کی شاعری کرتے ہیں" (انقلاب کے نمائندہ خصوصی ہارون رشید کے ذریعے۔ انقلاب ۵ جنوری ۱۹۶۵ء)

"مشاعرے میں حسب ذیل ۲۵ شعراء نے بالترتیب اپنا اپنا کلام سنایا اور داد حاصل کی"۔

عبدالسلام (بھیونڈی)، حیرت مالیگانوی، راتم بھیونڈی، بیکش بھیونڈی، ظہیر بھیونڈی، حسن صوابی بھیونڈی، نہال بھیونڈی، نہی بھیونڈی، جان محمد ببتبر، نازاں بھیونڈی، غیرت بھیونڈی، بیتاب بھیونڈی، ایس بھارتی، فیضی نظام پوری، شاکر اندوری، غرقاب بھیونڈی، سراج بنارسی، شاداب دعو، ضیا ہالی، لطفی آفاقی بھیونڈی، وسیم حیدرآبادی، نذیر عابد، ظریف نظام پوری، شفیق عباس فیضی، عزیز جاوید، احمد عقیل پونوی، یوسف ناظم، مظفر شاہجہاں پوری، اختر راہی، عزیز قیسی، کیفی اعظمی، سردار جعفری اور جناب سکندر علی وجد"۔

"مشاعرہ کافی سردی کے باوجود پُر لطف و پُر کیف رہا، کثیر تعداد میں بھیونڈی کی باذوق خواتین اور حضرات نے شرکت کی"۔

"مشاعرہ میں حسب ذیل معزز حاضرین نے شرکت کی اور شعراء کی آخر وقت تک حوصلہ افزائی کرتے رہے: جناب محمد ایوب پنجابی، جناب محمد یوسف سرجار، شاہد علی خان، جناب ذاکر حسین (کلکٹو سیٹھ)، جناب خلیق احمد قریشی، جناب غلام محمد مومن، جناب غلام رسول ہدایت اللہ، جناب مصطفیٰ احمد، جناب ظفر الاسلام، جناب منتظر انصاری، جناب بشیر بھوپالی پرنسپل، جناب شوقی، محمد یٰسین سرجار، جناب عبدالاحد خطیب، جناب محمد یوسف رمضان اور جناب حاجی محمد حسن ولی محمد"

(انقلاب۔ ایضاً)

<u>مومن کلب ویلفیئر سینٹر</u> (محلہ باڑہ بھیونڈی)۔ محلہ کے نوجوانوں نے قائم کیا تھا کچھ دنوں تک یہ فلاحی ادارہ بڑا فعال رہا۔ مستحق طلبہ کی امداد کے لیے پروگرام کیے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں تقسیم انعامات کے موقع پر ۷ مارچ ۱۹۶۵ء کو یک طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ راقم الحروف کو مشاعرے کا افتتاح کرنے کے لیے اراکین بزم نے مدعو کیا تھا۔

<u>عام مشاعرہ</u> ۱۹۶۲ء کے میونسپلٹی کے ہنگامی انتخاب کے بعد منتخب گروہ نے جو میدا

سمیتی کے نام سے ابھرا تھا جشنِ فتح منانے کی غرض سے ایک شاندار مشاعرہ شبیر احمد راہی (صدر جلسہ یہ) کے اعزاز میں منعقد کیا" صدارت کا قرعۂ فال جناب مین دیوانہ زدنہ' افتتاح مدیر انقلاب عبدالحمید انصاری نے کیا اور نظامت عبدالکریم خفی نے کی۔ مہمان شعرا میں حسرت جے پوری، بقار بدایونی، صابرہ سرور خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے مقامی شعرا میں یہ شعرا حضرات حاضر تھے: محمد اسحٰق بیتاب، راقم جونپوری، لطفی آفاقی، ظریف نظام پوری، شاکر ادیبی، عبدالمجید دھولپوری۔

یہ مشاعرہ ابابیلانِ کُہسار محلہ کی جانب سے محمد یوسف چھوٹے کے مکان کے سامنے اسی محلہ میں منعقد کیا گیا تھا۔

ہم سخن فہم ہیں......

شعر فہمی اور سخن سنجی — ادب نوازی کا ایک دلنواز پہلو ہے، شاعر جس ذہنی کیفیت اور جذبات کے بہاؤ یا دباؤ میں آکر شعر کہتا ہے اس کی معنوی تہہ داری تک رسائی حاصل کرنا اور احساس کی نبض شناسی کرنا ایک خداداد وصف اور دیبی دین ہے، مولانا حسرت موہانی سے ان کے ایک شعر کے شانِ نزول کے بارے میں کسی نے پوچھا تو آپ نے کہا مجھے یہ یاد نہیں یہ شعر میں نے کس کیفیت کے عالم میں کہا تھا تم پر اس شعر کو پڑھ کر جو اثر ہوا ہے وہی اثر مجھ پر بھی ہوا تھا۔

مشاعروں کا انعقاد اور اس کی کامیابی کا دار و مدار ارباب ذوق اور ادب نواز حضرات پر ہے بھیونڈی جیسے مرکز علم و ادب میں شاعروں سے زیادہ شاعر نواز حضرات موجود ہیں، ان میں اپنے وقت کے مشہور ادب پرور اور شاعر نواز حضرت غلام رسول بہ یت اللہ تھے ان کا دولت کدہ 'ایوان ادب' بنا ہوا تھا ان کے بعد ان کے دونوں صاحبزادوں نصیر احمد مومن سیٹھ اور شکیل احمد مومن سیٹھ نے والد بزرگوار کی سنت کو قائم رکھا ہے۔

بدرالدین انصاری (ولادت ۱۹۴۳) بھیونڈی کے 'تازہ واردانِ بساطِ دل' میں سے ہیں لیکن ہر ادبی جلسہ اور مشاعرے کی بہار بن گئے ہیں اکثر مشاعروں میں بحیثیت ایک ادب نواز بلائے جاتے ہیں، کبھی صدارت کے لئے اور کبھی خاص مہمان کی صورت بزم محمدی (کھجور پورہ) کے صدر ہیں۔

نثار احمد حاجی رمضان نثار سکنرہ (سکندرہ) ضلع الہ آباد میں سنہ ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔ اور پھر ہجرت کرکے آئے اور نثار بھیونڈی بن گئے فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، شاعر بھی ہیں اور نغمہ نگار اور گیت کار بھی ہیں آپ نے نوشاد میوزیکل سرکل کی بنیاد ڈالی ہے، اس صنعتی شہر کے چیختے چلاتے ماحول میں سرگم کے سُر بھی ڈھونڈتے ہیں۔ اوم پرکاش اگروال بی اسکول (سابق نیشنل انگلش ہائی اسکول) کے بانیان میں سے ہیں، بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ انہوں نے سیوک پاور لوم سوسائٹی بھی قائم کی ہے۔

ڈاکٹر ابرار احمد (ماہر امراض دنداں) اب ثقافتی اور ادبی جلسوں میں شریک ہوکر اپنی تقریروں سے "دنداں شکن" جواب دینے لگے ہیں۔

رؤسائے شہر عموماً شعر و ادب کے مربی تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن تاجر طبقہ کے علاوہ مختلف تعلیمی اور علمی ادارے بھی شعر و سخن کی محفلیں سجاتے ہیں، محبانِ ادب و شعر و سخن کی بھیونڈی شہر میں کبھی کال نہیں رہا — اور نہ شعرائے کرام کا قحط پڑا، تاجر طبقہ کے سیٹھ حضرات، اساتذہ جن میں شعراء کا وجود سب سے زیادہ ہے اور سماجی کارکنان ادبی و شعری جلسوں اور تقریبات کو رونق بخشتے ہیں، تازہ واردانِ بساطِ سخن، میں حاجی عبدالحمید انصاری مربیِ علم و ادب ہیں اور تعلیمی خدمات میں بھی نمایاں رہتے ہیں، عبدالرحیم انصاری کے بارے میں ایک مقامی ہفتہ وار لکھتا ہے۔

"آپ محسنِ علم و ادب ہیں جن کی علمی [و] ادبی خدمتوں اور قربانیوں سے بھیونڈی ارباب علم و ادب واقف بھی اور مستفیض بھی ہیں۔"

محمد ایوب حیدر علی انصاری اور ڈاکٹر نثار انصاری (سیکریٹری نیو نیشنل اردو ہائی سکول شانتی نگر) کی بھی ادبی سرگرمیوں سے شہر کے اربابِ ذوق کی تعداد میں خوشگوار اضافہ ہوا ہے

بھیونڈی کی اردو صحافت

بھیونڈی کا پہلا اردو اخبار یا گلدستۂ سخن کے بارے میں تیقن سے کچھ کہا نہیں جا سکتا اور نہ اس بارے میں تاریخی شواہد مہیا ہیں اور نہ آثار باقی ہیں، ہماری یاد میں پہلا ہفت روزہ تقسیم ہند سے پہلے 'سپاہی'، شعاع تیمور رشخ نعمان روڈ سے نکالا گیا، اس کے پہلے شمارے میں کسعو، اول پر بھیونڈی کی سب سے مشہور ہستی خانصاحب حاجی عبدالصمد سیٹھ

صاحب کے اکلوتے صاحبزادے محمد یونس رئیس اعظم بھیونڈی کی تصویر چھاپی گئی تھی، غالباً
۱۹۴۱-۴۲ء کا سال تھا اس کے ایک 'ایشو' میں راقم الحروف کا ایک جذباتی مضمون 'میدانِ عمل'
کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مالی مجبوریوں کے محاذ پر سپاہی شکست کھا گیا، پھر اردو بہ کے دو
خالص تجارتی صحافیوں نے 'دھنک' نام سے ایک پرچہ نکال کر کچھ دنوں تک ادبی قوسِ
قزح کی رنگینیاں پھیلائیں، مگر جو بہت جلد پھیکی پڑ گئیں۔ فیضی نظام پوری نے ایک
ادبی ماہنامہ "نقوش" کے نام سے جاری کیا، اس میں راقم السطور کا ایک ڈرامہ "ٹوٹے تارے
جال" (۱۹۶۱ء) کے ایک شمارے میں شائع ہوا، 'نقوش' صرف یادوں میں نقش ہو کر
رہ گیا ہے۔

وقتاً فوقتاً دستی رسالے بھی نکلتے رہے ہیں، ایک دستی جریدہ "عصری کاوش" کے نام
سے ہر تین مہینے بعد نکلتا رہا، اس کے مدیران اور معاونین میں اقبال مومن کے ساتھ
اسعد حسین قریشی، مظہر سلیم، حفیظ الکبیر پرواز، اکبر عابد، قاسم ندیم وغیرہ کے نام گرامی
شامل تھے رسالہ تکمیل پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔

ہفت روزہ 'صبح و شام'

بھیونڈی کے ہفت روزہ 'صبح و شام' نے دو سال کے ماہ و سال کی گردش کے بعد تیسرے
سال میں قدم رکھا ہے۔ بھیونڈی کا یہ پہلا مقامی ہفت روزہ اخبار ہے جسے دو سال مسلسل
شائع ہونے کا اعزاز حاصل ہے، ۲۴ر جولائی ۱۹۹۳ء کو اس کی دوسری سالگرہ منائی
گئی۔ صدارت کے لئے راقم السطور کے نام کا اعلان ہوا تھا لیکن حضورِ آپ آتے تھے مگر
کوئی عناں گیر بھی تھا، اب صرف محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے والا معاملہ نصیب ہے۔

"صبح و شام نے جن تھوڑی مدت میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے
اپنی حق گوئی اور بیباکی سے اس نے لوگوں کے دلوں میں وہ جگہ بنائی ہے
جو اس کی صحافتی دیانتداری کا بین ثبوت ہے۔"

یہ صبح و شام کے صرف ایک قاری عبدالباری انصاری (کھنڈوپاڑہ) کا ہی تاثر نہیں
بلکہ عام رائے بھی انہیں کی تائید میں ہے جیسا کہ ایک اور صاحب لکھتے ہیں۔

"ہم صبح و شام کے جملہ اسٹاف اور خاص طور سے مدیر عبدالجلیل انصاری صاحب کو مبارکباد

پیش کرتے ہیں کہ یہ انہیں کی بے باک، ایماندارانہ اور تجربہ کار صحافت کا نتیجہ ہے کہ پرچہ ابھی زندہ ہے ورنہ بھیونڈی میں متعدد اخبار آئے اور جلد ہی حالات کا شکار ہو گئے دیا کئے گئے ہیں۔[1]

صبح و شام کے لئے ہماری بھی دعا ہے کہ ؎

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوئے و مشکوئے صحن و منظر و بام (غالب)

عبد الجلیل عبد الاحد انصاری (ولادت ۲ر اکتوبر ۱۹۵۲ء)

تعلیم کم تجربہ زیادہ اور ادبی و شعری ذوق وافر — بزم یاران ادب کے سرپرست ہیں۔ شعر و سخن کی مجلسوں میں جلوہ فگن رہتے ہیں، سیاسی میدان کے مرد انگن ہیں، جنتا دل کی مقامی شاخ کے کارگذار صدر رہ چکے ہیں، مہاراشٹر ویلفیئر سوسائٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے ۱۹۸۵ء سے تعلیمی خدمت انجام دے رہے ہیں، صحافتی زندگی میں ابھی تک ثابت قدمی اور استقلال سے صبح و شام گزر رہے ہیں، اور اس ہفت روزہ اخبار کو نکال کر عبد الجلیل نے بھیونڈی کے صبح و شام کے واقعات ہی کو نہیں — ادبی، تجارتی، صنعتی اور سیاسی سرگرمیوں کی بھی نشر و اشاعت کر رہے ہیں۔

صبح و شام کے معاونین میں شہر کا نوجوان فنکار طبقہ شامل ہے، پروفیسر محمد رفیع انصاری 'بزاب ادب' کا ادبی صفحہ مرتب کرتے ہیں، قمر النساء انصاری شہر کے بزرگ الحاج عبد المجید دفتری کی ہونہار اور دیندار صاحبزادی "نگینہ" کے عنوان سے خواتین کا صفحہ مرتب کرتی ہیں، قمر النساء انصاری ایک صحیح العقیدہ مذہبی ذہن رکھتی ہیں اور دینی مکتب فکر کی پروردہ ہیں اسی لئے یہ صفحہ خواتین کے لئے روحانی و مذہبی افادیت کا حامل رہتا ہے۔

ڈاکٹر ریحان انصاری کا "صحت نامہ" بڑا شفابخش ہوتا ہے، آپ صبح و شام کے تزئین کار بھی ہیں مومن محمد یعقوب (جناب) مصور بھی ہیں اور عکاس بھی، نظام الدین مومن خوشنویس ہیں اور اپنی کتابت سے صبح و شام کو جلی و خفی بناتے ہیں بلال ناصر بھی کاتب

[1] بھیونڈی کے صبح و شام (ہفت روزہ)۔ سالگرہ اسپیشل، جلد ۲ شمارہ ۵۱ و ۵۲، جمعہ ۳ر جولائی ۱۹۹۲ء

ہیں، اقبال عثمان مومن بچوں کے لئے خصوصی صفحہ اور ادبی انعامی معمہ ترتیب دیتے ہیں،
دیگر معاونین میں مختار احمد مومن، مقبول شیخ اور عبدالحق مومن قابل ذکر ہیں، ادریس
انصاری صبح وشام کے خصوصی نمائندے اور بہترین معاون ہیں جن کی متعدد تفتیشی
رپورٹوں نے تہلکہ مچادیا، ایم۔ اے۔ پنڈت، حنیف رمضان اور ادریس انجم نامہ نگار
ہیں، عبدالرحمٰن انصاری جو عبدالجلیل انصاری کے بڑے بھائی ہیں اخبار کی طباعت و
اشاعت کے نگراں ہیں، صبح وشام کے ادارے کو عمائدین شہر کی اعانت اور ان کا تعاون
بھی حاصل ہے۔ نصیر احمد (بیچو سیٹھ)، وغیرہ کے اسمار گرامی
خاص ہیں۔

بھیونڈی سے ایک اور ہفتہ وار اخبار 'مخدوم' بھی نکلتا ہے یہ بھی تیزی سے ترقی
کر رہا ہے۔

تصنیف و تالیف

تریاقِ خیال کے بعد برسوں تک شاعروں کے منتخب کلام کے کسی گلدستے کی مہک نہیں
اٹھی۔ یوں مختلف ہنگامی مسائل پر رسائل چھپتے رہے ہیں، محمد عمر صاحب دین (میزبان
بازڈی) نے اپنے خرچ سے اکبر علی ہیڈ ماسٹر کا لکھا ہوا ایک مفید رسالہ جرعس اور
بدعات کے بارے میں تھا چھپوایا تھا نشاط شاہدوی کا مجموعۂ کلام "امربیل" ۱۹۵۲ء
میں ان کے بھانجے محمد خلیل اسماعیل خوشحال نے شائع کیا تھا۔ اس میں نشاط کے دوستوں
کی تقریظات بھی شامل ہیں، 'میرا ہمدم میرا دوست'، ساحر لدھیانوی کے صادق جذبات
کا آئینہ دار ہے، اس مضمون میں ساحر نے پیشنگوئی کی تھی کہ اردو شاعری کو عنقریب ایک
ایسا فنکار ملنے والا ہے جس کا کلام جمالیت اور مقصدیت کا ایک ندرا در خوشگوار امتزاج
لئے ہوگا ایسا امتزاج جو رنگین بھی ہوگا اور سنگین بھی" — لیکن ؎

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

اور احباب نشاط کی جواں مرگی کا ماتم کرتے رہے "گیا تیرا ہجر تا جو نہ مرتا کوئی دن اور"
امربیل میں شبیر احمد حکیم نے "ہمارا ہمدم" لکھ کر حق دوستی ادا کیا ہے اور صمامیں یوسف
کالج جوگیشوری کے طالبعلم مومن محی الدین نے ان کے مشہور شعر ؎

یاد میری سنبھال کر رکھنا   میر کیا میں رہا نہ رہا

کو عنوان بنا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کیفی اعظمی نے "حیف در چشم زدن" میں اس کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور ادب کے لئے ایک نقصان عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

شہپارہ ہی کے علیم شہاودی کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ 'خاکِ آرزو' ستمبر ۱۹۷۵ء میں بزم ادب شہپارہ نے شائع کیا تھا۔ علیم شہاودی کا بھیونڈی سے کیا تعلق ہے، شاید ڈاکٹر شمیم احمد مومن (بھیونڈی) ہی بتلا سکتے ہیں جنہوں نے 'خاکِ آرزو' کا ٹائٹل بنایا ہے اور جو واجہ محلہ بھیونڈی میں آزاد پرنٹنگ پریس میں چھپا ہے۔

ادارہ ترسیل ادب بھیونڈی نے مرحوم محمد ایوب فہمی کا منتخب مجموعۂ کلام ۱۹۷۴ء میں شائع کی تھی.... "میرا ہمدم میرا دوست" میں زبیدہ عابد نے فہمی کے کلام کے محاسن پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔

بھیونڈی کے قادر الکلام و کہنہ مشق شاعر عبدالکریم خفی بن منشی عبدالاحد کے صاحبزادے، در صبح و شام کے مدیر عبدالجلیل انصاری کے برادر بزرگ ہیں۔ شاعری میں ایک منفرد انداز بیان رکھتے ہیں۔ ان کے مجموعۂ کلام 'نشانِ منزل' کی اشاعت و طباعت کے سلسلے میں ان کے مخلص دوستوں اور احباب نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا تھا ان میں عبدالرحیم انصاری، شبیر احمد راہی، شفیق احمد شیخ (بی۔کام)، ابوبکر جذب، محمد اسحاق خضر (ہیڈ ماسٹر تہذیب ہائی اسکول)، مایۂ ناز عبدالغنی سیٹھ مشین والے۔ بلال احمد مومن ہیڈ ماسٹر ویورس ہائی اسکول (بھیونڈی)، محمد یسین عثمان مومن، نثار احمد محمد یوسف مومن، ملک سلیمان مومن، عبدالکریم نزہت رنگ، مسعود احمد قول، عبدالعزیز انصاری، مصطفی آفاقی اور محمد عمر شفیق صاحبان کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ 'نشانِ منزل' کے پیش لفظ مضامین خفی کے ادبی سفر کے سنگِ میل ہیں۔ بھیونڈی کی مشہور ادبی، علمی اور سیاسی شخصیت شبیر احمد راہی (ایم۔اے) نے عبدالکریم خفی اور ان کی شاعری پر عالمانہ تقریظ لکھی ہے۔ جناب ابوبکر اکبر علی نے جن کی شعر فہمی، شعر گوئی اور ادبی خدمات کا اعتراف پورا شہر کرتا ہے۔ خفی سب کی نظر میں اپنی ادبی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ جرار ملک سکریٹری شفیق احمد شیخ (بی کام) تھے، اراکین انجمن فروغ تعلیم بھیونڈی کا پرخلوص تعاون بھی خفی صاحب کو حاصل تھا۔ انصاری محمد اسحاق خضر جو بھیونڈی کی ایک مشہور ادبی شخصیت ہیں "خطِ جلی" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر خفی کی شاعری

معنوی رموز و نکات کو اجاگر کیا ہے۔ مولانا محمد رضا انصاری دہشتی کامل، ادیب کامل، جنرل سیکریٹری الفاروق بھیونڈی نے جو ایک اسلامی ذہن کے مفکر ہیں خفی کی ابتدائی نظم ' حمد باری' پر ایمان افروز روشنی ڈالی ہے۔

ظفرالاسلام ظفر بنارس کے تھے مگر اپنوں میں سے تھے بڑے قابل احترم شخص تھے ان کا مجموعۂ کلام 'کچھ ورق' جب شائع ہوا تو رئیس ہائی اسکول کے فاروقی جمنیزیم میں اس کا اجرا ہوا جس میں راقم السطور نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام کی تحقیقی کتاب نوح ناروی۔ حیات اور شاعری منظر عام پر آچکی ہے۔

مشتاق مومن کی شہرت کو رُت جگوں کا زوال' نے عروج پر پہنچایا' یہ ان کے بیدار کُن افسانوں کا مجموعہ ہے' مومن جان محمد رہبر کا مجموعۂ کلام 'امتزاج نو' ان کے شعری مزاج کا ترجمان بن کر شائع ہو چکا ہے۔ محمد رفیع انصاری کا خمیازہ بھی 'نگر' ایاں لے کر شہرت کے آسمان کی طرف مائل پرواز ہے۔ رضیہ حکیم کا ناول "شمع جلتی رہی" ایوان ادب کا پہلا چراغ تھا جسے ایک خاتون نے روشن کیا' اسی طرح ایک اور ابھرتے ہوئے شاعر اور ادیب جن سے اہلِ ذوق کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں عبدالملک مومن ہیں۔ انہوں نے شعرائے بھیونڈی کا تذکرہ "آئینہ" کے نام سے مرتب کر کے یہاں کی ادبی تاریخ کا ایک طرح سے پہلا باب لکھ دیا ہے، آئینہ۔ دوسرے دور کے متاخرین شعراء کا مرقع ہے اس میں اُن چند شعراء کے عکس جمیل دیکھ کر راقم السطور نے اپنی تقریظ میں لکھا ہے:

> "جب آئینہ دیکھا تو میر و غالب و اقبال کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ پرچھائیاں پھر مجسم بن جائیں اور کوئی ثانی تو پیدا ہو"

بھیونڈی کے مومن شعراء حضرات

مقطع میں سخن گسترانہ بات آگئی ہے، اس کا تعلق بعض شعراء حضرات کے ادبی نسب یا سلسلۂ شاعری سے ہے، کوئی اپنا ادبی سلسلہ مقامی استاد کے استاد کے واسطے سے دبیر دناسخ تک پہنچانے کی اڑان بھرتا ہے اور کوئی ہے جو امیر مینائی اور میر تقی میر سے اپنا سلسلۂ شاعری جوڑتا ہے۔ اس ادعائیت کی نہ کوئی اہمیت ہے ورنہ ادبی افادیت بجز ' دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے' آخر یہ اظہار تفاخر کس لئے ہے؟ شاعر کا کلام

خود نماری سے ہمکلام ہوتا ہے۔ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" ۔ اگر ہم ان سلسلوں کا تعاقب کریں تو یقیناً آدم علیہ السلام تک پہنچ جائیں گے جو ایک روایت کے مطابق نہ صرف ابو البشر ہیں بلکہ ابو الشعرا بھی ہیں جنہوں نے اپنے بیٹے ہابیل کی موت کا مرثیہ لکھا تھا۔

حضرت حسان بن ثابتؓ کا کلام سن کر رسول اکرم صلعم نے شاعر کو خدا کا شاگرد کہا۔

"ترایاتِ خیال" جو بیسویں صدی کے اول نصف کے اور دورِ اول کے شعرائے کرام کے مجموعۂ کلام کا گلدستہ ہے، روایتی شاعری کی بو باس سے بسا ہوا ہے۔ دوسرے دور کے عام شعراء کا لب و لہجہ بھی تقریباً ویسا ہی ہے لیکن آزادیٔ ہند کے بعد روایتی زبان و بیان میں تبدیلیاں آنے لگیں، نئی تشبیہات، نئی علامتیں اور نئے استعارات شاعری میں داخل ہونے لگے، ترقی پسند تحریک نے بھیونڈی کی ادبی فضا کو زیادہ متاثر نہیں کیا۔ یہاں اشتراکیوں کے جلسے ہوتے تھے اور اپٹا (IPTA) کے ڈرامے اور مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ایوب فہمی اور زین العابدین عابد (زیڈ عابد) جو حضرت مسلم مالیگانوی کے بھانجے تھے ترقی پسند شاعر تھے[1]۔ ہم پچھلے اوراق میں ان مومن انصاری شعرا کا ذکر کر چکے ہیں جو بھیونڈی کی سرزمین سے اٹھے اور آسمانِ سخن پر مانند نجوم و کواکب چمکے — اور اب خاک نشین بن گئے ہیں۔

ع کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

[illegible] پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے نقاد کو چاہیے کہ غالبؔ کے اس مصرع کو معیارِ سخن اور کسوٹی [illegible] سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں، اور اُن کی طرح بھی یہ دعویٰ بھی [illegible] جیسیں [illegible] اس [illegible] سے بہتر ٹھہرائے بلکہ غالبؔ کا یہ شعر شاعر کے [illegible] اور [illegible] کلام پر [illegible] کا نصب العین اور انصاف کا ترازو [illegible]

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی

اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

---

[1] [illegible] عبدالسلام [illegible] منتخب مجموعہ کلام مرحوم محمد ایوب فہمی [illegible] [illegible] بھیونڈی منعقدہ ۱۵ ستمبر ۱۹۷۲ء اور ۲ نومبر ۱۹۷۲ء [illegible] منزل [illegible] مضامین مطبوعہ [illegible] روزنامہ [illegible] بھیونڈی

محمد ایوب فہمی (متوفی ۱۲؍ فروری ۱۹۷۳ء)

ظلمتِ شب میں ستارے بن کے تابندہ رہے

جینے والے اس طرح اس شان سے زندہ رہے

— فہمی کا یہ شعر خود ان کی زندگی کی تفسیر اور ترجمان ہے۔ تنگدستی نے فہمی کو زندگی بھر تنگ رکھا لیکن انہوں نے پامردی، استقلال اور خودداری کی ردیف کا پیچھا نہیں چھوڑا اور نہ فکر سخن کا قافیہ تنگ ہونے دیا۔ وہ غزلیں لکھتے رہے بڑی زرخیز زمینوں میں اور دشوار بحروں میں، اسی لئے فہمی کی شاعری میں معنویت کی گہرائی ہے اور جذباتی گیرائی۔ وہ ترقی پسند شاعر تھے اسی لئے مقصدیت کی سنگ بندی اور حجرہ بندی سے آزاد نہ رہ سکے۔ ان کے عزیز ترین دوست زبیڈ عابد نے اپنے مضمون "فہمی — میرا ہمدم۔ میرا دوست" میں ان کی شاعری کے بارے میں رقم کیا ہے:

> "فہمی سچا اور بیدار ...ب وطن... اور دی جمہوریت اور اشتراکیت کا دلدادہ، ترقی پسند ادب برائے زندگی کا علمبردار تھا۔ وہ صاحب فکر بھی ... جب طرز بھی۔ وہ دیدۂ بینا بھی رکھتا تھا اور دولت فکر و احساس بھی۔ اسے ... کا ورثہ عزیز تھا اور ... کا سرمایہ بھی۔ اس کے ذہن میں روشن مستقبل کے تانے بانے بھی تھے اور عظمتِ انسانیت کے نقوش بھی۔"

ایوب فہمی نے ہمیشہ سماجی نابرابری اور انسانی استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ آپ نے اپنے دور کے سلگتے ہوئے مسائل پر کھل کر لکھا ہے۔ ازراہِ تنقید کی ... سے

بگڑ گیا جو مقدر تو ایک تم ہی نہیں	تمہاری طرح ہزاروں نے ساتھ چھوڑ دیا
دنیا نے کیا ... کیا ہے نہ پوچھئے	دنیا کا ... ابھی نہیں

"منتخب مجموعۂ کلام" میں فہمی کی یہ غزل۔ خاص ...

کونسی شئے غمِ ہستی میں نہاں ٹھہری ہے	... زبوں ٹھہری ہے

محمد اسحٰق بیتاب (۱۹۰۹ء - ۱۹۷۱ء):

تخلص خاص معنویت کا حامل اور ان کی شخصیت کا پرتو اور ترجمان ہے، اور دلنشانہ

وضع قطع، بالشت بھر داڑھی اور اضطراب و اضطراب کی کیفیت سے معمور شخصیت تھی۔ مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں بھیونڈی کے کہنہ مشق اور بزرگ شاعر حضرت غلام رسول آغا سے اصلاح لیتے رہے، پھر بیتاب اور سیماب صفت بن کر سیماب اکبرآبادی کو استاد تسلیم کرنے لگے، آرزو تھی کہ دبستانِ دہلی کے علاوہ دبستانِ لکھنؤ سے بھی کسبِ فیض کریں لہٰذا آرزو لکھنوی سے اصلاحِ سخن لینے لگے، عبدالملک مومن نے 'آئینہ' میں آپ کی شاعری کی یہ جھلکیاں دکھائی ہیں ؎

"تنوع اور رنگارنگی، سلاست اور روانی، نفاست اور حسنِ آفرینی اور محاورں کا برمحل استعمال آپ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں"

نمونۂ کلام:

ہم نے آنسو پی لیے رو رو کے بہتے بہتے | حیف صد حیف کوئی محبت کا مارا نہ ہوا
ہم نے جب جاہا اسے دل سے لگایا بیتاب | غم سے بڑھکر کوئی محبوب ہمارا نہ ہوا
داغ کے انگارے سے ظاہر ہوئی بہار | بیتاب سچ تو یہ ہے جنوں کام آ گیا

پیر محمد غرقاب (۱۹۱۰-۱۹۷۹)

لکھنؤ کے تھے اسی لیے دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر تھے یہ اور بات کہ آپ کا سلسلۂ شاعری کئی واسطوں سے امیر مینائی تک پہنچا ہے اور خود ان کی استادی کا سکہ بھیونڈی کے تعلیمِ سخن میں چلتا رہا، ارشد تلامذہ میں سے محمد عمر شفق جانشین ہیں۔ غرقاب ہمہ وقت غرقِ سخن رہتے تھے اور شعر سنانے کا ایسا چسکا پڑا تھا کہ سرِ راستہ روک کے کہدو نگا جو کہنا ہے مجھے کے مصداق شعر سنا دیتے تھے اور چل دیتے تھے۔ دیندار مسلمان تھے اور تقویٰ غالب تھا اسی لئے کلام سے روحانیت کی مہک اٹھتی ہے چونکہ تصوف میں ڈوب چکے تھے اور جب حال و دل کی سطح پر آکر موجِ سخن اٹھتی تھی تو لفظ و معانی کے گوہر کلام میں بکھر جاتے تھے روایتی شاعری کی علامتیں، جام و شراب، جمالِ ساقی اور رومانی انگیز خیالات سے بھی حذر نہیں کیا ؎

بت نگینوں پہ پرتو تاباں ساقی کا | یا میکدے میں کوئی ماہتاب آیا ہے
دامنِ نہیں مت دیکھ حقارت کی نظر سے | بخشش کی تمنا میں گنہگار کھڑے ہیں
پہنچے رہے شورِ سند منزل نہ ملی انہیں | اہلِ جنوں گذر گئے حدِ تعینات سے

زیڈ عابد شہابی (۱۹۲۹ - ۱۹۸۲)

زین العابدین عابد۔ الولہ میں پلے بڑھے، میٹرک کرنے کے بعد مزید تعلیم پونہ میں آباد ہوئے یہیں پروفیسر دستگیر شہاب کے حلقۂ تلامذہ کے واسطۃ العقد بنے، شہابی کی عرفیت عقیدت کا اظہار ہے جو انہیں اپنے استاد سے تھی، پروفیسر دستگیر شہاب ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر تھے اور یوں بھی اقبالیات کے حامل ہونے کے سبب امت مسلمہ کا درد رکھتے تھے لیکن نظریۂ اشتراکیت کے زبردست حامی بھی تھے۔ یہی سب کچھ زیڈ عابد کا ذہنی سرمایہ بن گیا، پونہ آزادیٔ ہند کے بعد علمی دنیا سے تعلق رکھنے والا ادیبوں اور شاعروں کا مرجع بن گیا تھا، یہ سارے لوگ بھی آزاد مشرب ہی تھے، مشاعرے ہونے لگے در محرم کے ادبی دنگل میں مقامی شعراء کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ جوش اور جگر کی شرکت سے مشاعروں کی رونق بڑھتی گئی لیکن زیڈ عابد بھی آباد ـــ پونہ سے ترک وطن کرکے مالیگاؤں آگئے یہاں حضرت مسیم مالیگانوی [illegible] موجود تھے، شعر و سخن کی محفلیں ادیب، شوق، سہیل، مسلم، حفیظ، حسن اور دیگر مکتب فکر و دبستان [illegible] سے بڑی رونق تھی۔ مالیگاؤں بھی راس نہ آیا تو بھیمڑی سے [illegible] پارچہ بافی کا کاروبار شروع کیا اور بازارِ سخن گرم کردیا، ہم خیال ارباب ذوق سے تعلق خاطر ہوگیا، ترقی پسند شاعری کی آواز بلند ہوگئی اور زیڈ عابد کی رعب دار آواز مشاعروں میں گونجنے لگی۔

صلیب و دار کی حد سے گذر جانے کو جی چاہے
جدھر جاتا نہیں کوئی ادھر جانے کو جی چاہے

عجب ویرانیٔ جاں ہے عجب ہے عالمِ وحشت
نہ باہر جی لگے اپنا نہ گھر جانے کو جی چاہے

کیا خبر تھی کہ بیاباں پسِ منظر ہوگا
چاند کا دور حسیں [illegible] تجسس ہوگا

پوچھتا پھرتا ہے جو میرا پتا لوگوں سے
میری مانند [illegible] ہوگا

مرے لہو سے خار رنگ دستِ عالم ہے
میں [illegible] خوں بہا پاؤں

میں وہ فرہاد ہوں عصرِ رواں کا
دلور [illegible] ہوں

ـــ اور دوروں کے پتھروں کو توڑتے توڑتے انہوں نے اپنے پندار کا صنمکدہ بھی ویران کردیا ـــ اور طوافِ کوئے ملامت کے بعد نادم اور پشیمان ہوکر خدائے بزرگ و برتر کو وہ تو خوش تجھ کو خدا مان لیا عابد نے ـــ اور مالک الملک کو نجانے عابد کی کون سی ادا بھا

گی کو اپنے پاس بلالیا۔

پروفیسر دستگیر شہاب کی نظروں میں زیڈ عابد کا جو مقام تھا اس کا اظہار پروفیسر موصوف نے زیڈ عابد کی 'بیٹی کی رخصتی' پر جو نظم لکھی تھی اس میں بڑے خلوص سے کیا ہے، یہی نظم انہوں نے نام بدل کر ہماری اکلوتی بیٹی رخشندہ کی شادی ۵ مہر جون سنہ ۱۹۸۲ء کے موقع پر بھیجی تھی۔

تو کہ بیٹی ہے اس باپ کی

جس کی فہم و فراست،

جس کی شرافت صداقت کی کھاتی ہے دنیا قسم

فکر و فن میں ہے جس کے عجب بانکپن

جس کی عظمت کا سکہ دلوں پر ہے بیٹھا ہوا

فکر و دانش کی جس نے عطا کی ہے دولت تجھے

تیرے کردار کو جس نے بخشا ہے اک دلربا بانکپن

عبدالخالق غیرت انصاری (۱۹۲۵ء۔ ۱۹۷۶ء)

شہر کے مشہور حاذق حکیم نور محمد کے صاحبزادے تھے مشرقی تہذیب کے ماحول میں اور خالص اسلامی فضا میں ذہنی وفکری تربیت ہوئی ان کی شاعری میں انہیں کے اثرات نمایاں ہیں، قدامت پسندی کے باوجود فکر کے دریچے عصری آگہی کی سمت کھلتے تھے اسی لیے ان کے کلام میں نہ بے معنویت اور رمزیت کا فقدان ہے اور نہ معنویت کا ابہام بلکہ کھلی دھوپ اور پھیلی ہوئی چاندنی کی طرح عشق و محبت اور روحانیت کا جذب نظر پر تو نظر آتا ہے۔ آپ غزل گو شاعر تھے، رنگین بیانی اور شگفتگی نے ہر ایک غزل کو ایک مہکتا ہوا گلاب بنا دیا ہے۔

بہار کی جو سند کیا، کعبہ کیا اور کلیسا کیا
گلوں کی پاک دامنی نے فنا کر دیا آخر

ہزار اک الزام اپنے سر اگر لیتے نہ دیوانے
گذر ہی جاتا وفا کی بستی کی منزلوں سے غیرت

دلوں سے خرمنِ عقل جل چکی جب خلل پڑا ایمانوں میں
وہ اک پیام جو میرے جنوں کے نام آیا تھا

ترے خود ساختہ دنیا کے فرزانے کہاں جاتے
وہ پناہ اس نے جو ڈھونڈی میرا پھٹا دامن بچا رہا

عبدالقیوم نازاں (۱۹۳۹ء-۱۹۹۰ء)

بھیونڈی کے اہلحدیث گھرانے کے فرد تھے والد بزرگوار امام الدین ماسٹر کا شمار بمبئی اور بھیونڈی کے ٹیکنکی ماہرین میں ہوتا تھا جنہوں نے صنعت پارچہ بافی میں ایک اعلیٰ فنی منصب حاصل کیا تھا۔ عبدالقیوم نازاں ایک صحیح العقیدہ، خداترس اور متقی انسان تھے۔ راقم سے بڑے خلوص اور عقیدت سے ملتے تھے اور نجانے کیوں مجھے اپنا محسن سمجھتے تھے۔ ہم نے جب ایک مرتبہ اس 'اندازِ گفتگو' کا سبب پوچھا تو انہوں نے ۱۹۶۷ء کا ایک واقعہ سنایا، جب وہ میری بچی رخشندہ کو جو اس وقت ساڑھے تین برس کی تھی انگریزی کا ٹیوشن دینے آتے تھے، اس واقعے کا تعلق ان کے مکان کے کرائے سے تھا ——— مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ میں نے ان کے ساتھ کیا نیکی کی تھی لیکن چونکہ وہ ایک نیک اور عالی ظرف انسان تھے اسی لیے انہوں نے مجھے یاد دلا کر گویا مجھ پر ایک ایسا احسان عظیم کیا جو میں عمر بھر نہیں بھول سکتا یعنی احسانمندی کا سبق دیا —— اور اللہ کا قرآن سنایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ (یقیناً اللہ کے ہاں محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔ التوبہ: ۱۲۰)۔ اس معمولی واقعے کے تذکرے کا مقصد نازاں کے اوصاف حمیدہ، ان کی غیرت، خودداری، تقویٰ اور دینداری کی ان جہتوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جہاں سے صراطِ مستقیم گذرتی ہے۔

عبدالقیوم نازاں کے بارے میں ہم نے اپنے داخلی احساسات و تاثرات کی 'کوزہ بندی' کی ہے۔ ان کی موت پر لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے ہم تہی دامن اقبال سے یہ اشعار مستعار بطور ہدیۂ عقیدت و محبت پیش کرتے ہیں ؎

خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو — رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

عبدالقیوم نازاں کی موت کی تیسری برسی پر بھیونڈی کے ہفت روزہ صبح و شام نے اپنے عیدالاضحیٰ اسپیشل نمبر (جمعہ ۲۸ مئی ۱۹۹۳ء) کے ایوانِ ادب میں نازاں کی یادوں کے چراغوں سے بڑی روشنی کی ہے۔ فاضل مرتب محمد رفیع انصاری نے "یہ تھے نازاں صاحب" کی کتاب حیات کا خلاصہ دیا ہے، نازاں تم پر شہر یہ سارا نازاں ہے، ان

عبداللطیف لطفی آفاقی

مرنجان مرنج قسم کے انسان تھے۔ حُلیے سے بے خبر لگتے تھے اور اخلاقی قدروں اور کُلیے سے باخبر لگتے تھے ایسے محتاط کہ راستے سے گزرتے تو لطفی صاحب کے لطیف لمس کا احساس بھی رہگذر کو نہ ہوتا ساری زندگی میرؔ کے اس شعر کی تفسیر بن کر جیے ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

شاعری میں پختگی تھی اور زبان میں لطافت، روایتی استعارات و علامات کے استعمال کے باوجود لب و لہجہ میں نیا پن تھا ؎

صبح تو کوششِ پیہم کا بدل ہونے تک — سایۂ زلفِ شبِ تار گھنیرا ہوگا
دوشیزگیٔ حسنِ چمن تو نکھر گئی — کیا غم جو اہلِ درد ہوسیں ستا گئے
لذتِ درد کو دیتا ہے بڑھاوا کیا کیا — ہائے وہ زخم جو شرمندۂ مرہم نہ رہا

محمد ابراہیم صوفی

تذکرۂ شعرائے بھیونڈی کے فاضل تذکرہ نویس نے صوفی صاحب سے اعتنا نہیں کیا لیکن راقم کو ان کا حُلیہ یاد ہے اور شاعروں میں نعت شریف پڑھنے کی ادا بھی یاد ہے۔ عشقِ رسول اکرمؐ میں ڈوبے رہتے تھے اور اصحاب کرام کی محبت میں غرق، مذہبی ذہن تھا، دینی مزاج اور اسلامی طرز فکر تھا واقعتاً صوفی تھے۔ مرزائیت اور جبر صفا کی اولین صف میں شامل تھے۔ نعت کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نزع کے وقت نہ جب کوئی سہارا ہوگا — میرے مولا تری رحمت پہ بھروسہ ہوگا
کاش مل جائے در پاک کی جاروب کشی — بادشاہوں سے فزوں تر مرتبہ ہوگا
کاش سمجھے کوئی اس وقت کا عالم صوفیؔ — سامنے جب شہِ لولاک کا روضہ ہوگا

ڈاکٹر ظفرالاسلام ظفرؔ (۱۹۲۷ء — ۱۹۹۱ء)

بنارس کی "شکیں کمند" کے ستیہ بن کر گیلان (ایران) کے مولانا علی حزیں گیلانی نے وہیں زندگی بسر کردی، ظفر صاحب سے ترکِ وطن کر کے بھیونڈی آئے اور

یہیں بس گئے لیکن جلد پہنچے وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا — سبکدوش ہو کر واپس وطن لوٹے تو آخرت کے مسافر بن گئے۔ ان کی تعلیمی، ادبی اور صحافتی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ایک لائق استاد اور قابل ہیڈ ماسٹر تھے، صدر جمہوریہ ہند نے نیشنل ایوارڈ (۱۹۸۲) سے نوازا تھا۔ مجموعۂ کلام "کچھ ورق" بہت عرصہ پہلے شائع ہوا تھا۔ آپ ادیب بھی تھے اور شاعر بھی۔ آپ کے کلام میں قدما کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور عصری ادب کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ "آئینہ" "تذکرۂ شعرائے بھیونڈی" میں متفرق اشعار اور دو غزلیں شامل ہیں، انہیں سے گلچینی کی ہے سہ

یہ چند سرفروش مرکے بھی زندہ ہیں آج تک	سکتے میں ہے صلیب تو حیرت ہے دار کو
چوٹی کے لوگ کھائی میں ذلت کی گر گئے	بے فکر تھے کہ برف کا تودہ پگھل گیا
طوفاں کی زد میں رہ کے بھی طوفاں اٹھا دیا	شیشے کے گھر میں بیٹھ کے پتھر چلا دیا

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

عرفی کا یہ مصرعہ زندگی کے نہایت تسلسل کی تفسیر ہے سہ

عہد گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن	اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

— لیکن بہار لوٹ کر آتی رہتی ہے اب ہمارے درمیان یہ سارے نواسنج محوِ ترنم ہیں:

شبیر احمد انصاری راہی (ولادت ۱۳۳۲ھ - ۱۹۲۰ء)

شبیر صاحب کی پہلو دار شخصیت میں اتنی پوشیدگی ہے کہ ان کا ذکر قند مکرر کی طرح لذت آفریں ہے ان کے اوصاف اتنے متنوع، ورنگا رنگ ہیں کہ وہ ادب، شاعری، صحافت و سیاست غرضیکہ ہر ثقافتی عنوان سے جگمگاتے ہیں۔ تبلیغ و دعوت کے میدان کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ خطیب بھی خرقہ ہی ہے۔ تاریخی ثقافتی نہیں علم و صنفِ اتفاقی ہے۔ دین حق افکار کی دعوت دیتا ہے اس کی معلومات نگزیر ہے دعوت الی اللہ تحریر و تقریر کے ذریعے دی جاتی ہے — شبیر احمد ایسے ہی داعی، خطیب اور اسلامی مفکر ہیں۔

میٹرک تک حکومت سے وظیفہ ملتا رہا ۱۹۴۳ء میں بہاء الدین کالج جونا گڑھ سے بی۔ اے کیا سیاسی اور تدریسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کرتے رہے ۱۹۴۹ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، پھر سیاسی میدان میں اترے، جلسوں میں خطابت کے زور سے چمکے، ادب و صحافت میں قلم کی طاقت سے ابھرے، مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بلندیٔ فکر اور مرتبۂ فن کے ذریعے سند نشینی کا شرف حاصل کیا۔ اخباروں میں درجنوں مضامین شائع ہو چکے ہیں، شاعری میں بھی تفرد رکھتے ہیں اور اس راہِ سخن کے تنہا راہی ہیں۔ نمونۂ کلام:

کوئی شکوہ زباں پہ نہ لایا گیا، ہم سے احساں نہ کوئی اٹھایا گیا
جھیلتے جھیلتے سختیاں دہر کی، مر گئے ہم تمہاری خوشی کے لئے
لاکھ اہلِ غرض ظلم ڈھاتے رہے، غم کی تاریکیوں کو بڑھاتے رہے
ہم سے جو اہلِ دل تھے وہ ہر دور میں دل جلاتے رہے روشنی کے لئے

آج تیرا ہے ترے جی میں جو آئے کر لے — روزِ محشر جسے کہتے ہیں وہ میرا ہوگا
کچھ اتنی بار ہم پر برق نے احسان فرمایا — کہ ہر جلتی ہوئی شے کو ہم اپنا آشیاں سمجھے
میں نے دنیا کا فقط تجھ کو مسیحا جانا — اک نظر دیکھو تو کیا ہو گئی حالت میری

ابو بکر اکبر علی (ولادت ۱۲/ستمبر ۱۹۲۲ء)

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے شعر فہمی اور سخن شناسی ادب کا ایک لازمی و شعوری تجربہ ہے اور اگر شعر گوئی کا ملکہ بھی شامل ہو تو ایسا شخص فنی طور پر ایک کامیاب [illegible] ہوتا ہے، بلاغت، بندش کی چستی، زورِ بیان، محاورت و [illegible] اوصاف خود بخود اس کی شاعری کے اوصاف بن جاتے [illegible] فارسی زبان پر قدرت ہونے پر [illegible] کلام کو نکھار دیتی ہے [illegible] کی طرح [illegible] درشتی [illegible]۔

[illegible] تبصرہ کرتے تھے، اردو اور فارسی کے شعراء کے [illegible] [illegible] سے چھوٹا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ

چراغ سے چراغ کیسے جلتے ہیں۔

عرفی شیرازی:

میروی با غیر و میگوئی بیا! عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو آکین پائے رازفتارنیست

میر:

غیر کے ہمرہ وہ آتا ہے میری دید کو — کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

سودا کا یہ شعر ہے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

— اس کی ساری معنوی کیفیت صرف اس ایک مصرع میں منتقل ہو گئی ہے کہ

ساغر از دست بگیرید من از کار شدم

ابوبکر جناب سخن سنجی اور سخن شناسی میں تفرد رکھتے ہیں لیکن خود ان کا کلام بھی حکم

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

ابوبکر جناب ایک بے لوث، خلیق اور ملنسار انسان ہیں۔ گفتگو سے پہلے تبسم پیرائی

کرتا ہے اور گفتگو کے بعد بھی تبسم ملاقاتی کا تعاقب کرتا ہے۔ بڑے اوصاف حمیدہ کے

مالک ہیں۔ عمر ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے۔ نمونۂ کلام:

وہ مرے عشق ترے حسن کے قائل ہیں جو — تو نے ان کو تو کبھی اس طرح نہ دیکھا ہوگا

نشان ان کا ہیں کچھ پختہ قبریں کچھ شکستہ سی — وہی یہ نام والے ہیں کہ جن کا نام چلتا تھا

وطن میں جیسے ہم کوئی عجب گھر کی زینت ہوں — کوئی جب دیکھنے آیا تو دکھلائے گئے ہم بھی

کہاں ہم اور کہاں وہ بزمِ ناز ں کی مگر ہمدم — وفا کی لاج رکھنی تھی تو بلوائے گئے بسمؔ بھی

نزع ناموس پہ آتا ہے تو میں اے ہمدم — ایسا رویا ہوں کہ میری ہی خطا ہو جیسے

باب نشیں میرے نہ تجھے تو کوئی مفلس نہ سمجھ — مجھے کردار مرا اے مری جاگیر نہ دیکھ

مرا بیں مجھ سے کتنا مختلف ہے — نظر آتا نہیں جو آئینے میں

اک نہ اک دن دیکھنا پوچھیں گے وہ — اٹھ کے ترانوں کو روتا کون ہے

ہمارا ساقیا کر تم کو پتہ دا نہیں ہوگا — کہ ہم تو دوستو دونوں جہاں کی بات کرتے ہیں

اک تبسم کی اللہ رے قیمت ہچکیاں بندھ گئیں روتے روتے

مشتاق احمد موسیٰ رضا رسوا

شاید یہ انکشاف کہ مشتاق جناب ایک قادر الکلام شاعر بھی ہیں بہت ساروں کے لئے موجب استعجاب ہو یا اشتباہ لیکن یہ حقیقت ہے اور ان کی کرامت بھی کہ رسوا تخلص فرماتے ہوئے بھی شاعری کی دنیا میں رسوائی سے محفوظ رہے۔ ہمارے درمیان ایسے محجوب اور محفوظ شاعر بھی ہیں جن کا کلام "خود کلام" ہوتا ہے۔ رسوا صاحب کا یہ شعر مشہور ہے اس میں محبوب کی خود بینی کی طرف بڑا لطیف اشارہ ملتا ہے۔

مجھ میں کچھ نہیں تا کسے رقیب کہوں خود ان کو اپنی ادا پر نثار دیکھا ہے

راقم جب اعلیٰ تعلیم کے لئے عازم سفر انگلستان تھا تو ایک الوداعی جلسہ میں (منعقدہ ۲۰ راگست ۱۹۵۱ء) کو آپ نے ایک نظم سنائی تھی ؎

رقصِ عشرت ہے دل کی گھبرائی کیا جھومیں بہار سے آئی
شوق پھر دے رہا ہے درسِ جنوں بے خرد محوِ دشت پیمائی
مومنِ باصفا مبارک ہو سفرِ زیست سے شناسائی
محفل اہلِ دل اداس ہے کیوں آج کیوں میری آنکھ بھر آئی
یہ جدائی پیامِ عشرت ہے تم سے ہے عیش کی پذیرائی
ہاں یہی اقتضائے فطرت ہے کوئی بچھڑا تو آنکھ بھر آئی
اہل دل کوئی آنے والا ہے اہلِ مغرب تہہ دی بج آئی
بسفر رفتنت مبارک باد بسلامت روی و باز آئی

محمد عمر شفق (ولادت ۱۹۲۱)

شہر کے بزرگ شاعر ہیں، استادی کا مرتبہ حاصل ہے۔ شعر و سخن کی محفلوں اور مشاعروں کے روحِ رواں ہیں۔ بلدیہ کے دو مرتبہ رکن رہے اور قوم کے بے لوث اور مخلص خادم ہیں، خلیق اور منکسار انسان ہیں اسی لئے ہر کوئی محمد عمر شفق کو درازیٔ عمر کی دعا دیتا ہے، کلام اخلاقی قدروں کا حامل ہے۔ مذہبی تاریخ کی بھی عینی عملی طور پر

معاشرے کی خرابیوں اور برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، فہرست تلامذہ ان کی شاعری کی طویل زندگی کی طرح بےحد طویل ہے۔ ادبی خدمات کا شمار بھی مشکل ہے۔

وہ بھی اک زمانہ تھا، یہ بھی اک زمانہ ہے
دشمنی سے ڈرتے تھے دوستی سے ڈرتے ہیں

تمام عمر مرے ساتھ ساتھ تھا لیکن
مرا نصیب مری دسترس سے باہر تھا

یوں خدمتِ عوام کئے جا رہا ہوں میں
جیسے خود اپنا کام کئے جا رہا ہوں میں

دردِ دل ہے تو اظہار بھی ہو سکتا ہے
سرِ محفل سرِ بازار بھی ہو سکتا ہے

جانِ عالم رہبر مومن

آپ شاعر بھی ہیں اور مضمون نگار بھی اور ایک قابل اُستاد کی حیثیت سے بھی مشہور و مقبول ہیں، سلسلہ شاعری میں بڑے بھاری بھرکم مرعُوب کن اساتذہ کے نام آتے ہیں، پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ پیروں اور ولیوں سے بڑی محبت رکھتے ہیں۔ 'راہ و رسمِ منزل ہا' سے یہ سالک بے خبر ہے یا باخبر۔ اللہ ہی جانے لیکن رہبر ضرور ہیں، کلام میں پختگی ہے اور زبان میں سلاست ہے لیکن بعض غزلوں کے ردیف و قافیہ جیسے کاٹ، گھاٹ، ٹاٹ، ریشمی اشعار میں ٹاٹ کا پیوند لگتے ہیں۔

یہ طرزِ نو ہے کہ رسم کہن اٹھا رکھئے
لہو ہتھیلی پہ اب صورتِ حنا رکھنا

تیری پیروں سے کہتے جب بھی فروزاں ہو
دیکھ لینا مری پلکوں پہ اجالا ہوگا

پیروں سے کچلتے ہیں یہ احساس نہیں ہے
پھولوں کا چمن میں کوئی دن ٹھاٹ رہے

مومن عبدالرحیم (بی۔ اے)

اسماعیل کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد ملازم رہے، سماجی خدمت کے شوق نے جدہ میں بنیاد ڈالی، کئی کمیٹیوں کے چیئرمین اور رکن رہے۔ انجمن ترقی اردو سے بھی وابستہ رہے۔ کم لکھتے ہیں۔ در کم نظر آتے ہیں بزم شعر و ادب کے زمانۂ عروج ۱۹۶۲ء میں مشاعروں میں پڑھتے تھے اور دادِ تحسین حاصل کرتے تھے۔

میں بھی پار ہو جاتے ہوش و حواس
وہ بھی ہیں شرمسار۔ مشکل ہے

بجھ گئی تیرے دامن کے باقی رنگ کی
یہی شعلہ یہی شبنم یہی دریا ہوگا

ہائے وارفتگیٔ شوق کہ اکثر مجھ کو یہ گذرتا ہے گماں تونے پکارا ہوگا

یوسف حسن مومن

یوسف حسن مومن کی تہہ دار اور پہلودار شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کی ادب نوازی اور ذوقِ شعری کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "پارچہ بافی کے تانے بانے میں الجھے رہنے کے باوجود آپ زلیخائے سخن کے گیسو بھی سنوارتے رہتے ہیں۔" آپ ایک اچھے مضمون نگار بھی ہیں اور ان کے ادبی مضامین ہندو پاکستان کے معیاری رسائل میں چھپتے تھے، ان میں "ذرا اجس دنیا" اور "اخبار جہاں" بھرپور طنزیہ مضامین تھے۔ تانے بانے کے عنوان سے ان کے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں وہ بڑے فکر انگیز ہوتے ہیں اور صنعت پارچہ بافی سے متعلق افراد کے لئے بڑی افادیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں لیکن ان کی آفس میں اور بہ برت ان کے دولتکدے پر احباب کے ساتھ ان کی محفلیں خوب جمتی ہیں پھر بھی وہ اس بات کے شاکی ہیں کہ سہ بھاگ کر تنہائیوں سے کیا ہوا محفلوں میں اور بھی تنہا ہوا

ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سہ

یہ جہاں بازار ہے یوسف یہاں ہر زمانے میں ترا سودا ہو

شاید یہی خیال ستاتا ہے رات بھر سہ

نیند آنکھوں سے اڑ گئی ہے سوتی راتیں رات بھر رت جگا کرتی ہے سوتی راتیں

عبدالکریم عبدالاحد خفی انصاری (ولادت ۱۹۴۲ء)

شبیر احمد راہی ایم۔ اے نے عبدالکریم خفی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں ایک فطری شاعر تسلیم کیا ہے، برہانپور کے مشہور شاعر اختر رشدی جو بھیونڈی میں مدتوں مقیم رہے آپ کے استادِ گرامی تھے۔ خفی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور مشاعرہ لوٹ لیا کرتے ہیں۔ تحسین و آفرین کے معنوی و لفظی زر و جواہر سے دامن بھر کر لوٹتے ہیں "سلاست، روانی، بے ساختگی ان کے اشعار کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ جو ان کو دوسرے شعراء سے متمیز کرتی ہیں۔ وہ ایک منفرد اندازِ بیان رکھتے ہیں۔ خفی کے فن

اور شخصیت پر شبیر احمد راہی، محمد اسحاق ظفر انصاری (ہیڈ ماسٹر تہذیب ہائی اسکول مالیگاؤں) اور ابوبکر جناب جیسے فاضل دوستوں نے مضمون لکھ کر "سخن شناسی" کا ثبوت دیا ہے۔

خفی کی شاعری کے اوصاف میں ان کا ایجاز بیان اور معنی آفرینی کی رنگینیاں امتیازی شان رکھتی ہیں۔ بقول ظفر "بدلتی ہوئی قدروں سے ابھرنے والا کرب خفی کے اشعار میں کردٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے"۔ چند اشعار بطورِ نمونہ کلام پیش کئے جاتے ہیں۔

شیشے کی طرح جوڑ دے ٹوٹے ہوئے دل کو ۔۔۔ اس دور میں ایسا تو نہیں کوئی ہنرمند

۔۔۔ مگر ایسے ہنرمندوں کا فقدان کبھی نہیں رہا۔ عرفی شیرازی کا مشہور شعر ہے ؎

دلِ شکست دراں کوی می کنند درست ۔۔۔ چناں کہ خود شناسی کہ از کجا بشکست

خفی نے چھوٹی بحر میں الفاظ و معانی کے دریا بہا دئے ہیں۔

وہ بھی تیرا کے اب گذرتا ہے ۔۔۔ مدتوں جس کا راستہ دیکھا

خیر مقدم کو جبھی آتی ہے رسوائی بھی ۔۔۔ میں جب آواز لگاتا ہوں دربار کے پاس

تیرے دیوانوں سے ہر ایک گلی ہو آباد ۔۔۔ لوگ برسائینگے اس شہر میں پتھر کتنے

۔۔۔ اس شعر نے قدسی کے اس شعر کی یاد دلادی ہے ؎

دیوانہ برای ما دو طفلیں براہی ۔۔۔ یاران با مگر این شہر شما سنگ ندارد

راقم نے بھی اسی خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے۔

پتھر لیے ہر شخص مجھے تک رہا ہے ۔۔۔ اس شہر میں کیا اور بھی دیوانے نہیں ہیں؟

عبدالرحیم تاباںؔ (ولادت ۱۹۳۴ء)

عبدالقیوم نزاں کے شاگرد ہیں، استاد نے ازراہ کرم تاباںؔ تخلص عطا کر کے ہم قافیہ بنادیا۔ شاعری میں بھی استاد کے ردیف میں ہیں۔ اسلامی ذہن رکھتے ہیں، نعت اور منقبت ان کے دینی جذبات سے معمور اور عشق رسول سے سرشار ہیں، غزلیں بھی اچھی کہتے ہیں۔

خیرات بانٹتی ہے اب لوں کی تیرگی ۔۔۔ سورج کھڑا ہے ہاتھ میں کاسہ لیے ہوئے

ایک دو ہوں تو انھیں چپ کے جھنجھوڑ جائے ۔۔۔ شہر کا شہر ہو سویا تو جگائیں کس کو

یوسف کنعاں جیسا تو میں بھی لے کر آیا ہوں ۔۔۔ ڈال گئے ہیں اندھے کنویں میں تو بھی ہاں جو لوگ

تنہا شرافت کی ترے خیز زمیں پر ۔۔۔ گذرے ہیں شریفوں پہ جو لمحے رقم کر

محمد بشیر نظر (ولادت ۱۹۳۹ء)

نظر بابا، نیگاروزی سے عقیدت کی برکت نے بصیرت بخشی اور شاعری کی بشارت دی اسی سے بشیر۔ نظر بن گئے، اور بہت جلد لوگوں کی نظروں میں سما گئے" بھیونڈی کی شعری فضا میں بشیر نظر کی آواز ۔۔۔ ایک منفرد آہنگ رکھتی ہے۔ عصری آگہی، انسانی رشتوں کی سچائی اور حقائق کا ادراک آپ کی شاعری کے اوصاف ہیں۔

فکر امروز بھی کرتے نہیں ہم وہ ہیں نظر ۔۔۔ اور ہوں گے جنہیں اندیشۂ فردا ہوگا
دکھایا ہوگا تجھے روشنی نے وہ منظر ۔۔۔ ترے ہی سائے سے قد تیرا گھٹ گیا ہوگا
آرہے ہیں وہ آرہے ہیں نظر ۔۔۔ ایسا ہوتا ہے کچھ گماں یارو

حسن صحرائی

مشاعرہ ۔ بزم شعر و ادب بھیونڈی کے دونوں گلدستوں میں صحرائی کی دو غزلیں شامل ہیں جو انہوں نے پڑھی تھیں ۔ ایک غزل طویل بحر میں ہے جس کا مطلع ہے

ناکام ہے تنظیم امن جہاں انسان پریشاں ہوتے ہیں
خونخوار گھٹائیں اٹھتی ہیں، طوفان کے امکاں ہوتے ہیں

پوری غزل فرقہ وارانہ فسادات اور انسان دشمنی کی خونچکاں داستان ہے۔ دوسری غزل میں بھی یہی ادعائیت اور مقصدیت نمایاں ہے۔

آپ کے دور میں اور اس کے سوا کیا ہوگا ۔۔۔ خون دل ہوگا کہیں خون تمنا ہوگا
کتنی تاریک ہے دیکھو یہ گذرگاہ حیات ۔۔۔ تم تو کہتے تھے یہ ہر گام اجالا ہوگا

امین بھارتی

آپ بھی مشاعروں میں نظر آتے ہیں اور زیادہ تر غزلیں کہی ہیں، مذکورہ بالا گلدستوں میں آپ کی دو غزلیں شامل ہیں۔

قتل ہونے کو تو ہر روز ہمارا ہوگا ۔۔۔ تم کو معلوم ہے کیا حشر تمہارا ہوگا
وہ داغ جو غم کے اور کے سینوں میں فروزاں ہوتے ہیں ۔۔۔ صد غیرت انجم ہوتے ہیں رشک مہ تاباں ہوتے ہیں

محمد ایوب اُفق

۲۵ ستمبر ۶۲ء، ۱۹ اور ۲۱ نومبر ۱۹۶۲ء کے منعقدہ مشاعروں میں محمد ایوب اُفق نے جو غزلیں پڑھی تھیں ان کے چند اشعار سے اندازہ ہوگا کہ طرزِ غالب کا بے اثر بیان اور

کب تک یہ عندلیب و گل و نسترن کی بات	آؤ کریں اب علم و عمل، فکر و فن کی بات
جس سے خود اپنے ہی غم کا نہ مداوا ہوگا	وہ بھلا خاک زمانے کا مسیحا ہوگا
ضبط کا حد سے گزر جانا بلا ہے ساقی	تشنہ لب چھین لیں پیمانہ تو پھر کیا ہوگا

عبدالملک مومن (ایم۔ اے) (ولادت ۱۹۵۱)

تذکرۂ شعرائے بھیونڈی کے "آئینہ" کی آئینہ بندی کرنے والے عبدالملک مومن کا عکسِ جمیل قارئین اس کتاب میں کئی بار دیکھ چکے ہیں، عبدالقیوم نازاں کے شاگرد ہیں، ادبی استعداد اور قادر الکلامی اشارہ کر رہی ہے "جائی استاد خالیست"۔ شرمیلے لجائے سے رہتے ہیں اسی لئے شاعری میں بھی کھل کر سامنے نہیں آتے، ایمائیت رمزیت اور کنایت سے کام لیتے ہیں مگر کسی قسم کا ابہام پیدا نہیں ہوتا بلکہ معنویت کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ دیکھئے یہی شعر کس پایہ کا ہے!

سورج نظر بہ ہم کو سرِ شام آ گیا	یک لخت یاد اپنا بھی انجام آ گیا

اور اس شعر کی معنوی گیرائی ملاحظہ فرمائیں آئینے کا سارا تدبر بکھر کر لفظی گرفت میں آ گیا ہے۔

تیار ہو دے کے میں بکھروں گا چار سو	آئینہ کہہ رہا ہے کہ پتھر چلائیے
دھندلا دھندلا سا اس میں کیوں عکس کھو گیا ہے	آئینہ آلودہ ہے یا اپنا چہرہ دھندلا ہے

نورالحسن نور (ولادت ۱۹۵۵)

عمر کے لحاظ سے ان کی شاعری ابھی کمسن ہے لیکن تیور بتلاتے ہیں کہ طرزِ "من انداز قدت را می شناسم" ـــــ اس سبزۂ نورستہ پر کیا بہار آنے والی ہے وہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" سے اندازہ ہوتا ہے، روایتی شاعری کے انداز کے حامل ہیں لیکن عصری رجحانات کی طرف بھی توجہ ہے

بے حیائی پہ اترتے ہیں جھگڑنے والے — جنگ میں دیکھا تو شمشیر کو عریاں دیکھا

آدمی کو آدمی آتا نہیں ہے اب نظر — روشنی ایسی بھی ہوگی یہ کبھی سوچا نہ تھا

جس سے میں کر سکوں حق و باطل میں امتیاز — اے ربِ ذوالجلال مجھے دے وہی چمک

حمید ابن رشید: بھیونڈی کے اولین دور کے شاعر عبدالرشید رشید کے فرزند ہیں۔ بڑے اچھے شعر کہتے ہیں ؎

مسکراتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ جاؤ میرے — ایک عادت سی ہے حالات کی تفسیر نہیں

لاش اعمال کی کاندھے پہ اٹھانے والو — تم نے خود اپنا جنازہ بھی تو دیکھا ہوگا

کچھ ایسے گمنام شاعر بھی ہیں جو نہ مشاعروں میں اپنا کلام پڑھنے کی جرأت کرتے ہیں اور نہ کہیں چھپتے ہیں۔ ان میں حاجی محمد قاسم حاجی محمد عثمان رچھ والے سرِفہرست ہیں جو بھیونڈی میں ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، پانچویں جماعت تک تعلیم پائی اور جن کا وسیلۂ معاش پارچہ بافی ہے۔ دل کو بہلانے کے لئے شعر کہتے ہیں لیکن دل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ سیدھے سادے شعر کہتے ہیں۔

حافظ گھرانے کے عبدالمجید ماہر اور محمد ہارون محمد امین بھی اظہارِ مدعا ردیف و قافیہ میں کر لیتے ہیں۔ نئی پود میں تو شاعری کے انکھوے تیزی سے پھوٹ رہے ہیں۔

غریبِ شہر سخن ہای گفتنی دارد

جن شعرائے کرام کا ذکر اب تک ہوا ہے ان کی ایک بڑی تعداد بھیونڈی کی پیداوار ہے جن کے آبا و اجداد غدر کے پُر آشوب زمانے میں یہاں آکر بس گئے تھے، آزادیِ ملک کے بعد حصولِ معاش میں دیارِ پورب سے ایک بڑی تعداد ترکِ وطن کر کے آئی اور خانوادوں سمیت بس گئی۔ ان نو واردوں میں ادبی ذوق رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں، اور یہاں تک کہ جو بنکری و مزدوری کرتے ہیں وہ بھی اچھا خاصہ شعر کہہ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اتنے تعلیم یافتہ بھی نہیں ہیں۔

اثر الٰہ آبادی (ولادت ۱۹۰۵ء) جو قصبہ سرایت (ضلع الٰہ آباد) سے ترکِ وطن کر کے آخر عمر میں بھیونڈی میں بس گئے تھے ایک قابلِ احترام بزرگ شاعر تھے، کئی ادبی اداروں کے سرپرست تھے جن میں بزمِ ادب کا نام سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ایچ بنرشہر کی ادبی دنیا کے جانے پہچانے فنکار ہیں۔

پرتاپ گڑھ کے قمر رونق، معصوم انصاری، ناز حق، راحت انصاری، فیض آباد کے

محمد سلیم، الہ آباد کے رحمت، قمر، نثار، نسیم، اعظم گڑھ کے ذوق، مضطر وغیرہ یہاں کی ادبی فضا کی رونق بڑھا رہے ہیں، ہم طوالت کے خوف سے ان کے مفصل ذکر سے مجبور ہیں لیکن ہر ہر ایک شاعر کا کم از کم ایک شعر جو حاصل غزل ہے وہ ہماری نظر میں ہے لکھ رہے ہیں۔

انیس الہ آبادی:

میں نے سورج سے بھی پیمانِ وفا توڑ لیا / روشنی جب مری دیوار سے آگے نہ بڑھی
ان کی محفل میں کوئی ذکرِ وفا کیا کرتا / بات جب کاکل و رخسار سے آگے نہ بڑھی

قمر پرتاب گڑھی:

سر پہ اٹھائے ہے بہت گردشِ دوراں / ایسے میں چھلکتا ہوا اک جام ہیں دو

رونق پرتاب گڑھی

وقت کے ساتھ رہے دل کے تقاضے ورنہ / نامۂ عشق و وفا آئے گئے نام بہت

معصوم انصاری پرتاب گڑھی

تم نے ہونٹ سی دیے جابری کے ڈر سے / اس کے خلاف کوئی گواہی نہ دے سکا
تمام راہ کے پتھر ہٹا دیے میں نے / کہ میرے بعد کوئی دوسرا بھی گذرے گا

نازش پرتاب گڑھی

جو داغ دل کو ملا ہے تری جدائی میں / یہ وہ چراغ ہے جو جھلملا نہیں سکتا

راحت نصری پرتاب گڑھی

ناامیدی مری تقدیر نہیں بن سکتی / میں جو تیرا ہوں تو، تو بھی کبھی میرا ہوگا

سلیم نجیب آبادی:

اس مہ رخسار پہ زلفوں کو بکھیرا ہوگا / ایک مرکز پہ کبھی شام سویرا ہوگا

رحمت الہ آبادی:

آئینہ خود تھا حیراں انہیں دیکھ کر / آئینہ دیکھ کر کیوں وہ شرما گئے

[illegible] الہ آبادی

زندگی کٹ گئی امیدوں پر / زندگی کٹ گئی یہی غم ہے

نثار الہ آبادی

تب بھی ہوگا کوئی زنجیر بہ نثار لیلیٰ / قیس کی طرح بیاباں میں بسیرا ہوگا

فنکار الٰہ آبادی:

یہ دل کی بات ہے سب کی سمجھ میں آ نہیں سکتی
جو دل پر چوٹ کھائے بس وہی فنکار ہو جائے

نسیم الٰہ آبادی:

نکلنے والے مرے ساتھ چلیں یا نہ چلیں
ہیں وہ رہبر وہ ہوں کہ منزل ہی پہ ڈیرا ہوگا

زین العابدین ذرہ:

تمہارے دل برباد ہوں میں
کسی بھولے ہوئے کی یاد ہوں میں

ذوق انظمی

تمہیں خبر بھی ہے منڈلا رہے ہیں یادوں کے
حریم قلب پہ برق و شرر چلے جاؤ

ڈاکٹر ایم۔ایچ ہنر

سادہ کاغذ پہ بھی کیا کیا نہ کرشمے جاگے
جب مرے ذہن میں افکار کا دریا جاگے

احتیاطاً وہ دبے پاؤں چلا کرتے ہیں
یہ سمجھ کر کہ مبتلا دیر سے سوتا ہوگا

دستکارِ اہلِ سخن

ہم اُن چند شعراء کا تذکرہ کر رہے ہیں جو ہنگر یا دستکار ہیں اور جو ترکِ وطن کر کے تلاشِ روزگار میں پچیس تیس برس پہلے آئے اور یہیں کے ہو رہے لیکن پھر بھی اپنا رشتہ توقت توڑا نہیں ہے بلکہ آتے جاتے رہتے ہیں اور ہر ایک آنے والے سے "دل والوں کی بستی" کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں ؎

"خوشبو، پھول، دھنک کی باتیں، پیار کے قصے ان کی بات"۔

محمد یونس زرتابانی محمد یوسف مومن (ولادت بمبئی ۱۹۳۱):

کاتب عربی پرورش ہوئی، اردو چہارم تک تعلیم پائی اور پھر تانے بانے میں الجھ گئے۔ ۵ر ستمبر ۱۹۵۶ء کو ترکِ وطن کر کے بھیونڈی آئے اور پارچہ بافی کو ذریعۂ معاش بنایا۔

نمونۂ کلام:

نام کیوں غیر کا لوں ذکر خدا سے پہلے
زیب دیتا نہیں کچھ اس کی ثنا سے پہلے

گھر میں میرے برف جمی تھی مدت سے تنہائی کی — تیری آمد کے سورج نے آج اسے پگھلایا ہے
دھوپ کے آنچل میں تیری چاہت کے سائے ناچتے تھے — اپنے سر پہ اوڑھ کے جسکو تیرے گھر تک آئے ہیں

نظیر نیئر بن محمد شریف

موضع کمال پور اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ آٹھویں جماعت تک ہندی اور اردو پڑھی ہے۔ ۱۹۶۸ء میں بسلسلۂ معاش بھیونڈی آئے کرگھے کے "دشتل" کی مرمت کرتے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎ ٹھوکر لگی ہے تجھ کو تری ذات سے مگر — سارا قصور راہ کے پتھر کے نام رکھ

حافظ محمد قاسم ولد غلام رسول انصاری آثم سیوانی (ولادت ۱۹۴۰)

۱۹۷۰ء میں ماہ پور سیوان (بہار) سے بھیونڈی آئے پارچہ بافی کرتے ہیں۔ اور بڑے عمدہ شعر کہتے ہیں۔

میرے مکاں کی آگ کا احسان مند ہے — کل رات سارا شہر بڑی روشنی میں تھا
میری تباہیوں سے بہت لوگ بچ گئے — طوفان بستیوں میں گیا میرے گھر کے بعد

نعیم احمد ولد محمد یوسف انصاری فہمی سہسرامی (ولادت ۱۹۴۱)

ساتویں اردو تک تعلیم پائی پھر بنکاری کرنے لگے۔ شاعری کا شوق ہے ؎

صدائیں دے کے بلاتی ہے بار بار مجھکو — وہ رہگذر جو مرے گاؤں جانے والی ہے
وعدہ کر کے بھلا دیا تو نے — کیا گیا میرا، تیری بات گئی

انیس احمد انصاری ولد امیر احمد انصاری انیس اعظمی (ولادت ۱۹۶۱)

پرائمری اردو تک تعلیم پائی، بافندگی پیشہ ہے۔ شعر کہنے کا شوق ہے۔

گھر کی دہلیز پہ جس شخص نے دم توڑ دیا — وہ مسافر تھا کہیں دور سے آیا ہوگا
میرے گھر سے جائیگا لیکر وہ جینے کا چلن — میرا دشمن بھی اگر مہمان بن کر آئیگا

مظہر الاسلام ظہور الحق انصاری (ولادت ۱۹۶۲ء): آبائی وطن قصبہ: بوڑی پٹہ بلگڈھ ہے احمد آباد میں پیدا ہوئے۔ ایس ایس سی تک تعلیم ہے ۱۹۸۴ء میں بھیونڈی آئے اور یہیں بس گئے ہیں

دشت و صحرا میں مجھے آوارہ پھرتا دیکھ کر — کہہ اٹھے بے ساختہ کچھ لوگ دیوانہ ہے
پلٹ تو آؤں میں میدانِ جنگ سے لیکن — سوال سر کا نہیں ہے مرے وقار کا ہے

بھیونڈی کی نئی نسل میں مقامی اور بیرونی ادب ذوق کا طبقہ تیزی سے ابھر رہا ہے۔ مصطفےٰ مومن، مرزا فہد مومن، ظہیر انجم، سلطان اختر انصاری اور ڈھیر سارے طلبہ و طالبات بھی ادبی و شعری صلاحیتوں کو نکھار رہے ہیں۔ جو اخبارات و رسائل میں چھپتے ہیں اور جو ستر بیلے ہیں وہ چھپتے بھی ہیں بھی رہے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

صنعتِ پارچہ بافی کا تاریخی جائزہ اور بنکر برادری کے مسائل حاضرہ

صنعتِ بافندگی، مصنوعات اور مختلف اقسام پارچہ جات کی طرف قرآن پاک میں جا بجا اشارے ملتے ہیں۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا (نحل:۹۲)

"اور اس عورت کی طرح نہ بنو جس نے محنت محنت سے سوت کاتا، پھر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

عورت کا چرخہ کاتنا اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے۔ فردوس دیلمی نے حضرت انسؓ کی جو روایت نقل کی ہے "اول من حاک آدم" اس سے حضرت آدمؑ کا پیشۂ بافندگی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ "شیخ عبدالحق محدث دہلوی و مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا تفسیر فتح العزیز میں بلا تردید نقل کرنا اسکا مؤید ہے نیز از روی درایت یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے گو از روی روایت بعض محدثین نے تضعیف[۱] کی ہے" تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت آدمؑ نے پشمینہ بُن کر کپڑے تیار کئے، اور حضرت حواؑ نے بھی اس کام کو کیا،

مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے کتاب استوال والبۂ اور محدثِ جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نے دستکار اہل شرف (تذکرۂ نساجین) میں مختلف ادوار قائم کرتے ہوئے طبقۂ نبوت، طبقۂ ثانیہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، طبقۂ ثالثہ فقہاء و تابعین اور تبع تابعین، طبقۂ رابعہ محدثین، طبقہ سلاطین، طبقہ صوفیائے کرام اور دیگر مشاہیر کرام کا ذکر کیا ہے جو بافندگی کا ہنر جانتے تھے مولانا عبدالسلام مبارک پوری لکھتے ہیں کہ "حضرت خضر علیہ السلام جن کی دیوار درست کرنے کے لئے ٹھہر گئے تھے وہ انہیں کپڑے بُننے والے حضرت کی اولاد تھے" (الکہف ۷۷-۸۰)[۲]

---

[۱] کتاب الموضوعات ... بعض تصانیف میں اس حدیث (اول من حاک آدم) کو موضوع لکھا ہے، بہرحال اس حدیث پر وثوق مشکل ہے" ایضاً ص۵

[۲] ایضاً ۹۱-۸۸

ایام الجاہلیہ میں بھی یہ صنعت اہلِ عرب کا پیشہ تھا اور علم الصنائع کو بجہ فروغ حاصل تھا' 'طلع الصباح وطفی المصباح' کی مثل جب صبح صادق نمودار ہوتی ہے تو شمعیں گل کر دی جاتی ہیں۔ اسلام کی پو پھوٹتے ہی جاہلیت کی ظلمت کافور ہو گئی اور نورِ اسلام نے صنعتوں کو آسمانِ دنیا کا آفتاب بنا کر چمکایا' مسلمانوں نے صنعت کو صرف عملی حیثیت سے ترقی نہیں دی بلکہ علمی حیثیت سے اس کا فن مرتب کیا' کتابیں تصنیف کیں اصول وضوابط مقرر کئے' صرف ایک یعقوب کندی نے جتنی چیزیں ایجاد کی ہیں اور ایجادات کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں اس زمانہ میں بھی ان کی اہمیت یورپ کی ایجادات سے کم نظر نہیں آتی۔

امہات صنائع (بڑے بڑے پیشے) میں بحیثیت تمدن فلاحت (کاشتکاری) کے بعد دوسرا درجہ حیاکت یعنی کپڑے بُننے کا ہے۔ صنعت وحرفت کے بارے میں ایک قدیم تصنیف اخوان الصفا نے پانچ درجات مقرر کئے ہیں ان کا دارومدار صناعی کے اشیاء پر ہے' عطار اور عطار کا درجہ سب سے بلند ہے' ضروریاتِ زندگی اور احتیاجات جن کی فوری ضرورت ہے اس ضمن میں جُلاہا' کاشتکار اور معمار آتے ہیں' علامہ ابن خلدون نے اپنی بے نظیر تصنیف مقدمۂ ابن خلدون میں تمدن کی ترقی وتنزل اور اس کے تغیر سے بحث کرتے ہوئے نہایت محققانہ باتیں لکھی ہیں' ان کی تحقیق ہے کہ انسان اپنی زندگی میں تمدن کے تین زینے طے کرتا ہے:

ضروری۔ حاجی (حاجت) اور کمالی۔ آخرالذکر میں کل کمالات عقلیہ' ترقیات فنونیہ اور صنعت وحرفت داخل ہیں' تکلفات' آرائش اور ترفہ بھی کمالی میں شامل ہیں۔

صنعتی ترقی میں بلادِ اسلام نے جو ترقیاں کی تھیں وہ تاریخ اسلام کا زرّیں باب ہے خصوصاً پارچہ بافی میں تو مسلم صناعوں نے فنِ کمال کو عجوبہ بنا دیا۔ مغربی اندلس میں شنترین نام کے ایک شہر میں ایسا بے نظیر کپڑا بنایا جاتا تھا جسے صارفین کراماتی کپڑا کہتے تھے' عوام الناس اس کپڑے کے بارے میں عجیب عجیب خیالات رکھتے تھے بن خفاکن سے ایک شخص نے اس کپڑے کی تعریف کرنا چاہی لیکن موزوں الفاظ نہ مل سکے اور صرف اتنا اس کی زبان سے نکلا "یہ مجھو کہ یہ کپڑا مکڑی کے جالے سے بڑھ کر ملائم لیکن مضبوط ہوتا ہے"۔ مغربی ریشم تل بافی' مشجر پردے' ریشمی اور اطلسی کپڑے' دیباج' صوف اور سنہری کے پارچے وغیرہ کمالِ تکلفات کے اور آرائش وزیبائش کے لوازمات کے لئے اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ عباسی خلیفہ المستعین (۸۶۶-۸۶۲) کی مادر علیبہ نے ایک قالین ۱۳ کروڑ درہم (۱۳۰۰۰۰۰۰۰) میں اپنے محل کے لئے تیار کرایا تھا

جس میں یاقوت، زبرجد، الماس اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ تبریز کے قالین شہرۂ آفاق تھے، سوزنی کی شہرت کی سرسراہٹیں ہر بزازہ میں سنائی دیتی تھیں۔ یہ تمام صناعیاں مسلمانوں سے مخصوص تھیں اور ہندوستان کے مسلمان بھی سلاطین دہلی اور تاجداران مغلیہ کے زمانے میں صناعی میں اوجِ کمال پر تھے، ایک ایسا مقدس اور منقش عماریاں کے ٹکڑوں سے تیار کیا تھا جس پر پورا قرآن پاک بنا گیا تھا جو ہنگامۂ غدر میں غاصبوں نے انگلستان بھیج دیا تھا۔

قدیم عرب کی حیاکت

"حیاکۃ العرب العرباء" کے عنوان سے سید محمد شکری آلوسی بغدادی نے فن ادب و تاریخ پر اپنی مشہور کتاب بلوغ الارب فی احوال العرب میں ایک طویل باب باندھا ہے، فن بافندگی کے مختلف آلات و اوزار اور متعلقات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے حسب ذیل معلومات بہم پہنچائی ہیں:

"بُننے کے آلات میں سے عرب کے نزدیک ایک آلہ (المُحَف) ڈھرکی ہے جس کے ذریعے بانی میں میخائی ہوتی ہے جس کے بعد ضرورت ہے کہ تانی میں بانی خوب جم کر مضبوط ہو جائے۔ مصر (المصری) نام سنول یعنی (ڈھرکی) کا ہے اور یہ تیزاں (حفہ) وہ لکڑی ہے جس پر بندگان لوگ بُنے ہوئے کپڑے لپیٹتے ہیں (بیلن) اور جس کا نام (حف) ہے دسکوڑ ڈھرکی کہتے ہیں۔ اور بُننے کے آلات (اوزار) میں سے (وشیعہ) ہے جو سیخ نما ہوتا ہے اور ایک لکڑی ہے جس کے سرے پر پیٹو (کنڈا) کے ایسے بنا ہوتا ہے جس سے اندر تاگہ داخل کر دیا جاتا ہے جس کو ہم کہتے ہیں۔ وشیعہ سوت لپیٹنے کا نفیفہ ہے اور یہ وہ لکڑی ہے جس پر (تانی) بُننے والے کپڑے کی بانی لپیٹتے ہیں اور اسکو وشیعہ بھی کہتے ہیں۔"[1]

وشیعہ۔ جس پر سوت لپیٹا جاتا ہے۔

---

[1] کتاب الموال حصہ ۲۔ صفحہ ۹

[2] وشیعہ ریڑ (گول لکڑی) جس پر لپیٹا جاتا ہے پیچ بیچ میں پھیلایا جاتا ہے یا لپیٹا جاتا ہے۔ نفیف جس پر سوت یا دھاگا لپیٹا جاتا ہے۔ وشیعہ (وتاغ) ڈھرکی۔

ثیب۔ جس پر کپڑے بُنے ہوئے تہ کیے جاتے ہیں۔

عدل۔ وہ لکڑی ہے جس میں دندانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس طرح آرے میں دندانے ہوتے ہیں جس سے تانی برابر کی جاتی ہے، اسے راچھ (چھ) یا کوچ کہتے ہیں۔

صیصہ (صیصیۃ)۔ وہ لکڑی ہے جو مضبوط جھوٹے وغیرہ سے بنائی جاتی ہے جب دبڑکی (ہتھیا) کے ذریعہ تانی بانی میں بٹھائی جاتی ہے تو اسی صیصہ کے ذریعہ ٹھوک کر برابر کرتے ہیں۔ یہ بڑا اور وزنی ہوتا ہے جس سے حضرات بافندگان تانی بانی برابر کرتے ہیں۔

نیر: وہ چھوٹی پتلی لکڑی ہے جس میں تاگا لگا رہتا ہے (نیرہ)۔ کپڑے کی بانی کو بھی کہتے ہیں اور جب دوہری بانی کپڑے میں بُنی جائیگی تو کپڑا مضبوط اور پائدار ہو جاتا ہے۔ (ذُو نیرین۔ دوہرا کپڑا بُنا ہوا)

مِداد۔ اس لکڑی (عصا) کو کہتے ہیں جس کے دونوں سرے پر دو سوئیاں لگی رہتی ہیں جس سے کپڑا خوب تنا ہوا رہتا ہے۔

صنارہ، صنار (فارسی چنار)۔ مغزل (سلائی، دبرکی) کے سرے کو کہتے ہیں فارسی میں ماکو اور عام زبان میں 'مکوا' کہتے ہیں۔

کَفَ یا کَفّہ (کھرکوٹ)۔ وہ لکڑی جو تانی کے نیچے رہتی ہے۔

الجمارتان۔ وہ دو کھونٹے جو کھرکوٹ (کفّ) کو اٹھائے رہتے ہیں، اُسے مہرہ، رفیدہ بھی کہتے ہیں، فارسی میں کھونٹا کو تَلِہ کہتے ہیں۔

مثلث۔ نام سے ظاہر ہے۔ تین لکڑیاں، انہیں فارسی میں سُکانہ کہتے ہیں۔

مبرم اور بریم۔ سفید اور سرخ دھاگے کو بل دے کر جو تاگا تیار کیا جاتا ہے اسے کہتے ہیں مُبرَم سلائی کے لیے اور مُبرَم بل کیے ہوئے دھاگے کو کہتے ہیں۔ دوہرے تاروں کے سوت سے جو کپڑا بُنا جاتا ہے اس دوسوتی کپڑے کو بھی عرب مُبرَم کہتے ہیں، مُبرَم اس رسّی کو بھی کہتے ہیں جو دو ڈوریاں ملا کر بٹی جاتی ہیں۔ ہندستان میں بھی دُہرے سوت سے دُوسوتی کپڑا بُنا جاتا تھا۔

نزیرہ: آٹے کی لئی، گوند کی جگہ یا مانڈی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔

شقیقہ: وہ لکڑی جو تانی کے بیچ میں دی جاتی ہے تاکہ تانی کو پھاڑے رکھے جس سے لئی کا پلانا آسان ہو یعنی خوب چپڑ جائے۔

"دم" کے بیچ پھینکا جاتا، بعض جگہ پاؤڑی دپائے رفتار "پوکھری" میں نصب کئے جاتے اور قدمچوں کو یکے بعد دیگرے دبا کر پھر ایک ہاتھ سے شٹل پھینکا جاتا، پھر کنگھی کی مدد سے بانے کے تار کو تانے کے تاروں میں دبایا جاتا۔

اس عمل میں ماہرین فن نے بڑی ترمیمات کی تھیں اور بُننے کا دقت طلب طریقہ آسان ہو گیا عموماً ایک کرگھے پر ایک شخص ہی بیٹھ کر بنکاری کرتا لیکن اطلس اور زربفت کے تاش کی بُنائی کے لیے پچاس کاریگر لگتے تھے، اسی طرح نفیس ململ کی تیاری میں دستکاروں کا ایک پورا عملہ مصروف عمل رہتا اونچی قسم کی نفیس ململ کی بُنائی کے کرگھے میں اکیس بیس آلات جُڑے رہتے تھے جس کے لیے دس کے قریب کاریگروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ریشمی کپڑے کی بُنائی کے لیے بڑی فنی ہنرمندی اور ماہرانہ دستکاری و نفاست کی ضرورت پڑتی تھی۔

کپڑوں کی بے شمار قسمیں تھیں "ہندستان کی پارچہ بافی" میں ان کا ذکر کیا جا چکا ہے، بطور اعادہ اہم پارچہ جات کے نام گنوائے جا رہے ہیں۔

ململ: کئی قسمیں تھیں: ململ بہاری، آب رواں، ہوابفت، شرد ع، ہمرد، گورے (چارخانی)، بیرم، تن زیب، شبنم، محمودی، اطلس، تحن، دیبا، [illegible] شیر، شنگی، خونہ، کیسکو، زربفت، سفتہ، شربتی، کرپ، گزی، بیریا، تینو، زین سکھو، دوسوتی، دوہرا، سماقی، بدا بافتہ، بہران، پرنیاں، چرخ، دریائی، گلبدن، سیمتی، سُندُس، سی جی، عشق، قلندر کرکری، کورچشم، لحمی، خنجری، لاہی، جاجم، جامہ بیری، تلکار، مشجر، نرگسی، چارخانہ، چکن، چوتارا، سوختہ، کتان، طاس، گجراتی، کم خواب، ارس، چشم بلبل، [illegible] مرغول۔

کپڑوں کے نام بڑے شاعرانہ تھے ایک روایتی غزل میں جتنے حسین الفاظ تشبیہات و استعارات ملتے ہیں انہیں سے مرصع ہر کپڑا تھا کہیں [illegible] ن [illegible] بہت [illegible] سے اور کبھی عشق و محبت کی "ستر دلبراں" کی سرگوشیاں [illegible] یہ جنت نظر [illegible] کہیں فردوس گوش۔

رنگائی

کپڑے کی صنعت سے متعلق جو بے شمار لوازمات اور ضروریات درکار ہیں ان میں سے

کپڑے یا سوت کی رنگائی سب سے اہم اور مقدم مرحلہ ہے، پہلے کپاس کے سادہ رنگ میں ساڑیاں رنگی جاتی تھیں، بعد میں رنگ چڑھا کر انہیں دیدہ زیب بنا دیا جاتا۔ اس سے پہلے ساڑی یا کپڑے کی دُھلائی یا بلیچنگ کی جاتی تھی، اس عمل کے بعد ہی کپڑا اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو رنگائی کے آخری مرحلہ میں داخل کیا جائے، اس پیشگی عمل کے بہت سے پہلو ہیں مثلاً کپڑے کو نرم کرنا، داغ دھبے مٹانا اور اس کو سفید بنانا، اس طرح کپڑے کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ رنگ کو زیادہ سے زیادہ جذب کرسکے ان ابتدائی تیاریوں کا رنگائی اور چھپائی سے گہرا تعلق ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ رنگے ہوئے کپڑوں کی ستر فیصد خرابیوں کا سبب یہی ہوتا ہے کہ ابتدائی کپڑا ناقص طور پر تیار کیا گیا تھا یا اس کے ابتدائی عمل میں دقت پسندی سے کام نہیں لیا گیا۔ کپاس اور کپڑے کا مزاج قدرتی ہوتا ہے۔ یوپی کے بعض قصبوں میں درختوں کی چھال سے رنگ بنایا جاتا تھا۔ نیل کے پودے سے نیلا رنگ بناتے تھے۔ احمد آباد میں نیل بہت سستا اور کثرت سے ملتا تھا۔ کپڑے رنگنے کے لئے نیل بڑا کام آتا تھا۔ نیل کے بڑے کارخانے الہ آباد، غازی پور، فیض آباد اور پرتاب گڑھ میں تھے۔ ۱۸۶۹ء کی مطبوعہ کتاب "ہندوستان کے لوگ" کا انگریز مصنف لکھتا ہے کہ رنگاری یا رنگریز زیادہ تر شیخ حضرات ہیں (صفحہ ۱۹۳ - جلد چہارم)

مزدوری کا ایک خاص طبقہ رنگائی اور چھپائی کا پیشہ اختیار کئے ہوا تھا، کامٹی، بھیونڈی، برہانپور، مالیگاؤں اور بمبئی میں سوت کے تاجر بھی زیادہ تر مومن انصاری برادری کے تھے جن میں کچھ رنگائی کا کام بھی کرتے تھے، مگر یہ کام چھیپا برادری کا تھا۔

مالیگاؤں میں چونکہ رنگین ساڑیوں کی بنائی کا رواج تھا اسی لئے وہاں رنگائی کے بہت زیادہ [illegible] تھے، قلعہ چھاپ پکا رنگ کمپنی کے قیام کے بعد رنگائی میں رنگ چوکھا آنے لگا بڑے کارخانہ داروں نے خود اپنے رنگائی کے شعبے قائم کرلئے تھے۔

رنگاری یا کپڑا چھاپنے کا ہنر ایک مخصوص اور منفرد فن ہے اور یہ ایک مخصوص جماعت یا برادری کا پیشہ تھا، احمد آباد، جیت پور اور گجرات کے چند شہروں میں چھیپا برادری یوپی سے آکر یہیں وطن پذیر ہیں، مقامی نومسلم برادری کھتری کہلاتی ہے، یہ رنگاری جماعت بمبئی میں [illegible] آباد تھی۔ یہاں یوپی کا چودھری گھرانا سب سے زیادہ ممتاز تھا۔ جو چھیپے [illegible] کی حیثیت سے معروف تھا۔

ہندستان میں یقیناً بہت سے خاندان حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اولاد و احفاد سے ہوں گے لیکن ان سب میں خلط ملط ہوا ہے؛ بعض ہندی الاصل قبائل نے من حیث المجموع یہ لقب اختیار کر لیا ہے۔ سردار، مہتو، سرپنچ کی طرح چودھری بھی دیہی نظام زندگی کا سربراہ اور محور ہوتا تھا، یوپی میں خصوصاً بدایوں کے مضافات میں چودھری حضرات کے متعدد گاؤں، کھیڑہ بزرگ، عارف پور زادہ، تال گاؤں، ببن، دوگریا، لالی، بری، حسین پور، خاص پوری، گڑپوری، نظام پور، بن گڑھ اور محی الدین نگر خاص ہیں۔ چودھری حضرات دولت و ثروت اور علم و فضل کے اعتبار سے بھی قابلِ ذکر ہیں؛ ان لوگوں کے آبا و اجداد قصبہ بلرام (ضلع ایٹہ) کے شیخ صلاح الدین (متوفی ۸۲۰ھ) کے دستِ مبارک پر مشرف بہ اسلام ہوئے، بیسویں صدی کے آغاز سے بالعموم نئے تعلیم یافتہ چودھری حضرات اپنے نام کے ساتھ صدیقی لکھنے لگے ہیں۔[1]

معین الحق چودھری کا چودھری گھرانا

حاجی لعل محمد معین الحق کے پردادا کا چودھری خاندان قریب دو سو سال سے اتر پردیش شہزادپور الہ آباد میں مقیم تھا، اسی چودھری گھرانے کی مناسبت سے یہ محلہ چودھری محلہ کہلاتا ہے۔ حاجی صاحب کے صاحبزادے حاجی نعمت حسین غدر کے ہنگامہ خیز دور میں بھولپور، مظفر گڑھ، جہاں گنج، مبارک پور اور مئو وغیرہ قصبات و قریات کے رکینِ وطن کے ساتھ اپنے قبیلے کا قافلہ لے کر نکلے۔ ان کی منزلِ مقصود بمبئی تھی یہاں جالی محلہ میں بس گئے؛ جہاں نو آمد کے ساتھ گجرات کی نومسلم رنگاری جماعت جو کھتری کہلاتی ہے آباد تھی۔ حاجی نعمت حسین اور ان کے بیٹے حاجی عبدالحق نے چھپائی کا کاروبار شروع کیا، محنت و رنگین کا صلہ ملا، دیانتداری اور مہارتِ فن و ہنر نے برکت عطا کی، سعادتمند اولاد کی نعمت سے واہب العطایا نے نوازا، معین الحق، مظہر الحق اور (مرحوم) محمود الحق نے تکمیل تعلیم کے بعد کاروبار کو ہاتھ میں لے لیا۔ اور اپنے حسنِ کارکردگی سے ایسا فنی منصب حاصل کیا کہ یہ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ اور آج ہیرا ڈنٹ سلک ہز دریہ، ڈنٹ نیبر کس لمیٹیڈ (گورے گاؤں) رنگائی اور چھپائی (اسکرین پرنٹنگ) کے جدید ترین آلات اور مشینوں سے آراستہ ہو کر دو عظیم الشان کارخانے اپنی نظیر آپ بن گئے ہیں ــــ

---

[1] نجابت یا شرافت یا لباس تقویٰ - مؤلفہ محمد ایوب انصاری، ۱۹۳۸ء الہ آباد۔ صــ ۸ - ۹۔

خودکار "فلیٹ بیڈ" پر جدید مروڑی اسکیم کے تحت جیگر اور جیٹ مشینوں کے ذریعے برقی سرعت سے
ہزاروں میٹر گرے مال، اخباروں کی طرح چھپ کر نکلتا ہے بھیونڈی کے کپڑوں کے "ہر پیکر
تصویر کا پیرہن انہیں کی شوخیٔ تحریر" کا نقشِ فریادی "بنا نظر آتا ہے۔

الحاج معین الحق چودھری (ولادت ۱۹۳۸ء)

سینٹ زیویرس کالج سے بی۔ اے اور ایم۔ اے میں فارسی اختیاری مضمون میں جعفر قاسم
گولڈ میڈل حاصل کیا، پھر طلبہ کے ثقافتی تبادلے کے پروگرام کے تحت مصر (قاہرہ) چلے
گئے ... اس متاعِ عزیز اور جنسِ گرانمایہ سے قاہرہ یونیورسٹی میں گرم بازاری پیدا ہو گئی، والد
بزرگوار کی بے وقت رحلت نے 'زلیخائے علم' کی مشاطگی کی تکمیل سے محروم کر دیا، کاروبار
کے گیسو سنوارنے لگے اور آج بفضلِ ربی عمائدینِ شہر کے سلسلۃ الذہب میں چاند کی
طرح گوندھے گئے ہیں اور رسالۂ شہر کے "واسطۃ العقد" بن کر ہر ادبی محفل، تعلیمی
جلسے اور علمی ادارے کو تابندگی بخشتے ہیں۔

انجمن اسلام ممبئی کی مجلس عامہ (کونسل) کے عرصے سے رکن ہیں، ۱۹۸۳ء سے
آج تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ ممبر منتخب ہوتے ہیں، جامعہ ملیہ دہلی کے کورٹ
کی بھی رکنیت حاصل ہے۔ اردو اکادمی کے ممبر رہ چکے ہیں، بیگم جمیلہ حاجی عبدالحق ٹرسٹ کا
قیام [illegible] زبان کے لئے صدقاتِ جاریہ کا وسیلہ بن گیا ہے، بڑے مجلسی آدمی ہیں اور بڑے باذوق
یہ اس زمانے کی بات ہے جب تشنہ جون تھا تو آپ نے اربابِ ذوق کے ساتھ [illegible] اردو،
فارسی اور عربی کی ادبی [illegible] پیش [illegible] قائم کی تھی، شہر کی ساری ادبی ہستیاں حسن و جمال کی
[illegible] اور شعر و سخن کی زور بیانیاں [illegible] کے ہر جلسے میں کھنچی ہو جاتیں اور ہر کوئی "تماشائی
نیرنگِ تمنا" [illegible] اور [illegible] کے [illegible] شعر [illegible] ڈھل جاتی ہے

[illegible] گل [illegible] پُرخیال ۔۔۔ ہے گلستاں نگاہ کا سامان کئے ہوئے

لیکن افسوس اب وہ ساری بزم آرائیاں نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں [illegible]
[illegible] [illegible] سے بھی [illegible] دلبراں [illegible] پھر بھی [illegible]
[illegible] بہت ہیں، جب بھی ملتے ہیں تبسم سے پذیرائی کرتے ہیں اور تکلم [illegible] شربانی
[illegible] اور [illegible] سلسلۂ کاروبار کے تعب [illegible] اور [illegible] ہیں آپ
کے بھائی الحاج [illegible] [illegible] کے ناظر علی ہیں ان کے بھی تین بیٹے ہیں، ظہیر،

سراج اور مبین۔ معین الحق چودھری کے داماد صلاح الدین عثمانی اسی فرم میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کا سارا کاروبار سنبھالتے ہیں۔

بُنکر برادری کے مسائل

ہندستان کی پارچہ بافی کی اقتصادی، معاشی اور صنعتی تاریخ، عروج و زوال، گرم بازاری اور کساد بازاری، صنعتی انقلابات اور نت نئی اختراعات کے تانے بانے میں الجھی ہوئی ایک 'لذیذ حکایت' ہے جس میں نہ افسانہ طرازی ہے اور نہ سحر آفرینی، بلکہ میری سنو جو گوش حقیقت ہوش ہے، ساہوکاروں اور مہاجنوں کے استحصال کی داستان دیار پورب پر مشتمل باب "پورب دیس کے نورباف" میں پڑھ چکے ہیں، فسادات، تکوینی حوادث یعنی وبا، سیلاب اور قحط سالی کی آسمانی مصائب نے صنعت کے تار و پود کو جڑ سے کئی بار اکھاڑ پھینکا، مگر یہ شاہ مدار ــــ اور یہ شاہ مدار اجنبی دیسوں کے غاصب اور ظالم تاجر تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر نے جس بزدلی اور چالبازی سے سیاسی تسلط جمایا اور فرنگی تاجر سے تاجدار بنا اور سوداگر سے سیاسی بازیگر بنا ــــ یہ ہماری تاریخ کا المیہ اور خونچکاں داستان ہے، پھر تقسیم ملک کے بعد بنکر برادری نئے مسائل سے دوچار ہونے لگی۔ مومن۔ انصاری برادری کا یک معتد بہ حصہ جنگ آزادی میں حصہ لینے کے لئے کھدر پوش بن گیا، ہندستان کی کسی مسلم پیشہ ور جماعت یا فرقے نے انگریزی استبدادیت و تسلط کے مقابلے میں اتنی مسلسل جارحانہ جنگ نہیں لڑی جتنی اس بافندہ برادری نے لڑی ع ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی۔ پاور لوم کی ملیں جو ۱۸۵۳ء سے قائم ہوئیں۔ آزادی کے بعد گویا ہینڈلوم سیکٹر کے لئے خطرہ بن گئیں، حکومت کی پالیسی سے کم از کم یہی معلوم ہوتا تھا، ادھر انفرادی یا پرائیویٹ سیکٹر کے کارخانہ داروں نے اپنی گٹھ جوڑ ہٹ کی سجدہ بندی اور باہمی مسابقت میں پاور لوم کا شور و غلغلہ بلند ہونے لگا، ورگو تجارت اور صنعت کی گونج بھی بلند آہنگ بن گئی مگر نئی پالیسیاں، نئی بندشیں اور نئے قانون کی زنجیروں کی جھنکار سے کارخانوں کا شور دب جاتا اور کبھی بنکر کا ہاتھ جکڑ جاتا، مہنگائی در دوامی کساد بازاری اس صنعت کی سب سے مہلک بیماری ہے جس کا مداوا آج تک کوئی مسیحا نہ کر سکا۔

پارلیمان میں بھی پاور لوم کی صنعت کا کوئی نمائندہ یا ترجمان نہ تھا جو اس صنعت کی بقا و تحفظ کے لئے آواز اٹھاتا، یوپی کے رہنما برادری کے بڑے درد مند فرد جن انصاری جب تک

برسراقتدار رہے اور جیتے رہے، ہم صنعت کے امین بنے رہے، بھیونڈی، مالیگاؤں اور دھولیہ کے پاورلوم مالکان سے برابر رابطہ رکھتے تھے۔ راجیہ سبھا میں ممبر ہونے کے بعد پاورلوم سے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے تھے اور وزراء سے ملاقات کرکے صورت حال میں بہتری پیدا کرنے کی کوششیں کرتے رہتے۔[1] حکومت بھی بظاہر بڑے اخلاص و ہمدردی سے صنعت پاور لوم کے تانے بانے سلجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب پارچوں کی سانس اکھڑنے لگی تو انہیں قومیانے کا قانون منظور کیا گیا اور فی الحال نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن (این ٹی سی) کی تحویل میں ۱۲۴ ملیں "طفیلی" بنی ہوئی ہیں جن کے مالی خساروں کی امربیل حکومت کے سر بقدر بڑھتی جا رہی ہے۔ حکومت نے اب تک پاورلوم صنعت کے مسائل سے متعلق کئی کمیٹیاں تشکیل دی ہیں۔ شیورامن کمیٹی، شوک مہتا کمیٹی، عابد حسین کمیٹی کی سفارشات پر حکومت نے غور و خوض کیا اور چند سفارشات پر عمل پیرا بھی ہوئی۔ ۱۹۸۵ء کی نئی ٹیکسٹائل پالیسی بھی حسین خوابوں کو جنتی رہی لوم مالکان کو مناسب قیمت پر یارن مہیا کرنے کا حسین وعدہ کبھی شرمندہ وفا نہ ہو سکا[2] اس حسین خواب کی تعبیر بڑی بھیانک نکلی، آندھرا پردیش، برہانپور، ناگپور، دھولیہ، مالیگاؤں، جبل پور، اچل کرنجی اور بھیونڈی کی تنگ و تاریک گلیاں سراسر اشانتی کا، سرڈیورس کی غلامی میں جا بسے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

مومن۔ انصاری اور او، بی، سی کا تصدیق نامہ

مومن۔ انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ کا ہر قاری بلاشبہ یہ کہنے کے موقف میں ہوگا کہ یہ پچھڑی ہوئی اور پسماندہ پیشہ ور جماعت تھی، تعلیمی، علمی، صنعتی و سماجی سطح پر اتنی اونچی اٹھ گئی ہے کہ سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ رہی ہیں گویا، وحشت بلاں کا منظر ہے ؎

آں روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمای عالمی خواہی شد

پھر بھی کچھ لوگ ہیں کہ وہی پسماندگی کا گھسا پٹا راگ الاپ رہے ہیں اور ہر وزیر کے

---

[1] [illegible] ۲۹ نومبر ۱۹۹۱ء مضمون ایک پاورلوم صنعت [illegible] سیکریٹری کے خود [illegible] پاورلوم صنعت [illegible] یونین بھیونڈی

[2] [illegible] ۲۳ جنوری ۱۹۹۲ء مضمون [illegible] پاورلوم صنعت کے یوسف حسن مومن

آستانے پر جاکر مراعات ورعایت طلبی کا کشکول آگے بڑھاتے ہیں' اور وہی 'او بی سی' کی گدا گری کرتے ہیں" اور درویش کی صدا کیا ہے!"۔۔۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا پورا سماج اور پوری نظام زندگی سفارش، رشوت اور ریشہ دوانیوں میں جکڑا ہوا ہے تو ہمارا 'مطلب' کھل کر نظر آتا ہے آج صرف قابلیت کی کنجی سے نہ تو کالجوں میں داخلہ ملتا ہے اور نہ صلاحیتوں کے زینے پر چڑھ کر ملازمت کی کرسی ملتی ہے' او بی سی کی سرٹیفکٹ سے لمبی قطار میں آگے جگہ ملتی ہے اولیت اور ترجیح ملتی ہے یا نہیں لیکن 'خانہ پری' ضرور ہو جاتی ہے۔

سب سے پہلے مومن۔ انصاری برادری پر اتر پردیش حکومت کو رحم آیا اور اسے پسماندہ طبقات میں شامل کرکے زیر بار احسان کیا' اور ۱۹۵۰ء میں احکامات بھی صادر کیے' بنگال کے تانتی بنکروں اور کرناٹک کے شالی اور کوشٹی جولاہوں کے ساتھ مومن بنکر بھی خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے۔ مہاراشٹر حکومت نے ۱۹۶۷ء کے حکنامے میں سیریل نمبر ۷۵ میں 'او بی سی' کی فہرست میں جولاہوں کو بھی شامل کر دیا' 'مومن' عرف کو نظر انداز اور انصاری لقب کو مسترد کر دیا' مراٹھواڑہ کے مومنوں کو رعایتیں ملنے لگیں جبکہ دوسری جگہوں کے انصاریوں کو او بی سی سرٹیفکٹ اس لیے نہیں دیا گیا کہ حکام بالا اور ارباب حل و عقد پر یہ عقدہ کھلا نہیں کہ مومن اور انصاری کی اصلیت کیا ہے؟ جبکہ سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ کے ارباب اقتدار تو کسی دستاویز کو اہمیت دیتے ہیں اور نہ حقیقت واصلیت کو مانتے ہیں۔

اس سلسلے میں مومن رہنماؤں نے وزراء سے مل کر مومن' انصاری اور جولاہے کے "فرق بین تفریق" کے سارے امتیازات مٹا دیے، دلائل سے ثابت کیا کہ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔ اور چاہے آپ بنکر کو کسی بھی نام سے پکاریں مومن بھی وہی ہے اور انصاری بھی وہی ہے

بہر طرزی کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم

مرحوم ضیاء الرحمٰن انصاری جب یک دفعہ بمبئی آئے تو مومن کانفرنس کا یک وفد ان کی سربراہی میں وزیراعلیٰ ایس بی چوان سے ملا' وزیراعلیٰ موصوف نے یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ ہفتہ عشرہ میں مطلوبہ احکامات جاری کر دیئے جائیں گے۔ ہفتہ عشرہ کی مدت کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ حکومت کے "شب و روز و ماہ و سال" کا کیلنڈر یا تقویم مختلف ہے۔ ضیاء الرحمٰن انصاری نے اس بارے میں چوان صاحب کو خط بھی لکھا تھا' مختار احمد انصاری وزیر مملکت برائے صنعت و فلاح و بہبود حکومت اتر پردیش نے بھی اپنے ہم منصب وزیر مہاراشٹر کو بھی اسی

مضمون کا ایک خط لکھا تھا۔

جرنی مسجد (مدنپورہ بمبئی) ٹرسٹ کے صدر یاسین انصاری نے بھی نہال احمد انصاری سے زیر بحث مومن۔ انصاری عرفیت کی یکساں معنویت و اصلیت کے بارے میں بتایا تو حزب مخالف کے لیڈر موصوف نے بھی شری ایس بی چوان کو یاد دلایا سہ

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

سوشل ڈپارٹمنٹ کے آفیسروں سے ملاقات کی گئی تو وزرا کی جانب سے تصدیق ہو جانے کے بعد بھی وہ قلم کو جنبش نہ دے سکے کیونکہ انہیں تحریری ثبوت کے طور پر دیگر دستاویزات کی طلب تھی۔ کتابیں پیش کی گئیں، حکومت یوپی کا ۱۹۵۸ء کا سرکولر دیا گیا لیکن یہ تمام ثبوت مہیا کر دینے کے باوجود ابھی تک معاملہ [illegible] ساٹھ سے زیادہ افراد پر مشتمل انصاری برادری کے ایک نمائندہ وفد نے وزیر اعلیٰ شری چوان سے ان کی رہائش گاہ ورشا پر ملاقات کی تھی مولانا ضیاء الدین بخاری کے علاوہ جناب سید احمد اور شری بی۔ڈی۔ زدے بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔ وزیر اعلیٰ نے یہ یقین دلایا تھا اور اعلان کیا تھا کہ وہ جلد ہی انصاری برادری کو او بی سی میں شامل کرنے کے احکامات جاری کرا دینگے، اس اعلان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن شری چوان صاحب آج بھی ریاست کی وزارت اعلیٰ پر جلوہ فگن ہیں لیکن ان کا حکم دفتری فائلوں میں چھپا پڑا ہے۔

راقم کی یہ حقیر تصنیف مومن انصاری برادری کی تاریخی دستاویز ہے۔ اللہ کرے اسی کے محبت سے انصاری اور مومن ایک ہو جائیں (آمین)

حرفِ آخر

۵ر ستمبر ۱۹۹۲ء کو جب میں نے "مومن۔ انصاری برادری کی تہذیبی تاریخ" لکھنے کے لئے "چل مرے خامہ بسم اللہ" کہہ کر اپنا تحریری سفر شروع کیا تو میرے گذرگاہِ خیال پر یادوں کا قافلہ میرے ساتھ ہو گیا ــــ اور آج ۲۴ر نومبر ۱۹۹۳ء کو جب میرا یہ تحریری سفر منزلِ مقصود پر پہنچ کر ختم ہو رہا ہے تو میں اپنے قلم کو سرنگوں کر کے اس معبودِ حقیقی کا شکریہ ادا کر رہا ہوں جس نے مجھے لکھنا سکھایا اور میرے قلم کو توانائی عطا فرمائی اور کامیابی سے ہمکنار کیا۔ وما التوفیق الا من عند اللہ۔

ــــ اس خالق کا شکریہ جس نے مجھے پیدا کیا، دن اور تاریخ اور سن یاد رکھنے اور لکھوانے کا رواج عام نہ تھا، لیکن جو حساب مقرر کر دیا گیا وہ دس مارچ سنہ ۱۹۲۹ء ہے۔ مدتِ عمر کے طویل سفر کے گرد و غبار میں سے اپنے بچپن کی کچھ دھندلائی ہوئی کجلائی ہوئی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں ــــ

اس صنعتی بستی کا دل کرگھوں کے ضرب سے دھڑکتا رہتا تھا، شام کا دھندلکا پھیل جاتا تو سناٹا سانس لینے لگتا، مسلمان محلوں میں کھیلتے ہوئے بچوں کو گھر بلا لیا جاتا (کیونکہ نبی کریم صلعم کا ارشاد ہے کہ "جب شام ہو جائے تو چھوٹے بچوں کو گھر میں روکے رکھو اس لئے کہ اس وقت شیاطین زمین پر پھیل جاتے ہیں البتہ جب گھڑی بھر رات گذر جائے تو ان کو چھوڑ سکتے ہیں" (صحاح ستہ، حصن حصین)۔ گھڑی کا وقت ختم ہوتے ہی ابا جن کے پاس صرف ایک کرگھا تھا ساڑی تن کر بیچ کر آتے تو گھر میں ساگ پات پکتا ورنہ روکھی سوکھی کھا کر ہم بچے جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے ہوئے تین سو بجلی کے کھمبوں میں روشن قمقموں کی پھیکی روشنی میں گلیاروں میں کھیلنے کے لئے پھیل جاتے۔

بھرپور چاندنی رات ہوتی تو سڑکوں کی قندیلیں بجھا دی جاتیں، روشنی کے کھمبے بینائی سے محروم نابینا کی لاٹھی کی طرح ساکت کھڑے بچوں کا شور و غل سنتے رہتے ــــ اور عورتیں اوٹوں پر بیٹھ کر چاند کے اُجالے اور روغنی چراغوں کی کپکپاتی ہوئی روشنی کا پیوند لگا کر چرخہ کاتنے بیٹھ جاتیں، میری اماں اور تینوں بہنیں سوت کاتتی رہتیں اور ہم بچے اماں کی کہانی سنتے سنتے نیند کے ہلکورے کھاتے کھاتے خوابوں کے جزیرے میں پہنچ جاتے ــــ چاندنی کے

بلوریں خول میں ملفوف سناٹا کبھی کبھار چھناکے سے ٹوٹ جاتا جب کھیتوں میں کبھی شبگرد
کی چوکنی آہٹیں سن کر مہجور چکور فضا میں چیخ کی ایک صوتی لکیر کھینچتا ہوا چاند کی اُور دیوانہ
وار تیزی سے اُڑ جاتا ۔۔۔ چرخے تھم جاتے۔ صبح کی اذان بلند ہوتی تو خاموشیوں کے سارے سُر
شور ہنگاموں کے ساگر میں ڈوب جاتے صرف مسجد کے بڑے حوض میں نمازیوں کے وضو کرنے سے
دھیمے سروں میں کبھی کبھار جلترنگ سی بج اٹھتی ۔۔۔ اور ایسی ہزاروں جلترنگوں کی دُھنوں
سے سارا قصبہ گونجنے لگتا جب اُودی گھٹاؤں کے تام جھام سے ترکر برسات کی جل پریاں دھرتی
پر رم جھم برسانے لگتی تھیں اور چھاجوں برستے ہوئے پانی میں ہم ٹپکنے والی چھت کے نیچے نہ سو
سکتے تھے اور نہ دلدل بھری سڑکوں پر جا سکتے تھے۔

۔۔۔ میرے تخیل کے مدفن میں فراموشی کی منوں مٹی تلے سے کبھی کبھار وہ درد و الم میں
ڈوبی ہوئی کربناک رات اٹھ کھڑی ہو کر مجھے ڈرانے لگتی ہے جب میں اپنے رشتے کے بھائی
پیر محمد بھتو کی گود میں سے اپنے ابا کی میت دیکھنے لگتا ہوں، وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
آج بھی میری یادوں کی شکستہ دیوار سے ٹکراتا ہے، زندگی کو موت کے محمل میں سوار ہوتے
میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا جب میں مشکل سے چار سال کا تھا، ابا کے ساتھ گزری ہوئی چند روز
کے ٹوٹے ہوئے نقوش آج بھی میرے حافظہ کی کال کوٹھری میں محفوظ ہیں۔

ابا کے مرنے کے بعد پورے کنبہ کی پرورش میری اماں اور بہنیں چرخہ کات کر اور بڑے
بھائی رحمت [illegible] کرتے رہے۔ پھر میرے تخیل کی گرفت میں وہ شاداب لمحے آگئے، جب میں
شیخ کے فضل رحمانی مدرسے میں پڑھنے جایا کرتا تھا جبکہ میرے دوست چوتھی جماعت پاس
کر کے ہائی اسکول میں پڑھنے لگے تھے اور میں حفظ کرنے لگا تھا کیونکہ امی کی خواہش مجھے
حافظِ قرآن بنانے کی تھی۔ میں بڑی حسرت سے اپنے ہمجولیوں کو اینگلو اردو ہائی اسکول
جاتے دیکھتا اور انگریزی گٹ پٹ کرتے سنتا اور مجھے بڑا رشک آتا تھا۔ میری امنگوں نے
مجھے بھی اکسا دیا اور ضد کر کے میں بھی اسکول جانے لگا ۔۔۔ لیکن فیس کون ادا کرتا، رشتے
سے ماموں ہوتے ہی عبدالصمد سیٹھ صاحب کا فیضانِ کرم شامل تھا، انہوں نے فیس معاف کر دی اور
میں معافی یافتہ طالبعلم کلاس کے ایک کونے میں چپکے سے بیٹھنے لگا، میرے ہم مکتب پادرام
اور کارخانہ دار سیٹھوں کے خوش پوش لڑکے۔ میرے ہم درجہ نہ تھے بلکہ مجھ سے اونچے
تھے کیونکہ انہیں اگلی بنچوں پر بٹھایا جاتا اور کچھ اساتذہ ان کا بڑا خیال رکھتے اور دلجوئی

کرتے رہتے جبکہ میں ایک نادار وظیفہ خوار سہما ہوا طالبعلم اس مجمع میں جنگلی جیسا لگتا تھا، ایک گمنام جُنکر خاندان کا فرد، پڑھنے لکھنے میں گو پورا نہ تھا لیکن غم کھانے میں بردا ول ناکام بہت تھا۔۔۔ احساسِ کمتری کا دباؤ بڑھتا گیا، حفظ کرنا چھوڑ کر معتوب بن گیا، اماں کی تمناؤں کا تانا بانا اُدھڑ گیا، اس کچی عمر میں بھلا کیوں گردشِ ایام سے دل نہ گھبراتا۔۔۔ مانع وحشت زوردی کوئی تدبیر نہ تھی۔۔۔ ایک دھوپ سے بھری دوپہر میں کتابیں چھپا کر گھر سے بھاگ نکلا، گیارہ سال کی عمر، ایک ہی راستہ معلوم تھا اور ایک ہی شہر کا نام یاد تھا، کلیان۔۔۔! آلام سے اٹی ہوئی اس ویران بستی کی طرف۔ کچی سڑک پر میں چل نکلا بھلا کتنی دور تک اکیلا تنہا، بھوکا پیاسا چل سکتا تھا، سنسان سڑک پر ایک کُنبی (کاشتکار) بڑھیا اور اس کے بیٹے نے رحم کھا کر مجھے اپنی بیل گاڑی میں بٹھا لیا۔۔۔ اور کلیان کے پل کے پاس ''کون'' گاؤں میں اتار دیا، پل کے اس پار کلیان تھا۔۔۔ آج سے پچیس سال قبل میں نے اپنی تصنیف تاریخ کوکن میں جب کلیان کی 'عظمت پارینہ' کے بارے میں لکھ تو۔۔۔ اس وقت بھی مجھے اپنے بچپن کا یہ حادثہ یاد آگیا تھا۔ اور آج پھر گوناگوں کے رنگ وروغن کی بلوریں دھنک ٹوٹ چکی ہے۔ اس کی کرچیاں بٹورتے بٹورتے میرا سارا تخیل لہولہان ہو رہا ہے۔۔۔!

بندر محلہ کی مسجدوں سے مغرب کی نماز پڑھ کر نمازی نکل رہے تھے میں نے یک بار ریش کو کئی جوان نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہا تھا گھبرا کر کلیان اسٹیشن کا راستہ پوچھا اس کے استفسار پر میں استفہامیہ نشان بن گیا، جواب بن نہ پڑا تو چھلکتے ہوئے آنسوؤں نے راز اگل دیا میں بیکسی کی شرم سے رونے لگا۔ لوگ اکٹھا ہو گئے، کچھ لوگ ہمدردی جتانے لگے ودلٹے کر کے بھیونڈی کی طرف جانے والی ایک پرائیویٹ بس میں مجھے پولس کی مدد سے بٹھا دیا۔۔۔ میں صبح کا بھولا تھا شام گھر لوٹ آیا، مجھ پر جو بیتی تھی گزر گئی۔ جھوٹ اس زمانے میں بڑا سہارا تھا اور نجات دہندہ!!

۔۔۔ پھر میرے اندر کا سویا ہوا ''مردِ مومن'' بیدار ہو گیا اور میں اس قصبہ کے بڑھتے ہوئے شور و غل کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا، بھائیوں کی مالی مدد سے محسنوں کی اعانت سے اور اپنی محنت و ریاضت سے راہ علم میں بڑھتا گیا اور بڑھتا گیا۔۔۔ مگر آج بھی میں اپنے آپ کو ایک طالبعلم ہی سمجھتا ہوں۔ مگر جو پہلے صبح کا بھولا تھا۔ پھر شام کا بھولا بنا

اب شعیب کو گھر لوٹ آیا ہے، اور جب میں اپنے پرانے گھر کی طرف سے کبھی کبھار گذرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ یہ بستی ساری کی ساری بدل گئی ہے، صنعتی انقلاب کے جلو میں مالی خوشحالی جبت آئی ہے رنگ بدل گئے ہیں قدریں بدل گئی ہیں، گھر بدل گئے، اور دل بدل گئے — اور وہ میرا اپنا گھر بھی بدل گیا اور — اوٹا جس پر بیٹھ کر میری اماں چرخہ چلاتی تھی اور چاند اور بڑھیا اور اس کے چرخے کی کہانی سناتی تھی — وہ "اوٹا" اب نظر نہیں آتا۔ مگر مجھے وہ کہانی آج بھی یاد ہے۔

"چاند میں ایک بڑھیا ہے جو چرخے پر سوت کاتتی رہتی ہے، وہ ہمیشہ سے چاند پر رہتی چلی آرہی ہے اور ہمیشہ وہیں رہے گی ...."

— مگر میں اب یہ کہانی اپنی اکلوتی بیٹی رخشندہ کے لڑکے شعیب اور بیٹی نظورہ کو سنا نہیں سکتا جب وہ مجھ سے فرمائش کرتے ہیں "نانا ابا آپ ہمیں وہ اسٹوری سنایئے وہی آرم اسٹرونگ کی مون والی اسٹوری جس میں ایک بڑھیا تھی چرخہ تھا، وہی جو آپ کی ممی سنایا کرتی تھیں"۔

— لیکن میں انہیں کیسے بتاؤں کہ اب چاند بھی بدل گیا ہے، اور وہ بڑھیا بھی نہیں رہی اور نہ اس کا چرخہ" — اس کہانی کا تانا بانا ٹوٹ چکا ہے چرخے کی مال ٹوٹ گئی ہے جس کی گردش نے اس کہانی کے تانے بانے کو کاتا تھا، مگر اس بڑھیا کی محنت کا انجام کیا ہوا؟ — یہ میں اپنے بچوں کو ضرور بتلانا چاہتا ہوں"۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا

"اور اس عورت کی طرح نہ ہو، جس نے محنت سے تو سوت کاتا، پھر اس کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا"

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي بِعِزَّتِهِ وَجَلَالِهِ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔

۲۴ر نومبر ۱۹۹۳ء
۲۰۳ سی کریسنٹ مسلہ۔ سات بنگلہ، ورسوا روڈ، اندھیری
بمبئی ۴۰۰۰۶۱

ضمیمہ

کانگریس صد سالہ جشن زیر اہتمام آل انڈیا مومن کانفرنس ۲۸؍ دسمبر ۱۹۸۵ء نئی دہلی کے استقبالیہ کمیٹی اور مومن کانفرنس کی مجلس عاملہ کے عہدہ داران اور اراکین کی طویل فہرست درج ذیل ہے:

عہدہ داران

(۱) ضیاء الرحمٰن انصاری (وزیر مرکزی حکومت۔ دہلی) صدر

(۲) اے۔ آر۔ انصاری (ایم۔ ایل۔ اے کلکتہ) نائب صدر

(۳) محمد ہارون انصاری (سابق ایم۔ ایل۔ اے۔ مالیگاؤں) نائب صدر

(۴) پروفیسر صلاح الدین (ایم۔ پی۔ نئی دہلی) نائب صدر

(۵) محمد صالح (وارانسی۔ بنارس) نائب صدر

(۶) قاسم علی عابد (سابق ایم۔ پی، سلطانپور، حیدرآباد) جنرل سیکریٹری

(۷) حاجی عبدالحمید انصاری (دہلی) جنرل سیکریٹری

(۸) خورشید انور عارفی (پٹنہ) سیکریٹری

(۹) محمد نسیم انصاری (لکھنؤ) 〃

(۱۰) جمیل ساز (ناگپور) 〃

(۱۱) رضی الزماں (کلکتہ) 〃

(۱۲) عبدالحیٔ انصاری (دہلی) خازن

اراکینِ مجلس عاملہ

(۱۳) حافظ محمد ادریس انصاری (پٹنہ)

(۱۴) فدا حسین (ایم۔ ایل۔ سی، پٹنہ)

(۱۵) امانت علی انصاری (سابق ایم۔ ایل۔ اے پٹنہ)

(۱۶) عبدالرؤف وارثی (رہتاس۔ بہار)

(۱۷) مولانا حبیب الرحمٰن نعمانی (سابق وزیر لکھنؤ)

(۱۸) ڈاکٹر شفاعت حسین انصاری (مراد آباد)

(۱۹) شاہ محمد یوسف (بمبئی)

(۲۰) نثار احمد انصاری (ایم۔ ایل۔ سی، ٹانڈہ، فیض آباد)

(۲۱) حاجی نورالدین (علیگڑھ)

(۲۲) ایوب پنجابی (بھیونڈی)

(۲۳) رمضان پاپا (جبلپور)

(۲۴) پروفیسر حنیف انصاری (جبلپور)

(۲۵) مصطفیٰ شیخ (احمد آباد)

(۲۶) نثار احمد انصاری (احمد آباد)

(۲۷) احمد ناصر انصاری (کونسلر) (بھوپال)

(۲۸) تاج الدین نواز بھائی (ولایت - بیدر کرناٹک)

خصوصی مدعوئین

(۲۹) محمد امین انصاری (صدر) صوبائی کانفرنس یوپی (الہ آباد)

(۳۰) شیخ حیات انصاری (صدر) مہاراشٹر مومن کانفرنس (اندھیری - بمبئی)

(۳۱) خورشید احمد انصاری (سابق ایم - ایل - اے) (امروہہ)

(۳۲) حاجی محمد مصطفیٰ انصاری (صدر دہلی مومن کانفرنس)

(۳۳) محمود الحسن انصاری (ایم - ایل - اے) (لکھنؤ)

(۳۴) رفیق احمد انصاری (ایم - ایل - اے) (بریلی)

(۳۵) مولانا صدر الدین انصاری (ایڈوکیٹ) (جمعیۃ العلماء ہند - نئی دہلی)

(۳۶) خلیل انصاری (ایم - پی - اے پٹنہ)

کل ہند مومن کانفرنس - صدسالہ جشن کمیٹی

ضیاء الرحمٰن انصاری (صدر) (وزیر مرکزی حکومت)

امانت علی انصاری (کنوینر)

اراکین

بہار : پروفیسر صلاح الدین انصاری (ایم - پی) - محمد خلیل انصاری (ایم - ایل - اے)
خالد انور انصاری (ایم - ایل - اے) - عبدالرؤف وارثی

دہلی : حاجی عبدالحمید انصاری؛ عبدالحیٔ انصاری؛ حاجی محمد مصطفیٰ انصاری؛ ایم یعقوب انصاری

بنگال : فرزند علی انصاری؛ عبدالرؤف انصاری (ایم - ایل - اے)؛ رضی الرحمٰن انصاری

مدھیہ پردیش : رمضان بابا، حاجی احمد انصاری

گجرات : محمد مصطفیٰ انصاری، پروفیسر نثار انصاری

مہاراشٹر : محمد مصطفیٰ مومن، حیات انصاری

کرناٹک : تاج الدین نواز بھائی

اُتر پردیش : محمد امین انصاری، نثار احمد انصاری (ایم-ایل-سی)، نسیم انصاری

بھیونڈی: جمعیۃ المومنین (سنہ ۱۹۳۲ء تا سنہ ۱۹۳۴ء)

سنہ ۱۹۳۲ء میں جمعیۃ المومنین کی بنیاد پڑنے کے بعد جنوبان باڑی میں ایک جلسۂ عام ہوا۔ محمد عمر محمود نے جو بمبئی کے اردو سکولوں کے سپرنٹنڈنٹ تھے جلسہ کی صدارت فرمائی یہ جمعیۃ کے سیکریٹری تھے، محمد عمر رجب (مدنپورہ بمبئی) نے جلسے سے خطاب کیا، مومن برادری کے یہ پہلے فرد تھے جو جنیوا (آسٹریا) عالمی مزدور کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندہ بن کر گئے، دو سال بعد دوسرے جلسے کی صدارت مالیگاؤں کے مشہور وکیل اور خادم قوم شیخ عبدالعزیز عبداللطیف نے کی، کرلا میونسپلٹی کے صدر، برادری کے ممتاز اور مخیر فرد عبدالرحمن فیت والا نے بھی شرکت کی۔ بھیونڈی کی جمعیۃ المومنین کی مجلس عاملہ کے عہدیداران مندرجہ ذیل افراد تھے:

محمد یعقوب جعفر۔ (میونسپل کونسلر) صدر

سیٹھ عبدالصمد حاجی علی محمد مومن (نائب صدر بلدیہ بھیونڈی) نائب صدر

منشی عبداللطیف۔ سیکریٹری

میاں جی جیون۔ نائب سیکریٹری

منشی محمد یٰسین محمود۔ خزانچی

صدرالدین بدل سیٹھ۔ محاسب

اراکین مجلس عاملہ: محمد یوسف جان محمد خواجہ، کامریڈ عبدالغفار، محمد سیٹھ، محمد یعقوب

ضمیمہ ۸

بھیونڈی ویورس ایجوکیشن سوسائٹی۔

فہرست ممبران مجلس عاملہ

(یکم اپریل ۱۹۹۳ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۹۶ء)

شریف حسن رمضان مومن	صدر
ایڈوکیٹ نثار ایم کھربے	نائب صدر
ایڈوکیٹ نیاز مومن	نائب صدر
ڈاکٹر عبدالمنان انصاری	خازن
محمد حسن محمد بشیر بھوپالی	اعزازی سیکریٹری
نیاز رمضان مومن	جوائنٹ سیکریٹری
یوسف حسن مومن	چیرمین ہائی اسکول کمیٹی
ڈاکٹر عبدالرؤف عبدالقدوس مومن	چیرمین پرائمری اسکول کمیٹی

ممبران

عبدالرشید طاہر مومن۔ سعید احمد عبدالرؤف پنجابی۔ مشتاق موسیٰ رضا مومن۔ محمد یٰسین عبدالرحمن دادا اقبال احمد عبدالرؤف پنجابی۔ سکندر محمد یونس انصاری۔ محمد حسن محمد خلیل مومن۔ خورشید حمید اللہ مومن۔ عبدالحفیظ حافظ محمد حسین مومن۔ غلام محمد غلام نبی۔ ایڈوکیٹ سعید انصاری۔ بدرالدین محمد عیسیٰ انصاری۔ انصاری اسرار حکیم الدین (کامریڈ)۔ نیاز عبدالقادر انصاری، عتیق احمد محمد طیب سیکریٹری مسلم ریڈنگ چیرمین مسلم آرفینیج۔

خاص مدعوئین

عرفان محمد ایوب پنجابی۔ نصیر غلام رسول مومن۔ نصیر عبدالمجید (پپّو سیٹھ)، عبدالملک عبدالخالق چٹائی والا، عبدالمجید پنجابی، ایڈوکیٹ انیس محمد یعقوب مومن، محمد یوسف عبدالمجید انصاری، شبیر احمد محمد حسین سیانجی۔ عبدالرحیم محمد اسمٰعیل، نثار احمد عبدالشکور مومن، ایڈوکیٹ مختار حسن۔ ڈاکٹر جاوید خلیل شاہجہاں۔ ڈاکٹر ابرار مومن۔

مومن لائبریری

۹۲، بنگال پورہ، بھیونڈی

مجلس منتظمہ برائے سال ۹۴-۱۹۹۳

نام	محلہ	شہر	عہدہ
• نثار احمد رمضان مومن	بنگالپورہ	بھیونڈی	صدر
• مختار احمد جمن	کوٹر گیٹ	"	نائب صدر
• اتیق احمد محمد ابراہیم مومن	صمد نگر کنیری	"	سکریٹری
• اقبال عثمان مومن	دایہ محلہ	"	جوائنٹ سکریٹری
• سہیل احمد محمد ایوب	"	"	خازن
• بلال احمد علی احمد	تھانہ روڈ	"	ممبر
• ملک احمد سلیمان	"	"	"
• محمد عرفات نذیر	بنگالپورہ	"	"
• محمد علی ظفر انصاری	"	"	"
• مشتاق احمد برنجکر	پربھوآڑی	"	"
• مشتاق احمد مومن	کنیری	"	"

منتظم لائبریرین — عبدالرحمٰن خیاط

یعقوب محمد یوسف مومن

ضمیمہ

مومن اتحاد کمیٹی اسلام پورہ بھیونڈی کے اراکین

سعید احمد محمد یوسف مومن — صدر

عبدالسمیع عبدالغنی انصاری — نائب صدر

ڈاکٹر امین بھارتی — جنرل سیکریٹری

محمد ایوب محمد عباس انصاری — نائب سیکریٹری

نثار احمد عبدالغنی مومن — خازن

اراکین: سراج احمد محمد عمر مومن۔ رحمت اللہ محمد حسین مومن۔ اقبال احمد عبدالستار بنارسی، عبدالرحمٰن محمد یوسف مومن۔ رضوان احمد محمد حسین مومن۔ مشتاق احمد محمد عمر مومن، نثار احمد محمد صدیق انصاری۔ زبیر احمد محمد اسحاق مومن۔

مومن ویلفیئر سوسائٹی (بنا، ۱۹۹۰)

مجلس عاملہ برائے ۱۹۹۴-۱۹۹۳

یوسف حسن مومن۔ — صدر

محمد نذیر محمد بشیر مومن۔ — نائب صدر

وقار احمد محمد ایوب انصاری۔ اعزازی سیکریٹری

سبحان سکندر انصاری۔ جوائنٹ سیکریٹری

مختار احمد پیر محمد عرف تاب انصاری۔ جوائنٹ سیکریٹری

شریف حسن رمضان مومن۔ — خازن

اراکین: سعید احمد محمد یٰسین (مولد) نفیس احمد عبدالرؤف مومن (ذ مرز)

مختار احمد حسن (ایڈوکیٹ) (ذ مرز)

نگراں اور ناظم: امتیاز احمد محمد ابراہیم

بھیونڈی ویلفیئر سینٹر کی مجلس عاملہ کے ممبران

نام	عہدہ
سراج الدین معین الدین انصاری	صدر
مشتاق احمد عثمان احمد مومن	نائب صدر
ڈاکٹر حسام الدین انصاری	جنرل سیکریٹری
محمد عثمان قریشی	جوائنٹ سیکریٹری
محمد شعیب فقیر محمد مومن	خازن
ڈاکٹر عبدالصمد انصاری	ممبر
عبدالرحمٰن امانت اللہ مومن	〃
فیروز احمد محمد یعقوب پینٹر	〃
کلیم احمد عبدالجلیل مومن	〃
سیماب انور آرٹسٹ	پروپگنڈا سکریٹری
جلال الدین انجینیر	چیرمین ایجوکیشن کمیٹی
نذیر احمد ذاکر حسین مومن	سکریٹری 〃 〃
محمد رفیع انصاری	ایجوکیشن ایڈوائزر
ڈاکٹر حسام الدین انصاری	میڈیکل ایڈوائزر
ڈاکٹر عبدالصمد انصاری	〃 〃
مشتاق احمد عثمان مومن	چیرمین میڈیکل کمیٹی
عبدالرحمٰن امانت اللہ مومن	سکریٹری 〃 〃
فیروز احمد محمد یعقوب پینٹر	اسپورٹس سکریٹری
سیماب انور محمد عمر آرٹسٹ	پروپگنڈا سکریٹری

بنگال پورہ اور پڑوسی محلوں کے نوجوان کاروباری جو شادیوں اور دیگر سماجی و ثقافتی امور میں ہاتھ بٹاتے ہیں

نام	برادری
ابوبکر عبدالکریم	مومن
اسلم یونس	〃
اشتیاق بارا ہادری	〃
آفاق عثمان سردار	〃
اقبال بشیر	〃
اقبال بابو	دھوبی
بشیر بابو	〃
تنویر احمد ذاکر حسین	مومن
سبحان سکندر	انصاری
سعود محمد ایوب	مومن
شکیل عبدالرؤف	〃
شکیل مصطفیٰ	〃
شکیل احمد محمد یونس مستری	〃
شبیر حسن	〃
ضیاء احمد عبدالحئ	〃
طفیل احمد ذاکر حسین	〃

نام	برادری
طفیل صدرالدین	مومن
ظفر الطاف	〃
ظفر اقبال	〃
عابد نور محمد	〃
عارف غلام مصطفیٰ مستری	〃
عقیل محمد حنیف	〃
مرتضیٰ یونس	〃
ماجد عبدالرشید	
نفیس عبدالرؤف	
نسیم صدیق نذیر	〃
ناظم عبدالرشید	〃
نثار نذیر	〃
نثار احمد	دھوبی
نثار احمد عمر	〃
نثار ایوب	انصاری

تیار کپڑوں کو بھاپ steam دینا

سانٹی بناتے ہوئے

منوال = جلاہے کا کرگھا

مہتوا

کرنچ
سیل
تانا
نی (سنگا)
بے (حالا)
پوسال (پوکھرن)
دوبیلن
طور (لبیش)
نال (ڈھوٹا)

نال (ڈھوٹا، شٹل)

تیلی

پکھو تیری

مکوہ (ماکو)

پائے رفتار (پیڈل، پاؤڑی)

رسّی

پائے رفتار

دکھوٹ گلی

جبیل

موٹھ (دستہ)

... لگانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

دھاگے کی نلیاں [illegible]
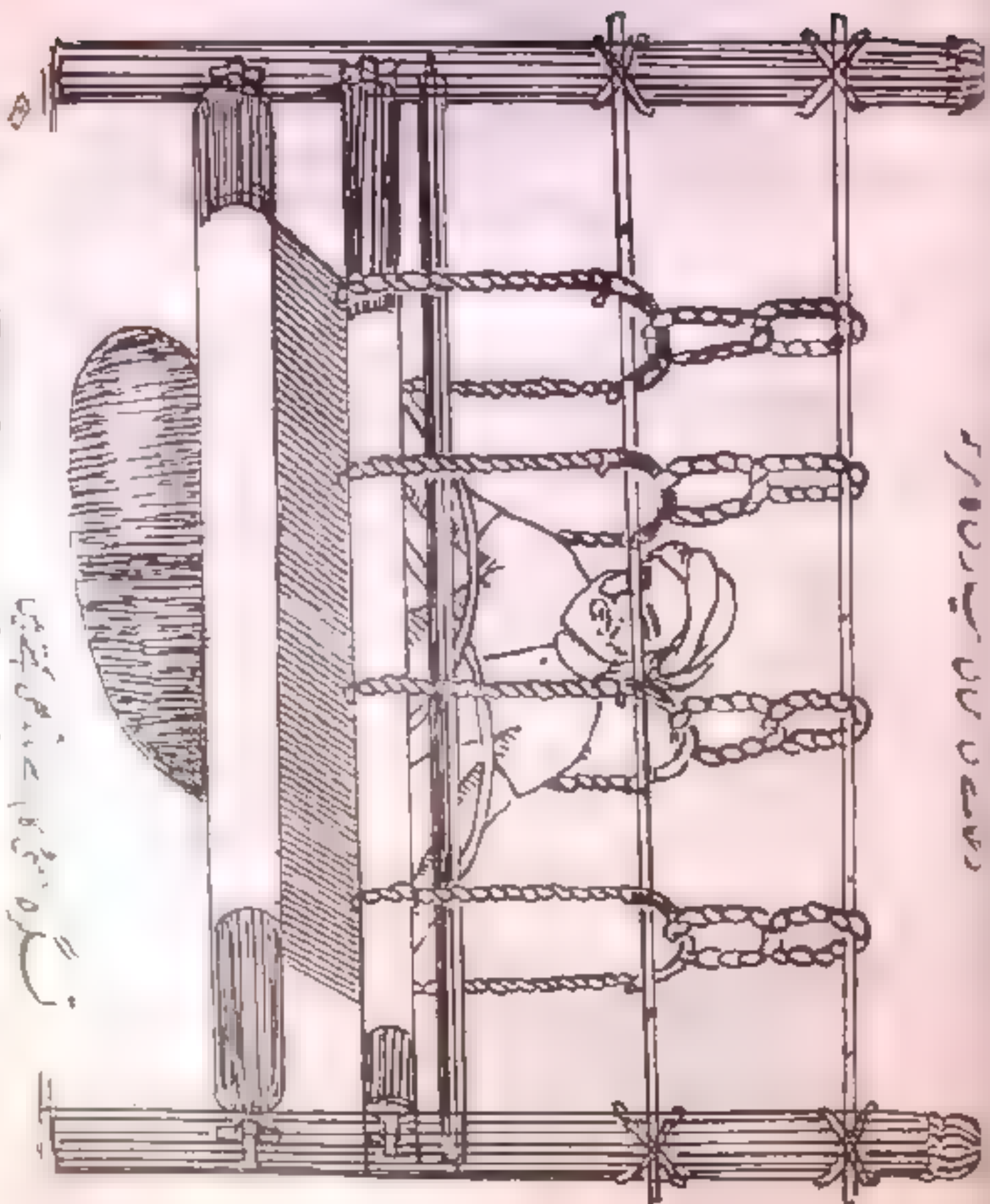
تگرہ مٹی کا، جسے ناند کہتے ہیں

سوت بھری نری (کانڈی) رکھنے کے لیے

پٹ لوم پر کام کرتا ہوا کاریگر

ناند

شکل ۱۲-۵

بے (جالا)

تسگر (بکالی)

بیلن

دو بیلن

رسی

پائے رفتار

سیل

(بچھ لٹکانے کی رسی)

مالا

کنگھی (بیس)

تراوڑی (...)

تنی (بچھ) سوت کے ٹھاٹے میں لگی ہوتی ہے

بنے (جالا)

تگر (ابسکال)

بیلن

رسی
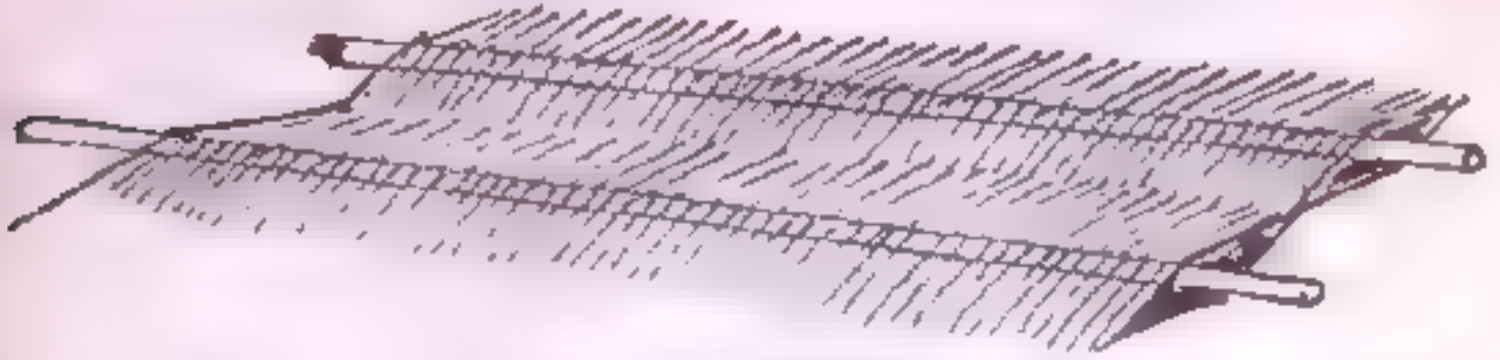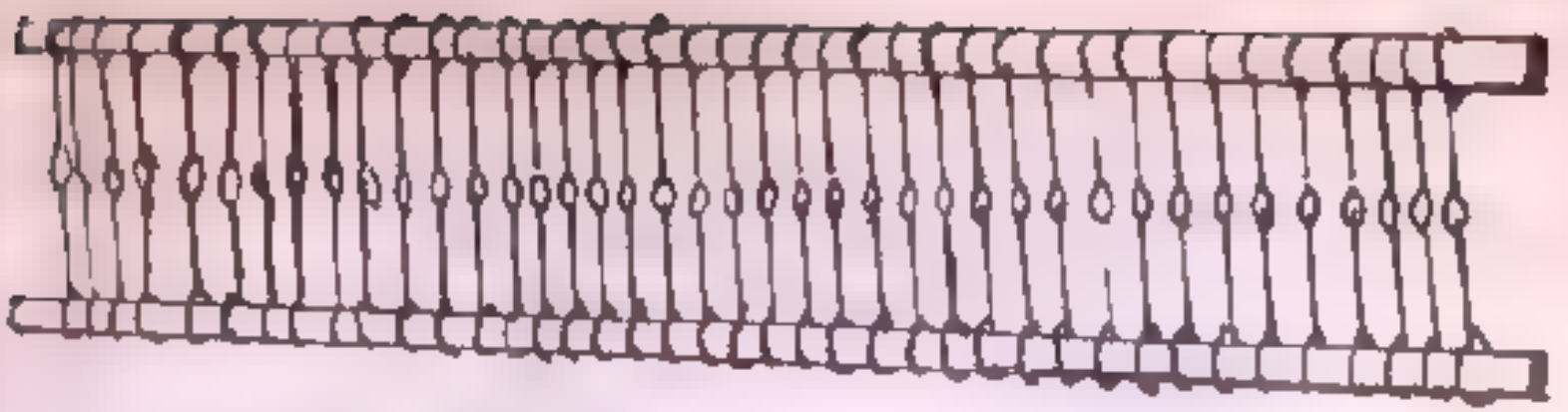
پائے رفتار
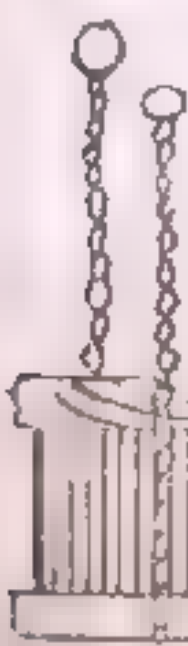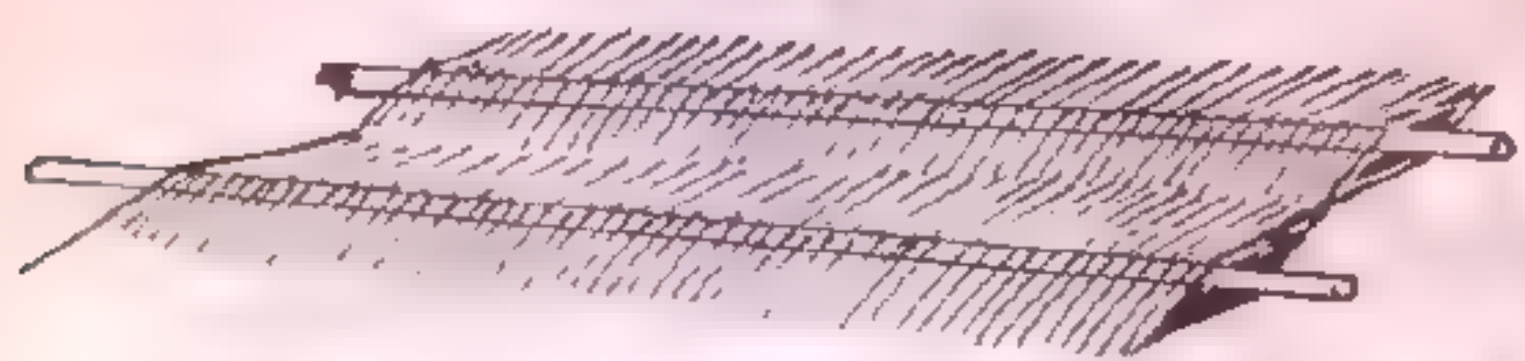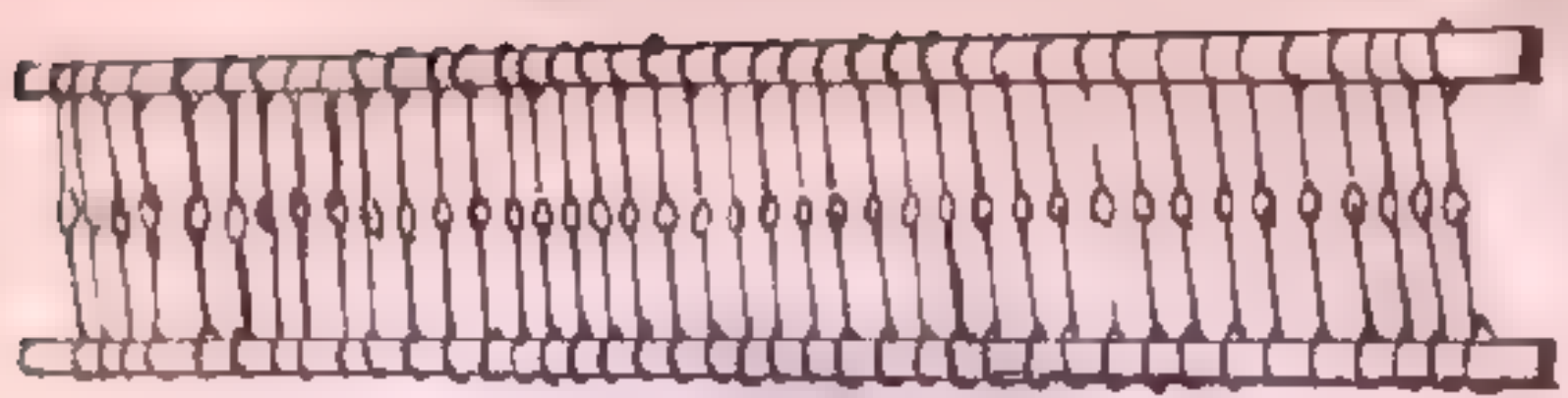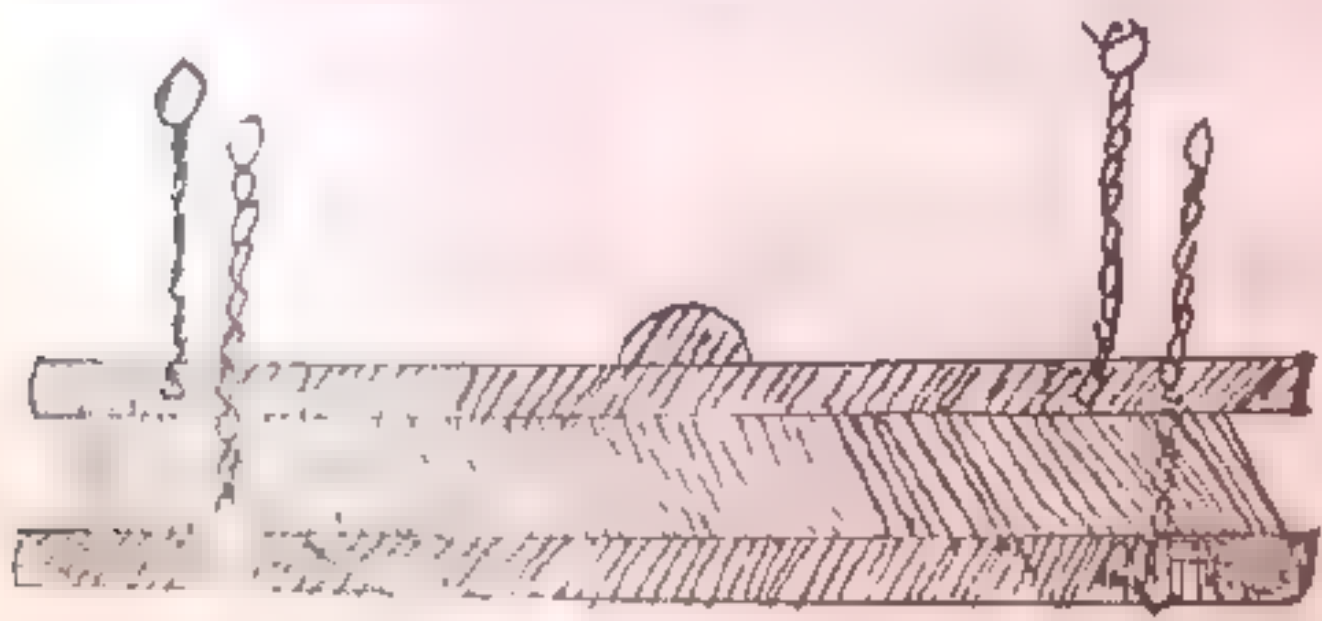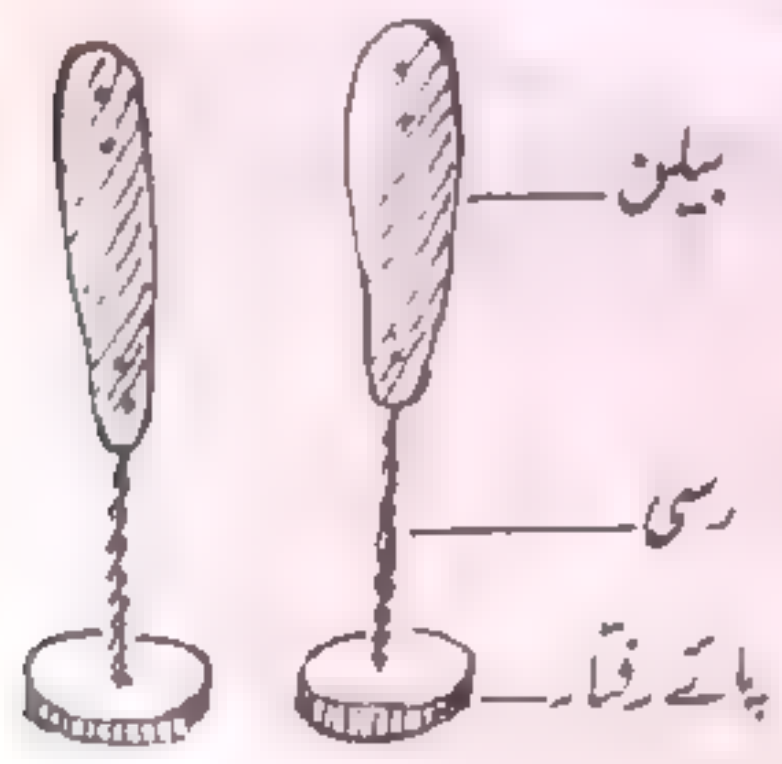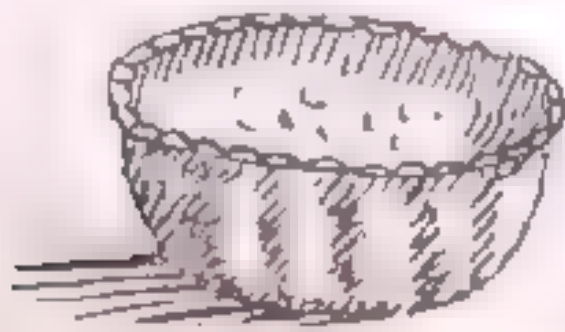
کپاس میں سے بیج نکالتے ہوئے

(Ginning) سنہ ۱۷۲۹ء

دھاگے سے پھرکی (ریل) بنانا
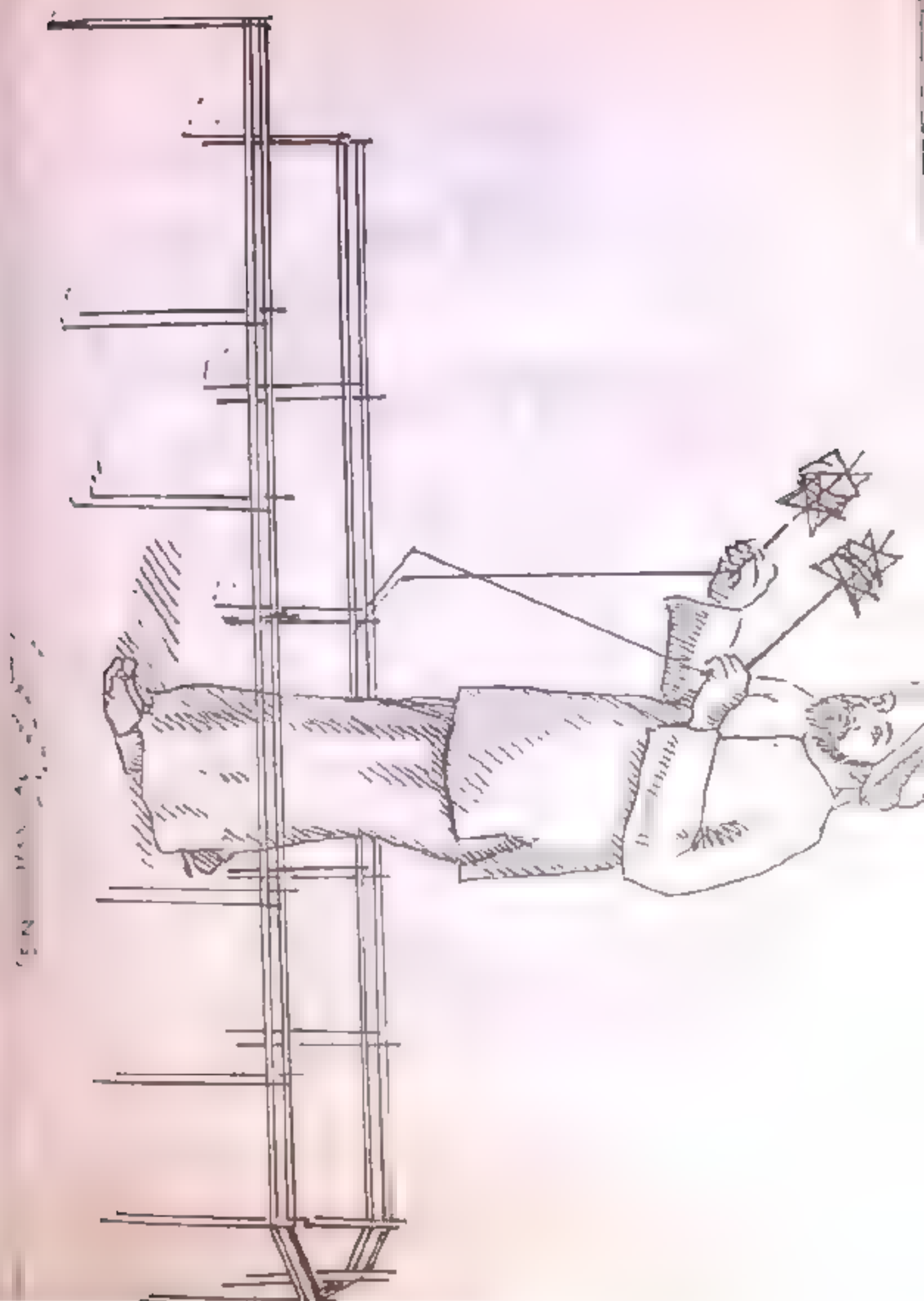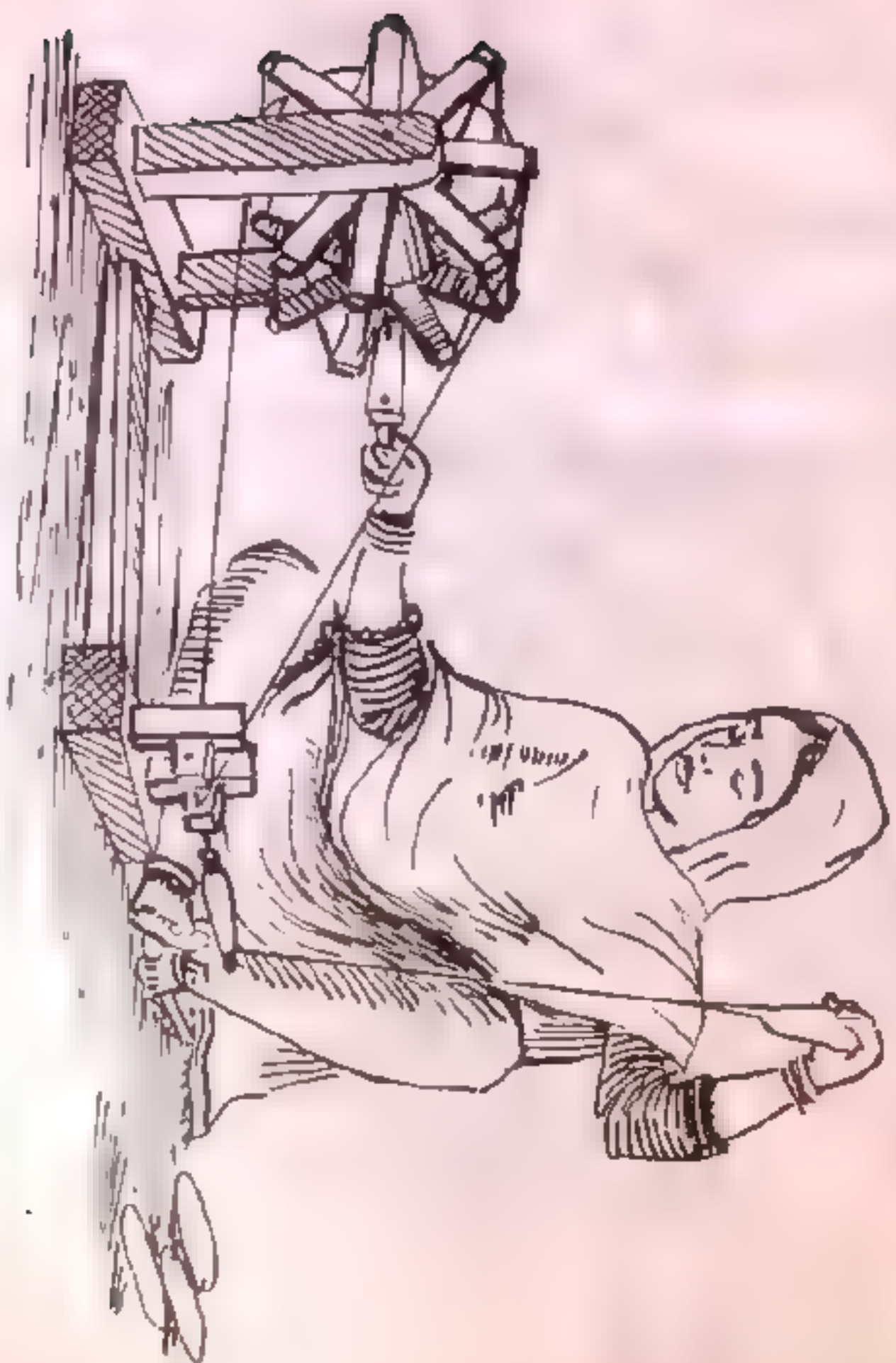
چرخے کی مدد سے دھاگا کاتتے ہوئے مسلم عورت سنہ ۱۲۱۵ء

(ٹیکوا) ٹیکوے کی مدد سے باریک (مہین) دھاگہ تیار کرنا شکل ۱۲۲۵ نمبر

ٹیکوے کی مدد سے کپاس سے دھاگہ بنانا سنہ ۱۲۲۵ء

دھنیا کپاس کو دھنکتے ہوئے

نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

نام	محی الدین محمد ابراہیم
عرفیت	مومن (انصاری زیادہ پسندیدہ ہے)
تاریخ ولادت	(بلا استناد) ۱۰۔مارچ ۱۹۲۹ء
جائے پیدائش	بھیونڈی (قصبہ اسلام آباد، بھیڑی)
آبائی وطن	موضع اکبر گنج، تحصیل پھولپور، ضلع الہ آباد (یوپی)
تعلیم	ایم اے (بمبئی) پی ایچ ڈی (اڈنبرا، انگلستان)
سلسلۂ درس و تدریس و تحقیق	آرکائیز آفیسر، نیشنل آرکائیز آف انڈیا، محکمہ تعلیمات حکومت ہند (بھوپال) سینئر ریسرچ فیلو، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی یو جی سی فیلوشپ (دکن کالج۔ پونہ یونی ورسٹی) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈیز شملہ فیلو استاد فارسی اور صدر شعبۂ زبانہائے خارجی۔ بمبئی یونیورسٹی (۱۹۸۹ء) انڈین کاؤنسل آف ہسٹاریکل ریسرچ۔ نئی دہلی، سینئر فیلوشپ (۱۹۸۹-۱۹۹۴)
بیرونی ممالک کی یونیورسٹیوں کے مذاکرات میں شرکت یا دعوت نامے	تہران، مشہد، شیراز اور کرمان (ایران) انقرہ اور استنبول (ترکی) الجامعۃ الاسلامیہ، مدینہ منورہ
اکرام الٰہی	سر کریم بھائی ابراہیم اسکالرشپ (برائے اعلیٰ تعلیم انگلستان) تین گولڈ میڈل بمبئی یونیورسٹی اور اسمٰعیل یوسف کالج فیلوشپ صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ:- توصیفی سند اور سالانہ وظیفہ تا حیات (سنہ ۱۹۹۱ء)
تخلیقات و مطبوعات	چار کتابیں (اردو۔ انگریزی) MUSLIM COMMUNITIES IN MEDIVAL KOKAN مقالات و مضامین (اردو انگریزی اور فارسی)
موضوعات	اسلامی تاریخ۔ فارسی اردو ادب۔ شاعری افسانے۔ فقہ اسلامی
تحقیقی منصوبہ	اَلْمُعْجَمُ الْمُفَهْرِسْ لِمُصْطَلِحَاتِ الْفِقْهِ الْإِسْلَامِیْ " " (فقہ کی عربی انگریزی فرہنگ) " "
شغل دعا	رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ
آخری خواہش خاتمہ بالخیر	تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَ (سورۃ یوسف)